شیخ العرب والعجم شیخ الاسلام حضرت مولانا

سیّد حسین احمد مدنی رحمۃ اللہ علیہ

کی

سیاسی ڈائری

اخبار وافکار کی روشنی میں

جلد اوّل

۱۵۰۲ء تا اختتام ۱۹۱۸ء

عطا فرمودہ

جانشین شیخ الاسلام حضرت مولانا سیّد ارشد مدنی مدظلہ العالی

(استاذ الحدیث دارالعلوم دیوبند و صدر جمعیت علماء ہند)

تالیف وتدوین

ڈاکٹر ابوسلمان شاہجہان پوری

باہتمام: محمد ناصر خان

فرید بُک ڈپو (پرائیویٹ) لمٹیڈ

FARID BOOK DEPOT (Pvt.) Ltd.

New Delhi - 110002

حضرت مولانا سید حسین احمد مدنی رحمۃ اللہ علیہ کی

سیاسی ڈائری

(جلد اوّل)

تالیف و تدوین .... ڈاکٹر ابو سلمان شاہجہان پوری

باہتمام .... محمد ناصر خان

صفحات 690

اشاعت 2018ء
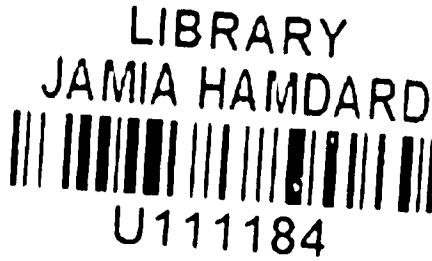
Maulana Sayyad Hussain Ahmad Madani (R.A.) Ki

Siyasi Diary

Akhbâr wa Afkâr Ki Roshni Mein

(Vol. 1)

Compiled by : Dr. Abu Salman Shahjahanpuri

Edition : 2018

Pages : 690
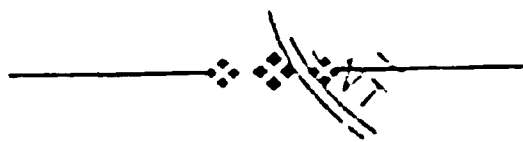
ناشر

FARID BOOK DEPOT (Pvt.) Ltd.

2158, M.P. Street, Pataudi House, Darya Ganj, New Delhi-2
Ph.: 011-23289786, 23289159 Fax: 011-23279998
E-mail: faridexport@gmail.com | Website: faridexport.com

Printed at : Farid Enterprises, Delhi-2

عرض ناشر

بحمد اللہ، ادارہ فرید بک ڈپو (پرائیویٹ لمیٹڈ) قرآن حکیم، احادیثِ مقدسہ، اسلامی تاریخ، فقہ، تبلیغی، اصلاحی، ادبی اور دیگر علوم وفنون پر اہم کتابوں کی طباعت واشاعت کے لیے پورے عالم اسلام میں مشہور ومقبول ہے۔ ادارہ کی اس نمایاں کامیابی میں اللہ رب العزت کی بے پایاں رحمت ونصرت اور بانی ادارہ خادم قرآن الحاج محمد فرید خاں مرحوم کا دینی وملی خلوص اور دعائیں شامل ہیں جنھوں نے قرآن مجید اور دینی لٹریچر کی اشاعت کو غیر منفعتی تبلیغی مشن کے طور پر جاری کیا تھا۔ خدا کا شکر ہے کہ بانی ادارہ کے نقشِ قدم پر چلتے ہوئے ہم مسلسل آگے بڑھ رہے ہیں۔

ہندوستان کی تاریخِ آزادی علمائے دیوبند کے بے مثال جذبۂ حریت اور جہدِ مسلسل سے روشن ہے۔ حضرت مولانا امداد اللہ مہاجر مکی، حضرت مولانا محمد قاسم نانوتوی، حضرت مولانا رشید احمد گنگوہی اور شیخ الہند حضرت مولانا محمود حسن رحمہم اللہ کے جانشین عظیم مجاہدِ آزادی شیخ الاسلام حضرت مولانا سید حسین احمد مدنی کی ذاتِ گرامی اسلامی ہند کی تاریخ کا درخشاں باب ہے۔ زیر نظر کتاب **"حضرت شیخ الاسلام مولانا سید حسین احمد مدنیؒ کی سیاسی ڈائری: اخبار وافکار کی روشنی میں"** شیخ الاسلامؒ کی حیات، علمی، دینی وملی خدمات اور وطن کی آزادی میں عدیم المثال قیادت کی مستند و معتبر دستاویز ہے جسے نامور اسلامی دانشور حضرت مولانا ابوسلمان شاہجہانپوریؒ نے مدوّن کیا ہے۔

ادارہ فرید بک ڈپو کو بجا طور پر فخر ہے کہ جمعیۃ علماء ہند کی سوسالہ تقریبات کے سلسلے میں اکابرینِ جمعیۃ علماء ہند کی یاد میں ان شاہکار کتابوں کو شائع کرنے کی سعادت ہمیں حاصل ہوئی ہے۔

اللہ جل شانہٗ کی بارگاہ میں دست بدعا ہوں کہ 'چراغِ مدنی' اسی آب وتاب سے روشن رہے اور دارالعلوم دیوبند و جمعیۃ علماء ہند ملتِ اسلامیہ کی خدمت، حفاظت اور قیادت کی شاہراہ پر پیش رفت کرتے رہیں۔ آمین۔

خادم قرآن

(الحاج) **محمد ناصر خان**

دُرُودِ شریف

اَللّٰھُمَّ صَلِّ عَلٰی مُحَمَّدٍ وَّ عَلٰی اٰلِ مُحَمَّدٍ
کَمَا صَلَّیْتَ عَلٰی اِبْرَاھِیْمَ وَ عَلٰی
اٰلِ اِبْرَاھِیْمَ اِنَّکَ حَمِیْدٌ مَّجِیْدٌ، اَللّٰھُمَّ بَارِکْ عَلٰی
مُحَمَّدٍ وَّ عَلٰی اٰلِ مُحَمَّدٍ کَمَا بَارَکْتَ عَلٰی اِبْرَاھِیْمَ
وَعَلٰی اٰلِ اِبْرَاھِیْمَ اِنَّکَ حَمِیْدٌ مَّجِیْدٌ ○

کلماتِ ارشد

نحمدہ و نصلی علیٰ رسولہ الکریم

شیخ الاسلام حضرت مولانا سید حسین احمد صاحب مدنی نوراللہ مرقدہ کی زندگی بڑی مشغول زندگی تھی، صبح سے لے کر رات تک کوئی وقت فارغ نہیں تھا، درس و تدریس، بیعت وارشاد، واردین وصادرین سے ملاقات اوران کی باتوں کو سن کران کی ضرورتوں کو پورا کرنا، دیوبند میں قیام کے وقت روز کا معمول تھا۔ سفر میں مشغولیتیں دوسرے انداز کی ہوتی تھیں اور آرام کا وقت کم ہی ملتا تھا۔ لیکن حالاتِ حاضرہ سے واقفیت کے لیے اخبارات پڑھنے کا معمول سفر وحضر میں جاری رہتا تھا۔ اور جو چیز حضرتؒ کے خیال میں اہم ہوتی تھی اس کو نوٹ کر لینے کا معمول تھا۔

اور یہ موضوع حضرت مدنی رحمۃ اللہ علیہ کی نظر میں اتنا اہم تھا کہ نوٹ کرنے کے لیے ایک کاپی سفر میں بھی آپ کے ساتھ رہا کرتی تھی اور جب کوئی چیز مذاق وپیش آمدہ حالات کے مطابق سامنے آتی تھی تو نوٹ فرمالیتے تھے، جس سے بظاہر یہ معلوم ہوتا ہے کہ حضرتؒ کے ذہن میں یہ بات تھی کہ فرصت ملنے پر کسی وقت ان معلومات کو کتابی شکل دی جائے گی۔ لیکن ۱۹۴۷ء سے پہلے تحریکِ آزادیٔ وطن میں انہماک رہا اور ۱۹۴۷ء کے بعد احیاے دین، اقامتِ مدارس تحریرِ مکاتیب، وعظ ونصیحت، بیعت و سلوک اور ہندوستان میں رہ جانے والے مسلمانوں میں اسلامی تشخص کے ساتھ حوصلہ اور ہمت پیدا کرنے میں شب وروز لگ گئے اور آخری وقت تک فرصت نہ مل سکی۔

حضرت مدنی نوراللہ مرقدہ کے ذاتی مکتبہ میں ہمیں اس طرح کے دو مجموعے ملے۔ ایک کا نام ''حضرت مدنی کی ذاتی ڈائری'' اور دوسرے کا نام ''معلوماتِ شتیٰ'' تھا۔ اور دونوں مجموعے نوے فیصد حضرت رحمۃ اللہ علیہ کے اپنے قلم سے تحریر کردہ ہیں شاید وباید کہیں کہیں ایسا بھی ہے کہ اگر مضمون طویل ہے تو منشی سید شفیع صاحب مرحوم کو

دے دیا کہ اس کو نوٹ کر دیں۔

زیر نظر کتاب حضرت مدنی رحمۃ اللہ علیہ کی جمع کردہ معلومات کا مجموعہ ہے۔ چوں کہ متفرق معلومات ہیں اس لیے کہیں کہیں اصل موضوع سے متعلق معلومات کا اضافہ کیا گیا ہے، تاکہ پڑھنے والا صحیح فائدہ حاصل کر سکے۔

آزادیٔ وطن کی تحریک جو حضرت شاہ ولی اللہ صاحب محدث دہلوی رحمۃ اللہ علیہ کے زمانے سے شروع ہوئی تھی، اس میں ایک نیا موڑ آیا اور مسلمانوں کا ایک حلقہ مذہب کے نام پر تقسیم ہند کی تحریک چلانے لگا، جمعیۃ علماء ہند جو ایک عرصے سے آزادیٔ وطن کی تحریک چلا رہی تھی اور ہر مرحلے پر بڑی سے بڑی قربانی دے رہی تھی، تقسیم ملک کے نظریے کی مخالف تھی اور تقسیم کو مسلمانوں کی طاقت ٹوٹ جانے اور بٹ کر بے وزن ہو جانے کے مرادف سمجھتی تھی۔

ایسا لگتا ہے کہ تقسیم ملک کے بعد تبادلۂ آبادی کے نتیجے میں بالخصوص پنجاب میں اور پھر دہلی میں مسلمانوں کی بربادی اور املاک کی تباہی، معصوم اور پاک دامن عورتوں کی عصمت دری کے بدترین حالات ان کی آنکھوں کے سامنے تھے اور وہ ہر مرحلے پر قوم کو باخبر کر رہے تھے۔

یہ دو نظریے تھے اور اپنے اپنے نظریے کو سامنے رکھتے ہوئے دونوں طبقے سر دھڑ کی بازی لگا کر کام کر رہے تھے۔ قضاء و قدر کا فیصلہ سامنے آیا، ملک آزاد بھی ہوا، تقسیم بھی ہو گیا اور مسلمانوں کی طاقت یکے بعد دیگرے بٹتی ہی چلی گئی۔

اب یہ فیصلہ قوم کے دانش ور کریں گے کہ حق کس کے ساتھ تھا اور مسلم قوم نے تقسیم ملک سے کیا پایا اور کیا کھویا؟

چوں کہ حضرت مدنی نور اللہ مرقدہ جمعیۃ علماء ہند کی بنیادی شخصیت تھے اس لیے ان کا نظریہ بھی جمعیۃ علماء ہند کا نظریہ تھا۔

پڑھنے والے کو اس مجموعے میں اس طرح کے واقعات بھی ملیں گے جو قایدین قوم کے نظریات کو پیش کرتے ہوں گے یا ان کی زندگی کی عکاسی کر رہے ہوں گے، یا

اسلام کے نام پر مملکتِ اسلامیہ کا مطالبہ کرنے والے افراد کی ان کی اپنی اسلامی زندگی کو پیش کر رہے ہوں گے۔ مگر چوں کہ وہ واقعات حوالے کے ساتھ شایع شدہ ہیں اور بلا مدافعت اخبارات کی سرخیوں میں آتے رہے ہیں اس لیے قابلِ انکار بھی نہیں ہیں اور پڑھنے والے کو صحیح نظریہ قایم کرنے اور ناقابلِ انکار حقیقت تک پہنچنے میں مددگار ثابت ہوں گے۔

یہ کام جناب ڈاکٹر ابوسلمان شاہ جہان پوری کی محنت نتیجہ ہے، جو آپ کے سامنے ہے۔

ہوا یوں کہ آج سے کم وبیش دس بارہ سال پہلے ڈاکٹر صاحب ہندوستان آئے تو دیوبند بھی آئے، چوں کہ اکابرِ دیوبند بالخصوص حضرت مولانا مدنی نور اللہ مرقدہ سے ان کو مراد آباد میں مولانا عبدالحق صاحب مدنی ؒ کے یہاں بحیثیت طالبِ علم کے قیام کے زمانہ سے انتہائی حسنِ عقیدت تھی، حضرت ؒ کو بار بار قریب سے دیکھا تھا، اس لیے وہ حضرت ؒ کی کچھ غیر مطبوعہ تحریرات کے متمنی تھے اور دیرینہ خواہش تھی کہ اس پر کچھ کام کریں، میں نے موصوف کے سامنے حضرت ؒ کے یہ دونوں مجموعے رکھے۔ موصوف نے اپنے چند روزہ قیام کے دوران مطالعہ کیا اور کہنے لگے کہ یہ میرا حاصلِ سفر ہے، میں نے اس کی فوٹو کاپی ان کو دے دی اور یہ وعدہ لے لیا کہ موصوف اس پر کام کر کے طباعت کا بندوبست کریں گے، ڈاکٹر صاحب اس درمیان بیمار بھی ہوئے اور مختلف حوادث ومشکلات کا شکار بھی رہے۔ لیکن یہ ان کے شدتِ تعلق اور حسنِ عقیدت کی دلیل ہے کہ انھوں نے اس کام کو نہ چھوڑا۔ اور بفضلِ خداوندی پایۂ تکمیل کو پہنچ گیا۔ اس دوران ڈاکٹر صاحب کو اگر کسی ایسے مضمون یا کتاب کی ضرورت پیش آئی، جو پاکستان میں میسر نہیں ہوتی تھی تو کوشش کر کے اس کو ہندوستان سے مہیا کر کے موصوف کے پاس بھیجا جاتا رہا۔

میں یہ سمجھ رہا ہوں کہ آج یہ ڈائری جو ڈاکٹر ابوسلمان صاحب شاہ جہان پوری کے ہاتھوں مرتب ہو کر کتابی شکل میں آ رہی ہے اور حضرت محترم قاری شریف احمد صاحب

مدظلہٗ اوران کے صاحب زادگان کی مساعیٔ جمیلہ سے زیورِ طبع سے آراستہ ہورہی ہے، یہ حقیقت میں حضرت مدنی نوراللہ مرقدہٗ کا ایک کام تھا، جو آج ان حضرات کے ہاتھوں پایۂ تکمیل کو پہنچا۔

راقم الحروف دعا گو ہے کہ اللہ تعالیٰ ان سب حضرات کو اپنے فضلِ خاص سے نوازے۔ اور شیخ الاسلام قطب عالم حضرت مولانا سید حسین احمد صاحب مدنی نوراللہ مرقدہٗ سے دنیا میں اس حسنِ عقیدت کو آخرت میں اپنی جنت میں قربت اور معیت کا ذریعہ بنائے، اپنی مرضیات پر چلنے کی توفیق عطا فرمائے اور شرور وفتن سے محفوظ و مامون فرمائے۔ آمین!

۲۱/۶/۲۳ھ

مقدمہ

شیخ الاسلام کی سیاسی ڈائری

۱۹۸۸ء میں مجھے ہندوستان جانے کا اور حضرت شیخ الاسلام مولانا سید حسین احمد مدنی علیہ الرحمہ کے خلف الرشید و جانشین حدیث مولانا سید ارشد مدنی مدظلہٗ سے دیوبند میں ملاقات اور ان کا مہمان بننے کا شرف حاصل ہوا۔ حضرت مخدومی مولانا سید اسعد مدنی دامت برکاتہم سے اس سے پہلے حضرت کے سفر کراچی کے موقع پر نیاز حاصل ہو چکا تھا اور اسی سفر میں چند دن پہلے دہلی میں دوسری بار ملاقات کی سعادت حاصل ہوئی تھی۔ یہیں مرشد زادہٗ محترم مولانا اسجد مدنی سے ملاقات کی خوش وقتی حاصل ہوئی تھی۔ دیوبند کے سفر کا اشتیاق ظاہر کیا تو فوراً ایک رفیق عزیز کے ساتھ اس کا انتظام کر دیا۔

ہندوستان میں اس سے پہلے اگست ۱۹۶۲ء میں بھی جا چکا تھا۔ لیکن حالیہ سفر میرے لیے ایک یادگار سفر تھا۔ اس سفر میں دارالعلوم دیوبند کے در و دیوار دیکھ کر آنکھوں نے ٹھنڈک حاصل کی اور قال اللہ وقال الرسول ﷺ کی فضا میں گونجتی ہوئی صداؤں سے کان آشنا ہوئے۔ دارالعلوم کے قیام کے پس منظر سے، اس کے دینی و ملی مقاصد اور مختلف میدانوں میں عظیم الشان کارنامے ایک حد تک میرے مطالعے میں آ چکے تھے۔

لیکن دارالعلوم کی سیر و مشاہدہ نے اس کی عظمت کا نقش دل و دماغ پر کندہ کر دیا اگر یہ سفر میرے نصیب میں نہ ہوتا تو شاید اس کی تاریخی عظمت اور ملی اور قومی زندگی میں اس کی خدمات اور اہمیت کا نقش دل پر اتنا گہرا نہ ہو سکتا تھا۔ دارالعلوم کی سیر و مشاہدہ نے میرے ذہن اور قلب پر خاص اثر کیا اور میں نے محسوس کیا کہ گویا اس کی تاریخ اور عظمت کی داستان میرے مطالعے کی نہیں مشاہدے اور تجربے کی چیز ہے۔ میں نے سوچا ملک کے انقلاب میں ہم نے کیا کھویا اور کیا پایا؟ کیا دارالعلوم دیوبند، جامعہٗ ملیہٗ اسلامیہ دہلی، ندوۃ العلماء لکھنو، مسلم

یونیورسٹی علی گڑھ، جامعۂ عثمانیہ حیدرآباد، اس کے دارالترجمہ اور دایرۃ المعارف، دارالمصنفین اعظم گڑھ، خدابخش لائبریری پٹنہ اور ان کے کاموں اور ان کے معیار و جامعیت کی کوئی مثال اور جواب پیدا ہو سکا؟

اے بسا آرزو کہ خاک شدہ

ہندوستان میں جو معاشرہ تعمیر ہوا تھا اور مسلمانوں کی تاریخی یادگاروں اور علمی و تعلیمی اداروں کی شکل میں جو آثار و نقوش پیدا ہوئے تھے جو سیرتیں نقش پذیر ہوئی تھیں اور علم و فکر کے جو چشمے جاری ہوئے تھے وہ صدیوں کی کوششوں اور جدوجہد کا نتیجہ تھے۔ اب بھی ہمیں اللہ کی رحمت اور فضل و کرم سے مایوس نہ ہو جانا چاہیے لیکن اداروں کی مکمل تباہی اور حیات آفرین سرچشموں کے قطعاً خشک ہو جانے، زندگی کی اعلیٰ قدروں کی پامالی اور عزائم کی مکمل شکست کے بعد عظمت رفتہ کی بازیافت اور نشأۃ ثانیہ نامہ کے سروسامان کے لیے صدیوں کی جدوجہد اور ہر دم تازہ ہمتوں اور جوان ولولوں کی ضرورت ہوگی۔

لیکن جس طرح قومی زندگی کے پچپن برس (۱۹۴۷ء تا ۲۰۰۲ء) ہم نے غفلت میں گزار دیے ہیں، اگر ہماری یہی روش رہی تو یقین رکھنا چاہیے کہ ہمارے تمام خواب شرمندۂ تعبیر ہی رہ جائیں گے اور ہم جنھوں نے اپنے اسلاف سے زندگی کے ہر شعبۂ فکر و عمل میں عظیم الشان ورثہ پایا تھا، اپنے اخلاف کو تباہ کن حالات اور بھیانک مستقبل کے حوالے کر جائیں گے۔

❁

دیوبند کے سفر کی خاص یادگار حضرت شیخ الاسلامؒ کی دو کاپیاں تھیں جن کے سوا سو صفحوں میں اخبار کی کچھ سیاسی خبریں، زندگی کے مختلف شعبوں کے متعلق اعداد و شمار، بعض معلومات اور چند مضامین اور بعض لیگی رہنماؤں کے اشتعال انگیز بیانات درج تھے، جن میں چنگیز و ہلاکو بن جانے کے عزائم ظاہر کیے گئے تھے۔

ان میں بیشتر معلومات، اعداد و شمار، بیانات وغیرہ وہی تھے جو حضرت کے خطبات، رسایل اور خطوط میں کئی کئی بار نقل ہو چکے ہیں! نئی چیزوں میں نقیب، پھلواری شریف سے ماخوذ قاضی بل کی تفصیلات میں ایک مضمون اور کشمیر کے قضیے میں ایک صحافی کا مضمون تھا۔ یہ مضمون بھی نفس مسئلہ پر نہیں بلکہ اس کے حالات میں ہے جو اس مسئلے کے آغاز کے دنوں میں اُسے پاکستان میں پیش آئے تھے۔

حضرت کے قلم سے ڈایری کے یہ صفحات میرے کاغذات میں اب بھی موجود ہیں ان صفحات کی طوالت کتابت کے ستر اسّی صفحات تک پہنچ سکتی تھی اور صرف ان کی تدوین ڈایری کی شکل اختیار نہ کر سکتی تھی۔ اس کے لیے مجھے مزید مراحل طے کرنے پڑے۔

۱۔ سب سے پہلے تو حضرت شیخ الاسلام کے خطبات، خطوط، کتابچے اور تصنیفات کے مطالعے سے ڈایری کے لیے مواد اخذ کرنا پڑا۔

۲۔ سیاسیات میں عام لٹریچر کو کھنگالنا پڑا۔

۳۔ ہندوستان کی مختلف سیاسی جماعتوں مثلاً جمعیت علماے ہند، کانگریس، مسلم لیگ، مجلس احرار اسلام وغیرہ کی تواریخ کی تلاش و مطالعہ میں ہمت صرف کی۔

۴۔ ملک میں چلنے والی مختلف قومی و ملی سیاسی تحریکات اور شخصیات پر لٹریچر سے استفادہ کیا۔

۵۔ روزانہ اور سہ روزہ و ہفت روزہ اخبارات اس کا بہت بڑا ماخذ بن سکتے تھے۔ یہ جنس نایاب تھی۔ اس کی تلاش میں کوتاہی نہیں کی اور اگر چہ بہت بڑی کامیابی تو نہ ہوئی لیکن بالکل ناکامی کا منہ بھی نہ دیکھنا پڑا۔ مدینہ (بجنور) زمزم (لاہور)، الجمعیہ (دہلی) صدق اور صدق جدید (لکھنو) وغیرہ کی بہت سی فائلیں مل گئیں۔ ماہنامہ رسایل کا بہت بڑا ذخیرہ خود میرے پاس تھا اور احباب کے ذخایر علمیہ سے استفادے کے دروازے کھلے ہوئے تھے۔ لیکن ان میں بہت کم مفید مطلب مواد ہاتھ آیا۔

۶۔ اردو میں سیاسی ڈائری کی تالیف وتدوین پر کوئی خاص توجہ نہیں دی گئی لیکن یہ خانہ بالکل خالی بھی نہ تھا چند نہایت مفید کام انجام پائے ہیں؛

الف: ایک نادر روز نامچہ   مولفہ: سید مظہر علی سندیلوی، مطبوعہ خدا بخش پبلک لائبریری، پٹنہ

ب: حسرت موہانی---- ایک سیاسی ڈائری   مولفہ: اثر بن یحییٰ

ج: مولانا آزاد----- ایک سیاسی ڈائری   "   "

د: کاروانِ احرار   مرزا غلام نبی جانباز

اس مسئلے میں مولانا سید محمد میاں کی تالیف ''علمائے حق اور ان کے مجاہدانہ کارنامے'' (دوم) تحریک آزادی کے آخری دور کے حالات وواقعات کے مطالعے کے لیے نہایت مفید ثابت ہوئی۔

ایک نادر روز نامچہ اس کے مولف کے سامنے علمی موضوع اور تصنیف وتالیف کے کسی علمی منصوبے کے طور پر نہ تھا۔ وقت گزاری کا ایک مشغلہ تھا۔ صرف چند برسوں اور مطالعے میں رہنے والے ایک اخبار سے خبروں کے اخذ وترتیب پر مشتمل تھا لیکن یہ نہایت مفید اور اہم خبروں کا مجموعہ ہے۔

اثر بن یحییٰ اور مرزا جانبار کے سامنے ایک خاص علمی مقصد تھا، دونوں ایک خاص دایرہ فکر کی شخصیات تھے۔ اثر کا کام صرف دو شخصیات تک محدود تھے۔ حسرت پر بہت مختصر اور آزاد پر اس سے قدرے طویل کام ہے۔ یہ کام اثر کے سیاسی ذوق کے مطابق تھے لیکن مواد اور رسایل کی کمی نے ان کاموں کو ایک خاص حد سے آگے نہ بڑھنے دیا۔

مرزا جانباز کا کام عمومی ہے۔ وہ ایک آزاد، ترقی پسند، تحریک آزادی کے مجاہد اور پنجاب کے احرار سے ان کا تعلق تھا۔ اس لیے ان کے کام پر جو آٹھ جلدوں میں پھیلا ہوا ہے۔ ان کی آزاد خیالی، ترقی پسندی، حریت نوازی اور قوم پروری کی چھاپ لگی ہوئی ہے۔ ان میں غلطیاں بھی ہیں، لیکن اردو میں یہ بہت مفید اور اہم کام انجام پائے ہیں۔

۵

مولانا محمد میاں کی کتاب ابواب وفصول میں تقسیم تاریخ کے مقابلے میں ایک دور کی سیاسی ڈائری کی خصوصیات سے زیادہ قریب ہے۔ خاکسار نے ان سابقین واولین بزرگوں کے مساعی سے ڈائری کی تالیف اور اس کے مواد میں فایدہ اٹھایا ہے۔

ڈائری کا آغاز سولھویں صدی عیسوی کے آغاز سے کیا ہے، لیکن خاص طور پر اس وقت جب کہ ہندوستان سے ایسٹ انڈیا کمپنی کا کاروبار شروع ہو چکا تھا اور اس کے استحصالی عزایم برگ وبار پیدا کر رہے تھے۔ کمپنی کا سیاست میں دخیل ہونا اور اس کے سیاسی عزایم کا ظہور تاریخ ہند کے ایک نئے دور کا آغاز تھا۔ کمپنی کے معاشی استحصال اور سیاسی عزایم نے ہندوستان کا نقشہ یکسر بدل دیا تھا۔ ہندوستان کی سیاست، اس کی معاشیات، تعلیم، اخلاق وغیرہ پر اس کے دوررس اثرات پڑے تھے۔ حضرت شیخ الاسلام نے معاشی ابتری اور استحصال کے ملکی زندگی پر ہمہ جہت گہرے اثرات پر غور کیا تھا اور ملک کو ایک نیا انداز فکر دیا تھا جس کی بے شمار مثالیں حضرت کے رسایل، خطوط، تصنیفات اور خطبات میں ملتی ہیں۔ اس سے پہلے بلاشبہ معاشی نقطۂ نظر سے ہندوستان پر کتابیں لکھی گئیں تھیں اور ان کی اپنی اہمیت تھی۔ ان سے خاص ذوق کے لوگوں نے فایدہ اٹھایا تھا۔ لیکن عام طور پر ان سے کوئی عام ذوق پیدا نہیں ہوا تھا اور نہ ان کی اہمیت کا عام اعتراف کیا گیا تھا۔ لیکن حضرت شیخ الاسلام نے اس خصوصیت اور تواتر کے ساتھ اس کی اہمیت کو اجاگر کیا کہ لوگ عام طور پر اور سیاسی مدبرین نہ صرف اسے پسند کرنے لگے بلکہ آزادی کی جنگ میں اسے ایک موثر ہتھیار کے طور پر استعمال کرنے لگے اور عوام بھی ہندوستان کی معاشی تباہ کاری اور کمپنی کے استحصال کی داستانوں کو شوق سے سننے اور ان میں دل چسپی لینے لگے۔ یہ نیا انداز فکر جس نے ایک تحریک کی شکل اختیار کر لی تھی، اس عہد کو حضرت شیخ الاسلام کی خاص دین ہے۔ ہندوستان کی تباہی و بربادی کی بنیادیں کمپنی کے

دور ہی میں استوار ہوئی تھیں۔ اگر ڈائری میں کمپنی کے عہد کو خاص اہمیت نہ دی جاتی اور اس کے معاشی استحصال اور اس کے ہمہ جہت اثرات کو واضح نہ کیا جاتا تو حضرت کے فکر کی ایک اہم خصوصیت نمایاں نہ ہو سکتی تھی۔

کمپنی کی لوٹ مار کا دور ۱۸۵۷ء تک جاری رہا، ۱۸۵۷ء کی جنگ آزادی اسی کے دور میں لڑی گئی۔ ملکہ وکٹوریہ کا دور یا انگلستان کی نام نہاد انصاف پسند سیاسی و آئینی حکومت کے قیام سے ہندوستان کی تاریخ کا ایک نیا دور شروع ہوتا ہے۔ لیکن چوں کہ نئی حکومت کے قیام سے انتظامیہ میں کوئی تبدیلی نہ ہوئی تھی اور کمپنی کے انداز کاروبار اور استحصال نے ہندوستانی معاشرے کو تباہی کے جس راستے پر ڈال دیا تھا۔ وہ سفر جاری رہا۔ استحصال کے عمل اور تباہی و بربادی کے اس سفر کو روک دینا نہ تو برطانوی حکومت کے بس میں تھا اور نہ اس کے پیش نظر مقاصد ہی میں شامل تھا۔ اگر چہ حکومت کا انداز بدل گیا تھا لیکن حکومت کا ہر فیصلہ اور اس کا عمل تباہی اور انتشار کا پیش خیمہ ثابت ہوتا تھا۔ پہلے کھلا استحصال اور دھاندلی تھی، اب ہر جبر و استحصال، لوٹ مار اور انتشار و فساد کے لیے اصول وضع کر لیے جاتے تھے۔ حضرت شیخ الاسلام کے افکار و افادات میں حوالہ جات کی صراحت کے ساتھ اس کے ثبوت موجود ہیں اور اس ڈائری کے اوراق میں اس کی واضح نشانیاں ہیں۔

ڈائری کا اختتام حضرت شیخ الاسلام کے سانحۂ ارتحال پر ہوتا ہے اور حضرت کے انتقال پر ملک میں جو ماتم برپا ہوا اور حضرت کو مختلف طبقاتِ قوم اور اکابر نے جو خراج عقیدت پیش کیا اس کا بھی احاطہ کر لیا گیا ہے۔

یہ ڈائری چار حصوں میں مرتب کی گئی:

پہلی جلد ۱۵۰۲ء سے شروع ہوتی ہے اور ۱۹۱۹ء کے اختتام کے ساتھ ساتھ ختم ہو جاتی ہے۔ اس حصے میں ایسٹ انڈیا کمپنی کی تجارت، ملک کے سیاسی معاملات میں اس کا دخیل

ہونا، معاشی استحصال، ملکی ریاستوں اور قوموں کا ایک دوسرے کے خلاف استعمال، اختلافات کا پیدا کرنا اور ان کی خلیج کو وسیع کرنا، کسانوں اور عوام پر مظالم، ملک میں عام بے چینی، ۱۸۵۷ء کی بغاوت کا ظہورِ عام، انقلابی قوتوں کی جاں بازی، شاملی کا معرکہ، تحریک آزادی کی ناکامی۔ مغلیہ حکومت کا خاتمہ، برٹش استعمار کی خونریزی، ملکہ وکٹوریہ کے راج کا آغاز، نام نہاد اعلان معافی، گرفتاریوں اور سزاؤں کا تسلسل، نئے حالات اور نئی منصوبہ بندی، مدرسۂ اسلامیہ (دارالعلوم) دیوبند کا قیام اور اس کے مقاصد، دورِ مسعود قاسمی اور عہد محمودی کی سیاسی خدمات، کانگریس کا قیام اور اس کے سیاسی سفر کا آغاز، حضرت شیخ الاسلام کے خاندان کی ہجرت مدینہ۔

مسلم لیگ، ہندو مہاسبھا کا قیام اور ان کے قیام کا پس منظر، جمعیۃ الانصار ا نظارۃ المعارف القرآنیہ کے انقلابی تعلیمی مرکز کا قیام مولانا سندھی کا سفر کابل اور حضرت شیخ الہند کا سفر حجاز اور تحریک ریشمی رومال ان کے مقاصد، ترکی خلافت کے خلاف شریف مکہ کی بغاوت، حجاز میں حضرت کی گرفتاری، رفقاء کا ایثار و وفاداری، مالٹا کی اسارت، مالٹا کے حالات و معمولات، ترکی کے خلاف برطانیہ اور دول یورپ کی سازش، ملک کے سیاسی حالات، تحریک آزادی کے نشیب و فراز، تحریک خلافت کا آغاز اور جمعیت علماے ہند کا قیام و مقاصد وغیرہ کے تذکرے پر پہلی جلد کا خاتمہ ہو جاتا ہے۔

دوسری جلد ۱۹۲۰ء کے آغاز سے شروع ہوتی ہے اور ۱۹۳۹ء کے اختتام تک پھیلتی چلی جاتی ہے۔ اس جلد میں تحریک خلافت، ترک موالات، تحریک ہجرت کا آغاز، حضرت شیخ الہند کی قید مالٹا سے رہائی، آمد ہندوستان اور آپ کے زیر صدارت جامعۂ ملیۂ اسلامیہ کا قیام اور جمعیت علماے ہند کے دوسرے سالانہ جلسۂ دہلی کا انعقاد، حضرت کی وفات کا حادثہ، مدرسۂ اسلامیہ کلکتہ کا قیام، پیغام کا اجرا، حضرت شیخ الاسلام مدنی، امام الہند مولانا آزاد، علی برادران اور بہت سے مسلمان اور غیر مسلمان زعماے ملک کی گرفتاریاں، کراچی اور علی پور (کلکتہ) سنٹرل جیل کے مقدمات، ترک موالات کا التوا، حجاز سے شریف مکہ حسین کا انخلا، سعود آل

فیصل کے زیر انتظام حجاز کی جدید تاریخ کا آغاز، سائمن کمیشن کی آمد، ملک میں سیاسی سرگرمی، نہرو رپورٹ کی تیاری اور قبول واسترداد کا ہنگامہ، مکمل آزادی کی قرارداد، نمک سازی اور سول نافرمانی کی تحریک، گول میز کانفرنس، ۱۹۳۵ء کے انڈیا ایکٹ کا نفاذ، ۱۹۳۷ء کے انتخابات، مسلم لیگ کی شکست فاش، صوبوں میں کانگریسی حکومت کا قیام، جنگ عظیم دوم کا آغاز، کانگریس اور برٹش گورنمنٹ کا اختلاف، جنگ میں برطانوی حکومت سے تعاون کی کانگریسی شرائط اور مسلم لیگ کا غیر مشروط تعاون، کانگریسی حکومتوں کا استعفا اور مسلم لیگ کا یوم نجات کا اعلان، اس پر ردعمل اور ملک میں نئی سیاسی کشمکش وغیرہ وغیرہ اہم واقعات اس جلد میں آئے ہیں۔

تیسری جلد ۱۹۴۰ء سے شروع ہو کر ۱۹۴۷ء تک پہنچتی ہے۔ یہی زمانہ تھا جب برطانیہ نے ہندوستان کے لیے نئی پالیسی وضع کی اور اس کے مطابق اپنے مہروں کو آگے بڑھایا۔ مسلم لیگ کا اجلاس لاہور منعقد ہوا جس میں ایک قرارداد پاس کی گئی جو بعد میں قرارداد پاکستان کے نام سے مشہور ہوئی۔ حال آں کہ اس میں پاکستان اور اسلام کا نام تک نہ آیا تھا اور نہ اجلاس کے صدر جناح صاحب کے خطبۂ صدارت میں اس قسم کی کوئی بات آئی تھی۔ لیکن جب بعض غیر مسلم اخبارات نے اسے پاکستان کا نام دیا اور ان کا پیچھا کیا تو انھوں نے جو تقریباً دو سال تک قرارداد کو پاکستان کے اتہام سے بچاتے رہے تھے، اس اتہام کو حقیقت تسلیم کر لیا۔

قرارداد لاہور کا صور کچھ اس بلند آہنگی سے پھونکا گیا اور اس پر ردعمل میں چند غیر مسلم اخبارات کے بیانات کو اس زور شور کے ساتھ پیش کیا گیا کہ معلوم ہوتا ہے۔ یہ قرارداد لیگ کی نہیں کل مسلمانوں کی متفقہ قرارداد تھی۔ چوں کہ جمعیت علماے ہند یا دیگر حریت پسند جماعتوں اور قوم پرور مسلمانوں کا کوئی فوری ردعمل سامنے نہ آیا تھا۔ حال آں کہ تاریخ کے اس یادگار موڑ پر بھی قوم پرور مسلمانوں، حریت پسند جماعتوں اور جمعیت علماے ہند کے بزرگوں نے قوم وملت کی رہنمائی کا فریضہ ادا کرنے میں ہرگز کوتاہی نہ کی تھی۔ مسلم لیگ کی یہ قرارداد ۲۳ ؍ مارچ کو پاس ہوئی تھی، حریت پسند جماعتوں اور قوم پرور مسلمانوں کا نقطۂ نظر ایک کل

جماعتی آزاد مسلم کانفرنس دہلی کے ذریعے ۲۶ تا ۳۰ راپریل میں سامنے آ گیا اور اس کے بعد ڈیڑھ مہینہ گزرنے سے پہلے حضرت شیخ الاسلام مولانا حسین احمد مدنی صدر جمعیت علماے ہند نے جون میں جمعیت کے سالانہ اجلاس لاہور میں اپنے نہایت مدلل اور مفصل خطبۂ صدارت میں جمعیت کا نقطۂ نظر پیش کر دیا۔ دہلی کانفرنس اور جمعیت کا جلسہ اور ان کے خطبات صدارت اور ان کی قراردادیں ہندوستان کی تحریک آزادی کا ایک یادگار تاریخی سرمایہ ہیں، جن پر ان کی اہمیت کے مقابلے میں بہت کم توجہ دی گئی ہے۔

اسی سال حضرت مفتی اعظم مولانا محمد کفایت اللہ دہلوی بیس سال کی سیاسی ملی خدمات انجام دینے کے بعد جمعیت کی صدارت سے الگ ہوئے تھے اور حضرت شیخ الاسلام نے جمعیت کی مستقل صدارت کی ذمہ داری سنبھالی تھی۔ مسلم لیگ کے اجلاس لاہور سے چند دن پہلے ۱۹ رمارچ کو لاہور میں خاکسار کے جلوس پر پولیس کی فائرنگ نے فضا کو نہایت مکدر بنا دیا تھا۔ خاکساروں میں بہت اشتعال تھا۔ اس واقعے نے جناح صاحب اور مسلم لیگ کے اجلاس کے لیے مشکلات پیدا کر دی تھیں۔ لیکن حکومت کو اور ویسرائے کو چوں کہ لیگ کے اجلاس کے لیے فضا کو سازگار بنانا اور اجلاس کو کامیاب کروانا تھا۔ اس لیے فوراً حالات پر قابو پا لیا گیا۔

اس سال کے آغاز کا ایک اہم واقعہ سابق گورنر پنجاب لیفٹننٹ جنرل سر مائیکل اڈوایر کا لندن میں قتل تھا۔ اڈوایر جلیان والہ باغ امرتسر کے قتل عام کا بانی مبانی تھا۔ سردار اودہم سنگھ نے اس واقعے کے اکیس برس بعد اسے گولی مار کر تاریخی انتقام لے لیا اور فخریہ اعتراف کر کے پھانسی کے تختے پر چڑھ گیا۔ اس سال کے نصف آخر میں مولانا ابوالکلام آزاد صدر کانگریس نے جناح صاحب کو جو لیگ کے صدر تھے، ملک کے حالات پر تبادلۂ خیالات کے لیے ایک خط لکھ کر دعوت دی۔ اس کے جواب میں جناح صاحب نے مولانا کو تاریخ کی سب سے بڑی گالی دے کر اخلاق و تہذیب کی دھجیاں اڑا دیں۔ اس پر کانگریس، جمعیت علماے ہند، حریت پسند جماعتوں، قوم پرور مسلمانوں نے شدید احتجاج کیا۔ ملک کے مسلم اور

غیر مسلم اور لیگ کے سنجیدہ حلقے میں بھی جناح صاحب کے اس رویے کو سخت ناپسند کیا گیا۔ مولانا آزاد سے ایک صاحب نے اپنے رنج کا اظہار کیا تو مولانا نے فرمایا کہ اسے بھول جاؤ اور تاریخ کے فیصلے کا انتظار کرو، کوئی شخص گالی دے کر اپنی عزت میں اضافہ نہیں کر سکتا! پاکستان کے نامور مورخ شریف الدین پیرزادہ نے جو ایک زمانے میں جناح صاحب کے پرائیوٹ سکریٹری بھی رہ چکے تھے، اپنے ایک مضمون میں اس واقعے کے اصلیت سے انکار کیا ہے کہ جناح صاحب نے کسی صحافی کو اس قسم کا کوئی بیان دیا تھا یا مولانا کو ایسا کوئی خط لکھا تھا۔

۱۹۴۱۔۴۲ء کے واقعات میں سبھاش چندر بوس کا خفیہ طور پر ملک سے فرار بہت اہم واقعہ تھا۔ جنوری ۱۹۴۱ء میں ایک روز وہ اپنے گھر سے اچانک غائب ہو گئے۔ گورنمنٹ نے انھیں تلاش کرنے کی ہر چند کوشش کی لیکن ناکام رہی ہے، انھوں نے یہ سفر بعض دوستوں کی مدد سے صوبہ سرحد اور افغانستان میں جرمن سفارت خانے کی مدد سے کیا تھا۔ وہ ۲۸ / مارچ میں بہ خیریت برلن پہنچ گئے اس سفر ---- جرمنی اور جنوب مشرقی ایشیا میں ان کی کارگزاریوں کی کسی حد تک تفصیلات ڈائری کے صفحات میں آگئی ہیں۔

اس دور کے بعض خاص واقعات پر ایک نظر ڈال لینی چاہیے۔

۱۹۴۲ء کے آغاز میں کرپس مشن آیا لیکن اس نے کانگریس اور حکومت کے درمیان مسائل کے تصفیے اور کسی مثبت نتیجے تک پہنچنے کے بجائے اختلاف کی خلیج کو اور وسیع اور پختہ کر دیا۔ کرپس کی آمد سے چند ہفتے پہلے چین کا جنرل چیانگ کائی شیک نے ہندوستان کا دورہ کیا تھا۔ اس دورے کی دعوت گورنر جنرل نے دی تھی اور ملاقاتیں مولانا آزاد، پنڈت نہرو، گاندھی جی اور دیگر جماعتوں کے رہنماؤں سے بھی کی تھیں اور پوری کوشش کی کہ حکومت اور اپوزیشن کی پارٹیوں کے درمیان مفاہمت کی کوئی راہ نکل آئے لیکن ان مصالحتی کوششوں کا کوئی نتیجہ نہیں نکلا ۔ لیگ اور حکومت کے تعلقات میں مزید استحکام اور پختگی پیدا ہوئی۔ کانگریس نے تحریک آزادی میں اپنی کوششوں کو اور تیز کر دیا۔ سول نافرمانی میں سرگرمی پیدا ہوئی گئی۔ حکومت کی پوری توجہ جنگ کے معاملات پر تھی۔ اس نے حریت پسند جماعتوں پر بین لگا دیا تھا اور سیاسی

سرگرمیوں کو معطل کردیا تھا۔ ملک میں بے چینیاں اپنی انتہا کو پہنچ چکی تھیں۔ اس زمانے میں لیگ کو خوب کھل کھیلنے اور کانگریس، جمعیت علماے ہند اور دوسری حریت پسند جماعتوں کے خلاف پروپیگنڈے سے فضا کو مسموم بنانے کا خوب موقع ملا، لیکن عالمی جنگ جوں جوں اپنے انجام کے قریب ہوئی گئی۔ حکومت کے دم خم ست پڑتے گئے۔

جنگ کے دوران سبھاش بابو کے ملک سے فرار، برما پر جاپان کے قبضے اور کلکتہ میں جاپان کے فوجی بوٹوں کی دھمک، ہندوستانی فوجوں کی گرفتاری، آزاد ہند گورنمنٹ کے قیام، آزاد ہند فوج کی تنظیم اور اس کی سرگرمیوں، جرمنی کی پیش قدمیوں اور ملک کے اندرونی اور بیرونی حالات نے برطانیہ کو سخت سراسیمہ کردیا تھا اور اگرچہ جرمنی اور اس کے حلیفوں کی شکست، جاپان کی پسپائی، آزاد ہند فوج کی ناکامی سبھاش بابو کی ہوائی حادثے میں شہادت وغیرہ حالات وواقعات نے اسے فتح کے نشے میں مست اور خوشیوں سے سرشار کردیا تھا لیکن کانگریس اور حریت پسند رہنماؤں کے خلاف حکومت کے پے در پے اقدامات اور اندرونِ ملک آزادی کے غصب نے اور ہیروشیما پر ایٹم بم گرائے جانے کے انسانیت سوز اور انتہائی وحشت ناک واقعے نے برطانوی حکومت کو بھی چاردانگ عالم میں رسوا کردیا تھا۔ یہ جنگ چوں کہ دنیا میں فاشزم کے خلاف اور امن کے قیام اور حق وانصاف کے نام پر لڑی گئی تھی اور اس کے نتیجے میں ہندوستان میں سیاسی اصلاحات، آزاد قومی حکومت کے قیام اور ملک کی آزادی کا وعدہ کیا گیا تھا۔ اگرچہ کانگریس، جمعیت علماء اور دیگر حریت پسند جماعتوں کو اس پر یقین نہ تھا لیکن جو باتیں دول متحدہ کے زعما ومدبرین، برطانوی رہنماؤں اور وایسراے کے بیانوں میں صاف وصریح طور پر آچکی تھیں، انھیں کیسے جھٹلایا جاسکتا تھا؟ ہندوستان کی جو فوجیں مختلف محاذوں پر لڑ چکی تھیں اور اب فتح یاب ہوکر وطن لوٹ رہی تھیں، ان کے ذہنوں میں یہ بات موجود تھی کہ آزاد وطن کے آزاد عوام ان کا پرجوش استقبال کریں گے۔ برطانوی مدبرین کے لیے ان اعلانوں اور وعدوں سے پھرنے کا کوئی بہانہ نہ تھا۔ کانگریس اور دیگر سیاسی جماعتوں کے سیکڑوں رہنما اور ہزاروں کارکن پچھلے ڈھائی تین سال سے جیلوں میں بند تھے۔

سیاسی سرگرمیوں پر پابندی تھی اور سیاسی جماعتوں اور ان کی ذیلی تنظیموں پر بین لگا ہوا تھا اور ان کے خلاف عوام میں نفرت کی آگ بھڑکانے کے لیے لیگ کو کھلی چھٹی ملی ہوئی تھی۔ لیکن عوام کے ذہنوں پر حریت پسند جماعتوں اور ان کے زعماء کا مکمل قبضہ تھا۔ حکومت ان رہنماؤں کو چھوڑنے اور ملک کے مستقبل کے لیے ان سے گفتگو کرنے پر مجبور تھی اور وہ حکومت جس نے تین برس سے زیادہ عرصے تک انھیں قید رکھا تھا، اب ان کی خوشامد کی حد تک تواضع کرنے اور وایسریگل لاج میں اپنا مہمان بنانے اور خدمت گذاری میں مصروف تھی۔ یہ بات مسلم لیگ کے زعماء پر بہت شاق گزر رہی تھی۔

اس دور کے اہم واقعات میں سول نافرمانی کے تیسرے دور کے بہت سے اہم واقعات، حضرت شیخ الاسلام کی گرفتاری (۱۹۴۲ء)، مرادآباد کا مقدمہ، اس میں حضرت شیخ کا تاریخی بیان، ہندوستان چھوڑ دو تحریک میں جمعیت علماے ہند اور دوسری انقلابی آزادی پسند جماعتوں اور قوم پرور رہنماؤں کا حصہ اور دیگر بہت سے واقعات کی تفصیلات آ گئی ہیں، جن کے لیے ڈائری کے اندراجات پر نظر ڈالنی چاہیے۔

۱۹۴۴ء کے آخر تک جنگ کے حالات نے ملک کے مستقبل کا ایک واضح نقشہ پیش کر دیا تھا۔ برطانیہ جنگ جیت چکا تھا لیکن آزادی کی تحریک جس مقام تک پہنچ چکی تھی اب اسے روکنا یا اس کا رخ بدلنا اس کے لیے ممکن نہ تھا۔ اب اس کے لیے ہندوستان پر اپنے اقتدار کو برقرار رکھنا ممکن نہ رہا تھا۔ البتہ اپنی اس خواہش سے دستبردار نہیں ہو سکتا تھا کہ کوئی ایسا تصفیہ طے پا جائے جس میں اس کے زیادہ سے زیادہ مفادات محفوظ رہیں۔ اس کے لیے وہ آخر وقت تک کوشاں رہا۔ جنگ ختم ہوتے ہی سیاسی قیدیوں کی رہائی، سیاسی جماعتوں سے پابندی ہٹانا، سیاسی سرگرمیوں کی بحالی اور حالات کو معمول پر لانے کی کوششیں اس کی اسی خواہش کا نتیجہ تھیں۔ شملہ کانفرنس کا انعقاد اور کیبنٹ مشن کی آمد اسی سلسلے کی کڑیاں تھیں اور کانفرنس کی گفتگو اور مشن کے منصوبے کی ناکامی کا یہی سبب تھا۔ ماؤنٹ بیٹن کے داؤں پیچ اسی لیے تھے۔ ڈائری میں حالات کے یہ تمام نشیب و فراز ایک خاص حد تک ضبط کر دیے گئے ہیں۔ لیگ

کا رول اس آخری دور میں افسوس ناک رہا۔ اس نے زبان سے ملک کی آزادی کا نام لیا، پاکستان کا نعرہ بلند کیا، فرقہ وارانہ اتحاد کی ضرورت سے کبھی انکار نہ کیا لیکن اس کے رویے سے آزادی، قومی اتحاد، حریت پرور جماعتوں سے تعاون حتی کہ مسلم مفاد کے تحفظ کے لیے بھی ہر ضروری عمل سے گریز کیا اور برطانوی حکومت کی بہترین حلیف اور دوست کا کردار ادا کیا۔ اس کا رویہ کانفرنس کے انعقاد اور کیبنٹ مشن سے ملک اور قوم کے حق میں کوئی فائدہ اٹھانے کے راستے کی رکاوٹ بن گیا۔

۱۹۴۵ء سے اس دور کا دوسرا باب اس وقت سے شروع ہوتا ہے جب جنگ کے خاتمے کے بعد شملہ کانفرنس کے انعقاد اور اس میں ملک کی آزادی اور مستقبل کی منصوبہ بندی کے مسئلے کو زیر غور لانے کا فیصلہ کیا گیا اور اس کے لیے لازم ٹھہرا کہ سیاسی قیدیوں کی رہائی اور نظربندوں پر سے پابندی اٹھالی جائے۔ شملہ کانفرنس ہوئی لیکن لیگ کے رویے کی بنا پر ناکام ہوگئی۔ کانفرنس کی ناکامی کے نتیجے سے وابستہ عارضی حکومت کے منصوبے پر عمل درآمد شروع ہوا اس دوران مسلم لیگ کے فرقہ وارانہ رویے اور الیکشن کے دوران اس کی اشتعال انگیزی نے ملک کے اتحاد کو پارہ پارہ کر دیا بلکہ مسلمانوں کی اجتماعی زندگی کو بھی تہ و بالا کر دیا الیکشن میں جہاں تک مسلمانوں کی حریت پسند جماعتوں اور مسلم لیگی نمائندوں میں ووٹوں کے تناسب کا تعلق تھا حریت پسندوں کو مسلم لیگ کی اشتعال انگیزیوں، ہنگاموں، الزاموں، اتہاموں تشدد اور حکومت اور اس کے اعلیٰ و ادنیٰ حکام کی پاسداریوں کے باوجود غیر معمولی اور توقع سے بہت زیادہ ووٹ ملے لیکن مجموعی طور پر کامیابی لیگ ہی کو حاصل ہوئی۔ انتخاب جماعتی بنیادوں پر ہوئے تھے لیکن مسلم لیگ کانگریس کو یہ اختیار دینے کو تیار نہ تھی کہ وہ اپنے کوٹے سے کسی مسلمان نمائندے کو نامزد کرے۔ اور پھر جب عارضی حکومت میں شریک ہوئی تو کانگریس کے وزرا سے عدم تعاون کے رویے نے حکومت کے کاروبار کو چلانا ناممکن بنا دیا اور ہندوؤں کے خلاف اشتعال انگیزیوں نے نہ صرف فضا کو مسموم بنا دیا تھا بلکہ راست اقدام کے نتیجے میں فسادات سے، سرزمین ملک خون سے رنگین ہوگئی تھی۔

فسادات کا یہ سلسلہ اگست ۱۹۴۶ء میں جناح صاحب کے راست اقدام سے شروع ہوا تھا کلکتہ، نواکھالی سے بہار کے دور دراز علاقوں تک پھیلا اور ۱۹۴۷ء کے آغاز تک حالات قابو میں نہ آئے تھے۔

چوتھی جلد کا آغاز ۱۹۴۷ء سے ہوتا ہے۔

مفادات کا سلسلہ جو اگست ۱۹۴۶ء سے شروع ہوا تھا اگست ۱۹۴۷ء اور اس کے بعد پنجاب و سرحد میں فسادات سے مل جاتا ہے۔ اس کے نتیجے میں ملک کی تقسیم کے لیے نہ صرف زمین ہموار ہوئی بلکہ پورے ملک کی زندگی تہ و بالا ہوئی اور لاکھوں انسان موت کے گھاٹ اتر گئے، عورتیں اغوا، بچے یتیم اور بوڑھے بے سہارا ہو گئے۔ اس دور کے واقعات کی تفصیلات اور پوری پوری تصویریں ڈائری کے اس حصے میں مرتب ہو گئی ہیں۔

۱۹۴۷ء کے آغاز سے سیاست ملکی کا ایک دور اس وقت شروع ہوا جب لارڈ ویول کو برطانوی حکومت نے واپس بلا لیا اور ماؤنٹ بیٹن کو ایک نئے منصوبے کو جو اس کے قومی اور برطانوی مفادات کا سب سے زیادہ ضامن تھا بروے کار لانے کے لیے بہت اختیار دے کر اور نیا گورنر جنرل بنا کر ہندوستان بھیجا۔ لندن سے وہ تقسیم ملک کا منصوبہ لے کر آیا تھا۔ لیکن اول روز سے منصوبے کو ظاہر کر کے اس نے قدم نہیں اٹھایا اس نے اپنی ذہانت سے تقسیم کے لیے دلائل ملکی حالات اور رہنماؤں کے رویے سے حاصل کیے۔ مسلم لیگ کو اس نے تقسیم کے مطالبے پر پختہ کیا، کانگریس کے چند بڑے رہنماؤں کو بڑی چالاکی سے تقسیم پر ایک ایک کر کے راضی کر لیا اور جو اس کے فلسفے سے متاثر نہیں ہوئے تھے، انھیں بے بس کر دیا، بالآخر انھیں بھی حالات کے سامنے سپر انداز ہونا پڑا۔ اس نے عزم ظاہر کیا تھا کہ خون کا ایک قطرہ نہیں بہنے دیا جائے گا لیکن دیکھا یہ گیا کہ ندیاں بہہ گئیں اور واقعات نے ثابت کیا کہ فسادات کے پس پردہ برٹش استعمال ہی کا منصوبہ کام کر رہا تھا اور برٹش انتظامیہ نے فساد کی آگ بھڑکانے کے لیے ایندھن فراہم کیا تھا۔

اس دور کے واقعات اور مسائل میں فسادات اور ان کی روک تھام کی کوششیں

انتظامیہ کے اور آزاد ملک کی تعمیر و ترقی کے تمام کاموں پر چھائے رہے تھے۔ دونوں ملکوں سے اقلیتوں اور مصیبت زدگان کی نقل مکانی اور ان سے پیدا شدہ مسائل آباد کاری ان کے لیے وسائل معیشت کی فراہمی، بے روزگاری، معاشرتی انتشار، بے اعتمادی، دونوں جانب مشتعل گروہوں اور فسادات کے متاثرین نے فسادات اور لوٹ مار کے خطرات میں بہت اضافہ کر دیا تھا۔ انتظامیہ فریق بن گئی تھی اور جہاں ایسا نہیں تھا وہاں مفلوج ہو کر رہ گئی تھی۔

جمعیت علمائے ہند، اس کے رہنماؤں، دیگر حریت نواز اور قوم پرور جماعتوں کی ذمہ داریوں اور مصروفیتوں میں بہت اضافہ ہو گیا تھا۔ ملک نے آزادی کی منزل پالی تھی لیکن حضرت شیخ الاسلام کو چین اور اطمینان و سکون حاصل نہ ہوا اس زمانے میں حضرت کے شب و روز فسادات کے دفعیہ، امن کے قیام، حالات کے سدھار، مسلمانوں کو ملک چھوڑنے سے روکنے، ان کی ہمتوں کے بندھانے قومی اور وطنی ذمہ داریوں کو محسوس کرانے، عزائم کو بلند رکھنے، فسادات میں اقدام نہ کرنے لیکن ظالموں اور فسادیوں کا ڈٹ کر مقابلہ کرنے اور قدم پیچھے نہ ہٹانے کی تلقین میں گزرے۔ جمعیت کے دوسرے رہنماؤں کی مصروفیات بھی اس زمانے میں اس کے سوا کچھ اور نہ تھیں۔ ان حضرات کے کارناموں سے تاریخ کے صفحات بھرے ہوئے ہیں۔ ڈاعری کے اندراجات میں بھی ان بزرگوں کی قومی اور وطنی خدمات کے تذکرے آئے ہیں۔

اسی حصے کو دراز کر کے دسمبر ۱۹۵۷ء میں حضرت شیخ الاسلام کے سانحۂ وفات اور اس پر ملک اور بیرون ملک کے اظہار غم و ماتم اور عظمت شیخ کے اعتراف و تذکرے پر چوتھی جلد کو ختم کیا ہے۔ یہ اس سلسلے کی آخری جلد ہے۔

ڈاعری کی جس تقسیم کی طرف اشارہ کیا ہے۔ واقعات و حوادث کی ترتیب اور سیاسی ادوار کی اہمیت اور خصوصیت کے مطابق ہے۔ لیکن واقعات مسلسل ہیں اس لیے ممکن ہے صفحات کے لحاظ سے جلدوں کو متوازن رکھنے کے لیے بعض جلدوں میں سنین و شہور کے کچھ واقعات کم و بیش ہو جائیں۔ اس سے وقوعات کی تاریخی ترتیب اور ادوار کی خصوصیات پر کوئی

اثر نہیں پڑے گا۔ لیکن یہ فیصلہ ناشر کی صواب دید پر منحصر ہے۔

مسلم لیگ کے قیام کے پس منظر، اس کے لیے ابتدائی مساعی، اس کے واقعی و حقیقی مقصد، اس کی سیاسی خدمات، اس کے رہنماؤں کے سیاسی، اخلاقی حالات، ان کے تاریخی و سیاسی کردار، ملکی سیاست اور زندگی پر اس کے اثرات، مصائب و مسائل کی تولید، ظہور میں ان کے حصے اور پچاسوں کہی اور ان کہی داستانوں کا ایک مجموعہ اور بھی ہے۔ اس کا مواد چوں کے حضرت شیخ الاسلام کی سیاسی ڈائری کی زیر تبصرہ جلدوں سے الگ کرلیا گیا اس لیے اس مجموعے کو بھی ڈائری کے سلسلے ہی کی جلد سمجھنا چاہیے۔ یہ جلد اپنی عبرت خیزیوں اور سبق آموزیوں میں اور اس لحاظ سے ایک انقلاب آفریں ہوگی کہ اس کے مطالعے سے بعض لیگی قایدین کے مذہبی عقاید و افکار، ان کی اخلاقی زندگی، سیاسی جدو جہد کے مقصد، ان کے اخلاص عمل، اسلام سے ان کے تعلق و وفاداری کے بارے میں شاید نقطۂ نظر ہی بدل جائے اور ان کی پوری شخصیت اور ان کے مقام کے بارے میں کوئی نیا فیصلہ کرنے پر مجبور ہونا پڑے۔ اس کی تصنیفی حیثیت بالکل نہیں تاریخ کے مسلسل واقعات ہیں۔ اخبارات و رسایل اور تصنیفات و تالیفات سے ماخوذ ہیں اور اکثر اخبار بین اور شایقین مطالعہ کی نظروں سے گزرے ہوں گے لیکن جوش و جذبات کے ایک خاص دور میں ان پر بہت کم توجہ کی گئی اور اکثر ان پر غور اور یقین نہیں کیا گیا۔ لیکن یہ تاریخ کے معلوم واقعات اور ان کی فکر و سیرت کی سچائیاں تھیں۔ جنھیں حوالوں کی صراحت کے ساتھ مرتب کردیا گیا ہے۔ لیکن اس جلد کی اشاعت اور طریقِ کار کے بارے میں ابھی کوئی فیصلہ نہیں کیا گیا ہے۔

❁

بنیادی طور پر حضرت شیخ الاسلام مولانا حسین احمد مدنی ایک مذہبی اور دینی شخصیت تھے۔ ان کی پوری زندگی کے شب و روز عبادت و ریاضت، درس و تدریس، وعظ و تبلیغ، دعوت و ارشاد، اصلاح عوائد و رسوم اور امتِ مسلمہ کی بہبود اور تعمیر کے کاموں میں گزرے تھے۔ لیکن ان

کے سامنے اللہ کی تمام مخلوق ایک کنبے کے مثل تھی اور تمام بنی آدم بھائی بھائی! حضرت کا قلب مومن صرف مسلمانوں کی بے راہ روی اور فسق و فجور پر دکھی تھا بلکہ تمام مخلوق کے عقاید کی گمراہی، کفر والحاد، بے دینی اور برائی کے ہر عمل پر تڑپتا تھا۔ وہ کسی فرد بشر کے لیے بھی نہ چاہتے تھے کہ بے اعتقادی اور بد اعمالی میں مبتلا ہو کر دنیا اور آخرت میں ان کے نتائج کا سزاوار ہو۔ ان کے اس دینی تصور نے ان کے سامنے فکر و عمل کے متعدد میدان پیدا کر دیے تھے۔

سب سے پہلے وہ امت مسلمہ کے ایک نامور فرد تھے اس لیے اس کی اصلاح و تعمیر و ترقی کی براہ راست سب سے زیادہ ذمے داری ان پر تھی۔ ذمہ داریوں کے شدید احساس نے ان کے سامنے درس و تدریس، وعظ و تبلیغ، ہدایت و ارشاد، تصنیف و تالیف کے میدان کھولے۔ چناں چہ علوم شریعت و طریقت کے میدانوں میں حضرت کا بلند مقام اور کارنامے کسی تعارف کے محتاج نہیں۔ حضرت بیسوی صدی کے نامور اور بلند پایہ محدث تھے۔ فقہ، تفسیر، اصول میں ان کا مقام بہت بلند تھا۔ اور اس عہد کے مرشدان برحق میں حضرت کا فیضان عام اور رنگ سب سے چوکھا ہے۔ حضرت کا فیضان نہ صرف براعظم ہند پاکستان میں بلکہ جنوب مشرقی ایشیا کے ممالک سے لے کر شمال مغربی ایشیا سے جنوبی افریقہ کے ممالک تک پھیلا ہوا ہے۔ اگر چہ حضرت شیخ الاسلام بہ واسطہ شیخ الہند و قاسم العلوم تحریک ولی اللہی کے ایک نامور رہنما تھے لیکن تصوف و طریقت میں وہ خود اپنی ایک حیثیت، اپنا ایک نظام اور اپنی خصوصیات رکھتے تھے۔ ان کے دور میں بڑے بڑے مرشد اور شیخ طریقت گزرے، انھوں نے بڑے کارنامے انجام دیے، ان کی خدمات عظیم الشان تھیں۔ ان کا فیضان ملک کے طول و عرض میں پھیلا ہوا تھا لیکن سب کے جھنڈے گر گئے اور خانقاہیں سونی پڑ گئیں، ان کے اخلاف میں کوئی ایسا نہ ہوا کہ ان کی رونق بحال رکھتا اور ان کی وراثت حقہ کا وارث کہلاتا۔ لیکن شریعت و طریقے کے اس خانوادۂ حسینی میں اتنے اہل اللہ پیدا ہوئے کہ انھوں نے نہ صرف اپنے بزرگ کے روشن کیے ہوئے چراغ کو روشن رکھا بلکہ اس سے ہزاروں نئے چراغ روشن کیے اور اس کے نام اور فیضان کو دنیا کے دور دراز ملکوں تک عام کیا اور جھنڈے گاڑ دیے۔

۱۹۴۷ء کے بعد جب کہ سیاسی اسفار، جلسوں کی شرکت اور دیگر سیاسی مصروفیات میں بہت کمی ہوگئی تھی۔ دعوت وارشاد اور اصلاح امت کے کاموں کا ذوق بہت بڑھ گیا تھا۔

اس مقام پر یہ واضح کر دینا ضروری ہے کہ یہ ڈایری سیاسی ڈایری ہے اور شریعت و طریقت کے مباحث و خدمات اس کے دایرۂ تالیف سے باہر ہیں۔ ڈایری کے مطالعے سے حضرت کی سیرت اور خدمات کے یہ پہلو نمایاں نہ ہو سکیں گے۔

امت مسلمہ کے نامور فرد ہونے کی حیثیت سے حضرت پر جو ذمہ داریاں عاید ہوتی تھیں حضرت نے انھیں بحسن وخوبی انجام دیا اور عیال اللہ کے نامور فرزند ہونے کی حیثیت سے تمام خلق اور انسانیت کی ہدایت و رہنمائی کی جو ذمہ داریاں آپ نے قبول کی تھیں ان کا احساس آپ کو سیاست کے میدان میں لایا۔ غلام آباد ہند میں آپ پیدا ہوئے تھے۔ اس لیے وہی آپ کی دعوت، خدمتِ انسانیت اور تحریک آزادی کا پہلا میدان بنا۔ ۱۹۱۶ء میں حضرت شیخ الہند نے انھیں اپنی تحریک میں جو ملک کی آزادی اور انسانیت کی خدمت کی تحریک تھی، شامل کیا تھا۔ اس کے بعد سے دسمبر ۱۹۵۷ء تک آزادی اور خدمت انسانیت کی کوئی تحریک جو ہندوستان اور جنوب مشرقی ایشیا سے شمال مغربی ایشیا اور مشرقی افریقہ تک کہیں چلی ہو، ایسی نہ تھی جس سے کسی نہ کسی حد تک اور بالواسطہ یا بلاواسطہ حضرت کا تعلق نہ رہا ہو، خصوصاً ہندوستان میں آزادی کی ہر قومی تحریک میں آپ پیش پیش رہے اور کوئی تحریک ایسی نہ تھی جس میں آپ کا کردار رہنمایانہ وقایدانہ نہ رہا ہو۔

خصوصاً ۱۹۴۰ء میں جمعیت علماء کے صدر بننے کے بعد۔ زندگی کے آخری دور میں تو آپ کا مقام بہت بلند اور آزادی کی تحریک میں بہت نمایاں ہوگیا تھا۔ اس ڈایری کے ہر صفحے پر آپ کی روشن سیرت اور زریں کارناموں کی جھلک نظر آئے گی۔

حضرت نے جس زمانے میں سیاست میں قدم رکھا تھا۔ اس وقت سیاسی سرگرمیوں کا دایرہ بہت محدود تھا۔ لیکن بعد میں جوں جوں سیاست کا دایرہ وسیع ہوا، حضرت کی سرگرمیوں میں بھی اضافہ ہوتا گیا اور اسی لحاظ سے سیاسی جماعتیں وجود میں آتی گئیں، سیاسی

رہنما پیدا ہوتے گئے۔ سیاسی مسائل وتحریکات میں اضافہ ہوا۔ حکومت سے مقابلے کے نئے نئے میدان سامنے آئے دارورسن کی آزمائشیں بھی بڑھتی گئیں۔ آزادی کی تحریکوں اور حریت پسند جماعتوں میں جیسے جیسے اضافہ ہوا ان کے توڑ اور ان کے مقابلے کے لیے برٹش استعمار کی بہی خواہ جماعتیں پیدا ہوتی گئیں اور مخالفت وموافقت کے نئے محاذ کھلتے گئے۔ دونوں طرف کے رہنماؤں میں اتحاد اور ٹکراؤ کے واقعات بھی کثرت سے رونما ہوتے گئے۔ اس دور میں حضرت کی سیرت اور کمالات کے نئے نئے پہلو نمایاں ہوئے اور خدمات کے میدان پھیلتے چلے گئے۔

۱۹۳۹ء میں ملک میں صوبائی کانگریسی حکومتوں کے استعفے کے بعد ملک میں سیاسی ہنگامہ آرائی بہت تیزی کے ساتھ اپنے عروج کی طرف بڑھی اور حضرت کی عزیمت اور تدبر کے پہلو نمایاں ہوتے گئے۔

حضرت مفتی اعظم مولانا محمد کفایت اللہ شاہجہان پوری ثم دہلوی ۱۹۱۹ء سے جمعیت کے صدر چلے آرہے تھے، اس کی علمی فکری، سیاسی بنیادیں بہت مضبوط ہو چکی تھیں۔ ملکی سیاست میں اس کے مثبت اور انقلاب آفریں کردار نے عزت واحترام کا ایک مقام پیدا کرلیا تھا، نیک نامی اور شہرت حاصل کرلی تھی لیکن اب جس دور کا سامنا تھا اس میں جمعیت کی باگ ڈور ایک ایسے ہاتھ میں ہونا ضروری تھا جو صاحب نظر ہونے کے ساتھ مجاہدانہ شان کا مالک ہو اور طوفانوں سے ٹکرانے کی ہمت بھی رکھتا ہو۔ حضرت مفتی اعظم کی کمزور صحت کا تقاضا بھی تھا کہ صدارت کے بار سے انھیں سبک دوش کیا جائے۔ مسلم لیگ کی قرارداد لاہور نے جو قرارداد پاکستان کے نام سے مشہور ہوئی، سیاسی فضا میں گرمی پیدا کردی تھی۔ اس کے بعد جو دن آیا اس کی گرمی اور تیزی وتندی میں اضافہ ہی ہوتا رہا۔

اس دور میں جمعیت کی صدارت کے لیے حضرت شیخ الاسلام کا انتخاب عمل میں آیا۔ صدارت کی ذمہ داری سنبھالنے کے بعد حضرت شیخ الاسلام کے مدبرانہ اور مجاہدانہ جوہروں اور بے پناہ قوت عمل نے ایک دنیا کو ورطۂ حیرت میں ڈال دیا۔ یہ صدارت کی ذمہ داری سنبھالنے

کا وقتی جوش نہ تھا۔ بلکہ ۴۲ تا ۴۴ء کی قید و بند کے عرصے کو چھوڑ کر ۴۷ء میں آزادی کی منزل پالینے اور اس کے بعد فسادات کے دور تک اسی مجاہدانہ شان کے ساتھ شب و روز گزرتے رہے۔ اس دور میں درس و تدریس، صدارت، دارالعلوم کے مفادات کی نگرانی اور طلبہ کی رہنمائی کی عام اور معمول کی ذمہ داریوں کے ساتھ دعوت وارشاد کے کام بہت پھیل گئے تھے۔ سیاسی اسفار، جلسوں کی شرکت اور صدارت کے ہنگاموں میں بہت اضافہ ہوگیا تھا۔ ایک طرف حضرت کے عقیدت مندوں، مریدوں اور سیاسی خدمت گذاروں کا بے پناہ ہجوم تھا جو سفر وحضر میں ان کے گرد جمع رہتا تھا: دوسری طرف مخالفین اور نکتہ چینوں کا ایک سیلاب اُمڈ آیا تھا۔ جو نہ صرف اپنے جلسوں، جلوسوں اور اخبارات، رسایل اور کتابچوں کے صفحات میں اعتراضات اور الزامات کے طومار باندھتے رہتے تھے، بلکہ حضرت کے جلسوں کو بھی درہم برہم کرنے کی کوششیں کرتے تھے۔ اس کے مسموم اثرات سے عقیدت کیش اور سیاسی کارکن بھی محفوظ نہ رہتے تھے اور وہ عام ملاقاتوں میں اور مراسلت کے ذریعے استفسارات میں رفعِ شکوک کے لیے حضرت کی زحمت کا باعث اور تضیع اوقات کا سبب بنتے تھے بلکہ مخالفین، جمعیت کے جلسوں، جلوسوں اور حضرت کے اسفار کے دوران حضرت کی جان لینے تک کے درپے ہو جاتے تھے۔ ان حالات سے اگر چہ تمام حریت پسند اور قوم پر رہنما دو چار تھے لیکن حضرت شیخ الاسلام ان کا خاص نشانہ تھے۔ پھر حضرت کی شانِ عزیمت نہ خود احتیاط کو گوارا کرتی تھی اور نہ اپنے مریدین و معتقدین کو کچھ کرنے دیتی تھی۔ اس زمانے میں حضرت کو چومکھی لڑنی پڑی۔

حضرت کی ذات گرامی دین اور اس کے علوم عالیہ کے محقق اور مطالعہ و نظر میں مجتہدانہ شان کی حامل تھی۔ شریعت وطریقت کے رمزشناس تھے۔ تصوف میں وقت کے بلند پایہ شیوخ سے بیشتر اونچا مقام رکھتے تھے۔ تاریخ اسلام، تاریخ ہند اور تاریخ انقلابات عالم پر بہت گہری نظر رکھتے تھے۔ استعمار کے استحصال، معاشی لوٹ کھسوٹ، اور تعلیم سے حکومت کے بے پروائی کے نقطۂ نظر سے ملک کی اخلاقی اور معاشی تباہی حضرت کے خاص موضوعات تھے۔ سیاست دانوں اور اس عصر کے مدبروں کی صف اول میں وہ اپنی امتیازی شان رکھتے تھے۔

ملک کے حریت پسندوں اور قوم پرستوں کے سرخیل تھے۔ حضرت کا میدان عمل پورے ملک اور اس کے دور دراز گوشوں تک پھیلا ہوا تھا اور حضرت کے ذوقِ عمل نے پورے ملک اور دور دراز کے گوشوں کے سفر کو بھی گھر آنگن کی بات بنادی تھی۔

وقت کے علمائے حق و صداقت اور امت مسلمہ کے رہنماؤں میں وہ ایک نامور شخصیت تھے لیکن وہ اللہ کی تمام مخلوق سے اللہ کے لیے پیار کرنے والے بزرگ اور انسانیت کے رہنما تھے۔ وہ اسلام کے دایرے میں امت مسلمہ کے تمام مکاتب فکر و مذاہب فقہ کے اتحاد کے داعی تھے لیکن انسانیت کے بارے میں وہ وقت کے جابروں اور استحصال پسندوں کے خلاف دنیا کے تمام مظلوموں کو متحد اور ایک دوسرے کا معاون بنا دینا چاہتے تھے۔ ملت بیضہ کے ایک فرد کی حیثیت سے مصر، شام، ترکی، حجاز، افغانستان، ہندوستان، الجزائر، کے مسلمانوں ہی پر ستم کی تلوار کے زخم کو اپنے جسم پر محسوس نہ کرتے تھے بلکہ دنیا کی ہر غیر مسلم قوم پر چلنے والے استحصال کے خنجر کی ضرب سے تڑپ اٹھتے تھے۔

حضرت کی اسلامی، انسانی اور قومی سیرت کے بہترین نقوش سے اس ڈایری کے صفحات بھرے ہوئے ہیں۔

حضرت کے کمالات اور افکار و سیرت کا ایک اہم پہلو یہ ہے کہ سیاست کے ہنگاموں میں حضرت کی شان کا مذہبی عالم اور دینی حیثیت کا بزرگ اور کون تھا؟ حضرت کی عام اور روزمرہ زندگی کا بھی کوئی عمل خلاف سنت واقع نہ ہوتا تھا۔ حضرت تو نہ صرف فرائض مستحبات تک میں اتباع سنت اور طریق صالحین کا خیال رکھتے تھے۔ قال اللہ و قال الرسول ﷺ صرف آپ کی زندگی میں درس و تدریس کے مشاغل تک محدود نہ تھا، اقوال سے افعال تک پوری زندگی پر چھایا ہوا تھا۔ سیاسی زندگی کی پوری جد و جہد میں تمام کوششوں اور تمام اقدامات کے محرکات اور فیصلوں کی بنیادیں احکام الٰہی اور سنت و سیرت نبوی علی صاحبہا الصلوٰۃ والسلام پر

استوار تھیں۔ لیکن ٹھیک اسی طرح حضرت کی دعوت کی بنیاد عقل وبصیرت اور تاریخی دلایل پر مبنی اور نظایر وشواہد کے مطابق بھی تھی۔ حضرت نے جہاں اسلامی شریعت کا حوالہ دیا وہاں تاریخ و سیاست کی معلوم سچائیوں کے نام پر بھی اپیل کی۔ حضرت نے یہ ضرور بتایا کہ وقت کے احکام و مسائل میں شریعت اسلامیہ کا حکم کیا ہے؟ لیکن ساتھ ہی اس پہلو کو بھی نمایاں کیا کہ عقل و بصیرت کا فیصلہ اور ملی وقومی اور انسانیت کے مفادات کا تقاضا بھی یہی ہے۔ حضرت نے مذہب کے نام پر اپیل کے ساتھ عقل وبصیرت کی روشنی میں فیصلے کے لیے راہ بند نہیں کی۔ جمعیت علماے ہند ملک میں مسلمانوں کے لیے مذہبی اور سیاسی رہنمائی کا سب سے بڑا ادارہ تھا۔ لیکن جیسا کہ لیگ کے رہنماؤں نے کہا تھا کہ مسلم ہے تو مسلم لیگ میں آ! حضرت نے یہ کبھی نہیں کہا کہ اگر تم مسلمان ہو اور مسلمان رہنا چاہتے ہو تو جمعیت علماے ہند میں داخل ہو جاؤ۔ حضرت نے ہمیشہ یہ کہا کہ مسلمانوں کے بہترین شرعی اور قومی وملی اور انسانی فرایض کی ادائیگی کے لیے جمعیت علماے ہند کا ساتھ دیا جائے۔ حضرت نے حق کو جمعیت کے دایرے میں منحصر نہیں کر دیا۔ جمعیت سے باہر رہ کر بھی حق کی خدمت کی جاسکتی ہے۔ ہر قومی وملی تحریک کے آغاز میں اور سیاسی زندگی کے ہر موڑ پر دوسرے قومی اور ملی رہنماؤں اور جماعتوں کو دعوت دی کہ باہم صلاح ومشورہ، بحث ونظر اور غور وفکر کے بعد لائحہ عمل تیار کیا جائے اور ایک دوسرے کے تعاون سے سیاسی اعمال انجام دے جائیں۔ جمعیت علماے ہند کے بزرگ پورے ہوش کے ساتھ تاریخی وسیاسی بصیرت اور عقلی دلائل کے ساتھ ملک وقوم کی رہنمائی اور خدمت کے لیے سیاسی میدان میں اترے تھے۔ وہ تمام باعمل عالم دین تھے لیکن انھوں نے کبھی عوام وخواص کے مذہبی جذبات کا استحصال نہیں کیا۔ اگر وہ مذہبی جذبات کو اکسپلائٹ کرتے تو ان سے زیادہ کون کامیاب ہوسکتا تھا۔ سیاسی مسائل میں مذہبی جذبات کے مجرد استعمال کے بجاے انھوں نے عوام وخواص کی عقل وبصیرت کو مخاطب کیا اور اس کے لیے تاریخی شواہد اور سیاسی نظایر سے استدلال کیا اگر کسی شخص کا قلب مفتی کے شرعی فتوے کے بجاے تفکر وتدبر اور بحث ونظر کے بعد عقل کی روشنی میں فیصلہ کر کے مطمئن ہوتا ہے تو ان بزرگوں نے اس کے لیے یہی نسخہ تجویز کیا۔

حضرت شیخ الاسلام کا طرز عمل بزرگوں کی اسی سیرت اور طرز فکر کے مطابق تھا۔ اس ڈائری میں جہاں حضرت کے سیاسی افکار اور مباحث آئے ہیں، ان میں حضرت کا یہ طرزِ فکر و عمل صاف نمایاں ہے۔

ڈائری میں صرف حضرت شیخ الاسلام کی زندگی، حضرت کی سیرت، حضرت کے افکار اور آثار ونقوش ہی کو موضوع نہیں بنایا ہے۔ اگر یہی مقصود ہوتا تو نہایت مناسب تھا کہ حضرت کی شخصیت اور سیرت وافکار میں ایک کتاب تصنیف کر دی جاتی، مقصد پورا ہو جاتا لیکن اس سے ہندوستان اور ایشیا و یورپ کے سیاسی حالات، ملکی وغیر ملکی تحریکات، عالمی سیاست کے نشیب وفراز، آزادیٔ وطن میں دیگر جماعتوں، ابنائے وطن اور مختلف الخیال سیاسی رہنماؤں کی جدوجہد، ان کے اندازِ سیاست، حکومت، مختلف پارٹیوں، افراد اور جماعتوں کے مابین اختلافات وتعاون، مخالفانہ ودوستانہ رویوں، جوڑتوڑ، کشمکش، رہنماؤں کی سیرتوں کی جھلک اور ایک ہی مسئلے اور ایک ہی تحریک میں مختلف رہنماؤں کے متضاد ومتعاون رویوں، کسی مسئلے کے حل میں یا کسی تحریک پر اس کے اثرات اور آخری تاریخی نتائج کی ذمہ داریوں کا کوئی اندازہ نہیں لگایا جاسکتا تھا۔ ڈائری اپنے موضوع کے دایرے میں ہمہ قسم کے حالات وواقعات کا خواہ مرتب ومؤلف کو ان سے اختلاف ہی کیوں نہ ہو، خواہ وہ اس کے نزدیک کتنے ہی ناپسندیدہ ہوں بہ شرطے کہ ان کی تاریخی اہمیت وحیثیت مسلم ہو اور سیاسی فضا پر ان کے مثبت یا منفی اثرات مرتب ہوئے ہوں۔ انھی حالات واقعات کے آئینے میں ڈائری کی موضوع شخصیت کی عظمت کا اندازہ لگایا جاسکتا ہے۔

کسی شخصیت کی کامیابی کا یہ پیمانہ نہیں ہوتا کہ وہ اپنے تمام مخالفین پر غالب آگئی ہو، وہ اپنے نظریے میں کامیاب ہوگئی ہو اور اس نے یکسر ایک انقلاب پیدا کر دیا ہو! کسی شخص کی بڑائی ہمیں اس کے فکر ورائے کی صحت میں، عمل وسعی کی راہ میں اخلاص وایثار میں، اس کی سیرت کی عزیمت واستقامت میں اور حق کی راہ میں کچھ پالینے کے بجائے سب کچھ لٹا دینے کے ذوق میں تلاش کرنی چاہیے۔ اس لیے کہ جدوجہد کی راہ بعض اوقات اتنی طویل ہوتی ہے

کہ افراد ہی کی نہیں کئی نسلوں کی زندگی بھی کم پڑتی ہے اور کسی تحریک کے مثلاً یہی تحریک آزادی، اولین رہنماؤں کو کامیابی دیکھنا نصیب نہیں ہوتا۔ کامیابی کی منزل سے وہ لطف اندوز ہوتے ہیں جن کا حصہ تحریک کی بنیادیں استوار کرنے میں نہیں تحریک کی توسیع، اجرا اور اسے آگے بڑھانے میں ہوتا ہے۔ حال آں کہ درحقیقت یہ کامیابی سب سے زیادہ اپنے اولین رہنماؤں اور تحریک کے بانیوں کی رہینِ منت ہوتی ہے۔

❁

حضرت شیخ الاسلام کئی لحاظ سے تحریک آزادی وطن کی تاریخ میں اہمیت رکھتے ہیں:

۱۔ وہ انقلابی سیاست کے دورِ آخر میں سیاست میں داخل ہوئے انھیں اس دور میں سیاست میں حصہ لینے کا موقع نہ ملا لیکن حضرت شیخ الہند کے ساتھ اپنی گرفتاری پیش کر کے حضرت نے نہ صرف وفاداری بلکہ آزمائش میں صبر و استقامت کا ثبوت دے کر اپنا صاحب عزیمت ہونا ضرور ثابت کر دیا تھا۔ مجرد یہ بات ان کی عظمت پر دلالت کرتی ہے۔ البتہ ۱۹۱۹ء کے بعد کے آئینی سیاست کے دور کے اولین رہناؤں میں وہ ایک نمایاں مقام رکھتے تھے۔

۲۔ وہ اپنے ذوق و فکر اور سعی و عمل ہر دو اعتبار سے ایک مکمل سیاست داں تھے۔

۳۔ آزادی کی راہ میں وہ ہر آزمائش سے کامیاب گزرے۔

۴۔ سیاسی زندگی کے آغاز میں انھوں نے سیاسی مسلک اور نصب العین کے بارے میں جو فیصلہ کیا تھا۔ وہ پوری استقامت کے ساتھ اس پر قائم رہے اور کبھی یمین و یسار کے تذبذب میں مبتلا نہ ہوئے۔

۵۔ برطانوی پنجۂ استبداد سے ملک کی آزادی، تعمیر و ترقی، مسلمانوں اور دیگر وطنی اقوام کی فلاح و بہبود، عالم اسلام کی استعمار کے پنجے سے رہائی، ان کی آبرو مندانہ زندگی کے حصول اور جنوب مشرقی ایشیا سے لے کر شمال مغربی ایشیا اور شمالی و جنوبی اور افریقہ کے ممالک تک کل اقوام و انسانیت کی آزادی کے لیے ملکی اقوام کے اتحاد اور مشترکہ سیاسی جدوجہد کے

لزوم وضرورت کو انھوں نے سیاسی زندگی کے آغاز ہی میں محسوس کرلیا تھا۔ اس کی اہمیت کے بارے میں انھیں کبھی شبہ پیدا نہ ہوا۔ اور انھوں نے کبھی اپنی زبان سے کوئی ایسی بات نہ نکالی اور نہ ایسا کوئی قدم اٹھایا جس سے قومی اتحاد اور انسانیت کے اعلیٰ مفادات کو ٹھیس لگے یا نقصان پہنچے۔

ہندوستان میں مسلمانوں کے اقتدار کے متعلق حالات کے مطالعے کے بعد وہ اس نتیجے پر پہنچے تھے کہ ملک سیاسی زندگی کے اس مقام پر پہنچ چکا ہے اور ۱۸۵۷ء کی تحریک آزادی اور قومی حکومت کے احیاء کی جدوجہد میں ناکامی کے بعد برٹش استعمار کی پالیسی نے مسلمانوں کو اس مقام پر لا کھڑا کیا ہے کہ ان کے سیاسی اقتدار کی بحالی کا کوئی امکان باقی نہیں رہا۔ اس لیے مستقبل میں پنجۂ استبداد سے رہائی کے بعد زندگی کا وہ نقشہ نہیں ہوسکتا جو ماضی میں رہ چکا تھا۔ آیندہ جو حکومت بھی قائم ہوگی اس کی بنیاد جمہوری ہوگی، اجتماعی رفاہ اور فلاح و بہبود مقصد قرار پائے گا، عقیدہ و مذہب میں ہر شخص آزاد ہوگا، مذہبی رسوم و اعمال کی بجا آوری میں حکومت عدم مداخلت کے اصول پر عمل پیرا ہوگی اور مذہبی تعلیم کے انتظام، جماعت سازی، اندرونی اصلاح، تہذیبی اور معاشرتی زندگی کے معاملات میں مسلمانوں اور دیگر اقوام کو اپنے اپنے دوایر میں مکمل آزادی ہوگی۔

یہ بات بھی حضرت شیخ الاسلام اور جمعیت علماے ہند کے دیگر رہنماؤں کے ذہن میں موجود تھی کہ اگرچہ ملک کے کسی حصے میں آزاد اسلامی زندگی کے قیام کو نظر انداز نہیں کیا جاسکتا لیکن ہندوستان کے طول وعرض میں دور دراز گوشوں تک مسلمان جس طرح پھیلے ہوئے ہیں اور پورے ملک اور غیر مسلموں کے انتہائی اکثریت کے شہروں اور علاقوں تک میں جو مسلمان زندگی گزار رہے ہیں اور جہاں تک ان کے مفادات، اوقاف، تعلیمی اداروں، تاریخی آثار، مسجدوں، خانقاہوں، مقبروں، قبرستانوں وغیرہ مذہبی عمارات کا تعلق ہے اور جس طرح صوفیہ و مشائخ کی کوششوں کی بدولت غیر مسلموں کی زندگی میں اسلام کی اچھی روایات اور پاکیزہ اخلاقی تعلیمات نے جو رسوخ حاصل کرلیا ہے اور بہ ایں پس منظر دعوت اسلام کی کامیابی

کے جو وسیع امکانات پیدا ہو گئے ہیں، ان سے دست بردار ہو جانا اور انھیں خطرے میں ڈال دینا ان اصحاب عزائم امور کے لیے باعث ننگ تھا۔ گیارہ سو سال تک مسلمانوں کی حکومت نے اس کی توجہ کے بغیر بھی اسلامی زندگی کے آثار و نقوش کو جس طرح سرزمین ہند میں پھیلا دیا تھا اور کسی کل ملکی تنظیم کے بغیر بھی مسلمان پورے ملک میں پھیلے ہوئے زندگی گزار رہے تھے، ان آثار و نقوش سے بے تعلق ہو جانا اور کسی ایک یا دو خطوں میں مسلمانوں کا جمع کر لینا ناممکن تھا، اس لیے ان بزرگوں کی کوشش تھی کہ مسلمانوں کو پورے ملک میں اپنے تاریخی، ملی اور سیاسی حقوق و مفادات سے دستبردار ہو کر اور انھیں خطرات کے حوالے کر کے اور مسلم لیگ کے صدر کے فلسفے کے مطابق ساڑھے پانچ کروڑ (مسلم اکثریت کے علاقے میں) مسلمانوں کی خاطر اقلیت کے علاقے میں ساڑھے چار کروڑ مسلمانوں پر جو کچھ بیتی ہے بیت جانے دو آؤ اکثریت کے مسلمانوں کو آزادی دلا دیں۔ وہ کسی ایک یا دو گوشوں پر قناعت کرنے کے لیے تیار نہ تھے۔ ان کے نزدیک یہ بات تدبر کے خلاف اور قیادت کے لیے باعث ننگ تھی کہ ساڑھے پانچ کروڑ پر ساڑھے چار کروڑ کو قربان کر دیا جائے تدبر کا تقاضا تھا کہ دس کروڑ مسلمانوں کی آبرو مندانہ زندگی کا حل تلاش کیا جاتا۔ اگر لیگی قیادت کا یہ فلسفہ درست تھا کہ اقلیت کو بہت تھوڑی اکثریت پر قربان کر دیا جا سکتا ہے تو اس بارے میں وہ کیا کہیں گے کہ اب پاکستان کی کل آبادی چودہ کروڑ ہے اور ہندوستان میں سو کروڑ سے زیادہ بیس بائیس کروڑ تک مسلمانوں کی آبادی کا دعویٰ کیا جاتا ہے۔ کیا یہ بات قرینِ انصاف و تدبر ہو گی کہ اسی لیگی فلسفے پر عمل کیا جائے؟ حال آں کہ اس وقت بھی حالات کا واضح اشارہ موجود تھا کہ ملک جب بھی آزاد ہو گا مسلم اکثریت کے علاقوں میں انھیں کی حکومت قائم ہو گی اور اسلام ہی اپنی اعلیٰ و ارفع اور پاکیزہ اخلاقی تعلیمات کی بدولت غالب رہے گا۔ خواہ اس کا نام پاکستان نہ ہوتا یا حضرت شیخ الاسلام ان کے اسلاف اور ان کے معاصر بزرگوں نے اسی نصب العین کے مطابق سیاسی جدوجہد میں حصہ لیا تھا اور ان کے اخلاف آج بھی اس سرزمین میں مسلمانوں اور اسلامی مفادات کے حفظ و دفاع اور مسلمانوں کی اسلامی زندگی کے قیام کی جدوجہد میں مصروف ہیں اور ۱۹۴۷ء اور اس کے بعد

کے دورِ ابتلا سے گزر جانے کے بعد ان کی کامیابی کے امکانات بہت روشن ہو گئے ہیں۔

حضرت شیخ الاسلام، ان کے بزرگوں اور معاصروں کے اس اندازِ فکر اور اسی نصب العین کے مطابق جدو جہد کی پوری تاریخ پورے پس منظر اور مضبوط دلایل کے ساتھ اس ڈایری کے صفحات میں منضبط ہو گئی ہے۔

❁

ڈایری کی خصوصیات کے اس پہلو پر بھی نظر رکھنی چاہیے کہ اس میں مجرد واقعات ہی کو تاریخ وار درج نہیں کر دیا گیا ہے بلکہ واقعات پر تبصرہ بھی کیا گیا ہے۔ اس میں

۱۔ بعض مقامات پر تبصرہ ڈایری کے مولف کے قلم سے ہے اور

۲۔ بعض مقامات پر کسی مدبر کے ایک بیان کے بعد دوسرے مدبر کے بیان سے تبصرے اور تنقید و تجزیہ کے مقصد کو حاصل کیا گیا ہے۔

۳۔ ۱۹۳۷ء میں جب مسلم لیگ کا مقصد پورا ہو گیا تو اس کے صدر نے حضرت شیخ الاسلام کے مسلم پارلیمنٹری بورڈ سے اخراج کے لیے قدم اٹھایا۔ اس سلسلے میں انھوں نے حضرت کی ایک تقریر کو جو مبینہ طور پر ایک مقام پر کی گئی تھی بنیاد بنایا تھا، لیکن اس کے جواب میں حضرت نے جو بیان دیا اس سے معلوم ہوا کہ اس تاریخ کو حضرت نے اس مقام کا نہ سفر کیا تھا، نہ کسی اور مقام پر اس طرح کی کوئی تقریر کی تھی، یا کوئی بیان دیا تھا۔

۴۔ اسی طرح ۳۹۔ ۱۹۳۸ء میں کانگریسی حکومتوں کے مفروضہ مظالم کے بارے میں لیگی رہنماؤں کی واویلا کے جواب میں راجندر پرشاد، پنڈت جواہر لال نہرو، مولانا آزاد وغیرہ کے بیانات نے نقد و تجزیہ کا کام لیا ہے یا کانگریسی حکومتوں کے استعفا پر لیگ کے صدر کی جانب سے ''یوم نجات'' منانے کے اعلان کے جواب میں مولانا کا بیان حقیقت کو واضح کر دیتا ہے۔

۵۔ مکالمۃ الصدرین کے جھوٹ کے جواب میں جمعیت کے کئی بزرگوں کے بیانات نے یہی مقصد پورا کیا ہے۔

۶۔ ایسٹ انڈیا کے دور استحصال میں ہر گورنر کے عہد کے واقعات کے اندراج کے بعد اس کے دور پر عمومی تبصرے کا یہی طریقہ استعمال کیا گیا ہے اور عام طور پر ''کمپنی کی حکومت'' کے فاضل مولف و محقق (باری علیگ) ہی کے افکار سے استفادہ کیا گیا ہے۔ اس طرح کے بہت مواقع پر پوری احتیاط کے ساتھ حالات واقعات پر نقد و تبصرہ کا یہی اسلوب اختیار کیا ہے۔

ڈاری میں واقعات کو تواریخ کی ترتیب سے درج کیا گیا ہے۔ لیکن بعض اندراجات میں اس ترتیب کو ترک بھی کر دینا پڑا۔ مثلاً:

۱۔ ۱۸۵۷ء کے حوادث کا ظہور ہوا تو مختلف مقامات پر ایک ہی تاریخ میں واقعات کا ظہور ہوا۔ اور ہر مقام کے ایک واقعے کی کڑیاں دوسرے اور تیسرے واقعے سے اس طرح جڑی ہوئی تھیں کہ انھیں ایک دوسرے سے الگ نہیں کیا جا سکتا تھا۔ اس لیے مناسب معلوم ہوا کہ ایک مقام کے واقعات کو جو مسلسل ہوں انھیں اس شہر یا علاقے کے عنوان سے ایک ہی جگہ مرتب کر دیا جائے۔ چناں چہ میرٹھ، مظفرنگر، سہارن پور، علی گڑھ، دہلی، اودھ، پنجاب، سندھ کے واقعات کے اندراج میں یہی طریقہ اختیار کیا گیا ہے۔

۲۔ حضرت شیخ الاسلام کے سوانح میں حضرت کی تاریخ ولادت کے اندراج کے بعد خاندان، ان کے بزرگوں کے حالات، ابتدائی تعلیم و تربیت وغیرہ کے حالات میں، دیو بند میں داخلے کے بعد کے حالات، مدینۂ منورہ کی ہجرت کے ذکر میں مدینۂ منورہ کے قیام کے زمانے کے حالات اور مدینۂ منورہ کی زندگی کے بعض تاریخی پہلوؤں کے تعارف میں بھی بیانات کے تسلسل کو توڑنا مناسب معلوم نہیں ہوا اور بعض مقامات پر یہ تسلسل ہفتوں اور مہینوں نہیں بلکہ برسوں پر پھیلا ہوا نظر آئے گا۔ یہ طریقہ اگرچہ ڈاری کے اصول کے خلاف ہے۔ لیکن جہاں ڈاری میں شخصی اور تاریخ کے کسی عہد اور ان کی خصوصیات زیر تذکرہ آئیں یا مختلف علاقوں اور شہروں کے واقعات کا اندراج الگ الگ تاریخی ترتیب سے لازم ٹھہرے وہاں یہ

طریقۂ کار ناگزیر ہو جاتا ہے کہ کسی مقام پر بعد کے واقعات کو پہلے بیان کر دیا جائے یا کہیں ماضی کے واقعات کو بعد کے کسی تذکرے میں سمیٹ لیا جائے۔

ڈاری کی ترتیب کے سلسلے میں یہ وضاحت بھی ضروری ہے کہ اس میں سے طویل تاریخی مضامین و مقالات کو الگ کر لیا گیا ہے ان کی وجہ سے ڈاری کی روانی میں رکاوٹ پیدا ہوتی تھی۔ ایک عہد کے مطالعے میں ایک تاریخ سے دوسری تاریخ تک پہنچنے میں اگر ۴۰، ۵۰ یا ۱۰۰ صفحے کا مقالہ یا رسالہ یا کوئی طویل علمی، تاریخی یا سیاسی بحث درمیان میں آ جائے تو مطالعے کی روانی میں رکاوٹ پیدا ہوتی ہے۔ اس لیے ایسے مقامات پر طویل مقالات و مضامین کی تحریر کا حوالہ تو دے دیا ہے، لیکن مقالات کو الگ کر لیا ہے۔ دراصل ڈاری کا موضوع حوادث و واقعات ہوتے ہیں جن کا تعلق ایام و شہور سے ہوتا ہے مقالات کا موضوع افکار و مباحث ہوتے ہیں، جن کا تعلق کسی مختصر یا طویل عرصے یا عہد سے ہوتا ہے۔ ان کے مطالعے کی ضرورت و اہمیت کسی خاص دن یا تاریخ سے وابستہ نہیں ہوتی۔ اس لیے مقالات کو الگ کر کے ڈاری کے ساتھ مقالات سیاسیہ کے تین مجموعے مرتب کر دے ہیں۔

۱۔ مقالات سیاسیہ (جلد اول) شیخ الاسلام مولانا حسین احمد مدنیؒ (تقریباً پانچ سو صفحات)

اس میں حضرت کے وہ تمام مضامین و مقالات جمع کر دیے ہیں جو مختلف اوقات میں مختلف عنوانات سے شائع ہو چکے تھے۔

۲۔ مقالات سیاسیہ (جلد دوم) مختلف اہل قلم (تقریباً چھ سو صفحات)

اس میں صرف جمعیت کے رہنماؤں ہی کے نہیں بلکہ جمعیت کی حلیف جماعتوں کے اکابر اور اہل علم و اصحاب قلم کے مقالات و مضامین بھی ہیں۔ چوں کہ ہر کسی کے ایک یا دو مضامین تھے اس لیے سب کو ایک ہی جلد میں مرتب کر دیا ہے۔

۳۔ مقالات سیاسیہ (جلد سوم) مولانا سید محمد میاںؒ معہ ضمیمۂ مقالات مولانا سید حامد میاںؒ (تقریباً ساڑھے چار سو صفحات)

یہ جلد صرف مولانا سید محمد میاں کے مقالات کے لیے مخصوص کر دی ہے۔ مولانا سید محمد میاں کو اہل قلم میں خاص امتیاز حاصل تھا انھوں نے جمعیت کی دعوت و خدمات کے تعارف میں، اس کے مسلک و موقف کے دفاع میں، اس کے اقدامات اور پالیسیوں کی وضاحت میں، جمعیت علماے ہند اور حضرت شیخ الاسلام پر تنقیدات و اعتراضات کے جواب میں سب سے زیادہ لکھا تھا اور مناسب ضخامت کے ایک مجموعے کے لیے مواد مہیا تھا اس لیے مولانا کے مقالات کا ایک مجموعہ الگ مرتب کر دیا ہے۔

اس مجموعے کے ساتھ ایک ضمیمہ بھی شامل ہے جس میں حضرت مورخ ملت کے خلف الرشید مولانا سید حامد میاںؒ کے دو مقالے ہیں۔ ان کی جگہ مختلف اہل قلم کے مضامین کا مجموعہ ہوسکتا تھا لیکن بحکم الولد سر لابیہ مناسب سمجھا کہ انھیں کے مورث و والد گرامی مرتبت کے یادگار مجموعۂ مقالات کا ضمیمہ بنا دیا جائے۔ یہ ان کے لیے زیادہ بہتر جگہ ہے۔

یہ ایک ایسا کام انجام پا گیا ہے جو ڈائری کے سلسلے ہی کی ضرورت نہ تھی بلکہ تاریخی سیاسی مطالعے کے لیے بھی ان مضامین و مقالات اور تاریخی کتابچوں کی ترتیب و تدوین کی اہم ضرورت تھی۔ یہ دعویٰ تو نہیں کیا جاسکتا کہ اس عہد کے اور ان شخصیات کے تمام اہم مقالات اور کتابچے ان تینوں جلدوں میں مرتب ہو گئے ہیں لیکن یہ بات ضرور کہی جاسکتی ہے کہ جمعیت علماے ہند اور قوم پرور مسلمانوں کے نقطۂ نظر، ان کے سیاسی موقف، نصب العین، افکار اور خدمات کے تعارف اور وضاحت میں یہ پہلا سلسلہ ہے جو صحت کے اہتمام کے ساتھ مدون ہوا ہے۔

ان تینوں جلدوں کی ضخامت ڈائری کی چار جلدوں سے الگ تقریباً سولہ سو صفحات تک پہنچتی ہے۔

ابوسلمان

۲۰۰۲ دسمبر

(ڈاکٹر ابوسلمان شاہ جہان پوری)

حضرت شیخ الاسلام مولانا سید حسین احمد مدنی قدس سرہٗ کی

اخبار و افکار کی روشنی میں

۱۵۰۲ء تا اختتام ۱۹۱۸ء

عطا فرمودہ

صاحبزادہ محترم حضرۃ مولانا سید محمد ارشد مدنی مدظلہ العالی
استاذ الحدیث ازہر الہند دار العلوم دیوبند (انڈیا)

تالیف و تدوین

ڈاکٹر ابو سلمان شاہجہان پوری

شیخ الاسلام حضرت مولانا سید حسین احمد مدنیؒ
کی سیاسی ڈائری (جلد اول) ایک نظر میں

۱۵۰۲ء

فروری ۱۵۰۲ء: پرتگال کے بادشاہ نے مشرق میں پرتگیزی سلطنت قائم کرنے کے لیے بیس جہازوں کے ایک بیڑے کو واسکو دے گاما کی کمان میں فروری ۱۵۰۲ء کو ہندوستان روانہ کیا۔ جب یہ بیڑہ ہندوستان کے ساحل کے قریب پہنچا تو واسکو دے گاما کو معلوم ہوا کہ بحیرۂ احمر سے ایک بہت بڑا تجارتی جہاز آرہا ہے۔ واسکو دے گاما نے اس تجارتی جہاز پر حملہ بول دیا۔ جہاز کے کپتان جوہر آفندی نے پرتگیزوں کی بہت منت سماجت کی لیکن انھوں نے ایک نہ مانی۔ سات دن تک جوہر آفندی پرتگیزی بیڑے سے لڑتا رہا۔ پرتگیزوں نے اس جہاز کے تمام سواروں کو جن میں بچے اور عورتیں بھی تھیں قتل کر دیا۔

۲۹ر اکتوبر: واسکو دے گاما نے کالی کٹ پہنچ کر (۲۹ر اکتوبر ۱۵۰۲ء) زیمورن سے مطالبہ کیا کہ وہ تمام موپلوں اور عربوں کو اپنی ریاست سے نکال دے۔ زیمورن نے یہ مطالبہ ماننے سے انکار کر دیا کیوں کہ کالی کٹ ایک مدت سے آزاد بندرگاہ چلی آ رہی تھی۔ زیمورن نے واسکو دے گاما سے کہہ دیا کہ اگر انھیں یہ شرط منظور نہیں تو وہ کالی کٹ سے چلے جائیں۔

واسکو دے گاما نے چاول لے جانے والے جہازوں کے آٹھ سو ملاحوں کو پکڑ کر ان سب کو قتل کروا دیا۔ ملاحوں کو قتل کرنے کے بعد اس نے دو دن تک کالی کٹ پر گولے برسائے۔ مالا باری فوج کے پاس دو توپیں تھیں۔ لیکن وہ ٹھیک نشانہ نہیں باندھ سکتے تھے۔ تیسرے دن واسکو دے گاما چین کی طرف چل دیا۔

۱۵۰۳ء

واسکو دے گاما نے کوچین اور کنانور کی پرتگیزی فیکٹریوں کو مستحکم کرنے کے بعد یکم ستمبر ۱۵۰۳ء کو پرتگال کی راہ لی۔ مالا بار کے ساحل میں پرتگیزوں کے تجارتی مفاد کی نگرانی کے لیے سودرے کی کمان میں ایک بیڑے کو پیچھے چھوڑ دیا گیا۔ (کمپنی کی حکومت)

مشرق میں پرتگال کا مفاد اس حد تک پہنچ گیا تھا کہ اب ہر سال نئے بیڑے کی روانگی ناکافی محسوس کی جانے لگی۔ چناں چہ تین سال کے لیے ایک وائسرائے مقرر کیے جانے کا فیصلہ کیا گیا۔ فرانسکو دا المیدہ ہندوستان میں پرتگالیوں کا پہلا وائسرائے تھا۔ المیدہ ایک بہت بڑے بیڑے اور پندرہ سو سپاہیوں کو لے کر ہندوستان کی طرف چل دیا۔ چوں کہ وہ کلوا، انجادیو، کنانور اور کوچین

میں پرتگالی قلعے بنانا چاہتا تھا اس لیے وہ بہت سے معماروں کو بھی اپنے ساتھ لے گیا۔ کلوا میں ایک قلعہ بنانے اور مشرقی افریقہ کے بہت سے ساحلی شہروں کو لوٹنے کے بعد وہ ۱۴ر ستمبر ۱۵۰۵ء کو انجادیو پہنچا۔ یہاں بھی ایک قلعہ کھڑا کرنے کے بعد المید ہ نے کنانور میں بھی ایک قلعہ بنوایا۔ اسی قلعہ میں المید ہ کے بیٹے لوریشو کو ایک اطالوی نے بتایا کہ پرتگالیوں کی سمندری سرگرمیوں کو ختم کرنے کے لیے زیمورن ایک بہت بڑا جنگی بیڑا تیار کر رہا ہے۔ (کمپنی کی حکومت)

روس میں بغاوت:

۱۸ر دسمبر ۱۹۰۵ء روسی سلطنت کے ہر صوبے میں غدر و فساد تو ہو ہی رہا تھا۔ اب فوج بحری وبرّی نے بھی بغاوت شروع کر دی ہے۔ چناں چہ اخبارات سے واضح ہوتا ہے کہ روسی فوج ہاربن، نے بھی غدر کر دیا اور شہر مذکور کو لوٹ وجلا کر خاکستر کر دیا۔ یہ بد اقبالی نکولس دوئم شہنشاہ روس کی ہے۔

(ایکن اودھ روز نامچہ: مولانا مولوی سید مظہر علی سندیلوی (خدا بخش لائبریری جرنل، پٹنہ، شمارہ ۵۶، ص ۹۱)

۱۵۰۶ء

مارچ ۱۵۰۶ء: زیمورن کا یہ بیڑا عبدالرحمٰن کی کمان میں مالابار کے ساحل سے روانہ ہوا۔ پرتگالیوں سے معمولی لڑائی کے بعد یہ بیڑا کالی کٹ چلا گیا۔

پرتگالیوں کی ان سمندری سرگرمیوں اور پرتگال کے سمندری لٹیروں کی لوٹ مار نے مصری بندرگاہوں کی چنگی میں نمایاں کمی کر دی تھی۔ مصر کے مملوک سلطان قانصو نے پرتگالیوں سے لڑنے کے لیے ایک جنگی بیڑا تیار کیا۔

۱۵۰۷ء

یہ بیڑا امیر ہاشم کی کمان میں ۲۰ر ستمبر ۱۵۰۷ء کو دیو پہنچا۔ دیو کے گورنر ملک ایاز نے میر ہاشم کی پوری امداد کا وعدہ کیا۔ چناں چہ میر ہاشم اور ملک ایاز نے پرتگالیوں کے بیڑے کو شکست دی۔ اس سمندری لڑائی میں پرتگالی کے وائسرائے کا بہادر بیٹا لوریشو مارا گیا۔ المید ہ اپنے بیٹے کا انتقام لینے کے لیے کوچین سے چل دیا۔ اس اثنا میں البوکریک، سقوطرہ اور گرمز سے ہوتا ہوا بحر ہند میں داخل ہو چکا تھا۔ ساحلی شہروں کو لوٹتا ہوا المید ہ، دیو (گجرات کے جنوب میں ایک چھوٹا سا جزیزہ) کی طرف بڑھا۔

۱۵۰۹ء

۳ رفروری ۱۵۰۹ء: دیو کے پانیوں میں پرتگالیوں اور اتحادیوں میں ۳ رفروری ۱۵۰۹ء کو لڑائی ہوئی۔ اس لڑائی میں اتحادیوں کو شکست ہوئی پرتگالی بیڑہ جس طرح لوٹ مار کرتا ہوا آیا تھا اسی طرح لوٹ مار کرتا ہوا کوچین پہنچ گیا۔

یکم دسمبر ۱۵۰۹ء کو المیدہ (۱۵۰۵ء۔۱۵۰۹ء) کوچین سے پرتگال روانہ ہوا۔

۱۵۰۹ء تا ۱۵۱۵ء

البوکریک (۱۵۰۹ء تا ۱۵۱۵ء) کو پرتگال کے بادشاہ نے گجرات کے ساحل سے راس کماری کے ساحل تک کا گورنر مقرر کیا تھا۔ شاہ پرتگال نے وائسرائے کا عہدہ اڑا دیا تھا۔ البوکریک نے مشرق میں پرتگالی سلطنت قائم کرنے کے لیے سب سے پہلے کالی کٹ پر حملہ کیا لیکن شکست کھائی۔ اُس لڑائی میں مالاباریوں نے پرتگالیوں کے سامان جنگ پر بھی قبضہ کر لیا۔ اس شکست کے بعد البوکریک نے اپنی قوت کو منظم کرنے کے لیے پرتگال سے فوجی افسروں کو بلا بھیجا۔ اس نے اپنی مالی حالت کو بہتر بنانے کے لیے موپلا جہازوں کو تجارت کی اجازت دے دی۔ اگلے سال البوکریک نے گوا پر قبضہ کر لیا۔ پرتگالی ابھی گوا کی دولت کو لوٹنے میں معروف تھے کہ اسمٰعیل عادل شاہ نے گوا کو پرتگالیوں سے چھین لیا۔ جب پرتگال سے کمک پہنچ گئی تو البوکریک گوا پر پھر حملہ کرنے کے لیے کنانور سے نکلا۔ کپتان رسول خان نے حملہ آوروں کا مقابلہ کیا، لیکن شکست کھائی۔ پرتگالیوں نے گوا پر قابض ہوتے ہی ایک قلعہ، ایک ہسپتال اور ایک گرجا بنا ڈالا۔ اب اس نے ملاکا پر ہلہ بول کر اس پر قبضہ کر لیا۔

۱۵۱۲ء

فروری ۱۵۱۲ء میں وہ کوچین میں تھا۔ اس سال البوکریک کو پرتگال سے جو کمک آئی تھی، اس میں پہلی مرتبہ بندوق بھی آئی تھی۔ اب البوکریک نے گوا کو اپنی ''راجدھانی'' بنالیا۔ پرتگالیوں کو بہت جلد گوا کی اہمیت کا اندازہ ہوگیا۔ البوکریک کے دربار میں ہرمز، سیام، پیگو، گجرات اور حبشہ کے سفیر دکھائی دینے لگے۔

۱۵۱۵ء

۱۶ ردسمبر ۱۵۱۵ء میں پرتگالیوں نے ہرمز پر بھی قبضہ کر لیا۔ ایک سال پہلے انھوں نے ملاکا پر

بھی قبضہ کرلیا تھا۔ ہرمز سے واپسی پر البوکریک ۱۶ر دسمبر ۱۵۱۵ء کو اس جہاز ہی میں مرگیا جو گوا کے سامنے لنگر ڈالے ہوئے تھا اگلے دن اسے گوا کے گرجا میں دفن کردیا تھا۔ (کمپنی کی حکومت)

۱۵۱۶ء

جنوری : البوکریک کے بعد شاہ پرتگال نے لوپوسوریز (۱۵۱۵ء۔۱۵۱۸ء) کو گورنر مقرر کیا۔ سوریز اپنے پیش رو کی خوبیوں سے خالی تھا۔ وہ بہت کمزور، بے ہمت اور بے کار سا انسان تھا۔

جنوری ۱۵۱۶ء میں پرتگال سے یہ اطلاع آئی کہ مصریوں کا ایک بہت بڑا جنگی بیڑا پچھلی لڑائی کا بدلہ لینے کے لیے تیار ہو رہا ہے۔ چناں چہ ایک سال تک تیاری کرنے کے بعد سوریز اپنے بیڑے سمیت بحیرۂ احمر کی طرف چل دیا۔ یہ بیڑا گیارہ دن تک جدہ کی بندرگاہ کے قریب لنگر ڈالنے کے بعد واپس ہوا۔ کاران پہنچ کر پرتگالیوں کے پاس بہت کم خوراک رہ گئی۔ پرتگالی بھوکے مرنے لگے۔ زندوں میں اتنی طاقت نہیں رہی تھی کہ وہ مردوں کو دفن کر سکتے۔ یہ تباہ حال بیڑہ بڑی مشکل سے ہرمز پہنچا۔ ہرمز سے پرتگالی گورنر نے ہندوستان کی راہ لی۔ ۱۵۱۸ء میں پرتگالیوں نے سلون میں بھی ایک قلعہ بنایا۔

۱۵۳۸ء

۲۲ر جون : پرتگالیوں اور بہادر شاہ میں ایک لڑائی ہوئی جس میں بہادر شاہ مارا گیا۔ اس لڑائی کے بعد پرتگالیوں نے دیو پر قبضہ کرلیا۔ سلطان بہادر شاہ نے عثمانی سلطان سے امداد لینے کے لیے جو ایلچی بھیجا تھا اس کے قسطنطنیہ پہنچنے سے پہلے سلطان بہادر شاہ کی موت کی خبر وہاں پہنچ چکی تھی۔ ترکی بیڑا ۲۲ر جون ۱۵۳۸ء کو سویز سے روانہ ہوا۔ اس بیڑے میں بہتر جہاز اور ساڑے چھ ہزار سپاہی تھے۔ سلیمان پاشا اس بیڑے کا کمانڈر تھا۔ عدن پر قبضہ کرنے کے بعد ۴ر ستمبر کو یہ بیڑا دیو پہنچا۔ پرتگالیوں کو اس بیڑے کے آنے کی خبر مل چکی تھی۔ چناں چہ انھوں نے بھی اپنی ساری سمندری طاقت کو جمع کرنا شروع کردیا تھا۔ سلیمان پاشا نے دیو کا محاصرہ کرلیا۔

اسی اثنا میں نونو کی جگہ گارشیا ہندوستان کے پرتگالی مقبوضات کا وائسرائے مقرر ہو چکا تھا۔ جب وہ گوا پہنچا تو پرتگالی بیڑا دیو جانے کے لیے تیار ہو چکا تھا۔ ترکی اور پرتگالی بیڑوں میں لڑائی ہوئی۔ اس لڑائی میں دونوں طرف سے بہادری کے جوہر دکھائے گئے۔ پرتگالیوں کے حفاظتی دستے نے کئی ہفتوں تک محاصرین کا مقابلہ کیا جس سے گجراتیوں اور ترکوں میں اختلاف پیدا ہوگیا۔ ۶ر نومبر کی صبح کو سلیمان پاشا نے بحیرۂ روم کی راہ لی۔ ترکوں کے چلے جانے کے بعد گجراتی

فوجیں دیو کے گرد ونواح سے ہٹ گئیں۔ ۲۰ر نومبر کو گارشیا نوے جہازوں کا بیڑا لے کر دیو کی طرف چل دیا۔

۱۵۳۹ء

جنوری: آدھا بیڑا طوفان کی نذر کرنے کے بعد جنوری ۱۵۳۹ء میں گارشیا دیو پہنچا۔ ترکی توپوں کی گولا باری سے دیو کا قلعہ تباہ ہو چکا تھا۔ پرتگالی وائسرائے نے سب سے پہلے قلعے کی مرمت کروا کر اسے پہلے سے زیادہ مضبوط بنا دیا۔ گارشیا نے گجرات کے سلطان کے ساتھ صلح کی بات چیت شروع کی۔

۱۱ر مارچ : چناں چہ ۱۱ر مارچ کو گجراتیوں اور پرتگالیوں میں معاہدہ ہو گیا۔ پرتگالیوں کا پلہ بھاری دیکھ کر کالی کٹ کے راجہ نے بھی پرتگالیوں کی تمام شرطیں مان کران سے صلح کر لی۔

۱۵۴۱ء

یکم جنوری تا ۸ر اگست ۱۵۴۱ء: گارشیا کی موت کے بعد واسکو دے گاما کا بیٹا استاداؤ دے گاما (۱۵۴۰ء۔۱۵۴۲ء) پرتگالی مقبوضات کا گورنر مقرر کیا گیا۔ استاداؤ نے آتے ہی سویز پر حملہ کرنے کی تیاریاں شروع کر دیں۔ پہلی جنوری ۱۵۴۱ء کو پرتگالی بیڑا بحر احمر کی طرف چل دیا۔ ۲۲ر اپریل کو پرتگالی جہاز سویز کے سامنے تھے۔ ہندوستان میں پرتگالیوں کے پہنچ جانے کے بعد سویز کی تجارتی حیثیت مٹتی چلی جا رہی تھی۔ سویز تیس یا چالیس جھونپڑیوں کی ایک بستی رہ گئی تھی۔ سویز میں چوں کہ ترکوں کا ایک جنگی بیڑا موجود تھا۔ پرتگالیوں نے ترکوں سے لڑے بغیر اپنا رخ بدل لیا۔

۸ر اگست: پرتگالی بیڑہ ۸ر اگست کو گوا پہنچ گیا۔ استاداؤ کے جانشین مارتیم انانسو (۱۵۴۲ء۔ ۱۵۴۵ء) نے جیا نگر کے ایک شہر کو لوٹ کر اپنے دوست کو دشمن بنا لیا۔ مارتیم نے پرتگالیوں کو لوٹ مار کی عام اجازت دے رکھی تھی۔ یہی وجہ ہے کہ اس کے جانشینوں کو بہت سی مشکلات کا سامنا کرنا پڑا۔ (کمپنی کی حکومت)

۸ر نومبر: اورنگ زیب کی نسبت جنھیں متعصب بادشاہ کہا جاتا ہے، سب کو معلوم ہے کہ انھوں نے بعض مندروں کے لیے جائیدادیں وقف کیں۔ ان کا ایک فرمان مورخہ ۲۵ر جمادی الثانی ۱۰۲۹ھ بعض کتابوں میں نقل ہوا ہے جو ابوالحسن گورنر بنارس کے نام جاری ہوا تھا اور جس میں حکم

تھا: ''کوئی شخص تمھارے علاقے کے برہمنوں کے ساتھ جو قدیم بت خانوں کے پروہت ہیں اور نیز دوسرے ہندوؤں کے ساتھ کسی قسم کی زیادتی نہ کرے۔ (تاریخ کا روشن پہلو از محمد دین فوق مطبوعہ کریمی پریس، لاہور، صفحہ ۴)

یہی طریقہ ہندو راجاؤں نے اپنی رعایا کے ساتھ رکھا تھا۔

چناں چہ حیدرآباد اور بڑودہ میں ایک طرف مندروں کے پجاری ریاست کے تنخواہ دار ہیں تو دوسری طرف جامع مسجد کے امام کا شمار سرکاری ملازموں میں ہے۔ اس لیے یہ امر مسلمات میں سے ہے کہ پچھلی عملداریوں میں رعایا کے مذہبی حقوق کی حفاظت کامل تھی۔ اس کی تصدیق پنڈت سندر لال صاحب الہ آبادی نے حسب ذیل الفاظ میں کی ہے:

''اکبر، جہانگیر، شاہجہاں اور ان کے بعد اورنگزیب کے تمام جانشینوں کے زمانے میں ہندو اور مسلم یکساں حیثیت رکھتے تھے۔ دونوں مذاہب کی مساویانہ توقیر کی جاتی تھی اور مذہب کے لیے کسی کے ساتھ کسی قسم کی جانبداری نہ کی جاتی تھی...... ہر بادشاہ کی طرف سے بے شمار ہندو مندروں کو جاگیریں اور معافیاں دی گئی تھیں۔ آج تک ہند میں متعدد مندروں کے پجاریوں کے پاس اورنگزیب کے دستخطی فرمان موجود ہیں۔ جن میں خیرات اور جاگیروں کے عطا کیے جانے کا تذکرہ ہے:

اس قسم کے دو فرمان اب تک الہ آباد میں موجود ہیں، جن میں سے ایک اریل میں سومیشور ناتھ کے مشہور مندر کی پجاریوں کے پاس ہے۔'' (ماخوذ از مضامین بابو سندر لال مصنف ''بھارت میں انگریزی راج'' بہ حوالہ 'استقلال'۔ دیوبند، مورخہ ۴ مارچ ۱۹۳۶ء)

اسی طرح شہنشاہ اورنگزیب نے اُردھر پسر جگ جیون ساکن موضع بنی ضلع بنارس اور جد مصر ساکن بنیش پور پرگنہ حویلی کو اور پنڈت لجند رمصر کو جاگیریں عطا کیں۔ (''مرقع بنارس'' از خان بہادر چودھری نبی احمد، ص ۱۶۴)

سولھویں اواخر: ہندستان کی معاشی اور اقتصادی حالت پر تبصرہ:

''ان تمام امور سے پتا چلتا ہے کہ اورنگزیب کی حکومت میں کس قدر استحکام اور کتنی مرکزیت تھی۔ صوبہ داروں کو ضلع کے حکام کے متعلق جو اختیارات بھی ہوں لیکن فوجدار اکثر ان کے متعلق مرکزی دفتر سے براہ راست مراسلت کر کے شاہی فرمان حاصل کرتا تھا۔ سردار مہم اور فوج کے دوسرے ماتحت حکام کو بھی شاہی اعتماد کی عزت حاصل تھی۔ خانِ ساماں کے ماتحت جو افسر کام

کرتے تھے وہ دراصل شاہی خدام ہوتے تھے اور انھیں براہ راست بادشاہ سے ہدایات اور احکام ملتے تھے۔ یہ صحیح ہے کہ ماتحتوں کی وہ درخواستیں جو شاہی لطف و کرم کے لیے پیش ہوتی تھیں زیادہ تر محکموں کے افسر اعلیٰ کے پاس رپورٹ کے لیے بھیج دی جاتی تھیں۔ لیکن ملکی انتظام کے بارے میں جو درخواستیں آتی تھیں ان پر براہ راست ہدایات بھیجی جاتی تھیں۔ ایسی صورت میں مرکز کا کام بہت بڑھ جاتا تھا۔ اس میں سہولت کے لیے دیوان اور بخشیوں کو یہ اختیار دے دیا جاتا تھا کہ وہ اپنے محکموں کے معاملات کی مسلوں پر اپنی رائے لکھ دیا کریں۔ اگرچہ اورنگزیب نے اس پر کبھی فخر نہیں کیا کہ وہ انصاف و عدل کا سرچشمہ ہے، لیکن وہ ہمیشہ حکام کے خلاف بھی شکایت سنتا تھا اور مظلومین کی دادرسی کرتا تھا!'' (معارف، اعظم گڑھ، جلد ۶۴، نمبر ۵)

افغانوں اور مغلوں کے دور میں ہندوستان نے صنعت و حرفت میں بہت زیادہ ترقی کی۔ ابن بطوطہ اپنے سفرنامے میں لکھتا ہے کہ ''صلیبی جنگوں کے زمانے سے ہندوستان کی تجارت وینس اور جنیوا کی راہ سے یورپ کے ملکوں سے ہو رہی ہے۔ ہندوستان کے لوگ خوش حال ہیں۔'' محمد تغلق نے دہلی میں سوتی کپڑے کا ایک کارخانہ قائم کیا تھا۔ جس میں پانچ ہزار کاریگر کام کرتے تھے۔ مارکو پولو ہمیں بتاتا ہے کہ ''راس امید اور شنگھائی کی تمام درمیانی بندرگاہوں میں ہندوستان کا بنا ہوا کپڑا افراط سے فروخت ہوتا ہے۔'' آج ہندوستان کو صرف زرعی ملک کہا جاسکتا ہے۔ لیکن حقیقت یہ ہے کہ انیسویں صدی کے شروع تک ہندوستان ایک صنعتی ملک تھا۔ دنیا کے ہر ملک کے تاجر ہندوستان سے تجارت کرتے تھے۔ مہذب دنیا میں ڈھاکہ اور مرشد آباد کی ململ کا استعمال عظمت اور برتری کا ثبوت تھا۔ یورپ کے ہر ملک میں ان دو شہروں کی ململ اور چکن بہت زیادہ مقبول تھی۔ ہندوستان کی دوسری صنعتوں کی نسبت پارچہ بافی کی صنعت کو کمال حاصل تھا۔ ہندوستان میں سوتی اور اونی کپڑے، شال، دوشالے، ململیں اور چھینٹیں برآمد کی جاتی تھیں۔ ریشم، کمخواب اور زربفت کے لیے احمد آباد دنیا بھر میں مشہور تھا۔ اٹھارھویں صدی میں ان کپڑوں کی انگلستان میں اتنی مانگ ہوگئی تھی کہ اسے بند کرنے کے لیے حکومت کو بھاری ٹیکس لگانے پڑے تھے۔ پارچہ بافی کے علاوہ لوہے کے کام میں بھی ہندوستان بہت زیادہ ترقی کرچکا تھا۔ لوہے سے تیار شدہ اشیا ہندوستان سے باہر بھی بھیجی جاتی تھیں۔ اورنگزیب کے عہد میں ملتان میں جہازوں کے لیے لوہے کے لنگر ڈھالے جاتے تھے۔ جہاز سازی میں بنگال نے بہت ترقی کرلی تھی۔ انیسویں صدی کے آغاز تک ہندوستان صنعت و حرفت میں انگلستان سے بڑھتا ہوا

تھا۔ انگلستان کے لیے تجارتی اور جنگی جہاز ہندستان میں تیار ہوتے تھے۔ لیکن انیسویں صدی کے بعد ہندوستان کی برآمد میں کمی ہونا شروع ہوئی اور اس کی درآمد میں ہر سال اضافہ ہوتا گیا۔ یہاں تک کہ برآمد برائے نام رہ گئی اور ہندوستان محض ''درآمدستان'' بن کر رہ گیا۔ ایک انگریز کے الفاظ ہیں: ''عام انگریزوں کو سمجھانا مشکل ہے کہ ہماری حکومت سے پہلے ہندوستانی زندگی کتنی پرلطف تھی۔ کاروباری اور باہمت لوگوں کے لیے کیسی کیسی آسانیاں میسر تھیں۔ مجھے پورا پورا یقین ہے کہ انگریزوں کے آنے سے پہلے کاروباری ہندوستانی نہایت آرام کی زندگی بسر کرتے تھے۔'' اورنگزیب کے عہد میں سورت اور احمد آباد سے جو مال باہر بھیجا جاتا تھا اس سے تیرہ لاکھ اور ایک سو تین لاکھ روپیہ سالانہ چنگی کے ذریعے وصول ہوتا تھا۔

گیارھویں صدی سے انیسویں صدی کے وسط تک ہندوستان تجارتی حیثیت سے بہت نمایاں تھا۔ اس دور میں انگلستان سے جاپان تک ہندوستانی مال فروخت ہوتا تھا۔ اٹھارھویں صدی کے شروع میں مغلیہ سلطنت میں زوال کے آثار پیدا ہوگئے۔ ان آثار کو یورپی قوموں نے اچھی طرح سمجھ لیا تھا۔ چناں چہ انھوں نے ہندوستان پر قبضہ جمانے کے ارادے کر لیے۔

پرتگال کے بعد ہالینڈ نے بھی ہندوستان سے تجارت کرنے کے لیے جدوجہد شروع کی۔ ولندیزوں نے بھی پرتگیزوں کی دریافت کردہ راہ سے ہندوستان کے ساتھ تجارت شروع کردی۔ پرتگال نے ہالینڈ کی مزاحمت کی۔ سولھویں صدی میں پرتگال، ہندوستان کی تجارت کا اجارہ دار بن گیا۔ سترھویں صدی کے شروع میں ہالینڈ میں ایک بہت بڑی تجارتی کمپنی بنائی گئی۔ اب ولندیزوں نے پرتگیزوں کے مقبوضات پر قبضہ کرنا شروع کیا۔ مشرقی تجارت پر پرتگیزوں کی جگہ ولندیزوں کا قبضہ تھا۔ دنمارک نے بھی نقدیر آزمائی کی۔ انگریز اور فرانسیسی بھی میدان میں اتر پڑے (کمپنی کی حکومت، ص ۶۳-۶۰)

سترھویں صدی واٹھارھویں صدی

۱۶۰۱ءتا آغاز ۱۷۰۰ء

کرامویل نے ابتدا میں نئے نئے تاجروں کو ہندوستان سے تجارت کی اجازت دی، لیکن جب اس طرح انگریزی تاجروں کی باہمی رقابت سے انگلستان کو نقصان پہنچنے لگا تو کرامویل نے کمپنی کو بلاشرکت غیرے ہندوستان اور مشرق سے تجارت کرنے کا فرمان دے دیا۔ چارلس اول کے عہد میں ہندوستان میں انگریزوں نے بہت سے مقامات پر تجارتی کوٹھیاں قائم کیں۔ چارلس دوم کے عہد میں ایسٹ انڈیا کمپنی نے خوب دولت پیدا کی۔ اس نے ایک پرتگیزی شہزادی سے شادی کی۔ یہ شہزادی اپنے جہیز میں جو جزیرہ لائی اسے چارلس دوم نے کمپنی کے ہاتھ دس پونڈ سالانہ لگان پر فروخت کر دیا۔ اس جزیرے نے بعد میں بمبئی کی صورت اختیار کی۔

اس زمانے میں کمپنی نے ہندوستان میں بہت سی زیادتیاں شروع کر دی تھیں۔ سورت میں کمپنی نے ادھم مچا رکھا تھا۔ اورنگزیب کے سپہ سالار نے انھیں سورت میں شکست دی۔ اس شکست کے بعد کمپنی کے ایک وفد نے اورنگزیب سے اپنے گذشتہ افعال کی معافی مانگی۔ اس پر اورنگزیب نے کمپنی کو ایک فرمان دیا جس کی رو سے کمپنی کو مغلیہ سلطنت میں تجارت کرنے کی اجازت مل گئی۔

اس فرمان میں شہنشاہ اورنگزیب نے کمپنی کو اس بات کے متعلق آگاہ کر دیا کہ اگر اسے آیندہ صوبے داروں سے کوئی شکایت ہو تو اس کی شہنشاہ کو اطلاع دیا کرے۔

"درخواست اس مضمون کی مابدولت کے ملاحظہ میں آئی کہ جس قدر فساد برپا ہوا اس کے ذمہ دار تم ہو اور یہ کہ اس میں سراسر تم قصوروار ہو۔ تمھاری طرف سے مابدولت کو مابدولت کے صوبہ داروں کے خلاف شکایات موصول ہوئی تھیں۔ تمھیں یہ شکایت تھی کہ مابدولت کے صوبے داروں نے تمھارے ساتھ بدسلوکی کی۔ تمھیں لازم تھا کہ شورش برپا کرنے سے پہلے تم مابدولت کو تمام واقعات کی اطلاع دیتے۔ اب چوں کہ تم اپنے جرم کو تسلیم کرتے ہو اس لیے اب واقعات کو معاف کر کے تمھاری درخواست ہی منظور نہیں کی جاتی بلکہ تمھاری التجا کے مطابق تمھیں ایک فرمان بھی دیا جاتا ہے۔ مابدولت نے اسد خان کو حکم بھیج دیا ہے کہ وہ فرمان مذکور سورت کے صوبہ دار کے پاس بھیج دے۔ جب یہ فرمان تمھیں موصول ہو تو اس کا احترام کرو۔ نیز آیندہ ایسی غلطی کا ارتکاب نہ کرنا۔ ہمیشہ مابدولت کی خوشنودی کے امیدوار رہو......"

جب کمپنی کی ان بداعمالیوں کا پتا چلا تو انگلستان میں اس کی مخالفت شروع ہوگئی۔ چونکہ کمپنی دولت مند ہوچکی تھی اس لیے اس نے دولت سے اپنے مخالفوں کو چپ کرا دیا۔ پھر بھی اس کمپنی کا اجارہ ٹوٹ گیا اور اس کے مقابلے میں ایک نئی کمپنی میدان میں نکل آئی۔ لیکن ہندوستان انگریزوں کی دو کمپنیوں کا متحمل نہیں ہوسکتا تھا۔ دونوں کمپنیوں کو نقصان اٹھانا پڑا۔ اس نقصان نے دونوں کو متحد کر دیا۔ اب ''متحدہ ایسٹ انڈیا کمپنی'' کے نام سے دوبارہ کاروبار شروع ہوا۔ اب کمپنی بادشاہ کی جگہ پارلیمنٹ کے ماتحت ہوگئی۔

کمپنی بہت جلد تجارت کے ساتھ سیاست کے میدان میں بھی اتر پڑی۔ اب اس کے پیش نظر تجارت اور ملک گیری تھی۔ یہ ملک گیری قائم رہی۔ یہاں تک کہ ملکہ وکٹوریہ کے ایک فرمان نے اس کی سیاسی قوت کو ختم کر دیا۔

ولندیزوں اور انگریزوں کے بعد فرانسیسی بھی ہندوستان کے ساحلوں کی طرف چل دیے۔ سترھویں صدی کی شروع میں فرانسیسیوں نے ہندوستان کے ساتھ تجارت کرنے کی کوشش کی۔ لیکن انھیں کامیابی نہ ہوسکی۔ لوئی چہاردہم کے وزیر کالبر نے اپنی کوششوں سے ۱۶۶۴ء میں فرنچ ایسٹ انڈیا کمپنی بنائی۔ دس سال تک ہندوستان سے تجارت کرنے کے بعد فرانسیسیوں نے پانڈی چری، چندرنگر، ماہی، کاریکل اور دوسری بندرگاہوں میں اپنی تجارتی کوٹھیاں بنالیں۔

اٹھارھویں صدی کے وسط میں جب انگریزوں اور فرانسیسیوں کے سیاسی اور معاشی مفاد ایک دوسرے سے ٹکرائے تو دوسری جگہوں کے علاوہ ہندوستان میں بھی انگریز اور فرانسیسی آپس میں لڑنے لگے۔ ان لڑائیوں کا آغاز کرناٹک سے ہوا۔ انگریزوں اور فرانسیسیوں میں کرناٹک کی تین لڑائیاں ہندوستان کی تاریخ میں اس لیے اہمیت رکھتی ہیں کہ ان لڑائیوں نے جہاں ہندوستان میں فرانسیسیوں کی سیاسی حیثیت کو ختم کر دیا وہاں ان لڑائیوں نے انگریزوں کے لیے مشرق میں ملک گیری کے دروازے کھول دیے۔ (کمپنی کی حکومت، ص ۷۳۔۷۱)

(۱۶۲۷ء تا ۱۷۰۷ء)

مہاراشٹر کو سب سے پہلے سیواجی نے گمنامی سے نکالا۔ سیواجی کا باپ شاہ جی بھونسلہ احمد نگر کے بادشاہ نظام شاہ کے ہاں بڑے بڑے عہدوں پر فائز رہا۔ ملک عنبر کی فوج میں اسے دو ہزاری کا عہدہ حاصل تھا۔ احمد نگر کی زوال پذیر بادشاہت میں شاہ جی کے باپ مالوجی نے بہت زیادہ رسوخ حاصل کرلیا۔ بادشاہ کی طرف سے اسے راجا کا خطاب دیا گیا۔ شاہ کی طرف سے اسے بہت

بڑی جاگیر دی گئی۔ دو قلعوں کی حفاظت کے لیے بھی اسے مقرر کیا گیا۔ مالوجی کی موت کے بعد شاہ جی نے دربار احمد نگر سے تعلق قائم کیا۔ دکن کی بہت سی لڑائیوں میں شاہ جی نے احمد نگر اور بیجاپور کا ساتھ دیا۔ ان خدمات کے صلہ میں اسے میسور میں بہت بڑی جاگیر دی گئی۔ سیواجی ۱۶۲۷ء میں پیدا ہوا۔ اس کے باپ نے اس کی تعلیم کے لیے بڑے بڑے فاضل پنڈت مقرر کیے لیکن اکبر کی طرح سیواجی اپنا نام تک لکھنا نہ سیکھ سکا۔ اس کے برعکس اس نے فن حرب میں مکمل اور پوری تعلیم حاصل کی۔ سولہ سال کی عمر میں اس نے اپنے ساتھیوں سے مہاراشٹر میں آزاد حکومت قائم کرنے کے مشورے شروع کر دیے تھے۔ سیواجی نے مہاراشٹر کے تمام پہاڑی راستوں سے واقفیت حاصل کر لی۔

بیجاپور کے حکمرانوں نے مہاراشٹر کے پہاڑی قلعوں کو مضبوط کرنے کی طرف زیادہ توجہ نہیں کی تھی۔ اس زمانے میں ان قلعوں کو بالکل نظر انداز کر دیا گیا۔ سیواجی نے کسی نہ کسی طرح ان قلعوں میں سے ایک پر قبضہ کر لیا۔ یہ تورنہ کا قلعہ تھا۔ یہ قلعہ پونہ سے بیس میل مغرب میں تھا۔ سیواجی کے اس اقدام کے خلاف دربار میں شکایت کی گئی۔ لیکن سیواجی نے شکایت کرنے والوں کو خاموش کر دیا۔ سیواجی نے اس قلعہ میں مرہٹوں کا حفاظتی دستہ مقرر کرنے کے بعد اسے مضبوط کرنا شروع کیا۔ اس قلعے کی کھدائی کے دوران میں سیواجی کے قبضے میں ایک دفینہ آ گیا۔ اس دولت سے اس نے بہت سا سامان جنگ خرید لیا اور اسی دولت سے اس نے رائے گڈھ کے قلعے کو مضبوط کیا۔ شاہ جی کی جاگیر کا مالیہ چوں کہ ادا کیا جاتا تھا اس لیے اس نے اپنے بیٹے سیواجی کو کرناٹک سے لکھا کہ وہ کیوں مالیہ ادا نہیں کرتا۔ اس پر سیواجی نے اپنے باپ کو لکھا کہ اس غریب ملک کے اخراجات اتنے بڑھ گئے ہیں کہ اب آپ کو کرناٹک کی جاگیر کی آمدن پر ہی گزارہ کرنا پڑے گا۔ سیواجی نے اپنے باپ کی جاگیر کے دو قلعوں پر بھی قبضہ کر لیا۔ اب سیواجی بیجاپور کی شاہی فوجوں سے لڑ کر طالع آزمائی کرنا چاہتا تھا۔ چناں چہ اس نے فوج تیار کر لی۔ سیواجی نے ان سپاہیوں کی مدد سے ایک شاہی خزانے کو لوٹا۔ ازاں بعد اس نے مغربی گھاٹ کے پانچ قلعوں پر بڑی تیزی سے قبضہ کر لیا۔ بیجاپور کے بادشاہ کو شبہ ہوا کہ سیواجی کا اقدام شاہ جی کے اشاروں پر ہو رہا ہے۔ شاہ جی کو گرفتار کر لیا گیا۔ اپنے باپ کی رہائی کے لیے سیواجی نے شاہ جہاں سے خط و کتابت کی۔ چوں کہ سیواجی نے شہنشاہ کی رعایا پر ہاتھ نہیں اٹھایا تھا اس لیے شہنشاہ نے مداخلت کر کے اسے رہا کر دیا۔ باپ کی رہائی کے بعد سیواجی نے پھر اپنی سرگرمیوں کو شروع کر دیا۔

سیوا جی نے راجا چندر راؤ کے دربار میں قاتلوں کو قاصدوں کی صورت میں بھیجا۔ راجا سے یہ ظاہر کیا گیا کہ ''یہ قاصد تمھاری لڑکی سے میری شادی کے متعلق بات چیت کریں گے۔'' ان قاصدوں نے راجا چندر راؤ کو قتل کر دیا۔ کئی ایک دوسرے قلعوں پر قبضہ کرنے کے بعد ۱۶۵۶ء میں سیوا جی نے شام راج نیت کو پیشوا کا خطاب دے کر اپنا وزیر اعظم مقرر کیا۔ اب اس نے مغلوں کے علاقوں پر بھی چھاپے مارنے شروع کیے، لیکن مغل شہنشاہ کی پالیسی یہ تھی کہ بیجاپور کے خلاف زیادہ دباؤ ڈالا جائے۔ چناں چہ مغل شہنشاہ نے سیوا جی کو اس کے مفتوحہ علاقے کا حکمران تسلیم کر لیا۔ اب اس نے بیجاپور کے علاقے پر زیادہ شدت سے حملے شروع کر دیے۔

افضل خاں کے قتل، اس کی فوج میں تباہی، قلعوں پر قبضہ اور مرہٹہ فوج کے بیجاپور کے دروازوں تک پہنچ جانے سے سیوا جی کے علاقے پر دوطرفہ حملہ کیا گیا۔ لیکن پھر بھی بیجاپور کو کامیابی نہ ہوئی۔ آخر ۱۶۶۱ء میں بیجاپور کا بادشاہ سیوا جی سے لڑنے کے لیے خود میدان میں نکلا۔ اس مرتبہ سیوا جی کے لیے بادشاہ کا مقابلہ دشوار تھا لیکن کرناٹک کی بغاوت فرد کرنے کے لیے بادشاہ کو وہاں جانا پڑا۔ بیجاپور کے بادشاہ نے باجی گلور رائے کو اس مہم کا انچارج بنایا۔ سیوا جی کو ان تبدیلیوں کا پتا چل گیا۔ چناں چہ اس نے موقع پر باجی گلور اور اس کے افراد خاندان کو قتل کرنے کے بعد اس کا سارا ساز و سامان لوٹ لیا۔ دو سال تک سیوا جی مفتوحہ علاقے کے نظم و نسق میں مصروف رہا۔ شاہ جی کی کوششوں سے سیوا جی اور بیجاپور کے بادشاہ میں صلح ہو گئی۔ اس وقت تک سیوا جی نے جو علاقہ فتح کیا تھا وہ دو سو پچاس میل لمبا اور ایک سو پچاس میل چوڑا تھا۔

یہ صلح ان دنوں میں ہوئی جب شہنشاہ اورنگ زیب صحت کی بحالی کے لیے کشمیر جا رہا تھا۔ سیوا جی اور بیجاپور کی صلح کا نتیجہ یہ نکلا کہ سیوا جی نے مغلوں کے علاقے پر حملے شروع کر دیے۔ جونر کے قریبی قلعوں پر سیوا جی نے قبضہ کر لیا۔ مرہٹہ سپاہی اورنگ آباد کی دیواروں تک بڑھ آئے۔ اورنگزیب نے شائستہ خان کو دکن کے حالات پر قابو پانے کے لیے بھیجا۔ وہ اورنگ آباد سے اپنی فوج لے کر نکلا۔ مرہٹہ فوج اس کے حملوں کی تاب نہ لا کر پیچھے ہٹ گئی۔ شائستہ خان نے پونہ پر قبضہ کر لیا۔ لیکن سیوا جی فوجی چال سے شائستہ خان کو ہراساں کرنا چاہتا تھا۔ شائستہ خان اسی مکان میں مقیم تھا جہاں سیوا جی پیدا ہوا تھا۔ سیوا جی اور اس کے ساتھی رات کی تاریکی میں اس مکان میں داخل ہو گئے۔ شائستہ خان نے بڑی مشکل سے اپنی جان بچائی۔ اگلے دن مرہٹہ سواروں نے

مغلوں کو شکست دے کران کا تعاقب کیا۔ شائستہ خان کو شبہ ہوا کہ مغل فوج میں سیواجی کے جاسوس ہیں۔ چناں چہ اس نے جسونت سنگھ پر شک کرتے ہوئے شہنشاہ کو ایک عرضداشت بھیجی۔ یہ عرضداشت شہنشاہ کو اس وقت پہنچی جب وہ کشمیر کے لیے روانہ ہو رہا تھا۔ شہنشاہ نے دونوں جرنیلوں کو واپس بلا لیا اور اپنے بیٹے سلطان معظم کو دکن کا وائسرائے بنا کر بھیجا۔ ازاں بعد شہنشاہ نے جسونت سنگھ کو دکن کا نائب حاکم بنا کر بھیج دیا۔

تاپتی کے کنارے سورت ہندوستان کی ایک پرانی بندرگاہ ہے۔ ۱۵۳۰ء میں پرتگالیوں نے اس بندرگاہ کو لوٹا تھا۔ ۱۶۱۲ء میں جہانگیر نے انگریزوں کو سورت میں فیکٹری قائم کرنے کی اجازت دی تھی۔ سورت کی دولت کے افسانے سیواجی کے کانوں تک پہنچائے گئے۔ چنانچہ ۱۶۶۴ء میں سیواجی چار ہزار مرہٹہ سواروں کو لے کر سورت کی طرف بڑھا۔ وہ انگریزی اور ولندیزی فیکٹریوں پر قبضہ نہ کر سکا۔ تاہم اس کے سپاہیوں نے سات دن تک سورت کو خوب لوٹا۔ سورت کی دولت کو سیواجی نے اپنے قلعہ رائے گڑھ میں پہنچا دیا۔ واپسی پر اسے اپنے باپ کی موت کی اطلاع ملی۔ اب سیواجی نے اپنے لیے راجا کا لقب اختیار کیا۔ سیواجی نے ایک مضبوط بیڑہ بنا کر مغلوں کے جہازوں کو لوٹنا شروع کیا۔ اس پر اورنگ زیب نے مغل فوج کے مرزا جے سنگھ اور دلیر خان کی کمان میں سیواجی سے لڑنے کے لیے بھیجا۔ اس مرتبہ سیواجی نے مغل فوج سے لڑنے کے بجائے مرزا جے سنگھ کی معرفت مغل فوج میں شامل ہونے کی درخواست کی۔ شہنشاہ نے سیواجی کو دربار میں طلب کیا۔ سیواجی ۱۶۶۶ء میں اپنے بیٹے سنبھاجی کو لے کر دربار شاہی کی طرف روانہ ہوا۔ جب سیواجی نے شہنشاہ کی خدمت میں نذرانہ پیش کیا تو شہنشاہ نے اس کی طرف زیادہ توجہ نہ دی اور اسے ایک معمولی سا فوجی عہدہ پیش کیا۔ اس پر سیواجی دربار سے باہر چلا گیا۔ شہنشاہ کے حکم سے اسے نظر بند کر دیا گیا۔ لیکن سیواجی نظر بندی سے بھاگ نکلا۔ متھرا پہنچ کر اس کے ساتھی اس سے مل گئے۔ اب اس نے بھیس بدل کر دکن کا سفر اختیار کیا۔ سیواجی نو مہینوں کی مصیبتوں کے بعد دکن پہنچا۔

سیواجی نے اپنی سرگرمیوں کو تیز کر دیا۔ شہنشاہ نے چالیس ہزار فوج کو یہ حکم دے کر بھیجا کہ وہ سیواجی کو گرفتار کر کے لائے۔ اس فوج کا کمانڈر مہابت خان تھا۔ مرہٹوں نے بیس ہزار سپاہیوں کو ہلاک کر دیا۔ مرہٹوں نے پہلی مرتبہ باقاعدہ جنگ میں مغلوں کو شکست دی۔ اس اثنا میں افغانوں اور ست نامیوں نے بغاوت کر دی۔ افغانوں نے مغلوں کو شکست دی۔ ست نامیوں کی بغاوت کو

شہنشاہ نے فرو کر دیا۔ لیکن اس بغاوت کا اورنگ زیب کے ذہن پر کچھ ایسا اثر پڑا جسے وہ عمر بھر زائل نہ کر سکا۔ اس کی نئی پالیسی سے راجپوت بھی ناراض تھے۔ راجپوتانہ کا مغربی حصہ شہنشاہ کا مخالف ہوگیا۔ اورنگ زیب راجپوتوں سے لڑنے کے لیے خود میدان میں نکلا۔ اس نے دکن، گجرات اور بنگال سے فوجیں بلا لیں۔ شہزادہ معظم اور شہزادہ اکبر بھی اورنگ زیب کے ہمراہ تھے۔

اسی اثناء میں سیواجی نے اپنی فتوحات کو جاری رکھا۔ اس نے کئی ایک نئی بندرگاہوں اور نئے قلعوں پر قبضہ کر لیا۔ ۱۶۸۰ء میں سیواجی کی موت کے بعد اس کا بیٹا سنبھاجی اس کا جانشین ہوا۔ شہزادہ اکبر نے راجپوتوں سے مل کر اورنگزیب کے خلاف بغاوت کی تھی۔ بغاوت میں ناکام ہونے کے بعد وہ سنبھاجی کے پاس پہنچا۔ لیکن سنبھاجی نے شہزادہ اکبر کی مدد کرنے سے انکار کر دیا۔ دکن کے معاملات پر قابو پانے کے لیے اورنگزیب وہاں روانہ ہوا۔ گولکنڈہ، بیجاپور اور مرہٹوں کے خلاف لڑنے میں اس نے زندگی کے باقی ایام دکن میں صرف کر دیے۔ گولکنڈہ اور بیجاپور کو اس نے نہایت آسانی سے فتح کر لیا۔ بیجاپور اور گولکنڈہ کی فوجوں کے سپاہی سنبھاجی کی فوج میں شامل ہوگئے۔ بعض نے ٹولیاں بنا کر لوٹ مار مچانا شروع کر دی۔ مغل سپاہیوں کے ایک دستے نے سنبھاجی کو گرفتار کر لیا۔ شہنشاہ کے حکم سے اسے قتل کر دیا گیا۔ اب مہاراشٹر کے تخت پر اس کا بیٹا ساہو بیٹھا۔ راجارام اس کا اتالیق مقرر ہوا۔ لیکن بہت جلد شہزادے اور اتالیق کو جان بچا کر ستارہ بھاگنا پڑا۔ اورنگ زیب نے ستارہ پر بھی قبضہ کر لیا۔ آیندہ پانچ سال میں اورنگزیب نے مرہٹوں سے تمام اہم قلعوں کو واپس لے لیا۔ شمال میں راجپوتوں اور جاٹوں نے بغاوتیں کر رکھی تھیں۔ اورنگ زیب نے مغل فوج کے بہت بڑے حصے کو شمالی ہندوستان کی طرف روانہ کیا۔ اس فوج کی روانگی کے فوراً بعد مرہٹوں نے دکن، مالوہ اور گجرات میں لوٹ مچانی شروع کر دی۔ وہ شہروں کو لوٹتے، کھیتوں کو جلاتے، تباہ شدہ بستیوں کا دھواں مرہٹی راہ گزر کا پتا دیتا تھا۔ (کمپنی کی حکومت، ص ۶۹۔ ۱۶۵)

۱۷۰۰ء تا ۱۷۱۲ء:

انگلستان کی پارلیمنٹ نے ۱۷۰۰ء میں ہندوستانی کپڑے کی درآمد بند کر دی اور اس کے ساتھ ہی ہندوستانی کپڑے کے استعمال کو جرم قرار دیا گیا۔ یہ قانون اس وقت تک جاری رہا جب تک کہ ہندوستان کی تجارت اور صنعت تباہ نہ ہوگئی۔ جب ہندوستان برآمد کے قابل نہ رہا تو انگلستان میں ہندوستانی کپڑے کی درآمد پر سے پابندیاں ہٹالی گئیں۔ لیکن اس پر اتنا محصول لگایا

جاتا کہ اس کا فروخت ہونا ناممکن بن گیا۔

پارلیمنٹ کے اس امتناعی حکم کے بعد ایسٹ انڈیا کمپنی نے ہندوستان سے مصنوعات برآمد کرنے کی جگہ یہاں سے خام پیداوار لے جانی شروع کی اور اس نے اپنے سرمایہ کو انگلستان میں صرف کردیا۔ اس کے ساتھ ہی ایسٹ انڈیا کمپنی نے ہندوستان میں انگریزی مال کی کھپت شروع کردی۔

وہ سرمایہ جو ایسٹ انڈیا کمپنی نے ہندوستان کی تجارت سے پیدا کیا تھا، انگلستان میں صنعتی انقلاب کا سبب بنا۔ سرولیم ڈگبی کے الفاظ میں ''انگلستان کو صنعتی اقتدار صرف اس وجہ سے ہوا کہ بنگال اور کرناٹک کے خزانے استعمال کرنے کا اسے موقع مل گیا۔ ورنہ اس سے پہلے ہمارے ملک کی صنعت زوال پذیر تھی۔ لنکاشائر میں کاتنے اور بننے کا کام صفر کے برابر تھا...... ہندوستان کی دولت کا انگلستان میں آنا اور اس کا ایک صنعتی ملک بن جانا کوئی اتفاقی امر نہیں ہے، بلکہ ان دونوں میں علت اور معلول کا تعلق ہے۔'' پلاسی کی جنگ کے بعد مرشد آباد سے آٹھ لاکھ پونڈ کی رقم کلکتہ بھیجی گئی۔ چناں چہ کلکتہ میں ترقی ہونی شروع ہوئی۔ جنگ پلاسی کے بعد کپڑا بننے کی کلوں کے لیے ایجادات ہونے لگیں۔ یہاں تک کہ ۱۷۸۵ء میں انگلستان میں کپڑا بننے کی مشین مکمل ہوگئی۔ اگر ۱۷۵۰ء کے معاشی اور تجارتی انگلستان کا ۱۷۹۰ء کے انگلستان سے مقابلہ کیا جائے تو انگلستان پر جنگ پلاسی کے اثرات کا پتا چل جاتا ہے۔ (کمپنی کی حکومت، ص ۱۹۰)

۱۷۰۷ء تا ۱۷۱۲ء

میں اورنگ زیب نے احمد نگر میں وفات پائی۔ اورنگ زیب نے اگرچہ سلطان معظم کو اپنا جانشین مقرر کیا تھا۔ تاہم شہزادہ اعظم بھی تخت کا دعویدار بن کر میدان میں نکل آیا۔ آگرہ کے جنوب میں جنگ تخت نشینی کا فیصلہ سلطان معظم کے حق میں ہوا۔ اعظم اور اس کے بیٹے لڑائی میں مارے گئے۔ سلطان معظم نے اپنے مقتول بھائی کے رشتے داروں سے بہت اچھا سلوک کیا۔ سلطان معظم نے بہادر شاہ کا لقب اختیار کیا۔ چند راجپوت راجوں نے مغل شہنشاہ کے خلاف ایک محاذ قائم کیا۔ چناں چہ بہادر شاہ راجپوتانہ کی طرف روانہ ہوا۔ دوران سفر میں انسے معلوم ہوا کہ سکھوں نے سرہند پر قبضہ کرلیا ہے۔ بہادر شاہ نے سکھوں کے لیڈر بندہ کو پہاڑیوں کی طرف بھگا دیا۔ ۱۷۱۲ء میں بہادر شاہ نے لاہور میں وفات پائی۔

اپریل ۱۷۵۰ء تا ۳۰/دسمبر ۱۷۵۰ء:

اس زمانے میں جب کہ ہندوستان میں بدامنی اور لوٹ مار کا بازار گرم تھا: نظام الملک نے

دکن میں امن قائم کیا۔ وہ ۱۷۱۳ء سے آخری دم تک دکن کو خوش حال بنانے میں مصروف رہا۔ انگریزوں اور فرانسیسیوں میں تجارت کے پردے میں جو سیاسی کشمکش شروع ہو چکی تھی۔ اس میں نظام الملک نے فراست اور تدبر کا اس حد تک ثبوت دیا کہ ان دونوں قوموں کو یقین تھا کہ نظام الملک اسی کا حامی ہے۔

ناصر جنگ اور مظفر جنگ کی خانہ جنگی نے فرانسیسیوں اور انگریزوں کو جنوبی ہندوستان کی سیاست میں دخیل کر دیا۔ ناصر جنگ ایک بہت بڑی فوج سمیت قلعہ جنجی کے آس پاس ڈیرے ڈالے ہوئے تھا۔ اس کی فوج میں دس ہزار مرہٹوں کے علاوہ چھ سو انگریز بھی تھے۔ چوں کہ مظفر جنگ دو پلنے سے مدد لے رہا تھا۔ اس لیے ناصر جنگ نے انگریزوں کو اپنا ساتھی بنالیا تھا۔ مظفر جنگ بھی اپنی فوج لیے ہوئے قلعہ جنجی کی طرف بڑھا۔ مظفر جنگ کی فوج میں قریبا دو ہزار فرانسیسی افسر اور سپاہی تھے۔ جب دونوں طرف سے حملے کی تیاریاں ہو رہی تھیں تو فرانسیسی کمانڈر نے انگریزی کمانڈر کو کہلا بھیجا کہ ''اس وقت یورپ میں انگریزوں اور فرانسیسیوں میں صلح ہے۔ لیکن بدقسمتی سے ہم اپنے اپنے مفاد کے لیے دو اجنبی حکمرانوں کی امداد کی خاطر ایک دوسرے سے لڑنے کے لیے آمادہ ہیں۔ میں نہیں جانتا کہ اس میدان جنگ میں انگریزی فوج کہاں ڈیرے ڈالے ہوئے ہے اس لیے ہمیں یہ بتایا جائے تاکہ فرانسیسی گولہ انداز اور دوسرے سپاہی ادھر کا رخ نہ کریں۔ میرے خیال میں یہ مناسب نہیں ہے کہ ہندوستانیوں کے لیے یورپی خون بہایا جائے۔'' میجر لارنس کی طرف سے جواب میں کہا گیا کہ ''انگریزی توپ خانے پر انگریزی پھریرا لہراتا رہے گا۔ اگر آپ نے تھوڑی سی توجہ سے کام لیا تو آپ کو پتا چل جائے گا کہ انگریزی فوج کہاں ہے۔ میں بھی یہ نہیں چاہتا کہ فرانسیسیوں اور انگریزوں کا خون بہایا جائے۔ لیکن اگر آپ نے پہل کی تو اس کا جواب دیا جائے گا۔''

۴ را پریل ۱۷۵۰ء کو لڑائی چھڑ گئی۔ اگلے دن فرانسیسی فوج میدان سے نکل گئی۔ چندا صاحب بھی اس کے پیچھے ہولیا۔ مظفر جنگ لڑائی میں شکست کھا کر گرفتار ہوا۔ اب ناصر جنگ کی فوج نے پانڈی چری کی طرف کوچ کیا۔ ناصر جنگ کی فوج نے پانڈی چری کے فرانسیسی قلعہ کو گھیر لیا۔ فرانسیسی توپوں کی گولہ باری کی شدت نے ناصر جنگ کو مجبور کر دیا کہ وہ ارکاٹ کا رخ کرے۔ راستے میں ناصر جنگ نے دندیواش کے قلعے پر قبضہ کیا۔ ارکاٹ پہنچنے کے بعد ناصر جنگ کی فوج نے مسولی پٹم پر حملہ کر کے وہاں کی فرانسیسی فیکٹری کو لوٹ لیا۔ لیکن بہت جلد فرانسیسیوں کی ایک

فوج نے مسولی پٹم پر قبضہ کرلیا۔ فرانسیسی فوج نے محمد علی کو بھی شکست دے کر ارکاٹ کی طرف بھاگنے پر مجبور کردیا۔ اسی فوج نے جنجی کے قلعے پر قبضہ کر کے بہت بڑی جنگی کامیابی حاصل کی۔ جب ناصر جنگ کو پتا چلا کہ فرانسیسیوں نے جنجی کے قلعہ پر قبضے کرلیا ہے تو اس نے اپنی فوج سمیت جنجی کی طرف کوچ کیا۔ جنجی سے چھ میل دور دو دریاؤں کے بیچ ناصر جنگ کی فوج نے ڈیرے ڈال دیے۔ کئی دن کی لگاتار بارش سے دریاؤں میں طغیانی آ گئی۔ آنے جانے کے راستے مسدود ہوگئے۔ وبا پھوٹ نکلی، سپاہی مرنے لگے۔ اب ناصر جنگ نے اپنے ایلچی کو صلح کے لیے دوپلے کے پاس بھیجا۔ اسی اثنا میں ناصر جنگ کی مشکلات سے واقف ہوکر دوپلے نے ناصر جنگ کے کئی ایک فوجی سرداروں سے ناصر جنگ کے قتل کی سازش کر رکھی تھی۔ دوپلے ایک طرف ناصر جنگ سے صلح کی بات چیت کر رہا تھا اور دوسری طرف وہ ناصر جنگ کے قتل کے لیے ساز باز میں مصروف تھا۔ ایک مورخ کے الفاظ میں ''دوپلے کو اپنی کامیابی کا پورا یقین تھا۔ اس لیے ناصر جنگ سے صلح کرلینا یا اسے قتل کروادینا یکساں مفید تھا۔ اس لیے اس نے ان میں سے کسی ایک کو ترجیح نہیں دی۔ اس نے دونوں صورتوں کو وقت پر چھوڑ دیا۔ چناں چہ قتل کی سازش، صلح کی بات چیت پر مقدم ہوگئی۔'' جب سازش مکمل ہوگئی تو فرانسیسی فوج نے جنجی کے قلعے سے نکل کر ناصر جنگ کی فوج پر ہلا بول دیا۔ ناصر جنگ ہاتھی پر سوار ہوکر حملہ آوروں کے مقابلے کے لیے بہادری کے ساتھ لڑتا ہوا آگے بڑھ رہا تھا کہ اس کی اپنی فوج کے کسی سردار نے قتل کردیا۔ جونہی ناصر جنگ کے قتل کی خبر پھیلی اس کی فوج بھاگنے لگی۔ (۳۰ر دسمبر ۱۷۵۰ء) (کمپنی کی حکومت، ص ۸۱۔۸۰)

اگست ۱۷۵۱ء تا فروری ۱۷۵۳ء

۲۶ راگست ۱۷۵۱ء کو کلاؤ مدراس سے ارکاٹ کی مہم پر روانہ ہوا۔ اس کی فوج میں دو سو انگریزی اور تین سو دیسی سپاہی تھے۔ اس فوج کے پاس فقط تین چھوٹی توپیں تھیں۔ پانچویں دن کلاؤ نے ارکاٹ کے قلعے اور شہر پر قبضہ کرلیا۔ چندا صاحب نے اپنی فوج کے بہت بڑے حصے کو ترچناپلی سے ارکاٹ کو واپس لینے کے لیے بھیج دیا، ادھر کلاؤ نے ارکاٹ کے قلعہ کو مستحکم کرلیا تھا۔ چناں چہ چندا صاحب کی فوج ارکاٹ کے قلعہ پر قبضہ نہ کرسکی۔ کلاؤ نے نہ صرف کرناٹکی فوج کو پسپا کیا بلکہ جب مراری راؤ ایک ہزار مرہٹوں سمیت کلاؤ سے مل گیا تو کلاؤ نے ارکاٹ سے نکل کر ارنی پر جو ارکاٹ سے سترہ میل دور تھا قبضہ کرلیا۔ اب کلاؤ کنجی پورم کی طرف بڑھا اور اسے بھی فتح کیا۔ ارکاٹ کے قلعے میں تھوڑی سی فوج چھوڑنے کے بعد کلاؤ نے مدراس کی راہ لی۔

چنداصاحب کے ہاتھ سے ارکاٹ نکل چکا تھا۔ لیکن اس نے ابھی تک ترچناپلی کا محاصرہ نہیں اٹھایا تھا۔ بنگال سے کے کمک آجانے پر کلاؤ نے کاویری پاک میں فرانسیسیوں کو شکست دے کر ان کے ارادوں کو ناکام بنادیا تھا۔ ترچناپلی کی فرانسیسی فوج اور چنداصاحب کی فوج نے بھی انگریزوں کے سامنے ہتھیار ڈال دیے۔ چنداصاحب کے قتل ہوجانے کے بعد انگریزوں نے محمد علی کو کرناٹک کی گدی پر بٹھادیا۔ کلاؤ نے ان چھوٹے چھوٹے حکمرانوں کو جو محمد علی سے باغی ہوچکے تھے شکست دے کر انھیں پھر ارکاٹ کے ماتحت کردیا۔ فروری ۱۷۵۳ء میں کلاؤ چھٹی لے کر انگلستان چلا گیا۔ (کمپنی کی حکومت، ص ۸۳۔۸۲)

جنوری ۱۷۵۳ء تا ۱۷۵۶ء

اب صلابت جنگ اور مرہٹوں میں مقابلہ تھا۔ صلابت جنگ، فرانسیسی فوج سمیت بیدر کے قریب ڈیرے ڈالے ہوئے تھا۔ بالاجی راؤ کے سواروں نے نظام کی فوج کو گھیر رکھا تھا۔ بسی کی وساطت سے صلابت جنگ اور بالاجی راؤ میں صلح ہوگئی۔ تھوڑے دنوں بعد راگھوجی بھونسلا نے بھی برار کی جاگیر لے کر صلابت جنگ سے صلح کرلی۔ بالاجی راؤ اور صلابت جنگ میں صلح کرانے کے بعد بسی نے گنڈھور کا ضلع صلابت جنگ سے فرانسیسی کمپنی کو دلوادیا۔ جب یہ خبر دوپلے تک پہنچی تو اس نے کہا کہ "کمپنی کو جس قدر ملک کی ضرورت تھی وہ اسے مل چکا ہے۔"

جنوری ۱۷۵۳ء: دربار دکن میں فرانسیسیوں کے بڑھتے ہوئے اثر ورسوخ سے دربار کے بہت سے امیر ناراض ہورہے تھے۔ چناں چہ بسی نے دوپلے کو لکھا کہ حالات کے پیش نگاہ مجھے اپنی فوج سمیت مسولی پٹم پہنچ جانا چاہیے۔ اس پر دوپلے نے جنوری ۱۷۵۳ء میں بسی کو لکھا کہ "صلابت جنگ کو چھوڑ کر چلے آنا اس وقت ممکن ہے جب کہ فوجی کونسل ایسی رائے دے۔ دربار دکن میں جو امیر ہمارے خلاف ہیں انھیں کسی نہ کسی طرح سے راضی کرلینا چاہیے۔ انتہائی مشکلات سے صلابت جنگ کو نظامت دلوانے کے بعد انتہائی کامیابی حاصل کیے بغیر چلے آنا عقل وعزت دونوں کے خلاف ہے۔" بسی کو دکن میں فرانسیسیوں کے اقتدار کو بڑھانے کا ایک اور موقع مل گیا۔ فرانسیسی فوج کا سالانہ خرچ تقریباً انتیس لاکھ روپے تھا۔ اتنی بڑی رقم کا ادا کرنا صلابت جنگ کے ذرائع سے باہر ہوتا چلا جارہا تھا۔ بسی نے میکاکول، ایلور، راج مندری اور گنٹور کے اضلاع کی مال گزاری وصول کرنے کی سند اپنے نام کروالی، تاکہ وہ فرانسیسی فوج کو باقاعدہ تنخواہ دیتا رہے۔

جب بسی ان اضلاع کا انتظام کرنے کے لیے آگے بڑھا تو ان اضلاع کے حاکم جعفر علی نے

بسی سے لڑنے کی تیاری کر لی۔ جعفر علی نے انگریزوں کو اپنی مدد پر بلایا۔ لیکن وہ جعفر علی کی مدد نہ کر سکے۔ بسی ان اضلاع کا انتظام اپنے افسروں کے سپرد کر دینے کے بعد پھر دوبارہ دکن میں چلا گیا۔

اس زمانے میں چوں کہ انگلستان و فرانس میں صلح تھی اس لیے دونوں ملکوں کی حکومتوں نے ہندوستان میں انگریزوں اور فرانسیسیوں کی باہمی لڑائی کی مذمت کی۔ فرانسیسی حکومت نے ڈوپلے کو واپس بلا کر اس کی جگہ گادیو کو گورنر مقرر کیا۔ گادیو نے انگریزوں کے ساتھ صلح کر لی۔ اس معاہدے میں طے پایا تھا کہ دونوں قومیں دیسی حکمرانوں کے لڑائی جھگڑوں میں حصہ نہیں لیں گی اور یہ کہ دیسی حکمرانوں نے انگریزوں اور فرانسیسیوں کو جو خطاب دے رکھے ہیں وہ سب واپس کر دیے جائیں۔ اس معاہدے کی رو سے دونوں قوموں کے مقبوضات ان کے پاس رہے۔ شمالی سرکار میں جہاں بسی کا بہت دخل تھا ایک شہر انگریزوں کے حوالے کر دیا گیا۔ بسی دکن ہی میں رہا، جہاں اس نے فرانسیسی اثر و اقتدار کو برقرار رکھا۔ اس معاہدے نے کرناٹک کی دوسری لڑائی کو ختم کر دیا۔

جنگ ہفت سالہ کے شروع ہوتے ہی ۱۷۵۶ء میں ہندوستان میں بھی انگریزوں اور فرانسیسیوں نے آپس میں پھر لڑنا شروع کر دیا۔ یہ لڑائی کرناٹک کی تیسری لڑائی کہلاتی ہے۔ اس لڑائی کے شروع ہوتے ہی کلاؤ نے چندر نگر (بنگال) پر قبضہ کر لیا۔ فرانسیسی حکومت نے لالی کو ہندوستان کے فرانسیسی مقبوضات کا گورنر اور کمانڈر ان چیف بنا کر بھیجا تھا تاکہ انگریزوں کو ہندوستان سے نکال سکے۔ شروع شروع میں لالی کو تھوڑی سی کامیابی بھی ہوئی۔ اس نے فورٹ سینٹ ڈیوڈ پر قبضہ کر لیا۔ لیکن تنجور کا قلعہ فتح نہ کر سکا۔ اب لالی نے بسی کو دکن سے بلا بھیجا تاکہ وہ مدراس پر حملے کرے۔ دکن سے بسی کے آتے ہی وہاں فرانسیسی اثر و رسوخ ختم ہو گیا۔ اب کلاؤ نے بنگال سے کرنل فورڈ کو بھیجا تاکہ وہ شمالی سرکار سے فرانسیسیوں کو نکال کر صلابت جنگ کے دربار میں انگریزوں کے اثر و رسوخ کو بڑھائے۔ کرنل فورڈ نے شمالی سرکار سے فرانسیسیوں کو نکال دیا۔ لالی نے مدراس پر حملہ کیا۔ لیکن اسے شکست ہوئی۔ اس شکست کے بعد وہ پانڈی چری چلا گیا۔ ۱۷۶۰ء میں وندیواش میں آئر کوٹ نے اسے شکست دی۔ تھوڑی مدت بعد انگریزوں نے پانڈی چری کو فتح کر کے ہندوستان میں فرانسیسی سلطنت کے خواب کو پریشان کر دیا۔ کرناٹک کی تیسری لڑائی ختم ہو گئی۔

کرناٹک کی آخری لڑائی نے ہندوستان میں فرانسیسی کمپنی کے اقتدار کو ختم کر دیا۔ ایسٹ انڈیا کمپنی تجارتی و مالی لحاظ سے فرانسیسی کمپنی سے بہتر تھی۔ ایسٹ انڈیا کمپنی نے لڑائی کے دنوں میں بھی اپنی تجارتی سرگرمیوں کو نگاہ انداز نہیں کیا تھا۔ اس کی سیاسی کامیابی کا مقصد تجارتی مفاد ہوتا تھا۔ لیکن فرانسیسی کمپنی تجارت میں ناکام ثابت ہوئی تھی۔ اس لیے فرانسیسیوں نے ہندوستان میں اپنے مقبوضات بڑھانے پر زور دیا۔ کمپنی کے اس طرز عمل نے فرانسیسی حکومت کو بہت پریشان کر دیا۔ چوں کہ اس زمانے میں فرانس، انگریزوں کے ساتھ یورپ و امریکا میں لڑ رہا تھا۔ اس لیے فرانسیسی حکومت دوپلے کی خواہشات پر زیادہ توجہ نہیں کر سکتی تھی۔ بنگال میں ایسٹ انڈیا کمپنی کے ہاتھ جو دولت لگی تھی وہ نہ صرف انگلستان کے صنعتی انقلاب کا ایک مؤثر ذریعہ بنی بلکہ اس دولت سے انگریزوں نے ہندوستان میں فرانسیسیوں کو شکست دی۔ انگریزی کمپنی کی کامیابی کی ایک وجہ یہ بھی تھی کہ وہ انگریزی سوداگروں کی ذاتی ملکیت تھی اور وہ اپنا طرز عمل اختیار کرنے میں آزاد تھی۔ لالی کے عدم تدبر اور اس کی عجلت نے بھی فرانسیسی کمپنی کے اقتدار کو ختم کرنے میں نمایاں حصہ لیا۔

قریباً دو سال تک انگلستان میں رہنے کے بعد کلاؤ نے ایسٹ انڈیا کمپنی کے ڈائریکٹروں سے ہندوستان جانے کی اجازت لی۔ ڈائریکٹروں نے کلاؤ کو شاہی فوج میں کمیشن دلوا کر اسے لیفٹیننٹ کرنل کا عہدہ دلایا۔ اسے فورٹ سینٹ ڈیوڈ کا گورنر اور سپہ سالار مقرر کیا گیا۔ کلاؤ اپنے ساتھ تین سو سپاہی اور توپ خانہ لے کر آیا تھا۔ اسے یہ ہدایت دی گئی تھی کہ وہ مرہٹوں کو اپنے ساتھ ملا کر فرانسیسیوں کو دکن سے نکال دے، لیکن جب وہ مدراس پہنچا تو اسے معلوم ہوا کہ انگریزوں اور فرانسیسیوں میں صلح ہو چکی ہے۔

۲۰/جون ۱۷۵۶ء کو کلاؤ فورٹ سینٹ ڈیوڈ پہنچا۔ چند ہفتے بعد جب مدراس میں یہ خبر پہنچی کہ کلکتہ پر سراج الدولہ نے قبضہ کر لیا ہے تو امیر البحر واٹسن اور کلاؤ کو بنگال کی مہم پر بھیجا گیا۔ (کمپنی کی حکومت، ص ۸۶-۸۴)

۱۵/اپریل ۱۷۵۶ء: ۱۷۵۶ء میں علی وردی کا انتقال ہو گیا۔ اس کے عہد میں انگریزوں اور فرانسیسیوں کی لڑائیاں صرف دکن تک محدود رہیں۔ کلکتہ اور چندر نگر ان لڑائیوں سے بے خبر تھے۔ علی وردی کی موجودگی میں یورپی قومیں بنگال کو اپنی حکمت عملی کا شکار نہ بنا سکتی تھیں۔ لیکن اس پر بھی علی وردی یورپی قوموں کے عزائم سے بہ خوبی آگاہ تھا۔ مرنے سے بیشتر اس نے اپنے بیٹے

سراج الدولہ کو ان الفاظ میں وصیت کی:

''مغربی قوموں کی اس قوت کو ہمیشہ پیش نظر رکھنا جو انھیں ہندوستان میں حاصل ہے۔ اگر میری عمر کا پیمانہ لبریز نہ ہو چکا ہوتا تو تمھارے اس اندیشہ کو بھی ہمیشہ کے لیے ختم کر دیتا۔ اس کام کی تکمیل تیرے ذمہ ہے، میرے چراغ! دکن میں ان کی سیاسی سرگرمیوں سے سبق حاصل کرو۔ ذاتی جنگوں میں الجھ کر انھوں نے اکبر اعظم کی رعایات کے اموال واملاک پر قبضہ جمالیا ہے۔ ایک ہی وقت میں تینوں قوتوں کو تباہ کرنے کی کوشش نہ کرنا۔ سب سے پہلے انگریزوں کی قوت کو توڑنا...... سنو بیٹا! انھیں سپاہی رکھنے اور قلعہ تعمیر کرنے کی اجازت نہ دینا۔ اگر ایسا ہوا تو بنگال تمھارا نہیں۔''

قطع نظر اس سے کہ یہ الفاظ علی وردی کی زبان سے نکلے یا ہال ویل کے افسانہ طراز ذہن کا نتیجہ ہیں، ان الفاظ سے سراج الدولہ کی مشکلات کا اندازہ لگایا جا سکتا ہے۔

۱۵/ اپریل ۱۷۵۶ء کو وہ علی وردی کی وصیت پر عمل کرنے کے لیے مجبور ہو گیا۔ کمپنی کا رویہ سراج الدولہ سے بے حد معاندانہ تھا۔ ژین لا اپنی یادداشت میں لکھتا ہے:

''انگریزوں نے دربار سراج سے تمام تعلقات منقطع کر لیے تھے۔ بارہا انھوں نے سراج الدولہ کو قاسم بازار کی فیکٹری میں داخل ہونے سے روکا۔''

انگریزوں نے سراج الدولہ کی تخت نشینی کے موقع پر رسمی تحائف بھی نہیں بھیجے تھے۔ انگریز سراج الدولہ کے خلاف سازش میں شریک تھے۔ کمپنی کے ملازم تاجرانہ مراعات سے ناجائز فائدہ اٹھاتے۔ سراج الدولہ کے خزانہ پر کمپنی کی ان بداعمالیوں کا بہت برا اثر پڑا۔ انگریزوں نے کلکتہ کے قلعہ کو نواب کی اجازت کے بغیر مستحکم کرنا شروع کر دیا۔ انگریزوں نے ڈھاکہ کے دیوان راج بلب کے بیٹے کرشن داس کو اپنے ہاں پناہ دی۔ سراج الدولہ کے پیہم اصرار پر بھی انگریزوں نے اسے نواب کے حوالے کرنے سے انکار کر دیا۔ کرشن داس کو صرف اس لیے پناہ دی گئی تھی کہ اس کا باپ ڈھاکا کے دیوان ہونے کی صورت میں انگریزوں کے لیے بے حد مفید ہو سکتا تھا۔

ان اسباب نے سراج الدولہ کو مجبور کر دیا کہ وہ انگریزوں کو اپنی مملکت سے باہر نکال دے۔ ''سراج الدولہ انگریزوں پر حملہ کرے۔'' تاریخ کا یہ فتویٰ تھا۔ ایک انگریز مصنف بل ان حالات پر تبصرہ کرتے ہوئے لکھتا ہے کہ ''سراج الدولہ کا انگریزوں پر حملہ حق بجانب تھا۔'' انگریزوں کو اپنی مملکت سے باہر نکالنے کے لیے سراج الدولہ قاسم بازار کی فیکٹری پر حملہ آور ہوا۔ فیکٹری زیادہ مستحکم اور مضبوط نہ تھی۔ نواب کی فوجوں کا مقابلہ غیر ممکن تھا۔ انگریز سپاہی تعداد میں بہت کم تھے۔ فیکٹری کی تسخیر پر نواب کے سپاہیوں کا ایک بھی کارتوس ضائع نہ ہوا۔ (کمپنی کی حکومت، ص ۱۰۳-۱۰۴)

۱۶؍جون ۱۷۵۶ء:

اب سراج الدولہ نے کلکتہ کا رخ کیا۔ بنگال کے بدترین موسم میں قاسم بازار سے کلکتہ تک کا فوجی کوچ سراج کی قابلیت کا بہترین ثبوت ہے۔ سراج کی فوجوں کو آتے دیکھ کر کلکتہ کے انگریز تاجروں نے وہاں کی مقامی آبادی کا ذرہ بھر خیال نہ کیا۔ تحفظ رعایا کے فرائض کو آگ کے شعلوں سے پورا کیا گیا۔ وہاں کی مقامی آبادی کے مکانوں کو نذر آتش کر دیا گیا۔ کلکتہ کے مقامی باشندوں سے اس قسم کا سلوک کیا جا رہا تھا لیکن آرمینیوں اور پرتگیزیوں کے بیوی بچوں کو اپنے ہاں پناہ دی گئی۔

امی چند کلکتہ میں تھا۔ اس کا وجود انگریز تاجروں کے لیے بہت مفید تھا۔ لیکن انھوں نے ایک غدار پر اعتماد نہ کیا۔ انھیں خیال تھا کہ کہیں اس کی رگ وطنیت میں خون انتقام نہ ابل پڑے۔ یہ محض ان کا ''حسن ظن'' تھا۔ غداران ازلی کے وہم و گمان میں بھی ملک و ملت کی بہی خواہی کا تصور نہیں آ سکتا۔ انگریز سپاہیوں نے اس کے مکان کا محاصرہ کر لیا۔ اس نے کسی قسم کی مزاحمت کے بغیر اپنے تئیں انگریزوں کے سپرد کر دیا۔ اس کے بھائی ہزاری مل اور کرشن داس نے اپنے نوکروں کو حکم دیا کہ وہ انگریز سپاہیوں پر گولی چلائیں۔ ہزاری مل اس وقت تک انگریزوں سے لڑتا رہا جب تک اس کا بایاں ہاتھ ضائع نہیں ہو گیا۔ انگریز سپاہی امی چند کے گھر داخل ہونا چاہتے تھے۔ ان کے عزائم محتاج بیان نہیں۔ امی چند کے نوکروں کا جمعدار دیویوں کی توہین کس طرح برداشت کر سکتا تھا؟ وہ انتقام چاہتا تھا۔ انگریز سپاہیوں سے لڑتے ہوئے اسے اپنی جان کھو دینے میں کوئی دریغ نہ تھا۔ ''کیا میری موت دیویوں کی آبرو بچا سکتی ہے؟'' اس نے خیال کیا۔ ''کبھی نہیں۔'' اس نے خود ہی جواب دیا۔ موت اجنبی سپاہیوں کے لیے شہوانی حرکتوں کے دروازے کھول دے گی۔ نوکر اپنے لہو کی آگ میں جل رہا تھا۔ دیویوں کی عصمت دری کو وہ اپنی موت کے بعد بھی برداشت نہیں کر سکتا تھا۔ خادم نے اپنے آقا کے مکان کو شعلوں کی صورت میں تبدیل کر دیا۔ خنجر کے تیرہ حملوں نے اسی قدر دیویوں کو آغوش مرگ میں سلا دیا۔ کیا اسے اب زندہ رہنے کا حق تھا؟ شاید اس نے خیال کیا ہو۔ تکمیل وفا کے لیے یہی خون آلود خنجر قاتل کے اپنے سینے کی طرف بڑھتا ہے۔ (کمپنی کی حکومت، ص ۱۰۵-۱۰۶)

۱۱؍جولائی ۱۷۵۶ء

نواب ۱۶؍جون ۱۷۵۶ء کو کلکتہ پہنچا۔ تین دن بعد نواب کی فوجوں نے فورٹ ولیم پر حملہ کیا۔

نواب کے فرانسیسی اور پرتگالی توپچیوں نے انگریزی قلعے پر گولے برساتے وقت نمک حرامی کا ثبوت دیا۔ اس امر کے باوجود انگریز، نواب کی فوجوں کا مقابلہ کرنے میں ناکام رہے۔ قاسم بازار کی فتح پر نواب نے انگریزوں پر صلح کا دروازہ بند نہیں کیا تھا۔ لیکن فورٹ ولیم کے افسروں نے نواب سے صلح کی گفتگو کرنے سے انکار کر دیا۔ اب سرکشی صلح پر آمادہ تھی۔ انگریز خجالت کے سبب نواب کے سامنے نہیں جاتے تھے۔ ناچار انگریزوں نے امی چند کو ثالث کے فرائض سرانجام دینے پر مقرر کیا۔ امی چند نے اپنی گذشتہ تحقیر و تذلیل کے پیش نظر انگریزوں کی اس خواہش کو پورا کرنے سے انکار کر دیا۔ راہِ فرار اختیار کرنے کے علاوہ انگریزوں کے پاس اور کوئی ذریعہ نجات نہ تھا۔

بلیک ہول کا افسانہ:

فورٹ ولیم سراج کے قدموں پر تھا۔ نواب برطانوی خطرے کو ہمیشہ کے لیے ختم کر سکتا تھا۔ لیکن اس موقع پر بھی نواب کی فطری رحم دلی جذبۂ انتقام پر غالب آئی۔ برطانوی مورخوں نے نواب کی اس کامیابی کے ساتھ ایک حکایت کو وابستہ کر رکھا ہے۔ اس حکایت کا عنوان ''بلیک ہول'' ہے۔ اس افسانے پر پورا زورِ قلم صرف کرتے ہوئے ہل لکھتا ہے:

''مقامی سپاہیوں نے یورپی آبادی کے مال واسباب کو لوٹا۔ لیکن یورپی لوگوں سے کسی قسم کی بدسلوکی نہ کی۔ مذہبی پیشوا نماز شکرانہ ادا کر رہے تھے کہ اچانک ایک بہت بڑا تغیر رونما ہوا۔ بعض یورپی سپاہیوں نے نشہ میں بدمست ہو کر دیسی سپاہیوں کی تذلیل کی۔ ان سپاہیوں نے نواب سے شکایت کی۔ نواب کے دریافت کرنے پر کہ اس قسم کے بدسلوک سپاہیوں کو انگریز کہاں قید کرتے ہیں، اسے بتایا گیا کہ ''بلیک ہول'' ایسے لوگوں کے لیے مقرر ہے۔ چناں چہ نواب نے حکم دیا کہ انھیں رات کے وقت اس میں بند کر دیا جائے۔ نواب کے افسروں نے بدسلوک سپاہیوں اور دوسرے جنگی اسیروں میں کوئی امتیاز نہ رکھا۔ ایک سو چھیالیس انگریزوں کو رات کے وقت ایک ایسے کمرے میں بند کر دیا جس کا رقبہ اٹھارہ مربع فٹ تھا۔

ہولناک تکالیف، قطرۂ آب کے لیے تڑپ اور ملکی سپاہیوں کی دل لگی کو ہال ویل نے اس انداز میں بیان کیا ہے کہ اس سے زیادہ روح فرسا واقعہ برطانوی ہندوستان کی تاریخ میں نہیں مل سکتا۔ سات بجے شام سے چھ بجے صبح تک یہ مصیبت جاری رہی۔ ملکی افسروں میں اتنی جرات نہ تھی کہ وہ نواب کی نیند میں مخل ہو کر اسے اس واقعے سے آگاہ کرتے۔ یہ مصیبت نواب کی بیداری تک جاری رہی۔ ایک سو چھیالیس قیدی داخل ہوئے اور صرف تیئس زندہ نکلے۔''

سراج الدولہ کو بدنام کرنے کے لیے انگریزوں نے بلیک ہول کے حادثے کو اس انداز میں پیش کیا کہ پونے دو سو سال تک سراج ہندی اور غیر ہندی مورخوں کے تیروں کا نشانہ بنا رہا۔ اس

واقعے کی تغلیط کے لیے اکاشی کمار مترا نے بنگالی زبان میں ''سراج الدولہ'' کے نام سے ایک کتاب لکھی۔ ڈاکٹر بھولا ناتھ چندر ۱۸۹۵ء میں کلکتہ یونیورسٹی میگزین میں لکھتے ہیں:

''مجھے بلیک ہول کے واقعے کی صحت سے انکار ہے۔ اس واقعے کی سب سے پہلے نشر و اشاعت کرنے والا ہال ویل ہے۔ مجھے ہمیشہ یہ خیال رہا ہے کہ ۱۴۶ انسان ۱۸ مربع فٹ کمرے میں ہرگز نہیں سما سکتے، خواہ انھیں انار کے دانوں کی طرح کیوں نہ بند کیا جائے۔ چونکہ اس حادثے میں اقلیدس اور ریاضی ایک دوسرے سے متضاد ہیں اس لیے اس واقعے کا حقیقت سے کوئی تعلق نہیں۔''

بنگالی مورخ باسو اسی موضوع پر قلم اٹھاتے ہوئے ''ہندوستان میں نصرانی حکومت کا اقتدار'' میں لکھتا ہے:

''ہم عصر مورخین اس واقعے کا ذکر تک نہیں کرتے۔ سیر المتاخرین کا مصنف خاموش ہے۔ مدراس کونسل کے مباحث میں اس کا اشارہ تک نہیں پایا جاتا۔ کلاؤ اور واٹسن کے ان خطوط میں جو انھوں نے نواب کو لکھے اس واقعے کا کوئی حوالہ نہیں دیا گیا۔ علی نگر کے عہد نامہ میں اس واقعے کا کوئی تذکرہ نہیں۔ سراج الدولہ کی تخت سے معزولی کے اسباب پر بحث کرتے ہوئے جو خطوط کلاؤ نے کورٹ آف ڈائریکٹرز کو لکھے ان میں اس واقعے کا کوئی ذکر نہیں۔ انگریزوں نے میر جعفر سے جو معاہدہ کیا اس میں بلیک ہول کے حادثے میں مرنے والوں کے پسماندگان کی اعانت کا کوئی تذکرہ نہیں ملتا...... ہال ویل نے سلکٹ کمیٹی کے سامنے جو یادداشت پڑھی اس میں بھی اس واقعے کا ذکر نہیں ملتا۔''

سراج الدولہ نے کلکتہ کو علی نگر میں تبدیل کرتے ہوئے راجا مانک چندر کو حاکم اعلیٰ مقرر کیا۔ سراج اگر چاہتا تھا تو انگریزوں کا کام تمام کر دیتا۔ قلعے میں پناہ گزین انگریزوں کی طرف توجہ کرنا سراج نے اپنی توہین خیال کیا۔ اس کے خیال میں انگریز ہواؤں کے موافق ہوتے ہی مدراس چلے جائیں گے۔ سراج ۲۴ رجون ۱۷۵۶ء کو روانہ ہو کر ۱۱ رجولائی ۱۷۵۶ء کو مرشد آباد پہنچا۔ (کمپنی کی حکومت، ۷۔۱۰۵)

۱۷ اردسمبر ۱۷۵۶ء: قاسم بازار اور کلکتہ کی شکستوں نے مدراس کونسل میں ہیجان پیدا کر دیا۔ کونسل کے ارکان نے نہ صرف بنگال میں تاجرانہ مراعات واپس لینے کی سعی کی بلکہ انھوں نے فیصلہ کر لیا کہ وہ کثیر فوج سے کلکتہ فتح کرنے کے بعد نواب کے خلاف سازش کا بازار گرم کر دیں گے۔ چناں چہ یکم اکتوبر ۱۷۵۶ء میں آٹھ سو یورپی اور تیرہ سو دیسی سپاہی بنگال کی طرف روانہ ہوئے۔ بحری و بری فوجوں کے کمانڈر واٹسن اور کلاؤ تھے۔ دسمبر ۱۷۵۶ء میں انگریزی فوجیں منزل مقصود پر پہنچ گئیں۔

۱۷ ار دسمبر ۱۷۵۶ء کو واٹسن اور کلاؤ نے نواب کو نیم تحکمانہ اور نیم صلح جویانہ خطوط لکھے۔ ان میں

بلیک ہول کا ذکر تک نہیں کیا گیا۔ واٹسن اور کلاؤ نے مانک چند سے سازش کی۔ چناں چہ ڈم ڈم کے مضبوط اور مستحکم قلعے سے اس کا نصف گھنٹہ لڑنے کے بعد بھاگ جانا اس امر کا بہت بڑا ثبوت ہے۔

۲۹ ر دسمبر ۱۷۵۶ء کو انگریزوں نے ڈم ڈم کا قلعہ فتح کر لیا۔ اب مانک چند کی غیر حاضری میں کلکتہ کی فتح بہت آسان تھی۔ فاتح انگریزوں کی حیرت کی کوئی انتہا نہ رہی جب انھوں نے فورٹ ولیم میں اپنے تجارتی مال و اسباب کو بالکل اسی طرح پایا جس طرح وہ چھوڑ گئے تھے۔ مفرور باغیوں کے املاک و اسباب کی حفاظت اسی سراج کے حکم سے ہو رہی تھی۔

ہگلی میں نواب کی فوجی قوت کم دیکھتے ہوئے کلاؤ اور اس کے ساتھیوں نے ہگلی پر حملہ کر کے لوگوں کے مال و متاع پر قبضہ کر لیا۔ (کمپنی کی حکومت، ص ۱۱۰۔۱۰۹)

احمد شاہ ابدالی نے ۱۷۵۶ء میں دلی پر قبضہ کر لیا۔ جب وہ افغانستان کو واپس ہوا تو اس نے نجیب الدولہ (ایک روہیلہ سردار) کو شہنشاہ عالمگیر ثانی کا وزیر اعظم اور کمانڈران چیف مقرر کیا۔ احمد شاہ ابدالی کے واپس ہوتے ہی غازی الدین نے وزارت پر پھر سے قبضہ کرنے کے لیے مرہٹوں سے ساز باز شروع کر دی۔ چناں چہ مرہٹوں نے دلی پر قبضہ کر لیا۔ نجیب الدولہ دلی چھوڑ کر روہیل کھنڈ چلا گیا۔ (کمپنی کی حکومت)

۱۷۵۷ء

۱۱رجنوری ۱۷۵۷ء۔ ہگلی:

''آج کا دن قلعہ کے اردگرد کے مکانات لوٹنے میں صرف ہوا۔ سات دن تک انگریزی فوجیں دیسی آبادی میں لوٹ مار مچاتی رہیں۔ بعض سپاہی اس بہانہ سے ولندیزی علاقے میں داخل ہوگئے کہ نواب کی رعایا اس علاقے میں پناہ گزیں ہو رہی تھی۔''

کمپنی کی ان جارحانہ حرکات سے سراج کی آنکھوں میں خون اتر آنا یقینی تھا۔ وہ اگر اس موقعے کو بنائے مخاصمت قرار دیتے ہوئے بنگال میں ہر انگریز تاجر کی جائیداد ضبط کر لیتا تو عسکری اخلاقیات کی قطعاً خلاف ورزی نہ ہوتی۔ لیکن نواب نے ہر بار سوداگروں کی قوم سے شریفانہ سلوک روا رکھا۔ اب پھر سراج اس کوشش میں تھا کہ تمام معاملہ خوش اسلوبی سے طے پایا جائے۔ چناں چہ سراج نے مندرجہ ذیل سطور ایک مکتوب کی صورت میں امیرالبحر واٹسن کو بھیجیں:

''آپ نے ہگلی پر قبضہ کرنے کے بعد میری رعایا کے مال واسباب کو لوٹا۔ یہ ترکات سوداگروں کے لیے ٹھیک نہیں۔ میں مرشد آباد سے روانہ ہو کر ہگلی کے قریب پہنچ چکا ہوں۔ میں اپنی فوجوں سمیت دریا عبور کر رہا ہوں۔ میری فوج کا ایک مختصر حصہ آپ کے معسکر کی طرف روانہ ہو چکا ہے۔ ان امور کے باوجود اگر آپ صلح پر راضی ہیں تو بات چیت کے لیے ابھی ایک نمائندہ میرے پاس بھیج دیں۔ میں کمپنی کو سابقہ مراعات دینے کے لیے تیار ہوں۔ میرے مقبوضات میں بسنے والے انگریز اگر میرے احکام کی اطاعت کریں اور مجھے تنگ کرنے کی حکمت عملی چھوڑ دیں تو آپ یقین جانیں کہ میں ان کے نقصان کی تلافی مدنظر رکھتے ہوئے ان کی تسلی کر دوں گا۔ آپ خوب جانتے ہیں کہ سپاہیوں کو لوٹ مار سے نہیں روکا جا سکتا۔ تاہم آپ سے دوستانہ تعلقات استوار کرنے کے لیے میں ان نقصانات کی بھی تلافی کر دوں گا۔ آپ عیسائی ہوتے ہوئے خوب جانتے ہیں کہ جنگ کے شعلوں کو سرد کر دینا انھیں ہوا دینے سے بہتر ہے۔ لیکن اگر آپ جنگ کے ذریعے کمپنی اور اس کے افراد کو نقصان پہنچانا چاہتے ہوں تو میری کون سی خطا ہے؟ اس قسم کی تباہ کن جنگ کو ختم کرنے کے لیے میں اپنا مکتوب بھیج رہا ہوں۔'' (کمپنی کی حکومت، ص ۱۰۸)

۹رفروری ۱۷۵۷ء: دربار سراج الدولہ میں غدار پیدا کیے جا چکے تھے۔ ان حالات میں نواب کا انگریزوں سے عہدہ برآ ہونا مشکل تھا۔ چناں چہ نواب نے ۹رفروری کو عہد نامۂ علی نگر پر دستخط کر دیے۔ اس عہد نامے کی مندرجہ ذیل دفعات تھیں:

(۱) ان تمام مراعات کا تسلیم کرنا جو شہنشاہ دہلی نے کمپنی کو دے رکھی تھیں۔

(۲) برطانوی پروانۂ راہ داری کے ذریعے بنگال، بہار اور اڑیسہ میں کمپنی کا مال بغیر چنگی دیے داخل ہوگا۔

(۳) نواب اس نقصان کی تلافی کرے جو کمپنی کے ارکان کو نواب کے سپاہیوں کے سبب ہوا۔

(۴) انگریز حسب منشا کلکتہ کو مستحکم کر سکتے ہیں۔

(۵) انگریزوں کو اپنا سکہ جاری کرنے کا حق ہوگا۔

(۶) برطانوی قوم اور کمپنی کی طرف سے کلاؤ اور واٹسن وعدہ کرتے ہیں کہ جب تک نواب اس عہدنامے پر عمل پیرا ہوگا وہ اس کے ساتھ دوستانہ تعلقات قائم رکھیں گے۔

ابھی اس عہدنامے کی سیاہی بھی خشک نہ ہونے پائی تھی کہ کلاؤ کو نواب سے مزید مطالبات منظور کرانے کی فکر ہوئی۔ کمپنی اس فوری عہدشکنی کو کام میں نہ لا سکی۔ تاہم کمپنی نے نواب کو اس امر پر رضامند کرلیا کہ کمپنی کا ایک سفیر مرشدآباد میں رہے گا۔ کمپنی کی طرف سے واٹسن سفیر مقرر ہوا۔ کمپنی کا یہ سفیر دربار مرشدآباد میں کامیاب سازش پیدا کرنے کے لیے امی چند کو اپنے ساتھ لے گیا۔ اب سراج کا تخت اس کے لیے کانٹوں کا بچھونا تھا۔ واٹسن ہی نے فورٹ ولیم میں یہ پیام بھیجا تھا کہ چندرنگر کی فرانسیسی بستی پر حملہ کیا جائے۔ کمپنی کے ارکان نے نواب سے اس حملے کی اجازت چاہی، نواب نے جواب میں کہا کہ انگریزوں کا چندرنگر پر حملہ معاہدے کی صریحاً خلاف ورزی ہے کیوں کہ چندرنگر اس کی مملکت کا ایک حصہ ہے۔ لیکن انگریز چندرنگر پر حملہ کرنے کا فیصلہ کر چکے تھے۔ اس لیے انھوں نے چندرنگر پر حملہ کرکے بنگال پر فرانسیسی اقتدار کا ہمیشہ کے لیے خاتمہ کردیا۔ انگریزوں کے اس حملے کی روک تھام کے لیے نواب نے نندکمار کو حکم دیا کہ وہ انگریزوں کو ہگلی سے آگے نہ بڑھنے دے، لیکن رشوت نے نندکمار کو مزاحمت میں اس قدر نرم کردیا کہ انگریزوں کا اپنے ارادوں میں کامیاب ہونا بہت آسان ہوگیا۔

کمپنی کا سفیر امی چند کی مدد سے نواب کے لیے مصیبتوں کا پہاڑ تیار کر رہا تھا۔ چناں چہ چند دنوں میں کمپنی نے لطف خان، میر جعفر، مانک چند، راج بلب، اور درلاب ایسے سازشی پیدا کرلیے۔ ان حالات میں سراج کا زندہ رہنا بہت مشکل ہوگیا۔ (کمپنی کی حکومت، ص ۱۳-۱۱۲)

سراج الدولہ کے دربار کے سب سازشیوں نے اسے انگریزوں سے لڑنے کا مشورہ دیا۔ سراج الدولہ کو اپنے امیروں اور اپنے فوجی سرداروں کی سازشوں کا پتا چل چکا تھا۔ اسے ان پر

اعتماد نہیں تھا۔ سراج الدولہ نے فرانسیسی جنرل بسی کو مدد کے لیے پکارا۔ لیکن بے سود۔ اس نے مرہٹوں کی طرف ہاتھ بڑھایا لیکن ادھر سے کوئی جواب نہ آیا۔ اس نے دلی کو صورت حال سے آگاہ کیا۔ لیکن وہاں کیا دھرا تھا۔ اودھ نے بھی سراج الدولہ کی درخواست کو ٹھکرا دیا۔ اسی اثنا میں اسے معلوم ہوا کہ امیر البحر واٹسن اور میر جعفر میں ایک ملاقات بھی ہو چکی ہے۔ بیرونی امداد سے مایوس ہونے پر اس نے اپنے سرداروں کو بنگال کی نازک سیاسی حالت، اور ان کے فرض سے آگاہ کیا۔ میر جعفر اور دوسرے سازشی سرداروں نے سراج الدولہ سے وفادار رہنے کی قسم کھائی۔ اب سراج الدولہ نے اپنی فوج کو پلاسی کے میدان کی طرف کوچ کرنے کا حکم دیا۔

۴؍فروری ۱۷۵۷ء: نواب ۴؍فروری ۱۷۵۷ء کو کلکتہ پہنچا۔ اب کلاؤ نے کمپنی کی طرف سے نواب کے خیمے میں دو نمائندے بھیجے جو بظاہر صلح کی بات چیت کے لیے بھیجے گئے تھے۔ لیکن ان کا مقصد نواب کے خیمے کی فوجی قوت کا اندازہ لگانا تھا۔ رات کے وقت یہ جاسوس اپنے خیموں میں واپس چلے گئے۔ خیموں میں داخل ہوتے ہی انھوں نے چراغ گل کر دیے تاکہ نواب کے پہرہ دار یہ خیال کریں کہ نمائندے محو خواب ہیں۔ تاریکی شب میں یہی نمائندے واپس جا کر کلاؤ کو کل حالات سے آگاہ کرتے رہے۔ فقط ان دو نمایندوں کے طرز عمل سے ساری کمپنی کی سیاسی خواہش کا اندازہ لگایا جا سکتا ہے۔ ایم ژین لا اپنی یادداشت میں لکھتا ہے:

''اگلے روز یعنی ۵؍فروری کو چار بجے صبح گہرے دھند لکے میں کمپنی کی فوج نے کلاؤ کے زیر قیادت ٹھیک اسی خیمے پر حملہ کیا جہاں کمپنی کے دو نمایندوں نے سراج کو اسی رات دیکھا تھا۔ اچھا ہوا کہ سراج اس خیمے میں نہ تھا۔ نواب کے دیوان نے اسے دوسری جگہ رات بسر کرنے کا مشورہ دیا۔ انگریز سپاہیوں نے سراج کے ایک سو اٹھاون سپاہی قتل کیے۔ سراج خوفزدہ ہو کر بھاگ نکلا۔ کلکتہ سے سولہ میل ادھر جا کر اس نے سانس لیا۔ سراج کے سپاہیوں اور ایک ایرانی رسالہ نے جم کر انگریزوں کا مقابلہ کیا۔ روشنی نمودار ہونے کو تھی اس لیے کلاؤ واپس چلا گیا۔ اس لڑائی میں انگریزی فوج کے دو سو سپاہی کام آئے۔'' (کمپنی کی حکومت، ص ۱۱۲۔۱۱۱)

۲۱؍جون ۱۷۵۷ء: ۲۱؍جون ۱۷۵۷ء کو سراج الدولہ کی فوج پلاسی کے میدان میں پہنچ چکی تھی۔ ادھر کلاؤ بھی اپنی فوج لیے ہوئے پلاسی پہنچ گیا۔

۲۳؍جون ۱۷۵۷ء: نواب کی فوج کا نہایت کارآمد دستہ وہ تھا جس میں چالیس پچاس فرانسیسی، سین فریس کی قیادت میں تھے۔ ان کے پاس چار ہلکی توپیں تھیں۔ ۲۳؍جون کی صبح کو سراج الدولہ اپنی فوج کو خندقوں سے نکال کر کلاؤ کے پڑاؤ کی طرف بڑھا۔ اکثر دستے پوری ترتیب سے بڑھ رہے تھے۔ سین فریس سب سے آگے تھا۔ اس نے کلاؤ کے باغ کے قریب

بڑے تالاب پر قیام کیا۔ اس کے دائیں طرف دریا کے قریب چند بھاری توپیں ایک دیسی افسر کی قیادت میں تھیں۔ ان دونوں کے پیچھے اتنے فاصلے پر کہ ضرورت کے وقت وہ ان کی مدد کر سکیں نواب کے سپہ سالار میر میدان کی قیادت میں پانچ ہزار سوار اور سات ہزار پیدل سپاہی تھے۔ نواب کی باقی فوج ایک کمان کی شکل میں ترتیب دی گئی تھی۔ جس کا ایک سرا پڑاؤ کے قریب کے ٹیلے پر تھا اور وہاں سے گھوم کر دوسرا سرا باغ کے جنوب مشرقی کنارے تک جاتا تھا۔ دونوں سروں کے درمیان بہت سی پیدل اور سوار فوج تھی۔ میر جعفر کی فوج انگریزی فوج کے قریب تھی۔ اس کے بعد لطف خاں اور راجا درلاب کی فوجیں تھیں۔ نواب کی فوجوں کی اس ترتیب سے باغ میں مقیم انگریزی فوج ایک طرف نواب کی فوج سے اور دوسری طرف دریا سے گھری ہوئی تھی۔ لیکن میر جعفر کی موعودہ غداری کے پیش نظر سب سے بڑا خطرہ سین فریس کے دستے اور میر میدان کی فوج سے رہ جاتا تھا۔ کلاؤ نے شکارگاہ (نواب سراج الدولہ کی بنائی ہوئی جو اس باغ کے قریب ہی تھی جہاں انگریزی فوج نے ڈیرے ڈالے ہوئے تھے) کی چھت سے نواب کی فوج کی ترتیب کو دیکھ کر یہ اندازہ کیا کہ اگر نواب کے فوجی سرداروں نے تھوڑی سی وفاداری سے بھی کام لیا تو وہ بڑی آسانی سے انگریزی فوج کو روک سکیں گے۔ اسی اثنا میں سین فریس نے گولہ باری شروع کر دی۔ لیکن ان کی گولیاں اونچی گئیں اور بہت کم نقصان پہنچا سکیں۔ کلاؤ نے ایک دستے کو شکارگاہ میں اور دوسرے کو اینٹوں کے ٹیلے کے قریب چھوڑا۔ باقی فوج سمیت وہ باغ کے اندر چلا گیا۔ کلاؤ کی اس پسپائی سے حملہ آور کے دل بڑھ گئے۔ وہ اپنی توپوں کو اور آگے لے آئے ان کی آگ پہلے سے زیادہ تیز ہو گئی۔ انگریزی فوج کے لیے یہ آتش بازی بھی زیادہ نقصان پہنچانے والی ثابت نہ ہوئی۔ کیوں کہ انگریزی فوجیں درختوں اور پشتے کی آڑ میں تھیں۔ گیارہ بجے کے قریب باقاعدہ لڑائی شروع ہوئی۔ نواب کے نقصانات انگریزوں سے زیادہ رہے۔ کلاؤ نے اپنے خاص افسروں کو مشورے کے لیے بلایا اور طے کیا کہ آدھی رات تک اسی جگہ پر قیام کیا جائے اور اس کے بعد نواب کے پڑاؤ پر چھاپا مارا جائے۔ کلاؤ کی مجلس مشاورت کے برخاست ہوتے ہی موسلا دھار پانی پڑنے لگا۔ آدھا گھنٹہ بارش ہوتی رہی۔ نواب کی فوجوں کی آتش بازی بھی کم ہوتی چلی گئی۔ یہاں تک کہ نواب کی توپیں خاموش ہو گئیں۔ نواب کے افسروں نے بارود کو کھلا چھوڑ دیا تھا۔ بارش نے اسے بے کار کر دیا۔ جب نواب کی سوار فوج نے یہ خیال کر کے حملہ کیا کہ بارش نے انگریزوں کی بارود کو بھی خراب کر دیا ہوگا تو ان کا سختی سے مقابلہ کیا گیا۔ انگریزی توپوں کی گولہ باری نے

انھیں پیچھے ہٹ جانے پر مجبور کر دیا۔ میر میدان بھی اسی معرکے میں کام آیا۔ اس وفادار اور بہادر سپاہی کی موت نے نواب کے حوصلے پست کر دیے۔ اب اس نے میر جعفر کو بلایا اور اس سے امداد کے لیے کہا۔ میر جعفر نے نواب کی مدد کرنے کا دوبارہ وعدہ کیا۔ لیکن وعدہ پورا کرنے کی جگہ اس نے کلاؤ کو تمام حالات سے آگاہ کر دیا اور آگے بڑھنے کے لیے کہا۔ اس نوجوان نواب سے جس کے گرد غدار جمع تھے اور جس کا وفادار جنرل میدان جنگ میں کام آ چکا تھا ہمدردی کیے بغیر رہنا غیر ممکن ہے۔ میر جعفر کے بعد راجا درلاب اس کے ہاں پہنچا۔ انگریزی فوج آگے بڑھ رہی تھی اور راجا درلاب کے سپاہی پیچھے ہٹ رہے تھے۔ نواب بہت زیادہ پریشان تھا۔ راجا درلاب نے نواب کو اور ڈرایا۔ اس نے نواب سے کہا کہ لڑائی میں شکست ہو چکی ہے اس لیے مرشد آباد چلنا ہی بہتر ہے۔ نواب نے مصیبت کے وقت اپنی جان بچانے اور اپنے خاندان کا وجود قائم رکھنے کے لیے غدار کی بات مان لی۔ اپنی فوجوں کو خندقوں میں واپس ہونے کا حکم دے کر ایک تیز رفتار اونٹنی پر سوار ہوا اور اپنے ساتھ دو ہزار سواروں کو لے کر راجدھانی کی طرف چل دیا۔ نواب کی فوج خندقوں میں واپس ہونے لگی۔ صرف فرانسیسیوں کا دستہ میدان میں باقی تھا۔ لیکن جب اس نے انگریزوں کی ہمت اور اپنی بے کسی پر غور کیا تو اس نے بھی خندقوں کے قریب کے موڑ پر پہنچ کر اپنی توپیں وہیں جما دیں۔ جب انگریزوں کی فوج آگے بڑھ رہی تھی تو میر جعفر کی فوج نواب کے پیچھے ہٹنے والی فوج کے پیچھے آتی ہوئی دکھائی دی۔ اس کے بعد یہ دیکھا گیا کہ باغ کی شمالی حد تک بڑھنے کے بعد وہ بائیں ہاتھ کو مڑی اور اسی سمت آگے بڑھنے لگی۔ انگریزوں نے پہلے یہ خیال کیا کہ یہ فوج ان کے مال و اسباب پر ٹوٹ پڑنے والی ہے۔ لہٰذا ایک دستے کو ایک توپ دے کر اسے روکنے کے لیے بھیج دیا گیا۔ یہ فوج پھر رک گئی اور آہستہ آہستہ دوسری فوجوں سے دور ہٹنے لگی اور ایک دوسری سمت میں آ گئی۔ کلاؤ کو یقین ہو گیا کہ یہ فوج میر جعفر کی ہے۔ اب اس نے نواب کی فوج پر ہلا بول دیا۔ سین فریس نے انگریزوں کا ڈٹ کر مقابلہ کیا۔ لیکن جب نواب کی ساری فوج بھاگ نکلی تو اسے بھی اپنی توپیں چھوڑ کر بھاگنا پڑا۔ جب یہ فوج اپنے سرداروں کی غداری کے سبب بھاگ رہی تھی تو میر جعفر نے اپنے قاصد کے ذریعہ کلاؤ سے ملاقات کی درخواست کی۔ اس نے جواب مین کہا کہ کل صبح داؤد پور میں ملاقات ہوگی۔ یہ مقام مرشد آباد سے بیس میل جنوب میں ہے۔ آئر کوٹ کی کمان میں ایک دستے نے بھاگتی ہوئی فوج کا پیچھا کیا۔ اگلے دن انگریزی فوجیں داؤد پور میں پہنچ گئیں۔ (کمپنی کی حکومت، ص ۱۱۴-۱۱۷)

۲۴ / جون ۱۷۵۷ء: ۲۴ / جون ۱۷۵۷ء کو کلاؤ اور میر جعفر میں ملاقات ہوئی۔ یہ ملاقات اس معاہدے کی تعمیل کے لیے کی گئی جو پلاسی کی لڑائی سے پہلے کلاؤ اور میر جعفر میں طے پا چکا تھا۔ میر جعفر نے وعدہ کیا تھا کہ اگر کلاؤ نے اسے مرشد آباد کی گدی پر بٹھا دیا تو وہ جنگی اخراجات کے علاوہ انگریزوں کو ایک کروڑ چھہتر لاکھ روپیہ دے گا۔ اس ملاقات میں کلاؤ نے میر جعفر کو مشورہ دیا کہ وہ فوراً مرشد آباد پہنچ کر خزانے پر قبضہ کرے۔ میر جعفر اپنی فوج سمیت شام کو مرشد آباد پہنچ گیا۔

سراج الدولہ پلاسی سے بھاگ کر اسی شام مرشد آباد پہنچ گیا تھا۔ دوسرے دن جب اسے اپنی فوج کی تباہی کی خبر ملی تو وہ اپنی بیوی سمیت مرشد آباد سے بھاگ نکلا۔ راج محل پہنچ کر اس نے ایک ویران باغ میں رات گزارنی چاہی۔ لیکن چند لوگوں نے اسے پہچان لیا۔ اسے میر جعفر کے حوالے کر دیا گیا۔ میر جعفر نے اسے قید کر دیا۔ رات کو میر جعفر کے بیٹے میرن نے اسے قتل کر دیا۔ (کمپنی کی حکومت، ص ۱۱۷)

۲۹ / جولائی ۱۷۵۷ء: داؤد پور میں چند دن ٹھہرنے کے بعد کلاؤ مادھو پور پہنچا۔ چند دن کے قیام کے بعد ۲۹ / جولائی ۱۷۵۷ء کو کلاؤ مرشد آباد میں داخل ہوا۔ میر جعفر کے بیٹے میرن نے اس کا استقبال کیا۔ جب وہ نواب کے محل میں داخل ہوا تو میر جعفر اس کے استقبال کے لیے موجود تھا۔ کلاؤ آداب بجالایا اور میر جعفر کو گدی تک لے گیا۔ میر جعفر نے گدی پر بیٹھنے میں پس و پیش کیا۔ لیکن اس نے گدی پر بٹھلاتے ہوئے نواب کو سو اشرفیوں کی نذر پیش کی اور ایک ترجمان کے ذریعے نواب کے امیروں سے خطاب کرتے ہوئے انہیں نئے نواب کا وفادار رہنے کے لیے کہا۔

جب میر جعفر نے مرشد آباد کے خزانے پر قبضہ کیا تو اسے معلوم ہوا کہ خزانے میں جو روپیہ ہے وہ اس معاہدے کی شرطوں کو پورا نہیں کر سکتا جو اس نے کلاؤ سے کر رکھا ہے۔ چناں چہ کلاؤ کے نمایندوں نے میر جعفر کے ساتھ یہ طے کیا کہ کل رقم میں سے آدھی ادا کر دی جائے اور باقی آدھی تین برابر سالانہ اقساط میں دی جائے۔ امی چند کو ایک پیسہ بھی نہ دیا گیا۔ مال غنیمت کی اس تقسیم میں صرف امی چند ہی کو محروم نہیں رکھا گیا بلکہ اس تقسیم میں بدمزگی کے بہت سے واقعات پیدا ہوئے۔

میر جعفر کا خزانہ خالی ہو چکا تھا۔ لیکن اس پر بھی اسے ان اقساط کی ادائیگی کی فکر تھی، جو اس کے ذمے باقی تھی۔ خزانے کو پُر کرنے کے لیے اس نے اپنی رعایا کو لوٹنا چاہا۔ رعایا میں بے چینی اور جاگیرداروں میں بغاوت پیدا ہو رہی تھی۔ میر جعفر نے جاگیرداروں کی بغاوت دبانے کے لیے

کلاؤ کو کلکتہ بلا بھیجا۔

۱۷ نومبر ۱۷۵۷ء کو کلاؤ چار سو انگریز اور تین سو دیسی سپاہیوں کو لے کر مرشد آباد کی طرف چل دیا۔ اسی اثنا میں بہار میں بغاوت نے زور پکڑ لیا تھا۔ اب کلاؤ نے میر جعفر سے یہ مطالبہ کیا کہ جب تک باقی رقم ادا نہیں کر دی جاتی اس وقت تک اس کا ایک سپاہی بھی باغی سرداروں کے خلاف لڑنے کے لیے ایک قدم نہیں اٹھائے گا۔ چناں چہ قرار پایا کہ کلاؤ کو مرشد آباد کے خزانے سے ساڑھے بارہ لاکھ روپیہ دیا جائے۔ بردوان، کشن گڑھ اور ہگلی کی مال گزاری سے ساڑھے دس لاکھ اور اپریل ۱۷۵۸ء تک ان ہی اضلاع کی مال گزاری میں سے انیس لاکھ روپیہ انگریزوں کو دیا جائے۔ اسی سلسلے میں کلکتہ کے جنوبی علاقے کو ایسٹ انڈیا کمپنی کے حوالے کر دیا گیا۔ اب میر جعفر اور کلاؤ پٹنہ پہنچے۔ میر جعفر کی کمزوری سے فائدہ اٹھاتے ہوئے کلاؤ نے بہار کے شورے کی تجارت کا اجارہ ایسٹ انڈیا کمپنی کو دلوا دیا۔ (کمپنی کی حکومت، ص ۱۹۔۱۱۸)

۱۷۵۷ء تا ۱۷۶۶ء

ملک کی اقتصادی حالت:

بنگال میں ایسٹ انڈیا کمپنی کی بدعنوانیوں کو ختم کرنے کے لیے کلاؤ عازم ہند ہوا۔ کلاؤ کے بلند بانگ دعوے کی کوئی حیثیت نہ تھی۔ اس نے اصلاحات کے پردے میں اپنی دولت میں نمایاں اضافہ کیا۔ اس کا اصلاحی شور و غوغا خاموش اقتصادی تباہی کی حکمت عملی کو مستحکم کر گیا۔ کلاؤ کی اصلاحات نے بنگال کے لوگوں کو مزید تباہی کا شکار بنا دیا۔ اس کی کتاب اصلاحات کا کوئی باب اٹھاؤ اس میں بنگال کی تباہی و بربادی کے سوا اور کچھ نہیں دکھائی دیتا۔ اس کی اصلاحات کلاؤ اور اس کے ہم وطن انگریزوں کو مالا مال کر گئیں۔

اندرون ملک میں تاجرانہ رہزنی بدستور رہی۔ حالات مزید خراب کرنے کے لیے کلاؤ نے نمک کی اجارہ داری کمپنی کے ملازموں کے سپرد کر دی۔ جنھوں نے اس پر زیادہ محاصل لگا کر اپنی جیبوں کا وزن بڑھا لیا۔

ایسٹ انڈیا کمپنی نے ایک فرمان کے ذریعے درآمد و برآمد کے محاصل سے آزادی حاصل کر لی تھی۔ حالاں کہ وطنی تجارت پر محاصل کی قیود بدستور عائد تھیں۔ یورپ سے جو مال کمپنی حاصل کرتی رہی اس پر اسے درآمد کے محاصل ادا نہیں کرنے پڑتے تھے۔ اسی طرح کمپنی کا مال بغیر

محاصل کے یورپ کی منڈیوں میں پہنچ جاتا۔ کمپنی کے صدر یا افسر کا پروانہ چنگی خانوں میں دکھانا کافی ہوتا۔ چنگی خانوں کے افسر اس پروانے کو دیکھ کر محاصل کا مطالبہ نہیں کر سکتے تھے۔

جنگ پلاسی کے بعد کمپنی کے کارکنوں نے اس رعایت سے انفرادی فائدہ اٹھانا شروع کیا۔ کمپنی کا ہر ملازم کمپنی کا تنخواہ دار ہونے کے علاوہ بنگال میں آزاد تاجر کی حیثیت رکھنے لگا۔ کمپنی کے آزاد تاجروں کی ان حرکتوں نے بنگال کو اقتصادی طور پر بالکل تباہ کر دیا۔ بنگال کے نوابوں نے کمپنی کے آزاد حقوق تاجرانہ تسلیم کیے ہوئے تھے، لیکن کمپنی کے ملازموں نے بھی اس رعایت سے ناجائز فائدہ اٹھانا شروع کیا۔ پلاسی کی جنگ کے بعد کلاؤ نے ۱۷۵۷ء میں میر جعفر کو بنگال کا نواب بنایا۔ اکتوبر ۱۷۶۰ء میں میر قاسم کو مسند بنگال پر بٹھایا گیا۔ نئے نواب نے کمپنی کو تین اضلاع کا مالیہ وصول کرنے کا حق دینے کے علاوہ اس رقم کے ادا کرنے کا بھی وعدہ کیا جو میر جعفر کے ذمہ تھی۔ میر قاسم نے کمپنی کو جنوبی ہند کی جنگوں کے لیے پانچ لاکھ روپیہ دیا۔ میر قاسم نے دو سال کی قلیل مدت میں کمپنی کا روپیہ تو ادا کر دیا۔ لیکن بنگال کی تجارت روز بروز تباہ ہوتی گئی۔ کمپنی کے ملازم آزاد تاجر تھے اور بنگال کے دیسی تاجروں کو بہت زیادہ ٹیکس ادا کرنے پڑتے تھے۔

نواب کا خزانہ خالی ہو رہا تھا۔ دیسی تاجر تباہ حال تھے۔ ۱۷۶۰ء میں وین اسٹارٹ، کلاؤ کا جانشین مقرر ہوا۔ وہ کمپنی کے ملازموں کی بدعنوانیوں کو ان الفاظ میں بیان کرتا ہے:

''جہاں تک تجارت کا تعلق ہے میر جعفر سے کسی جدید رعایت کا مطالبہ نہیں کیا گیا تھا اور حقیقت یہ ہے کہ کمپنی کو مزید مراعات کی ضرورت بھی نہ تھی...... تاہم جب ہمارا سیاسی اثر رونما ہوا تو اس وقت کمپنی کے ملازموں نے ان اشیا کی تجارت شروع کر دی جن کی انھیں اجازت نہ تھی۔''

ورلسٹ بھی وین اسٹارٹ کی نگاہوں سے ان واقعات کا مشاہدہ کرنے کے بعد لکھتا ہے:

''آزاد تجارت کو بروے کار لاتے وقت ان گنت مظالم کیے گئے۔ برطانوی گماشتوں نے نہ صرف رعایا کو تنگ کیا بلکہ حکومت کے اقتدار کو بھی صدمہ پہنچایا۔ نواب کے افسروں کو سزائیں دی گئیں۔ میر قاسم سے جنگ کا یہ اولین سبب تھا۔''

ان اقتباسات سے بنگال کی تباہی کا اندازہ لگایا جا سکتا ہے۔ سیر المتاخرین کا مصنف بنگالی رعایا کی تباہی کا تذکرہ ان الفاظ میں کرتا ہے:

''انگریز اپنی رعایا کے لیے کسی قسم کا التفات روا نہیں رکھتے۔ انھیں رعایا سے کسی قسم کی ہمدردی نہیں، وہ لوگ جو انگریزی حکومت کی رعایا میں ہر جگہ تباہ ہو رہے ہیں۔ انھیں بے حد مفلس

بنایا گیا ہے۔''

یہی مصنف اپنا بیان جاری رکھتے ہوئے لکھتا ہے:

''اے خدا! اپنے مظلوم اور تباہ حال بندوں پر رحم فرما۔ اے خدا! انھیں اس مصیبت سے نجات دلا، جس میں وہ گرفتار ہیں۔''

میر قاسم اپنی مجبوریوں کے باوجود بنگال کی تباہی سے متاثر ہو رہا تھا۔ اس نے دیکھ لیا کہ انگریزی تاجران مراعات سے دیسی تاجروں کو تباہ و برباد کرنے کے علاوہ دیسی صنعت بھی ختم کرنے کی فکر میں ہیں۔ میر قاسم کی رگ وطنیت میں خون دوڑنے لگا۔ اس نے دیسی تاجروں کو انگریزی تاجروں کی سطح پر لانے کے لیے دیسی تاجروں کو بھی محاصل سے آزاد کر دیا۔ نواب کے اس عادلانہ فعل کو انگریزوں نے عہد شکنی سے تعبیر کیا ہے۔

کمپنی نے ہر نواب کی مسند نشینی کو اپنے لیے حصول زر کا ذریعہ بنایا۔ ایک نواب کے خزانے پر ہاتھ صاف کرنے کے بعد اسے مسند سے اس لیے علیحدہ کیا جاتا تھا کیوں کہ اس کے دامن زر سے مزید قطرات نہیں نچوڑے جا سکتے تھے۔ نیا نواب ان کے لیے از سر نو زر و دولت کے دروازے کھول دیتا۔ جب ۱۷۵۷ء میں جنگ پلاسی کے بعد میر جعفر کو بنگال کا نواب بنایا گیا تو اس وقت برطانوی افسرن نے ۵۷۵ و ۲۳۸، اپونڈ کی رقم وصول کی۔ اس نذرانے میں سے لارڈ کلاؤ نے ۳۱۵۰۰ پونڈ وصول کرنے کے علاوہ بنگال میں ایک جاگیر بھی حاصل کی۔ جب ۱۷۶۰ء میں میر قاسم کو بنگال کی مسند پر بٹھایا گیا تو برطانوی افسروں نے نذر کے طور ۲۰۰۲۶۹ پونڈ نواب سے وصول کیے۔ اس رقم میں سے ۵۸۳۳۳ پونڈ وین اسٹارٹ کو ملے۔ جب ۱۷۶۳ء میں میر جعفر کو از سر نو نواب بنایا گیا تو اسے ۵۰۰۱۶۵ پونڈ کمپنی کی نذر کرنے پڑے۔ نجم الدولہ نے شکرانہ کے طور پر جو رقم پیش کی وہ ۲۳۰۳۵۶ پونڈ کی تھی۔ گویا نو سال کی قلیل مدت میں کمپنی کے افسروں نے بنگال کے نوابوں سے ۲۱،۶۹،۶۶۵ پونڈ وصول کیے۔ اسی اثنا میں دیگر ذرائع سے جو رقم نوابوں سے وصول کی گئی وہ ۲،۲۷،۰۷،۸۳۳ پونڈ کی تھی۔ ۱۷۷۲ء میں دار العوام کی کمیٹی کے سامنے ان رقوم کا وصول کیا جانا تسلیم ہو چکا ہے۔

ایسٹ انڈیا کمپنی کے لندنی کار پردازوں کو اس ''تحفہ بازی'' کی سمجھ نہ آئی۔ چناں چہ انھوں نے ۱۷۶۵ء میں قبول تحائف کے خلاف احکام بھیجے اور ساتھ ہی کلاؤ کو لندن سے کمپنی کے امور کی اصلاح کے لیے روانہ کیا۔ کمپنی کے ارکان نے ایک لمحہ بھی ضائع نہ کیا۔ کلکتہ کونسل نے نجم الدولہ کو

مسند نشین کرتے ہوئے جنس تحائف کی فصل کو آخری مرتبہ کاٹ لیا۔

برطانوی ہند کی اقتصادی تاریخ کا مصنف رومیش دت بنگال کی اقتصادی تباہی کے اسباب و علل پر بحث کرتے ہوئے لکھتا ہے:

''تین کروڑ انسانوں سے وصول کردہ محاصل، اخراجات کے بعد اس ملک کی بہتری کے لیے صرف نہیں کیے جاتے تھے بلکہ کمپنی کے نفع کی صورت میں انگلستان بھیج دیے جاتے۔ کمپنی کے برطانوی حصہ داروں میں ہر سال ایک کروڑ پچاس لاکھ پونڈ تقسیم کیے جاتے۔ ایک غریب قوم کے مالیہ سے دنیا کی امیرترین قوم کو ہر سال مزید دولت مند بنایا جاتا رہا۔ چناں چہ ہم دیکھتے ہیں کہ برطانوی حکمرانوں کی اس تجویز کے ذریعے ہندوستان کو اقتصادی طور پر تباہ کیا گیا۔ آج بھی اسی اسکیم کی رو سے کروڑوں روپیہ ہندوستان سے انگلستان پہنچ جاتا ہے... انگلستان اور ہندوستان کے اقتصادی تعلقات ابتدا ہی سے ناروا تھے۔ ہندوستان اپنی زرخیز زمین، اپنے وسیع ذرائع اور اپنی صنعتی آبادی کے باوجود برطانوی راج کے ایک صد و نیم صد سالہ عہد کے بعد دنیا کا مفلس ترین ملک ہے۔''

بنگال کی تجارت وصنعت کی تباہی کی متوازی زرعی بربادی کارفرما تھی۔ کمپنی کے ملازموں نے بردوان اور مدناپور کے اضلاع میں نیا بندوبست رائج کر کے وہاں کی زرعی آبادی میں بداطمینانی کے بیج بو دیے۔ کمپنی کے روز افزوں اخراجات پورے کرنے کے لیے بڑی سختی سے مالیہ وصول کیا جاتا۔

برطانوی پارچہ باف بنگالی پارچہ بافوں سے حسد کرنے لگے تھے۔ وہ چاہتے تھے کہ بنگال کے نفیس وعمدہ کپڑے کی انگلستان میں درآمد بند ہو جائے۔ آزاد بنگال انگریزی جولاہوں کی اس خواہش پر زیادہ سے زیادہ مسکرا دیتا۔ لیکن محکوم بنگال کو اپنی صنعت، تجارت اور زراعت کی تباہی کا تماشا کرنے کے سوا کام ہی کیا تھا؟ انگلستان کے جولاہوں کی حوصلہ افزائی کے لیے کمپنی نے اپنا سیاسی اثر استعمال کیا۔ بنگال کے پارچہ بافوں کو مجبور کر دیا گیا کہ وہ صرف برطانوی فیکٹریوں میں کام کریں۔ (کمپنی کی حکومت، ص ۳۷۔ ۱۳۵)

۱۷۵۷ء تا ۱۷۶۹ء

ٹیپو سلطان:

حیدر علی ۱۷۲۲ء میں پیدا ہوا۔ بچپن میں اسے فنون جنگ کی تعلیم دی گئی۔ جب وہ جوان ہوا تو اس نے میسور کے راجا کی ملازمت کر لی۔ پائین گھاٹ کی جنگ میں حیدر علی نے ذاتی شجاعت کے کارنامے سرانجام دیے جس کے صلے میں دربار میسور نے اسے ڈنڈی گل کا گورنر بنا دیا۔

۱۷۵۷ء میں دربار میسور نے حیدر علی کو میسوری فوجوں کا سپہ سالار بنا دیا۔ پانی پت کی تیسری جنگ میں جب مرہٹوں کو شکست ہوئی تو اس سے فائدہ اٹھاتے ہوئے حیدر علی نے میسور کا وہ تمام علاقہ واپس لے لیا جس پر مرہٹوں نے قبضہ جما رکھا تھا۔ اسی اثنا میں ریاست کا وزیر نندراج راجا کے کے خلاف ایک سازش میں مصروف تھا۔ حیدر علی نے اس موقعے پر نندراج کو وزارت سے علاحدہ ہونے پر مجبور کر دیا۔ اس کام کے صلے میں راجا میسور نے حیدر علی کو "فرزند ارجمند" کا خطاب دیا۔ حیدر علی کے زیر اثر ورسوخ اور اس کی جرأت وشجاعت کے پیش نظر شہنشاہ دہلی نے اسے سرا کا صوبے دار مقرر کر دیا۔ اس فرمان کے بعد میسور حیدر علی کی ایک باجگزار ریاست بن گئی، لیکن راجا میسور چاہتا تھا کہ حیدر علی کے اقتدار کو ختم کر دے۔ چناں چہ اس نے مادھوراو کو خط لکھ کر اس سے فوجی مدد طلب کی تھی۔ حیدر علی نے اس فوج کو شکست دینے کے بعد میسور کا نظم ونسق خود سنبھال لیا۔ بیدنور کی فتح نے حیدر علی کو جنوبی ہندوستان کا سب سے بڑا انسان بنا دیا۔ اس نے بہت جلد بیار اور شاہ نور پر قبضہ کر لیا۔ مادھوراو پیشوا حیدر علی کو ابھرتا ہوا نہیں دیکھ سکتا تھا، چناں چہ ۱۷۶۵ء میں وہ بہت بڑی فوج لے کر میسور پر حملہ آور ہوا۔

بالاپور، کڑپہ، کولار، ملباگل اور گرم کنڈا پر قبضہ کرانے کے بعد سرنگا پٹم کی طرف بڑھا۔ حیدر علی کو اس امر کا احساس تھا کہ اگر مادھوراو نے سرنگا پٹم پر قبضہ کر لیا تو اس کی سلطنت کا خاتمہ ہو جائے گا۔ مرہٹہ اور میسوری فوجوں میں جنگ ہونے کے بعد صلح ہو گئی۔

جب مادھوراو نے میسور پر حملہ کیا تو اس وقت انگریزوں اور نظام دکن (نظام علی خاں) کا خیال تھا کہ مادھوراو اپنے بل بوتے پر حیدر علی کی ابھرتی ہوئی قوت ختم کر دے گا، لیکن جب حیدر علی اور مادھوراو میں صلح ہو گئی تو انگریزوں اور نظام دکن نے حیدر علی کے خلاف محاذ بنا لیا۔ اس محاذ میں ایک مرہٹہ سردار بھی شامل ہو گیا۔ اتحادیوں نے میسور کا رخ کیا۔ اتحادی فوجوں کی کمان کرنل اسمتھ کے ہاتھ میں تھی۔ حیدر علی بھی اپنی فوج لیے ہوئے اتحادیوں کا راستہ روکنے کے لیے بالا گھاٹ کی طرف بڑھا۔ اسی اثنا میں بمبئی سے ایک انگریزی فوج منگلور کے ساحل پر اتری تاکہ بیدنور پر قبضہ کر لے۔ حیدر علی نے مشرقی محاذ کی کمان محمد علی کمیدن کے سپرد کی اور خود اپنے بیٹے ٹیپو کو ساتھ لے کر منگلور کا رخ کیا۔ انگریزی فوج کو شکست دینے کی بعد حیدر علی مشرقی محاذ کی طرف بڑھا۔ اسی اثنا میں اتحادی فوجوں نے کئی ایک مقامات پر قبضہ کر لیا تھا۔ حیدر علی نے مختلف مقامات پر اتحادیوں کو اس حد تک پریشان کر دیا کہ نظام اپنی فوج سمیت اتحادیوں سے الگ ہو گیا۔ مرہٹہ

سردار بھی حیدر علی کے ساتھ سمجھوتا کر کے پونا چلا گیا۔ اب حیدر علی نے محمد علی (نواب ارکاٹ) کی ریاست پر دھاوا بول دیا۔ میسوری فوج نے کرناٹک کے کئی ایک شہروں پر قبضہ کر لیا۔ کرنل اسمتھ اور محمد علی مدراس پہنچ کر انگریزی حکومت سے مشورہ کرنے میں مصروف تھے کہ ٹیپو کی کمان میں میسوری فوج قلعہ سینٹ جارج کے آس پاس پہنچ گئیں۔ مدراس پر گولے برسنے لگے۔ ایک گولہ اس جگہ کے قریب گرا جہاں محمد علی اور گورنر مدراس مشورہ کر رہے تھے۔ گورنر مدراس نے بھاگ کر ایک جہاز میں پناہ لی۔ گورنر اپنی ٹوپی اور تلوار کو میز پر ہی چھوڑ گیا۔ محمد علی نے بھی بھاگ کر اپنے محل میں پناہ لی۔ کرنل اسمتھ چوں کہ مدراس سے کلکتہ چلا گیا تھا اس لیے اب کرنل اوڈ نے بنگلور پر قبضہ کرنے کے لیے چڑھائی کی۔ حیدر علی نے کرنل اوڈ کو شکست دے کر انگریزی فوج کی بہت سی توپوں پر قبضہ کر لیا۔ مدراس کی انگریزی حکومت نے کرنل اوڈ کو واپس بلا کر کرنل لینگ کو اس کی جگہ کمانڈر مقرر کیا۔ حیدر علی نے اپنے بہت سے شہروں کو انگریزی فوجوں سے چھڑانے کے بعد مدراس پر چڑھائی کر دی۔ حیدر علی کو مدراس کی طرف بڑھتا ہوا پا کر گورنر مدراس نے کیپٹن بروک کو صلح کی بات چیت کے لیے حیدر علی کے پاس بھیجا لیکن اس نے بروک کو یہ جواب دیا کہ ''میں خود مدراس پہنچ کر گورنر اور مدراس کونسل کی شرطوں پر غور کروں گا۔'' تین دن میں ایک سو بیس میل کا کوچ کرنے کی بعد حیدر علی سینٹ تھامس میں پہنچ گیا جو مدراس سے صرف پانچ میل دور تھا۔ حیدر علی کی پیش کی ہوئی ان شرطوں پر کہ ''آیندہ فریقین ایک دوسرے کی مدد کریں گے، فریقین مقبوضات کو چھوڑ دیں اور قیدیوں کا تبادلہ کر لیں اور علاقہ کرور کو محمد علی سے چھین کر حیدر علی کو دیا جائے۔''

۲۹ مارچ ۱۷۶۹ء:

گورنر مدراس نے دستخط کر کے میسور کی پہلی لڑائی کو ختم کر دیا۔ ایک انگریز مورخ کے لفظوں میں ''اگر جنگ کی ابتدا ایک سیاسی غلطی تھی تو اس کا خاتمہ اس سے بھی برا نکلا۔''

دو سال بعد جب پیشوا نے میسور پر حملہ کیا تو حیدر علی نے معاہدے کے مطابق انگریزوں سے مدد مانگی لیکن انگریزوں نے حیدر علی کی مدد کرنے سے انکار کر دیا۔ حیدر علی اور مرہٹوں میں لڑائی جاری تھی کہ مادھو راؤ اس دنیا سے چل بسا۔ نارائن راؤ اور رگھوناتھ (رگھوبا) میں پیشوائی کے لیے کش مکش ہونے لگی۔ حیدر علی نے پونا کے سیاسی حالات سے فائدہ اٹھاتے ہوئے مرہٹہ کمانڈر ترمک راؤ کو صلح پر آمادہ کر لیا۔ حیدر علی سے چھتیس لاکھ روپیہ لے کر ترمک راؤ پونا چلا گیا۔ مرہٹہ فوج کے واپس ہونے پر حیدر علی نے کورگ پر قبضہ کرنے کے بعد مالا بار کے بہت سے علاقے فتح کر

کے کنارا کے نام سے ایک نیا صوبہ بنا کر سردار خاں کو اس کا صوبے دار مقرر کیا۔ اس طرح حیدر علی نے بہت تھوڑی مدت میں اپنی کھوئی ہوئی طاقت حاصل کر لی۔

نارائن راو نے پیشوا بنتے ہی رگھوبا کو قید کر دیا لیکن اس کے قتل کے بعد رگھوبا قید سے نکل کر پیشوا بن گیا۔ لیکن دربار پونا میں نارائن راو کے دودھ پیتے بچے کو پیشوا بنانے کے لیے نانا فرنویس اور دوسرے مرہٹہ سردار متحد ہو چکے تھے۔ رگھوبا کو آخر کار پونا سے بھاگنا پڑا۔ رگھوبا نے میسور میں آ کر حیدر علی سے امداد طلب کی۔ حیدر علی اور رگھوبا میں ابھی بات چیت ہو رہی تھی کہ اس کی فوج کے بہت سے سپاہیوں نے اس کا ساتھ چھوڑ دیا۔ اس پر رگھوبا نے گجرات کی راہ لی، رگھوبا نے بمبئی کی انگریزی حکومت سے امداد طلب کی، بمبئی کی انگریزی حکومت کے اس طرز عمل سے انگریزوں اور مرہٹوں میں ایک لمبی لڑائی چھڑ گئی۔ اس لڑائی کے دوران نظام دکن، مرہٹوں (گائیک وار کے علاوہ) اور حیدر علی نے ہندوستان سے انگریزوں کو نکالنے کے لیے ایک متحدہ محاذ بنایا لیکن سندھیا کی مدد سے وارن ہیسٹنگز نے اس متحدہ محاذ کو عہد نامہ سلبئی کے ذریعے منتشر کر دیا۔ (کمپنی کی حکومت، ص ۱۴۹۔۵۲)

۱۴ اپریل ۱۷۵۸ء: ۱۴ اپریل ۱۷۵۸ء کو دلی سے ایک شاہی فرمان آیا جس میں نہ صرف میر جعفر کو بنگال، بہار اور اڑیسہ کا گورنر تسلیم کر لیا گیا تھا بلکہ کلاؤ کو چھ ہزاری کا منصب دے کر اس کا شمار دربار دلی کے امیروں میں کیا گیا۔ اب میر جعفر مرشد آباد اور کلاؤ کلکتہ چلا گیا۔

اسی اثنا میں کمپنی کے ڈائریکٹروں کی طرف سے ایک چٹھی ملی جس میں بنگال کے انگریزی مقبوضات کے انتظام کو دس اشخاص کے سپرد کیا گیا تھا۔ چوں کہ چٹھی لکھنے اور اس کے بھیجنے کی درمیانی مدت میں حالات تبدیل ہو چکے تھے اس لیے ان اشخاص نے کلاؤ کو اپنی مجلس کا صدر مقرر کیا۔ یاد رہے کہ اس چٹھی میں کلاؤ کا نام درج نہیں تھا۔ (کمپنی کی حکومت، ص ۱۱۸)

۸ اپریل ۱۷۵۹ء: میر جعفر کی مشکلات ہر روز بڑھتی جا رہی تھیں۔ سب سے بڑی مشکل یہ آن پڑی کہ عالمگیر دوم کے بڑے بیٹے عالی گوہر نے اپنے باپ کے خلاف بغاوت کر کے بہار پر حملہ کر دیا۔ اس نے پٹنہ کا محاصرہ کر لیا۔ اب میر جعفر نے کلاؤ سے پھر مدد مانگی۔ ادھر دلی کے شہنشاہ نے کلاؤ کو ولی عہد کی بغاوت فرو کرنے کے لیے کہا۔ میر جعفر اور کلاؤ اپنی اپنی فوجوں سمیت ۸ اپریل ۱۷۵۹ء کو پٹنہ میں داخل ہوئے۔ چار دن پہلے باغی شہزادہ پٹنہ سے واپس ہو چکا تھا۔ اس کامیابی کی بدلے میں بھی میر جعفر کو کچھ نہ کچھ دینا اور کلاؤ کو لینا تھا۔ میر جعفر نے پٹنہ سے واپس ہو

کر کلکتہ کا وہ جنوبی علاقہ جسے کمپنی نے پٹے پر حاصل کیا ہوا تھا کلاؤ کو جاگیر میں دے دیا۔ (کمپنی کی حکومت، ص ۲۰۔۱۱۹)

اکتوبر ۱۷۵۹ء: بنگال میں انگریزوں کے بڑھتے ہوئے تجارتی وسیاسی اقتدار نے ولندیزوں کو بہت زیادہ نقصان پہنچایا تھا۔ انھوں نے تہیہ کرلیا کہ وہ انگریزوں کو بنگال سے نکال کر رہیں گے۔ چناں چہ اکتوبر ۱۷۵۹ء میں ولندیزوں نے کلکتہ پر حملہ کرنے کے لیے اپنے جنگی بیڑے کو حرکت دی۔ ولندیزی بیڑے کو ہگلی میں شکست ہوئی اور کرنل فورڈ نے چنسورہ کے قریب ولندیزوں کی بری فوج کو شکست دی۔ ان شکستوں کے بعد ولندیزوں نے ہندوستان میں اپنی تجارتی سرگرمیوں کو تو جاری رکھا لیکن ہندوستان کی سیاست میں کبھی دخل نہ دیا۔ (کمپنی کی حکومت، ص ۱۲۰)

نومبر ۱۷۵۹ء: مرہٹوں نے روہیل کھنڈ پر دھاوا بول دیا۔ حافظ رحمت خان اور دوسرے روہیلہ سرداروں نے نواب اودھ (شجاع الدولہ) سے امداد مانگی۔ شجاع الدولہ ایک بہت بڑی فوج لے کر روہیل کھنڈ میں داخل ہوا۔ نومبر ۱۷۵۹ء میں شجاع الدولہ نے مرہٹوں کو روہیل کھنڈ سے نکال دیا۔ مرہٹوں کی واپسی کا دوسرا سبب یہ تھا کہ ستمبر ۱۷۵۹ء میں احمد شاہ ابدالی پنجاب میں داخل ہو چکا تھا۔ نجیب الدولہ، حافظ رحمت خان، شجاع الدولہ اور کئی ایک دوسرے سرداروں نے ابدالی کا ساتھ دیا۔ (کمپنی کی حکومت، ص ۱۶۳)

۱۷۶۰ء

جولائی ۱۹۶۰ء: اکتوبر ۱۷۵۶ء میں کلاؤ جن ارادوں کے ساتھ بنگال آیا تھا، وہ سب کے سب پورے ہو چکے تھے۔ میر جعفر اگر چہ بنگال کا نواب تھا لیکن بنگال کے سیاسی ومعاشی امور کلکتہ کونسل کے ہاتھ میں تھے۔ ولندیزوں کو شکست ہو چکی تھی، کلاؤ نے بہت دولت جمع کرلی تھی۔ کلاؤ فروری ۱۷۶۰ء میں انگلستان چلا گیا۔ کلاؤ کے چلے جانے کے بعد وین اسٹارٹ بنگال کے انگریزی مقبوضات کا گورنر مقرر ہوا۔ وہ جولائی ۱۷۶۰ء میں کلکتہ پہنچا۔ اس درمیانی مدت میں ہال ویل قائم مقام گورنر تھا۔ (کمپنی کی حکومت)

۱۵ ر ستمبر ۱۷۶۰ء: ۱۵ ر ستمبر ۱۷۶۰ء کو میر قاسم نے کلکتہ میں ہال ویل سے ملاقات کی۔ اس ملاقات میں میر قاسم نے ہال ویل کو یقین دلایا کہ اگر اسے بنگال کا نواب بنا دیا گیا تو وہ بہت سے اضلاع کو کمپنی کے حوالے کر کے کمپنی کی بقایہ رقم ادا کر دے گا۔ وین اسٹارٹ نے میر قاسم کو فوجی مدد دینے کا وعدہ کیا۔ کلکتہ میں کمپنی کا خزانہ خالی ہو چکا تھا۔ ''بنگال آرمی'' کے اخراجات پورے کرنے

کے لیے روپے کی ضرورت تھی، میر قاسم کی حمایت کر کے وین اسٹارٹ کلکتہ کے خالی خزانہ کو پھر بھرنا چاہتا تھا۔ ابتدائی بات چیت کے بعد میر قاسم اور کمپنی میں ایک خفیہ معاہدہ ہوا۔ یہ معاہدہ کرنے کے بعد میر قاسم کلکتہ سے چلا گیا۔ ۲ اکتوبر ۱۷۶۰ء کو وین اسٹارٹ اور کرنل کیلاڈ انگریزی فوج لے کر مرشد آباد چل دیے تاکہ وقت پر میر قاسم کی مدد کر سکیں اور اس فوجی قوت کی زور پر میر قاسم سے خفیہ معاہدے کی شرطوں پر عمل کروا سکیں۔ (کمپنی کی حکومت، ص ۱۲۴)

۱۵ اکتوبر ۱۷۶۰ء: ۱۵۔ اکتوبر کو میر جعفر نے مراد باغ میں وین اسٹارٹ سے ملاقات کی۔ اس ملاقات میں وین اسٹارٹ نے نواب کی مشکلات کا ذکر کرتے ہوئے اس سے کہا کہ وہ میر قاسم کو اپنا جانشین مقرر کرے لیکن نواب نے گورنر کی بات ماننے سے انکار کر دیا۔ وین اسٹارٹ کے اپنے الفاظ میں ”میں نے ہر چیز کو انتہائی ڈراؤنی صورت میں پیش کیا تاکہ میں آسانی کے ساتھ اس سے مجوزہ شرطیں منوا سکتا۔“ میر جعفر بددل ہو کر واپس ہوا۔ اگلے دن وین اسٹارٹ نے نواب سے ملاقات کی۔ دو دن بعد میر جعفر اور وین اسٹارٹ میں مراد باغ میں سیاسی بات چیت شروع ہوئی۔ وین اسٹارٹ نے نواب کے نظم و نسق میں بہت سی خامیاں بیان کرتے ہوئے اسے مشورہ دیا کہ وہ دربار کے بہت سے عہدے داروں کو ہٹا کر کلی نظم و نسق کا کام کسی قابل شخص کے سپرد کرے۔ میر جعفر نے کہا کہ وہ اپنے مشیروں سے مشورہ کرنے کے بعد ہی کوئی قطعی جواب دے سکے گا۔ لیکن وین اسٹارٹ اسے مشیروں سے بات چیت کرنے کی مہلت نہیں دینا چاہتا تھا چناں چہ اس نے میر قاسم سے کہا کہ وہ اپنے کسی رشتہ دار کو یہاں بلا کر اسے اپنا نمایندہ مقرر کر دے۔ تاکہ اسی کے ساتھ کھل کر بات چیت کی جا سکے۔ وین اسٹارٹ نے خود ہی نواب کے بہت سے رشتہ داروں کے نام لینے شروع کر دیے ان میں سے میر قاسم بھی تھا۔ میر جعفر نہیں چاہتا تھا کہ وہ میر قاسم کو اپنا نمایندہ مقرر کرے چناں چہ جب وین اسٹارٹ نے میر قاسم کو بلوا بھیجا تو اس کے آنے سے پہلے ہی میر جعفر اپنے محل میں چلا گیا۔ میر قاسم کے پہنچتے ہی وین اسٹارٹ نے سارے حالات بیان کر دیے۔ (کمپنی کی حکومت، ص ۲۵۔۱۲۴)

۲۰ اکتوبر ۱۷۶۰ء: ۲۰ اکتوبر ۱۷۶۰ء کو کرنل کیلاڈ اور میر قاسم کی فوجوں نے دریا پار کر کے نواب کے محل کا محاصرہ کر لیا۔ نواب کا حفاظتی دستہ پریشان ہو گیا۔ اس کے بہت سے سپاہی میر قاسم سے جا ملے۔ وین اسٹارٹ نے میر جعفر کو لکھا کہ ”کرنل کیلاڈ آپ کو آپ کے برے مشیروں سے نجات دلوانے آیا ہے۔ میں بھی بہت جلد آ رہا ہوں۔“ میر جعفر نے اس پر بھی میر قاسم کو اپنا جانشین

مقرر کرنے سے انکار کر دیا لیکن چند گھنٹوں کے بعد اس نے اس شرط پر تخت چھوڑنے پر آمادگی ظاہر کر دی کہ اس کی جان بچالی جائے۔ وین اسٹارٹ نے میر جعفر کی اس شرط کو مان کر میر قاسم کی نوابی کا اعلان کر دیا۔ میر جعفر کو کلکتہ پہنچا دیا گیا۔

میر قاسم ۲۰ر اکتوبر ۱۷۶۰ء کو گدی پر بیٹھا۔ وین اسٹارٹ نے ایسٹ انڈیا کمپنی کی طرف سے اسے مبارک بادد ی اور میجر بارک کو مرشداد میں چھوڑ کر خود مراد باغ چلا گیا۔ مرشد آباد کے خزانے میں مشکل سے ایک لاکھ روپیہ نقد اور چند لاکھ روپے مالیت کا سونا چاندی نکل سکا۔ یہ رقم نہ اس کے سپاہیوں کے لیے کافی تھی اور نہ کمپنی کی فوج کے سپاہیوں کا بقایا ادا کیا جاسکتا تھا۔ میر قاسم نے سب سے پہلے اپنی مالی حالت بہتر بنانے کے لیے قدم اٹھایا۔ اس نے محاسبوں کو مقرر کیا تا کہ وہ حکومت کے مختلف محکموں کے حساب کتاب کی پڑتال کریں۔ محاسبوں نے غبن کرنے والوں کی رپورٹ کی۔ میر قاسم نے انھیں گرفتار کر کے ان سے سرکاری رقم وصول کی۔ بڑے بڑے عہدے داروں کی جائیدادیں ضبط کر لی گئیں۔ حکومت کے افسر جس مرد یا عورت کے خلاف رپورٹ کرتے کہ اس نے دولت کو دبا رکھا ہے، اس کی دولت پر قبضہ کر لیا جاتا۔ ہر دولت مند کو اس کی دولت کی بنا پر مجرم قرار دیا جاتا۔ اس طرح میر قاسم نے اپنے خزانے کو بھرنے کے بعد اپنی اور کمپنی کی فوجوں کو تنخواہ دی۔ اس نے اپنی مالی حالت مزید بہتر بنانے کے لیے سیٹھوں سے قرضہ لیا اور اپنے ذاتی اخراجات گھٹا دیے۔ اس نے شاہی محل کے تمام غیر ضروری جانوروں کو بیچ دیا۔ اس مقصد کے لیے اس نے مرشد آباد کے امام باڑے کے قیمتی سامان پر قبضہ کر لیا۔ اس نے میر جعفر کے مقرر کردہ وظیفے میں بھی پندرہ ہزار روپیہ ماہوار کی کمی کر دی۔ اب میر قاسم نے اپنی اور کمپنی کی فوج کو تنخواہ ادا کی، لیکن جب وین اسٹارٹ نے شکایت کی کہ کمپنی کو باقاعدگی سے روپیہ ادا نہیں کیا جارہا تو اس نے بہت سے قیمتی ہیروں کو نیلام کروا کر کمپنی کے سپاہیوں کا تمام بقایا ادا کر دیا۔ اس زمانے میں جنوبی ہندوستان میں انگریزوں اور فرانسیسیوں کی لڑائی ہو رہی تھی۔ میر قاسم نے اس لڑائی میں انگریزوں کو پانچ لاکھ روپیہ چندہ دیا۔ اس نے کلکتہ کونسل کے ممبروں میں بیس لاکھ پونڈ تقسیم کیا۔ میر قاسم نے ایسٹ انڈیا کمپنی سے جو معاہدہ کیا تھا اس پر عمل کرتے ہوئے اس نے بردوان، مدناپور اور چٹاگانگ کے اضلاع کمپنی کے حوالے کر دیے۔ اس نے دس لاکھ کی وہ رقم بھی ادا کر دی جو کمپنی کی فوج کی تنخواہ کے ضمن میں بقایا تھی۔ اس نے صرافوں اور سوداگروں کے نام حکم جاری کر دیا کہ وہ کمپنی کے سکوں پر کسی قسم کی بٹائی نہ لیں۔

اپنی مالی حالت مضبوط کرنے کے بعد میر قاسم نے بہار اور بنگال کے ان جاگیرداروں کی طرف توجہ کی جو بغاوت اختیار کیے ہوئے تھے اور جو شہزادہ عالی گوہر کا ساتھ دے چکے تھے۔ ان جاگیردارو نے مرشد آباد کے خزانے میں مالیہ بھیجنا بند کر دیا تھا۔ ان میں سب سے پیش پیش بیر بھوم کا راجا تھا۔ میر قاسم نے بیر بھوم کے راجا اسد زمان خان سے لڑنے کے لیے ایک فوج بھیجی۔ راجا نے نواب کی فوج کو شکست دی ہوتی اگر میجر یارک اور میجر وہائٹ نواب کی مدد پر نہ پہنچتے۔ اس زمان خاں نے نواب کی اطاعت قبول کر لی، دوسرے جاگیرداروں نے بھی یہی روش اختیار کر لی۔" (کمپنی کی حکومت، ص ۲۶۔۱۲۵)

اکتوبر ۱۷۶۰ء: میر جعفر کے لیے اپنی حکومت کو جاری رکھنا غیر ممکن ہو چکا تھا۔ کلکتہ کونسل کی موجودگی میں اس کا خزانہ کبھی نہیں بھر سکتا تھا۔ اس نے جس تخت کے لیے سراج الدولہ سے غداری کی تھی وہ اس کے لیے کانٹوں کا بچھونا ثابت ہوا۔ میر جعفر اب کلکتہ کونسل کے لیے مفید نہیں رہا تھا۔ چناں چہ اسے گدی سے اتارنے کے لیے کلکتہ کونسل کے خفیہ اجلاس ہونے شروع ہوئے۔ ان اجلاس کا صدر بنگال کا گورنر ہوتا تھا۔ اس خفیہ مجلس کے اجلاس ستمبر ۱۷۶۰ء میں بہت ہوئے۔ ایک اجلاس میں مجلس نے "موجودہ حالات" پر ان الفاظ میں تبصرہ کیا: "کرنل کلاؤ کے پیدا کردہ انقلاب نے ہمارے اثر و رسوخ کا دائرہ بہت وسیع کر دیا۔ اب اس وسیع دائرے پر اپنا اثر جاری و ساری رکھنے کے لیے ہماری عسکری قوت میں بھی اضافہ ہو۔ ایک ہزار انگریزی اور پانچ ہزار دیسی سپاہ پر مشتمل فوج کے لیے بہت روپیہ درکار ہے...... اس لیے ہمیں نواب سے مطالبہ کرنا چاہیے کہ وہ کمپنی کے لئے مزید ذرائع آمدنی پیدا کرے...... ہمارا دائرہ اقتدار بے شک وسیع ہے لیکن پائیدار نہیں۔ ہمیں اپنی قوت میں اضافہ کرنا ہے تاکہ بروقت کام آسکے۔"

وین اسٹارٹ نے میر قاسم اور ہال ویل نے رائے درلاب سے اس موضوع پر تبادلۂ خیال کیا۔ انگریز اپنے عزائم میں کامیاب ہو گئے۔

چناں چہ اکتوبر ۱۷۶۰ء میں میر جعفر کو تخت سے اتار دیا گیا۔ میر جعفر نے انگریزوں کے لیے پلاسی میں سراج کی فوجوں کو شکست دلوائی۔ مرشد آباد کی جوئے زر کا رخ کلکتہ کی طرف پھیر دیا۔ کمپنی کے عہدہ داروں کو خوش کیا۔ کلاؤ کو پچیس لاکھ روپیہ دیا۔ عہد نامہ کی حرف بہ حرف پیروی کی۔ لیکن انگریزوں نے جب دیکھا کہ میر جعفر سے زیادہ میر قاسم مفید ہو سکتا ہے تو انھوں نے میر جعفر کو تخت سے علاحدہ کرنے میں ذرا بھی تامل نہ کیا۔ سراج کی زندگی میں کمپنی کے ذمہ دار ارکان نے

ایسے مکتوب لندن روانہ کیے جن میں سراج کو ظالم اور جعفر کو رحم دل ثابت کرنے میں انگریزی ادبیات کی تمام بلاغت صرف کردی۔ لیکن اب اسی جعفر کے قلمی چہرے کو اس قدر تاریک پیش کیا جارہا تھا کہ جعفر، سراج سے کہیں زیادہ ظالم دکھائی دینے لگا۔ انگریزوں نے نئے نواب کو اس شرط پر فوجی مدد دینے کا وعدہ کیا کہ بردوان، مدنا پور اور چٹاگانگ کے اضلاع کمپنی کے حوالے کردیے جائیں اور یہ کہ میر قاسم کلکتہ کونسل کے ممبروں کو ''تحائف'' پیش کرے۔ میر جعفر کی درخواست پر اسے کلکتہ میں پناہ دی گئی۔

میر قاسم نے اپنے عہد حکومت میں عہد نامے کی تمام دفعات پر عمل کیا، لیکن اس کے باوجود کمپنی نے اپنے مظالم میں کمی واقع نہ کی۔ مظالم کی فہرست میں ہر روز اضافہ ہوتا رہا۔ میر قاسم نے کمپنی کو بیس لاکھ روپیہ نقد دیا۔ بنگال کے تین زرخیز اضلاع انگریزوں کے حوالے کیے۔ کمپنی کو اپنا سکہ جاری کرنے کی اجازت دی، لیکن انگریزی کاسۂ آز ہنوز خالی تھا۔ سونے کا پہاڑ بھی اس سنہری بھوک کے لیے ناکافی تھا۔ انگریز میر قاسم اور اس کی رعایا کو نیم عریاں اور نیم گرسنہ دیکھنا چاہتے تھے۔ وہ بنگال کی تمام تر تجارت اپنے قبضہ میں کرنا چاہتے تھے۔ میر قاسم ان شرائط کی پابندی پر بھی رضامند تھا، لیکن انگریزی مطالبات کے تیروں نے اس معاہدے کو بھی چھلنی کردیا۔ انگریزوں نے میر قاسم کو مجبور کردیا کہ وہ چند لمحات کے لیے امن وصلح کے دعاوی سے منہ پھیر کر عہد شکنوں سے نپٹ لے۔ (کمپنی کی حکومت، ص ۱۲۱۔۱۲۰)

۶ رجنوری ۱۷۶۱ء: ۶ رجنوری ۱۷۶۱ء کو پانی پت کی لڑائی میں مرہٹوں کو شکست دینے کے بعد احمد شاہ ابدالی نے شاہ عالم (جو اس وقت الہ آباد میں تھا) کو مغل شہنشاہ تسلیم کرتے ہوئے نجیب الدولہ کو اس کا کمانڈران چیف اور شجاع الدولہ کو اس کا وزیراعظم مقرر کیا۔ (کمپنی کی حکومت)

۱۵ رجنوری ۱۷۶۱ء: میر جعفر ہی کے وقت سے عالی گوہر کے حملے اور جاگیرداروں کی بغاوت نے بہار کی سیاسی صورت حالات میں بے چینی پیدا کر رکھی تھی۔ عالی گوہر ابھی تک بہار ہی میں تھا۔ بہار میں نواب کی فوج کے سپاہی شہزادے کی فوج میں شامل ہورہے تھے۔ بیر بھوم کے راجا کی بغاوت فرو کرنے کے بعد میر قاسم کو پٹنہ جانا پڑا۔ میجر کارنک نے ۱۵ رجنوری ۱۷۶۱ء کو عالی گوہر کو شکست دی۔ عالی گوہر کمپنی سے معاملہ کرنے کے بعد دلی جانا چاہتا تھا کیوں کہ اب وہ دلی کا شہنشاہ ہوچکا تھا۔ میر قاسم کو اندیشہ تھا کہ انگریز کہیں شہزادے کے ساتھ ساز باز نہ کرلیں۔ اس کے لیے پٹنہ جانا ضروری ہوگیا۔ پٹنہ کی انگریزی فیکٹری میں میر قاسم اور شاہ عالم (عالی گوہر نے یہ لقب

اختیار کرلیا تھا) میں ملاقات ہوئی۔ اس ملاقات میں میر قاسم نے شہنشاہ کو چوبیس لاکھ روپیہ سالانہ خراج دینا منظور کیا۔ (کمپنی کی حکومت)

۳۰ رنومبر ۱۷۶۲ء: جون ۱۷۶۲ء کے آخر میں میر قاسم مونگیر کے قلعے میں داخل ہوا۔ مرشد آباد کے سازشی ماحول، اور کلکتہ کونسل سے دور رہ کر وہ اپنی نئی راجدھانی مونگیر میں اپنے نئے ارادوں کو عملی صورت دینا چاہتا تھا۔ اس نے مونگیر کے قلعے کو مستحکم کرنا شروع کر دیا۔ اس نے شہر کو اچھا بنانے کے لیے کئی ایک نئی عمارتیں شروع کروادیں۔ شہر کی پرانی فصیل کو گروا کر نئی اور مضبوط فصیل بنوائی گئی۔ اس نے اپنا توپ خانہ بھی مرشد آباد سے مونگیر میں منتقل کرلیا۔ اس نے اپنی نئی راجدھانی کی رونق کو شاعروں اور آرٹسٹوں کی قدر دانی سے مزید بڑھایا۔ محمد علی حزیں اس کا درباری شاعر تھا۔ مونگیر کو اپنی راجدھانی بنانے کے بعد اس نے کمپنی کے ملازموں کی ذاتی تجارت کے خلاف کلکتہ کونسل کو شکایات بھیجنی شروع کیں۔ اس کے عہدے داروں نے کمپنی کے ملازموں کی ذاتی تجارت کو بند کرنے اور ان سے مقررہ ٹیکس وصول کرنے کی مہم جاری کردی۔ ایسٹ انڈیا کمپنی کے ملازموں کی اس تجارت کو بند کرنے کے لیے میر قاسم نے اپنی مملکت میں بہت سے نئے چنگی خانے قائم کیے۔ کمپنی کے ملازموں نے کلکتہ کونسل تک اپنی شکایات پہنچادیں۔ میر قاسم نے بھی اپنی شکایات کا سلسلہ جاری رکھا۔ یہاں تک کہ کمپنی کے ملازموں کی ذاتی تجارت کا سوال نواب اور کمپنی میں نزاع کا سبب بن گیا۔ سمجھوتے کی صرف یہی صورت تھی کہ میر قاسم اور وین اسٹارٹ میں ملاقات ہو۔ چناں چہ وین اسٹارٹ نے نواب سے ملاقات کرنے کے لیے مونگیر جانے کا فیصلہ کرلیا۔ ۳۰ رنومبر ۱۷۶۲ء کو نواب اور وین اسٹارٹ میں ملاقات ہوئی۔ دونوں نے ایک دوسرے کو تحائف پیش کیے۔ (کمپنی کی حکومت، ص ۳۰-۱۲۹)

۱۷۶۱ء

نومبر۱۷۶۱ء: بہار میں عالی گوہر کی موجودگی نے جو سیاسی بے چینی پیدا کردی تھی اس سے فائدہ اٹھانے کے لیے بھوج پور کے جاگیرداروں نے اپنی سرگرمیوں کو تیز کر دیا۔ میر قاسم نے بہار پر اپنا اقتدار منوانے کے لیے ان جاگیرداروں کے خلاف فوجی سرگرمیاں شروع کر دیں۔ جب عالی گوہر نے بہار پر دوسرا حملہ کیا تو ان جاگیرداروں نے نواب کے خلاف اس کا پورا پورا ساتھ دیا تھا۔ میر قاسم کو یہ بھی شبہ تھا کہ نواب وزیر، بھوج پور کے سرحدی جاگیرداروں کو بغاوت پر اکسا رہا ہے۔

بھوج پور کے جاگیرداروں کی سرکوبی کے لیے اس نے کمپنی سے زیادہ فوجی امداد طلب نہ کی بلکہ اس نے اپنی فوج کے لیے بنگالی افسروں کو تربیت دلانی شروع کی۔ اس نے اپنی فوج کی نئی تنظیم کا کام گرجین خان کے سپرد کیا۔ جب دین اسٹارٹ کو بتایا گیا کہ میر قاسم بہت کم انگریزی سپاہیوں کے ساتھ جاگیرداروں کی سرکوبی کے لیے جا رہا ہے تو اس نے میر قاسم کو لکھا کہ اسے انگریز سپاہیوں کو زیادہ تعداد میں اپنے ساتھ لے جانا چاہیے لیکن اس نے دین اسٹارٹ کی اس پیش کش کو قبول نہ کیا۔ نومبر ۱۷۶۱ء میں نواب اپنی فوج سمیت پٹنہ سے روانہ ہوا۔ جوں ہی بھوج پور کے باغیوں کے نواب کی بہت بڑی فوج کو حرکت کرتے دیکھا وہ اودھ میں داخل ہو گئے۔ جنوری ۱۷۶۲ء تک نواب نے باغیوں کے بہت سے قلعوں پر قبضہ کر لیا۔ جاگیرداروں کی قوت توڑنے کے بعد میر قاسم نے تمام قلعوں میں دستے مقرر کیے۔ شاہ آباد کے باغی جاگیرداروں کو دبانے کے بعد میر قاسم نے اپنی سرحدوں کو بیرونی حملے سے بچانے کے لیے مضبوط بنانا شروع کیا اور اس کے ساتھ ہی اس نے شجاع الدولہ (نواب وزیر) کے ساتھ مفاہمت کر لی۔ اس مفاہمت کا مقصد غالباً انگریزوں کو بنگال سے نکالنے کے لیے کسی مشترکہ جدوجہد کا امکان پیدا کرنا تھا۔

جب میر قاسم بہار کے باغی سرداروں کے خلاف لڑ رہا تو نومبر ۱۷۶۱ء میں پٹنہ کی انگریزی فیکٹری کا افسر ایلس وہاں پہنچا۔ ایلس نے میر قاسم کے معاملات میں مداخلت شروع کر دی حال آں کہ میر قاسم بڑی مشکل سے اپنے نظم ونسق کو انگریزوں کی مداخلت سے آزاد کر چکا تھا۔ پٹنہ میں ایلس کی موجودگی میر قاسم کے ارادوں میں ایک بہت بڑی رکاوٹ تھی۔ میر قاسم چوں کہ اپنی راجدھانی کو بنگال سے بہار میں منتقل کرنا چاہتا تھا اس لیے اسے اندیشہ تھا کہ پٹنہ میں ایلس کی موجودگی کسی نئی سازش کا مرکز بن سکے گی۔ میر قاسم نے یہ محسوس کر لیا تھا کہ ایلس کے ہوتے

ہوئے وہ اپنے آپ کو مصیبتوں میں گھرا ہوا پائے گا۔ اسی اثنا میں نواب نے ایسٹ انڈیا کمپنی کے ملازموں کی پرائیویٹ تجارت کو بند کرنے کا بھی فیصلہ کرلیا تھا۔ کمپنی کے یہ ملازم ٹیکس ادا کیے بغیر کاروبار کرتے تھے۔ جس سے دیسی تاجروں کو بہت زیادہ نقصان پہنچتا تھا۔ ایلس اور میر قاسم میں بہت جلد جھگڑا شروع ہوگیا۔ میر قاسم کا یہ مطالبہ تھا کہ کمپنی کے ملازم ٹیکس ادا کیے بغیر تجارتی مال کو ایک جگہ سے دوسری جگہ نہ لے جائیں، لیکن ایلس کو اصرار تھا کہ کمپنی کے ملازموں کو ایسا کرنے کا حق ہے۔ اس زمانہ میں پٹنہ کی انگریزی فوج کے سپاہی اور افسر فوج سے بھاگ جایا کرتے تھے۔ انگریزی فوج کے چند افسروں نے بھاگ کر مونگیر کے قلعے میں پناہ لی۔ ایلس نے ان افسروں کو واپس لانے کے لیے انگریزی فوج بھیج دی۔ اس فوج نے مونگیر کے قلعے کا محاصرہ کر لیا۔ وین اسٹارٹ نے بھی میر قاسم کو کلکتہ سے لکھا کہ وہ انگریزی فوج کو قلعہ کی تلاشی لینے کے اجازت دے لیکن میر قاسم نے وین اسٹارٹ کی بات نہ مانی۔ اس پر وین اسٹارٹ نے ایک وفد تجویز کیا جو مونگیر کے قلعے کی تلاشی لے۔

مئی ۱۷۶۲ء: میر قاسم نے وین اسٹارٹ کا یہ مطالبہ مان لیا۔ ہیسٹنگز نے مونگیر کے قلعے کی تلاشی لی، لیکن اسے ایک بھی مفرور انگریز نہ مل سکا۔ مونگیر کے قلعہ کے تلاشی لینے کے بعد ہیسٹنگز نے ۹ رمئی ۱۷۶۲ء کو میر قاسم سے سہسرام میں ملاقات کی۔ میر قاسم نے کمپنی کے ملازموں اور پٹنہ کی انگریزی فیکٹری کے افسر ایلس کے خلاف شکایات کیں۔ چناں چہ ہیسٹنگز نے ایلس کے طرز عمل کی مذمت کرتے ہوئے گورنر کو ایک مفصل خط لکھا۔ گورنر نے ہیسٹنگز سے کہا کہ وہ میر قاسم کے ساتھ تمام امور کا تصفیہ کرلے۔ ہیسٹنگز نے نواب کے سامنے جو شرطیں پیش کیں ان سے نواب کی تسلی نہ ہوسکی۔ نواب چاہتا تھا کہ وہ کلکتہ کونسل سے اپنے اور کمپنی کے اختیارات کی حد بندی کرالے۔ ہیسٹنگز کلکتہ کونسل کی طرف سے اس قسم کا معاہدہ کرنے کا مجاز نہیں تھا، اس لیے ہیسٹنگز قاسم بات چیت کوئی نتیجہ پیدا نہ کرسکی۔ میر قاسم کو کمپنی کے ملازموں کی ذاتی تجارت کے خلاف جو شکایات تھیں وہ بدستور باقی رہیں۔

بہار کے سرحدی علاقوں پر اپنا تسلط قائم کرنے کے بعد میر قاسم نے مونگیر کی راہ لی۔ اس نے مونگیر کو اپنی راجدھانی بنانے کا فیصلہ کرلیا تھا۔ مونگیر جاتے ہوئے جب اس نے پٹنہ میں قیام کیا تو ایلس نے اس سے ملنے کی درخواست کی، اس نے درخواست کو مسترد کردیا۔ (کمپنی کی حکومت، ص ۲۵۔۱۲۴)

۹ رجنوری ۱۹۶۳ء: نواب نے پٹنہ کی انگریزی فیکٹری کے افسر ایلس کے طرز عمل اور کمپنی کے

ملازموں کی ذاتی تجارت کے خلاف شکایات کیں۔ میر قاسم نے مطالبہ کیا کہ کمپنی کے ملازموں کی ذاتی تجارت بند کر دی جائے یا انھیں مملکت کے دوسرے تاجروں کی طرح چنگی ادا کرنی چاہیے۔ وین اسٹارٹ نے میر قاسم کے اس مطالبے کو مان لینے کے بعد اندرونی تجارت کے بارے میں بھی نواب سے سمجھوتا کر لیا۔ وین اسٹارٹ نے میر قاسم کو ایک بدلا ہوا انسان پایا، وہ پہلے کی طرح کمزور نہیں تھا، اس کے پاس پہلے سے زیادہ فوج تھی۔ گرجین خان نے مونگیر میں جو فوجی نمایش کی اس نے وین اسٹارٹ کو بہت متاثر کیا۔ ۹ رجنوری ۱۷۶۳ء کو وین اسٹارٹ مونگیر سے کلکتہ روانہ ہوا۔'' (کمپنی کی حکومت، ص ۱۳۰)

مئی جون ۱۷۶۳ء: کمپنی اور نواب کے افسروں میں کھلم کھلا لڑائیاں ہونے لگی۔ لڑائیاں بند کرنے اور دیسی تاجروں کو کمپنی کے ملازموں کی سطح پر لانے کے لیے نواب نے دو سال کے لیے اندرونی تجارت پر ہر قسم کا محصول معاف کرنے کا فرمان جاری کر دیا۔ اس فرمان نے کمپنی کے کاروبار کو چوں کہ نقصان پہنچایا تھا اس لیے کلکتہ کونسل نے اس فرمان کی تنسیخ کے لیے میر قاسم سے بات چیت کرنے کے لیے ایک وفد مونگیر بھیجنا چاہا لیکن نواب نے اس وفد سے بات چیت کرنے سے انکار کر دیا۔ اس پر وین اسٹارٹ نے اسے لکھا کہ اگر اس نے وفد سے ملاقات کرنے پر رضا مندی کا اظہار نہ کیا تو اس کے اس طرز عمل کو ''اس کی طرف سے لڑائی کرنے پر آمادگی'' سمجھا جائے گا۔ میر قاسم نے جواب دیتے ہوئے کہا کہ ''ایک طرف تو آپ تشدد کر رہے ہیں اور دوسری طرف آپ معاہدوں کے پیش نظر سمجھوتے کی بات چیت کرنا چاہتے ہیں۔'' بہت زیادہ خط و کتابت کے بعد نواب نے انگریزوں کے وفد کو اس شرط پر مونگیر آنے کی اجازت دی کہ وہ اپنے ساتھ انگریزی فوج نہیں لائیں گے۔ مئی ۱۷۶۳ء میں نواب نے انگریزوں کے اس وفد سے ملاقات کی۔ اس ملاقات میں وفد نے اس کے سامنے جو شرطیں پیش کیں انھیں اس نے ماننے سے انکار کر دیا۔

اس وفد کی موجودگی میں گرجین خاں کے حکم سے ان چھ کشتیوں کو پکڑ لیا گیا جو سامان جنگ سے لدی ہوئی تھیں اور جنہیں پٹنہ کی انگریزی فیکٹری کے افسر ایلس کے پاس بھیجا جا رہا تھا۔ جب وفد نے ان کشتیوں کو رہا کرانے کی بہت کوشش کی تو اس نے وفد سے کہا کہ ''بہ ظاہر آپ سامان جنگ بھیجے جانے سے انکار کرتے ہیں لیکن خفیہ طور پر سامان جنگ بھیج رہے ہیں، آخر یہ کیا ہے؟'' نواب کو یقین ہو گیا تھا کہ اس سامان جنگ سے ایلس، پٹنہ پر قبضہ کرنا چاہتا ہے۔ سامان جنگ سے لدی ہوئی کشتیوں کو پکڑنے کے بعد اس نے مطالبہ کیا کہ کمپنی کی فوج کو پٹنہ سے ہٹا لیا جائے۔ لیکن

کلکتہ کونسل نے یہ ماننے سے انکار کر دیا۔ میر قاسم نے کشتیوں کو چھوڑ دیا۔ لیکن اگلے دن اس کے حکم سے کشتیوں کو پھر پکڑ لیا گیا۔ اسی اثنا میں ایلس نے پٹنہ پر قبضہ کرنے کی تیاری مکمل کر لی تھیں۔

۲۵ر جون ۱۷۶۳ء: چناں چہ اس نے ۲۵ر جون ۱۷۶۳ء کو پٹنہ پر حملہ کر دیا۔ جن دنوں میر قاسم، کمپنی کے بھیجے ہوئے وفد سے بات چیت کر رہا ہوگا ان ہی دنوں ایلس نے کلکتہ کونسل سے پٹنہ پر حملہ کرنے کی اجازت حاصل کر لی ہوگی۔

پٹنہ پر ایلس کا قبضہ ہوتے ہی نواب اور کمپنی میں لڑائی چھڑ گی۔ ایلس کے سپاہیوں نے پٹنہ میں خوب لوٹ مچائی۔ لیکن بہت جلد نواب کی فوج نے انگریزی فوج کو شہر سے نکال دیا۔ انگریزی فوج نے اپنی فیکٹری میں پناہ لی لیکن نواب کی فوج نے اسے بہت جلد بھاگنے پر مجبور کر دیا۔ میجر سمرو نے اس فوج کا پیچھا کر کے انھیں پھر شکست دی، انگریزی فوج کے جو سپاہی لڑائی میں کام نہیں آئے تھے انھیں گرفتار کر کے پٹنہ لے جایا گیا۔ یہاں میجر سمرو نے ان جنگی قیدیوں کو قتل کروا دیا۔ لیکن بہت جلد کمپنی کی فوجوں نے کٹوا، مرشد آباد، مونگیر، پٹنہ اور اودانالا میں نواب کی فوجوں کو شکست دی۔ اودانالا میں میجر ایڈمنز اور تقی خان میں مقابلہ ہوا۔ ایڈمنز اپنی فوجوں سمیت کلکتہ سے اور تقی خان مرشد آباد سے روانہ ہوا۔ تقی خاں ایک بہادر سپاہی اور قابل جنرل تھا لیکن سید محمد خان نائب حاکم مرشد آباد کی سازشوں نے تقی خان کو اتنا موقع نہ دیا کہ وہ اپنے جوہر دکھا سکتا۔ سیر المتاخرین کا مصنف لکھتا ہے کہ ''اس جنگ میں انگریزوں کی کامیابی نوک شمشیر کی جگہ نوک زبان کی مرہون منت ہے۔'' کمپنی کے زبانی وعدوں نے میر قاسم کی فوجوں میں غداری، بے وفائی اور نمک حرامی پیدا کر دی۔ میر قاسم کا قابل جرنیل تقی خان میدان جنگ میں خاموش پڑا ہے۔ نواب انگریزوں سے آخری مرتبہ نبرد آزما ہونے کی فکر میں ہے۔ وہ انگریزوں کے وجود سے بنگال کو خالی کرنے پر تلا ہوا ہے۔ میر قاسم نے اودانالا ایسے مقام کو جنگ کے لیے انتخاب کر کے اپنی عسکری ذہانت کا سب سے بڑا ثبوت دیا۔ ایک ماہ تک انگریزی فوجوں نے نواب کی فوجوں کے مقابل آنے کی جرأت نہ کی۔ نواب کے فوجی افسر نجف خان نے شب خون سے انگریزی فوجوں پر لرزہ طاری کر رکھا تھا۔ اودانالا کی تسخیر کمپنی کی قوت سے بہت بالا تھی۔ نواب کی فوجیں باقاعدہ منظم اور محفوظ تھیں، لیکن اس کے آرمینی افسر محسن کش، غدار اور بے ایمان تھے۔ ان کی غداری نے اودانالا ایسے مستحکم مقام کو انگریزوں کے حوالہ کر دیا۔ (کمپنی کی حکومت، ص ۱۳۲-۱۳۱)

۷ر جولائی ۶۳ ۱ء: اودانالا کی شکست نے میر قاسم کو پریشان کر دیا۔ اس شکست کے بعد وہ

پٹنہ چلا گیا۔ پٹنہ میں اسی کے حکم سے میجر سمرو نے انگریز قیدیوں کو قتل کیا۔ میر قاسم کی مشکلات بڑھانے کے لیے کلکتہ کونسل نے ۷/ جولائی ۱۷۶۳ء کو میر جعفر کی نوابی کا اعلان کر دیا۔ کئی ایک پرانے درباریوں اور جاگیرداروں نے میر جعفر کا ساتھ دیا۔ (کمپنی کی حکومت، ص ۱۳۳)

۴/ دسمبر ۱۷۶۳ء: میر قاسم ۴/ دسمبر ۱۷۶۳ء کو اودھ کی مملکت میں داخل ہوا۔ مغل شہنشاہ شاہ عالم ابھی الہ آباد ہی میں تھا۔ شجاع الدولہ کا شاہ عالم پر بہت اثر تھا۔ چناں چہ اس خیال کے پیش نظر میر قاسم نے اپنے تئیں شجاع الدولہ کے حوالہ کر دیا۔ شجاع الدولہ نے بھی میر قاسم سے وعدہ کر لیا کہ وہ اسے مسند بنگال پر بٹھانے کے لیے انگریزوں سے جنگ کرے گا۔ شجاع الدولہ نے مندرجۂ ذیل مکتوب کلکتہ کونسل کو بھیجا:

"سابق شاہان ہند نے انگریزی کمپنی کے سوداگروں کو اس قدر اعزاز و مراعات دیے کہ ان کی مثال دیسی اور غیر انگریزی تاجروں میں نہیں ملتی۔ حال ہی میں اعلیٰ حضرت نے تمہارے حقوق سے زیادہ تم پر کرم کیا۔ لیکن ان احسانات کے باوجود کمپنی نے حکومت کے علاقوں پر قبضہ کر لیا۔ کمپنی اپنی خواہش کے مطابق نوابوں کو تاج و تخت سے محروم کرتی، اپنی مرضی کے مطابق انھیں نواب بناتی رہی۔ کمپنی نے ان معاملات میں کبھی دربار شہنشاہی سے مشورہ طلب نہیں کیا۔ کمپنی کا درباریوں کو قید کرنا، دربار اعلیٰ کی توہین کرنا، اپنے مظالم سے لوگون کو تباہ کرنا اور شہنشاہ کے خزانہ کی کمی کا سبب ہونا کیا معنی رکھتا ہے؟

ملک پر قبضہ جمانے کی ایک مکارانہ چال...... حکومت کے معاملات میں مداخلت نہ کرو، اپنے سپاہیوں کو ملک کے حصوں سے واپس منگا کر انھیں وطن بھیج دو۔ تجارت کرو اور صرف تاجر رہو۔ اس صورت میں حکومت تمھاری مدد کرتی رہے گی...... اگر ضدی اور نافرمان ہو تو یقین جانو کہ انصاف کی تلوار سے نافرمانوں کی گردنیں اڑا دی جائیں گی۔ اعلیٰ حضرت شہنشاہ ہندوستان کی ناراضگی کا نتیجہ تم بہت جلد محسوس کرو گے۔" (کمپنی کی حکومت، ص ۳۴-۱۳۳)

بکسر کی جنگ:

۱۵/ ستمبر ۱۷۶۴ء: شاہ عالم، شجاع الدولہ و میر قاسم کے حملۂ بہار سے انگریزوں کا مارے خوف کے کانپنا ایک فطری امر تھا۔ وہ نواب وزیر کے افسروں میں سازش پیدا کرنے میں کامیاب ہو گئے۔ نواب وزیر نے میر قاسم کے ساتھ انتہائی بدسلوکی شروع کر دی۔ نواب وزیر کی فوجیں پٹنہ کی طرف بڑھیں۔ کمپنی نے میجر منرو کو اس ہدایت کے ساتھ روانہ کیا کہ وہ جنگ کو جلد از جلد ختم کر

دے کیوں کہ کمپنی کو اندیشہ تھا کہ مرہٹے اور افغان کہیں نواب وزیر کی مدد پر آمادہ نہ ہو جائیں۔

بکسر کی جنگ ۱۵؍ستمبر ۱۷۶۴ء کو لڑی گئی۔ شجاع الدولہ کو نقصان عظیم کے ساتھ شکست کھانی پڑی۔ میر قاسم نے فرار ہو کر اپنی جان بچائی۔ شہنشاہ کمپنی سے جاملا۔

میر قاسم تاریخ کے اوراق سے غائب ہوتا ہے۔ (کمپنی کی حکومت، ص ۱۳۴)

۵؍فروری ۱۷۶۵ء: ۵؍فروری ۱۷۶۵ء کو مرشد آباد میں میر جعفر نے وفات پائی! میر جعفر اسپنسر کے ایام حکومت میں چل بسا۔ کمپنی نے میر جعفر سے جو عہد نامہ کیا اس میں اس کی جانشینی پر بحث نہیں کی گئی تھی۔ اس کی موت نے کمپنی کے ارکان اقتدار کے لیے رشوت کا دروازہ کھول دیا۔ میر جعفر کی رفیقۂ حیات منی بیگم نے میرن کے بیٹے کو وارث 'تاج وتخت' بنانے کے لیے لاکھوں روپیہ خرچ کیا لیکن کمپنی نے میر جعفر کے پندرہ سالہ فرزند نجم الدولہ کی نوابی کا اعلان کر دیا۔

نیا نواب و نیا معاہدہ لازم و ملزوم تھے!

نئے معاہدے کی رو سے نواب کے لیے ضروری تھا کہ وہ محمد رضا خان کو اپنا نائب مقرر

ثانیاً: محکمہ دیوانی کے تمام عہدے داروں کا تقرر و تعطل حکومت کلکتہ کے ایما سے ہوگا۔

ثالثاً: کمپنی کی افواج کے لیے نواب پانچ لاکھ روپیہ بدستور ادا کرتا رہے گا۔

رابعاً: نواب کو اسی قدر فوج رکھنے کی اجازت ہوگی جس سے وہ مالیہ جمع کرنے میں مدد لے سکے۔

خامساً: انگریز تاجر حدود مملکت میں تمام محاصل سے آزاد ہوں گے۔

نجم الدولہ نے عہد نامہ پر دستخط کرنے کے علاوہ کلکتہ کونسل کے ارکان کو بیس لاکھ روپیہ بطور ''نذرانہ'' پیش کیا۔ نواب نے انتہائی کوشش کی کہ نند کمار کو اس کا دیوان مقرر کیا جائے۔ کمپنی نے نواب کی درخواست کا یوں جواب دیا کہ نند کمار کو قید کر کے کلکتہ پہنچا دیا۔ (کمپنی کی حکومت، ص ۳۵-۱۳۴)

۳۰؍دسمبر ۱۷۶۵ء: بنگال کے انگریزی مقبوضات کا نیا گورنر کلائیو مئی ۱۷۶۵ء کو کلکتہ پہنچا۔ ۳۰؍دسمبر ۱۷۶۵ء کو اس نے کورٹ آف ڈائریکٹرز کو مندرجہ ذیل مکتوب لکھا:

''کمپنی کے حالات بگڑ چکے ہیں کہ ہر صاحب عزت کا اس سے لرزہ براندام ہونا یقینی ہے ...... دولت کی اچانک کثرت نے انتہائی عشرت کے دروازے کھول رکھے ہیں...... چھوٹے بڑے

سب ایک ہی مرض کا شکار ہیں۔

فوجوں کی حالت اس سے بھی بدتر ہے۔ کسی شہر پر قبضہ کرنے کے بعد وہاں کی تمام دولت پر فوجی قابض ہو جاتے ہیں۔ میں آپ کو یقین دلاتا ہوں کہ بنارس میں ایسا ہوا۔

ظلم وستم کے دروازے جو کمپنی کے ملازموں نے کھول رکھے ہیں انگریزوں کو بدنام کرنے کے لیے کافی ہیں۔

انگریزی شرافت، کمپنی کی نیک نامی اور انصاف وانسانیت کا خون کرتے ہوئے حرص وآز اور عیش وعشرت نے سیاسیات میں ایک نیا راستہ کھول رکھا ہے۔''

کلاؤ کے اس مکتوب کا جواب دیتے ہوئے کورٹ آف ڈائریکٹرز نے لکھا:

''ہمارے خیال میں اندرون ملک کی تجارت سے جو دولت کمائی گئی ہے وہ محض ظلم وستم سے حاصل کی گئی۔ ظلم وستم کی ایسی مثالیں کسی زمان ومکان میں نہیں مل سکتیں۔''

''ہم یورپی دلالوں کی ستم رانیوں کا عرصے سے مطالعہ کر رہے ہیں...... ہمیں توقع ہے کہ حضور عالی ایسے دلالوں کو پریزیڈنسی کے تحت لانے کی ہر ممکن کوشش کریں گے۔'' (کمپنی کی حکومت، ص ۳۶۔۱۳۵)

اگست ۱۷۶۶ء: ان اصلاحات سے کلاؤ کا مقصد حکومت کلکتہ کے دست وبازو کو طاقت ور بنانا تھا۔ وہ چاہتا تھا کہ بنگال، بہار اور اڑیسہ میں انگریز اسی طرح حکومت کریں جس طرح پیشوا، نظام اور نواب وزیر پونہ، حیدرآباد اور لکھنو میں کر رہے تھے۔ کلاؤ انگریزوں کے لیے شہنشاہ سے دیوانی حقوق حاصل کرنا چاہتا تھا۔ وہ شہنشاہ سے ملاقات کرنے کے لیے نکل پڑا۔ شہنشاہ اس وقت تک الٰہ آباد میں تھا۔ راستہ میں مرشد آباد پر کلاؤ نے قبضہ کیا۔ اب نواب کا وجود محض سایہ کی حیثیت رکھتا تھا۔ شجاع الدولہ چوں کہ ان دنوں بنارس میں تھا اس لیے کلاؤ اس کی ملاقات کے لیے بنارس پہنچا۔ ۱۲/اگست کو پہلی مرتبہ کلاؤ نواب وزیر سے ملا۔ اس ملاقات کا نتیجہ ایک عہد نامہ کی صورت میں رونما ہوا جس کے ذریعے الٰہ آبا اور کورہ نواب وزیر سے چھین لیے گئے۔ نیز نواب نے چھ لاکھ پونڈ تاوان جنگ ادا کیا۔ وہ وزارت روندنے کے بعد شاہیت زیر کرنے کے لیے الٰہ آباد روانہ ہوا۔

۹/اگست ۱۷۶۶ء: کلاؤ ۹/اگست کو شاہ عالم سے ملا۔ شاہ عالم نے بنگال، بہار، اڑیسہ کے دیوانی حقوق کمپنی کے حوالے کرتے ہوئے سوائے ذاتی مفاد کے اور کسی امر کو پیش نظر نہیں رکھا۔

نواب نجم الدین کا قتل:

مرشد آباد میں پر اسرار واقعات رونما ہو رہے تھے۔نوجوان نواب نجم الدولہ کی اچانک موت کے متعلق 'سیر المتاخرین' کا مصنف لکھتا ہے:

''اس امر کا تذکرہ ضروری معلوم ہوتا ہے کہ لارڈ کلاؤ مرشد آباد میں قیام کرنے کے بعد سادھو باغ میں مقیم رہا۔ جہاں نجم الدولہ اور محمد رضا خان نے اس کی خاطر و مدارات کی۔اس کے رخصت ہونے پر دونوں اپنے محلوں میں واپس جا رہے تھے کہ اچانک نجم الدولہ کو تکلیف محسوس ہوئی۔نواب نے محل میں پہنچ کر جان دے دی۔'' وہی مصنف حاشیہ میں لکھتا ہے:

''میں اس وقت نوجوان شاہزادے کے محل کے پاس سے گزر رہا تھا......زبان خلق پر محمد رضا خان تھا۔''

رضا خان انگریزوں کا دوست تھا اور اس حرکت کا کمپنی کے ارکان کے اشارے سے پایۂ تکمیل تک پہنچنا بعید از قیاس معلوم نہیں ہوتا۔''ہندوستان میں نصرانی اقتدار کا عروج'' کا مصنف اس ضمن میں رقم طراز ہے کہ ''نجم الدولہ کی موت میں کلاؤ کا ہاتھ ہے۔''

نجم الدولہ کی موت سے بنگال میں مرشد آباد کے نوابوں کا تذکرہ ختم ہو جاتا ہے۔اب بنگال کی تاریخ کا عنوان انگریزی حکمرانوں کا نام ہے۔(کمپنی کی حکومت، ص ۳۸۔۱۳۷)

۱۷۶۹ء تا ۱۷۷۰ء

بنگال کا قحط:

۱۷۶۹ء کے جاڑوں میں بنگال میں ایک ایسا قحط پڑا جس کی تباہ کاریاں دو نسلوں تک باقی رہیں۔کمپنی کی سرگرمیوں کا تذکرہ لکھنے والے انگریز مورخوں نے بنگال کے اس ہولناک حادثے کی طرف بہت کم توجہ دی ہے لیکن اس زمانے کے ریکارڈوں میں اس قحط کی تباہ کاریوں کی پوری تصویر اب تک موجود ہے۔اس قحط نے بنگال کو چالیس سال تک متاثر کیے رکھا۔اضلاع کے انگریز افسروں نے قحط سے چند مہینے پہلے کلکتہ کونسل کو آنے والے واقعات سے آگاہ کر دیا لیکن کلکتہ کونسل کے ارکان نے ان افسروں کی باتوں پر کان نہ دھرے۔بنگال کی مال گزاری کی تاریخ ایسے واقعات سے بھری پڑی ہے کہ جب کبھی حکومت کے کارندوں نے حکومت کو فصل کے خراب ہونے کی اطلاع دی تو حکومت نے یا تو مال گزاری معاف کر دی یا پھر اس میں اس حد تک کمی کر دی کہ

کسانوں کو اس کی ادائیگی گراں نہ گزری۔ لیکن کونسل کے ارکان نے بنگال کی ان روایات کو سامنے نہ رکھا۔ جب کمپنی کے افسروں نے کونسل کو فصل خراب ہو جانے کی اطلاع دی تو اس پر کونسل کی طرف سے مال گزاری کی معافی یا اس میں کمی کے احکام جاری نہ ہوئے۔ چناں چہ کمپنی کے افسروں نے قحط کے مارے ہوئے لوگوں سے مال گزاری وصول کر کے انھیں بھوکوں مرنے کے لیے چھوڑ دیا۔ بپتا کے مارے ہوئے لوگوں کی مصیبتوں کو بڑھانے کے لیے کونسل نے مال گزاری میں دس فی صد اضافہ کر دیا۔

مئی ۱۷۷۰ء میں جب حالات بہت زیادہ بگڑ گئے تو کونسل نے کمپنی کی مجلس نظامت کو لکھا کہ ''اموات و افلاس کی تباہ کاریاں بیان نہیں کی جاسکتیں۔ پورینیا کے سرسبز صوبے کی ایک تہائی آبادی مر چکی ہے۔ دوسرے حصوں کی کیفیت بھی کم و بیش یہی ہے۔'' کسانوں نے اپنے مویشی اور ہل، بیچ دیے، انھوں نے اپنے بچوں کو فروخت کر دیا۔ جب بچے خریدنے والا کوئی نہ رہا تو وہ درختوں کے پتے کھانے لگے۔

جون ۱۷۷۰ء میں مرشد آباد کے انگریز ریذیڈنٹ نے تسلیم کیا کہ زندوں نے مردے کھانے شروع کر دیے ہیں۔ بھوک اور افلاس کے مارے ہوئے کسانوں نے اپنے گھروں کو چھوڑ دیا۔ وہ شہروں کی طرف چل دیے۔ صرف مرنے کے لیے! بنگال کے سرسبز گاؤں ایک سال بھر ویرانوں میں بدل گئے۔ انسانوں کی صورت ڈھونڈنے سے بھی دکھائی نہیں دیتی تھی۔ ان سخت جانوں کے لیے جنھیں قحط موت کے منہ تک نہ پہنچا سکا۔ وباؤں نے گھیر لیا۔ اب وہ کہاں جاسکتے تھے، قحط جنھیں موت تک نہ پہنچا سکتا وبا موت کی صورت میں خود ان تک پہنچ جاتی۔ لاکھوں ایسے بدنصیب تھے جو ستمبر کی فصل کا انتظار نہ کر سکے۔ وہ ان لہلہاتے ہوئے خوشوں کو دیکھتے رہے جن کے پکنے سے پہلے انھیں مرنا تھا۔ دسمبر کی فصل ستمبر سے بھی اچھی رہی۔ لیکن مرنے والوں کی گنتی بڑھتی چلی آئی۔ اس اچھی فصل کو کمپنی کے کارندوں نے سستے داموں اناج خریدنے اور ذخیرہ کرنے کا حیلہ بنا لیا۔ کمپنی نے اپنے گوداموں کو اناج سے بھر لیا۔ رعایا کا پیٹ کون بھرتا؟

اس قحط نے بنگال کی ایک تہائی آبادی کو موت کا شکار بنا دیا۔ اگلے سال بنگال پھر سرسبز اور شاداب ہو گیا لیکن ہل چلانے والے کہاں تھے۔ بنگال کے زرخیز ترین خطوں میں بھی ویرانی دکھائی دیتی تھی لیکن کمپنی کو یہ غم کھائے جا رہا تھا کہ ''زمینیں ویران ہونے سے مال گزاری گھٹتی چلی جا رہی ہے۔'' کونسل کے ارکان کو لاکھوں انسانوں کا بھوک سے مر جانا متاثر نہ کر سکا۔ وہ متاثر

ہوئے بھی تو صرف مال گزاری کے گھٹنے سے! کتنے سادہ تھے مرنے والے؟ اور کتنے ہوشیار تھے؟ مال گزاری والے؟ (کمپنی کی حکومت، ص ۴۵-۱۴۳)

کونسل کے ارکان نے کمپنی کی مجلس نظامت کو جو چٹھیاں لکھیں تھیں ان سے بھی اس قحط کی تباہ کاریوں کا اندازہ کیا جا سکتا ہے۔

۲۳ رنومبر ۱۷۶۹ء: ''اناج کی کمی سے جو تباہی پیدا ہو سکتی ہے، وہ ہماری آنکھوں کے سامنے ہے۔ بارش نہ ہونے سے بنگال کے ہر حصے میں قحط کے آثار دکھائی دیتے ہیں۔ بڑے بوڑھوں کا کہنا ہے کہ ایسا قحط پڑے گا جس کی مثال نہ مل سکے گی۔ ہمارے خیال میں چھ مہینے سے پہلے قحط دور نہیں ہو سکے گا اس لیے ہم نے ابھی سے اپنی فوج کی ضرورت کے مطابق اناج حاصل کرنے کا حکم دے دیا ہے۔''

۲۵ رجنوری ۱۷۷۰ء: ''ہم آپ کو نہایت افسوس کے ساتھ اطلاع دیتے ہیں کہ ہم نے اپنے خط مورخہ ۲۳ رنومبر ۱۷۶۹ء میں جن خدشات کا ذکر کیا تھا وہ اب سارے بنگال کو گھیرے ہوئے ہیں۔ بردوان کے راجے اور وہاں کے ریزیڈنٹ نے جو عرض داشت بھیجی ہے اسے کلکٹر جنرل نے ہمارے سامنے پیش کر دیا ہے اس میں ہم سے یہ مطالبہ کیا گیا ہے کہ اس سال مال گزاری میں کمی کر دی جائے۔ ہمارے خیال میں ایسا کرنے سے کسانوں کو بھی بہت زیادہ فائدہ ہوگا۔ ہم یہ بھی جانتے ہیں کہ اس طرز عمل سے آپ کو عارضی تکلیف ہوگی، لیکن آپ کو مجموعی طور پر گھاٹا نہیں رہے گا کیوں کہ اگر اگلے سال حالات اچھے ہو گئے تو اس کمی کو پورا کر لیا جائے گا۔''

۴ رفروری ۱۷۷۰ء: ''ہمیں اس وقت تک بنگال میں مال گزاری وصول کرنے میں کسی قسم کی ناکامی نہیں ہوئی۔''

۹ رمئی ۱۷۷۰ء (خفیہ): ''پچھلے چھ مہینوں سے بنگال کے اضلاع میں ایک بوند تک نہیں پڑی۔ قحط، اموات اور افلاس کا تذکرہ بیان سے باہر ہے۔ پورینیا میں ایک تہائی آبادی مر چکی ہے۔ دوسرے اضلاع کی بھی یہی حالت ہے۔ بہار کے ناظم نے ریزیڈنٹ کو اطلاع دی ہے کہ اپریل کی فصل بہت خراب ہوئی ہے اس لیے بانکی پور کی فوج کو وہاں سے ہٹا لیا جائے تاکہ فوج کو جو اناج صرف کرنا ہے اس سے ہزاروں لوگوں کی جانیں بچائی جا سکیں نیز یہ کہ اناج کی قیمت بہت چڑھ گئی ہے۔''

۲۸ رجون ۱۷۷۰ء: ''اس مدت میں بہت کم تبدیلی ہوئی ہے۔ ہم نے جس قحط کا ذکر کیا تھا

اس کی تباہ کاریوں میں کسی قسم کا فرق نہیں آیا۔ ہماری تمام کوششوں کے باوجود تباہی اور بربادی بڑھتی چلی جارہی ہے۔ آپ کے منافع میں کمی یقینی ہے۔"

دیسی افسروں کی رپورٹیں:

کلکتہ کونسل کی ان چٹھیوں کے علاوہ ان عرض داشتوں سے بھی اس قحط کی تباہ کاریوں کا اندازہ لگایا جاسکتا ہے جو بنگال کے ذمے دار دیسی افسروں نے کلکتہ کونسل کو لکھیں۔

مہاراجا شتاب رائے:

"اس صوبے میں اناج کی اس حد تک کمی ہے کہ پٹنہ کے بازاروں میں ہر روز پچاس انسان بھوک سے مرجاتے ہیں۔ دوسرے اضلاع میں حالات اس سے بھی زیادہ خراب ہیں۔ بانکی پور کی انگریزی فوج کے لیے ڈھاکہ سے چالیس ہزار من چاول ابھی تک نہیں پہنچ سکا۔ آپ سے درخواست ہے کہ آپ اناج کی اس مقدار کو بہت جلدی پٹنہ پہنچادیں تاکہ فوج اس صوبے کے اناج کو صرف کرنا شروع نہ کردے جو خود اس کی اپنی ضرورت کے لیے ناکافی ہے۔" (۴ر جنوری ۱۷۷۰ء کو ملی۔)

محمد رضا خان:

"میں نے مال گزاری وصول کرنے کے لیے ہر امکانی کوشش صرف کردی ہے۔ خدا کے کاموں میں دخل نہیں دیا جاسکتا، میں آپ سے ملک کی تباہ کاری بیان نہیں کرسکتا۔ تالاب اور چشمے سوکھ چکے ہیں، پانی حاصل کرنا دشوار ہوچکا ہے۔ قحط کی تباہ کاریوں کو آگ نے مکمل کردیا ہے۔ راجا گنج، دیوان گنج، دیناج پور اور پورینیا میں اناج کے جو ذخیرے باقی تھے وہ سب آگ نے جلا ڈالے۔ میں نہیں جانتا کہ اس ملک کے تقدیر میں کیا لکھا ہے۔ صرف خدا ہی ہمیں اس مصیبت سے رہائی دلاسکتا ہے۔" (۱۵ر مئی ۱۷۷۰ء کو ملی)۔

بنگال کے اس قحط کو کمپنی کے افسروں اور ملازموں نے دولت جمع کرنے کا ایک اچھا موقع جان کر اس سے خوب فائدہ اٹھایا۔ کمپنی کی مجلس نظماء (بورڈ آف ڈائریکٹرز) نے ۲۸ر اگست ۱۷۷۱ء کو کونسل کو جو مراسلہ بھیجا اس میں ان لوگوں کی جنھوں نے قحط کے دنوں میں لوگوں کو مصیبت سے بچانے کی کوشش کی تعریف کرنے کے بعد "مجلس نظماء ان لوگوں (خاص کر انگلستان کے رہنے والوں) کے خلاف ناراضگی کا اظہار کرتی ہے جنھوں نے اس عوامی تباہی کو ذاتی فائدے کا

ذریعہ بنایا۔ محمد رضا خان کے مراسلات میں بتایا گیا ہے کہ انگریزوں نے نہ صرف اناج کا ذخیرہ کر لیا بلکہ انھوں نے کسانوں کو مجبور کر دیا کہ وہ اگلی فصل کے لیے رکھے ہوئے بیج کو بھی بیچ ڈالیں۔

۱۷۷۰ء کی شروع میں جان شور انگلستان سے کلکتہ پہنچا۔ اس نوجوان نے آگے چل کر بہت بڑا عہدہ پایا، لیکن اس وقت وہ ایک معمولی حیثیت سے ایسٹ انڈیا کمپنی کی ملازمت کے سلسلے میں کلکتہ پہنچا تھا۔ بنگال کے قحط نے اس پر جو اثر کیا اسے اس نے ایک نظم میں پیش کیا تھا۔

فاکس ایسٹ انڈیا بل پر تقریر کرتے ہوئے اڈمنڈ برک نے اس قحط کی تباہ کاریوں کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا تھا کہ:

''ہندوستان پر تاتاریوں کا حملہ بہت خوف ناک تھا لیکن ہم ہندوستان کو اپنی حفاظت میں لے کر اسے زیادہ تباہ کر رہے ہیں۔ وہ تاتاریوں کی دشمنی تھی اور یہ ہماری دوستی ہے۔ ہمارے مفتوحہ علاقے کی بدحالی آج بھی ویسی ہے جیسی بیس سال پہلے تھی۔ ہندوستانیوں سے ہمدردی کیے بغیر چند چھوکرے ان پر حکومت کر رہے ہیں۔ ہر وہ روپیہ جو انگریز کو نفع میں حاصل ہوتا ہے اصل میں ہندوستان کا نقصان ہے۔'' (کمپنی کی حکومت، ص ۴۸۔۱۴۶)

۱۷۷۱ء

نجیب الدولہ اور نواب دوندے خان، کی موت (۱۷۷۰ء) کے بعد جب ۱۷۷۱ء میں مرہٹوں نے دلی پر قبضہ کیا تو ضابطہ خان کو دلی چھوڑ کر بھاگنا پڑا۔ اب مرہٹوں نے شاہ عالم کو الہ آباد سے بلا کر اسے دہلی کے تخت پر بٹھایا۔

پانی پت کی لڑائی میں نواب وزیر شجاع الدولہ اور روہیلہ سرداروں نے جو طرز عمل اختیار کیا تھا وہ مرہٹوں کو یاد تھا۔ مرہٹوں نے روہیل کھنڈ اور اودھ سے انتقام لینے کا تہیہ کر رکھا تھا۔ جب شاہ عالم دلی پہنچ گیا تو مرہٹوں نے شاہ عالم کو اپنے ساتھ لے کر روہیل کھنڈ پر حملہ کر دیا۔ روہیلہ سرداروں کے لیے مرہٹوں اور شاہ عالم کی متحدہ فوجوں کا مقابلہ کرنا بہت مشکل تھا۔ متحدہ فوجوں نے روہیل کھنڈ کو ایک سرے سے دوسرے سرے تک پامال کیا۔ کھیت کاٹ لیے گئے، بستیاں جلا ڈالی گئیں، محل اور مکان لوٹ لیے گئے، متحدہ فوجوں نے ضابطہ خان کے خاندان کے لوگوں کو قید کر لیا گیا۔ قید ہونے والوں میں سے ضابطہ خان کا خوبصورت بیٹا غلام قادر خان تھا جس نے آگے چل کر اپنی کسی ہتک یا کسی بدسلوکی کا شاہ عالم سے انتقام لیا۔ جب روہیل کھنڈ اس طرح تباہ و برباد ہو رہا تھا تو حافظ رحمت خان اور نواب ضابطہ خان نے شجاع الدولہ سے امداد مانگی۔ شجاع الدولہ کو یقین ہو گیا تھا کہ روہیل کھنڈ کی تباہی کے بعد مرہٹوں اور شہنشاہ کی فوجیں اودھ پر حملہ کریں گی۔ مرہٹے نہ صرف اودھ پر حملہ کرنا چاہتے تھے بلکہ انھوں نے اودھ سے نکل کر بہار اور بنگال میں انگریزوں سے لڑنے کا تہیہ کر لیا تھا۔ ان حالات میں شجاع الدولہ نے کلکتہ کونسل سے مدد مانگی۔ (کمپنی کی حکومت، ص ۱۶۴)

۲۰ جنوری ۱۷۷۲ء کو بنگال آرمی کے کمانڈر سر رابرٹ بارکر اور نواب شجاع الدولہ میں فیض آباد میں ملاقات ہوئی۔ اگلے دن رابرٹ بارکر نے کلکتہ کونسل کو بات چیت کے تمام پہلوؤں سے آگاہ کرنے کے لیے اپنی رپورٹ بھیجی۔ کلکتہ کونسل سے اجازت مل جانے کے بعد رابرٹ بارکر اور شجاع الدولہ روہیل کھنڈ کی طرف بڑھے۔ اسی اثنا میں مرہٹوں نے شجاع الدولہ اور روہیلوں کے اس تعاون کو توڑنے کے لیے دونوں کے ساتھ بات چیت شروع کر دی۔ شجاع الدولہ بہت حد تک مرہٹوں سے سمجھوتا کرنے اور روہیل کھنڈ پر ان کا قبضہ ماننے کے لیے تیار ہو چکا تھا۔ لیکن رابرٹ بارکر نے شجاع الدولہ کو مرہٹوں سے لڑنے کا مشورہ دیا۔ شاہ آباد میں شجاع الدولہ، رابرٹ بارکر، حافظ رحمت خان اور نواب ضابطہ خان میں ایک کانفرنس ہوئی جس میں روہیلوں اور نواب وزیر

کے درمیان ایک معاہدہ ہوا جس میں روہیلوں نے مرہٹوں کے خلاف لڑنے کے لیے نواب وزیر کا ساتھ دینے کا یقین دلایا اور نواب وزیر سے وعدہ کیا کہ اگر وہ مرہٹوں کو روہیل کھنڈ سے نکال دے تو روہیلے سردار سے چالیس لاکھ روپیہ دیں گے۔ جب روہیلہ سرداروں اور شجاع الدولہ میں معاہدہ ہونے لگا تو مرہٹوں نے واپس جانے کی تیاریاں شروع کر دیں۔ برسات سے پہلے ہی وہ واپس ہوگئے۔ ضابطہ خان کی بیوی اور بیٹے کو بھی رہا کر دیا گیا۔ مرہٹوں کے جاتے ہی روہیلہ سرداروں نے روہیل کھنڈ پر قبضہ کرلیا۔ نواب وزیر اور رابرٹ بارکر فیض آباد چلے گئے۔

روہیل کھنڈ سے مرہٹوں کے چلے جانے کے بعد روہیلہ سرداروں کی باہمی پھوٹ نے ان کے سیاسی اقتدار کو کافی نقصان پہنچایا۔ کئی ایک روہیلہ۔ سرداروں کی بغاوتوں نے اس نقصان میں اضافہ کیا۔ (کمپنی کی حکومت، ص ۶۵-۱۶۴)

جولائی ۱۷۷۲ء میں ضابطہ خان نے مرہٹوں سے اس شرط پر الگ سمجھوتا کرلیا کہ اس کے مقبوضات اسے واپس کر دیے جائیں اور یہ کہ اسے شاہ عالم کا وزیر اعظم بنا دیا جائے۔ ضابطہ خان اور مرہٹوں کے اس سمجھوتے سے شجاع الدولہ نے یہ سمجھا کہ جونہی برسات ختم ہوئی مرہٹے اودھ پر حملہ کر دیں گے۔ اب شجاع الدولہ نے وارن ہیسٹنگز سے فوجی مدد طلب کی۔ ہیسٹنگز نے فوجی مدد دینے کا اقرار کرلیا۔ (کمپنی کی حکومت، ص ۱۶۵)

۱۸ر نومبر ۱۷۷۲ء: بالاجی راؤ کی وفات پر اس کا بیٹا مادھوراؤ پیشوا بنا۔ چوں کہ وہ نابالغ تھا اس لیے اس کا چچا رگھوبا اس کا ولی مقرر کیا گیا۔ رگھوبا کے عہد میں پہلی مرتبہ پونا اور ایسٹ انڈیا کمپنی میں عہد نامہ ہوا۔ اس عہد نامے سے رگوبا کا مقصد کمپنی سے گولہ بارود اور چند فوجی سپاہی حاصل کرنا تھا۔ رگوبا کے زمانے میں مرہٹوں کو نظام کے حملے کا بہت اندیشہ تھا۔ کمپنی کے لیے اس سے بہتر موقع مداخلت کا اور کیا ہوسکتا تھا؟ کمپنی نے سلسٹ اور بسین کے معاوضے میں فوجی مدد کا وعدہ کرلیا۔ چوں کہ نظام دکن نے مرہٹوں پر حملہ نہ کیا اس لیے رگوبا کو کمپنی کی مدد کی ضرورت نہ رہی۔ سلسٹ اور بسین کمپنی کے قبضہ سے بچ گئے!

جب مادھوراؤ پیشوا بالغ ہوا تو اس نے نظم مملکت کو ابتر پایا۔ جوان اور ذہین پیشوا نے چچا کو بدعنوانیاں ختم کرنے کے لیے کہا، لیکن بے سود، آخر پیشوا نے رگھوبا کو قید کرلیا۔ نوجوان پیشوا ۱۸ر نومبر ۱۷۷۲ء کو ۲۸ سال کی عمر میں مرگیا۔ موت سے قبل وہ اپنے چچا رگھوبا کو قید سے رہا کر چکا تھا۔ مادھوراؤ لاولد تھا۔ اس کی بیوی بھی اس کی موت پر ستی ہوگئی۔ بستر مرگ پر مادھوراؤ نے اپنے

بھائی نارائن راؤ کو پیشوا نامزد کیا۔ رگھوبا اس نئے پیشوا کا سرپرست مقرر ہوا۔ چچا کو انتقام لینے کا موقع مل گیا۔ رگھوبا نے نارائن راؤ کو ۳۰ راگست ۱۷۷۳ء کو قتل کرا دیا۔ (کمپنی کی حکومت، ص ۷۶۔۱۷۵)

مارچ ۱۷۷۳ء: مرہٹوں نے دلی پہنچ کر ضابطہ خان کو شاہ عالم کا وزیر اعظم مقرر کرنے کے بعد شاہ عالم سے کورہ اور الہ آباد کے اضلاع حاصل کر لیے۔ ان اضلاع کو شاہ عالم انگریزوں کے حوالے کر چکا تھا۔ شجاع الدولہ نے مرہٹوں اور ضابطہ خان کے اتحاد سے یہ اندازہ لگایا تھا کہ مرہٹے روہیل کھنڈ پر پھر حملہ کرنے والے ہیں۔ مرہٹوں نے ۱۷۷۳ء کے شروع میں روہیل کھنڈ پر حملہ کر دیا۔ شجاع الدولہ نے انگریزوں سے مدد مانگی۔ وارن ہیسٹنگز نے شجاع الدولہ کی مدد کے لیے انگریزی فوج بھیج دی۔ نواب اور انگریزی فوج مارچ ۱۷۷۳ء میں روہیل کھنڈ میں داخل ہوگئی حال آں کہ اس وقت کسی روہیلہ سردار نے شجاع الدولہ سے مدد نہیں مانگی تھی۔ ضابطہ خان نے حافظ رحمت خان سے بات چیت کی تاکہ اسے مرہٹوں سے سمجھوتا کرنے پر آمادہ کر سکے۔ اسی اثنا میں شجاع الدولہ نے رابرٹ بارکر کے سامنے یہ تجویز پیش کی کہ روہیلوں کو روہیل کھنڈ سے نکال کر اسے اودھ میں شامل کر دیا جائے۔ حافظ رحمت خاں نے مرہٹوں کے ساتھ سمجھوتا کرنے سے انکار کر دیا تھا۔ اودھ اور انگریزوں کی فوج رودم گھاٹ کی طرف بڑھتی دیکھ کر مرہٹوں نے واپسی کی راہ لی۔ اب شجاع الدولہ نے معاہدے کے مطابق حافظ رحمت خان سے رقم طلب کی۔ حافظ رحمت خان نے کہا کہ وہ دوسرے روہیلہ سرداروں سے مشورہ کرنے کے بعد جواب دے گا۔

۱۲ رمئی ۱۷۷۳ء کو شجاع الدولہ کی فوج روہیل کھنڈ چھوڑ کر اودھ کی طرف چل دی۔ رقم ادا کرنے میں حافظ رحمت خان کی تھوڑی تاخیر نے شجاع الدولہ کے لیے موقع پیدا کر دیا کہ وہ انگریزی فوج کی مدد سے روہیل کھنڈ پر قبضہ کرے۔ (کمپنی کی حکومت، ص ۶۶۔۱۶۵)

۱۹ راگست ۱۷۷۳ء میں وارن ہیسٹنگز نے بنارس میں شجاع الدولہ سے ملاقات کی۔ اس ملاقات میں شجاع الدولہ اور وارن ہیسٹنگز میں جو معاہدہ ہوا اس کی رو سے کمپنی نے پچاس لاکھ روپے میں کورہ اور الہ آباد کے اضلاع شجاع الدولہ کے ہاتھ بیچ دیے۔ اسی اثنا میں شاہ عالم کا ایک خط وارن ہیسٹنگز کو ملا جس میں مطالبہ کیا گیا تھا کہ وارن ہیسٹنگز ''کورہ اور الہ آباد کے اضلاع مابدولت کے حوالے کر دے اور اس کے ساتھ ہی بنگال کا خراج بھی بھیجنا شروع کر دے۔'' کورہ اور الہ آباد کو وارن ہیسٹنگز فروخت کر چکا تھا۔ خراج دینے سے اس نے انکار کر دیا۔ میکالے کے

الفاظ میں ''ہیسٹنگز کو مقبوضات کی ضرورت نہیں تھی بلکہ دولت کی۔ اس نے کورہ اور الہ آباد کو فروخت کرنے کا تہیہ کرلیا۔ خریدار کی کمی نہیں تھی۔ شجاع الدولہ کا خزانہ بھرا ہوا تھا۔ بیچنے والے اور خریدنے والے میں سودا ہوگیا۔'' (کمپنی کی حکومت، ص ۱۶۶)

۲۳ر اپریل ۱۷۷۴ء: بنارس ہی میں شجاع الدولہ نے وارن ہیسٹنگز کے ساتھ روہیل کھنڈ پر حملہ کرنے کا فیصلہ کرلیا تھا۔ شجاع الدولہ نے اس مہم کے کامیاب ہونے کی صورت میں کمپنی کو چالیس لاکھ روپے دینا منظور کیا۔ جب شجاع الدولہ نے اٹاوہ پر حملہ کرنا چاہا تو وارن ہیسٹنگز نے فوجی امداد پر چند شرطیں لگا دیں۔ شجاع الدولہ نے ان شرطوں کو ماننے سے انکار کردیا لیکن اس پر بھی اس نے اٹاوہ پر حملہ کردیا۔ مرہٹوں نے مقابلہ نہ کرتے ہوئے شہر کو خالی کردیا۔ شجاع الدولہ نے وارن ہیسٹنگز سے پھر فوجی مدد مانگی۔ وارن ہیسٹنگز نے مدد دینے کا اقرار کرلیا۔ چناں چہ کرنل چیمپین کو شجاع الدولہ کی مدد کے لیے بھیجا گیا۔ شاہ آباد کے قریب شجاع الدولہ اور کمپنی کی فوجیں اپریل ۱۷۷۴ء میں ایک دوسرے سے ملیں، شجاع الدولہ نے اپنے ایلچی کو حافظ رحمت خان کے پاس بھیجا تاکہ ۱۷۷۲ء کے معاہدے کے مطابق اسے رقم ادا کرنے پر آمادہ کرے۔ اس اثنا میں حافظ رحمت خان اور کرنل چیمپین میں خط و کتابت ہوتی رہی۔ حافظ رحمت خان نے اپنے خطوں میں اپنی اور دوسرے روہیلہ سرداروں کی مالی پریشانیوں کو ظاہر کرتے ہوئے شجاع الدولہ سے درخواست کی کہ وہ اس وقت موجود رقم کا مطالبہ نہ کرے۔ جونہی حالات اچھے ہوئے، یہ رقم آہستہ آہستہ ادا کردی جائے گی۔ حافظ رحمت خان کے دردناک لفظوں کا شجاع الدولہ اور کرنل چیمپین پر کوئی اثر نہ ہوا۔ ۲۳ر اپریل ۱۷۷۴ء کو سیرن پور کٹرہ میں لڑائی ہوئی۔ روہیلوں نے حملہ آوروں کا بڑی بہادری سے مقابلہ کیا۔ حافظ رحمت خان لڑتا ہوا مارا گیا۔ (کمپنی کی حکومت، ص ۶۷۔۱۶۶)

۷ر اکتوبر ۱۷۷۴ء: حافظ رحمت خان کی موت کے بعد علی محمد کا بیٹا فیض اللہ خان روہیلوں کا سردار بنا۔ وہ اپنی فوج سمیت گڑھوال کی پہاڑیوں میں پناہ گزیں ہوگیا۔ فیض اللہ خان نے شجاع الدولہ کے سامنے صلح کی شرطیں پیش کیں لیکن وارن ہیسنگز یہ نہیں چاہتا تھا کہ روہیلوں اور شجاع الدولہ میں سمجھوتا ہو جانے۔ چناں چہ اس کی ہدایات کے مطابق کرنل چیمپئن نے شجاع الدولہ پر دباؤ ڈال کر اسے روہیلوں سے سمجھوتا کرنے سے دور رکھا۔ لیکن ۷ر اکتوبر ۱۷۷۴ء کو شجاع الدولہ اور فیض اللہ خان میں سمجھوتا ہوگیا۔ فیض اللہ خان رام پور چلا گیا۔ معاہدے کے مطابق اس نے اپنی حفاظت کے لیے صرف پانچ ہزار سپاہی رکھے۔'' (ایضاً، ص ۱۶۷)

روہیل کھنڈ کی تباہی:

نواب شجاع الدولہ اور انگریزی فوج نے روہیل کھنڈ پر حملہ کرنے اور فیض اللہ خان سے سمجھوتا کرنے کی درمیانی مدت میں روہیل کھنڈ کے سیکڑوں گاؤں جلا دیئے۔ روہیلوں کی شکست کے بعد شجاع الدولہ نے حافظ رحمت خان کے بیٹے مہابت خان سے اس کے باپ کا خزانہ دریافت کیا جس پر مہابت خان نے کہا کہ اس کے باپ کے پاس اپنی رعایا کی محبت کے سوا اور کوئی خزانہ نہیں تھا۔ اس پر شجاع الدولہ نے حافظ رحمت خان کی بہو بیٹیوں کو خیموں میں قید کر کے ان کے گھروں کی تلاشی لی۔ شجاع الدولہ نے نواب دوندے خان کے بیٹوں کو گرفتار کر کے ان کی جائیداد ضبط کر لی۔ حافظ رحمت خان کے خاندان کو الہ آباد میں نظر بند کر دیا گیا۔

مل کے الفاظ میں "ہر وہ شخص جس کا نام روہیلہ تھا۔ موت کے گھاٹ اتار دیا گیا یا جلاوطن کر دیا گیا۔" میکالے روہیلوں کی تباہی کا اس طرح ماتم کرتا ہے:

"ایک لاکھ سے زاید انسان بے خانماں ہو کر وبائی علاقہ کی طرف بھاگ نکلے...... انھوں نے اپنی بیبیوں اور بیٹیوں کو انتہائی مصیبت میں دیکھا...... ان کے دیہات جلا دیے گئے۔ ان کے بچے ذبح کر دیے گئے۔ ان کی عورتیں بے عزت کی گئیں۔"

لائل لکھتا ہے کہ

"برطانوی عساکر ایک ایسی قوم کے خلاف صف آرا ہوئے جس سے انھیں کوئی پرخاش نہ تھی۔"

برطانیہ کے پارلیمانی خطیب برک نے یوں کہا:

"جناب ہیسٹنگز اس امر پہ نازاں ہیں کہ انھوں نے ظالم ترین نواب وزیر کے ہاتھ روہیلوں کو فروخت کر دیا۔ صفحۂ ہستی پر نواب وزیر سے زیادہ قاہر انسان کی جستجو فضول ہے۔" (کمپنی کی حکومت، ص ۶۸۔ ۱۶۷)

کمپنی کی لوٹ مار پر ایک تبصرہ:

اٹھارھویں صدی میں انگلستان کے بعض لوگوں میں اس امر کا احساس ہونے لگا کہ برطانوی قوم ہندوستان میں برطانوی حکومت کی ذمے دار ہے، نہ کہ سوداگروں کی جماعت۔ کلاؤ نے بھی ۱۷۵۹ء میں پٹ کو لکھا کہ "اس قدر وسیع حکومت سوداگروں کی ایک جماعت کے بس کی بات

نہیں۔ کمپنی قوم کی مدد کے بغیر حکومت کے لیے نااہل ہے۔'' اسی مکتوب میں کلاؤ بتاتا ہے کہ اگر برطانوی حکومت بنگال پر قابض ہو جائے تو اس کی آمدنی ٹیکس دینے والے انگریزوں کے بوجھ کو ہلکا کر دے گی۔ پٹ نے کلاؤ کی اس خواہش کو ''بہت ہی پر لطف معاملہ'' کہہ کر پورا نہ کیا۔ پلاسی کی جنگ کے پندرہ سال بعد کمپنی کے فارغ شدہ ملازموں نے لندن میں مشرق کے تاجداروں کی شان و شوکت کا مظاہرہ کیا۔ ہندوستان میں دولت کے علاوہ اگر وہ کسی غیر چیز کو اپنے ہمراہ لے گئے تھے تو نواب کا لفظ تھا جسے ان نئے نوابوں نے ''نباب'' بنادیا۔ سیاستدانوں نے چاہا کہ کمپنی کے نفع میں سے کچھ رقم شاہی خزانے میں جمع ہونی چاہیے۔ دوسری طرح کمپنی کے حصہ داروں نے شور مچایا کہ ملازموں کی نسبت انھیں زیادہ حصہ ملنا چاہیے۔ ۱۷۶۶ء سے پارلیمنٹ نے کمپنی کی معاملات میں دلچسپی لینی شروع کی۔ نیز یہ کہ کمپنی کے مقبوضات پر تاج برطانیہ کا قبضہ ہونا چاہیے۔ وزارت نے اس معاملے کی طرف خاص توجہ نہ کی۔ چناں چہ ۱۷۶۷ء میں پارلیمنٹ اور کمپنی کے درمیان ایک ہلکا سا معاہدہ ہو گیا، لیکن اس معاہدے سے دونوں ناخوش تھے۔ ۱۷۶۹ء میں کورٹ آف ڈائریکٹرز کی طرف سے کمپنی کے تمام ہندوستانی مقبوضات کے نظم و نسق کی دریافت کے لیے کمپنی کے تین پرانے خادم وین اسٹارٹ، کرنل فورڈ اور سکریفٹن عازم ہندوستان ہوئے۔ کورٹ آف ڈائریکٹرز نے انھیں وسیع اختیارات دے کر بھیجا۔ یہ کمیشن ہندوستان نہ پہنچ سکا۔ راس امید کے بعد اس جہاز کا کچھ پتا نہ چل سکا جس پر کمیشن کے ارکان سوار تھے۔ لندن میں کمپنی کی مخالفت زیادہ موثر ہوتی رہی۔ مخالفت کا یہ جذبہ انتہائی کمال کو پہنچ گیا۔ جب ڈائریکٹروں نے ۱۷۷۲ء میں لارڈ نارتھ کو اطلاع دی کہ جب تک حکومت کمپنی کو دس لاکھ پونڈ قرض نہیں دیتی اس وقت تک کمپنی کے کاروبار بند رہیں گے۔ اسی سال خفیہ پارلیمانی کمیٹی کے کئی اجلاس منعقد ہوئے۔ ان مجالس کی روئیدادوں کے مطالعے سے معلوم ہوتا ہے کہ ۱۷۵۷ء سے ۱۷۶۶ء تک کی مدت میں کمپنی کے ملازموں نے بنگالیوں سے ۲۱۶۹۶۶۵ پونڈ صرف نذرانے کی صورت میں وصول کیے۔ کلاؤ کی جاگیر کی مالیت اس رقم میں شامل نہیں۔ اس کے علاوہ تلافی نقصانات کی صورت میں کمپنی نے ۳۷،۷۰،۸۳۳ پونڈ وصول کیے۔ ان دو مجالس کی روئیدادوں نے اس خیال کو یقین کے درجے تک پہنچا دیا کہ کمپنی کو پارلیمنٹ کے ماتحت کام کرنا چاہیے۔ چناں چہ ۱۷۷۳ء میں رگولیٹنگ ایکٹ منظور ہوا۔

اس ایکٹ کی رو سے کمپنی کے ڈائریکٹر مجبور ہو گئے تھے کہ وہ کمپنی کے دیوانی، فوجی اور مالی امور سے متعلقہ خط و کتابت انگلستان کے وزیروں کے سامنے رکھیں۔ اس ایکٹ کے تحت بنگال کے گورنر کو ہندوستان میں برطانوی مقبوضات کا گورنر جنرل بنادیا۔ گورنر جنرل کے مشورہ کے لیے

چار ارکان کی ایک کونسل بنائی گئی۔ فیصلہ کثرت آرا پر چھوڑ دیا گیا۔ مساوی آرا کی صورت میں گورنر جنرل کو کاسٹنگ ووٹ کا حق دیا گیا۔ مدراس اور بمبئی کے گورنروں کو دیسی ریاستوں کے ساتھ تعلقات قائم کرنے میں گورنر جنرل اور کونسل کے ماتحت رکھا گیا۔ اسی ایکٹ کے ذریعے کلکتہ میں عدالت عالیہ قائم کی گئی۔ یہ عدالت تاج انگلستان کے ماتحت تھی۔ کمپنی کے ملازموں کو ذاتی کاروبار اور تحائف قبول کرنے کی ممانعت ہوگئی۔ رگولیٹنگ ایکٹ ناقص اور نامکمل تھا۔

کونسل کے چار ارکان میں سے کلیورنگ، مون سن اور فرانسس انگلستان سے آئے تھے اور یہی وجہ ہے کہ وہ ہر معاملے میں ہیسٹنگز کے خلاف متحد دکھائی دیتے ہیں۔ وہ چاہتے تھے کہ کمپنی کے مظالم اور اس کی بدعنوانیوں میں کمی واقع ہو۔ بارویل چوں کہ کمپنی کا ملازم تھا اس لیے کونسل کا رکن ہونے کی صورت میں وہ ہیسٹنگز کا طرف دار اور ہمدرد رہا۔ ہیسٹنگز کے خلاف کونسل میں بہت سے الزامات پیش کیے گئے۔ ان میں سب سے اہم نند کمار کا وہ الزام تھا۔ جس کی رو سے ہیسٹنگز نے منی بیگم سے بہت بڑی رقم رشوت کے طور پر وصول کی۔

کونسل نے ہیسٹنگز کو اپنے روبرو ایک مجرم کی حیثیت سے طلب کرنا چاہا۔ ہیسٹنگز نے کونسل میں پیش ہونے سے انکار کرتے ہوئے کونسل کو تحلیل کر دیا۔ ابھی یہ معاملہ طے نہ پایا تھا کہ ایک ہندوستانی سوداگر نے نند کمار پر جعل سازی کا مقدمہ دائر کر دیا۔ عدالت عالیہ نے نند کمار کو سزائے موت کا حکم سنا دیا۔ نند کمار کی سزائے موت نے اس مقدے کا خاتمہ کر دیا۔

نند کمار کا صرف یہی جرم تھا کہ اس نے اپنے مکتوب کے ساتھ منی بیگم کا خط فرانسس کو بھیجا جس میں بیگم نے اقرار کیا تھا کہ ہیسٹنگز نے اس سے رشوت کے طور پر لاکھوں روپیہ وصول کیا ہے۔ نند کمار نے اس خط میں لکھا تھا کہ رضا خان نے دس لاکھ روپیہ ہیسٹنگز کو اور دو لاکھ روپیہ اسے دیا تھا۔ چناں چہ ہم دیکھتے ہیں کہ اس کے فوراً بعد ہی رضا خان کی تقصیر معاف کر دی جاتی ہے۔
فرانسس اور اس کے ہم خیال ارکان نے ہیسٹنگز سے روپیہ واپس کرنے کا مطالبہ کیا۔ روپیہ واپس کرنے سے یہ کہیں آسان تھا کہ نند کمار کو مجرم ثابت کیا جائے۔ جعل سازی کے الزام میں نند کمار کو گرفتار کر لیا گیا۔ ہیسٹنگز نے تمام معاملہ کلکتہ کی عدالت عالیہ میں جو ۱۷۷۴ء میں قائم ہوئی تھی پیش کر دیا۔ میر عدالت سرایلیجا ایمپی نے نند کمار کے مقدمہ کی سماعت کی اور آخر اسی عدالت کے حکم سے نند کمار نے موت کی سزا پائی۔

مفروضہ جعل سازی کا جرم ۱۷۷۰ء میں ہوا لیکن عدالت عالیہ ۱۷۷۳ء میں قائم ہوئی۔ عدالت اپنی پیدائش سے قبل کے مجرموں کو سزا دینے کی مجاز نہ تھی اور اگر اس امر کو تسلیم بھی کر لیا جائے

کہ نند کمار مجرم تھا تو پھر بھی سزا نوعیت جرم سے کہیں زیادہ سخت تھی۔ اس میں کلام نہیں کہ ان ایام میں انگلستان کے قانون کے مطابق جعل سازی کی سزا پھانسی تھی۔ لیکن نند کمار نہ تو انگریز تھا اور نہ ایسٹ انڈیا کمپنی کا ملازم۔ (کمپنی کی حکومت، ص ۶۴۔۱۶۲)

۶ ؍ مئی ۱۷۷۵ء: ایسٹ انڈیا کمپنی اس زمانے میں مرہٹوں، نظام دکن اور حیدر علی کے اتحاد سے بہت خائف تھی۔ چناں چہ مرہٹوں کو نظام اور حیدر علی سے علاحدہ رکھنے کے لیے حکومت بمبئی نے موسٹن کو دربار پیشوا میں بھیجا تھا۔ اس زمانے میں کمپنی مرہٹوں سے بہت ڈرتی تھی کیوں کہ مرہٹے کمپنی کے سیاسی اقتدار کو ختم کرنے پر تلے ہوئے تھے۔ مرہٹے الٰہ آباد، اودھ اور روہیل کھنڈ پر حملہ کرنا چاہتے تھے کہ ۱۷۷۳ء میں ان کے خانگی معاملات نے انھیں واپس جانے پر مجبور کر دیا۔

موسٹن اپنا کام کر چکا۔ رگھوبا اب پیشوا تھا۔ رگھوبا موسٹن کا آلۂ کار تھا۔ موسٹن نے رگھوبا کو مشورہ دیا کہ نظام اور حیدر سے جنگ کرے۔ ان جنگوں میں رگھوبا نے اگرچہ شکست نہیں کھائی۔ تاہم ان جنگوں نے اسے کسی قسم کا فائدہ بھی نہ پہنچایا۔ نانا فرنویس کو اس امر کا یقین تھا کہ رگھوبا حکومت بمبئی کا آلۂ کار ہے اور یہ کہ رگھوبا کی پیشوائی میں مرہٹوں کی تباہی لپٹی ہوئی ہے۔ رگھوبا کمپنی کی فوجی حمایت کو مرہٹی قوت کا سب سے بڑا سبب خیال کرتا تھا لیکن نانا فرنویس کے نزدیک کمپنی کی فوجی مدد مرہٹوں کی موت تھی۔

جب رگھوبا کو معلوم ہوا کہ فرنویس اور دوسرے مرہٹہ وزیر اس کے خلاف ہیں تو رگھوبا گجرات کی طرف بھاگ نکلا۔ رگھوبا نے بمبئی کونسل سے مدد کی درخواست کی۔ ارکانِ کونسل معاونت کے لیے رضامند تھے۔ انھیں رگھوبا سے کسی قسم کی ہمدردی نہ تھی۔ وہ مرہٹوں کو کمزور دیکھنے کے خواہاں تھے۔ سب سے بڑھ کر وہ سلسٹ اور بسین پر قابض ہونا چاہتے تھے۔ ایسٹ انڈیا کمپنی کے ڈائریکٹروں نے ایک خط کے ذریعے جو انھوں نے صدر اور بمبئی کونسل کو لکھا، اس میں اس امر کی صاف طور پر وضاحت کر دی گئی تھی کہ سلسٹ اور بسین پر کسی نہ کسی طرح سے قبضہ کر لیا جائے۔ سلسٹ اور بسین پر قابض ہونے کے لیے صدر اور ارکان کونسل نے رگھوبا کی مدد کا وعدہ کر لیا۔ رگھوبا نے سورت پہنچ کر ۶ ؍ مئی ۱۷۷۵ء کو عہد نامہ سورت کی رو سے سلسٹ اور بسین کے علاقے انگریزوں کے سپرد کر دیے۔

مرہٹوں کی پہلی جنگ کا سبب عہد نامۂ سورت ہے! (کمپنی کی حکومت، ص ۸۵۔۱۸۴)

۱۷۷۹ء

۱۷۷۹ء میں نظام نے انگریزوں کو ہندوستان سے بالکل خارج کرنے کے لیے ایک محاذ قائم کیا۔ اس محاذ میں گائیکوار کے سوا تمام مرہٹہ سردار شامل تھے۔ حیدر علی بھی اس میں شریک تھا۔ اس محاذ کو کامیاب بنانے کے لیے نانا فرنویس نے انتہائی کوشش کی۔ اس نے شہنشاہ دہلی کو بھی اس میں شامل ہونے کی دعوت دی۔ نانا فرنویس نے مندرجہ ذیل خط اپنے وکیل مقیم دہلی کو لکھا:

''معلوم ہوا ہے کہ کلکتہ کے انگریز دہلی کے شہنشاہ کے ساتھ سیاسی تعلقات قائم کرتے ہوئے شہنشاہ کو اپنی طرف مائل کرنا چاہتے ہیں۔ اس لیے تمھیں چاہیے کہ شہنشاہ اور نجیب خان کو مندرجۂ ذیل حقائق سے آگاہ کردو:

ٹوپی کاروں کا طرز و طریق نامناسب اور عیارانہ ہے۔ وہ ابتدا میں ہندی تاجداروں کو اپنے ساتھ متحد ہونے کے مفاد بتاتے ہیں، لیکن آخر کار ان کی مملکتوں پر قابض ہو کر انھیں زندانوں میں بند کر دیتے ہیں۔ مثال کے طور پر شجاع الدولہ اور محمد علی خان پیش کیے جا سکتے ہیں۔ تمھیں چاہیے کہ اہل مغرب کو اچھی طرح دباؤ ورنہ یورپ کے یہ اجنبی تمام علاقے پر قابض ہو جائیں گے اور یہ اچھا نہیں۔ شہنشاہ کو چاہیے کہ وہ عزت و ناموس کے لیے اس مسئلے کی طرف توجہ کرے۔ دکن کے تمام تاجدار متحد ہو چکے ہیں۔ انھوں نے انگریزی اقتدار کو ختم کرنے کے لیے اپنی فوجیں تیار کر لی ہیں۔ وہ اپنے اپنے علاقوں میں انگریزوں سے جنگ آزما ہونے والے ہیں۔ شمالی ہندوستان میں شہنشاہ اور نجیب خان کو تمام قوتیں متحد کرنے کے بعد انگریزوں کا خاتمہ کر دینا چاہیے۔ اس طرح سلطنت کی شان میں نمایاں اضافہ ہوگا۔''

نانا فرنویس پہلا مدبر ہے جس نے تمام ہندوستان کو انگریزوں کے خلاف متحد ہونے کی دعوت دی۔ نانا فرنویس کے اس اعلان کے خوف سے کمپنی نے مرہٹوں سے صلح کر لی۔ عہد نامہ سلبئی نے مرہٹوں کی پہلی جنگ کا خاتمہ کر دیا۔

مہاراجا سندھیا کے واسطہ سے عہد نامہ سلبئی مرتب ہوا۔ اس عہد نامے کی سترہ دفعات تھیں۔ اس کی رو سے انگریزوں نے وہ تمام علاقہ مرہٹوں کو واپس کر دیا۔ جس پر انھوں نے عہد نامہ پورندھر کے بعد قبضہ کر لیا تھا۔ گوالیار پر مہاراجا سندھیا کا قبضہ تسلیم کیا گیا۔ رگھوبا کی پنشن پچیس ہزار روپیہ ماہانہ مقرر کی گئی۔

مرہٹوں کی پہلی جنگ نے کمپنی کا خزانہ خالی کر دیا۔ اسی خالی خزانے کو پر کرنے کے لیے اس نے ایک ایسا سلسلہ شروع کیا، جس نے اسے قانون کی گرفت میں پہنچا دیا۔ مرہٹوں کی پہلی جنگ کے بعد گورنر جنرل کو کسی ہندوستانی تاجدار سے جنگ کرنے کی جرات نہیں کرنی چاہیے تھی لیکن گورنر جنرل حیدر علی سے نبرد آزما ہونا چاہتا تھا، کیوں کہ وہ اتحادیوں کو حیدر علی سے جدا کر چکا تھا۔

کمپنی کی حکومت کو ختم کرنے کے لیے تنہا مرہٹوں ہی نے کوشش نہیں کی بلکہ حیدر علی بھی

مرہٹوں کا شریک کار تھا۔ انگریزوں کو سب سے خوف ناک جنگیں حیدر ہی سے کرنی پڑیں۔ وہ ان کا سب سے بڑا دشمن تھا۔ وہ اپنی موت تک انگریزوں سے لڑتا رہا۔ ذاتی فراست وشجاعت سے اس نے تاریخ میں اپنے لیے جگہ پیدا کی۔ (کمپنی کی حکومت، ص ۸۷۔۱۸۶)

۱۷۸۰ء تا ۱۷۸۴ء

۱۷۷۹ء میں نظام نے انگریزوں کے خلاف متحدہ محاذ بنایا تو حیدر علی بھی اس میں شریک ہو گیا تھا۔ جب مدراس کی انگریزی حکومت نے ماہی کی بندرگاہ پر سے اپنا قبضہ اٹھانے سے انکار کر دیا تو انگریزوں اور حیدر علی میں لڑائی چھڑ گئی۔ یہ لڑائی ۱۷۸۰ء سے ۱۷۸۴ء تک ہوئی۔

حیدر علی نے کرناٹک پر دھاوا بول دیا۔ اس نے کرنل بیلی کی فوج کو ہتھیار ڈالنے پر مجبور کر دیا۔ بکسر کا فاتح منرو بھی حیدر علی کے حملے کی تاب نہ لا سکا۔ وہ اپنی بہت سی توپوں کو چھوڑ کر بھاگ نکلا۔ چند دنوں کے اندر اندر حیدر علی نے ارکاٹ پر قبضہ کر لیا۔ اسی اثنا میں وارن ہیسٹنگز نے نظام اور سندھیا کو حیدر علی سے الگ کر دیا، لیکن حیدر علی نے لڑائی کو جاری رکھا۔ اب وارن ہیسٹنگز نے بنگال سے سر آیئر کوٹ کی کمان میں ایک فوج بھیجی جس نے ۱۷۸۱ء میں پورتو نوو میں حیدر علی کو شکست دی، لیکن حیدر علی نے بہت جلد اس شکست کا بدلہ لے لیا۔ اسی اثنا میں فرانسیسیوں کا ایک جنگی بیڑہ حیدر علی کی مدد کو پہنچ گیا۔ ۱۷۸۱ء میں حیدر علی کے بیٹے ٹیپو نے بھی کرنل بر-تھ ویٹ کو شکست دی۔ اسی اثنا میں حیدر علی اس دنیا سے چل بسا۔ ٹیپو نے لڑائی کو بدستور جاری رکھا۔ چوں کہ ۱۷۸۳ء میں معاہدۂ ورسائی کی رو سے انگریزوں اور فرانسیسیوں میں صلح ہو چکی تھی، اس لیے فرانسیسیوں نے ٹیپو کی مدد سے ہاتھ اٹھا لیا۔ کئی مہینوں تک لڑائیاں ہوتی رہیں، لیکن آخر کار انگریزوں نے ٹیپو سلطان کے سامنے صلح کی شرطیں پیش کر دیں جنھیں ٹیپو سلطان نے مان لیا۔ معاہدۂ منگلور نے ۱۷۸۴ء میں میسور کی دوسری لڑائی کو ختم کر دیا۔

حیدر علی کا کیریکٹر:

میسور کی دوسری لڑائی کا سب سے اہم واقعہ حیدر علی کی موت ہے۔ پرانے زمانے کے بادشاہوں کی طرح حیدر علی رات کو بھیس بدل کر اپنی رعایا کے حالات سے براہ راست واقفیت حاصل کرتا تھا۔ حیدر علی نے اپنی پولیس اور فوج کو اعلیٰ پیمانے پر منظم کیا تھا۔ بہادرانہ کارناموں پر حیدر علی سپاہیوں کو بہت زیادہ انعام واکرام دیتا تھا۔ حیدر علی کے عدل وانصاف کی داستانیں جنوبی

ہند میں زبان زد خاص و عام ہیں۔ کہا جاتا ہے کہ اس نے ایک جرم کی پاداش میں اپنے بیٹے ٹیپو کو اپنے ہاتھ سے کوڑے لگائے تھے۔ حیدر علی کوئمبوتور میں مقیم تھا۔ ایک شام سیر کے لیے نکلا تو ایک بڑھیا نے اسے روک لیا۔ نواب نے وجہ دریافت کی۔ بڑھیا نے کہا کہ نقیبوں کے سردار آغا محمد نے اس کی لڑکی چھین لی ہے اور اس نے انصاف طلب کرنے کے لیے جو درخواست دی تھی، اس پر تاحال غور نہیں کیا گیا۔ حیدر علی نے تحقیقات شروع کی۔ معلوم ہوا کہ بڑھیا نے اپنی درخواست سردار حیدر شاہ کے ہاتھ میں دی تھی۔ جب سردار سے دریافت کیا گیا تو اس نے بڑھیا اور اس کی بیٹی کو طوائفوں سے بتلایا۔ اس نے سردار حیدر شاہ کو دو سو کوڑے لگا کر معزول کر دیا اور سردار آغا محمد شاہ کو سزائے موت دی۔ حیدر علی نے سرنگا پٹم میں روما کے تماشوں کو رائج کیا۔ بہادر سپاہی زرہ بکتر پہن کر شیروں اور چیتوں سے لڑتے۔ اگر سپاہی غالب آ جاتا تو اسے انعام دیا جاتا اگر شیر یا چیتا غالب دکھائی دیتا تو اسے گولی مار کر ہلاک کر دیا جاتا۔ اس کی زندگی میں حیرت انگیز رواداری کا ثبوت ملتا ہے۔

ایک واقعہ بھی ایسا نہیں ملتا کہ محض دینی اختلاف کی بنا پر اس نے کسی شخص کو کسی قسم کی اذیت پہنچائی ہو۔ حیدر علی کی فوج میں غیر مسلموں کو بہت بڑے عہدے دیے گئے تھے۔ اس کا مشیر خاص کھاندے راؤ برہمن تھا۔ اس نے نہ صرف قدیم مندروں کی جاگیروں کو بحال رکھا، بلکہ اس نے منادر کی جاگیروں میں اضافہ کیا۔ میسور کے مندروں میں آج تک حیدر علی کے فرامین محفوظ ہیں۔ میسور کے محکمۂ آثار قدیم کی سالانہ رپورٹیں اس دعوے کا بہترین ثبوت ہیں۔ سرنگا پٹم کا سب سے بڑا مندر اسی کا تعمیر کردہ ہے۔ رواداری کی اس سے شان دار مثال اور کیا ہو سکتی ہے کہ اس نے اپنی زندگی میں جہاں متعدد منادر تعمیر کروائے، وہاں اس نے ایک مسجد تعمیر نہیں کی۔ اس نے سلطنت کے تحفظ کے لیے قلعوں کا ایک جال بچھا دیا۔ قلعہ بندی کے فن میں اس کو بہت دسترس حاصل تھی۔ وہ انگریزوں کو ہندوستان کا سب سے بڑا دشمن خیال کرتا تھا۔ کمپنی اس کو اپنے اقتدار کے لیے سب سے بڑا سنگ گراں خیال کرتی تھی۔ وہ انگریزوں سے آخر دم تک لڑتا رہا۔ ایک مورخ کے الفاظ میں:

''انگریزوں کو اپنی سلطنت قائم کرنے کے لیے ہندوؤں، مرہٹوں، جاٹوں، گورکھوں اور سکھوں سے کئی جنگیں لڑنا پڑیں لیکن انھیں سب سے طاقت ور دشمن حیدر علی ملا، جسے انگریز شکست نہ دے سکے۔ ۱۷۶۷ء سے ۱۷۸۲ء تک اس نے اپنی بہادری کا سکہ انگریزوں کے دل میں بٹھا دیا۔ مدراس پر اس کا مشہور دھاوا ایک ایسا تاریخی اور جنگی کارنامہ ہے کہ مدت تک یاد رہے گا۔ اس

کے دل میں اس قدر رحم اور وسعت تھی کہ اس نے مدراس پر قبضہ نہیں کیا، حال آں کہ وہ نہایت آسانی سے مدراس پر قابض ہوسکتا تھا۔ اگر اس وقت مدراس پر حیدر علی کا قبضہ ہو جاتا تو جنوبی ہندوستان سے انگریزوں کا اقتدار ختم ہو جاتا۔ بعد کی جنگوں میں بھی اس کو اس قسم کے مواقع حاصل ہوئے۔ حیدر علی کی موت میسور اور مہاراشٹر کے لیے بہت بڑا نقصان ثابت ہوئی۔ اس کی موت کی خبر سنتے ہی مرہٹوں نے ہتھیار ڈال کر انگریزوں سے ان کی پیش کردہ شرائط پر سالبئی کے مقام پر ان سے صلح کر لی۔ حیدر علی مذہبی تعصب سے بالکل مبرا تھا۔ اس جیسا کوئی اور جرنیل اس زمانے کے ہندوستان میں پیدا نہیں ہوا۔ وہ تنہا ہندوستانی حکمران تھا جس نے اپنے ملک کی مدافعت کے لیے بحری طاقت قائم کی۔'' (کمپنی کی حکومت، ص ۸۳۔۱۸۱)

۲۳ رفروری ۱۷۹۲ء: حیدر علی کی وفات پر اس کے بیٹے ٹیپو نے جنگ کو جاری رکھا۔ اسی دوران میں انگریزوں کو ٹیپو کی فوجی قابلیت کا اندازہ ہوا۔ انگریز مجبور ہو گئے تھے کہ وہ ٹیپو سے صلح کریں۔ اس عہد نامے کی رو سے جو تاریخ میں عہد نامہ منگلور کہلاتا ہے انگریزوں نے ٹیپو کو اپنا حلیف قرار دیا اور بوقت ضرورت دونوں نے ایک دوسرے کی مدد کرنے کا عہد کیا۔ لیکن کارنوالس ٹیپو سے صرف اس لیے جنگ آزما ہونا چاہتا تھا کہ امریکی نقصانات کی تلافی ہو سکے۔ کارنوالس، واشنگٹن سے شکست کا داغ ٹیپو کے خون سے دھونا چاہتا تھا۔ چوں کہ جدید آئین کی رو سے وہ ٹیپو سے جنگ آزما نہیں ہوسکتا تھا۔ اس لیے اس نے ایسا رویہ اختیار کرنا چاہا۔ جس سے ٹیپو کو یقین ہو جائے کہ کارنوالس اس کا دشمن ہے۔ کارنوالس نے نظام دکن کو اپنے حلیفوں کی ایک فہرست بھیجی لیکن ٹیپو کا نام عمداً اس فہرست سے اڑا دیا گیا۔ اب ٹیپو کو یقین ہو گیا کہ کارنوالس اس سے ضرور جنگ آزما ہوگا۔ کارنوالس نے نظام اور مرہٹوں کو اپنے ساتھ شامل کرلیا۔ جب ٹیپو ٹراونکور پر حملہ آور ہونے کی فکر میں تھا اس وقت کارنوالس اس کے خلاف صف آرا ہوا۔ کارنوالس گم شدہ شہرت کے حصول کے لیے ٹراونکور کی حمایت پر اتر آیا۔ کارنوالس کی حمایت ''کمزور کی مدد کرو'' کی بنا پر نہ تھی اسے ٹیپو سے ضرور نبرد آزما ہونا تھا۔ کارنوالس نے پارلیمانی آئین کی خلاف ورزی کرتے ہوئے ٹیپو سے جنگ کی!

کارنوالس کو کسی بہانے کی جستجو تھی۔ یہ مفروضہ کہ ٹیپو ٹراونکور پر حملہ کرنا چاہتا ہے، کافی تھا۔ مرہٹوں اور نظام کو ٹیپو کے خلاف صف آرا ہونے کی دعوت دی گئی۔ انھیں یقین دلایا گیا کہ مفتوحہ علاقے کی تقسیم میں وہ مساوی شریک ہوں گے ٹیپو کو ختم کرنے کے لیے انگریز، نظام، مرہٹے سب

متحد ہوگئے۔ اس اتحاد ثلاثہ کے مقصد کو مزید کامیاب بنانے اور رائے عامہ کی اخلاقی ہمدردی حاصل کرنے کے لیے انگریزوں نے ٹیپو سلطان کی مفروضہ چیرہ دستیوں کو اس انداز میں دور دور تک پہنچادیا کہ خود اپنے بھی اس سے متاثر ہونے لگے۔ فورٹ ولیم کی دیواروں پر کھڑے ہو کر اعلان کر دیا گیا کہ ''ٹیپو سفاکی میں چنگیز اور ہلاکو سے کہیں زیادہ ہے۔'' ...... ٹیپو کی جنگی تیاریوں کو حکومت مدراس، کارنوالس سے بہتر سمجھ سکتی تھی لیکن کارنوالس نے حکومت مدراس سے اس معاملے میں مشورہ نہ لیا۔ ٹیپو نے حکومت مدراس کو صاف طور پر لکھ بھیجا کہ وہ ٹراونکور پر حملہ نہیں کرنا چاہتا۔ نیز وہ جنگ کے لیے تیار نہیں۔ کارنوالس نے ٹیپو سلطان کے خلاف اس لیے اعلان جنگ نہیں کیا کہ وہ ٹراونکور پر حملہ آور ہونے کی فکر میں تھا بلکہ صرف اس لیے کہ ٹیپو جنگ کے لیے تیار نہ تھا۔ کارنوالس نے گورنر مدراس کو لکھا:

''حکمت عملی کا تقاضا یہ ہے کہ ہم اس عمدہ موقعے سے اس شہزادہ کی قوت میں کمی کر دیں جو ہر معاملے میں ہماری ملت کا سب سے بڑا دشمن ثابت ہوتا ہے۔ اس وقت ہمیں یقین ہے کہ ہندوستانی ریاستیں ہماری مدد کریں گی لیکن ٹیپو کو فرانس سے کسی قسم کی مدد نہیں مل سکتی اور اگر ٹیپو کی موجودہ حالت کو اس وقت تک برقرار رکھا گیا جب فرانس اس کی مدد کے قابل ہو جائے تو اس سے آیندہ جنگ یقینی ہے۔''

کارنوالس کا ٹیپو کے خلاف اعلان جنگ نامنصفانہ اور غیر عادلانہ ہے۔ مدراس کے گورنر، جنرل میڈوز نے ٹیپو کو ایک حقارت آمیز خط لکھا ہے۔ ٹیپو نے نہایت نرم الفاظ سے گورنر کی غلط فہمیوں کو رفع کرنے کی کوشش کی۔ لیکن میڈوز کا مقصد ٹیپو سے جنگ کرنا تھا۔ جب ایسٹ انڈیا کمپنی کے ہندی مقبوضات کا حاکم اعلیٰ اور مدراس کا حاکم دونوں ٹیپو سے جنگ آزما ہونے کا تہیہ کریں تو اس صورت میں آئین واخلاق کی کوئی دفعہ انھیں اپنے ارادوں سے باز نہیں رکھ سکتی۔ ٹیپو جنگ کے لیے تیار نہ تھا۔ اس لیے اس کی توہین کی گئی۔ اس کے غیض وغضب کو دل خراش جملوں سے اکسایا گیا۔ ٹیپو کو مجبور کر دیا گیا کہ وہ کمپنی سے جنگ کرے۔ ٹیپو نے میڈوز کو شکست دی۔ کارنوالس میدان میں اتر آیا۔ وسیع ذرائع، نانا و نظام کی فوجوں اور دیگر حربی سہولتوں کی موجودگی میں ٹیپو کو شکست دینا چنداں مشکل نہ تھا۔ بنگلور کو اتحادیوں نے فتح کر لیا۔

بنگلور کی فتح کے بعد کارنوالس سرنگاپٹم کو مسخر کرنا چاہتا تھا۔ چوں کہ ٹیپو کی جنگی تیاریاں ناکافی تھیں اس لیے وہ نامہ وپیام کے ذریعے صلح کی درخواست کرتا رہا لیکن کارنوالس ٹیپو کو شکست دے کر واشنگٹن کی شکست کا انتقام لینا چاہتا تھا۔ امریکی جنگ حریت کے سالار کا انتقام دکن کے ایک

حکمران سے لیا جارہا ہے۔ جب کارنوالس کی فوجیں سرنگا پٹم کے سواد میں تھیں اس وقت ٹیپو نے کارنوالس کے لیے پھلوں کے چند ٹوکرے بھیجے جنھیں کارنوالس نے بغیر چھوئے واپس کر دیا۔ سرنگا پٹم کے قریب آری کیسرہ کے مقام پر ٹیپو کو شکست ہوئی لیکن بہت جلد سلطان نے اس شکست کا بدلہ لے لیا۔ اب کارنوالس بنگلور میں پناہ گزین ہونے پر مجبور ہوگیا۔ اتحادیوں نے سلطان کو سرنگا پٹم میں محصور کرلیا۔ ٹیپو نے پھر صلح کی درخواست کی۔ اس موقعے پر اس کی درخواست پر غور کیا گیا۔ ۲۳ر فروری ۱۷۹۳ء کو ٹیپو اور کارنوالس نے عہد نامۂ سرنگا پٹم پر دستخط کیے۔

اس عہد نامہ کی رو سے:

''ٹیپو کو ریاست میسور کا نصف حصہ اتحادیوں کے حوالے کرنا پڑا۔ ٹیپو کو تین کروڑ تیس ہزار روپیہ بطور تاوان جنگ ادا کرنا اور۔ شرائط کی تکمیل ہونے تک ٹیپو اپنے بیٹوں کو بطور یرغمال بھیج دینے پڑے۔ مالا بار، کورگ، ڈنڈی گل اور بارہ محل کے اضلاع انگریزوں کے قبضے میں آئے''۔

''میسور کا جنوب مشرقی حصہ نظام کو ملا''۔

''میسور کا شمال مغربی علاقہ مرہٹوں کے ہاتھ آیا۔''

اس جنگ میں وزارت انگلستان کی نہ صرف اخلاقی ہمدردی کارنوالس کے ساتھ تھی، بلکہ انگلستان نے لاکھوں روپیہ کمپنی کو قرض دیا۔ ان امور سے اس بات کا اندازہ لگانا نہایت آسان ہے کہ وزارت انگلستان، امریکی نقصانات کی تلافی کے لیے ہندوستان میں اپنی سلطنت وسیع کرنا چاہتی تھی۔

مال غنیمت کی تقسیم اس انداز سے کی گئی کہ ٹیپو کی سرحدیں ساحل سمندر سے دور ہوگئیں۔ کارنوالس ہندوستان کی کسی ریاست کی بحری طاقت گوارا نہیں کرسکتا تھا۔ اس تقسیم نے میسور کو بحری طاقت ہونے سے روک دیا۔ (کمپنی کی حکومت، ص ۱۹۴۔۱۹۲)

۲۲ر ستمبر ۱۷۹۲ء: فرانس میں ۲۲ ستمبر ۱۷۹۲ء کو عوامی بغاوت کے بعد بادشاہت کے خاتمے اور فرانس کے جمہوریہ ہونے کا اعلان کیا گیا۔ بادشاہ لوئی سیزدہم پر مقدمہ چلا کر اسے پھانسی دے دی گئی۔ فرانس کی انقلابی حکومت کے نعرے یہ تھے:

''آزادی، مساوات اور اُخوت۔'' لیکن فرانس کے اندر انقلاب کی کامیابی کے بعد انھیں نعروں کی بنیاد پر فرانس نے سامراجی توسیع کی پالیسی اختیار کی۔''

(فرہنگ سیاسیات: مرتبین محمد محمود فیض و حسن علی جعفری دہلی ۱۹۸۴ء، ص ۸۰)

۱۷۹۸-۹۹ء

نواب وزیر علی۔ایک کیریکٹر:

۲۱رجنوری ۱۷۹۸ء: آصف الدولہ کی موت (۱۷۹۷ء) پر اس کا بیٹا وزیر علی مسند نشین ہوا۔ سر جان شور نے اس کی مسند نشینی کو رسمی طور پر تسلیم کر لیا لیکن بعد میں اس نے آصف الدولہ کے بھائی سعادت علی کو مسند پر بٹھانا چاہا۔ سعادت علی بنارس میں قید تھا۔ چناں چہ سر جان شور بنارس روانہ ہوا۔ سعادت علی نے ہر شرط پر مہر ثبت کر دی۔

۲۱رجنوری ۱۷۹۸ء کو سعادت علی نواب وزیر بنا دیا گیا۔ اسی دن سعادت علی اور سر جان شور کے درمیان سترہ دفعات پر مشتمل ایک معاہدہ ہوا۔ صرف ایک دفعہ کی رو سے دس لاکھ روپیہ نقد اور الٰہ آباد کا قلعہ کمپنی کے قبضے میں چلا گیا۔ نیز اسی معاہدے کے رو سے مملکت اودھ سے تمام یورپی لوگوں کو سوائے کمپنی کے ملازموں کے، باہر نکل جانے کا حکم دیا گیا۔ ان لوگوں کو مملکت اودھ سے اس لیے نکالا گیا تھا کہ سر جان شور کے مظالم انگلستان اور دوسرے یورپی ملکوں میں رہنے والے لوگوں کے کانوں تک نہ پہنچ جائیں۔ سر جان شور کو وارن ہیسٹنگز کا انجام خوب یاد تھا۔

اب ہمیں نواب وزیر علی کو جنگلوں، بیابانوں اور کوہستانوں میں رومانی زندگی بسر کرتے ہوئے دیکھنا ہے۔ اس شہزادے کے متعلق مورخوں نے اس قدر غلط فہمیاں پیدا کر دی ہیں کہ ان کا ازالہ کیے بغیر ہم آگے نہیں بڑھ سکتے۔ نواب وزیر آصف الدولہ کے ہاں ۳۳ سال کی عمر میں ایک لڑکا پیدا ہوا۔ نواب وزیر نے نوزائیدہ کے مستقبل سے آگاہ ہونے کے لیے منجموں کو دربار میں طلب کیا۔ منجموں نے نواب وزیر سے کہا کہ زائچہ میں غفلہ اور قبض الخارج جمع ہونے سے شکل حمرہ پیدا ہو گئی ہے جس سے معلوم ہوتا ہے کہ شہزادے کی تقدیر میں کوہستانوں، جنگلوں اور بیابانوں میں آوارہ سر گرداں پھرنا ہے۔ نواب نے خواہ مخواہ منجموں کو زحمت دی۔ اسے چاہیے تھا کہ کمپنی کے کسی افسر سے اپنے بیٹے کا مستقبل معلوم کر لیتا۔ بچے کا نام وزیر علی رکھا گیا۔ نواب آصف الدولہ کا بھائی سعادت علی چوں کہ نوابی کا امیدوار تھا اس لیے اس نے اس بچے کی پیدائش کو اپنی موت خیال کیا۔ وزیر علی کو حرامی بچہ مشہور کرنے میں سعادت علی کا سب سے بڑا ہاتھ تھا۔ اس قسم کی حکایتیں جب گورنر جنرل کے کانوں تک پہنچیں تو اس نے نواب آصف الدولہ سے اس کے وارث کے متعلق دریافت کیا۔ نواب نے وزیر علی کو اپنا وارث قرار دیا۔ ۱۷۹۷ء میں نواب وزیر آصف الدولہ کی موت پر

وزیر علی مملکت اودھ کو انگریزی اثر و رسوخ سے پاک کرنا چاہتا تھا اس لیے سر جان شور سعادت علی کی مدد پر آمادہ ہو گیا۔ پانچ ماہ کی مختصر حکومت کے بعد وزیر علی کو معزول کر دیا گیا۔ اس قلیل مدت میں اس نے فوجوں کی تربیت اور تنظیم کی طرف خاص توجہ کی تھی۔ معزول ہونے کے بعد وزیر علی کو بنارس پہنچا دیا گیا۔ تین لاکھ روپیہ سالانہ وزیر علی کا وظیفہ مقرر ہوا۔ وزیر علی کو بنارس میں چند ماہ ہی گزرے تھے کہ گورنر جنرل نے اسے کلکتے میں طلب کیا۔ وزیر علی کمپنی کے وکیل مقیم بنارس کے پاس گیا اور شکایت کی کہ گورنر جنرل اسے کلکتے میں کیوں طلب کرتا ہے؟ وکیل نے ایک اسیر کی شکایت کی پروانہ کی اور جلا وطن نواب کے ساتھ تلخ کلامی سے پیش آیا۔ وزیر علی اس توہین کو برداشت نہ کر سکا، اس نے خنجر سے وکیل کا کام تمام کر دیا۔ اس واقعے سے شہر میں ہیجان پیدا ہو گیا۔ وزیر علی اپنے جاں نثاروں سمیت اعظم گڑھ کی طرف روانہ ہوا۔ اعظم گڑھ کے حکمران نے وزیر علی کو گھاگھرا تک پہنچا دیا۔ اب یہ کارواں گورکھ پور کے جنگلوں میں پناہ گزیں ہوا۔ وزیر علی چاہتا تھا کہ نیپال پہنچ جائے۔ لیکن انگریزی اور سعادتی فوجوں نے اس کا بڑی سختی سے پیچھا کر رکھا تھا۔ ان جنگلوں میں بارہا وزیر علی کے ساتھیوں نے دشمنوں کو شکستیں دیں۔ وزیر علی نے کئی سال ان جنگلوں میں صرف کر دیے۔ کرنل کالنز کو وزیر علی کی گرفتاری پر مقرر کیا گیا۔ ایک روز کالنز اپنے خیمے کے باہر سیر کر رہا تھا کہ اسے دور سے گرد اٹھتی ہوئی دکھائی دی۔ کالنز نے سپاہیوں کو تیار رہنے کا حکم دیا اور خود اسی سمت نگاہ لگائے رکھی۔ جب اسے یقین ہو گیا کہ صرف ایک سوار سرپٹ گھوڑا دوڑائے اس کی طرف بڑھ رہا ہے تو اس نے سپاہیوں کو حکم دیا کہ اس سوار کی نقل و حرکت پر غور کرتے رہیں۔ اتنے میں سوار سپاہیوں کے قریب آ کر رک گیا: ''مجھے کرنل سے ملنا ہے۔'' اس نے کہا۔ ''بہت خوب۔'' سپاہی چلا اُٹھے۔ جب کرنل کو اس واقعے سے آگاہ کیا گیا تو اس نے سوار کو طلب کیا۔ سوار کرنل سے آنکھیں ملاتے ہی پکار اٹھا: ''تنہائی، تنہائی۔'' ''صاحب! یہاں کوئی غیر آدمی نہیں ہے۔ آپ رازِ دل کہہ دیں۔'' ''دیوار ہم گوش دارد! تنہائی۔'' کرنل اور سوار باغ میں چلے گئے۔ ادھر ادھر دیکھنے کے بعد سوار نے کرنل سے کہا۔ ''آپ اس مقام پر کیوں خیمہ زن ہیں؟'' ''کمپنی کا حکم ہے کہ وزیر علی کو گرفتار کیا جائے۔'' ''لیکن اتنا لاؤ لشکر، کیا معنی؟'' ''گرفتاری میں مدد دینے کے لیے۔'' ''وزیر علی کی گرفتاری بہت مشکل ہے۔'' سوار نے کہا۔ ''کیوں؟'' کرنل نے پوچھا:

''وہ ایک بہادر سپاہی ہے۔''

''میں نے بھی یہی سن رکھا ہے۔ آپ کیا چاہتے ہیں؟''

''چند کارتوس۔''

''کس لیے۔''

''وزیر علی کو گرفتار کرنے کے لیے۔''

''یہ لو دس کارتوس!''

''تشکر!'' مسکراتے ہوئے۔''

''آپ کا نام۔''

''وزیر علی!''

''آپ نے مجھے کارتوس دیے۔ اس لیے آپ کی جان بخشی کرتا ہوں۔ یہ کہتے ہوئے سوار جنگلوں کی طرف چل نکلا۔

''ایک بہادر سپاہی۔'' کرنل نے دبی زبان سے کہا۔

اس واقعے کے بعد کرنل نے انتہائی کوشش کی کہ وزیر علی کو گرفتار کر سکے، لیکن اسے اپنے ارادوں میں کامیابی نہ ہوئی۔ آخر کرنل نے راجا جے نگر کو انعام واکرام کا لالچ دے کر اسے وزیر علی کی گرفتاری پر مامور کیا۔ راجا نے وزیر علی کو اپنے محلات میں زندگی بسر کرنے کی دعوت دی۔ متواتر مصائب نے وزیر علی کو آرام کی زندگی بسر کرنے پر مجبور کر دیا۔ جب وزیر علی جے نگر کے محل میں پہنچا تو اس نے کرنل کی فوجوں کو اطلاع دے کر وزیر علی کو گرفتار کرا دیا۔ وزیر علی کا تمام مال و اسباب ضبط کر لیا گیا۔ وزیر علی کو کلکتہ کے قلعے میں قید کر دیا گیا۔ کسی ہندوستانی کو وزیر علی سے ملاقات کرنے کی اجازت نہ تھی۔ اس کے اپنے الفاظ میں:

''جوں سبزہ رندے اگے ہی پیروں کے تلے ہم
اس گردشِ افلاک سے پھولے نہ پھلے ہم
ارمان بہت رکھتے تھے ہم دل کے چمن میں
بیٹھے نہ خوشی سے کبھی سائے کے تلے ہم
ہم وہ نہ قلم تھے کسی مالی کی لگائے
نرگس کے نہالوں میں تھے آصف کے پلے ہم
زندانِ مصیبت میں بھلا کس کو بلائیں
رہتے ہیں وزیر ہی سے دن رات ملے ہم''

(کمپنی کی حکومت، ص ۲۲۷۔۲۳۰)

انیسویں صدی
ہندوستانی صنعتوں کی تباہی

۱۷۹۳ء تا ۱۸۴۹ء:

کمپنی نے ہندوستان کی صنعتوں کو جس انداز میں تباہ کیا اس کا ذکر ولیم بوسٹس نے ۱۷۷۲ء میں ان الفاظ میں کیا تھا: ''تمام اندرون ہند کی تجارت اور کمپنی کا ایک خاص طریقے پر ہندوستان میں روپیہ لگانا، یہ سب مسلسل مظالم کا ایک ایسا منظر ہے جس کے برے اثرات کو ہندوستان کا ہر کپڑا بننے والا محسوس کر رہا ہے۔ ہر سامان جو تیار کیا جاتا ہے وہ کمپنی کی ملکیت بن جاتا ہے اور انگریز اپنے بنیوں اور گماشتوں کے ذریعے انتہائی تکبر سے یہ طے کرتے ہیں کہ ہر کاریگر کتنا مال کس قیمت پر دے گا۔ جب ان باتوں کے تصفیے سے ہندوستانی جلاہے کمپنی سے پیشگی روپیہ لینے سے انکار کرتے تو وہ زبردستی روپیہ ان کی کمر میں بندھوا دیا جاتا ہے اور پھر اس جلاہے کو کوڑے لگائے جاتے ہیں۔ اس محکمے میں جو بدمعاشیاں کی جاتی ہیں وہ وہم و قیاس میں بھی نہیں آسکتیں۔ کمپنی کے گماشتے جو نرخ مقرر کرتے ہیں وہ بازار کے نرخ سے چالیس فی صد کم ہوتا ہے۔ ریشم کاتنے والے بے شمار کاریگروں نے ان تکلیفوں سے تنگ آکر انگوٹھے کٹوا لیے ہیں لیکن اس کے باوجود ۱۸۱۳ء کی ایک رپورٹ سے پتا چلتا ہے کہ ہندوستان کے ریشمی اور سوتی کپڑے انگلستان کے بازاروں میں انگلستان کے کپڑوں سے پچاس ساٹھ فی صد کم قیمت پر بکتے تھے۔ انگلستان میں ہندوستانی کپڑے کی درآمد پر زیادہ سے زیادہ محصول لگایا جانے لگا۔ چناں چہ ۱۸۱۳ء میں ہندوستان کے دھاری دار کپڑوں پر قریباً پچاس فیصد محصول لگایا گیا۔ ہندوستانی چھینٹ پر اسی فی صد محصول اور اونی کپڑے پر بیاسی فی صد محصول لگایا گیا۔ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ ۱۸۱۳ء تک باوجود پابندیوں کے ہندوستان کی صنعت پارچہ بانی زندہ تھی اور اسے ختم کرنے کے لیے پارلیمنٹ کو ابھی سے زیادہ سے زیادہ محصول لگانے کی ضرورت تھی، لیکن جب انگلستان کو اپنے مال کی کھپت کی ضرورت پیش آئی تو انگلستان نے آزاد تجارت کی ایسی پالیسی اختیار کر لی۔ جوں جوں ہندوستانی صنعت تباہ ہوتی گئی، اسی نسبت سے انگلستان میں ہندوستانی مال کی درآمد پر محصول کم ہوتا گیا۔ ۱۸۲۳ء کے ایک بیان کے مطابق نہ صرف ہندوستان کا سوتی کپڑا انگلستان میں درآمد ہونے سے رک گیا تھا بلکہ الٹا انگلستان سے سوتی کپڑا ہندوستان جانے لگا تھا۔ یہ محصول اس وقت منسوخ کیے گئے جب ہندوستان کی تجارت تباہ ہو چکی تھی۔ ذیل کے دو نقشوں سے معلوم ہو سکتا

ہے کہ انگلستان میں ہندوستان کے کپڑے کی درآمد کس طرح بتدریج کم ہوئی:

۱۷۹۳ء میں ۳۲۴۵۷۴۵ پونڈ کا کپڑا درآمد ہوا۔

۱۷۹۸ء میں ۳۴۵ ۹۷۳۴۵ پونڈ کا کپڑا درآمد ہوا۔

۱۸۰۵ء میں ۹۷۸۳۱۷ پونڈ کا کپڑا درآمد ہوا۔

۱۸۱۰ء میں ۸۱۲۷۳ پونڈ کا کپڑا درآمد ہوا۔

۱۸۱۴ء میں ۵۳۴۴۵۹۰ تھان انگلستان میں درآمد ہوئے۔

۱۸۲۱ء میں ۱۲۶۶۶۰۸ تھان انگلستان میں درآمد ہوئے۔

۱۸۲۸ء میں ۴۲۲۵۰۴ تھان انگلستان میں درآمد ہوئے۔

۱۸۳۵ء میں ۳۶۶۰۸۶ تھان انگلستان میں درآمد ہوئے۔

۱۸۴۳ء میں ۱۸۱۲۲۴ تھان انگلستان میں درآمد ہوئے۔

۱۸۴۹ء مس ۳۶۱۵۱ تھان انگلستان میں درآمد ہوئے۔

جب ہندوستانی مال دوسرے ملکوں میں بھیجا جاتا تھا تو ہندوستان کی صنعت جہاز سازی بھی اپنے عروج پر تھی۔" جب ہندوستان کا مال تجارت ہندوستان کے بنے ہوئے جہازوں میں بندرگاہ میں پہنچا تو وہاں کے کارخانہ داروں پر اتنی وحشت طاری ہوئی گویا کسی دشمن ملک نے انگلستان پر حملہ کردیا ہے۔لندن کے سب جہاز سازوں نے چلانا شروع کیا کہ اگر ہندوستان کے جہازوں کو باربرداری میں اسی طرح استعمال کیا جانے لگا تو انگلستان کے جہاز ساز بھوکے مرجائیں گے۔(کمپنی کی حکومت، ص ۹۱۔۲۹۰)

فورٹ ولیم کالج کا قیام:

لارڈ ویلزلی کا زمانہ، ۱۷۹۸ء تا ۱۸۰۵ء ہے۔اس کے زمانے کا ایک اہم واقعہ فورٹ ولیم کالج کا قیام ہے۔ یہ کالج خالص سیاسی مقاصد کے حصول کے لیے قائم کیا گیا تھا۔لیکن اردو اور ہندی زبانوں اوران کے ادب کو کالج کے قیام سے بہت فائدہ پہنچا۔ باری علیگ لکھتے ہیں۔"

"ویلزلی کے عہد میں کمپنی کے ملازموں اور عہدے داروں پر بہت سی ذمے داریاں عائد ہوچکی تھی۔ان ذمہ داریوں کے پورا کرنے کے لیے ضروری تھا کہ کمپنی کے ملازم اور عہدے دار ہندوستانی زبانوں سے واقف ہوں۔کمپنی کے ملازم سولہ یا اٹھارہ برس کی عمر میں انگلستان سے ہندوستان کی طرف چل دیتے، یہ نوجوان اپنے وطن میں بھی واجبی سی تعلیم حاصل کرسکتے تھے۔

ہندوستان کے متعلق انھیں کچھ علم نہیں ہوتا تھا، وہ ہندوستان کی زبانوں اور اس کے حالات سے واقف نہیں ہوتے تھے۔ یہی وجہ ہے کہ جب یہ نوجوان ہندوستان پہنچتے تو اپنے فرائض کو پوری طرح سے ادا نہیں کر سکتے تھے نہ انگلستان میں ان کی تعلیم کے لیے کوئی انتظام تھا اور نہ ہندوستان میں انھیں ٹریننگ دینے کے لیے کوئی کالج موجود تھا۔ ولیزلی نے انڈین سول سروس میں بھرتی ہونے والے انگریزوں کے لئے ایک کالج قائم کر دیا۔ ولیزلی کو اس امر کا پورا یقین تھا کہ کمپنی کے ڈائریکٹر اس کالج کی منظوری دے دیں گے۔ ولیزلی نے فورٹ ولیم کالج کے قاعدے اور ضابطے خود مرتب کیے۔ ولیزلی خاص خاص موقعوں پر کالج کے طالب علموں میں انعام بانٹنے کے لیے جاتا اور ان کے سامنے تقریر کرتا۔ اس کالج نے بہت تھوڑی مدت میں ذہین اور محنتی افسر پیدا کیے لیکن کمپنی کے ڈائریکٹروں نے اس کالج کو جاری رکھنے کی اجازت نہ دی۔ ولیزلی نے اپنی کونسل کی تائید کے ساتھ کورٹ آف ڈائریکٹرز کے اس فیصلے کے خلاف عرض داشت بھیجی اور اس کے ساتھ ہی کالج کو ۳۱ رد سمبر ۱۸۰۳ء تک جاری رکھنے کا فیصلہ کر لیا اس پر کمپنی کے ڈائریکٹروں نے فورٹ ولیم کالج کو صرف کمپنی کلرکوں کی تربیت اور مشرقی زبانوں کی تعلیم کے لیے محدود کر دیا۔ چند سال بعد کمپنی کے ڈائریکٹروں نے اپنی سول سروس میں بھرتی ہونے والوں کی ٹریننگ کے لیے ہیلی بری میں ایسٹ انڈیا کالج کھول دیا۔

فورٹ ولیم کالج میں ڈاکٹر گلکرائسٹ نے آسان ہندوستانی میں کتابیں لکھنے اور لکھوانے کا سلسلہ شروع کیا تھا۔ کمپنی کے ملازموں کو ہندوستانی زبان سکھانے کے لیے قصے کہانیوں کی بہت سی کتابیں فورٹ ولیم کالج سے شائع کی گئیں۔ تاریخ، اخلاق اور دوسرے علوم پر بھی کتابیں چھاپی گئی تھیں۔ گلکرائسٹ نے اردو کو آسان صورت میں پیش کر کے آنے والے مصنفوں کو ایک نئی راہ بتائی۔'' (کمپنی کی حکومت، ص ۵۹۔۲۵۸)

ولیزلی کے عہد میں کمپنی کو سیاسی میدان میں بھی عظیم الشان کامیابیاں حاصل ہوئیں۔ باری علیگ لکھتے ہیں:

''ولیزلی نے ہندوستان میں انگریزوں کی حکومت کو پہلے سے زیادہ مضبوط بنا دیا۔ اس نے ٹیپو سلطان کی مملکت پر قبضہ جمایا۔ اس نے ہندوستان میں فرانس کے اثر و رسوخ کو مٹا دیا۔ نظام اور اودھ کو کمپنی کے زیر اثر کر دیا گیا۔ اس نے پیشوا کو کمپنی کی امداد کا سہارا لینے پر مجبور کیا۔ سندھیا اور راجا برار کی قوت کو ولیزلی ہی نے ختم کیا۔ کرناٹک، تنجور اور سورت کو کمپنی کے مقبوضات میں شامل کر

کے ویلزلی نے ہندوستان میں کمپنی کے مقبوضات میں اضافہ کیا۔ اس نے ہندوستان کی انگریزی حکومت کو ہندوستان کی سب سے بڑی سیاسی قوت بنا دیا۔ (ایضاً، ص ۲۵۹)

۱۳؍فروری ۱۸۰۰ء: ۱۷۹۵ء میں نانا فرنویس نے مرہٹہ سرداروں کو متحد ہو کر نظام کو شکست دی تھی۔ میسور پر انگریزی قبضے کے بعد جنوبی مہاراشٹر کے جاگیرداروں نے پیشوا کے خلاف بغاوت کر دی تھی۔ نانا فرنویس نے جاگیرداروں کی اس بغاوت میں کمپنی کا ہاتھ محسوس کیا۔ اس نے ان جاگیرداروں کے خلاف فوج بھیجی ہی تھی کہ ۱۳؍فروری ۱۸۰۰ء کو وہ اس دنیا سے چل بسا۔ (کمپنی کی حکومت، ص ۲۵۳)

۱۸۰۱ء

لارڈ ویلزلی نے نواب وزیر (سعادت علی خاں) کو مجبور کر دیا کہ وہ ایک نیا معاہدہ کرے جس کی رو سے اسے گورکھپور، روہیل کھنڈ اور دوآب کو کمپنی کے حوالے کرنا تھا تاکہ ان علاقوں کی آمدنی سے ان انگریزی فوجوں کے اخراجات پورے کیے جائیں جو اودھ میں موجود تھیں۔ نواب نے لارڈ ویلزلی کے اس مطالبے کے خلاف احتجاج کیا لیکن اس کا کچھ اثر نہ ہوا۔ ۵۔ نومبر ۱۷۹۹ء کو گورنر جنرل نے نواب وزیر کو لکھا کہ انگریزی فوج کے تیرہ ہزار سپاہی اودھ کی حفاظت کے لیے ناکافی ہیں اس لیے ضرورت ہے کہ نواب وزیر اپنی فوجوں کو توڑ کر اودھ میں مزید انگریزی فوج رکھے۔ نیز یہ کہ انگریزی فوجوں کے اخراجات کے لیے گورکھ پور، روہیل کھنڈ اور دوآب کے علاقے کمپنی کے حوالے کر دیے جائیں۔ نواب وزیر نے اس نئے جال سے نکلنے کی بہت کوشش کی۔ اس نے لکھنؤ کے انگریز ریزیڈنٹ کرنل اسکاٹ سے کئی ملاقاتیں کیں۔ جب کرنل اسکاٹ نے اس کی بات نہ مانی تو نواب وزیر نے اعلان کر دیا کہ وہ مسند سے علاحدہ ہونا چاہتا ہے۔ نواب وزیر کی منظوری حاصل کیے بغیر ویلزلی نے انگریزی فوج کو اودھ مین بھیج دیا اور ساتھ ہی نواب وزیر کو لکھ بھیجا کہ اس فوج کے اخراجات اسے برداشت کرنے پڑیں گے۔ گورنر جنرل نے ہنری ویلزلی کو لکھنؤ بھیجا تاکہ نواب وزیر کو نیا معاہدے ماننے پر مجبور کر دیا جائے۔ ہنری ویلزلی ستمبر ۱۸۰۱ء میں لکھنؤ پہنچا۔ نواب وزیر نے معاہدے کی شرطیں ماننے سے انکار کر دیا اس پر ویلزلی لکھنؤ کی طرف چل دیا لیکن راستے میں اسے معلوم ہوا کہ نواب وزیر نے معاہدے پر دستخط کر دیے ہیں۔ اس معاہدے نے اودھ کی رہی سہی سیاسی آزادی کو ختم کر دیا۔ اس معاہدے کے بعد ویلزلی نے کورٹ آف ڈائریکٹرز کو ان فائدوں سے آگاہ کیا جو کمپنی کو اس نئے معاہدے سے حاصل

ہوئے تھے۔ لکھنو پہنچ کر ویلزلی نے نواب وزیر سے ملاقات کی۔

نواب وزیر نے گورنر جنرل سے مطالبہ نہیں کیا تھا کہ اسے اپنی ریاست کی حفاظت کے لیے مزید انگریزی فوج کی ضرورت ہے، لیکن اس پر بھی گورنر جنرل نے زائد انگریزی فوج کو اودھ میں بھیج دیا۔ انگریزی فوجوں کے اخراجات کے لیے اودھ کے علاقے طلب کرنا ۱۷۷۸ء کے معاہدے کی خلاف ورزی تھی۔ نواب وزیر معاہدے کے مطابق قسطیں ادا کر رہا تھا۔ کمپنی کی کوئی رقم نواب وزیر کے ذمے نہیں تھی۔ معاہدۂ لکھنو (۱۸۰۱ء) پر دستخط کرنے کے لیے نواب وزیر کو مجبور کیا گیا تھا۔ یہ معاہدہ ۱۷۸۷ء اور ۱۷۹۸ء کے معاہدوں کی خلاف ورزی تھا۔ ان معاہدوں میں اس امر کی وضاحت کر دی گئی تھی کہ کمپنی اودھ کے اندرونی انتظام میں دخل نہیں دے گی۔ (ایضاً، ص ۲۵۱۔۵۲)

۶ر دسمبر ۱۸۰۲ء:

اناف زنوس کی موت (۱۳ر فروری ۱۸۰۰ء) کے بعد مرہٹہ سرداروں میں جھگڑے شروع ہو گئے۔ دولت راؤ سندھیا اور جسونت راؤ ہلکر پونا دربار کو اپنے زیر اثر لانے کے لیے ہاتھ پاؤں مارنے لگے۔ پیشوا نے سندھیا کی طرف داری کی، لیکن ۱۸۰۲ء میں جسونت راؤ ہلکر نے پونا کی لڑائی میں پیشوا اور سندھیا کی متحدہ فوجوں کو شکست دی۔ پیشوا باجی راؤ دوم نے بھاگ کر انگریزوں کے ہاں پناہ لی۔ جسونت راؤ ہلکر نے ونک راؤ کو پیشوا کی گدی پر بٹھا دیا۔

شکست خوردہ پیشوا ۶ر دسمبر ۱۸۰۲ء کو بسین پہنچا جہاں اس کی گردن میں سبسی ڈیری کا طوق ڈال دیا گیا۔ باجی راؤ نے عہد نامۂ بسین کی دفعات میں سب کچھ کھو دیا۔ یہ عہد نامہ کمپنی کی تاریخ میں بہت اہمیت رکھتا ہے۔ اس عہد نامہ نے نہ صرف پیشوا کو آزادی سے محروم کیا بلکہ دوسری مرہٹہ ریاستوں کے سامنے ایک بہت بڑا خطرہ کھڑا کر دیا۔ ویلزلی نے جلاوطن پیشوا کو پونا لانے میں اس لیے تاخیر کی تاکہ پیشوا اس کی مرضی کے مطابق شرائط قبول کر لے۔ نیز وہ اس امر سے خوب آگاہ تھا کہ پیشوا کی تخت نشینی مرہٹوں کے خلاف اعلان جنگ تھی۔ چناں چہ وہ اس اثنا میں جنگ کے لیے تیار ہو رہا تھا۔ جب تیاری پایۂ تکمیل تک پہنچ گئی تو پیشوا کو پونا جانے کا حکم ملا۔

ان شرائط کو ماننے کے بعد باجی راؤ کو مسند پر بیٹھنا نصیب ہوا

(۱) پیشوا اپنے ہاں کمپنی کی امدادی فوج رکھے گا۔

(۲) پیشوا غیر برطانوی افسروں کو اپنی فوجوں میں ملازم نہیں رکھے گا۔

(۳) کمپنی کی رضامندی کے بغیر پیشوا کسی دیسی ریاست سے کسی قسم کا معاہدہ نہیں کرے گا۔

(۴) نظام اور گائیکواڑ سے جھگڑے کی صورت میں پیشوا کمپنی کو ثالث تسلیم کرے گا۔

(۵) کمپنی کی امدادی فوج کے اخراجات کے لیے پیشوا احاطۂ بمبئی کے بعض اضلاع کمپنی کے حوالے کرے گا۔

مسند پیشوائی باجی راؤ کے لیے کانٹوں کا بستر ثابت ہوئی۔ وہ ایام جلاوطنی میں غلامی کے بوجھ کا اندازہ نہ لگا سکا۔ (کمپنی کی حکومت، ص ۵۵۔۲۵۴)

۶ راگست ۱۸۰۳ء: ویلزلی نے سندھیا کے ساتھ طویل مراسلت کا سلسلہ شروع کیا تاکہ اس اثنا میں وہ جنگی تیاریاں کر لے۔ جب ویلزلی نے دیکھا کہ کمپنی کی فوجیں صرف ایک اشارے کی منتظر ہیں تو اس نے اپنے بھائی آرتھر ویلزلی کو جنگ اور صلح کے اختیارات دیے۔ چناں چہ اس نے ۶ راگست ۱۸۰۳ء کو سندھیا اور بھونسلہ کے خلاف ہندوستان کے طول و عرض میں سازشوں کے جال بچھا دیے۔ سندھیا اور راجا برار کے مقابلے کے لیے کمپنی کی فوجیں چھ مختلف محاذ قائم کیے ہوئے تھیں۔ جنرل اسٹوارٹ سرحد میسور پر، آرتھر ویلزلی پونا میں، کرنل اسٹیون سن حیدرآباد میں، جنرل لیک شمالی ہندوستان میں، کرنل کیمپ بل شمالی مدراس میں اور کرنل مرے گجرات میں سندھیا اور بھونسلہ سے جنگ کرنے کے لیے تیار تھے۔ آرتھر ویلزلی اور جنرل لیک سب سے اہم جنگوں میں شریک ہوئے۔

۷ راگست ۱۸۰۳ء: آرتھر ویلزلی ۷ راگست ۱۸۰۳ء کو احمد نگر روانہ ہوا۔ چار روز بعد احمد نگر کا قلعہ اس کے قبضے میں تھا۔ ۱۱ راگست کو جنرل ویلزلی احمد نگر سے روانہ ہوا۔ ۲۴ راگست کو اس نے گوداوری کو عبور کیا۔ وہ کرنل اسٹیون سن سے اورنگ آباد میں ملنا چاہتا تھا۔ جب سندھیا اور بھونسلہ کو احمد نگر کی تسخیر اور ویلزلی کے کوچ کی خبر ملی تو وہ بھی جنگ کے لیے تیار ہو گئے۔

۲۳ ستمبر ۱۸۰۳ء کو سندھیا اور آرتھر ویلزلی کی فوجوں میں جنگ ہوئی۔ سندھیا کے یورپی افسروں نے غداری کی اور میدان آرتھر ویلزلی کے ہاتھ رہا۔ جنگ میں سندھیا کی فوجوں کے یورپی افسروں نے ان کا ساتھ نہیں دیا۔ ''سندھیا اور بھونسلہ کی شکست خوردہ فوجوں کے تعاقب کی جرات نہ آرتھر ویلزلی میں تھی اور نہ کرنل اسٹیون سن میں، لیکن جب انھیں معلوم ہوا کہ سندھیا اور بھونسلہ کی فوجیں ایک دوسرے سے جدا ہو گئی ہیں۔ تب کرنل اسٹیون سن نے سندھیا کی نقل و

حرکت کا مطالعہ کرنے کے لیے اس کا تعاقب کیا اور جنرل ویلزلی بھونسلہ کے مقابلہ کے لیے روانہ ہوا۔ آرگام کی جنگ میں ویلزلی پھر کامیاب ہوا۔

۱۱؍دسمبر ۱۸۰۳ء کو گوال گڑھ کا قلعہ بھی آرتھر ویلزلی کے قبضے میں چلا گیا۔ قلعۂ گوال گڑھ کی تسخیر کے ساتھ ہی آرتھر ویلزلی کی مہمات دکن کا خاتمہ ہو جاتا ہے۔ سندھیا اور بھونسلہ کی کمپنی سے صلح ہو گئی۔ پون گڑھ اور سانبل پور کی تسخیر سے گجرات اور اڑیسہ پر کمپنی کا قبضہ ہو گیا۔ (کمپنی کی حکومت، ص ۵۶-۲۵۵)

۷؍اگست ۱۸۰۳ء کو جنرل لیک کان پور سے روانہ ہو کر ۲۸؍اگست کو کمپنی کی سرحد تک جا پہنچا۔ جنرل لیک، سندھیا کی مملکت پر حملہ آور ہوا۔ ۲۹؍اگست کو جنرل لیک علی گڑھ پر قابض ہو گیا۔ اب لال قلعہ کی دیواروں پر برطانوی علم لہرانے کے لیے لیک دہلی کی طرف بڑھا۔ لوئی بار جن دہلی میں سندھیا کی فوجوں کا افسر اعلیٰ تھا۔ لیک کو داخلۂ دہلی سے قبل اس فرانسیسی جرنیل سے نبرد آزما ہونا تھا۔ لیک نے دہلی پر حملہ کرنے سے پہلے سندھیا کے خلاف سازش کی۔ شاہ عالم نے لوئی بار جن کی مخالفت اور لیک کی حمایت کی۔ شاید وہ اس خیال سے جنرل لیک کا طرف دار ہو گیا ہو کہ لیک کامیابی کے بعد اسے "مغل اعظم" بنا دے گا۔ ہندوستان کے برائے نام شہنشاہ کو معلوم نہیں تھا کہ "اعظم" بنتے ہیں، بنائے نہیں جاتے!

۲۴؍ستمبر ۱۸۰۳ء کو لیک آگرہ روانہ ہوا۔ ۱۷؍اکتوبر کو لیک آگرہ کے قلعے پر قابض ہو گیا۔ لیک کی شمالی مہمات کا خاتمہ لاسواری کی جنگ پر ہوتا ہے۔ لاسواری کی جنگ ہندوستان کی فیصلہ کن جنگوں میں سے ہے۔ اس لڑائی میں کمپنی کے اقتدار کا بالکل خاتمہ ہو جاتا، اگر سندھیا کی فوجوں کے غیر ملکی افسر سندھیا سے غداری نہ کرتے۔ کمپنی اور سندھیا دونوں صلح پر مائل تھے۔ کمپنی نے نئے معاہدے کے ذریعے سندھیا اور بھونسلہ کو ان کی زرخیز زمینوں سے محروم کر دیا۔ نیز کمپنی کی اطاعت کا طوق ان کی گردن میں ڈال دیا گیا۔ پیشوا کی گردن سے سبسی ڈائری سسٹم کا طوق اتارنے کے لیے سندھیا کس قدر بے تاب تھا! یہی سندھیا اب اسی زہر کے پیالے کو اپنے لبوں سے لگا رہا ہے۔ (کمپنی کی حکومت، ص ۲۵۶)

یکم جولائی ۱۸۰۴ء: ہلکر نے جو اس وقت تک خاموش تھا، اب اپنے طور پر انگریزوں سے لڑنے کا فیصلہ کر لیا۔ اس نے ان راجپوت ریاستوں پر حملے کیے جو انگریزوں کے اثر میں تھیں۔ ہلکر نے انگریزوں سے چوتھ کا مطالبہ بھی کیا۔ ویلزلی نے اس مطالبے کو ماننے سے انکار کرتے

ہوئے ہلکر کے خلاف اعلان جنگ کر دیا۔ ہلکر نے اپنے اس خیال کے پیش نظر کہ سندھیا کی فوجوں کی شکست کی سب سے بڑی وجہ اس کی فوجوں کے یورپی افسروں کی غداری ہے۔ اپنی فوج کے تمام یورپی افسروں کو قتل کرا دیا۔ یہی وجہ ہے کہ ہلکر سندھیا کی نسبت زیادہ دیر تک کمپنی سے لڑتا رہا۔ ہلکر کے خلاف جنگی تیاریاں مکمل ہو چکی تھیں۔ ہلکر کی قوت ختم کرنے کے لیے ویلزلی نے تین مقامات پر فوجی اڈے قائم کیے۔ سب سے زیادہ فوج جنرل لیک کے ماتحت شمالی ہندوستان میں تھی۔ دکن کی فوج کرنل ولیس کے زیر کمان تھی۔ گجرات میں کرنل مرے انگریزی فوجوں کا افسر اعلیٰ تھا۔ ہلکر نے اگرچہ اپنی فوجوں کے تمام یورپی افسر قتل کر دیے تھے تاہم انگریزوں کی طرف سے اس کے ذمہ دار افسروں کو منحرف کرنے کی کوشش جاری رہی۔ امیر خان سب سے پہلے ہلکر سے الگ ہو گیا۔ لیک نے جنرل موسن کو ہلکر کے مقابلہ کو بھیجا۔

جنرل موسن یکم جولائی ۱۸۰۴ء کو دورۂ مکندہ کی راہ سے مملکت ہلکر میں داخل ہوا، لیکن بہت جلد اسے واپس ہونا پڑا۔ جنرل موسن کی واپسی ایک بہت بڑی شکست تھی۔ انگریزوں کو بہت نقصان برداشت کرنا پڑا۔ بڑی مشکل کے ساتھ جنرل مونسن آگرہ پہنچا۔ اس پسپائی کی خبر پا کر لارڈ ویلزلی نے کہا: ''میں اس حادثے کے سیاسی نتائج سے لرز جاتا ہوں۔''

۱۵ر دسمبر ۱۸۰۴ء: ہلکر فتح و نصرت کا علم لہراتا ہوا متھرا تک جا پہنچا۔ اس کی آمد پر انگریزوں نے متھرا خالی کر دیا۔ ایک تھکے ہوئے مسافر کی طرح ہلکر متھرا میں ستانے کے لیے رک گیا۔ اسی اثنا میں اس کی دکنی اور مالوی مقبوضات پر انگریز قابض ہو گئے۔ ہلکر متھرا آ رہا تھا، لیکن اس کا مد مقابل جنگی تیاریوں میں مصروف تھا۔ تین ستمبر کو کان پور سے روانہ ہو کر ۲۲۔ ستمبر کو لیک آگرہ پہنچا۔ یکم اکتوبر کو وہ متھرا روانہ ہوا۔ ہلکر اسی اثنا میں دہلی روانہ ہو چکا تھا۔ ہلکر کے دہلی پہنچنے سے قبل لیک دہلی فتح کر چکا تھا۔ ہلکر دہلی فتح کرنے میں ناکام رہا۔ لیک سایہ کی طرح اس کا پیچھا کر رہا تھا۔ ہلکر نے سہارن پور کی راہ لی۔ لیکن بہت جلد ہلکر بھرت پور کی طرف روانہ ہوا۔ شکاری کتے کی طرح لیک نے تعاقب جاری رکھا۔ ہلکر اپنی فوج سمیت ڈیگ کے قلعے میں پناہ گزین ہوا۔ ۱۵ر دسمبر تک آگرے میں قلعہ شکن توپیں پہنچ گئیں۔

۲۳ر دسمبر: ۲۳ر دسمبر کو وہ ڈیگ کے قلعے پر قابض ہو گیا۔ ہلکر بھرت پور کے قلعے میں پناہ گزین ہوا۔ ڈیگ کا قلعہ بھرت پور کی ریاست میں واقع تھا۔ ڈیگ کی تسخیر پر بھی بھرت پور کے حکمران رنجیت سنگھ نے ہلکر کا ساتھ نہ چھوڑا۔ ڈیگ کی شکست و ریخت کے ساتھ ہی راجا تمام

مملکت کو اپنے ہاتھ سے کھو چکا تھا۔ صرف بھرت پور اس کے قبضے میں تھا۔ گرد و نواح پر کمپنی قابض ہو چکی تھی۔ بھرت پور کا محیط تقریباً آٹھ میل تھا۔ شہر کے ارد گرد ایک کچی فصیل تھی۔ فصیل کے باہر پانی سے بھری ہوئی ایک خندق تھی۔ بھرت پور کا مشہور قلعہ شہر کی مشرقی جانب تھا۔ لیک ۲۹/دسمبر ۱۸۰۴ء کو ڈیگ سے روانہ ہو کر ۳/جنوری ۱۸۰۵ء کو بھرت پور پہنچا۔ چار روز بعد فصیل پر آگ برسائی گئی۔ لیک تین بار حملہ آور ہوا لیکن اسے ہر بار شکست سے دو چار ہونا پڑا۔ "سب ٹھیک ہے۔" لیک نے تینوں مرتبہ گورنر جنرل کو لکھا۔ (کمپنی کی حکومت، ص ۵۸۔ ۲۵۷)

۱۸۰۶ء

باوجود گورنمنٹ کے ظاہری احکام کے مذہب عیسوی کی اشاعت و تبلیغ اور مذہب میں مداخلت کا سلسلہ بڑھتا رہا جس سے رعایا کے دلوں میں حد درجہ کی بدگمانیاں پیدا ہوئیں۔ اس کا ظہور پہلی بار ۱۸۰۶ء میں مقام ویلور صوبہ مدراس میں ہوا۔ جب کہ فوج کے سپاہیوں کو حکم دیا گیا کہ وہ پیشانی پر کوئی نشان نہ لگائیں، کان میں کچھ نہ پہنیں اور داڑھیاں منڈائیں جس کی وجہ سے سپاہیوں نے بغاوت کی تھی۔ دوسری بارک پور میں اور تیسری بار مئی ۱۸۵۷ء میں جب کہ سپاہیوں نے چربی کے کارتوسوں کو دانت سے توڑنے سے انکار کیا ملک میں ہنگامہ ہوا۔

۱۸۰۸ء یا اس سے قبل

شاہ عبدالعزیزؒ کا فتویٰ دارالحرب...... تاریخی و سیاسی اہمیت:

برعظم پاک و ہند کی سیاسی تاریخ، تحریکات، تنظیمات (سیاسی پارٹیاں) اور شخصیات ڈاکٹر ابوسلمان شاہجہان پوری کے خاص موضوعات ہیں۔ ان کے بیشتر علمی کام انہی دائروں میں سے کسی نہ کسی دائرے سے تعلق رکھتے ہیں۔ اسی حوالے سے موصوف نے ہندوستان کے دارالحرب ہو جانے کے مسئلے پر قلم اٹھایا ہے۔ ملک کا دارالحرب بن جانا مسلم ہندوستان کی سیاسی تاریخ کا بہت اہم واقعہ تھا۔ لیکن ملک کی سیاسی نوعیت بدل جانے اور دارالاسلام سے دارالحرب ہو جانے کا یہ عمل اتنی آہستگی سے ظہور میں آیا تھا کہ ایک صاحب نظر ہستی کو مستثنیٰ کر دینے کے بعد وقت کا کوئی مدبر اس کی آہٹ بھی نہ سن سکا۔ اتنا ہی نہیں متعدد اہل علم نے تو حالات کے انقلاب اور ملک کی سیاسی اور قانونی حیثیت یکسر بدل جانے کی نوعیت کو تسلیم کرنے ہی سے انکار کر دیا اور نہ صرف

جنگ آزادی ۱۸۵۷ء کی ناکامی کے حادثے کے بعد بھی اس حقیقت کو نہیں سمجھا، بلکہ ۱۹۴۷ء میں قیام پاکستان تک، جب کہ دوسو سال کی تاریخ ہند میں مسلمانوں کی قومی ذلت ورسوائی کی کوئی شکل ایسی نہ تھی جو ظہور میں نہ آچکی ہو اور جس نے مسلمانوں کی پیٹھ پر عبرت کے تازیانے نہ لگائے ہوں، انھوں نے ملک کی سیاسی اور قانونی حیثیت میں انقلاب کا اعتراف نہیں کیا۔ حتیٰ کہ انھوں نے یہ تک نہ سوچا کہ ایک طرف تو وہ ملک کے دارالاسلام ہونے کا عقیدہ رکھتے ہیں اور دوسری طرف بزعم خود پاکستان کی تحریک میں حصہ لینے کے بھی مدعی ہیں۔ دارالاسلام کے تو معنی ہیں اسلامی ملک کے ہیں۔ ''الاعلام بان الہند دارالاسلام'' کے فاضل مفتی مولانا احمد رضا خاں بریلوی کے مطابق اگر ہندوستان ہی دارالاسلام تھا تو آزادی کی جدوجہد اور قیام پاکستان کی تحریک میں حصہ لینے کے کیا معنی ہوئے؟

وہ مستثنیٰ شخصیت جس کا اوپر ذکر کیا گیا ہے اور جس نے ملک کی سیاسی اور قانونی حیثیت بدل جانے کا سب سے پہلے ادراک اور انقلابی اعلان کیا تھا، حکیم الہند حضرت شاہ عبدالعزیز محدث دہلوی قدس سرہ کی تھی۔ انھوں نے انیسویں صدی کی پہلی دہائی میں جب کہ ہندوستان کے تخت پر شاہ عالم ثانی رونق افروز تھے، فتویٰ دیا کہ ہندوستان کی سیاسی حیثیت بدل گئی ہے۔ اس فتوے نے نہ صرف تحریک آزادی کا جواز پیدا کیا تھا بلکہ شاہ صاحبؒ کی زندگی ہی میں تحریک کا عملی آغاز بھی ہو گیا تھا۔ پاکستان کی تحریک کے جواز کی بنیاد بھی یہی عقیدہ یا فتویٰ بن سکتا ہے۔ یعنی ملک دارالحرب تھا تو مسلمانوں پر فرض ہوا کہ وہ اس کی سیاسی حیثیت کو تبدیل کرنے کی جدوجہد کریں اور ملک کو از سرنو ''دارالاسلام'' بنانے کی سعی میں اپنی ہمتیں صرف کردیں۔ یہ بحث بعد کی ہے کہ اس کی صورت کیا ہو؟

(الف) کسی ایک علاقے میں جو مسلمانوں کی اکثریت کا علاقہ ہو، آزاد حکومت قائم کرلیں اور غیر مسلم اکثریت کے علاقوں میں مسلم اقلیت کو اکثریت کے رحم وکرم پر چھوڑ دیں! یا

(ب) پورے ملک میں، خواہ کسی علاقے میں مسلمان اکثریت میں ہوں، خواہ اقلیت میں، ان کے لیے آزادی اور عزت کی زندگی کے سامان کی فکر کی جائے اور ملک میں صدیوں پر پھیلی ہوئی مسلمانوں کی تاریخ، آثار قدیمہ، اوقاف، مساجد، مقابر، درسگاہوں، علم وتہذیب کے مراکز سے رشتے قائم رکھنے کے ساتھ ملک کے اقتدار کے مالک اور حصہ دار بن کر رہا جائے؟

بہر حال ملک کی آزادی کی تحریک خواہ متحدہ ہندوستان کے وفاق میں مساویانہ حیثیت میں شرکت اور کل صوبوں میں ان کی اکثریت کی آزاد حکومتوں کے قیام کی شکل میں ہو، خواہ تقسیم ملک کی بنیاد پر قیام پاکستان کی شکل میں ہو، دونوں تحریکوں کے جواز کے لیے ہندوستان کے دارالحرب ہو جانے کا اعتقاد بنیاد اور اصل اصول کی حیثیت رکھتا ہے۔ آزادی کے ہیرو اور اصل رہنما وہی حضرات تھے جو اس فتوے سے متفق تھے اور تحریک آزادی کے لیے اسے بہ طور عقیدہ مانتے تھے۔ وہ حضرات جو برٹش دور کے ہندوستان کو "دارالاسلام" سمجھتے تھے، ہندوستان کی جنگ آزادی اور قیام پاکستان کی تحریک میں ان کا کوئی حصہ نہ تھا۔

جو حضرات تحریک آزادی اور قیام پاکستان کو تواریخ کے صحیح پس منظر میں پڑھنا چاہتے ہیں، ان کے لیے یہ مقالہ مطالعے کی درست اور مضبوط بنیاد ثابت ہوگا۔ یہ مقالہ ذیل میں نقل کیا جاتا ہے۔ (تنویر احمد شریفی، ناظم مجلس یادگار شیخ الاسلام۔ پاکستان)

مقالہ:

شاہ عبدالعزیز محدث دہلوی (اکتوبر ۱۷۴۶ء۔ جون ۱۸۲۳ء) پہلے شخص ہیں جنھوں نے ہندوستان کے دارالحرب ہونے کا اعلان کیا تھا اور اس ایک اعلان نے ملک کے واقعی اور متسلط اقتدار کے خلاف جدوجہد کا فیصلہ کر دیا تھا۔ لیکن اس اعلان کے لیے اسلامیات کی ایک مخصوص اصطلاح "فتویٰ" استعمال کی گئی تھی۔ اس لیے تحریک آزادی کے مورخوں اور اہل قلم نے اس کی طرف التفات نہیں کیا اور آزادی کی تاریخ میں اس اعلان کو جو مقام ملنا چاہیے تھا، نہ مل سکا اور اس کی واقعی تاریخی اہمیت اور سیاسی حیثیت نمایاں نہ ہو سکی، اگر یہی فتویٰ دہلی کے مدرسۂ رحیمیہ اور شاہ عبدالعزیز کے دارالافتاء کے بجائے کسی قومی، سیاسی جماعت کے پلیٹ فارم سے قرارداد کی شکل میں پاس کر کے شائع کیا جاتا تو جنگ آزادی کا اعلانِ اول قرار پاتا اور تاریخ آزادی کا عنوان جلی بنتا۔

لیکن یہی فتویٰ ہے، جس نے نہ صرف ملک کی سیاسی حیثیت کا فیصلہ کر دیا بلکہ تحریک آزادی کا جواز پیدا کر دیا تھا۔ یہ ملک کی آزادی کی جنگ کا بنیادی پتھر تھا اور پاکستان کی تحریک کی کوئی حقیقی اور واقعی بنیاد بن سکتا تھا تو یہی فتویٰ دارالحرب تھا نہ کہ کوئی اور نعرہ!

ہندوستان "دارالحرب" ہو گیا تھا، تو ہندوستان پر انگریزوں کے تسلط و اقتدار کے خلاف جدوجہد اور آزادی کی تحریک کا بھی جواز تھا۔ اور اگر بعض علماء کے بقول ہندوستان "دارالاسلام"

تھا، جیسا کہ ان کے فتوؤں سے ظاہر ہے اور انگریز ''اولو الامر منکم'' میں داخل تھے اور بہ حکم اطیعوا اللہ و اطیعوا الرسول و اولی الامر منکم، ان کی اطاعت مثلِ اطاعتِ خدا اور رسول کے مسلمانوں پر واجب تھی جیسا کہ بعض علماے وقت نے لکھا ہے تو مسلمانوں کے لیے خصوصاً ان علماء اور ان کے متبعین کے لیے نہ تو برٹش اقتدار کے خلاف جدوجہد جائز تھی اور نہ ملک کی آزادی کی جنگ اور قیامِ پاکستان کی تحریک میں ان کے لیے حصہ لینا جائز تھا۔

البتہ شاہ عبدالعزیز کے اتباع کے لیے نہ صرف جائز بلکہ ان پر واجب تھا کہ وہ برطانوی استعمار کے بڑھتے ہوئے اقتدار اور پھیلتے ہوئے اثرات کے انسداد کے لیے سعی اور ملک کی آزادی کے حصول اور قومی حکومت کے قیام کے لیے جدوجہد کریں۔ چناں چہ جن بزرگوں نے حضرت شاہ صاحب ؒ کو اپنا مقتدا تسلیم کیا تھا انھوں نے شاہ صاحب کی زندگی ہی میں اس کے لیے جدوجہد شروع کر دی تھی، اور ان کے اخلاف نے اس جدوجہد کو اس وقت تک جاری رکھا جب تک برٹش استعمار نے سرزمین ہند کو اپنے وجود کی نحوستوں سے پاک نہیں کر دیا۔

حضرت شاہ عبدالعزیزؒ کا کارنامہ یہ ہے کہ:

۱۔ انھوں نے سب سے پہلے ملک کی سیاسی اور قانونی حیثیت کا فیصلہ کیا اور اعلان کر دیا کہ اب اس کی حیثیت ''دارالاسلام'' کی نہیں رہی۔ اب یہ ملک دارالحرب ہو گیا ہے۔ یہ ہندوستان کی تاریخ سیاست کا بہت بڑا اعلان اور ان کی سیاسی بصیرت اور تدبر کا ثبوت تھا۔ ڈبلیو، ڈبلیو ہنٹر نے اس کا اعتراف کیا ہے۔ وہ لکھتا ہے:

''علماء میں جو لوگ زیادہ زیرک تھے، انھوں نے ہندوستانی مسلمانوں کی حیثیت میں آنے والے تغیر کو بہت پہلے بھانپ لیا تھا۔ یہ تغیر اب ایک حقیقت بن چکا ہے۔ وقتاً فوقتاً شائع ہونے والے فتوؤں میں یہ بات ظاہر ہو جاتی ہے کہ ایسٹ انڈیا کمپنی کے مآل اندیشانہ رویے کے باوجود حکومت کا انقلاب ایک نامعلوم طریقے پر جاری نہ تھا۔ چناں چہ ان میں سے ایک فتوے میں صاف صاف اعلان کیا گیا ہے کہ ہندوستان اس وقت تک دارالاسلام رہ سکتا ہے، جب تک مسلمان مفتی جن کو آگے چل کر ہم نے برطرف کر دیا تھا، قانونی فیصلے کرتے رہیں۔''

ان میں سے دو فتوے یعنی ایک تو شمس الہند مولوی شاہ عبدالعزیز صاحب کا اور دوسرا ان کے داماد مولوی عبدالحی صاحب کا سب سے زیادہ اہم ہیں۔

''جب ہم نے نظامِ حکومت کو بہ تدریج اپنے ہاتھوں میں لے لیا تو اس وقت دیندار مسلمانوں میں اضطراب

پیدا ہوا کہ ہمارے ساتھ ان کے تعلقات کیا ہونے چاہئیں۔ لہذا انھوں نے ہندوستان کے سب سے زیادہ مستند علماء سے رجوع کیا اور اوپر کے دونوں مشہور و معروف علماء نے ان کے جواب میں فتوے صادر فرمائے۔"

ہمارے ہندوستانی مسلمان از ڈبلیو ڈبلیو ہنٹر (ترجمہ اَوَرْ انڈین مسلمانز۔ مترجم ڈاکٹر صادق حسین) لاہور، اقبال اکیڈمی، ۱۹۴۴ء، ص ۱۹۹)

۲۔ شاہ عبدالعزیز نے صرف ایک فتویٰ صادر فرمادینے ہی پر اکتفا نہیں کیا، بلکہ مختلف مسائل کے ضمن میں بار بار ہندوستان کے دارالحرب ہونے کا اعلان کیا۔ خطوط کے ذریعے اپنے معتقدین و منتسبین میں اس فتوے کو عام کیا اور ایک فکری تحریک پیدا کردی۔ یہ ایک خاص قومی سیاسی تحریک تھی۔

اس مرحلے میں ان کے سامنے متعدد راہیں شریعت حقہ نے پیدا کردی تھیں۔ جن کی طرف انھیں مسلمانوں کی راہنمائی کرنی تھی اور سب سے بڑھ کر یہ کہ اپنے عمل سے ان کے لیے نمونہ پیش کرنا تھا۔

(الف) ایک یہ کہ دارالحرب سے ہجرت کر جائیں۔

(ب) دوسری راہ یہ تھی کہ دارالحرب کی حیثیت کو بدلنے کی کوشش کریں اور ملک کو دوبارہ دارالاسلام بنانے کے لیے ساعی ہوں۔

(ج) تیسری راہ یہ تھی کہ وقت کے بعض تن آسان علماء کی طرح ہندوستان کو بدستور دارالاسلام قرار دیں۔

(د) اور چوتھی راہ یہ تھی کہ وقت کے تقاضے اور قوم کے سیاسی مفادات سے اغماض برتیں اور خاموش رہیں۔ جیسا کہ وقت کے بعض علماء کا طرز عمل تھا۔

ان میں سے اول الذکر دو راہیں عزیمت کی تھیں جو ہمیشہ اصحاب عزم امور کے لیے مخصوص رہی ہیں اور دو راہیں رخصت کی تھیں جو ہمیشہ سے ابنائے وقت نے اپنے لیے مذہب و مصلحت کے نام پر روا رکھی ہیں۔

اول الذکر دو راہوں میں بھی اگر پہلی دشوار گذار تھی تو دوسرا دشوار گذار تر تھی۔

پہلی راہ کو اختیار کرنا انفرادی طور پر کچھ لوگوں کے لیے یا ایک مختصر جماعت کے لیے ممکن ہوسکتا تھا، لیکن ہندوستان میں پھیلے ہوئے کروڑوں مسلمانوں کے لیے عملاً ممکن نہ تھا کہ ہندوستان سے ہجرت کر جائیں۔ اگر ان میں سے ایک جماعت چلی بھی جاتی تو مسئلہ پھر بھی اپنی جگہ پر باقی رہ جاتا اور پیچھے رہ جانے والے مسلمانوں کی حالت اور بھی ابتر ہو جاتی اور انہیں گویا کفر و طاغوت

کے حوالے کر دینا ہوتا۔ ان دونوں راہوں میں حضرت شاہ صاحبؒ نے جو راہ اختیار فرمائی تھی اس پر مولانا عبید اللہ سندھی مرحوم نے ان الفاظ میں روشنی ڈالی ہے:

''امام عبدالعزیز نے سب سے پہلے فتویٰ دیا کہ ہندوستان کے جس قدر حصے غیر مسلم طاقت کے قبضے میں جا چکے ہیں، ان قطعات میں اگرچہ برائے نام سلطان دہلی کا دخل مانا جاتا ہے، لیکن وہ سب کے سب دارالحرب ہیں۔ امام عبدالعزیز کے نزدیک سلطان دہلی کی برائے نام حکومت ملک کو دارالاسلام نہیں بنا سکتی۔ ہندوستان میں مسلمانوں کی جو زبردست قوتیں موجود ہیں، ان کا فرض ہے کہ وہ یا تو یہاں سے ہجرت کر جائیں یا دشمن سے لڑ کر اپنی نئی اسلامی حکومت بنائیں۔ ہر وہ شخص جو دارالحرب میں رہتا ہو، اس کا یہ مذہبی فرض ہے۔ دوسرے الفاظ میں اس کا مطلب یہ ہوا کہ اگر اسلامی حکومت کا نظام دشمنوں کی غالب طاقت کا مقابلہ کرنے سے عاجز ہو تو یہ فرض عام مسلمانوں پر عائد ہوتا ہے۔ ملت اسلامیہ کا اس سے تغافل برتنا اور اس معاملے میں کچھ نہ کرنا شریعت کی نظر میں حرام ہے۔ جب یہ حالت ہو تو مسلمانوں کے ہر فرد پر واجب ہے کہ وہ دشمنوں کے غلبے کو ختم کرنے میں اپنی پوری طاقت صرف کرنے کا ارادہ کر لے، اور پھر جیسے جیسے حالات پیش آتے رہیں اسی لحاظ سے اجتماعی نظام قائم کرتا رہے۔

امام ولی اللہ (محدث دہلوی) نے دہلی کے اعلیٰ طبقے سے اپنے علوم و افکار کا تعارف کرایا تھا، مگر امام عبدالعزیزؒ نے قوم کے متوسط طبقے کو بیدار کر کے عوام کو اس حقیقت سے آشنا کر دیا۔ یہی قومی حکومت کی تاسیس ہے۔'' (شاہ ولی اللہؒ اور ان کی سیاسی تحریک، ۱۹۵۲ء، لاہور، ص ۶۵۔۶۴)

مولانا عبید اللہ سندھی نے دارالحرب سے ہجرت کے بارے میں ہندوستان کی اسلامی تاریخ کو پیش نظر رکھتے ہوئے ایک حاشیہ بھی لکھا ہے، اس پر بھی ایک نظر ڈال لینی چاہیے۔ فرماتے ہیں:

''ہجرت کے سلسلے میں یہ بات یاد رکھنی چاہیے کہ ہندوستانی مسلمان ہندوستان چھوڑ ہی نہیں سکتا۔ یہاں کی اکثر آبادی ہندوؤں سے مسلمان ہوئی ہے۔ ان کے مرشد اور استاد بے شک باہر سے آئے اور گو مسلمان بادشاہوں نے یہاں اپنے خاندان چھوڑے مگر ایسی حالت میں کہ اب ان کے پاس حکومت نہیں رہی۔ یہ تینوں (استاد، مرشد اور شاہی خاندان) طبقے ایسے ہیں جو ہندوؤں سے مسلمان نہیں ہوئے تھے لیکن ان کو اپنا ملک چھوڑے اتنا زمانہ گزر چکا ہے کہ انھیں وطن میں کوئی شخص نہیں پہچانتا، ایک سید اگر مکہ معظمہ میں جائے تو عام ہندوستان کی طرح سمجھا جائے گا، یہی حال افغانوں کا افغانستان میں اور ترکوں کا ترکستان میں ہے۔ ہمارے سامنے شریف افغانی خاندان سے تعلق رکھنے والے تعلیم یافتہ ہندوستانی نوجوان کابل میں آئے تاکہ وہ اپنی قومی حکومت کی ترقی میں مدد دیں۔ مگر وہ عام ہندوستانیوں سے زیادہ ذلیل ہو کر واپس گئے۔ لہٰذا ہم نہیں مانتے کہ کوئی ہندوستانی ہندوستان سے ہجرت کی استعداد رکھتا ہے۔ اس لیے ان کا فرض یہی ہوگا کہ وہ ہندوستان میں رہ کر اس کو دارالاسلام بنانے کی سعی کریں۔'' (ایضاً ص ۶۴)

حضرت شاہ عبدالعزیز کو جو برِ عزیمت نے دشوار گذار کے مقابلے میں بھی دشوار گزار تر راہ کا انتخاب کیا، اور ہندوستان کی قانونی حیثیت کو بدلنے اور پھر سے دارالاسلام بنانے کی راہ اختیار فرمائی۔

۳۔ حضرت شاہ عبدالعزیز کا تیسرا بڑا کارنامہ یہ ہے کہ انھوں نے اپنی زندگی میں بعض اصحاب استعداد کی تربیت فرما کر عمل و سعی کے لیے انھیں منظم کر دیا اور ہندوستان کے طول و عرض میں پھیلے ہوئے اپنے تلامذہ اور منتسبین کو ان کی مدد کے لیے آمادہ کر دیا۔

یہاں حضرت شاہ عبدالعزیزؒ کے سیاسی کارنامے کے تمام پہلوؤں پر تبصرہ کرنا مقصود نہیں بلکہ حضرت کی تحریروں میں ان خاص مقامات کی نشان دہی کرنا چاہتا ہوں، جہاں انھوں نے ہندوستان کے دارالحرب ہونے کا اعلان کیا ہے۔

(۱)

اس سلسلے میں جو چیز سب سے پہلے ہمارے سامنے آتی ہے وہ حضرت کا مشہور ''فتویٰ دارالحرب'' ہے جو ''فتاویٰ عزیزی'' کے ابتدائی صفحات ہی میں درج ہے:

سوال: دارالاسلام دارالحرب شود یانہ؟

جواب: در کتب معتبرہ اکثر ھمیں روایت اختیار کردہ کہ دارالاسلام دارالحرب تواند شد بشروط ثلاثہ در درالمختار می نویسد "لاتصیر دارالاسلام دارالحرب الا بامور ثلثة باجراء الاحکام اهل الشرک وباتصالها بدار الحرب وبان لایبقی فیها مسلم اوذمی آمنا بالامان الاول علیٰ نفسه ودارالحرب تصیر دارالاسلام باجراء احکام اهل الاسلام فیهاً، انتهیٰ. ودر کافی می نویسد ان المراد بدار الاسلام بلادیجری فیها حکم امام المسلمین ویکون تحت قهره وبدارالحرب بلادیجری فیها امر عظیمها و یکون قهره، انتهٰی.

دریں شهر حکم امام المسلمین اصلا جاری نیست و حکم رؤساء نصاریٰ بے دغدغه جاری است و مراداز اجراء احکام کفر این ست که در مقدمات ملک داری و بندوبست رعایا و اخذ خراج وباج وعشور، اموالِ تجارتؔ و سیاست، قطاع الطریق و سراق، فصل خصومات و سزاے جنایات کفار بطور خود حاکم باشند آرے اگر بعضے احکام اسلام رامثل جمعه و عیدین و اذان و ذبح بقرتعرض نه کنند نکرده باشد، لیکن اصل الاصول این چیز هانزد ایشاں

هجاوهد راست زیرا که مساجد را بے تکلف ہدم می نمایند و ہیچ مسلمان یا ذمی بغیر استیمان ایشان دریں شہر و در نواح آں نمی تواند آمد برائے منفعتِ خود واردین و مسافرین و تجار مخالفت نمی نمایند اعیان دیگر مثل شجاع الملک و ولایتی بیگم بغیر حکمِ ایشاں دریں بلاد داخل نمی توانند شدوازیں شہر تا کلکته عمل نصاریٰ مقد راست. آرے در چپ و راست مثل حیدر آباد و لکھنو و رام پور احکام خود جاری نہ کردہ اندبسبب مصالحه و اطاعت مالکان آں ملک. و از روے احادیث و تتبع سیرتِ صحابۂ کرامؓ و خلفاء عظام ہمیں مفہوم می شود۔ زیرا که در عہد حضرت صدیق اکبر ملک بنی یربوع را حکم دارالحرب دادند، باوجودیکه مسلمانان دراں بلاد موجود بودند، و علیٰ ہذا القیاس درعہد خلفاء کرام ہمیں طریق سلوک بود بلکه درعہد حضرت پیغمبر ﷺ فدک و خیبر را حکم دارالحرب فرمودند. حالانکه تجارِ اہل اسلام بلکه بعضے سکنه آں جائیز دراں مکانات در وادی القریٰ مشرف باسلام بودند و فدک و خیبر را کمال اتصال بودبا مدینہ منورہ.“ (فتاویٰ عزیزی، جلد اول، ص ۱۶۱)

سوال: دارالاسلام دارالحرب ہوسکتا ہے یا نہیں؟

جواب: معتبر کتابوں میں اکثر یہی روایت اختیار ہے کہ جب تین شرطیں پائی جائیں تو دارالاسلام دارالحرب ہوجاتا ہے۔ ”درالمختار“ میں ہے:

”لاتصیر دارالاسلام دارالحرب الا بامور ثلثة باجراء احکام اہل الشرک وباتصالها بدار الحرب وبان لایبقی فیهامسلم اوذمی آمنا بالامان الاول علیٰ نفسه و دارالحرب تصیر دارالاسلام باجراء احکام اہل الاسلام فیها. انتھیٰ.“

یعنی دارالاسلام دارالحرب نہیں ہوسکتا مگر جب تین امور پائے جاویں:

۱۔ وہاں مشرکین کے احکام جاری ہوجاویں۔

۲۔ اوردارالاسلام دارالحرب سے مل جاوے۔

۳۔ اور وہاں کوئی مسلمان باقی نہ رہے، اور نہ وہاں کوئی ایسا کافر ذمی رہ جائے جو پہلے مسلمانوں سے پناہ لے کر رہا ہو، اور اب بھی اسی پناہ کی وجہ سے ہو۔

اور دارالحرب اس حالت میں دارالاسلام ہو جاتا ہے کہ اہل اسلام کے احکام اس میں جاری ہو جائیں اور ''کافی'' میں لکھا ہے:

''ان المراد بدار الاسلام بلاد یجری فیها حکم امام المسلمین ویکون تحت قهره وبدار الحرب بلاد یجری فیها امر عظیمها ویکون تحت قهره انتهیٰ.

یعنی دارالاسلام سے مراد وہ شہر ہیں جن میں مسلمانوں کے امام کا حکم جاری ہو، اور وہ شہر اس کے زیر حکومت ہوں، اور دارالحرب سے وہ شہر مراد ہیں جن میں کافروں کے سردار کا حکم جاری ہو اور اس کے زیر حکومت ہوں۔

یہ کافی کی عبارت کا ترجمہ ہے، اس ملک میں مسلمانوں کے امام کا حکم ہرگز جاری نہیں، نصاریٰ کے حکام کا حکم بے دغدغہ جاری ہے اور احکام کفر کے جاری ہونے سے یہ مراد ہے کہ مقدمات ملک وانتظام سلطنت و بندوبست رعایا و تحصیل خراج و باج وعشر اور اموال تجارت میں حکام بطور خود حاکم ہوں اور ڈاکوؤں اور چوروں کی سزا اور رعایا کے باہمی معاملات اور جرموں کی سزا کے مقدمات میں کفار کا حکم جاری ہوا۔ اگرچہ بعض احکام اسلام مثلاً جمعہ وعیدین واذان وگاؤ کشی میں کفار تعرض نہ کریں لیکن ان چیزوں کا اصل اصول ان کے نزدیک بے فائدہ ہے۔ لیکن مسجدوں کو بے تکلف منہدم کر دیتے ہیں، جب تک یہ اجازت نہ دیویں کوئی مسلمان اور کافر ذمی ان اطراف میں نہیں آ سکتا۔ مصلحتاً واردین اور مسافرین اور تاجروں سے مخالفت نہیں کرتے، دوسرے امراء مثلاً شجاع الملک اور ولایتی بیگم بلا اجازت ان کے شہروں میں نہیں آ سکتے اور اس شہر سے کلکتہ تک ہر جگہ نصاریٰ کا عمل ہے۔ البتہ اپنے دائیں بائیں مثلاً حیدر آباد، لکھنو اور رام پور میں ان کا حکم جاری نہیں، کیوں کہ ان مقامات کے والیانِ ملک نے ان سے صلح کر لی اور ان کی فرماں برداری منظور کر لی اور احادیث اور صحابۂ کرام اور خلفاے عظام کی رائے سے ایسا ہی مفہوم ہوتا ہے، کیوں کہ حضرت صدیق اکبرؓ کے زمانے میں یہ حکم دیا گیا تھا کہ بنی یربوع دارالحرب ہے۔ حال آں کہ جمعہ اور عیدین اور اذان اس جگہ جاری تھا مگر وہاں کے لوگوں کو حکم زکوٰۃ سے انکار تھا، اور ایسا ہی اس کے اطراف و جوانب کے بارے میں یہ حکم تھا کہ دارالحرب ہے، حال آں کہ

ان شہروں میں مسلمان بھی تھے۔علی ہذا القیاس خلفاے کرام کے زمانے میں یہی طریقہ جاری رہا، بلکہ حضرت پیغمبر ﷺ نے بھی اپنے زمانے میں یہ حکم فرمایا تھا کہ فدک اور خیبر دارالحرب ہے، حال آں کہ ان مقامات میں اہلِ اسلام کے تجار بلکہ وہاں کے بعض باشندے بھی وادی قریٰ میں مسلمان تھے،اور فدک وخیبر مدینۂ منورہ سے نہایت متصل تھا۔(فتاویٰ عزیزی، جلد اول، ص ۳۵)

(۲)

شاہ عبدالعزیز کا دوسرا فتویٰ سود کے ضمن میں ہے، جس میں شاہ صاحب نے ہندوستان کے دارالحرب ہونے کا ذکر فرمایا ہے، سوال اور اس کا جواب یہ ہے:

سوال: دارالحرب کے کفار (حربی) کو سود دینا درست ہے یا نہیں؟

جواب: کتب فقہ میں اس کی نسبت حکم عام ہے، جس میں حربی سے سود لینا اور اسے سود دینا شامل ہیں۔ جیسا کہ ہدایہ وغیرہ کتب فقہ میں ہے کہ:

"لاربوا بین المسلم والحربی فی دار الحرب."

"یعنی دارالحرب میں مسلمان اور حربی کے درمیان سود کا معاملہ ناجائز نہیں۔"

اور قاضی ثناء اللہ صاحب پانی پتی نے اپنے رسالے میں سود دینے کی جو توجیہ بیان کی ہے، وہ اس وقت فقیر کو یاد نہیں۔ لیکن ظاہر ہے کہ کافر حربی سے سود لینا حلال ہے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ کافر حربی کا مال مباح ہے، بشرطیکہ کافر حربی کا مال لینے میں عہد شکنی کا احتمال نہ ہو۔ لیکن اگر اہل اسلام سے کوئی معاہدہ ہو تو جائز نہیں۔ اس واسطے کہ ایسی حالت میں اگر ناجائز طور پر حربی کا مال لیا جائے تو عہد شکنی ہوگی تو جب کہ حربی خود بخود اپنا مال سود میں دے تو وہ مال بلاشبہ حلال ہے اور کفار حربی کو سود دینا بھی جائز ہے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ مال حرام مسلمانوں کو کھانا حرام ہے اور جو چیزیں ہمارے یہاں حرام ہیں، ان کو کفار حربی خود کھاتے ہیں تو اگر ان کو کچھ بطور سود کے دیا جائے تو صرف یہی لازم آئے کہ جو چیز ہمارے یہاں حرام ہے کفار حربی اس معاملے کے ذریعے کھائیں گے اور جو کفار ذمی ہیں یعنی اہل اسلام سے پناہ لے کر دارالاسلام میں ہیں، تو اگرچہ جو چیز ہمارے یہاں حرام ہے وہ چیز کفار ذمی کھاتے ہیں۔ مگر ذمی کو دارالاسلام میں سود دینا حرام ہے۔ اس کا سبب یہ ہے کہ جو شخص ایسا کرتا ہے وہ سود کے معاملے کو دارالاسلام میں رواج دیتا ہے۔

اور دارالحرب میں کافر کو سود دینے سے یہ نقص لازم نہیں آتا۔ اس واسطے کہ دارالحرب میں کافر

کو سود دینا مباح ہے۔ اس مسئلے کی تحقیق یہ ہے کہ سود دینا بالتبع حرام ہے۔ اس واسطے کہ سود دینے میں کسی دوسرے کا مال نہیں لیا جاتا۔ بلکہ اپنا مال دینا ہوتا ہے اور اگر چہ اپنا نقصان ہو تب بھی اپنا مال دینا مباح ہے۔ علی الخصوص جب غرض ہو کہ مال دینے سے حاجت روائی ہو یا کسی کے ظلم سے محفوظ رہیں تو اس غرض سے اپنا مال دینے میں کچھ حرج نہیں۔ صرف دو امر سے سود دینا حرام ہے:

(۱) اول امر یہ کہ سود دینے والا غیر کو حرام کھلاتا ہے۔ یعنی جب وہ سود دیتا ہے تو اس فعل حرام کا باعث ہوتا ہے کہ دوسرا شخص اس کے ذریعے سے سود کھاتا ہے۔ جو مال حرام ہے اور یہی قباحت اس صورت میں بھی لازم آتی ہے کہ قاضی یا کسی دوسرے حاکم کو رشوت دی جائے۔

(۲) دوسرا امر یہ ہے کہ سود دینے والا اس امر کے لیے باعث ہوتا ہے کہ دارالاسلام میں سود رواج پائے اور علماء نے یہ جائز قرار دیا ہے کہ بحالت اضطرار دارالاسلام میں بھی سود دیا جائے۔

غرضیکہ سود لینے اور دینے میں بہت فرق ہے۔ اگر چہ اصل گناہ دونوں امر میں ہے۔ (فتاویٰ عزیزی، کراچی، ایچ ایم سعید کمپنی، ۱۹۶۷ء، ص ۵۳-۵۵۲)

(۳)

سود ہی کے سلسلے میں ایک مستفتی کا سوال اور شاہ عبدالعزیزؒ محدث دہلوی کا جواب ملاحظہ فرمائیں:

سوال: تمام ملک نصاریٰ کا بالاتفاق دارالحرب ہے یا نہیں، اور اگر نصاریٰ کا تمام ملک دارالحرب ہے تو جائز ہے یا نہیں کہ اہل اسلام ان نصاریٰ سے سود لیں۔ دیگر جس جگہ کفار کی عملداری ہے وہاں جب جمعہ پڑھ لیا جائے تو اس دن کے ظہر کی فرضیت ساقط ہو جاتی ہے یا نہیں؟

دیگر: اہل اسلام ضرورت کی وجہ سے کفار کو روپیہ دیتے ہیں اور ان سے سود لیتے ہیں یہ جائز ہے یا نہیں؟

جواب: دارالحرب ہونے کی شرطیں روایات فقہ میں مذکور ہیں۔ ان روایتوں کو ملاحظہ کرنا چاہیے۔ چناں چہ دو شرطیں اس جواب میں لکھی جائیں گی، خیال کرنا چاہیے کہ وہ شرطیں اگر نصاریٰ کے ملک میں پائی جاتی ہیں تو وہ ملک دارالحرب ہے اور جب کوئی

چیز پائی جاتی ہے تو اس کے لوازم بھی پائے جاتے ہیں۔ تو جب نصاریٰ کا ملک دارالحرب ہوا تو اس ملک میں کفار سے سود لینا اور کفار کو سود دینا بھی جائز ہوا۔ اس واسطے کہ ہدایہ میں یہ مذکور ہے:

''لاربوا بین المسلم والحربی فی دار الحرب.''

''مسلمان اور کافر حربی کے درمیان دارالحرب میں سود حرام نہیں۔''

اور قاعدہ یہ ہے کہ روایات میں جو حکم مطلق ہوتا ہے، وہ عام ہوتا ہے تو دونوں صورتوں میں، یعنی سود لینا اور دینا حرمت کی نفی میں داخل ہوا۔

لیکن مسلمانوں کو چاہیے کہ کافر حربی کو سود دینے میں احتیاط کرے۔ بے ضرورت کافر حربی کو بھی سود نہ دے۔

اور دارالحرب میں جمعہ قائم کرنے کے بارے میں یہ حکم ہے کہ اگر دارالحرب میں کسی جگہ مسلمان حاکم کفار کی طرف سے مقرر ہو تو درست ہے، اس حاکم کی اجازت سے جمعہ قائم کیا جائے۔ اور اگر مسلمان حاکم نہ ہو تو مسلمانوں کو چاہیے کہ جو شخص امانت دار اور دیانت دار ہو، اسے وہ خود رئیس مقرر کرلیں تا کہ اس رئیس کی اجازت سے اس کی موجودگی میں جمعہ وعیدین قائم کی جائے اور جس نابالغ کا ولی نہ ہو اس کا نکاح کیا جائے اور لاوارث مال اور یتیموں کے مفاد کی حفاظت کی جائے، اور جب کسی کی وفات پر ترکے کی تقسیم میں نزاع ہو تو ترکہ اس متوفی کے وارثوں میں ان کے حصوں کے مطابق تقسیم کیا جائے۔ اگرچہ اس رئیس کو امور ملکی میں تصرف اور دخل نہ ہوگا۔ اور اگر دارالحرب میں کسی جگہ کفار کی طرف سے مسلمان حاکم مقرر نہ ہو اور نہ مسلمانوں نے اپنے طور پر کسی شخص ایماندار کو وہاں کا رئیس قرار دیا ہو تو وہاں چاہیے کہ نماز جمعہ ادا کرنے کے بعد چار رکعت فرض اس نیت سے پڑھے کہ وہ آخر ظہر پڑھتا ہوں جس کا وقت میں نے پایا، مگر اس کو میں نے نہ پڑھا۔ تا کہ فرض ادا ہو جائے۔

فی الهداية لاربوا بين المسلم والحربی فی دار الحرب خلافاً لابی يوسف والشافعی لهما ان الاعتبار بالمستامن منهم فی دارنا ولنا قوله عليه السلام لاربوا بين المسلم والحربی فی دار الحرب ولا ان مالهم مباح فی دارهم فبای طريق اخذه المسلم اخذ مالاً مباحاً اذا لم يكن فيه بخلاف المستامن منهم لان ماله صار محظورا بعقد الامان. انتهى.

یعنی ہدایہ میں لکھا ہے کہ مسلمان اور کافر حربی کے درمیان دارالحرب میں سود حرام نہیں۔ اس مسئلے میں خلاف ہے امام ابو یوسفؒ اور امام شافعیؒ کا۔ ان دونوں صاحبوں کی دلیل یہ ہے کہ جو کافر دارالاسلام میں مسلمانوں سے امن لے کر رہتا ہو، تو وہاں اس کافر اور مسلمان کے درمیان سود کا معاملہ ناجائز ہوگا۔ وہی حکم کافر حربی کے بارے میں دارالحرب میں ہوگا۔ یعنی دارالحرب میں کافر حربی اور مسلمانوں کے درمیان سود کا معاملہ ناجائز ہوگا اور ہماری دلیل یہ حدیث شریف ہے کہ مسلمان اور کافر حربی کے درمیان دارالحرب میں سود حرام نہیں اور یہ دلیل بھی ہے کہ دارالحرب میں کفار حربی کا مال مباح ہوتا ہے تو جس طور سے وہ مال مسلمان لے گا یہی حکم ہوگا کہ اس مسلمان نے مال مباح لیا ہے۔ بشرطیکہ وہ مال لینے میں عہد شکنی نہ ہو، بخلاف اس کافر کے جو مسلمانوں سے پناہ لے کر دارالاسلام میں ہو۔ اس واسطے کہ کافر کو پناہ دی جاتی ہے۔ اس وجہ سے اس کا مال لے لینا منع ہو جاتا ہے:

وفی عالمگیریة من باب الاستیلاء الکفار اعلم ان دارالحرب تصیر دارالاسلام بشرط واحد وھو اظہار حکم الاسلام فیھا قال محمد فی الزیادات انما تصیر دارالاسلام دارالحرب عندابی حنیفة بشرائط ثلٰث.

احدھا اجراء احکام الکفار علیٰ سبیل الاشتہار وان لایحکم فیھابحکم اسلام.

والثانی ان یکون متصلةً بدار الحرب ولا یتخلل بینھما بلدة من بلادالاسلام.

والثالث ان لایبقیٰ فیھا مؤمن ولا ذمی امناً بالامان الاول الذی کان ثابتاً قبل استیلآء الکفار للمسلم باسلامہٖ والذمی بعقد الذمة.

وصورة المسئلة علیٰ ثلٰثة اوجه اما ان یغلب اھل الحرب علی دار من دارنا اوارتد اھل مصر وغلبوا واجروا احکام الکفرا ونقض اھل الذمة العھد وتغلبوا علیٰ دارھم ففی کل من ھذه الصور لاتصیر دارالحرب الابثلث شرائط وقال ابو یوسف و محمد بشرط واحدٍ لاغیروھو اظہار احکام الکفر وھو القیاس. انتھیٰ.

ایضاً فی العالمگیریة من باب الجمعة بلاد علیھا ولاة کفار یجوز

المسلمين اقامة الجمعة ويصير القاضي قاضياً بتراضي المسلمين ويجب عليهم ان يلتمسوا والياً مسلماً، كذا في معراج الدراية . انتهىٰ.

یعنی فتاویٰ عالمگیری میں باب استیلاء الکفار میں لکھا ہے کہ دارالحرب صرف ایک شرط پائے جانے سے دارالاسلام ہو جاتا ہے اور وہ شرط یہ ہے کہ اس دارالحرب میں اسلام کا حکم ظاہر کر دیا جائے۔

امام محمدؒ نے زیادات میں لکھا ہے کہ دارالاسلام امام ابوحنیفہ کے نزدیک اس وقت دارالحرب ہو جاتا ہے جب اس دارالاسلام میں یہ تین شرطیں پائی جائیں۔

پہلی شرط یہ ہے کہ اس دارالاسلام میں کفار کے احکام جاری وشائع ہو جائیں۔ وہاں اسلام کا حکم باقی نہ رہے۔

دوسری شرط یہ ہے کہ دارالحرب کے ساتھ دارالحرب متصل ہو جائے، ان دونوں مقامات کے درمیان میں اسلام کا کوئی شہر نہ ہو۔

تیسری شرط یہ ہے کہ اس دارالاسلام میں کوئی مسلمان امن کے ساتھ باقی نہ رہے۔ اس کے امن کے ذریعے سے جو سابق میں اس کو اسلام کے سبب سے حاصل تھا اور نہ وہاں کوئی کافر ذمی امن کے ساتھ باقی رہ جائے۔ اس امن کے ذریعے سے جو سابق میں اس کو حاصل تھا۔

اور صورت اس مسئلے کی تین طور پر ہے:

ایک یہ کہ کفار حربی کا غلبہ کسی دارالاسلام میں ہو جائے، یا کسی شہر کے لوگ مرتد ہو جائیں (نعوذ باللہ من ذلک) اور ان لوگوں کا غلبہ ہو جائے اور وہ لوگ احکام کفر کو جاری کر دیں۔

دوسرے یہ کہ کسی جگہ کے کفار ذمی عہد شکنی کریں، اور وہاں ان کا غلبہ ہو جائے تو دارالاسلام ان صورتوں میں دارالحرب نہ ہوگا۔

البتہ دارالاسلام اس حالت میں دارالحرب ہو جائے گا کہ وہاں وہ تین شرطیں پائی جائیں جن کا ذکر اوپر ہوا ہے اور امام ابو یوسفؒ اور امام محمدؒ کا قول یہ ہے کہ جب کسی مقام میں کفر کے احکام شائع ہو جائیں تو وہ مقام صرف اسی ایک شرط کے پائے جانے سے دارالحرب ہو جائے گا۔ دوسری شرط کی ضرورت نہیں۔ اور یہی حکم قیاس کے موافق ہے۔

اور یہ بھی فتاویٰ عالمگیری کے باب الجمعہ میں مذکورہ ہے کہ جن شہروں میں والیانِ ملک کفار ہیں، وہاں اہل اسلام کے لیے جائز ہے کہ جمعہ قائم کریں اور وہاں کے اہل اسلام جس شخص کے

قاضی ہونے پر راضی ہوں گے، وہی شخص شرعاً قاضی ہو جائے گا۔ مگر اہل اسلام پر واجب ہے کہ کوئی مسلمان والی ملک تلاش کریں، ایسا ہی معراج الدرایہ میں ہے۔ یہ مضمون فتاویٰ عالمگیری کی عبارت مذکور کا ہے۔ (ایضاً ص ۵۶۔ ۵۵۳)

(۴)

ایک اور مستفتی نے حضرت شاہ عبدالعزیز سے اسی قسم کا سوال دریافت فرمایا تھا۔ اس کے جواب میں حضرت نے ملک کے دارالحرب ہو جانے کا ذکر کیا۔ اگرچہ سوال میں یہ مسئلہ سود کے ضمن میں آیا تھا لیکن حضرت نے دارالحرب کی شرائط کا بہ تفصیل ذکر اور ان شرائط کا ہندوستان میں اطلاق فرمایا اور نہ صرف انگریزی حکومت کے حدود بلکہ ان کے مثل مرہٹہ اور سکھ ریاستوں کو بھی اس میں شامل فرمایا۔ مستفتی کا سوال اور حضرت شاہ صاحب کا جواب یہ ہے:

سوال: ہدایہ میں لکھا ہے کہ امام ابوحنیفہ کے نزدیک جائز ہے کہ دارالحرب میں کافر سے سود لیا جائے۔ لیکن صاحبینؒ (امام ابو یوسفؒ اور امام محمدؒ) اور امام شافعیؒ کے نزدیک یہ سود بھی ناجائز ہے۔ سود منع ہونے کے بارے میں شارع کی جانب سے کتاب وسنت میں جس قدر تشدد وارد ہے، اس کے اعتبار سے یہ مسئلہ امام اعظم کا شرع کے لحاظ سے بعید معلوم ہوتا ہے۔ انگریز اور ان کے مانند دوسرے لوگوں (مرہٹوں اور سکھوں) کی عملداری دارالحرب ہے یا نہیں؟ جواب ارشاد فرمائیں:

جواب: یہ جو قول ہے: لا ربوا بین المسلم والحربی۔ یعنی ''اور نہیں سود ہے درمیان مسلمان اور کافر حربی کے۔''

تو یہ قول ظاہر پر محمول ہے، اور اصول فقہ کے موافق ہے اور اس طرح کے بہت سے مسائل ہیں۔ مثلاً لا ربوا بین المالک والمملوک۔ یعنی نہیں ہے سود درمیان مالک اور مملوک کے۔'' اور بھی اس کے مانند قول ہے۔ اور اصل قاعدۂ کلیہ یہ ہے کہ جس جگہ مال بلا شرط معاوضہ مفت لینا جائز ہے وہاں سود حرام نہیں۔

اگر کوئی مسلمان کافر حربی سے پناہ لے کر دارالحرب میں رہے تو وہاں اس مسلمان کے لیے جائز نہیں کہ کافر حربی کا مال جبراً لے لے۔ اگر کفار خوشی سے دے دیں تو بہرحال ان کا مال لے لینا جائز ہے۔ حتیٰ کہ اگر کفار حربی کسی عقد فاسد کے ذریعے سے بھی اپنا مال اس مسلمان کو دیں، تب

بھی مسلمان کے لیے وہ مال لینا جائز ہے اور دارالحرب میں اس عقد فاسد کی شرط فاسد درست ہو جاتی ہے۔اس واسطے کہ کفار حربی کا مال دارالحرب میں مسلمان کے لیے اصل میں مباح ہے۔ لیکن جو مسلمان کہ دارالحرب میں کفار حربی سے پناہ لے کر رہتا ہو، اس کے لیے حرام ہے کہ وہاں کفار حربی کا مال جبراً ان سے لے لے۔اور یہ حرمت صرف اس وجہ سے ہے کہ وہاں کفار حربی کا مال جبراً لے لینے سے عہد شکنی ہوتی ہے اور جب وہ خوشی سے اپنا مال دیں تو اس مال کے بارے میں کوئی وجہ حرمت کی نہیں۔

اور یہ جو سوال میں ہے کہ عملداری انگریز کی اور ان کے مانند اور لوگوں کی عملداری جو اہل اسلام سے نہیں، دارالحرب ہے یا نہیں؟

جاننا چاہیے کہ یہ قول کہ دارالاسلام کبھی دارالحرب نہیں ہو سکتا مرجوح ہے۔یعنی ضعیف ہے۔ اصح قول یہ ہے کہ ایسا ہو سکتا ہے کہ دارالاسلام دارالحرب ہو جائے۔البتہ اس میں اختلاف ہے کہ دارالاسلام کس صورت میں دارالحرب ہو جاتا ہے۔

☆ علماء کی ایک جماعت کا یہ کلام ہے کہ اگر کوئی ایک چیز بھی شعائر اسلام سے جبراً منع کی جائے مثلاً اذان یا ختنہ سے جبراً دارالاسلام میں منع کیا جائے تو وہ دارالاسلام دارالحرب ہو جاتا ہے۔

علماء کی دوسری جماعت کا یہ قول ہے کہ دارومدار اس امر کا کہ دارالاسلام دارالحرب ہو جائے اس پر نہیں کہ اس دارالاسلام میں شعائر اسلام مٹا دیے جائیں بلکہ جب شعائرِ کفر بے دغدغہ اعلانیہ دارالاسلام میں رواج پائیں، اگرچہ وہاں شعائرِ اسلام بھی سب قائم ہوں تاہم وہ دارالاسلام دارالحرب ہو جاتا ہے۔

علماء کی ایک تیسری جماعت بھی ہے، اس نے اس سے بھی ترقی کی ہے اور یہ کہا ہے کہ دارالحرب اس کو کہتے ہیں کہ وہاں نہ کوئی مسلمان اور نہ کوئی کافر ذمی امن میں سابق پناہ کے ذریعے سے ہو۔خواہ بعض شعائرِ اسلام وہاں ترک کیے گئے ہوں یا نہ کیے گئے ہوں، اور خواہ اعلانیہ شعائرِ کفر نے رواج پایا ہو یا نہ پایا ہو۔

اور اسی قول ثالث کو محققین نے ترجیح دی ہے اور باعتبار اس قول ثالث کے عملداری انگریز کی اور اس کے مانند دوسرے غیر اسلام (مرہٹہ اور سکھ) کی عملداری بلاشبہ دارالحرب ہے۔واللہ اعلم۔

(ایضاً ص ۵۶-۵۵۵)

(۵)

یہ تمام سوال و جواب فتاویٰ عزیزی سے نقل کیے گئے۔ ان سوال و جواب پر کہیں تاریخ نہیں ہے۔ یہ بات تو معلوم ہے کہ یہ تمام تحریریں حضرت شاہ صاحب کی زندگی کی ہیں۔ یعنی جون ۱۸۲۴ء سے قبل کی۔ لیکن ذیل میں حضرت شاہ صاحب کے جن خطوط سے دو اقتباس پیش کیے جاتے ہیں، اگرچہ تاریخ ان پر بھی نہیں ہے، لیکن وہ اخون زادہ مولوی عبدالرحمٰن خان رام پوری اور ان کے بھائیوں کے نام ہیں اور مولوی صاحب مرحوم کا انتقال ۱۲۲۴ھ میں (مطابق وسط فروری ۱۸۰۹ء تا فروری ۱۸۱۰ء) میں ہوگیا تھا۔ اس امر نے فیصلہ کردیا کہ شاہ صاحب کا فتویٰ ۱۸۰۹ء سے قبل کا ہے۔

میرا خیال ہے کہ شاہ صاحب کا ذہن ہندوستان کے دارالحرب ہونے کا فیصلہ اس وقت کرچکا تھا جب حضرت نے سید احمد شہید کو نواب ٹونک سے وابستگی کا ایما فرمایا تھا۔ مولانا غلام رسول مہر مرحوم کی تحقیق کے مطابق سید صاحب ۱۰۔۱۸۰۹ء میں ٹونک سے وابستہ ہوئے اور سات سال کی ملازمت کے بعد ۱۸۱۸ء (مئی یا جون) میں مراجعت فرمائے دہلی ہوئے۔ اسی کے بعد ولی اللّٰہی تحریک اصلاح و جہاد کا عملی و انقلابی دور شروع ہوگیا۔ اس صراحت سے بھی اندازہ کیا جاسکتا ہے کہ شاہ صاحب کا فتویٰ جہاد ۱۸۰۹ء سے پہلے کا ہے۔ سید صاحب دہلی ۱۸۰۷ء میں پہنچے تھے۔ شاہ صاحب نے شروع ہی سے ان میں علمی صلاحیتوں کے مقابلے میں عمل و ریاضت سے ان کے شوق و رغبت کو محسوس کرلیا تھا۔ یقیناً یہی وقت تھا جب شاہ صاحب نے تحریک ولی اللّٰہی کے عملی و انقلابی دور کے آغاز اور جماعت کی تنظیم کا فیصلہ کرلیا ہوگا اور میرے خیال میں یہی وقت ہوگا جب ذہنی و فکری تربیت اور سعی و عمل کا میدان ہموار کرنے کے لیے شاہ صاحب نے دارالحرب کا فتویٰ دیا ہوگا۔

اب آپ اخون زادہ مولوی عبدالرحمٰن خان (رام پوری) اور ان کے بھائیوں کے نام حضرت شاہ عبدالعزیز محدث دہلوی کے مکتوب گرامی کے اقتباسات ملاحظہ فرمائیں۔

۱۔ (ترجمہ) ''بڑے بھائی شاہ محمد صاحب سلمہم اللہ تعالیٰ بلدہ لکھنو چھاؤنی میں نواب محمد افضل خان (برادر نجیب الدولہ مرحوم) کے پاس ہیں اور خیریت سے ہیں۔ ان کے خطوط اکثر آتے رہتے ہیں۔ خاطر جمع رکھیے۔ باقی ہر طرح خیریت ہے۔ لیکن ان شہروں میں کفار کا عمل دخل اور غلبہ بہت زیادہ ہوگیا ہے، اور مسلمان خصوصاً زمرۂ فقرا اور علماء کا

طریقِ معاش بے مزہ ہوگیا ہے"۔ (تذکرۂ کاملان رام پور، از حافظ احمد علی شوق، پٹنہ، خدا بخش لائبریری، ۱۹۸۶ء، ص ۲۰۳)

۱۔ (ترجمہ) "اوران شہروں کے امرا و نوابین کے برے عقیدوں کے بارے میں جو کچھ لکھا ہے، فی الواقع اسی طرح سننے میں آیا ہے۔ حسبنا الله ونعم الوكيل. لاحول ولا قوة الا بالله العلى العظيم.

اس ملک میں جب سے جاٹ اور مرہٹہ قوموں کا غلبہ ہوا ہے، اور اسلام کی صورت جو پہلے تھی، اگرچہ وہ بھی حقیقتِ (معنی) سے خالی تھی، اب بالکل ہی درہم برہم ہوگئی ہے۔ تمام مسلمان خصوصاً اہل علم وصلاح کو ان کی جانب سے ہر طرح کی ایذا پہنچتی ہے۔ اسی وجہ سے پکا ارادہ ہوتا ہے کہ کسی طرف کو ہجرت کر جانی چاہیے۔ مگر جب اس جگہ کے علاوہ ملک ہندوستان میں اس وقت جو حالت نظر آتی ہے۔ اس معاملے میں ان شہروں کے لوگوں کے برے عقائد کا سن کر ہم لوگ توقف کرتے ہیں، اور چار و ناچار ابھی تک دارالحرب میں ٹھہرے ہوئے ہیں۔ اگر کیفیتِ اضطرار پیدا ہو جاتی ہے تو اس وقت مجبوراً شاید اس طرف کا رخ کریں، اور اس جگہ کے دولت مندوں کے فاسد عقیدوں کو دور کر سکیں۔ لیکن ہدایت دینا اور گمراہ کرنا اللہ تعالیٰ کے ہاتھ میں ہے۔

فقیر نے پچھلے دنوں اس تہمت کے رد میں ایک رسالہ بھی لکھا ہے۔ ان شاء اللہ اس کی نقل بعد میں روانہ کی جائے گی۔" (ایضاً ص ۲۰۴)

حوالہ جات:

اس مضمون میں فتاویٰ عزیزی کے جو اردو تراجم استعمال کیے گئے ہیں ان کی تفصیل یہ ہے:

۱۔ حضرت شاہ عبدالعزیز کے پہلے فتوے کا ترجمہ سید رئیس احمد جعفری مرحوم کا ہے، اور ان کی تالیف ''اوراق گم گشتہ'' سے لیا گیا ہے۔ اگرچہ یہ فتویٰ ''مجموعہ فتاویٰ عزیزی'' (اردو ترجمہ) میں شامل ہے۔

۲۔ بعد کے تین فتوؤں (نمبر ۲ تا ۴) کے ترجمے ایچ، ایم سعید کمپنی، کراچی کے مطبوعہ ''فتاویٰ عزیزی'' ۱۹۶۷ء سے ماخوذ ہیں۔ یہ ترجمہ مولوی عبدالماجد نولوی غازی پوری نے کیا تھا۔ لیکن اس میں بعض مقامات پر بعض لفظی تبدیلی مولوی نواب علی اور مولوی عبدالجلیل کے ترجمے مطبوعہ حیدر آباد (۱۳۱۳ھ) کو سامنے رکھ کر خاکسار نے ضروری سمجھی۔

۳۔ نمبر ۵ کے تحت اخون زادہ مولوی عبدالرحمٰن خان (رام پوری) کے نام حضرت شاہ صاحب کے دو خطوط کے اقتباسات ہیں۔ اس ترجمے کے لیے ہم جناب ثناء الحق صدیقی مرحوم کے شکر گزار ہیں۔ (ابوسلمان شاہ جہان پوری)

۲۶ر اپریل ۱۸۰۹ء: لارڈ منٹو نے الفنسٹن کی سربراہی میں شاہ کابل شجاع کے دربار میں ایک مشن بھیجا تھا۔ اس نے پشاور میں شاہ شجاع سے ملاقات کی:

۲۶ر اپریل ۱۸۰۹ء کو الفنسٹن نے لارڈ منٹو کو ایک خط کے دوران میں لکھا کہ ''شاہ کابل کے حالات نے غیر موافق صورت اختیار کرلی ہے۔ کچھ مدت پہلے اس کے حالات بہتر بنتے دکھائی دیتے تھے۔ اس زمانے میں بات چیت کا سلسلہ جاری رہا اور ۱۹ر اپریل کو معاہدہ ہوگیا جس کی رو سے آپ کو شاہ کابل کی مالی امداد کرنی پڑے گی تاکہ وہ فرانسیسیوں اور ایرانیوں کا مقابلہ کرسکے۔ شاہ نے یہ وعدہ بھی کیا ہے کہ وہ اپنے ملک سے فرانسیسیوں کو ہمیشہ کے لیے نکال دے گا۔ چند دن ہوئے یہ اطلاع ملی تھی کہ شاہ محمود کی فوجیں کابل پر چڑھائی کرنے والی ہیں۔ چوں کہ شاہ محمود اور شاہ شجاع میں پشاور کے پاس ہی لڑائی ہونے والی ہے، اس لیے میں نے شاہ کابل سے اجازت چاہی تھی۔ جوں ہی شاہ شجاع نے کابل کا رخ کیا مجھے شاہ کے دربار سے رخصت ہونے کی اجازت مل جائے گی۔ اس کے بعد میں اٹک پہنچ کر لڑائی کے نتیجے کا انتظار کروں گا۔ اگر لڑائی میں شاہ محمود جیت گیا تو پھر اس کے ساتھ ان ہی شرطوں پر معاہدہ کرلینا کوئی مشکل نہیں ہوگا۔ لیکن میں سمجھتا ہوں کہ ایسا کرنے پر تقریباً تین لاکھ روپے خرچ آئیں گے۔ میں شاہ محمود سے بات چیت کرنے کے احکام کا منتظر ہوں۔''

۱۴ر جون کو مشن پشاور سے رخصت ہوا۔ ایک مہینے کے اندر اندر شاہ شجاع شکست کھا کر افغانستان سے بھاگ نکلا تھا۔ اسی اثنا میں انگریزوں اور ایران میں معاہدہ ہوچکا تھا اس لیے الفنسٹن کو شاہ محمود کے ساتھ بات چیت کرنے کی اجازت نہ مل سکی۔ کمپنی اور کابل میں جو معاہدہ ہوا تھا اسے شاہ شجاع کی شکست نے بے کار بنا دیا۔ کمپنی اور سندھ کے درمیان بھی ایک دفاعی معاہدہ کیا گیا تھا۔ منٹو کی سفارتی سرگرمیوں کا سب سے بڑا فائدہ یہ ہوا کہ ان سفارتوں کے ذریعے کمپنی کو ان ملکوں کے حالات کا پتا چل گیا۔ الفنسٹن کی 'تاریخ کابل' کرنل میلکم کی 'تاریخ ایران' اور ہنری پوٹن جر کی 'بلوچستان' منٹو کی سفارتی سرگرمیوں ہی کے دوران میں تیار کی گئی تھیں۔ پہلی دو کتابوں کی اشاعت کمپنی کے خرچ پر ہوئی تھی۔ (کمپنی کی حکومت، ص ۲۷۷)

۱۸۰۹ء اور قریب کے حالات پر تبصرہ:

۱۸۰۹ء کے شروع میں ایک فوجی سردار امیر خان نے برار پر حملہ کردیا۔ راجا برار کمپنی کے ساتھیوں میں سے نہیں تھا، لیکن اس پر بھی منٹو نے عدم مداخلت کی پالیسی کو ترک کرتے ہوئے راجا

برار کی امداد کی۔ منٹو کے اپنے الفاظ میں: ''سوال یہ نہیں ہے کہ راجا برار کی مدد کرنا ضروری ہے یا نہیں بلکہ سوال یہ ہے کہ ایک طاقت ور مسلمان سردار کو اس امر کی اجازت دی جا سکتی ہے کہ وہ راجا برار کی ریاست کے کھنڈروں پر اس علاقے میں اپنی حکومت کرے جو ہمارے ساتھی نظام کے ساتھ ملا ہوا ہے۔ ہو سکتا ہے کہ آگے چل کر امیر خاں اور نظام دونوں مل کر کمپنی کے لیے خطرہ بن جائیں۔'' کمپنی نے اپنے مفاد کے لیے امیر خان کا مقابلہ کیا اور اسے برار سے نکال دیا۔

ایرانی مہم:

اسی سال کمپنی نے خلیج فارس میں اپنے اقتدار کو بڑھانے کے لیے ایک نئی مہم شروع کی۔ یہ نئی مہم خلیج فارس کے سمندری ڈاکوؤں کے سدباب کے نام پر کی گئی۔ اس مہم نے ایران میں برطانوی تجارت کے لیے راستہ صاف کر دیا۔

مدراس میں بغاوت:

اسی اثنا میں منٹو کو مدارس جانا پڑا کیوں کہ مدراس آرمی اور گورنر مدراس میں اختلافات بہت حد تک بڑھ گئے تھے۔

حکومت مدراس کے فوجی اور سول افسروں کا جھگڑا خطرناک صورت اختیار کر چکا تھا۔ ۱۷۶۵ء میں کلاؤ نے بنگال آرمی کے انگریز افسرون کی بغاوت کو دبا دیا تھا لیکن ہر دس سال میں فوجی افسروں کی بغاوت کہیں نہ کہیں دکھائی دیتی ہے۔ مدراس آرمی کے انگریز افسروں کی بغاوت کو فرو کرنے کے لیے منٹو کو مدراس جانا پڑا۔ گورنر جنرل کی مدافعت نے بنگالی آرمی کے افسروں کی بغاوت کو فرو کر دیا۔

لارڈ منٹو کی کامیابی:

لارڈ منٹو کے عہد حکومت کے شروع میں برطانوی مدبروں کے ذہن پر یہ اندیشہ چھایا ہوا تھا کہ فرانس ہندوستان پر حملہ کرنے والا ہے، لیکن منٹو کے عہد حکومت کے آخر میں راس امید کے مشرق میں فرانس کا اقتدار ختم ہو چکا تھا۔ جب فرانس نے پرتگال پر قبضہ کیا تو کلکتہ گورنمنٹ کو یہ احکام ملے کہ وہ پرتگال کے تمام مشرقی مقبوضات پر قبضہ کر لے۔ جب فرانس نے ہالینڈ پر قبضہ کیا تو ہالینڈ کے تمام مشرقی مقبوضات پر بھی فرانس ہی کا اقتدار ہو گیا تھا۔ کمپنی نے بوربون اور مارشس کے جزیروں پر قبضہ کرنے کے بعد منٹو جاوا کی مہم پر روانہ ہوا۔ جاوا پر انگریزوں نے قبضہ کر

لیا۔ بٹادیا سے واپس ہوتے وقت منٹو نے کہا تھا کہ ''یہ امر یقینی نہیں ہے کہ جاوا پر انگلستان کا قبضہ مستقل ہوگا۔'' (کمپنی کی حکومت، ص ۵۶-۲۶۳)

فورٹ ولیم کالج میں ترقی:

منٹو کے عہد حکومت (۱۳-۱۸۰۷ء) میں فورٹ ولیم کالج کی طرف سے کئی ایک کتابیں چھاپی گئیں۔ اسی زمانے میں سنسکرت کی کتابوں کی اشاعت کے لیے جو ذاتی پریس لگایا گیا تھا، فورٹ ولیم کالج کی طرف سے اس کی مدد کی گئی۔ ۱۸۰۸ء میں منٹو نے فورٹ ولیم کالج میں تقریر کرتے ہوئے ملائی اور پشتو کی اہمیت کو واضح کیا تھا، چنانچہ بہت جلد فورٹ ولیم کالج میں پشتو کی ڈکشنری اور پشتو گرامر چھاپی گئیں۔ منٹو نے بنارس کالج کے لیے چند اصلاحات تجویز کی تھیں۔ وہ کلکتہ کے مدرسۂ عالیہ کے تعلیمی نصاب کو بھی بدلنے کا آرزومند تھا۔ (ایضاً ص ۲۷۹)

ایسٹ انڈیا کمپنی چارٹر:

کمپنی کو برطانوی حکومت کی طرف سے ۱۷۹۳ء میں بیس سال کے لیے جو چارٹر ملا تھا، اس کی تجدید ۱۸۱۳ء میں کی گئی۔ جب کمپنی کے چارٹر کا مسئلہ درپیش تھا تو اس وقت برطانیہ کے ایک طبقے کا یہ خیال تھا کہ ہندوستان کے ساتھ تجارت کرنے کے لیے کوئی پابندی نہیں ہونی چاہیے۔ لیکن کمپنی کے ڈائریکٹر کمپنی کی تجارتی اجارہ داری کو اپنے ہاتھ میں رکھنا چاہتے تھے۔ آخرکار دونوں میں سمجھوتا ہوگیا۔ برطانوی پارلیمنٹ نے کمپنی کے لیے چین کی تجارتی اجارہ داری وقف کردی اور ہندوستان کے ساتھ تجارت کرنے کی عام اجازت دے دی گئی۔ ۱۸۱۳ء کے نئے چارٹر میں پہلی مرتبہ ہندوستان میں تعلیم پھیلانے کے لیے ایک لاکھ روپیہ منظور کیا گیا۔ کلکتہ کے لیے ایک بشپ مقرر کیا گیا۔ یہ چارٹر بیس سال کے لیے منظور کیا گیا تھا۔ (کمپنی کی حکومت، ص ۲۷۹)

امیرانِ سندھ سے کمپنی کا معاہدہ:

مدتوں سے انگریزی نگاہیں دریائے سندھ پر لگی ہوئی تھیں۔ چناں چہ ۱۸۰۹ء میں امیران سندھ اور کمپنی کے درمیان ایک معاہدہ ہوا جس کی رو سے:

(۱) سندھ اور برطانوی حکومت مس ابدی رفاقت قائم رہے گی۔

(۲) دونوں ملکوں کے درمیان کبھی جذبۂ عناد پیدا نہیں ہوگا۔

(۳) دونوں حکومتوں میں سفارت بدستور جاری رہے گی۔

(۴) حکومت سندھ "فرانس کے قبیلہ" کو سندھ میں داخل نہیں ہونے دے گی۔

انگریزوں نے سندھ کے آبی سفر کے دوران میں اس معاہدے کی خلاف ورزی کی۔ یہ سفر امیران سندھ کی مرضی کے بغیر اختیار کیا گیا تھا۔ اس دریائی سفر سے ایک حکایت وابستہ ہے:

> "جب برنز اپنے دریائی سفر میں مصروف تھا تو ایک سیدزادہ ساحل دریا پر وضو کر رہا تھا۔ سید نے جب آنکھ اٹھائی تو اسے برنز دکھائی دیا۔ "سندھ کی آزادی ختم ہوگئی، انگریزوں نے دریائی راستہ معلوم کر دیا۔" سیدزادہ چلایا۔ (کمپنی کی حکومت، ص ۳۳۵)

شاہ عبدالعزیزؒ کا انتقال:

۵/ جون ۱۸۲۴ء: دہلی، شاہ عبدالعزیز محدث دہلوی کا انتقال ہوگیا۔ وہ شاہ ولی اللہ دہلوی کی بڑے بیٹے اور ان کے جانشین تھے۔ انھوں نے اپنے والد کی مسند تدریس کو زینت بخشی تھی اور ان کے علوم و معارف کی تدریس و اشاعت اور اصحاب استعداد کی تربیت کا عظیم الشان کارنامہ انجام دیا تھا۔ انھوں نے اپنے پیچھے متعدد تصانیف اور سیکڑوں تلامذہ کا ایک سلسلہ جو ہندوستان سے بیرون ہند تک پھیلا ہوا تھا، یادگار چھوڑا۔ ان کی اولاد نرینہ نہیں تھی۔ ان کی بیٹیوں کی اولاد سے ان کی تعلیمی، اور علمی و فکری روایت کا سلسلہ دراز ہوا اور پچھلے دو سو برس میں دراز سے دراز تر ہوتا چلا جا رہا ہے۔ ہندوستان پاکستان کا کوئی شہر اور قریہ ایسا نہیں ہوسکتا جہاں کوئی عالم دین، مدرس، امام وغیرہ موجود ہو اور اس کا حضرت شاہ صاحب سے تعلق نہ نکل آئے۔ ایشیا و افریقہ کے بیشتر ممالک میں اس خانوادۂ علمی سے نسبت رکھنے والے موجود ہیں۔

۱۸۲۸ء

برہمو سماج:

ہندو مذہب کے دائرے میں رہتے ہوئے بنگال کی ایک مذہبی اصلاحی تحریک جس کی بنیاد راجہ رام موہن رائے نے کلکتہ میں ۱۸۲۸ء میں رکھی۔ برہمو سماج بت پرستی کے خلاف اور توحید کا قائل ہے۔ وہ دیوی دیوتاؤں، جات پات کے نظام، کرم اور آواگون پر عقیدہ نہیں رکھتا۔ اس نے ہندوؤں کی بہت سی قدیم رسوم مثلاً ستی اور ممانعت عقد بیوگان کا ازالہ کیا۔ اس سماج کے کوئی مستند

اور تحریر شدہ عقائد، ضوابط یا قوانین نہیں ہیں۔ اس کی بنیاد اذعان سے زیادہ عقلیت پر ہے۔

راجہ رام موہن رائے ہندو مذہب کو یکسر بدلنے کے بجائے اس کی اندرون سے اصلاح کرنا چاہتے تھے۔ لیکن ان کے جانشین رابندر ناتھ ٹیگور نے ۱۸۵۰ء میں ویدوں کے نص (متن کی صحت) کو ماننے سے انکار کر کے برہمائیت کی بنیاد عقل اور الہام پر رکھی۔ لیکن اسی کے ساتھ انھوں نے بعض ہندو رسوم اور روایات کو باقی رکھنے کی کوشش کی۔ بعد میں کیشب چندر سین کی قیادت میں ایک انقلاب پسند گروہ نے برہمو سماج سے الگ ہو کر ۱۸۶۶ء میں ''ہندوستانی برہمو سماج'' کی بنیاد ڈالی۔ یہ نئی جماعت وسیع المشربی اور آفاقی فکر و نظر کی حامل تھی اور اس نے سماجی اصلاح کی جدو جہد میں گہرا اثر ڈالا۔ اس نے اعتدال پسندی، عورتوں کی تعلیم، عقد بیوگان کے لیے مہمیں چلائیں اور بچپن کی شادیوں کی ممانعت کا قانون منظور کرانے کی کوشش کی۔ لیکن ۱۸۷۸ء میں کچھ لوگوں نے اس سماج سے بغاوت کر کے ایک تیسرے سماج، ''سادھارن برہمو سماج'' کی بنیاد ڈالی۔ جہاں ایک طرف کیشب چندر ایک نئے عالمی مذہب ''نو ودھان'' کو مرتب کرنے کی کوشش کر رہے تھے، وہیں دوسری طرف سادھارن برہمو سماج رفتہ رفتہ ویدون اور اپنشدوں کی سمت واپس آیا لیکن سماجی اصلاح کی کوشش جاری رکھی۔ بیسوی صدی کے اوائل تک اس تحریک میں کوئی جان نہیں رہ گئی تھی۔ ہندوستانیوں کی ایک بہت معمولی تعداد اس کو مانتی ہے ۱۹۵۰ء میں یہ تعداد صفر اعشاریہ دو فی صد تھی۔ لیکن سماجی اصلاح کے میدان میں اس کے بنیادی اصولوں کو اب ہندو معاشرے میں عام قبولیت حاصل ہے۔ (فرہنگ سیاسیات، ص ۹۵)

۱۸۳۱ء

تیتو میر شہید کا نام سید نثار علی تھا۔ وہ سید احمد شہید کے نامور مریدین میں سے تھے۔ انھوں نے مشرقی ہند میں تحریک اصلاح و جہاد کا عظیم الشان کارنامہ انجام دیا تھا۔ انھوں نے مسلمانوں میں جرأتِ آزادی کی شمع روشن کی تھی۔ وہ ایک درویش صفت مجاہد تھے۔ ۱۴؍نومبر ۱۸۳۱ء کو ناریکل بیڑیا کے معرکے میں شہید ہو گئے۔ انگریزی فوج کی رہنمائی کرنل اسٹوارٹ کر رہا تھا۔ اس حادثے میں رام چندر بینرجی نامی شخص کی ریشہ دوانیوں کا خاص حصہ تھا۔

عبدالغفور صدیقی نے تیتو شہید کے حالات اور کارناموں کے تعارف میں مناسب ضخامت کی ایک کتاب لکھ دی ہے مترجم یونس احمر ناشر ادارہ قومی تعمیر نو پاکستان، کراچی ۱۹۶۱ء

۱۸۳۱ء میں رنجیت سنگھ نے تقسیم سندھ کی ایک تجویز ولیم بینٹنگ کو پیش کی۔ ولیم بینٹنگ نے

اس تجویز پر غور کرنا اپنی توہین خیال کیا۔ (کمپنی کی حکومت، ص ۳۲۵)

۱۸۳۲ء

ہندوستان کی انگریزی حکومت نے سندھ کے متعلق جو روش اختیار کی تھی۔ اس میں ان معاہدوں کا ذرہ برابر خیال نہ رکھا گیا جو انگریزوں اور سندھی امیروں میں تھوڑی مدت پہلے ہو چکے تھے۔ ۱۸۰۹ء میں لارڈ منٹو نے امیران سندھ کے درباروں میں اپنا ایک سفیر بھیج کر ان سے دوستانہ معاہدے کیے تھے۔ ان معاہدوں کا مقصد فرانسیسیوں کو سندھ سے نکالنا تھا۔ گیارہ سال بعد اس معاہدے کی تجدید کی گئی۔ ۱۸۳۲ء میں ولیم بینٹنگ نے امیران سندھ کے ساتھ ایک نیا معاہدہ کیا۔ اس معاہدے کی رو سے سندھ کے دریاؤں اور سندھ کی سڑکوں کو تجارت کے لیے اس شرط پر کھول دیا گیا کہ نہ کوئی جنگی کشتی اور نہ جنگی سامان سندھ میں سے گزرنے دیا جائے گا۔ افغانستان کی پہلی لڑائی میں لارڈ آکلینڈ نے اس معاہدے کی خلاف ورزی کرتے ہوئے نہ صرف انگریزی فوجوں کو سندھ میں سے گزارا بلکہ امیران سندھ سے جبری طور پر روپیہ بھی حاصل کیا لیکن اس کے باوجود جب افغانستان میں انگریزی فوجوں کی حالت بہت زیادہ خراب ہو رہی تھی امیران سندھ نے انگریزوں کے خلاف کسی قسم کی سرگرمی جاری نہ کی۔ لارڈ آکلینڈ نے سندھ کے معاملات میں دخل دے کر معاہدے کی خلاف ورزی کی لیکن اس کے جانشین لارڈ ایلن برا نے ایک قدم آگے بڑھ کر سندھ کو لڑائی کرنے پر مجبور کر دیا۔ امیران سندھ کے خلاف بے بنیاد الزام لگا کر لارڈ ایلن برا نے چارلس نیپیر کو شہری اور فوجی اختیارات دے کر سندھ بھیج دیا۔ چارلس نیپیر نے امیران سندھ کو مجبور کر دیا کہ وہ ایک نیا معاہدہ کریں جس کی رو سے وہ اپنے بہت سے علاقے انگریزوں کے حوالے کر دیں۔ اس کے جابرانہ طرز عمل نے بلوچیوں کو مجبور کر دیا تھا کہ وہ برٹش ریزیڈنسی پر حملہ کریں۔ اس پر چارلس نیپیر کو سندھ کے خلاف لڑنے کا وہ بہانہ مل گیا، جسے وہ خود پیدا کر رہا تھا۔ میانی اور دابو کی لڑائیوں میں امیران سندھ کو شکست ہوئی اور سندھ کو برطانوی ہندوستان مین شامل کر لیا گیا۔ انگریزی فوجوں نے حیدر آباد میں جو لوٹ مار کی اس میں چارلس نیپیر کو ستر ہزار پونڈ ملے۔

۱۸۳۲ء میں کمپنی اور سندھ میں ایک نیا معاہدہ ہوا جس کی رو سے "ہندوستان" کے تاجروں کو دریائے سندھ سے گزرنے کی اجازت حاصل ہو گئی۔ اس معاہدے کی رو سے کوئی جنگی جہاز یا سامان حرب دریائے سندھ کے راستے نہیں گزر سکتا تھا۔ اسی معاہدے کی رو سے امیرانِ سندھ یا

کمپنی ایک دوسرے کے علاقوں کو للچائی ہوئی نگاہوں سے نہیں دیکھ سکتے تھے۔ (کمپنی کی حکومت، ص ۳۲۵)

۱۸۳۴ء

۱۸۳۴ء میں رنجیت سنگھ کو از سرِ نو تسخیر سندھ کا خیال ہوا۔ لیکن کمپنی کو امیران سندھ کی پشت پر دیکھتے ہوئے رنجیت سنگھ اپنے ارادوں کو عملی شکل نہ دے سکا۔ کمپنی نے اس موقعے سے فائدہ اٹھاتے ہوئے ۱۸۳۸ء میں حیدر آباد میں ایک برطانوی ریزیڈنٹ مقرر کر دیا۔ برطانوی حکمت علی نے ریزیڈنسی کے قیام ہی پر اکتفا نہ کیا بلکہ آکلینڈ نے سندھ پر قبضہ جمانے کے لیے تگ و دو شروع کر دی۔ افغانستان کی پہلی جنگ کے دوران برطانوی فوجیں معاہدے کے خلاف سندھ میں سے گزریں۔ ہندوستان کی برطانوی حکومت نے خیال کیا ہوگا کہ طاقت ور فریق کو تنسیخ میثاق کا حق ہے۔ شاہ شجاع، کمپنی اور رنجیت سنگھ کے اتحاد ثلاثہ میں امیران سندھ کے حصول رضا کو بے معنی خیال کیا گیا۔ اس اتحاد ثلاثہ کے قیام نے سندھ کی سیاست ختم کر دی۔ پنجاب اور افغانستان کی دوستی کے لیے سندھ کی قدیم رفاقت کو پس پشت ڈال دیا گیا۔ انگریزوں نے امیرانِ سندھ کو بتا دیا کہ طاقت ور اور کمزور میں کبھی اتحاد نہیں ہو سکتا اور یہ کہ قوت اپنے زور بازو سے ناتوانی کے خلاف سیکڑوں الزام تراش سکتی ہے۔

> "روایتی گرگ نے برہ کے خلاف الزام لگاتے وقت اتنی ہوشیاری کا ثبوت نہیں دیا تھا جتنا کہ انگریزوں نے سندھ پر قبضہ جماتے وقت"۔ (کلکتہ ریویو)

جنگ افغانستان کے دوران نہایت بے دردی کے ساتھ امیران سندھ سے روپیہ وصول کیا گیا۔ فروری ۱۸۳۹ء میں جدید معاہدے سے امیران سندھ کو برطانوی امداد فوج کے لیے تین لاکھ روپیہ سالانہ ادا کرنا قرار پایا۔ نیز امیران سندھ کو صاف الفاظ میں بتا دیا گیا کہ ہندوستان کی برطانوی حکومت یا سرحد کے لیے ان کی آزادیاں سلب کی جا سکتی ہیں۔ (کمپنی کی حکومت)

۲ر فروری ۱۸۳۵ء: ولیم بینٹنگ (۱۸۲۸ء تا ۱۸۳۵ء) نے نظم و نسق کے ضمن میں ۱۸۳۴ء میں نئی تعلیمی پالیسی کو نافذ کیا۔ اس نئی پالیسی کے ذریعے انگریزی کو کمپنی کے ہندوستانی مقبوضات کی سرکاری زبان بنا دیا گیا۔ اس کے ساتھ ہی مدارس میں مختلف علوم کی تعلیم حاصل کرنے کے لیے انگریزی کو ذریعہ بنا دیا گیا۔ ولیم بینٹنگ کے اس اقدام نے جہاں ہندوستانی طلبہ کو جدید ترین علوم

سے روشناس کر دیا وہاں بدیشی زبان کے ذریعۂ تعلیم بن جانے سے ہندوستانی طلبہ کے ذہنوں پر دوہرا بوجھ ڈال دیا گیا۔ اس اقدام نے ہندوستان کی ملکی زبانوں کی ترقی کو کافی نقصان پہنچایا۔ ولیم بینٹنگ کی تعلیمی پالیسی تعلیم کی نسبت اقتصاد پر زیادہ مبنی تھی۔ انگریزی کے ذریعۂ تعلیم بن جانے کے بعد کمپنی کو انگریز اہل کاروں کی نسبت کم تنخواہ پر دیسی اہل کار مل سکتے تھے۔ بہر حال کلکتہ کونسل کے ارکان میں اس بات پر کافی اختلاف تھا۔ بعض ممبروں کی یہ رائے تھی کہ انگریزی کو دفتری اور تعلیمی زبان بنا دیا جائے۔ دوسروں کی رائے اس کے خلاف تھی۔ کلکتہ میں یہ بحث جاری تھی کہ ۱۸۳۳ء کے چارٹر ایکٹ کی رو سے کلکتہ کونسل میں ایک لا ممبر (مشیر قانون) کا اضافہ ہو گیا۔ میکالے پہلا لا ممبر ہو کر اسی سال کے آخر میں کلکتہ پہنچ گیا۔ اس نے کمپنی کی تعلیمی پالیسی میں بہت زیادہ حصہ لیا۔ ہندوستان پہنچتے ہی اسے تعلیمات عامہ کی جنرل کمیٹی کا صدر مقرر کر دیا گیا، لیکن اس نے اس وقت تک صدر بننے سے انکار کر دیا جب تک کہ گورنر جنرل ذریعۂ تعلیم بنائی جانے والی زبان کا فیصلہ نہ کر لے۔ لیکن کلکتہ کونسل کے ممبر ہونے کی حیثیت سے اس نے اپنی سرگرمیوں کو جاری رکھا۔ جب دونوں پارٹیوں نے اپنے اپنے دعوے کا جواز پیش کیا تو ۲؍فروری ۱۸۳۵ء کو میکالے نے اس مسئلے پر جو یادداشت لکھی تھی اس میں کہا گیا ہے کہ:

''سب پارٹیاں اس بات پر متفق ہیں کہ

ہندوستان کے اس حصے میں جتنی بھی بولیاں رائج ہیں ان میں ادبی اور سائنسی معلومات نہیں ہیں۔ یہ بولیاں ابھی اپنی ابتدائی شکل میں ہیں اور جب تک کسی دوسری طرف سے ان زبانوں کو بلند نہیں کیا جاتا اس وقت تک ان میں کسی مفید کتاب کا ترجمہ نہیں کیا جا سکتا۔

اس امر پر بھی پورا پورا اتفاق ہے کہ وہ لوگ جو اعلیٰ تعلیم حاصل کرنا چاہتے ہیں اپنی زبان کے لیے کسی دوسری زبان ہی کے ذریعے حاصل کر سکتے ہیں۔

ایسی زبان کون سی ہو؟

کمیٹی کے آدھے ممبروں کی رائے یہ ہے کہ یہ زبان انگریزی ہونی چاہیے۔ باقی آدھے ممبر عربی اور سنسکرت کو ذریعۂ تعلیم بنانے جانے کی سفارش کرتے ہیں۔ میرے نزدیک مسئلہ یہ ہے کہ کون سی زبان ایسی ہے،

جسے جاننا بہت ضروری ہے؟ میں نہ سنسکرت جانتا ہوں اور نہ عربی، لیکن میں نے انتہائی کوشش کی ہے کہ ان کی قدر و قیمت معلوم کر سکوں۔ میں نے عربی اور سنسکرت کی چند بڑی بڑی کتابوں کے تراجم بھی پڑھے ہیں۔ کمیٹی کے وہ ممبر جو تعلیم کی مشرقی اسکیم کے حامی ہیں مغربی ادب کی افادی قدر سے انکاری نہیں ہیں۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ شعر و شاعری کے میدان میں مشرقی ادب یورپی ادب سے آگے ہے لیکن ان علوم میں جن کا تعلق حقائق سے ہے یورپی ادب کو مشرقی ادب سے بہتر ماننا پڑتا ہے۔ یہ کہنا مبالغہ نہیں کہ سنسکرت زبان میں تاریخ سے متعلقہ کتابیں معلومات کے پیش نظر ان خلاصوں سے بھی کم قدر و قیمت رکھتی ہیں جو انگلستان کے مدارس میں پڑھائے جاتے ہیں۔ اصل مسئلہ یہ ہے کہ ہمیں ایسے لوگوں کو پڑھانا ہے جنھیں سر دست ان کی مادری زبان میں تعلیم نہیں دی جا سکتی۔ ہمارے لیے ضروری ہے کہ ہم انھیں کوئی نہ کوئی غیر ملکی زبان پڑھائیں۔ ہماری زبان اس دعوے پر پوری اترتی ہے کہ ایسے لوگوں کے لیے اسے ذریعہ تعلیم بنایا جائے۔"

انگریزی کی خوبیوں کا تذکرہ کرنے کے بعد میکالے اپنی یادداشت میں لکھتا ہے کہ:

"ہندوستان میں حکمران طبقے کی زبان انگریزی ہے۔ راجدھانیوں میں اعلیٰ طبقے کے دیسی لوگ بھی اسے بولتے ہیں۔ انگریزی بہت جلد مشرق کے سمندروں میں تجارتی زبان بن جائے گی۔ ہماری زبان کی خوبیوں اور ہندوستان کے حالات کا تقاضا ہے کہ سب غیر ملکی زبانوں میں سے صرف انگریزی ہی ایسی زبان ہے جو ہماری دیسی رعایا کے لیے مفید ثابت ہو سکتی ہے۔"

"ہمارے سامنے یہ سوال ہے کہ جب اس زبان کو پڑھانا ہمارے اختیار میں ہے تو پھر ہم کیوں دیسی باشندوں کو ایسا علم ہیئت پڑھائیں جسے سن کر انگریزی بورڈنگ اسکول کی طالبات ہنسنے پر مجبور ہو جائیں۔ ایسی تاریخ پڑھائیں جس میں بادشاہوں کا قد تیس فٹ اور ان کا عہد حکومت تیس

ہزار سال بتایا گیا ہو۔ ایسا جغرافیہ پڑھائیں جس میں مکھن کے سمندروں کا ذکر کیا گیا ہو۔ مغربی یورپ کی زبانوں نے روس کو مہذب بنایا۔ مجھے اس امر میں ذرہ برابر شک نہیں کہ ان زبانوں نے تاتاریوں کے لیے جو کچھ کیا وہ ہندوؤں کے لیے بھی ویسا ہی کریں گی......"

۷/ مارچ ۱۸۳۵ء: میکالے کے ہندوستان میں آنے سے پہلے ولیم بینٹنگ انگریزی زبان کو ذریعۂ تعلیم بنانے کے حق میں ہو چکا تھا۔ چناں چہ اس نے میکالے کے خیالات کے ساتھ پورا پورا اتفاق کیا۔ ۷/ مارچ ۱۸۳۵ء کو ایک قرارداد کے ذریعے انگریزی کو ہندوستان کی سرکاری زبان بنا دیا گیا۔ (کمپنی کی حکومت، ص ۳۰۰۔۲۹۹)

لارڈ ولیم بینٹنگ وائسرائے ہند کی طرف سے ۷/ مارچ ۱۸۳۵ء کے مراسلے کے ذریعے یہ حکم دیا گیا ہے کہ تعلیم عامہ اور وظائف کا کل روپیہ صرف انگریزی تعلیم پر صرف کیا جائے۔ جس کے معنی یہ تھے کہ مسلمانوں کا جو روپیہ کلکتہ مدرسے میں عربی تعلیم کے وظائف کی شکل میں مل جاتا ہے وہ اس سے بھی محروم کر دیے گئے۔ (مسلمانوں کا روشن مستقبل، صفحہ ۵۲۔۱۵۱)

۷/ مارچ ۱۸۳۵ء: ۱۸۲۳ء میں راجہ رام موہن رائے نے یہ کوشش شروع کی کہ مشرقی زبانوں کی جگہ انگریزی زبان میں تعلیم دی جایا کرے۔ اس مسئلے کو طے کرنے کے لیے ۱۸۳۴ء میں ایک کمیٹی بنائی گئی جس کا اجلاس ۷۔ مارچ ۱۸۳۵ء کو منعقد ہوا لارڈ میکالے اس کمیٹی کے صدر بنائے گئے۔ اس کمیٹی کے اراکین میں اختلاف رائے تھا۔ ایک فریق انگریزی زبان میں تعلیم دیے جانے کا مخالف تھا تو دوسرا حامی تھا۔ جب رائے لی گئی تو دونوں فریق کے ووٹ برابر ہوئے۔ تب لارڈ میکالے نے اپنا فیصلہ کن ووٹ انگریزی زبان کی تعلیم کی تائید میں دیا جس سے انگریزی کے اجرا کا فیصلہ ہو گیا۔ اس فیصلے کی تعریف میں بڑے بڑے راگ گائے جاتے ہیں اور کہا جاتا ہے کہ لارڈ میکالے نے اس کے ذریعے ہندوستان کو آزادی کا فرمان عطا کیا۔ مگر جو امور اس رائے کے محرک تھے، ان میں سے ایک اعلانیہ اور دوسرا خفیہ تھا۔ اعلانیہ رائے وہ تھی جو انھوں نے اپنی رپورٹ میں ان الفاظ میں تحریر فرمائی تھی:۔

"ہمیں ایک ایسی جماعت بنانی چاہیے جو ہم میں اور ہماری کروڑوں رعایا کے درمیان مترجم ہو اور یہ ایسی جماعت ہونی چاہیے جو خون اور رنگ کے اعتبار سے تو ہندوستانی ہو مگر مذاق اور رائے، اور سمجھ کے اعتبار سے انگریز ہو۔" تاریخ التعلیم از میجر باسو، صفحہ ۱۰۵ بحوالہ مسلمانوں کا روشن مستقبل، صفحہ ۵۱۔۱۴۹

مگر لارڈ میکالے کی حقیقی رائے جوان کے قلب کے اندرونی پردوں کے اندر چھپی ہوئی تھی وہ تھی جو انھوں نے اپنے والد ماجد کو ایک چھٹی میں لکھ کر بھیجی تھی اس کے الفاظ یہ ہیں:

''اس تعلیم کا اثر ہندوؤں پر بہت زیادہ ہے۔ کوئی ہندو جو انگریزی داں ہے، کبھی اپنے مذہب پر صداقت کے ساتھ قائم نہیں رہتا۔ بعض لوگ مصلحت کے طور پر ہندو رہتے ہیں، مگر بہت سے یا تو موحد ہو جاتے ہیں یا مذہب عیسوی اختیار کر لیتے ہیں۔ میرا پختہ عقیدہ ہے کہ اگر تعلیم کے متعلق ہماری تجاویز پر عمل درآمد ہوا تو تیس سال بعد بنگال میں ایک بت پرست بھی باقی نہ رہے گا'' تاریخ التعلیم از میجر باسو، صفحہ ۱۰۵ بحوالہ مسلمانوں کا روشن مستقبل، صفحہ ۵۱۔۱۴۹

۱۸۳۶ء

ڈپٹی نذیر احمد دہلوی:

ڈپٹی نذیر احمد ۶ ردسمبر ۱۸۳۶ء کو پیدا ہوئے، ۳ رمئی ۱۹۱۲ء کو فالج کے حملہ سے رحلت کر گئے۔ جس زمانے میں مسئلہ جہاد انگریزوں کے لیے ایک مستقل خطرہ تھا۔ اس زمانے میں آپ نے شاہ عبدالقادرؒ کے بعد پہلا ترجمہ کیا۔ تب شاہ عبدالقادر کے ترجمہ کو ۱۰۹ برس گزر چکے تھے۔ آپ کا ترجمہ ۱۷۹۰ء میں طبع ہوا تھا اور ڈپٹی صاحب کا ترجمہ ۱۸۹۹ء میں۔ انگریز مسئلہ جہاد کی بیخ کنی اپنی وفاداری بشرط استواری کے لیے علماء کی ایک کھیپ سے کام لے رہا تھا۔ ڈپٹی صاحب نے اس ترجمہ کے بعد ۱۹۰۶ء میں الحقوق والفرائض لکھی۔ اس کے بعد ۱۹۰۸ء میں الاجتہاد!

سرولیم میور ۱۸۶۸ء میں یو۔ پی کا لیفٹننٹ گورنر تھا۔ اس بدبخت نے رسول اکرم ﷺ کے خلاف ہندوستان میں سب سے پہلے تحریری بدزبانی کی نیو رکھی اور ایک کتاب حیات محمد ﷺ (LIFE OF MUHAMMAD) تصنیف کی۔ اس نے لکھا کہ انسانیت کے دو سب سے بڑے دشمن ہیں محمد ﷺ کی تلوار اور محمد ﷺ کا قرآن۔ (نعوذ باللہ) اسی بدبخت نے علی گڑھ کی پہلی عمارت ایم۔ اے او اسکول کا سنگ بنیاد رکھا...... وہ قرآن و محمد ﷺ سے عناد کے باوجود ڈپٹی نذیر احمد پر انتہائی مہربان تھا۔ اس نے اپنی گورنری کے زمانے میں نذیر احمد کو ان کی بعض تصانیف پر گران قدر انعامات عطا کیے، کئی تعریفی ریویو لکھے۔ شمس العلماء کا خطاب دلوایا۔ پھر جب سبکدوش ہو کر انگلستان واپس گیا، اور ایڈنبرا یونیورسٹی کا چانسلر ہوا تو ڈپٹی صاحب کو ایل۔ ایل ڈی کی ڈگری

عطا کی۔ اس کا واحد سبب انگریزی اقتدار کی طاعت میں ڈپٹی صاحب کی تفسیر اور حمایت میں بعض دوسری تحریریں تھیں۔ انھوں نے "اطیعوا اللہ و اطیعوا الرسول و اولی الامر منکم" میں اولی الامر کا مصدق انگریزوں کو ٹھہرایا تھا۔

نذیر احمد نے لکھا کہ...... خدا نے حکام وقت کی اطاعت فرض کر کے احکام شریعت کو ہمارے حق میں خود معطل کر دیا ہے۔ مزید فرمایا کہ احکام شریعت کا مقصود قیام امن ہے اور یہ مقصد انگریزی قانون سے بھی حاصل ہے۔ فرق صرف تدابیر یعنی طریق کار کا ہے۔ "الحقوق والفرائض" حصہ دوم کے صفحہ ۱۳۱ پر لکھا ہے کہ "ہمارے لیے انگریزی قانون بھی اسلامی شریعت ہے۔" اس کتاب میں جہاد کا باب قائم نہ کرنے پر جو معذرت کی ہے اس میں لکھا ہے کہ:

> "جس طرح احکام زکوٰۃ مفلس سے جو صاحب نصاب نہ ہو اور احکام حج نامستطیع سے متعلق نہیں، اسی طرح احکام جہاد مسلمانان ہند سے متعلق نہیں...... ہم نے جہاد کا باب اس لیے قائم نہیں کیا کہ کہیں عوام کالانعام کے لیے، سر دبستان یاد دہانیدن نہ ہو جائے۔"

مشہور فاضل ڈاکٹر غلام جیلانی برق نے ڈپٹی نذیر احمد سے متعلق صحیح کہا ہے کہ ان کا اسلام انگریزوں کے ہاں گرو ہو چکا تھا۔ (تحریک ختم نبوت از شورش کاشمیری، لاہور ۱۹۸۰ء، ص ۱۸۔۱۷)

۱۸۴۳ء

۱۸۴۳ء میں دولت راؤ کا پالک بیٹا جنکا جی بے اولاد مر گیا۔ اس کی بیوہ تارا بائی نے اپنا ایک متبنیٰ بنا لیا تھا۔ لارڈ ایلن برا کی منظوری سے اس بچے کا ایک اتالیق مقرر کر دیا گیا۔ تارا بائی نے اس اتالیق کو علاحدہ کر دیا اس پر ایلن برا نے گوالیار کے خلاف چڑھائی کر دی۔ گوالیاری فوجوں کو شکست ہوئی۔ اس شکست کے بعد حکومت ہند اور گوالیار میں ایک نیا معاہدہ ہوا جس کی رو سے گوالیار کی فوج کی تعداد بہت زیادہ گھٹا دی گئی۔ (کمپنی کی حکومت)

ستمبر ۱۸۴۴ء

جنگ افغانستان کے زمانے میں ایران سندھ نے معاہدے کی حرف بہ حرف پیروی کی۔ ان کا طرز عمل انتہا درجہ دیانت دارانہ تھا۔ کمپنی نے اپنی روایات کے مطابق امیرانِ سندھ پر سازش کا الزام لگایا۔ اس موقع پر ایلن برا نے کہا تھا کہ اسے یقین نہیں آسکتا کہ امیران سندھ کمپنی سے

دوستانہ تعلقات قائم رکھ سکتے ہیں۔

سندھ پر حملے کے جواز کے اسباب:

۱۔ امیران سندھ کی دولت کی شہرت برطانوی کانوں تک پہنچ چکی تھی۔ طامع نصرانی چاہتے تھے کہ امیران سندھ کی دولت پر قبضہ جمانے کے لیے سندھ کو فتح کیا جائے۔ انگریزوں کی اس حرص و آز پر قلم اٹھاتے ہوئے سر چارلس لکھتا ہے کہ صدیوں کی تعلیم و تربیت بھی انگریزوں کی رہزنانہ فطرت کی نہیں بدل سکی۔ ہندوستان میں جب کبھی کوئی انگریز کسی دولت مند ہندی یا کسی عالی شان عمارت کو دیکھتا ہے تو بے ساختہ کہہ اٹھتا ہے:

"کیسا اچھا شکار ہے...... مارنے کے لیے
کیسا اچھا محل ہے...... جلانے کے لیے"

۲۔ شمال مغربی سرحد کا استحکام

۳۔ فرانسیسی حملے کا خطرہ!

۴۔ افغانستان کی جنگوں کا انتقام لینے کے لیے امیرانِ سندھ پر حملہ کیا گیا۔

برطانوی مصنوعات کے لیے ایک نئی منڈی کی تلاش اور برطانی کارخانوں کے لیے ارزاں کپاس کی ضرورت نے سندھ کی آزادی کو چھین لیا۔

۲ رستمبر ۱۸۴۲ء میں سر چارلس نیپیر کو تسخیر سندھ کے لیے بھیجا گیا۔ سر چارلس نیپیر ایک ضدی اور جنگ جو افسر تھا۔ اس نے امیرانِ سندھ کو مجبور کر دیا کہ وہ ایک ایسا معاہدہ قبول کریں جس کی رو سے:

۱۔ برطانوی امدادی فوج کے اخراجات کے لیے آئندہ بجائے تین لاکھ روپیہ سالانہ کے امیرانِ سندھ کو اپنی مملکت کا ایک حصہ کمپنی کے حوالے کرنا پڑا۔

۲۔ امیران سندھ کو برطانوی جہازوں کے لیے ایندھن فراہم کرنا تھا۔

۳۔ امیران سندھ کو اپنے نام کا سکہ بند کرنا تھا۔

آخری شرط نے امیران سندھ کو مشتعل کر دیا۔ چارلس نیپیر اعلان جنگ کے بغیر امام گڑھ روانہ ہوا۔ امام گڑھ کے صحرائی قلعہ کو اس نے سطح زمین کے ساتھ ہموار کر دیا۔ برطانوی ریزیڈنٹ

آوٹ رم نے امیران سندھ کو جدید معاہدہ قبول کرنے کے لیے کہا۔ امیران سندھ نے معاہدہ قبول کرتے ہوئے آوٹ رم سے حیدرآباد خالی کرنے کو کہا کیوں کہ وہ مشتعل رعایا کے افعال کے ذمہ دار نہیں ہونا چاہتے تھے۔ چنانچہ تین دن کے بعد مشتعل ہجوم نے ریزیڈنسی پر حملہ کر دیا۔ آوٹ رم بڑی مشکل سے جان بچا کر ایک برطانوی جہاز تک پہنچا۔ جنگ کا اعلان ہو چکا تھا۔

۱۷ فروری ۱۸۴۳ء کو نیپیر نے میانی کے مقام پر سندھی فوجوں کو شکست دی۔ حیدرآباد پر انگریزوں کا قبضہ ہو گیا۔ ایک ماہ بعد امیر خیر پور کو بھی شکست کھانی پڑی۔

سندھ کی برطانوی حکمت عملی اخلاقی طور پر قابل تعریف ہے۔ ایک آزاد ملک کو غلام بنانے کے لیے سازشوں کی فرضی داستان بنائی گئی۔ محض ایک فوجی افسر کی چند خواہشات کی تکمیل نے لاکھوں انسانوں کو نان جویں سے محروم کر دیا۔ حیدرآباد کے شاہی محلات کو جس بے جگری سے لوٹا گیا، اس کی مثال چنگیزی کارناموں کی یاد تازہ کرتی ہے۔ شاہی بیگمات کے جواہرات کا لوٹا جانا تو ایک لازمی امر تھا، لیکن محض کپڑوں کے لیے بیگمات کو برہنہ کر دینا انسانی ذلت کی انتہا تھی۔ حیدرآباد کی لوٹ سے نیپیر کو نو لاکھ روپے ملے۔ سر چارلس نیپیر نے امیران سندھ پر محض اس لیے حملہ کیا کہ وہ کمزور تھے اور ''مرض ضعیفی کی سزا مرگ مفاجات ہے'' نیپیر نے امیرانِ سندھ کی کمزوری سے اپنی قوت میں اضافہ کیا۔

اگست ۱۸۴۳ء میں سندھ پر قبضہ کر لیا گیا۔ امیران سندھ جلاوطن ہو گئے۔

سر چارلس نیپیر سندھ کی تسخیر پر قلم اٹھاتے ہوئے لکھتا ہے: ''ہمیں کوئی حق حاصل نہیں کہ ہم سندھ پر قابض ہوں لیکن اس کے باوجود ہم ایسا ہی کریں گے۔''

حیدرآباد اور خیر پور کے حکمرانوں کو پونا، کلکتہ اور ہزاری باغ میں نظر بند کر دیا گیا۔ دس سال کے بعد ان میں سے جو زندہ بچے انھیں پھر سندھ جانے کی اجازت مل گئی۔

سندھ کو برطانوی ہندوستان کے ساتھ ملحق کرنے کے بعد سر چارلس نیپیر کو سندھ کا گورنر مقرر کیا گیا۔ اس نے کراچی کو سندھ کی راجدھانی بنایا۔ سر چارلس نیپیر کے نظم ونسق کا اندازہ سر بارٹلے کے الفاظ سے لگایا جا سکتا ہے: ''جب میں ۱۸۵۱ء میں سندھ آیا تو سارے سندھ میں ایک میل لمبی پکی سڑک نہیں تھی۔ نہ ڈاک بنگلہ تھا اور نہ کوئی سرائے، نہ کچہری تھی، اور نہ چوکی۔''

سر چارلس نیپئر کے مستعفی ہو جانے کے بعد ۱۸۴۷ء میں سندھ کو احاطہ بمبئی میں شامل کر کے اسے ایک کمشنر کے ماتحت کر دیا گیا۔ (کمپنی کی حکومت)

۱۰؍اکتوبر ۱۸۴۴ء: اس تاریخ کو لارڈ ہارڈنگ وائسرائے ہند کا ریزولیوشن اس مضمون کا جاری ہوا کہ اب ملازمتوں میں انگریزی تعلیم یافتہ لوگوں کو ترجیح دی جائے گی۔ (مسلمانوں کا روشن مستقبل، صفحہ ۱۵۱)

انگریزوں نے انگریزی تعلیم کی جو تحریک اٹھارھویں صدی کے اواخر میں شروع کی تھی، اس کی تکمیل لارڈ ہارڈنگ کے ۱۰؍اکتوبر ۱۸۴۴ء کے مذکورۃ الصدر حکم سے ہوگئی۔ مگر اس کی نسبت رعایا کی طرف سے جن میں مسلمان بھی شامل تھے کبھی یہ نہیں کہا گیا کہ انگریزی کو شرط ملازمت قرار نہ دیا جائے یا اسے اہمیت نہ دی جائے۔ البتہ انگریزی کی مخالفت اس بنا پر ضرور کی گئی تھی کہ اس کو مذہب عیسوی کی اشاعت کا ذریعہ بنایا جاتا تھا۔ اس بارے میں سب سے پہلا احتجاج مسلمانان کلکتہ نے آٹھ ہزار دستخطوں سے کیا جب کہ لارڈ ولیم بینٹنگ وائسرائے کی طرف سے ۷؍مارچ ۱۸۳۵ء کے مراسلہ کے ذریعہ یہ حکم دیا گیا کہ تعلیم عامہ اور وظائف کا کل روپیہ صرف انگریزی تعلیم پر صرف کیا جائے! جس کے معنی یہ تھے کہ مسلمانوں کو جو کچھ روپیہ کلکتہ مدرسہ میں عربی تعلیم کے وظائف کی شکل میں مل جاتا تھا وہ اس سے بھی محروم کر دیے گئے۔ اسی کے ساتھ ۱۸۴۶ء میں ہندوؤں نے بھی اس امر کو محسوس کیا کہ مروجہ تعلیم کا اثر براہ راست ان کے مذہب پر پڑتا ہے۔ اس کی تفصیل یہ ہے کہ ۱۸۴۶ء میں سررشتہ تعلیم مدراس نے یہ تجویز کیا کہ گورنمنٹ اسکولوں میں انجیل بطور اختیاری مضمون کے پڑھائی جائے۔ مارکوئیس آف ٹوئیڈل گورنر مدراس نے اس کی تائید میں بہت سے دلائل دیئے اور کہا:

> "رفتہ رفتہ کل لڑکے انجیل کے اختیاری مضمون کو پڑھنے لگیں گے، جس سے ان میں اخلاقی ترقی ہوگی۔ سرکاری ملازمت کے لیے ضرورت ہے کہ بہ نسبت ہندو یا مسلمانوں کے مذہب کے اخلاق کو زیادہ مضبوط بنیادوں پر قائم کیا جائے۔"

مگر کورٹ آف ڈائریکٹران نے ۲۳؍مارچ ۱۸۴۶ء کو اسکولوں میں انجیل پڑھانے کی تجویز نامنظور کر دی۔ باوجود اس حکم کے مدراس کے افسران زیادہ تر روپیہ عیسائی اسکولوں کو دیتے تھے اور جن مقامات میں عیسائی اسکول تھے وہاں کوئی اور اسکول قائم نہ کرنے دیتے تھے۔ اس پر باشندگان مدراس نے جن میں ہر مذہب کے لوگ شریک تھے۔ ۱۸۵۲ء میں پارلیمنٹ کی خدمت میں گورنر صاحب صوبۂ مدراس کے خلاف ایک عرض داشت کے ذریعہ سخت احتجاج کیا اور اس میں لکھا کہ سرکاری روپیہ عیسائی بنانے میں صرف کیا جاتا ہے۔ اس شکایت پر حکومت کی طرف سے تعلیم کے

بارے میں غیر جانبداری کا اعلان کیا گیا۔

۱۸۳۹ء تا ۱۸۴۶ء

پنجاب کے حالات پر ایک نظر:

مہاراجا رنجیت سنگھ نے پنجاب میں فوجی سرداروں کی قوت توڑ کر پنجاب کو سیاسی لحاظ سے متحد کر دیا تھا۔ پنجاب کی مرکزی حکومت کو مضبوط بنانے کے لیے مہاراجا نے اپنے زمانے کے حالات کے مطابق بہت سی سختیاں بھی کیں۔ مہاراجا رنجیت سنگھ کے عہد حکومت میں کمپنی اور پنجاب میں تصادم نہ ہو سکا، لیکن مہاراجا کی موت کے بعد ایک طرف کمپنی نے پنجاب پر قبضہ کرنے کی تدبیریں کیں اور دوسری طرف دربارِ لاہور کے سازشی ماحول نے انگریزوں کو یہ موقع دے دیا کہ وہ اس سے پورا پورا فائدہ اٹھائیں۔

مہاراجا کی موت (۱۸۳۹ء) کے بعد اس کا بیٹا کھڑک سنگھ تخت پر بیٹھا۔ کھڑک نے چیت سنگھ کو اپنا وزیر اعظم مقرر کیا۔ چیت سنگھ نے اپنے مخالف دھیان سنگھ کو قتل کرانے کی سازش کی۔ اس پر دھیان سنگھ نے کھڑک سنگھ کے بیٹے نونہال سنگھ کو اپنے ساتھ ملا کر مہاراجا اور وزیر اعظم سے انتقام لینا چاہا۔ دھیان سنگھ نے دوسرے فوجی سرداروں کی مدد سے چیت سنگھ کو قتل کر دینے کے بعد کھڑک سنگھ کو نظر بند کر دیا۔ کھڑک سنگھ جتنا زیادہ انگریزوں کا حامی تھا اس کا بیٹا نونہال سنگھ اتنا ہی انگریزوں کا مخالف تھا۔ اپنے باپ کی نظر بندی کے بعد نونہال سنگھ ۸/اکتوبر ۱۸۳۹ء کو تخت پر بیٹھا۔ نونہال سنگھ مشکل سے ایک سال حکومت کرنے پایا تھا کہ اپنے باپ کی نعش کو آگ کے سپرد کرنے کے بعد قلعے میں داخل ہونا چاہتا تھا کہ ایک دیوار کے گرنے سے بری طرح زخمی ہوا۔ دھیان سنگھ اسے زخمی حالت میں قلعہ کے اندر لے گیا۔ نونہال سنگھ کے مرنے کے بعد راجا گلاب سنگھ اور سردارانِ سندھانوالیہ متوفی کی ماں اور کھڑک سنگھ کی بیوہ رانی چندر کور کو تخت پر بیٹھانا چاہتے تھے۔ راجا دھیان سنگھ چاہتا تھا کہ مہاراجا رنجیت سنگھ کے دوسرے بیٹے شیر سنگھ کو تخت پر بیٹھائے۔ چناں چہ وہ جموں چلا گیا تاکہ اپنی فوج کو لاہور ساتھ لے آئے۔ لاہور چھوڑنے سے پہلے راجا دھیان سنگھ نے کنور شیر سنگھ کو لکھا تھا کہ وہ بٹالہ سے بہت جلد لاہور پہنچ جائے۔ شیر سنگھ نے لاہور پہنچ کر راجا دھیان سنگھ کا انتظار کیے بغیر قلعہ کا محاصرہ کر لیا۔ رات کے وقت شیر سنگھ کی فوج نے شہر میں داخل ہو کر خوب لوٹ مار کی۔ چار پانچ دن تک شیر سنگھ اور گلاب سنگھ میں لڑائی ہوتی رہی۔ دھیان سنگھ کے لاہور پہنچ جانے کے بعد راجا گلاب سنگھ اور رانی چندر کور نے قلعہ خالی کر دیا۔ راجا گلاب

سنگھ نے قلعہ خالی کرتے وقت خزانے پر خوب ہاتھ صاف کیا۔ شیر سنگھ کے ہاتھ صرف ''کوہ نور'' آیا۔

۱۸؍جنوری ۱۸۴۱ء: ۱۸؍کو شیر سنگھ تخت پر بیٹھا۔ اس نے راجا دھیان سنگھ کو وزیر اعظم اور راجا سوچیت سنگھ کو سپہ سالار مقرر کیا۔ سندھیانوالہ سرداروں کی جائیداد ضبط کر لی گئی۔ شیر سنگھ نے سندھیانوالیہ سرداروں کو بہت جلد معاف کر دیا۔ ان سرداروں کی اتنی قوت تھی کہ شیر سنگھ اور دھیان سنگھ دونوں انھیں اپنی اپنی سازش میں شریک کرنے لگے لیکن سندھانوالیہ سرداروں نے ۱۲؍دسمبر ۱۸۴۲ء کو مہاراجا شیر سنگھ اور وزیر اعظم دھیان سنگھ کو قتل کر دیا۔ سندھیانوالہ سرداروں نے قلعے میں داخل ہو کر مہاراجا رنجیت سنگھ کے کم سن بیٹے دلیپ سنگھ کو تخت پر بیٹھا دیا۔

جب راجا دھیان سنگھ کے بھائی اور اس کے بیٹے ہیرا سنگھ کو مہاراجا شیر سنگھ اور وزیر اعظم دھیان سنگھ کے قتل ہو جانے کی خبر ملی تو انھوں نے دوسرے دن قلعے کا محاصرہ کر لیا۔ سندھانوالیہ سرداروں کے لیے حملہ آوروں کا مقابلہ بہت مشکل تھا۔ ہیرا سنگھ اور اس کی فوج نے قلعے میں داخل ہو کر ایک ایک کر کے قاتلوں کو ختم کر دیا۔ ہیرا سنگھ نے دلیپ سنگھ کی تخت نشینی کا اعلان کیا اور خود وزیر اعظم بن گیا۔ مہاراجا دلیپ سنگھ کے ماموں جواہر سنگھ اور ہیرا سنگھ کا چچا سوچیت سنگھ نئے وزیر اعظم کی مخالفت میں آگے آگے تھے۔ ہیرا سنگھ نے سوچیت سنگھ کو قتل کروا دیا لیکن جواہر سنگھ نے بہت جلد ہیرا سنگھ کو موت کے گھاٹ اتارنے کے بعد وزارت عظمیٰ پر قبضہ کر لیا لیکن چند مہینوں کے بعد ۲۳؍دسمبر ۱۸۴۵ء کو فوج نے رانی جنداں (دلیپ سنگھ کی ماں) کے سامنے اس کے بھائی جواہر سنگھ کو قتل کر دیا۔ فوج کے اختیارات اس حد تک بڑھ گئے تھے کہ وزارت کا قلمدان سنبھالنا بڑی ہمت کا کام تھا۔

بڑی مشکل سے راجا لال سنگھ نے وزارت کے قلمدان کو سنبھالا۔ راجا لال سنگھ اور رانی جنداں نے فوج کے بڑھتے ہوئے اثر و رسوخ کو ختم کرنے کے لیے جو پالیسی وضع کی وہ ان کی ذاتی خواہشوں کے مطابق ہو تو ہو، لیکن اس سے پنجاب کا محکوم بن جانا ایک یقینی امر تھا۔ راجا لال سنگھ نے سب سے پہلے فوج کو افغانستان پر حملہ کرنے کے لیے تیار کرنا چاہا لیکن فوج نے انکار کر دیا۔ اب رانی جنداں اور وزیر اعظم لال سنگھ نے فوج کو انگریزوں کے ساتھ لڑانا چاہا۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ مہاراجا رنجیت سنگھ کی موت تک کمپنی نے ۱۸۰۹ء کے معاہدے پر عمل کیا لیکن اس کے ساتھ ہی پنجاب کی سرحد پر اپنی فوجی طاقت بڑھاتی رہی۔ ۱۸۳۸ء میں پنجاب کی سرحد پر انگریزی

فوج کے صرف اڑھائی ہزار سپاہی تھے لیکن لارڈ ہارڈنگ کے آتے ہی اس فوج کی تعداد بتیس ہزار ہوگئی۔ انگریزوں کی فوجی تیاریوں سے لاہور میں یہ افواہ عام ہوگئی تھی کہ انگریز پنجاب پر قبضہ کرنا چاہتے ہیں۔ انگریزوں اور پنجاب میں لڑائی کا ہونا یقینی تھا لیکن رانی جنداں اور وزیر اعظم لال سنگھ نے جن ارادوں کے ساتھ پنجاب کی فوج کو انگریزی فوج سے لڑوانا چاہا وہ پنجاب کے لیے کسی حالت میں بھی مفید نتائج پیدا نہیں کر سکتے تھے۔ پنجاب پر انگریزی حملے کے امکانات نے پنجاب کی فوج کے دلوں میں بہت زیادہ جوش وخروش پیدا کر دیا تھا۔ اس جوش وخروش سے فائدہ اٹھانے کے لیے رانی جنداں اور وزیر اعظم لال سنگھ نے انھیں ستلج پار جا کر انگریزوں سے لڑنے کا حکم دے دیا۔ لال سنگھ اور تیج سنگھ اس فوج کے ہمراہ تھے۔

انگریز جنگ کے لیے فوراً تیار ہو گئے۔ گورنر جنرل نے پنجاب کے خلاف اعلان جنگ کر دیا۔ ۱۸ر دسمبر ۱۸۴۵ء مدکی کے مقام پر دونوں فوجیں متصادم ہوئیں۔ انگریزی فوجوں کا افسر اعلیٰ سر ہیو گف اور پنجابی فوج کا کمان دار اعلیٰ لال سنگھ تھا۔

اس لڑائی میں انگریزوں کو بہت نقصان اٹھانا پڑا۔ سکھ سپاہی میدان جنگ میں شیروں کی طرح لڑ رہے تھے کہ بارود ختم ہو گیا۔ سپاہیوں کی حیرت کی کوئی انتہا نہ رہی جب انھوں نے دیکھا کہ بارود کی جگہ انھیں سرسوں کے بیج روانہ کیے جا رہے تھے۔ آتش گیر مادہ کا مقابلہ سرسوں کے بیج کیوں کر کر سکتے تھے؟ خالصہ فوج بھائی پھیرو کی طرف لوٹی۔ اس لڑائی میں انگریزوں کو بہت زیادہ نقصان اٹھانا پڑا۔ دو دن تک خالصہ فوج نے انگریزی فوج کا جم کر مقابلہ کیا۔ انگریزوں کو شکست کے آثار دکھائی دینے شروع ہوئے۔ بعض انگریز افسروں نے میدان جنگ چھوڑ کر بھاگ جانے کا فیصلہ کیا لیکن غداری نے یہاں بھی اپنا کام کیا۔ بھائی پھیرو سے ہٹ کر خالصہ فوج نے علی وال کے مقام پر مورچے لگا دیے۔ لیکن سر جیری اسمتھ نے سکھوں کو اس مقام پر شکست دی۔ اب خالصہ فوج نے تھوڑا پیچھے ہٹ کر آخری مرتبہ سبراؤں کے مقام پر لڑنا چاہا۔ اس میدان میں سردار شام سنگھ اٹاری والے نے جرأت اور شجاعت کے حیرت انگیز کارنامے کیے۔ سردار شام سنگھ اٹاری والا مہاراجا رنجیت سنگھ کی موت کے بعد اٹاری میں گوشہ نشین ہو چکا تھا لیکن جب اسے جنگ کی اطلاع ملی تو وہ میدان میں کود پڑا۔ سبراؤں کی لڑائی میں وہ نہایت بہادری سے لڑا۔ جب تیج سنگھ میدان سے بھاگنے لگا تو اس نے اٹاری والے سردار کو بھی اپنے ساتھ جانے کے لیے کہا لیکن جواں ہمت بوڑھے سردار نے ڈرپوک سپہ سالار کے مشورے پر عمل کرنے سے انکار کر دیا۔ سردار شام

سنگھ اٹاری والا لڑتا رہا یہاں تک کہ اس کی نعش ابدی نیند میں سوئے ہوئے ساتھیوں کے انبار میں مل گئی۔

۱۱رفروری ۱۸۴۶ء: اگلے دن (۱۱رفروری ۱۸۴۶ء) انگریزی فوج نے ستلج پار کر کے قصور پر قبضہ کرلیا۔ اسی اثنا میں رانی جنداں نے راجا گلاب سنگھ کو اپنا وزیر اعظم مقرر کرلیا تھا۔ راجا گلاب سنگھ نے لارڈ ہارڈنگ سے جو پنجاب میں پہلی جنگ میں ایک فوجی افسر کی حیثیت سے حصہ لے رہا تھا ملاقات کرنے کے بعد طے پایا کہ دربار لاہور ڈیڑھ کروڑ روپیہ بطور تاوان ادا کرے۔ فوج کی تعداد بارہ ہزار سوار اور بیس ہزار پیدل کردی جائے دربار لاہور کو صرف تیس توپیں اپنے پاس رکھنی چاہییں، باقی توپوں کو انگریزوں کے حوالے کر دیا جائے۔ ستلج اور بیاس کے درمیانی علاقے کو انگریزوں کے سپرد کر دیا جائے۔ مہاراجا دلیپ اور لال سنگھ کو گورنر جنرل کے دربار میں پیش کیا جائے گا۔

۲۸رفروری ۱۸۴۶ء: چنانچہ ۲۸رفروری ۱۸۴۶ء کو دلیپ سنگھ نے اپنے فوجی سرداروں سمیت گورنر جنرل لارڈ ہارڈنگ سے للیانہ میں ملاقات کی۔ لاہور پہنچ کر گورنر جنرل نے ۸رمارچ ۱۸۴۶ء کو معاہدہ لاہور کی شرطوں کی تصدیق کرنے کے بعد سرہنری لارنس کو لاہور میں اپنا ریذیڈنٹ مقرر کر دیا۔ ریذیڈنٹ کی حفاظت کے لیے نومہینوں کے لیے ایک فوجی دستہ بھی لاہور رکھا گیا۔

کشمیر کا سودا

معاہدۂ امرتسر:

عہد نامہ لاہور کے مکمل ہوجانے کے بعد سرہنری لارنس نے راجا گلاب سنگھ کی خدمات کا صلہ اس طرح دیا کہ کشمیر کو پچھتر لاکھ روپے کے عوض اس کے ہاتھ فروخت کر دیا اور اس کے ساتھ ہی کشمیر کو دربار لاہور کی اطاعت سے نکال کر اسے انگریزی حمایت میں لے لیا۔ کمپنی اور راجا گلاب سنگھ کے درمیان ۱۶رمارچ ۱۸۴۶ء کو امرتسر میں جو معاہدہ ہوا وہ مندرجۂ ذیل دس دفعات پر مشتمل تھا:

دفعہ نمبر ۱: سرکار انگلشیہ مہاراجا گلاب سنگھ اور ان کے وارثان کو تمام ملک کوہستانی بمعہ اس کے تابع علاقے کے جو دریائے سندھ کے مشرق کی طرف اور مغرب کی جانب دریائے

راوی کے درمیان مع علاقہ چھچھ ماسوائے لاہور جو کہ ان ممالک کا حصہ نہیں، جو برٹش گورنمنٹ کو دفعہ ۴، عہد نامۂ لاہور مورخہ ۹/ مارچ ۱۸۴۶ء ملا ہے بااختیار خودمختار مستقل طور پر عطا کرتے ہیں۔

دفعہ نمبر ۲: جو علاقہ مہاراجا گلاب سنگھ جی کو اس عہدنامے کی مندرجۂ بالا شرط کے تحت منتقل کیا جاتا ہے اس کی حدود شرقی معلوم کرنے کے لیے برٹش گورنمنٹ اور مہاراجا گلاب سنگھ کی طرف سے کمشنر مقرر کیے جائیں گے اور یہ حدود علاجدہ اقرارنامے کے ذریعے تعین کی جائے گی۔

دفعہ نمبر ۳: اس ملک کی عطائیگی بحق مہاراجا گلاب سنگھ و وارثان کے عوض مہاراجا صاحب موصوف سرکار انگلشیہ کو پچھتر لاکھ روپیہ (نانک شاہی) ادا کریں گے۔ ان میں سے پچاس لاکھ روپیہ اس عہدنامے کو استحکام دیے جانے کے وقت اور پچیس لاکھ روپیہ اس سال کے ماہ اکتوبر کی پہلی تاریخ سے قبل ادا کیا جائے گا۔

دفعہ نمبر ۴: حدود ملک مہاراجا گلاب سنگھ صاحب کسی وقت بھی سرکار انگلشیہ کی منظوری کے بغیر تغیر وتبدل نہ ہو سکے گا۔

دفعہ نمبر ۵: اگر مہاراجا گلاب سنگھ اور لاہور گورنمنٹ یا کسی ہمسایہ ریاست کے مابین تنازعہ ہو جائے تو مہاراجا صاحب موصوف اس تنازعہ کو برٹش گورنمنٹ کے حوالے کریں گے اور اس کے ثالثی فیصلہ پر پابند رہیں گے۔

دفعہ نمبر ۶: مہاراجا گلاب سنگھ خود اور از طرف والاشان خود اقرار کرتے ہیں کہ جب کبھی انگریزی فوج کسی ملحقہ ملک میں لڑ رہی ہو گی اپنی پوری فوج کے ساتھ تعاون کریں گے۔

دفعہ نمبر ۷: مہاراجا گلاب سنگھ جی عہد کرتے ہیں کہ وہ کبھی کسی انگریز یا کسی یورپین یا امریکن کو برٹش گورنمنٹ کی منظوری کے بغیر اپنی ملازمت میں نہ رکھیں گے۔

دفعہ نمبر ۸: مہاراجا گلاب سنگھ عہد کرتے ہیں کہ وہ ان ممالک کے متعلق جو ان کو منتقل کیے گئے ہیں عہد نامۂ لاہور مورخہ ۱۱/ مارچ ۱۸۴۶ء مابین سرکار انگلشیہ اور لاہور گورنمنٹ کی دفعات ۵، ۶، ۷ کا احترام کریں گے۔

دفعہ نمبر ۹: سرکار انگلشیہ عہد کرتی ہے کہ وہ بیرونی دشمنوں سے مملکت مہاراجا صاحب بہادر پر حملہ کے وقت مہاراجا صاحب کی مدد کریں گے۔

دفعہ نمبر ۱۰: مہاراجا گلاب سنگھ عظمت و دولت اقتدار سرکارِ انگلشیہ کا احترام کرتے ہیں اور اس احترام کے پیش نظر سرکارِ انگلیشہ کو ہر سال ایک گھوڑا اور تین جوڑے کشمیری شال وغیرہ بہ طور نذرانہ آ دیں گے۔

جب دربار لاہور کو عہد نامۂ امرتسر کا علم ہوا تو لال سنگھ نے کشمیر کے گورنر شیخ امام الدین کو یہ ہدایت کی کہ گلاب سنگھ کو کشمیر کا قبضہ نہ دیا جائے۔ چناں چہ کہ اس حکم کے ماتحت شیخ امام الدین نے گلاب سنگھ کی فوج کے ساتھ لڑنے پر آمادگی ظاہر کی۔ اس پر گلاب سنگھ نے سر ہنری لارنس سے فوجی مدد طلب کی۔ میجر جان لارنس نے گلاب سنگھ کو کشمیر کا قبضہ دلوا دیا۔ لال سنگھ کو گلاب سنگھ کی مخالفت کرنے کے عوض جلاوطن کر دیا گیا۔ اسی اثنا میں انگریزی فوج کے لاہور میں ٹھہرنے کی مدت ختم ہو گئی۔ لیکن بعض درباریوں سے یہ کہلوا لینا کوئی مشکل کام نہیں تھا کہ ''حضور پرنور ابھی تھوڑی مدت لاہور میں مزید قیام فرمائیں کیوں کہ آپ کے چلے جانے کے بعد نقص امن کا اندیشہ ہے'' چناں چہ یہی ہوا۔ لارڈ ہارڈنگ نے ان درباریوں کی درخواست مان لی۔ لارڈ ہارڈنگ نے بھیروال میں پہنچ کر ۱۶؍دسمبر ۱۸۴۶ء کو ایک نیا عہد نامہ مرتب کیا جس کی رو سے انتظامی امور کے لیے ایک کونسل مقرر کی گئی جس کی صدارت کے فرائض سر ہنری لارنس کے سپرد کیے گئے۔ رانی جنداں کے لیے ڈیڑھ لاکھ روپیہ سالانہ منظور کیا گیا۔ اس عہد نامے میں یہ بھی لکھا ہوا تھا کہ دسمبر ۱۸۵۴ء میں جب دلیپ سنگھ سولہ برس کا ہو جائے گا تو پھر ایک نیا معاہدہ کیا جائے گا۔ اس عہد نامے نے رانی جنداں کے اختیارات ختم کر دیے۔ سر ہنری لارنس نے اس وقت تک چین نہ لیا جب تک کہ اس نے رانی جنداں کو شیخوپورہ میں نظر بند اور اس کے بیٹے دلیپ سنگھ کو اس سے علاحدہ نہ کر لیا۔ اسی اثنا میں ہنری لارنس انگلستان چلا گیا اور اس کی جگہ فریڈرک کری ریزیڈنٹ مقرر ہوا۔ لارڈ ہارڈنگ کا دورِ حکومت بھی ختم ہو چکا تھا۔ لارڈ ڈلہوزی نیا گورنر جنرل تھا! (کمپنی کی حکومت، ص ۳۷۴ـ۳۸۰)

نہر سوئز:

۱۸۴۶ء میں بمقام پیرس اس مقصد کی تکمیل کے لیے ایک مجلس قائم کی اور نہر سوئز کی تعمیر کے لیے ایک کمیٹی مقرر کی گئی ۳۰؍نومبر ۱۸۵۴ء کو مصر کے گورنر محمد سعید پاشا نے اپنے فرانسیسی دوست اور شاہ فرانس کے ایک عزیز فرڈیننڈ ڈی لیسپس (Ferdinand De Lesseps) کو ایک فرمان کے ذریعے اس شرط پر بعض مراعات دینے کا وعدہ کیا کہ وہ نہر سوئز کی تعمیر کے لیے ایک کمپنی

قائم کرے۔ اس موقعے پر برطانوی حکومت اس نہر کی تعمیر کی شدید ترین مخالف تھی لیکن ۱۸۵۶ء میں ترکی حکومت نے محمد سعید پاشا کے فرمان کی تصدیق کر دی۔ ابتدا میں یہ کمپنی فرانسیسی اور مصری سرمایہ سے قائم کی گئی تھی اور ریاست ہائے متحدہ امریکہ، برطانیہ اور چند دوسرے ممالک نے اس کام میں حصہ لینے سے انکار کر دیا تھا۔ اس نہر کو مصری مزدوروں نے تعمیر کیا تھا لیکن رفتہ رفتہ مصر اس کی ملکیت اور منافع سے محروم کر دیا گیا۔

نہر سوئز کی تعمیر ۲۵/اپریل ۱۸۵۹ء کو شروع ہوئی تھی۔ ۱۰/اپریل ۱۸۶۹ء کو بحیرۂ متوسط کا پانی بحیرۂ احمر میں شامل ہو گیا اور ۱۷/نومبر ۱۸۶۹ء کو اس کی رسم افتتاح ادا کی گئی۔ یہ نہر ۱۷۳ کلومیٹر طویل ہے اور اسے مقفل نہیں کیا جا سکتا۔ نہر سوئز متعدد جھیلوں میں سے گزرتی ہے اور اس کا انتظامی مرکز شہر اسمعیلیہ بھی ایک جھیل ہی کے کنارہ پر واقع ہے۔ یہ نہر مختلف مقامات پر ایک سو بیس میٹرس سے ڈیڑھ سو میٹرس تک وسیع ہے۔ (اردو انسائیکلو پیڈیا آف اسلام (لاہور، ۱۹۷۵ء) کے مطابق لمبائی ۱۰۱ میل، چوڑائی ۱۹۶ فٹ کم اَز کم) اور اس میں رات دن جہازوں کی آمد و رفت جاری رہتی ہے اور جہاز تیرہ گھنٹہ میں اسے عبور کر لیتے ہیں۔ نہر سوئز کا صدر دفتر پیرس میں واقع ہے اور اس کی مجلس انتظامیہ انیس فرانسیسیوں، دس انگریزوں، دو مصریوں اور ایک ڈچ پر مشتمل ہے لیکن نہر کی حفاظت کے نام پر مشرق وسطیٰ کے ہر ملک میں انگریزی فوجیں مقیم رہتی ہیں اور اس طرح عملاً اس نہر پر برطانیہ کا قبضہ ہے اسی مقصد سے اس نے ۱۸۸۲ء میں مصر پر بھی قبضہ کر لیا تھا۔ ۱۸۸۸ء میں قسطنطنیہ کنونشن منعقد ہوا اور اس نہر کو بین الاقوامی بحری راستہ قرار دیا گیا۔ اور ۱۹۳۶ء میں مصری برطانوی معاہدے کی رو سے اس نہر کو مصر کی ملکیت تسلیم کر لیا گیا۔ اس نہر کے چھہتر لاکھ باون ہزار حصص میں سے برطانوی حکومت دو لاکھ پچانوے ہزار حصوں کی مالک ہے۔ لیکن یہ حصص ۱۹۶۹ء میں مصر کی زیر ملکیت منتقل ہو جائیں گے۔ اس نہر سے گزرنے والے جہازوں کو محصول ادا کرنا پڑتا ہے۔ برطانیہ کو اس کے مشرقی مقبوضات سے وابستہ رکھنے والا بحری راستہ آبنائے جبرالٹر اور بحیرۂ روم کے بعد اسی نہر سے ہو کر گزرتا ہے (بین الاقوامی سیاسی معلومات از اسرار احمد آزاد دہلی، مکتبہ برہان، 1951ء، ص ۵۷۔۵۷۴)

مصر نے ۱۵/اکتوبر کو نہر سویز سے متعلق مصر اور برطانیہ کے معاہدہ ۱۹۳۶ء اور سوڈان کے متعلق معاہدہ ۱۸۹۹ء کو منسوخ کر دیا ہے لیکن برطانیہ کی سابقہ لیبر گورنمنٹ اور موجودہ کنزرویٹو گورنمنٹ نے اس تنسیخ کو قبول نہیں کیا اور برطانیہ نہر سویز کے علاقے میں مزید افواج بھیج رہا

ہے۔ مصر میں ہنگامی صورت حال کا اعلان کر دیا گیا ہے۔ مصر کے شہری برطانوی عمال سے عدم تعاون کر رہے ہیں۔ متعدد مقامات پر برطانوی سپاہیوں اور عوام کے مابین تصادمات بھی ہوئے ہیں۔ مصری رضا کار دفاعی تیاریوں میں مصروف ہیں اور عوام کی طرف سے اس بات کا مطالبہ کیا جا رہا ہے کہ مصر کی حکومت کو سوویت روس کے ساتھ غیر جارحانہ معاہدہ کر لینا چاہیے۔ اس سلسلے میں برطانیہ، فرانس، امریکہ اور ترکی کی طرف سے مصر کے روبرو یہ تجویز بھی پیش کی گئی تھی کہ اگر وہ مشرق وسطیٰ کے دفاعی میثاق میں شریک ہو جائے تو نہر سویز کے علاقہ کو بین الاقوامی..... قرار دے کر اسے مصر کے حوالے کر دیا جائے گا لیکن مصر نے اس تجویز کو منظور نہیں کیا۔ (ایضاً ص ۸۰۰)

نہر سویز:

یہ ایک سو ایک میل لمبی نہر ہے جو بحر متوسط کو بحر احمر سے ملاتی ہے۔ یہ نہر ۱۸۶۹ء میں جہاز رانی کے لیے کھولی گئی تھی۔ ایک مصری کمپنی اس نہر کی مالک تھی اور اس کا انتظام زیادہ تر فرانسیسیوں کے ہاتھ میں تھا اس کمپنی کو یہ مراعات دی گئی تھیں کہ ان سب جہازوں سے فیس وصول کرے جو اس نہر سے گزریں۔ ۱۹۶۶ء میں اس سے بچانوے ملین پونڈ کی آمدنی تھی۔ یہ مراعات ۱۷ر نومبر ۱۹۶۸ء کو ختم ہونے والی تھی کیوں کہ یہ طے شدہ تھا کہ اس تاریخ سے نہر کی ملکیت حکومت مصر کو منتقل ہو جائے گی۔ ۱۸۸۸ء میں قسطنطنیہ معاہدہ پر دستخط ہوئے اور اس نہر کو ہمیشہ ہمیشہ کے لیے راستہ بند کیے جانے سے مستثنیٰ کر دیا گیا اور طے پایا کہ جنگ اور امن دونوں حالتوں میں تمام جہازوں کو خواہ وہ مسلح ہوں یا غیر مسلح نہر میں ہو کر گزرنے کی اجازت ہوگی۔ اکتوبر ۱۹۵۴ء میں برطانیہ اور مصر کے درمیان سمجھوتا ہوا جس کی رو سے برطانوی فوج نہر سویز کے علاقوں سے واپس بلالی گئی۔ یہ تحریک ابتدا میں برطانوی لیبر حکومت نے ۱۹۴۶ء میں ہی کر دی تھی۔ ۲۶ر جولائی ۱۹۵۶ء کو اسوان بند کے لیے امریکی امداد کی واپسی کے ردعمل میں عکومت مصر نے اس کمپنی کو یہ کہہ کر قومی ملکیت میں لے لیا کہ جو آمدنی اس سے ہوگی وہ اسوان بند کی تعمیر کے کام میں صرف ہوگی۔ اس کے بعد ہی فرانس، اسرائیل اور برطانیہ نے مصر پر حملہ کر دیا اور مصری حکومت نے نہر کو بند کر دیا۔ یہ رکاوٹ اقوام متحدہ کے ایک مشن نے اپریل ۱۹۵۷ء میں دور کر دی۔ ۱۳ر جولائی ۱۹۵۸ء کو کمپنی کے سابق حصہ داروں کے نمائندوں اور مصری حکومت میں معاوضہ کے متعلق معاہدہ ہو گیا۔ ۱۹۶۷ء میں مصر اور دوسرے عرب ملکوں کے خلاف اسرائیل کی جارحیت کے بعد سے نہر سویز بند رہی اور ۱۹۷۴ء میں دوبارہ کھل گئی۔ (فرہنگ سیاسیات، ص ۱۵-۴۱۴)

۱۸۴۷ء تا ۱۸۵۶ء

حالات پر ایک نظر:

لارڈ ڈلہوزی کے عہد حکومت (۱۸۴۸ء۔۱۸۵۶ء) میں اودھ کے سیاسی حالات نے وہ صورت اختیار کر لی تھی، جس سے کمپنی کی یہ خواہش کہ وہ اودھ پر قبضہ کر لے، پوری ہوتی دکھائی دے رہی تھی۔ اودھ کی سیاسی پوزیشن سے کمپنی بہت فائدہ اٹھا چکی تھی۔ اب یہ بات اس کے اپنے مفاد کے خلاف تھی کہ اودھ کی بادشاہت کو قائم رکھا جائے۔ اب کمپنی کو ہندوستان کی کسی بڑی طاقت سے خطرہ نہیں تھا۔ پنجابیوں کی شکست کے بعد اودھ کی سرحدی حیثیت کی انگریزوں کو ضرورت باقی نہیں تھی۔ اودھ کے نظم و نسق کو 'دوعملی' نے مدت سے تباہ کر رکھا تھا۔ لارڈ ڈلہوزی نے کمپنی ہی کی پیدا کی ہوئی برائیوں کی آڑ لے کر ۱۸۵۶ء میں اودھ کو ہندوستان کی انگریزی سلطنت میں شامل کر لیا۔

امجد علی کی موت کے بعد اس کا بیٹا واجد علی شاہ (۱۸۴۷ء۔۱۸۵۶ء) لکھنؤ کے تخت پر بیٹھا۔ واجد علی شاہ کی تعلیم و تربیت پر اس کے باپ نے بہت زیادہ توجہ کی تھی۔ واجد علی شاہ کی زندگی کا صرف وہی پہلو پیش کیا جاتا ہے جس میں وہ ایک عیش پسند انسان دکھائی دیتا ہے۔ یہ ٹھیک ہے کہ واجد علی اپنے ماحول میں پوری طرح سے جکڑا ہوا تھا لیکن اس کے باوجود اس نے اودھ کی حالت کو بہتر بنانا چاہا۔ لکھنؤ کا دربار کسی قسم کے اصلاحی کاموں کے لیے تیار نہیں ہو سکتا تھا۔ جب درباریوں نے بادشاہ کو نظم و نسق اور فوجی طاقت کو بہتر بنانے کی طرف جھکا ہوا پایا تو ان کے لیے ایک نوجوان بادشاہ کو عیش و عشرت کی راہ پر ڈال دینا کوئی مشکل کام نہیں تھا۔ چناں چہ واجد علی نے اپنے آپ کو عشرتوں کے سپرد کر دیا۔

واجد علی کے تخت پر بیٹھتے ہی امین الدولہ نے وزارت سے الگ ہونا چاہتا لیکن ریذیڈنٹ نے اسے اپنا عہدہ نہ چھوڑنے دیا۔ اودھ کی حالت خراب تر ہوتی چلی جا رہی تھی۔ امین الدولہ اور واجد علی کے تعلقات خراب ہونے میں بھی دیر نہ لگی۔ جولائی ۱۸۴۷ء میں واجد علی نے امین الدولہ کو ہٹا کر علی نقی خان کو اودھ کا وزیر اعظم مقرر کیا۔ اسی سال لارڈ ہارڈنگ نے لکھنؤ پہنچ کر واجد علی سے کہا کہ اگر دو سال کے اندر اندر ملکی نظم و نسق درست نہ ہوا تو کمپنی ایک ایسا اقدام کرے گی جس کا اثر لکھنؤ کی بادشاہت پر پڑے گا۔ گورنر جنرل نے لکھنؤ کے انگریز ریذیڈنٹ کو چند ہدایات بھی

کیں جن کا مقصد یہ تھا کہ اودھ کو کمپنی کا مقبوضہ بنانے کے لیے راستہ صاف کیا جائے۔اس کام کو لارڈ ڈلہوزی اور لکھنئو کے انگریز ریزیڈنٹ کرنل سلمین نے اودھ کے مختلف مقامات کا دورہ کرنے کے بعد اپنی طویل رپورٹ گورنر جنرل کو بھیجی۔ یہ رپورٹ جہاں اودھ کے معاشی اور سماجی حالت کی ترجمانی کرتی ہے، وہاں اس رپورٹ میں ایسے واقعات جمع کر دیے گئے ہیں جن کی بنا پر گورنر جنرل کو اودھ پر قبضہ کرنے کا موقع مل سکتا تھا۔ جولائی ۱۸۵۴ء میں جب کرنل سلمین چھٹی پر تھا تو جنرل آوٹ رم کو ریزیڈنٹ مقرر کیا گیا۔ نئے ریزیڈنٹ نے بھی ''کاغذات متعلقہ اودھ'' کے نام سے ایک رپورٹ تیار کی۔ اس رپورٹ کا مقصد بھی اودھ کی بدنظمی کے بارے میں شور مچانا تھا۔ چوں کہ واجد علی شاہ خوب جانتا تھا کہ کمپنی اودھ پر قبضہ کرنا چاہتی ہے، اس لیے اس نے اودھ کی فوج کو بہتر بنانے کی طرف توجہ کی۔ واجد علی شاہ گھنٹوں اپنی فوج کی پریڈ دیکھنے میں صرف کر دیتا۔ ایک دن علی نقی خان نے واجد علی شاہ سے کہا کہ بادشاہ کی یہ سرگرمیاں ریزیڈنٹ کو کھٹکتی ہیں۔ بادشاہ کو مجبور کر دیا گیا کہ وہ توپ تفنگ سے توجہ ہٹا کر شراب و شباب سے جی بہلائے۔

لارڈ ڈلہوزی نے کرنل سلمین اور جنرل آوٹ رم کی رپورٹوں کی آڑ لے کر ۱۸۵۶ء میں واجد علی شاہ کو معزول کر کے اودھ کو کمپنی کے مقبوضات میں شامل کر لیا گیا۔ کمپنی نے واجد علی شاہ کے لیے پندرہ لاکھ روپیہ سالانہ وظیفہ مقرر کیا۔ واجد علی شاہ نے چاہا کہ وہ حکومت برطانیہ کے سامنے اپنا معاملہ پیش کریں چناں چہ انگلستان جانے کے لیے واجد علی شاہ اپنے ساتھیوں سمیت کلکتہ روانہ ہوا۔

واجد علی شاہ ۱۳ر مئی ۱۸۵۶ء کو کلکتہ پہنچا۔ مولوی مسیح الدین خان کی کوشش سے واجد علی شاہ کو مٹیا برج میں مہاراجا بردوان کی ایک کوٹھی میں اتارا گیا۔ چند ہفتوں کے بعد واجد علی شاہ نے گورنر جنرل کو شکایت کا ایک خط لکھا جس کے جواب میں لارڈ کیننگ نے یہ کہا کہ لارڈ ڈلہوزی نے جو کچھ کیا تھا اس میں کسی تبدیلی کی گنجائش نہیں۔ ہاں اگر واجد علی شاہ کی مرضی ہو تو وہ اودھ کے معاملے کو ملکۂ انگلستان تک پہنچا سکتا ہے۔ چناں چہ واجد علی کی ماں، واجد علی کے بھائی سکندر حشمت اور واجد علی کے بیٹے مرزا محمد حامد کو اپنے ساتھ لے کر انگلستان روانہ ہوئی۔ مولوی مسیح الدین خان بھی ان کے ساتھ تھے۔ ابھی یہ وفد انگلستان ہی میں تھا کہ ۱۸۵۷ء کا ہنگامہ شروع ہو گیا۔ گورنر جنرل کے حکم سے واجد علی کو فورٹ ولیم میں نظر بند کر دیا گیا۔ (کمپنی کی حکومت، ص ۶۹-۳۶۸)

۱۸۵۰ء

حضرت شیخ الہند مولانا محمود حسنؒ:

حضرت مولانا محمود حسن صاحب قدس اللہ سرہ العزیز جن کو تحریک خلافت میں مسلمانوں کی طرف سے لقب ''شیخ الہند'' دیا گیا تھا قصبہ دیوبند ضلع سہارن پور کے باشندہ تھے۔ ان کے والد ماجد حضرت مولانا ذوالفقار علی صاحب رحمۃ اللہ علیہ ۱۸۵۰ء میں بہ عہدۂ ڈپٹی انسپکٹر مدارس بانس بریلی میں ملازم تھے، وہاں ہی ۱۸۵۰ء کے اخیر ۱۹۵۱ء کے ابتدا میں مولانا شیخ الہند رحمۃ اللہ علیہ کی پیدائش ہوئی۔ حضرت رحمۃ اللہ علیہ صغیر السن ہی تھے کہ ان کے والد ماجد کا تبادلہ شہر میرٹھ کو ہو گیا۔ جب کہ حضرت رحمۃ اللہ علیہ کی عمر چھ یا سات برس کی تھی۔ میرٹھ میں ہنگامہ انقلاب آزادی ۱۸۵۷ء واقع ہوا۔ ۵۷ء کے واقعات کو اگرچہ صغرسنی کی وجہ سے پوری طرح نہیں دیکھ سکے تھے مگر اجمالی طور سے یاد تھے۔ بڑے ہونے کے بعد اپنے والدین ماجدین اور اساتذہ اور گردو پیش سے وہ انسانیت سوز مظالم اور درندگی و بربریت کے معاملات جو انگریزوں نے ہندوستانیوں کے ساتھ کیے تھے، سنتے اور معلوم کرتے رہے، ذہن ثاقب، طبیعت غیور، حافظہ نہایت قوی اور جرأت بے مثل قدرت نے عطا فرمائی تھی، بناء بریں تاریخی اطلاعات اور ان کو کھوج و تلاش اور ان کی یاد مثل دیگر امور علمیہ سینۂ مبارک میں جاگزیں ہوتی گئی، پھر قدرت نے حضرت شمس الاسلام والمسلمین مولانا محمد قاسم صاحب نانوتوی اور حضرت شمس العلم والعلماء مولانا رشید احمد صاحب گنگوہی قدس اللہ سرہ العزیز کے درِ دولت تک پہنچا کر شرف شاگردی اور حاضر باشی بارگاہ عطا فرمایا۔ یہ ہر دو حضرات ۱۸۵۷ء میں شاملی، تھانہ بھون وغیرہ میں جہادِ حریت کے علمبردار رہے تھے اور حضرت قطب عالم مولانا الحاج امداد اللہ صاحب مہاجر مکی قدس اللہ سرہ العزیز کی سرپرستی میں بڑے بڑے کارنمایاں کر چکے تھے اور اگرچہ برطانوی درندگی ان دونوں حضرات کو بھی مثل دیگر مجاہدین حریت صفحہ ہستی سے مٹانا چاہتی تھی اور اگرچہ غدارانِ ملت نے ان کو بھی اپنی ناعاقبت اندیشی سے پھنسانے کے لیے ایڑی چوٹی کا زور لگایا تھا، مگر قدرت کے خفیہ ہاتھوں نے ان دونوں حضرات کی کھلی کھلی خوارق عادات کرامتوں سے حفاظت کی تھی۔ بہر حال حضرت شیخ الہند رحمۃ اللہ علیہ میں ان دونوں بزرگوں اور بالخصوص حضرت نانوتوی قدس اللہ اسرار ہما کی صحبت اور شاگردی اور خدمت کی وجہ سے وہ تمام حالات جن کی وجہ سے انقلاب ۱۸۷۵ء کی کوششیں ہندوستانیوں نے

کی تھیں اور وہ واقعات جو اس جنگ آزادی میں پیش آئے تھے۔ معلوم ہو کر محفوظ ہو گئے تھے، جن کی بناء پر وہ جذبۂ حریت وایثار اور اس کی آگ اور امور حکومت پر تنقیدانہ نظر پیدا ہو گئی تھی کہ جس کی نظیر بجز قرون اولیٰ عالم اسلام میں پائی جانی تقریباً ممتنع ہے۔ حضرت شیخ الہندؒ صرف تفسیر وحدیث فقہ واصول منطق اور فلسفہ حساب اور مساحت، ہیئت اور معقولات کے ہی بحرِ ذخار نہیں تھے بلکہ ان کو ادبیاتِ عربیہ وفارسیہ، اردو شعر وسخن اساتذۂ فن کے مقالات اور قصائد وغزلیات اور مثنویاں وغیرہ اس قدر یاد اور ازبر تھیں کہ سننے والا حیران ہو جاتا تھا اور تعجب کرنے لگتا تھا کہ ان کے حافظے میں کس قدر بے شمار علوم اور محفوظات کے خزانے بھرے ہوئے ہیں۔ اسی طرح حضرت رحمۃ اللہ علیہ کی نظر تاریخی معلومات اور سیاسی واقعات پر نہایت وسیع اور گہری تھی، جس پر اطلاع پانے کے بعد انسان ششدر ہو جاتا تھا کہ یہ بیشمار امور کس طرح ان کے ذخائر علمیہ میں آ گئے؟ نیز حضرت مولانا شیخ الہند رحمۃ اللہ علیہ تواریخ سلاطین ماضیہ خصوصاً شہنشاہان ہند اور ان کے واقعات وانتظامات پر نہایت زیادہ عبور رکھتے تھے۔ ہندوستان کی اقتصادی، معاشی، سیاسی، تجارتی، صنعتی، تعلیمی، انتظامی، جنگی، صحتی وغیرہ معلومات بھی اس قدر تھیں کہ بڑے سے بڑا ڈاکٹر اور اکانومک پروفیسر ان تک نہیں پہنچ سکتا تھا۔ اخبار بینی اور واقعات عالم پر اطلاع کا بہت شوق تھا۔ بہرحال ان کو انگریزی حکومت اور ہندوستان کے مندرجۂ ذیل واقعات نے مجبور کیا کہ اپنی جان کو ہتھیلی پر رکھ کر انگریزی استبداد اور مظالم کا مقابلہ کیا جائے اور اس کو جڑ سے اکھاڑ دینے کی پوری جدوجہد عمل میں لائی جائے اور کسی قسم کے خطرے کو بھی مرعوب یا متاثر کرنے کا موقع نہ دیا جائے۔ حضرتؒ نے واقعات ۵۷ء اور انگریزوں کے ہندوستانیوں پر بے شمار سنگین مظالم اور خلاف انسانیت بربریت کے مظاہرات خود دیکھے اور بہت قریب سے سنے تھے اس لیے ان کے قلب میں بہت زیادہ اثر اور جوش ان کے خلاف تھا۔ (نقش حیات، حصہ اول، صفحہ ۱۵۱۔۱۵۰)

۲۸ رجون ۱۸۵۳ء: سرچارلس ٹریویلین نامی ایک آئی۔سی۔ایس آفیسر نے دارالامرا میں بیان ردیتے ہوئے کہا:

> "گورنمنٹ کی درسگاہوں میں انجیل کا مضمون داخل نہیں ہے۔ بعض لوگ
> اس قاعدے پر اس لیے اعتراض کرتے ہیں کہ اس سے مذہب عیسوی
> کی صداقت کی ترقی کی مخالفت پائی جاتی ہے۔ مگر یہ رائے بالکل غلط ہے
> جب سے ۱۸۳۵ء کے ریزولیشن کے مطابق سرکاری اداروں کے متعلق

انگریزی کتب خانے قائم کیے گئے تو ان میں انجیل رکھی گئی اور میرا خیال ہے کہ انجیل کی شرح مصنفہ منٹ اور دیگر شروح بھی رکھی جاتی ہیں۔ جو کتابیں کالجوں میں پڑھائی جاتی ہیں، ان میں انجیل کے حوالے ہیں۔ جس کی وجہ سے طلبہ انجیل کو پڑھتے ہیں۔ استادوں کو اجازت ہے کہ وہ اپنے طلبہ سے انجیل کے مضامین پر گفتگو کریں۔ بعض مضامین ایسے پڑھائے جاتے ہیں جن میں مذہب عیسوی کے مضامین ہیں۔ اگر واقعی نتائج کو دیکھا جائے تو معلوم ہوگا کہ جن اچھے تعلیم یافتہ لوگوں نے مذہب عیسوی اختیار کیا ہے، ان کی تعداد ہندو کالج اور دوسرے گورنمنٹ کالجوں سے نکلی ہوئی اتنی ہی ہے جتنی کہ عیسائیوں کے کالجوں سے ہے۔''

(تاریخ تعلیم از سید محمود، بحوالہ ''مسلمانوں کا روشن مستقبل''، صفحہ ۱۵۲)

اسی بیان میں سرچارلس نے یہ بھی کہا:

''میرے خیال میں اب وقت آ گیا ہے کہ تمام اسکولوں کو جہاں عمدہ تعلیم دی جاتی ہے مالی امداد دی جائے۔ میرا یہ منشا نہیں کہ وہ وقت کبھی نہ آئے گا جب کہ سرکاری مدارس میں بھی مذہب عیسوی کی تعلیم براہ راست دی جائے گی۔ میرے نزدیک ہمارا اصل اصول یہ ہونا چاہیے کہ لوگوں کو وہ عمدہ تعلیم دی جائے، جس کے اصول کے لیے وہ رضامند ہوں۔ اس میں کوئی شبہ نہیں کہ کوئی تعلیم جو مذہب عیسوی پر مبنی نہ ہو، وہ ناقص ہے۔ نتیجہ یہ کہ جب ہندوستان کا بڑا حصہ تعلیم یافتہ ہو جائے گا تب ہمارا فرض ہوگا کہ مذہب عیسوی کی تعلیم جاری کریں، مگر ہمیں اس امر کی بہت احتیاط کرنی چاہیے کہ فوجوں میں ناراضی نہ پھیل جائے۔ کلکتہ چھوڑنے سے قبل میں نے تمام ان تعلیم یافتہ لوگوں کی فہرست بنوائی تھی جو عیسائی ہوئے۔ اس سے معلوم ہوا کہ ان لوگوں میں سے جو اعلیٰ چلن اور مضبوط طبیعت رکھتے تھے اور تربیت یافتہ تھے اور جن سے عیسائیت کو بہت مدد ملی زیادہ تعداد ان لوگوں کی تھی جنھوں نے ہندو کالج میں پڑھا تھا۔ میرے نزدیک عیسائی بنانے کے طریقے میں لوگ غلطی کرتے ہیں۔''

''میرا یقین ہے کہ جس طرح ہمارے بزرگ کل کے کل ایک ساتھ عیسائی ہوگئے تھے، اسی طرح یہاں بھی سب کے سب عیسائی ہوجائیں گے۔ ملک میں مذہب عیسوی کی تعلیم بلاواسطہ پادریوں کے ذریعہ اور بالواسطہ کتابوں، اخباروں اور یورپینوں سے بات چیت وغیرہ کے ذریعے نفوذ کرے گی۔ حتیٰ کہ عیسوی علوم تمام سوسائٹی میں نفوذ کر جائیں گے، تب ہزاروں کی تعداد عیسائی ہوا کریں گے۔'' (ایضاً، صفحہ ۱۵۴)

۴ر فروری ۱۸۵۶ء: ہندوستان میں ہمیشہ سے متبنیٰ لڑکا مثل اصلی بیٹے کے سمجھا جاتا تھا۔ مگر کمپنی نے رئیسوں کو اس حق سے محروم کر کے کوئی پندرہ ریاستیں اپنے قبضے میں کر لیں، جن سے عام ناراضی پھیل گئی۔ اس ناراضی کی تکمیل صوبۂ اودھ کے الحاق نے جو حد درجہ وفادار رہا تھا، پوری طرح کردی۔ آدھے سے زیادہ ملک جس کی مالگزاری ایک کروڑ تیس لاکھ تھی۔ لارڈ ویلزلی پہلے ہی فوج کے خرچہ کے لیے لے چکے تھے اور نواب (واجد علی شاہ) کے پاس صرف ایک کروڑ کی آمدنی کا علاقہ رہ گیا تھا اس پر بھی اودھ کی دولت پر کمپنی بہادر کی للچائی ہوئی نظریں پڑتی رہتی تھیں اور کمپنی نواب سے بڑی بڑی رقمیں قرض لیتی رہتی تھی۔ ان میں سے ایک رقم ایک کروڑ روپیہ کی تھی۔ دوسری رقم جو غازی الدین حیدر کے زمانے میں لے گئی پچاس لاکھ کی تھی۔ ان رقوم پر پانچ فی صدی سود مقرر کیا گیا تھا جو اس شرح کا آدھا بھی نہ تھا جس پر انگریزوں نے کرناٹک کے نواب کو قرضے دیے تھے۔ پھر اس سود میں سے نواب اودھ کو کچھ نہ دیا جاتا تھا بلکہ نواب کے وابستگانِ دولت کے وثیقوں کے لیے وقف تھا اصل رقم کبھی ادا ہونے کی صورت ہی نہ تھی۔ بلکہ آخر الذکر قرضہ ایک معاہدے کے ذریعے دوامی قرار دے دیا گیا تھا۔ (تاریخ اودھ (جلد سوم) از مولوی نجم الغنی، صفحہ ۱۳۵)

ان حالات میں آئے دن فسادات رہتے تھے اور ملک ویران ہوتا جاتا تھا۔ بالآخر ۴ر فروری ۱۸۵۶ء کو صوبۂ اودھ کے الحاق کا حکم نواب واجد علی شاہ کو سنایا گیا۔ جس میں ان کی وفاداری تسلیم کی گئی اور صرف بدنظمی کے الزام میں انھیں معزول کیا گیا۔ درآں حالے کہ بدنظمی نتیجہ تھی خود کمپنی کے طرز عمل کا! حقیقت یہ ہے کہ جب واجد علی شاہ نے اپنی فوج میں کچھ اضافہ کر کے اس کی تنظیم شروع کی اور چار بجے صبح سے اُٹھ کر فوج کی قواعد کرانے لگے تو کمپنی کے لوگوں نے ان سے کہا کہ موجودہ فوج کافی ہے اور اگر اور فوج چاہیے تو اس کے اخراجات کے لیے کمپنی کو مزید علاقہ دے دیا

جائے ان مخالفتوں سے پریشان ہوکر مظلوم واجد علی شاہ نے اپنا غم غلط کرنے کے لیے ناچ رنگ کا مشغلہ اختیار کرلیا اور امورِ سلطنت سے دیدے دہ ودانستہ غافل ہو گئے۔ بہر حال جب شاہ اودھ موصوف کو ان کی معزولی کا حکم سنایا گیا تو انھوں نے سرِ تسلیم خم کر کے وضعداری کی تکمیل کردی اور فرمایا کہ میں تو خادم ہوں میں کوئی سرکشی نہ کروں گا۔ البتہ حکومت انگلستان سے چارہ جوئی کروں گا۔ اس کے بعد انھوں نے افسروں اور فوج کو اپنی ملازمت سے علاحدہ کر کے انھیں ہدایت کی کہ وہ حکومت برطانیہ کی اطاعت اور عزت کریں۔ مگر اطاعت نتیجہ ہوتا ہے، انصاف اور مراعات اور وعدوں کے ایفا کا جن کی حکام گورنمنٹ اپنی مسلسل کامیابیوں کے زعم میں ضرورت نہ سمجھتے تھے۔ (مسلمانوں کا روشن مستقبل، صفحہ ۸۴۔۸۲)

اودھ پر قبضہ:

۷ر فروری ۱۸۵۶ء: ۳۰ر جنوری ۱۸۵۶ء کو جنرل آؤٹ رم نے شاہِ اودھ کے وزیر اعظم کو اطلاع دی کہ کمپنی اودھ پر قبضہ کرنا چاہتی ہے۔ شاہ اودھ سے یہ بھی کہا گیا تھا کہ وہ ایک معاہدے پر دستخط کردے جس میں یہ مرقوم ہو کہ شاہ اودھ اپنی مرضی سے اودھ کے تخت کو چھوڑ رہا ہے۔ شاہ اودھ نے اسے ماننے سے انکار کردیا۔ شاہ اودھ کو مزید سوچنے کے لیے تین دن کی مہلت دی گئی۔ تین دن کے بعد بھی شاہ اودھ کا انکار قائم رہا۔ ۷ر فروری ۱۸۵۶ء کو میجر جنرل آؤٹ رم نے اعلان کردیا کہ ''آج سے اودھ پر کمپنی کا قبضہ ہے۔'' اس اعلان کے بعد اس نے کلکتہ کی سپریم کونسل کی ہدایات کے مطابق اودھ کے نظم ونسق کی طرف توجہ کی۔ حکومت کے کئی ایک شعبوں کے افسروں اور کارکنوں نے کمپنی کی ملازمت کرنے سے انکار کردیا۔ شاہ اودھ کی منتشر شدہ فوج کے سپاہیوں نے نئی فوج میں بھرتی ہونے سے گریز کیا۔ شاہی محلوں، پارکوں، باغوں اور خزانوں پر قبضہ کرلیا گیا۔ شاہ میوزیم اور لائبریری (جس میں دو لاکھ کتابیں تھیں) کو بھی ضبط کرلیا گیا۔ شاہ اودھ کے تازی، ایرانی اور انگریزی گھوڑوں کو نیلام کردیا گیا۔ بیگمات اودھ سے بھی ناروا سلوک کیا گیا۔ (کمپنی کی حکومت)

فروری ۱۸۵۶ء: لارڈ ڈلہوزی کے بعد برطانیہ کی وزارت نے لارڈ کیننگ کو ہندوستان کا گورنر جنرل نامزد کیا۔...... وہ فروری ۱۸۵۶ء میں کلکتہ پہنچا۔ (کمپنی کی حکومت، ص ۴۰۷)

۲۳ر اگست ۱۸۵۶ء: جب بیگمات کو محل سے نکالا گیا تو اس وقت عام خوش خلقی کے اصولوں کو بھی نظر انداز کردیا گیا۔ واجد علی کو ایک لاکھ بیس ہزار روپیہ سالانہ کی پنشن دے کر کلکتہ میں جلا وطن

کردیا گیا۔ لارڈ ڈلہوزی نے بغیر جنگ کے اودھ پر قبضہ کرلیا لیکن اس قبضہ کو برقرار رکھنے کے لیے کمپنی کو ایک سال بعد اودھ کے کونے کونے میں لڑنا پڑا۔ (کمپنی کی حکومت)

۱۸۵۷ء

آغاز:

اس ہنگامہ کی ابتدا اس طرح ہوئی کہ کلکتہ میں فوج کے لیے جو کارتوس بنائے گئے ان میں بقول بعض افسران فوج ''ٹھیکہ دار نے گائے کی چربی استعمال کی تھی اور غالباً سور کی چربی استعمال نہ کی تھی۔''

جنوری ۱۸۵۷ء میں کلکتہ کے فوجی کارخانے کے ایک چھوٹی ذات کے آدمی نے ایک برہمن سپاہی سے پانی کا لوٹا مانگا۔ سپاہی کے انکار کرنے پر اس نے طعنہ دیا کہ اس وقت تم لوگوں کا دھرم کہاں رہ جائے گا جب تمھیں سور اور گائے کی چربی کے کارتوس استعمال کرنا پڑیں گے۔ اس خبر سے کلکتہ کی فوج میں اشتعال ہوا تو میجر کوانا نے اسے دبا دیا۔ البتہ یہ خبر پھیل کر بارک پور میں پہنچی تو وہاں کی فوج نے افسروں کی عدول حکمی کی، جس پر وہاں کی دو رجمنٹیں نمبری ۱۹، اور ۳۴ ماہ اپریل ختم ہونے سے قبل توڑ دی گئیں اور سپاہیوں کو برخاست کردیا گیا۔ اسی قسم کا واقعہ مارچ میں انبالہ میں ہوا مگر تب بھی فوجی افسروں نے مرض کا صحیح علاج نہ کیا اور بجائے ان کارتوسوں کا استعمال بند کردینے کے اپنی طاقت کے گھمنڈ میں سپاہیوں کو برخاست کرنے کا طریقہ اختیار کرلیا۔ چناں چہ لکھنو میں نئی مقامی رجمنٹ نے نئے کارتوس استعمال کرنے سے انکار کیا تو اس رجمنٹ کو توڑ دیا اور اپنے نزدیک سمجھ لیا کہ معاملہ ختم ہوگیا۔ اسی طرح میرٹھ میں ۲۲/اپریل کو جب یہی واقعہ پیش آیا تو پچاسی سپاہیوں کا جن میں دیسی افسر بھی شامل تھے کورٹ مارشل کرکے بجائے برخاست کرنے کے ایک قدم اور آگے بڑھا کر انھیں دس دس سال کی سزائے قید دے دی۔ مگر ہر چیز کی ایک حد ہوتی ہے۔ چناں چہ ۹/مئی ۱۸۵۷ء کو جب کہ یہ حکم پریڈ پر سنایا گیا اور سپاہیوں کو حوالات میں بھیج دیا گیا تو شہر میں اس کا بڑا چرچا ہوا اور بازار میں لوگوں نے سپاہیوں پر فقرے کسنے شروع کیے۔ بالآخر ۱۰/مئی کو ہندوستانی فوج نے چند انگریز افسروں کو مار کر حوالات توڑ دی اور قیدی سپاہیوں کو رہا کرکے سیدھے دہلی چل دیئے جو میرٹھ سے چالیس میل ہے۔ دہلی پہنچنے پر وہاں کی فوج ان سپاہیوں کے ساتھ ہوگئی اور دوسرے دن یعنی ۱۱/مئی کو یہ لوگ زبردستی قلعے میں گھس گئے اور بہادر

شاہ کو سردار بننے پر مجبور کیا۔ اسی قسم کی کوشش بارک پور کے سپاہیوں نے نواب مرشد آباد کو اپنا سردار بنانے کے لیے کی تھی، مگر وہ راضی نہ ہوئے۔ دہلی میں سپاہیوں کے زور اور عام ناراضی کی وجہ سے رائے عامہ کا غلبہ تھا، اس لیے بہادر شاہ کے لیے کوئی چارہ کار نہ رہا تھا۔ اس لیے وہ بلوائیوں کے ساتھ ہو گئے۔ دہلی پر بلوائیوں کا قبضہ ہونا تھا کہ یہ خبر تمام ملک میں پھیل گئی اور ہر طرف ہنگامے ہونے لگے فیروز پور علاقہ پنجاب میں سپاہیوں نے بغاوت کی مگر فی الجملہ پنجاب محفوظ رہا، اودھ، روہیل کھنڈ اور دوآبہ انگریزوں کے ہاتھوں سے نکل گئے۔ یہی حالت بندیل کھنڈ، باندہ، جھانسی اور کالپی کی ہوئی۔ نیز چھوٹا ناگ پور اور بہار میں بدامنی ہو گئی۔'' (مسلمانوں کا روشن مستقبل، صفحہ ۸۸،۸۷)

۲۲ر جنوری ۱۸۵۷ء و حالات مابعد:

دل آزار تکلیف دہ اور ہندوستانیوں کے لیے توہین آمیز واقعات کا سلسلہ جو عرصہ سے چل رہا تھا، وہ دن بدن زیادہ ہوتا رہا۔ حکومت کو بار بار آگاہ کیا لیکن اس کے سول اور ملٹری حکام نے پتوں کی کھڑکھڑاہٹ پر کان دھرنے سے انکار کر دیا۔ انھیں اس وقت ہوش آیا جب طوفان نے درختوں کو اکھاڑنا شروع کر دیا۔

اس بے چینی نے سب سے پہلے ۲۲ر جنوری ۱۸۵۷ء کو ڈم ڈم میں عملی شکل اختیار کی۔

ڈم ڈم میں مقیم دیسی سپاہیوں نے اپنے انگریز افسر سے شکایت کی کہ ان فیلڈ رائفلوں کے لیے جو کارتوس بنائے جاتے ہیں، ان میں گائے اور سور کی چربی ہے۔ اس افسر نے حکومت بند کو اس بات سے آگاہ کر دیا۔ حکومت نے بعض چھاؤنیوں میں دیسی سپاہیوں کو یقین دلا دیا کہ کارتوسوں میں ممنوعات استعمال نہیں کی جا رہی ہیں۔ لیکن یہ افواہ بارود کے ڈھیر میں چنگاری کا کام کر چکی تھی۔ بارک پور کے فوجیوں نے بہرام پور کی انیسویں رجمنٹ میں بے چینی کا بیج بو دیا۔ ۱۹ر فروری کی رات کو اس رجمنٹ نے مظاہرہ شروع کر دیا۔ کرنل مچل نے فوجیوں سے اس مظاہرہ کا سبب دریافت کیا۔

فوجیوں کا جواب یہ تھا: ''سرکار ہمارا دین بگاڑ رہی ہے۔''

کرنل نے فوجیوں کے سامنے ایک تقریر کی اور یقین کر لیا کہ فوج مطمئن ہو گئی۔ اطمینان کہاں؟ جب لارڈ کیننگ کو بہرام پور کے واقعے کا پتا چلا تو اس نے ایک دوسری رجمنٹ کو بارک

پور پہنچنے کا حکم دیا۔ نیز بہرام پور کی انیسویں رجمنٹ کو بھی حکم ملا کہ وہ بارک پور پہنچ جائے!

یہ سلسلہ چل رہا تھا کہ بارک پور کی چونتیسویں رجمنٹ کے ایک فوجی نے پریڈ کے وقت دین دین کا نعرہ لگاتے ہوئے اپنے ساتھیوں کو فرنگیوں کے خلاف لڑنے کے لیے اکسایا۔ سارجنٹ میجر موقع پر پہنچ گیا۔ اس فوجی نے اس پر گولی چلادی۔ وہ بال بال بچ گیا۔ بغاوت کے آثار پا کر جنرل ہرسی موقع پر پہنچ گیا۔ حالات پر قابو پالیا گیا۔

منگل پانڈے:

۱۶/اپریل ۱۸۵۷ء: یہ ''دین دین'' کا نعرہ لگانے والا ایک برہمن تھا۔ ''منگل پانڈے'' نام۔ اس کا واقعہ یہ تھا کہ ایک خلاصی نے جو نیچ ذات کا تھا اس سے کہا کہ اپنے لوٹے سے مجھے پانی پلادے! منگل پانڈے نے جواب دیا۔ تو کس ذات کا ہے۔ خلاصی نے طنزاً کہا۔ ذات کیا پوچھتے ہو۔ اب سب ذات پات رکھی رہ جائے گی۔ وہ کارتوس آگئے ہیں۔ جن میں سور اور گائے کی چربی لگی ہے، ان کو دانت سے کاٹنا پڑے گا۔

بہرحال اس سے اگلے روز انیسویں رجمنٹ بھی بارک پور پہنچ گئی تھی۔ اسی شام کو انگریزی سپاہی بھی بارک پور آگئے تھے۔ اگلے دن جرنیل نے گورنر جنرل کا ایک فرمان سنایا جس میں انیسویں رجمنٹ کو توڑ دینے کا حکم تھا۔ ۶/اپریل کو منگل پانڈے کا مقدمہ شروع ہوا۔ ۷/کو پھانسی کی سزا تجویز کی گئی اور ۸/کو اسے پھانسی پر لٹکا دیا گیا۔ ۲۱/اپریل کو اس کے ایک ساتھی ایشوری پانڈے کو پھانسی دے دی گئی۔ اس کا جرم یہ تھا کہ منگل پانڈے جب فائر کی تیاری کر رہا تھا اور ایشوری سے کہا گیا تھا کہ منگل پانڈے کو گرفتار کرلے تو ایشوری نے تعمیل میں لاپرواہی برتی تھی۔ جب دوبارہ اس کو حکم دیا گیا تو کہہ دیا۔ منگل پانڈے تو پاگل ہو گیا ہے۔

ایشوری کا جواب یہ تھا کہ میں نے سب سے کہا تھا۔ منگل پانڈے سے بچو اور درخت کی اوٹ میں کھڑے ہو جاؤ، منگل پانڈے پاگل ہو رہا ہے۔

۲۳/اپریل: چند روز بعد چونتیسویں رجمنٹ کی سات کمپنیوں سے ہتھیار چھین کر انھیں الگ کر دیا گیا۔ حکومت مطمئن تھی کہ بغاوت ختم ہو چکی ہے۔ بغاوت تو ابھی ہونے والی ہے۔

بارک پور کی خبریں کسی قدر مبالغہ کے ساتھ شمالی ہند تک جا پہنچیں۔ اپریل ۱۸۵۷ء کے آخری ہفتہ میں میرٹھ میں ہندوستانی سپاہیوں نے مختلف صورتوں میں بے چینی کا اظہار کیا تھا۔ چوں کہ میرٹھ میں انگریزی سپاہیوں کی ایک پوری رجمنٹ موجود تھی اور یہاں کا توپ خانہ

پورے ملک میں سب سے بہتر توپ خانہ تھا۔ اس لیے یہاں کے فوجی حکام مطمئن تھے۔

غالباً اسی زعم میں یہاں پر ۲۳ر اپریل کو پریڈ کا حکم نافذ کیا گیا۔ ۲۴ر کو دیسی فوج نے پریڈ کی۔ پریڈ کے بعد حوالدار میجر اور اس کے اردلی نے ان کارتوسوں کو چلایا جن کے متعلق خیال تھا کہ ان کے چلاتے وقت دانتوں سے کاٹنا پڑتا ہے۔ پریڈ ختم ہوئی۔ دیسی سپاہی اپنی بارکوں میں چلے گئے۔ اسی رات اردلی کے خیمہ کو آگ لگادی گئی۔ اگلے دن دیسی سپاہیوں نے کارتوس لینے سے انکار کر دیا۔

۲۵ر اپریل: کوڈپٹی جج کے سامنے اس معاملے کی پڑتال کی گئی۔ سپاہیوں نے کارتوسوں کو ناپاک بتایا۔ انھیں سمجھایا گیا کہ کارتوسوں میں ممنوعات استعمال نہیں کی گئیں۔ سپاہیوں نے وعدہ کرلیا کہ وہ ان کارتوسوں کو استعمال کریں گے۔

سپاہیوں کے سامنے بڑی پریشانی یہ تھی کہ کارتوسوں کے خلاف پروپیگنڈا اتنا زیادہ کردیا گیا تھا کہ اگر فوج کے سپاہی مطمئن ہو کر کارتوسوں کو لے بھی لیتے تو فوج سے باہر ان کی بات ماننے والا کوئی نہیں تھا۔ ان کی ذات برادری کے آدمی بھی ان سے نفرت کرنے لگتے تھے۔

فوجی اس تصور سے لرز جاتے تھے۔ وہ زار زار روتے تھے کہ اگر ہم کارتوس لے لیتے ہیں تو ذات برادری سے خارج ہوتے ہیں۔ اپنے عزیزوں سے چھوٹتے ہیں۔ جینا برباد اور موت کے ساتھ ایمان اور دھرم کا خطرہ، اور اگر نہیں لیتے تو سرکار کے باغی ٹھہرتے ہیں۔

ادھر ہر سفید چمڑی والا اقتدار کے نشے میں ایسا مدہوش تھا کہ غیر مشروط وفاداری کے سوا کسی بات کے ماننے کے لیے تیار نہ تھا۔ وہ دیکھ رہا تھا کہ دلوں کی بے چینی زبانوں تک، اور زبانوں سے بڑھ کر ہاتھ پاؤں تک پہنچ چکی ہے۔ چھاؤنیوں کی بیرکوں میں آگ لگنے کا سلسلہ دن بدن بڑھ رہا تھا۔ آگ لگانے والوں کا پتا کیسے چلتا، جب پتا چلانے والے خود مجرم تھے اور کوئی گواہی دینے کو تیار نہ ہوتا تھا۔ لیکن اس کے باوجود فتوحات کے غرور نے گردنوں کو اتنا سخت کردیا تھا کہ وہ کسی طرح خم ہونے کو تیار نہ تھیں۔

۶ر مئی: مختصر یہ کہ ۶ر مئی کو میرٹھ چھاؤنی میں پریڈ کرائی گئی۔ ہر ایک فوج سے پندرہ پندرہ آدمی منتخب کیے گئے۔ کل نوے ۹۰ آدمی پریڈ میں موجود تھے۔ کارتوسوں کی تقسیم کا حکم دیا گیا۔ پانچ کے سوا سب نے انکار کردیا۔ جن میں انچاس ۴۹ مسلمان تھے ۳۶ غیر مسلم۔

۹ر مئی فیصلہ سنانے کا دن تھا۔ پوری فوج پریڈ پر حاضر تھی۔ سب کے سامنے بہت بلند آواز

سے سزا کا حکم سنایا گیا۔ دس دس سال قید با مشقت۔ پھر فوراً ہی فوجی نشان چھین لیے گئے۔ ان کی وردیاں پشت کی طرف سے پھاڑ دی گئیں۔ پھر لوہار آگے بڑھے۔ چند لمحوں میں یہ بے داغ، وفادار سپاہی بیڑیوں اور ہتھکڑیوں میں جکڑے ہوئے تھے۔

یہ نظارہ بہت ہی حسرت ناک اور اشتعال انگیز تھا۔ بیڑیوں میں جکڑے ہوئے سپاہیوں نے اپنے ساتھیوں کی طرف دیکھا، وہ ساتھی جوان کو عزت کی نظر سے دیکھتے تھے کیوں کہ یہ اپنی اپنی لین میں با عزت تھے، فوج میں نام آور رہے تھے۔ یاس انگیز نگاہوں نے اشاروں ہی اشاروں میں بغاوت کا سبق پڑھا دیا۔ مگر گرداگرد تیار توپ خانے کی موجودگی میں سرکشی کا تصور بھی خودکشی تھا۔

اس کے بعد ان پچاسی ۸۵ جوانوں کو پا پیادہ شہر کے جیل خانہ میں پہنچا دیا گیا۔ جدھر سے یہ سپاہی گزرتے تھے، ان کے مایوس دلوں کو سوزش ہندوستانی غیرت وحمیت کی ٹوٹی جھونپڑیوں میں چنگاریاں چھوڑی جاتی تھی۔ عورتیں بھی بے تاب ہو کر چیختی تھیں۔ اگر مردوں میں ان کے چھڑانے کی ہمت نہیں تو چوڑیوں اور ہتھیاروں کا تبادلہ کر لیں چوڑیاں وہ پہن لیں اور تلوار ہمارے ہاتھ میں دیں۔ ہم دکھا دیں گے غیرت کس چیز کا نام ہے اور حمایت کس طرح کی جاتی ہے۔

کیا آج کے آفتاب کے بعد بھی آفتاب طلوع ہوگا۔ آفتاب ضرور طلوع ہوگا، مگر اب اس کی چھلکتی ہوئی دھوپ اور نوکیلی کرنیں انگریزی اقتدار کی جڑیں اکھاڑنے کے لیے کام میں لائی جائیں گی۔ یہ تجویز دکھی دلوں کی پوری تائید کے ساتھ بلا کسی کانفرنس کے پاس ہوگئی۔

۱۰ ر مئی: ۱۰ ر مئی اتوار کا دن، صبح کا سہانا وقت ختم ہوا۔ جیسے جیسے درجۂ حرارت بڑھنے لگا، جذبات کے تنور دہکنے لگے۔ کہا جاتا ہے ۳۱ ر مئی بغاوت کے لیے متعین تھی۔ مگر جس کو شام کرنی مشکل تھی وہ ۳۱ ر مئی کا انتظار کہاں تک کرتا؟

آفتاب دن بھر کی بکھری ہوئی کرنوں کو ابھی سمیٹنے نہیں پایا تھا۔ گرجا میں شام کا گھنٹہ بجنا شروع ہی ہوا تھا کہ بغاوت کا آتش فشاں انگارے اگلنے لگا۔

ایک دستے نے بیرکوں کو آگ لگائی، دوسرا جیل خانے کی طرف دوڑا۔ کل جن کی مدد نہ کر سکے تھے، آج ان کی بیڑیاں کاٹ ڈالیں۔ جیل خانے کے جنگلے توڑ کر آٹھ سو اخلاقی قیدیوں کو بھی رہائی کا فیصلہ عملاً سنایا گیا۔

دہلی چلو:

بغاوت کر دی، بارکیں پھونک دیں، قیدی چھڑا لیے، جو انگریز سامنے آیا، اسے گولی کا نشانہ

بنایا۔ اب کیا کرنا ہے؟ یہاں انگریزی فوج موجود ہے۔ اس کے پاس بہترین توپ خانہ ہے، وہ آناً فاناً سب کو توپ دم کر سکتے ہیں۔ اب کیا کیا جائے اور کس طرح کیا جائے؟ جوش اور وحشت سے لبریز دماغوں کا یہ سوال تھا!

جواب ایک تھا، دہلی چلو، اور اتنا تیز چلو کہ انگریزوں کی تیاری سے پہلے ایک منزل طے کر لو، اور صبح کو جمنا کے پانی سے وضو کرو اور اشنان کر لو۔ چلتے چلتے یہ باتیں طے ہو گئیں۔

دہلی میں انقلابی فوج کی آمد: باغی سپاہی جو دن چھپنے کے بعد میرٹھ سے چلے تھے، صبح سویرے دہلی پہنچ گئے۔ کہیں آرام کرنا اور سانس لینا تو درکنار، کھانے پینے سے بھی بے نیاز۔

مئی کا مہینہ، چاند کی سولھویں رات، دن گرم، رات خوشگوار، جوش جنوں نے قدموں کی رفتار بڑھا دی۔ یا زمین کی طنابیں کھینچ دیں کہ نو گھنٹے میں پاپیادہ چوالیس میل طے کر لیے۔

غلطی اور غفلت:

مثل مشہور ہے "چوں قضا آید طبیب ابلہ شود۔" قضا اور تقدیر کو کوئی مانے یا نہ مانے، لیکن تاریخ کا یہ کس قدر عجیب و غریب سانحہ ہے کہ میرٹھ میں انگریزی سپاہیوں کی پوری رجمنٹ اور پورے ہندوستان کا سب سے بہتر توپ خانہ موجود تھا جو دنیا کے بہترین توپ خانوں میں شمار ہوتا تھا۔ ادھر دہلی میں فوج کی ایسی بڑی جمعیت جو باغیوں پر دہلی کے دروازے بند کر سکتی تھی۔ حاضر تھی لیکن میرٹھ چھاؤنی کے افسران کے متعلق تو کہا جاتا ہے کہ وہ حیران اور ایسے بدحواس ہو گئے کہ یہ بھی نہ معلوم کر سکے کہ انقلابی فوج کس طرف گئی۔

اور جب حواس ٹھکانے ہوئے تو بر سبیل احتیاط یا کسی یقین کی بنا پر دہلی تار دیا۔ تار فوراً پہنچ گیا مگر سائمن فریزر (ریذیڈنٹ و کمشنر دہلی) جن کے نام تار تھا، نیند یا نشے میں ایسے بے خود تھے کہ تار کو بغیر پڑھے جیب میں رکھ لیا اور سو گئے۔

۹ر مئی ۱۸۵۸ء: یہ حادثہ ۹ر مئی ۱۸۵۷ء کو ہوا۔ ایک انگریز مورخ کے الفاظ کو ایڈورڈ ٹامسن اپنی کتاب "تصویر کا دوسرا رخ" میں پیش کرتا ہے:

"بندوقوں اور سنگینوں کے پہرے میں ۸۵ سپاہیوں کو فوجی لباس میں فوجی عدالت میں پیش کیا گیا۔ سزا کے احکام کو اونچی آواز میں سنایا گیا۔ ان احکام کا مقصد ان سپاہیوں کو مجرموں کو فہرست میں داخل کرنا تھا۔ ان سپاہیوں سے فوجی نشان چھین لیے گئے۔ ان کی وردیوں کو پشت کی طرف سے پھاڑ دیا گیا۔ لوہار آگے بڑھے، چند لمحوں میں یہ سپاہی بیڑیوں اور ہتھکڑیوں میں نظر

آئے ۔ یہ نظارہ درد ناک اور ذلت آفرین تھا جس سے دوسرے سپاہی بہت زیادہ متاثر ہوئے...... بیڑیوں میں جکڑے ہوئے سپاہیوں نے اپنے ساتھیوں کی طرف دیکھا اور اس ذلت کو خاموشی سے برداشت کرنے پر انھیں اشاروں ہی اشاروں میں شرمندہ کیا۔ اس وقت ہر سپاہی نے نفرت اور رنج کے جذبات کو محسوس کیا لیکن بھری ہوئی توپوں اور بندوقوں کی موجودگی میں حملہ کرنے کا خیال پیدا نہیں ہو سکتا تھا۔''

۱۰ر مئی ۱۸۵۷ء: جب دیسی سپاہی اپنی بارکوں میں لوٹے تو جوش اور نفرت کا ان پر غلبہ ہو چکا تھا۔ ان سپاہیوں نے بغاوت کا ارادہ کر لیا۔ اگلے دن (۱۰ر مئی ۱۸۵۷ء) دیسی سپاہیوں نے اپنی بارکوں میں آگ لگا کر بغاوت کا اعلان کر دیا۔ کرنل فینی باغی سپاہیوں کو ان کے فرائض کا احساس دلانے کے لیے آگے بڑھا۔ ایک سنسناتی ہوئی گولی نے کرنل کو ختم کر دیا۔ کرنل فینی پہلا انگریز ہے جو باغی سپاہیوں کے ہاتھوں مارا گیا۔ دوسرے فوجی افسر اس بغاوت کو فرو کرنے کے لیے آگے بڑھے۔ انھیں بھی مار دیا گیا۔ باغیوں نے ان انگریز عورتوں اور بچوں کو بھی قتل کر دیا جو گرجا سے واپس آرہے تھے۔ باغی سپاہیوں کا ایک حصہ چھاؤنی کو آگ لگانے میں مصروف ہو گیا۔ دوسرا حصہ میرٹھ جیل میں جا پہنچا۔ جیل کے دروازے توڑ دیے گئے۔ ۸۵ سواروں کو جیل سے نکالا گیا۔ ان سواروں کے علاوہ بارہ سو قیدی بھی باغیوں میں شامل ہو کر میرٹھ شہر سے چھاؤنی کی طرف بڑھے۔ چھاؤنی میں پہنچ کر انھوں نے کئی انگریزوں کو قتل کیا۔ لوٹ مچائی اور دلی کی طرف چل دیے۔ میرٹھ سے دلی جانے والی سڑک صاف تھی۔ چاندنی میں باغی سپاہیوں کی یہ فوج جمنا کی طرف بڑھی۔ انگریز سپاہیوں نے ان کا تعاقب نہ کیا۔ اگلے دن ان باغی سپاہیوں کو جو زخمی ہونے کے سبب دلی نہیں جا سکتے تھے گرفتار کیا گیا۔ انھیں گولی مار دی گئی!......

۱۱ر مئی ۱۸۵۷ء: چودہ گھنٹوں کے بعد باغی سپاہی میرٹھ سے دلی پہنچ گئے۔ دلی نے باغیوں پر اپنے دروازے کھول دیے۔......

۱۱ر مئی ۱۸۵۷ء کی صبح کو باغی سپاہیوں نے دریا کو دیکھتے ہی ''جمنا مائی کی جے'' کا نعرہ بلند کیا۔ راج گھاٹ کا دروازہ ان پر کھل گیا۔ باغی شہر میں داخل ہو گئے۔ دلی میں مقیم انگریزی فوج کے ہندوستانی سپاہیوں نے جب باغیوں کے آنے کی خبر سنی تو ان میں سے کئی ایک پلٹنوں نے اپنے انگریز افسروں کو قتل کر دیا۔ باغی سپاہیوں نے لال قلعہ کا رخ کیا۔ قلعے میں داخل ہو کر انھوں نے انگریز افسروں کو قتل کیا اور بہادر شاہ کی بادشاہت کا اعلان کر دیا۔ بہادر شاہ نہ بادشاہت کی

صلاحیت رکھتا اور نہ باغیوں کی مخالفت کرنے کی قوت رکھتا تھا۔ روایت ہے کہ جب بہادر شاہ نے اس نئی بادشاہت کو قبول کرنے میں پس وپیش کی تو باغیوں نے بے پرواہو کر کہا تھا: ''اگر یہ بڈھا نہیں مانتا تو نہ مانے، ہم جس کے سر پر جوتا رکھ دیں گے وہی بادشاہ ہوگا۔''

دلی اور میرٹھ کے باغی سپاہی شہر میں داخل ہوئے۔ بینکوں اور دکانوں کو لوٹ لیا گیا۔ انگریزوں کو قتل کیا گیا۔ بچوں اور عورتوں تک کو نہ چھوڑا گیا۔ چند انگریزوں نے بھاگ کر جان بچائی۔ میجر ایبٹ دلی سے میرٹھ بھاگ گیا۔ کشمیری دروازے کے قریب انگریزوں کا ایک بہت بڑا میگزین تھا۔ باغی سپاہی اس میگزین پر قبضہ کرنے کے لیے بڑھے۔ میگزین کے انگریز افسر نے اسے آگ دی۔ اتنا بڑا دھماکا اٹھا کہ کشمیری دروازے کی دیسی فوج جو اس وقت اپنے انگریز افسروں کے ساتھ تھی باغیوں میں جاملی۔ انگریزوں کے علاوہ دیسی عیسائی بھی باغیوں کے ہاتھوں قتل ہوئے۔ سیٹھ بدری چند کو صرف اس بنا پر عیسائی سمجھ کر قتل کر دیا گیا کہ وہ کوٹ پتلون پہنے ہوئے تھا۔ جب باغیوں سے یہ کہا جاتا کہ فلاں مکان میں فرنگی چھپا ہوا ہے تو باغی بغیر تصدیق کے اس مکان کے مال اسباب کو لوٹ لیتے اور بعض حالات میں مکینوں کو قتل کر دیتے۔ ہر اس شخص کو قتل کر دیا جاتا جس کے متعلق یہ شبہ ہوتا کہ وہ انگریزوں کی جاسوسی کرتا ہے۔

۱۱ رمئی ۱۸۵۷ء کی صبح کو باغی سپاہی دلی میں داخل ہوئے اور شام تک وہ ساری دلی پر قابض ہو گئے۔ دلی پر باغیوں کا قبضہ ۱۴ ر ستمبر ۱۸۵۷ء تک رہا۔ اس مدت میں دلی کو امن وامان نصیب نہ ہوسکا۔ باغیوں کی دلی کا اگر انقلاب پسندوں کے پیرس سے مقابلہ کیا جائے تو حیرت انگیز تضاد دکھائی دیتا ہے۔ پیرس (۱۸۷۸ء) میں پورے طور پر امن وامان قائم رکھا گیا۔ لوگوں کو انقلاب کے مقصد سے آگاہ کیا جاتا۔ لوٹ مار کا وجود تک باقی نہیں تھا۔ ہر شخص دوسرے کو ''شہری'' کہہ کر پکارتا۔ اسلحہ سازی کے کارخانے کھولے گئے۔ ان کارخانوں میں کام کرنے کے لیے رضاکاروں کی ٹولیاں بھرتی کی گئیں۔ قومی فوج تیار کی گئی لیکن دلی میں باغی سپاہیوں نے لوٹ مار سے دلی کے تجارت پیشہ لوگوں کی ہمدردیوں کو کھو دیا تھا۔ شہر کے بازار بند ہو رہے تھے۔ کھاری باؤلی اور دریبہ میں دکانوں کو دن دھاڑے لوٹ لیا جاتا۔ لوٹ مار کی اس گرم بازاری میں باغیوں کی حمایت کے جذبات کیوں کر پرورش پاتے۔ بہادر شاہ کی بادشاہت برائے نام تھی۔ اس کے احکام بے اثر اور بے معنی ہوتے تھے۔ باغی فوجوں کی کمان مرزا مغل اور بخت خان کے ہاتھوں میں تھی۔ مرزا مغل اور بخت خان فوجی امور میں ہمیشہ غیر متفق رہتے تھے۔ شہر کی بیشتر آبادی اس حادثے کو باغی

سپاہیوں اور کمپنی کا باہمی تصفیہ خیال کرتی رہی۔

۸رجون: ۸رجون ۱۸۵۷ء کو جنرل سر برنارڈ اپنی فوج سمیت دلی کے باہر نمودار ہوا۔ دلی پہنچ کر اسے معلوم ہوا کہ توپوں کے بغیر وہ دلی کو سر نہیں کر سکتا۔ جب اس کے پاس توپیں پہنچ گئیں تو اس کے پاس توپچی نہیں تھے۔ توپچیوں کے آنے کا انتظار کرنے لگا۔ جنرل سر برنارڈ ایک ہلہ بول کر دلی فتح کرنا چاہتا تھا، لیکن ایک ہی جھڑپ میں اسے معلوم ہو گیا کہ یہ کام اتنا سہل نہیں۔ جنرل سر برنارڈ کی فوج دلی کے شمال میں فصیل سے دو میل کے فاصلے پر ایک ماہی پشت سطح پر مقیم تھی۔ اسی اثنا میں دلی میں مختلف شہروں سے باغی فوجیں جمع ہو رہی تھیں۔ انگریزی فوج کو آہستہ آہستہ تھوڑی بہت کمک مل رہی تھی۔ دونوں فوجوں میں لڑائیوں کا سلسلہ شروع ہو چکا تھا۔ ان لڑائیوں میں کبھی باغیوں کا اور کبھی انگریزوں کا زیادہ نقصان ہوتا۔ ۲۳رجون کو جنگ پلاسی کی برسی منائی گئی۔ اس دن باغیوں کی فوج کے حملوں نے شدت اختیار کر لی تھی۔ باغیوں نے دلی کی فصیل پر توپیں چڑھا دی تھیں۔ ان توپوں کے دہانے آگ اگلتے رہے۔ اس دن لڑائی کا فیصلہ نہ ہو سکا۔ (کمپنی کی حکومت، ص ۳۹۱-۳۹۳)

سہارن پور:

جنگ آزادی کی ابتداء ۱۰ر مئی ۱۸۵۷ء کو میرٹھ میں ہوئی اور اس کی خبر ۱۲ر مئی کو سہارن پور پہنچی۔ چناں چہ انبالہ کو اطلاع دی گئی دوسرے دن تمام انگریز عورتوں اور بچوں کو دہرہ دون بھیج دیا گیا۔ بعد میں دہلی کے ہنگامہ کی خبر ملی۔ گوجروں اور رانگھڑوں نے موقع سے فائدہ اٹھایا اور انھوں نے دیہاتوں کو لوٹنا شروع کر دیا۔ یہ دیکھ کر سہارنپور کی حفاظت کے بندوبست بڑے پیانہ پر کیے گئے۔ اور وہاں پولیس فورس بڑھادی گئی۔

۲۱ر مئی کو گوجروں اور رانگھڑوں کی ایک بڑی تعداد نے پرگنہ سہارن پور کے جنوبی اور مغربی حصہ میں جمع ہو کر موضع ہلنی پور کو جو خزانہ کے متصل تھا لوٹ لیا۔ ان کے تدارک کے لیے مجسٹریٹ صاحب تمام انگریزی عملہ اور ضلع کے سواروں کو لے کر گئے۔ ساتھ میں ۲۰ سپاہی ۲۹ وین رجمنٹ کے گئے۔ اتنی جمعیت کو دیکھ کر کوئی مقابلہ میں نہ آیا اور سب بھاگ گئے۔ یہی نہیں بلکہ ہلنی پور سے جو مال لوٹا تھا۔ وہ کھیتوں اور سڑکوں پر پھینک گئے۔ اسی موقع پر ضلع میرٹھ سے جو قیدی جیلوں سے نکل کر فرار ہوئے تھے سب گرفتار ہو کر سہارن پور میں آئے۔ مجسٹریٹ نے اس سے پہلے ہی کمشنر انبالہ مسٹر ماریس صاحب سے امداد کی درخواست کی تھی۔ وہاں اسسٹنٹ کمشنر

مسٹر ولیم چچلی پلوڈن جو اس زمانے میں جگادھری میں آئے ہوئے تھے۔ چوتھے رسالے کے کچھ آدمی اور ایک کمپنی ۵ رجمنٹ کی لے کر اور جمنا کو عبور کر کے آگئے۔

۳۰ مئی: کو مجسٹریٹ نے مع مسٹر پلوڈن، مسٹر ٹرنچ، مسٹر ایڈورڈ اور رابرٹس کپتان ایلڈ، کپتان گارسٹن، موضع مانکنور پر حملہ کیا۔ یہ گوجروں کا گاؤں تھا۔ ان کا سرغنہ امراؤ سنگھ تھا۔ سب گاؤں والے بھاگ گئے۔ اور گاؤں کو آگ لگادی۔ چند آدمی گرفتار ہوئے۔ اس موقع پر ۲۹ ویں رجمنٹ کے بھی ۳۰ آدمی اور چوتھے رسالہ کے چند سوار ساتھ تھے۔ (جہاد شاملی وتھانہ بھون از ثناء الحق صدیقی، کراچی ۱۹۸۶ء ص ۱۹۔۱۸)

روڑکی:

روڑکی میں بھی میرٹھ کے ہنگامہ کی خبر ۱۲ر مئی کو پہنچی۔ وہاں سے ۱۳ر مئی کی شب میں کشتیوں کے ذریعہ چھٹی اور آٹھویں کمپنیاں روانہ کردی گئیں جو ۱۴ر تاریخ کو میرٹھ پہنچ گئیں۔ روڑکی میں بھی مناسب حفاظتی انتظامات کیے گئے۔ روڑکی سے جو کمپنیاں میرٹھ گئی تھیں ان سے ہتھیار رکھنے کو کہا گیا۔ جس کی وجہ سے وہ باغی ہوگئیں اور انھوں نے اپنے کمانڈنگ افسر فریڈر کو قتل کردیا۔ اس کے بعد انھوں نے سرکاری فوجوں سے مقابلہ کیا۔ لیکن شکست کھائی۔ پچاس میدان میں قتل ہوئے۔ باقی گرفتار کرلیے گئے۔ انھوں نے بھاگنے کی کوشش کی جس کی وجہ سے مزید ۱۵۹ افراد اور قتل کردیے گئے۔ روڑکی میں چند خفیف وارداتیں ہوئیں لیکن چھاؤنی ہونے کی وجہ سے مجموعی طور پر امن رہا اور وہاں سے ضرورت پڑنے پر دوسرے مقامات پر کمک بھیجی جاتی رہی۔ (ماخوذ از تاریخ سہارن پور) (جہاد شاملی وتھانہ بھون، صفحہ ۲۱۔۲۰)

بنارس میں بغاوت:

۴ر جون ۱۸۵۷ء: میرٹھ اور دہلی کے واقعات نے کئی ایک دوسرے مقامات پر بھی اثر کیا۔

یہ اثر بعض مقامات پر طوفان کی ایک آدھ لہر سے ملتا جلتا تھا لیکن سر ولیم ہنٹر کے الفاظ میں:

"فوجیوں کی یہ بغاوت اودھ میں پہنچ کر قومی جنگ کی صورت اختیار کرگئی۔"

گورنر جنرل نے مدراس اور بمبئی کے گورنروں کو حالات سے آگاہ کرنے کے بعد ان سے کمک طلب کی۔ مئی ۱۸۵۷ء کے اختتام پر کرنل نیل مدراس سے فوج لے کر کلکتہ پہنچ گیا۔ کلکتہ سے ریل گاڑی پر سوار ہو کر یہ فوج رانی گنج پہنچی۔ کرنل نیل بنارس میں اس وقت پہنچا جب کہ وہاں کے

دیسی سپاہی بغاوت پر تلے ہوئے تھے۔ ۴ر جون ۱۸۵۷ء کو بنارس چھاؤنی کے دیسی سپاہیوں نے اپنے افسروں پر حملہ کر دیا۔ سکھ سپاہیوں نے انگریزوں پر گولیاں چلانا شروع کر دیں۔ انھوں نے تین مرتبہ ہلا کیا لیکن انگریز سپاہیوں نے انھیں ہر بار پسپا کر دیا۔ چند منٹ میں ایک سو باغی سپاہی مارے گئے اور دو سو کے قریب زخمی ہوئے۔ اس فساد میں بہت سے دیسی سپاہیوں نے انگریزوں کا ساتھ نہ چھوڑا۔ جب کرنل نیل بڑی جرأت سے بنارس میں باغیوں کا مقابلہ کر رہا تھا تو اسے گورنر جنرل کی طرف سے حکم ملا کہ وہ فوراً الٰہ آباد پہنچ جائے۔ ''ایسا نہیں ہو سکتا۔ میری یہاں ضرورت ہے۔'' کرنل نے جواب بھجوا دیا۔ (کمپنی کی حکومت)

۶ر جون: الٰہ آباد میں حالات نازک صوت اختیار کر رہے تھے۔ جن دیسی سپاہیوں نے ۶ر جون ۱۸۵۷ء کو پریڈ میں اپنی وفاداری کا یقین دلایا تھا چار گھنٹے بعد ان سپاہیوں نے اپنے سترہ افسروں کو قتل کر دیا۔ انگریز بچوں اور عورتوں کو قتل کرنے کے بعد یہ سپاہی (چھٹی دیسی پیادہ فوج) بینڈ پر ''خدا ملکہ کو سلامت رکھے'' بجاتے ہوئے دلی کی طرف چل دیے۔ انگریزوں کے بنگلوں کو آگ لگا دی۔ ریلوے اسٹیشن کا بھی یہی حشر ہوا۔ ریل گاڑی کے انجنوں پر دور سے گولیاں چلائی گئیں۔ کئی میل تک ٹیلی گراف کے تار اور ریل گاڑی کی پٹڑی تباہ کر دی گئی۔ ۱۱ر جون کو کرنل نیل اپنے سپاہیوں سمیت الٰہ آباد پہنچا۔ وہ باغی سپاہیوں کو گولی سے اڑا دیتا اور باغی شہریوں کو پھانسی پر لٹکا دیتا۔ اس نے الٰہ آباد پر پوری طرح سے قبضہ کر لیا۔ (کمپنی کی حکومت، ص ۴۲۶)

جون ۱۸۵۷ء: ۲ر جون کو کپتان گارسٹن صاحب کے ہمراہیوں میں سے ۱۶ آدمیوں نے اپنے نام کٹوا لیے اور مجسٹریٹ صاحب کی کوٹھی پر فساد کر دیا۔ انھوں نے بندوقوں سے مقابلہ کیا۔ لیکن جب ان کا ایک آدمی مارا گیا تو وہ فرار ہو گئے۔

مراد آباد:

۳ر جون کو گورکھا فوج میجر بکٹ کی ماتحتی میں پہنچی اور اسی تاریخ کو خبر آئی کہ مراد آباد میں ۲۹ ویں رجمنٹ باغی ہو گئی ہے۔ ۱۶ر جون کو کسی قدر گورکھا فوج باغیوں کے مقابلے کے لیے آئی۔ یہ فوج لفٹننٹ بائس رانگٹن اور مسٹر ایڈورڈ کی ماتحتی میں آگے بڑھی، لیکن مقابلہ زیادہ دیر نہیں ہوا اور باغی ضلع چھوڑ کر چلے گئے۔

۲۰ر جون کو یہ خبر ملی کہ قصبہ نکوڑ کے لٹ جانے کا ڈر ہے۔ مجسٹریٹ مسٹر رابرٹس گورکھوں کی کچھ فوج لے کر گئے۔ لیکن ان کے پہنچنے سے پہلے ہی گوجروں نے حملہ کر دیا تھا۔ اور تحصیل اور

پولیس لائن کو مع دفتر جلا دیا۔ (جہادِ شاملی و تھانہ بھون، صفحہ ۱۹)

کان پور کا محاذ:

۵/ جون ۱۸۵۷ء: مئی ۱۸۵۷ء کے مہینے میں کان پور کی دیسی فوجیں بے چینی کا اظہار کرتی رہیں۔ ۵/ جون ۱۸۵۷ء کو کان پور کے تمام دیسی سپاہیوں نے بغاوت کر دی۔ چھاؤنی کو آگ لگانے کے بعد باغی سپاہی خزانے کی طرف بڑھے۔ اس خزانے کی حفاظت نانا صاحب کے سپاہی کر رہے تھے۔ خزانے کے محافظ بھی باغیوں کی صف میں کھڑے ہو گئے۔ باغیوں نے ایک لاکھ ستر ہزار پونڈ ہاتھیوں اور چھکڑوں پر لاد کر دلی جانے کا ارادہ ظاہر کیا۔ اس وقت تک نانا صاحب جس کا محل کان پور کے قریب ہی تھا، غیر جانب دار رہا لیکن اگلی صبح وہ باغیوں کا سردار بن گیا۔ اس کے حکم سے کان پور میں قتل و غارت گری کا بازار گرم ہوا۔ باغیوں نے شہر کو آگ لگا دی۔ نانا صاحب نے اپنے پیشوا ہونے کا اعلان کر دیا۔ باغیوں نے انگریزی فوج کی خندقوں کے سامنے مورچے لگا دیے۔ اسی اثنا میں باغی سپاہی آس پاس کے علاقوں سے انگریز عورتوں اور بچوں کو پکڑ کر کان پور لاتے رہے، جہاں انھیں بڑی اذیتوں سے قتل کیا جاتا۔ خندقوں میں محصور انگریزوں کو نانا صاحب نے الٰہ آباد جانے کی اجازت دے دی، لیکن جب یہ لوگ کشتیوں میں دریا عبور کر رہے تھے تو ان پر گولیوں کی بارش کی گئی۔ جب نانا صاحب کو پتا چلا کہ انگریزی فوج کان پور کی طرف بڑھ رہی ہے تو اس نے ان تمام بنگالی کلرکوں کے ہاتھ اور ناک کٹوا دیے جو تجارتی فرموں میں کام کر رہے تھے۔ ہر اس شخص کو قتل کر دیا جس کے متعلق یہ شبہ تھا کہ وہ انگریزی لکھنا، پڑھنا بولنا جانتا ہے۔ یہ بات دلچسپی سے خالی نہ ہوگی کہ خود نانا صاحب اچھی خاصی انگریزی جانتا تھا۔

یکم جولائی ۱۸۵۷ء کو کرنل نیل نے میجر رینالڈ کی کمان میں جنرل ویلر کو کان پور میں مدد بھیجی۔ دو دن بعد کان پور کو مزید کمک بھیجی گئی۔ میجر رینالڈ کو قدم قدم پر مشکلوں کا سامنا تھا۔ اودھ کی ساری آبادی باغی ہو چکی تھی۔ چند دن بعد جنرل ہیولاک اپنی فوج سمیت کان پور روانہ ہوا۔ فتح پور میں اس نے باغیوں کو شکست دی۔ جنرل ہیولاک کی آمد کی اطلاع پا کر نانا صاحب اسے روکنے کے لیے آگے بڑھا۔ کان پور سے سولہ میل دور لڑائی ہوئی جس میں ہیولاک نے نانا صاحب کو شکست دی۔

۱۷؍جولائی ۱۸۵۷ء کو ہیولاک کان پور میں داخل ہوا۔ دس دنوں میں ہیولاک نے ایک سو چھبیس میل کا سفر کیا۔ چار لڑائیاں جیتیں اور چوبیس توپوں پر قبضہ کیا۔ نانا صاحب کے محل کو آگ لگا دی گئی۔ اس کی توپوں پر قبضہ کرلیا گیا۔ اب ہیولاک نے کرنل نیل کو لکھا کہ وہ بہت جلد کان پور پہنچ جائے۔ کرنل نیل کان پور پہنچ گیا۔ کرنل نیل نے اب مقتول انگریزوں کا انتقام لیا۔ ہیولاک اب لکھنو روانہ ہوا، لیکن باغیوں کے بڑھتے ہوئے زور کو دیکھ کر وہ چند دنوں بعد کان پور واپس آ گیا۔ اسی اثنا میں نانا صاحب نے کان پور پر حملہ کرنے کی پھر تیاریاں کرلی تھیں۔ وہ دس ہزار سپاہیوں کی فوج لے کر کان پور کی طرف بڑھ رہا تھا۔ ہیولاک کی فوج میں تیرہ سو سپاہی تھے۔ ہیولاک نے اپنے لیے خطرہ محسوس کرتے ہوئے کمک طلب کی۔ میجر جنرل آؤٹ رم الہٰ آباد سے کان پور روانہ ہوا تاکہ وہاں حالات پر قابو پانے کے بعد ہیولاک اور نیل کو اپنے ساتھ لے کر لکھنو کی طرف بڑھے۔ ۱۵؍ستمبر کو میجر جنرل آؤٹ رم کان پور پہنچا۔ کان پور پر پوری طرح سے قبضہ کرنے کے بعد انگریزی فوج لکھنو کی طرف بڑھی۔ (کمپنی کی حکومت، ص ۴۲۷۔۲۸)

ضلع سہارن پور:

جولائی ۱۸۵۷ء: ۱۹؍جولائی کو کمپنی ۲۹ویں رجمنٹ جو سہارنپور کے خزانے پر متعین تھی بھاگ گئی۔ بھاگنے والوں کی تعداد ۹۷ تھی۔ ان ہی تاریخوں میں یہ اطلاع ملی کہ کوتوال شہر سہارن پور علیم اللہ خان باغیوں کے ساتھ سازش کررہا ہے۔ یہ اطلاع پاکر پہلے اس کو نکوڑ کی تحصیلداری پر بھیج دیا گیا اور پھر وہاں سے گرفتار ہوکر انبالہ لے جایا گیا اور آخر کار اس کو پھانسی دے دی گئی۔ کنکھل میں بھی کچھ شورش ہوئی مگر جلد دبا دی گئی۔ دیوبند میں بھی لوٹ مار اور قتل وغارت گری ہوئی اور اکثر ہندو مہاجنوں کے گھر لوٹے گئے۔ اس زمانے میں وہاں کا کوتوال ایک عیسائی تھا۔ وہ اپنی جان بچا کر سہارن پور چلا گیا۔ اور ایک ہندو مان سنگھ کوتوال مقرر ہوا۔ اس نے امن و امان کو بحال کیا۔ قصبہ انبیٹھ اور قصبہ سرسادہ میں بھی گوجروں نے تاخت وتاراج کی لیکن گورکھا فوج کے آجانے سے نہ صرف ان مقامات پر بلکہ پورے ضلع میں امن وامان قائم ہوا۔ (جہاد شاملی وتھانہ بھون، ص ۲۰)

اعلانِ معافی کی دفعہ ۳ اور انگریزوں کے جارحانہ اقدام

باوجودے کہ ۱۸۵۸ء میں کوئن وکٹوریہ اور دارالعوام اور دارالامراء اور انگلستان کی مذہبی جماعت کے سربرآوردہ لوگوں کے اتفاق سے منجملہ دیگر وعدوں کے (اعلان معافی کی دفعہ ۳ میں) یہ وعدہ پختہ طور پر کیا گیا تھا کہ ہم آیندہ کسی دوسرے ملک پر قبضہ اور دست درازی نہ کریں گے۔ مترجم کے الفاظ حسب ذیل تھے "جو ملک بالفعل ہمارے قبضے میں ہے اسے زیادہ کرنا نہیں چاہتے اور جب ہم کو یہ گوارا نہیں ہے کہ کوئی شخص ہماری مملکت یا حقوق میں دست اندازی کرے تو ہم بھی پیش قدمی کی اپنی طرف سے بہ نسبت ملکیت یا حقوق اوروں کے اجازت نہ دیں گے اور والیان ہند کے حقوق و منزلت اور عزت مثل اپنے حقوق و منزلت اور عزت کے عزیز سمجھیں گے۔" مگر کیا اس پر عمل کیا گیا؟ (۱)۔ واقعات مندرجۂ ذیل اس پر روشنی ڈالیں گے:

(۱) ۱۸۶۵ء میں دوار آف بھوٹان پر قبضہ کر کے برطانوی ہند سے الحاق کیا گیا،

(۲) ۱۸۸۵ء میں برہما کا شمالی حصہ فتح کر کے سلطنت میں شامل کیا گیا،

---

(۱) اس کی مختصر تفصیل یہ ہے کہ ۱۸۵۷ء کے اسباب انقلاب وجدوجہد آزادی میں سے ایک امر یہ بھی تھا کہ کمپنی نے مختلف ریاستوں پر خلاف معاہدہ قبضہ کر لیا تھا اور ہمیشہ توسیع مملکت اور فارورڈ پالیسی اس کے زیر نظر رہتی تھی جس کے ماتحت جنگ وجدل اور الحاق ممالک ہند شرمناک طریقوں اور حیلوں سے جاری رہتا تھا، باوجود بہت سے والیان ریاست کے انتہائی وفاداری امداد اور اطاعت کے پھر الحاق کی پالیسی عمل میں لائی جاتی تھی جیسا کہ اودھ اور اس کے والی واجد علی شاہ اور جھانسی کی رانی وغیرہ کے ساتھ کیا گیا تھا، اس لیے ہندوستانیوں کی بے چینی دور کرنے اور آئندہ کے خطرات کو مٹانے کی غرض سے یہ اعلان ضروری سمجھا گیا تھا جس کی بنا پر تمام والیان ریاست ہائے ہند مطمئن ہو گئے اور بیرون حدود برطانوی ہند کے رہنے والے باشندوں کو بھی یقین ہو گیا کہ انگریز آئندہ امن وامان سے رہیں گے اور ہماری ملکتیں محفوظ رہیں گی، مگر جوں ہی ذمہ داران برطانیہ کو اس اعلان کے بعد محسوس ہونے لگا کہ اب ہندوستانیوں کی بے چینی ہماری طرف سے دور ہو گئی ہے اور ہماری قوت اور گرفت بھی مکمل ہو گئی ہے۔ اسی وقت سے آنکھیں بدل لیں اور اس عہد نامہ کو ردی کی ٹوکری میں ڈالنا اور فارورڈ پالیسی کو زندہ کرنا ضروری معلوم ہونے لگا سربارتھ فیسر اور انکی پارٹی نے فارورڈ پالیسی کے لیے پارلیمنٹ میں آوازیں بار بار اٹھائیں اور اپنے ہم خیال بنانے شروع کیے تاآں کہ اپنی اکثریت بنا کر وائسرائے ہند پر عملدرآمد کا زور ڈلوایا اس وقت میں لارڈ نارتھ بروک وائسرائے تھے انھوں نے اس کی مخالفت کی اور اس کے خطرات اور مضرات کو ظاہر کیا، مگر ایک نہ سنی گئی اور برابر زور پڑتا رہا، چونکہ وہ اس پالیسی کو ہندوستان اور انگلستان کے لیے بہت مضر سمجھتے تھے اس لئے ۱۸۷۶ء میں استعفیٰ دے کر واپس انگلستان چلے گئے اور ان کی جگہ لارڈ لٹن آتے وہ اس پالیسی کے موافق تھے، چنانچہ انھوں نے آتے ہی کابل کو مشن بھیجا اور بالآخر ۱۸۸۰ء کی کابل کی چڑھائی عمل میں آئی جس میں برطانیہ اور گورنمنٹ ہندوستان کو بہت زیادہ جانی اور مالی نقصان برداشت کرنا پڑا۔ دو کروڑ پونڈ اس مہم میں خرچ ہوا۔ جس میں سے برطانیہ نے اپنے انگلینڈ کے خزانہ سے صرف پچاس لاکھ پونڈ دیا، اور باقی ڈیڑھ کروڑ پونڈ ہندوستان کے سر ڈالا گیا پھر بھی کامیابی کا منہ دیکھنا نصیب نہ ہوا، (حکومت خود اختیاری)

(۳) ۱۸۹۰ء میں منی پورا انگریزی انتظام میں لیا گیا، لیکن کچھ عرصے کے بعد پھر ہندوستانی ریاستِ برطانیہ بنایا گیا۔

(۴) ۱۸۹۵ء میں چترال پر چڑھائی گئی اور تمام علاقہ سلطنت میں شامل کیا گیا،

(۵) تیرہ کی سرحدی مہم بھی اسی سال واقع ہوئی،

(۶) ۱۸۸۰ء میں کابل کی دوسری لڑائی کی گئی جس میں چالیس لاکھ پونڈ خرچ ہوا،

(۷) ۱۸۹۷ء میں پھر جنگ سرحد کی گئی جس میں بیالیس لاکھ پونڈ خرچ ہوا۔

(۸) ۱۸۹۸ء میں تبت اور چین پر حملہ کیا گیا جس میں ایک لاکھ بیس ہزار پونڈ خرچ ہوئے،

(۹) ہم ۱۸۶۳ء اور ۱۸۶۸ء کے ستھانہ اور ان مقامات پر حملوں کا ذکر چکے ہیں جہاں آزادی ہند کے متوالے حضرت سیّد احمد شہید رحمۃ اللہ علیہ کے تابعداروں کا قیام رہتا تھا۔

روسی ممالک وقبائل پر انگریزوں کے حملے:

غرضے کہ ہندوستان کی بیرونی حدود پر رہنے والے قبائل اور ممالک پر جو کہ ۱۸۵۷ء تک کے مقبوضہ ممالک سے باہر تھے حملہ کرنے اور ان کے برباد اور کمزور کرنے کے بے شمار واقعات جاری کیے گئے۔ بلوچستان، یاغستان (آزاد قبائل کا ملک)، افغانستان، تبت، چین، برہما وغیرہ پر برابر فوج کشی جاری رہی، جس سے ہمیشہ ہندوستانی فوجیں ہندوستانی خزانے ہندوستانی رسد وغیرہ موت کے گھاٹ اُترتے رہے اور پڑوس کے ممالک اور قوموں کی بربادی ہوتی رہی، ان کو ہندوستان اور باشندگان ہند سے بغض وعداوت بڑھتی رہی اور اس طرح انگریزوں کی غلامی ہندوستانیوں کے لیے مضبوط ہوتی گئی مندرجہ بالا واقعات تو بڑی بڑی جنگوں کے ہیں جن میں اس قدر مصارف واقع ہوئے کہ ہندوستانی قومی قرضہ کی نوبت آئی ورنہ ایسی مہمات جن میں قرض لینا نہیں پڑا وہ تو بے شمار ہیں۔ آفریدیوں، مسعودیوں، مہمندوں، وزیریوں اور دیگر قبائل سے آئے دن فارورڈ پالیسی کی بنا پر چھیڑ چھاڑ عمل میں لائی جاتی اور پھر ان پر فوج کشی عمل میں لائی جاتی تھی، جس سے ان بہادر قوموں کو فنا کرنا، ہندوستان پر اپنے تسلط اور اقتدار کو مضبوط بنانا، باہر سے آنے والے خطرات کے لیے تحفظ اور سدِ راہ کی صورتیں پیدا کرنا اصلی مقصد تھا، ورنہ یہ ممالک ایسے زرخیز نہ تھے، جن کے لیے اس قدر مصارف برداشت کیے جائیں، حقیقت یہ ہے کہ یہ تمام کاروائیاں شہنشاہیت (برٹش ایمپائر) کے لیے عمل میں لائی جاتی تھیں اور برطانوی قوم اور ملک کا کافی نقصان جانی یا مالی نہیں ہوتا تھا، آدمی ہندوستان کے مرتے تھے، خزانہ ہندوستان کا کھپتا تھا، دوسرے نقصانات بھی ہندوستان ہی کے ہوتے تھے اور برٹش اقتدار روز افزوں ہوتا رہتا تھا۔

ہندوستان پر اپنا آہنی پنجہ اور اس کی گرفت روز افزوں زیادہ ہوتی رہتی تھی اس لیے کانگریس اور بیدار مغز ہندوستانی اس عملدر آمد کو ملک کے لیے انتہائی خطرناک سمجھتے تھے، فوجی مصارف کے بارِ گراں کی بنا پر ہندوستان پر ٹیکسز آئے دن بڑھائے جاتے تھے اور اندرون ملک کی ضروریات کے لیے بجٹ میں روپیہ نہ ہونے کا بہانہ لے کر رعایا کی ضروریات داخلیہ کی انجام دہی سے معذوری ظاہر کی جاتی تھی۔

کانگریس کا ایک اہم رزولیوشن:

۱۸۸۵ء میں جب بلکہ کانگریس کا پہلا اجلاس ہوا تو ایک ریزولیوشن میں فوجی مصارف کی تخفیف کا مطالبہ کیا گیا اور اس کے بعد اجلاس میں مندرجۂ ذیل تجویز پاس کی گئی۔

> ''سرحد کی پیش قدمی کی پالیسی سلطنت برطانیہ کے لیے اور بالخصوص ملک ہندوستان کے مفاد کے لیے مضرت رساں ہے۔ کیوں کہ اس کی وجہ سے ہندوستان کی حدود کے باہر فوجی مہمات بھیجنی پڑتی ہیں، جس سے قیمتی جانیں تلف ہوتی ہیں اور رعایا کا روپیہ ضائع ہوتا ہے۔ اس لیے کانگریس مستدعی ہے کہ اس جارحانہ کارروائی کو بند کیا جائے اور یہ امر قرار دیا جائے کہ درآں حالے کہ یہ مہمات شاہی اغراض کے لیے ضروری سمجھی جائیں تو ان کے صرف کا بڑا حصہ سلطنتِ برطانیہ کے خزانے سے ادا کیا جائے۔''

نیز اس قرارداد کے بعد دوسری قرارداد میں کانگریس نے گورنمنٹ کی پیش قدمی کی پالیسی پر اظہار افسوس کرتے ہوئے کہا کہ ''سرحدیوں کے ساتھ پرانی دوستانہ پالیسی کی طرف رجوع کیا جائے اور وادی سوات میں جو کثیر اخراجات کیے جاتے ہیں انھیں بند کیا جائے'' چوں کہ کانگریس کے سمجھدار ممبر اور بیدار مغز لوگ سمجھ رہے تھے کہ یہ کارروائی ہندوستانیوں کی غلامی کو بڑھانے اور مضبوط کرنے اور ان کی آزادی کو زیادہ سے زیادہ دُور بلکہ مستحیل بنانے کے لیے کی جارہی ہے۔ اور اس سے ہندوستان روز بروز کمزور و ناتواں اور غریب ہوتا جارہا ہے۔ لہٰذا اس کی مخالفت کرنا ضروری ہے، مگر سادہ لوح مسلم افراد جو کہ سرسیّد کے تابعدار اور مسٹر بیک کے جادو میں پھنسے ہوئے تھے، وہ اس قسم کی تجویزوں کے مخالف رہے، یہ بھی نظر اٹھا کر نہ دیکھا کہ اس فارورڈ پالیسی کے عمل میں آنے سے کیا مسلمانوں ہی کی بربادی نہیں ہورہی ہے؟ ہندوستان کی مغربی و شمالی سرحد پر تو صرف مسلمان ہی آباد تھے اس پیش قدمی سے ہر روز انھیں موت کے گھاٹ اتارا

جاتا ہے۔ انھیں کے مال اور گھروں کو نیست و نابود کیا جا رہا ہے، نیز زمانہ سابقہ میں آزادی کے لیے اس راستے ہی سے ہمیشہ کامیابی ہوتی رہتی تھی،

افغانستان پر انگریزوں کے حملے:

مگر افسوس کہ ان مسحورین برطانیہ کی آنکھیں اس وقت نہ کھلیں۔ افغانستان پر انگریزوں نے چار مرتبہ چڑھائی کی، اگر علاقہ پہاڑی اور وہاں کے باشندے بہادر اور جنگجو نہ ہوتے اور انگریز کو یہ خطرہ نہ ہوتا کہ روس سے بلا واسطہ اور آمنے سامنے لڑائی کہیں نہ کرنا پڑ جائے تو بہت ممکن تھا کہ مثل ہندوستان افغانستان بھی غلامی کی ہولناک دلدل میں پھنس جاتا۔ انگریز چاہتا تھا کہ میرے اور روس کے درمیان میں افغانستان لوہے کی دیوار بنا رہے۔ چناں چہ ہندوستان کے خزانے سے عرصہ دراز تک ایک معقول رقم امیر افغانستان کے لیے جاری رہی جس کو امیر عبدالرحمن خاں مرحوم جزیے سے تعبیر کیا کرتے تھے، بہر حال انگریزوں نے اپنی ان حدوں سے جو کہ ۱۸۵۷ء میں تھیں ہر طرف آگے بڑھ کر وہاں کے باشندوں کو غلام اور ان کے ملکوں کو اپنے اقتدار اور تسلط کا آماجگاہ بنا لیا۔ صرف افغانستان میں مذکورۂ بالا وجوہ سے پوری کامیابی نہ ہو سکی تاہم اس کو ہندوستان کی تمام حدود کی طرف سے اطمینان ہو گیا۔

عدن اور باب المندب پر قبضہ:

چوں کہ انگلینڈ سے ہندوستان آنے کے لیے اس زمانے میں بجز بحری راستے کے اور کوئی راستہ نہیں تھا اور قدیمی راستہ ساؤتھ افریقہ کا بہت دور پڑتا تھا اس لیے انگریزوں نے جبرالٹر سے بمبئی تک کے لیے اپنے تسلّط کی ہمیشہ انتہائی کوششیں جاری رکھیں، سلطان عبدالمجید خان مرحوم ۱۸۲۹ء میں تخت نشین ہوئے محمد علی پاشا اس سے پہلے بغاوت کر کے تمام فلسطین اور شام کے علاقوں پر قابض ہو چکا تھا اور ترکی بیڑا نوضی پاشا کی خیانت کی بنا پر محمد علی کے قبضے آ چکا تھا اس لیے سلطان کے لیے نہایت سخت دقتوں کا سامنا تھا۔ انگریزوں اور ان کے حلفاء کی امداد سے ترکوں کو کامیابی اور محمد علی پاشا کو ناکامی کا منہ دیکھنا پڑا تھا اور اس بنا پر سلطان عبدالمجید سے دوستانہ تعلقات قائم ہو گئے تھے (حال آں کہ یہ انگریزوں کی امداد اپنے مقاصد ہی کے لیے تھی اور حال آں کہ انگریزوں نے صرف جہازوں سے مدد کی تھی، تمام جنگی کارروائیاں ترکی فوجیں ہی کر رہی تھیں۔ مگر انگریزوں نے اس دوستی سے بہت سے عظیم الشان فوائد حاصل کیے۔ من جملہ دیگر فوائد کے ایک فائدہ عدن پر

قبضہ تھا جو کہ محض کوئلے کے مخزن کے نام سے طلب کیا گیا تھا، سلطان مرحوم سے ظاہر کیا گیا کہ ہمارے جہازوں کی آمد و رفت کے لیے عدن میں کوئلے کا مخزن ضروری ہے۔ وہاں سے ہندوستان کی بندرگاہیں بہت دور پڑتی ہیں۔ جہازوں کے آتے وقت اور اسی طرح جاتے وقت جہازوں میں کوئلہ اور پانی کا ذخیرہ ختم ہو جاتا ہے نیز وہ ایک ایسا مرکزی مقام ہے، جہاں سے ہر طرف کی آمد و رفت اور تجارتی تعلقات اور کاروبار ہو سکتے ہیں۔ اس کے لیے عدن میں ایسے مخزن کے لیے زمین اور اجازت دی جائے۔ چناں چہ فرمان شاہی ہو گیا۔ مگر انگریزوں نے بجائے مخزن کے تمام شہر اور اس کے گردونواح کے علاقوں پر رفتہ رفتہ قبضہ کر لیا، عدن ایک عظیم الشان بندرگاہ اور جنگی مرکز ہو گیا، اس کے بعد باب المندب پر بھی قبضہ کیا گیا، جس کے لیے سومالی لینڈ اور سوڈان اور مصر تک کی کوششیں کی گئیں اور ۱۸۸۵ء میں اس لڑائی خاتمہ ہوا۔

نہر سویز کی تکمیل اور مصر پر قبضہ:

پہلے پہل انگریز ''راس امید'' کے راستے سے جو کہ جنوبی افریقہ کا چکر کاٹ کر ہندوستان پہنچتا ہے آمد و رفت رکھتے تھے اس راستے کی مسافت بہت طویل ہے

نہر سویز کی تکمیل:

اس لیے جبکہ ۱۸۶۹ء میں نہر سویز کو اسماعیل پاشا خدیو مصر نے کھدوا کر اس کا افتتاح کیا، تو انگریزوں کی آنکھیں کھلیں۔ انگریز مدبرین اس کی تعمیر کو ناممکن خیال کرتے تھے۔
اس لیے انھوں نے ابتدا سے اس میں کسی قسم کی کوئی دلچسپی نہیں لی۔ مگر جب یہ تیار ہو گئی تب اس کی اہمیت سمجھی گئی اور اس پر قبضہ کرنے کی کوششیں طرح طرح سے عمل میں آنی شروع ہوئیں۔ انگریزوں نے اسماعیل پاشا سے خفیہ معاہدہ کر کے اسماعیل کے تمام حصے اُنتالیس لاکھ چھتر ہزار پانچ سو بیاسی (۳۹،۷۶،۵۸۲) پونڈ میں خرید لیے اور اس کے بعد مختلف طریقوں سے مصر میں مداخلت کرنے لگے (۱) جس کی تفصیل تاریخ دولت عثمانیہ مصنفہ مسٹر محمد عزیز صاحب ایم اے علیگ جلد ثانی صفحہ ۱۲ تا ۲۴ پر درج ہے۔

---

(۱) انھیں مداخلتوں میں سے ایک یہ بھی ہے کہ اسماعیل پاشا خدیو مصر کو معزول کرایا۔ مورخ مذکور کہتا ہے ''برطانیہ اور فرانس کو سخت غصہ آیا اور انھوں نے باب عالی (سلطان عبدالحمید خاں ثانی مرحوم) پر دباؤ ڈال کر اسماعیل کو خدیو کے عہدے سے معزول کرا دیا۔ ۲۶ رجون ۱۸۷۹ء کو باب عالی کا ایک تار اسماعیل کو ملا جس میں اسے اطلاع دی گئی تھی کہ وہ معزول کیا گیا اور اس کی جگہ اس کا لڑکا توفیق خدیو مصر مقرر کیا گیا۔ (ص، ۲۱۸)

بالآخر انگریزوں نے ۱۱/ جولائی ۱۸۸۲ء میں اسکندریہ پر بمباری کی اور انتہائی خفیہ اور علانیہ سازشوں غداریوں کے ساتھ اس جنگ کو دو برس تک جاری کر کے (۱) عرابی پاشا کو قید اور توفیق پاشا کو برسر اقتدار اس طرح لائے کہ وہ ان کے ہاتھ میں بالکل کٹھ پتلی تھا۔ مورخ مذکور مسٹر عزیز مندرجۂ ذیل الفاظ اس جنگ کے نتیجے کے متعلق صفحہ ۲۴۲ پر لکھتے ہیں:

''توفیق برٹش سنگینوں کے سائے میں اسکندریہ سے قاہرہ آیا اور برطانیہ کی سرپرستی میں عنان حکومت ہاتھ میں لی۔ شریف پاشا نے وزارت قائم کی۔ نئے دور کا افتتاح یوں ہوا کہ وطنی تحریک کے علم بردار باغیوں کی حیثیت سے عدالت میں لائے گئے۔ اعرابی پاشا کے لیے سزائے موت تجویز ہوئی، لیکن مسٹر بلنٹ نے ایک کثیر رقم اپنی جیب سے خرچ کر کے اس مقدمے کی پیروی جس انگریز بیرسٹر کے سپرد کی تھی اس نے صفائی میں ایسی شہادتیں پیش کیں کہ خدیو کو موت کی سزا منسوخ کر دینا پڑی تاہم اعرابی پاشا تمام عمر کے لیے جلاوطن کر کے سیلون بھیج دیے گئے۔ انگریزوں نے جس آسانی کے ساتھ مصر پر قبضہ پالیا تھا اس کے لحاظ سے یہ توقع نہیں کی جاسکتی تھی کہ وہ ملک کی حکومت توفیق کے حوالے کر کے خود واپس چلے جائیں گے۔ تل الکبیر کے بعد ہی انھوں نے مصر پر اپنا تسلط قائم کرنے کا فیصلہ کرلیا تھا اور اب وہ مالیاتی امور کے انتظام میں بھی فرانس کو شریک کرنے پر تیار نہ تھے، توفیق ان کے ہاتھ میں کٹھ پتلی کی طرح کام کر رہا تھا اس نے ایک انگریز ''کالوین'' کو اپنی حکومت کا تنہا مشیر مال مقرر کیا۔ لارڈ ڈفرن جو اس وقت قسطنطنیہ میں برطانوی سفیر تھا بحیثیت ہائی کمشنر کے مصر آیا اور حکومت کے آئندہ انتظام کا خاکہ مرتب کر گیا، اس خاکے کی تفصیلی خانہ پری ''سرایولین بیرنگ'' کے سپرد ہوئی۔ جس نے جنوری ۱۸۸۴ء میں بحیثیت قونصل جنرل کے چارج لیا یہی شخص ہے جو بعد میں لارڈ کرومر کے نام سے مشہور ہوا۔ اس کے آنے کے بعد مصر گویا سلطنت برطانیہ کا ایک صوبہ بن گیا۔ ملک کے ہر معاملے میں برٹش قونصل جنرل کی رائے فیصلہ کن تھی، مصری فوجیں انگریزی افسروں کے زیر کمان کردی گئیں۔ انگریزی فوجیں جن کی تعداد چھ ہزار تھی پورے ملک پر اپنا تسلط قائم کر چکی تھیں۔ برطانیہ نے اعلان کیا کہ مصر کی مالی حالت کے درست ہو جانے کے بعد انگریزی فوجیں واپس بلالی

جائیں گی، لیکن مالی حالت روز بروز خراب ہوتی گئی اور حکومت برطانیہ کی فرض شناسی نے کسی طرح گوارانہ کیا کہ غریب مصریوں کو اپنے سایۂ عاطفت سے محروم کر دے۔"

ہندوستان پر مظالم:

بہر حال اس جنگ مصر اور سوڈان میں جو کچھ خرچ ہوا چوں کہ ہندوستان کے سر منڈھا گیا اور مبلغ ایک کروڑ پچاس لاکھ پونڈ ہندوستان کے قومی قرضے میں ڈالا گیا جس کا سود ہمیشہ ہندوستان ادا کرتا رہا۔ اس جنگ میں ہندوستانی فوج کے بیشمار آدمی جو کہ قتل کیے گئے یا زخمی ہوئے، جو بے شمار سامانِ رسد و ہتھیار وغیرہ خرچ ہوا وہ سب اس نقد کے علاوہ ہے۔

اور چوں کہ جنوبی افریقہ کے ممالک ٹرانسوال وغیرہ بھی ہندوستان اور انگلستان کے راستے میں واقع ہیں، قدیمی راستہ راس امید کا انھیں ممالک سے گزرتا ہے، انگریز اسی راستے سے ہندوستان آئے تھے اور نہر سویز سے پہلے یعنی ۱۸۶۹ء سے قبل انھیں ملکوں سے ہوتے ہوئے آمد و رفت ہوا کرتی تھی اس لیے ان ملکوں کا تحفظ بھی ہندوستان ہی کے ذمہ قرار دیا گیا، چناں چہ ۱۹۰۰ء میں جبکہ ساؤتھ افریقہ میں بغاوت ہوئی اور بوئر کی لڑائی ظہور پذیر ہوئی تو اس کا خرچہ جو کہ دو کروڑ ساٹھ لاکھ (۲،۶۰،۰۰،۰۰۰) پونڈ تھا وہ بھی ہندوستان ہی پر ڈالا گیا۔ اور ہندوستان کے قومی قرضے میں محسوب ہوا۔ جس کا سود در سود ہندوستان برابر ادا کرتا رہا۔ جانی اور مالی مصارف اس کے علاوہ تھے۔

یہ قومی قرضہ (انڈین نیشنل ڈیٹس) ۱۸۵۷ء تک ۵ کروڑ دس لاکھ پونڈ تھا۔ ۱۸۶۲ء میں ۹ کروڑ ستر لاکھ پونڈ تک اور پھر ۱۹۰۱ء میں بیس کروڑ پونڈ تک پہنچ گیا۔ (خطبۂ صدارت مسٹر فضل حق از کتاب دت)۔

اسی قومی قرضے کی بنیاد جنگ پلاسی ۱۷۵۷ء میں رکھی گئی تھی۔ ہندوستان کے لیے (انگریزوں کے دعووں پر) جہاں بھی لڑائیاں ہوئیں خواہ ہندوستان کے اندر یا باہر وہ سب ہندوستان کے سر تھوپی گئیں اور ان کا صرفہ ہندوستان سے وصول کیا جاتا رہا۔ اور جو کچھ لوٹ میں وصول ہوتا تھا خواہ وہ کتنا بھی قیمتی ہوتا تھا وہ سب غنیمت شمار ہوتا رہا۔ اس کی کوئی گنتی نہیں ہوئی۔ چناں چہ

۱۷۵۷ء میں جنگ پلاسی میں	۳۰ لاکھ ۲۵ ہزار پونڈ

۱۷۸۲ء میں جنگ میر قاسم نواب بنگالہ میں	۵۲لاکھ پونڈ
۱۸۰۷ء میں جنگ مرہٹہ میں	۲کروڑ ۱۰لاکھ پونڈ
۱۸۲۹ء میں جنگ کابل اوّل میں	۳۸لاکھ پونڈ
۱۸۴۲ء میں جنگ نیپال میں	۱۰لاکھ پونڈ
۱۸۵۸ء جنگ آزادی ہند میں معہ جملہ مصارف وحصص کمپنی	۴کروڑ ساٹھ لاکھ پونڈ

یہ سب اسی قرضے میں شمار کیے گئے اور ہندوستان کے سر مڑھے گئے۔ ہندوستان ہمیشہ مقروض رہ کر سود ادا کرتا رہا۔ ''اس قرضۂ عامہ کی مقدار ۱۹۱۲ء میں چودہ ارب چودہ کروڑ تھی۔ ہندوستان کے قرضۂ عامہ کا جزو اعظم انگریزوں سے انگلینڈ میں لے کر حکومت ہند کو دیا گیا اور سالانہ سود ہندوستان سے وصول کر کے اہل انگلینڈ کو دیا جاتا رہا۔ چناں چہ ۱۶کروڑ پندرہ لاکھ سے زاید روپیہ صرف ایک سال ۱۲۔۱۹۱۱ء میں ہندوستان نے انگلستان کو محض بطور سود قرض عامہ ادا کیا گیا۔'' (علم المعیشت ص ۶۰) نیز وہ لکھتا ہے:

''ہندوستانی قرضۂ عامہ کی بنیاد ۱۸۵۷ء سے پڑی جب کہ کمپنی سے ہندوستان خریدنے کی قیمت اور غدر فرد کرنے کے کل مصارف ۴کروڑ ساٹھ لاکھ پونڈ ہندوستان سے وصول کرنے قرار پائے۔ مگر دت لکھتا ہے کہ اس کی بنیاد ۱۷۵۷ء یعنی جنگ پلاسی سے پڑی یہ کل رقم بطور قرض عامہ انگلستان میں لے کر ہندوستان کے نام لکھ دی گئی اور اس روز سے آج کے دن تک ایک رقم بطور سود ہندوستان سے انگلستان وصول کرتا رہا ہے۔ ذرا خیال تو کرو کہ گذشتہ نصف صدی (بقول دت ڈیڑھ صدی سے زائد) میں ہندوستان کتنی رقم بطور سود انگلستان کو ادا کر چکا ہوگا۔'' ص ۶۰۶

ہندوستان سے وہ بے شمار دولت جو لوٹ کر انگلستان پہنچائی گئی تھی جس کا تذکرہ ہم پہلے کر چکے ہیں اور جس کو ''پراسپرس برٹش انڈیا'' میں، مسٹر ڈگبی نے اور بروکس وغیرہ نے ''مال مال خزانوں'' کروڑوں آدمیوں کی صدیوں کی کمائی، اور تمام دول یورپ کے مجموعی خزانوں سے زیادہ لکھا ہے وہ کسی حساب میں نہیں لائے گئے۔

قبرص پر قبضہ:

اسی حفاظتِ راہِ ہندوستان کے سلسلے میں بحرابیض (بحیرۂ روم) کو زیر تسلط واقتدار رکھنے کی غرض سے جزیرہ سائپرس (قبرص) پر قبضہ کرنا اور اپنی بحری قوت کا مرکز بنانا ضروری سمجھا گیا۔ چناں چہ باب عالی (سلطان عبدالحمید خاں مرحوم) سے ۱۸۷۸ء میں ایک خفیہ معاہدہ کے ذریعے

حاصل کیا گیا۔ جو کہ معاہدۂ سان اسٹیفانو کی تنسیخ اور معاہدہ برلین کے انعقاد کے وقت بصورت امداد دولت علیہ واقع ہوا تھا۔ یہ جزیرہ معاہدہ برلن میں اس وقت تک کے لیے حوالۂ برطانیہ کیا گیا تھا جب تک روس گزشتہ جنگ کی ایشیائی فتوحات سے اپنا قبضہ نہ اٹھالے۔ نیز یہ جزیرہ برطانیہ کو اس غرض سے دیا گیا تھا کہ وہ روس کے مقابلے کے لیے وہاں سامان جنگ تیار رکھ سکے۔ سلطان کی فرمانروائی کا حق قائم رکھنے کے لیے سالانہ خراج کی ادائیگی ضروری قرار دی گئی۔ (تاریخ دولتِ عثمانیہ از محمد عزیز، ص ۱۷۵)

جبرالٹر اور مالٹا پر قبضہ:

بالآخر یہ جزیرہ جو کہ تین سو برس سے ترکی سلطنت میں چلا آتا تھا اور زرخیز تھا اور بحیرۂ روم میں بحری قوت کی مرکزیت کی شان رکھتا تھا، انگریز ڈپلومیسی کی نذر بن گیا۔ اس کے علاوہ جبرالٹر اسپین سے اور مالٹا جمہوریہ وینس سے حاصل کیا گیا جس کی تفصیل کتب تاریخ میں موجود ہے۔ بحر حال بحیرۂ روم پر برطانیہ نے مغربی کنارہ سے مشرقی کنارہ اور وسط پر پورا قبضہ کرلیا۔ واضح ہو کہ جبرالٹر اس بحیرہ کے مغربی سرے پر ہے اور سائپرس (قبرص) مشرقی سرے پر ہے اور مالٹا وسط میں واقع ہے۔ مالٹا کو شہنشاہی برطانوی بیڑے کا مرکز بنایا گیا جس کے بڑے مصارف کا بوجھ ہندوستان پر رکھا گیا اور یہی کہا گیا کہ یہ بیڑا ہندوستان کا ہے اور اسی کے لیے ہم نے رکھ رکھا ہے۔ ہندوستان کے لیے بحیرۂ روم میں حفاظت اور راستے کا امن وامان فوجوں اور تجارتی جہازوں کی حفاظت یہی کرتا ہے۔ کچھ بحری قوت سائپرس میں اور کچھ جبرالٹر میں بھی ہمیشہ رکھی گئی، مگر اس پر کفایت نہیں کی گئی بلکہ ہمیشہ اس کی کوشش جاری رہی کہ بحرِ ابیض کے سواحل پر ہمارا یا ہمارے یورپین حلیفوں کا قبضہ ہو جس کی کچھ تفصیل ہم عنقریب ذکر کریں گے۔

ظالم نے تیرے صید نہ چھوڑا زمانے میں:

انگریزوں نے قوت پاتے ہی تمام ایشیائی اور افریقی ممالک کو غلام بنانے اور اپنے جبروت و اقتدار کے ماتحت کچلنے اور ان کو لوٹ کر اپنے ملک اور قوم کو تنومند اور موٹا بنانے اور تمام باشندگان ایشیا و افریقہ کا خون ہمیشہ چوستے رہنے کی کوششیں شروع کر دیں، بالخصوص جب کہ ۱۸۵۷ء میں اپنے جبر و استبداد کا وحشیانہ مظاہرہ کرنے کے بعد انھوں نے تمام ہندوستان کو اپنے گمان میں فنا کر دیا تھا تو دوسرے ممالک پر انتہائی چالاکی اور عیاری کے ساتھ پل پڑے، سب سے زیادہ انھوں

نے حکومت عثمانیہ (ترک) کو اپنے تیرو نشتر کا نشانہ بنایا اور اسی طرح ایران، چین، ہند چینی، جاوا، برہما، سماٹرا وغیرہ اور افریقہ کے سواحل اور ممالک پر چیرہ دستی شروع کی، مگر اس کی تفصیل کے لیے ضخیم ضخیم مجلدات درکار ہیں، ہماری مختصر تالیف اس کی متحمل نہیں ہوسکتی، تاہم ہم مختصر نوٹ دربارۂ سلطنت عثمانیہ وغیرہ پیش کرتے ہیں تاکہ ناظرین اس سے برطانیہ کی نیت اور طرزِ عمل سے وہ امور اندازہ کرلیں جن کو حضرت شیخ الہند رحمۃ اللہ علیہ نے اندازہ کیا تھا۔ اس مقام پر ہم اقوام یورپ اور ترکی کی پرانی تاریخ کو پیش کرنے سے اعراض کرتے ہوئے صرف ۱۸۵۶ء سے واقعات کو اجمالاً شروع کرتے ہیں جب کہ برطانیہ کو کافی اقتدار اور قوت حاصل ہوگئی تھی۔

صلح نامۂ پیرس:

۱۸۵۶ء، ۱۵ر فروری کو پیرس میں ایک معاہدے کی مجلس منعقد ہوئی جس میں دولت عثمانیہ، فرانس، انگلستان، روس، آسٹریا، ساڈینیا کے نمائندے شریک ہوئے آخر میں پرشیا کو بھی شریک کر لیا گیا، ایک ماہ کے بحث و مباحثہ کے بعد ۳۰ر مارچ ۱۸۵۶ء کو صلح نامۂ پیرس مرتب ہوا اور مذکورہ بالا سات حکومتوں کے نمائندوں نے اس پر دستخط کیے، اس کی خاص دفعات حسب ذیل تھیں:

(۱) ان حکومتوں نے دولت عثمانیہ کو باضابطہ طور پر مجلس دول یورپ کا رکن بنالیا اور اس کی آزادی اور اس کے مقبوضات کی سالمیت کے لیے متحدہ طور پر ضمانت کی۔

(۲) سلطان نے بلا امتیاز نسل و مذہب تمام رعایا کی اصلاح حال کا وعدہ کیا اور یورپین حکومتوں نے صراحت کے ساتھ اعلان کیا کہ سلطنت عثمانیہ کے اندرونی معاملات میں دخل دینے کا مجموعی یا انفرادی طور پر انھیں کوئی حق حاصل نہ ہوگا۔

(۳) بحرِ اسود تمام قوموں کے تجارتی جہازوں کے لیے کھول دیا گیا لیکن جنگی جہازوں کا داخلہ ممنوع قرار پایا، روس اور دولت علیہ کو اس کے ساحلوں پر اسلحہ خانہ قائم کرنے کی بھی مخالفت کردی گئی۔

(۴) وہ تمام علاقے جو دورانِ جنگ میں فریقین نے فتح کرلیے تھے واپس کردیے گئے، چناں چہ قارص دولت علیہ کے حوالے کردیا گیا، اور کریمیا روس کے۔

(۵) ایک بین الاقوامی کمیشن کی نگرانی میں دریائے ڈینیوب بھی تمام قوموں کے جہازوں کے لیے کھول دیا گیا۔

(۶) جنوبی بسرابیا کا علاقہ جس پر روس نے قبضہ کرلیا تھا مولڈیویا میں شامل کردیا گیا، مولڈ

یویا اور ولاچیا کی ریاستوں پر باب عالی کی فرماں روائی بدستور رکھی گئی، روس ان ریاستوں کے حق سے جس کا وہ بلا شرکت غیرے دعویدار تھا دست بردار ہوگیا اور ان کے حقوق کا تحفظ مذکورہ حکومتوں نے مجموعی طور پر اپنے ذمہ لے لیا، ان ریاستوں کو حکومت خود اختیاری کے حقوق عطا کیے گئے، انھیں مذہب قانون سازی اور تجارت کی پوری آزادی اور ایک قومی مسلح فوج رکھنے کی اجازت دی گئی،

(۷) سرویا کو بھی یہی حقوق دیے گئے، البتہ قومی فوج رکھنے کی اجازت اسے نہ ملی، اس کے اندرونی معاملات میں باب عالی کی فوجی مداخلت دول یورپ کی اجازت کے بغیر ممنوع قرار دی گئی۔

ضمنی معاہدے!:

صلح نامہ پیرس کے تکملہ کے بعد اسی روز دو معاہدے اور مرتب ہوئے ایک کی رو سے ۱۸۴۱ء کے معاہدہ کی تجدید کی گئی اور دردانیال اور آبنائے باسفور میں غیر حکومتوں کے جنگی جہازوں کا داخلہ بند کر دیا گیا، دوسرا صرف زار اور سلطان کے درمیان ہوا، جس کی بنا پر ہر فریق کو چھ چھوٹے اسٹیمر اور چار ہلکی کشتیاں بحرِ اسود کی ساحلی ضروریات کے لیے رکھنے کی اجازت دی گئی۔

۱۵ اپریل کو ایک عہد نامہ اور ہوا، جس میں برطانیہ، آسٹریا، فرانس نے مجموعی اور انفرادی طور پر دولتِ عثمانیہ کی آزادی اور سالمیت کو قائم رکھنے کی ضمانت لی اور عہد کیا کہ صلح نامۂ پیرس کے کسی جزو کی خلاف ورزی جنگ کا سبب قرار دی جائے گی۔ (نقشِ حیات: حصہ دوم، ص ۸۹۔۷۹)

آریہ سماج:

۱۸۷۵ء: عصرِ حاضر کے ہندومت کی ایک اصلاحی، تجدیدی اور تبلیغی تحریک، جس کی بنیاد سوامی دیانند (۱۸۲۴۔۱۸۸۳ء) نے ۱۸۷۵ء بمبئی میں ڈالی۔ دیانند نے آریہ سماج کی بنیاد ویدوں (ہندوؤں کے مقدس مذہبی صحیفوں) کی سچی تعلیمات پر رکھی، انھوں نے ویدوں میں بعد کی تمام تحریفوں اور ترمیم و اضافہ کی مذمت کی۔ دیانند کے بیان کے مطابق ویدیں آریہ سماج کی زندگی کا سرچشمہ اور صداقت و علم کا مخزن ہیں، آریہ سماج بت پرستی کا مخالف اور توحید کا قائل ہے، وہ مذہبی طبقے کی اجارہ داری کے بھی خلاف ہے، وہ خاندان اور خاندانی پیشہ پر مبنی جات پات کے

نظام کی مذمت کرتا ہے اور اسے ویدوں کی تعلیمات کے منافی قرار دیتا ہے، اس کا کہنا ہے کہ جاتوں کو لیاقت کی بنیاد پر قائم ہونا چاہیے، اس کی اصلاحی سرگرمیوں میں بچپن کی شادی کا خاتمہ اور چھوت چھات کا ازالہ شامل ہے۔ اس کی تنظیم مقامی سماجوں پر مشتمل ہوتی ہے، جو اپنے نمایندے چن کر صوبائی سماجوں اور کل ہند سماج کو بھیجتے ہیں، ہر مقامی سماج جمہوری طریقے پر اپنے عہدے دار خود چنتا ہے۔ ۱۹۳۱ء میں آریہ سماج کے دس لاکھ رکن تھے۔

آریہ سماج کا مقصد ہندوؤں کے اندر نئی زندگی اور طاقت لانا اور قومی شعور اور اپنی تہذیب سے افتخار کا جذبہ بیدار کرنا ہے۔ اس کے لیے آریہ سماجیوں نے سارے ہندوستان میں اسکولوں اور دیانند ویدک کالجوں کا ایک جال بچھا دیا، جہاں ویدوں کے ساتھ جدید علوم کی بھی تعلیم دی جاتی ہے۔

(فرہنگِ سیاسیات: مرتبین: محمد محمود فیض و حسن علی جعفری، دہلی، ۱۹۸۴ء، ص ۲۱)

قحط:

۱۸۷۷ء:

۲۷ راگست ۱۸۷۷ء لوگ مشہور کرتے ہیں کہ لارڈ لٹن صاحب گورنر جنرل ہندوستان اور کوپر صاحب لیفٹیننٹ گورنر اضلاع مغربی و شمالی و اودھ کی نیت اچھی نہیں ہے، یہی امر باعث خشک سالی ہے، یہ دونوں صاحب ان عہدوں پر جدید مقرر ہوئے ہیں۔

۵ رستمبر ۱۸۷۷ء غلہ روز بروز گراں ہوتا جاتا ہے، آج نرخ گندم کا ۱۴ سیر نمبری اور چنے و جو ۱۵ سیر نمبری تھا، بارش مطلقاً نہ ہوئی، خلق اللہ کو ہراس و نا امیدی بہ درجۂ غایت ہے۔

۱۶ رستمبر ۱۸۷۷ء ہوا گرم مثل بیساکھ و جیٹھ کے چلتی ہے۔ اخیر شب کو سردی ہوتی ہے۔ پانی کے آثار بالکل معلوم نہیں ہوتے، نرخ غلہ کا بالمرہ گھٹتا جاتا ہے خلائق از حد پریشان اور کاشتکار اپنے مویشی اُتر لیے جاتے ہیں۔

۲۳ رستمبر ۱۸۷۷ء خشک سالی کی شکایت ترقی پذیر ہے۔ آثارِ قحط بہ وجوذ پیدا ہیں۔ صدہا آدمیوں نے گداگری اختیار کی، خدا اپنا فضل فرمائے۔

۲۷ رنومبر ۱۸۷۷ء جب کہ باعث خشک سالی اسامی فاقہ کر رہے ہوں تو وصول ہونا مال گزاری کا سخت دشوار ہے لیکن افسوس ہے کہ سرکار کوئی عذر سماعت نہیں کرتی

(ایک نادر روزنامچہ از سید مظہر علی سندیلوی۔ ص ۴، ۵، خدا بخش لائبریری جرنل (۵۶)، پٹنہ)

۱۸۷۸ء:

کابل: ۲۵ر اکتوبر ۱۸۷۸ء منجانب انگلش گورنمنٹ بہ افسری چمبرلین صاحب کابل کو سفارت جاتی تھی بمقام علی مسجد، فیض محمد خان گورنر علی مسجد ۱۸۷۸ء نے حسب اشارت میر شیر علی خان والی کابل سفارت کو آگے جانے سے روکا لہذا سرکار نے حکم فراہمی فوج بند ھنے لام کا بہ مقام پشاور دیا ہے، غالباً تھوڑے زمانے میں لڑائی ہو۔

۱۵ر نومبر ۱۸۷۸ء: پشاور میں فوج انگریزی بہت مجتمع ہوگئی ہے۔ غالباً عنقریب واسطے جنگ کے روانہ کابل ہو۔

۲۳ر نومبر ۱۸۷۸ء: سرکار اور امیر شیر علی والی کابل سے لڑائی شروع ہوگئی ہے۔ ۲۱ر نومبر ۱۸۷۸ء کو اس کا آغاز ہوا تھا۔ ۲۲ر ماہ حال کو قلعۂ علی مسجد فتح ہوگیا اور سرکار انگریزی کے قبضے میں آیا۔

۴ر دسمبر ۱۸۷۸ء: فوج انگریزی نے مقام، بنوار، کو شیر علی خان والی کابل سے خالی کرالیا اور فوج آگے کی طرف بڑھتی چلی جاتی ہے۔

۱۸۷۹ء:

۲۵ر مارچ ۱۸۷۹ء: جنگ کابل ابھی تک ختم نہیں ہوئی ہے۔ ایک فوج کابلی مع سامان کثیر واسطے مقابلہ انگریزوں کے کابل سے جلال آباد کو گئی۔

۹ر ستمبر ۱۸۷۹ء: معائنہ اودھ اخبار سے دریافت ہوا کہ میجر کو گنارل صاحب ریذیڈنٹ و دیگر حکام انگلش بمقام کابل بالا حصار قتل ہوئے کوئی شخص فوج انگریزی کا باقی نہیں رہا جس کا سبب یہ ظاہر کیا جاتا ہے کہ فوج کابلی امیر صاحب غدر کرکے باعث اس قتل عام کی ہوئی ہے اور امیر یعقوب خان بھی بحالت محصوری ہیں لہذا فوج انگریزی قندھار سے واسطے تادیب فوج باغی کے کابل بھیجی گئی ہے۔

۱۲ر اکتوبر ۱۸۷۹ء: سرکار انگلشیہ نے بسر کردگی جنرل رابٹ کابل کو فتح کیا۔ (ایک نادر روزنامچہ، ص ۷۳)

شیخ الاسلام مولانا سید حسین احمد مدنی
مختصر سوانح حیات

سنہ و تاریخ ولادت:

۱۲۹۶ھ، ماہِ شوال کی انیسویں تاریخ کی شب میں گیارہ بجے دوشنبہ کے دن گزر جانے کے بعد یعنی شب سہ شنبہ میں بمقام بانگر مئو ضلع اناؤ میں پیدا ہوا۔ تاریخی نام چراغ محمد ہے۔ حضرت والد صاحب مرحوم نے اپنی بیاض میں صرف یہی تحریر فرمایا ہے۔ تاریخ و سنہ عیسوی نہیں لکھا ہے حساب سے ۱۶/ اکتوبر ۱۸۷۹ء ہوتا ہے۔

اس زمانے میں والد صاحب مرحوم قصبہ بانگر مئو میں اردو مڈل اسکول کے ہیڈ ماسٹر تھے اور کئی سال سے معہ متعلقین وہاں ہی مقیم تھے ۱۸۷۷ء میں اس سے پہلے میرے منجھلے بھائی مولانا سید احمد صاحب مرحوم بھی وہاں ہی پیدا ہوئے تھے جس زمانے میں میری پیدائش ہوئی' اس زمانے میں موسمی تپ ولرزہ کا بہت زور تھا اموات زیادہ ہوتی تھیں۔ والدہ مرحومہ فرماتی تھیں کہ عموماً بچے اور ان کی مائیں جو کہ اس زمانے میں زچہ ہوئیں تھیں، ضائع ہو گئے، تمام قصبہ میں صرف میں اور ایک دوسری عورت بمعہ بچے کے سالم بچی تھی۔

ابتدائی پرورش بانگر مئو ہی میں ہوئی۔ میں بہت ہی چھوٹا تھا جب کہ والد مرحوم بانگر مئو چھوڑ کر وطنِ آبائی قصبہ ٹانڈہ میں قیام گزیں ہوئے، چوں کہ اس پردیسی اقامت کی وجہ سے زمینداری کا انتظام نہیں ہو سکتا تھا، اس لیے انھوں نے کوشش کی کہ تبدیلی ٹانڈہ کو ہو جائے۔ حکام بالا نے اس وجہ سے اس میں لیت ولعل کی کہ ٹانڈہ کے ہیڈ ماسٹر کی تنخواہ (۲۰ روپے) ماہوار ہے اور تم کو یہاں (۳۰ روپے) ماہوار ملتے ہیں، یہ مقدار تم کو وہاں نہیں دی جا سکتی مگر ضروریات وقت نے مجبور کیا کہ اس قلت تنخواہ پر بھی تبدیلی کرالی جائے۔ بالآخر وہ وہاں سے تبدیلی ہو کر ٹانڈہ چلے آئے مجھ کو وہاں سے آنا بالکل یاد نہیں۔ غالباً تین برس کی عمر ہوگی اس کے بعد بارہ برس کی عمر تک ٹانڈہ ہی میں رہنا اور ابتدائی تعلیم حاصل کرنا نصیب ہوا۔

سلسلۂ نسب حسب ذیل ہے۔ حسین احمد بن سید حبیب اللہ بن سید پیر علی بن سید جہانگیر بخش بن شاہ نور اشرف بن شاہ مدن بن شاہ محمد ماہ شاہی بن شاہ خیر اللہ بن شاہ صفت اللہ بن شاہ محب اللہ بن شاہ محمود بن شاہ لدھن بن شاہ قلندر بن شاہ منور بن شاہ راجو بن شاہ عبدالواحد بن شاہ محمد زاہدی بن شاہ نور الحق رحمہم اللہ تعالٰے۔

مورث اعلیٰ:

شاہ نورالحق رحمہ اللہ وہ مورث اعلیٰ ہیں جو کہ اس سرزمین ''الہ داد پور قصبہ ٹانڈہ'' میں پہلے پہل تشریف لاکر اقامت گزیں ہوئے اس زمانے میں قوم رجبھر کا ٹانڈہ کے گردونواح میں تمام دیہات وغیرہ پر قبضہ اور تصرف تھا اور وہ مسلمانوں کو ستاتے رہتے تھے۔ حضرت شاہ نورالحق صاحب مرحوم نے پہنچ کر ان کو دعوتِ اسلام دی، مگر وہ لوگ اور راجہ مقابلہ پر آئے۔ آپ نے بہ زورِ کرامت اُن کو زک دی، اُن کا راجہ قلعہ چھوڑ کر بھاگ گیا۔ آپ نے وہیں اقامت فرمائی اور اس موضع کا نام الہ داد پور رکھا، جس کی وجہ تسمیہ ظاہر ہے، قلعے کے آثار اب تک موجود ہیں، شمالی دیوار اور مشرقی برجوں کے باقی ماندہ پتھر وغیرہ باقی ہیں، اسی قلعے میں آپ کے اور آپ کی تمام اولاد کے مزار اب تک بنتے چلے آتے ہیں۔

شجرۂ طریقت:

آج ہمارے خاندان میں کوئی ایسا کاغذ یا تحریر موجود نہیں ہے جس سے ظاہر ہو کر موصوف کہاں سے آئے تھے اور سلسلۂ نسب فوقانی کیا ہے اور کس زمانے میں آئے؟ مگر شجرۂ طریقت میں جو کہ آپ شاہ داؤد چشتی کے اور وہ شاہ قطب الدین چشتی کے اور وہ شاہ نجم الدین چشتی کے اور وہ شاہ ردمی چشتی کے اور وہ حضرت خواجہ قطب الدین بختیار کاکی رحمہم اللہ تعالٰے کے خلیفہ ہیں۔

یہ شجرۂ طریقت بہت پرانے کاغذات میں پایا۔ اس کا تصنیف کرنے والا والد ماجد مرحوم کے پڑدادا شاہ نوراشرف قدس اللہ سرہ العزیز کا کوئی مرید یا بیٹا ہے۔

یہ شجرہ شاہ نورالحق صاحب تک شجرہ طریقت بھی ہے اور نسب نامہ بھی ہے، مگر ان کے بعد کا نسب نامہ شجرۂ طریقت سے جدا ہوتا ہے، نسب نامہ اور دیگر احوال کی تفصیل حضرت شاہ ولایت احمد صاحب لاہر پوری کی مساعی جمیلہ سے حسب ذیل حاصل ہوئی ہے۔ جس کے ہم نہایت شکرگزار ہیں۔ جزاھم اللہ خیر الجزاء.

بعض تفصیلات متعلق سلسلۂ نسب:

عہد سلطان مبارک شاہ جون پوری (یہ دوسرا بادشاہ جونپور کا تھا) ۸۰۲ھ لغایت ۸۰۴ھ اس کے مختصر عہد میں اکثر سادات مستقر خلافت جون پور میں تشریف لاکر بحصول علوفہ وجاگیر علیٰ قدر

مراتب بادشاہ مرحوم سے مواضعات مفصلۂ ذیل میں مسکن گزیں ہوئے۔

موَرثان سادات ٹانڈہ ضلع فیض آباد و سادات مسوی و سادات بچھوکر و سادات بلو پور گنہ کادی پور ضلع سلطان پور و سادات دردے پور و سادات کمال پور تکنی و سادات منڈیا ہو پرگنہ خاص و سادات دیوگاؤں پرگنہ خاص (ذکر سادات ٹانڈہ) سادات آں بسیار نجیب اند و اکثر درقبائلِ ایشاں صاحبِ جاہ وجلال بودہ اند ودر سیادت ایشاں ہیچ شکے نیست اور سادات بوی وخرسوان بھی نہایت صحیح النسب تھے۔ وصلت و مصاہرت ان کی سادات ٹانڈہ سے تھی، سادات ٹانڈہ وغیرہ حضرت سید احمد توختہ تمثال رسول (علیہ السلام) کے اولاد میں ہیں۔ اس طرح سید شاہ زید بن سید شاہ [1] احمد زاہد بن سید شاہ [2] حمزہ [3] بن سیّد شاہ ابوبکر [4] ابن سید [5] شاہ عمر بن سید [6] شاہ محمد بن حضرت مخدوم سید شاہ [7] احمد توختہ تمثال رسول (علیہ السلام) بن [8] سید علی بن سید حسین [9] بن سید محمد مدنی [10] المعروف بہ سید ناصر ترمذی بن سید [11] حسین بن سید موسیٰ [12] حمصہ بن سید [13] علی بن سیدّ حسین [14] اصغر بن حضرت امام علی [15] زین العابدین (علیٰ جدہ وعلیہ السلام) سید محمد مدنی عرف سید ناصر ترمذی تشریف لائے اور ان کی اولاد سے حضرت مخدوم سید احمد توختہ تمثال رسول (علیہ السلام) لاہور تشریف لائے اور ۶۰۲ھ میں وصال ہوا۔ لاہور میں مزار ہے۔ ان کی اولاد میں سے سید شاہ زید بن سید شاہ احمد زاہد موَرث سادات ٹانڈہ وغیرہ کے ہیں۔ اُن کی اولاد میں سے ایک بزرگ سید شاہ عبدالوہاب قدس سرہ کا مزار بمقام شاہ دھورہ متصل جونپور ہے۔ ان کی ایک کرامت یہ تھی کہ ان کے مکان کے سامنے سے جس کسی کافر کا جنازہ نکلتا تھا تو پھر جل نہ سکتا تھا۔ یہ بزرگ چشتی تھے۔ حضرت سید احمد توختہ تمثال رسول (علیہ السلام) کے کوئی اوپر کے اجداد سے حضرت سلطان الطائفہ جنید بغدادی قدس سرہ کے خلیفہ تھے ان کو حضرت نے دعا دی تھی کہ تمہاری نسل میں بکثرت اولیا اللہ ہوں گے اور ہمیشہ ایک قطب ہوا کرے گا......

حضرت مخدوم سید نورالحق چشتی ٹانڈوی قدس اللہ سرہ العزیز حضرت سید احمد توختہ تمثال رسول صلی اللہ علیہ وسلم (قدس اللہ سرہ) کی اولاد سے تھے اور وہ سید محمد مدنی المعروف بہ سیّد ناصر ترمذی کی اولاد سے تھے اور وہ حضرت سید حسین اصغر بن حضرت امام علی زین العابدین ابن شہید کربلا حضرت امام حسین (علی جدہ وعلیہم السلام) کی اولاد سے تھے متفق علیہ نسابین ہے (عمدۃ الطالب، منبع الانساب، کنز الانساب، ائمۃ الہدیٰ، تاریخ آئینہ اودھ)..........

والد صاحب مرحوم فرماتے تھے کہ میں جب صفی پور اور بانگر مئو میں ہیڈ ماسٹر تھا اور لوگوں سے تذکرہ آتا تھا کہ میں سادات سے ہوں اور میرا خاندان پیرزادوں کا خاندان ہے تو لوگ تصدیق

نہیں کرتے تھے کیوں کہ اودھ کے شہروں میں ٹانڈہ کپڑوں کے بننے والوں (نور بافوں) کی بستی مشہور تھا اور......اس لیے لوگ یہی سمجھتے تھے کہ یہ بھی اسی قوم میں سے ہوں گے، مگر حضرت مولانا فضل الرحمٰن صاحب گنج مرادآبادی قدس سرہ العزیز نے ایک روز بھرے مجمع میں فرمایا:

مدرس (۱) تو سیّد اور پیرزادے ہیں ان کے مورث اعلیٰ شاہ نور الحق رحمۃ اللہ علیہ بہت بڑے اولیاء اللہ میں سے ہیں۔ رات میرے پاس وہ آئے تھے اور مجھ سے کہتے تھے کہ میرے بیٹے حبیب اللہ کا خیال رکھو! بھئی یہ تو بڑے پیرزادے ہیں۔"

اس کے بعد سے ان کی نظر التفات مجھ پر بہت زیادہ ہوگئی اور لوگوں کے خیالات میرے نسب کے متعلق بدل گئے اور یہ مقالہ حضرت مولانا رحمۃ اللہ علیہ کا مشہور ہوگیا۔

والد صاحب مرحوم فرماتے تھے کہ میں نے اوائل عمر میں خواب دیکھا تھا کہ حضرت فاطمہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا ایک بڑے تالاب کے کنارے ایک درخت کے نیچے بیٹھی ہوئی چرخا کات رہی ہیں اور میں اپنے آپ کو بچہ پاتا ہوا اور تالاب کے دوسرے کنارے پر ہوں۔ میں نے دیکھا کہ میں تالاب میں تیرتا ہوں ان کی طرف اس طرح جا رہا ہوں جیسے بچہ اپنی ماں کے پاس جاتا ہے، میں خواب ہی میں ان کو ماں سمجھ رہا ہوں اور وہاں پہنچ گیا ہوں۔ ہجرت کرنے کے بعد انھوں نے مدینۂ منورہ میں اس کو ذکر کیا اور فرمایا کہ سمجھ میں نہیں آیا کہ کیا مطلب تھا میں نے عرض کیا کہ تعبیر تو ظاہر ہے آپ سمندر کے دوسرے کنارے پر تھے ہجرت کر کے مدینۂ منورہ حضرت فاطمہ رضی اللہ عنہا کے پاس پہنچ گئے نسبی سلسلے میں وہ ماں ہیں ہی!

نیز ایک مرتبہ فرمایا کہ مجھ کو نسب نامہ کی تلاش تھی تو میں نے خواب میں دیکھا کہ حضرت امام حسین رضی اللہ عنہ گھوڑے پر سوار جہاد کو جا رہے ہیں اور میں ان کے پاس کھڑا ہوا ہوں تو مجھ کو فرمایا کہ تو میری اولاد سے ہے۔ بہر حال یہ امور اگرچہ قطعی حیثیت سے تعیین نسب پر روشنی نہیں ڈالتے، مگر کچھ نہ کچھ روشنی ضرور ڈالتے ہیں۔

والد صاحب مرحوم کے مختصر حالات:

حضرت والد صاحب مرحوم جیسا کہ پہلے گزر چکا ہے، قدرت کی فیاضیوں سے بہت کچھ فیض

(۱) حضرت مولانا قدس اللہ سرہ، والد صاحب مرحوم کو "مدرس" فرمایا کرتے تھے (مصنف)

یاب ہوئے تھے۔ دل اور دماغ بے نظیر پائے تھے۔ اگر ماحول مساعدت کرتا تو بے نظیر تبحر اور محقق عالم ہوتے اور علم معرفت اور تصوف میں بھی اعلیٰ درجہ حاصل کرتے یا اگر دنیوی علوم حاصل کرتے تو اپنی اعلیٰ قابلیت کی بنا پر اعلیٰ درجہ کے مناصب ضرور حاصل کرتے تاہم باوجود ہر قسم کی عسرت اور تنگدستی کے جس نے ان کو بچپن کے زمانے سے چاروں طرف سے گھیر لیا تھا اُنھوں نے حیران کن ترقی کی اور نہ صرف عسرت اور تنگدستی کو دور کیا بلکہ حضرت مولانا فضل الرحمن صاحب قدس سرہ العزیز کی بارگاہ میں حاضر ہو کر ذکر و فکر و مراقبہ میں جد و جہد کی اور بڑے درجے تک اس میں کامیاب ہوئے، کشف ان کا بہت قوی اور زیادہ تھا۔ متعدد مکاشفات ان کے صحیح ثابت ہوئے انھیں میں سے یہ بھی ہے کہ انھوں نے مدینۂ منورہ میں ایک مرتبہ فرمایا تم میں سے ایک شخص کو ہندوستان جانا ہوگا۔ میں نہیں جانتا تھا کہ یہ قرعہ فال مجھ دیوانے پر پڑے گا، دنیا اور اہل دنیا سے ان کو نفرت تھی۔ حضرت مولانا گنج مرادآبادی سے ان کو خلافت اور اجازت زندگی میں ظاہراً نہیں ملی تھی مگر بعد از وفات حضرت مولانا رحمتہ اللہ علیہ کو والد صاحب نے خواب میں دیکھا کہ میں تم کو اجازت بیعت دیتا ہوں، اس بناء پر دو شخصوں کو ٹانڈہ میں بیعت کیا تھا اور یہی وجہ تھی کہ انھوں نے اپنی اولاد کو (حال آں کہ وہ علوم دنیاویہ میں اعلیٰ قابلیت کا اظہار کر چکے تھے اور بڑے بھائی صاحب مرحوم اور بھائی سید احمد صاحب مرحوم مڈل کلاس کے امتحانوں میں پورے صوبۂ اودھ سے تمام طلبہ میں نمبر اول نکلے تھے) انگریزی تعلیم کی طرف متوجہ نہیں کیا اور علوم دینیہ ہی کی طرف لگایا، ہمیشہ یہی فکر رہی کہ میری اولاد نہیں علوم عربیہ میں اعلیٰ قابلیت حاصل کرے۔ انھوں نے جب کہ ہم سب بڑے ہو گئے تھے جمع کیا اور فرمایا کہ میں نے تم سبھوں کو اس لیے پرورش کیا کہ تم اللہ کے راستے میں جہاد کرو اور کچھ کر کے شہادت حاصل کرو، اُن کی ہی رغبت اور خواہش کی وجہ سے ہم سبھوں کو طریقت کا شوق ہوا اور حضرت گنگوہی قدس اللہ سرہ العزیز کے دربار کی خاکروبی کا شرف حاصل ہوا۔ انھیں کی حُسن توجہ کا نتیجہ تھا کہ نہ صرف ہندوستان میں اس بارگاہ کی حاضری اور اس کا توسل نصیب ہوا بلکہ مدینۂ منورہ پہنچنے کے بعد بھی باوجود مشکلات اپنی اولاد کو اس دربارِ دُربار میں بھیجا اور جب کہ اخیر میں بھائی سید احمد صاحب مرحوم کوئی برس گنگوہ شریف کے قیام میں لگ گئے تو حضرت گنگوہی رحمتہ اللہ علیہ کو لکھا کہ سید احمد اگر کسی قابل ہو گیا ہو تو اس کو اجازت دے کر یہاں بھیج دیجیے مجھ کو اس کی ضرورت ہے اور اگر کسی قابل نہیں ہوا تو بہتر ہے کہ آپ کی چوکھٹ پر سر مار مار کر وہیں مر جائے۔ اس کلام پر حضرت گنگوہی قدس اللہ سرہ العزیز بہت خوش ہوئے اور فرمایا کہ مولوی سیّد احمد کے والد چوں کہ سلوک اور طریقت سے واقف ہیں اس لیے اس کی قدر اور منزلت جانتے ہیں اور پھر بھائی سید احمد صاحب کو مزید تاکید ذکر وغیرہ کی فرمائی اور حسن توجہ زیادہ

کردی مدینۂ منورہ کے قیام کے زمانے میں اتباع سنت اور التزام جماعات خمسہ وغیرہ میں باوجود ضعف اور پیرانہ سالی انتہائی کوشاں رہتے تھے۔ سخت سردیوں اور سخت گرمیوں میں بھی اس طرح اوقات کی پابندی فرماتے تھے کہ ہم نوجوان اس سے عاجز رہتے تھے، اپنے اوراد وظائف، مراقبہ وغیرہ کے اخیر تک نہایت پابند رہتے تھے، امور خانہ داری اور ضروریات تعمیر وغیرہ کے انجام دینے میں بھی انتہائی جفاکشی کرتے رہتے تھے بسا اوقات تعمیری اوقات میں گارا بنانا، پتھروں اور گارے کا معماروں تک پہنچانا، روڑوں وغیرہ کو جمع کرنا اور غیر تعمیری اوقات میں اینٹ پاتھنا، بازار میں ہر روز جاکر مناسب تعمیرات اشیا کا خریدنا، کھونٹیوں اور چارپائی کے پایوں کا بنانا وغیرہ وغیرہ۔ (حال آں کہ کبھی ہندوستان میں ان چیزوں کے کرنے کی نوبت نہیں آئی تھی) اور جب ہم میں سے کوئی کہتا تھا کہ اب آپ پیرانہ سالی کے اس درجے پر پہنچ گئے ہیں کہ آپ کو صرف آرام کرنا چاہیے آپ دن رات ان مشقتوں میں کیوں بسر کرتے ہیں تو فرماتے کہ مجھ سے پڑے پڑے بیکار نہیں رہا جاتا۔

سلب مرض وغیرہ اعمال نقشبندیہ میں ان کو عمدہ ملکہ تھا، بلکہ ایک مرتبہ سخت خطرہ میں اسی وجہ سے پھنس گئے تھے، جب کہ ایک سخت مریض کا ٹانڈہ میں انھوں نے سلب مرض کیا تو وہ مریض تو اچھا ہو گیا مگر خود مرض میں اس قدر مبتلا ہو گئے کہ لوگ ان کی زندگی سے مایوس ہو گئے۔ کیوں کہ سلب مرض میں ان کا طریقہ تھا کہ اولاً مرض کو اپنے اوپر کھینچتے تھے اور پھر اپنے اوپر سے دفع کر دیتے تھے۔ اس مرتبہ چوں کہ مرض شدید تھا اس لیے طبیعت سنبھال نہ سکی اور نہ دفع کر سکی بالآخر خود مبتلا ہو گئے۔

تعویذ اور عملیات میں بھی ان کو اچھا خاصا ملکہ اور کامل مہارت تھی۔ فرمایا کرتے تھے کہ ایک زمانے میں مجھ کو اس کی اس قدر مہارت ہو گئی تھی کہ امراض کے لیے نقش خود تصنیف کیا کرتا تھا اور اُن سے فوائد ہوتے تھے۔ مجھ کو زبانی اجازت اعمال و نقوش دیتے وقت فرمایا کہ اس بیاض میں (ان کی اپنی قلمی بیاض) جس قدر اعمال ہیں میرے زکوٰۃ دیے ہوئے ہیں، تجھ کو زکوٰۃ کی ضرورت نہیں ہے، میں تجھ کو اجازت دیتا ہوں۔ مگر بہتر یہ ہے کہ یہ تمام اعمال میرے سامنے ایک مرتبہ کر لے۔ مگر میں نے بے وقوفی اور تکاسل سے اس سے اعراض کیا اور مشاغلِ علمی کو اہمیت دیتا ہوا اس مشغلہ کو قابلِ اعتنا نہ سمجھا جس کی وجہ سے بعد میں پچھتانا پڑا۔

علاوہ خاندانی اعمال کے والد صاحب مرحوم نے لکھنو اور صفی پور وغیرہ کے قیام کے زمانے میں بہت سے اعمال مشاہیر سے حاصل کیے تھے، پھر اس پر مزید یہ ہوا کہ حضرت مولانا فضل الرحمن صاحب گنج مرادآبادی قدس اللہ سرہ العزیز نے جب کہ ان کے پاس رسالہ معدن الاعمال

والمسائل مولوی محمد رمضان صاحب مرحوم بوڑیوی نے چھپوا کر بھیجا تو والد صاحب کر بلا کر یہ رسالہ دیا اور فرمایا کہ میں ان تمام اعمال کی جو اس میں مذکور ہیں تم کو اجازت دیتا ہوں۔

۱۳۲۷ھ میں جب کہ میں ہندوستان میں تھا والد صاحب مرحوم نے اسی رسالہ معدن الاعمال کی پیشانی پر خود مندرجہ ذیل تحریر فرمائی:

بسم اللہ الرحمن الرحیم.

الحمد للہ رب العلمین والصلوٰۃ والسلام علی سیّد المرسلین. اما بعد!

میں عبد ضعیف حبیب اللہ اس کتاب کے سارے عملیات وتعویذات کے کرنے ولکھنے وکسی کو (مگر اہل کو) بخش دینے کی اجازت فرزند حسین احمد کو اسی طرح دیتا ہوں جس طرح سے مجھ کو حضرت مرشدنا مولانا فضل الرحمن صاحب رحمۃ اللہ علیہ نے بلا عمل وادائے زکوٰۃ کے بخشا وعطا فرمایا ہے، پس اس کو بھی عمل کرنے وزکوٰۃ دینے کی چنداں ضرورت نہیں۔ ان شاء اللہ تعالے وہ قادر مطلق یونہی خلق اللہ کو نفع دیوے گا۔ اسی طرح دوسری قلمی کتاب کی بھی میں نے اس کو اجازت دی۔ اللہ تعالے لوگوں کو اس سے فائدہ پہنچاوے، آمین!

اگر فرزند سیّد احمد بھی طلب وخواہش رکھتے ہوں تو ان کو بھی یہ اجازت نامہ بس ہے فقط۔

حبیب اللہ بقلم خود

۲۰ر جمادی الثانی ۱۳۲۷ھ (۹ر جولائی ۱۹۸۹ء)

انھوں نے مدینہ منورہ میں پہنچ کر مصارف سفر میں سے جو سرمایہ بچا تھا حسب قواعدِ فرائض وارثت تقسیم کر دیا تھا اور فرمایا تھا کہ میں نے ہجرت کی نیت کی ہے تو میں یہاں ہی مرنے کے لیے آیا ہوں۔ میں تو یہاں سے بہر حال نہیں جاؤں گا، تم سبھوں کو میری طرف سے اجازت ہے، خواہ یہاں رہو یا ہندوستان چلے جاؤ، کیوں کہ ایسے شفیق مربی ضعیف العمر کا تنہا چھوڑنا انتہائی بے مروتی تھا۔ اس لیے نہ کوئی اولاد میں سے اور نہ والدہ ماجدہ اُن کے فراق پر راضی ہوئے۔ اگرچہ سوائے والد ماجد مرحوم کسی نے بھی ہجرت کی نیت نہیں کی تھی اور سب نے قصد کیا تھا کہ جب تک وہ زندہ

ہیں یہاں ہی رہیں گے، اور سرمایۂ مذکور سے تجارت وغیرہ کا ارادہ کیا گیا۔

شاعری کا ذوق!

والد صاحب مرحوم کو طبعی طور پر شاعری سے بھی دلچسپی تھی اور بالخصوص ہندی بھاشا میں ان کے قصائد بہت زوردار اور مؤثر اور مضامین تصوف سے بھرے ہوئے ہیں۔ فارسی اور اردو میں نعتیہ اشعار ان کے بہت ہیں حضرت مولانا فضل الرحمٰن صاحب گنج مرادآبادی کے فراق میں (بعد از وصال) بہت پُر درد اشعار انھوں نے لکھے ہیں، جن میں سے چند قصائد برفغاں دل ہاشمی وغیرہ میں شائع بھی ہوئے ہیں، جن سے والد صاحب مرحوم کی قابلیت اور افتاد طبیعت کا پتا چلتا ہے''۔

اس مقام پر حضرت شیخ الاسلام نے فارسی زبان میں تین قطعاتِ نعت، ایک نعتیہ قطعۂ اردو، ایک بھاکا اور اردو کی مخلوط نعت اور بھاکا زبان میں ایک بجھن (مناجات) اور حضرت مرشد مولانا فضل الرحمٰنؒ کے وصال کے بعد ایک بروگ (فراق نامہ یا نالۂ فراق) کے کچھ اشعار نقل فرمائے ہے لیکن ان کی زبان ہمارے لیے قطعاً نامانوس اور عسیر الفہم ہے، اس لیے یہاں انھیں ترک کر دیا ہے۔ اربابِ ذوق اور شائقین محترم ''نقش حیات'' سے رجوع فرمائیں۔ یہاں بہ طور نمونۂ کلام نعت میں تین) فارسی قطعات اور ایک اردو قطعۂ نعت نقل کیا جاتا ہے (ا۔س۔ش)۔

قطعات:

قطعاتِ نعت در فارسی!

ایں جمال و حسنِ عالم سوز تو — ویں رُخِ پُر نور دل افروز تو
کرد بسمل صد ہزاراں جبرئیل — ناوک مژگانِ سینہ دوز تو

جان و دل رامی بردو یک آن تو — ایں چہ حسن است اے عجائب شان تو
سوخت از دردت حبیب ارچہ عجب — اے بسا جبریل شد قربان تو

اے بہار باغ رضوان کوے تو — بلبل سدرہ اسیر موے تو
سجدہ ریزاں آمدہ سویت حبیب — اے ہزاراں کعبہ در ابروے تو

قطعۂ نعتِ اُردو!

چار و ناچار جو محفل سے ترے جاتے ہیں — حسرت و رنج و قلق ساتھ وہ لے جاتے ہیں
جاں سے جانا ہے ترے پاس سے جاناں جانا — جیتے جاتے ہیں مگر مُردہ بنے جاتے ہیں
ایک ہم ہی رہے اس بزم میں باقی ساقی — لوگ میخانے سے پی پی کے چلے جاتے ہیں
اے رسول عربی آپ کی فرقت کے قتیل — پل محشر سے سُبک پار اُتر جاتے ہیں
سر رہے یا نہ رہے پر رہے سودا سر میں — عشق احمدؐ کا خدایا یہی ہم چاہتے ہیں

اس حبیبِ دلِ خستہ پہ نظر ہو جائے
دردمندوں کی دوا آپ کیے جاتے ہیں!

اذکار واشغال:

زمانۂ شباب اور مدرسی میں ان کی طبیعت ریاضی اور حساب میں بہت ہی زیادہ تیز تھی ہر ایک کے مشکل سے مشکل سوالات آناً فاناً میں حل کر دیتے تھے۔ مگر آخری عمر میں تصوف کا اس قدر غلبہ ہو گیا تھا کہ سب کو بھلا بیٹھے تھے اور جب کبھی ایسے مسائل کا تذکرہ آتا تو فرما دیتے کہ اب میں سب بھول گیا، جفاکش اس قدر تھے کہ احاطے میں مکان بنوایا ہے چھ سات کنویں اور پائخانے اور بالوعے اپنے ہاتھوں سے کھودے۔ حال آں کہ وہاں کی زمین جس (یعنی جمے ہوئے کنکروں والی) ہے بڑی مشکلوں سے گھنٹہ بھر میں ڈیڑھ دو بالشت کھودی جاتی تھی۔

موصوف مدینۂ منورہ میں یا تو ذکر و فکر، اوراد و وظائف اور صلوٰۃ وسلام میں مشغول رہتے تھے یا کبھی کبھی اپنے ہم عمر مہاجرین ہند اہل صلاح وتقوی کے پاس بیٹھ کر دل بہلاتے تھے۔ عام لوگوں سے میل جول نہایت کم تھا اور نہ فضول اور لایعنی باتوں میں وقت ضائع فرماتے تھے۔ حقہ پینے کے بہت عادی تھے اور چوں کہ حضرت مولانا فضل الرحمٰن صاحب مرحوم حقہ پیتے تھے۔ اس لیے ان کا ہر مرید تقریباً اس کا عادی پایا جاتا تھا، عرب میں خمیرہ تمباکو نہ ہونے کی وجہ سے ہم لوگ جس طرح بھی ہوتا تمباکو لے جانے اور منگوانے کی کوشش کرتے تھے۔ ترکی حکومت کے سخت کسٹم کی وجہ سے اس میں دقتوں کا سامنا بھی ہوتا تھا پان اور تمباکو کھانے کے بھی عادی تھے۔

گرفتاری اور اڈریانوپل روانگی ونظر بندی:

۱۳۳۳/۳۴ھ (۱۶-۱۹۱۵ء) میں جنگ عمومی ہو رہی تھی اور حکومت ترکیہ بھی داخل جنگ تھی

اور حضرت مولانا شیخ الہند قدس اللہ سرہ العزیز اور مولانا خلیل احمد صاحب قدس اللہ سرہ العزیز حجاز تشریف لے گئے تھے اور شریف حسین نے انگریزوں سے مل کر بغاوت کردی تھی تو مختلف اسباب کی بناء پر مدینۂ منورہ کی پولیس کو ہمارے خاندان سے خصوصاً اور تمام ہندوستانیوں سے عموماً بدظنی پیدا ہوگئی۔ حضرت شیخ الہند'' کے مدینۂ منورہ سے روانگی مکہ کے بعد جناب والد صاحب کو معہ ہر دو بھائی مولانا سید احمد صاحب مرحوم و عزیزم محمود سلمہ کے اڈریانوپل بے خبری کی حالت میں گرفتار کر کے بھیج دیا گیا، بچوں اور عورتوں کو مدینۂ منورہ ہی میں چھوڑ دیا گیا۔ بہت کچھ عرض کیا گیا مگر فوجی احکام تھے کوئی شنوائی نہیں ہوئی۔ اس زمانے میں مولانا عبدالحق صاحب مدنی مہتمم مدرسہ شاہی مسجد مراد آباد کی ایک بہن، بھائی سیّد احمد صاحب مرحوم کے نکاح میں تھیں۔ علاوہ ازیں موصوف سے اور تعلقات قدیمہ بھی تھے۔ بدیں وجوہ انھوں نے بچوں اور عورتوں کی خبر گیری میں بہت زیادہ ہمدردی اور جفاکشی کا ثبوت دیا۔ (جزاہ اللہ خیر الجزاء)

اس وقت عورتوں اور بچوں میں میری زوجہ اور ایک لڑکی دس گیارہ برس کی زہرہ اور ایک لڑکا اشفاق تقریباً ڈیڑھ سال کا اور بھائی سید احمد صاحب کی اہلیہ اور عزیزم محمود کی اہلیہ اور والد صاحب مرحوم کی اہلیہ ضعیف العمر تھیں اس تعدی اور ظلم کا اثر ان کی طبیعت پر غایت زیادہ ہونا ضروری تھا طبعی طور پر ان ضعفاء سے جدائی اور پھر تمام عمر کی وہ خواہش کہ آنحضرت ﷺ کی بارگاہ میں حاضری (جس کی وجہ سے وہ کسی جگہ کے لیے بھی مدینۂ منورہ سے نکلنا گوارا نہ کرتے تھے اور یہیں دفن ہونے کے آرزومند تھے) کے فوت ہونے کی وجہ سے غیر معمولی اثر اُن کے قلب اور دماغ پر پڑا تھا۔

اڈریانوپل نہایت سرد شہر ہے وہاں پر ان تینوں کو لے جا کر نظر بند کر دیا گیا۔ شہر سے ایک میل باہر نکلنے کی اجازت نہ تھی۔ تین اشرفی (نوٹ) ہر ایک کے لیے ماہوار مقرر کر دیا گیا، ترکی نوٹ اس وقت میں بہت زیادہ گر گیا تھا۔ والد صاحب مرحوم کی ضعیف طبیعت وہاں کی سخت سردی کو برداشت نہ کر سکی اور ذات الجنب میں مبتلا ہو کر ایڈریانوپل پہنچنے کے ایک ماہ بعد وفات پا گئے۔ (۱۹۱۷ء) انا للہ و انا الیہ راجعون. ایڈریانوپل ہی میں مدفون ہوئے......

ابونا اب لو کان للناس کلھم

اب مثلہ اغناھم بالمناقب!

والد صاحب مرحوم کا آخری حصۂ عمر بالخصوص والدہ مرحومہ کی وفات کے بعد بہت زیادہ

مکدر اور رنجیدہ گزرا ہے۔ ان کی اولاد اور اولاد کی اولاد اور گھرانے کے نفوس تقریباً چالیس نفری یکے بعد دیگرے وفات پا گئے۔ خود فرماتے تھے کہ تقریباً چالیس نفر اپنے گھرانے کے میں نے اپنے ہاتھ سے مدینۂ منورہ میں دفن کیے ہیں۔ مگر انتہائی ضبط اور صبر و استقلال پر عمل پیرا رہے۔ آخری زمانے میں ان کی اُمیدوں اور آرزوؤں کا خون اس طرح ہونا انتہائی مصیبت تھا کہ وفات اور دفن بھی مدینۂ منورہ میں حاصل نہ ہو سکا۔ ذلک تقدیر العزیز العلیم

میں اس زمانے میں حضرت شیخ الہند رحمۃ اللہ علیہ کے ساتھ انگریزی اسارت میں تھا۔ مالٹا میں ان کے انتقال کی خبر پہنچی تو نہایت قلق ہوا مگر بجز صبر و شکر چارہ ہی کیا تھا۔ فللہ الحمد والشکر علی ماقدر و قضیٰ" (نقشِ حیات، حصہ اول، ص ۵۳-۴۴)

میری تعلیم و تربیت اور ایامِ طفولیت:

مجھ کو ہوش و حواس جب آئے تو میں نے آپ کو ٹانڈہ میں پایا، بانگر مئو بالکل یاد نہیں۔ والدین مرحومین کو اولاد کی تعلیم و تربیت کا غیر معمولی اور بہت زیادہ خیال تھا اور اس کے لیے والد مرحوم بہت زیادہ سختی کرتے تھے اور ہر بچہ کو جب کہ چار برس کا ہو جاتا تھا، پڑھنے کے لیے بٹھا دیتے تھے اور نہ پڑھنے اور یاد نہ کرنے، کھیلنے پر خوب مارتے تھے، اس لیے مجھ کو کھیلنے کا موقع آزادی کے ساتھ صرف چار برس کی عمر تک ملا ہے۔ جب اس عمر کو پہنچا تو گھر میں والدہ مرحومہ کے پاس قاعدہ بغدادی اور اس کے بعد سیپارہ پڑھنا پڑتا تھا۔ صبح ساڑھے نو بجے تک یہ قید اور پڑھائی گھر میں ہوتی تھی اور ساڑھے نو بجے کھانا کھا کر والد مرحوم کے ساتھ اسکول میں جانا پڑتا تھا، اسکول الہ داد پور سے تقریباً ایک میل یا کچھ زائد دوری پر ہے۔ اسکول کی تعلیم میں بھی مدرسین اس زمانے میں خوب مار پیٹ کرتے تھے۔ اس وقت مجھ کو درجہ آٹھ میں داخل کر دیا گیا۔ (اس زمانے میں درجوں کی ترتیب اسی طرح تھی۔ مڈل کلاس کو اول درجہ کہا جاتا تھا۔ اور سب سے نیچے کا درجہ آٹھواں کہلایا جاتا تھا) چار بجے شام تک اسکول میں مقید رہنا پڑتا تھا، اس کے بعد والد صاحب مرحوم کے ساتھ ہی گھر آنا ہوتا تھا، گھر پر بھی سخت قید تھی۔ باہر نکلنا، گاؤں کے لڑکوں کے ساتھ کھیلنا، اس کی بالکل اجازت نہ تھی اور اگر کبھی غفلت دیکھ کر یا والد صاحب کی غیوبت میں موقع پا کر نکل جاتا تھا تو جب پتا چل جاتا تھا تو سخت مار پڑتی تھی۔ ایک بکری بھی والد صاحب نے اچھی نسل کی پال رکھی تھی اسکول جانے اور واپس آتے ہوئے اس کو اور اس کے بچوں کو ساتھ رکھنا پڑتا تھا۔ چوں کہ اسکول کا احاطہ بڑا تھا تو وہ لانبی رسی میں باندھ دی جاتی تھی اور دن بھر اس طرح چرتی رہتی تھی اور دیگر

اوقات فارغہ یا تعطیل میں مکان کے قریب جنگل میں اس کو اور اس کے بچوں کو چرانا پڑتا تھا (اس طرح یہ سنتِ نبوی علیہ السلام ادا کرنی پڑی تھی)۔ گاؤں میں میرا ہم عمر لڑکا ماموں زاد بھائی جواد حسین مرحوم تھا موقع پا کر اس کے ساتھ گولی کھیلتا تھا۔ صرف دو گھروں میں ہم آزادی کے ساتھ جا سکتے تھے۔ ایک تائے صاحب مرحوم کے یہاں، دوئم ماموں تفضل حسین صاحب مرحوم کے گھر میں۔ مگر چوں کہ تائے صاحب کے یہاں کوئی ہم عمر لڑکا نہ تھا اس لیے وہاں جانا بے سود ہوتا تھا جواد حسین مرحوم کے یہاں بھی کھیلنے کی اگر خبر ہو جاتی تھی تو مار پڑتی تھی۔ بہر حال ایام طفولیت میں صرف گولی کھیلنے کی نوبت آئی اور وہ بھی چھپ، لک کر، آزادی کے ساتھ وہ بھی نصیب نہ ہوا۔ پتنگ اڑانا یا گیند کھیلنا یا گلی ڈنڈا کھیلنا وغیرہ کبھی وہاں نصیب ہی نہ ہوا۔ گاؤں میں بعض ہم عمر اور بھی لڑکے تھے۔ مگر ان کے گھروں میں جانے کی اجازت نہ تھی۔ بھائی سید احمد صاحب مرحوم اور میں اوپر تلے کے تھے اس لیے وہ ہمیشہ کاٹ کرتے تھے (جیسے کے فطرتاً اوپر تلے کے بھائیوں کی عادت ہوتی ہے) وہ طبعی طور پر ابتدا سے سلیم الطبع تھے۔ کھیل کود کی طرف کم رغبت رکھتے تھے اور والدین مرحومین کی منشا کے مطابق زیادہ رہتے تھے۔ چھوٹے بچوں کی خبر گیری میں والدہ مرحومہ کی بہت زیادہ امداد کرتے تھے۔ میں جب کبھی غفلت دے کر کھیلنے کے لیے نکل جاتا تو وہی تلاش کرنے کے لیے بھیجے جاتے تھے اور وہ گوشالی کرتے ہوئے لا کر والد صاحب مرحوم کے سامنے پیش کر دیتے تھے اور پھر مار پڑتی تھی۔ الحاصل آٹھ برس اس طرح وطن میں قیام رہا اس میں پانچویں سیپارہ تک والدہ مرحومہ سے قرآن شریف ناظرہ پڑھنا ہوا۔ اس کے بعد آمد نامہ، دستور الصبیاں، گلستاں کا کچھ حصہ مکان پر پڑھنا ہوا اور اسکول میں دوئم درجے تک پڑھنا ہوا۔ اس وقت اسکول میں فنون اور کتب بہت زیادہ تھے۔ تمام اقسام حساب جبر و مقابلہ تک مساحت اور اقلیدس مقالۂ اولی، تمام جغرافیہ عمومی و خصوصی، تاریخ عمومی و خصوصی، مساحت عملی (تختہ جریب وغیرہ سے زمین ناپ کر با قاعدہ نقشہ بنانا) تحریر، املا، شکست لکھنا اور پڑھنا، اُردو، کورس وغیرہ سب اس عمر میں پوری طرح یاد اور مشق کر چکا تھا، اور ہر چیز میں اس قدر مہارت ہو چکی تھی کہ از بر بخوبی جواب دے سکتا تھا۔

میری دیوبند روانگی:

جب کہ تیرھواں سال عمر کا شروع ہوا اور بھائی سید احمد صاحب مرحوم اُردو، مڈل کلاس پاس کر کے ذیقعدہ ۱۳۰۸ھ جون (۱۸۹۱ء) میں دیوبند بھیج دیے گئے، بڑے بھائی صاحب پہلے سے

وہاں پڑھتے تھے اور ان کی کتابیں آخری تھیں جب وہ شادی ہو جانے کے بعد جانے لگے تو بھائی سید احمد صاحب بھی ان کے ساتھ کر دیے گئے۔ اب ہم مکان پر اس حیثیت سے آزاد ہو گئے کہ ہم کو ڈھونڈھ کر گھروں میں سے نکال لانے اور والد مرحوم کے سامنے پیش کر دینے والا کوئی نہیں رہا۔ طبیعت میں کھیل کود کا شوق تھا ہی، جہاں والد صاحب مرحوم نے کسی کام کو یا کسی کو بلانے کے لیے بھیجا تو اس کو انجام دیا اور ماموں صاحب کے گھر میں گھس گئے اور جواد حسین مرحوم کے ساتھ کھیلنا شروع کیا۔ وہاں ہر ایک ہم سے محبت سے پیش آتا تھا اور ہماری اس مظلومیت پر کہ ہم کو کھیلنے کا موقع نہیں دیا جاتا ہے، تیلی کے بیل کی طرح دن اور رات لکھنے پڑھنے میں لگا رہنا پڑتا ہے، ہم سے ہمدردی رکھتا تھا۔ اس وجہ سے والد صاحب کو سخت کلفت پیش آئی۔ اگر چہ مارا پیٹا بھی بہت زیادہ مگر بے سود معلوم ہوا، دو چار دن مار کا اثر رہا پھر وہی کھیل کا شوق سوار ہوا۔ بالآخر والد صاحب مرحوم نے طے کر لیا کہ اس کو یہاں نہ رکھنا چاہیے۔ اور دیوبند ہی بھیج دینا چاہیے، چناں چہ تین مہینہ بھائی صاحبوں کی روانگی کے گزرنے کے بعد جناب منشی فیروز الدین صاحب بٹالوی مرحوم کے ساتھ دیوبند بھیج دیا۔ منشی صاحب مرحوم بٹالہ ضلع گورداسپور پنجاب کے باشندہ اور والد صاحب مرحوم کے بہت زیادہ دوست اور فیض آباد میں محافظ دفتر تھے۔ پیر بھائی ہونے کی وجہ سے آپس میں بہت زیادہ خلوص اور ربط تھا وہ کسی ضرورت سے اپنے وطن بٹالہ کو جا رہے تھے۔ والد صاحب مرحوم نے ان کو کہا کہ حسین احمد کو اپنے ساتھ لیتے جائیے اور دیوبند پہنچا دیجیے چوں کہ سہارن پور ہی ہو کر ان کا راستہ تھا۔ اس لیے ان کو کوئی دقت نہ تھی۔

دیوبند میں تعلیم کا آغاز:

چناں چہ اوائل صفر ۱۳۰۹ھ (ستمبر ۱۸۹۱ء) میں، میں ان کے ساتھ دیوبند پہنچ گیا اور ہر دو بھائیوں کے زیر سایہ انھیں کے کمرہ میں حضرت شیخ الہند قدس اللہ سرہ العزیز کے مکان کے قریب رہنے لگا۔ یہ کمرہ حضرت رحمۃ اللہ علیہ کی مسجد کے سامنے کوٹھی میں واقع تھا۔ یہاں پہنچنے کے بعد گلستان اور میزان شروع کی۔ بڑے بھائی صاحب مرحوم نے حضرت شیخ الہند رحمۃ اللہ علیہ سے درخواست کی کہ آپ تبرکاً اس کو دونوں کتابیں شروع کرا دیں۔ مجمع میں حضرت مولانا خلیل احمد صاحب مرحوم اور دوسرے اکابر علماء موجود تھے۔ حضرت رحمۃ اللہ علیہ نے مولانا خلیل احمدؒ صاحب سے فرمایا کہ آپ شروع کرا دیں چناں چہ انھوں نے ہر دو کتابوں کو شروع کرا دیا اور پھر بھائی صاحب نے میزان، منشعب پڑھائی۔

اگر چہ تیرھواں سال عمر کا شروع ہو چکا تھا مگر جسم اس قدر دبلا اور پستہ تھا کہ کوئی دیکھنے والا یہ

اندازہ نہیں لگا سکتا تھا کہ اس کی عمر گیارہ سال سے زائد ہے۔ اس وجہ سے مجھ پر وہاں شفقت زیادہ کی گئی۔ وہاں اس قدر دور کے نو عمر اور چھوٹے طالب علم عموماً نہیں جاتے اور چوں کہ میں تحریر و حساب وغیرہ سے بخوبی واقف تھا، خط بھی فی الجملہ اچھا تھا اس لیے اساتذہ کے یہاں خانگی خطوط اور خانگی حسابات کی خدمت اور گھروں میں جانا اور پردے کا نہ کیا جانا وغیرہ کا سلسلہ کئی برس تک جاری رہا۔ بالخصوص حضرت شیخ الہندؒ کی اہلیہ محترمہ (رحمہا اللہ تعالیٰ) بہت زیادہ شفقت فرماتی تھیں۔ مستوراتی منشی مشہور ہو گیا تھا۔

دیوبند پہنچنے کے بعد وہ ضعیف سی کھیل کود کی آزادی جو کہ مکان پر تھی وہ بھی جاتی رہی۔ دونوں بھائی صاحبان اور بالخصوص بڑے بھائی صاحب سب سے زیادہ سخت تھے خوب مارا کرتے تھے۔ والد صاحب مرحوم تو ممکن ہے کہ ان کو مارتے وقت یا بعد میں کچھ شفقت آجاتی ہو مگر یہاں تو وہ بھی نہ تھی بہر حال اس تقید اور نگرانی نے مجھ میں علمی شغف زیادہ سے زیادہ اور لہو و لعب کا شغف کم سے کم کر دیا۔ فرحمهم الله وجازاهم احسن الجزاء

دارالعلوم دیوبند کی تعلیمات:

بھائی صاحب مرحوم نے گلستان کے تو شاید ایک ہی دو سبق پڑھائے، مگر میزان منشعب خوب توجہ سے پڑھائی۔ جب دونوں خوب یاد ہو گئیں تو اس کے بعد پنج گنج، صرف میر حضرت حکیم محمد حسن صاحب مرحوم کے پاس یکے بعد دیگرے پڑھیں اور یہ اسباق مدرسہ کے اوقات کے علاوہ خارج میں ہوئے اور اسی طرح بہت سے اسباق خارج اوقات میں عصر کے بعد مغرب کے بعد عشاء کے بعد ہوتے رہے جن کی وجہ سے مجھ کو جلد ترقی کرنے کا موقع ملتا رہا اور اپنے ہم سبقوں کو نیچے درجات میں چھوڑ کر اگلی جماعتوں اور کتابوں میں شمول کا امتیاز حاصل ہوتا گیا اور اس شغف اور پابندی کو دیکھ کر اساتذۂ کرام نے بھی اپنی عنایتیں زیادہ سے زیادہ مبذول فرمائیں۔

خلاصہ یہ کہ صفر ۱۳۰۹ھ (ستمبر ۱۸۹۱ء) سے شعبان ۱۳۱۶ھ (دسمبر ۱۸۹۸ء) تک دیوبند میں قیام رہا۔ اس مدت میں مندرجۂ ذیل کتابیں مندرجۂ ذیل اساتذہ کے پاس ہوئیں؛

(۱) حضرت شیخ الہند قدس اللہ سرہ العزیز: دستور المبتدی، زرادی، زنجانی، مراح الارواح، ، قال اقوال، مرقات، تہذیب، شرح تہذیب، قطبی تصدیقات، قطبی تصورات، میر قطبی، مفید الطالبین، نفحۃ الیمن، مطول، ہدایہ آخیرین، ترمذی شریف، بخاری شریف،

الوداؤد، تفسیر بیضاوی شریف، نخبۃ الفکر، شرح عقائد نسفی، حاشیہ خیالی، موطا امام مالک موطا امام محمد رحمہما اللہ تعالےٰ۔

(۲) مولانا ذولفقار علی صاحب (والد ماجد حضرت شیخ الہند رحمۃ اللہ علیہما): فصول اکبری۔

(۳) مولانا عبدالعلی صاحب رحمہ اللہ مدرس دوم دارالعلوم: مسلم شریف، نسائی شریف، ابن ماجہ، سبعہ معلقہ، حمد اللہ، صدرا، شمس بازغہ توضیح تلویح، تصریح۔

(۴) مولانا خلیل احمد صاحب مرحوم مدرس دارالعلوم دیوبند، تلخیص المفتاح

(۵) مولانا الحکیم محمد حسن صاحب مرحوم مدرس دارالعلوم دیوبند، پنج گنج، صرف میر، نحو میر، مختصر معانی، سلم العلوم، ملا حسن، جلالین شریف، ہدایہ اولین۔

(۶) مولانا المفتی عزیز الرحمٰن صاحب مرحوم مدرس دارالعلوم دیوبند: شرح جامی بحث فعل، کافیہ، ہدایۃ النحو، منیۃ المصلی، کنز الدقائق، شرح وقایہ، شرح مأتہ عامل، اصول شاشی

(۷) مولانا غلام رسول صاحب مرحوم بفوی مدرس دارالعلوم دیوبند: نور الانوار، حسامی، قاضی مبارک، شمائل ترمذی

(۸) مولانا منفعت علی صاحب مرحوم: میر زاہد رسالہ، میر زاہد ملا جلال، میبذی، خلاصۃ الحساب، رشیدیہ، سراجی،

(۹) مولانا الحافظ احمد صاحب مرحوم: شرح ملا جامی بحث اسم

(۱۰) مولانا حبیب الرحمٰن صاحب: مقامات حریری، دیوان متنبی۔

(۱۱) بڑے بھائی صاحب مرحوم۔ میزان الصرف، منشعب، ایساغوجی

غرضے کہ ان مختلف علوم وفنون کی یہ سرسٹھ کتابیں جو سترہ فنون سے متعلق ہیں ساڑھے چھ برس کی مُدت میں پڑھنے کا شرف حاصل ہوا۔ یہ کتابیں عموماً درس دلی اللہی سے تعلق رکھنے والی ہیں جو کہ ہندوستان کی عربی درس گاہوں میں جاری ہیں۔ کچھ کتابیں ادب، ہیئت، عروض، طب وغیرہ کی جو کہ داخل نصاب تھیں، باقی رہ گئی تھیں۔ سفر حجاز کی وجہ سے وہ پوری نہ ہوسکیں۔

حضرت شیخ الہند صاحبؒ مدرس اوّل تھے اور ان کے پاس طلبہ کی بڑی بڑی کتابیں ہوتی تھیں۔ ابتدائی کتابیں ان کے پاس نہ ہوتی تھیں اور نہ ہوسکتی تھیں، مگر چوں کہ حضرتؒ کے حقیقی بھتیجے منشی حبیب حسن صاحب ہماری جماعت میں تھے اور حضرتؒ کو ان سے بوجہ اُن کی حقیقی والدہ کے فوت ہوجانے اور قرابتِ قریبہ کے بہت زیادہ انس تھا اور اس وجہ سے بھی کہ حضرت رحمۃ اللہ

علیہ کو ہم تینوں بھائیوں پر بہت زیادہ شفقت تھی اور بڑے بھائی صاحب مرحوم خدمت میں غیر معمولی حاضری دیتے اور امور خدمت انجام دیتے رہتے تھے۔ اس لیے رعایت خاصہ فرماتے رہے اور مندرجۂ بالا ابتدائی کتابیں بھی مجھ کو پڑھائیں اور اکثر کتابیں خارج اوقاتِ مدرسہ میں پڑھائیں۔ پڑھنے میں بدشوق میں ہمیشہ رہا ہوں۔ کتابوں کا پوری طرح مطالعہ کرنا اور سبق پڑھنے کے بعد کتاب کو دیکھنا یا تکرار کرنا بہت کم ہوا۔ البتہ اس کا ہمیشہ التزام کیا کہ اسباق میں حاضری ضرور دیتا رہا اور حتی الوسع مقام درس میں سبق سمجھ لینے کی پوری جدوجہد کرتا تھا جب تک ابتدائی کتابیں ہوئیں جن کا تقریری امتحان ہوتا تھا امتحانوں میں عمدہ اور اعلیٰ نمبروں سے پاس ہوتا رہا مگر جب تحریری کتابیں آئیں یعنی درجۂ وسطیٰ اور اوپر کے درجۂ کی وہ کتابیں، جن میں تحریری امتحان ہوتا تھا) ان میں پہلے سال چھ کتابوں میں سے تین میں فیل ہوگیا۔ چوں کہ تحریری امتحانوں میں تمام کتاب میں سے صرف تین سوال دیے جاتے تھے اور کوئی متعین مبحث اور باب وفصل طالب علم کو بتلائی نہیں جاتی تھی، اس لیے اگر پوری کتاب پر اچھی طرح عبور نہ ہو اور مبحث اچھی طرح یاد نہ ہوں، امتحان میں کامیاب ہونا سخت مشکل ہوتا تھا۔ نیز قاعدہ یہ بھی تھا کہ تینوں سوالوں کے انفرادی نمبروں کو تین پر تقسیم کر کے اوسط نمبر نکالا جاتا تھا جس پر مدار کامیابی ہوتا تھا اس لیے اگر دو سوالوں کے جوابات عمدہ سے عمدہ بھی لکھے جائیں اور ایک کا جواب کچھ نہ ہو تو نمبر اوسط تین پر تقسیم ہونے کے بعد کامیابی کے نہیں ہوسکتے تھے۔ اس لیے سخت محنت کرنا ضروری ہوتا تھا اور بغیر اس کے پاس ہونا انتہائی دشوار ہوتا تھا، اس بناء پر میں نے ایام امتحان میں طریقہ اختیار کیا کہ رات کو کتاب ابتدا سے اخیر تک مطالعہ کرتا تھا اور تمام رات میں صرف ایک گھنٹہ یا اس سے بھی کم سوتا تھا۔ نیند کے دور کرنے کے لیے نمکین چائے کا انتظام کرتا تھا جب بھی نیند غالب آتی تھی اس چائے کو پیتا تھا جس سے گھنٹہ دو گھنٹہ کو نیند جاتی رہتی تھی کیوں کہ میں ہمیشہ سے نیند سے مجبور رہتا ہوں اور بالخصوص کتب بینی کے وقت تو نیند بہت ہی غالب آجاتی ہے۔ اس طریقے پر عمل کرنے کی وجہ سے مجھ کو تحریری امتحان کی مشکلات پر غلبہ حاصل ہوگیا اس کے بعد الحمدللہ کسی کتاب میں فیل ہونے کی نوبت نہیں آئی، بلکہ اپنی جماعت میں اکثر امتیازی نمبر حاصل کرتا رہا۔

دارالعلوم دیوبند کا امتحان!

دارالعلوم دیوبند کا امتحان ابتدا سے نہایت سخت رکھا گیا ہے، خواہ تقریری ہو یا تحریری! طالب

علم کو تقریری امتحان میں کوئی جگہ بتائی نہیں جاتی۔ جہاں سے ممتحن چاہے فوری طور پر پوچھتا ہے۔ طالب علم کو موقع اور وقت نہیں دیا جاتا۔ البتہ داخلہ کے امتحان میں کچھ آسانیاں کی جاتی ہیں اور تحریری امتحان میں بھی کسی جگہ کو کتاب سے متعین نہیں کیا جاتا ہے۔ صرف اس دن اور وقت کا اعلان کر دیا جاتا ہے جس میں امتحان ہونے والا ہے۔ پرچہ ہائے سوالات نہایت حفاظت سے چھپوائے جاتے ہیں۔ جن کا پتا لگنا طلبہ کو محال ہوتا ہے تمام کتاب میں سے جس مقدار کو طلبہ نے پڑھا ہے صرف تین سوال دیے جاتے ہیں۔ مفروضہ نمبر کچھ نہیں ہوتے اور نہ زاید سوالات دیے جاتے ہیں تاکہ طالب علم ان دس بارہ سوالات میں سے انتخاب کر کے جو سوالات پسند آئیں ان کو لکھے اور مفروضہ نمبروں سے ایک تہائی حاصل کر لینے پر کامیاب شمار کیا جا سکے۔ کاش اگر ایسا کیا جا سکتا (جیسا کہ سرکاری کالجوں اور یونیورسٹیوں وغیرہ میں رائج ہے) تو شاید ناکام طلبہ کا وہاں وجود ہی باقی نہیں رہتا۔ امتحان گاہ میں حفاظت وغیرہ کا انتظام مکمل کیا جاتا ہے، جس کی بنا پر طلبہ کو استمداد و استعانت کا موقع بالکل حاصل نہیں ہوتا۔ مگر افسوس ہے کہ دوسرے مدارس عربیہ میں اس قدر نگہداشت اور سختی نہیں ہوتی۔ جس کی وجہ سے عربی تعلیم میں بہت زیادہ خامیاں ہوتی ہیں۔ دارالعلوم دیوبند کے اساتذہ اور ممتحنین بھی دوسرے مدارس کے امتحانات اور پرچہ ہائے امتحان اور جوابات میں مجبور کیے جاتے ہیں کہ وہ کہیں بھی ایسی سختی عمل نہ لائیں جس کے وہ دارالعلوم میں عادی ہیں اور یہی وجہ ہے کہ جب دارالعلوم کا طالب علم کسی ادارہ (مولوی فاضل، مولوی عالم وغیرہ) میں داخل ہو جاتا ہے یا انگریزی زبان کے درجات میں تعلیم حاصل کر کے امتحان دیتا ہے، تو وہ اپنی جماعت میں غیر معمولی امتیاز حاصل کر لیتا ہے، جس کی نظیریں بہ کثرت موجود ہیں۔

دارالعلوم میں جب داخل ہوا تو اہتمام جناب حاجی عابد حسین صاحب مرحوم کا تھا، تھوڑے عرصے کے بعد جناب منشی فضل حق صاحب مرحوم مہتمم مقرر کیے گئے اور حضرت حاجی صاحب مرحوم مذکور الصدر بمنزلہ صدر مہتمم و رکن مجلس شوریٰ اُن کے نگہبان ہو گئے، پھر کچھ عرصے کے بعد مولانا محمد منیر صاحب نانوتوی رحمۃ اللہ علیہ مہتمم مقرر ہوئے اور پھر بعض وقائع کی بنا پر غالباً ۱۳۱۲ھ (۹۵-۱۸۹۴ء) میں مولانا الحافظ احمد صاحب خلف الصدق حضرت مولانا محمد قاسم صاحب نانوتوی رحمہما اللہ تعالیٰ مہتمم مقرر ہوئے اور تاحیات یعنی ۱۳۴۷ھ تک عہدۂ اہتمام پر رونق افروز رہے۔ ان کے زمانۂ اہتمام میں دارالعلوم نے بہت زیادہ ترقی کی۔

جس زمانے میں داخل مدرسہ ہوا، اس زمانے میں بیشتر طلبہ کی امداد اہالی دیوبند کھانوں سے کیا کرتے تھے۔ اصحاب استطاعت ایک ایک یا دو دو یا اس سے زاید طالب علموں کا کھانا دو وقتہ

اپنے یہاں مقرر فرما دیتے تھے اور یہی طریقہ ابتدائی قیام مدرسہ سے تھا، وظائف خوراک نقدی کی صورت میں ابتدا میں بہت کم تھے مگر بعد میں ایسے ناخوشگوار واقعات پیش آئے، جن کی وجہ سے عام طلبہ کو خوراک کے لیے نقدی وظائف دارالعلوم کی طرف سے جاری کرنے ضروری معلوم ہوئے پھر کچھ عرصے کے بعد دارالعلوم میں مطبخ کا انتظام ہو گیا جس کی بنا پر اہل شہر کی امدادِ طعام اور نقدی وظیفہ تقریباً نفی کے حکم میں ہو گیا۔

ہم تینوں بھائیوں کا بھی اُس زمانے میں دارالعلوم کی طرف سے کھانا، مقرر کیا گیا۔ چناں چہ میرا کھانا حضرت مولانا حافظ احمد صاحب خلف الصدق مولونا محمد قاسم صاحب رحمۃ اللہ علیہما کے یہاں اور بڑے بھائی صاحب کا حضرت شیخ الہند رحمۃ اللہ علیہ کے یہاں اور بھائی سید احمد صاحب کا دوسری جگہ مقرر ہوا۔ جب تک دیوبند میں رہا، تقریباً تمام مدت اقامت میں میرا کھانا، حضرت حافظ صاحب موصوف رحمۃ اللہ علیہ کے در دولت پر ہی رہا جزاہم اللہ خیر الجزاء

کھانوں کے تقرر کی وجہ سے طالب علم بالکل متفرغ ہو کر مشاغل علمیہ میں منہمک ہو سکتا تھا، نقدی وظائف یا اپنے پاس سے کھانے میں وقت بہت ضائع ہوتا تھا، اگر چہ میں بدشوق اور محنت و جفاکشی سے جان چور ہمیشہ سے تھا، مگر بحمد اللہ جوں جوں آگے بڑھتا گیا علمی شغف اور طبعی تناسب بھی روز افزوں ہوتا گیا اور اسی وجہ سے لہو ولعب بھی غیر مرغوب ہو گیا، اگر چہ بعد میں قیود شدیدہ سے آزاد ہو گیا تھا مگر مجھ کو اس سے بہت کم دوچار ہونے کا موقع ملا۔

ابتدا ابتدا میں مجھ کو منطق اور فلسفہ سے بہت شغف رہا، پھر علم ادب سے شغف ہو گیا۔ مقامات حریری اور دیوان متنبی اور سبعہ معلقہ کے قصائد اور عبارتیں کی عبارتیں از بر یاد ہو گئیں تھیں پھر علم حدیث سے شغف ہو گیا اور پہلے دونوں شغفوں میں کمی آ گئی اور علم حدیث کے انہماک ہی میں دور طالب علمی ختم ہو گیا۔

ابتدا سے نمبر ہائے امتحانیہ ۱۸، ۱۹، ۲۰ مقرر تھے اول درجہ بیس کا تھا اور اوسط انیس کا اور ادنیٰ اٹھارہ کا اس سے کم نمبر پر طالب علم انعامی نمبروں سے گرا ہوا شمار ہوتا تھا اور اس کو فیل ہونے والا کہا جاتا تھا اگر کوئی طالب علم غیر معمولی استعداد والا ہوتا تھا اس کو ممتحن بیس سے زائد نمبر بھی دیتا تھا جو کہ درجۂ اعلیٰ کے نمبروں میں سے سمجھا جاتا تھا بحمد للہ اس زمانے میں اکیس اکیس اور بائیس بائیس اور تیئیس تیئیس بھی متعدد کتابوں میں نمبر آتے رہے۔ اس کے بعد اراکینِ مدرسہ نے امتحانی اور تعلیمی ضرورتوں کی بنا پر اس قاعدے میں تبدیلی کی اور ادنیٰ درجہ کامیابی کا چالیس اور متوسط درجہ

پینتالیس اور اوّل درجہ پچاس مقرر کیا۔ اس تغیر کے بعد امتحانات میں اکاون، باون، ترپن اور صدر امیں پچھتر نمبر تک حاصل ہوئے۔ وللہ الحمد! (نقشِ حیات، حصہ اول صفحہ ۶۰-۵۳)

ذریعہ معاشِ خاندان:

۱۸۵۷ء کے انقلاب کے وقت خاندان کے پاس تیرہ یا چودہ گاؤں تھے، جن کی وجہ سے مشترکہ خاندان نہایت ثروت اور رفاہیت سے گزران کرتا تھا۔ مشہور ہے کہ تخت دہلی سے کسی زمانے میں بہتر دیہات کی جاگیران اطراف میں تین خاندان پر تقسیم تھی جن میں سے ایک الہ داد پور کا ہمارا خاندان بھی تھا جس کو چوبیس گاؤں دیے گئے تھے۔ چوں کہ کاغذات ضائع ہو گئے، اس لیے یہ نہیں معلوم ہو سکا کہ یہ عطیہ کس بادشاہ کے وقت میں ہوا تھا اور کس وجہ سے ہوا تھا۔ والد صاحب مرحوم فرماتے تھے کہ بادشاہ دہلی کے یہاں پرچہ گزرنے پر مصارف خانقاہ کے لیے یہ دیہات دیے گئے تھے (واللہ اعلم)

۱۸۵۷ء میں خانقاہ وغیرہ کے کوئی آثار باقی نہ تھے اور ان میں مالکانہ تصرفات اہل خاندان کے جاری تھے اور اس سے پہلے گیارہ گاؤں غیر معلوم انقلابات اور اسباب کی بنا پر قبضہ واقتدار سے نکل چکے تھے انگریزی حکومت کے زمانے میں جو قدر و منزلت زمینوں اور جائدادوں کی بڑھ گئی ہے وہ بلکہ اس کی عشر عشیر بھی زمانہ سابق میں نہ تھا، معمولی ضرورتوں میں زمینوں کو فروخت کر دینا رہن رکھ دینا، بلکہ دوسروں کو بخش دینا، معمولی خدمتوں کے صلے میں گاؤں کا گاؤں ہبہ کر دینا وغیرہ وغیرہ مسلمانوں اور بالخصوص مسلم رؤسا کا بائیں ہاتھ کا کھیل تھا۔ غرضے کہ انھیں وجوہ کی بنا پر صرف تیرہ گاؤں باقی رہ گئے تھے۔ الہ داد پور، جڑاون پور، چاند پور، گوبھردن پور، مہری پور، فرید پور، رسول پور، بھکنا پور وغیرہ۔

اس زمانے میں انتظام زمینداری اکبر علی صاحب مرحوم میرے حقیقی نانا کے ہاتھ میں تھا، ۱۸۵۷ء کے آخری ایّام میں جب کہ وہ ضلع بستی کے بعض دیہات سے واپس ہوتے ہوئے دریائے گھاگھرا کو کشتی میں عبور کر رہے تھے اور متعلقین کو دوسری کشتی میں اس سے پہلے بھیج چکے تھے۔ آندھی چلی اور کشتی منجدھار میں اُلٹ گئی تو وہ اس حالت کو دیکھ کر تلوار لے کر دریا میں کود پڑے۔ تیر کر دریا کو پار کرنا چاہا، مگر پانی زور پر تھا اس لیے ڈوب گئے۔ اس کے بعد ہر قسم کی کوشش بچانے کی گئی مگر ڈوبنے سے بچنا تو درکنار لاش تک کا پتا نہ چلا۔

مرحوم سے بھیٹی کے راجہ کو عداوت اور سخت دشمنی تھی۔ اس نے موقع پا کر مکان پر حملہ کر دیا اور چاروں طرف سے گھیر لیا اس کا مطالبہ یہ تھا کہ اکبر علی صاحب مرحوم کے لڑکوں کا سر لوں گا۔ مرحوم کے تین لڑکے تصدق حسین، تفضل حسین، عبدالغفور اور لڑکی (والدہ ماجدہ مرحومہ) تھے۔ یہ بچے نو عمر تھے چوں کہ اس وقت امن کامل طور پر نہ ہوا تھا اور گاؤں میں اتفاقاتِ وقت سے کوئی بااثر قوی ہستی جو کہ راجہ اور اس کے سپاہیوں کا مقابلہ کرتی، موجود نہ تھی۔ عورتوں نے یہ احساس کر کے کہ مبادا یہ دشمن بچوں کو قتل کر دے۔ رات میں خادمات کا بھیس بدل کر بچوں کو لے کر شہر ٹانڈہ محلہ قصبہ میں جو کہ گاؤں سے قریب تھا چلی گئیں۔ وہاں قرابت داری پہلے سے تھی، شہر میں راجہ کا حملہ کرنا ممکن نہ تھا جب راجہ کو گھر خالی معلوم ہوا تو تمام اسباب اور سامان لوٹ لیا ایک مہنہ تک گاڑیوں میں لوٹ کا مال منتقل کرتا رہا اور ان دیہات پر قبضہ کر لیا جو کہ زیرِ تصرف تھے صرف دو گاؤں جڑاون پور اور الہ داد پور اس کے قبضے سے محفوظ رہ گئے۔ انھیں دو میں مختلف ورثا خاندان کے حصے ہوئے۔ بڑے ہو کر ہمارے ماموں صاحبان نے ان دیہاتوں کے لیے دیوانی میں دعوے دائر کیے مگر قلتِ سرمایہ اور دیوانی کے مصارف کی کثرت کی وجہ سے ایک مالدار زمیندار راجہ بھیٹی کا مقابلہ نہ کر سکے، بلکہ بقیہ زمینداری سے بھی ہاتھ دھونا پڑا، کیوں کہ مصارف مقدمہ کے لیے اپنے حصوں کو مہاجنوں کے یہاں رہن کر چکے تھے اور امید رکھتے تھے کہ کامیاب ہو کر رہن شدہ زمینوں کو چھڑا لیں گے۔ قرضہ سودی تھا اس سے خلاصی ناممکن تھی۔ نہایت تنگی اور افلاس سے سب کی بسر اوقات ہوتی تھی، مدار آمدنی پیری مریدی اور نذرانہ پر رہ گیا، ہر دو مذکورہ بالا گاؤں میں دادا مرحوم کا حصہ دو آنے آٹھ پائی تھا والد مرحوم جب کہ بانگر مئو سے تبدیل ہو کر ٹانڈہ پہنچے ہیں تو یہ حصہ بھی مہاجنوں کے یہاں مرہون تھا۔ فقط سیر کی زمین باقی تھی جس میں ہمارے تایا اشرف علی صاحب مرحوم زراعت کرتے تھے۔

والد صاحب مرحوم کی پیدائش اور تربیت:

۵۳-۱۸۵۲ء: والد صاحب مرحوم (سید حبیب اللہ بن سید پیر علی مرحوم) الہ داد پور ہی میں ۱۸۵۷ء سے چار پانچ برس پہلے پیدا ہوئے۔ ۱۸۵۷ء میں ان کو ہوش و حواس تھا اور اس سے پہلے کی رفاہیت اور یہ کہ اُن کے لیے مٹکے لڈؤں وغیرہ سے بھرے رہتے تھے۔

والد دادا صاحب مرحوم تین بھائی تھے، پیر علی، تیغ علی، نوازش علی (رحمہم اللہ تعالیٰ)

نوازش علی اور تیغ علی مرحومین لاولد تھے صرف پیر علی صاحب اولاد ہوئے۔ چوں کہ منجھلے دادا تیغ علی مرحوم اور ان کی اہلیہ مرحومہ کو اولاد کا بہت شوق تھا اس لیے جب کہ دادا مرحوم۔ کے منجھلے بیٹے نجیب اللہ پیدا ہوئے تو انھوں نے ان کو متبنیٰ بنایا اور گود لے لیا مگر قضائے الٰہی سے ان کی عمر نے وفا نہ کی اور بچپن ہی میں انتقال کر گئے۔ اس کا اثر سب پر بہت ہوا۔ اُس کے بعد والد صاحب مرحوم پیدا ہوئے تو دادا صاحب مرحوم نے زور دیا کہ اب اس بچے کو لے لو وہ تامل کرتے تھے مگر ان کو مجبور کیا گیا بالآخر انھوں نے والد صاحب مرحوم کو گود لے لیا اور دونوں میاں بیوی (مرحومین) نے نہایت محبت اور شفقت سے والد صاحب مرحوم کو پالا۔ تقدیر الٰہی نے ایسی پلٹی کھائی کہ ۱۸۵۷ء تک تینوں بھائی (دادا مرحومین) انتقال کر گئے۔ گھر میں سوائے عورتوں اور بچوں کے کوئی مربی صاحب اثر باقی نہ رہا۔ زمینداری اور ثروت چھن گئی۔ افلاس اور ادبار نے چاروں طرف سے گھیر لیا، منجھلی دادی مرحومہ نے نہایت تنگدستی کی حالت میں والد صاحب کی پرورش کی۔ میں نے ان کو بچپن میں دیکھا ہے اور فرمایا کرتی تھیں کہ میں نے چرخے کات کات کر حبیب اللہ کو پالا ہے۔

والد صاحب مرحوم نے فضل و کرم خداوندی سے ذہن اور حافظ بہت عمدہ پایا تھا۔ طبیعت نہایت تیز اور مستقیم تھی اس یتیمی اور افلاس کی حالت میں ٹانڈہ میں علمی درسگاہوں میں پہنچتے رہے اور قرآن شریف فارسی اور اسکول اُردو میں مڈل کلاس پاس کر لیا اور عنفوان شباب ہی میں ٹانڈہ کے قریب ہی پرائمری اسکول ''التفات گنج'' میں آٹھ روپے ماہوار پر مدرس ہو گئے۔ اس ملازمت کی بنا پر کسی قدر بسر اوقات کی سہولتیں پیدا ہو گئیں۔ کاش اگر اس زمانے میں کوئی مربی تکفل کرنے والا ہوتا تو وہ اپنی تعلیم میں بہت بڑی ترقی کر سکتے۔ التفات گنج ہی میں ان کو بطور خود ترقی کا خیال پیدا ہوا۔ تنخواہ اور ملازمت میں ترقی بغیر نارمل اسکول پاس کیے نہیں ہو سکتی تھی، اس لیے ان کو لکھنو جانا پڑا۔ اس زمانے میں تمام صوبہ میں نارمل اسکول صرف لکھنو میں تھا۔ وہاں پہنچ کر طبعی ذکاوت کی بنا پر بہت جلد عمدہ طریقہ پر کامیاب ہوئے اور پاس ہوتے ہی قصبہ صفی پور ضلع اناؤ میں ہیڈ ماسٹر ہو گئے اور پھر بانگرمئو میں تبدیل کر دیے گئے اور وہاں متواتر کئی برس تک مقیم رہے اسی تنگی اور افلاس اور فکر معاش کی وجہ سے علوم عربیہ حاصل نہیں کر سکے اگرچہ لوگ ان کو مولوی کہتے تھے، مگر وہ علوم عربیہ سے بالکل ناواقف تھے اور اسکول میں تدریسی مشغلہ کرتے تھے اس زمانے میں ایسے لوگ مولوی کہے جاتے تھے۔

نارمل پاس کرنے کے بعد انگریزی بعض احباب کی ترغیب سے شروع کی مگر شروع کرنے کے بعد پہلی ہی شب میں خواب میں دیکھا کہ دونوں ہاتھ پاخانہ سے ملوث ہیں اس کی وجہ سے ان کو انگریزی سے نفرف ہوگئی اور ملازمت کی کوشش میں کامیاب ہوگئے۔

والد صاحب مرحوم کی شادی:

جب کہ والد صاحب مرحوم اٹھارھویں سال میں تھے اور التفات گنج پرائمری اسکول میں ملازم تھے منجھلی دادی صاحبہ مرحومہ نے ضروری سمجھا کہ شادی کردی جائے، پہلے گزر چکا ہے کہ نانا اکبر علی صاحب مرحوم جائداد کے متولی ومتصرف تھے ۵۷ء میں دریائے گھاگھرا میں ڈوب گئے تھے تین لڑکے نوعمر اور ایک لڑکی (والدہ صاحبہ مرحومہ) چھوڑ گئے تھے۔ والدہ صاحبہ ان کی وفات کے وقت چھ مہینہ کی تھیں۔ ان سب بچوں کی پرورش یتیمانہ طریقے پر نہایت تنگدستی سے ہوئی۔ کیوں کہ باقی ماندہ زمینداری کی آمدنی بہت کم تھی اور کوئی بڑی عمر والا نہیں تھا۔ نانی صاحبہ مرحومہ بہت منتظم اور تعلیم یافتہ تھیں، انھوں نے فارسی اُردو وغیرہ بچوں کو حسب رواج وقت پڑھائی۔ دادی صاحبہ مرحومہ نے کوشش بلیغ کی کہ رشتہ خاندان ہی میں ہوجائے چناں چہ وہ کامیاب ہوگئیں اور جبکہ والدہ مرحومہ کی عمر چودہ برس کی تھی۔ شادی ہوگئی۔ سب سے بڑے بھائی محمد صدیق صاحب مرحوم الہ داد پور ہی میں ۱۲۸۸ھ (۱۸۷۱ء) میں پیدا ہوئے۔

والدہ ماجدہ:

نانی صاحبہ مرحومہ موضع نندرولی علاقہ بیکار پور ضلع فیض آباد کے سادات خاندان میں سے تھیں اُن کے ماموں بہت بڑے کامل ولی اللہ اور صاحب علم تھے انھوں نے نانی صاحب کی تربیت فرمائی تھی، علاوہ ہندی اُردو لکھنے پڑھنے کے نانی صاحبہ طریقت اور تصوف میں باکمال تھیں۔ کشف قبور وغیرہ میں ان کو مہارت تامہ تھی، ریاضت شاقہ اور ذکر واذکار وغیرہ میں بہت زیادہ جدو جہد فرماتی تھیں۔ انھوں نے والدہ مرحومہ کو بھی اُردو ہندی پڑھائی، ہندی لکھنا بھی سکھایا، اور ہندی بھاشا میں ہنس جواہر، پدماوت وغیرہ کتابیں بھی پڑھائیں۔ تصوف کا چسکا بھی پیدا کرادیا جو کہ حضرت مولانا فضل الرحمن صاحب گنج مرادآبادی قدس اللہ سرہ العزیز سے بیعت ہوجانے کے بعد اور بھی زیادہ ہوگیا۔ چناں چہ باوجود کثیر الاولاد ہونے کے وہ ہمیشہ شب خیز اور تہجد گزار رہیں۔ اخیر شب میں اُٹھ کر صبح تک ذکر وشغل مناجات وغیرہ میں مشغول رہتی تھیں، ان کا

اخیر تک معمول رہا کہ روزانہ دوسومرتبہ سورہ اخلاص پڑھ کر جناب رسول اللہ ﷺ کو ہدیہ کرتی تھیں، امور خانہ داری میں اخیر تک نہایت جفاکش تھیں۔ مدینۂ منورہ میں پہنچنے کے بعد عُسرت اور تنگدستی کی بنا پر اپنے گھر کا آٹا خود پیسنا پڑتا تھا، حال آں کہ کبھی ہندوستان میں اس کا اتفاق نہیں ہوا تھا، مگر اس پیرانہ سالی میں روزانہ ایک طرف خود اور دوسری طرف تینوں بہوؤں میں سے ایک کو باری باری بٹھلا کر آٹا پیسا کرتی تھیں۔ ان کی محبت بھی اولاد سے عاقلانہ تھی، اولاد کو تعلیم کے لیے جُدا کرنے میں انھوں نے کبھی پس وپیش نہیں کیا، بچوں کی تعلیم وتربیت کا انھیں بہت خیال تھا اور بچپن ہی سے مذہبی جذبات اور اخلاقی اصلاح کی تعلیم وتربیت کا کہانیوں اور چٹکلوں وغیرہ میں خیال رکھا کرتی تھیں والدہ مرحومہ کا سلسلۂ نسب حسب ذیل ہے:

بنت اکبر علی بن مخدوم بخش بن تراب علی بن شاہ مدن (مرحومین)۔ شاہ مدن مرحوم کے تین لڑکے تھے۔ تراب علی، ہدایت اللہ، نور اشرف مرحوم، شاہ نور اشرف کی اولاد میں والد صاحب مرحوم تھے اور تراب علی مرحوم کی اولاد میں والدہ صاحبہ مرحومہ اور ان کے تین بھائی تصدق حسین، تفضل حسین، عبدالغفور جن میں سے عبدالغفور مرحوم لاولد فوت ہوئے اور اول الذکر ہر دو صاحبوں کی اولاد موجود ہے۔ شاہ مدن صاحب مرحوم کے تیسرے صاحبزادے ہدایت اللہ لاولد فوت ہوئے۔ والدہ صاحبہ مرحومہ ۱۳۲۲ھ (۱۹۰۴ء) میں مدینۂ منورہ میں فوت ہوکر بقیع شریف میں مدفون ہوئیں۔ ان کے بعد والد صاحب مرحوم نے ضروریاتِ خدمت کی وجہ سے متعدد نکاح کیے، مگر وہ راحت حاصل نہ کر سکے جس کی ضرورت اور خواہش تھی۔ والد مرحومہ بہت زیادہ صاحب نصیب تھیں۔ جب سے شادی ہوئی مال اور اولاد کی ترقی گھر میں ہوتی رہی۔ اگرچہ بعض چھوٹی اولاد نے ان کے سامنے انتقال کیا۔ مگر جوان اولاد کی جُدائی کا صدمہ اور کثرت سے اولاد کے مرنے کا صدمہ ان کو نہیں پیش آیا۔

والد صاحب مرحوم نے بانگرمئو سے قصداً کم تنخواہ پر تبدیلی کرائی کیوں کہ جو کچھ حصہ جائداد کا تھا وہ بھی ضائع ہو رہا تھا۔ تائے صاحب مرحوم اس کو رہن سے نہ واگذاشت کرا سکتے تھے اور نہ متغلب شرکاء کے جوروستم سے محفوظ رہ سکتے تھے۔ والد صاحب مرحوم نے ٹانڈہ پہنچ کر پھر رہن پر قرض لیا اور جائداد مرہونہ کو واگذاشت کیا اور چھ سات برس میں قرض بھی جائداد کی آمدنی سے ادا کر دیا۔ پھر تقسیم حصص کی درخواست دے کر تقسیم کرایا اس طرح تائے صاحب مرحوم اور ان کی اولاد کے لیے بھی آسانیاں ہوگئیں اور خود والد صاحب مرحوم کو بھی زمینداری سے منافع حاصل

کرنے کا موقع ملا اور بغیر قرض دام کے اولاد کی تقریبیں وغیرہ انجام دے سکے۔

والد صاحب مرحوم کی اولاد:

مولانا محمد صدیق: ان کے پانچ لڑکے اور تین لڑکیاں پیدا ہوئے۔ مولانا محمد صدیق صاحب مرحوم سب سے بڑے لڑکے تھے ۱۲۸۸ھ (۱۸۷۱ء) میں بمقام الہ داد پور پیدا ہوئے۔ اور ۱۳۳۱ھ (۱۹۱۳ء) میں مدینۂ منورہ میں وفات پا کر بقیع شریف میں مدفون ہوئے۔ ان سے اولاد ذکور واناث متعدد ہوئیں۔ نکاح بھی متعدد ہوئے، مگر ان کے بعد صرف ایک لڑکا مولوی وحید احمد مرحوم زندہ رہا جو کہ صاحب اولاد ہو کر ٹانڈہ الہ داد پور میں متوفی ہوا۔ تین لڑکے اور دو لڑکیاں چھوڑیں بفضلہ تعالےٰ سب زندہ ہیں فرید احمد۔ رشید احمد، سعید احمد سلمہم اللہ تعالےٰ۔ صغیہ عرف (نیرہ) اور رضیہ سلمہما اللہ تعالےٰ۔

مولانا سید احمد صاحب: مولانا سید احمد صاحب مرحوم ۱۲۹۳ھ (۱۸۷۷ء) میں بمقام بانگرمئو میں پیدا ہوئے اور غالباً ۱۳۵۸ھ ماہ شوال (دسمبر ۱۹۳۹ء) میں یا ۱۳۵۹ھ (۱۹۴۰ء) میں مدینۂ منورہ میں وفات پائی اور بقیع میں مدفون ہوئے باوجود متعدد نکاحوں اور متعدد اولاد ذکور واناث کے سوائے ایک لڑکی کے کوئی اولاد نہیں چھوڑی مرحوم مدینۂ منورہ میں مدرسۂ شرعیہ کی بنیاد ڈالی جس کا نام ''مدرسۃ العلوم الشرعیہ لیتامی المدینۃ النبویہ'' رکھا۔ چوں کہ حکومت وقت نے علوم جدیدہ کے لیے بالخصوص جنگ عظیم کے بعد متعدد مدارس قائم کر دیے تھے۔ اور علوم شرعیہ کی طرف سے بہت بے توجہی کر دی تھی۔ ترکی حکومت کے زمانے میں جس قدر بھی تو علوم شرعیہ کی طرف باقی تھی وہ بھی باقی نہیں رکھی گئی تھی۔ اس لیے اہلِ مدینۂ منورہ کے بچے نہایت ضائع اور علوم دینیہ سے بالکل بیگانہ ہو رہے تھے۔ اس ضرورت کو محسوس کر کے یہ مدرسہ قائم کیا اور با ہمت اہل خیر ہندوستانیوں نے امداد و اعانت کی۔ اس لیے اس مدرسہ سے فیض بہت ہوا۔

ہر دو بھائی مرحومین دار العلوم دیوبند کے فارغ التحصیل تھے۔ دیوبند جانے سے پہلے اُردو مڈل اسکول میں بہت اعلیٰ درجہ میں پاس ہو چکے تھے اور قرآن شریف اور فارسی کی تعلیم والدین مرحومین سے حاصل کر چکے تھے۔ بڑے بھائی صاحب مرحوم کو بارگاہ رشیدی (قدس اللہ سرہ العزیز) سے خلافت اور اجازت عطا کی گئی تھی اور بھائی سید احمد صاحب مرحوم کئی برس خانقاہ میں مقیم اور شرف خدمت گزاری حاصل کرتے ہوئے ذاکر و شاغل رہے، مگر حضرت رحمۃ اللہ علیہ سے شرف اجازت حاصل نہ ہوا۔ بعد میں حضرت شیخ الہند اور حضرت مولانا خلیل احمد صاحبؒ نے

اجازت عطا فرمائی۔ مدینۂ منورہ میں ہر دو صاحب علوم دینیہ کی تدریس بھی کرتے رہے۔

جمیل احمد: جمیل احمد مرحوم ذیقعدہ ۱۳۰۲ھ (ستمبر اکتوبر ۱۸۸۵ء) میں الہ داد پور میں پیدا ہوئے عربی درسیات کی وسطانی کتابیں پڑھتے تھے کہ والد صاحب مرحوم نے ہجرت کی، مدینہ منورہ میں پہنچ کر ترکی مدرسۂ رشدیہ میں داخل کر دیا چوں کہ طبیعت نہایت ذکی تھی اور فنون عربیہ میں اچھی استعداد حاصل کر چکے تھے۔ بہت تھوڑی مدت میں عمدہ ترقی کی اور ہر درجے میں سب لڑکوں سے اول نمبر رہنے لگے ''باش صنف'' کا تمغہ ان کو دیا گیا اور اساتذہ کی خصوصی توجہ منعطف ہوئی اور جب مدرسۂ رشدیہ کے سب درجوں کو ختم کر چکے تو حکومت ترکیہ کے مصارف سے تمام جماعت فارغہ کو استنبول بھیجا گیا جن میں ''باش صنف'' مرحوم ہی تھے اس وقت گورنر مدینہ عثمان پاشا تھے اور زمانہ سلطان عبدالحمید خان کا تھا۔ اس جماعت کے بھیجنے کے وقت عثمان پاشا مرحوم نے خصوصی تزک و احتشام کیا اور باب عالی میں بذریعۂ تار اطلاع دی۔ سلطان عبدالحمید خان مرحوم کے حکم سے مدینۂ منورہ کے لڑکے ہونے کی بنا پر استنبول میں ان کا خصوصی استقبال ہوا اور تزک و احتشام سے جہاز سے اتارے گئے اور پھر خصوصی توجہات کے ساتھ مدرسۂ اعدادیہ میں داخل کر دیے گئے۔ پہلے ہی سال کے امتحان میں مرحوم وہاں بھی تقریباً ڈیڑھ سو طلبہ میں اول نمبر ثابت ہوئے، جس کی وجہ سے وہاں کے حکام اور اساتذہ کی بہت زیادہ توجہ ان کی طرف مبذول ہوئی۔ مگر تقدیرات الٰہیہ نے مساعدت نہیں کی۔ دوسرے سال میں مرض دق میں مبتلا ہو گئے، کئی مہینے بیمار رہے، ہر قسم کا علاج کیا گیا، مگر افاقہ نہ ہوا بالآخر مدینۂ منورہ واپس آکر کچھ دنوں بیمار رہ کر نوجوانی کی عمر میں وفات پائی اور مدینۂ منورہ میں بقیع شریف میں مدفون ہوئے۔ والد صاحب مرحوم کو اس کا زیادہ صدمہ ہونا طبعی امر تھا۔

محمود احمد: محمود احمد سلمہ اللہ تعالیٰ ۱۳۰۸ھ شوال (مئی جون ۱۸۹۱ء) میں الہ داد پور میں پیدا ہوئے ہجرت کے وقت آٹھ برس کی عمر تھی۔ معمولی اردو وغیرہ پڑھتے تھے۔ مدینۂ منورہ میں ان کو ترکی مدرسہ میں داخل کر دیا گیا۔ جملہ درجات میں کامیابی کے بعد عثمان پاشا مرحوم نے ان لڑکوں کو جو کہ درجہ علیا میں پاس کر چکے تھے، استنبول نہیں بھیجا بلکہ مختلف اداروں میں بطور امیدوار داخل کر دیا۔ چناں چہ عزیزم محمود احمد سلمہ کو محکمہ قضاء میں داخل کر دیا، جس میں انھوں نے بہت جلد ترقی کی اور تھوڑے ہی دنوں میں باضابطہ تنخواہ دار ''صنف اہل تحریر'' میں ملازم ہو گئے۔ جنگ عظیم کے بعد زمانہ حکومت شریف حسین میں ''باش کاتب'' یعنی میر منشی ہو گئے اور زمانہ حکومت سعودیہ

میں جدہ کے قاضی بنا دیے گئے۔ مگر چوں کہ جدہ میں باوجود کئی سال رہنے کے وہاں کی ہوا موافق نہیں آتی تھی، حکومت سے مدینۂ منورہ کی تبدیلی کی درخواست کی مگر کامیاب نہ ہونے کی وجہ سے استعفاد ے کر مدینۂ منورہ میں مشاغلِ تجارت اختیار کر لیے جس کی ابتدا انھوں نے ملازمت قضاء کے وقت سے شروع کر دی تھی۔ جرمنی سے آبپاشی کی مشینیں منگا کر مدینۂ منورہ میں باغ والوں کو پہنچاتے تھے اور ایک کارخانہ ان کی درستی اور اوزاروں وغیرہ کا بھی کھولا، جس میں ان کو اچھی آمدنی ہوئی۔ چوں کہ ایام ملازمت میں حکومت کو ان کی استعداد و قابلیت بہت زیادہ اطمینان بخش ثابت ہوئی تھی۔ اور پبلک کو کسی قسم کی ان سے شکایتیں بھی نہیں ہوئیں، اس لیے حکومت مدینۂ منورہ مہم محکموں میں ان کا وجود ضروری سمجھتی رہتی ہے اور اُن کو بلا معاوضہ اور بعض میں بالمعاوضہ ممبر بنا رکھا ہے۔ الحمدللہ کامیابی سے بسر اوقات کر رہے ہیں۔

ایک لڑکا حبیب اللہ جوان اور چند لڑکیاں ہیں۔ حبیب اللہ موصوف ہی اس وقت مدرسۂ شرعیہ کا مہتمم اور نگراں ہے۔

والد صاحب مرحوم کے تین لڑکیاں ہوئیں۔ ایک لڑکی زینب ۱۲۹۹ ہجری (۱۸۸۲ء) میں الہ داد پور میں پیدا ہوئی اور تین چار برس زندہ رہ کر وفات پا گئی۔ دوسری لڑکی نیم زہرا ۱۳۱۱ ہجری (۹۴-۱۸۹۳ء) میں پیدا ہوئی اور وہ بھی سال ڈیڑھ سال کی ہو کر وفات پا گئی۔ تیسری لڑکی ریاض فاطمہ مرحومہ ۱۳۰۵ھ یا ۱۳۰۶ھ (۱۸۸۸ء) میں پیدا ہوئی اور ۱۳۳۰ھ (۱۹۱۲ء) میں ایک بچی چھوڑ کر مدینۂ منورہ میں متوفی ہوئی۔ اس کی بچی بھی کچھ دنوں کے بعد وہاں ہی وفات پا گئی، دونوں بقیع شریف میں مدفون ہوئیں۔

والد صاحب مرحوم کی زندگی میں مدینۂ منورہ میں ان کے خاندان سے تقریباً تینتیس یا پینتیس نفوس مرے اور وہیں مدفون ہوئے۔ رحمہم اللہ تعالےٰ۔

والد صاحب مرحوم کی تعمیرات ہندوستان میں:

جدی مکان میں تائے صاحب کی کثرتِ اولاد اور پھر والد صاحب کی کثرتِ اولاد وغیرہ کی وجہ سے نیز دوسرے رشتہ داروں کی شراکت کی وجہ سے بھی ضروری معلوم ہوا تھا کہ مستقل مکان بنوائیں چناں چہ بزمانۂ قیام بانگر مئو مکان کی بنیاد رکھی اور تنخواہ کا بڑا حصہ اس میں صرف کرتے رہے اور اپنے آپ نہایت تنگی سے بسر کرتے رہے، حتیٰ کہ مہینوں صرف چنوں کے چبا لینے پر وقت گزارا۔ بحمداللہ مستقل مکان وسیع اور راحت پہنچانے والا بنوالیا۔ اگرچہ خام اور کھپریل ہی کا تھا مگر

وسیع اور بہت کارآمد تھا۔ ٹانڈہ پہنچنے کے بعد اس میں اور بھی وسعت کرلی گئی۔

والد صاحب مرحوم کی ہجرتِ مدینہ:

فروری ۱۸۹۹ء: ٹانڈہ کے قیام میں حسن انتظام کی بنا پر زمین بھی رہن سے خلاص کرالی گئی تھی اور تقسیم بھی مشترک حصہ داروں سے کرالی گئی تھی اور اطمینان سے آمدنی بھی جائداد کی جاری ہوگئی تھی اور بغیر مقروض ہوئے اولاد کی تقریبیں؛ عقیقے، ختنے، شادیاں انجام پاتی رہیں۔ واقعہ یہی ہے کہ والدین مرحومین کا حسن انتظام ہی تھا کہ اس تھوڑی تنخواہ میں اور معمولی زمین میں وہ سپید پوشی کے ساتھ کثیر الاولاد گھرانے کا روزمرہ کا خرچ، تعلیمی اخراجات تقریبیں پوری کرتے رہے، حال آں کہ کسی قسم کی بیرونی آمدنی نہ تھی۔ اول تو اسکول کے ہیڈ ماسٹر کو بیرونی آمدنی کا موقع ہی نہیں ہوتا، دوسرے یہ کہ والد صاحب مرحوم بہت زیادہ متشرع تھے کسی ناجائز آمدنی کو کسی طرح روا ہی نہیں رکھتے تھے۔ اگر غور کیا جائے تو بجز کرامت کے اور کوئی صورت نہیں معلوم ہوتی۔ وہ ہمیشہ آمدنی سے پس انداز کر کے ایسی بڑی بڑی تقریبات کا استقبال فرماتے رہتے تھے۔ بڑے بھائی صاحب اور منجھلے بھائی صاحب کا ۱۳۰۸ھ شوال (مئی، جون ۱۸۹۱ء) میں نکاح کیا اور اول الذکر کی بارات شہزاد پور میں چھ کوس کی دوری پر گئی اور ثانی الذکر کی شادی ماموں تفضل حسین صاحب مرحوم کے یہاں گاؤں ہی میں ہوئی۔ زیورات، جوڑوں، مہمانوں ولیمہ وغیرہ میں خاصی مقدار خرچ ہوئی جو کہ پس انداز مقدار سے پوری ہوئی۔

پھر ۱۳۱۲ھ (۹۵-۱۸۹۴ء) میں میری شادی قتال پور پرگنہ اترولیہ ضلع اعظم گڑھ میں ہوئی اور مصارف کثیرہ برداشت کرنے پڑے، مگر ایک پیسہ قرض نہیں لیا۔ اگرچہ ہماری آمدنیوں وغیرہ کی مقایست پر یہ حالت بہت گری ہوئی نظر آئی ہے۔ مگر والدین مرحومین پر جو حالت ان کے ابتدائی زمانۂ طفولیت اور عنفوان شباب میں گزری تھی۔ اُس پر نظر کرتے ہوئے بہت اعلیٰ درجے کے شمار ہوتی تھی۔ اور وہ بہت مطمئن اور خوش و خرّم نظر آتے تھے۔ بڑے بھائی صاحب مرحوم سہوارہ اور بلند شہر میں بہ صیغۂ تدریس ملازم ہوگئے تھے، اگرچہ میرے اور بھائی سید احمد صاحب مرحوم کے مصارف دارالعلوم دیوبند تحمل کرتا تھا۔ مگر والد صاحب مرحوم اخراجات زائد کے لیے ایک ایک روپیہ ماہوار ضرور بھیجا کرتے تھے۔ کبھی کبھی ہم لوگ قرضدار بھی ہو جاتے تھے۔ جس میں ہماری بے وقوفیوں کا بہت دخل ہوتا تھا، اور اس پر بہت زیادہ ملامت بھی کی جاتی تھی مگر اس کو ادا بھی وہی فرماتے تھے۔ اسی طرح ایام تعطیل سالانہ میں دیوبند سے وطن تک آمد و رفت کا خرچ

بھی تحمل کرنا پڑتا تھا اور اسی وجہ سے دوسرے سال مکان جانا ہوتا تھا۔ اس وقت میں ان کی دوربیں نظر اس طرف متوجہ تھی کہ اولاد کے لیے باغات لگائیں اور مکان میں وسعت دیں کہ ۱۳۱۳ ہجری میں بروز جمعہ ۲۲ ربیع الاول (۱۲ دسمبر ۱۸۹۵ء) والدین ماجدین کے پیرومرشد حضرت مولانا فضل الرحمٰن صاحب گنج مرادآبادی قدس اللہ سرہ العزیز کا بہ عمر ایک سو پانچ برس انتقال ہوگیا۔ یوں تو ہر مرید کو اپنے مرشد سے تعلق خاطر اور عشق کم و بیش ہوتا ہی ہے، مگر والدین مرحومین کو اور بالخصوص والد صاحب کو بہت ہی زیادہ شغف تھا۔ مدتوں خدمت میں رہنا ہوا تھا۔ ذکر و شغل استفادۂ باطنی اور قطعِ منازلِ سلوک کی نعمت حاصل ہوئی تھی، مولانا مرحوم کی خصوصی عنایت اور توجہ بھی ان پر زیادہ رہتی تھی، اس لیے عرصے تک بہت زیادہ مغموم رہا کیے۔ فراق مرشد میں متعدد قصائد بھی لکھے ہیں جن میں سے اکثر قصائد بھاکھا زبان میں بہت زوردار ہیں۔ جب کہ یہ احوال گزر رہے تھے بھائی سید احمد صاحب نے ایک خط میں والد صاحب مرحوم کو لکھ دیا کہ ''میاں! (ہم سب اولاد ان کو میاں کہا کرتے تھے) اب ہندوستان رہنے کی جگہ نہیں رہی، اب تو مدینۂ منورہ چل بسیے باغ وغیرہ لگانے کی فکر فضول ہے!'' یہ کلمات ایسے موثر واقع ہوئے جیسے کہ اسپرٹ میں دیا سلائی ہوتی ہے۔ اس خط کو دیکھنا تھا کہ عشق محمدی (صلی اللہ علیہ وسلم) کی آگ بھڑک اٹھی، اور ہر دم یہی پیچ و تاب رہنے لگا اور یہ دھن پیدا ہوگئی کہ تمام گھرانے کو لے کر وہیں چلنا چاہیے۔ تدبیریں سوچنے لگے۔ اس گیارہ بارہ نفوس والے خاندان کے سفر مدینۂ منورہ کا بوجھ معمولی بوجھ نہ تھا۔ لوگوں نے سمجھایا کہ آپ خود جائیے اور حج و زیارت کر آیئے۔ مگر نہ مانا۔ بیٹوں کی سسرال والوں نے زور دیا تو جواب دیا کہ اپنی اپنی لڑکیوں کو طلاق لے لو، میں تو اپنے لڑکوں کو ساتھ لے کر جاؤں گا۔ بہوؤں کو خود کہا کہ جس کو چلنا منظور نہ ہو، وہ اپنے خاوند سے طلاق لے لے مگر ہندوستانی رسم و رواج اور طرز معاشرت میں جس قدر یہ امر مبغوض ہے، ہر ایک جانتا ہے۔ میری کتابیں ادب اور ہیئت وغیرہ کی کچھ باقی تھیں۔ میں نے عرض کیا کہ آپ تشریف لے جائیں، میں ایک دو سال بعد آؤں گا، فرمایا کہ مدینۂ منورہ میں پوری کر لینا۔ میرے خسر حقیقی تو بہت عرصہ پہلے فوت ہو چکے تھے، میری اہلیہ کو اس کے حقیقی ماموں شیخ کفایت اللہ صاحب مرحوم قتال پوری نے پالا تھا اور وہی شادی وغیرہ کے متکفل تھے، ریاست بلرام پور میں ملازم تھے۔ ان دنوں بعہدہ معتمد ریاست لکھنو میں مقیم تھے، انھوں نے مجھ کو روکنا چاہا اور والد صاحب سے کہا کہ میں خود لکھنو میں ہوں، میں حسین احمد کو اپنے پاس رکھ کر حکیم عبدالعزیز صاحب (مرحوم) کے یہاں طب پڑھانا چاہتا ہوں۔ اس کو

یہاں چھوڑ دیجیے، والد صاحب نے جواب دیا کہ کیا حسین احمد کو گھوڑے پر سوار کرنے کے بعد میں گدھے پر سوار کروں گا؟ اس کو علومِ دینیہ کی تعلیم دلائی گئی ہے، اس سے بڑھ کر کون سی تعلیم ہے۔ الغرض دوستوں، رشتہ داروں، اغیار سبھوں نے سمجھایا مگر حسب قول شاعر:

مریضِ عشق پر رحمت خدا کی
مرض بڑھتا گیا جوں جوں دوا کی

یہاں تک ان کا جوش اور عشق بڑھا ہوا تھا کہ زمانۂ سفرِ حجاز میں جب کہ گورنمنٹ کی طرف سے سختیاں بہت زیادہ کی جارہی تھیں (جن کا ذکر آگے آئے گا) الہ آباد کے قرنطینہ کی سختیاں دکھلا کر ایک صاحب نے کہا کہ اس سال ارادہ نہ کیجیے تو فرمانے لگے کہ اگر مجھ کو یہ کہا جائے کہ تجھ کو توپ کے منہ پر باندھ کر گولا چلائیں گے اور مدینۂ منورہ پہنچ جائے گا تو میں اس کے لیے بھی تیار ہوں۔ گھر میں سوائے بھائی سید احمد صاحب مرحوم کے پوری طرح ہم خیال حضرت والد صاحب کا کوئی نہ تھا۔ بڑے بھائی صاحب نے جب اس قدر عزم مصمم والد صاحب کا دیکھا تو حضرت گنگوہی قدس اللہ العزیز سے بطور شکایت عرض کیا آپ نے فرمایا کچھ حرج نہیں چلے جاؤ، انھوں نے عرض کیا کہ حضرت ابھی تک میری تعلیم باطنی پوری نہیں ہوئی، میں اس کو انجام دینا چاہتا تھا، تو فرمایا کہ اب ساتھ چلے جاؤ پھر سب کو چھوڑ چھاڑ کر چلے آنا۔ خلاصہ یہ کہ شوق و اضطراب والد صاحب کا بڑھتا رہا اور انھوں نے فکر کی کہ کسی طرح جائداد کا حصہ فروخت ہو جائے تو روانہ ہو جائیں اس جد و جہد میں عرصہ لگ گیا بڑی کوششوں کے بعد ایک رئیس ٹانڈہ کے راجہ علی حسین تیار ہو گئے اور غالباً تین ہزار روپیہ پر دونوں گاؤں الہ داد پورا اور جزادن پور کا زرعی حصہ فروخت کر دیا سکنائی حصہ بھی فروخت کرنا چاہا مگر کوئی آدھی تہائی قیمت دینے والا بھی نہ ملا اس لیے وہ فروخت نہ کیا گیا اور بالآخر شعبان ۱۳۱۶ھ (فروری ۱۸۹۹ء) میں روانگی ہوگئی جس کا تفصیلی تذکرہ آگے آئے گا۔ (نقشِ حیات، حصہ اول، ص ۴۴۔۳۴)

اسلامی اتحاد کی تحریک (پین اسلامزم) (۱۸۸۰ء):

اتحاد اسلامی کی تحریک عالم اسلام میں قوم پروری کی نشو و نما اور مغربی استعمار و تسلط سے اس کے ٹکراؤ سے پیدا ہوئی۔

اسلامی اتحاد کی تحریک (پان اسلامزم) ۱۸۸۰ء میں شروع ہوئی۔ اس کا پروگرام اور پروپیگنڈا اس صدی کے خاتمے تک عروج کو پہنچ چکا تھا۔ سلطان عبدالحمید اس کے سرپرست اور

جمال الدین افغانی (مقیم قسطنطنیہ) اس کے پیشرو اور فلسفی تھے جو اس کی تبلیغ کرتے تھے۔ ۱۸۹۷ء میں افغانی کی وفات تک تمام اسلامی دنیا میں یہ ایک مشن کی حیثیت اختیار کر چکا تھا۔ اسلامی مراکز دور دراز ملکوں مثلاً جاوا، تیونس اور شنگھائی میں قائم ہو چکے تھے۔ ۱۹۰۳ء میں عبداللہ سہروردی نے پان اسلامک سوسائٹی کی لندن میں بنیاد ڈالی۔ ان کا رسالہ ''پان اسلام'' ملکی حالات کے لحاظ سے انسانیت دوستانہ اور اشترکی اصطلاحوں کے استعمال سے کام لیتا تھا اور اس میں یورپ کی بُرائیوں کے مقابلہ میں ایشیا کی خوبیاں بیان کرتا تھا۔ (فرہنگ سیاسیات، ص ۴۹۔۴۸)

بندے ماترم:

(۱۸۸۲ء): ''بندے ماترم'' ایک سنسکرت گیت ہے جو بنگال کے مشہور ناول نگار بنکم چندر چٹر جی کے ناول ''آنند مٹھ'' (۱۸۸۲ء) میں شامل ہے۔ بنگال میں مذہبی احیاء اور مذہبی قوم پروری کی تحریک کو نشو ونما دینے میں بنکم چندر کا بہت بڑا حصہ ہے۔

۲۴ رجنوری ۱۹۵۰ء کو جب رابندر ناتھ ٹیگور کے گیت ''جن گن من ادھنا ئیک جے ہے'' کو قومی ترانہ کے طور پر اختیار کیا گیا تو اسی کے ساتھ ''بندے ماترم'' کے ابتدائی حصہ کو برابر درجہ میں دوسرا قومی ترانہ قرار دیا گیا، کیوں کہ آزادی کی جنگ میں اس ترانے نے دلوں میں وطن پرستی کا ولولہ پیدا کر کے خاص مقام حاصل کیا۔ بندے ماترم گیت کے شروع کے حصہ کا ملتا جلتا اردو ترجمہ ذیل میں ہے (اصل نظم طویل ہے):

''اے ماں! میں تیرے سامنے سر جھکاتا ہوں،
تو بہت سیراب، بہت بار آور ہے،
دکھن کی ہوائیں تجھے طراوت دیتی ہیں،
فصل کی کھیتیوں سے تیرا رنگ گہرا ہے، ماں!
اس کی راتیں چاندنی کی عظمت میں سرشار ہیں،
اس کی زمینیں پھلتے پھولتے درختوں کی خوش نما پوشاک میں ملبوس ہیں،
وہ شیریں خنداں، شیریں سخن ہے،
ماں، جو عنایات سے نوازتی اور برکت عطا کرتی ہے!

(فرہنگ سیاسیات، ص ۱۰)

اس نظم میں وطن کی سرزمین کو مخاطب کیا گیا ہے۔ جس سرزمین کے ایک ایک ذرے کو علامہ

اقبال مرحوم نے ''دیوتا'' کہا ہے۔

خاک وطن کا مجھ کو ہر ذرہ دیوتا ہے

۶ر فروری ۱۸۸۳ء: کل (میر محبوب علی خان) نظام حیدر آباد گدی نشین ہوئے۔ لارڈ رپن صاحب گورنر جنرل ہند نے گدی نشین کیا۔ (ایک نادر روزنامچہ، ص ۵۵)

دسمبر ۱۸۸۳ء: دسمبر ۱۸۸۳ء میں ولفریڈ اسکاون بلنٹ نے کلکتہ میں یہ تجویز پیش کی کہ:

''اس کے خیال میں شمالی ہند کے تمام صوبوں کو عملی طور پر مسلم حکومت کے تحت دے دیا جائے اور جنوبی ہند کے صوبوں کو ہندو حکومت کے تحت اس کے منصوبے میں بہر حال برطانوی حکومت کو ایک نگران حکومت کی حیثیت سے برقرار رہنا تھا۔ نیز انگریزی افواج کو ہر صوبے میں مقیم رہنا تھا، تاکہ ان صوبوں کو برطانوی حمایت بھی حاصل رہ سکتی۔ لیکن سارے دیوانی نظم ونسق، قانون سازی اور مالیات کو ملکی ہاتھوں میں دے دینا ضروری تھا۔''

مذکورہ تجویز کنندہ ولفریڈ بلنٹ نے مذکورہ تجویز اپنی تصنیف (Ideas about India) ''آئیڈیاز اباؤٹ انڈیا'' میں پیش کی تھی۔ (کاروانِ احرار۔ جلد نمبر ۴، ص ۴۴۔۳۴۳)

۲۶ر جنوری ۱۸۸۴ء: آج کل سر سید احمد خان مدرستہ العلوم علی گڑھ کے چندے کے لیے پنجاب کے دورے پر نکلے ہوئے ہیں ۲۶ر جنوری کو انھوں نے انجمن اسلامیہ امرتسر کے سپاس نامے کے جواب میں جو تقریر فرمائی، اس تقریر میں قومیت کے مسئلے پر بھی اظہار خیال کیا۔ انھوں نے کہا:
''مدرستہ العلوم بیشک ایک ذریعۂ ترقی قوم کا ہے۔ یہاں پر قوم سے میری مراد صرف مسلمانوں ہی سے نہیں ہے، بلکہ ہندو اور مسلمان دونوں سے ہے۔ مدرستہ العلوم بلا شبہ مسلمانوں کی ابتر حالت کے درست کرنے کے لیے اور جو افسوس ناک محرومی ان کو یورپین سینسز اور لٹریچر کے حاصل کرنے میں تھی، اس کے رفع کرنے کو قائم کیا گیا، مگر اس میں ہندو مسلمان دونوں پڑھتے ہیں اور تربیت، جو ہندوستان میں مقصود ہے، دونوں کو دی جاتی ہے۔ ہم لوگ آپس میں کسی کو ہندو، کسی کو مسلمان کہیں مگر غیر ملک میں ہم سب نیٹو یعنی ہندوستانی کہلائے جاتے ہیں۔ غیر ملک والے خدا بخش اور گنگا رام دونوں کو ہندوستانی کہتے ہیں۔ غیر ملکوں میں جب ہم جاتے ہیں تو ہندو اور مسلمان کے نام سے نہیں پکارے جاتے ہیں، بلکہ نیک دل لوگوں سے نیٹو یعنی ہندوستانی کا اور تنگ دل لوگوں سے نیگرو یعنی کالے منہ یا وحشی ہندوستانی کا لقب دونوں کو برابر ملتا ہے اور یہی سبب ہے کہ ہندوؤں کی ذلت سے مسلمانوں کی اور مسلمانوں کی ذلت سے ہندوؤں کی ذلت ہے۔ پھر ایسی حالت میں جب تک یہ دونوں بھائی ایک ساتھ پرورش نہ پاویں، ساتھ ساتھ یہ دونوں دودھ نہ پییں، ایک ہی ساتھ تعلیم نہ پاویں، ایک ہی طرح کے وسائل ترقی دونوں کے لیے موجود نہ کیے جاویں، ہماری عزت نہیں ہو سکتی، مدرستہ العلوم کے قائم کرنے میں میرا یہی مطلب تھا، مگر میرا کیا مقدور تھا کہ اس کو انجام دے سکتا۔ میں ان لوگوں کا شکر گزار ہوں جنھوں نے اس میں مدد کی۔ اس مدد میں مسلمانوں کا اس قدر مشکور نہیں ہوں جس قدر ہندوؤں کا ہوں، جنھوں نے بطور خیرات کے اپنے بھائیوں کی مدد کی۔ مدرسے کی عمارت کی دیواروں اور محرابوں پر بہت سے ہندوؤں کے نام کندہ ہیں جس سے ہمیشہ کو یہ یادگار قائم رہے گی کہ ہندوؤں نے اپنے درماندہ مسلمان بھائیوں کی کس فیاضی سے مدد کی تھی۔ (سید احمد خان کا سفر نامۂ پنجاب از مولوی سید اقبال علی، لاہور، مجلس ترقی ادب، ۱۹۷۳ء، ص ۱۰۶۔۷)

۲۷ر جنوری ۱۸۸۴ء: باشندگان گورداس پور کے سپاس نامے کے جواب میں سر سید احمد خان نے فرمایا:
''قومی کام میں واقعی اس وقت تک مدد نہیں ہو سکتی، جب تک کہ لوگوں کے دلوں میں ملک کی بھلائی، قومی ہمدردی، اپنے ملک کے تمام بچوں کی تربیت کا جوش نہ آ جائے۔ بے شک میں اس

قدر کہوں گا یہ جوش میرے دل میں ہے۔ میں ضرور کہوں گا اور یقین دلاؤں گا کہ میرے دل میں یہ جوش شاید زیادہ ہے۔ اُسی کے سبب سے میں نے قوم کی کچھ خدمت کی ہے، اس کے قوم بنانے کی مجھے تمنا ہے، مجھے اُمید ہے کہ ہندوستان میں، جس میں خدا نے ہم کو اور ہمارے ہندو بھائیوں کو آباد کیا ہے، جس سے اس کا منشا پایا جاتا ہے کہ ہم دونوں گروہ بھائی ہو کر اور ایک دوسرے کو بھائی سمجھ کو ایک دوسرے کو مدد دیں، روز بروز ترقی کرے گا، پنجاب اور پلیٹ فارم گورداس پور پر یک جائی مجمع ان دونوں گروہوں کا دیکھ کر معلوم ہوتا ہے کہ ایک دوسرے کی مدد کرتا ہے۔ اسی چیز کی ہندوستان میں ضرورت ہے۔ میرے یہاں آنے میں دونوں گروہوں نے ایک ساتھ خوشی کی اور ایک ہی ساتھ ہمدردی کا اظہار کیا، جس سے میری اُمید کو بہت تقویت ہوتی ہے۔ میری دعا ہے کہ خدا ہندوستان میں ہندو اور مسلمان دونوں کے دلوں میں ایک دوسرے کی مدد کا خیال پیدا کرے اور ایک کو دوسرے کا حامی کرے، آمین۔ (سید احمد خان کا سفرنامۂ پنجاب، ص ۱۱۹)

اسی تاریخ کو سرسید احمد خان نے مدرسۂ گورداس پور میں اپنے لیکچر میں فرمایا:

''اس وقت ہندوستان میں خدا کے فضل سے دو قومیں آباد ہیں اور اس طرح سے ہیں کہ ایک کا گھر دوسرے سے ملا ہے۔ ایک کی دیوار کا سایہ دوسرے کے گھر میں پڑتا ہے۔ ایک آب و ہوا کے شریک ہیں۔ ایک دریا یا کنوئیں کا پانی پیتے ہیں۔ مرنے جینے میں ایک دوسرے کے رنج و راحت کا شریک ہوتا ہے ایک کو دوسرے سے بغیر ملے چارہ نہیں پس کسی چیز کو، جو معاشرت سے علاقہ رکھتی ہے، ان دونوں کا علاحدہ علاحدہ رکھنا دونوں کو برباد کر دیتی ہے۔ ہم کو ایک دل ہو کر مجموعی حالت میں کوشش کرنی چاہیے۔ اگر ایسا ہوگا تو سنبھل جائیں گے، نہیں تو ایک دوسرے کے اثر سے دونوں قومیں تباہ اور بگڑ جاویں گی، (چیرز)۔

پرانی تاریخوں میں، پرانی کتابوں میں دیکھا اور سنا ہوگا اور اب بھی دیکھتے ہیں کہ قوم کا اطلاق ایک ملک کے رہنے والوں پر ہوتا ہے۔ افغانستان کے مختلف لوگ ایک قوم کہے جاتے ہیں۔ ایران کے مختلف لوگ ایرانی کہلاتے ہیں یورپین مختلف خیالات اور مختلف مذاہب کے ہیں، مگر سب ایک قوم میں شمار ہوتے ہیں۔ گو اُن میں دوسرے ملک کے بھی لوگ آ کر بس جاتے ہیں، مگر وہ آپس میں مل جل کر ایک ہی قوم کہلائے جاتے ہیں۔ غرض کہ قدیم سے قوم کا لفظ ایک ملک کے باشندوں پر بولا جاتا ہے، گو اُن میں بعض بعض خصوصیتیں بھی ہوتی ہیں۔

اے ہندوؤ اور مسلمانو! کیا تم ہندوستان کے سوا اور ملک کے رہنے والے ہو؟ کیا اسی زمین پر تم دونوں نہیں بستے؟ کیا اسی زمین میں تم دفن نہیں ہوتے ہو یا اسی زمین کے گھاٹ پر جلائے نہیں

جاتے؟ اسی پر مرتے ہو اور اسی پر جیتے ہو تو یاد رکھو کہ ہندو اور مسلمان ایک مذہبی لفظ ہے ورنہ ہندو مسلمان اور عیسائی بھی، جو اس ملک میں رہتے ہیں۔ اس اعتبار سے سب ایک ہی قوم ہیں۔ (چیرز)۔ جب یہ سب گروہ ایک قوم کہے جاتے ہیں تو ان سب کو ملکی فائدے میں، جو ان سب کا ملک کہلاتا ہے۔ ایک ہونا چاہیے۔ اتفاق کی خوبیاں مجھ کو زیادہ بیان کرنے کی ضرورت نہیں ہے۔ (ایضاً، ص ۳۲-۱۳۱)

۲۹ر جنوری ۱۸۸۴ء: ٹاؤن ہال امرتسر میں سرسید احمد خان نے مسلمانوں، ہندوؤں اور سکھوں کے مشترکہ جلسے سے خطاب کیا ہے۔ سید صاحب نے اپنی تقریر میں یہ بھی فرمایا:

''اے صاحبو! یہاں تک جو کچھ میں نے بیان کیا وہ حقیقت میں تعلیم اور تربیت ہی کے متعلق تھا۔ مگر مجھ کو ایک امر میں اور بھی کہنا ہے۔ تمام تربیت اور تعلیم کے ساتھ ایک اور بڑا مسئلہ ہے۔ جس کے بغیر ہم کچھ نہیں کر سکتے، اور اس کی ہندوستان میں سب سے زیادہ ضرورت، وہ باہمی اتحاد ہے (چیرز)۔

اے صاحبو! عقل مند شخص، جو خدا پر یقین رکھتا ہے، اس کی یہی خواہش ہوگی کہ اُسی طریقے پر چلیں جو خدا کی مرضی ہے۔ اب ہندوستان میں دیکھنا چاہیے کہ خدا کی مرضی باہم کس طرح بسر کرنے کی ہے۔ صدیاں گزر گئیں ہیں کہ ہندو اور مسلمان یہاں آباد تھے، چند سال سے خدا کی یہ مرضی ہوئی کہ ایک تیسری قوم بھی یہاں آباد ہو، یہ تینوں قومیں اب یہاں آباد ہیں اور اب انہی تینوں کا یہ ملک ہے۔ ان سب کو آپس میں اتفاق اور دوستی پیدا کرنا چاہیے۔ مذہبی خیالات کا جدا گانہ ہونا خدا کی مرضی کے خلاف نہیں ہوسکتا۔ یہ کسی کا کام نہیں کہ سب کو ایک مذہب پر لے آوے۔ یہ تو وہ لوگ بھی نہیں کر سکے جو انبیاء علیہم السلام کے نام سے گزرے ہیں۔ مختلف مذاہب کے لوگ ہونے سے یہ خیال نہ کرنا چاہیے کہ باہمی اتفاق نہیں ہوسکتا۔ ایک باریک بات غور کرنے سے معلوم ہوتی ہے، اور وہ یہ ہے کہ ہر انسان کی خلقت میں دو حصے ہیں، ایک عقیدہ، جو دل سے متعلق ہے، اس میں دوسرے کی شرکت نہیں ہے۔ باپ کا عقیدہ بیٹے کے لیے اور بیٹے کا باپ کے لیے مفید یا مضر نہیں ہے۔ دوسرا حصہ انسانیت کا، جو تمدنی حالتوں سے متعلق ہے، جس کے سبب سے آپس میں ملنے، ہم جنس سے دوستی کرنے، باہم یگانگت اور اخلاص کا برتاؤ کرنے کی ضرورت ہے۔ ان دو حصوں میں خدا کا حصہ خدا کے لیے مخصوص ہے۔ اس کے حصے کو اسی کے واسطے چھوڑ دو، مگر جو حصہ انسانیت کا ہے، اور جس کی وجہ سے ایک دوسرے کے ساتھ دوستی اور اخلاص کرنا

ضروری ہے، ایک کو دوسرے سے مانگنا چاہیے۔" (سید احمد خان کا سفر نامہ پنجاب، ص ۱۷۲-۷۳)

۲ر فروری ۱۸۸۴ء: آج سید احمد خان لاہور میں تھے۔ آریا سماج کا ایک ڈیپوٹیشن ان کی خدمت میں حاضر ہوا۔ وفد نے سر سید احمد خان کی تعلیمی اور اصلاحی خدمات کا اعتراف کیا۔ سید صاحب نے گفتگو میں فرمایا:

"آپ صاحبان جو تکلیف فرما کر یہاں تشریف لائے اور میری بعض خدمات کا ذکر کیا، میں اس کا تہ دل سے شکریہ ادا کرتا ہوں۔ آپ نے جو لفظ ہندو کا استعمال فرمایا ہے وہ میری رائے میں درست نہیں، کیوں کہ ہندو میری رائے میں کسی مذہب کا نام نہیں ہے، بلکہ ہر ایک شخص ہندوستان کا رہنے والا اپنے تئیں ہندو کہہ سکتا ہے۔ پس مجھے نہایت افسوس ہے کہ آپ مجھ کو، باوجود اس کے کہ ہندوستان کا رہنے والا ہوں، ہندو نہیں سمجھتے! (بہت زور سے چیرز) آپ اس بات کو یقیناً جانتے ہوں گے۔ کہ ہندوستان کی ترقی کے لیے یہ بات ضرور ہے کہ اہل ہنود اور اہل اسلام باہم مل کر کام کریں۔ جب تک یہ نہیں ہوگا اس ترقی کو، جو ایک قوم کرے گی، ہندوستان کی کامل ترقی سے تعبیر نہیں کریں گے، کیوں کہ غیر ملک والے ہم سب کو خواہ ہم مسلمان ہوں، خواہ ہندو (مجھے معاف کیجیے کہ میں لفظ ہندو کو اس خاص معنی میں استعمال کرتا ہوں) ایک لفظ ہندوستانی سے نامزد کرتے ہیں اور ہماری ترقی وتنزل علاحدہ علاحدہ اہل ہنود واہل اسلام کی ترقی وتنزل سے نامزد نہیں ہوتی، بلکہ کل ہندوستان کی ترقی وتنزل سے تعبیر ہوتی ہے۔ (سفر نامہ پنجاب بہ حوالہ پنجابی اخبار، لاہور، ص ۱۹۵)

اسی ملاقات کی روداد بیان کرتے ہوئے اخبار "انجمن پنجاب، لاہور" نے لکھا تھا:

"سید صاحب نے اس بات پر کسی قدر افسوس ظاہر کیا کہ اہلِ ہنود صاحبان صرف اپنے تئیں ہندو یعنی باشندہ ہند خیال کرتے ہیں، جس کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ وہ مسلمانوں کو اجنبی خیال کرنے لگتے ہیں۔ حال آں کہ ہندو اور مسلمان دونوں قومیں ہندو یعنی "اہل ہند" کے خطاب کی مستحق ہیں۔ صاحب! وہ زمانہ اب نہیں کہ صرف مذہب کے خیال سے ایک ملک کے باشندے دو قومیں سمجھے جاویں۔" (ایضاً ص ۲۰۰)

۳ر فروری ۱۸۸۴ء: انڈین ایسوسی ایشن لاہور نے سید احمد خان کی خدمات کے اعتراف میں سپاس نامہ پیش کیا۔ سید صاحب نے اس کے جواب میں شکریے کی جو تقریر کی۔ اس میں

انھوں نے یہ بھی فرمایا:

''میں اس بات کے بیان کرنے سے خوش ہوں کہ اس کالج میں دونوں بھائی ایک ہی سی تعلیم پاتے ہیں۔ کالج کے تمام حقوق، جو اُس شخص سے متعلق ہیں جو اپنے تئیں مسلمان کہتا ہے۔ بلا کسی قید کے اُس شخص سے بھی متعلق ہیں جو اپنے تئیں ہندو بیان کرتا ہے۔ ہندوؤں اور مسلمانوں کے درمیان ذرا بھی امتیاز نہیں ہے۔ صرف وہی شخص انعام کا دعویٰ کر سکتا ہے جو اپنی سعی و کوشش سے اس کو حاصل کرے۔ اس کالج میں ہندو اور مسلمان دونوں برابر وظیفوں کے مستحق ہیں اور دونوں کی نسبت بطور بورڈر کے یکساں طور پر سلوک کیا جاتا ہے۔ میں ہندوؤں اور مسلمانوں کو مثل اپنی دو آنکھوں کے سمجھتا ہوں۔ اس کہنے کو بھی پسند نہیں کرتا کیوں کہ لوگ علی العموم یہ فرق قرار دیں گے کہ ایک کو دائیں آنکھ اور دوسری کو بائیں آنکھ کہیں گے۔ مگر میں ہندو اور مسلمان دونوں کو بطور ایک آنکھ کے سمجھتا ہوں۔ اے کاش! میرے صرف ایک ہی آنکھ ہوتی کہ اس حالت میں میں عمدگی کے ساتھ ان کو اس ایک آنکھ کے ساتھ تشبیہ دے سکتا۔''

(سید احمد خان کا سفرنامۂ پنجاب، ص ۲۳۳)

اسی سال (۱۸۸۴ء) ہندوستان میں ایک کل ہند عوامی انجمن بنی جس کا نام پہلے ''انڈین نیشنل یونین'' رکھا گیا پھر انڈین نیشنل کانگریس تجویز ہوا۔ گو اس جماعت کا محرک و خالق اے۔ او۔ ہیوم نامی ایک منصف مزاج نیک دل انگریز تھا۔ اس نے موجودہ گورنر لارڈ ڈفرن کی ایماء سے حکومت سے وفاداری کے اظہار کے ماتحت اس کی بنیاد رکھی جس کا مقصد وائسرائے ہند کو خراجِ عقیدت پیش کرنا تھا لیکن اس کے زیادہ تر ارکان تعلیم یافتہ ہندوستانی تھے۔

اس سے قبل بنگال، بمبئی وغیرہ میں کئی ایک مقامی انجمنیں بن چکی تھیں اور قومیت کا احساس انگڑائیاں لے رہا تھا۔ زبانوں کی مہر ٹوٹ چکی تھی اور حکومت سے مطالبات کا دریچہ کھل گیا تھا، نئے پریس ایکٹ کے طفیل پبلک اخبارات حکومت پر توتلی زبان میں جو نکتہ چینیاں کرتے تھے، اس میں صفائی آ گئی تھی۔ پہلے انگریز ملزموں کے مقدمے ہندوستانی مجسٹریٹ کے سامنے پیش نہیں ہو سکتے تھے۔ لارڈ رپن نے اس امتیاز کو ختم کرنا چاہا اور اس مقصد کے حصول کے لیے اس کی کونسل کے ممبر البرٹ نے ایک بِل پیش کیا، لیکن ہندوستان میں رہنے والے انگریزوں نے اس کی سخت مخالفت کی اور رپن کو اس میں ترمیم کرنے پر مجبور ہونا پڑا۔ فیصلہ یہ ہوا کہ انگریز ملزموں کے مقدموں کا فیصلہ جیوری کے ذریعہ ہوا کرے گا۔ جس کے آدھے ممبر انگریز ہوں گے۔ اور آدھے

ہندوستانی اس بل کی ناکامی پر پورے ملک کے دانشور طبقے نے تحریر وتقریر میں غم وغصہ کا اظہار کیا۔ بالخصوص پنڈت جوالا پرشاد برق کا مضمون آج بھی لہو گرما دیتا ہے۔(حسرت مہانی ۔۔۔۔ایک سیاسی ڈائری مرتبہ اثر بن یحییٰ انصاری، دھولیہ، مہاراشٹر، ۱۹۷۷ء، ص ۱۸)

۱۸۸۵ء

قیام کانگریس کا پس منظر:

یکم نومبر ۱۸۵۸ء اس اعلان معافی پر ہندوستان میں امن اور اطمینان کی لہر دوڑ گئی۔ اگر چہ ایسٹ انڈیا کمپنی اس سے پہلے بہت سے اعلانوں اور معاہدوں کو توڑ چکی تھی اور اسی بنا پر اس کے کسی اعلان اور عہد نامے پر ہندوستانیوں کو اعتماد نہ ہوتا تھا، مگر چوں کہ یہ اعلان ملکہ وکٹوریہ اور ہاؤس آف کامنس (دارالعوام) اور ہاؤس آف لارڈس (دارالخواص) اور انگلستان کی مذہبی جماعتوں کی طرف سے ہوا تھا اس پر اعتماد کیا گیا اور بڑے درجے تک بے چینی دور ہوگئی، چاروں طرف رعایا مطمئن ہوگئی، مگر بعد کے کچھ عرصے کے معاملات نے واضح کردیا کہ یہ اعلان محض ہاتھی کے دانت کی طرح تھا جو محض دکھلاوے کا کام کرتا ہے۔ تمام حکام وہی رکھے گئے جن کے ہاتھ ہندوستانیوں کے خون سے رنگے ہوئے تھے۔ اور جن کی سرشت میں درندگی اور بربریت بھری ہوئی تھی۔ اور جو کہ ہندوستانیوں کو نہایت حقارت کی نظر سے دیکھتے تھے۔ اور مساوات گورے اور کالے کے انتہائی مخالف تھے۔ چناں چہ حکام ان کی چیرہ دستیوں کو دیکھ کر گورنروں اور وائسرائے کو برابر واقعات اور مظالم کی عرضداشتیں پیش کی گئیں، مگر کوئی شنوائی نہ ہوئی۔ عاجز آکر ہندوستانیوں نے ان امور کی اطلاعات پارلیمنٹ آف کامنس اور وزرا تک پہنچائیں، مگر وہاں سے بھی کوئی دستگیری اور اشک شوئی نہ ہوئی تو اضطراب اور بے چینی بڑھنے لگی۔ چناں چہ ان بے عنوانیوں کی شکایت حکام رس لوگوں نے وائسرائے وقت لارڈ ڈفرن تک زبانی پہنچائیں تو جواب یہ ملا کہ اب تک تم لوگوں نے جو کارروائی کی وہ انفرادی ہے تم کو اپنی جماعت بنانی چاہیے اور اجتماعی طور سے مطالبات پیش کرنے کی پالیسی اختیار کرنی چاہیے۔ حکومت برطانیہ کے لوگ اجتماعی مطالبات کو وقعت کی نظر سے دیکھتے ہیں۔

کانگریس کا قیام:

چناں چہ ۱۸۸۵ء میں کانگریس کی بنیاد رکھی گئی اور پہلا اجلاس اس کا بمبئی میں کیا گیا اور اس

میں بلا تفریق مذہب و نسل ہندوستانیوں کو ممبر بنانے کا اعلان کیا گیا اور شکایات اور مطالبات کو ریزولیوشنوں کی صورت میں تمام اہل ہند کی طرف سے پیش کیا گیا۔ اس اجلاس میں اٹھتر ممبر شریک ہوئے جن میں دو مسلمان اور تین بنگالی اور باقی بمبئی کے باشندے ہندو اور پارسی وغیرہ تھے۔ مسلمانوں میں مشہور تاجر بمبئی سیٹھ رحمت اللہ سیانی تھے، اس اجلاس کی صدارت مسٹر سریندر ناتھ بنرجی نے کی۔

انگریزوں کا خوف اور دہشت:

چوں کہ ۱۸۵۷ء کے واقعے پر انگریزوں نے اس قدر اور ایسے ملعون اور شرمناک مظالم چاروں طرف ہندوستان میں کیے تھے، جن کی نظیر وحشی قوموں اور جاہل سے جاہل ملکوں میں بھی نہیں پائی جاتی تھی۔ توپوں کے منہ پر باندھ کر گولے سے اڑا دینا، ہاتھی کے پیر سے باندھ کر کچلوا دینا، زندہ آدمی کو لوہے کی گرم سلاخوں سے داغ کر آگ میں جلانا وغیرہ وغیرہ معمولی باتیں تھیں۔ اس لیے عام ہندوستانی اور بالخصوص مسلمان انتہائی درجہ خوف وہراس میں مبتلا ہو گئے تھے۔ اس لیے باوجود ہر قسم کی ناانصافیوں کے معائنہ کرنے کے تمام پبلک میں آزادی وطن کے لیے کھڑے ہونے کی ہمت نہ تھی۔ اگر چہ ہر سمجھدار شریف النفس، غیرت مند ہندوستانی کے دل میں آزادی کی چنگاری بھڑکتی رہتی تھی مگر خوف وہراس کے تسلط کی بنا پر کسی قسم کی ظاہری کارروائی عمل میں لانا احاطۂ قدرت سے باہر سمجھا جاتا تھا۔ یہ ضرور تھا کہ کچھ مسلمان جن پر خصوصی طور پر محبت قوم و وطن اور دین کا غلبہ تھا، ان انسانیت سوز مظالم کے باوجود خفیہ کارروائیاں ہتھیلی پر سر رکھ کر جاری کیے ہوئے تھے اور جن کی وجہ سے انگریزوں کو سرحد میں بار بار جنگی مہمیں ۱۸۶۸ء تک جاری کرنی پڑی اور متعدد مقدمات عدالت ہائے ہند میں چلائے گئے، جن میں ابنالہ کا مشہور مقدمہ بھی ہے۔

مسلمانوں سے انگریزوں کی بدظنی یا خوف:

انھیں جیسے مسلمانوں کے متعلق ۱۶ر فروری ۱۸۷۷ء میں سر ولیم میور لیفٹننٹ گورنر نے کہا تھا:

> ''لوگوں کی یہ عادت ہے کہ وہ مسلمانوں کو بے جان اور ضعیف بیان کرتے ہیں۔ شاید ایسا ہو! مگر بہت سے شکاریوں کو خطرہ برداشت کرنے کے بعد یہ بات معلوم ہوگئی ہے کہ اگر کسی عالی نسب شیر پر زخم لگایا جائے گا تو گو وہ کیسا ہی ضعیف اور ناتواں بلکہ قریب المرگ ہی کیوں نہ ہو مگر پھر بھی اپنی اصلی حرارت کے ساتھ ایک مرتبہ جست

کرے گا اور چاروں طرف ہلاکت اور تہلکہ مچادے گا۔'' (روح روشن مستقبل، ص ۲۲)

بہرحال عام پبلک ہندو اور مسلمان بالخصوص مسلمان انتہائی درجے میں خائف اور ہراساں ہو گئے تھے۔ چوں کہ سب کا یہی خیال تھا کہ آزادی بجز تشدد اور قتل وقتال کے نہیں حاصل ہوسکتی۔ اس لیے مایوسی ہر ایک پر چھائی ہوئی تھی۔ کوئی دم مارنے کی طاقت نہیں رکھتا تھا۔ کانگریس کے اجلاسِ اول کے بعد لوگوں کی سمجھ میں آیا کہ آزادی حاصل کرنے کی دوسری صورت بھی ہے۔ اس لیے لوگ جوق در جوق اس میں شامل ہونے لگے۔ کیوں کہ اس میں اطمینان تھا کہ انگریزوں کو اپنی درندگی اور بربریت کا موقعہ ہاتھ نہیں آئے گا اور ہم اپنی محبوبہ آزادی سے وصال حاصل کرسکیں گے۔ اگرچہ دیر میں تدریجاً تدریجاً ہو۔ چناں چہ ۱۸۸۶ء میں جب کانگریس کا دوسرا اجلاس کلکتہ میں دادا بھائی نوروجی کی صدارت میں منعقد ہوا تو ممبروں کی تعداد (۷۸) سے بڑھ کر ایک ہی سال میں ۴۳۶ ہوگئی جس میں مسلمان ممبر ۲۳ تھے۔ اور پھر ۱۸۸۷ء میں جب اس کا تیسرا اجلاس مدراس میں زیر صدارت بدرالدین طیب جی منعقد ہوا تو ممبروں کی تعداد (۶۰۴) تھی جن میں مسلمان ۸۳ تھے۔

کانگریس سے انگریزوں کا اندیشہ اور اس کی مخالفت:

کانگریس کی اس بڑھتی ہوئی حالت اور مقبولیت کو دیکھ کر ممکن نہ تھا کہ مستبد اور سیاہ دل انگریزوں کے دماغ ماؤف نہ ہوں اور سینے اور دل میں کپکپی پیدا نہ ہو۔ مسٹر بیک پرنسپل علی گڑھ کالج اور دوسرے انگریزوں کو انتہائی بے چینی نے گھیر لیا۔ چناں چہ انھوں نے انجمنِ محبانِ وطن (انڈین پیٹریاٹک ایسوسی ایشن) کی بنیاد ڈالی۔ کانگریس کی مخالفت میں آرٹیکل بار بار شائع کیے۔ مختلف مقامات پر سفر کیے اور لکچر دیے اور سرسید پر اس قدر اثر اور دباؤ ڈالا کہ وہ انتہائی درجہ کانگریس کے مخالف ہو گئے اور مسلمانوں پر زور ڈالنے لگے کہ وہ ہرگز ہرگز کانگریس میں شرکت نہ کریں اور انڈین پیٹریاٹک ایسوسی ایشن میں شریک ہوکر انگریزوں کی وفاداری کا ثبوت دیں۔ اس میں شرکت مسلمانوں کے لیے فرض اور ضروری ہے اور کانگریس میں جانا مسلمانوں کے لیے سم قاتل اور زہر ہلاہل ہے، چند علماء کو اپنا ہم خیال بنا کر فتویٰ شائع کرایا جس کی رو سے مسلمانوں کو کانگریس کی شرکت حرام قرار دے دی گئی اور پیٹریاٹک ایسوسی ایشن کی شرکت فرض بتائی گئی۔

علمائے لدھیانہ و دیوبند کی پیش قدمی:

یہ تمام معاملہ ۱۸۸۸ء سے پرزور طریقہ جاری ہوا۔ اس پر حضرت مولانا رشید احمد صاحب

گنگوہی رحمتہ اللہ علیہ اور حضرت مولانا محمود حسن صاحب اور مدرسین دارالعلوم دیو بند اور بہت سے علمائے حقانی اطراف و جوانب ہند نے پرزور مخالف کی اور کانگریس کی شرکت کی حمایت اور انڈین پیٹریاٹک ایسوسی ایشن کی شرکت کی ممانعت میں فتوے لکھے۔ اس بارے میں پیش پیش علمائے لودھیانہ مولانا محمد صاحب اور ان کے دو بھائی مولانا عبدالعزیز صاحب اور مولانا عبداللہ صاحب مرحومین تھے انھوں نے اطراف و جوانب ہندوستان سے فتاویٰ منگائے اور ان سب کو ایک رسالہ ''نصرۃ الابرار'' میں جمع کیا۔ اور خود کھلی کھلی اور زوردار دلیلوں سے کانگریس کی شرکت کا جواز اور پیٹریاٹک ایسوسی ایشن میں شرکت کا عدم جواز ثابت کیا، چناں چہ حضرت مولانا گنگوہی (قدس اللہ سرہ العزیز) کا فتوی اسی رسالہ ''نصرۃ الابرار'' میں صفحہ ۱۹۔۲۰ اور صفحہ ۲۶ میں اور حضرت شیخ الہند مولانا محمود حسن صاحب اور دیگر علمائے دارالعلوم دیو بند کا فتویٰ صفحہ ۲۳ و ۲۴ میں درج ہے اور مولانا محمد صاحب مرحوم لودھیانوی اور ان کے دونوں بھائیوں مرحومین کے تفصیلی فتوے صفحہ ۱۳ سے لے کر ۱۹ تک میں مذکور ہیں۔ اس رسالے میں تقریباً سو علمائے ہند کے فتاوی نقل کیے گئے ہیں۔

آئی پی اے سے ہندوؤں کی کنارہ کشی:

انڈین پیٹریاٹک ایسوسی ایشن میں مسٹر بیک اور ان کے ہم نواؤں کی جدوجہد سے ہندو امرا اور تعلقہ دار بھی شریک ہوئے تھے۔ اس کی ممبری کسی خاص فرقے کے لیے مخصوص نہ تھی مگر ہندو رؤسا ایسوسی ایشن سے نکل گئے مگر مسلمان سرسید اور مسٹر بیک کے جادو کی بنا پر بالکل نہ سمجھ سکے۔

پہلی سیاسی فرقہ وارانہ انجمن:

مسٹر بیک نے جب دیکھا کہ پیٹریاٹک ایسوسی ایشن سے ہندو بالکل نکل گئے ہیں تو دوسری انجمن دسمبر ۱۸۹۳ء میں مسلمانوں اور انگریزوں کی بنائی اور اس کا نام ''محمڈن اینگلو اورینٹل ایسوسی ایشن'' رکھا اور پہلی انجمن پیٹریاٹک کو دفن کر دیا۔ اس نئی ایسوسی ایشن کے مقاصد حسب ذیل تھے۔ مسلمانوں کے سیاسی حقوق کی حفاظت، مسلمانوں میں سیاسی شورش پھیلنے کو روکنا، سلطنت برطانیہ کے استحکام کی تدابیر کرنا، لوگوں میں سلطنت برطانیہ کی وفاداری کے جذبات پیدا کرنا۔ اس انجمن کے سیکرٹری خود مسٹر بیک بنے اور تفرقہ اندازی (ہندو مسلم پھوٹ)، مسلمانوں کو بزدل بنانے، ان میں انگریزوں کی غلامی کی زوردار اسپرٹ پیدا کرنے اور کانگریس سے علاحدگی بلکہ دشمنی رکھنے کے کھیل خوب کھل کر کھیلے، جس سے رفتہ رفتہ مسلمانوں میں مستقل طور پر مایوسی چھا گئی

اور بالخصوص تعلیم یافتہ مسلمان جو کہ ان انجمنوں کے ممبر اور جوشیلے کارکن تھے یہ دیکھ کر کہ کانگریس کامیاب ہوتی جارہی ہے، امتحانات مقابلہ رک نہیں سکتے، کونسلوں کی توسیع ہوتی جاتی ہے اور دیگر امور میں بھی کانگریس کی بھی آواز کچھ نہ کچھ اثر انداز ہو رہی ہے، ان کے دماغ معطل اور ان کے قلوب ضعیف اور ان کے قویٰ مضمحل ہو گئے۔

مسٹر ماریسن کی رہنمائی:

سرسید ۱۸۹۸ء میں اور مسٹر بیک ۲/دسمبر ۱۸۹۹ء میں انتقال کر گئے۔ اس کے بعد مسٹر ، ریسن علی گڑھ کالج کے پرنسپل بنا دیے گئے۔ انھوں نے وہاں کی سیاست میں بھی قائم مقامی کی۔ ۱۹۰۰ء میں لیفٹنٹ گورنر یو پی مسٹر میکڈانلڈ نے اردو ہندی کا نیا جھگڑا پیدا کیا، جس سے ہندو مسلمانوں کا اتحاد کافور کر دیا گیا اور افتراق کا زہر تمام ملک میں پھیلا دیا گیا۔ دوسری انجمن ''محمڈن اینگلو اورینٹل'' بھی مسٹر ماریسن نے دفن کر دی۔ اردو ہندی کے جھگڑے میں نواب مہدی علی خان محسن الملک کو سخت زک اٹھانا پڑی۔ ۱۹۰۱ء میں محمڈن پولیٹکل آرگنائزیشن بنائی گئی۔ جس کی وجہ سے نواب وقار الملک کو بہت زیادہ تکالیف برداشت کرنا پڑی۔ اس کے بعد تقسیم بنگال کا واقعہ پیش آیا، جس نے مسلمانوں کو بالکل بے دم کر دیا۔

مسلم لیگ کا قیام:

— الغرض سرسید کی اس پالیسی اور مسٹر بیک اور دیگر انگریزوں کی ان کارروائیوں کا اثر انگریزی تعلیم یافتوں پر اس قدر زہریلا پڑا کہ مسلمان سیاسیات میں ہندوؤں سے بہت پیچھے پڑ گئے جس کا احساس مسلمانوں کو بہت بعد میں ہوا۔ اسی زہریلی پالیسی کے ماتحت ۱۹۰۶ء میں مسلم لیگ کی بنیاد ڈالی گئی، ان امور کی تفصیل ''روشن مستقبل'' میں پوری طرح دی گئی ہے۔

ہندوستانیوں کو اس شدت اور بے دردی سے پامال کر دینے کے بعد انگریزوں نے ہندوستان کی سرحدوں کی طرف توجہ کرنا ضروری سمجھا۔ (نقشِ حیات، حصہ دوم، ص ۹۷-۷۵)

آئینی اصلاحات کی پہلی قسط:

ہندوستان میں گورنر جنرل کی کونسل سب سے اول ۱۸۵۴ء میں بنائی گئی مگر اس میں کوئی غیر سرکاری ممبر نہ تھا۔ غالباً ہنگامہ ۱۸۵۷ء کے اثرات سے ۱۸۶۱ء میں آئینی اصلاحات کا پہلا قانون

پاس ہوا جس کی رو سے تین ہندوستانی ممبر بذریعۂ نامزدگی مقرر کیے گئے۔ ان میں سے ایک ممبر گوالیار کے مشہور وزیر سر ڈنکر راؤ تھے۔

انڈین نیشنل کانگریس کا قیام:

لارڈ رپن کے زمانہ (۱۸۸۰ء تا ۱۸۸۴ء) میں البرٹ بل کو ناکام بنانے میں اینگلو انڈین اصحاب نے جو منظم کوشش کی تھی اُسے ہندوستانیوں نے بہت محسوس کیا مختلف صوبوں میں چند سیاسی جماعتیں موجود تھیں۔ ۱۸۷۶ء میں بنگال میں ''انڈین ایسوسی ایشن'' بن چکی تھی۔ اور ۱۸۸۴ء میں مدراس میں ''مہاجن سبھا'' قائم ہو چکی تھی۔ البرٹ بل کی ناکامی سے ان جماعتوں میں حرکت پیدا ہوئی اور ہر طرف سیاسی چرچے ہونے لگے، جس سے انگریز بہی خواہان ہند کو اندیشہ ہوا کہ یہ بڑھتی ہوئی بے چینی نہ معلوم کیا شکل اختیار کرے گی؟ اس لیے مسٹر اے۔ او۔ ہیوم پنشنر سویلین، ہندوستان کی سیاسی رہنمائی کے لیے کھڑے ہو گئے اور انھوں نے سب سے اول ہندوستانی گریجویٹوں کو ایک چھٹی اس مضمون کی لکھی کہ

''اگر آپ لوگ ذاتی آسایش اور ذاتی مقاصد کو ٹھکرا کر اپنے ملک کے لیے زیادہ آزادی اور ایک بہتر اور غیر جانبدارانہ آئین حاصل نہ کر سکیں، جس میں آپ لوگوں کا ہاتھ ہو تو آپ کے مخالفین کے خیالات آپ کے بارے میں صحیح ثابت ہوں گے۔ اور ہمارے خیالات، جو آپ کے دوست ہیں غلط ثابت ہوں گے۔ لارڈ رپن کے اعلیٰ منصوبے جو آپ کی بھلائی کے لیے تھے بے نتیجہ اور محض خیالی رہ جائیں گے۔ اور ترقی کے تمام خیالات کا خاتمہ ہو جائے گا۔ آپ کو چاہیے کہ انگریزوں کی یہ شکایت کرنا چھوڑ دیں کہ تمام بڑے بڑے عہدے دینے میں انھیں ترجیح دی جاتی ہے اور یہ کہ ہندستان غلامی کے رسوں میں جکڑے ہوئے ہیں اور ان کے ساتھ بچوں کا سا برتاؤ کیا جاتا ہے۔ اگر آپ لوگ جدوجہد نہیں کرتے تو اسی برتاؤ کے مستحق ہیں کہ آپ کو اسی حالت میں رکھا جائے۔ کیوں کہ آپ میں ملکی ہمدردی اور بے نفسی کی وہ صفات نہیں ہیں۔ جو انگریزوں میں ہیں جن کی وجہ سے اُنھیں ترجیح دی جاتی ہے۔ اِن حالات میں اُنھیں آپ کا حاکم اور آپ سے خدمت لینے والا آقا بنا رہنا چاہیے۔ اور آپ کے کندھوں کو اپنے جوے سے خوب زخمی کر دینا چاہیے حتیٰ کہ آپ اس بات کو خوب سمجھ جائیں کہ ذاتی قربانی اور بے نفسی ہی ایسی چیزیں ہیں جن کے ذریعے آزادی اور خوشی حاصل ہو سکتی ہے۔'' (اہلِ ہند کا قومی ارتقا: اے۔ سی۔ منر مدار، ص ۲۷)

اِس چھٹی کے اثر سے ۱۸۸۴ء کے آخر میں ''انڈین نیشنل یونین'' قائم ہوئی اور مسٹر ہیوم اُس زمانے کی تمام موجودہ جماعتوں سے خط و کتابت کرتے رہے حتیٰ کہ دسمبر ۱۸۸۴ء میں ''تھیو سافیکل سوسائٹی پونا'' کے جلسے میں طے ہوا کہ آیندہ سال کے دسمبر میں کانگریس کا پہلا جلسہ طلب کیا جائے جلسہ کے ابتدائی امور طے کر کے مسٹر ہیوم، لارڈ ڈفرن وائسرائے ہند کے پاس چند تجاویز لے کر گئے جن کا منشا یہ تھا کہ ہندوستانیوں کے لیے وہ اصلاح رسوم اور اصلاح تمدّن کی انجمن قائم کریں۔ مگر لارڈ ڈفرن نے انھیں حسب ذیل الفاظ میں مشورہ دیا:

''اس ملک میں ایسے لوگوں کی کوئی جماعت نہیں ہے جو مثل انگلستان کے بطور ملک معظم کی مخالف جماعت کے کام کرتی ہو۔ چوں کہ انگریزوں کو یہ علم نہیں ہے کہ ہندوستانیوں میں ان کی نسبت اور ان کی پالیسی کی نسبت کیا خیالات ہیں، حاکم اور محکوم دونوں کے لیے یہ مفید معلوم ہوتا ہے کہ ہندوستان کے سیاست داں اصحاب سالانہ جمع ہو کر گورنمنٹ کو یہ بتائیں کہ اس کا نظام کن امور میں ناقص ہے اور اس کی حالت کس طرح بہتر کی جا سکتی ہے۔''

(اہل ہند کا قومی ارتقا از اے۔ سی مزمدار (انگریزی) صفحہ ۵۰)

یہ مشورہ دیتے وقت لارڈ ڈفرن نے مسٹر ہیوم سے کہہ دیا تھا کہ جب تک کہ وہ وائسرائے ہیں تب تک اُن کے مشورے کا اظہار لوگوں پر نہ کیا جائے۔ چناں چہ جب تک وہ وائسرائے رہے، اس کا اظہار نہ کیا گیا اور ان کے ہندوستان سے چلے جانے کے بعد یہ واقعہ روشنی میں لایا گیا۔ لارڈ ڈفرن سے معاملات طے کرنے کے بعد مسٹر ہیوم انگلستان گئے اور وہاں پارلیمنٹ کے ممبروں سے گفتگو کی اور بہت سے لبرل اصحاب سے ہمدردی اور امداد کے وعدے لیے اور ہندوستان واپس آ کر صوبوں سے جدا جدا ڈیلی گیٹ طلب کر کے کانگریس کا پہلا اجلاس دسمبر ۱۸۸۵ء میں بمقام بمبئی منعقد کیا۔ اس طرح جو لوگ شریک جلسہ ہوئے وہ مختلف صوبوں اور مختلف سیاسی جماعتوں کے نمایندے تھے۔ اسی لیے مسٹر ہیوم نے یہ توقع ظاہر کی تھی کہ مجلس آیندہ زمانے میں ہندوستان کی پارلیمنٹ ہوگی، اس وقت کانگریس کا تعلق حکومت سے اس قدر قریب تھا کہ مسٹر ہیوم نے وائسرائے سے یہ کوشش کی تھی کہ کوئی گورنر کانگریس کی صدارت کرے۔ مگر وائسرائے نے کہا کہ گورنر کی موجودگی میں لوگ آزادی سے اظہار رائے نہ کر سکیں گے۔ اس لیے یہ مناسب نہیں۔ غرض ان خوشگوار حالات اور عمدہ فضا میں اس قومی پارلیمنٹ کی ابتدا

ہوئی اور ہندوستان میں جو سیاسی احساس انگریزی عمل داری کے آنے کے وقت سے پیدا ہوا تھا، اُس نے بتدریج نشو ونما پا کر ۱۸۸۵ء میں کانگریس کی شکل اختیار کی۔

نیشنل کانگریس قائم ہونے کے بعد اُس کی ایک شاخ لندن میں قائم ہوئی جس کے صدر سر ولیم وڈ برن صوبہ بمبئی کے پنشنر سول سرونٹ تھے۔ وہ مسلسل ۲۹ سال تک جب تک کہ زندہ رہے کانگریس کی خدمت کرتے رہے اور ایک ہزار پونڈ سالانہ کی کل پنشن اسی کام میں صرف کر دیتے تھے۔ ۱۸۸۹ء میں اُنھوں نے بمبئی کے اجلاس کانگریس میں انگلستان سے آ کر صدارت کی تھی۔ (مسلمانوں کا روشن مستقبل سید طفیل احمد دہلی، کتب خانہ عزیزیہ، ۱۹۴۵ء، ص ۵۸۔۳۵۴)

مولوی صدیق حسن بھوپال سے خطاب کی واپسی:

۲؍نومبر ۱۸۸۵ء: بمعائنہ اودھ اخبار ۱۸۸۵ء معلوم ہوا کہ ماہ حال کو بحکم گورنمنٹ مولوی صدیق حسن شوہر رئیسہ بھوپال سے خطاب نوابی واپس لے لیا گیا اور کار ریاست سے بے تعلق ہوئے۔ اور ۱۷ اضرب توپ سلامی کی موقوف ہوئی۔ (ایک نادر روز نامچہ، ص ۵۵)

برہما:

۲۹؍نومبر ۱۸۸۵ء: آج سرکار انگلشیہ نے شہر مانڈلے دار السلطنت ملک برہما پر فتح حاصل کر لی شاہ ہنبیا نے اطاعت اختیار کی اور اپنی جان و مال کو انگریزوں کے سپرد کیا۔ شاید ہندوستان کے کسی ٹاپو میں اب ان کا قیام ہو۔ (ایک نادر روز نامچہ، ص ۸)

۱۷؍دسمبر ۱۸۸۵ء: ۱۷؍دسمبر ۱۸۸۵ء ''کو آل انڈیا یونین''۔ معرض وجود میں آئی۔ ایک سال بعد یعنی ۱۸۸۶ء میں اسی انجمن نے آل انڈیا کانگریس کا، قالب اختیار کر لیا، جس کے روح رواں ایک انگریز مسٹر ہیوم تھے۔ (کاروان، گم گشتہ: رئیس احمد جعفری، کراچی، ۱۹۷۱ء ص ۱۱۸)

۲۸؍دسمبر ۱۸۸۵ء کو گوکل داس تیج پال سنسکرت کالج میں انڈین نیشنل کانگریس کا پہلا اجلاس شری ومیش چندر بنرجی کی صدارت میں منعقد ہوا بنرجی کلکتہ بار کے نامی رہنماؤں میں سے تھے اس اجلاس میں مسٹر اے او ہیوم'' (شملہ)'' ومیش چندر بنرجی، نریندر ناتھ سین (کلکتہ) وامن سدا شیو آپٹے اور کرشن آگر کر (پونہ)، گنگا پرشاد (لکھنو)، دادا بھائی نورو جی (بمبئی)، کاشی ناتھ ترمبک اور فیروز شاہ مہتا (بمبئی)، جی سبرم مینم اَیر اور ویرا دھوا چاریا (مدراس)، کیشو پلے اننت پور، مسٹر رحمت اللہ سایانی اور جسٹس رانا ڈے (بمبئی) وغیرہم (۷۲) نمایندوں کے علاوہ بہت

سے صحافی بھی شریک ہوئے تھے۔ اجلاس میں انڈین کانسٹی ٹیوشن کے سلسلے میں رائل کمیشن کے قیام، انڈیا کونسل کے خاتمے لیجس لیٹو کونسلز کی ہیئت ترکیبی کی خرابی جس کے تمام ارکان مقرر کردہ تھے، آئی سی ایس کے امتحان کے امیدواروں کی عمر کی حد میں اضافے، فوجی اخراجات میں کمی، برما کے ہندوستان سے انضمام، کانگریس کی منظور شدہ تجاویز کو ملک کی تمام سیاسی جماعتوں کو بھیجنے اور ان سے بھی پاس کرانے سے متعلق پاس کی گئی تھیں۔ آخری اور نویں تجویز کانگریس کے آیندہ اجلاس کے مقام (کلکتہ) اور تاریخ ۲۸ر دسمبر ۱۸۸۶ء کے فیصلے کے بارے میں تھی۔ (سکسٹی ایرس آف کانگریس، لاہور، ۱۹۴۶ء، ص ۲۶۔۱۲۵)

"اجلاس میں کانگریس کے حسب ذیل مقاصد قرار پائے:

(۱) ہندوستان کی آبادی جن مختلف اور متصادم عناصر سے مرکب ہے اُن سب کو متحد و متفق کر کے ایک قوم بنانا۔

(۲) اور اس طرح جو ہندوستانی قوم پیدا ہو اُس کی دماغی، اخلاقی، اجتماعی اور سیاسی صلاحیتوں کو دوبارہ زندہ کرنا۔

(۳) ایسے حالات کی اصلاح و ترمیم کرانا جو ہندوستان کے لیے مضرت رساں اور غیر منصفانہ ہوں اور اس طریقے سے ہندوستان اور انگلستان کے درمیان اتحاد و یگانگت کو استوار کرنا۔"

ان مقاصد میں بظاہر کوئی بات قابلِ اعتراض معلوم نہ ہوتی تھی اب دیکھنا یہ ہے کہ منظور شدہ قراردادوں کی نوعیت کیا تھی جو کانگریس کے پہلے جلسہ میں پاس ہوئیں وہ یہ ہیں:

(۱) نظام ہند کے متعلق موجودہ تحقیقات کے لیے ایک شاہی کمیشن مقرر کیا جائے۔

(۲) سکریٹری آف اسٹیٹ ہند کی کونسل توڑ دی جائے۔

(۳) صوبوں کی قانونی کونسلوں میں منتخب شدہ ممبروں کی کافی تعداد بڑھا کر کونسلوں کی توسیع کی جائے اور پنجاب اور ممالک متحدہ میں کونسلیں قائم کی جائیں اور ان کے سامنے بجٹ پیش ہوا کرے۔

(۴) حسب سفارش انڈین آفس ۱۸۶۰ء سول سروس کا امتحان انگلستان کی طرح اُسی وقت ہندوستان میں بھی ہوا کرے۔

(۵) فوجی اخراجات میں جو اضافہ تجویز ہوا ہے، وہ ملک کی آمدنی کافی نہ ہونے کی وجہ سے

نہ کیا جائے۔

(۶) شمالی برہما کا الحاق نہ کیا جائے اور اگر یہ کیا جائے تو اسے مثل سیلون کے ایک کالونی (نوآبادی) قرار دیا جائے۔ (تواریخ کانگریس از ڈاکٹر پٹا بھائی سیتارامیہ، ص ۳۰۔۲۸)

سید طفیل احمد منگلوری نے اس پر ان الفاظ میں تبصرہ کیا ہے:

''مندرجہ بالا تجاویز میں دو تجویزیں سول سروس کے امتحانات اور کونسلوں کی توسیع کے متعلق خاص طور پر ایسی تھیں جن کا مضمون علی گڑھ کے جلسہ میں ۱۸۸۴ء میں (سر) سر نیدر و ناتھ بنرجی نے اپنی تقریر میں بھی بیان کیا تھا اور جس کی وجہ سے مسٹر بیک کو برہمی پیدا ہوئی تھی اب جبکہ وہ کانگریس میں پاس ہو کر آ گئیں تو مسٹر بیک اور رجعت پسند انگریزوں کو کانگریس سے ایک مستقل رنجش اور بنائے مخاصمت پیدا ہوگئی اور اینگلو انڈین اخبارات یعنی پانیر الہ آباد وغیرہ میں مضامین کا ایک سلسلہ چھڑ گیا جن کے لکھنے میں مسٹر بیک کا بڑا حصہ تھا۔ اس منزل پر سر سید نے کوئی اظہار خیال نہیں کیا۔ البتہ اگلے سال دسمبر ۱۸۸۶ء میں محمڈن ایجوکیشنل کانگریس، علی گڑھ میں قائم کی گئی جس کا نام بعد میں مسلم ایجوکیشنل کانفرنس کر دیا گیا۔ اس جماعت کے قائم کرتے وقت سیاسی امور کے بارے میں سر سیّد نے ان الفاظ میں اظہار خیال فرمایا:

> ''جن لوگوں کا یہ خیال ہے کہ پولیٹکل امور پر بحث کرنے سے ہماری قومی ترقی ہوگی، اُس سے میں اتفاق نہیں کرتا بلکہ میں تعلیم کی ترقی کو اور صرف تعلیم کو ذریعہ قومی ترقی کا سمجھتا ہوں (مسلمانوں کا روشن مستقبل، ص ۲۸۲۔۲۸۰)

۱۸۸۶ء

۵ر جون ۱۸۸۶ء: سر سید نے اپنے دوسرے مضمون میں لکھا ہے:

''ایک زمانہ تھا کہ ہمارے ملک کے حکمراں اس بات کے نہایت خواہشمند تھے کہ ہندوستان کے رہنے والے (انگریزی زبان اور انگریزی علوم وفنون سیکھنے پر آمادہ ہوں اور اب یہ زمانہ ہے کہ اس کے برخلاف خفیہ اور اعلانیہ تدبیر ہوتی ہے کہ ہندوستانیوں کو انگلش ہائی ایجوکیشن سے محروم کیا جائے اور اس پالیسی کی تبدیلی کے وجوہ خواہ صحیح ہوں یا غلط، ہندوستانی یہ سمجھتے ہیں کہ ابتدا میں تمام انگریزوں اور تمام مشنری سوسائٹیوں کو یقین تھا کہ انگریزی تعلیم سے تمام ہندوستان یا اس کا بڑا حصہ عیسائی ہو جائے گا۔ اور

نیز گورنمنٹ کو اپنے دفتر کے کاروبار کے لیے انگریزی خوانوں کی ضرورت تھی، مگر اس تعلیم سے مشنری سوسائیٹوں کا مقصد حاصل نہ ہوا، بلکہ اس کے خلاف ظہور میں آیا۔ اس لیے مشنری سوسائیٹیاں ہائی انگلش ایجوکیشن کے برخلاف آمادہ ہوئیں۔ اور گورنمنٹ کو یہ سبق پڑھایا کہ اُس کا کام عام تعلیم پھیلانے کا ہے نہ کہ ہائی ایجوکیشن میں روپیہ صرف کرنے کا ہندوستان کے حاکم جو بجائے کشادہ دل حاکم ہونے کے زیادہ تر مشنری اوصاف سے متصف تھے مشنریوں کی تائید پر آمادہ ہو گئے اور انگلش ہائی ایجوکیشن کی مخالفت اختیار کی اور جو حاکم درحقیقت کشادہ دل تھے ان کو یہ غلط خیال پیدا ہوا کہ ہندوستانیوں کو ہائی ایجوکیشن کی تعلیم دینا خود گورنمنٹ کو اپنے ایک مخالف گروہ کا پیدا کرنا ہے۔ ان خیالات پر ہندوستانی یقین کرتے ہیں کہ گورنمنٹ نے ہائی ایجوکیشن برباد کرنے کی پالیسی اختیار کی ہے۔ اور اس پالیسی کو مختلف حیلوں سے چھپاتی ہے اور اس پالیسی کے عمل درآمد کرنے کے لیے ایک بڑا حیلہ علوم مشرقی کے ساتھ ہمدردی ظاہر کرنے کا اختیار کیا ہے۔''

۱۷ر جولائی ۱۸۸۶ء: بہادر شاہ ظفر کی بیوہ زینت محل کا مولمین میں مورخہ ۱۷ر جولائی ۱۸۸۶ء کو انتقال ہو گیا۔ وہ نومبر ۱۸۵۸ء میں اپنے شوہر کے ساتھ جلاوطن کی گئی تھیں، بہادر شاہ کے انتقال (۱۸۶۴) کے بعد وہ تنہا زندگی گزار رہی تھیں۔

۲۸ر دسمبر ۱۸۸۶ء: کانگریس کا دوسرا سالانہ اجلاس کلکتہ میں دادا بھائی نوروجی کی صدارات میں منعقد ہوا۔ دادا بھائی اس اہم اجلاس کے بعد ۱۸۹۳ء اور ۱۹۰۶ء میں بھی کانگریس کے صدر منتخب ہوئے تھے۔ اجلاس میں ملک کے ۴۳۲ نمایندے شریک ہوئے، ان میں ۳۳ مسلمان تھے۔ اجلاس میں عوام کے جان و مال کی حفاظت کسانوں کی خوشحالی، کونسل میں پچاس فیصد تک ملک کے منتخب نمایندوں کے اضافے، سیشن ججوں اور ہائی کورٹوں کے اختیارات بڑھانے وغیرہ کے بارے میں تجاویز پاس کی گئیں۔ لارڈ ڈفرن وائسرائے ہند نے تمام ڈیلی گیٹوں کو گارڈن پارٹی دی (سکسٹی ایئرس آف کانگریس، ص ۲۸۔۱۲۷)

اس اجلاس میں حسب ذیل تجاویز پاس ہوئیں:

(۱) جیوری کے ذریعے سے مقدمات طے کیے جایا کریں۔

(۲) عدالتی اور عاملانہ (انتظامیہ کے) اختیارات رکھنے والے افسران جدا جدا مقرر کیے

جائیں۔

(۳) ملک کی حفاظت کے لیے ہندوستانیوں کو والنٹیر بنانے کا سلسلہ جاری کیا جائے۔

مندرجہ بالا دونوں سالوں کی تجاویز میں کوئی تجویز بظاہر ایسی نہ تھی جو مخصوص مسلمانوں کے خلاف ہو، سول سروس کے امتحان کے مسئلے میں سرسید ہمیشہ سے ساعی تھے اور جب کہ اُن کا مشن یہ تھا کہ تعداد میں اگرچہ کتنے ہی کم مُسلمان تعلیم پائیں گے مگر جتنے بھی تعلیم یافتہ ہوں، وہ اعلیٰ پایے کے اور بمنزلہ آسمان کے تاروں کے ہوں تو اُصولاً یہ تحریک اُن کی مرضی کے خلاف نہ ہو سکتی تھی جیوری کی تجویز ہندوستانیوں کو اُس ذلت سے نکالنے والی تھی، جس کے لیے سرسید ہمیشہ سے کوشاں تھے۔

عدالتی اور عاملانہ (انتظامیہ کے) اختیارات مُسلمانوں کی عملداری میں جدا جدا تھے مگر کمپنی نے اُنھیں یکجا کر دیا تھا بمشکل ۱۸۳۳ء میں علاحدہ علاحدہ کیا تھا لیکن ہنگامہ ۱۸۵۷ء کے بعد ۱۸۵۸ء میں پھر یکجا کر دیا جس کی وجہ سے ہندوستانیوں کے ساتھ حد درجہ کی ناانصافی ہو رہی تھی۔ ان کا جدا ہونا ہر ہندوستانی کے حق میں ہر طرح مفید تھا۔ ملک کی حفاظت کے لیے والنٹیروں کا بھرتی ہونا عین مُسلمانوں کی طبیعت کے موافق تھا اور جو اس ذلت کو مٹاتا تھا، جو دیسی عیسائیوں کے مقابلے میں ہندو مُسلمانوں کو ہوتی تھی اور جس قومی امتیاز کے مٹانے میں سرسید ہمیشہ ساعی رہتے تھے ان سب سے بڑھ کر کانگریس کی تجویز کونسلوں میں ممبروں کی توسیع کے متعلق تھی اور جن صوبوں میں قانونی کونسلیں نہ تھیں اُن میں قیام کا مطالبہ کیا گیا تھا، جو سرسیّد کا عین مقصد رہا تھا۔ اب کانگریس سے سرسید کے اختلاف کی بہ ظاہر وجہ یہ ہوئی کہ حکام وقت میں سے بعض اصحاب نے کانگریس کو ایک تحریک ٹھہرایا۔ اخبار پانیر الہ آباد نے جو نیم سرکاری اخبار تھا، لکھا کہ اس تحریک کو دبانے کے لیے نصف درجن پولیس والے کافی ہوں گے، اس قسم کی باتیں مسٹر بیک کہتے رہتے تھے۔''

(مسلمانوں کا روشن مستقبل ص، ۸۴-۱۲۸۲)

الہ آباد یونیورسٹی قائم ہونے کے وقت سرسید نے ایک مضمون لکھا تھا، وہ اس میں لکھتے ہیں:

''افسوس کہ لوگوں میں یہ خیال زیادہ پختہ ہوتا جاتا ہے کہ الہ آباد یونیورسٹی کی پالیسی وہی ہوگی جو پنجاب یونیورسٹی کی تھی۔

یعنی علوم مشرقی کا دھوکا دے کر انگلش ہائی ایجوکیشن کو گھٹانا اور ہندوستانی رعایا کی آنکھیں بند

کر کے اُن کو ایک چکر میں ڈالے رکھنا! بے شک ایک مہذب گورنمنٹ کو ایسا ہی کرنا چاہیے ہندوستانیوں کو اس بات کا شبہ ہے کہ گورنمنٹ نے انگلش ہائی ایجوکیشن کے معدوم کرنے کی پالیسی قرار دی ہے، یہ شبہ لارڈ میو کے زمانے سے پیدا ہوا تھا لارڈ الگن کے زمانے میں اُس شبہ کو تقویت ہوئی مارکوئس آف رپن کے زمانے میں یہ شبہ بہت زیادہ قوی ہو گیا گو ہزا کسلینسی نے اس سے انکار کیا، مگر چوں کہ قول کی نسبت عمل بہت زیادہ یقین دلانے والا ہوتا ہے، اس لیے ہندوستانیوں کے دل میں جو شبہ پیدا ہوا تھا وہ رفع نہیں ہوا۔ اسی زمانے میں منحوس پنجاب یونیورسٹی قائم ہوئی۔ پھر وہی بد بخت زمانہ لارڈ ڈفرن کے عہد حکومت میں نظر آیا۔ اور ہم کو اندیشہ ہوا کہ جو آفت پنجاب پر آئی وہی ہمارے صوبے پر آنے والی ہے۔

بلا شبہ گورنمنٹ کی یہ عادت ہے کہ جو پالیسی وہ اختیار کرتی ہے، اس کو بمشکل چھوڑتی ہے۔ وہ جانتی ہے کہ میں گناہ کرتی ہوں اس کا کانشنس اس کو بتلاتا ہے کہ یہ اُن لوگوں کے ساتھ جن کو خدا نے اُس کے سپرد کیا ہے بدسلوکی ہے، مگر وہ اپنے کانشنس کو اُن خوشامد خوروں کی باتوں سے جو خلاف اپنے کانشنس کے گورنمنٹ کی ہاں میں ہاں ملا دیتے ہیں اور نادان رئیسوں اور سرداروں کی باتوں سے جو چند توپ سلامی یا دربار میں کرسی کے اول یا دوم نمبر ہونے پر اپنی عزت کا مدار سمجھتے ہیں۔ اور ہندوستانی عہدہ داروں کی رایوں سے جنھوں نے بجز کریمنیل اور سول اور ریونیو لا کے تعلیم کے معاملہ میں ایک منٹ بھی غور کرنے میں اپنی زندگی کو صرف نہیں کیا یا اُن متعصب ہندوؤں اور مسلمانوں کی باتوں سے جو انگریزوں کی ہر ایک چیز سے دلی نفرت رکھتے ہیں، اپنے کانشنس کو ٹھنڈا کر لیتی ہے۔ مگر یہ اصلی ٹھنڈک نہیں ہے، بلکہ صرف مصنوعی ٹھنڈک ہے، جس کے اچھے اثر کی کبھی توقع نہیں ہو سکتی۔

لیکن اگر گورنمنٹ الہ آباد یونیورسٹی کو پنجاب یونیورسٹی کی بہن بنائے تو ہمیں کیا کرنا چاہیے جواب یہ ہے کہ استقلال استقلال، استقلال، ہمت، ہمت، ہمت، کوشش! کوشش! کوشش!!! ہم کو گورنمنٹ کی پالیسی کے کچھ پروا نہیں کرنی چاہیے اور خود اپنے لیے انگلش ہائی ایجوکیشن کے حاصل کرنے کی کوشش کرنی چاہیے اور اگر ہم میں سلف ریسپکٹ کا کچھ اثر باقی ہے تو گورنمنٹ کو دکھا دینا چاہیے کہ بلا شبہ گورنمنٹ کو لوگوں کی جانوں پر اختیار ہے مگر لوگوں کی رایوں پر اختیار نہیں ہے۔ (مسلمانوں کا روشن مستقبل، ص ۵۸۔۱۵۷)

۱۸۸۷ء

۸ر مارچ ۱۸۸۷ء کے کلکتہ گزٹ میں مشتہر کیا گیا کہ مسلمانوں کی سلطنت تو نہایت حقیر:

ذلیل ہوگئی ہے ہندوؤں سے ہم کو کچھ خوف نہیں ہے، اگرچہ بہت آدمیوں نے یہ صلاح دی کہ مسلمانوں کو تقویت دے کر ہندوؤں کی قوت کو مغلوب کرنا چاہیے، مگر یہ تدبیر اور انتظام اچھا نہیں ہے کچھ ضروری نہیں ہے۔ کہ ہم ایسے کام کریں جو ہندوستانیوں کو ناگوار خاطر ہوں اور سلطنت جو بر سر زوال ہے اور وہ حقیقت میں ہماری قلبی دشمن اور رقیب ہے اس کے حامی اور مددگار ہوں۔" (تاریخ ہندوستان: مولوی ذکاءاللہ (جلد پنجم)، ص ۳۳۴)

مگر باوجود کمپنی کے مخالفانہ طرز عمل کے ۱۸۵۷ء تک مسلمانوں کی جو کچھ تعلیمی اور ذہنی حالت باقی رہی اُس کا اندازہ بنگال سول سروس کے ایک افسر کی حسب ذیل تحریر سے ہوگا، جو یہ ہے:

"عزم تعلیم اور ذہنی صلاحیت کے اعتبار سے مسلمان ہندوؤں سے کہیں زیادہ فائق ہیں اور نسبتاً ہندو اُن کے سامنے طفلِ مکتب معلوم ہوتے ہیں۔ علاوہ اس کے مسلمانوں میں انتظامی کاموں کی اہلیت زیادہ ہوتی ہے۔" (بغاوتِ ہند اور آیندہ پالیسی: ہیرنگٹن طامسن، ص ۱۷۔۱۳)

بدقسمتی سے ہنگامہ ۱۸۵۷ء کے بعد سے گورنمنٹ کی ناراضی مسلمانوں سے اور زیادہ بڑھ گئی جس کی بابت سر آکلینڈ کالون لیفٹنٹ گورنر صوبہ متحدہ نے فرمایا:

"غدر فرد ہو جانے پر ان ہی سے سخت انتقام لیا گیا اور دونوں قوموں (یعنی انگریزوں اور مسلمانوں) میں مصالحت کی امید جاتی رہی۔" (مسلمانوں کا روشن مستقبل، ص ۶۵۔۱۶۴)

وفات واجد علی شاہ:

۲۲ ستمبر ۱۸۸۷ء، کل واجد علی شاہ سابق بادشاہ اودھ نے بہ مقام مٹیا برج، کلکتہ بہ عمر ۷۰ سال قضا کی۔ مرحوم کے ۱۹ لڑکے اور ۳۸ لڑکیاں ہیں (ایک نادر روزنامچہ، ص ۹)

۲۸ دسمبر ۱۹۸۷ء: کانگریس کا تیسرا سالانہ اجلاس ۲۸ دسمبر کو مدراس میں ہوا۔ اس کے لیے خاص طور پر پنڈال بنایا گیا تھا۔ اس کے صدر بدرالدین طیب جی تھے جو بعد میں جسٹس بدرالدین طیب جی کہلائے۔ استقبالیہ کمیٹی کے صدر راجہ سرٹی مادھوراؤ تھے۔ اس اجلاس میں ۶۰۷ نمایندوں نے شرکت کی، شریک ہونے والوں میں مسٹر اردے نارٹن بھی تھے۔ جو عوام میں باغی مشہور تھے انھوں نے اپنی تقریر میں کہا کہ اگر برائیوں کے خلاف آواز اٹھانا، عوام کے انتظامیہ اور معاملات میں عوام کے حصے پر اصرار کرنا، اگر طبقاتی ناانصافیوں اور عوام کے استحصال کی مخالفت کرنا، اگر مقدمہ چلائے بغیر سزا سنا دینے کے خلاف احتجاج کرنا بغاوت ہے تو میں فخریہ طور پر میں تسلیم کرتا

ہوں کہ میں باغی ہوں اور باغیوں کے ایک عظیم الشان سلسلے سے میرا تعلق ہے۔

متعدد تجاویز پاس کی گئیں ایک تجویز میں کہا گیا کہ عدلیہ کو انتظامیہ سے الگ کر دینا چاہیے

(سکسٹی ایئرز آف کانگریس، ص ۲۹۔۱۲۸)

مدراس کے گورنر نے اجلاس کا خیر مقدم کرتے ہوئے کہا کہ اگر کانگریس اپنے آپ کو محض عوام کی جماعت سمجھتی ہے تو یہ درست نہیں ہے کہ اس طرح شہنشائیت پرست اور وطن پرستوں میں آپسی ٹکراؤ ہوتا رہے گا، گورنر کی تقریر کا منہ توڑ جواب مسٹر اے او ہیوم نے بڑی خوبی اور دلیری سے دیا۔ اس اجلاس میں مسلمان وکلا و شرفا نے شرکت کی۔ میر ہمایوں جاہ نے کانگریس کو پانچ ہزار روپے نذر کیے۔

(حسرت موہانی۔۔۔ایک سیاسی ڈائری)

اُس اجلاس میں آنریبل میر ہمایوں جاہ، حاجی محمد عبدالشکور بادشاہ، حامد علی خان علیگ بیرسٹرایٹ لا لکھنو اور علی گڑھ کے حافظ عبدالرحیم وکیل شریک تھے۔ اس اجلاس سے قبل مسلمان کافی تعداد میں غالباً اس لیے نہیں آئے تھے کہ ابتدا میں کانگریس کے دعوت نامے میں لکھا گیا تھا کہ ڈیلی گیٹ انگریزی سے اچھی واقفیت رکھتے ہوں، جس کی مسلمانوں میں کمی تھی، نیز کانگریس کی تمام کارروائی انگریزی زبان میں ہوتی تھی جو مسلمانوں کی شرکت مین ایک رُکاوٹ تھی، تاہم مدراس کے اجلاس میں... مسلمان شریک ہوئے، مدراس کے گورنر نے بھی ممبران کانگریس کو ایک ایوننگ پارٹی دی تھی۔ جس کے معنی یہ تھے کہ حُکام بالا اُس وقت اُسے اچھی نظروں سے دیکھتے تھے اس اجلاس میں حسب ذیل قراردادیں منظور ہوئیں:

(۱) اعلان شاہی کے مطابق جو پہلے ہو چکا ہے، ہندوستانیوں کو فوج کے اعلےٰ عہدوں پر مقرر کیا جائے اور ہندوستان میں ایک فوجی کالج قائم کیا جائے۔

(۲) قانون اسلحہ میں ایسی ترمیم کی جائے کہ اس کی رو سے زیادہ لوگوں کو ہتھیار استعمال کرنے کا اختیار ہو۔

(۳) جن لوگوں کی آمدنی ایک ہزار روپیہ سال سے کم ہے اُن پر سے انکم ٹیکس معاف کیا جائے۔

(۴) ہندوستانیوں کے افلاس کو مدنظر رکھ کر اُن کے لیے صنعتی تعلیم کا انتظام کیا جائے۔

(مسلمانوں کا روشن مستقبل، ص ۸۷۔۲۸۶)

۲۸ر دسمبر ۱۸۸۷ء: ٹھیک ایک زمانے میں جب کہ کانگریس کا سالانہ اجلاس بدرالدین طیب جی کی زیرِ صدارت مدراس میں ہوا، محمڈن ایجوکیشنل کانگریس (کانفرنس) کا دوسرا سالانہ اجلاس لکھنؤ میں ہو رہا تھا اُس کے اختتام پر ایک پبلک سیاسی جلسے میں (سر سید) احمد خان نے اپنی پہلی مشہور اسپیچ کانگریس کے خلاف دی، اس کے پڑھنے سے تعجب ہوتا ہے کہ ''اسباب بغاوت ہند'' کے مصنف کی زبان سے ایسی باتیں کس طرح نکلی ہوں گی مثلاً:

(الف) سر سید ہمیشہ اس بات پر بے حد زور دیا کرتے تھے کہ ہندوستانی اور انگریز مرتبہ میں بالکل برابر قرار دیے جائیں، اُس کے مقابلے میں اب جو سر سید نے انتخاب کے خراب نتائج کے متعلق کہا اُس میں خود ہندوستانیوں میں بھی امیر اور غریب کا امتیاز کیا۔ اس بارے میں آپ نے فرمایا:

''آپ خیال کریں کہ وائسرائے کے ساتھ کونسل میں بیٹھنے کے لیے واجبات سے ہے کہ ایک معزز شخص ملک کے معزز شخصوں میں سے ہو! کیا ہمارے ملک کے رئیس اس کو پسند کریں گے کہ ادنیٰ قوم یا ادنیٰ درجے کا آدمی خواہ اُس نے بے،اے کی ڈگری لی ہو یا ایم،اے کی اور گو وہ لائق بھی ہو، اُن پر بیٹھ کر حکومت کرے؟ ان کے مال جائداد اور عزت پر حاکم ہو؟ کبھی نہیں، کوئی ایک بھی پسند نہیں کرے گا! گورنمنٹ کی کونسل کی کرسی نہایت معزز ہے۔ گورنمنٹ مجبوری ہے سوائے معزز کے کسی کو نہیں بٹھا سکتی اور نہ وائسرائے اس کو مائی کلیگ یا مائی آنریبل کلیگ یعنی برادر یا معزز مصاحب کہہ سکتا ہے، نہ شاہانہ ڈنروں میں اور نہ شاہی جلسوں میں، جہاں ڈیوک اور ارل بڑے بڑے معززین شامل ہوتے ہیں، بلایا جا سکتا ہے۔ غرضے کہ گورنمنٹ پر یہ الزام کسی طرح عائد نہیں ہو سکتا کہ رئیسوں کو کیوں منتخب کرتی ہے۔'' (انڈین نیشنل کانگریس مدراس پر آنریبل سر سید احمد خان بہادر کے۔سی۔ایس۔آئی کا لیکچر، کان پور، ص ۲،۳)

(ب) ہندوستان میں سول سروس کے امتحان کی تجویز کی نسبت سید صاحب نے فرمایا:

''غور کیجیے کہ مقابلے کے امتحان کا اصول جو ولایت میں ہے اُس کا کیا نتیجہ ہے۔ یہ امر آپ کو ظاہر ہے کہ ولایت میں ہر شخص اعلیٰ و ادنیٰ ڈیوک اور ارل یا کسی جنٹلمین کا بیٹا اور ایک درزی یا کسی ادنیٰ درجے کے خاندان کا بیٹا برابر امتحان دے سکتا ہے، جو یوروپین ولایت سے کمپٹیشن کا امتحان دے کر آتے ہیں، ادنیٰ خاندان کے بھی ہوتے ہیں اور اعلیٰ خاندان کے بھی ہوتے ہیں...... لیکن انگلستان سے جو آتے ہیں وہ ہماری آنکھ سے اتنی دور ہیں کہ ہم نہیں جانتے کہ وہ لارڈ کے بیٹے ہیں

یا ڈیوک کے یا ایک درزی کے اور اس سبب سے یہ امر کہ ہم پر ایک ادنیٰ حکومت کرتا ہے، ہماری آنکھ سے چھپا ہوا رہتا ہے لیکن ہندوستان میں یہ خیال نہیں ہے۔ ہندوستان کی شریف قومیں، ہندوستان کے ادنیٰ درجے کے شخص کو جس کی جڑ بنیاد سے وہ واقف ہیں۔ اپنی جان و مال پر حاکم ہونا پسند نہیں کریں گے۔" (ایضاً ص ٦)

(ج) سید صاحب نے ہندوستانیوں کے ایک قوم نہ ہونے کے بارے میں فرمایا:

دیگر یہ کہ وہ ملک کمپٹیشن کے امتحان کے لیے مناسب ہے جس ملک میں تمام لوگ ایک قوم کے ہیں ......(یا)...... ملک میں مختلف قومیں بستی ہوں، لیکن وہ قومیں آپس میں مل کر بمنزلہ ایک قوم کے ہو گئی ہوں، جیسے انگلینڈ اور ما اسکاٹ لینڈ ...... مگر ہمارے ملک کی جس میں مختلف قومیں آباد ہیں یہ حالت نہیں ہے۔ ایک طرف ہندو دوسری طرف مُسلمان اور تیسری طرف پارسی ہیں۔ اگر آپ کے نزدیک یہ سچ ہے کہ یہ قومیں ایسی ہی آپس میں مل گئی ہیں کہ سب کو ایک قوم سمجھ لیا جائے تو بلاشبہ میں ضرور کہوں گا کہ ہندوستان میں کمپٹیشن (مقابلے) کا امتحان ہونا چاہیے اور اگر یہ نہیں ہے تو ہمارا ملک کمپٹیشن کے امتحان کے قابل نہیں ہے۔ تیسری صورت کمپٹیشن کے امتحان کی یہ ہے کہ گویا ایک ملک میں مختلف قومیں رہتی ہوں لیکن بہ اعتبار لیاقت، تعلیم اور دولت کے برابر ہوں... مگر یہ نہیں ہیں۔ مُسلمان پیچھے ہیں اور اس صوبے کے ہندو بنگالیوں سے کم ہیں۔" (ایضاً ص ٦، ٧)

سرسید کی مندرجہ بالا تقریر سے بالکل ظاہر ہے کہ مسٹر بیک کو اپنے مشن میں کس درجے کامیابی ہو گئی تھی، جس سے وہ بہت خوش تھے۔ بالخصوص ہندو مسلمانوں کی علاحدگی سے اینگلو انڈین اصحاب کو حد درجے کی خوشی تھی۔ اس کا اندازہ (سر) تھیوڈور ماریسن پروفیسر علی گڑھ کالج کی حسب ذیل تحریر سے بخوبی ہوگا:

"کانگریس کے خلاف سرسید کی تقریر سے مسلمانوں نے بالاتفاق کانگریس کی حمایت چھوڑ دی اور گورنمنٹ ہند میں اُصول نیابت کے آغاز کی خاص طور پر مخالفت کی۔ اس سے ایک بڑی سیاسی بحث چھڑ گئی اور آیندہ سالوں میں سرسید اور بیک کی کوشش بہت بڑی حد تک مُسلمانوں رائے مجتمع کرنے اور اُس کی نیابت کرنے میں مشغول ہو گئی۔

گاؤ کشی کے خلاف شورش پھر ان سیاسی واقعات کے ساتھ ہی پیش آئی اور اس سے مُسلمانوں کے ہندوؤں سے علاحدہ ہونے میں اور بھی مدد ملی۔

اُس وقت کا سارا رجحان مُسلمانوں اور انگریزوں کے درمیان اتحاد پیدا کرنا تھا۔ یہی بات

ہے جس کی طرف سرسید عرصۂ دراز سے مسلمانوں کو لانا چاہتے تھے۔ زندگی بھر وہ مُسلمانوں کو خدا کا یہ قول یاد دلاتے رہے کہ وہ اہل کتاب کو اپنے بہترین دوست پائیں گے۔"

(تاریخ علی گڑھ کالج از (سر) تھیوڈور بیسن، ص ۶۲)

مگر سوال یہ ہے کہ آیا لارڈ رپن، مسٹر ہیوم اور دوسرے لبرل خیالات رکھنے والے انگریز، اہل کتاب اور عیسائی نہ تھے جن کے ساتھ سرسید اب تک رہے تھے اور اُن کے اُصول کے مطابق ہندوستانیوں کی آئینی ترقی کے لیے ساعی رہتے تھے اور کنسرویٹو خیالات رکھنے والے انگریز کیا اول الذکر انگریزوں سے بہتر اہل کتاب تھے، جن کا مشن یہ تھا کہ اپنے ذاتی نفع کے لیے ابدالآباد تک ہندوستان کو اقتصادی اور سیاسی غلامی میں رکھیں۔

اسی لکھنو کے اجلاس کے فوراً بعد سید احمد خان صاحب کو حکومت کی طرف سے "سر" کا خطاب عطا ہوا۔

(مسلمانوں کا روشن مستقبل، صفحہ ۹۰۔ ۲۸۷)

۱۸۸۸ء

۲۱ر اگست ۱۸۸۸ء نینی تال: سرسید احمد خان نے کانگریس کے خلاف تحریک کا آغاز کر دیا ہے۔ تحریک کو منظم طور پر چلانے کے لیے ایک انجمن بہ اسم "دی انڈین پیٹریاٹک ایسوسی ایشن" قائم کی ہے۔ ایسوسی ایشن کی طرف سے ایک گشتی مراسلہ ملک کی مختلف ادبی، تعلیمی، اصلاحی، انجمنوں اور جماعتوں کو بھیجا گیا ہے۔ تاکہ ان کا تعاون حاصل کر کے کانگریس مخالف تحریک کو آگے بڑھایا جائے۔

افسوس کہ سرسید نے اپنے مراسلے میں کئی غلط بیانیاں کی ہیں۔ سرسید مرحوم اس زمانے میں نینی تال میں مقیم تھے۔ مراسلہ یہ ہے

بسم اللہ الرحمن الرحیم

الحمد للہ الذی الف بین قلوب المومنین. وقال لنبیہ علیہ الصلواۃ والسلام" لو انفقت مافی لارض جمیعا ماالفت بین قلوبھم و لکن اللہ الف بینھم انہ عزیز حکیم"

والصلواۃ والسلام علی رسولہ محمد و اصحابہ اجمعین.

خاکسار سید احمد امابعد بعالی خدمت اراکین......

عرض پرداز ہے۔

ان دنوں میں جو ہنگامہ بنگالی صاحبوں نے اور ان کے ہم مشرب ہندو صاحبوں اور ان کے مقلد چند مسلمان صاحبوں نے انڈین نیشنل کانگریس کا برپا کیا ہے، مجھے یقین ہے کہ اُس پر ہندوستان کے تمام مسلمانوں نے بخوبی غور کر لیا ہے اور بہت سی انجمن ہائے اسلام میں اُس پر بحث ہو چکی ہے اور سواد اعظم اہل اسلام نے اور تقریباً کل انجمن ہائے اسلامی نے یہ فیصلہ کیا ہے کہ مذکورہ بالا کانگریس کے مقاصد کل ہندوستان کے مسلمانوں کے حق میں مضر ہیں اور اس لیے مسلمانوں کو اُس میں شریک ہونا نہیں چاہیے اور میں یقین کرتا ہوں کہ آپ کی انجمن کی بھی یہی رائے ہے۔ میں نے بھی اس پر بخوبی غور کیا ہے اور بعد غور کامل میری یہ رائے قرار پائی ہے کہ کانگریس مذکور کے مقاصد ملک کے لیے، ملک کے امن کے لیے۔ ملک کی ترقی کے لیے۔ گورنمنٹ کے لیے اور خاص مسلمانوں کے لیے اُن کی موجودہ حالت میں آیندہ کو بھی گو کہ ان کی تعلیم میں کتنی ہی ترقی ہو جاوے، نہایت درجہ مضر ہیں۔ اگر بالفرض محال کانگریس مذکورہ کے مقاصد پورے ہو جاویں تو ہندوستان میں مسلمان کا حال یہودیوں سے بھی جن کے نسبت خدا نے فرمایا ہے ”و ضربت علیهم الذلة و المسكنة و باء و بغضب من الله“ بہت زیادہ بدتر ہو جاوے گا اعوذ باللہ من غضب اللہ! پس میں ہر ایک مسلمان کا فرض سمجھتا ہوں کہ کانگریس مذکورہ میں شریک نہیں اور اپنی بیزاری اُس سے ظاہر کرے۔

حامیانِ کانگرس نے یہ ایک غلط اور ناواجب طریقہ اختیار کیا ہے کہ انگلستان کے لوگوں اور پارلیمنٹ کے ممبروں کے سامنے ظاہر کرتے ہیں کہ ہندوستان کی کل قومیں ہندو مسلمان مذکورہ بالا کانگریس میں شریک ہیں۔ اس لیے ہمارا فرض ہے کہ ہم انگلستان کے لوگوں اور پارلیمنٹ کے ممبروں کو جتلا دیں کہ حامیان کانگریس کا وہ بیان غلط ہے بلکہ عموماً مسلمان اُس میں شریک نہیں ہیں بجز اُن معدودے چند کے سواد اعظم مسلمانان سے علاحدہ ہو گئے ہیں۔

اس مقصد کے حاصل ہونے کو بصلاح خیر خواہاں و دانایان قوم ایک انجمن قائم کی گئی ہے اور ”انڈین پیٹریاٹک ایسوسی ایشن“ اُس کا نام رکھا ہے، جس کا اشتہار اس نیاز نامے کے ساتھ شامل ہے۔

یہ امر قرین مصلحت ہے کہ جن انجمن ہائے اسلامی کی رائے متفقہ یا کثرت رائے یہ قرار پائی

ہو کہ کانگریس مذکورہ بالا مسلمانوں کے حق میں مضر ہے اور مسلمانوں کو اُس میں شریک ہونا نہیں چاہیے۔ اُس انجمن کا نام ہم اپنی ایسوسی ایشن کی اُس فہرست میں مندرج کریں جس میں بتایا جاوے گا کہ کس قدر انجمن ہائے اسلامی ہمارے ساتھ متفق اور انڈین نیشنل کانگریس کے برخلاف ہیں۔

واضح ہو کہ اُن انجمنوں کو جو اس طرح شریک ہوں گی کوئی چندہ دینا نہ ہوگا کیوں کہ چندہ لینے کا قاعدہ اُن خاص اشخاص سے تعلق رکھتا ہے جو بذات خاص ہماری ایسوسی ایشن میں شریک ہوں گے نہ کسی انجمن سے جس کا نام شامل کرنا صرف اس مقصد سے ہے تاکہ معلوم ہو کہ وہ انجمن ہماری رائے سے متفق ہے۔

پس میں درخواست کرتا ہوں کہ میرا یہ عریضہ اجلاس انجمن میں پیش کیا جاوے اور در این صورت کہ ممبران انجمن اس رائے کو پسند فرماویں تو اجازت دی جاوے کہ ''انڈین پیٹریاٹک ایسوسی ایشن آپ کی انجمن کا نام اپنی اس فہرست میں مندرج کرے، جس میں انجمن ہائے اسلامی متفقہ کا نام مندرج ہوگا۔

یہ فہرست ہمراہ اُن پرچوں کے ''جو پیٹریاٹک ایسوسی ایشن انگلستان'' میں بھیجنے کے لیے تیار کر رہی ہے۔ اور وقتاً فوقتاً بھیجتی رہے گی، بھیجی جاوے گی۔

والسلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہ

راقم خاکسار، سید احمد

ممبر انڈین پیٹریاٹک ایسوسی ایشن

مقام نینی تال مورخہ ۲۱ راگست ۱۸۸۸ء

واضح ہو کہ غالباً میرا قیام نینی تال میں ۱۵ ار اکتوبر تک ہوگا اس کے بعد علی گڑھ چلا جاؤں گا۔

(سر سید س کور سپانڈنس سلیکٹڈ ڈاکومنٹس (جلد دوم، حصہ اول) مرتبہ عتیق احمد صدیقی، علی گڑھ ۱۹۹۰ء، ص ۱۱۶۔۱۱۳)

انڈین پیٹریاٹک ایسوسی ایشن کے قواعد مرتب کر لیے گئے ہیں۔ درج ذیل ہیں:

''کارروائی انڈین پیٹریاٹک ایسوسی ایشن:

(۱) اس ایسوسی ایشن کا نام ''دی انڈین پیٹریاٹک ایسوسی ایشن'' ہوگا۔

(۲) اُس کے مقاصد حسب مندرجہ ذیل ہوں گے۔

(الف) بذریعہ چھاپنے اور تقسیم کرنے پمفلٹوں اور دیگر قسم کے کاغذات کے ممبران پارلیمنٹ اور انگریزی اخبارات اور گریٹ برٹن کے لوگوں میں اُن غلط بیانیوں کی اصلاح کرنا جن کے ذریعے سے حامیان انڈین نیشنل کانگریس نے غلط طور پر انگلستان کے لوگوں کو اس بات پر یقین دلانے کی کوشش کی ہے کہ کل قومیں ہندوستان کی اور ہندوستان کے والیان ملک مقاصد کانگریس کے ساتھ متفق ہیں۔

(ب) مسلمانوں اور انجمن ہائے اسلامی اور ان ہندوؤں اور ہندو انجمنوں کے خیالات سے جو انڈین نیشنل کانگریس کے مقاصد کے برخلاف ہیں اُس ذریعے سے ممبران پارلیمنٹ اور گریٹ برٹن کے اخبارات اور وہاں کے لوگوں کو اطلاع دینا۔

(ج) ہندوستان کے امن وامان اور برٹش گورنمنٹ کے استحکام میں کوشش کرنا اور ہندوستان کے لوگوں کے دلوں میں سے اُن برے خیالات کا دور کرنا جو حامیان کانگریس ہندوستان میں پھیلاتے ہیں اور جن کے سبب ہندوستان کے لوگوں میں برٹش گورنمنٹ سے ناراضی پیدا ہوتی ہے۔

(۳) ہندوستان کے والیان ملک جو اس ایسوسی ایشن کی تجاویز کو پسند فرماویں گے ان سے درخواست کی جائے گی کہ وہ اس ایسوسی ایشن کا پیٹرن ہونا منظور فرماویں۔

(۴) بلحاظ قاعدہ پنجم ہر ایک شخص خواہ کسی نسل و مذہب کا ہو اور اس ایسوسی ایشن کے مقاصد سے متفق ہو ایسوسی ایشن کا ممبر ہو سکے گا اور اس کو ایک سالانہ چندہ بارہ روپیہ سے ساٹھ روپیہ تک حسب مرضی چندہ دینے والے کے پیشگی دینا ہوگا۔

(۵) کوئی شخص جو گورنمنٹ کا تنخواہ دار ملازم ہو اس ایسوسی ایشن کا ممبر نہ ہو سکے گا۔

(۶) ہر ایک شخص کی طرف سے جو ایسوسی ایشن کا ممبر ہو یا نہ ہو ایسوسی ایشن کی امداد کے لیے جس قدر وہ ڈونیشن دینا چاہے منظور کیا جاوے گا اور غیر ممبر ڈونیشن دینے والوں کا نام ایک فہرست میں مشتہر ہوگا۔

(۷) انجمن ہائے اسلامی اور ہندو انجمنوں کے نام جو ایسوسی ایشن کے ساتھ متفق ہوں ایک جدا

گانہ فہرست میں مندرج ہوں گے۔

(۸) ہر ایک پمفلٹ کے ساتھ ایسوسی ایشن کے ممبروں اور ڈونیشن دینے والوں اور انجمن ہائے مذکورہ بالا کی فہرستیں چھاپ ہو کر انگلستان میں تقسیم کے لیے مرسل ہوں گی۔

(۹) ہر ایک پمفلٹ کی ایک کاپی جو انگلستان میں تقسیم ہونے کو ایسوسی ایشن چھاپے گی اُن ممبروں کو جنھوں نے ساٹھ روپے سالانہ چندہ دیا ہے، بلا قیمت دی جاوے گی اور اُن کے سوا اور لوگ اس کو بقیمت خرید سکیں گے۔

(۱۰) ایک سالانہ رپورٹ ایسوسی ایشن کے کاموں کی جس میں آمدنی و خرچ کا حساب بھی شامل ہوگا، تیار ہوگی اور ہر ایک ممبر کو اور انجمن ہائے مذکورۂ بالا کو بلا قیمت تقسیم کی جاوے گی۔

(۱۱) پمفلٹوں کی ترتیب اور اُن کے چھپوانے کے لیے کوئی یورپین جنٹلمین بطور ایڈیٹر کے مقرر کیا جاوے گا۔

(۱۲) پمفلٹ جو چھاپ ہوں گے اُن میں مفصلۂ ذیل مضامین ہوں گے۔

(الف) ہندوستان کے اُن اخبارات سے جو مقاصد ایسوسی ایشن سے ہمدردی رکھتے ہیں آرٹیکلوں اور خبروں کا انتخاب اور ہندوستانی اخبارات کا ترجمہ۔

(ب) مسلمانوں یا ہندوؤں کے جلسوں کی رائیں اور ریزولیوشن جو مقاصد ایسوسی ایشن سے متفق ہوں۔

(ج) ممبروں یا غیر ممبروں کے آرٹیکل و لکچر، ایس سے (مضمون) وغیرہ جو مقاصد ایسوسی ایشن کی تائید میں تحریر ہوں۔ ہر ایک آرٹیکل کے نیچے اُس کے لکھنے والے کا نام درج ہوگا، بجز اُس صورت کے کہ وہ اپنا نام ظاہر کرنا نہ چاہے اور منتظمانِ ترتیب پمفلٹ بلا اظہار نام اُس کا چھاپنا منظور کریں۔

(۱۳) منجملہ ممبران ایسوسی ایشن کے چند ممبر منتخب ہو کر ایڈیٹر کے شریک کیے جاویں گے اور تمام مضامین کا پمفلٹ میں چھپنا اُن کی منظوری پر منحصر ہوگا۔

(۱۴) جب تک کہ کوئی دوسری تجویز ہو آنریبل سر سید احمد خان بہادر کے۔سی۔ایس۔آئی ساکن علی گڑھ۔ ایسوسی ایشن کے آنریری سکریٹری اور ٹریزرر رہیں گے اور تمام خط و

کتابت متعلق ایسوسی ایشن اُن سے ہوگی۔

دستخط (سید احمد خان: آنریری سیکریٹری)

(سرسیدس کورسپانڈنٹس، ص ۴۱ ۔ ۲۳۷)

مولانا الطاف حسین حالی نے حیات جاوید (حصہ اول) میں کانگریس کی مخالفت کے پس منظر، مخالفت کے آغاز، دی پیٹریاٹک ایسوسی ایشن کے قیام اوراس کے نتائج پر تفصیل کے ساتھ روشنی ڈالی ہے۔ (صفحہ ۲۴ ۔ ۳۱۱، اکادمی پنجاب، لاہور (ایڈیشن) فروری ۱۹۵۷ء)

مولانا طفیل احمد منگلوری نے انڈین پیٹریاٹک ایسوسی ایشن کے ابتدائی تین (الف، ب، ج،) مقاصد نقل کرنے کے بعد لکھا ہے:

''انھیں امور کی وجہ سے عام طور پر یہ جماعت ''اینٹی کانگریس'' کے نام سے مشور ہوئی کیوں کہ اُس کا مقصد بجز کانگریس کی مخالفت کے اور کچھ نہ تھا۔ یہ امر کہ یہ تمام اسکیم مسٹر بیک کے دماغ کا نتیجہ تھی، اُس اعلان سے عیاں تھا جس میں شرکت انجمن کے لیے خط وکتابت کرنے کے واسطے علی گڑھ میں مسٹر بیک اور سرسید کے نام شائع کیے گئے تھے اِس انجمن کی ایک شاخ انگلستان میں قائم کی گئی تھی جس کا دفتر مسٹر ماریسن کے مکان پر تھا۔ موصوف بعد میں کالج کے پروفیسر اور پھر پرنسپل مقرر ہوئے''
(مسلمانوں کا روشن مستقبل، صفحہ ۲۹۵)

سرسید نے کانگریس کی مخالفت اندرونِ ملک ہی نہیں کی بلکہ کانگریس کی مخالفت اور برٹش حکومت سے اظہار وفاداری کی تحریک ہندوستان سے لے کر انگلستان تک پھیلانے کا سروسامان کیا۔ اس سلسلے میں ایڈمنڈ مائیکل نامی شخص کا تعاون حاصل کیا اور منظم طور پر کام کرنے کے لیے وہ ایک پروپیگنڈا ایجنسی قائم کرنے کا عزم رکھتے تھے۔

اس سلسلے میں دیکھیے ''سرسیدس کورسپانڈنس...... جیمس میکنزی کے نام سرسید کا خط صفحہ ۲۳ ۔ ۱۲۲ ایڈمنڈ مائیکل کے نام سرسید کے خطوط صفحہ ۱۲۴، ۲۴۱، دیگر حضرات اور اداروں اور انجمنوں کے نام خطوط ومراسلات میں یہ ذکر آیا ہے۔

دی انڈین پیٹریاٹک ایسوسی ایشن کے ایک اجلاس میں جس میں مسلمانوں کے علاوہ سکھ اور ہندو بھی شریک تھے ایک قرارداد پاس کی گئی:

''(۱) ہم سکھ، ہندو اور مسلمان قوم کے سربرآوردہ کانگریس کے مقاصد کو رد کرتے ہیں اور انڈین

پیٹریاٹک ایسوسی ایشن کے مقاصد کو پسند کرتے ہیں۔

(۲) ہم یہ بھی فیصلہ کرتے ہیں کہ اس ایسوسی ایشن کے نام میں ''یونائٹڈ'' کے لفظ کا اضافہ کر دیا جائے۔ تاکہ معلوم ہو کہ اس میں ہندوستان کی تمام قوموں کا عمل دخل ہے۔ اس لیے آیندہ اسے'' یونائٹڈ انڈین پیٹریاٹک ایسوسی ایشن'' کے نام سے پکارا جائے گا''۔

(سرسیدس کورسپانڈنٹس......، صفحہ۔۲۴۲)

'' قواعد جن پر اجلاس پنجم محمڈن ایجوکیشنل کانگریس میں بمقام الہ آباد عمل درآمد ہوگا۔

''(۱) اجلاس محمڈن ایجوکیشنل کانگریس کا بمقام الہ آباد تاریخ ۲۸ ر دسمبر ۱۸۹۰ء روز یکشنبہ سے شروع اور تاریخ ۳۰ ر دسمبر ۱۸۹۰ء روز سہ شنبہ کو ختم ہوگا۔ واضح ہو کہ اجلاس کے دن اُس انداز کے مقرر کیے ہیں کہ احباب پنجاب ملازمان سرکار بخوبی آسکتے ہیں اور بخوبی اپنے عہدوں پر مراجعت کر سکتے ہیں۔

(۲) جو لوگ محمڈن ایجوکیشنل کانگریس کے ممبر ہوں گے اور زرچندہ ممبری کم سے کم پانچ روپیہ ادا کیا ہوگا۔ اُن کو اجلاس میں تشریف لانے اور مباحثہ اور ووٹ دینے میں شریک ہونے کا استحاق حاصل ہوگا''۔

ہ **آبادی ممالک:** یکم جون ۱۸۸۸ء معائنہ پرچہ جریدہ روزگار، مدراس نمبر ۲۱۵ محررہ مئی ۱۸۸۸ء سے واضح ہوا کہ ممالک ذیل کی آبادی حسب صراحت تحت ہے:

چین: ۴۰ کروڑ، سلطنت برطانیہ: ۳۶ کروڑ، روس: ۱۰ کروڑ، فرانس: ۷ کروڑ، ممالک متحدہ امریکہ: ساڑھے پانچ کروڑ، جرمنی: ۵ کروڑ۔

مردم شماری دارالسلطنت ممالک: ۳۰ ر جون ۱۸۸۸ء معائنہ اودھ اخبار مورخہ ۲۷ ر جون ۱۸۸۸ء نمبری ۱۳۸ سے واضح ہوا کہ مردم شماری سلطنت ہائے ذیل میں حسب مندرجہ تحت ہے:

لندن	دارالسلطنت	انگلستان	۳۶۵۵۸۱۹
پیرس	//	فرانس	۲۲۶۹۰۲۳
برلن	//	پروشیا	۱۱۲۲۳۳۰
سینٹ پیٹرس برگ	//	روس	۷۶۶۶۶۴
کلکتہ	//	ہندوستان	۷۶۶۲۹۸

وائنا	//	آسٹریا	۲۰۱۰۵ ۷
قسطنطنیہ	//	ترکی	۰۰۰۰۰ ۷
میڈرڈ	//	اسپین	۵۰۰۹۰۰

مردم شماری ناخواندگی: ۱۴ اپریل ۱۸۸۹ء ممالک یورپ مندرجۂ ذیل میں اشخاص ناخواندہ یعنی جاہل حسب ذیل جس کی شہادت اخبار سررشتۂ تعلیم اودھ، یکم اپریل ۱۸۸۹ء سے کما حقہ ہوتی ہے:

نام ملک	تعداد فی صدی	نام ملک	تعداد فی صدی
روس سردیہ ورومانیہ	۸۰	فرانس و بلجیم	۱۵
ہنگری	۴۱	اسکاٹ لینڈ	۷
آسٹریا	۲۹	جرمنی	۱
اسپین	۶۳	انگلستان	۱۲
اٹلی	۴۸	اضلاع امریکہ	۸
سوئٹزرلینڈ	۲۵	ڈنمارک بوریا	۰
آئرلینڈ	۲۱	ہندوستان	۸۳

یعنی ہندوستان میں سو میں صرف ۱۷ آدمی لکھے پڑھے ہوتے ہیں مقام غور ہے کہ ہندوستان کے باشندے روسیوں سے بھی جو جاہل قوم مشہور ہے تہذیب و شائستگی میں پیچھے رہ گئے۔

(ایک نادر روزنامچہ، ص، ۷۵۔۷۴)

تعدادفوج: ۲۲ر ستمبر ۱۸۸۸ء بمعائنہ پرچہ جریدۂ روزگار، مدراس مورخہ ۱۵ر ستمبر ۱۸۸۸ء واضح ہوا کہ ہندوستان میں کل فوج انگریزی بقید گورہ و ہندوستانی حسب ذیل ہے۔فوج گورہ: ۷۹۱۳۷۔فوج ہندوستانی: ۱۲۶۷۱۳ کل: ۲۰۵۸۵۰ سرکار انگریزی ایسی منتظم ہے کہ اس قلیل فوج سے کل ہندوستان اور بنادر کا خوش اسلوبی کے ساتھ بندوبست کر رہی ہے۔عہد شاہی میں قریب دولاکھ کے فوج لکھنؤ میں رہتی تھی۔لیکن اس سے صرف اودھ کا انتظام قابل اطمینان نہیں ہوسکتا تھا۔(ایک نادر روزنامچہ،ص ۱۰)

۲۶ر محرم ۱۳۰۶ھ ۱۲ر اکتوبر ۱۸۸۸ء: علی محمد نامی ایک صاحب متوطن بمبئی نے انڈین نیشنل کانگریس میں مسلمانوں کی شرکت اور سرسید احمد خان سے تعاون کے جواز یا عدم جواز کے بارے میں سوال کیا تھا۔مولانا عبدلعزیز ابن مولانا عبدالقادر لدھیانوی نے ایک جمعے کو اپنی تقریر میں ان دونوں مسائل کے بارے میں اظہار خیال فرمایا۔حضرت لدھیانوی نے یہ تقریر لدھیانہ میں فرمائی تھی۔مجمع میں شہر اور ضلع کے تقریباً ایک ہزار مسلمان تھے۔بعد میں علی محمد صاحب نے اپنے سوالات کو ایک استفتاء کی شکل میں مرتب کر کے ہندوستان کے مختلف امصار کے علمائے دین اور مفتیان کرام سے حکم شرعی دریافت کیا۔یہ استفتاء اور فتاوے مولانا محمد مفتی لدھیانہ نے مرتب کر کے ''نصرۃ الابرار'' کے نام سے مطبع صحافی، لاہور سے شائع کر دیا تھا۔یہاں صرف کانگریس میں شرکت کے جواز سے متعلق فتویٰ اور مفتیان کرام کے اسمائے گرامی شائع کیے جاتے ہیں۔استفتاء یہ ہے:

> ایک جماعت قومی مسمی بہ نیشنل کانگریس جو ہندو اور مسلمان وغیرہ سکنائے ہند کے واسطے رفع تکالیف وجلب منافع دنیاوی چند سال سے قائم ہوئی ہے اور ان کا اصل اصول یہ ہے کہ بحث انھیں امور میں ہو جو کل جماعت ہائے ہند پر موثر ہوں اور ایسے امر کی بحث سے گریز کی جاوے جو کسی ملت یا مذہب کو مضر ہو یا خلاف سرکار ہو تو ایسی جماعت میں شریک ہونا درست ہے یا نہیں؟

مولانا مفتی عبدالعزیز لدھیانوی نے اس کا یہ جواب تحریر فرمایا:

> اللھم ارنا الحق حقاً و الباطل باطلاً جب معاملات دنیاوی میں شریک ہونا ہنود سے بموجب آیات اور حدیث مذکورہ جواب دوم درست

ہواتواس مجلس میں شریک ہونا کیوں کر منع ہو جیسا کہ بازار جانا جہاں اکثر دوکاندار اہل ہنود ہوں، واسطے کاربار دنیا کے شرعاً منع نہیں ہے۔ اسی طرح نیشنل کانگریس میں شریک ہونا مباح ہے۔ البتہ جس مجلس میں اہانت دین ہواس میں ہرگز اس وقت شامل نہ ہو۔ وَاِذَا رَأَیْتَ الَّذِیْنَ یَخُوْضُوْنَ فِیْ اٰیٰتِنَا فَاَعْرِضْ عَنْهُمْ حَتّٰی یَخُوْضُوْا فِیْ حَدِیْثٍ غَیْرِهٖ اور جب دیکھے تو ان لوگوں کو کہ جھگڑتے ہیں بیچ آیات ہماری کے پس مونہہ پھیر لے ان سے یہاں تک کہ بحث کریں بیچ بات کے سوا اس کے۔ یعنی کفار کی مجلس میں صرف وقت اہانت کرنے دین کے شامل ہونا منع ہے، باقی اوقات میں حرام نہیں، چوں کہ اصول اور قواعد کانگریس کے جہاں تک دیکھے گئے مضر اسلام اور موجب عدم ترقی اہل اسلام نہیں ہیں، پس اس میں شامل ہونا موجب، آیات مذکورہ کے درست ہوا۔ پس جو فتویٰ نیچریوں نے یا ان کے چیلوں نے واسطے وھوکا دہی عوام کے اوپر منع ہونے اس مجلس کے شائع کیے ہیں، باطل اور مردود ہیں۔ جاء الحق وزحق الباطل ان الباطل کان زھوقا. والله اعلم وعلمه اتم

اس فتویٰ پر مندرجہ ذیل علما و مفتیان کرام نے توثیق و تصدیق کے دستخط اور مہریں ثبت فرمائی ہیں اور بعض بعض نے ایک دو جملوں میں یا مختصر لفظوں میں خود بھی تائیدی رائے لکھ دی ہے۔

سب سے پہلے مولانا محمد عبداللہ لدھیانوی نے اس فتویٰ کے تصویب فرمائی ہے۔

اس کے بعد حضرت مولانا رشید احمد گنگوہیؒ نے لکھا ہے:

''اگر ہندو مسلمان باہم شرکت بیع وشرا و تجارت میں کر لیویں۔ اس طرح میں کہ کوئی نقصان دین میں یا خلاف شرع معاملہ کرنا اور سود اور بیع فاسد کا قصہ پیش نہ آوے۔ جائز ہے اور مباح ہے...... اگر ہنود کی شرکت سے اور معاملہ سے بھی کوئی خلاف شرع امر لازم آتا ہو یا مسلمانوں کی ذلت یا اہانت یا ترقی ہنود ہوتی ہو، وہ کام بھی حرام ہے۔ جیسا کہ اوپر لکھا گیا۔ اسی طرح پر ہے اور بس فقط۔''

مولانا اسماعیل لدھیانوی، مولانا عبدالواحد لدھیانوی، ناصر الاسلام محمد شفیع ناصر رام پوری،

مولانا نظام الدین لدھیانوی، مولانا رکن الدین سکنہ لدھیانہ، مولانا محمد اسحاق لدھیانوی۔

علماے انبالہ: مولانا عبدالقادر، مولانا توکل شاہ، مولانا عبدالرحیم خان امام مسجد میاں توکل شاہ، مولانا ظہور الدین شاگرد مولانا فیض الحسن سہارن پوری۔

علماے سہارن پور: مولانا پیر محمد سہارن پوری، مولانا احمد علی، مولانا ثابت علی، مولانا ابوالحسن، مولانا محمد امیر باز خان، مولانا قاضی فضل الرحمٰن، مولانا عمر دراز، مولانا قمر الدین، مولانا عنایت علی۔

علماے دیوبند: (شیخ الہند) مولانا محمود حسن، مولانا احمد حسن (امروہوی)، مولانا محمد حسن، مولانا عبداللہ خان، مولانا محمد منفعت علی، مولانا احمد حسن ولد مولوی محمد قاسم، مولانا محمد فضل عظیم، مولانا محمد مراد۔

علماے دہلی: مولانا محمد حسین، مولانا شاہ عالم، مولانا حبیب احمد، مولانا گل محمد، مولانا محمد قاسم، مولانا امام الدین، مولانا حافظ عبداللہ۔

علماے پاک پتن و گردونواح: مولانا محمد سرفراز، مولانا غلام قادر، مولانا شاہ سوار چشتی، مولانا محمد عظیم، مولانا عبدالحکیم، مولانا محمد اسماعیل۔

علماے فیروز پور ونواح: مولانا عبدالکریم، مولانا جمال الدین سکنہ چھاونی فیروز پور، مولانا جمال الدین سکنہ موضع امیر، مولانا ظہور اللہ، مولانا ہدایت اللہ، مولانا سراج الدین، مولانا محمد حسین، مولانا عبدالرحیم، مولانا ابوالنجیب محمد صدیق، مولانا غلام محی الدین۔

علماے مدینہ منورہ وبغداد: الحاج علی بن الحاج یوسف، مولانا طاہر آفندی البغدادی

نصرۃ الابرار میں اسی مضمون کے ایک اور استفتاء کے جواب میں فتویٰ بھی ہے، جس کی تصدیق وتصویب دیگر علاقہ جات ہند کے مختلف علماے کرام نے فرمائی ہے۔ استفتا اور فتویٰ یہ ہے:

استفتاء:

باسمہٖ سبحانہٗ

کیا فرماتے ہیں علماے دین ومفتیان شرع متین اس مسئلے میں کہ مولوی عبدالعزیز صاحب نے ایک شخص کے جواب میں یوں فرمایا کہ ہنود سے معاملہ کرنا بشرط عدم نقصانِ دین جائز ہے اور

جو جماعت ہندو اور مسلمانوں کی واسطے منافع سکنائے ہند کے قائم ہوئی ہے۔ بشرط عدم نقصان دین اس میں شامل ہونا درست ہے اور نیچر کی جماعت میں جو نیچریوں اور ہندوؤں سے سید احمد نے جمع کی ہے، اس میں شامل ہونا ہرگز درست نہیں۔ کیوں کہ یہ شخص مرتد ہے۔ اس سے تعلق رکھنا اور اس کی تعظیم کرنی ہرگز درست نہیں۔ آیا یہ جواب مولوی صاحب موصوف کا شرعاً درست ہے یا نہیں؟ غیر مقلدین اور بعض شاگردوں مولوی صاحب موصوف کے بسبب کینۂ دیرینہ، اس جواب کو کفر قرار دیتے ہیں، حق پر ہیں یا نہیں؟

جواب: "اللھم ارنا الحق حقاً و الباطل باطلاً۔ جواب مولوی صاحب کے مطابق شرع کے ہیں۔ مخالفین کا قول بالکل مردود ہے۔ کیوں کہ معاملہ کرنا کفار سے شرعاً درست ہے۔ بلکہ خدا تعالیٰ نے نکاح کتابیہ کا جو مقتضی کمال یگانگت کو ہے، جائز قرار دیا ہے۔ قال اللہ تعالیٰ والمحصنات من الذین اتوا الکتاب اور جوابات منع سوالات وبرأت کفار میں وارد ہیں۔ وہ اپنے ظاہر اور متبادر پر محمول نہیں۔ قال اللہ تعالیٰ: "لاینھاکم اللہ عن الذین لم یقاتلوکم فی الدین ولم یخرجوکم من دیارکم ان تبروھم" تکرموھم وتحسنوا الیھم قولاً و فعلا، "وتقسطوا الیھم ان اللہ یحب المقسطین . انما ینھکم اللہ عن الذین قاتلوکم فی الدین واخرجوکم من دیارکم وظاھروا واعلی اخراجکم ان تولوھم." ھو بدل من الذین قاتلوکم والمعنی لاینھاکم عن مضرۃ ھولاء وانما ینھاکم عن قول ھولاء "ومن یتولھم منکم فاولئک ھم الظالمون." حیث وصنعوا القوی غیر موضعہ انتھی مافی المدارک ۔ البتہ نیچری کی جماعت میں ملنا درست نہیں۔ کیوں کہ وہ خدا کے نزدیک ملعون ابدی ہے۔ قال اللہ تعالیٰ: "اولئک جزاؤھم ان علیھم لعنۃ" اللہ والملائکۃ والناس اجمعین خالدین فیھا"۔ پس بموجب اس آیت کے اس سے رابطہ پیدا کرنا اور اس کی مدد کرنی اور اس کو تعظیمانہ الفاظ سے خط لکھنا شرعاً کب درست ہے۔ بس غیر مقلد وغیرہ جو اس جواب کو غلط یا کفر قرار دیتے ہیں سخت بے دین اور زندیق ہیں۔ واللہ یھدی من یشاء وھو علی کل شئ قدیر.

خادم الطلباء محمد غنی عنہ لودھیانوی"

اس فتوے کی سب سے پہلے حضرت مولانا رشید احمد گنگوہیؒ کی تحریر سے تصدیق ہوتی ہے۔ حضرت گنگوہی نے دستخط کے ساتھ ۲۶ رمحرم ۱۳۰۶ھ تاریخ بھی ثبت فرمائی ہے جو ۲ را کتوبر ۱۸۸۸ء کے مطابق ہے۔

تصدیق کرنے والے دیگر علماے دین کے اسماے گرامی یہ ہیں:

علماے دہلی: مولانا محمد عبدالحق مصنف تفسیر حقانی، مولانا محمد ادریس واعظ خلف مولوی محمد عبدالرب واعظ، مولانا ابوالمنصور، مولانا نصرت علی، مولانا محمد علاؤالدین جلال آبادی، مولانا محمد امیر الدین، مولانا قادر علی، مولانا محمد مصطفیٰ، مولانا محمد، مولانا حافظ شمس الدین، مولانا سید مخلص الرحمٰن، مولانا عبدالحکیم، مولانا خیر محمد، مولانا حکیم اللہ، مولانا عبدالرحیم، مولانا محمد کرامت اللہ، مولانا عزل الدین، مولانا نور الہدیٰ، مولانا محمد حسن، مولانا محمد محی الدین، مولانا غلام محمد، مولانا سید محمود دہلوی، مولانا عبدالغفور دہلوی، مولانا محمد احمد یار دہلوی، مولانا امام الدین، مولانا محمد اسماعیل، مولانا محمد حسین، مولانا حافظ رحیم بخش، مولانا محمد عزیز الحسن، مولانا عبداللہ دہلوی، مولانا محمد ابراہیم دہلوی، مولانا حافظ ابراہیم، مولانا اسماعیل۔

علماے رام پور: مولانا عبدالواحد، مولانا ارشاد حسین، مولانا محمد عبداللہ، مولانا محمد عبدالغفار خان، مولانا حامد حسین، مولانا محمد ریاست علی خان، مولانا گوہر علی، مولانا قاری عبدالعلی امرتسری، مولانا غلام رسول الحنفی، مولانا حافظ غلام محمد۔

بعض دیگر علماء: مولانا سید محمد شمس محی الدین قادری بٹالوی المعروف صاحبزادہ حال وارد امرتسر، مولانا محمد فیروز الدین حنفی گجراتی، مولانا نور الدین از جموں۔

علماے ملتان: مولانا عبدالرحمٰن ملتانی، مولانا عبدالعلیم ملتانی، مولانا نظام الدین ملتانی، مولانا غلام محمد سکنہ شیخ عمر حال وارد کوٹھ شریف ضلع ملتان، مولانا حافظ نور محمد، مولانا غلام صدیق کوٹھوی، مولانا جمال الدین کوٹھوی، مولانا محمد ولد میاں صاحب غلام سرور کوٹھوی۔

علماے تونسہ: مولانا خدا بخش، مفتی علی گوہر، مولانا یار محمد، مولانا نور محمد، مولانا غلام محی الدین، مولانا کریم بخش فتح آبادی حصاری۔

علماے جالندھر: مولانا نجم الدین، مولانا عزیز بخش، مولانا سید رکن الدین۔

علماے ہوشیار پور، قصور وغیرہ: مولانا غلام احمد، مولانا محمد عبدالکریم، مولانا نور محمد سنکو والی، مولانا

امانت علی نکودری، مولانا غلام مصطفیٰ، مولانا عبداللہ خیر اللہ آبادی، مولانا فتح محمد، مولانا عبدالرحمٰن، مولانا نور علی، مولانا شاہدین، مولانا محمد اشرف علی سلطان پوری، مولانا امام الدین کپورتھلوی، مولانا محبوب عالم ہوشیار پوری، مولانا فتح الدین ہوشیار پوری،
اس ذیل میں ایک نامور علمی دینی شخصیت مولانا غلام دستگیر قصوری کی ہے، انھوں نے فتویٰ کی تصدیق میں ایک مختصر عبارت بھی تحریر فرمائی ہے اور دستخط کے ساتھ تاریخ بھی ثبت کر دی ہے۔ وہ لکھتے ہیں:

"جس امر کے شمول میں اہل ہنود سے کوئی مضرت دینی و دنیاوی نہ ہو، شرعاً کوئی قباحت نہیں اور فقیر نے چند سال سے ایک رسالہ جواہر مضیہ رد نیچریہ جو تالیف کر کے مطبوع کرادیا ہے، اس میں نیچریوں کی محبت و شمول کا سخت گناہ ہونا درج کیا ہے۔ جس پر مواہیر علماے لاہور و اطراف درج ہیں اور بڑا افسوس ہے اس واقعے کا جو بعضے نئے مفتیان لدھیانہ نے اپنے استادوں کے حق میں بے ادبیاں کر کے اشتہار چھپوائے ہیں اور اسلام کو بد نام کیا ہے۔ انا للہ وانا الیہ راجعون۔

بتعلم فقیر غلام دستگیر قصوری، ۵ر ربیع الاول ۱۳۰۶ھ (۹ر نومبر ۱۸۸۸ء)

اسی مضمون کا ایک استفتاء بریلوی مکتبۂ فکر کے بانی اعلیٰ حضرت مولانا احمد رضا خانؒ کو بھیجا گیا تھا۔ اعلیٰ حضرت نے اس کا مفصل جواب تحریر فرمایا۔ اس مسئلے میں حضرت کا مسلک اس وقت ٹھیک ٹھیک وہی تھا جو علماے دیوبند و دہلی اور دیگر حق پرست علماے دین اور مفتیان شرع متین کا تھا۔ حضرت مولانا کی تصویب و تصدیق میں اسی مکتبۂ فکر کے دو علماے مراد آباد نے بھی دستخط فرمائے ہیں۔

اعلیٰ حضرت بریلوی سے کیا جانے والا استفسار اور اس کے جواب میں حضرت کا فتویٰ یہ ہے:

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

کیا فرماتے ہیں علماے دین و مفتیان شرع متین اس مسئلے میں کہ ایک شخص کے جواب میں مولوی عبدالعزیز صاحب لدھیانوی نے یہ فرمایا کہ ہندوؤں سے معاملہ کرنا درست ہے اور جو ایک جماعت ہندو اور مسلمانوں کی واسطے موقوف کرانے انکم ٹیکس وغیرہ کے قائم ہوئی ہے بشرطِ

عدم نقصانِ دین ان سے ملنا درست ہے اور جو نیچری نے ہندو اور نیچریوں سے جمع کی ہے ان سے ملنا شرعاً درست نہیں۔ کیوں کہ یہ لوگ مرتد ہیں، مرتد سے معاملہ کرنا ہرگز درست نہیں۔ آیا جواب مولوی صاحب کا شرع کے موافق ہے یا نہیں؟ اللھم ھدایة الحق والصواب

الجواب: فقیر غفر اللہ تعالیٰ لہ نے اپنے رسالہ ''اعلام الاعلام بان ہندستان دارالاسلام'' میں بدلائل ساطعہ ثابت کیا ہے کہ ہندوستان دارالاسلام ہے اسے دارالحرب کہنا ہرگز صحیح نہیں اور اس سے پہلے فقیر ایک مدلل فتویٰ لکھ چکا ہے کہ ہنود زمانہ اہل ذمہ ہیں، انھیں کافر حربی نہیں کہہ سکتے وتمام تحقیقہ فی فتاونا الملقبة ''بالعطایا النبویة فی الفتاوے الرضویہ'' اور ظاہر ہے کہ شرع مطہر نے معاملات دنیویہ میں اہل ذمہ کو ہمارے مماثل کہا ہے لھم مالنا وعلیھم ماعلینا ان کے خون ومال مثل ہمارے خون ومال کے ہوجاتے ہیں۔ یہاں تک کہ اگر مسلمان کسی ذمی کو قتل کرے، اس کے قصاص میں مارا جائے گا اور اسلام وکفر کا تفرقہ مانع نہ آئے گا امام نسفی کافی شرح وافی میں فرماتے ہیں: یقتل المسلم بالذمی الخ وھکذافی الھدایتہ وغیرھا عامةاسفار المذھب. یوہیں (یوں ہی) ذمی ہمسایہ کے ساتھ بیماری میں عیادت موت میں تعزیت کا برتاؤ شرع مطہر نے جائز رکھا۔ خود حضور پرنور ﷺ نے ایک جوان یہودی کی عیادت فرمائی۔ قدم اکرم کی برکت سے اللہ تعالیٰ نے اسے ہدایت فرمائی کہ اسی وقت اسلام لایا اور انتقال کیا رضی اللہ تعالیٰ عنہ۔ اشباہ میں ہے: ''لاتکرہ عیادة جارہ الذمی'' ہدایہ میں ہے: ''لا نہ نوع برفی حقھم ومانھینا عن ذلک وصح ان النبی ﷺ عادیھود یا مرض بجوارہ'' ردالمختار میں ہے: ''فی النوادر جاریھودی او مجوسی مات ابن لہ او قریب ینبغی لہ ان یعزیہ ویقول اخلف اللہ علیک

خیر امنه و اصلحک و کان معناه اصلحک الله بالاسلام یعنی رزقک الاسلام و رزقک ولدا مسلما کفایه. بالجملہ سوا افعال تعظیم واجلال کے ذمیوں کے ساتھ نیک برتاؤ چاہیے اور دنیوی معاملات ان کے ساتھ کرنے میں کوئی حرج نہیں، جب تک ان میں معاذ اللہ اپنے دین کی توہین یا ان کے رسوم مذہبی کی تائید نہ ہو۔ اللہ جل جلالہ فرماتا ہے۔ لَا یَنۡهٰکُمُ اللّٰهُ عَنِ الَّذِیۡنَ لَمۡ یُقَاتِلُوۡکُمۡ فِی الدِّیۡنِ وَلَمۡ یُخۡرِجُوۡکُمۡ مِّنۡ دِیَارِکُمۡ اَنۡ تَبَرُّوۡهُمۡ وَتُقۡسِطُوۡۤا اِلَیۡهِمۡ اِنَّ اللّٰهَ یُحِبُّ الۡمُقۡسِطِیۡنَ۔ غمز العیون والبصائر میں ہے: ''الذمی حکمه حکم المسلین یعنی فی غیر مایو جب تعظیمه الخ۔ ہنوز مانہ عند التحقیق ان سب احکام کے مستحق ہیں۔ خصوصاً اس معاملے میں انھیں شریک کرنا جس میں رفاہ عام ونفع انام وحقوق ومراعات مخلوق ہو کہ اس میں خاص انھیں کا فائدہ نہیں بلکہ اپنا اور تمام اہل وطن کا نفع ہے جب کہ مسلمانوں کے اہل تدبیر ورائے منیر بہ نظر غامض وباریک بین وانجام شناس ووقت گزین خوب تنقیح تام کرلیں کہ اس سے حالاً یا مآلاً اسلام ومسلمین پر کوئی ضرر عائد نہیں۔ یہ شرط کہ فقیر نے ذکر کی، ضرور قابل لحاظ ہے۔ رہے حضرات نیچریہ شرع مطہر میں ان کے اور تمام مبتدعین کے احکام جن کی بدعت درجۂ کفر کو پہنچی ہو احکام جمیع اقسام کفار سے اشد واعظم ہیں۔ فقیر غفر اللہ تعالیٰ نے اپنے رسالہ المقالۃ المسفرۃ عن احکام البدعۃ المکفرۃ'' میں بدلائل قاطعہ واضح کیا ہے کہ نیچری وغیرہ ہر بدمذہب جو باوصف کلمہ گوئی وادعائے اسلام ضروریات دین کا انکار کرے قطعاً مرتد ہے اور اس کے احکام بعینہا احکام مرتدین کما نص علیه فی الفتاوی الظهیریة والفتاوی الهندیة والطریقة المحمدیة وغیرها من الکتب الفقهیة۔ مرتد کو احکام اہل ذمہ سے کیا تعلق کہ وہ باوجود سکونت دار الاسلام کافر حربی ہے ہدایہ کے باب الردہ میں ہے انه حربی مقهور تحت ایدینا بلکہ خاص دار الحرب کے اصلی کافروں

سے بھی اس کا حکم سخت تر ہے۔ وہاں کے کافر کو سال بھر کے لیے امان دے کر دارالاسلام میں آنے اور تجارت وغیرہ کرنے دیں گے کما علم فی باب المستامن اور مرتد کے لیے سلطنت اسلامیہ میں تین دن سے زیادہ مہلت نہیں کما نصوا علیه فی باب الردہ کافر حربی اگر ایام امان میں اپنے ملک کو پلٹنا چاہے گا سلطنت اسلامی اپنے ظل حمایت میں سے سرحد تک پہنچا دے گی۔ قال الله تعالیٰ: " وانْ احَدٌ مِنَ الْمُشْرِكِيْنَ اسْتَجَارَكَ فَاَجِرْهُ حَتّٰى يَسْمَعَ كَلَامَ اللّٰهِ ثُمَّ اَبْلِغْهُ مَامَنَهُ ذٰلِكَ بِاَنَّهُمْ قَوْمٌ لَا يَعْقِلُوْنَ اور مرتد اگر لحوق دارالحرب چاہے گا ہرگز قدرت نہ دیں گے بلکہ بادشاہ اسلام اس پر وہ مہلت سہ روزہ بھی حبس وقید میں گزارے گا۔ اعرف فی موضعه بالجملہ شرع مطہر کے نزدیک مرتد سب کافروں سے بدتر ہے۔ اس سے میل رکھنا، موافقت کرنا، صلاح میں رہنا، شریک ہونا، معاون بننا ہرگز جائز نہیں کہ یہ سب مناقض مراد خدا اور رسول ہے۔ جل جلالہ وصلی اللہ علیہ وسلم کما لایخفی علی من کان له قلب او القی السمع وهو شهید ۔ زن مرتدہ کو خیال کرو کہ دنیا میں اس کا حکم مرد مرتد کے حکم سے اخف ہے لان المرتد لایجازی فی الدنیا بار تدادہ اما یجازی بانه حربی والمرأة لیست من اهل الحراب اور ساتھ کھانا کھا لینے یا پاس بیٹھ جانے کو شرکت ومعاونت کے ساتھ تو لو کہ اس سے کس قدر ہلکے ہیں۔ بااین ہمہ علما صاف صریح ممانعت فرماتے ہیں کہ مرتدہ کے ساتھ مجالست ومواکلت نہ کی جائے۔ درمختار میں ہے: المرتدة ولو صغیرة تحبس ابدا ولا تجالس ولا تواکل حقائق ۔ پھر کہاں مرتد اور اس کے ساتھ شرکت ومدد ان هذا الظلم اشد والله الهادی الی سبیل الرشد بے ضرورت ومصلحت صحبت ومخالطت کسی بدمذہب سے نہ چاہیے۔ قال الله عز ذکره واما ینسینک الشیطن فلا تقعد بعد الذکری مع القوم الظلمین پھر اس حکم میں بھی نیچریوں کا حصہ

ہنود سے زاید ہے۔ اگر چہ ذمی و مرتد کے فرق سے قطع نظر کیجیے کہ

اولاً ہنود اپنے مذہب کی طرف داعی نہیں کہ ان کی صحبت میں معاذ اللہ تزلزل عقائد مظنون ہو، بخلاف نیا چرہ کہ سخت مخرب اسلام ومغوی عوام ہیں۔

ثانیاً: ہندو کی بات کھلی مخالف کی بات ہے کہ ہر جاہل سا جاہل اس کے کفر پر مطلع اور اسے اپنے مذہب سے جدا جانتا ہے۔ یہ حضرات کہ بظاہر کلمہ پڑھتے اور زبانی دعوی اسلام رکھتے بلکہ اپنے ہی آپ کو سچا پکا مسلمان وخیر خواہ مومنین وایمان بتاتے ہیں، ''دام در سبزہ و مار آستین'' ہیں۔ ان کا زہر آلود افسون سیفہ بدبخت پر جلد چلتا اور انجام کار ہلاک کر دیتا ہے والعیاذ باللّٰہ رب العالمین.

ثالثاً: ان کے ایجادی مذہب میں ایک ایسی لذیذ چیز ہے جو نفس شیطانی کو دل سے عزیز ہے وہ کیا یعنی آزادی مطلق، جس کی طرف نفس امارہ بالطبع راغب ہے۔ لہذا اس راہ سے شیطان بہت جلد قابو پاتا اور ربقہ شرع گردن سے نکال کر کھلے بندوں آزاد بنا دیتا ہے۔ اب یہ کون کہے کہ او اپنی جان کے دشمن! الاسلام گردن نہادن ہے نہ خود سرشدن! آج کی آزادی کل محبس جہنم میں حبس دائمی کی مبار کباد ہے والعیاذ بالملک الحق المبین ولاحول ولاقوۃ الا باللہ ذی القوۃ المتین نسال المولی سبحانہ وتعالیٰ ان یکفنا لنا ویجمع اخواننا المسلمین نعمۃ الایمان الی یوم الدین انہ ولی ذلک والقادر علیہ وھو حسبنا ونعم المعین وصلی اللہ تعالیٰ علی سیدنا ومولانا محمد والہ واصحابہ اجمعین آمین، بمحمد المصطفی النبی الامی صلی اللہ تعالیٰ علیہ وآلہ وسلم کتبہ عبدہ المذنب احمد رضا البریلوی عفی عنہ۔

اصاب من اجاب نیاز محمد خان نقشبندی مجددی مراد آبادی۔

کفار سے اس قدر دین میں فساد نہیں جس قدر نیچریوں سے ہے۔ دین کے لباس میں بے دینی پھیلاتے ہیں۔ اسی سبب سے بہت بے عقل مسلمان بے دین ہو گئے۔ ان سے دور رہنا ضروری ہے۔ واللہ تعالیٰ اعلم

کتبہ محمد حسین تمنا مراد آبادی تمت ۔ ۱۷ ربیع الاول ۱۳۰۶ھ۔

۶ محرم ۱۳۰۶ھ (۱۱ دسمبر ۱۸۸۸ء): کانگریس میں شرکت اور ہندوؤں سے تعاون کے جواز میں مولانا رشید احمد گنگوہی نے ایک فتویٰ دیا ہے۔ یہ فتویٰ مولوی علی محمد متوطن بمبی کے ایک استفسار کے جواب میں مولانا عبدالعزیز لدھیانوی نے مرتب کیا تھا اور نصرۃ الابرار کے نام سے مطبع صحافی، لاہور سے چھپا تھا۔

اس فتوے پر ہندوستان کے مختلف دیار و امصار کے علماے مشاہیر کے توثیق وتصویب کے دستخط اور مواہیر ثبت ہیں۔ اس پر علماے لدھیانہ میں سے اسماعیل، عبدالواحد، نظام الدین، رکن الدین، محمد اسحٰق، محمد، عبدالعزیز، عبداللہ۔ انبالہ کے عبدالقادر، توکل شاہ، عبدالرحیم، ظہور الدین، سہارن پور کے مولانا فیض الحسن، پیر محمد، احمد علی، ثابت علی، ابوالحسن، محمد امیر باز خان، قاضی فضل الرحمٰن عمر دراز، قمر الدین، عنایت الٰہی، دیوبند کے مولانا محمود حسن، احمد حسن، محمد حسن، عبداللہ خان، محمد منفعت علی (مدرسین دار العلوم دیوبند) محمد فضل عظیم خطیب دیوبند، مظفر نگر کے محمد مراد، دہلی کے محمد حسین، شاہ عالم، گل محمد، محمد قاسم، امام الدین، حافظ عبداللہ، پاک پتن اور اس کے گرد ونواح کے محمد سرفراز، غلام قادر، شاہ سوار چشتی، محمد عظیم، عبدالحکیم، مولوی محمد، محمد اسماعیل، فیروز پور اور مدراس کے نواح کے عبدالکریم، جمال الدین، جمال الدین، (یہ دوسرے عالم ہیں) ظہور اللہ، ہدایت اللہ، سراج الدین، محمد حسین، عبدالرحیم، محمد صدیق، غلام محی الدین، دہلی کے محمد عبدالحق مصنف تفسیر حقانی، محمد ادریس، ابوالمقصود، محمد علاء الدین جلال آبادی، محمد امیر الدین، قادر علی، محمد مصطفیٰ، محمد، حافظ شمس الدین، سید مخلص الرحمٰن، خیر محمد، حکیم اللہ، عبدالرحیم، محمد کرامت اللہ، عزل الدین، نور الہدیٰ، محمد حسن، محمد محی الدین، غلام محمد، سید محمود، عبدالغفور، محمد احمد یار، امام الدین، محمد اسماعیل، محمد حسین، رحیم بخش، محمد عزیز الحسن، عبداللہ، محمد ابراہیم، حافظ ابراہیم، اسماعیل، رام پور کے علماء میں سے عبدالواحد، مولانا ارشاد حسین، محمد عبداللہ، محمد عبدالغفار خان، حامد حسین، محمد ریاست علی خان، گوہر علی، قاری عبدالعلی امرتسری، غلام رسول، حافظ غلام محمد، غلام مصطفیٰ، سید محمد شمس محی الدین قادری بٹالوی، محمد فیروز الدین گجراتی، نور الدین از جموں، ملتان کے عبدالرحمٰن، عبدالعلیم، نظام الدین، غلام محمد، حافظ نور محمد، غلام صدیق، جمال الدین، محمد، تونسہ شریف کے شاہ اللہ بخش، خدا بخش، علی گوہر، یار محمد، نور محمد، مکھڈ شریف کے غلام محی الدین، کریم بخش فتح آبادی حصاری، جالندھر کے نجم الدین، عزیز بخش، سید رکن الدین، غلام احمد، محمد عبدالکریم، نور محمد، امانت علی، غلام

مصطفیٰ، عبداللہ خیراللہ پوری، فتح محمد، عبدالرحمٰن، نور علی، شاہدین، محمد اشرف علی سلطان پوری، امام الدین کپورتھلوی، ہوشیار پور کے محبوب عالم، فتح الدین اور غلام دستگیر قصوری

حضرت شیخ الہند مولانا محمود حسن دیوبندی نے اس فتویٰ کی ان الفاظ میں تصویب فرمائی ہے:

"ہنود سے معاملہ کرنے میں حکم شرعی یہ ہے کہ بہ شرط عدم مخالفت و مضرت دینی جائز ہے۔ علیٰ ہذا القیاس فرقۂ نیچریہ کے بارے میں جو کہ منکر نصوص قرآنی و احادیث نبوی و اجماع امت ہے جو کچھ علمائے معتبرین نے ارشاد فرمایا ہے۔ وہ امر حق موافق کتاب و سنت ہے۔ واللہ اعلم بالصواب

بندہ محمود حسن عفی عنہ

مدرس مدرسہ اسلامیہ دیوبند

تـــــــــمـــــــــت

اینٹی کانگریس:

۲۲ نومبر ۱۸۸۸ء آج دو بجے شام کو جلسہ اینٹی کانگریس میں بارہ دری قیصر باغ میں شریک ہوا۔ قریب ایک ہزار آدمیوں کا مجمع تھا۔ من جملہ ان کے چند مشاہیر کے نام درج ذیل ہیں:

راجہ شیو پرشاد صاحب (بنارس) سر سید احمد خان صاحب بہادر (علی گڑھ)، اودے نرائن سنگھ صاحب تعلقہ دار (مہدونہ) راجہ پرتاپ نرائن سنگھ صاحب تعلقہ دار (بھنگا)، راجہ تصدق رسول صاحب تعلقہ دار (جہانگیر آباد)، چودھری محمد عظیم صاحب تعلقہ دار (گکرالی) وغیرہ وغیرہ

اوّلاً منشی امتیاز علی صاحب وکیل نے منجانب انجمن شکریہ تکلیف فرمائی شرکائے کمیٹی کا ادا کیا۔ بعدہٗ منشی اظہر علی صاحب وکیل نے اس چٹھی کا ترجمہ پڑھا جو سر آکلینڈ کولون صاحب لیفٹننٹ گورنر ممالک مغربی و شمالی و اودھ نے مسٹر ہیوم صاحب بانی کانگریس کے جواب میں تحریر فرمایا تھا، جس سے جناب ممدوح کی مخالفت بانیان قومی کانگریس سے صاف طور پر ظاہر ہوتی ہے۔ زاں بعد اس کمیٹی کا نام "انجمن خیر خواہاں ملک ہند"، رکھا گیا جس کے پریسیڈنٹ اودے صاحب تعلقہ دار مہدونہ باتفاق رائے تجویز ہوئے اور سر سید احمد خان صاحب اور راجہ صاحب (بھنگا) سکریٹری قرار پائے اور ممبران انجمن میں راقم کا نام حسب تحریک چودھری نصرت علی صاحب درج ہوا۔ شام کو جلسہ برخواست ہوا اور راقم اپنے مکان مشک گنج میں مقیم ہوا۔ (ایک نادر روز نامچہ، ص ۱۱)

جدید وائسرائے:

۱۳ر دسمبر ۱۸۸۸ء معائنہ ''اودھ اخبار'' محررۂ امروزہ سے معلوم ہوا کہ لارڈ لینس ڈاؤن صاحب جدید وائسرائے ۹ر دسمبر ۱۸۸۸ء کو داخل کلکتہ ہوئے اور ۱۰ر دسمبر کو چارج وائسرائے کا لے کر انتظام سلطنت میں مصروف ہوئے۔ اور لارڈ ڈفرن صاحب سابق گورنر جنرل ہند بعد دینے چارج کے اسی وقت صبح کے ۱۰ بجے بہ عزم ولایت روانۂ بمبئی ہوئے۔

۲۶ر دسمبر ۱۸۸۸ء: کانگریس کا چوتھا سالانہ اجلاس مسٹر جارج یول کی صدارت میں ۲۶ر دسمبر کو الہ آباد میں ہوا۔ اجلاس میں ۱۲۴۸ نمایندوں نے شرکت کی۔ جناب بدرالدین طیب جی اور لالہ ''جپت رائے بھی شریک تھے۔ پنڈت ایودھیاناتھ استقبالیہ کمیٹی کے صدر تھے۔ شیخ رضا حسین خان نے کانگریس کی تائید میں سنی مسلمانوں کا ایک فتویٰ کانگریس کی تائید میں پیش کیا۔ اجلاس میں پولس انتظامیہ کی خرابیوں کو دور کرنے کے لیے ایک تحقیقاتی کمیٹی بنانے کی تجویز پاس کی گئی۔ یہ فیصلہ بھی کیا گیا کہ سبجیکٹ کمیٹی میں کوئی ایسی تجویز پیش نہ کی جائے جس سے مسلمانوں کو یا ہندوؤں کو کلی طور پر اتفاق نہ ہو۔ (سکسٹی ایئرز آف کانگریس، ص ۱۳۱-۱۲۹)

۱۸۸۸ء: اس سال سرسید احمد نے کانگریس کے خلاف ''یونائیٹڈ انڈین پیٹریاٹک ایسوسی ایشن'' قائم کیا کانگریس ابھی گھٹنوں ہی چل رہی تھی کہ حکومت کی نگاہ کرم میں موردِ عتاب بن گئی، لیکن اس کی نشو ونما میں اضافہ ہی ہوتا گیا۔ اور دسمبر ۲۶ر تاریخ کو الہ آباد میں کانگریس کا چوتھا سالانہ اجلاس مسٹر جارج یول کی صدارت میں منعقد ہوا..... لالہ لاجپت رائے نے بہترین اردو میں تقریر کی۔ زمین اور کسان کے حقوق کے متعلق تجویزیں پاس ہوئیں۔ یہ اجلاس بھی اپنے مقصد کے اعتبار سے بہت کامیاب رہا۔'' اول الذکر ایسوسی ایشن اس لیے قائم کی گئی تا کہ کانگریسی خیالات کی پرزور تردید کی جائے اور اس کے نشو ونما کو ہر ممکن طریقے سے دبا دیا جائے اس انجمن میں بھی ہندو مسلم دونوں شریک ہوئے تھے۔ اس لیے یونائیٹڈ کا لفظ اس کے ساتھ بڑھا دیا گیا۔

(حسرت موہانی۔ ایک سیاسی ڈائری)

۱۸۸۹ء

وائسرائے اور گورنروں کی تنخواہ:

۲۴ر فروری ۱۸۸۹ء پرچہ جریدۂ روزگار مدراس محررہ ۹ر فروری ۱۸۸۹ء بحوالہ گائڈ اخبار واضح ہوا کہ گورنر جنرل ہند و گورنر لوکل گورنمنٹوں کی تنخواہ حسب ذیل ہے:

وائسرائے ہند تنخواہ سالانہ دو لاکھ پچاس ہزار آٹھ سو، گورنر بمبئی تنخواہ سالانہ ایک لاکھ بیس ہزار، لیفٹنٹ گورنر ممالک مغربی و شمالی تنخواہ سالانہ انسٹھ ہزار، گورنر مدراس تنخواہ سالانہ ایک لاکھ بیس ہزار، لیفٹنٹ گورنر بنگالہ تنخواہ سالانہ بانوے ہزار لیفٹنٹ گورنر پنجاب تنخواہ سالانہ چھہتر ہزار۔

(ایک نادر روزنامچہ، ص ۱۲)

وفات نواب صدیق حسن خان بھوپال:

۲۶ر فروری ۱۸۸۹ء بمعائنہ اودھ اخبار محررہ امروزہ سے معلوم ہوا کہ نواب صدیق حسن خان صاحب شوہر شاہجہاں بیگم رئیسہ بھوپال واقعہ ۱۹ر فروری سنہ رواں بعارضہ استسقاء فوت ہونے اور ۲۰ کو دفن ہوئے۔ نواب صاحب ساکن قنوج ادنیٰ درجہ کے آدمی تھے لیکن اقبال نے کچھ ایسی ترقی کی کہ دفعتاً شوہر رئیسہ ہو کر مرتبہ اعلا پر پہنچے اور خطاب نوابی گورنمنٹ انگلشیہ سے حاصل ہوا اور گیارہ ضرب توپ سلامی کے مقرر ہوئے، لیکن تھوڑے عرصہ میں بہ ثبوت مخالفت گورنمنٹ نے خطاب وغیرہ واپس لے لیا اور عہدۂ مدار المہامی ریاست سے معزول کیا، جس کا سخت صدمہ نواب صاحب کو ہوا اور کوئی کوشش حصول اعزاز کارگر نہ ہوئی۔ بالآخر اسی کوفت میں انتقال کیا۔ اگرچہ ذی علم تھے لیکن مادہ انتظامی دماغ میں نہ تھا۔ تلون کی شکایت تھی اور مخبری پر دارومدار، جس سے سارے اہل کاران ریاست ہمیشہ اندیشہ ناک رہتے تھے۔ نواب صاحب کی ذات سے رئیسہ کی بیٹی اور داماد کے درمیان عداوت قلبی تھی۔ یقین ہے کہ اس حادثہ سے اہل کارانِ ریاست کم ملول ہوں۔ (ایک نادر روزنامچہ، ص ۵۸۔۵۷)

افواج یورپ:

۲۳ر اگست ۱۸۸۹ء بمعائنہ اودھ اخبار امروزہ بحوالہ اخبار پانیر انگریزی مورخہ ۴ر اگست ۱۸۸۹ء سے واضح ہوا کہ لڑائی اور امن کے دوران افواج سلاطین یورپ حسب ذیل مہیا و موجود

رہتی ہے تفصیل افواج:

جنگ: جرمن: تیس لاکھ پچاس ہزار، آسٹریا: گیارہ لاکھ ۸۱ ہزر، اٹلی: اکیس لاکھ ۱۹ ہزار دوسو پچاس۔ فرانس: سینتیس لاکھ ۵۳ ہزار، روس: ۵۵ لاکھ۔

امن: جرمن: چار لاکھ ۹۲ ہزار، آسٹریا۔ تین لاکھ ۸۱ ہزار، اٹلی: دو لاکھ ۵۳ ہزار، فرانس: چار لاکھ ۹۹ ہزار، روس: سات لاکھ۔ (ایک نادر روز نامچہ، ص ۷۵)

۲۶ر دسمبر ۱۸۸۹ء: آل انڈیا نیشنل کانگریس کا پانچواں سالانہ اجلاس ۲۶ر دسمبر ۱۸۸۹ء میں بہ مقام بمبئی سر ولیم ویڈر برن کی صدارت میں منعقد ہوا۔ ۱۸۸۹ نمایندوں نے شرکت کی۔ شری گوپال کرشن گوکھلے، شری بال گنگادھر تلک کے ساتھ کانگریس میں شریک ہوئے۔ اجلاس میں تقریر کرتے ہوئے گوکھلے نے نمک پا عائد شدہ ٹیکس کے متعلق کہا کہ کس طرح نمک کے ایک پیسے کی ٹوکری کی قیمت پانچ آنہ ہو جاتی ہے۔ ملک کے ننگے بھوکے کسانوں کے لیے شری گوکھلے نے اپنی دلی ہمدردی کا اظہار کیا۔ ملک سے افلاس دور کرنے اور مختلف ٹیکسوں کو کم کرنے سے متعلق بھی تجویزیں پاس ہوئیں۔

اس اجلاس میں چارلس بریڈلاف مشہور پارلیمنٹیرین نے بھی شرکت کی، جو انگلینڈ سے آئے ہوئے تھے۔ اسی اجلاس میں فیروز شاہ مہتا اور سریندر ناتھ بینرجی، ڈبلیو۔ سی بینرجی اور چند دوسرے رہنماؤں پر مشتمل ایک کمیٹی کا تقرر عمل میں آیا جو انگلینڈ میں کانگریس کے مقصد اور ہندوستان کے حالات کا تعارف کرائے گی۔ ضروریات کے لیے ۴۵ ہزار روپے کی فراہمی کا فیصلہ بھی کیا گیا۔

(سکسٹی ایئرز آف کانگریس، ص ۳۲۔۱۳۱ و حسرت موہانی۔ ایک سیاسی ڈائری، ص ۲۱۔۲۰)

۱۸۹۰ء

۲۶ر دسمبر ۱۸۹۰ء: کلکتہ میں فیروز شاہ مہتا کی صدارت میں کانگریس کا چھٹا سالانہ اجلاس شروع ہوا۔ اجلاس میں نمک پر عائد ٹیکس کے خلاف احتجاج کیا گیا۔ شراب پر ٹیکس کی رائے قائم کی گئی۔ شہر کی سات ہزار شراب کی دکانوں کو بند کرنے کی مانگ کی گئی۔

۶۷۷ نمایندوں نے شرکت کی جن میں سے ۱۵۴ مسلمان ڈیلی گیٹ تھے۔ استقبالیہ کمیٹی نے جوئنٹ وزیٹرز کے لیے بنگال کے گورنر کو بھیجے تھے۔ یہ کہہ کر واپس کر دیے گئے کہ گورنمنٹ آف انڈیا نے اپنے ملازمین کے لیے کانگریس کے اجلاسوں میں شرکت کرنے پر پابندی لگادی۔ اگرچہ

سرکاری ملازمین نے اس حکم کی بہت کم پابندی کی۔

گذشتہ پانچویں سالانہ اجلاس میں جو برٹش کمیٹی کا تقرر میں آیا تھا اس سلسلے میں فیصلہ کیا گیا کہ سریندر ناتھ بنرجی اور ڈبلیو سی بنرجی کی قیادت میں ایک وفد لندن میں کانگریس کے ہونے والے سیشن میں شرکت کرے اور کانگریس کے مطالبات پیش کرے گا۔

(سکسٹی ایئرز آف کانگریس، ص ۳۳۔۱۳۲)

۱۸۹۱ء

۲۸ر مارچ ۱۸۹۱ء: ۲۸ر مارچ ۱۸۹۱ء آج نو بجے رات کو مسٹر کوئینٹن صاحب چیف کمشنر آسام کو منی پوریوں نے قتل کر دیا۔ (ایک نادر روزنامچہ، ص ۱۴)

سال رواں میں ملک کے حالات تیزی سے پلٹا کھاتے رہے۔ کسانوں کو اپنے لگائے ہوئے پودوں کے حق سے محروم کیا جانے لگا۔ ملک میں قحط سالی کے آثار نمایاں ہونے شروع ہوئے۔ تقریباً تین لاکھ مویشی بھوک سے مر گئے۔ لیکن عوام کا جذبۂ مخالفت سرد نہ پڑا۔

۲۸ر دسمبر ۱۸۹۱ء: ۲۸ر دسمبر ۱۸۹۱ء ناگ پور میں شری پی آنند چارلو کی صدارت میں کانگریس کا ساتواں اجلاس شروع ہوا۔ اس اجلاس میں ۸۱۲ نمایندوں نے شرکت کی۔ شہری برتری، دیہات سدھار اور جنگلات کے معاملات کے ساتھ کسانوں سے ہمدردی اور حقوق کی تجویزیں پاس ہوئیں اور انڈین کونسل ایکٹ کی تائید کو برقرار رکھا۔ اس اجلاس میں جناب لالہ مرلی دھر نے بہترین انداز کے ساتھ اردو میں تقریر کی اور صوبائی حکومتوں کی پریس پر پابندیوں کی سخت مخالفت کی۔ (حسرت موہانی۔ ایک سیاسی ڈائری، ص ۲۱)

مزید جو مطالبات کیے گئے، ان میں اسلحہ کے قانون میں نرمی، جماعت سازی، ملیشیا، والنٹیرز کے نظام اور فوجی کالجوں کا قیام بھی شامل ہے۔ یہ مطالبہ بھی کیا گیا کہ جب تک کونسل میں الیکشن کے ذریعے عوام کے نمایندوں کی خاص تعداد میں شمولیت عمل میں نہیں آئے گی، حکومت کو درست طور پر چلایا نہیں جا سکتا۔ (سکسٹی ایئرز آف کانگریس، ص ۳۴۔۱۳۳)

مردم شماری:

۱۸۹۲ء

۶ر اگست ۱۸۹۲ء۔ بمعائنہ اودھ اخبار مطبوعہ امروزہ بحوالہ کان پور گزٹ مورخہ ۲۳ر جولائی

کے واضح ہوا کہ جو مردم شماری واقعہ ۲۶ رفروری ۱۸۹۱ء کو ہوئی تھی اس کی رو سے حسب ذیل تعداد مختلف مذاہب کے پیرووٗں کی ہے!

ہندو: ۲۰ کروڑ ساڑھے سات لاکھ، مسلمان: ۵ کروڑ ساڑھے سات لاکھ، بودھ: ۷ لاکھ، عیسائی: ۲۵ لاکھ، آبادی جنگلات: ۹ لاکھ، پارسی: نواسی ہزار نو سو نواسی ...... یہودی: ۱۷ ہزار ایک سو اٹھاسی، ملحد: ۳ سو نواسی، برہمو: ۲ ہزار چار سو ایک، آریا: ۴ ہزار چھ سو، مذہب نامعلوم: انتالیس ہزار سات سو پینسٹھ، تعداد ہندو سب قوموں میں زائد ہے۔ (ایک نادر روزنامچہ، ص ۱۶)

۲۸ ر دسمبر ۱۸۹۲ء: الہ آباد میں شری دویش چندر بیز جی کی زیر صدارت کانگریس کا آٹھواں اجلاس ۶۲۵ نمایندوں کی شرکت کے ساتھ شروع ہوا۔ کونسلوں کے سدھار کے لیے انڈین کونسل ایکٹ منظور کر لیا گیا، لیکن ساتھ ہی اظہار افسوس بھی کیا گیا کہ ایکٹ میں بذات خود اپنے نمایندوں کو انتخاب کرنے کا حق عوامی نہیں ہے جس کا حصول بہت ضروری ہے۔ دیگر مقررین کے ساتھ لالہ مرلی دھر نے عوامی حقوق اور صنعتی کارکردگی سے حاضرین کو روشناس کرایا اور کانگریس کی طاقت کو مضبوط بنانے کی پرزور اپیل کی۔ (سکسٹی ایرز آف کانگریس، ص ۳۵۔۱۳۴)

۱۸۹۳ء

روٗسائے ہند کے آمدنی:

۲۵ رمارچ ۱۸۹۳ء: بمعائنہ اودھ اخبار مطبوعہ امروزہ سے واضح ہوا کہ آمدنی سالانہ روٗسائے ہندوستانی حسب ذیل ہے:

ریاست حیدر آباد دکن: ۲ کروڑ، گوالیار: سوا کروڑ، گیکو ار برودہ: ایک کروڑ ۲۰ لاکھ، میسور: ایک کروڑ سے کچھ زیادہ، کشمیر: ۸۵ لاکھ، اودے پور: ۶۴ لاکھ، ٹراونکور: ۶۰ لاکھ، اندور: ۵۰ لاکھ پٹیالہ: ۴۴ لاکھ، بھرت پور: ۲۸ لاکھ، بھوپال: ۲۶ لاکھ، جودھ پور: ۲۵ لاکھ، ریوا: ۲۵ لاکھ، الور: ۳۰ لاکھ، بھاول پور: ۱۹ لاکھ، کپورتھلہ: ۱۷ لاکھ، راوٗ صاحب کچ: ۱۳ لاکھ۔

یہ بھی اس اخبار سے معلوم ہوا کہ ہندستان کے شہروں میں بلحاظ آبادی سب سے اول شہر کلکتہ، پھر بمبئی، پھر مدراس، پھر حیدر آباد لکھنو، زاں بعد بنارس ہے۔ (ایک نادر روزنامچہ، ص ۱۷)

متفرق معلومات:

۳ رجولائی ۱۸۹۳ء: بمعائنہ اودھ اخبار لکھنو مطبوعہ دیروزہ سے معلوم ہوا۔

۱۔ تمام روے زمین پر اہل اسلام کی آبادی ساڑھے سترہ کروڑ ہے۔
۲۔ شہر لندن کی ۷۰۰ مربع میل میں آبادی ہے۔
۳۔ تمام دنیا میں ایک ارب ۲۷ کروڑ پچاس لاکھ من گیہوں پیدا ہوتا ہے۔
واقعی اس زمانہ میں شہر لندن سے کوئی دوسرا بڑا شہر بلحاظ طول وآبادی روے زمین پر نہیں ہے۔

یکم اگست ۱۸۹۳ء: یکم اگست ۱۸۹۳ء۔ بمعائنہ اودھ اخبار مطبوعہ امروزہ کے واضح ہوا کہ مولوی مہدی علی خان صاحب ملقب بہ نواب محسن الملک جو ہوم ڈیپارٹمنٹ ریاست حیدر آباد کے نامور وزیر تھے اور جن کی لیاقت اور عالی دماغی کی بہت تعریف تھی اور ریاست موصوفہ کے سچے خیر خواہ تھے مسٹر پلوڈل صاحب ریذیڈنٹ حیدر آباد کی پولیٹکل کارروائیوں سے علاحدہ ہوئے اور یکم محرم ۱۳۱۱ھ مطابق ۱۰۔ جولائی سنہ الیہ کو ریاست موصوفہ سے اپنے وطن مالوفہ شہر اٹاوہ کو روانہ ہوئے، جن کی مفارقت میں ہزار ہا پارسی، دکھنی و ہندوستانی بوقت رخصت اسٹیشن ریلوے پر چشم پرنم وگریہ کناں تھے۔ سچ یہ ہے کہ زمانہ خیر خواہ لوگوں کا دشمن ہے۔ یہ مسلمہ امر ہے کہ جب کسی ریاست میں زوال آنے والا ہوتا ہے تو وہاں سے خیر طلب لوگ اول اسی طور سے علاحدہ ہو جاتے ہیں۔

۲۴ر اگست ۱۸۹۳ء: بمعائنہ اودھ اخبار کے واضح ہوا کہ خدا داد خان خان قلات (بلوچستان) بباعث قتل کرنے اپنے وزیر و وزیر زادہ کے معزول ہوئے اور بجاے ان کے محمود خان ان کے بڑے بیٹے حسب منظوری گورنمنٹ ہند والی قلات مشتہر ہوئے۔

(ایک نادر روزنامچہ، ص ۵۹)

۱۵ر ستمبر ۱۸۹۳ء: مسٹر ڈیورنڈ کا کمیشن بغرض صلاح و مشورہ عبدالرحمان خان امیر کابل ۱۵ر ستمبر سنہ الیہ کو پشاور سے روانۂ جمرود ہوا۔ یہ کمیشن لارڈ لینس ڈاؤن صاحب گورنر جنرل کشور ہند کی ہدایت سے بدیں غرض بھیجا گیا ہے کہ مراتب ضرور یہ سرحدی کے بعد یہ بھی امیر سے طے کرے کہ وہ قندھار تک ریل بنانے کی اجازت عطا کریں۔ (ایک نادر روزنامچہ، ص ۷۷)

۲۱ر ستمبر ۱۸۹۳ء: مردم شماری ۱۸۹۱ء سے واضح ہوا کہ تمام ہندوستان میں ۲۷ کروڑ ۴۲ لاکھ ۷۳ ہزار آبادی ہے۔ کل فرقہ کے آدمیوں سے حسب ذیل اذکار رفتہ ہیں بے وقوف و خراب دماغ کے آدمی: ۷۴ ہزار ۲ سو ۸۹، بہرے اور گونگے: ایک لاکھ ۹۶ ہزار ۴ سو اکسٹھ، اندھے ۴۵۸۸۶۸۔ (ایک نامہ روزنامچہ، ص ۱۸)

۲۳رنومبر ۱۸۹۳ء: سفارت مسٹر ڈیورنڈ کامیابی کے ساتھ کابل سے واپس ہوئی۔ امیر عبدالرحمان خان صاحب نے ہر طرح سے اس کی خاطر داری کی اور جملہ عہد و مواثیق مابین گورنمنٹ اور امیر کابل بسہولت طے ہوئے اور برٹش گورنمنٹ نے بعوض بارہ لاکھ روپیہ سالانہ اب اٹھارہ لاکھ روپیہ سالانہ کا گزارہ امیر کابل کا مقرر کر دیا یعنی ڈیڑھ لاکھ روپیہ ماہوار ان کو ملا کریں گے اور جس قسم کے آلات حرب وغیرہ امیر کابل چاہیں انگلستان سے منگالیں۔ (ایک نادر روزنامچہ، ص ۷۷)

۲۷رسمبر ۱۸۹۳ء: کو لاہور میں زیر صدارت دادا بھائی نوروجی ۸۶۷ ڈیلی گیٹوں کے ساتھ کانگریس کا نواں ۹ سالانہ اجلاس شروع ہوا۔ اجلاس میں پنڈت مدن موہن مالویہ نے تقریر کرتے ہوئے کہا کہ ہمارے ملک کے بافندے جو بہترین کپڑا تیار کرتے تھے وہ کہاں چلے گئے؟ آج ہمارے ملک کی اس صنعت کو کس بیدردی سے تباہ کیا جارہا ہے۔ ان بافندوں کے حالات کیا کیا ہورہے ہیں؟ آج دیکھتے ہیں کہ بیشتر لوگوں کے اور انگریزوں کے جسموں پر انگریزی کپڑے ہی نظر آتے ہیں۔ اگر چہ ہمارے یہاں کے تیار کیے ہوئے کپڑے یورپ بھیجے جاتے تھے۔ اس طرح ہمارے کسانوں کو بھی اس کے سوا چارہ نہیں کہ اپنی معمولی کاشت کے ذریعے اپنی برائے نام زندگی بسر کرسکیں اور دوسروں کے لیے سہارا بن سکیں چناں چہ حکومت کو چاہیے کہ دستی سوتی کپڑوں پر سے ٹیکس اٹھالے یا معاف کردے۔ اسی طرح پچاس برس پہلے ہمارے ہم وطنوں کو جو ملازمتیں میسر تھیں، آج اس کا دسواں حصہ بھی میسر نہیں ہے، ایسی صورت میں ہمارا ملک کیسے ترقی کرسکتا ہے اور ہم کیسے سکھی رہ سکتے ہیں؟

استقبالیہ کمیٹی کے صدر سردار دیال سنگھ مجیٹھا تھے۔

(حسرت موہانی......ایک سیاسی ڈائری و سکسٹی ایرز آف کانگریس، ص ۳۷۔۱۳۵)

ڈیورنڈ لائن:

پاکستان کے شمال مغربی سرحدی صوبے کے قبائلی علاقوں کو افغانستان سے جدا کرنے والی بین الاقوامی سرحد ہے۔ اس سرحد کی نشان بندی ہندوستان کی برطانوی سرکاری کے ایک افسر سر مارٹیمر ڈیورنڈ اور افغانستان کے فرمانروا امیر عبدالرحمان کے درمیان ۱۸۹۳ء کے ایک معاہدے کے تحت کی گئی۔ یہ سرحد شمالی گلگت سے جہاں ہمالیہ اور ہندوکش ملتے ہیں، شروع ہو کر کوہ ملک سیاہ پر ختم ہوتی ہے۔ جو افغانستان، ایران اور پاکستان کی سرحدوں کا نقطہ اتصال ہے۔ ڈیورنڈ کی لمبائی

۱۴۰۰ میل ہے۔ اس کا شمالی حصہ جو گلگت سے باجوڑ تک ۳۵۰ میل لمبا ہے، نا قابل عبور پہاڑوں سے ہو کر گزرتا ہے۔ اس کا جنوبی حصہ نشکی سے ملک سیاہ کے درمیان گہری ریت والے ریگستان اور بنجر پہاڑیوں سے ہو کر گزرتا ہے۔ اس کا طول بھی ۳۵۰ میل ہے۔ یہاں پانی نہیں ملتا اور ذرائع رسل و رسائل نا پید ہیں۔ اس کا وسطی حصہ باجوڑ اور نشکی کے درمیان ۷۰۰ میل پر مشتمل ہے۔ اور یہ چھ ہزار سے گیارہ ہزار فٹ بلند پہاڑوں سے ہو کر گزرتا ہے۔ اس سلسلے میں جا بجا فوجی اور مواصلاتی اہمیت کے درے واقع ہیں مثلاً خیبر، گمال اور بولان خوجک۔ یہ خطہ قدیم زمانے سے سرحدی دفاع کی پالیسی میں کلیدی اہمیت رکھتا ہے۔

پاکستان، برطانیہ کی جانشین مملکت ہونے کی حیثیت سے ڈیورنڈ لائن کو پاکستان اور افغانستان کے درمیان بین الاقوامی سرحد تسلیم کرتا ہے۔ (فرہنگ سیاسیات، ص ۲۲۹)

۱۸۹۳ء میں محمڈن اینگلو اورینٹل ڈیفنس ایسوسی ایشن کے نام سے ایک جماعت اور قائم ہوئی۔ اس کے باوجود تعلیم یافتہ اور باہوش مسلمانوں کا ایک بڑا طبقہ کانگریس کا ہمنوا ہو گیا اور حکومت کے خلاف اظہار خیال ہونے لگا۔ حتیٰ کہ سرسید احمد خان کے رفیق خاص شبلی نعمانی کانگریس کے ہم خیال ہو گئے۔ یہیں سے حسرت موہانی نے علمی قابلیت کی بنا پر شاعری کی ابتدا کی اور پہلی غزل لکھی۔ (حسرت موہانی۔ ایک سیاسی ڈائری)

۱۸۹۴ء

۴ر جنوری ۱۸۹۴ء...... آج بوقت ساڑھے پانچ بجے شام کے زلزلہ محسوس ہوا۔ چوں کہ فی الجملہ شدید تھا اور تمام کوٹھی میری جنبش کرنے لگی تھی لہٰذا میں اندیشہ ناک ہو کے باہر صحن کے چلا گیا تھا اور قیام اس کا تقریباً دو منٹ تک رہا اور چار منٹ کے بعد پھر محسوس ہوا، جو نصف منٹ سے زائد نہیں رہا۔ (ایک نادر روزنامچہ، ص ۱۸)

کرنل ہارس فورڈ:

۹ر فروری ۱۸۹۴ء: بمعائنہ اخبار انگریزی 'مارننگ پوسٹ' الہ آباد مطبوعہ ۹ر فروری کے معلوم ہوا کہ کرنل ہارس فورڈ صاحب سابق ڈپٹی کمشنر ہردوئی حال چیف کمشنر جزیرۂ انڈمان کو ایک جنم قیدی مسمیٰ بھیرا رام برہمن نے جو میرٹھ کے باغیوں سے اکیس سالہ عمر کا دائم الحبس ہوا تھا، چھریوں سے سر و شانہ کو شدید زخم پہنچائے اور دو انگلیاں بھی کٹ کر جدا ہو گئیں۔ اول لیڈی صاحبہ ہارس فورڈ نے جرأت کر کے اسے پکڑا۔ بعدہ اور لوگوں نے اسے گرفتار کر لیا۔ چوں کہ صاحب بہادر کے مزاج

میں سختی و دشنام وہی زاید تھی، عجب نہیں کہ اسی وجہ سے ایسی نوبت کو پہنچے ہوں۔
(ایک نادر روز نامچہ ص، ۱۹۔۱۸)

۲۶ر دسمبر ۱۸۹۴ء: کانگریس کا دسواں اجلاس مسٹر الفرید وہب کی صدارت میں بہ مقام مدراس ۲۶ ر دسمبر ۱۸۹۴ء کو منعقد ہوا۔ اس میں ملک کے طول و عرض سے ۱۱۶۳ ڈیلی گیٹوں نے شرکت کی اور برٹش پارلیمنٹ کے ایک برٹش آفیسر سر ولیم ویڈر برن نے بھی شرکت کی اور اپنے خیالات کا اظہار کیا۔ اجلاس میں متعدد ریزیولیشن پاس کیے گئے جن میں اعلیٰ ملازمتوں کے لیے ہندوستانیوں کی نااہلیت کے خلاف احتجاج اور ایکسائز ڈیوٹی سوت اور سوتی، کپڑوں پر ٹیکس، انڈین کونسل ایکٹ، آئی سی ایس کے امتحانات، قانون جنگلات، حکومت پنجاب کے پاس کردہ قوانین وغیرہ معاملات کے متعلق تھے۔ (سکسٹی ایز آف کانگریس، ص ۳۹۔۱۳۷)

۱۸۹۵ء

سرحد:

۱۱راپریل ۱۸۹۵ء: جو فوج برٹش گورنمنٹ بہ تعداد ۱۴ ہزار بغرض اعانت چترال واسطے مقابلہ عمرا خان والی باجوڑ کے بھیجی گئی تھی اس کا مقابلہ سواتی لوگوں سے بمقام شاہ کوٹ ۴راپریل کو ہوا۔ پانچ گھنٹے تک سخت لڑائی رہی۔ اگر چہ سرکاری فوج زیادہ کام آئی لیکن مقام مذکور فتح ہو گیا۔ اس بیان کی تصدیق اودھ اخبار مطبوعہ ۱۰راپریل ترجمہ اخبار "پائنیر" انگریزی الہ آباد مورخہ ۶راپریل سے ہوئی۔ اول لڑائی گھاٹی مالاکنڈ میں ۳راپریل کو ہوئی تھی......

۷رمئی ۱۸۹۵ء: دیکھنے اخبارات سے واضح ہوا کہ عمرا خان باجوڑی تاب مقابلہ انگلش گورنمنٹ نہ لا کر مفرور ہوئے اور شیر افضل خان اور ان کے ہمراہیوں کو جو قلعۂ چترال کا محاصرہ کیے ہوئے تھے محمد شریف خان، خان دیر نے گرفتار کر کے سپرد فوج انگریزی کیا۔ اب فوج اعانت چترال سے کوئی مقابلہ کرنے والا باقی نہیں رہا۔ سچ یہ ہے کہ انگریزی قواعد داں فوج کا گروہ افغانی کیا مقابلہ کر سکتے ہیں جن کے پاس ہتھیار تک نہیں۔ (ایک نامہ روز نامچہ، ص ۲۲)

وفات مولوی فضل رحمان صاحب:

۱۳رستمبر ۱۸۹۵ء: آج آٹھ بجے شام کو بمقام گنج مراد آباد جناب مولوی فضل الرحمان

صاحب نے بہ عارضہ پیرانہ سالی قضا کی۔ آپ کے فیض و برکت کا اس قدر شہرہ تھا کہ تمام ہندوستان کے لوگ جوق در جوق آپ کی زیارت و شرف حصول بیعت کو تشریف لاتے تھے۔ کوئی شک نہیں کہ آپ نہایت خجستہ خصال بزرگ تھے...... آپ کی عمر سو برس سے تجاوز کر گئی تھی۔ مولوی صاحب مرحوم شاہ آفاق صاحب کے مرید تھے جو دہلی میں نہایت بزرگ شخص گزرے ہیں۔ آپ خاندان نقش بند میں مرید تھے، گانا وغیرہ کچھ نہیں سنتے تھے۔ (ایک نادر روز نامچہ، ص ۴۴)

۲۷ر دسمبر ۱۸۹۵ء: کانگریس کا گیارھواں سالانہ اجلاس ۲۷ر دسمبر کو بہ مقام پونا منعقد ہوا۔ اجلاس کے صدر سریندر ناتھ بنرجی تھے۔ اس سال ۱۵۸۴ ڈیلی گیٹوں نے شرکت کی۔ اہل ملک کی فلاح و بہبود کی کئی تجویزیں پیش ہو کر پاس ہوئیں۔ ان سے ایک قرار داد کے ذریعے بمبئی اور مدراس کی ایگزیکٹیو کونسلز میں ہندوستانیوں کو جگہ دینے کا مطالبہ کیا گیا۔
(سکسٹی ایرز آف کانگریس، ص ۴۲۔ ۱۳۹)

۱۸۹۶ء

۷ر فروری ۱۸۹۶ء: آج کل بباعث تقامت فصل از حد گرانی ہے، لوگ مصیبت سخت میں مبتلا ہیں۔ دو دو، تین تین روز تک دانہ میسر نہیں آتا، حتیٰ کہ اکثر بے دین ہو گئے۔ دوسروں کی غلامی اختیار کی۔ بعض نے اپنی اولاد کچھ لے کر جدا کر ڈالی۔ چناں چہ لڑکیاں مختلف قوم کی جو اسی نہج سے حاصل ہوئیں میرے گھر میں موجود ہیں (جن کے نام اب یہ رکھے گئے ہیں۔ گلرنگ موئی، سندر، شربتی، سہلی وغیرہ) یہی کیفیت تمام ہندوستان کی ہے، جس کی تصدیق اخباروں سے ہوتی ہے۔ میرے خیال میں یہ حالت خشک سالی ۱۸۷۷ء سے بڑھ کر ہے، جو صرف ایک فصل خریف کی عدم پیداوار سے رونما ہوئی تھی اور حالت موجودہ میں تین سال زیادتی بارش و سال حال کی کمی بارش سے پیدا ہو رہی ہے۔ یہ حالت سخت نازک ہے خدا آبرو رکھے۔ (ایک نادر روز نامچہ، ص ۲۳۔ ۲۲)

جلاوطنی مہاراجہ جھالراوار:

۳ر اپریل ۱۸۹۶ء: آج معتبر ذرائع سے معلوم ہوا کہ ۱۷ر مارچ کو مہاراجہ ظالم سنگھ والیٔ ریاست جھالراوار بحکم گورنمنٹ آف انڈیا اجلاسی ایلگن صاحب وائسرائے، شہر بنارس کو جلا وطن کیے گئے الزام یہ قرار پایا کہ اپنی رعایا کے ساتھ حسن انتظام کی قابلیت نہیں رکھتے ہیں۔ (ایک نادر روز نامچہ، ص ۶۰)

۲۴ر ستمبر ۱۸۹۶ء: یہ عجیب وقت ہے کہ آج کل تمام ہندوستان میں بہ باعث امساک باراں وعدم پیداوار فصل سخت گرانی ونوبت قحط کی پہنچ گئی ہے کہ صدہا آدمی فاقہ سے مر رہے ہیں۔ فقیروں کی یہ کثرت ہے کہ تمام دن اور گیارہ بجے رات تک ان کے سوالوں سے نجات نہیں ملتی۔ حال آں کہ میں نے اپنے گھر کا بندوبست کر رکھا ہے کہ کچھ غلہ اپنی نگاہ کے سامنے رکھوالیا ہے اور ملازموں پر تاکید ہے کہ جو سائل آوے وہ خالی نہ پھیرا جاوے لیکن کہاں تک دیا جاوے۔ بعض وقت نوکر بھی تنگ آکر جواب دینا جائز رکھتے ہیں۔ حضرت موسیٰ علیہ السلام کے عہد میں تین قسم کی صعوبتیں نازل ہوئی تھیں۔ اول حاکم ظالم، دوسرے ہیضہ وبائی کی شدت، تیسرے قحط کی صعوبت، جس سے خلق اللہ کو سخت پریشانیوں کا سامنا ہوا تھا۔ آج کل میں جہاں تک خیال کرتا ہوں تو وہی کیفیت تمامی ہندوستان کی ہو رہی ہے اور جا بجا لوٹ مار، ڈاکہ زنی شروع ہوگئی ہے۔

(ایک نادر روزنامچہ، ص ۲۴۔۲۳)

۶ر اکتوبر ۱۸۹۶ء: تفصیل قحط جو ہندوستان میں پڑے:

۱۔ ۱۸۳۷ء ایسٹ انڈیا کمپنی:

یہ قحط کل ہندوستان میں ایسا ہیبت ناک تھا کہ اس کی رو سے لوگ اپنی عمر کا اس وقت حساب لگاتے تھے۔

۲۔ ۱۸۶۶ء ملکہ وکٹوریہ:

یہ قحط مساوی قحط ۱۷۷۰ء کے تھا، لیکن گورنمنٹ نے بہت سے کام رفاہ عام نہر وریل جاری کیے جس سے اس کا کچھ زیادہ اثر نہیں ہوا۔

۳۔ ۱۷۷۰ء ایسٹ انڈیا کمپنی:

یہ قحط صوبہ بنگالہ میں پڑا تھا۔ کاشتکاروں نے اپنے بیل بیچ ڈالے تھے۔ گداگری کرتے تھے اور مقدار قلیل غلہ کے عوض اپنی اولاد فروخت کرتے تھے۔ زندہ مردوں کو کھاتے تھے اور ہر قسم کی سخت بیماری وبائی پیدا تھی، جس سے ایک ملت ندارد ہوگئی۔

۴۔ ۱۷۸۳ء وارن ہسٹینگز گورنر جنرل:

اضلاع مغربی وشمالی واودھ میں یہ قحط پڑا تھا اودھ میں جو دچنا ۱۵ سیر کا بکتا تھا حال آں کہ معمولی نرخ غلہ وہاں ہمیشہ فی روپیہ ڈیڑھ من بکتا تھا۔ بیماری وبا بھی ساتھ تھی۔

۵۔ ۷۴۔۱۸۷۳ء سر جارج کیمبل لیفٹننٹ گورنر بنگالہ:

یہ قحط بہار و بنگالہ میں پڑا تھا، جس سے زراعت خشک ہوگئی تھی۔

۶۔ ۱۸۷۷ء لارڈ لٹن صاحب گورنر جنرل:

جاری ہونے کام رفاہ عام بہت بڑی مدد ملی۔ ۱۰ اسیر کا گندم اس وقت میں فروخت ہوتا تھا۔ اگر چہ یہ قحط عام تھا لیکن صرف فصل خریف بوجہ نہ ہونے پانی کے بوئی نہیں گئی تھی، لیکن ربیع بہت عمدہ ہوئی کہ عین وقت بونے و پکنے غلہ کے دو پانی ہو گئے تھے۔

۷۔ ۱۸۹۶ء لارڈ ایلگن صاحب گورنر جنرل:

یہ قحط تمامی ہندوستان میں ہے جس سے ایک عام پریشانی پیدا ہے۔ خریف جس قدر بوئی گئی تھی وہ بوجہ امساک باراں بہت کم ہوئی اور کاشت ربیع کی کوئی صورت نظر نہیں آئی۔ یہ بہت طویل قحط ہے۔ لوگ انجاح و مدد کو چیخ رہے ہیں۔ بازار موت گرم ہے۔ اگر چہ گورنمنٹ اجرائے کام رفاہ عام میں بڑی فیاضی کر رہی ہے۔ (ایک نادر روزنامچہ، ص ۲۵۔۲۴)

۲۸ دسمبر ۱۸۹۶ء: کوکلکتہ میں کانگریس کا بارھواں سالانہ اجلاس ہوا، جس میں ۷۸۴ ڈیلی گیٹوں نے شرکت کی۔ اس اجلاس کے صدر جناب احمد رحمت اللہ سیانی صاحب تھے، اتحاد و اتفاق پر پرزور مدلل تقریریں ہوئیں۔ مختلف ٹیکسوں کے خلاف احتجاج کیا گیا۔ آنندموہن بوس، اور ستیندر ریرسن سنہا نے حکومت پر دوستانہ انداز میں تقریر کرتے ہوئے زور ڈالا کہ بلا مقدمہ چلائے قید و بند کا سلسلہ بند ہونا چاہیے۔

اجلاس میں کئی ریزولیشن پاس ہوئے جن میں صوبوں کو مالیات میں آزادی، ایجوکیشنل سروسز کی انصاف کے تقاضوں کے مطابق از سر نو تنظیم اور انگلینڈ میں کانگریس کے کاموں کے لیے ۶۰ ہزار روپے کی منظوری شامل تھی۔ (حسرت موہانی......ایک سیاسی ڈائری و سکسٹی ایئرز آف کانگریس، ص ۱۴۲)

۱۸۹۷ء

قحط: ۱۷ جون ۱۸۹۷ء۔ ہفتۂ مختتمہ ۱۹ مئی میں حسب ذیل آدمی کار رہا ہے رفع تکلیف ہندوستان میں تھے۔ مدراس، ۴۰۰۸۶۱، بمبئی، ۳۵۰۰۰۲، بنگال، ۸۳۳۴۴۷، ممالک مغربی وشمالی واودھ، ۱۵۴۴۲۵، پنجاب، ۹۶۳۶۶، ممالک متوسط، ۶۹۷۴۵۸، برار، ۳۰۴۷۲، حیدرآباد،

۴۰۵۳۷، وسط ہند ۱۲۸۴۵۴، راجپوتانہ ۲۰۶۵۰، کل ۴۱۶۱۲۴۹۔

نرخ غلہ:

۲۴ رجولائی ۱۸۹۷: بمعائنہ اخبار انجمن ہند، ہفتۂ گذشتہ کے واضح ہوا کہ جب ملکہ وکٹوریہ کا جشن تخت نشینی واقعہ ۲۱ رجون ۱۸۳۷ء ہوا تھا اور جب جشن جوبلی ۲۲ رجون ۱۸۹۷ء کو ہوا تو نرخ غلہ دونوں زمانہ کا ہندوستان میں حسب ذیل تھا:

نام جنس	نرخ بروقت جلوس ملکہ معظمہ ۲۱ رجون ۱۸۳۷ء	نرخ غلہ بروقت جشن جوبلی واقعہ ۲۲ جون ۱۸۹۰ء	نام جنس	نرخ بروقت جلوس ملکہ معظمہ ۲۱ رجون ۱۸۳۷ء	نرخ غلہ بروقت جشن جوبلی واقعہ ۲۲ رجون ۱۸۹۷ء
گندم	یک من ۵ سیر بحساب نمبری	۹ ۳/۴ سیر بحساب نمبری	باجرہ	یک من ۵ سیر بحساب نمبری	۷ ۱/۲ سیر بحساب نمبری
تخود	یک من ۵ سیر ″	۱۰ سیر ″	ماش	یک من ۱۰ سیر ″	″ ″
			مونگ	یک من ۱۵ سیر ″	۶ ۳/۴ سیر ″
بجھرا	یک من ۲۰ سیر ″	۱۱ سیر ″	ارہر	یک من ″	۱۰ ۳/۴ سیر ″
جَو	یک من ۲۰ سیر ″	۱۱ ۳/۴ سیر ″	جوار	یک من ۱۰ سیر ″	۱۰ ۳/۴ سیر ″
چاول	۲۰ سیر ″	۸ ۱/۴ سیر ″	گھی	۴ ۱/۲ سیر ″	۱ ۱/۲ سیر ″
گڑ	۱۳ سیر ″	۸ ۳/۴ سیر ″	تیل	۱۴ سیر ″	۳ ۱/۲ سیر ″

(ایک نادر روزنامچہ، ص ۲۷۔۲۶)

۲۷ رجولائی ۱۸۹۷ء: حکومت ہند نے بال گنگا دھر تلک کو ان کی اپنی تقریر کی اشاعت پر راج دروہی (سرکار دشمن) قرار دیا اور گرفتار کرلیا۔ تلک کا ''دکن ایجوکیشن سوسائٹی'' کی بنیاد رکھنا بھی جرم ہوگیا۔ ۱۴ ردسمبر کو ان پر مقدمہ دائر کیا گیا اور ۱۸ ماہ کی قید بھگتنے کے لیے جیل روانہ کردیا گیا، لیکن تلک کی جیل یاترا ملک میں حریت کی چنگاری کے لیے ہوا بن گئی (۶ رستمبر ۱۸۹۸ء کو وہ رہا کردیے گئے)۔ (حسرت موہانی۔ ایک سیاسی ڈائری، ص ۲۴ و سکسٹی ایئرز آف کانگریس، ص ۱۴۴)

سرحد:

۲۵ راگست ۱۸۹۷ء: آج کل سرحد مالاکنڈ و ٹوچی پر انگریزوں سے سخت لڑائی ہو رہی ہے اور ہندوستانی فوج بغرض مقابلہ برابر جارہی ہے۔ اگرچہ امید نہیں تھی کہ مجاہدین لوگ ظفریاب ہوں گے جن کے پیشوا ملا ہڈا ہیں۔ لیکن یہ بات اخباروں سے ضرور معلوم ہوتی ہے کہ سرکاری فوج کو بہت نقصان پہنچا۔

۲۸ر نومبر ۱۸۹۷ء: سرحدی لڑائی آفریدیوں اور برٹش گورنمنٹ سے ابتدا ۷ر جنوری ۱۸۹۷ء میں شروع ہوئی تھی وہ اب تک بدستور قائم ہے اور ۶۵ ہزار فوج سرکاری مقامات سرحد پر موجود ہے۔ سرکاری فوج اور اس کے افسر بہت سے مارے گئے۔ بالفعل یہ مقابلہ تیراہ میں ہو رہا ہے اور اب برف پڑنا شروع ہو گیا ہے۔ اس وجہ سے سرکاری فوج کا اب زیادہ قیام وہاں مشکل نظر آتا ہے۔

۷ر دسمبر ۱۸۹۷ء: ۱۹ر نومبر کو مہاراجہ پرتاپ سنگھ وزیر اعظم جودھ پور جنگ سرحدی میں زخمی ہوئے۔ ہاتھ میں گولی لگی۔ یہ جنگ انگریزوں اور آفریدیوں سے ہو رہی ہے اور مہاراجہ صاحب انگریزوں کی کمک پر گئے تھے۔

۱۲ر دسمبر ۱۸۹۷ء: یکم دسمبر کے پرچہ "ہندوستانی اخبار" لکھنو سے واضح ہوا کہ ۱۹ر جون سے ۱۰ر نومبر تک جنگ سرحدی آفریدیوں میں حسب تفصیل ذیل برٹش آفیسر اور سپاہی مقتول و مجروح ہوئے۔

ملٹری سرشتہ اسٹاف کے آفیسر ۲ ہلاک، ۶ مجروح، رجمنٹ کے آفیسر ۲۷ ہلاک، ۶۰ مجروح، برٹش عہدہ دار و سپاہی: ۵۹ ہلاک، ۲۴۰ مجروح، دیسی آفیسر ۶ ہلاک ۲۲ مجروح، دیسی عہدہ دار و سپاہی: ۲۳۶ ہلاک، ۶۵۵ مجروح، شاگرد پیشہ: ۹ ہلاک، ۲۲ مجروح۔ کل: ۳۳۹ ہلاک، ۱۰۰۸ مجروح۔

اگرچہ قتل و مجروح بہت سے لوگ ہوئے لیکن یہ لڑائی کا اصول ہے کہ تعداد کم کر کے بتائی جاتی ہے۔ (ایک نادر روزنامچہ، ص ۲۷)

۲۷ر دسمبر ۱۸۹۷ء: امراوتی کے مقام پر کانگریس کا تیرھواں سالانہ اجلاس مسٹر ایم۔ سی شنکرن نائر کی صدارت میں شروع ہوا۔ اجلاس سے کچھ دنوں قبل بال گنگا دھر تلک کی گرفتاری اور سزایابی کا واقعہ پیش آ چکا تھا۔ اجلاس کے موقع پر اس واقعے اور اس کے عواقب و نتائج پر خاص بحث ہوتی رہی۔ اس اجلاس میں ۶۹۲ ڈیلی گیٹ شریک ہوئے۔ (حسرت موہانی۔ ایک سیاسی ڈائری، ص ۲۵۔۲۴، سکسٹی ایئرز آف کانگریس، ص ۴۴۔۱۴۳)

۱۸۹۸ء

۲۷ر مارچ ۱۸۹۸ء: آج سر سید احمد خان کا دہلی میں انتقال ہو گیا۔

۲۹ر دسمبر ۱۸۹۸ء: اسی سال بنارس میں ایک اسکول لیڈی اینی بیسنٹ نے قائم کیا جو آگے

چل کر بنارس ہندو کالج اور یونیورسٹی بن گیا۔ ۲۹ر دسمبر ۱۸۹۸ء مدراس میں آنند موہن بوس کے زیرِ صدارت کانگریس کا اجلاس شروع ہوا۔ اس اجلاس میں ۶۱۴ ڈیلیکیٹ شریک ہوئے۔ جس میں بہت سی مفید تجویزیں پاس ہوئیں۔ ساتھ ہی کانگریس کو طاقتور بنانے کی اپیل کی گئی۔ اور کانگریس کا دستور بنانے کے لیے جو قدم اٹھایا گیا تھا، اس پر غور کیا گیا۔ یہ کانگریس کا چودھواں سالانہ اجلاس تھا۔ (حسرت موہانی۔ ایک سیاسی ڈائری، ص ۲۵)

ہجرت کے سفر اور قیام مدینۂ منورہ کے حالات ۹۹۔۱۸۹۸ء

حضرت شیخ الاسلام واقعات ہجرت کے سلسلے میں فرماتے ہیں:

"۱۳۱۶ھ (۱۸۹۸ء) میں جب کہ میں اکثر کتب درسیہ سے فارغ ہو چکا تھا۔ صرف علم ہیئۃ میں سے شرح چغمینی، سبع شداد اور ادب میں سے حماسہ، تاریخ یمینی، طب میں سے موجز قانونچہ، شرح اسباب، نفیسی اور علم عروض کی رائج کتابیں، فقہ میں سے درمختار وغیرہ باقی تھیں کہ والد صاحب مرحوم کا سامان سفر حجاز وعرب مکمل ہو گیا۔ مزروعہ زمین جس قدر بھی والد صاحب مرحوم کے حصے میں الہ داد پور اور جڑاون پور میں تھی، اس کو ٹانڈہ کے ایک رئیس نے خرید لیا اور سکنائی زمین اس خیال سے نہیں بیچی کہ ممکن ہے اولاد میں سے کوئی واپس آئے تو کم از کم رہنے کے لیے تو اس کو ٹھکانا مل جائے۔ مسکونہ مکان کی قیمت بھی نہایت کم ملتی تھی اس لیے بھی اس کو فروخت نہیں کیا۔ زمین کی آمدنی اور تنخواہ وغیرہ سے کچھ روپیہ والد صاحب نے پس انداز کر رکھا تھا اس لیے مجموعہ تقریباً پانچ ہزار روپے ہو گیا تھا ضروریات سفر فرش، لباس وغیرہ بھی سب مکمل کر کے والد صاحب مرحوم نے اعلان کر دیا کہ شعبان ۱۳۱۶ھ (دسمبر ۱۸۹۸ء) میں روانہ ہو جائیں گے۔ میں نے استدعا کی کہ مجھ کو ایک سال کے واسطے چھوڑ دیا جائے تاکہ میں بقیہ کتب پڑھ لوں۔ اس کے بعد میں آ جاؤں گا تو اس کی اجازت نہ دی اور فرمایا کہ مدینۂ منورہ میں چل کر پڑھ لینا۔ خلاصہ یہ کہ بارہ آدمیوں کا مختصر سا قافلہ اس سفر کے لیے تیار کیا گیا۔ والدین مرحومین، بھائی محمد صدیق صاحب مرحوم معہ زوجہ وپسر وحید احمد، بھائی سید احمد صاحب مرحوم معہ زوجہ، حسین احمد معہ زوجہ، عزیزم محمود احمد سلمہ، ہمشیرہ عزیزہ ریاض فاطمہ مرحومہ، عزیزم جمیل احمد مرحوم۔

اس برس بمبئی اور سواحل بحر ہند میں طاعون تھا۔ اس لیے مغربی ہند کے تمام بندر بند تھے۔ کسی سے حجاج کو سفر کرنے کی اجازت نہ تھی، صرف مشرقی ہند خلیج بنگال میں چاٹگام سے اجازت شمالی اور مشرقی ہند کے حصوں کے باشندوں کو دے دی گئی تھی اور قرنطینہ کے لیے پنجاب میں انبالہ، یوپی میں الہ اباد، بنگال میں چاٹگام مقرر کیا گیا تھا اور ہر جگہ پر ان میں سے کیمپ حجاج بنائے گئے تھے۔ الہ آباد کیمپ میں شعبان کے آخر میں ہمارا قافلہ داخل ہوا۔ یہ کیمپ شہر سے باہر دریا کے قریب جہاں گنگا جمنا ملتے ہیں ایک پرانی کوٹھی میں بنایا گیا تھا۔ دس بارہ دن یہاں قیام کیا گیا ڈاکٹری معائنہ ہوتا تھا۔ اہل شہر میں سے کسی کو ہم سے ملنے کی اجازت نہیں تھی۔ کیمپ میں سوائے مامورین کے کسی کو داخل نہیں کیا جاتا تھا۔ مولانا محمد حسین صاحب مرحوم الہ آبادی تشریف

لائے تو ان کو بھی اندر داخل نہیں ہونے دیا گیا۔ صرف دروازۂ کیمپ پر دور دور سے باتیں ہو سکیں۔ اس عرصے میں ہمارے تمام کپڑے خواہ مستعمل تھے یا غیر مستعمل ایک بڑے کڑاہ میں دوا ڈالے ہوئے کھولتے ہوئے پانی میں پکائے گئے۔ جس سے ریشمین اور اونی کپڑے اور نئے تھان وغیرہ خراب ہو گئے (حال آں کہ دوسرے بڑے بڑے مقامات قرنطینہ میں صرف مستعمل سوتی کپڑے بھاپ کی انجن میں ڈس انفیکٹ کیے جاتے ہیں۔ کامران، بمبئی، کراچی وغیرہ میں یہی حال ہے) اگرچہ مدت قرنطینہ صرف دس روز تھی۔ مگر گاڑی وغیرہ کے انتظام کی وجہ سے کچھ دیر لگ گئی اور رمضان کی دسویں یا بارھویں کو ہم روانہ ہو سکے۔ ریل گاڑی میں ایسا ڈبہ منگایا گیا تھا جس میں ایک کمرہ سلاخوں والا تھا جس میں عموماً خطرناک قیدی سفر کرائے جاتے ہیں۔ اس میں ہم سبھوں کو بٹھایا گیا اور عام مسافروں سے بالکل الگ تھلگ رکھا گیا۔ محافظ کیمپ ہمارے ہمراہ تھا جو کہ اسٹیشنوں پر ہماری حفاظت کرتا تھا کہ کسی شخص سے ہماری ملاقات نہ ہونے پائے۔ اس طرح ہم سفر کر کے الہ آباد، بنڈیل، منٹی، گوالنڈو، چاند پور ہوتے ہوئے چاٹگام پہنچے جب تک ہم ای۔ آئی۔ آر پر سفر کرتے رہے، ہماری پوری نگرانی ہوتی رہی۔ جس اسٹیشن پر ایکسپریس ٹھہرتی تھی وہاں سے تار پہنچ جاتا تھا اور سپاہی کمرہ کے سامنے آ کر محافظت کے لیے کھڑا ہو جاتا تھا۔ بنڈیل کے بعد یہ تمام انتظام ختم ہو گیا۔ صرف محافظ کیمپ جو کہ ہمدرد مسلمان تھا اس کی نگرانی باقی رہی کرائے ریل اور جہاز ہم سے پہلے ہی الہ آباد میں وصول کر لیا گیا تھا۔ چاٹگام اسٹیشن سے ایک دو اسٹیشن پہلے پہاڑتلی اسٹیشن کے قریب ریلوے لائن کے کنارے حجاج کا کیمپ بنوایا گیا تھا جو کہ وہاں کی ریتلی پہاڑیوں سے ملا ہوا تھا۔ ایک انگریز افسر تمام کیمپ کا معہ چند کانسٹبلوں کے محافظ تھا۔ ہم سب اس کیمپ میں داخل کر دیے گئے اور خس پوش بانس کی پردہ دار بارک میں ہم کو ٹھہرا دیا گیا۔ اس کیمپ میں پہلے سے صرف صوبہ بنگال کے مختلف اضلاع کے حجاج موجود تھے۔ یوپی سے فقط ہمارا خاندان تھا۔ آخر میں پنجاب سے بھی کچھ لوگ سیالکوٹ وغیرہ کے آ گئے تھے۔ کچھ ترکستان چینی اور سرحد کے لوگ بھی آئے۔ جہاز کے انتظار میں اسی کیمپ میں ایک مہینہ سے کچھ زائد ٹھہرنا پڑا۔

۱۸۹۹ء، مارچ: اواخر شوال (۱۳۱۶ھ مارچ ۱۸۹۹ء) میں حاجی قاسم کمپنی کا زبیدہ جہاز چاٹگام پہنچا اور ہماری انتظار کی گھڑیاں اختتام کو پہنچیں۔ اس سال اس جہاز کے بعد ایک دوسرا جہاز مرزاپور بھی چاٹگام سے روانہ ہوا تھا۔ اس کے بعد کوئی جہاز نہیں گیا۔

سپرنٹنڈنٹ کیمپ ہم لوگوں پر کچھ مہربان ہو گیا تھا۔ اس نے کپتان جہاز سے اوپر کے حصے پر ایک بہت بڑا کمرہ جو کہ جہاز کے وسطانی حصے میں کسی زمانے میں ڈاک کے لیے مخصوص تھا

(کیوں کہ یہ جہاز غالباً پی او کمپنی سے حاجی قاسم کمپنی نے خریدا تھا) دلوادیا جس کی وجہ سے نہایت اطمینان سے تمام خاندان ایک ہی محفوظ و پردہ دار کمرے میں سفر کرسکا۔ تقریباً سترہ اٹھارہ دن سفر کر کے جہاز عدن ہوتا ہوا کامران پہنچا۔ وہاں ہم سب اتارے گئے اور دس دن تک حجاج کیمپ میں ٹھہرنا پڑا۔ فی کس دس روپیہ فیس قرنطینہ دینی پڑی (اب قاعدہ بدل گیا ہے۔ جہاز کے کرائے کے ساتھ ساتھ کامران کی فیس دس دس روپیہ وصول کر لی جاتی ہے۔ جہاز کامران پہنچتا ہے اور قرنطینہ کے آفیسر اور ڈاکٹر جہاز پر آکر فیس وصول کر کے اجازت روانگی کی دیتے ہیں۔ کپتان اور جہاز کے ڈاکٹر کی رپورٹ دربارۂ صحت مسافرین قابل اعتماد سمجھی جاتی ہے۔ ہاں اگر جہاز میں بیماری ہیضہ وغیرہ ہو اور ڈاکٹر رپورٹ کردے تو مسافروں کو اتارنا ضروری سمجھا جاتا ہے)

۵،۶؍اپریل ۱۸۹۹ء: وہاں سے روانگی کے تیسرے دن جہاز جدہ پہنچا۔ جدہ کے پورٹ اسٹیشن پر پورٹ اسٹیشن کی فیس تقریباً ساڑھے سات روپے یا کچھ زائد فی کس لی گئی۔ نیز کرائے کشتی بھی وصول کیا گیا۔ اس کے بعد ہم کو مطوف کے کارندے کے حوالے کر دیا گیا (اب پورٹ کی فیس وغیرہ کا قاعدہ بدل گیا ہے جہاز کے ٹکٹ کے ساتھ یہ بھی وصول کرلیا جاتا ہے اور کپتان فی کس مقرر مقدار حکومت حجاز کو ادا کر دیتا ہے۔ یا کمپنی کے نمایندے سے حکومت حجاز وصول کر لیتی ہے۔ مشہور ہے کہ اب فی کس پچیس روپیہ وصول کیے جاتے ہیں۔ البتہ کرایہ کشتی اب بھی پورٹ اسٹیشن پر وصول کیا جاتا ہے وہاں نکلنے پر کسٹم میں تمام اسباب کا معائنہ کیا جاتا ہے، اور اگر کوئی محصولی مال ہو تو اس پر مقررہ محصول وصول کیا جاتا ہے) بالآخر ذیقعدہ کی ۲۴ یا ۲۵؍تاریخ (۵ یا ۶؍اپریل ۱۸۹۹ء) کو ہم مکۂ معظمہ پہنچے۔ رشید ابوبکر رسیدی مرحوم کو مطوف بنایا گیا تھا۔ ان کے ایک صبی (کارندہ) بنگالی تھے، ان کے مکان پر محلہ جیاد میں قیام کیا۔ اگرچہ ان کا مکان نہایت تنگ تھا مگر ہم لوگ بالکل ناواقف تھے اور ٹھہرنا بھی کم تھا اس لیے کچھ کنج وکاؤ نہیں کیا گیا۔ مختلف قسم کی تکالیف پر صبر کیا گیا۔ طواف قدوم سے فارغ ہو کر حضرت قطب عالم مولانا الحاج امداد اللہ صاحب تھانوی قدس اللہ سرہٗ العزیز کی بارگاہ عالی میں حاضری کا شرف حاصل کیا اور پھر روزانہ حاضر ہوتے رہے۔ درمیان میں مجھ کو چند روز بخار بھی آیا جس سے حاضری میں کمی ہوئی۔

۲۳؍مئی ۱۸۹۹ء: حج اور عمرہ کے مناسک ادا کرنے کے بعد غالباً ۲۵ یا ۲۶؍ذی الحجہ (۶ یا ۷۔مئی) کو مدینۂ کی روانگی ہوئی اور تقریباً بارھویں دن محرم ۱۳۱۷ھ (۲۳؍مئی ۱۸۹۹ء) کی ابتدائی تاریخوں میں مدینۂ منورہ میں شرف حضور حاصل ہوا۔ حرم نبوی کے باب النساء کے قریب

زقاق البدور کے کنارے پر ایک مکان کرایے پر لے کر قیام کیا گیا۔ مگر چوں کہ وہ مکان تنگ تھا اس میں اتنے کمرے نہ تھے کہ چار پردہ دار علاحدہ علاحدہ رہ سکیں نیز اس میں کنواں بھی نہ تھا۔ اس لیے سخت تکلیف کا سامنا ہوا۔

(نوٹ) مدینۂ منورہ میں ہر مکان میں کنواں ہونا ضروری ہے، جو مکان کنویں سے خالی ہو وہ نہایت کم کرایے پر اٹھتا ہے اور لوگ اس میں رہنے سے احتراز کرتے ہیں۔ کیوں کہ استعمال کے لیے وضو، غسل، برتنوں کے دھونے، کپڑوں کے دھونے، استنجا وغیرہ کے لیے پانی کی بہت ضرورت ہوتی ہے۔ اگر ان مصارف کے لیے سقہ سے پانی منگایا جائے تو بہت زیادہ خرچ پڑتا ہے۔ وہاں پر سقہ اس زمانے میں صرف ایک مشک پانی پر ڈھائی روپیہ (ایک مجیدی) ماہوار لیا کرتا تھا۔ عموماً سقوں کو صرف پینے اور کھانا پکانے کے پانی کے لیے رکھا جاتا ہے۔ سقے نہر زرقاء سے (جس کے تمام شہر میں متعدد مخزن بنے ہوئے ہیں) پانی لاتے ہیں۔ یہ پانی نہایت شیریں اور ہلکا ہے۔ گھروں میں جو کنویں پائے جاتے ہیں، ان کا پانی شیریں نہیں ہوتا۔ بلکہ کم وبیش کھاری ہوتا ہے جو کہ دیگر استعمال کے لیے کارآمد ہو سکتا ہے۔

نہر زرقاء کی مجمل کیفیت:

نہر زرقاء بنی امیہ کے زمانے کی جاری کی ہوئی نہر ہے، جو کہ قبا کی پہاڑیوں میں سے کھود کر نکالی گئی ہے۔ کہا جاتا ہے کہ مروان بن حکم نے جب کہ وہ وہاں حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ کی طرف سے حاکم تھا، ان کے حکم سے نکلوائی تھی۔ چوں کہ اس کی آنکھیں ازرق یعنی نیلگوں تھیں اس لیے اس نہر کو زرقا کہا گیا۔ بعض لوگ کہتے ہیں کہ مروان بن حکم کی ماں یا دادی کا نام یا لقب زرقا تھا اس لیے اس نہر کا نام زرقاء ہو گیا۔ بعض کہتے ہیں کہ اس کا پانی نہایت صاف شفاف تھا اور دور سے ازرق یعنی نیلگوں معلوم ہوتا تھا اس لیے اس کو زرقا کہا گیا۔ اب بھی اس کا وہ سوت جو کہ قدیمی ہے اور پہاڑ کی طرف سے مجمع الماء (وہ کنواں جس میں دو سوت جمع کیے گئے ہیں) میں گرتا ہے۔ نہایت صاف اور شفاف ہے۔ اوپر سے نیلگوں ہی معلوم ہوتا ہے۔ غرض یہ کہ یہ نہر بہت قدیمی ہے اور تمام شہر مدینۂ منورہ میں اسی کا پانی استعمال کیا جاتا ہے، مگر یہ نہر کاریز کی طرح سے زمین دوز ہے، سطح زمین کی اونچائی کی وجہ سے نیچے نیچے لائی گئی ہے اور شہر میں مختلف مقامات پر اس کے مخزن بنا دیے گئے جن میں پتھر کی وسیع پیمانے پر سیڑھیاں لگا دی گئی ہیں لوگ نیچے اتر کر نہر سے پانی بھرتے ہیں...... نہر زرقا کے لیے ترکی حکومت نے اخیر زمانے میں انجن لگوا کر نلوں کے ذریعے

پانی شہر میں تقسیم کر دیا تھا جس کی وجہ سے اہل شہر کو بہت آسانی ہو گئی ہے، مگر وہ مخازن سابقہ بحالہا قائم ہیں۔

الغرض زقاق البدور کے اس مکان کی دشواریاں دیکھ کر دوسرے مکان کو لینے اور پہلے عقد جارہ کو فسخ کرنے کا ارادہ کیا گیا۔ مدینۂ منورہ میں مکانات ماہواری کرایہ پر نہیں ملتے بلکہ سالانہ کرایے پر ملتے ہیں۔ البتہ حجاج کو یومیہ کے حساب سے یا تا قیام قافلہ کرایے پر دیے جاتے ہیں۔ جو کہ بہت گراں پڑتا ہے۔ ماہ محرم میں مکانات کرایے پر اٹھائے جاتے ہیں۔ حارۃ الآ غاوات میں ایک وسیع مکان لیا گیا اور اس میں قیام کیا گیا غالباً وہ مکان ایک سو بیس روپیہ میں لیا گیا تھا۔

حضرت والد صاحب مرحوم نے مدینۂ منورہ پہنچ کر جو مقدار نقود کی مصارف سے بچی تھی حسب حصص شرعیہ ہم لوگوں پر تقسیم کر دی اور فرمایا کہ میں نے تو ہجرت کی نیت کی ہے اس لیے میں تا زیست یہاں ہی رہوں گا۔ تم لوگوں کو اختیار ہے کہ یہاں رہو یا ہندوستان چلے جاؤ۔ یہ روپیہ واپسی کے لیے کافی ہے۔ ہم لوگوں نے ہجرت کی نیت نہیں کی تھی کیوں کہ حضرت گنگوہی قدس اللہ سرہٗ العزیز اور پھر حضرت قطب عالم حضرت حاجی امداد اللہ صاحب قدس اللہ سرہٗ العزیز نے ہجرت کی نیت کرنے سے منع فرما دیا تھا اور یہ ارشاد فرمایا تھا کہ ہجرت کرنے والوں پر امتحانات شدیدہ ہوتے ہیں، جس میں اکثر لوگ پھسل جاتے ہیں اور ہجرت توڑ کر اوطان کو واپس ہو جاتے ہیں اور گنہگار ہوتے ہیں۔ صرف قیام کی نیت کرنا اگر احوال سازگار ہوئے قیام کرنا ورنہ جب جی چاہے واپس ہو جانا۔ حضرت حاجی صاحب قدس اللہ سرہ العزیز نے تو یہ بھی فرمایا تھا کہ میں نے بھی ہجرت کی نیت اس وقت کی جب کہ میں ایک مرتبہ بیمار ہو کر زندگی سے مایوس ہو گیا تھا اور فرمایا کہ جس کو صرف دنیا مقصود ہو، وہ جدہ میں رہے اور جس کو دین و دنیا مقصود ہو وہ مکۂ معظمہ میں رہے اور جس کو صرف دین مقصود ہو وہ مدینۂ منورہ میں رہے کیوں کہ ہندوستانیوں کے لیے خصوصاً اور دوسروں کے لیے عموماً جدہ میں اسباب معیشت بہت اور آسان ہیں اور مکۂ معظمہ میں اس سے زیادہ اور سہل تھے مکۂ معظمہ میں ہندوستانی بکثرت آباد بھی ہیں، مگر مدینۂ منورہ میں اسباب معیشت نہایت ہی کم ہیں اور گرانی زیادہ ہے۔ بہر حال ہم میں سے کسی نے بھی سوائے حضرت والد صاحب مرحوم کے ہجرت کا ارادہ نہیں کیا تھا۔ صرف قیام کا ارادہ تھا مگر والد صاحب مرحوم کو اکیلا چھوڑ کر چلا آنا نہ والدہ ماجدہ مرحومہ کو گوارا ہوا اور نہ اور کسی کو، سب نے ایک زبان ہو کر کہا کہ ہم جب تک آپ زندہ ہیں یہاں ہی رہیں گے۔

والد صاحب مرحوم نے فرمایا کہ یہ نقد ہمیشہ کے لیے کافی نہیں ہو سکتا، کوئی آمدنی ہندوستان سے ہمیشہ جاری رہنے والی نہیں ہے۔ عموماً اہل مدینہ کی گزران ان وظائف اور تنخواہوں پر ہے جو کہ ان کو ترکی حکومت یا دوسرے ممالک سے ملتی ہیں۔ اس لیے کوئی طریقہ معیشت کے لیے عمل میں لانا چاہیے۔ اس لیے قرار پایا کہ تجارت کی جائے، کیوں کہ کوئی دوسری صورت ملازمت یا دستکاری یا زراعت وغیرہ کی ممکن نہ تھی۔ چناں چہ باب الرحمۃ اور باب السلام کے درمیان میں ایک دکان کرایے پر لی گئی، جس میں پرچونی سامان چاء، شکر، صابن، چاول، دال وغیرہ رکھا گیا۔ تھوک فروش تاجروں سے خرید کر مال لایا جاتا تھا اور وہاں پھٹ کر طریقے پر فروخت کیا جاتا تھا۔ نیز قرار پایا کہ کھجوروں کے موسم میں جب کہ باغوں سے کھجوریں کٹ کر نیلام کے بازار میں آتی ہیں خرید لی جائیں اور ان کو محفوظ مخزنوں میں ذخیرہ کرلیا جائے اور موسم حج میں ان کو فروخت کر دیا جائے۔ مدینہ منورہ میں کرایے کے ایسے مکانات ہیں جن میں بڑے بڑے مغربی مٹکے رکھے ہوئے ہیں (یہ مٹکے افریقہ کے مغربی شمالی حصے میں مٹی کے نہایت مضبوط بنائے جاتے ہیں۔ ان کا منہ چھوٹا ہوتا ہے۔ نہایت مضبوط ہوتے ہیں۔ افریقہ سے جہازوں اور کشتیوں پر عرب کے بندرگاہوں تک لائے جاتے ہیں اور پھر اونٹوں پر لاد کر مدینہ منورہ پہنچائے جاتے ہیں۔ مدینہ منورہ میں لوگوں کی آمدنی کے لیے یہ جائداد کا حکم رکھتے ہیں۔ ان کا کرایے سال بھر کے لیے کیا جاتا ہے۔ اگر چہ عرب اور مدینہ منورہ میں بکثرت مٹکے بڑے منہ والے مختلف مقدار کے بنائے جاتے ہیں، مگر وہ اتنے مضبوط اور کارآمد نہیں ہوتے وہ اقسام کھجوروں کی جن میں کیڑے لگ جانے کا خوف زیادہ ہوتا ہے ان مٹکوں میں بھر کر خوب دبا دی جاتی ہیں اور پھر اوپر سے ام جروان (ہلیہ) کھجور بھر کر پھر نمک بھر کر مٹی سے مٹکوں کا منہ بند کر دیا جاتا ہے۔ اس طرح سے کھجوریں سال سال دو دو سال محفوظ رہتی ہیں۔

مدینہ منورہ میں کھجوروں کی بہت سی قسمیں پیدا ہوتی ہیں۔ خلاصۃ الوفاء اور دیگر تاریخی کتابوں میں ان کے اقسام تقریباً ایک سو تیس ذکر کیے گئے ہیں۔ ہر ایک قسم کا مزہ، رنگ، وضع وغیرہ جدا جدا ہوتا ہے۔ اس زمانے میں تقریباً چالیس قسمیں بکثرت پائی جاتی ہیں ہر ایک صنف علاحدہ علاحدہ فروخت ہوتی ہے۔ ام جروان بھی ایک قسم کھجوروں کی ہے اس زمانے میں اس کا نام ہلیہ ہے۔ رطب (تازہ و تر کھجور) کے زمانے میں سب سے پہلے اس کی ہی رطب ہوتی ہے اور بکثرت کھائی جاتی ہے۔ سوکھنے کے بعد اس میں جلے ہوئے گڑ کا مزہ پیدا ہو جاتا ہے۔ اس کے دانے

چھوٹے ہوتے ہیں اور سوکھنے کے بعد یہ سیاہ اور سخت ہو جاتی ہے۔ اس کی پیداوار بہت ہے۔ جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ہجرت کر کے جب پہلے پہل قبا میں وارد ہوئے تو آپ کے سامنے کلثوم بن الہدم رضی اللہ عنہ نے اسی کا خوشہ پیش کیا تھا وہ زمانہ رطب کا تھا۔ آپ نے اس کے لیے دعا فرمائی تھی۔ اس کھجور کو مٹکوں میں رکھنے کی ضرورت نہیں پڑتی۔

خلاصہ یہ کہ کئی سو روپے کی کھجوریں اس طرح خرید لی گئی اور رباط العجم میں مخزن کرائے پر لے لیا گیا اور وہ اس کے مٹکوں میں بھر دی گئیں اور بعض اقسام جو کہ بغیر مٹکوں میں بھرنے کے محفوظ رہ سکتی ہیں، جیسے ام جروان (حلیہ) لبانہ سخل (بیدانہ) وغیرہ وہ سکونت کے مکان میں کھلی جگہ ذخیرہ کر لی گئیں۔ تھوک مال کی خرید بڑے بھائی مولانا محمد صدیق احمد صاحب مرحوم کرتے تھے ان کو اس کا شوق بھی تھا اور مہارت بھی بہت جلد حاصل ہو گئی تھی۔ دکان پر میں اور بھائی سید احمد صاحب مرحوم باری باری بیٹھتے تھے اور کبھی کبھی بڑے بھائی صاحب مرحوم بھی بیٹھتے تھے۔ تھوڑے عرصے میں تجربے سے معلوم ہوا کہ اس طریقے سے اگرچہ آمدنی ہے مگر کرائے دکان اور دیگر مصارف منہا کرنے کے بعد آمدنی اتنی نہیں ہو سکتی جو کہ روزمرہ کے اخراجات کو کافی ہو سکے۔ اس لیے میں نے سلسلۂ کتابت علی الاجرت شروع کر دیا۔ عربی نسخ خط میں کتابیں نقل کرتا تھا اور اجرت حاصل کرتا تھا۔ مدینۂ منورہ میں اس وقت دو کتب خانے منتظم تھے۔ ایک کتب خانہ شیخ الاسلام اور دوسرا محمودیہ۔ ان دونوں میں قلمی کتابیں نایاب بکثرت تھیں۔ مجاورین مدینہ (باہر کے باشندے جو مدینۂ منورہ میں قیام پذیر ہیں) اور اہالی شہر اور زائرین کو بسا اوقات کسی کتاب کی ان کتب خانوں میں سے ضرورت پڑتی ہے تو وہ ان کو نقل کرتے رہتے ہیں۔ کبھی کبھی مصر یا مغربی افریقہ وغیرہ سے بھی لوگ کسی کتاب کی نقل چاہتے ہیں تو اپنے نمائندوں کے ذریعے سے یہاں نقل حاصل کرتے ہیں۔ مگر ہر دو کتب خانوں میں اس کی اجازت نہیں تھی کہ کتاب کتب خانے سے باہر نکالی جائے، البتہ انتظام تھا کہ جو شخص کسی کتاب کو نقل کرنا یا مطالعہ کرنا چاہے وہ کتب خانہ ہی میں آ کر استفادہ کرے۔ روزانہ کتب خانہ ۳ بجے عربی (یعنی نو بجے افرنجی) سے لے کر ۱۰ بجے عربی (۴ بجے افرنجی) تک کھلا رہتا تھا۔ اس لیے بجز اس مدت کے دوسرے اوقات میں لکھنا ممکن نہ ہوتا تھا بنابریں آمدنی بہت تھوڑی ہوتی تھی۔ اس زمانے میں چند اور بھی اشخاص یہ مشغلہ کرتے تھے۔ باقی اوقات میں مشاغل سلوک اور درس و تدریس کا سلسلہ میں نے جاری کر لیا تھا۔ نیز چونکہ ادبیات میں بعض کتابیں باقی رہ گئی تھیں اس لیے مدینۂ منورہ کے مشہور اور معمر ادیب مولانا الشیخ آفندی

عبدالجلیل برادہ رحمۃ اللہ علیہ کے پاس شام کو کچھ ادب کی کتابیں ہم تینوں بھائی پڑھتے رہے۔ مشاغل سلوک کی تفصیل علاحدہ آئے گی'۔ (نقش حیات: حصہ اول، صفحہ ۶۹۔۶۰)

مدینۂ منورہ میں درس وتدریس کا سلسلہ:

حضرت شیخ الاسلام فرماتے ہیں:

''درس وتدریس کی تفصیل یہ ہے کہ اواخر شعبان ۱۳۱۶ھ (جنوری ۱۸۹۹ء) میں جب کہ ہم تینوں بھائی دیوبند سے آخری طور پر روانہ ہوئے تو منجملہ رخصت کرنے والوں کے خود حضرت شیخ الہند قدس اللہ سرہ' العزیز ساتھ ساتھ اسٹیشن دیوبند تک پیدل تشریف لائے تھے۔ راستے میں پر زور طریقے پر ہدایت فرمائی کہ پڑھانا ہرگز نہ چھوڑنا۔ چاہے ایک دو طالب علم ہی ہوں۔ اس لیے تعلیمی مشغلہ کا خیال بہت زیادہ ہوگیا تھا۔ مدینۂ منورہ پہنچنے کے بعد بعض بعض طلبہ ہندوستانی اور عرب بعض کتابوں کی تدریس کے خواستگار ہوئے۔ اگرچہ عربی زبان میں عرصہ تک کتابیں پڑھنے کی نوبت آئی تھی، مگر بولنے کی مشق نہ تھی۔ اس لیے اشکال کا سامنا ہوا مگر حسب ہدایت حضرت شیخ الہند رحمۃ اللہ علیہ اوقات کتابت کے علاوہ دوسرے اوقات میں اس کام کو شروع کردیا اس زمانے میں بہت سے علماء اعزازی طریقے پر حرم محترم نبوی (مسجد نبوی علیہ السلام) میں پڑھایا کرتے تھے۔ اس سے مجھ کو ایک تو فائدہ یہ ہوا کہ ابتدائی کتابیں صرف ونحو وفقہ وغیرہ کی محفوظ ہوگئیں اور دوسرے یہ کہ زبان صاف ہوگئی۔ اہل علم میں عموماً اور علمائے حجاز میں خصوصاً حسد اور رقابت کا مادہ بہت ہوتا ہے۔ اس لیے جب کوئی عالم آتا ہے تو اس کی طرف آنکھیں بہت اٹھتی ہیں اور تنقیدی معاملات اکثر پیش آتے ہیں۔ علماء ہند چوں کہ عربی بولنے کے عادی نہیں ہوتے۔ اس لیے بسا اوقات شکست کھاجاتے ہیں۔ اگرچہ مدینۂ منورہ میں پہلے سے علماء ہند کی دھاک بیٹھی ہوئی تھی کیوں کہ حضرت شیخ محمد عابد انصاری سندھی رحمۃ اللہ علیہ اور ان کے بعد حضرت شاہ عبدالغنی نقش بندی دہلوی رحمۃ اللہ علیہ اور ان کے بعد حضرت مولانا حبیب الرحمٰن صاحب ردولوی رحمۃ اللہ علیہ اور مولانا محمد اسحاق صاحب امرتسری رحمۃ اللہ علیہ بڑے بڑے پایے کے علماء گزرے تھے جن کے غیر معمولی علم اور اعلیٰ استعداد وقابلیت کا سب کو اقرار تھا۔ بہت سی تصانیف اور بہت سے شاگرد اُن کے وہاں موجود تھے۔ آخرالذکر ہر دو حضرات اس زمانے میں زندہ بھی تھے۔ اگرچہ حضرت مولانا حبیب الرحمٰن صاحب کی جلالی اور زاہدانہ طبیعت کی وجہ سے عام طور پر لوگوں کو استفادہ ممکن نہ ہوسکا تھا مگر ان کی اعلیٰ استعداد اور انتہائی قابلیت کا سکہ بیٹھا ہوا تھا۔

بہرحال ہمارے جیسے ٹٹ پونجیوں کے لیے ان عربی علماء کے میدان امتیاز وامتحان میں پیش

قدمی یا اعتبار پیدا کرنا نہایت مشکل امر تھا، اس لیے ہمارا گوشۂ گم نامی میں ایک ایک دو دو طالب علموں کو پڑھانا اور ابتدائی کتب نحو وصرف وفقہ وغیرہ سے اشتغال رکھنا بہت مفید ہوا۔ ۱۳۱۸ھ شوال تک میں اسی طرح ابتدائی کتابیں مختلف فنون کی دو دو چار چار طالب علموں کو پڑھاتا رہا۔ حلقات درس وتدریس میں کوئی امتیازی شان پیدا نہیں ہوئی۔ اس لیے کسی کی تنقیدی نظر نہیں پڑی۔ ۱۳۱۸ھ ذیقعدہ (مارچ ۱۹۰۱ء) میں حضرت قطب عالم مولانا گنگوہی قدس اللہ سرہٗ العزیز کے ارشاد کے مطابق گنگوہ شریف کا سفر کیا اور ۱۳۲۰ھ ماہ محرم (اپریل ۱۹۰۲ء) میں واپس مدینہ منورہ پہنچا۔

اس وقت سے سلسلۂ تعلیم بڑے پیمانے پر جاری ہوا، جس کا مفصل حال آگے آئے گا (نقش حیات: حصہ اول، صفحہ ۶۹۔۶۸)

۱۸۹۹ء

لارڈ کرزن:

۳۰ر دسمبر کو لارڈ کرزن صاحب نائب السلطنت داخل بمبئی ہوئے، جہاں سے ۶ر جنوری کو کلکتہ پہنچ کر چارج وائسرائے کشور ہند لارڈ ایلگن صاحب سے حاصل کریں گے صاحب ممدوح تجربہ کار شخص ہیں اور کئی مرتبہ بطور سیاحت ہندوستان تشریف لاچکے ہیں۔

۶ر جنوری ۱۸۹۹ء۔ آج لارڈ ولیڈی کرزن صاحب وائسرائے کشور ہند نے چارج باضابطہ لارڈ ایلگن صاحب کنارہ کش وائسرائے ہندوستان کا لیا اور صاحب آخر الذکر اسی وقت کلکتہ سے جہاز پر واسطے روانگی ولایت کے سوار ہوئے اور یہ کارروائی ساڑھے نو بجے صبح کو عمل میں آئی۔ (ایک نادر روز نامچہ، ص ۲۸)

مارچ ۱۸۹۹ء: ۶ر مارچ کو مولوی عبدالحق صاحب خیرآبادی نے بعوارض چند در چند رحلت کی۔ مرحوم بہت بڑے عالم متقی تھے اور دو سو روپیہ ماہوار ریاست رام پور سے وظیفہ پاتے تھے۔ مولوی صاحب کی شہرت تمام ہندوستان میں تھی۔ (ایک نادر روز نامچہ، ص ۱۲۸)

مولانا عبدالحق خیرآباد، مولانا فضل حق خیرآبادی کے خلف اور اپنے والد گرامی کے جانشین تھے۔ آخری دور میں ہندو پاکستان میں فلسفہ ومنطق کا ذوق انھیں مرحوم کے ذریعے سے پھیلا۔

۲۴ر مئی ۱۸۹۹ء: آج کی تاریخ میں ملکہ قیصرۂ ہند پورے اسی برس کی ہوئیں۔ سچ یہ ہے کہ یہ

ملکہ نہایت خوش اقبال بادشاہ زادی ہیں جن کے عہد میں صد ہا ممالک مفتوح ہو کر قبضے میں آئے۔

۹ر ستمبر ۱۸۹۹ء: امساک باراں کی عام شکایت ہے۔ احمد آباد (گجرات) میں سخت قحط پڑا ہوا ہے کہ وہاں کے لوگ ترس ترس مرنے کے عوض اپنی ہلاکت کو پسند کرتے ہیں بلکہ ایک شخص نے اپنا گلا کاٹ کر اپنے کو ہلاک کیا۔ (ایک نادر روز نامچہ، ص ۲۸)

۲ ستمبر ۱۸۹۹ء: کئی روز سے ابر محیط آسمان ہے لیکن پانی نہیں برستا۔ رقم دھان خشک ہوئی جاتی ہے...... آثار قحط پیدا ہیں۔ یہ حالت تو اودھ کی ہے لیکن اور حصۂ ہندوستان میں کام قحط شروع ہو گیا ہے۔ میں نے ایسا جلد قحط تو تاریخ ہندوستان میں کہیں نہیں دیکھا۔ ایک کو ابھی دو سال نہیں گزرے تھے کہ دوسرا نمودار ہو گیا۔ پروردگار عالم اپنی خلقت پر رحم کرے۔ (ایک نادر روز نامچہ، ص ۱۲۶)

۲۸ر ستمبر ۱۸۹۹ء: ۲۶ر فروری ۱۸۹۱ء کو تمام ہندوستان کی مردم شاری ہوئی تھی۔ ۲۸ کروڑ دس لاکھ مرد و عورت ہیں۔ من جملہ ان کے انگریزی عمل داری میں ۲۲ کروڑ پانچ لاکھ اور ریاستوں میں ۶ کروڑ پانچ لاکھ آباد ہیں۔ جو مردم شاری ۱۸۸۱ء میں ہوئی تھی۔ اس کے مطابق ۲ کروڑ نو لاکھ آدمیوں کی ترقی ہوئی۔ (ایک نادر روز نامچہ ص، ۲۹)

۱۷ر کتوبر ۱۸۹۹ء: دیکھنے اخبارات سے واضح ہوتا ہے کہ دارجلنگ متصلہ کلکتہ میں اس قدر شدید بارش ہوئی کہ پہاڑ کو جنبش ہوگئی جس سے چار سو جانیں تلف ہوگئیں اور صد ہا مکانات گر گئے اور اس کے رہنے والے اسی کے اندر دفن ہو گئے۔ راستہ آمد شد ہنوز بند ہے۔ عجب حال دنیا کا ہے کہ کہیں تو اس قدر بارش ہو رہی ہے کہ لوگ اس سے امان مانگ رہے ہیں اور کہیں اس قدر کمی ہے کہ عدم پیداوار غلہ و گھاس سے بغرض رفاہ عام کام قحط کا جاری ہے۔ عجب کارخانۂ ایزدی ہے کہ کچھ سمجھ میں نہیں آتا۔

۱۴ر اکتوبر ۱۸۹۹ء: چوں کہ ریاست ہائے راجپوتانہ میں اور نیز بعض حصص ممالک مغربی و شمالی میں کمی بارش سے قحط پیدا ہے لہذا اکثر ڈاکہ زنیاں بوجہ گرانی غلہ ہو رہی ہیں۔ ڈاکوؤں نے جس موضع کوتا کا فوراً وہاں رات کو پہنچ گئے اور جو پایا لوٹ لے گئے۔

چوں کہ جودھ پور وغیر راجپوتانہ میں قحط پڑا ہوا ہے لہذا بہت سے مارواڑی اپنا وطن چھوڑ کر اس ضلع میں آ گئے ہیں اور شب و روز بھیک مانگ کر اپنی گزر کرتے ہیں۔ (ایک نادر روز نامچہ، ص ۲۹)

۲۷ر دسمبر ۱۸۹۹ء: بمقام لکھنؤ شری رمیش چندر دت کی صدارت میں کانگریس کا پندرھواں

اجلاس شروع ہوا۔ اس اجلاس میں ۷۰۴ ڈیلیگیٹ شریک ہوئے۔ حکومت ہند پر دباؤ ڈالا گیا کہ سرکاری اور فوجی خرچ میں کمی کی جائے۔ ملک بھر میں گھریلو صنعت کو بڑھاوا دیا جائے۔ کاشت کے لگان میں جو اضافے کیے جا رہے ہیں، انھیں روکا جائے۔ ہندوستانی سرمایہ جو زیادہ لندن منتقل کیا جا رہا ہے، اس کی روک تھام کی جائے اور عوام کے روز بہ روز بڑھتے ہوئے افلاس کو دور کیا جائے۔ (حسرت موہانی...... ایک سیاسی ڈائری، ص ۲۵)

۱۹۰۰ء

۴ر جنوری ۱۹۰۰ء: ۴ر جنوری ۱۹۰۰ء...... مسٹر کاکس صاحب بہادر ڈپٹی کمشنر ہردوئی حسب منشا گورنمنٹ بذریعۂ پولیس سندیلہ اس بات کی تفتیش کرا رہے ہیں کہ روٗسائے سندیلہ سے کون کون لوگ شریک جلسۂ کانگریس ہوئے جو میدان شاہ مینا صاحبؒ (لکھنو) میں ۲۷ر دسمبر تک تین روز منعقد رہا اور جس کے پریسیڈنٹ مسٹر دت بنگالی تھے، جو اس کام کے لیے ولایت لندن سے آئے تھے، جہاں وہ کسی مدرسے کے پروفیسر ہیں۔ (ایک نادر روزنامچہ، ص ۲۹)

۱۸ر اپریل ۱۹۰۰ء: ۱۸ر اپریل کو گورنمنٹ کا ایک ریزولیشن جاری ہوا۔ جس کا منشا یہ تھا کہ عدالتوں اور سرکاری دفاتر میں ناگری حروف میں لکھی ہوئی درخواستیں دینے کی اجازت دی جاتی ہے۔ تمام سمن اور اعلان اردو اور ناگری حروف میں جاری ہوا کریں گے اور کوئی شخص کسی عہدے پر مقرر نہ ہوگا، جسے ناگری اور اردو حروف میں سرعت کے ساتھ لکھنے کی مہارت نہ ہو۔'' (مسلمانوں کا روشن مستقبل، ص ۲۳۲، پانچواں ایڈیشن)

خیال رہے کہ اس تجویز میں ناگری حروف میں درخواست دی جانے کی اجازت دی گئی تھی۔ اردو حروف میں درخواستوں کے دیے جانے کی اجازت پر اس سے کوئی اثر نہ پڑتا تھا۔ لیکن افسوس کہ اس سے بھی قومی اختلافات اور افتراقات کو وسیع کرنے کا کام لیا گیا۔ ہندوؤں نے اس فیصلے پر جلسے کر کے حکومت کا شکریہ ادا کیا۔ جب کہ مسلمانوں نے اس ریزولیشن کے خلاف جلسوں، مضمونوں اور مراسلوں میں ناگری حروف میں درخواستیں دیے جانے کی اجازت کے خلاف اپنے جذبات کا اظہار کیا۔

گورنمنٹ کا مقصد ہندو مسلمانوں میں اختلاف پر شکرگزاری اور بیزاری کے اظہار، دونوں سے پورا ہو رہا تھا۔ اور دونوں میں سے کوئی نہیں سمجھ رہا تھا کہ وہ کس کے مقصد کے لیے آلۂ کار بنے ہوئے ہیں۔

ناگری:

۱۶رمئی ۱۹۰۰ء: گورنمنٹ نے جو ریزولیوشن اپنے گزٹ مورخہ ۱۸راپریل میں نسبت رواج حروف ناگری کے جاری کیا ہے۔ اس کی وجہ سے کل بڑے بڑے شہروں میں کمیٹیاں ہو رہی ہیں اور لیفٹنٹ گورنر و گورنمنٹ ہند کو میموریل بھیجے جا رہے ہیں کہ ناگری کا دفاتر سرکاری میں جاری ہونا مناسب نہیں ہے جس کی وجہ سے تکلیف زائد ہوگی۔ (ایک نادر روزنامچہ، ص۳۱)

اردو:

۱۹راگست ۱۹۰۰ء کل بہ وقت ۷ بجے صبح کے ایک جلسہ اردو ڈیفنس بصدارت نواب مہدی علی صاحب محسن الملک بارہ دری قیصر باغ لکھنو میں منعقد ہوا جس کا یہ منشا تھا کہ جو ریزولیوشن مسٹر میکڈانلڈ صاحب لیفٹنٹ گورنر ممالک مغربی وشمالی واودھ نے ۱۸راپریل ۱۹۰۰ء کو در بارہ شائع اور رائج کرنے دیوناگری کے نافذ کیا ہے۔ وہ منسوخ کیا جاوے۔ جس کی نسبت نواب صاحب نے ایک نہایت عمدہ و دلچسپ اسپیچ فرمائی جس کا اثر کل حاضرین پر بخوبی پڑا اور اس جلسے میں قریب آٹھ نو ہزار آدمیوں کی شرکت تھی جو بطور قائم مقامان ہندوستان کے ہر ایک حصۂ ملک سے آئے ہوئے تھے اور یہ جلسہ نہایت خیر و خوبی کے ساتھ ختم ہوا اور ریزولیوشن پاس ہوئے۔ وہ بحضور گورنمنٹ بھیجے گئے کہ اہالی جلسہ کا یہ منشا ہے کہ اگر نواب لیفٹنٹ گورنر بہادر نے اس عرض داشت کی کچھ سماعت نہ فرمائی تو اس کی اپیل وائسرائے ہند و وزیر اعظم ہندوستان کے حضور میں پیش کی جاوے گی۔ (ایک نادر روزنامچہ، ص۳۲)

۲۷ردسمبر ۱۹۰۰ء: لاہور میں شری نارائن گنزیشن چنداورکار کی صدارت میں آل انڈیا کانگریس کا سولھواں اجلاس منعقد ہوا۔ اس اجلاس میں ۵۱۸۷ نمائندوں نے شرکت کی۔ کانگریس نے جب دیکھا کہ ملک میں شراب عام ہوتی جا رہی ہے تو حکومت سے درخواست کی کہ شراب اور دیگر نشیلی چیزوں پر حکومت زیادہ سے زیادہ ٹیکس عائد کر دے تاکہ غریب عوام شراب اور اس کے غلط اثرات سے محفوظ رہ سکیں۔ اس طرح تجویز خاص یہ بھی تھی کہ حکومت کے ہر محکمے میں ہندوستانیوں کو ملازمت دی جائے۔ (حسرت موہانی۔ ایک سیاسی ڈائری، ص۲۶)

۱۹۰۰ء

ہندوستان کے قحط ۱۷۰۷ء تا ۱۹۰۰ء:

جس قدر قحط ہندوستان میں ہوئے ہیں منجملہ ان کے گزشتہ ایک سو اکیس سال کے قحطوں پر

نظر ڈالنے سے معلوم ہوگا کہ موجودہ قحط کیا چیز ہے:

نمبر شمار	سنہ	قحط زدہ علاقہ	قحط زدہ رقبہ
۱	۱۷۷۰ء	بنگال	ایک لاکھ مربع میل
۲	۱۷۹۱ء	مشرقی مدراس، حیدرآباد گجرات، مارواڑ، جنوبی مہاراشٹر	دولاکھ مربع میل
۳	۱۸۰۳ء	دکن حیدرآباد	ڈیڑھ لاکھ مربع میل
۴	۱۸۰۴ء	ممالک مغربی وشمالی، وسط ہندوراجپوتانہ	ایک لاکھ مربع میل
۵	۱۸۲۴ء	شمالی مدراس	۸۰ ہزار مربع میل
۶	۱۸۲۵ء	بمبئی، گجرات وشمالی دکن	۸۰ ہزار مربع میل
۷	۱۸۳۷ء	ممالک مغربی وشمالی، مشرقی ریاست ہائے راجپوتانہ مشرقی پنجاب	۸۰ ہزار مربع میل
۸	۱۸۳۸ء	دوآبہ، ممالک مغربی وشمالی، دہلی وحصارڈویژن	۸۰ ہزار مربع میل
۹	۱۸۴۰ء	گجرات، کچھ وکاٹھیاواڑ	۵۰ ہزار مربع میل
۱۰	۱۸۶۱ء	دوآبہ، ممالک مغربی وشمالی، دہلی حصار و ایک حصہ راجپوتانہ	۵۰ ہزار مربع میل
۱۱	۱۸۶۵ء	اضلاع گنجام بلاری، اڑیسہ بہار، میسور، حیدرآباد، بمبئی وسط ہندو بنگال	دولاکھ مربع میل
۱۲	۱۸۷۲ء	راجپوتانہ، پنجاب ومابین جمناوسندھ، شمالی و مشرقی اضلاع ممالک متوسط	دولاکھ مربع میل
۱۳	۱۸۷۳ء	مغربی راجپوتانہ، اضلاع الہ آباد، دہلی، حصار، گجرات، کچھ، چند اضلاع ممالک متوسط	
۱۴	۱۸۷۴ء	بہار، یو، پی	۵۵ ہزار مربع میل
۱۵	۱۸۷۶ء	مدراس، میسور، دکھن، حیدرآباد	۵۵ ہزار مربع میل

۱۶	۱۸۷۷ء	مدراس، میسور، بمبئی، حیدرآباد	ڈھائی لاکھ مربع میل
۱۷	۱۸۷۸ء	ممالک مغربی وشمالی، کشمیر، پنجاب	ڈیڑھ لاکھ مربع میل
۱۸	۱۸۹۶ء	ممالک مغربی وشمالی وممالک متوسط	
۱۹	۱۸۹۷ء	ممالک مغربی وشمالی وسی پی	۳ لاکھ سے ۴ لاکھ مربع میل
۲۰	۱۸۹۹ء	جنوبی پنجاب، راجپوتانہ، سی پی، برار وسط ہند، حیدرآباد، بمبئی، چھوٹا ناگپور، مدراس	
۲۱	۱۹۰۰ء	جنوبی پنجاب، مشرقی سندھ، راجپوتانہ، وسط ہند، برار، سی پی، بمبئی، کاٹھیاواڑ، گجرات	۶ لاکھ سے ۷ لاکھ مربع میل

۱۹۰۱ء

ملکۂ معظمہ کا سوگ:

۱۲ر فروری ۱۹۰۱ء: اشتہار لارڈ کرزن صاحب گورنر جنرل کشور ہند مشعر بدیں مضمون شائع ہوا کہ کل رعایا ہندوستان سے امید ہے کہ جناب ملکۂ معظمہ کی وفات کا ۶ر مارچ تک پورا اور ۱۷راپریل تک نصف غم کریں اور ملازمین وفوج بری و بحری وغیرہ ۲۴ر جولائی ۱۹۰۱ء تک بائیں بازو پر سیاہ کپڑا باندھے رہیں۔ (ایک نادر روزنامچہ، ص ۳۲)

وفات شاہ جہاں بیگم بھوپال:

۱۹ر جون ۱۹۰۱ء خط برخوردار مجتبیٰ علی مطابق ۲۹ر صفر موصولہ بھوپال سے واضح ہوا کہ تاریخ ۱۶ر جون ۱۹۰۱ء یوم یک شنبہ ساڑھے گیارہ بجے دن کے سرکار عالیہ شاہ جہاں بیگم صاحبہ والی ریاست بھوپال نے بعمر ۶۵ سال مرض آکلا میں رحلت کی، جس کی شکایت میں وہ ایک سال سے مبتلا تھیں۔ رئیسہ کے مزاج میں خیر خیرات بہت تھی اور پکی مسلمان تھیں۔ انھوں نے اپنا عقد ثانی مولوی صدیق حسن قنوجی سے کیا تھا جو شوہر ہونے کے بعد خطاب نواب سے ممتاز ہوئے جو گورنمنٹ نے دیا تھا۔ دس بارہ سال کا زمانے ہوا کہ مولوی صاحب موصوف نے رحلت کی۔ مرحومہ بعد نماز مغرب باغ نشاط افزا میں دفن ہوئیں پچیس ہزار سے زائد لوگ شریک نماز تھے۔ بعد وفات رئیسۂ مرحومہ ان کی ولی عہد بیٹی سلطان جہاں بیگم صاحبہ داخل ''تاج محل'' ہوئیں۔

چوں کہ رئیسہ مرحومہ سولہ سال سے ان سے ناراض تھیں۔ اس وجہ سے صرف ایک مرتبہ بیٹی صاحبہ چندمنٹ کے لیے اپنی والدہ کی عیادت کو آئی تھیں اور اب بعد وفات آئیں۔

تخت نشینی سلطان جہاں بیگم:

۲۸؍جون ۱۹۰۱ء: آج برخوردار مجتبیٰ علی معہ ہمشیرہ منجھلی خودوار دِسندیلہ ہوئے، جن کی زبانی معلوم ہوا کہ ۳؍جولائی مطابق ۱۷؍ربیع الاول سنہ رواں کو جناب سلطان جہاں بیگم رئیسہ بھوپال تخت نشیں ہوں گی، لیکن انھوں نے انتظام ریاست ابھی سے شروع کر دیا ہے اور ہر ایک کارخانہ میں تخفیف کا رگا لگا دیا ہے چناں چہ تعمیرات میں ۲۵ ہزار روپیہ ماہوار کا صرفہ تھا جو گھٹا کر صرف دو ہزار روپیہ کر دیا گیا اور جس قدر بیگمات لکھنؤ وغیرہ کی محل سرا میں تھیں، ان سب کو نکال دیا اور منشی احتشام علی خلف امتیاز علی صاحب مرحوم سابق وزیر اعظم کو جو تنخواہ پانچ سو روپیہ ماہوار ملتی تھی وہ موقوف کر دی گئی۔ غرض کہ ریاست میں ہر قسم کا عزل و نصب ہو رہا ہے اور سلطان جہاں بیگم اپنے شوہر احمد علی خاں ملقب بہ لقب سلطان دولھا کی رائے پر کام کرتی ہیں۔ (ایک نادر روزنامچہ، ص ۶۱)

مدینۂ منورہ کی معیشت ان ایام کی:

اگر چہ حسبِ دعوات نبویہ (علیٰ صاحبہا الصلوٰۃ والتحیۃ) مدینۂ منورہ میں برکات مادیہ بھی بڑے درجہ میں پائی جاتی ہیں۔ اور پیمانہ ہائے ارزاق صاع و مدوزن وغیرہ میں اس قدر برکت محسوس ہوتی ہے کہ اور جگہ حتیٰ کہ مکۂ مکرمہ میں بھی اس کا آدھا تہائی حصے بھی نہیں پایا جاتا۔ اور کیوں نہ ہو۔ ارشاد ہے۔ اللھم اجعل بالمدینۃ ضعف مابمکۃ من البرکۃ اور دوسری روایت ہے ضعفی مابمکۃ من البرکۃ مگر باوجود اس کے وہاں گرانی اور مالوفات وطنیہ کے نہ پائے جانے اور اسباب معیشت کی قلت بلکہ عدم موجودگی وغیرہ کی وجہ سے ہر ملک کے باشندوں کو نہایت سختیاں پیش آتی ہیں نیز باشندگان مدینۂ منورہ اگر چہ عموماً نرم طبیعت اور خوش اخلاق ہیں مگر اپنے آپ کو تمام عالم اسلام سے اشرف اور سب کا پیرزادہ سمجھتے ہیں۔ کسی بیرونی شخص کو مساوات کا درجہ اپنے قلب اور دماغ میں نہیں دے سکتے۔ حال آں کہ عموماً بیرونی ہی اشخاص کی اولاد میں کسی کو دو کسی کو تین کسی کو چار یا کم وبیش پشتیں مدینۂ منورہ میں رہتے ہوئے ہوگئی ہیں۔ زمانۂ سعادت علیہ الصلوٰۃ والسلام سے آج تک کا رہنے والا کوئی خاندان وہاں نہیں ہے۔ ایک گھرانا انصار میں سے کہا جاتا ہے مگر اس کی بھی دو یا تین پشتیں باہر گزری ہیں مگر جو شخص بھی مدینۂ منورہ میں پیدا ہوا ہے وہ باہر کے

لوگوں کو اپنے سے نیچا اور کمتر دیکھتا ہے چاہے وہ لوگ اس کے باپ دادا کے ہم وطن بلکہ رشتہ دار ہی کیوں نہ ہوں۔ بالخصوص اگر بیرونی شخص کی زبان عربی نہ ہو۔ وہ تو اور بھی گرا ہوا ان کی نظروں میں معلوم ہوتا ہے۔ یہ ایک امر طبعی بھی ہے کیوں کہ ہر ملک اور قوم میں غریب الوطن خواہ وہ اپنے وطن میں کیسا ہی عزت والا کیوں نہ ہو، کم درجے کا اور ضعیف شمار ہوتا ہے۔ پھر اہل مدینہ کو جناب رسالت مآب علیہ الصلوٰۃ والسلام کے ساتھ شرف مجاورت (پڑوسی ہونے کا شرف) نہایت غیر معمولی شرف ہے، اس کی وجہ سے ان کو جو بھی برتری حاصل ہو کم ہے۔ جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا رشاد ہے "المدینة مهاجری ومضجعی من الارض وحق علیٰ امتی ان یکرموا جیرانی ما اجتنبوا الکبائر فمن لم یفعل ذلک سقاه الله من طینة الخبال عصارة اهل النار (قط فی الافراد عن جابر (رطب عن معقل بن یسار) اس کے علاوہ شرف مدینہ اور مجاورین مدینہ کے متعلق بہت سے ارشادات کنز العمال جلد ۶ اور دیگر کتب حدیث میں موجود ہیں۔

علاوہ ازیں اپنے وطنی رشتہ داروں اور احباب (جن سے سلاسل زندگانی وطن میں وابستہ تھے) وہ سب چھوٹے ہوئے ہوتے ہیں اور سابقہ ان لوگوں سے پڑتا ہے جو کہ بالکل اجنبی اور نئے ہوتے ہیں۔ وہ اس نووارد کے مرتبہ اور عزت سے واقف نہیں ہوتے اور نہ وہ ان لوگوں کے مراتب سے واقف ہوتا ہے۔

خلاصہ یہ کہ مختلف وجوہ سے نووارد آفاقیوں کو وہاں پر سخت مشکلات کا سامنا کرنا پڑتا ہے۔ غالباً یہی وجہ ہے کہ جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا من صبر علی لاوائها کنت له شفیعا او شهیدا یوم القیامة (جس نے مدینہ کی سختیوں پر صبر کیا تو میں اس کی خصوصی شفاعت قیامت میں کروں گا۔ یا یہ فرمایا کہ میں اس کی بہتری کی گواہی دوں گا) دوسری روایت میں فرمایا من استطاع ان یموت بالمدینة فلیمت بها فانی اکون له شفیعا او شهیدا یوم القیامة (جس سے یہ ہو سکے کہ مدینہ منورہ میں مرے تو یہاں ہی مرے کیوں کہ میں اس کی خصوصی شفاعت کروں گا۔ یا فرمایا کہ خصوصی گواہی دوں گا)

ہم لوگوں کو بھی بہت سی مشکلات کا سامنا کرنا پڑا بالخصوص عورتوں کو ان کے وطن اور اعزہ سے تو ان کو جدا ہونا ہی پڑا تھا۔ یہ مصیبت بجائے خود کیا کم تھی، مگر وہاں قیام کی صورت میں افلاس اور عادات و رسوم و اختلاف مواسم و ہوا وغیرہ کی وجہ سے بھی نئی نئی مشقتیں اٹھانی پڑیں۔ اگرچہ ہمارا خاندان غریب تھا مگر تاہم بہت سے کاروبار خانہ داری برتن مانجنا یا دھونا، جھاڑو دینا گھر میں نوکر

عورتیں انجام دیا کرتی تھیں، مگر وہاں پہنچ کر یہ سب کام بھی انھیں کو کرنے پڑتے تھے۔ کھانا پکانا تو یہاں وطن میں بھی حسب معمول غربا ان کو انجام دینا ہوتا ہی تھا۔ مزید برآں ان کو آٹا بھی خود ہی پیسنا پڑا۔ حال آں کہ یہ مشقت کبھی بھی ان کو وطن میں تحمل نہ کرنا پڑی تھی۔ والدہ مرحومہ باوجود ضعیف العمری بہت زیادہ جفاکش اور عالی ہمت تھیں اپنی ہر بہو کی اگر چہ باری مقرر کر دی تھی، مگر خود ہر ایک کے ساتھ چکی پیسنے میں اور دوسرے کاروبار میں لگی رہتی تھیں۔ علیٰ ہذا القیاس عورتوں کو اپنے اور اپنے خاوندوں اور بچوں کے کپڑے بھی دھونے پڑتے تھے۔ حال آں کہ اس کا سابقہ کبھی بھی ان کو وطن میں نہ ہوا تھا۔ مگر مدینۂ منورہ میں سب لوگ اپنے اپنے گھروں ہی میں کپڑے دھوتے ہیں۔ متوسط طبقے اور غریب طبقے والوں کی بیویاں دھوتی ہیں اور بڑے طبقے والوں کی باندیاں دھوتی ہیں۔ عموماً گھروں میں استری اور کلف کا سامان پایا جاتا ہے۔ اہل مدینہ نہایت خوش پوشاک اور خوش خوراک ہیں مگر دھوبیوں کا دستور نہیں۔

اس میں عورتوں کو ابتدا ابتدا میں ناگواری ہوئی، مگر چارہ ہی کیا تھا؟ کرنا پڑا اور آہستہ آہستہ عادت ہوگئی ہم مردوں کو بھی بسا اوقات کپڑوں کا دھونا اور مشکوں میں میٹھا پانی کندھوں پر لاد کر لانا پڑتا تھا، جس کو ہم رات کو جب کہ نہر کے مخزن کی بھیڑ کم ہو جاتی تھی انجام دیتے تھے۔ یہ کام مجھ کو اور بھائی سید احمد صاحب مرحوم کو انجام دینا پڑتا تھا کیوں کہ ایک مشک پانی جو کہ روزانہ سقے سے لیا جاتا تھا بارہ آدمیوں کے پینے اور کھانے میں ڈالنے کے لیے کافی نہ ہوتا تھا۔

کھانا بھی سرمایہ اور محاصل کی کمی کی وجہ سے نہایت معمولی ہوتا تھا۔ والد مرحوم نہایت منتظم طبیعت کے تھے۔ اکثر بازار کی سستی سے ستی ترکاری لاتے تھے اور کبھی کبھی گوشت اور اکثر دال پکتی تھی۔ روٹی اور چاول حسب عادت وطن مستعمل ہوتے تھے۔ کھجوروں کی تجارت مذکورہ میں نفع تو ہوا مگر کم؛ البتہ کھجوریں کھانے میں بہت آئیں۔

۱۳۱۸ھ کے محرم (مئی ۱۹۰۰ء) میں ایک دوسرا مکان کرائے پر لیا گیا جو کہ بہ نسبت پہلے کے زیادہ صاف اور وسیع تھا۔ سرمایہ روزانہ مصارف میں کم ہوتا گیا۔ کیوں کہ دکان کی آمدنی کم ہوتی تھی اور بہت سے لوگوں نے قرض لے لے کر ادا کرنے کا نام تک نہیں لیا۔ اس کی وجہ سے بہت زیادہ سرمایہ ضائع ہوگیا۔ ہم میں اتنی طاقت نہ تھی کہ عربوں وغیرہ سے لڑائی کریں۔ اگر ایسا نہ ہوتا تو فی الجملہ آمدنی حد کفالت تک ضرور ہوتی۔ مختلف تجربوں کے بعد ۱۳۱۸ھ کے اواخر ۱۹۰۱ء میں یہی مناسب معلوم ہوا کہ دکان اٹھالی جائے۔

ہندوستان کا سفر:

بھائی سید احمد صاحب مرحوم کو بعض نو وارد سیٹھوں کے یہاں بچوں کی تعلیم کی ملازمت مل گئی اور مجھ کو اور بڑے بھائی صاحب کو ذیقعدہ ۱۳۱۸ھ (مارچ ۱۹۰۱ء) میں سفر ہندوستان پیش آ گیا۔ ہر دو کے پاس تقریباً ساٹھ ساٹھ روپیہ سفر کے لیے تھا۔ (اس کی تفصیل علاحدہ آئے گی) یہ زمانے گھر والوں پر نہایت سخت گزرا۔ بھائی سید احمد صاحب مرحوم کی تنخواہ صرف بیس روپیہ ماہوار تھی۔ اندوختہ باقی نہ تھا۔ ہم دونوں سفر میں تھے اس لیے تنگ ہو کر والد صاحب مرحوم نے پچاس روپے ایک اپنے ملنے والے میمن سیٹھ سے قرض لیے اور اس کی دال چاول خریدی۔ ایک وقت کھچڑی اور ایک وقت نمکین پیچ پر تمام گھر والوں کا گزران کئی ماہ تک رہا۔ ہم جب کہ ہندوستان پہنچے تو والد صاحب مرحوم کے پیر بھائیوں نے جن کے والد صاحب مرحوم سے بہت زیادہ تعلقات تھے کچھ روپے آپس میں چندہ کر کے ہدیۂ والد صاحب مرحوم کو دیے ان کو ہم نے بذریعہ ہنڈی بھیجا تب والد صاحب مرحوم نے وہ قرض ادا کیا اور کسی درجے میں کھانے پینے میں وسعت کی۔ یہی چند مہینے ہمارے گھر والوں پر سختی کے مدینۂ منورہ میں گزرے ہیں۔ اس کے بعد آہستہ آہستہ فراخی ہوتی گئی۔ بحمد اللہ فاقوں کی نوبت کسی کو اور کبھی نہیں آئی حال آں کہ بہت سے لوگوں کو مہینوں فاقوں کی نوبت آئی ہے۔ قطب عالم حضرت حاجی امداد اللہ صاحب قدس اللہ سرہ العزیز کو فرماتے ہوئے میں نے خود سنا کہ ایک ہفتہ تک موصوف کو صرف زمزم کے پانی پر گزارہ کرنا پڑا۔ اس اثنا میں ایک مخلص دوست سے جو کہ بہت زیادہ اخلاص کا مدعی تھا۔ چند پیسے قرض مانگے تو اس نے ناداری کا بہانہ کر کے انکار کر دیا، حال آں کہ واقع میں نادار نہ تھا۔ حضرت قدس اللہ سرہٗ العزیز نے فرمایا کہ میں اس کے انکار سے سمجھا کہ منشاءِ الوہیت یہی ہے" اس لیے میں بھی صبر کر کے چپکا ہو گیا۔ ایک ہفتہ گزر جانے کے بعد جب کہ ضعف و نقاہت بہت زیادہ ہو گیا تھا۔ رات میں حضرت خواجہ معین الدین چشتی قدس اللہ سرہٗ العزیز کو خواب میں دیکھا ارشاد فرماتے ہیں کہ ہم نے تم کو اپنے باورچی خانہ کا ناظم اور مہتمم بنا دیا۔ صبح کو اندھیرے میں ایک شخص نے دروازہ کھٹکھٹایا، میں نے دروازہ کھولا تو اس نے ایک تھیلی دی جس میں سو ریال تھے اور پھر چلا گیا۔ اس کے بعد سے عسرت نہیں ہوئی۔ اسی طرح حضرت شاہ عبد الغنی صاحب مجددی دہلوی اور حضرت شاہ احمد سعید صاحب مجددی دہلوی قدس اللہ اسرار ہما اور ان کے خاندان والون پر عرصے تک فاقوں کی نوبتیں آتی رہیں۔ مگر ہمارے خاندان والے اس امتحان شدید سے محفوظ رہے اور ہونا بھی یہی چاہیے تھا۔ امتحان بقدر قوت ایمان ہوا کرتا ہے۔ اشد الناس بلاء الانبیاء ثم الا مثل فالا مثل (الحدیث)

حضرت قطب عالم حاجی امداد اللہ صاحب رحمۃ اللہ علیہ نے دعا بھی رخصت کرتے وقت ہمارے لیے فرمائی تھی کہ اللہ تعالیٰ اس خاندان کو امتحان شدیدہ میں مبتلا نہ فرمائے! کیا عجب ہے کہ یہ اسی کا اثر ہو۔

۱۳۱۸ھ اپریل ۱۹۰۱ء کے آخر میں جب کہ ہم سفر ہند میں تھے۔ یہ واقعہ پیش آیا کہ جس مکان میں ہم سب سکونت پذیر تھے اور امتحان کی شدید گھڑیاں گزار رہے تھے۔ اس کے مالک نے نوٹس دیا کہ سال ختم ہو رہا ہے یا تو سال بھر کا کرایہ معہ زیادتی دو ورنہ گھر خالی کر دو۔ یہ امر نہایت دشوار تھا۔ روزمرہ کا خرچ تو دو چار آنہ میں چل سکتا تھا مگر کرائے مکان سال بھر کا بجز سوا سو ڈیڑھ سو کے نہیں ادا ہو سکتا۔ اگر مرد ہی مرد ہوں تو کہیں بھی گلی کوچہ، مدرسہ یا مسافر خانہ وغیرہ میں گزر کر لیں پردہ نشین عورتوں اور بچوں کو کہاں لے جایا جائے۔ مالک مکان سے کچھ مہلت طلب کی گئی مگر وہ راضی نہ ہوا مدینہ منورہ میں بعض بعض مسافر خانے (رباطین) پردہ دار خاندانوں کے لیے وقف ہیں، مگر کوئی جگہ خالی نہ تھی۔ بہت زیادہ دوڑ دھوپ کے بعد بیرون باب مجیدی ایک مکان ایک حیدر آبادی رئیس نواب جانی میاں صاحب کا ملا جو کہ زیر تعمیر تھا۔ روپیہ ختم ہو جانے کی وجہ سے اس کی تعمیر رکی ہوئی تھی۔ اس میں متعدد کمرے پردہ دار تھے۔ اس کے متولی صاحب ڈاکٹر محمد خواجہ مرحوم حیدر آبادی نے مہربانی کر کے رہنے کو تا اجرائے تعمیر مفت دے دیا۔ اس مکان میں دروازے کھڑکیاں طاقچے وغیرہ نہیں تھے۔ صرف صدر دروازہ چیڑ کی لکڑی کا لگا ہوا تھا، مگر حضرت والد صاحب مرحوم کو یہی غنیمت معلوم ہوا۔ مالک مکان حیدر آباد ہی میں تھے۔ الحاصل تمام گھرانا یہاں آ گیا۔ اور ٹاٹ کے پردوں وغیرہ سے ہوا اور سردی و گرمی اور پردے کا تحفظ کر لیا گیا۔ مگر ان حالتوں سے حضرت والد صاحب کی سمجھ میں آ گیا کہ جس طرح بھی ممکن ہو مکان بن جانا ضروری ہے، بغیر مکان کے رہنا نہیں ہو سکتا۔ وہ اس فکر میں تگ و پو کرنے لگے۔ عمارت میں مدینہ منورہ میں بہت زیادہ خرچ ہوتا ہے اور نقد کچھ پاس نہ تھا، مگر ان کی عالی ہمتی میں کمزوری نہ ہوئی۔ ایک افتادہ زمین جس میں کسی زمانے میں کھجوروں کا باغ تھا، فروخت ہوتی ہوئی قریب میں معلوم ہوئی۔ یہ زمین حجرۂ مطہرۂ نبویہ کے خالص خادموں آغاوات حرم (خصی خادمین حجرۂ مطہرۂ نبویہ) پر وقف تھی ایسی زمینیں بیکار ہونے کے بعد بحکم قاضی فروخت کی جاتی ہیں جس میں منافع زمین فروخت کر دیے جاتے ہیں اور اصل زمین برائے وقف باقی رکھی جاتی ہے، جس کا کرایہ سالانہ خریدار کو حسب قرارداد متولی وقف دینا پڑتا ہے۔ یہ کرایہ معمولی ہوتا ہے۔ زمینیں بحسب

مخازن فروخت ہوتی ہیں (ایک مخزن بیس گز لانبا اور پانچ گز چوڑا ہوتا ہے) فی مخزن کچھ قیمت مقرر ہو جاتی ہے۔ اس زمانے میں زمینیں سستی تھیں۔ وہاں مکانات مثل ہندوستان پھیلے ہوئے صحن والے نہیں بنائے جاتے، بلکہ تین تین چار چار طبقے کے اونچے مثل بمبئی، کلکتہ وغیرہ کے بنائے جاتے ہیں۔ اس لیے اگر کوئی پھیلا ہوا مکان بنائے بھی، تو اولاً گرانی زمین کی وجہ سے خرچ زیادہ پڑتا ہے۔ ثانیاً اردگرد کے اونچے مکانات کی وجہ سے پردہ محفوظ نہیں رہ سکتا۔ چوں کہ اس وقت والد صاحب مرحوم کے پانچ بیٹے اور ایک بیٹی تھی اس لیے اتنا بڑا قطعہ خریدنا ضروری ہوا جس میں چھ مکان بن جائیں۔ چناں چہ ایک نقشہ بنا کر اتنا بڑا قطعہ خرید لیا۔ اس قطعے میں باغ کا اصلی کنواں اور مٹی کا بہت بڑا ڈھیر بھی پڑتا تھا جو کہ زمانۂ قدیمہ میں باغ کی عمارت کا گرا ہوا ڈھیر تھا۔ روپیہ پاس نہ تھا مگر جب حضرت والد صاحب مرحوم نے سفر سے بچا ہوا سرمایہ تقسیم کیا تھا تو بہن (ریاض فاطمہ مرحومہ) کا حصے بھی لگایا تھا۔ سبھوں کا روپیہ تو ضروریات میں خرچ ہوتا رہتا تھا، مگر س کا حصے اس کے نکاح کے مصارف کے لیے محفوظ رکھا تھا۔ اس میں سے پانچ سو روپیہ قرض لے کر زمین کی قیمت میں ادا کیا گیا۔ ایک اور مشکل حائل تھی کہ حسب قوانین دولت ترکیہ کسی غیر رعایا کو کوئی ملکیت حاصل کرنے کا اختیار نہ تھا۔ رعیت نامہ حاصل کرنے کے لیے عرصہ درکار تھا، اس لیے فوری کارروائی یہ کی گئی کہ زمین بنام ڈاکٹر رفاقت علی صاحب مرحوم خریدی گئی (۱) اور بیع نامہ انھیں کے نام رجسٹری کرالیا گیا اور ادھر رعیت نامہ کی درخواست دے دی گئی۔ چوں کہ کسی انگریزی یا دوسری حکومت کی رعیت کے لیے اسی وقت رعیت نامہ دیا جاسکتا تھا۔ جب کہ اس کی سابقہ حکومت اجازت دے دے اور دعوے دار نہ ہو۔ اس لیے وہ عرضی جدہ میں انگریزی وائس کونسل کے پاس باضابطہ بھیجی گئی اور وہاں سے بعد از استصواب حکومت ہند تحریر آئی کہ ہم کو کوئی اعتراض نہیں ہے۔ تب حضرت والد صاحب مرحوم کے نام پر رعیت نامہ جاری کیا گیا۔ اس میں تقریباً چھ مہینہ یا زیادہ عرصہ لگ گیا۔ رعیت نامہ آجانے کے بعد ڈاکٹر صاحب مرحوم نے زمین کا بیع نامہ حضرت والد صاحب مرحوم کے نام کر دیا، اسی زمانے میں وہ روپیہ جو والد صاحب مرحوم کے پیر بھائیوں اور احباب نے دیا تھا اور ہم نے ہنڈی کر کے بھیج دیا تھا پہنچ گیا، جس سے ہمشیرہ مرحومہ کا روپیہ بھی ادا کر دیا گیا اور مٹی کے ڈھیر سے پکی اینٹیں تھپوالی گئیں۔ اس ڈھیر میں دبے

---

(۱) مولانا عبدالحق صاحب مدنی مہتمم مدرسہ شاہی مسجد مراد آباد کے والد ماجد۔ یہ اصل باشندے دیوبند کے تھے، مگر عرصہ دراز سے مدینہ منورہ میں مقیم تھے اور حکومت ترکیہ میں بعہدۂ ڈاکٹر افواج ملازم اور میجری کا رتبہ رکھتے تھے۔

ہوئے بہت سے پتھر قدیم عمارت کے نکلے جو کہ عمارت میں کام آئے اور بہت مفید ثابت ہوئے اور تھوڑے سے پتھر خرید بھی لیے گئے اور ضروری سمجھا گیا کہ تمام قطعۂ زمین کا احاطہ بنوالیا جائے چناں چہ ہمارے پہنچنے سے پہلے تمام زمین کا چاروں طرف احاطہ بنوالیا گیا۔ بنیادوں میں پتھر لگائے گئے، اور اوپر کی دیوار پکی اینٹوں کی تقریباً بارہ تیرہ فٹ یا زیادہ اونچی بنوائی گئی جس سے تمام قطعے کی زمین محفوظ اور مستور ہوگئی۔

ہم دونوں بھائی جب کہ ۱۳۲۰ھ کے محرم (اپریل ۱۹۰۴ء) میں گنگوہ شریف سے واپس حج بدل وعمرہ ادا کرتے ہوئے، مدینۂ منورہ پہنچے تو یہ احاطہ بنا ہوا تھا۔ (ہماری واپسی ہندوستان سے حج بدل پر ہوئی تھی۔ بجز اس کے کوئی صورت واپسی کی قلت سرمایہ کی وجہ سے نہیں ہوسکتی تھی۔ حضرت گنگوہی قدس اللہ سرہٗ العزیز ہی نے یہ دونوں حج بدل اپنے بعض رشتہ داروں کے دلوائے تھے جس میں مدینۂ منورہ تک پہنچ جانے کا صرفہ تھا) اس وقت تمام خاندان ان حیدر آبادی رئیس کے مذکورہ بالا مکان میں مقیم تھا۔ مدینۂ منورہ پہنچنے کے بعد میں شمسیہ باغ معروف بہ توطیہ کے مدرسہ میں (جس کو اس زمانے ہی میں جاری کیا گیا) بعہدۂ مدرسی پچیس روپے ماہوار پر ملازم ہوگیا۔ بڑے بھائی صاحب مرحوم بھی ایک نو وارد، سورتی سیٹھ کے یہاں اس کے بچوں کی تعلیم کے لیے ملازم ہوگئے۔ میں نے اس زمانے میں مشغلہ کتابت ترک کردیا اور چوں کہ طلبہ کا ہجوم ہوا اس لیے خارج از مدرسہ اوقات میں حرم محترم نبوی میں کتابیں پڑھانے لگا۔ صبح کی نماز کے بعد، عصر کے بعد، مغرب کے بعد، بلکہ عشاء کے بعد بھی مختلف علوم وفنون کی کتابیں شروع کرادیں۔ اب اس وقت میں طلبہ کی مقدار زیادتی کی وجہ سے لوگوں کی آنکھیں اٹھیں اور تنقیدات کا ارادہ کیا گیا، مگر چوں کہ زبان عربی صاف ہوچکی تھی اور ابتدائی کتابیں منجھ گئی تھیں، ادھر میں نے حافظے کی تقویت کے لیے علمائے خیرآباد کا طریقے اختیار کیا تھا کہ نفس کتاب یا شرح یا حاشیہ پڑھاتے وقت سامنے نہ رکھتا تھا، بلکہ طالب علم کی قرأت عبارت کے بعد مسائل پر تقریر کرتا اور سمجھاتا تھا، گھر پر کتاب اور اس کی شروح وحواشی خوب دیکھ کر مسائل کو منضبط کر کے جاتا تھا (حال آں کہ علماء مدینۂ وغیرہ نہ صرف کتاب بلکہ اس کی شرح بھی ہاتھ میں لے کر پڑھایا کرتے تھے اور تقریر کرتے وقت اکثر عبارت شرح یا حاشیہ کی سنادیتے تھے۔ بالعموم یہی طریقے رائج تھا۔ البتہ خاص خاص ماہر حضرات بلا کتاب پڑھاتے تھے، مگر ان کے پاس نہ تمام علوم وفنون کی کتابیں ہوتی تھیں اور نہ وہ زیادہ وقت صرف کرتے تھے۔) اس لیے عام طلبہ اور علماء میں دھاک بیٹھ گئی اور سمجھنے لگے کہ اس کو تمام فنون

درسیہ میں نہ صرف مہارت رہے، بلکہ محفوظ بھی ہیں۔ اسی بناء پر سمجھ دار اور جد و جہد کرنے والے طلبہ کا اجتماع میرے پاس بہت زیادہ ہوگیا، جس سے متعدد مدرسین حرم محترم کو حسد ہوا اور رقابت بھی پیدا ہوگئی۔ ناظر مدرسہ شمسیہ باغ کو اصرار تھا کہ جو طلبہ تجھ سے پڑھتے ہیں وہ مسجد نبوی میں نہیں، بلکہ مدرسے میں آ کر پڑھا کریں، مگر سب طلبہ اس پر راضی نہ ہوئے۔ طلبہ صرف اہل مدینہ ہی نہ تھے، بلکہ ترک، بخاری، قازانی، قزق، ترکستانی، کابلی، مصری وغیرہ بھی تھے۔ ناظر مدرسہ کا یہ بھی اصرار تھا کہ خارج از مدرسہ اوقات میں کہیں بھی نہ پڑھایا جائے۔ اس قسم کی چند اور باتیں پیش آئیں جن کی وجہ سے بہ مجبوری مدرسے کی ملازمت سے استعفاء دینا پڑا اور یہ ارادہ کرلیا گیا کہ لوجہ اللہ بلا معاوضہ حرم محترم میں اسباق پڑھائے جائیں اور رزق کو اس کے کفیل جناب باری عز اسمہ کی کفالت پر رکھا جائے چناں چہ استعفاء دینا پڑا اور کتب درسیہ کا میدان وسیع کردیا گیا۔ حضرت گنگوہی قدس اللہ سرہٗ العزیز کی بارگاہ میں ان اسباق کی فہرست اور مشاغل کی تفصیل لکھی اور یہ عرض کیا کہ جو تعلیم طریقت کے شغل کی عالیجاہ نے فرمائی ہے، جب اس کے لیے بیٹھتا ہوں تو نیند غالب آجاتی ہے۔ نیز خطرات اور وساوس سخت پریشان کرتے ہیں۔ ادھر طلباے علوم کا اصرار بہت زیادہ ہے، مجبور ہو کر میں نے دن ورات کا اکثر حصے اسی میں صرف کر رکھا ہے جواب میں حضرت رحمۃ اللہ علیہ نے ارشاد فرمایا کہ پڑھاؤ، خوب پڑھاؤ۔ اس سے ہمت زیادہ بڑھ گئی۔ روزانہ چودہ اسباق پڑھاتا تھا پانچ سبق صبح کو، تین یا چار ظہر کے بعد، دو عصر کے بعد، دو مغرب کے بعد، ایک عشاء کے بعد۔ وہاں ظہر کی نماز زوال ہوتے ہی پڑھی جاتی ہے اور عصر کی بعد مثلین ہوتی ہے اس لیے ظہر اور عصر کے درمیان میں بہت وسیع وقت ملتا ہے۔

ڈاکٹر محمد خواجہ صاحب مرحوم ناظر مدرسۂ شمسیہ کو ان کی عدم تابعداری اور استعفاء کی وجہ سے کاوش ہوگئی اور انھوں نے نوٹس دے دیا کہ مکان خالی کردو، ہم کو تعمیر کرانی ہے! ایک مہینہ کی مہلت تم کو دی جاتی ہے۔ اس بناء پر والد صاحب مرحوم نے ضروری سمجھا کہ احاطۂ مذکور میں ہی چند کمرے گزران کے لائق، اپنے ہاتھوں سے بنالیے جائیں کیوں کہ نہ کسی مکان کے مستقل کرائے پر لینے کی طاقت ہے اور نہ مکان بنوانے کی! سرمایہ کوئی نہ تھا اور اگر کچھ ہوتا بھی تو دوسرے مکان میں خرچ کرنے سے بہتر اپنے مکان میں خرچ کرنا تھا۔ کچی اینٹیں تھپوائی ہوئی موجود تھیں عورتوں اور بچوں کو لے کر روز وہاں جاتے تھے اور خود اپنے ہاتھ سے دیوار بناتے تھے اور ہم تینوں اینٹیں ڈھوتے تھے اور عورتیں گارا لاتی تھیں۔ الحاصل اسی طرح احاطے کے جانب شرقی شمالی میں

پانچ کوٹھریاں، ایک غسل خانہ، ایک پاخانہ اور ایک پردے کی دیوار ان تمام کوٹھریوں کے سامنے اپنے ہی ہاتھوں سے سب نے مل کر بنائی۔ کوٹھریوں کی دیواریں کچی اینٹوں کی تھیں۔ چھت اتنی اونچی بنائی گئی کہ اگر چارپائی پر کھڑے ہوں تو سر چھت پر نہ لگے مگر زیادہ نیچی بھی نہ رہے۔ کڑی کی جگہ ببول کی موٹی موٹی شاخیں جو کہ بدوی لوگ شہر فروخت کرنے کے لیے لاتے ہیں دور دور لگائی گئیں اور ان پر کھجور کے پتوں کے ڈنٹھل قریب قریب بچھائے گئے اور ان پر کھجور کے بوریے بچھا دیے گئے اور ان پر گارا (تر مٹی) بچھا کر خشک مٹی ڈال دی گئی۔ چھت اتنی مضبوط نہ تھی کہ بلا تکلف اس پر آدمی چل سکے اور نہ اتنی موٹی تھی کہ زور کی بارش کو روک سکے۔ چھپر کی طرح ڈھلوان رکھی گئی تھی۔ اس طرح پر دھوپ اور سردی سے حفاظت ہوگئی۔ معمولی بارش کی بوندوں سے بھی حفاظت ہوتی تھی۔ مگر زور کی باش میں (جو کہ مدینۂ منورہ میں بہت کم ہوتی ہے) سب پانی اندر آتا تھا۔ اس طرح پر جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے حجرات کی مشابہت حاصل ہوگئی تقریباً پندرہ بیس روز کی محنت و مشقت میں یہ تعمیر پوری ہوگئی۔ پڑھنا پڑھانا ان دنوں بالکل بند کر دیا گیا تھا۔ زیادہ تر محنت حضرت والد صاحب مرحوم کرتے تھے وہ اگرچہ ضعیف العمر تھے مگر عالی ہمت اور جفاکش ہم نوجوانوں سے بہت زیادہ تھے۔ ان سے بلا مشغلہ بیٹھا نہیں جاتا تھا۔ اس عمارت کے تیار ہو جانے پر ہم سبھوں کو اس قدر خوشی ہوئی جو حد بیان سے باہر تھی۔ گویا ہم سب قید غلامی سے آزاد ہوگئے۔ اپنے مکان میں جہاں چاہیں بیٹھیں، جہاں چاہیں سوئیں، جہاں چاہیں پانی گرائیں۔ روشنی کھلی ہوئی تھی۔ ہوائیں بڑے صحن دار مکان کی طرح آتی تھیں، کوئی ٹوکنے اور کہنے والا نہ تھا۔ کرایے کا فکر اور تقاضوں کا کھٹکا باقی نہ رہا تھا۔ پانی بھی اس کنویں کا تقریباً شیریں تھا۔ صرف پینے اور کھانے پکانے کے لیے ایک مشک پانی سقہ لاتا تھا۔ الحاصل بہت زیادہ اطمینان کی صورت یہاں پیدا ہوگئی اور سابقہ مکان کو (جس میں پہلے سے رہتے تھے) ایک مہینہ کی میعاد سے پہلے ہی ترک کر کے یہاں چلے آئے۔ ان ہی کوٹھریوں میں نہایت آزادی اور ہشاشی و بشاشی کے ساتھ کئی سال متواتر جب تک احاطہ کے جنوب و مغرب والے مکان کے دو طبقہ مکمل و تیار نہ ہوگئے رہنا ہوا۔ اس تعمیر کو دیکھ کر اور لوگوں کو بھی شوق پیدا ہوا اور اردگرد میں تھوڑے ہی عرصے میں متعدد عمارتیں بن گئیں اور آبادی روز افزوں ترقی کرنے لگی۔ زمینیں گراں ہوگئیں، بالخصوص جب کہ ریل آگئی تو اس طرف کی آبادی بہت زیادہ بڑھ گئی۔ افسوس کہ شریف حسین کے فتنہ کے بعد یہ تمام حصہ اجاڑا گیا اور اس قدر بدامنی بعد کے زمانے میں پھیلی کہ وہاں بود و باش مشکل ہوگئی۔'' (نقش حیات: حصہ اول، صفحہ ۶۸۔۶۹)

وظائف کا ہم لوگوں کے بے تقرر:

میں پہلے عرض کر چکا ہوں کہ عموماً اہل مدینہ کی گزران کا ذریعہ ان کے وہ وظائف ماہانہ یا سالانہ تھے جو کہ دولت عثمانیہ ترکیہ یا دوسری اسلامی ریاستوں اور امراء وغیرہ کی طرف سے آیا کرتے تھے اور لوگوں کو مختلف حیلوں سے دیے جاتے تھے۔ مسجد نبوی (علی صاحبہ الصلوٰۃ والسلام) میں تقریباً ڈیڑھ سو یا اس سے زائد اذان دینے والے مقرر تھے، دو سو سے زائد امام تھے جن میں تقریباً ستر اشخاص خطیب تھے۔ سال میں ایک مرتبہ خطیب کی باری آتی تھی اسی طرح مسجد شریف میں جھاڑو دینے والوں، روشنی کرنے والوں، حجرۂ مطہرۂ نبویہ کی خدمت کرنے والوں، عمارتی کاموں کو انجام دینے والوں وغیرہ وغیرہ کی بہت بڑی تعداد تھی جن کی بڑی بڑی تنخواہیں خزینۂ جلیلہ (محکمۂ اوقاف حرم محترم نبوی) سے جاری تھیں۔ یہ اوقاف سلاطین آل عثمان اور دیگر امرائے بلاد اسلامیہ کی طرف سے ممالک ترکیہ اور عربیہ وغیرہ میں زیر نظارتِ حکومتِ ترکیہ تھے۔ اسی طرح اور بہت سے امرائے اسلام کی طرف سے خصفے تھے۔ وہاں خصفہ اس جماعت کو کہتے ہیں جو کہ وقت معین پر مسجد نبوی میں جمع ہو کر قرآن مجید، بخاری شریف، دلائل الخیرات یا حزب اعظم وغیرہ پڑھ کر صاحب خیرات کے لیے دعا کرتی ہے اور ماہوار ان کی تنخواہ جاتی ہے۔ اس دعا گوئی کی جماعتوں کی بہت بڑی تعداد ہمیشہ رہتی تھی۔ اگرچہ مدینۂ منورہ میں تجارت اور زراعت پیشہ لوگ بھی بڑی تعداد میں موجود ہیں اور اس زمانے میں بھی تھے۔ مگر وہاں کی تجارت اور زراعت اور دیگر پیشے اس قدر کمزور تھے کہ وہاں کی گرانی اور اعلیٰ معیارِ معیشت کو جو کہ وہاں کے لوگوں میں بہت زیادہ پھیل گیا تھا متحمل نہیں ہو سکتے تھے۔ اور یہی وجہ ہے کہ حجاج کی آمد کے وقت اکثر لوگ سائل اور بھیک مانگنے والے نظر آتے ہیں۔ ان کے معیشت کے اعلیٰ معیار کے لیے یہ آمدنیاں بھی کافی نہیں ہو سکتیں اور یہی وجہ ہے کہ اکثر اہل مدینہ مقروض ہو کر دیار اسلامیہ کا سفر کرتے ہیں اور مسلمانوں سے استدعاء اعانت و امداد کرتے ہیں۔ زمانہ ہائے سابق میں معیار معیشت نہایت سادہ اور قلیل المصارف بدویانہ تھا۔ اس لیے وہ ایسے شرمناک اطوار اختیار نہ کرتے تھے اور قناعت وصبر کی زندگی جفاکشی اور محنت کا طریقے اختیار کیے ہوئے تھے۔

زراعت میں صرف وہی شخص کامیاب ہو سکتا ہے، جس کے پاس سرمایہ بھی ہو اور خود اپنے اور اپنے اہل وعیال کی ساتھ دن رات زراعت میں لگا رہے۔

افسوس کہ جنگ عمومی کے بعد جب کہ حکومت ترکیہ کا تعلق حجاز، شام، فلسطین، عراق سے اُٹھ گیا اور شریف حسین اور عربوں کی غداری نے عالم اسلامی اور بالخصوص ملک عرب کو اعدائے اسلام

کے آہنی پنجوں میں ڈال دیا تو یہ وجوہ وظائف و خیرات اور آمدنی واوقاف ممالک ترکیہ سب بند ہوگئیں، استنبول او ایشیائی روم کے اوقاف پر نئی حکومت ترکیہ نے قبضہ کرلیا اور ان کو قومی اور ملکی مصارف میں صرف کرنے لگے جو وظائف سلاطین آل عثمان اپنی جیب خاص سے اہل حرمین کو دیتے تھے۔ جس میں بڑا حصے اہل مدینہ کا تھا وہ بوجہ ابطال ملوکیت سب بند ہوگیا۔ شام کے اوقاف پر فرانس نے قبضہ کرلیا۔ وعلیٰ ہذا القیاس، عراق اور فلسطین وغیرہ میں بھی ایسی ہی صورتیں پیش آئیں اس لیے اہل حرمین کی حالت ناگفتہ بہ ہوگئی۔

ریاست بھوپال اور حیدر آباد سے بھی خصفے وہاں جاری تھے، بالخصوص رئیس بھوپال نواب سلطان جہاں بیگم مرحومہ کے جانے کے بعد بھوپال سے یہ خیرات بہ نسبت سابق زیادہ ہوگئی تھی مکہ معظمہ میں تو اس کا سلسلہ نواب سکندر جہاں بیگم مرحومہ والدہ ماجدہ نواب شاہ جہاں بیگم مرحومہ والیہ ریاست بھوپال کے زمانے سے جاری تھا، مگر مدینہ منورہ میں بہت تھوڑی مقدار پر نواب شاہ جہاں بیگم نے جاری کیا تھا۔ ریاست حیدر آباد کی طرف سے پہلے سے بڑے پیمانے پر اس قسم کے خیرات کی مختلف سلسلے جاری تھے۔ رباطین، مسافر خانے، ہسپتال وغیرہ خود ریاست کی طرف سے بھی اور بعض بعض امرائے ریاست کی طرف سے بھی جاری تھے۔ ہندوستانی مہاجرین اور مقیمین حرمین شریفین کی ان وسائل سے عموماً پرورش ہوتی تھی۔ خلاصہ یہ کہ عموماً اہل مدینہ منورہ کے معاشیات کا دارومدار ان ازمنہ اخیرہ میں بالخصوص سلطان عبدالحمید خاں مرحوم کے زمانے سے وظائف پر ہوگیا تھا۔ اعلیٰ طبقے کے لوگ دیگر ذرائع کی طرف بہت ہی کم توجہ کرتے تھے۔ اس سے پہلے زمانے میں آبادی بھی کم تھی اور حجاز کی کفالت دولت مصریہ کے سپرد تھی وہاں کے ترکی گورنر اور خدیوی یکے بعد دیگرے متعدد اوقاف کی آمدنیوں سے حجاز کی خبر گیری رکھتے تھے۔ وقفی زمینوں سے خاندانوں کے نام گیہوں کی مقداریں سالانہ جاری تھیں۔ اس مقدار کو اروب کہتے تھے۔ (ایک اروب غالباً چوبیس مد کا ہوتا ہے اور ایک مد چھ سیر پختہ کا ہوتا ہے) اس طرح سے کسی کے نام ایک، کسی کے نام دو یا زیادہ اروب سرکاری دفتر میں لکھے ہوئے تھے۔ سالانہ یہ غلہ مصر سے آتا تھا اور ایک مخزن میں جس کو شونہ کہتے تھے جمع کیا جاتا تھا اور حسب کا غذات اہالی مدینہ منورہ اور اہالی مکہ کو تقسیم کر دیا جاتا تھا۔ بدوؤں کے قبائل کے لیے بھی اسی طرح غلہ مقرر تھا۔ علاوہ ازیں بدوی قبائل کے لیے نقد بھی مقرر تھا۔ جو کہ محمل شامی کے ساتھ (استنبول اور شام و روم کے اوقاف وغیرہ سے) اور محمل مصری کے ساتھ (مصر کے اوقاف وغیرہ سے) آتا تھا اور ہر منزل پر بدوی قبائل کے

شیوخ کو اور بعض بعض کو مکۂ معظمہ یا مدینۂ منورہ میں دیا جاتا تھا۔ ان وظائف اور غلہ جات سے صرف بدوی قبائل کی پرورش ہی مقصود نہ تھی بلکہ یہ بھی مقصود اعظم تھا کہ یہ حجاج وزوار کو نہ ستائیں، بلکہ ان کی حفاظت کے ذمہ دار بنیں۔ زمانۂ سابق میں لوٹ مار کرنے والے قبائل نے اپنے افلاس کا اظہار کر کے لوٹ مار کا سبب یہی بتایا تھا اس لیے سلاطین سابقہ نے ان کے لیے یہ وظائف مقرر کر دیے تھے، تا کہ بسر اوقات کی صورت ہو اور قبائل حجاج کو نہ ستائیں زیادہ خرابیاں حجاز میں جو بدوی قبائل سے ظہور میں آتی رہیں ان کا سبب بھی یہی ہوا کیوں کہ شرفائے مکۂ جو کہ حکومت مصریہ اور بعد کو حکوت ترکیہ کی طرف سے مقرر ہوئے تھے اور قبائل عربان (بدوی) اور اہل حجاز کی نگرانی ان کے ذمے کی جاتی تھی، وہ جائز یا ناجائز وجوہ سے یہ مقررہ وظائف قبائل کو وقت پر نہیں پہنچاتے تھے۔ اس لیے وہ قبائل قوافل حجاج کو لوٹتے تھے۔ اگر یہ چیز سلاطین سابقہ سے مقرر ہوئی ہوتی یا مقرر ہونے کے بعد وقت پر پہنچتی رہتی تو یہ مشکلات پیش نہ آتیں۔

چناں چہ عثمان پاشا مرحوم جب کہ والی حجاز مقرر ہوا تو اس نے شریف مکۂ کے اختیارات میں مداخلت کر کے ان کو عضو مفلوج بنا دیا اور تمام قبائل بدویہ کا مقررہ وظیفہ ان کے منازل میں پہنچانے کا انتظام دائمی کر دیا۔ اس کا اثر اس قدر قوی ہو گیا کہ لوٹ وغارت بالکل بند ہو گئی اور امن کامل حجاز میں ایسا پھیل گیا کہ حجاج وزوار ایک ایک دو دو اونٹ پر سفر کرتے تھے اور کوئی گزندان کو نہیں پہنچتا تھا۔ حکومت اسلامیۂ مصریہ اور ترکیہ نے اپنے تمام قلمرو میں ہتھیار کی آزادی دے رکھی تھے۔ اس لیے بدوی قبائل بارہا حکومت کے مقابلے پر بھی آجاتے تھے اور کشت وخون کی نوبت آتی تھی۔ آج بھی حکومت سعودیہ نے اسی قسم کا مکمل امن وامان قائم کر دیا جو کہ عثمان پاشا کے زمانے میں تھا مگر یہ سیاست دہشت کی اور جابرانہ ہے، جس کو ترکی حکومت نے ممالک اسلامیہ میں کبھی جاری نہیں کیا بہ مجبوری کبھی کبھی ایسی دہشت کی نوبتیں آتی تھیں، مگر بہت کم اور اس میں بھی جانب لطف ومرحمت ملحوظ رہتی تھی۔ سعودی حکومت نے شریر اور سر برآوردہ فسادی لوگوں کو قتل کر دیا اور تمام قبائل سے ہتھیار چھین لیے اور پولیس وفوج کی شدید نگرانی قائم کر دی جس کی وجہ سے حجاز کی کایا پلٹ ہو گئی اور مکمل امن وامان کا دور دورہ ہو گیا۔ موجودہ بدوی قبائل اور عربی طبائع کے لیے ہمیشہ سے یہی طریقہ موزوں ہے۔

علاوہ ازیں حکومت مصریہ کا دونوں جگہوں (مکۂ معظمہ اور مدینۂ منورہ) میں مستقل لنگر خانہ قائم تھا اور اب تک قائم ہے، جس میں روزانہ فقراء اور مساکین کو صبح کو روٹی اور شوربا تقسیم کیا جاتا

ہے۔ اس لنگر خانے کو تکیۂ مصریہ کہتے ہیں۔ اس کی نہایت شاندار اور وسیع عمارت مدینۂ منورہ میں باب العنبریہ کے پاس قشلہ کے مقابل موجود ہے اور اسی طرح مکۂ معظمہ میں بھی ہے۔ بہت سے مساکین صرف اسی پر گزران کر لیتے ہیں۔

خلاصہ کلام یہ کہ ۱۳۲۰ھ (۳-۱۹۰۲ء) ہی میں بعض کرم فرماؤں کی عنایت و توجہ سے حضرت والد صاحب مرحوم کے لیے پندرہ بیس روپیہ ماہوار کا وظیفۂ دعا گوئی بھوپال سے مقرر ہو گیا۔ جس سے بڑی ڈھارس پیدا ہو گئی۔

نواب سلطان جہاں بیگم مرحومہ کی آمد پر لوگوں نے ان کو ختمہ بنانے کی ترغیب دی۔ چناں چہ انھوں نے دس بارہ آدمیوں کو بخاری شریف روزانہ پڑھنے اور دعا کرنے کے لیے مقرر کیا۔ ان میں کچھ لوگ اہل مدینہ تھے اور کچھ ہندوستانی۔ ہندوستانیوں میں بڑے بھائی صاحب کا اور میرا نام بھی تھا اور کچھ عرصے بعد بھائی سید احمد صاحب کا نام بھی آ گیا تھا۔ ہر شخص کو دس دس روپیہ ماہوار مقرر کیا گیا تھا۔ بعض لوگوں کو خصوصی وظائف بھی بیگم صاحبہ مرحومہ نے مقرر فرمائے تھے۔ مسجد نبوی میں ٹھنڈے پانی کی سبیل بھی بیگم صاحبہ مرحومہ نے جاری فرمائی تھی۔ چوں کہ نقشوں کا مرتب کرنا اور خط و کتابت اور مراسلات وغیرہ کو انجام دینا ناظر ایصال وظائف مدینۂ منورہ شیخ حسن عبدالجواد صاحب سے نہیں ہو سکتا تھا، وہ اردو نوشت و خواند اور حساب سے واقف نہ تھے، اس لیے محرر کی ضرورت پڑی اور انھیں کی درخواست پر مجھ کو پندرہ روپے ماہوار پر یہ خدمت بھی سپرد کی گئی۔ میں تعطیل کے ایام میں یعنی جمعہ اور سہ شنبہ کو اس کو ہمیشہ انجام دیتا تھا۔ کیوں کہ حرمین شریفین میں ہفتے میں یہ دو دن تعطیل کے ہوتے ہیں۔ ان میں درس و تدریس عام طور پر نہیں ہوتی۔ پھر آخر میں میرا نام ختمہ میں باقی نہیں رہا، بلکہ پوری تنخواہ چوبیس روپے ماہوار انھیں تحریرات کے سلسلے میں کر دی گئی۔ نواب بہاول پور مرحوم بھی بہ سلسلۂ زیارت حرمین و حج و عمرہ تشریف لے گئے تو مولانا صاحب مرحوم (۱) وزیر اعظم ریاست کی سعی سے دس روپے ماہوار مقرر ہو گئے، مگر یہ رقم سالانہ سالگرہ کے جشن پر آیا کرتی تھی۔ ....

مدینۂ منورہ پہنچنے کے بعد بھی ایک عرصے تک تمام کاروبار خانہ داری مشترکہ تھا۔ والدۂ ماجدہ مرحومہ نے اپنی تینوں بہوؤں میں باری مقرر کر رکھی تھی۔ کھانا سب ایک ہی جگہ پکتا تھا۔ والدہ

(۱) مولانا رحیم بخش صاحب مرحوم منصب وزارت کے علاوہ ویسے بھی ریاست کے معاملات میں بہت دخیل تھے۔ مولانا موصوف حضرت گنگوہی قدس اللہ سرہ العزیز کے متوسلین میں سے تھے اور نواب صاحب مرحوم کی آمد سے پہلے ہی مدینۂ منورہ آ چکے تھے۔ اس لیے آپ سے کچھ شناسائی پہلے سے تھی۔ منہ

صاحبہ تقسیم فرمادیا کرتی تھیں۔ باری والی عورت پخت وپز کے تمام کام اپنی باری پر انجام دیتی تھی اور زاید مشاغل میں سب شریک رہتی تھیں، مگر طبعی طور پر ان نئی عورتوں میں کچھ تنافس اور تنافر کی نوبت آئی، بالخصوص اس بناء پر کہ بھائی سید احمد صاحب مرحوم کی اہلیہ مرحومہ والدہ ماجدہ مرحومہ کی حقیقی بھتیجی تھیں اور باقی ماندہ دو عورتیں اجنبی خاندانوں کی تھیں۔ اس لیے وہ چاہتی تھیں کہ تمام نظام خانہ داری ہر ایک کا علاحدہ کردیا جائے۔ مگر سرمایے کی کمی اس کی اجازت نہ دیتی تھی۔ ناگوار امور پر صبر کرنا اور کرانا ضروری سمجھا جاتا تھا جب کہ ہم دونوں بھائی سفر گنگوہ شریف میں تھے ایک روز والدہ ماجدہ مرحومہ نے خواب میں دیکھا کہ حجرہ مطہرہ نبویہ (علیٰ صاحبہا الصلوٰۃ والسلام) میں قبر شریف پر چارپائی بچھی ہوئی ہے اور اس پر جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم لیٹے ہوئے آرام فرما رہے ہیں اور والدہ ماجدہ پیچھے بیٹھی ہوئی آپ کی کمر دبا رہی ہیں۔ یکایک سامنے سے بڑے بھائی صاحب مرحوم کی اہلیہ (وحید مرحوم کی والدہ) آئیں تو جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے والدہ ماجدہ کو مخاطب کرکے فرمایا کہ تم ان کو جدا کیوں نہیں کردیتی ہو۔'' یہ خواب والدہ صاحبہ نے صبح کو والد ماجد سے ذکر کیا تو اسی روز والد صاحب نے سب کو جدا کردیا۔ مگر چوں کہ بھائی سید احمد صاحب کی اہلیہ خواہش مند نہ تھیں اور قرابت قریبہ کی وجہ سے کوئی گرانی ان پر نہ آتی تھی اس لیے وہ والدہ ماجدہ ہی کے ساتھ رہیں۔ جو جو جنسیں غلہ وغیرہ اور گوشت ترکاری اور دیگر ضروریات کی آتی تھیں خام تقسیم کردی جاتی تھیں۔ بعد اجرائے وظائف بھی عرصے تک یہ طریقہ جاری رہا۔ مگر بعد میں والد صاحب نے ارشاد فرمادیا کہ اپنی اپنی آمدنی کو اپنی ضروریات میں خرچ کرو۔

پختہ مکانوں کی تعمیر:

اگرچہ فوری طور پر جلدی میں..... چند کوٹھریاں اپنے ہاتھوں بنالی گئی تھیں، مگر یقیناً ان میں گزران نہیں ہوسکتی تھی۔ گرمی کے زمانے میں مدینۂ منورہ کی لو اور شدت تمازت میں ان میں بسر کرنا از حد مشکل تھا۔ علی ہذا القیاس سردی۔ کے شدت کے زمانے میں اور زور کی بارش میں! اس لیے ضروری تھا کہ پختہ مکان بنایا جائے اور جلد بنایا جائے۔ اس لیے اس کی طرف پوری توجہ والد صاحب مرحوم نے اسی وقت سے کردی۔ جو رقوم ان کے پیر بھائی اور احباب ہندوستان سے بھیجتے تھے یا جو رقوم ہمارے بعض احباب وغیرہ موسم حج وزیارت میں دے جاتے یا اور کوئی بالائی آمدنی ہوجاتی تھی۔ اس کو روزمرہ کے مصارف خانہ داری میں صرف نہیں کرتے تھے، بلکہ تعمیر ہی میں لگانا ضروری سمجھتے تھے۔ جس کی وجہ سے نہایت تنگی اور نہایت معمولی غذا پر سب کو بسر کرنا پڑتا تھا۔ کبھی

پتھر خرید لیے۔ مدینۂ منورہ کے شرق اور غرب اور جنوب میں زمین دوز سنگ خارا کے پہاڑ ہیں انھیں کو حرہ اور لابہ کہتے ہیں۔ یہ پتھر سیاہ اور نہایت سخت ہوتے ہیں انھیں سے مدینۂ منورہ کی عمارتیں بنائی جاتی ہیں۔ اونچے پہاڑ بھی قریب میں واقع ہیں۔ بالخصوص سلع مگران کے پتھر سنگ خارا کی قسم کے نہیں ہیں اور نہ اتنے مضبوط ہیں۔ پتھروں کی تجارت اور گھڑائی کرنے والے انھیں زمین دوز حروں میں سے بارود سے پتھروں کو توڑ کر پھر پتھروں سے ٹکڑے کر کے گدھوں اور خچروں پر لادتے اور مواضع تعمیر تک پہنچاتے ہیں اور فی حمل (بوجھ) بھاؤ مقرر ہو جاتا ہے۔

کبھی لکڑی خرید لی۔ مدینۂ منورہ میں لکڑیوں کے لیے کھجوروں کے تنے عموماً کام میں آتے ہیں اور مضبوط ہوتے ہیں جو لوگ بہت زیادہ امیر ہیں اور اپنی عمارت امیرانہ بنوانا چاہتے ہیں وہ چھت میں جاوی لکڑیاں تین تین چار چار انچ موٹائی والی لگاتے ہیں۔ چوں کہ یہ جاوی لکڑیاں بہت گراں پڑتی ہیں، اس لیے عام طور پر کڑیوں میں استعمال نہیں ہوتیں، البتہ دروازوں، کھڑکیوں، طاقچوں اور طاقوں، روشندانوں وغیرہ میں جاوی ہی لکڑیاں مستعمل ہوتی ہیں۔ معمولی اور غرباء کے مکانات میں جھاؤ اور ببول کی موٹی شاخیں بجائے کڑی کے استعمال کی جاتی ہیں۔ کڑیوں پر کھجور کے پتوں کے ڈنٹھل رکھے جاتے ہیں اور ان پر کھجور کے بورے بچھائے جاتے ہیں۔ اور ان کے اوپر (گارا اور اس پر خشک مٹی بچھائی جاتی ہے)

کبھی اور ضروریات خرید لیں کبھی اس مجموعہ ضروریات سے عمارت تعمیر کرالی۔ معماروں اور مزدوروں کے ساتھ خود بھی لگے رہتے تھے اور ہم بھائیوں کو بھی ساتھ لگنے کی تاکید فرماتے تھے۔ بسا اوقات میں مسجد نبوی میں بیٹھا ہوا کتاب پڑھاتا ہوتا تھا اور آدمی آتا کہ والد صاحب بلاتے ہیں طلبہ کو رخصت کر کے حاضر ہوتا تو فرماتے کہ مٹی اٹھانے والا یا اینٹ اٹھانے والا مزدور نہیں، تم اس کام کو انجام دو۔ بہ مجبوری تمام دن یہ کام کرنا پڑتا اور تمام اسباق کو معطل کرنا پڑتا۔ بسا اوقات ایک ایک دو دو ہفتہ اسباق کو معطل کر کے تمام اوقات اسی تعمیری خدمات میں صرف کرنا پڑا۔ بڑے بھائی صاحب مرحوم اور دوسرے بھائیوں اور بچوں کو بھی ایسا کرنا پڑتا تھا، مگر چوں کہ میں سب میں زیادہ مضبوط اور نوجوان تھا اس لیے مجھ پر نزلہ زیادہ گرتا تھا چھوٹے بھائی جمیل احمد مرحوم اور محمود احمد بھی اگر اپنی تعلیمات سے فارغ ہوتے تو وہ بھی یہ کام انجام دیتے۔ گارا بنانا، گارا ڈھونا، اینٹیں پاتھنا، معمار تک پہنچانا، پانی بھرنا (گارے کے لیے) وغیرہ تمام ضروریات عمارت ہم لوگ انجام دیتے رہے۔ البتہ تعمیر کرنا اور پتھروں کا گھڑنا اور ان کو موقع تعمیر تک پہنچانا یہ ہم سے نہیں ہو سکتا تھا اس لیے اس کے کرنے والے مزدور ضرور رکھے جاتے تھے۔ اس طرح تقریباً دو سال میں پہلے

مکان کے دو طبقے تیار ہو گئے۔ تب ان عارضی اور چھوٹے کمروں سے منتقل ہو کر سب یہاں آ گئے۔ ان دو طبقوں میں سات کمرے وسیع ہوادار تیار ہوئے۔ ہر طبقے میں پاخانہ، غسل خانہ، باورچی خانہ اور کنواں تھا۔ تیسرے طبقہ اور چھت کی پردہ دار تعمیر بعد میں ہوئی۔ اس کے بعد والد صاحب مرحوم نے دو مکانات اور تعمیر کرائے، مگر ان میں ہم لوگوں نے زیادہ کام نہیں کیا۔ کیوں کہ تعلیمی مشاغل کا بہت حرج ہوتا تھا۔ اگرچہ والد صاحب مرحوم خود لگے رہتے تھے۔ البتہ زیادہ مشقت کا کام نہیں کرتے تھے، جس زمانے میں تعمیری کام نہیں ہوتا تھا، اس زمانے میں بھی والد صاحب مرحوم خالی نہیں بیٹھتے تھے۔ اوقات وظائف و اوراد سے فارغ ہونے کے بعد نیلام کے بازار میں چلے جاتے اور لکڑیاں یا اور مفید چیزیں خرید لاتے۔ جلانے کی لکڑیوں میں سے جو لکڑی کارآمد ہوتی اس سے چارپائیوں کے پائے یا پٹی یا کھونٹیاں وغیرہ اپنے ہاتھ سے بنا لیتے۔ اگرچہ یہ کام کبھی ہندوستان میں نہیں کیا تھا۔ مگر ضرورت ہر چیز کی تعلیم دے دیتی ہے۔ نیلام کے بازار سے بڑھئی کے اوزار ہر قسم کے خرید لائے تھے۔ ان سے یہ معمولی کام کر لیتے تھے۔ چناں چہ اپنے ہی ہاتھوں سے سب کے لیے چارپائیاں وغیرہ بنا دی تھیں۔ رحمہ اللہ تعالیٰ وارضاہ وجازاہ عنا احسن الجزاء۔

والد صاحب مرحوم نے بعد کو اس تمام تعمیر کو اس خوف سے کہ مبادا کوئی شخص اولاد میں سے فروخت کر کے چلا جائے وقف علی الاولاد کر دیا شریف حسین کے زمانۂ حکومت میں یہ تمام محلہ اوجڑ ہو گیا تھا بلکہ بیرون باب مجیدی جو کہ قبل از جنگ عمومی نہایت آباد اور قیمتی متعدد محلات کو مشتمل ہو گیا تھا۔ صرف ان محلوں کی آبادی تقریباً تیس ہزار تک پہنچ گئی تھی مگر شریف موصوف کی بغاوت کی وجہ سے وہ آفت آئی کہ صرف چند سو کی آبادی رہ گئی تمام مدینۂ منورہ کی تقریباً سوا لاکھ یا اس سے زائد مردم شماری تھی۔ جنگ کے بعد امن کے زمانے میں صرف بارہ تیرہ ہزار کی مردم شماری رہ گئی۔

سور البلد۔ (شہر پناہ کی دیوار) کے باہر کی آبادی نہایت خطرناک ہو گئی۔ چوروں اور قزاقوں کا دور دورہ ہو گیا۔ امن و امان کافور ہو گیا۔ لوگ اپنے اپنے بیرونی مکانات چھوڑ کر (جو باقی رہے تھے) اندرون شہر پناہ رہنے پر مجبور ہو گئے۔

بعد از واپسی از ایڈریانوپل وشام بھائی سید احمد صاحب اور محمود احمد نے اپنے اس مکان کی سکونت نہیں چھوڑی۔ چوروں نے حملہ کیا اور بھائی صاحب مرحوم پر گولی چلائی مگر اللہ تعالیٰ کے فضل سے زخم معمولی ہوا اس لیے مجبوراً مکان خالی کر کے اندرون شہر پناہ متصل باب النساء کرائے

پر مکان لے کر سکونت اختیار کی اور بیرونی مکان کی حفاظت کے لیے کہ کہیں چور دروازوں اور کڑیوں اور طاقوں وغیرہ کو اکھاڑ نہ لے جائیں تنخواہ دے کر تکرو ینوں کو رکھ دیا۔

نفوس کا ابتلا اور امتحان:

کھانے پینے اور سکونت کے بارے میں جو کچھ کڑا اور سخت امتحان پیش آیا اور جس طرح بہ توفیق اللہ تعالیٰ اس کا تحمل کیا گیا اس کی مختصر سرگزشت تو گزر چکی اس کے ساتھ نفوس کا ابتلا بھی عجیب وغریب گزرا۔ پہلے عرض کر چکا ہوں کہ والد صاحب مرحوم کی اولاد ایک لڑکی اور ہم پانچ لڑکے جو کہ بوقت سفر مدینۂ منورہ موجود اور زندہ تھے اس سے پہلے دو تین لڑکیاں اور لڑکے خورد سالی ہی میں فوت ہو چکے تھے۔ وہ رفیق سفر نہیں ہو سکتے تھے۔ یہ چھ موجودہ اولاد ہی تھی جن میں سے تین کی شادیاں ہندوستان میں ہو چکی تھیں۔ بڑے بھائی صاحب صاحب اولاد بھی تھے۔ وحید احمد مرحوم جو کہ ۱۳۱۲ھ میں ٹانڈہ ہی میں پیدا ہوا تھا اور اس سفر حجاز میں تقریباً چار برس کا تھا۔ والد صاحب کی باقی تین اولاد شادی کی عمر کو نہیں پہنچی تھی والدہ صاحب مرحومہ کا ارادہ تھا کہ مدینۂ منورہ ہی میں ان کی شادی کر دیں گے اور یہ بھی خیال تھا کہ چوں کہ میں نے اولاد کو عربی پڑھائی ہے اس لیے وہاں پر ان کی ملازمتیں بھی بآسانی ہو جائیں گی اور یہ بھی خیال تھا کہ یہ سب میری اولاد پھلے پھولے گی۔ اور آپس میں اپنی اولاد کی شادی بیاہ کر کے ترقی کر جائے گی اور ایک اچھا خاصہ کنبہ اور خاندان بن جائے گا مگر قدرت کو یہ منظور نہ تھا ملازمتوں کا سلسلہ تو خیال خام ابتدا ہی میں نکلا۔ اگر چہ کچھ عرصے کے بعد اس میں کامیابی ہوتی گئی۔ بالخصوص چھوٹے بھائیوں کی ترکی تعلیم کے بعد جمیل احمد مرحوم (جو کہ ۱۳۰۲ھ (۱۸۸۵ء) میں ٹانڈہ میں پیدا ہوا تھا اور بوقت وفات تقریباً اکیس برس کی عمر رکھتا تھا) کا اگر انتقال نہ ہو جاتا تو قوی امید تھی کہ وہ کسی بڑے عہدے پر فائز ہوتا۔ اور اچھی تنخواہ ہوتی۔ محمود احمد سلمہ (جو کہ ۱۳۰۸ھ شوال (مئی جون ۱۸۹۱ء) میں بہ مقام ٹانڈہ پیدا ہوا اور اس سفر حجاز میں آٹھ برس کی عمر رکھتا تھا) جب کہ ترکی کالج سے فراغت حاصل کی تو اس کو فوراً محکمۂ قضا میں عارضی جگہ محرری کی دے دی گئی۔ جس میں وہ ترقی کرتے کرتے بڑے عہدوں تک پہنچ گیا۔ اسی طرح انھوں نے وحید مرحوم کو بھی ترکی کالج میں داخل کر دیا تھا۔ چناں چہ اس نے بھی ترکی میں اچھی استعداد پیدا کر لی تھی۔ مگر نسل اور اولاد کے متعلق والد صاحب مرحوم کا خیال بالکل غیر قابل تعبیر خواب ثابت ہوا۔

میں جس وقت ۱۳۱۸ھ کے آخر (۱۹۰۱ء) میں گنگوہ شریف کو روانہ ہوا تو گھر میں حمل تھا اور بڑے بھائی صاحب کا دوسرا بچہ حمید احمد پیدا ہو چکا تھا جو کہ مدینۂ منورہ میں ۹ر جمادی الاولیٰ ۱۳۱۷ھ ۲۳ر اکتوبر (۱۸۹۹ء) میں پیدا ہوا تھا۔ میرے سفر کے ایام میں بچی پیدا ہوئی ۱۳۲۰ھ (۱۹۰۲ء) کے ابتدا میں جب کہ ہم دونوں ہندوستان سے واپس آئے تو پہلے پہل کچھ دنوں کے بعد میری بچی کا انتقال ہوا۔ اس کے کچھ عرصے کے بعد بڑے بھائی صاحب کے دوسرے بچہ حمید احمد کا انتقال ہوا۔ بھائی سید احمد صاحب مرحوم کے کئی بچے پیدا ہوئے مگر سب کے سب ایام رضاعت ہی میں انتقال کرتے گئے۔ بالآخران کی اہلیہ نسوانی امراض میں مبتلا ہو گئیں۔ مدینۂ منورہ میں بہت کچھ علاج کیا گیا، مگر فائدہ نہ ہوا۔ میرے سفر ثانی ہند میں (جس کا تذکرہ آگے آئے گا) وہ ہندوستان گئیں کیوں کہ ان کے حقیقی بھائی ڈاکٹر ہیں، انھوں نے تقاضا کیا تھا کہ ہمشیرہ کو یہاں بھیج دو، میں علاج کروں گا وہ اپنے بھائی کے پاس تقریباً ایک سال یا زیادہ رہیں مگر کوئی معتد بہ فائدہ نہیں ہوا ۱۳۲۸ھ (۱۹۱۰ء) میں ان کو پھر مدینۂ منورہ بھیج دیا گیا اور یہاں آکر چند ماہ بیمار رہ کر ۱۳۲۹ھ (۱۹۱۱ء) میں انتقال کر گئیں۔

۱۳۲۲ھ (۱۹۰۵ء) میں والدہ صاحبہ مرحومہ کا انتقال ہوا اور اس کے کچھ عرصے بعد جمیل احمد مرحوم استنبول سے تب دق اور سل میں مبتلا ہو کر آیا اور چند مہینے زندہ رہ کر راہیِ ملکِ عدم ہوا۔ والدہ مرحومہ کے انتقال کی وجہ سے والد صاحب مرحوم کو اپنی خدمات ضروریہ میں سخت تکالیف برداشت کرنی پڑتی تھیں۔ اس وجہ سے ہم سبھوں نے مناسب سمجھا کہ والدہ مرحومہ کی خالہ زاد بہن کو جو عرصۂ دراز سے لاولد بیوہ تھیں اور ان کے تعلقات بھی والدہ صاحبہ مرحومہ اور ہم سبھوں سے بہت زیادہ تھے۔ ان کو بلایا جائے اور والد صاحب سے ان کا نکاح کر دیا جائے چناں چہ والد صاحب مرحوم کر اس پر راضی کر لیا گیا اور بھائی سید احمد صاحب مرحوم کو لکھ دیا گیا کہ واپس ہوتے ہوئے تم خالہ صاحبہ کو اپنے ساتھ لیتے آؤ۔ ۱۳۲۴ھ (۱۹۰۶ء) کے ابتدا میں وہ معہ خالہ صاحبہ کے آئے اور والد صاحب سے ان کا عقد ہو گیا۔ اس سے اگرچہ فی الجملہ ان کو کچھ راحت ہوئی مگر جو آرام والدہ مرحومہ کی موجودگی میں جو کہ مزاج اور عادتِ سے واقف تھیں، حاصل ہوتا تھا وہ حاصل نہ ہوا۔ والد صاحب مرحوم کو حقے کی اس قدر عادت تھی کہ پائخانہ میں بھی حقہ لے کر جاتے تھے اور رات میں اٹھ اٹھ کر پیا کرتے تھے۔ بدن دبوانے کی بھی عادت تھی۔ بہر حال وہ بھی کچھ دنوں زندہ رہ کر رحلت فرما گئیں۔

بھائی سید احمد صاحب مرحوم کو یہ بھی لکھا گیا کہ ماموں زاد بھائی فاروق احمد کو بھی اپنے ساتھ لیتے آئیں، تاکہ ہمشیرہ کا عقد اس سے کر دیا جائے۔ والدہ مرحومہ کو اس رشتے کی خواہش بھی تھی، کیوں کہ وہ ان کا حقیقی بھتیجا تھا۔ اگر چہ والد صاحب اس کے غیر تعلیم یافتہ ہونے کی وجہ سے پسند نہ کرتے تھے، مگر خاندان میں کسی دوسرے لڑکے کے موجود نہ ہونے کی وجہ سے راضی ہو گئے تھے فاروق احمد موصوف کے والدین اس وقت موجود تھے وہ اس رشتے پر راضی تھے۔ ان سے والد صاحب مرحوم نے یہ وعدہ کیا تھا کہ فاروق احمد کو میں یہاں رکھوں گا اور عربی تعلیم دلواؤں گا۔ چند سال رہنے اور تعلیم حاصل کرنے کے بعد جی چاہے گا وہ معہ اپنے متعلقین کے ہندوستان چلا جائے گا اور جی چاہے گا یہاں ہی قیام پذیر رہے گا۔ چناں چہ وہ بھی بھائی سید احمد صاحب مرحوم کے ساتھ آ گیا اور اس کا عقد ہمشیرہ مرحومہ سے کر دیا گیا وراس کی تعلیم و تربیت کا انتظام کر دیا گیا۔ عربی کی ابتدائی کتابیں شروع کرائی گئیں مگر وہ بدنصیب ایک سال رہ کر خفیہ طریقے پر بھاگ گیا۔ اس نے اپنی بیوی کے کچھ زیور خفیہ طریقے پر فروخت کر کے زادراہ حاصل کیا اور ہندوستان پہنچ گیا۔ چند مہینوں کے بعد اس کے لڑکی ۱۸ محرم ۱۳۲۵ھ (۳ مارچ ۱۹۰۷ء) کو مدینہ منورہ میں پیدا ہوئی۔ اس کے والدین مرحومین کا تقاضا رہا کہ ہماری پوتی اور بہو کو ہندوستان بھیج دو۔ مگر والد صاحب مرحوم کو فاروق احمد موصوف کی نالائقی سے اس قدر صدمہ ہوا تھا کہ وہ بھیجنے پر راضی نہیں ہوئے، اس کے کچھ عرصے کے بعد بڑے بھائی صاحب مرحوم کی اہلیہ مرحومہ (والدہ وحید) تپ دق اور سل میں مبتلا ہو کر راہی ملک عدم ہوئی تھی۔ صرف وحید احمد مرحوم ایک لڑکا چھوڑا۔ بھائی صاحب مرحوم کو تنہائی کی سخت تکالیف پیش آئیں۔ سید فرزند علی صاحب مرحوم بریلی کے ایک مہاجر تھے۔ ان کی لڑکی سے بھائی صاحب مرحوم کا عقد کر دیا گیا۔ اس نکاح کو تقریباً ڈیڑھ سال یا اس سے کچھ ہی زائد گزرے تھے کہ ایام زچگی میں اس کا بھی انتقال ہو گیا۔ بچہ بھی زندہ نہ رہا۔ پھر بھائی صاحب مرحوم نے ایک بنارس کی مہاجرہ عورت سے (جو کہ اس زمانے میں بیوہ تھیں اور کشمیری خاندان سے تھیں) نکاح کیا۔

۱۳۲۶ھ (۱۹۰۸ء) کے ابتدا میں میری پہلی اہلیہ صرف دق وسل میں مبتلا ہو کر چند مہینے بیمار رہ کر راہی ملک عدم ہوئی۔ ایک لڑکی زہرا جو کہ ۱۳۲۳ھ (۱۹۰۵ء) میں پیدا ہوئی تھی چھوڑ گئی جو کہ ۱۳۳۷ھ (۱۹۱۹ء) میں بہ مقام دمشق فوت ہو گئی۔

ہمشیرہ مرحومہ بھی مرض دق وسل میں مبتلا ہوئی اور سال بھر سے زیادہ بیمار رہ کر ۱۳۲۹ھ

(۱۹۱۱ء) کے ابتدا میں راہی ملک عدم ہوئی۔ اس کے کچھ عرصے کے بعد اس کی لڑکی بھی انتقال کر گئی جو تقریباً چار برس کی تھی۔ بڑے بھائی صاحب مرحوم کے اس تیسری زوجہ سے بچہ پیدا ہوا۔ مگر وہ بھی کچھ عرصے زندہ رہ کر فوت ہو گیا اور اس کے کچھ عرصے بعد ان کی تیسری اہلیہ بھی انتقال کر گئیں۔

عزیزم محمود احمد سلمہ کا عقد ایک بریلی ہی کے خاندان میں شیخ ریاض الدین صاحب مہاجر کی ہمشیرہ سے کیا گیا، چند مہینوں کے بعد والد صاحب مرحوم سے اور شیخ ریاض الدین صاحب اور ان کے خاندان سے نا اتفاقی ہو گئی جس کی وجہ سے آمد و رفت بند ہو گئی۔ صلح کی کوششوں میں ناکامی ہوئی۔ آخر کار اہلیہ محمود احمد بیمار ہوئی اور تپ دق میں مبتلا ہو کر راہی ملک عدم ہو گئی۔ بڑے بھائی صاحب مرحوم کا چوتھا عقد ڈاکٹر رفاقت علی صاحب مرحوم کی لڑکی سے ہو گیا۔ اس سے ایک لڑکا بھائی صاحب کے ہوا جو کہ پیدا ہونے کے چند دنوں بعد فوت ہو گیا۔ پھر بھائی صاحب بھی ۱۳۳۰ھ (۱۹۱۳ء) میں وفات پا گئے۔ اس طرح خاندان کے افراد کا برابر وفیاتی سلسلہ جاری رہا۔ والد صاحب مرحوم کے سامنے ہی تقریباً بتیس یا تینتیس نفوس مدینۂ منورہ میں وفات پا گئے اور خاندان کے بڑھنے کی امیدیں خاک میں مل گئیں۔ انا للہ وانا الیہ راجعون۔ (نقش حیات۔ حصۂ اول۔ صفحہ ۸۸۔۷۸)

بیعت و حضوری بارگاہِ حضرت گنگوہی قدس اللہ سرہ العزیز

استفادۂ طریقت و روحانیت:

پہلے ذکر آ چکا ہے کہ خاندان کے اسلاف اہل معرفت و طریقت تھے۔ صرف اخیر میں دو تین پشتیں دنیادار زمینداروں کی ہو گئی تھیں۔ نیز یہ بھی ذکر آ چکا ہے کہ شاہان دہلی سے خاندان کو چوبیس گاؤں دیے گئے تھے۔ شاہ مدن رحمۃ اللہ علیہ کے بعد شاہ نور اشرف نے سجادۂ طریقت اور دوسرے بیٹے تراب علی مرحوم نے جائداد کا انتظام سنبھالا۔ اس طرح خاندان میں دو پٹیاں قائم ہو گئیں، مگر خاندان میں کوئی شخص باہر کسی دوسرے خاندان سے بیعت نہ ہوتا تھا۔ والد صاحب مرحوم سب سے پہلے باہر بیعت ہوئے۔ جس کی صورت یہ پیش آئی کہ ان کی شادی نانا اکبر علی مرحوم کی دختر سے ہوئی (نانا صاحب مرحوم ۱۸۵۷ء میں تمام جائیداد کے متصرف تھے اور ۱۸۵۸ء میں امن قائم ہونے پر ضلع بستی سے واپس آتے ہوئے دریائے گھاگرا میں کشتی الٹ جانے سے ڈوب

گئے تھے) نانی صاحبہ مرحومہ نندردلی ضلع فیض آباد کی رہنے والی تھیں اور صاحب کشف ونسبت تھیں۔انھوں نے اپنے ماموں سے میکہ ہی میں سلوک طے کیا تھا۔ان کے ماموں بہت بڑے صاحب نسبت تھے۔ والدہ صاحب مرحوم کوانھوں نے ہدایت کی تھی کہ تمھارے گھرانے میں مرید کرنے کا طریقہ جاری ہے مگر یہ غلط ہے کہ جب تک کسی کامل سے بیعت ہوکر منازل سلوک طے نہ کر لیے جائیں مرید کرنا جائز نہیں۔ قیامت میں سخت وبال ہوگا۔اس لیے والد صاحب مرحوم کو شیخ طریقت کی تلاش تھی۔خاندان کے دوسرے لوگوں نے بغیر سلوک خاندانی نام پر یہ سلسلہ جاری کرر کھا تھا اوران خاندانوں میں جو کہ اضلاع بستی، گونڈہ، گورکھپور وغیرہ میں سلسلہ اسلاف میں داخل ہوجاتے تھے۔اور نذرانہ وغیرہ وصول کرتے تھے اور لوگوں کو مرید بھی کرتے۔ والد صاحب مرحوم جب صفی پور میں مدرس اور ہیڈ ماسٹر ہوئے تو چوں کہ گنج مرادآباد شریف قریب تھا اوران اطراف میں حضرت مولانا فضل الرحمٰن صاحب گنج مرادآبادی رحمۃ اللہ علیہ کا شہرہ تھا۔ ان کی کرامت اور بزرگی بہت زیادہ زبان زدعوام وخواص تھی۔ اس لیے حضرت مولانا موصوف کی خدمت میں آمدورفت شروع کی اور وہ کمالات جو اہل اللہ میں ہونے چاہییں دیکھ کر گرویدہ ہوگئے اورانھیں سے بیعت ہوگئے اور حسب تعلیم وارشاد فرائض سلوک انجام دینے لگے۔ جہاں تک معلوم ہے حضرت مولانا قدس سرہ العزیز نے طریقۂ قادریہ کا سلوک حضرت والد صاحب مرحوم کو تلقین فرمایا تھا اور پھر جب تبدیلی بانگرمؤ کی ہوگئی تو بہت زیادہ حاضری کا موقع مل گیا کیوں کہ بانگرمؤ گنج مرادآباد سے بہت ہی زیادہ قریب ہے، غالباً دو یا تین ہی میل کا فاصلہ ہے۔ پھر والدہ مرحومہ کو بھی مولانا رحمۃ اللہ علیہ ہی سے بیعت کرایا۔

خاندان کے لوگوں نے والد مرحوم پر باہر بیعت کرنے پر اعتراضات بھی کیے، مگراس کا کوئی اثر نہ ہوا۔ والد صاحب کے ارشاد پر ہم تینوں بھائیوں مولانا محمد صدیق صاحب مرحوم اور مولانا سید احمد صاحب مرحوم اور راقم الحروف کو بھی دیوبند سے بعض اوقات میں واپسی پر گنج مرادآباد بارگاہ میں حاضری کا شرف حاصل ہوا۔

جب بڑے بھائی صاحب مرحوم (مولانا محمد صدیق صاحب) دیوبند میں فارغ التحصیل ہوئے تو انھوں نے حضرت مولانا گنگوہی قدس اللہ سرہٗ العزیز سے بیعت ہونے کی اجازت والد صاحب مرحوم سے طلب کی۔ والد صاحب کی منشا طبعی طور پر یہی تھی کہ وہ حضرت گنج مرادآبادی قدس اللہ سرہ العزیز ہی سے بیعت ہوں۔ دونوں میں عرصے تک خط وکتابت رہی۔ بالآخر والد

صاحب مرحوم نے ان کو حضرت گنگوہی قدس اللہ سرہٗ العزیز سے بیعت ہونے کی اجازت دے دی اور وہ ان سے بیعت ہو گئے۔ اس عرصے میں بھائی صاحب مرحوم بلند شہر اور سہوارہ وغیرہ بصیغۂ تدریس ملازم رہے اور حسب تعلیم ذکر و شغل بھی برابر کرتے رہے۔ ۱۳۱۶ھ (۹۹-۱۸۹۸ء) میں جب کہ والد صاحب مرحوم نے بعد وفات حضرت مولانا گنج مراد آبادی قدس سرہٗ العزیز ارادہ ہجرت کیا۔ (چوں کہ والد صاحب مرحوم کو حضرت مولانا قدس اللہ سرہٗ العزیز سے بہت گہرا تعلق تھا اور تقریباً ان میں فنا تھے۔ اس لیے مولانا رحمۃ اللہ علیہ کے وصال سے ان کو اس قدر صدمہ ہوا کہ ہندوستان میں بسر کرنا نہایت ناگوار معلوم ہونے لگا۔ اسی وقت سے اس فکر میں ہو گئے کہ کوئی انتظام کر کے معہ جملہ متعلقین مدینۂ منورہ میں گزر بسر کی جائے) اور ماہ شعبان میں بارادۂ توجہ وطن بھائی صاحب جائے ملازمت سے دیوبند پہنچے تو حضرت شیخ الہند رحمۃ اللہ علیہ نے بھائی صاحب مرحوم سے فرمایا کہ ان دونوں (بھائی سید احمد صاحب اور حسین احمد) کو حضرت گنگوہی قدس اللہ سرہٗ العزیز سے بیعت کرادو، خدا جانے یہاں سے جانے کے بعد کس کے پلے پڑ جائیں۔ کہیں کسی بدعتی سے وابستہ نہ ہو جائیں۔ بھائی صاحب مرحوم نے ہم سے فرمایا میں نے عرض کیا کہ میں تو حضرت شیخ الہند رحمۃ اللہ علیہ سے بیعت ہوں گا۔ واقعہ یہ تھا کہ اگر چہ گنگوہ میں ایام طالب علمی میں بارہا حاضری کی نوبت آ چکی تھی مگر حسن عقیدت اور محبت حضرت شیخ الہند رحمۃ اللہ علیہ ہی سے تھا بچپن سے ان کی خدمت میں رہنا ہوا تھا اور ابتدائی کتابوں سے لے کر آخری کتابوں تک کا اکثر حصے انھیں سے پڑھتا رہا تھا۔ مضامین علمیہ اور اخلاق عالیہ اور اعمال صالحہ کے مشاہدات حاصل ہوئے تھے۔ حضرت شیخ الہند رحمۃ اللہ علیہ ایسے الطاف و کرم فرماتے تھے جو کہ اولاد کے لیے ہوتے ہیں اس لیے پوری وابستگی انھیں سے تھی۔ حضرت گنگوہی قدس اللہ سرہ العزیز کو بہت بڑا عالم ضرور جانتا تھا مگر قلبی تعلق ایسا نہ تھا اور نہ طریقت کا کامل سمجھتا تھا۔ بھائی صاحب مرحوم نے جواب دیا کہ حضرت شیخ الہند رحمۃ اللہ علیہ بیعت نہیں کرتے۔ میں نے خود بہت کوشش اپنے لیے کی تھی، جب نہیں راضی ہوئے اور حضرت گنگوہی قدس سرہ العزیز سے بیعت ہو جانے کا ہی ارشاد فرمایا، تب میں وہاں بیعت ہوا۔ تم دونوں کے لیے بھی ان کا یہی ارشاد ہے۔ بالآخر وہاں ہم دونوں حاضر ہوئے اس زمانے میں حضرت استاذ مولانا حبیب الرحمٰن صاحب دیوبندی وہاں ہی خانقاہ میں رہتے تھے اور مشاغل سلوک کے انہماک کے ساتھ حضرت قطب عالم رحمۃ اللہ علیہ کی ڈاک کی خدمات بھی انجام دیتے رہتے تھے۔ بھائی صاحب مرحوم نے ان کو خط لکھ دیا تھا کہ ان دونوں کو

حضرت رحمۃ اللہ علیہ سے بیعت کرا دیجیے۔ جب ہم دونوں وہاں پہنچے تو حضرت مولانا حبیب الرحمٰن صاحب نے دونوں کو یہ کہہ کر پیش کر دیا کہ مولوی صدیق احمد صاحب نے اپنے دونوں چھوٹے بھائیوں مولوی سید احمد اور حسین احمد کو بیعت ہونے کے لیے بھیجا ہے، وہ حاضر ہیں۔ حضرت رحمۃ اللہ علیہ کی عادت تھی کہ بیعت فرمانے میں بہت زیادہ ردوقدح فرمایا کرتے تھے۔ بالخصوص لکھے پڑھے اور عربی تعلیم یافتہ لوگوں کے متعلق تو بہت زیادہ کنج وکاؤ اور گفت وشنید کی نوبتیں آتی تھیں۔ بعض حاضرین اور بے تکلف خدام مثل مولانا محمد یحییٰ صاحب مرحوم کاندھلوی کے دریافت کرنے پر فرمایا کہ میں دیکھتا ہوں کہ کس شخص کو مجھ سے قلبی مناسبت ہے اور کتنی مناسبت ہے اگر مناسبت نہیں ہوتی تو میں انکار کر دیتا ہوں ورنہ بیعت کر لیتا ہوں۔ بہرحال ہم دونوں پیش ہوئے تو کچھ پس وپیش نہیں فرمایا مولانا حبیب الرحمٰن صاحب نے پیش فرمایا۔ اور حضرت رحمۃ اللہ نے بیعت فرمالیا۔ مگر کچھ تلقین نہیں فرمایا بلکہ یہ فرمایا کہ میں نے بیعت تو کر لیا اب تم مکہ معظمہ جا رہے ہو، وہاں حضرت (حضرت قطب عالم حاجی امداد اللہ صاحب قدس اللہ سرہٗ العزیز) موجود ہیں، ان سے عرض کرنا وہ ذکر تلقین فرما دیں گے، پس اسی روز ہم دیوبند واپس آگئے اور پھر وطن کو روانہ ہو گئے۔ دیوبند سے رخصت ہوتے وقت حضرت شیخ الہند رحمۃ اللہ علیہ پیدل اسٹیشن تک ساتھ ساتھ تشریف لائے اور راستہ میں صدر چوکی کے پاس وصیت فرمائی کہ پڑھانا نہ چھوڑنا خواہ ایک ہی طالب علم پڑھنے والا ہو۔

بیعت کے برکات:

اگرچہ بیعت بادل ناخواستہ ہوئی تھی مگر اس کے آثار مبارکہ میں نے اپنے اندر اسی دن سے محسوس کیے اس سے پہلے کبھی کبھی نماز چھوٹ جاتی تھی مگر اس روز سے برابر مداومت ہو گئی۔ کبھی قضا نہیں ہوئی اور اگر کسی عذر قوی سے بلا اختیار فوت بھی ہو گئی جو کہ شاذ ونادر ہوئی تو قضا کر لی گئی (جو نمازیں بیعت سے پہلے کبھی کبھی فوت ہوئی تھیں ان کو بھی ایام اسارت احمد آباد میں تخمینہ کر کے ادا کرنے کی توفیق ہوئی وللہ الحمد) بیعت کے بعد میں نے خواب میں دیکھا کہ ایک میدان ہے اور اس کے بیچ میں ایک قبر ہے جو کہ حضرت خواجہ علاؤ الدین صابر رحمۃ اللہ علیہ اور حضرت خواجہ معین الدین چشتی رحمۃ اللہ علیہ کی ہے۔ خواب میں میں ایک ہی قبر کو دونوں بزرگوں کی قبر سمجھ رہا ہوں۔ میں اس قبر کی طرف جا رہا ہوں اور بالکل قریب پہنچ گیا ہوں، میں نے اس خواب کو حضرت شیخ الہند رحمۃ اللہ علیہ کے پاس لکھ کر بھیجا۔ وطن پہنچتے ہی الہ آباد کو جو کہ اس زمانے میں یوپی کے حجاج کے

لیے قرنطینہ کا مقام مقرر کیا گیا تھا، روانگی ہوگئی وہاں تقریباً پندرہ بیس دن قیام کرنا پڑا۔ یہ جگہ شہر کے باہر پراگ کے قریب خصوصی انتظام کے ساتھ حجاج کے لیے علاحدہ بنائی گئی تھی ۔ وہیں جواب منگایا۔

حضرت اس وقت گنگوہ شریف میں بارادۂ قیام رمضان شریف مقیم تھے ۔ حضرت شیخ الہند رحمۃ اللہ علیہ نے اس خواب کو حضرت قطب عالم گنگوہی رحمۃ اللہ علیہ سے ذکر کیا تو تعبیر میں فرمایا کہ لکھ دو کہ منزل مقصود کو پہنچے گا ۔ یہ جوابی خط الہ اباد میں قرنطینہ کے کیمپ میں موصول ہوا۔ سفر حج کرتے ہوئے جب کہ اواخر ماہ ذیقعدہ ۱۳۱۶ھ (اپریل ۱۸۹۹ء) میں حاضری مکۂ معظمہ نصیب ہوئی تو جائے قیام پر اسباب وغیرہ منظم کرنے کے بعد حضرت قطب عالم حاجی امداد اللہ صاحب قدس اللہ سرہٗ العزیز کے یہاں صبح کو حاضر ہونے کی عزت نصیب ہوئی۔ موصوف اس وقت بہت ضعیف ہوگئے تھے ۔ اکثر لیٹے رہتے تھے۔ صبح کو مثنوی شریف پڑھایا کرتے تھے۔ اس وقت پلنگ پر کچھ دیر بیٹھ جاتے تھے ۔ مولانا محب الدین صاحب مرحوم اور مولانا شفیع الدین صاحب مرحوم اور چند حضرات حاضر درس ہوتے تھے جب ہم سب معہ والد مرحوم حاضر بارگاہ ہوئے تو حضرت قطب عالم نے بہت توجہ فرمائی۔ حضرت گنگوہی قدس اللہ سرہٗ العزیز کا سلام و پیام سن کر بہت خوش ہوئے اور دیر تک نہایت محبت سے تذکرہ فرماتے رہے اور فرمایا کہ تمنا ہے کہ ایک مرتبہ پھر زندگی میں ان سے ملاقات ہوجاتی۔

بالآخر ہم دونوں بھائی (سید احمد صاحب اور راقم الحروف) نے عرض کیا کہ حضرت گنگوہی قدس اللہ سرہٗ العزیز نے ہم کو بیعت تو کرلیا تھا مگر یہ فرمایا تھا کہ تلقین ذکر حضرت سے حاصل کر لینا تو آپ نے انفاس کی تلقین فرمائی اور فرمایا کہ روز صبح کو آکر یہاں بیٹھا کرو اور اس ذکر کو کرتے رہو۔ چناں چہ جب تک مکۂ معظمہ میں رہنا ہوا حتی الامکان روز حاضر ہوتے رہے چوں کہ زمانۂ حج قریب تھا اس لیے جلد ہی وہ وقت آگیا کہ جس میں عرفات منیٰ وغیرہ کا سفر ہوا حج سے فارغ ہونے کے بعد پھر خدمت میں چند دنوں حاضری کا شرف حاصل ہوا۔ جب قافلۂ حجاج اخیر عشرہ ذی الحجہ ۱۳۱۶ھ (مئی ۱۸۹۹ء) میں مدینۂ منورہ کو روانہ ہونے لگا تو خلاف معمول بعد از ظہر ہم تینوں کو حاضری کا شرف حاصل ہوا۔ حضرت نے بہت شفقت فرمائی اور سر پر ہاتھ پھیرا اور فرمایا کہ تم کو اللہ تعالےٰ کے سپرد کرتا ہوں ۔ ہم نے سکوت کیا تو فرمایا کہ کہو ہم نے قبول کیا۔ ہم نے حسب تلقین عمل کیا۔ حضرت رحمۃ اللہ علیہ نے دعا فرمائی ہم نے رخصتی مصافحہ کیا اور پھر مدینۂ منورہ کو روانہ ہوگئے ۔ مدینۂ منورہ پہنچنے کے بعد کچھ ایسی مشغولیتیں پیش آئیں کہ تعلیم کردہ ذکر پر مداومت نہ ہوسکی چند مہینہ کے بعد حضرت قطب عالم حاجی امداد اللہ صاحب قدس اللہ سرہ العزیز کا

ماہ جمادی الاولیٰ (۱۳۱۷ھ/۱۸۹۹ء) میں وصال ہو گیا۔ (۱)

مکہ معظمہ سے روانہ ہونے کے بعد چوتھے روز جب کہ قضیمہ سے رابغ کو قافلہ جا رہا تھا رات میں اونٹ پر سوتے ہوئے خواب میں دیکھا کہ جناب سرور کائنات علیہ الصلوٰۃ والسلام تشریف لائے ہیں۔ میں قدموں پر گر گیا آپ نے میرا سر اٹھا کر فرمایا کیا مانگتا ہے؟ میں نے عرض کیا جو کتابیں پڑھ چکا ہوں وہ یاد ہو جائیں اور جو نہیں پڑھی ہیں ان کے سمجھنے کی قوت ہو جائے۔ تو فرمایا کہ تجھ کو دیا۔

مدینۂ پہنچنے سے کچھ عرصے بعد بعض ہندوستانیوں اور بعض عربوں کی خواہش ہوئی کہ سلسلۂ تعلیم جاری کیا جائے۔ نحو وصرف وغیرہ کی کتابیں ایک ایک دو دو آدمیوں کو خالی اوقات میں حسب ارشاد حضرت شیخ الہند رحمۃ اللہ علیہ حرم محترم نبوی میں پڑھانے لگا اور دن کے باقی اوقات میں دکان کا کام کرتا تھا یا کتابت کا۔ کیوں کہ روزگار کی کوئی صورت نہ تھی۔ اس لیے یہ مشغلہ تھا کہ اجرت پر بعض کتابوں کو کتب خانہ سے نقل کرتا اور کبھی کبھی دکان پر بیٹھتا تھا جو بڑے بھائی صاحب نے بازار میں کھولی تھی جس میں شکر، چائے، چاول صابن وغیرہ بکتا تھا اور نوبت بنوبت ہم تینوں اس میں بیٹھتے تھے) ان مشاغل نے اس قدر مشغول کیا کہ ذکر پر کوئی مداومت نہ ہو سکی۔ حضرت قطب عالم قدس اللہ سرہ العزیز کے وصال کے بعد شوق پیدا ہوا کہ تعلیم کردہ ذکر پر مداومت کی جائے۔ چناں چہ حرم محترم (مسجد نبوی) میں بیٹھ کر پاس انفاس کیا کرتا تھا۔ تھوڑے ہی عرصے میں حضرت قطب عالم گنگوہی قدس اللہ سرہٗ العزیز سے محبت اور تعلق، قلب میں بڑھنا شروع ہوا ورمحسوس ہوتا تھا کہ جس طرح بعض درخت جلد جلد بڑھتے ہوئے دکھائی دیتے ہیں، اس طرح حضرت گنگوہی کی محبت بڑھ رہی ہے۔ یہاں تک کہ حضرت شیخ الہند رحمۃ اللہ علیہ کے تعلق پر ان کا تعلق بہت بڑھ گیا۔ حال آں کہ حضرت شیخ الہندؒ کا تعلق کم نہیں ہوا، بلکہ اپنی حالت پر ہی قائم رہا۔ تھوڑے ہی عرصے کے بعد سلسلہ چشتیہ قدس اللہ اسرارہم کی نسبت کے آثار ظاہر ہونے لگے اور گریہ کی حالت طاری ہونی شروع ہوگئی۔ اس اثنا میں رویائے صالحہ اور جناب رسول صلی اللہ علیہ وسلم کی زیارت باسعادت خواب میں بکثرت ہونے لگی۔ نیز ذکر کی وجہ سے جسم میں بے اختیاری حرکات بھی ہونے لگیں۔ مسجد نبوی علیٰ صاحبہ الصلوٰۃ والسلام میں چوں کہ لوگوں کا مجمع ہر وقت رہتا ہے، اس لیے ایسا وقت مقرر کیا جس میں کم سے کم مجمع رہے۔ وہ وقت آفتاب نکلنے کے ایک گھنٹہ بعد کا تھا۔ چناں چہ روزانہ ایسے وقت میں ناشتہ کر کے باوضو مسجد شریف میں داخل ہو کر تحیۃ المسجد ادا

(۱) تذکرہ علمائے ہند، مشاہیر علمائے دیوبند وغیرہ میں حضرت کے انتقال کی تاریخ ۱۲ ربیع الآخر ۱۳۱۷ھ درج ہے (مطابق ۱۸/اکتوبر ۱۸۹۹ء)۔

کر کے مواجہہ شریف (قبر مبارک کے سامنے کی وہ جگہ جو کہ چہرۂ مبارک کے سامنے ہے) میں حاضر ہوتا اور آداب والفاظ شرعیہ زیارت کے بعد جس قدر ممکن ہوتا الفاظ صلوٰۃ وسلام بجالا کر پھر مسجد شریف میں جہاں خالی جگہ پاتا وہاں بیٹھ کر گھنٹہ ڈیڑھ گھنٹہ (جس قدر جی لگتا تھا) ذکر میں مشغول رہتا تھا مگر جب آثار جسم پر زیادہ ظاہر ہونے لگے تو لوگوں کی شرم کی وجہ سے شہر کے باہر جنگل میں جانے لگا۔ مسجد شریف کی مشرقی جانب جدھر بقیع شریف ہے (مدینۂ منورہ کا مقبرہ) آبادی نہیں ہے ادھر نکل جاتا تھا اور کبھی مسجد الاجابہ میں (یہ مسجد مشہور ہے اور اب بالکل جنگل میں واقع ہے یہاں پر بعض ادعیہ جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی مقبول ہوئی ہیں) اور کبھی اسی کے قریب کھجوروں کے جھنڈوں میں تنہا بیٹھ کر ذکر کرتا رہتا تھا۔ اسی حالت پر ایک مدت گزری جو حالتیں یا رویائے صالحہ وغیرہ پیش آتی تھیں ان کو قلم بند کر کے گنگوہ شریف بھیجا کرتا تھا ایک روز مسجد نبوی (علی صاحبہا الصلوٰۃ والسلام) میں بانتظار جماعت بوقت ظہر یا عصر بیٹھا ہوا تھا یک بارگی ایسا معلوم ہوا کہ میرا تمام جسم حضرت گنگوہی قدس اللہ سرہ العزیز کا جسم ہو گیا ہے یہ حالت اس قدر قوی ہوگئی۔ کہ میں اپنے جسم کو اپنا نہیں پاتا تھا اور تعجب سے ہاتھ کو دانتوں سے کاٹتا تھا کہ دیکھوں یہ میرا جسم ہے یا نہیں اگر نہ ہوگا تو تکلیف محسوس نہ ہوگی۔ یہ حالت تھوڑی دیر گھنٹہ دو گھنٹہ رہی پھر زائل ہوگئی میں نے اس حالت کو بھی لکھا۔ حضرت رحمۃ اللہ علیہ نے جواب میں فرمایا کہ یہ حالت فنافی الشیخ ہونے کی ہے۔

۱۸ شوال ۱۳۱۸ھ (فروری ۱۹۰۱ء) میں والا نامہ گنگوہ شریف سے وارد ہوا کہ اگرچہ وہاں سب کچھ ہے مگر بہتر ہوتا کہ تو ایک مہینہ کے لیے گنگوہ آجاتا۔ چوں کہ والد صاحب مرحوم اور بھائی صاحبان میری مشغولی ذکر اور بعض رویاء وغیرہ سے واقف تھے، ادھر سے اس والا نامہ سے بھی واقف ہوگئے تھے۔ اس لیے جب کہ میں نے اس والا نامہ کے مضمون کی وجہ سے سفر کی اجازت طلب کی تو والد صاحب مرحوم نے بجز قلت خرچ اور کوئی عذر پیش نہیں کیا فرمایا اور یہ واقعی تھا کیوں کہ اس مدت میں سرمایہ تقریباً قریب الختم ہو چکا تھا۔ اس لیے مجبوراً سکوت کرنا اور سفر سے باز رہنا پڑا۔ مگر بڑے بھائی صاحب کو (مولانا محمد صدیق صاحب مرحوم) کو جو کہ تمام کاروبار تجارت اور ضروریات کے انجام دینے والے تھے اور ہندوستان سے روانگی پر جب کہ حضرت گنگوہی قدس اللہ سرہ العزیز سے انھوں نے اپنے ذکر و شغل میں ناکامی کی شکایت کی تھی اور حضرت رحمۃ اللہ علیہ نے جواب میں فرمایا تھا کہ اب تو چلے جاؤ، پھر وہاں سب کو چھوڑ کر چلے آنا۔ یہ مقولہ یاد آگیا اور ان کی آتش شوق بھڑک اٹھی اور انھوں نے خفیہ طریقے پر انتظام شروع

کر دیا۔ ماہ ذیقعدہ میں جب کہ ایک قافلہ مدینۂ منورہ سے رابغ کو روانہ ہو رہا تھا۔ اس کے ساتھ چھپ کر بارادۂ ہندوستان روانہ ہو گئے اور اپنے ساتھ ساٹھ یا ستر روپے لے گئے۔ گھر میں جب دن بھر نہیں آئے تو تلاش ہوئی۔ ان کے کمرہ میں ایک تحریر لٹکتی ہوئی پائی گئی جس میں انہوں نے اپنے ارادہ وغیرہ کا تفصیلی ذکر کیا تھا۔ اس پر مطلع ہونے کے بعد حضرت والد صاحب مرحوم نے مجھ کو فرمایا کہ اب تو بھی جا، تجھ کو وہاں سے طلب کیا گیا تھا، مگر وہ روانہ ہو گئے ہیں۔ خرچ کے نہ ہونے کی وجہ سے میں متوقف تھا۔ ان کو راستہ میں تنہائی کی وجہ سے تکلیف ہوگی۔ چناں چہ انھوں نے زادہ راہ کا انتظام کر دیا۔ بھائی صاحب مرحوم رابغ سے بادبانی جہاز پر جدہ پہنچے۔ راستے میں تکلیف زیادہ ہوئی، طبیعت میں استقلال و جفاکشی کم تھی۔ تنہائی بھی تھی۔ جدہ میں کوئی جہاز ہندوستان جانے والا نہ ملا۔ دو چار روز جدہ میں رہ کر پریشان ہو گئے اور والد صاحب مرحوم کو مفصل خط لکھا کہ اب میں اپنے کیے پر پشیمان ہوں اور چوں کہ حج کا زمانہ قریب آ گیا ہے۔ حج کر کے واپس آ جاؤں گا۔ والد صاحب مرحوم عزائم کے بہت پختہ تھے۔ ان کو ناگوار ہوا اور مجھ کو کہا کہ تو جا کر ان کو واپسی کے ارادے سے باز رکھ اور تم دونوں ہندوستان کو روانہ ہو جاؤ۔ مجھ کو بھی تقریباً ساٹھ روپے سفر خرچ کے لیے عطا فرمائے اور مال لانے والے قافلہ میں جب کہ وہ مال پہنچا کر واپس ینبع البحر کو جا رہا تھا تاجروں کے ذریعہ پشت شتر کرائے کر کے روانہ کر دیا۔ اگر چہ قوافل ینبع سے پانچ یا چھ دن میں آتے ہیں مگر یہ خالی اونٹ تھے۔ مختصر راستوں سے پہاڑوں میں ہوتے ہوئے رات دن چل کر دو یا تین دن میں ینبع پہنچ گئے۔ اتفاق سے خدیوی ڈاک کا جہاز جدہ جانے والا آیا ہوا تھا۔ فوراً اس میں سوار ہو گیا اور اگلے روز جدہ پہنچ گیا۔ وہاں پہنچ کر معلوم ہوا کہ بھائی صاحب مرحوم گھبرا کر مکۂ معظمہ روانہ ہو گئے اور یہ بھی معلوم ہوا کہ ایک جہاز بمبئی سے آیا ہوا ہے اور وہ بمبئی واپس ہونے والا ہے۔ میں نے اس کو غنیمت کبریٰ سمجھ کر یہ چاہا کہ جلد سے جلد حضرت رحمتہ اللہ علیہ کی خدمت اقدس میں بھائی صاحب مرحوم سے پہلے پہنچ جاؤں اور ان کو اس جلد بازی اور چھپ کر چلے آنے کی سزا دے دوں۔ اس کا ٹکٹ چالیس روپے میں خرید لیا اور ایک خط مکۂ معظمہ میں بھائی صاحب کو اور ایک مدینۂ منورہ میں والد صاحب مرحوم کو تفصیلی لکھ دیا اور اپنی روانگی کی اطلاع دے کر جہاز پر سوار ہو گیا۔ مگر ایک روز کے بعد ہی بمبئی سے تار آ گیا کہ جہاز نہ آئے بلکہ جدہ ہی میں ٹھہرا رہے۔ حج کے بعد حجاج کو لے کر واپس ہو۔ اس بنا پر ایک یا دو دن جہاز میں رہنے کے بعد جدہ واپس آنا پڑا۔ یہ تاریخ اواخر ذی قعدہ (مارچ ۱۹۰۱ء) کی تھیں۔ ٹکٹ کے روپے

واپس لے کراب یہی ضروری معلوم ہوا کہ مکۂ معظمہ روانہ ہوکر نعمت حج اور رفاقت بھائی صاحب مرحوم کا شرف حاصل کیا جائے۔ چناں چہ والد صاحب مرحوم کو اطلاع دے دی اور چوں کہ خرچ کم تھا اور اسباب بھی زائد نہ تھا یکم ذی الحجہ (۲۲ر مارچ ۱۹۰۱ء) شام کے وقت پیدل مکۂ معظمہ روانہ ہوگیا۔ قرب حج کی وجہ سے راستے میں پیدل جانے والوں کی کثرت تھی۔ اخیر شب میں بحرہ پہنچ کر کچھ آرام کیا اور پھر دن بھر چل کر شام کو مکۂ معظمہ پہنچا۔

بھائی صاحب مرحوم میرے خط اور جہاز کی خبر سے سخت پریشان اور پشیمان ہوگئے تھے۔ اس واقعے سے بہت خوش ہوئے۔ بفضلہٖ تعالیٰ اور مناسک حج سے فارغ ہوکر جب جدہ پہنچے تو کرائے فی کس پینسٹھ روپے تھا۔ ہم دونوں کے پاس مصارف مکۂ معظمہ اور مصارف حج کی وجہ سے اس قدر مقدار باقی نہیں رہ گئی تھی جو کہ اس وقت کے دخانی جہازوں کے کرائے کے لیے کافی ہوسکے۔ اگرچہ حج پیدل ہی دونوں نے کیا تھا۔ قیام بھی مولانا شفیع الدین صاحب کے پاس تھا۔ مگر خورد ونوش وغیرہ کے مصارف میں اس قدر خرچ ہوچکا تھا کہ ہر ایک کے پاس چالیس چالیس روپیہ تقریباً باقی تھا۔ جہاز کے کرائے کی کمی کا انتظار کیا گیا مگر کم نہ ہوا اور وہ روانہ ہوگیا۔ پھر دوسرا جہاز آیا اور اس کا بھی کرائے اسی قدر گراں تھا۔ وہ بھی روانہ ہوگیا۔ اب بجز اس کے کوئی صورت نہ تھی کہ یا تو جدہ میں مہینہ دو مہینہ ٹھہرا جائے اور آخری جہاز کا جب وقت آئے تو مساکین کے ساتھ روانہ ہوں جو کہ قلت حجاج کی وجہ سے یقینی نہ تھا۔ یا مدینۂ منورہ واپس ہوجائیں یا بادبانی کشتیوں میں مسقط یا مکلا یا عدن کو روانہ ہوجائیں اور وہاں سے کراچی یا بمبئی کو دخانی جہازوں پر روانہ ہوں۔ مگر جدہ کا خرچ پہلے امر کی اجازت نہ دیتا تھا۔ وقت بھی ضائع ہوتا تھا۔ دوسرا امر مقصد کے بالکل مخالف تھا۔ تیسرے اَمر پر بھائی صاحب راضی نہ ہوتے تھے کیوں کہ رابغ سے جدہ تک وہ بادبانی کشتی ہی میں آئے تھے اور ان میں ان کو سخت تکلیف اٹھانی پڑی تھی بلکہ وہ تقریباً ارادہ توڑ چکے تھے۔ جدہ میں ہم میمنوں کی رباط (مسافر خانہ) میں مقیم تھے۔ ایک شخص مستری غلام محمد مرحوم امرتسر کے باشندہ وہ بھی ہندوستان جانا چاہتے تھے اور قلت خرچہ کی وجہ سے دخانی جہازوں میں سفر نہ کرسکتے تھے۔ میں نے اور انھوں نے بھائی صاحب مرحوم کو تیسرے امر پر بمشکل آمادہ کیا اور ایک بڑی کشتی مسقط جانے والی بادبانی جس کو بغلہ کہتے ہیں حاصل کی۔ مبلغ دس روپے فی کس میں اس کا ٹکٹ لیا۔ جب چھوٹی کشتی پر سوار ہوکر (کیوں کہ بغلے اپنی بڑائی کی وجہ سے وسط سمندر میں رہتے ہیں) وہاں پہنچے تو معلوم ہوا کہ بغلہ چھوٹ گیا۔ مجبور ہوکر واپس ہوئے۔ اب بھائی صاحب

مرحوم اور بھی مخالف ہو گئے۔ مگر ایک دوسرے بغلہ کا پتا چلا اس کے لیے بہ مشکل تمام بھائی صاحب کو آمادہ کیا۔ انھوں نے اس کو بہ مشکل اس شرط پر قبول فرمایا کہ اگر یہ بغلہ نہ ملا تو پھر ضرور بالضرور مدینۂ منورہ واپس ہو جائیں گے۔ مگر خدا کے فضل سے یہ بغلہ مل گیا اور ہم اسی پر اسی کرائے میں سوار ہو گئے۔ یہ بغلہ بحرین کے تاجروں کا تھا وہ کھجوریں لے کر آئے تھے اور اس کو فروخت کر کے نیز حج سے فارغ ہو کر واپس ہو رہے تھے۔ اس میں تقریباً ایک سو بیس مسافر تھے۔ کچھ اباضی (خارجی) مسقط کے باشندے تھے اور تقریباً ستر یا اسی بنگالی حجاج تھے اور تین شخص ہم ہندوستانی تھے اور دس پندرہ کشتی بان بحرین کے تھے۔ چوں کہ ہوا قدرے مخالف تھی اس لیے بغلے کو وسط سمندر میں کشتی بان نہیں چھوڑتے تھے، بلکہ کنارے کنارے چلاتے تھے اور دن بھر چلاتے تھے۔ پندرہ دن میں عدن کے قریب پہنچنا ہوا، مگر وہاں ہوا بالکل مخالف ملی اس لیے مکلہ (باوجودے کہ دخانی جہاز سے صرف ایک دن کی مسافت ہے) پندرہ دن میں پہنچنا ہوا۔ خلاصہ یہ کہ جدہ سے ایک مہینہ میں مکلہ پہنچنا ہوا۔ باوجودے کہ ہم نے احتیاطی طور پر کافی خورد و نوش کا سامان لے لیا تھا مگر سب ختم ہو گیا۔ جس کی وجہ سے کشتی والوں سے چاول وغیرہ قرض لیتے تھے اور پھر مکلہ پہنچ کر ان کو ادا کیا گیا۔ مکلہ پہنچنے تک مخالف ہوا کی وجہ سے بغلہ میں حرکت بہت زیادہ ہوئی تھی، اس لیے بھائی صاحب مرحوم اور مستری غلام محمد صاحب کو چکر اور قے بہت آتی رہی۔ سائبان نہ ہونے کی وجہ سے سایے کی بھی تکلیف رہتی تھی۔ مگر مکلہ سے ہوا موافق ملی تو کشتی بانوں نے بغلہ کو وسط سمندر میں ڈال دیا۔ رفتار بھی خوب تیز ہو گئی اور رات دن چلنا ہوا اس لیے سات دن میں مسقط پہنچ گئے۔ حرکت بھی ایسی نہیں ہوئی جس سے متلی یا چکر یا قے ہوتی۔ مجھ کو چوں کہ بحری سفر میں چکر نہیں آتا اس لیے اس تمام سفر میں کوئی خاص تکلیف نہیں ہوئی۔ اس بحری سفر میں، میں نے ایک شب کو خواب میں دیکھا کہ حضرت قطب عالم حاجی امداد اللہ صاحب رحمۃ اللہ علیہ کی خدمت میں مکۂ معظمہ حاضر ہوا ہوں۔ آپ نے فرمایا تو جو کھجوریں مدینۂ منورہ کی دے گیا ہے، اس کو آ کر تقسیم کر دے۔ میں نے عرض کیا کہ حضرت میں تو آپ کے لیے لایا ہوں۔ میرے یہاں تو ان کی دکان ہے۔ تو فرمایا کہ نہیں تو ان کو تقسیم کر دے۔ میں جانتا ہوں کہ ہندوستان میں کھجوریں کتنی دقتوں سے حاصل ہوتی ہیں۔ اس خواب کو میں نے گنگوہ شریف پہنچ کر جب حضرت مرشد قدس اللہ سرہ العزیز سے ذکر کیا تو فرمایا کہ تجھ کو حضرت حاجی قدس اللہ سرہ العزیز کے یہاں سے اجازت ہو گئی۔ میرے یہاں سے بھی اجازت ہو جائے گی۔ اس تعبیر پر میں شرمندہ ہو گیا کیوں کہ میرے

وہم وخیال میں بھی اس وقت اجازت حاصل کرنے کی طلب نہ تھی اور خیال ہوا کہ حضرت رحمۃ اللہ علیہ سمجھیں گے کہ طالب خلافت اس کی غرض وغایت ہے۔

مسقط کے قریب ہی ایک آبادی مطرح ہے، اس میں صرف اہل سنت والجماعت رہتے ہیں۔ مگر مسقط کی زیادہ تر آبادی اباضیوں (خوارج) کی ہے۔ اگر چہ حکومت دونوں جگہ سلطان مسقط ہی کی ہے جو کہ اباضی ہے اس لیے بغلہ والوں نے مطرح میں ہی ہم کو اتارا کیوں کہ وہ سب سنی، شافعی تھے۔ دریافت کرنے پر معلوم ہوا کہ ڈاک کا جہاز کراچی جانے والا ایک روز پہلے جا چکا ہے۔ اب چھ سات دن کے بعد جائے گا۔ اس لیے وہاں سات دن ٹھہرنا پڑا۔ انگریزی عہدہ دار کسٹم کا ہندوستانی مسلمان تھا اس نے جگہ دے دی۔ وہاں قیام کیا گیا اور ساتویں دن جب جہاز آیا تو دو روپیہ فی کس پر کراچی کا ٹکٹ لے کر اس پر سوار ہو گئے اور ایک دن رات سفر کرنے کے بعد کراچی پہنچنا ہو گیا۔ ڈیڑھ مہینہ سے کچھ زیادہ میں یہ سفر طے ہوا۔ ربیع الاول (شروع جولائی ۱۹۰۱ء) کا وسط ہو چکا تھا۔ ہمارے پاس جو کچھ نقد تھا وہ اس قدر خرچ ہو چکا تھا کہ سہارنپور کا ٹکٹ لینے کے بعد راستہ میں کھانے کے لیے صرف تین چار آنے باقی رہ گئے تھے مگر جب ہم نے ڈاک گاڑی پر بیٹھنا چاہا تو ٹکٹ کلکٹر نے روک دیا اور کہا کہ اسباب زائد ہے اس کو وزن کراؤ۔ ہم نے دکھایا کہ وزن زیادہ نہیں ہے، گاڑی کا وقت قریب ہے جانے دیجیے۔ مگر اس نے نہ مانا۔ تلوانے اور بعض غیر ضروری چیزوں کے پھینکنے میں اس قدر دیر لگ گئی کہ گاڑی چھوٹ گئی۔ بالآخر دوسری پسنجر گاڑی میں روانگی ہوئی، جو کہ لاہور تک نہیں جاتی تھی۔ اس لیے اس نے راستہ میں چھوڑ دیا اور وہاں ایک شب پڑا رہنا پڑا اور جو چند آنے کھانے کے لیے ہمارے پاس تھے وہ بھی خرچ ہو گئے۔ اگلے دن ڈاک گاڑی میں روانگی ہوئی تو کھانے کا کچھ سامان نہ تھا۔ بالآخر مطرح سے کچھ مسقط کے حلوے کے ڈبے ہم نے ہدیے کے لیے خریدے تھے، ان کو مسافروں کے ہاتھ فروخت کر کے روٹی کھائی۔ اخیر شب میں گاڑی سہارن پور پہنچی۔ چوں کہ ہمارے پاس مدینۂ منورہ کی کھجوریں اور دیگر تبرکات تھے اور کھجوروں پر چنگی لگنی ضروری تھی، پیسے پاس نہ تھے اس لیے معہ اسباب اسٹیشن کی مسجد میں ٹھہر گیا اور بھائی صاحب حضرت مولانا خلیل احمد صاحب مرحوم کی خدمت میں اس لیے چلے گئے کہ وہاں سے کچھ پیسے لا کر چنگی والوں کو دے دیے جائیں گے۔ مگر مولانا مرحوم نے ان کو روک لیا اور کسی خادم کو معہ پیسوں کے بھیج دیا۔ پھر حضرت مولانا کی خدمت میں حاضری کی سعادت مجھ کو بھی نصیب ہوئی۔ بھائی صاحب مرحوم وہاں سے براہ راست گنگوہ شریف روانہ

ہو گئے۔ مگر میں نے یہ مناسب سمجھا کہ پہلے دیوبند حاضر ہولوں اور اس کے بعد وہاں سے گنگوہ شریف کا قصد کروں جو ہدایا وہاں کے حضرات کے ہیں وہ بھی پہنچا دیے جائیں گے اور ان کی زیارت کا بھی شرف حاصل ہو جائے گا اور پھر باطمینان گنگوہ شریف قیام ہو سکے گا۔ گنگوہ شریف کے لیے جو تبرکات عامہ تھے وہ بھائی صاحب اپنے ساتھ لے گئے۔ مگر حجرہ شریفہ کا غبار، مسجد شریف کی کھجوریں (اس زمانے میں صحن مسجد نبوی میں بھی چند درخت کھجوروں کے تھے) اور بعض خصوصی دیگر تبرکات میرے ہی پاس تھے۔ چوں کہ حجرۂ مطہرۂ نبویہ (علی صاحبہا الصلوٰۃ والسلام) کے خاص خدام جن کو آغاوات کہتے ہیں، مجھ سے پڑھا کرتے تھے، اس لیے خصوصی تبرکات مجھ کو حاصل کرنے میں آسانی ہوتی تھی۔ میں اول دیوبند گیا اور حضرت شیخ الہند رحمۃ اللہ علیہ اور دیگر اساتذہ کرام سے شرف ملاقات حاصل کیا۔ میری ایک غرض اس میں یہ بھی تھی کہ میں حضرت مرشد قدس اللہ سرہ العزیز کی بارگاہ میں تنہا اور پیادہ پا حاضر ہوں۔ بھائی صاحب پیادہ چلنے پر راضی نہ تھے۔

چوں کہ ہم کو جدہ سے روانہ ہو کر تقریباً دو ماہ گزر چکے تھے، اس لیے حضرت والد صاحب مرحوم بے تاب تھے کیوں کہ اس مدت طویل میں ان کو کوئی خبر ہماری نہ ملی تھی۔ وہ اس خیال میں تھے کہ جہاز آٹھ دس دن میں بمبئی پہنچتا ہے تو پندرھویں، سولھویں دن بمبئی یا کراچی پہنچنے کی خبر آجانی چاہیے۔ اس لیے انھوں نے گنگوہ شریف حضرت قلب عالم رحمۃ اللہ علیہ کی خدمت میں خط بھیجا کہ بقصد حاضری بارگاہ عالی میرے فلاں فلاں لڑکے روانہ ہو چکے ہیں مگر ابھی تک کوئی خبر ان کے پہنچنے کی معلوم نہیں ہوئی۔ اس لیے وہاں بھی انتظار تھا۔ بھائی صاحب مرحوم کے پہنچنے سے پہلے حضرت رحمۃ اللہ علیہ نے دو جوڑے نئے کپڑوں کے کرتہ پائجامہ تیار کرا رکھے تھے۔ جب بھائی صاحب پہنچے تو فرمایا کہ میں نے تم دونوں کے لیے ایک ایک جوڑا کپڑوں کا تیار کرا رکھا ہے، مگر جب دوں گا کہ حسین احمد آ جائے۔ نیز پوچھا کہ حجرۂ شریفہ کا غبار بھی لائے ہو یا نہیں؟ بھائی صاحب نے فرمایا کہ وہ حسین احمد کے ساتھ ہے جو تبرکات، کھجوریں، زمزم وغیرہ بھائی صاحب لے گئے تھے ان کو پیش کیا اور مشرف بقبولیت ہوئے۔

دیوبند میں ایک دن قیام کرنے کے بعد ظہر کے بعد پیدل روانہ ہوا اور چوں کہ گرمیوں کے دن تھے اس لیے راتوں رات چل کر صبح کو نو دس بجے گنگوہ شریف پہنچا۔ اپنی نالائقی اور تن پروری اور راہ طریقت میں کسل مندی وغیرہ کی وجہ سے خجالت اور شرمندگی کا اثر بہت قوی تھا۔ اس لیے

راستے میں برابر گریہ طاری رہتا تھا اور شوق حضوری بارگاہ کشاں کشاں قدم بڑھا رہا تھا۔ بالآخر حاضر خدمت ہوا اور شرف ملاقات سے فیضیاب ہوا۔ بہت زیادہ شفقت فرمائی اور دونوں جوڑے عنایت فرمائے۔ چوں کہ ان میں عمامے نہ تھے اس لیے بھائی صاحب نے عرض کیا کہ حضرت ہم اپنے اپنے عمامے لے کر آتے اور پیش کرتے ہیں۔ آپ اپنی طرف سے ہم کو وہ عطا فرمادیں تاکہ جوڑا مکمل ہو جائے تو ارشاد فرمایا کہ نہیں پھر دیکھا جائے گا۔ اس کے بعد ذات بحت کا مراقبہ تعلیم فرمایا اور کہا کہ یہ چیز وہاں کس طرح لکھی جاسکتی تھی۔

اس زمانے میں حضرت مولانا محمد یحییٰ صاحب مرحوم کاندھلوی حاضر باش خدمت تھے۔ ان سے کہلوایا کہ دونوں سے پوچھو کیوں آئے ہیں؟ اگر مدرسی یا ملازمت کے قصد سے آئے ہوں تو کوئی کوشش کی جائے۔ مجھ کو اس پر تعجب ہوا۔ میں نے عرض کیا کہ میں کسی دنیاوی مقصد یا نفسانی غرض سے نہیں آیا۔ میرا مقصد بجز طلب ذات حق سبحانہ اور کوئی نہیں ہے۔ ارشاد ہوا تھا کہ ایک مہینہ کے لیے تو یہاں آجا، اس لیے حاضر ہوا ہوں۔ میں کوئی دوسرا مقصد نہیں رکھتا۔ اس کو سن کر سکوت فرمایا۔

خانقاہ قدوسیہ میں ہر ایک کو ایک ایک حجرہ مل گیا اور وہاں رہنے لگے۔ کھانے کے لیے ارشاد فرمایا گیا کہ ہمارے یہاں سے دونوں کا کھانا آیا کرے گا۔ چناں چہ جب تک قیام رہا، حضرت رحمۃ اللہ علیہ کے یہاں سے ہی کھانا آتا رہا۔ غبار حجرۂ مطہرہ پیش کیا گیا۔ اس کو سرمہ میں ڈلوایا اور روزانہ اس سرمہ کو استعمال فرماتے رہے۔ مسجد نبوی علی صاحبہا الصلوٰۃ والسلام کی کھجوروں کے تین دانے پیش کیے گئے۔ ان کو تقریباً ۲۷ حصوں میں کر کے تقسیم فرمائے۔ مدینۂ منورہ کی کھجوریں جو تقسیم کی گئیں ان کے متعلق ہدایت فرمائی کہ ان کی گٹھلیاں نہ پھینکی جائیں ان کو ہاون دستے میں کٹوا کر رکھ لیا اور روزانہ اس میں سے تھوڑا سا پھانک لیا کرتے تھے۔

میں نے تعلیم فرمودۂ مراقبہ پر عمل کرنا شروع کردیا۔ عصر کے بعد جب کہ صحن میں مجلس عمومی فرماتے تھے تو میں نے اس مراقبہ میں حجرہ قدوسیہ (جس میں حضرت رحمۃ اللہ علیہ رہتے تھے) کے برآمدہ میں ستون کے پیچھے (تقریباً دو تین گز فاصلے سے) مشغول ہو جاتا تھا۔ مغرب کے وقت تک مشغول رہتا تھا۔ حضرت رحمۃ اللہ علیہ کے یہاں مثل مشائخ نقشبند توجہ اور حلقے کی کوئی مجلس نہیں ہوئی تھی۔ البتہ مسترشدین اپنی اپنی جگہ اپنے مشغلۂ قلبی میں مشغول ہو جاتے تھے۔ عادت شریف یہ تھی کہ صبح کی نماز کے بعد حجرہ شریف میں داخل ہوتے اور دروازہ بند کر لیتے۔ مشاغل

روحانیہ میں مشغول ہوکر ڈیڑھ دوگھنٹہ دن چڑھنے کے بعد دروازہ کھلتا اور صحن میں گولر کے درخت کے نیچے بیٹھتے تھے۔ مہمانوں سے باتیں، خطوط کے جوابات، فتاوٰی وغیرہ اسی وقت انجام پاتے تھے۔ یہ عام مجلس تقریباً گیارہ بجے تک رہتی تھی۔ مسترشدین کو اگر کوئی بات مجمع میں پوچھنی ہوتی تھی، اسی وقت پوچھتے تھے۔ ذاکرین اپنے کمروں میں مشغول رہتے تھے۔ اس کے بعد حضرت رحمتہ اللہ علیہ مکان تشریف لے جاتے تھے اور کھانے کے بعد تشریف لاکر قیلولہ فرماتے تھے۔ ظہر کے بعد حجرۂ شریفہ میں دروازہ بند کر کے تلاوت قرآن شریف وغیرہ میں تھوڑی دیر مشغول رہتے تھے۔ پھر دروازہ کھلتا تھا۔ اس زمانے میں معجم کبیر طبرانی کا ایک قلمی نسخہ آیا ہوا تھا۔ چوں کہ آنکھوں سے معذور ہوگئے تھے اس لیے اسی وقت مجھ سے پڑھوا کر سنا کرتے تھے۔

عصر کے بعد خدمت میں قریب بیٹھ کر مشغولیت مراقبہ سے مجھ کو نہایت قوی اور بہت زیادہ فائدہ ہوتا تھا۔ چند دنوں کے بعد میں نے خواب میں دیکھا کہ کسی میدان میں وہ گولر جو صحن حجرہ میں تھا اور اس کے سایے میں حضرت رحمتہ اللہ علیہ بیٹھا کرتے تھے، کھڑا ہے اور اس میں گولر پکے ہوئے لگے ہیں۔ کچھ لوگ ڈلے پھینک رہے ہیں تاکہ پکا ہوا گولر حاصل کریں۔ میں نے بھی یہی کوشش کی مگر کوئی گولر ہاتھ نہیں آیا۔ یکایک دیکھا کہ ایک پکا ہوا گولر مع اس ٹہنی کے جس میں وہ لٹک رہا تھا خود بخود ٹوٹا اور لٹکتا ہوا نیچے اترتا ہوا آہستہ آہستہ میرے پاس آ گیا اور میں نے ہاتھ میں لے لیا۔ اس خواب کو میں نے حضرت رحمتہ اللہ علیہ سے عرض کیا تو فرمایا کہ ثمرۂ مقصود ہاتھ آئے گا اور ایک روز عشاء کے بعد دوسرے خدام کے ساتھ میں بھی حضرت رحمتہ اللہ علیہ کا بدن دبا رہا تھا۔ میں پشت کی طرف تھا، دباتے دباتے آنکھ جھپک گئی تو دیکھا کہ ایک شخص کہتا ہے کہ چالیس دن گزرنے کے بعد مقصود حاصل ہوگا۔ اس تاریخ کے ٹھیک چالیس دن گزرنے پر عصر کے بعد حضرت رحمتہ اللہ علیہ نے بھائی صاحب مرحوم سے فرمایا کہ اپنے اپنے عمامے لے آؤ۔ بھائی صاحب لے آئے۔ حضرت نے ہر ایک کے سر پر اس کا عمامہ باندھ دیا۔ جس وقت حضرت رحمتہ اللہ علیہ میرے سر پر عمامہ باندھ رہے تھے مجھ پر زوردار گریہ طاری تھا اور اپنی کم مائیگی اور خجالت کا شدید احساس تھا۔ اس کے بعد بھائی صاحب سے فرمایا کہ جانتے ہو یہ کیسی دستار ہے؟ بھائی صاحب نے عرض کیا کہ دستار فضیلت ہے۔ فرمایا کہ ''نہیں، دستارِ خلافت ہے، میری طرف سے تم دونوں کو اجازت ہے۔''

بھائی صاحب مرحوم کو بہت خوشی تھی مگر مجھ پر اس وقت سخت صدمہ تھا اور بار بار روتا

تھا، کیوں کہ اپنی نا قابلیت، نامرادی اور بدحالی مشاہد تھی اور اس صدمے کا اثر چہرے اور گفتار و رفتار وغیرہ پر ظاہر تھا۔ مولانا صادق الیقین صاحب مرحوم نے (موصوف کرسی ضلع لکھنو کے باشندے اور حضرت گنگوہی قدس اللہ سرہ العزیز کے خاص خلفاء میں سے تھے) جب کہ اس صدمے کا مذاکرہ ہو رہا تھا اور میں نے اپنی بے بضاعتی اور بدحالی کا تذکرہ کیا تھا۔ فرمایا کہ مخبر صادق نے خبر دی ہے۔ اس کا اعتبار ہونا ضروری ہے۔ اس لیے کہ دو تین دن بعد میں نے عرض کیا کہ سلسلۂ نقشبندیہ کا سلوک بھی میں طے کرنا چاہتا ہوں تو فرمایا کہ جو تعلیم میں نے دی ہے، وہ سب کی بالکل آخری تعلیم ہے۔ یہاں پر تمام سلاسل مل جاتے ہیں۔ اسی کو مشق کرو۔ اسی میں جد و جہد کر کے پیر مرید سے بڑھ جائے یا مرید پیر سے بڑھ جائے۔

اس میں شک نہیں کہ اس مدت میں جو احوال اور کیفیات قلب پر وارد ہوتی تھیں یا جو رویائے صالحہ وغیرہ پیش آتی تھیں، ان کا تذکرہ حضرت رحمتہ اللہ علیہ سے کر دیا کرتا تھا۔ اثنائے سلوک میں انوار مکاشفات، الہامات وغیرہ بالکل پیش نہیں آئے۔ ایک مرتبہ برقی کیفیت کے انوار پیش آئے۔ حضرت رحمتہ اللہ علیہ سے ذکر کیا تو وہ کیفیت بھی جاتی رہی۔ ہاں یہ بہت پیش آیا کہ اپنے سامنے بدر یا تیز روشنی کی شمع یا دائیں جانب ایک ایک یا دو دو شمع بین النوم والیقظہ دیکھتا تھا۔ جس کی تعبیر ظاہر ہے۔ یہ حالت مدینۂ منورہ میں بھی اور بعد میں احمد آباد جیل وغیرہ میں کبھی کبھی رہتی تھی۔ جس سے حضرت مرشد قدس اللہ سرہ العزیز اور جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی روحانی امداد معلوم ہوتی تھی۔

دو ماہ سے دو چار دن تقریباً زیادہ حاضر باشی کو ہو گئے تھے کہ یک بارگی بعد از اجازت یہ کیفیت پیش آئی کہ نماز میں بھی اور باہر بھی، یہ تمام فضا بین السموات والارض مجھ کو تنگ معلوم ہونے لگی اور نماز میں اس قدر اس کا اثر ہوا کہ جی چاہتا تھا کہ نماز توڑ کر بھاگ جاؤں۔ حضرت رحمتہ اللہ علیہ سے عرض کیا تو فرمایا کہ کلیر شریف وغیرہ ہو آؤ۔ حضرت قطب عالم حاجی امداد اللہ صاحب رحمتہ اللہ علیہ کو بھی جب قبض پیش آیا تھا تو ایسے مقامات پر تشریف لے جاتے تھے۔ چناں چہ ہم دونوں کلیر شریف اور دیوبند وغیرہ گئے اور چند دنوں میں واپس آ گئے۔ یہ حالت اس سفر میں جاتی رہی۔ واپسی کے بعد تقریباً پندرہ دن قیام رہا۔ پھر فیض آباد اور بھوپال وغیرہ کا سفر پیش آیا۔ وہاں سے واپسی پر موسم حج قریب آ گیا۔ حضرت رحمتہ اللہ علیہ نے دو حج بدل اپنے اعزہ کے عطا فرمائے جن سے مدینۂ منورہ تک واپسی کی صورت ہو گئی۔ اس زمانے میں بھی بمبئی اور

کراچی کے بندر بند تھے۔ پور بند سے حجاج کی جہاز کی روانگی مقرر ہوئی تھی۔ غالباً ابتدائی شوال (جنوری ۱۹۰۲ء) میں جہاز روانہ ہوا۔ ذیقعدہ کے ابتدا (فروری ۱۹۰۲ء) میں جدہ پہنچا اور پھر بعد از حج ابتدائے ۱۳۲۰ھ (اپریل ۱۹۰۲ء) میں مدینۂ منورہ پہنچنے کا شرف حاصل ہوا۔

اس مدت میں طلبہ میں کافی شہرت ہو چکی تھی۔ ابتدائی کتابیں بھی صاف ہو چکی تھیں۔ عربی تقریر کی مشق بھی اچھی طرح ہو گئی تھی۔ اس لیے طلبہ کا ہجوم زیادہ ہوا۔ ضروری تھا کہ کچھ وقت مشاغل طریقت کے لیے روزانہ مقرر کیا جاتا اور اس میں تعلیم فرمودہ اشغال کو انجام دیا جاتا، مگر بدقسمتی سے جب بھی اس کے لیے بیٹھتا تو ہجوم خواطر و احادیث نفس و غلبۂ نوم سے پریشان ہو جاتا۔ ادھر طلبہ کے ہجوم نے اس پر مجبور کر دیا کہ جس قدر بھی ممکن ہو ان کو اوقات تعلیم کے لیے دیے جائیں۔ بالآخر اپنی بدقسمتی اور شومیِ احوال کی شکایت اور مشاغل تدریسیہ کی کیفیت حضرت قطب العالم قدس اللہ سرہ العزیز کی بارگاہ میں لکھی تو جواب آیا کہ ''پڑھاؤ اور خوب پڑھاؤ''۔ نفس کو یہ جواب خوب پسند آیا۔ مشاغل طریقت تو تقریباً چھوٹ گئے اور مشاغل تعلیمیہ اس قدر جملہ فنون میں بڑھ گئے کہ دن رات میں تقریباً تین گھنٹہ بہ مشکل سونا ہوتا تھا۔ باقی اوقات تدریس اور مطالعہ اور شخصی ضروریات میں صرف ہوتے تھے۔ اس سے علوم و فنون میں تو قوت بحمد اللہ ترقی کرتی رہی مگر معرفت و طریقت میں پسماندگی ہی رہی۔

یہ کس قدر بدنصیبی تھی کہ حضرت قطب عالم مرشد گنگوہی رحمۃ اللہ کی خدمت میں حاضر باشی کا شرف تین مہینہ کامل بھی نصیب نہ ہوا۔ حال آں کہ ان کی بارگاہ میں حاضری اور مشغولیت سے جو فیض روحانی میں محسوس کرتا تھا، وہ نہایت ہی عظیم تھا اور اصلاح حال بہت زیادہ ہوتی تھی۔ کاش کچھ عرصے تک اس کے حصول کی نوبت آتی تو خدا جانے کہاں تک ترقی ہو جاتی مگر:

تہیدستان قسمت راچہ سود از رہبر کامل
کہ خضر از آب حیواں تشنہ می آرد سکندرا

بدقسمتی نے چاروں طرف سے گھیر لیا اور ایسے اسباب و عوارض پیش آ گئے جنھوں نے قیام نہ کرنے دیا۔ یہ وہ زمانہ ہے کہ گھر کے لوگوں پر مدینۂ منورہ میں سخت عسرت کا حال گزر رہا تھا۔ والد صاحب مرحوم کے بھی تقاضے آتے تھے۔ جن کی بناء پر بھی حضرت گنگوہی رحمۃ اللہ علیہ نے جلد واپسی کا ارشارہ فرمایا۔ بہرحال شومیِ قسمت اور طبعی رذالت، تن پروری، کسل مندی، عدم استقلال، راحت طلبی وغیرہ نے ایسے گل کھلائے کہ باوجود ہر قسم کے سامان ترقی کے محرومیت کا ہی

منہ دیکھنا پڑا:

سو دہ گشت از سجدۂ راہ بتاں پیشانیم
چند برخود تہمت دین مسلمانی نہم

اس میں شک نہیں کہ اللہ تعالیٰ نے اپنے خاص فضل وکرم سے ایسی مقدس اور بابرکت اور کاملین اہل اللہ کے دروں تک پہنچایا جو کہ نہ صرف اپنے زمانے کے ممتاز اور مایۂ ناز اور آسمان طریقت وشریعت کے درخشندہ آفتاب تھے بلکہ صدیوں میں بھی زمانے کو ایسی ہستیاں نصیب نہیں ہوئی تھیں، مگر اپنی دنات اور خست کی وجہ سے میں حقیقی معنوں میں ان بزرگوں بلکہ تمام سلسلے کے لیے ننگ اور عار ہوا۔ کاش ان قدموں کی برکت سے مغفرت اور اصلاح حال کی نعمت اور رضائے الٰہی حاصل ہو جائے۔ وما ذلک علی اللہ بعزیز۔

یظن الناس بی خیراً وانی
لشر الناس ان لم یعف عنی

(نقش حیات: حصہ اول، صفحہ ۱۰۴۔۸۹)

۱۹۰۱ء

بنگال کا قومی نعرہ

کچھ عرصے سے جو قبولیت بندے ماترم کے نعرے کو بنگال میں اور بعض دیگر مقامات میں حاصل ہوئی ہے۔ اور جس قدر شورش اور غلط فہمی اس سے پیدا ہوئی ہے۔ اسے دیکھ کر ہم نے سوچا۔ کہ اگر اس نظم کا جس سے یہ الفاظ لیے گئے ہیں۔ اردو ترجمہ شائع کیا جائے۔ تو خالی از فائدہ نہ ہوگا۔ ایک طرف بنگال کے انگریزی حکام اس نعرے سے ناراض ہیں۔ دوسری طرف وہاں کے اکثر مسلمان اس کے سننے سے گھبراتے ہیں۔ اس صورت میں حقیقت حال کا ظاہر کر دینا مفید ہے اور علاوہ اس کے وہ بنگالی نظم جس میں یہ الفاظ آتے ہیں۔ نیچرل شاعری کے لحاظ سے بھی قابل ترجمہ ہے۔

مندرجۂ ذیل نظم ہمیں لالہ گل بہار سنگھ صاحب ایم۔ اے نے سنسکرت سے ترجمہ کر کے عنایت کی ہے۔ اور وہ یقین دلاتے ہیں کہ یہ اس نظم کا لفظی ترجمہ ہے۔ جس سے کسی کو برافروختہ ہونے کی کوئی وجہ نہیں۔ ہر ملک میں شعرا نے اپنے وطن کی تعریف میں زور طبع دکھایا ہے۔ اگر کچھ عیب ہوگا۔ تو اس طریق میں ہوگا۔ جس سے یہ آوازہ بلند کیا گیا۔ یا ان حالات میں جو بنگال میں ایسی سخت ناراضگی کا باعث ہوئے ہیں:

آؤ جھکائیں سر کو بھارت ہماری ماں ہے!

میٹھا ہے اس کا پانی، شیریں ہیں پھل یہاں کے — کھیتی ہری بھری ہے، پودے ہیں لہلہاتے
راتوں کو چاندنی ہے خوشبو میں گل سنگھاتے — آتش جگر کی جنگل صندل کے ہیں بجھاتے
بھولی ہے مسکراہت، آواز پیاری پیاری — راحت ہیں اس سے پاتے، اپنی مراد پاتے

محسن ہے، مہرباں ہے، سارے جہاں کی جاں ہے
آؤ جھکائیں سر کو بھارت ہماری ماں ہے!

تیرے کروڑوں بیٹے، سب آن بان والے — ہاتھوں میں تیغ جن کے، تیر و کمان والے
بازو میں تیرے طاقت، تری کمر میں بوتا — تیرے ہیں زیر فرماں سب آسمان والے
ہودیں فرار دشمن تجھ کو جو دیکھ پاویں — کہتے ہیں تجھ کو بے بس کیوں کر جہان والے

محسن ہے، مہرباں ہے، سارے جہاں کی جاں ہے

آؤ جھکائیں سر کو بھارت ہماری ماں ہے!

ایمان تو ہے، تو ہی دانشوری ہماری
شریان تو ہے، تو ہی ہے زندگی ہماری
دل ہے بدن میں تو ہی، بازو میں تو سکت ہے
تیرے ہی سے کھلی ہے دل کی کلی ہماری
تو ہے عقیدہ دل میں ماتا! ہمیشہ دیکھیں
ہر جا تجھے ہی آنکھیں الفت بھری ہماری

محسن ہے، مہرباں ہے، سارے جہاں کی جاں ہے
آؤ جھکائیں سر کو بھارت ہماری ماں ہے!

ہادی کہیں تجھے ہم، تو بے بہا ہے دولت
علم و ہنر کے موتی ہم کو کیے مرحمت
ترچھی تری نظر ہے، چتون تری ہے بانکی
بجلی ترا تبسم، زینت تیری قیامت
پانی ترا ہے میٹھا، پھل ہیں مزے مزے کے
صورت تری پیاری، اچھی تری ہے سیرت
تو ہے بہار کی ماں، گُل کو کھلانے والی
سبزہ بڑھا رہا ہے، کیا کیا تری ملاحت

محسن ہے، مہرباں ہے، سارے جہاں کی جاں ہے
آؤ جھکائیں سر کو بھارت ہماری ماں ہے!

گُل بہار سنگھ

(مخزن، لاہور۔ اکتوبر ۱۹۰۱ء)

جنگ افریقہ:

۳۱/اکتوبر ۱۹۰۱ء: جنگ ٹرانسوال جنوبی افریقہ اب تک مابین برٹش گورنمنٹ اور بوئروں کے قائم ہے جس کا آغاز ۱۱/اکتوبر ۱۸۹۹ء کو ہوا تھا۔ اگرچہ بوئر بوجہ کی فوج برابر دو تین روز تک جنگ نہیں کر سکتے ہیں تاہم سرکار کی ایک بڑی فوج سے جس کی تعداد دو لاکھ ترپن ہزار ہے، برابر مقابلہ کرتے رہتے ہیں۔

اجلاس کانگریس:

۱۴/دسمبر ۱۹۰۱ء: کلکتہ میں آل انڈیا کانگریس کا سترھواں سالانہ اجلاس ہوا ۱۸۹۶ نمائندوں کی موجودگی میں شری ڈین شا ایڈل جی واچا کی صدارت میں منعقد ہوا۔ آزادی وطن کے دیوانوں نے اس اجلاس میں شرکت کی۔ ہندو مسلم منافرت کو مٹانے پر تقریریں ہوئیں۔ گاندھی جی نے جو اس اجلاس میں شریک تھے اپنی تقریر میں جنوبی افریقہ کے لاکھوں ہندوستانیوں کے ساتھ اس غلط

اور ظالمانہ سلوک کا ذکر کیا جو وہاں کے انگریزوں کا معمول بن چکا تھا۔ اس کے تدارک کے لیے چند تجاویز پاس ہوئیں اور ساتھ ہی انگلینڈ میں ہونے والے پولیس کے مقابلۂ امتحانات میں ہندوستانیوں کی زیادہ شمولیت اور فوج کے اعلیٰ عہدوں پر ان کے تقرر کا مطالبہ کیا گیا۔

کلکتہ کے اسی اجلاس میں کالی چرن بنرجی نے جو ایک مخلص ہندوستانی عیسائی تھے، اپنی ایک تجویز پیش کرتے ہوئے تقریر کی کہ ہندوستانی معاملوں (اپیل) کی سماعت کے لیے پریوی کونسل کی جو جیوڈیشل کمیٹی بنتی ہے، اس میں ہندوستانی وکیل بھی رکھے جائیں۔ (حسرت موہانی...... ایک سیاسی ڈائری، ص ۲۸)

۱۹۰۲ء

بیواؤں کی مردم شماری:

۲۱ رجنوری ۱۹۰۲ء: آج کے اودھ اخبار سے واضح ہو کہ ۱۸۹۱ء کی مردم شماری کی رو سے بیوہ عورتوں کی تعداد دو کروڑ چھبیس لاکھ ستاون ہزار چار سو چھبیس ہے، جس میں ہندو بیواؤں کی تعداد مع جین مت کے ایک کروڑ چورانوے لاکھ ترپن ہزار پانچ سو چھیاسی ہے اور مسلمان و عیسائی وغیرہ بیواؤں کی تعداد بتیس لاکھ تین ہزار آٹھ سو چھیالیس ہے۔ اس ملک کی مردم شماری قریب تیس کروڑ کے ہے۔ اگر نصف مرد نصف عورتیں ہوں تو گویا دس کروڑ عورتوں میں قریب دو کروڑ کے بیوہ ہیں۔ یعنی پانچ عورتوں میں ایک بیوہ۔ چوں کہ تعداد بیواؤں کی بہت زائد ہے، لہٰذا اگر اصلاح دہندگان قوم ان کے عقد ثانی کی جانب متوجہ ہو جائیں تو ایک سخت مشکل آسان ہو سکتی ہے۔

(ایک نادر روزنامچہ، ص ۳۳)

آبادی لندن:

یکم فروری ۱۹۰۲ء: لندن کی مردم شماری انتالیس لاکھ، ۲۶ ہزار، ۵۴۱ ہے جس کی تصدیق اودھ اخبار مورخہ امروزہ سے ہوئی۔ دس سال گزشتہ میں تین لاکھ کا اضافہ ہوا۔

وفات لارڈ ڈفرن:

۱۴ رفروری ۱۹۰۲ء: لارڈ ڈفرن صاحب سابق گورنر جنرل نے ۱۲ رفروری ۱۹۰۲ء کو بمقام لندن رحلت کی۔

مردم شماری:

۷؍مارچ ۱۹۰۲ء: جو مردم شماری یکم مارچ ۱۹۰۱ء کو تمامی ہندوستان کی ہوئی۔ اس کی رو سے اخبار پانیر میں جو نقشہ جات شائع ہوئے ہیں، اس کی تعداد حسب ذیل ہے:

مرد چودہ کروڑ ننانوے لاکھ ترپن ہزار سات سو اکسٹھ، عورتیں چودہ کروڑ چوالیس لاکھ آٹھ ہزار ۹ سو گیارہ۔ کل آبادی ۲۹ کروڑ تینتالیس لاکھ باسٹھ ہزار چھ سو بہتر آدمی ہیں۔ اس حساب سے پچپن لاکھ چوالیس ہزار ۸۵۴ آدمی بمقابلہ عورتوں کے زیادہ قرار پاتے ہیں۔ (ایک نادر روزنامچہ، ص ۳۳)

جنگ بوئرز:

۲۹؍مارچ ۱۹۰۲ء: ۲۹ مارچ ۱۹۰۲ء جنوبی افریقہ ٹرانسوال کے بوئرز نے جو برٹش گورنمنٹ سے ۱۱؍اکتوبر ۱۸۹۹ء کو لڑائی شروع کی تھی وہ ابھی تک بدستور جاری ہے۔ سچ یہ ہے کہ وہ لوگ نہایت جری ہیں۔ باجودے کہ ان کی فوج بہت قلیل ہے اور انگریزوں کی ڈھائی لاکھ سے زیادہ ہے لیکن وہ برابر مقابلہ کر رہے ہیں اور اکثر مقاموں پر انگریزوں کو فاش زک دی۔ اگرچہ ایک روز یہ شدنی ہے کہ وہ مغلوب ہو کر اطاعت قبول کر لیں گے مگر ابھی تک ان کے دم خم وہی ہیں۔

۳؍جون ۱۹۰۲ء: آج کے اودھ اخبار سے واضح ہوا کہ جو لڑائی برٹش گورنمنٹ اور جنوبی افریقہ کے بوئرز کے درمیان ۱۱؍اکتوبر ۱۸۹۹ء سے ہو رہی تھی اور فریقین کے بڑے بڑے نامی افسر مقتول و مجروح ہوئے تھے، اب دونوں میں تاریخ ۳۱؍مئی ۱۹۰۲ء کو صلح ہوگئی۔ کوئی شک نہیں کہ کہ بوئر لوگ نہایت جری، جفاکش اور بہادر ہیں جنھوں نے اپنی تھوڑی فوج سے ایک بہت بڑی سلطنت ذی مقدور سے جس کی کئی لاکھ فوج ان کے مقابل تھی دو سال سات مہینے تک برابر لڑتے رہے اور بہت کچھ نقصان اسے پہنچایا اور جس کا کروڑوں روپیہ اس جنگ میں صرف ہوگیا۔

۷؍جون ۱۹۰۲ء: آج کے اودھ اخبار سے معلوم ہوا کہ جنگ جنوبی افریقہ میں جو بوئر لوگوں کے ساتھ سرکار انگریزی سے ۱۱؍اکتوبر ۱۸۹۹ء شروع ہوئی تھی اور ۳۱؍مئی ۱۹۰۲ء کو بذریعہ صلح ختم ہوئی اس میں سرکار انگریزی کا ۱۶۰ ملین پونڈ جو مساوی ۲۴ ملین روپے کے ہے، صرف ہوا۔ اس صرف میں معمولی فوجی صرفہ جو بالفعل بہت زیادہ ہوگیا ہے داخل نہیں ہے اور نہ وہ روپیہ شامل ہے جو گورنمنٹ کو اختتام جنگ کے بعد صرف کرنا ہوگا جس کی تعداد دس ملین پونڈ ہوگی۔ شرائط صلح میں

جو مابین ڈچ کاشتکاروں اور گورنمنٹ انگریزی ہوئی ہے اس کی شرط پنجم یہ ہے کہ ڈچ کاشتکار اپنی حفاظت جان و مال کے خیال سے اپنی رائفل و بندوقیں اپنے پاس رکھیں گے اور چھٹی شرط یہ ہے کہ مصارف جنگ کے متعلق جنوبی افریقہ کے ٹرانسوال والوں سے کچھ نہیں لیا جائے گا۔

۹/ جون ۱۹۰۲ء: لارڈ کچنر صاحب سپاہ سالار جنوبی افریقہ کو بہ سلسلہ ان کے حسن خدمات کہ انھوں نے بوئر لوگوں سے ۳۱/ مئی کو صلح کرادی پچاس ہزار پونڈ انعام دیا گیا اور خطاب ''وائی کاؤنٹ'' ان کو شہنشاہ انگلینڈ نے مرحمت فرمایا اور قبل اس کے لارڈ رابرٹس کو بخدمات و کارگزاری جنوبی افریقہ کے ایک لاکھ پونڈ انعام میں ملا تھا۔ اس صلح سے جو ٹرانسوال میں بوئر لوگوں سے ہوئی تمامی ہندوستانی عموماً اور اہل انگلینڈ خصوصاً خوشیاں منا رہے ہیں۔

۱۰/ جون ۱۹۰۲ء: بہ معائنہ اودھ اخبار امروزہ سے واضح ہوا کہ بحوالہ بیان محکمہ جنگ جنوبی افریقہ کی لڑائی میں ایک ہزار پچھتر افسر اور پینتیس ہزار آٹھ سو بہتر سپاہی ہلاک ہوئے اور تین ہزار ایک سو سولہ افسر اور پچھتر ہزار تین سو چودہ سپاہی معزول الخدمت قرار پاکر انگلینڈ کو واپس بھیجے گئے۔

(ایک نادر روزنامچہ، ص ۸۵)

صوبہ برار:

۱۸/ دسمبر ۱۹۰۲ء: گورنمنٹ انگریزی نے نظام حیدرآباد کو مجبور کر کے اقرارنامے پر دستخط کرالیے جس کا منشا یہ ہے کہ ۲۵ لاکھ روپیہ سالانہ بعوض صوبہ برار دواماً نظام حیدرآباد کو دیتی رہے گی۔ سنا جاتا ہے کہ فی الحال صوبہ مذکور کی آمدنی ایک کروڑ روپیہ سال کی ہے۔ سنا گیا کہ نظام کو اس قدر موقع نہیں ملا کہ اس بارہ خاص میں اپنے وزراء سے پورے طور پر صلاح کریں۔ (ایک نادر روزنامچہ، ص ۶۴)

۲۳/ دسمبر ۱۹۰۲ء: احمدآباد میں سریندرناتھ بنرجی کی زیر صدارت آل انڈیا کانگریس کا اٹھارھواں ۱۸ سالانہ اجلاس منعقد ہوا جس میں ۴۷۱ ڈیلیگیٹ شریک ہوئے۔ نمک پر عائد شدہ ٹیکس کے خلاف تجویز پاس ہوئی اور یہ کہ برٹش سرکار جو اپنی یورپین فوج پر سالانہ ۷ لاکھ ۸۶ ہزار پونڈ ہندوستان کا خرچ کر رہی ہے، اس میں کمی کی جائے۔

نیز ہندوستانی یونی ورسٹیوں کے متعلق تعلیمی کمیشن کی رجعت پرستانہ، غیر منصفانہ اور معاندانہ سفارشات کے خلاف بھی تجویز پاس کی گئی۔

(حسرت موہانی...... ایک سیاسی ڈائری، ص ۲۸ و سکسٹی ایئرز آف کانگریس، ص ۵۲-۱۵۱)

مدینۂ منورہ کی تعلیمی حالت اور دیوبند جانے کی اصلی ضرورت:

۱۳۲۰ھ (۱۸۰۲ء) سے ۱۳۲۶ھ (۱۹۰۸ء) تک مسلسل طور پر میرا مشغلہ علمی مدینۂ منورہ جاری رہا، جیسا کہ پہلے ذکر آچکا ہے۔ تمام مشاغل معاش وغیرہ سے دست بردار ہو کر میں سفر گنگوہ سے واپس ہوتے ہی (اپریل ۱۹۰۲ء میں) مسجد نبوی میں تعلیمی مشاغل میں تدریجاً منہمک ہو گیا۔ حتیٰ کہ روزانہ چودہ چودہ کتابیں مختلف فنون کی پڑھاتا تھا اور چوں کہ مدینۂ منورہ میں منگل اور جمعہ کو تعطیل ہوتی ہے تو ان تعطیل کے ایام میں بھی، خصوصی دروس چار پانچ ہوتے تھے۔ بہت سی ایسی کتابیں جن کو ہندوستان میں پڑھایا نہیں جاتا ہے اور مدینۂ منورہ، مصر، استنبول کے نصاب میں وہ داخل ہیں، پڑھانی پڑیں۔ مثلاً اجرومیہ، وحلان، کفرادی، الفیہ، ابن عقیل، شرح الفیہ، ابن ہشام وغیرہ (نحو میں) شرح عقود الجمان، رسالہ استعارات، رسالہ وضعیہ للقاضی عضد وغیرہ (معانی و بیان میں) بدیعیۃ ابن حجہ (بدیع میں) نور الایضاح، ملتقی الابحر، درر وغیرہ غیرہ (فقہ میں) شرح جمع الجوامع للسبکی و شرح و مستصفی الاصول، ورقات و شرح منتہی الاصول وغیرہ (اصول شافعیہ و مالکیہ میں) مسامرہ شرح مسایرہ، شرح طوالع الانوار، جوہرہ وغیرہ (عقائد میں) الفیۃ اصول الحدیث، بیقونیہ و دیگر رسائل اصول حدیث میں اسی طرح فرائض اور منطق وغیرہ کے متعدد رسائل اور کتابیں جن کو یہاں سنا بھی نہ تھا پڑھانا پڑھا۔ چوں کہ نفس فن میں ان فنون سے مناسبت تھی، اس لیے کچھ دشواریاں پیش نہیں آئیں۔ جن کتابوں کو یہاں پڑھا تھا۔ خواہ تفسیر کی یا حدیث، معانی، کلام، فقہ اصول وغیرہ کی ان کی بھی بارہا نوبت آئی اور بحمد اللہ نہایت کامیابی کے ساتھ یہ دروس جاری رہے۔ اکابر اساتذہ رحمہم اللہ تعالیٰ کی برکتیں اور دعائیں اور فضل خداوندی شامل حال تھا، اس سے علمی ترقی ہوتی گئی اور افاضہ اور استفاضہ کا حلقہ روز افزوں ہوتا رہا اور اگر حافظہ جید اور عمدہ ہوتا تو یقیناً بہت بڑی استعداد اور ذخیرہ علمی حاصل ہو جاتا۔ اس امر کا التزام تھا کہ کوئی کتاب بلا مطالعے اور بغیر شروح و حواشی پر پوری طرح نظر ڈالنے اور سمجھنے کے نہ پڑھائی جائے۔ اسی وجہ سے دن و رات میں تقریباً تین ساڑھے تین گھنٹے سونا ملتا تھا۔ باقی اوقات مطالعہ یا تدریس یا ضرورت بشریہ وغیرہ میں صرف ہوتے تھے۔ البتہ کبھی کبھی تمام دروس کا ناغہ کر کے دن کو بھی چھ سات گھنٹہ سو جاتا تھا جس سے ہفتے بھر کا تکان رفع ہو جاتا تھا، اس زمانۂ تعلیم میں جب کہ خوب سمجھ کر اور شروح و حواشی کو مطالعہ کر کے کتابیں پڑھانی پڑیں، تو مضامین مستحضر ہو گئے۔ کتب عالیہ

حدیث وتفسیر وعقائد واصول وغیرہ میں اور بالخصوص حدیث وتفسیر میں بعض بعض شبہات اور مشکلات پیش آتی رہیں جن کو حل کرنے کی کوئی صورت نہ تھی اور طبعی طور پر زور دار خواہش ہوتی تھی کہ کسی طرح حضرت شیخ الہند قدس اللہ سرہٗ العزیز کی بارگاہ تک رسائی ہو تو کتب حدیث پھر پڑھوں! کیوں کہ طالب علمی کے زمانے میں اس طرح مضامین متحضر نہ تھے۔ اس لیے مشکل مسائل کے حل کرنے کی صورت پوری طرح سے نہ ہو سکی تھی اور عمر کا وہ حصہ لاابالی پن کا بھی تھا مگر اب اشد ضرورت ہے۔ پہلی اہلیہ مرحومہ کے انتقال (۱۹۰۸ء) کے بعد جب کہ والد صاحب مرحوم نے ہندوستان کے سفر کا ارشاد فرمایا تو میں نہایت خوشی سے اس پر تیار ہو گیا اور سیدھا دیوبند پہنچا اور ترمذی شریف اور بخاری شریف میں شریک ہو گیا اور بالالتزام ان دونوں کتابوں کو پھر پڑھا، مسائل پر پوری بحث کیا کرتا تھا۔ حضرت رحمۃ اللہ علیہ بھی اس مرتبہ غیر معمولی توجہ فرماتے تھے اور خلاف عادت تحقیقی جوابات نہایت وضاحت سے دیتے تھے۔ جس سے بہت فائدہ ہوا۔ حضرت رحمۃ اللہ علیہ اگرچہ پہلے بھی بہت شفقت فرمایا کرتے تھے، مگر اس مرتبہ بہت زیادہ عنایات فرمائیں اور علاوہ علمی افادات کے دنیاوی اور معاشی امور میں بھی مثل والد حقیقی بلکہ زیادہ توجہ فرماتے رہے۔ میرا قیام بھی حضرت رحمۃ اللہ علیہ کے یہاں رہا۔ دوسرے نکاح کے بعد بھی اہلیہ کو حضرت رحمۃ اللہ علیہ کے مکان ہی پر رکھا۔ سفر و حضر میں ساتھ رہا۔ دارالعلوم میں بسلسلۂ تدریس ملازم بھی ہو گیا۔ ایک مرتبہ ہدایہ آخیرین میں ایک مسئلہ ایسا آ گیا کہ بہت غور وفکر اور حواشی وشروح کے مطالعے سے بھی حل نہ ہو سکا سخت عاجز ہو کر حجرۂ مطہرۂ نبویہ پر حاضر ہوا اور بعد سلام ودرود عرض کیا، تھوڑی ہی دیر میں سمجھ میں آ گیا۔ حضرت مولانا محمد قاسم صاحب رحمۃ اللہ علیہ کی تصانیف میں ایسے ایسے حکم اور علمی مضامین ملتے تھے کہ تمام مطولات وکتب قدیمہ میں ہاتھ نہیں آتے تھے۔ ان سے طبیعت کو بہت زیادہ اطمینان اور شرح صدر ہوتا تھا اور یہی حالت اب تک ہے۔ ان مضامین کو دیکھ کر ارمان پیدا ہوتا تھا کہ کاش یہ علوم مجھ کو بھی حاصل اور محفوظ ہو جائیں، کیوں کہ حضرت نانوتوی مرحوم کی تحقیقات نہایت ہی بلند پایہ اور مفید ہیں حضرت شاہ ولی اللہ صاحب دہلوی قدس اللہ سرہٗ العزیز کی تصانیف میں بھی تحقیقات اور حکمتیں بھری ہوئی ہیں اور نہایت مفید اور بلند پایہ ہیں مگر مجھ کو جو طمانیت اور بلند پائیگی حضرت نانوتوی رحمۃ اللہ علیہ کی تصانیف میں ملتی تھی، وہ وہاں نہ تھی۔ اگرچہ تحقیقات کے انتہائی بلند پایہ ہونے کی وجہ سے بہت سے مضامین سمجھ میں آنے دشوار ہوتے تھے اور چند صفحوں کے مطالعے کے بعد طبیعت تھک بھی جاتی تھی اور بہت سی باتیں سمجھ میں

بھی نہیں آتی تھیں، تاہم ان سے بہت سکون اور شرح صدر ہو جاتا تھا۔ افسوس کہ حافظے کی کمزوری کی بنا پر بہت سے مضامین تھوڑے عرصے میں ضائع ہو گئے اور ہوتے رہے ایک روز بہت غلبۂ شوق پیدا ہوا اور ان علوم کے حاصل ہونے کی رغبت اس قدر زیادہ ہوئی کہ مواجۂ شریفۂ نبویہ (علیٰ صاحبہا الصلوٰۃ والتحیۃ) میں حاضر ہو کر بہت رویا اور ان علوم کے حاصل ہونے کی استدعا اور درخواست کرتا رہا اور اپنی بے بضاعتی اور جہالت کا شکوہ بھی کیا۔ دیر تک اسی حالت گریہ میں رہ کر واپس ہوا تو چند قدم ہی چلا تھا کہ یکایک قلب میں واقع ہوا۔ لا تقنطوا من رحمة الله! مگر افسوس کہ آج تک محرومی ہی ہے۔ ممکن ہے کہ آیندہ اللہ تعالیٰ کا فضل شامل حال ہو جائے۔ وما ذلک علی الله بعزیز.

علوم میں جدو جہد کرنے والے طلبہ کا ہجوم اس قدر ہوا کہ اور علماء مدرسین کے حلقہ ہائے دروس میں اس کی مثال نہیں تھی۔ عوام کے اجتماع سے بعض بعض حلقے بڑے بڑے ہوتے تھے مگر پڑھنے والے اور جدو جہد علمی کرنے والے اوروں کے یہاں کم تھے اور میرے یہاں حال برعکس تھا۔ عوام کو اس وجہ سے دلچسپی نہ ہوتی تھی کہ علمی بحثیں ان کی سمجھ میں آنی دشوار ہوتی تھیں۔ بعض بعض علماء ایسے بھی تھے کہ ان کے یہاں پہلے پہل رجوع بہت زیادہ تھا، مگر بعد میں کم ہو گیا اور ان کے یہاں کے طلبہ بھی میرے یہاں آنے لگے۔ یہ سب برکتیں ان ذوات مقدسہ کی تھیں، جن کی جوتیاں اٹھانے کا شرف بعنایت ایزدی حاصل ہوا تھا، ورنہ میں تو بالکل ہی ناکارہ اور خالی تھا اور آج تک خالی ہی ہوں:

قبولیت اسے کہتے ہیں مقبول ایسے ہوتے ہیں
عبید سود کا ان کے لقب ہے یوسف ثانی

کا منظر نظر آتا تھا۔ اس کی بنا پر جس طرح بہت بڑی جماعت محبین اور ارباب عقیدت کی پیدا ہو گئی اسی طرح ایک جماعت حاسدین اور رقبا کی بھی پیدا ہوئی۔ اس میں غیر علمی ہندوستانیوں اور غیر ہندوستانیوں کی وہ جماعت بھی تھی جو محض اس بنا پر بغض رکھتی تھی کہ اس خاندان کو اس قدر قبولیت اور رفعت کیوں حاصل ہوتی جا رہی ہے۔ اگرچہ میرے طرز عمل اور اکابر کے اتباع اخلاق واعمال اور تواضع کی وجہ سے ان کی کامیابی کی صورتیں منصۂ ظہور پر نہیں آسکیں مگر پھر بھی ان کے دلوں میں حسد کے زخم ہرے ہوتے رہے۔

جشن تاج پوشی:

یکم جنوری ۱۹۰۳ء: آج دہلی میں دربار بہت شان وشوکت سے ہوا اور یہی کیفیت ہر ضلع میں ہوئی یعنی فرمان شاہی پڑھا گیا اور لوگوں کو اعزاز حاصل ہوا۔

۱۰ر جنوری ۱۹۰۳ء: جناب لارڈ کرزن صاحب گورنر جنرل کشور ہند ۲۹ر دسمبر ۱۹۰۲ء کو بہ کمال تزک واحتشام والیان ملک کے جلوس کے ساتھ دہلی کو تشریف لائے تھے اور آج ۱۰ر جنوری ۱۹۰۳ء کو بعد فراغت دربار وغیرہ بارادۂ کلکتہ دہلی سے روانہ ہوئے۔ لارڈ صاحب بمقابلہ اور وائسرایوں کے کم عمر ہیں۔ غالباً ۴۵ سال کے اندر عمر ہوگی آج کل اسپیشل ٹرینیں بوجہ واپسی رؤساؤ والیان ملک برابر سندیلہ اسٹیشن سے گزر رہی ہیں کہ وے لوگ دہلی سے اپنے وطن کو جارہے ہیں
(ایک روز نادر روزنامچہ، ص ۳۴)

مہاراجہ ہلکر اندور:

یکم فروری ۱۹۰۳ء: کل مہاراجہ ہلکر نے تخت سے کنارہ کشی کی۔ شاید لارڈ کرزن وائسرائے سے کچھ ناچاقی ہوگئی تھی۔ مہاراجہ موصوف ۱۸۶۰ء میں پیدا ہوئے تھے اور ۱۸۸۶ء میں ریاست کی گدی پر متمکن ہوئے تھے۔ بعد کنارہ کشی اپنے اکلوتے بیٹے بالا صاحب کو تخت نشین کیا جس کی اب عمر بارہ برس کی ہے اور مہاراجہ صاحب کو منجانب ریاست چار لاکھ سالانہ کا گزارہ تجویز ہوا۔ اور انھوں نے اپنی ریاست کا ایک مقام ''بروہار'' واسطے سکونت کے تجویز کیا جو دریائے نربدا کے کنارے واقع ہے اور اسی وقت اندور سے روانہ ہوگئے۔ (ایک نادر روزنامچہ، ص ۶۴)

بھائی سید احمد صاحب مرحوم کا سفر گنگوہ شریف:

یکم مارچ ۱۹۰۳ء: جناب بھائی سید احمد صاحب بھی سفر مدینۂ منورہ زید شرفا کرتے وقت حضرت قطب عالم گنگوہی رحمۃ اللہ علیہ سے بیعت ہوئے تھے مگر جب کہ میں طلب کیا گیا اور بڑے بھائی صاحب مجھ سے پہلے چھپ کر روانہ ہوگئے تھے اور پھر مکۂ معظمہ سے مل کر ساتھ ساتھ ہندوستان اور گنگوہ شریف پہنچے تھے...... تو بھائی سید احمد مرحوم کا ہماری واپسی پر تقاضا ہوا کہ اب مجھ کو اجازت ہونی چاہیے تاکہ میں بھی بارگاہ رشیدیہ میں پہنچ کر منازل سلوک طے کروں۔ والدین ماجدین رحمۃ اللہ علیہما ایسے مقاصد جلیلہ میں بہت زیادہ شیر دل تھے۔ انھوں نے خوشی سے اجازت

دے دی اور ۱۳۲۰ھ کے اواخر میں (یکم مارچ ۱۹۰۳ء سے قبل) وہ روانہ ہو کر گنگوہ شریف پہنچے اور تقریباً تین سال متواتر ان کو اس بارگاہ عالی میں حاضر باشی اور خدمت گزاری کا شرف حاصل رہا۔ حضرت قطب عالم رحمۃ اللہ علیہ کا وصال بھی انھیں کے زمانۂ حاضری میں ہوا۔ وصال کے چند مہینہ کے بعد وہ واپس مدینۂ منورہ ہوئے۔ ان کو اگرچہ حضرت قدس اللہ سرہٗ العزیز نے اجازت بیعت اور خلافت عطا نہیں فرمائی تھی مگر حضرت شیخ الہند اور حضرت مولانا خلیل احمد صاحب رحمۃ اللہ علیہما نے بعد کو اجازت عطا فرما دی تھی۔ تاہم جہاں تک مجھے معلوم ہے بھائی صاحب مرحوم نے سلسلۂ ارشاد و تلقین جاری نہیں فرمایا۔ واللہ اعلم۔

ہاں ان کی عالی ہمتی اور بے انتہا جد و جہد سے مدرسہ شرعیہ مدینۂ منورہ وجود میں آیا جس سے بحمد اللہ علوم دینیہ اور حفظ قرأت قرآن کا عظیم الشان سلسلہ جاری ہوا اور اب تک جاری ہے یہ صدقہ جاریہ اللہ تعالیٰ کی نہایت مبارک اور اعلیٰ درجے کی نعمت ہے۔ اللہ تعالیٰ قبول فرمائے اور بانی مرحوم اور اہل امداد و اعانت کے لیے موجب فلاح و نجاح ہو۔ آمین۔ (نقش حیات: حصہ اول، صفحہ ۷۸)

محصول نمک:

۱۹ مارچ ۱۹۰۳ء: آج کے اخبار پانیر سے معلوم ہو کہ کرزن صاحب وائسرائے کشور ہند کی کونسل کی رائے ہے کہ نمک پر ڈھائی روپیہ فی من سے محصول گھٹا کر دو روپے فی من کر دیا جائے۔ اور انکم ٹیکس جو پانچ سو سالانہ کے منافع پر لیا جاتا ہے۔ اب ہزار روپیہ کے منافع پر لیا جائے گا اور جن لوگوں کا منافع پانچ سو روپے ہے، وہ بری کیے جاویں گے۔ غالباً مارچ ۱۹۰۳ء کی کمیٹی سے اس کی بابت حکم صادر ہو جائے۔ (ایک نادر روزنامچہ، ص ۳۴)

غوثیہ بیگم، حیدر آباد:

۸/اپریل ۱۹۰۳ء آج کے اودھ اخبار سے واضح ہوا کہ مہاراجہ سرکشن پرشاد صاحب وزیر اعظم حیدر آباد پر نواب سید سراج الحسن امیر یار جنگ بہادر نے بذریعۂ قاضی کبیر الدین بیرسٹرایٹ لا بمبئی و ہرادجی وکیل حسب منشا دفعہ ۳۶۱، ۳۶۳، ۴۹۳، ۴۹۶، ۱۰۹ تعزیرات ہند باجلاس کنٹونمنٹ مجسٹریٹ مقدمہ دائر کیا ہے کہ ان کی پوتی مسماۃ غوثیہ بیگم نابالغہ دختر سید نور الدین متوفی کو بلا اجازت ناشی عقد کر کے اپنے محل میں داخل کر لیا ہے۔ چوں کہ یہ جرم انگریزی عملداری میں

وقوع پذیر ہوا ہے لہذا مدعا علیہ پر سمن جاری ہونا چاہیے اور یہ نالش سکندر آباد کے مجسٹریٹ کے اجلاس میں رجوع ہوئی ہے اور بیرسٹر نے یہ بھی بیان کیا کہ حسب دفعہ ۱۸۱ ضمن ۴ ضابطہ فوجداری سے عدالت میں یہ مقدمہ دائر ہونا چاہیے۔

۹ رمئی ۱۹۰۳ء مسماۃ فیض النسا بیگم زوجہ مسٹر سید نوالدین متوفی نے اخبار مشیر دکن، کو چھٹی بھیجی کہ عدالت کنٹونمنٹ مجسٹریٹ سکندر آباد میں سید سراج الحسن نے مہاراجہ کشن پرشاد صاحب وزیر اعظم پر جو نالش دائر کی تھی، وہ خارج ہوئی اور بوجہ پردہ نشینی اس کی اطلاع مجھے دیر کو ہوئی لہذا اب میں سچے واقعات ظاہر کرتی ہوں کہ میری دختر غوثیہ بیگم پر جو الزام عداوتاً لگائے گئے ہیں ان کی تردید کروں۔ غوثیہ بیگم مسٹر سید نورالدین کی اور میری دختر ہے جو صغر سنی سے اپنے والد متوفی اور میری نگرانی وحفاظت میں پرورش پاتی رہی۔ اب اس کی عمر ۲۱ برس کی ہے۔ اس کے بلوغ کو پانچ برس کا عرصہ ہوا۔ گو مسٹر سراج الحسن غوثیہ بیگم کے دادا ہیں، لیکن کبھی وہ ان کی حفاظت ونگرانی میں نہیں رہی۔ میں نے مہاراجہ کشن پرشاد بہادر کے ساتھ اپنی خوشی اور اپنے لڑکے یعنی اس کے بھائی سید معین الدین کی رضامندی سے غوثیہ بیگم کی نسبت کر دی۔ یہ گفتگو ایک سال سے ہو رہی تھی جس سے سراج الحسن اور تمام اہل خاندان واقف تھے اور جن باتوں کا انھوں نے ذکر کیا وہ محض بے بنیاد ہیں۔ نہ میرے بیٹے سکندر آباد کو گئے اور نہ کسی عورت نے اسے بہکایا اور نہ کسی وقت مہاراجہ کشن پرشاد نے اپنے مذہب کے بارے میں مجھ سے غلط بیانی کی۔ تمام باتیں میری رضامندی سے ہوئیں۔

۲۲ رمئی ۱۹۰۳ء: مہاراجہ کشن پرشاد کے خاندان میں برابر یہ دستور چلا آتا ہے کہ منجملہ اور بیبیوں کے ایک مسلمان بیوی بھی تصرف میں آیا کرتی ہے۔ چناں چہ مہاراجہ چندولال جو مہاراجہ حال کے پردادا تھے ان کی بھی ایک مسلمان بیوی تھی۔ علیٰ ہذا ان کے بعد جو جو راجہ وزیر مقرر ہوئے ان کے بھی ایک زوجہ مسلمان ہوتی آئی۔ چناں چہ مہاراجہ صاحب حال کے بھی مسلمان زوجہ سابق میں تھی جو فوت ہوگئی۔ اب مسماۃ غوثیہ بیگم بنت فیض النساء بیگم زوجہ ثانیہ ہوئی ہیں۔ (ایک نادر روز نامچہ، ص ۶۵-۶۴)

طاعون:

۶ رمئی ۱۹۰۳ء...... اودھ اخبار مورخہ امروزہ سے بحوالہ اخبار ٹیلی گراف (انگریزی) محررہ ۳ راپریل ۱۹۰۳ء واضح ہوا کہ جب سے طاعون ہندوستان میں شروع ہوا ہے اس کی سالانہ اموات حسب ذیل تمامی ہندوستان میں وقوع پذیر ہوئیں۔

''۱۸۹۷ء: ۵۶ ہزار، ۱۸۹۸ء: ایک لاکھ ۱۸ ہزار، ۱۸۹۹ء: ایک لاکھ ۳۳ ہزار ۱۹۰۰ء: ایک لاکھ ۹۳ ہزار، ۱۹۰۱ء: دولاکھ ۴۷ ہزار، ۱۹۰۲ء: پانچ لاکھ ۳۷ ہزار۔ کل: ۱۶ لاکھ ۳۷ ہزار۔ (ایک نادر روزنامچہ، ص ۳۵)

وفات سید محمود:

۱۳ رمئی ۱۹۰۳ء:......۸ رمئی کو مسٹر سید محمود بیرسٹرایٹ لا کا بمقام سیتاپور انتقال ہوگیا۔ متوفی سر سید احمد خان صاحب بانی کالج علی گڑھ کے بیٹے تھے اور امتحان بیرسٹری لندن میں پاس کر کے ہندوستان میں وکالت شروع کی تھی ۔ چند سال تک وہ جج ہائی کورٹ بھی رہے تھے جنھوں نے بڑے بڑے پیچیدہ مسائل قانونی اپنی قابلیت اور عالی دماغی سے حل کیے۔ بعدہ عہدہ ججی سے بہ حصول پنشن چھ سو روپیہ ماہوار کنارہ کش ہوکر پھر اپنا کام بیرسٹری شروع کیا۔ مگر افسوس کہ وہ شراب بکثرت پینے لگے جس سے ان کا دماغ خراب ہوگیا۔ آخرش انتقال ہوا۔ متوفی ۲۲ رمئی ۱۸۵۰ء میں پیدا ہوئے تھے۔ ایک لڑکا خورد سال جس کی عمر ۱۶ سال ہوگی یادگار چھوڑا۔ مسٹر محمود کی لاش علی گڑھ بھیجی گئی جہاں اپنے باپ کے پہلو میں مدفون ہوئے۔ (ایک نادر روزنامچہ، ص ۳۵)

بلغاریہ:

۲۱ راگست ۱۹۰۳ء: سرحد بلغاریہ پر پہلی بغاوت ہوئی لہذا فوج سلطان ٹرکی واسطے تادیب کے بھیجی گئی اور سلونیکا کے قریب کل جماعت باغیوں کی گولہ اندازی افواج ٹرکی سے مقتول ہوئی۔

ترکی:

۱۶ ستمبر ۱۹۰۳ء: ممالک مقدونیا و بلغاریہ و سلونیکا کی بغاوت سے آج کل بڑی بدنظمی سلطان ترکی کی عملداری میں ہے اور افواج ٹرکی باغیوں کو گوشمالی واجب دے رہی ہے۔ ہزاروں آدمیوں کا کشت وخون ہورہا ہے۔ سلاطین یورپ سلطان کو الگ دھمکی دے رہے ہیں کہ بدنظمی جلد دور کی جائے۔

۷ ارستمبر ۱۹۰۳ء آج کل یورپ میں باہم سلاطین میں انواع واقسام کے نزاعات پیدا ہیں اور عموماً سلطان ٹرکی کو دبا رہے ہیں اور کوئی شک نہیں کہ وہ بتیس دانتوں میں ایک زبان ہے۔
(ایک نادر روزنامچہ، ص ۸۶)

صوبۂ برار:

۱۵؍اکتوبر ۱۹۰۳ء: یکم اکتوبر ۱۹۰۳ء سے ملک برار متعلقہ حیدرآباد دکن، اضلاع متوسطہ عملداری برٹش انڈیا میں شریک کیا گیا۔ (ایک نامہ روزنامچہ، ص ۶۵)

۲۶؍دسمبر ۱۹۰۳ء: مدراس میں زیر صدارت لال موہن گھوش آل انڈیا کانگریس کا انیسواں سالانہ اجلاس منعقد ہوا۔ نواب سید محمد آزاد صاحب صدر استقبالیہ تھے۔ اس اجلاس میں ۵۳۸ نمایندے شریک ہوئے۔ اپنی صدارتی تقریر میں مسٹر گھوش نے کہا کہ آج شاید ہی کوئی ایسا شخص ہوگا جو برٹش سرکار کا وفادار نہ ہو، لیکن اس کے یہ معنی نہیں ہیں کہ اس کو اس سرکار پر تنقید کرنے کا کوئی حق نہیں ہے۔ ہم کو بڑے ادب کے ساتھ کہنا پڑ رہا ہے کہ برٹش اور ہمارے عوام میں کوئی امتیاز نہیں ہونا چاہیے، بلکہ ہمارے عوام بھی جملہ حقوق ملنے چاہییں! آج حکومت جس بے غیرتی کے ساتھ ہماری سوتی کپڑوں پر ٹیکس عائد کر کے تقریباً دو کروڑ اسٹرلنگ ہر سال ہمارے ملک سے انگلینڈ روانہ کر رہی ہے، اس کی روک تھام ہونی چاہیے اور اس کے کہنے کا ہم کو حق حاصل ہے۔ اسی طرح کسانوں پر جو بھاری بوجھ لادا گیا ہے وہ بھی اتارنا چاہیے۔ آج ملک میں جب کہ قحط کے آثار تیزی سے نمایاں ہیں، ایسی صورت میں کیا حکومت کی لوٹ جائز ہے؟ مسٹر گھوش نے یہ بھی کہا کہ گزشتہ دنوں شہنشاہ کی تخت نشینی کے سلسلے میں جو دلی دربار منعقد کیا گیا تھا اور اس پر جس بیدردی سے روپے خرچ کیے گئے اگر اس کا نصف بھی قحط زدہ لوگوں پر صرف کیا جاتا تو ہزاروں بچے، بوڑھے، مرد، عورتیں موت کے منہ سے باہر نکل آتے اور ملک ایک زبردست بحران سے بچ جاتا۔
(حسرت موہانی۔ ایک سیاسی ڈائری، ص ۳۰۔۲۹)

۱۹۰۴ء

جنگ روس و جاپان:

۱۳؍فروری ۱۹۰۴ء: ۱۲؍فروری سنہ الیہ کے اودھ اخبار سے واضح ہوا کہ ۹؍فروری ۱۹۰۴ء کو بوقت ۱۰ بجے دن مابین روس و جاپان لڑائی شروع ہوگئی اور جاپانی تارپیڈو کشتیوں نے بمقام پورٹ آرتھر روسی جہازوں پر حملہ کیا۔ (ایک نادر روزنامچہ، ۸۷۔۸۶)

۳۰؍اپریل ۱۹۰۴ء: آج کے اخبار میں میں نے پڑھا کہ جاپان کے مرد و عورت دونوں اپنی بہبودی ملک کے عاشق ہیں جس کی تصدیق مضامین ذیل سے ہوتی ہے:

۱۔ ایک سپاہی لڑائی پر جاتا تھا۔ اس نے اپنے ایک دوست سے جو اسے پہنچانے آیا تھا بیان کیا مجھے ایک روز مرنا ہے، پس بہتر ہے کہ ہم اپنے ملک کے لیے مریں۔ اگر میں بستر مرگ پر مروں گا تو کیا خاک میری ماں کو تسلی ہوگی۔

۲۔ ایک عورت نے اپنے بیٹے سے، جب وہ لڑائی پر جاتا تھا کہا کہ تم لڑائی پر جاتے ہو پھر گھر کو واپس نہ آنا۔ اگر تم واپس ہوئے تو میں معاف نہ کروں گی۔

۳۔ قصبہ 'نکاس' کی ایک عورت کو جب معلوم ہوا کہ اس کا بیٹا اس بنا پر جنگی خدمت سے معاف کر دیا گیا کہ وہ اکیلا اپنی ماں کا پرورش کرنے والا تھا تو اس نے فوراً خودکشی کر لی اور اس نے ایک خط میں بیان کیا کہ میں نے اس وجہ سے خودکشی کی کہ میرا بیٹا اپنے ملک کے لیے روسیوں سے آزادی کے ساتھ لڑ سکے۔ دم توڑنے کے وقت اس نے وہ خنجر جس سے خودکشی کی تھی، اپنے بیٹے کو دے دیا کہ وہ اس کو دشمن کے خلاف کام میں لائے۔ لڑکے نے خنجر کمر سے باندھ لیا اور فوراً جنگ میں شریک ہونے کی درخواست پیش کر دی۔

واہ رے ملک کی ہمدردی! جب کہ ایسی ہم قومی و ملک کی ہمدردی ہو تو کیوں نہ اس ملک کے بادشاہ کو پوری کامیابی حاصل ہو سکے۔

یکم جون ۱۹۰۴ء: مابین جاپان اور روسیوں کے ہنوز جنگ جاری ہے۔ دو مقاموں پر سخت لڑائیاں ہوئیں۔ ایک دریائے 'یلو' پر ۶ مئی کو، دوسری، نان شان، پر ۱۵ مئی کو اوران دونوں جنگوں میں جاپانیوں کو کامیابی حاصل ہوئی، نیز پورٹ آرتھر میں۔ 'نان شان' کی جنگ میں جاپانیوں کو ۳۷ توپیں کلدار باقی میدانی اور بندوقیں و گولے بارود حاصل ہوئے اور بہت سے روسی گرفتار ہوئے۔

یکم جولائی ۱۹۰۴ء: اب تک جس قدر لڑائیاں مابین جاپان و روس ہوئیں، ان سب میں جاپانی فتح یاب ہوئے اور ۲۸؍ جون کی جنگ میں انھوں نے کئی مقامات منچوریا کے روسیوں کے مقابلے میں فتح کر لیے۔

۶؍ ستمبر ۱۹۰۴ء: آج کل خوب گھمسان کی لڑائی مابین جاپان اور روسیوں کے بمقام 'لیونگ' متعلقہ 'منچوریا' (چین) ہو رہی ہے۔ ڈھائی لاکھ فوج و تیرہ سو توپیں دونوں جانب ہیں اور ہزاروں آدمی دونوں طرف مقتول و مجروح ہو رہے ہیں۔ ۲۴ و ۲۸؍ اگست سنہ الیہ کے مابین سخت

لڑائیاں ہوئیں اور تیسری ستمبر سنہ الیہ بوقت ۹ بجے کے جاپانیوں نے روسیوں سے 'لیونگ' چھین لیا اور اپنا قبضہ و دخل کیا۔ جنرل کروٹین روسیوں کی طرف سے افسر اعلیٰ ہیں اور جنرل 'کرو کے' اور جنرل اوکر جاپانیوں کی جانب سے۔ (ایک نادر روز نامچہ، ص ۸۸۔۸۶)

نیا وائسرائے:

۳ر مئی ۱۹۰۴ء۔ ۳۰ر اپریل ۱۹۰۴ء: کو بیرن اسمٹ ہل گورنر پریسیڈنسی مدراس نے وائسرائے کشور ہند کا عہدہ قبول کیا اور لارڈ کرزن صاحب بمبئی سے جہاز پر سوار ہو کر روانہ ولایت ہوئے۔

(ایک نادر روز نامچہ، ص ۳۶)

مئی ۱۹۰۴ء: ماہ مئی ۱۹۰۴ء میں انڈین نیشنل کانگریس کا خصوصی اجلاس بمبئی میں منعقد ہوا۔ مولانا حسرت ڈیلیگیٹ کی حیثیت سے اس اجلاس میں شریک ہوئے۔ (حسرت موہانی۔ ایک سیاسی ڈائری، ص ۳۰)

معاہدۂ تبت و برٹش:

۲۱ر ستمبر ۱۹۰۴ء: برٹش گورنمنٹ اور تبت کے مابین حسب ذیل عہد نامہ ہوا:

۱۔ تبت پابند ہوگا کہ مقامات بٹنگ' گیا' مٹسی اور کٹوک میں بازار قائم کرے۔

۲۔ تبت نصف ملین اسٹرلنگ تاوان جنگ ادا کرے۔ اس کی سالانہ تین اقساط ہوں گی۔

۳۔ برٹش فوج وادی چمبی پر اس وقت تک رہے گی جب تک کہ تاوان جنگ ادا نہ ہو۔

۴۔ برٹش گورنمنٹ کی رضامندی کے بغیر کوئی غیر سلطنت تبت کے کسی علاقے پر قبضہ نہ کرے گی، نہ کسی سلطنت کو اس کا پٹہ دیا جائے گا۔

۵۔ کوئی غیر سلطنت معاملات تبت میں دست اندازی نہ کرے گی۔ نہ کوئی سڑک یا ریلوے یا تار برقی قائم کرے گی اور نہ کوئی کان کھدوائے گی۔ (ایک نادر روز نامچہ، ص ۸۹۔۸۸)

علی گڑھ کالج:

۲۳ر دسمبر ۱۹۰۱ء: آج کے اودھ اخبار سے واضح ہوا کہ اہل تشیع شاہزادگان و نواب زادگان لکھنو نے ایک جلسہ خلاف کانفرنس علی گڑھ کے امام باڑہ آصف الدولہ میں ۱۸ر دسمبر کو منعقد کیا تھا جس میں علمائے فرنگی محل اہل تسنن مجتہدان شیعہ کے فتوے مشعر بدیں خلاصہ پیش ہوئے کہ کالج علی گڑھ کے لوگوں کے عقائد خلاف دین اسلام ہیں کہ وہ عربی میں نماز پڑھنا لازمی نہیں سمجھتے ہیں

اور نہ پانچ وقت کی نماز کی پابندی اور نہ عید الاضحیٰ کی قربانی اور نہ روزہ رکھنا وغیرہ وغیرہ۔ تو ایسی حالت میں اطلاق کفر کا ان پر لازم آتا ہے۔ ان کی اعانت کسی نہج سے نہیں کرنا چاہیے۔۔ اس پر بہت سی تقریریں ہوئیں۔ اس جلسے میں اہل سنت جماعت کے معزز شریک نہیں ہوئے تھے۔ چوں کہ علی گڑھ کالج نے طریقۂ تعلیم ایک عمدہ نوعیت کا جاری کیا ہے۔ اب اس کی مخالفت ہو رہی ہے۔
(ایک نادر روزنامچہ، ص ۳۷)

۲۶ر دسمبر ۱۹۰۴ء: ۲۶ر دسمبر ۱۹۰۴ء کو بمبئی میں آل انڈیا کانگریس کا بیسواں سالانہ اجلاس منعقد ہوا جس کے صدر سر ہنری کاٹن تھے۔ ایک ہزار ڈیلی گیٹ شریک ہوئے۔ اس اجلاس میں ودھان (قانون) بنانے کی جو کمیٹی چنی گئی تھی، اس میں نواب سید محمد صاحب کا بھی انتخاب ہوا۔
(حسرت موہانی...... ایک سیاسی ڈائری، ص ۳۰)

معائنہ دیوبند:

اس سال گورنمنٹ نے یونی ورسٹیوں کا قانون پاس کیا ہے اور یونی ورسٹیوں کے نظم ونسق میں سرکاری عمل دخل بڑھا دیا۔

۱۹۰۵ء

۶ر جنوری ۱۹۰۵ء: سر جیمس ڈگس لاٹوش بہادر لیفٹننٹ گورنر صوبہ جات متحدہ جن کو مسلمانوں اور اسلامی علوم کے ساتھ خاص دلچسپی و ہمدردی ہے، ملاحظۂ دار العلوم کے لیے تشریف لائے تھے۔ یہ تاریخی واقعہ نہ صرف دار العلوم کے لیے یادگار تھا، بلکہ دیوبند کو باوجود قدامت آبادی کبھی یہ امتیاز حاصل نہ ہوا تھا کہ صوبہ کے فرمانروا کسی ضرورت سے اس میں تشریف لائے ہوں۔
(القاسم، دیوبند، بابت ماہ جمادی الاولیٰ ۱۳۲۳ھ، ص ۲، ۳)

طاعون:

۱۸ر فروری ۱۹۰۵ء: ہفتۂ مختتمہ ۴۔ فروری ۱۹۰۵ء نقشہ جات طاعون سے واضح ہوا کہ ہندوستان میں مرض مذکور سے ۳۶۱۶۷ آدمی ضائع ہوئے اور اس کے قبل کے ہفتے میں ۳۳۰۸۷ آدمی فوت ہوئے تھے۔ ممالک متحدہ ہفتہ ۴۔ فروری ۱۵،۳۶۷، اور ہفتہ ماسبق میں ۱۴۷۰۴۔
پانچ سال کے ہفتۂ مختتمہ ۳۱ر جنوری کی تعداد اموات طاعون ذیل میں درج کی جاتی ہے جس سے معلوم ہوگا کہ پانچ سال سے طاعون میں اموات کی سال بہ سال کیسی کثرت ہوتی جاتی ہے:

۱۹۰۱ء:۱۴۱۵،۱۹۰۲ء:۱۲۱۹۲،۱۹۰۳ء:۲۳۵۶۔۱۹۰۴ء:۲۳۴۰۳،۱۹۰۵ء:۳۲۰۸۷۔

(ایک نادر روزنامچہ،ص ۳۸۔۳۷)

جنگِ روس وجاپان:

۱۸رفروری ۱۹۰۵ء: جاپانی روس کو منچوریا میں برابر شکست دے رہے ہیں۔''پورٹ آرتھر'' ان سے چھین لیا اور ''مکڈن'' میں بھی شکست دے رہے ہیں۔ادھر سے ''سینٹ پیٹرس برگ'' دارالخلافہ روس 'ووارسا' 'طفلس' وغیرہ میں لاکھوں آدمی بلوہ کررہے ہیں۔حضرت شہنشاہ روس محل میں چھپے ہیں۔فوجیں بلوائیوں کا مقابلہ کررہی ہیں جس کی وجہ سے زائد فوجیں واسطے مقابلہ جاپان کے منچوریا نہیں جاسکتی ہیں۔

۸رفروری ۱۹۰۴ء کو جنگ شروع ہوئی تھی اور ہنوز برابر قائم ہے۔جنرل اسٹوسل پورٹ آرتھر سے اس شرط کے ساتھ رہا ہوئے کہ وہ آیندہ کسی جنگ میں جاپانیوں کے مقابلے میں نہ آئیں گے اور جنرل کروپٹکن 'مکڈن' میں شکستیں کھارہے ہیں، جو گورنمنٹ روس سے وعدہ کرکے آئے تھے کہ جاپانیوں کو سمندر میں ڈبودوں گا۔

۱۶رمارچ ۱۹۰۵ء جاپانیوں نے 'مکڈن' واقع منچوریا' کو روسیوں سے چھین لیا۔اس لڑائی میں دولاکھ روسی فوج قتل ہوئے اور چار ہزار مقید اور پانچ سو توپیں علاوہ بہت سے سامان رسد وغیرہ کے جاپانیوں کے ہاتھ آئیں۔جنرل کروپٹکن جو جاپانیوں کو شکست دینے کے واسطے روس سے آئے تھے انھوں نے شہنشاہ روس کو درخواست دی ہے کہ ان کہ جگہ پر کوئی دوسرا جنرل بھیجا جاوے۔اب ان کے آرام کرنے کے دن ہیں۔(ایک نادر روزنامچہ،ص ۹)

صلح روس وجاپان:

۸رستمبر ۱۹۰۵ء پورٹسماوتھ، واقع امریکہ میں ۵رستمبر ۱۹۰۵ء کو روسی اور جاپانیوں کے مابین صلح نامہ پر دستخط ہوگئے اور لڑائی ختم ہوگئی۔(ایک نادر روزنامچہ،ص ۹۱)

زلزلہ:

۱۲راپریل ۱۹۰۵ء: آج کے اودھ اخبار سے واضح ہوا کہ ۴راپریل ۱۹۰۵ء کے زلزلے سے شملہ میں اکثر مکانات منہدم ہوگئے۔لیڈی کرزن معہ اپنے بچوں کے وایسرائنگل لاج چھوڑنے پر مجبور ہوئیں اور کرزن ہاؤس میں جاکر قیام کیا۔۴و۵راپریل کی رات کو پھر پانچ مرتبہ زلزلہ آیا اور

۶ اپریل کو ایسا شدید تھا کہ یورپین اپنے مکانوں کو چھوڑ کر میدانوں میں کمبل اوڑھ کر سوئے۔ دھرم شالہ کا زلزلہ بہت شدید تھا۔ ایک ہزار ہندوستانی وچار سو گورکھا سپاہی اور کئی یورپین افسر مرے۔ بیان کیا جاتا ہے کہ اسی فی صدی جانوں کا نقصان زلزلہ سے ہوا۔ لاہور میں بہت سے مکانات کو ضرر پہنچا۔ ایک سو جانیں ضائع ہوئیں۔ زلزلہ کا مرکزی قیام شملہ ولاہور کے مابین تھا اور وہاں اس کا قیام کئی منٹ تک رہا۔

۱۳ اپریل ۱۹۰۵ء: آج کے اودھ اخبار سے واضح ہوا کہ ۴ اپریل کے زلزلے سے شہر کانگڑھ بالکل تباہ ہوگیا۔ منجملہ ۴۶۷۶ آدمیوں کے صرف ۵۰۰ بچے اور یہ مردم شماری اس کی مارچ ۱۹۰۱ء میں ہوئی تھی اور دھرم شالہ کے گردونواح کے مواضعات بالکل تباہ ہوگئے۔ چوں کہ جا بجا پہاڑ شق ہوگئے ہیں اور کئی مقاموں میں پہاڑ کھسکنے سے بڑے بڑے غار پڑ گئے ہیں اس وجہ سے دھرشالہ کے نواحی لوگ نہایت خطرناک حالت میں ہیں۔ غلہ خورد ونوش باقی نہیں رہا اور وہ خچروں کے ذریعے سے بھیجا جارہا ہے۔ بمبئی میں زلزلہ کا احساس بالکل نہیں ہوا۔

۸ مئی ۱۹۰۵ء۔ آج کے اودھ اخبار سے واضح ہے کہ جس رقبہ میں شدید زلزلہ آیا اور اس سے جان ومال دونوں کا نقصان ہوا وہ سات سو مربع میل ہے۔ جس میں اس وقت تک اتلاف جانوں کا تخمیناً پندرہ ہزار معلوم ہوا۔ ممکن ہے کہ اس تعداد سے اور بھی زیادہ ملبوں سے فوت شدہ اشخاص کی لاشیں برآمد ہوں۔ (ایک نادر روزنامچہ، ص ۳۸)

صلح کابل:

۲۷ مئی ۱۹۰۵ء۔ آج کے اودھ اخبار سے واضح ہوا کہ سفارت مسٹر ڈین صاحب کابل کو گئی تھی اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ شرائط صلح تمام بدستور وہی قائم رہے جو امیر عبدالرحمان خان مرحوم والی کابل کے عہد میں طے ہوئے تھے اور امیر حبیب اللہ خان والی کابل کو گورنمنٹ ہند نے خطاب عطا کیے: ہز ''مجسٹی خودمختار دولت افغانستان''۔ (ایک نادر روزنامچہ، ص ۹۰)

یہی زمانہ تھا کہ جب لارڈ کرزن نے چاہا کہ بنگال کو تقسیم کردیا جائے تاکہ اس صوبے کے ہندو کمزور ہو جائیں اور مسلمان طاقتور۔ چناں چہ بنگال کی تقسیم کردی گئی۔ نتیجے کے طور پر ہندو مسلمانوں میں نفاق کی مستقل خلیج پیدا ہوگئی۔

سال رواں میں روس نے جاپان پر حملے شروع کردیے باوجودے کہ جاپان کی حیثیت روس کے مقابل کچھ نہ تھی۔ مگر وہ ایسی بہادری سے لڑا کہ روس کے چھکے چھوٹ گئے۔ جاپان کی اس

حیرت انگیز کامیابی نے ہندوستانی عوام کو بڑا حوصلہ دیا۔

مولانا حسرت موہانی کے رفیقوں میں شری آر بند وگھوش بھی تھے ۔ بڑودہ سے شری آر بندوگھوش کلکتہ پہنچے اور یہیں سے اپنی جدو جہد کو تیز کر دیا۔گھوش نے ایک اخبار ''کرم یوگن'' نکالنا شروع کر دیا، جو قوم کی بیداری کی نفیر بن گیا اور حکومت کے خلاف علم جنگ لہرانے کا پیش خیمہ ثابت ہوا۔شری شاہ سندر چکرورتی اس دور کے انقلابیوں کے سرغنہ گنے جاتے تھے اور بلند مرتبے کے حامل بھی تھے۔شری چکرورتی سے مولانا ابوالکلام آزاد کی ملاقات ہوئی تب سے مولانا آزاد بھی انقلابیوں کی صف میں آگے آگے رہنے لگے۔

یہ وہ دور ہے جب کہ ملک میں طاعون، قحط، گرانی، صنعت وحرفت کی کمی اور ٹیکس کی بھرمار سے عوام پریشان تھے اور دوسری طرف حکومت کانگریس کے مطالبات سے برابر بے توجہی برت رہی تھی۔ بنا بریں ملک میں ایک ایسا طبقہ پیدا ہو گیا جو اپنے مقاصد کو حاصل کرنے کے لیے عملی اقدام پر زور دینے لگا۔شری بال گنگا دھر تلک، لالہ لاجپت رائے اور آر بندوگھوش اس طبقے کے لیڈر تھے۔مولانا حسرت بھی انھیں لوگوں کے ساتھ تھے۔دوسرا طبقہ اس کا حامی تھا کہ ضابطے کے مطابق اپنے مطالبات کو منوایا جائے۔اس کے رہنما دادا بھائی نوروجی۔سریندر ناتھ بنرجی، گوپال کرشن گوکھلے اور بدرالدین طیب جی تھے۔مذکورہ ہر دو طبقہ رائے عامہ کو ہموار اور متاثر کرنے میں کوشاں رہا۔نتیجے کے طور پر کانگریس میں جاگرتی پیدا ہوگئی مگر لارڈ کرزن کی شاطرانہ پالیسیوں کے باعث انقلابیوں کا پورا طبقہ مسلمانوں سے بھی بہت بدظن تھا کیوں کہ ہر انقلابی ہندو یہ سمجھتا تھا کہ برطانوی حکوت نے تحریک آزادی کی مخالفت میں مسلمانوں کو چھوڑ رکھا ہے، اسی بنا پر مسلمانوں کو تحریک آزادی ہند میں رکاوٹ سمجھتے ہوئے انقلابی اپنی جماعت میں معمولی کارکن بھی ہندوؤں ہی میں سے چنتے تھے۔(حسرت موہانی......ایک سیاسی ڈائری)

۷/اگست ۱۹۰۵ء: ۷/اگست ۱۹۰۵ء کو تقسیم بنگالہ کے خلاف سودیشی تحریک شروع ہوگی، جو روز بروز ترقی کرتی رہی۔اسی دوران گوپال کرشن گوکھلے نے ''سرونٹس آف انڈیا سوسائٹی'' قائم کی۔نرائن، ملہار، جوشی، رام باجپائی اور ہردے ناتھ کنزرو نے سماجی بھلائی کی طرف توجہ دی۔

(حسرت موہانی......ایک سیاسی ڈائری، ص۳۳)

تقسیم بنگالہ:

۱۵/اگست ۱۹۰۵ء: ۷/اگست کو ایک جلسہ ٹاؤن ہال کلکتہ میں اس غرض سے منعقد ہوا کہ تقسیم بنگلہ کی جو کارروائی گورنمنٹ سے تجویز ہوئی ہے، اس کی عذرداری کی جاوے۔اس کمیٹی میں

بارہ ہزار آدمی از اعلا تا ادنیٰ شریک تھے اور پانچ ہزار طالب علم ماتمی لباس پہنے ہوئے، ایک ممبر کونسل کے ہمراہ شہر میں گشت لگاتے پھرتے تھے تاکہ عوام کو اپنا ہمدرد بنادیں اور یہ ریزولیشن بہ اتفاق رائے منظور ہوا اور عہد کیا گیا کہ جب تک تقسیم بنگال کا فیصلہ رعایا کے حق مین حسب اطمینان نہ ہوگا ولایت کی بنی ہوئی چیزیں استعمال نہ کریں گے۔ دیکھا چاہیے کہ اس کا کیا اثر ہوتا ہے۔
(ایک نادر روزنامچہ، ص ۳۹)

لارڈ کرزن کا استعفا:

۲۳ راگست ۱۹۰۵ء: لارڈ کرزن صاحب وائسرائے ہند نے ایک فوجی تنازعے کی وجہ سے ۲۱ر اگست سنہ الیہ کو اپنے عہدے سے استعفا دے دیا۔ یہ جھگڑا ان کے اور لارڈ کچنر صاحب کمانڈر ان چیف کے مابین تھا اور ان کی جگہ پر لارڈ منٹو وائسرائے ہند مقرر ہوئے۔ (ایک نادر روزنامچہ، ص ۳۹)

تقسیم بنگالہ:

۲۸ ر ستمبر ۱۹۰۵ء: چوں کہ اشتہار نمبر ۲۸۳۲۔ مورخہ یکم ستمبر ۱۹۰۵ء کے بموجب گورنر جنرل ہند نے بمنظوری ملک معظم وشہنشاہ ہندوستان تقسیم بنگال کی کارروائی عمل میں آئی اور صوبہ آسام قائم ہوا۔ لہذا اب اس کی تعمیل ہو رہی ہے۔ (ایک نادر روزنامچہ، ص ۳۹)

۲۲ راکتوبر ۱۹۰۵ء: ۱۶ راکتوبر کو مقاسمۂ بنگال کا نفاذ ہوا جس سے بنگالیوں کو سخت رنج و غم ہوا۔ اور انھوں نے زرد راکھیاں باندھیں اور جس قدر دکانیں ان کے امکان میں تھیں، وہ بند کرا دیں اور یہ دن وہ ہمشہ یاد رکھیں گے۔ (ایک نادر روزنامچہ، ص ۴۰)

سودیشی تحریک:

۲۷ راکتوبر ۱۹۰۵ء: اہل بنگالہ نے جو سودیشی تحریک شروع کی ہے۔ یعنی اپنے ہی ملک ہندوستان کی اشیا استعمال کریں اور یورپ کی ساختہ اشیا کو ترک کریں اس کے جلسے ہندوستان کے تمام شہروں میں ہو رہے ہیں اور کوشش ہے کہ ہندوستان کی بنی ہوئی چیزیں کام میں لائی جائیں۔ چوں کہ عموماً ہر مقام پر کوشش ہو رہی ہے عجب نہیں کہ یہ کارروائی تکمیل کو پہنچ جاوے۔
(ایک نادر روزنامچہ، ص ۴۰)

کرزن:

۲۲ رنومبر ۱۹۰۵ء: آج کے اودھ اخبار سے واضح ہوا کہ ۱۸ رنومبر کو لارڈ منٹو داخل بمبئی

ہوئے۔ یہ پچیسویں گورنر جنرل ہند کے ہیں اور ۱۸ر نومبر کو لارڈ کرزن کنارہ کش ہو کر واپس براہ بمبئی روانہ ولایت ہوئے۔ (ایک نادر روزنامچہ، ص ۴۰)

۲۷ر دسمبر ۱۹۰۵ء: بنارس میں آل انڈیا کانگریس کمیٹی کا اکیسواں سالانہ اجلاس گوپال کرشن گوکھلے کی صدارت میں منعقد ہوا۔ اجلاس میں ۷۵۸ نمایندوں نے شرکت کی۔ ان دنوں پرنس اور پرنس آف ویلز ہندوستان کا دورہ کر رہے تھے۔ جب ان کے استقبال کے بارے میں ریزولیوشن پیش کیا گیا۔ تو اکثر قوم پرست رہنما مجلس مضامین سے احتجاجاً اٹھ گئے۔ (سکسٹی ایرز آف کانگریس، ص ۶۳۔ ۱۵۶)

اس اجلاس میں بنگال کی سرگرمیوں کا ذکر بڑی شدت سے کیا گیا۔ گوکھلے اپنے بیان میں سخت اور نرم دونوں طریقوں کو روا رکھتے تھے۔ یہ اجلاس بڑا ہنگامہ خیز ثابت ہوا۔ اس اجلاس میں مولانا حسرت موہانی بھی شریک تھے اسی سال قائم مقام وائسرائے لارڈ کرزن نے فیروز شاہ مہتا کو سر کے خطاب سے نوازا۔ اگرچہ اسی سر کے خطاب کو گوکھلے نے قبول کرنے سے انکار کر دیا تھا۔ تلک نے اسی سال سے شیواجی جینتی منانے کا ڈول ڈالا۔ (حسرت موہانی..ایک سیاسی ڈائری، ص ۳۴)

انقلابی جماعتیں:

۱۹۰۵ء: اور اس کے بعد: ''برن ہارڈی'' نے اپنی کتاب ''جرمنی اور آیندہ جنگ'' میں یہ امید ظاہر کی تھی کہ بنگال کے لوگوں میں قومی اور انقلابی تحریک جاری ہے۔ اگر وہ ہندوستان کے مسلمانوں سے متفق ہو جائیں تو ان کی شرکت عمل سے انگلستان کا بلند درجہ جو اسے اقوام عالم میں حاصل ہے مخدوش ہو سکتا ہے۔ (رولٹ ایکٹ کمیٹی کی رپورٹ، ص ۱۵۹)

غدر پارٹی کا قیام اور اخبار کا اجرا:

ایک شخص مسمی ہردیال جو کبھی دہلی کا باشندہ اور پنجاب یونیورسٹی کا ایک ہندو طالب علم تھا۔ ۱۹۰۵ء میں سرکاری وظیفہ حاصل کر کے آکسفورڈ میں تکمیل کی غرض سے انگلستان گیا۔ اس نے اپنا وظیفہ اور آخری قسط واپس کر دی اور بیان کیا کہ میں انگریزی طریقۂ تعلیم کو پسند نہیں کرتا۔ ۱۹۰۸ء میں وہ واپس آیا اور ایک انقلابی پارٹی تیار کی۔ (ایضاً، ص ۱۵۸)

۱۹۱۱ء میں سان فرانسسکو (امریکہ) پہنچا اور ریاست ہائے متحدہ امریکہ کے مختلف مقامات پر جلسے کر کے لیکچر دیے اور ایسی انجمنیں قائم کیں، جنھوں نے ہندوستان سے سلطنت برطانیہ کو ختم

کرنے کی قسمیں کھائیں۔اس نے "غدر" کے نام سے ایک اخبار نکالا جس کا پہلا پرچہ یکم نومبر ۱۹۱۳ء کو شائع ہوا جو کثیر تعداد میں ہندوستان میں تقسیم ہوجاتا تھا۔(ایضاً ص ۲۲۷)

جس میں باغیانہ اشتعال انگیز مضامین شائع کیے جاتے تھے اور خفیہ انجمنوں کے بنانے کی تلقین ہوتی تھی۔دلچسپی کے لیے ایک مضمون کا اقتباس درج کیا جاتا ہے:

بہادرو، جلدی کرو غدر برپا کر کے ان تمام ٹیکسوں کو بند کردو جو ہم سے وصول کیے جاتے ہیں۔ضرورت ہے ایسے بہادر سپاہیوں کی جو ہندوستان میں غدر پھیلائیں۔موت تنخواہ ہے، شہادت انعام ہے۔آزادی پنشن ہے۔میدان جنگ ہندوستان ہے۔اٹھو آنکھیں کھولو۔غدر کے لیے روپوں کی تھلیاں بھرو۔ہندوستان پہنچ جاؤ اور آزادی کے لیے جانیں قربان کرو۔رولٹ ایکٹ کمیٹی کی رپورٹ ص ۳۲۷)

اخبار کے علاوہ موقعہ بموقعہ پمفلٹ بھی شائع کیے جاتے تھے۔مثلاً ایک مرتبہ "غدر" کے نام سے اشتعال انگیز نظموں کا ایک مجموعہ شائع کیا۔ایک نظم میں تلک، لیاقت حسین، برکت اللہ، موکی، جیت سنگھ، ساورکر، آربندو گھوش، کرشنا درما، ہردیال وغیرہ کی تعریفیں کی گئیں۔(ایضاً)

اس کے ساتھیوں میں زیادہ قابل ذکر دو آدمی ہیں۔ایک ہندو مسمی رام چندر، دوسرا مسلمان مسمی برکت اللہ۔(ایضاً ص ۳۸)

ہردیال نے اپنے تمام ساتھیوں کو سمجھایا کہ انگلستان پر جرمنی عنقریب حملہ کرنے والا ہے اور یہی وقت ہے کہ ہم ہندوستان پہنچ کر کام کریں۔(۱۴ اگست ۱۹۱۴ء۔)

ہردیال اور اس کے ساتھیوں کے تمام واقعات موضوع کلام سے خارج ہیں۔مقصد یہ ہے کہ یہ پارٹی امریکہ، فلپائن، ملایا، ہانگ کانگ، سنگاپور، چین، مصر، ترکی افغانستان وغیرہ تمام ممالک میں پھیلی ہوئی تھی۔

اس پارٹی میں ہندو، مسلمان، سکھ، تینوں قومیں شریک تھیں۔

ترکی اور جرمنی اس کی پشت پر تھے۔مختلف جہازوں کے ذریعے سے ہندوستان میں رائفلیں اور سامان جنگ نیز نقد روپیہ پہنچانے کی کوشش کی گئی۔

جہان اسلام کا اجرا:

اخبار غدر کی طرح ایک دوسرا اخبار 'جہان اسلام' مئی ۱۹۱۴ء کے قریب قسطنطنیہ سے جاری کیا گیا۔اس میں عربی، ترکی اور اردو ہندی کے مضامین ہوتے تھے۔اس کا اردو حصہ پنجاب کا

ایک باشندہ ابوسعید تیار کرتا تھا جو ۱۹۱۲ء تک مدراس اور کسی زمانے میں رنگون میں کلرک تھا اور جب ٹرکی اور اٹلی کی جنگ چھڑی تو وہ مصر چلا گیا تھا۔ اعلان جنگ کے بعد اس اخبار کا اردو حصہ ہردیال کا لکھا ہوا تھا۔ اور مصر کے نیشنلسٹ لیڈروں یعنی فرید بے منصور عرفت نے بھی برطانیہ کے خلاف مضامین لکھے تھے۔

۲۰ر نومبر ۱۹۱۴ء: کی اشاعت میں انور پاشا کی ایک تقریر درج کی گئی تھی جس میں اور بہت سی باتوں کے علاوہ انور پاشا مرحوم نے یہ بھی کہا تھا کہ

> ''ہندوستان میں غدر برپا کیا جائے۔ انگریزی اسلحہ خانوں کو تاخت و تاراج کر کے اسلحہ لوٹ لیے جائیں اور انھیں ہتھیاروں سے انگریز مار ڈالے جائیں۔ ہندوستان میں ہندوستانی بتیس کروڑ اور انگریز صرف دو لاکھ ہیں۔ ان سب کو قتل کر دینا چاہیے۔ ان کے پاس فوج بالکل نہیں ہے۔ ترک نہر سویز کو عنقریب بند کرنے والے ہیں لیکن وہ جو اپنے ملک و وطن کو آزاد کرنے کی کوششوں میں جان دے گا ہمیشہ زندہ رہے گا۔ اے ہندوؤ اور مسلمانو! تم دونوں انگریزی فوجوں کے سپاہی ہو۔ تم آپس میں بھائی ہو۔ نیچ اور کمینے اور انگریز تمھارے دشمن ہیں۔ تم جہاد کا اعلان کر کے غازی بن جاؤ۔ اپنے بھائیوں کے ساتھ مل کر انگریزوں کو قتل کر دو اور ہندوستان کو نجات دلوادو۔''

ہردیال ستمبر ۱۹۱۴ء میں قسطنطنیہ گیا تو ابوسعید کے پاس ٹھہرا۔

ابوسعید کی تجویز پر ''ینگ ٹرکش پارٹی کے ایک ممتاز ممبر'' توفیق بے'' ۱۹۱۳ء میں رنگون آئے اور رنگون کے ایک تاجر کو ترکی کا قنصل بنایا۔ رنگون اور برما کی داستان بھی طویل ہے اور موضوع بحث سے خارج۔ اس سلسلہ میں خصوصیت سے مندرجہ ذیل حضرت کے نام لیے جاتے ہیں۔

(سید مجتبیٰ حسن عرف مول چند (۲) علی احمد صدیقی (۳) حکیم فہم علی (۴) حسن خان، ہردیال اور ہندوستان کے دیگر انقلاب پسندوں نے ۱۹۰۵ء میں برلن میں ''انجمن انقلاب ہند'' بنائی۔ اس انجمن کا مقصد یہ تھا کہ ہندوستان میں جمہوری حکومت قائم ہو۔ اس کے مسلسل جلسے ہوتے رہتے تھے جن میں ترک، روسی، جرمن آفیسرز شریک ہوتے تھے اس کے علاوہ ایسے جلسے ہوتے تھے جن میں جرمن اور ہندوستان کے مشترکہ مقاصد پر بحث ہوتی تھی۔ (رولٹ کمیٹی کی رپورٹ، ص ۲۲۶؛

دیگر صفحات)

ان مسلسل واقعات اور اس پیہم جدوجہد کا نتیجہ یہ تھا کہ فروری ۱۹۱۵ء میں ایک تاریخ مقرر کی گئی جس میں ہندوستان کے مختلف مقامات اور چھاؤنیوں پر حملہ کرنے کا تہیہ کرلیا گیا۔ مگر حسب ضرورت اسلحہ فراہم نہ ہوسکنے کے باعث یہ تاریخ خالی گئی اور اس کے بعد گورنمنٹ کو اس کا سراغ لگ گیا۔

مذکورۂ بالا تحریر سے آپ کو مندرجہ ذیل امور کا اندازہ ہوگیا!

۱۔ ۱۸۹۳ء سے ۱۹۱۵ء تک ہندوستان کی سیاست تشدد پسندی کی بنیاد پر تھی۔

۲۔ دہشت انگیزی اور تشدد کے اصول پر ہی انقلاب کا لائحۂ عمل مرتب کیا گیا تھا۔

۳۔ یہ تمام جماعتیں ایک دوسرے سے منسلک نہیں تھیں۔

۴۔ جب اس تحریک کا تعلق بیرونی ممالک سے ہوا تو وطنی رابطے نے ان سب کو انگریز کے مقابلے کے لیے متحد کردیا۔

(علمائے حق اور ان کے مجاہدانہ کارنامے (حصہ اول) از مولانا سید محمد میاں)

۱۹۰۶ء

۳۰ر جولائی ۱۹۰۶ء: نواب حاجی محمد اسمٰعیل خان رئیس علی گڑھ نینی تال میں گرمی کا موسم گزار رہے تھے۔ ان کے بارے میں مولانا طفیل احمد منگلوری نے لکھا ہے کہ حکام رس تھے۔ ''انھوں نے نواب محسن الملک بہادر آنریری سکریٹری علی گڑھ کالج کو ایک مسودہ تیار کرکے بھیجا ہے اور لکھا ہے کہ مسلمان بھی اس طرح اپنے حقوق کا مطالبہ کریں۔

(مسلمانوں کا روشن مستقبل، دہلی ۱۹۴۵ء، ص ۳۴۸)

۱۰ر اگست ۱۹۰۶ء: ۱۹۰۶ء کے وفد کے پس منظر پر مولانا طفیل احمد منگلوری نے اپنی تالیف ''مسلمانوں کا روشن مستقبل'' میں روشنی ڈالی ہے اور بتایا ہے کہ اس کی تحریک کس نے کی اور اس کے لیے کیا انداز اختیار کیا گیا۔ مولانا منگلوری لکھتے ہیں:

''علی گڑھ کالج کے پرنسپل مسٹر آرچبولڈ بوجہ تعطیلات کلاں شملہ میں تھے۔ وہ وہاں اعلیٰ حکام سے ملتے رہتے تھے۔ انھوں نے مجوزہ وفد کے بارے میں پرائیویٹ سکریٹری وائسرائے سے گفتگو کی اس گفتگو کے بعد مسٹر آرچبولڈ نے جو چھٹی ۱۰ر اگست ۱۹۰۶ء کو نواب محسن الملک مرحوم کو لکھی اور جو طبع ہوکر ممبران وفد کے پاس بھیجی گئی، اس چٹھی کے خلاصے سے معلوم ہوگا کہ علی گڑھ

کالج کے پرنسپل تمام سیاسی جزئیات میں مسلمانوں کی طرح رہنمائی کیا کرتے تھے اور وہ علی گڑھ میں بمنزلہ گورنمنٹ کے رزیڈنٹ کے ہوتے تھے۔ چھٹی کا خلاصہ یہ ہے جس کا ایک ایک لفظ توجہ سے پڑھنے کے قابل ہے:

"کرنیل ڈنلاپ اسمتھ (پرائیویٹ سیکریٹری وائسرائے) اب مجھے لکھتے ہیں کہ حضور وائسرائے مسلمانوں کا وفد منظور کرنے کو تیار ہیں اور مجھے ہدایت کرتے ہیں کہ اس کے لیے ایک باضابطہ درخواست بھیجی جائے۔ اس کے متعلق حسب ذیل امور غور طلب ہیں؛

اول درخواست بھیجنے کا مسئلہ ہے۔ میرے نزدیک یہ کافی ہوگا کہ مسلمانوں کے کچھ نمایندے اگرچہ ان کا انتخاب نہ ہوا ہو، درخواست پر دستخط کردیں۔

دوسرا مسئلہ ممبران کا وفد ہے۔ یہ لوگ جملہ صوبجات کے نمایندے ہوں۔

تیسرا مسئلہ ایڈریس کے مضمون کا ہے اس کی نسبت یہ ہے کہ ایڈریس میں وفاداری کا اظہار کیا جائے۔ اس امر کا شکریہ ادا کیا جائے کہ طے شدہ پالیسی کے مطابق حکومت خود اختیاری کی طرف قدم بڑھایا جانے والا ہے جس کی رو سے ہندوستانیوں کے لیے عہدے ملنے کے دروازے کھول دیے جائیں مگر اس اندیشے کا اظہار کیا جائے کہ طریقۂ انتخاب جاری کرنے سے مسلم اقلیت کو نقصان پہنچے گا اور یہ امید ظاہر کی جائے کہ نامزدگی کا طریقہ جاری کرنے میں یا مذہبی عقائد کی بنا پر نیابت دینے میں مسلمانوں کی رائے کو مناسب اہمیت دی جائے گی۔

اس رائے کا اظہار بھی کیا جائے کہ ہندوستان جیسے ملک میں یہ ضروری ہے کہ زمینداروں کی رائے کو اہمیت دی جائے گی۔

ذاتی طور پر میرا خیال ہے کہ مسلمانوں کی سب سے زیادہ عقلمندی اس میں ہوگی کہ وہ نامزدگی کے طریقے کی تائید کریں کیوں کہ ابھی انتخاب کا وقت نہیں آیا۔ علاوہ بریں ان کے لیے نہایت مشکل ہوگا کہ طریقۂ انتخاب جاری ہونے میں انھیں مناسب حصہ مل سکے۔"

اس درخواست کے سلسلے میں خط کے یہ جملے نہایت قابل توجہ اور مسلمانوں اور تاریخ سیاست کے طالب علموں کی آنکھیں کھول دینے کے لیے کافی ہیں۔ مسٹر آرچ بولڈ لکھتے ہیں:

اس تمام کارروائی میں میں پردہ کے پیچھے رہنا چاہتا ہوں اور یہ تحریک تمھاری طرف سے ہونی چاہیے۔ مگر آپ واقف ہیں کہ مسلمانوں کے فوائد کا میں کس قدر دل سے خواہاں ہوں اور اس لیے میں نہایت خوشی کے ساتھ ہر قسم کی امداد کروں گا۔ میں تمھارے لیے ایڈریس تیار کرنے یا اس پر

تنقید کرنے کا کام کرسکتا ہوں۔ اگر وہ بمبئی میں تیار کرایا جائے تو میں اس کا مسودہ دیکھ سکتا ہوں۔ کیوں کہ میں عمدہ الفاظ میں استدعا کرنے کے فن سے واقف ہوں۔

مگر نواب صاحب یاد رکھیے کہ اگر تھوڑے وقت میں کوئی با اثر اور زبردست تحریک پیدا کرنی ہے تو ہمیں فی الواقع بہت جلدی کرنی چاہیے۔''

مصنف روشن مستقبل اس خط اور اس میں دی جانے والی ہدایات پر تبصرہ کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

''مندرجۂ بالا چھٹی میں سب سے زیادہ نمایاں امر یہ ہے کہ وہ وائسرائے ہند کے پرائیویٹ سیکریٹری کی ایک چھٹی کی بنا پر لکھی گئی، جو انھوں نے مسٹر آرچبولڈ کو لکھی تھی اور اسی کے مطابق آرچبولڈ موصوف نے نواب محسن الملک کو ایڈریس کے مضمون، طریق انتخاب اور ترتیب وفد کے متعلق ہدایات دی تھیں۔ اور سب کچھ لکھنے کے بعد اپنے کو پس پردہ رکھنے کی کوشش کی ہے۔ جس سے صاف ظاہر ہے کہ اس تمام کارروائی میں اصل مفاد اینگلو انڈین اصحاب کا تھا نہ کہ غریب مسلمانوں کا؟ چناں چہ یہ ایڈریس حسب ہدایت بہت جلد مرتب کیا گیا۔ اور اس میں ظاہر کیا گیا کہ مسلمانوں کو ہمیشہ سے اپنے حکام کے انصاف پر بھروسا رہا ہے اور انھوں نے حقوق طلبی کرنے میں حکام کو پریشان کرنے سے احتراز کیا ہے۔ نیز کہا گیا کہ یورپ کے نمونے کی نیابتی جماعتیں ہندوستانیوں کے لیے نئی ہیں۔ اس لیے ان کے اختیار کرنے میں یہ خطرہ ہے کہ ہمارے قومی مفاد کی باتیں ایک غیر ہمدرد اکثریت کے رحم پر منحصر ہو جائیں گی۔

یہ امر قابل لحاظ ہے کہ نواب محسن الملک وہی علی گڑھ کالج کے سیکریٹری ہیں، جن پر اردو ہندی کی نام نہاد سیاست میں حصہ لینے پر ۱۹۰۰ء میں عتاب ہوا تھا اور اس کے بعد وہ مسٹر ماریسن کی اس رائے کی تائید پر مجبور ہوئے تھے کہ علی گڑھ میں کوئی سیاسی جماعت قائم نہ کی جائے۔ مگر اب ۱۹۰۶ء میں جب دفتری حکومت کا صحیفہ کوہستانی نازل ہوتا ہے اور نواب صاحب کو اپنے ماتحت پرنسپل مگر سرکاری رزیڈنٹ کی وساطت سے اطمینان ہو جاتا ہے کہ یہ سیاسی وفد حکام بالا کی مرضی کے مطابق ہے اور اس کے مرتب کرنے سے عزیز کالج کو نقصان نہ پہنچے گا، تب انھیں وفد کے مرتب کرنے کی ہمت ہوئی ہے۔ وہ تھوڑے وقت میں تین چار ہزار دستخطوں سے ایک درخواست بھجواتے ہیں اور کل سوا مہینے کے اندر تمام ہندوستان کے منتخب نمایندوں کا وفد شملہ لے جاتے ہیں۔ اس سے انکار نہیں کیا جا سکتا کہ اس وفد کو تمام صوبوں کے مسلمانوں نے بڑی گرم جوشی سے لبیک کہا''۔

یکم اکتوبر ۱۹۰۶ء: مسٹر ارچ بولڈ پرنسپل علی گڑھ کالج کی ہدایت کے مطابق وائسرائے کی خدمت میں پیش کیا جانے والا ایڈریس تیار ہو گیا، مسلمانوں کے معزز ترین نمایندوں کا انتخاب بھی عمل میں آ گیا اور وفد کی سرکردگی کے لیے ہز ہائی نس سر آغا خان کو چنا گیا، جن کا حکام بالا میں بہت رسوخ تھا۔ وہ یورپ سے روزانہ ہو کر سیدھے شملے پہنچے اور یکم اکتوبر کو وفد کے ساتھ وائسرائے کی خدمت میں ایڈریس مذکور پیش کیا۔ اس کے جواب میں وائسرائے ہند نے مسلمانوں کے اعتدال اور ضبط نفس کا شکریہ ادا کیا اور ان کی وفاداری تسلیم کر کے ان کے حقوق کی حفاظت کی طرف سے اطمینان دلایا۔ مسلمانوں کی سیاسی خدمات اور اہمیت کو تسلیم کیا اور میونسپلٹی، ڈسٹرکٹ بورڈ اور قانون ساز کونسلوں میں ان کا حق انتخاب مذہب کی بنا پر مان لیا اور مانا کیسے نہ جاتا جب کہ وہ خود انھی حضور وائسرائے کے ایماء سے مانگا گیا تھا۔ یہ پہلا موقع تھا جب کہ مذہب کی بنا پر مختلف قوموں کے حلقہ جات انتخاب کے قیام کے حق کو تسلیم کیا گیا۔ جس سے ہندوستان کی قومیت کے دو ٹکڑے ہو گئے۔ ایک طرف کم تعداد مسلمان۔ ان کے مقابلے میں دوسری طرف ہندوستان کی تمام دوسری قومیں لا کھڑی کر دی گئیں۔ عام مسلمان اس وفد کی کامیابی سے بہت خوش تھے۔ مگر چوں کہ وہ سیاست کا سبق بھول چکے تھے اس لیے وہ نتائج وعواقب کا کچھ اندازہ نہ کر سکے۔ لیکن یہ خاص بات تھی کہ ہندوستان اور انگلستان کے انگریزوں اور سیاست دانوں نے بھی اس پر خوشی منائی اور اپنے اخباروں میں اس کے شادیانے بجائے، جس سے ان امور کا پتا چلتا ہے جو اس تحریک کی تہہ میں تھے۔'' (مسلمانوں کا روشن مستقبل)

۲؍اکتوبر ۱۹۰۶ء: ٹائمز آف لندن میں یکم اکتوبر ہی کو ایڈریس شائع ہو گیا تھا۔

۲؍اکتوبر کو اس میں ایک طویل مضمون اس ایڈریس پر بطور تبصرہ شائع ہوا ہے، جس میں بنگال کی شورش پسندوں کے مقابلے میں مسلمانوں کے اعتدال کی تعریف کی جاتی ہے اور کہا جاتا ہے کہ مسلمان سیاسی ذمہ داری کے اہل معلوم ہوتے ہیں۔

اسی طرح اخبار ''ویسٹرن پریس برسٹل'' کے ۲؍اکتوبر کے شمارے میں ایک مفصل مضمون شائع ہوا ہے۔ اس میں مسلمانوں کی بہادری کی تعریف کی ہے اور لکھا ہے:

''اس وفد میں وہ مضبوط، جنگجو اور دلاور فاتحین ہند قوموں کے لوگ تھے جو کانگریس میں تقریر کرنے والوں سے سخت نفرت کرتے ہیں اور انھیں کم مرتبہ سمجھتے ہیں۔ بنگال کی پچھلی شورش نے مسلمانوں کو بہت ہی برافروختہ کیا ہے اور کل کے وفد سے اس امر کی طرف اشارہ ہوتا تھا کہ

گورنمنٹ کے لیے یہی بہتر ہے کہ وہ اس قسم کے لوگوں کی چیخ پکار کی طرف زیادہ توجہ نہ کرے، جو کہ اپنی چرب زبانی اور ذاتی ادعاؤں سے یہ سمجھنے لگے ہیں کہ وہ ایک قوم ہیں۔ یہ خیال ایک اندیشے کی علامت تھا اور وہ ایک تنبیہ بھی تھی۔ بہادر مسلمان، ہندوؤں کو حقیر سمجھتے ہیں اور ان سے نفرت کرتے ہیں۔ اور وہ ان ادنیٰ لوگوں کو جو جسمانی اور فوجی قوت میں ان سے نفرت کرتے ہیں۔ اور وہ ان ادنیٰ لوگوں کو جو جسمانی اور فوجی قوت میں ان سے کم ہیں، نہیں چاہتے کہ انھیں وہ سیاسی قوت دی جائے جس کے لیے وہ شور وشغب کرتے ہیں۔ کسی ایسی چیز کا وجود ابھی نہیں ہے، جسے ہندوستانی قوم کہہ سکتے ہیں اور نہ ایسی چیز کا وجود ہو سکتا ہے۔ ہندوستان میں سو سے زیادہ قومیں آباد ہیں۔ اگر برٹش گورنمنٹ کی طاقت محافظ نہ ہوتی تو باتونی اور جوشیلے بنگالی بابو، باوجود اپنی یونیورسٹی کی سندوں اور اپنی واقعی قابل قدر دماغی قوتوں کے ایک بار پھر شمال کی مسلمانوں قوموں کے غلام ہوتے اور ان کے لیے لکڑیاں کاٹتے اور پانی بھرنے کا کام کرتے۔ مسلمان انگریز کی اطاعت کرے گا مگر ہندو کی اطاعت ہرگز نہ کرے گا۔ اور جب ہندو سیلف گورنمنٹ کے متعلق گفتگو کرتے ہیں اور اپنے سوا کسی دوسرے کی طرف سے بولنے کا ادعا کرتے ہیں تو وہ صرف انگریزوں کو دھوکا دے سکتے ہیں جو ہندوستان کے حالات سے ناواقف ہیں۔''

ان مضامین سے معلوم ہوتا ہے کہ انگلستان کے پریس کو ہندوستانیوں کے ایک قوم ہونے کا کس قدر قلق اور صدمہ تھا اور وہ اس کو پاش پاش کر دینے سے کس قدر زیادہ خوش تھے اور انھیں، ہندوستان کے لوگوں کو مذہب کے اعتبار سے ایک دوسرے کے خلاف بھڑکا کر ان میں مستقل عداوت پیدا کرنے میں کس قدر انہاک تھا۔'' (مسلمانوں کا روشن مستقبل، صفحہ ۵۸۔۳۵۷)

کانگریس:

۵ ستمبر ۱۹۰۶ء: آج کے اودھ اخبار سے واضح ہوا کہ سرا ندرناتھ بنرجی کو مشرقی و مغربی دونوں بنگالوں کے شاہ کی حیثیت سے تاج پہنایا گیا اور انھوں نے غیر ملک کی ساخت کی چیزوں پر سخت اعتراض کیا اور ملک کی کارروائی جائز رکھنے کے لیے مذہبی مدد حاصل کی اور انگریزی کپڑے پر اسی وجہ سے اعتراض کیا کہ وہ سور کی چربی سے گھوٹا جاتا ہے۔ لہٰذا ہندو اور مسلمانوں دونوں کو ناگوار ہے۔ اس جلسے میں ہزاروں بنگالیوں کا مجمع تھا۔ میری رائے میں بظاہر ان کارروائیوں کا انجام بخیر نظر نہیں آتا۔ (ایک نامہ روزنامچہ، ص ۴۱)

وفد مسلمانوں کا:

۹/اکتوبر ۱۹۰۶ء: مسلمانوں کے ایک ڈپوٹیشن نے بہ سرغنائی آغا سلطان محمد شاہ آغا خان صاحب جی، سی، آئی، ای بمبئی جن کے ساتھ سربرآوردہ معزز اہل اسلام ہندوستان شریک تھے یکم اکتوبر ۱۹۰۶ء بمقام شملہ حضور میں لارڈ منٹو صاحب بہادر وائسرائے ہند حاضر ہو کر ایڈریس پیش کیا کہ جو انتظامات نسبت تقرر ججان ہائی کورٹ وغیرہ آئندہ ہونے والے ہیں۔ اس میں مسلمانان ہند کے حقوق کا بھی لحاظ رکھا جاوے جس کا جواب وائسرائے نے قابل اطمینان دیا۔ اس کی کیفیت مفصل اودھ اخبار مورخہ ۱۸/اکتوبر میں درج ہے۔

۹/نومبر ۱۹۰۶ء: نواب سلیم اللہ خان بہادر آف ڈھاکا نے ایک گشتی خط جاری کیا ہے، جس میں تجویز کیا گیا ہے کہ ''مسلم آل انڈیا کنفیڈریسی'' کے نام سے ایک سیاسی جماعت قائم کی جائے۔ اس جماعت کے مقاصد اور مجوزہ کاموں کا خاکہ بنا کر بزرگان قوم کے سامنے پیش کیا گیا اور مشوروں کی تکمیل کے آخر دسمبر ۱۹۰۶ء کے لیے ڈھاکا میں جمع ہونے کی دعوت دی گئی ہے۔

۲۶/دسمبر ۱۹۰۶ء کو کلکتہ میں آل انڈیا کانگریس کا یادگار اجلاس دادا بھائی نوروزی کی صدارت میں شروع ہوا۔ اس میں ۱۶۶۳ نمایندوں نے شرکت کی۔ ایک طرف اعتدال پسند وال کی صف تھی یعنی شری گوکھلے وغیرہ دوسری جانب، تلک مہاراج کے ساتھی مولانا حسرت وغیرہ تھے۔ جن کا پرزور مطالبہ تھا کہ تعلیمی ترقی کے ساتھ سوراج حاصل کرنے کے لیے ملک کو اپنی قسمت کا فیصلہ خود ہی کرنا چاہیے اور برطانوی سامراج کو تاراج کر دینے کے مناسب ذرائع اختیار کیے جانے چاہئیں۔ کانگریس کا یہ اجلاس بڑا ہنگامہ خیز تھا۔ اور یہ اندیشہ لاحق ہو گیا تھا کہ مبادا جماعت دو حصوں میں تقسیم ہو جائے لیکن صدر دادا بھائی نوروزی نے بڑی عجلت اور کمال ہنرمندی سے کام لے کر دونوں فریقوں میں مفاہمت کرا دی اور اسی اجلاس میں سوراج کے لفظ کو اہمیت دے دی گئی۔ ساتھ ہی بپن چندر پال جو انتہا پسند لیڈر تھے ان کی تجویز پر ''وندے ماترم'' کو قومی گیت قرار دے دیا گیا۔ (حسرت موہانی۔ ایک سیاسی ڈائری)

۳۰/دسمبر ۱۹۰۶ء: ڈھاکا میں آل انڈیا محمڈن ایجوکیشنل کانفرنس کا آخر دسمبر میں سالانہ اجلاس ہوا۔ اس موقعے پر ۳۰/دسمبر کو نواب وقار الملک کی صدارت میں ایک سیاسی جلسہ ہوا جس میں ''آل انڈیا مسلم لیگ'' قائم ہوئی۔ جس کے حسب ذیل مقاصد قرار دیے گئے:

(الف) مسلمانان ہند کے دل میں برٹش گورنمنٹ کی نسبت وفادارانہ خیالات کو ترقی دینا اور

گورنمنٹ کی کسی کارروائی کے متعلق ان میں جو غلط فہمی پیدا ہو، اسے دور کرنا۔

(ب) مسلمانان ہند کے پولٹیکل حقوق و فوائد کی نگہداشت کرنا اور ان کی ضروریات اور خواہشات کو مودبانہ طریقہ سے گورنمنٹ میں پیش کرنا۔

(ج) لیگ کے دیگر مقاصد کو نقصان پہنچائے بغیر مسلمانان ہند میں ایسے خیالات پیدا نہ ہونے دینا جو دوسرے فرقوں کی نسبت معاندانہ ہوں۔"

اس جلسے میں نواب وقار الملک سیکریٹری اور نواب محسن الملک جوائنٹ سیکریٹری مقرر کیے گئے۔

۱۹۰۶ء کی سیاست پر تبصرہ:

سال رواں میں مسلمانوں کے ایک وفد نے وائسرائے ہند سے فرقہ وارانہ طریق انتخاب کی استدعا کی اس میں اندرونی طور پر چند انگریزوں کا بھی ہاتھ تھا۔ ایک تو وائسرائے کے پرائیویٹ سکریٹری کرنل ڈنلاپ اسمتھ نے عرض داشت کا مضمون بنایا تھا۔ دوسرے مسٹر آرچ بولڈ پرنسپل علی گڑھ کالج جس نے کرنل ڈنلاپ کی تحریر سے نواب محسن الملک کو آگاہ کیا اور اس کی وکالت کی۔ ان سب کے سرگروہ تھے لارڈ منٹو وائسرائے جنھوں نے مسلمانوں کے اس مطالبے کو وزیر ہند سے منظور کرانے میں ایڑی چوٹی کا زور لگایا۔ اس مطالبے کی منظوری کے بعد انگلستان میں خوشیاں منائی گئیں کہ اب ہندوستان میں ایک قوم نہ رہے گی بلکہ کئی قومیں ہوں گی۔ جو آپس میں لڑتی رہیں گی۔" (حسرت موہانی۔ ایک سیاسی ڈائری)

۲۔ جنگ روس و جاپان کے جو اثرات ہندوستان کی سیاست پر پڑے اس کے بارے میں ڈاکٹر محمد اشرف لکھتے ہیں:

"۱۹۰۶ء ایشیا کی جنگ آزادی میں ایک فیصلہ کن منزل ہے۔ اس لیے کہ ۱۹۰۵ء کے روسی مزدور انقلاب کے بعد ایشیا میں ایک ہل چل سی مچ گی۔ اور جاپان کے علاوہ ایشیا کے اسلامی ممالک بھی جاگ اٹھے۔ اس موقعے پر برطانیہ اور زار روس نے اپنی پرانی رقابت کو بالائے طاق رکھ کر ایشیائی ممالک کو اپنے اپنے "حلقۂ اثر" میں لینے کا نیا منصوبہ بنایا اور اس بنیاد پر ۱۹۰۷ء کا باہمی معاہدہ ہو گیا۔ انگریزوں نے جب ہندوستان پر نظر ڈالی تو دیکھا کہ انقلاب کی چنگاریاں یہاں بھی بھڑک چکی ہیں۔ اور لوگ معمولی مراعات کی بجائے اب سودیشی اور سوراج کے نعرے

لگا رہے ہیں اور میموریل پیش کرنے کی بجائے بم اور پستول سے کام لینا چاہتے ہیں۔ ان کی گھبراہٹ اس واقعے سے اور بڑھی کہ انتہا پسندی کی ان سیاسی صفوں میں سے حسرت موہانی جیسے علی گڑھ کے نوجوان اور مولویوں میں عبیداللہ سندھی جیسے بھی نظر آتے تھے۔ چناں چہ برطانیہ نے اپنی حکمت عملی سے کام لے کر تقسیم بنگال کا اعلان کر دیا اور اس تفرقہ پردازی کی حمایت کے لیے آل انڈیا مسلم لیگ یعنی مسلمانوں کی فرقہ وارانہ سیاسی تنظیم وجود میں آئی۔ علی گڑھ اور نئی مسلم سیاست کی تنظیم اس منزل سے شروع ہوئی اور جب دو تین سال بعد نئی اصلاحات کا اعلان ہوا تو حکومت کے اشارے پر آغا خان کا وفد شملہ پہنچا اور اس نے ''جداگانہ حق انتخاب'' کے وہ مطالبات دہرائے جو لارڈ منٹو نے پہلے سے علی گڑھ بھیج دیے تھے۔ اور لارڈ منٹو نے حسب امید مسلمانوں کے بارے میں حکومت برطانیہ کی نئی پالیسی کا اعلان کیا جس میں جداگانہ حق انتخاب کے علاوہ ان کی تاریخی حیثیت کا لحاظ کرتے ہوئے ان کی امتیازی حیثیت تسلیم کر لی گئی تھی اور آیندہ کے لیے مسلمانان ہند کی اقلیت مخصوص مراعات کی مستحق قرار پائی۔ بالفاظ دیگر مسلمانان ہند کا یہ منصب اور فریضہ قرار پایا کہ ہندو اکثریت اور تحریک آزادی وطن کے ہر جائز اور جمہوری مطالبے میں اپنی پسماندگی کا بہانہ بنا کر روڑے اٹکایا کریں اور برطانیہ کے آلۂ کار بند جائیں۔ سدیشی اور سوراج کا کانگریس ہندوستانی عوام میں پرچار کر رہی تھی، اب علی گڑھ کے رہنماؤں نے بھی مسلم عوام کو بہکانے کے لیے ان سے ربط پیدا کرنے کی کوشش کی اور مولانا طفیل احمد مرحوم کے بیان کے مطابق علی گڑھ کالج کے انگریز پرنسپل نے دہلی کی جامع مسجد میں عید کی نماز کے موقعے پر اپنے طالب علم اس لیے بھیجے کہ مشترکہ انتخابات کے جمہوری مطالبہ کی مخالفت یہ کہہ کر کریں کہ اگر مشترکہ انتخابات پر عمل ہوا تو مسلمانوں سے گائے کی قربانی کا حق چھن جائے گا۔ علی گڑھ کے نوجوان اب تک نائب تحصیلدار، تھانیدار ہوا کرتے تھے۔ کوئی کوئی فوج میں چھوٹے عہدوں پر بھرتی ہو جاتا تھا۔ اب علی گڑھ کے گریجویٹ بحمداللہ ڈپٹی کلکٹر اور سپرنٹنڈنٹ پولیس کے درجے پر پہنچنے لگے بلکہ ایک دو ذہین نوجوان ممالک اسلامیہ میں وزارت خارجہ کی خفیہ خبر رسانی کے لیے بھیجے گئے۔ حکومت کے لیے یہ اس لیے اور بھی ضروری تھا کہ اب ''اتحاد اسلامی'' کی مغرب دشمن تحریک ترکی، ایران اور مصر میں پھیل چکی تھی اور ''نوجوان ترک'' اپنے وطن کو مغربی تسلط سے آزاد کرانے کے لیے مسلمانان ہند سے اپنے روابط مضبوط کرنا چاہتے تھے۔

علی گڑھ نے اس منزل پر احرار لیگ کی نوجوان جماعت کو جنم دیا، جس کے رہبر مولانا محمد علی

اوران کے رفیق تھے۔ مولانا محمد علی کے ساتھ حکیم اجمل خان، حسن امام، ظفر علی خان، فضل الحق وغیرہ سب نوجوان آل انڈیا محمڈن ایجوکیشنل کانفرنس کے ۱۹۰۶ء والے اجلاس ڈھاکا میں شریک تھے جب مسلم لیگ کی بنیاد ڈالی گی۔ علی گڑھ سیاست کے مطالبہ ''تحفظات'' کو یہ حضرات بھی تسلیم کرتے تھے۔ حالی اور شبلی کی شاعری ان کی رگ و پے میں بھی سرایت کر چکی تھی بلکہ مولانا محمد علی اس فکر میں تھے کہ شبلی کی سیرت نبوی موسومہ ''سیرۃ النبی'' کا انگریزی میں ترجمہ کریں۔ البتہ یہ لوگ سرسید کو ''جی حضوری'' سیاست کا نہیں بلکہ بے خوف ترجمانی کا دعویدار شمار کرتے تھے جس کا منطقی تقاضہ یہ تھا کہ علی گڑھ کا یہ نوجوان گروہ مسلمانوں کو اقتدار اور خوشحالی دلانے کے لیے صرف یہی نہیں کہ تحریک آزادی وطن میں شریک ہو اور برطانیہ کے بجائے کانگریس سے مفاہمت کر لے بلکہ دیوبند اور فرنگی محل کے علمائے اسلام کو بھی قریب لائے، جو اب تک علی گڑھ کو ''نیچری'' اور بے دین سمجھ کر ان سے متنفر رہے تھے۔ چناں چہ مولانا محمد علی نے ڈھاکا سے واپس آکر بڑودہ کی ملازمت سے استعفیٰ دیا اور کلکتہ سے اپنا مشہور اخبار ''کامریڈ'' نکالا۔ (ہندوستانی مسلم سیاست، صفحہ ۲۷-۲۴)

مولوی احمد رضا خان صاحب بریلوی کا قصہ:

۱۳۲۴ھ (۱۹۰۶ء) کے ابتدا میں، حضرت مولانا خلیل احمد صاحب قدس اللہ سرہٗ العزیز بعد از فراغت حج مدینۂ منورہ تشریف لائے اور تقریباً پندرہ روز قیام فرمایا چوں کہ موصوف میرے اساتذہ کرام میں سے تھے، اس لیے طلبائے مدینۂ منورہ کا ان کی طرف بہت ہجوم ہوا اور عموماً علمائے مدینہ بھی ان کی زیارت اور دست بوسی کے لیے حاضر ہوتے رہے اور بہت بڑے مجمع نے اوائل کتب احادیث سنا کر مسجد شریف کے اندر بڑے حلقے میں اجازت کتب حدیث وعلوم لی۔ یہ امر ان متعدد ہندوستانیوں کو نہایت شاق گزرا جو خود یا ان کے اکابر حضرات علمائے دیوبند اوران کے اسلاف رحمہم اللہ تعالیٰ سے، کسی قسم کا خلاف رکھتے تھے۔ نیز جاہل ہندوستانیوں کو بھی ان کے حسد نے اس پر مجبور کیا۔ ہم پر تو ان کا داؤ اس لیے اب تک نہ چلا تھا کہ اہل مدینہ اور وہاں کے عمائد وغیرہ سے ہمارے تعلقات قوی ہو گئے تھے، وہ خود یا ان کے لڑکے اور احباب ہم سے پڑھتے تھے یا دوستی وغیرہ کا تعلق تھا۔ نیز ہماری کوئی تصنیف بھی جس سے ان کو غلط افواہ پھیلانے کا موقع ملے موجود نہ تھی ہر قسم کی کتب درسیہ اہل سنت والجماعت کی زیر تدریس تھیں۔ اس لیے ان کی غلط بیانیوں کی کوئی وقعت نہیں ہو سکتی تھی۔ مگر حضرت مولانا مرحوم کی یہ عظمت و شوکت دیکھ کر ان کے

کلیجوں پر سانپ لوٹنے لگا۔ کتاب ''براہین قاطعہ'' حضرت مولانا مرحوم کی اہل بدعت کے لیے جس قدر سیف قاطع اور دلوں کی زخمی کرنے والی ہے۔ اس کو ان مخالفوں کا کلیجہ ہی جانتا ہے۔

چوں کہ حضرت مولانا مرحوم قافلے کی واپسی پر مجبور تھے اس لیے پندرھویں دن معہ اپنے رفقا کے واپس ہو گئے مگر مخالفین کے سینوں میں زخم کر گئے۔ حضرت مولانا موصوف مرحوم کی واپسی کے بعد میں نے خواب دیکھا کہ میں مسجد شریف میں بیٹھا ہوا ہوں اور میرے ایک طرف حضرت گنگوہی قدس اللہ سرہٗ العزیز تشریف فرما ہیں اور دوسری طرف (غالباً داہنی جانب) جناب رسول اللہ ﷺ کوئی کتاب لیے ہوئے تشریف لائے ہیں۔ بیداری پر مجھ کو فکر ہوئی کہ کیا بات ہے کہ ہر دو آقا میری امداد فرما رہے ہیں۔ دو تین دن کے بعد مولوی احمد رضا خاں صاحب مدینۂ منورہ پہنچے۔ وہ مکۂ معظمہ میں بعد از حج اپنے ایک رسالے ''حسام الحرمین'' پر دستخط کرانے کے لیے کچھ ٹھہر گئے تھے۔ ان کی آمد پر یہ زخمی جماعت (مخالف ہندوستانیوں وغیرہ کی) ان کے ارد گرد جمع ہو گئی اور ہماری بڑھتی ہوئی وجاہت اور رفعت سے جو خطرات ان کو اپنے عقائد اور خیالات کے متعلق اور اپنی اپنی پوزیشنوں کے بارے میں نظر آ رہے تھے پیش کیا۔ نیز یہ کہا کہ رسالہ ''حسام الحرمین'' کے خلاف اگر حسین احمد نے کوشش کی تو کامیابی نہ ہو سکے گی اور یہی عظیم الشان مقصد مولوی احمد رضا خان صاحب کا تھا یعنی یہ کہ اس رسالے کی تصدیق علمائے مدینۂ منورہ کر دیں۔ اس لیے مشورہ ہوا کہ بڑے بڑے حکام سیاسی اور مذہبی سے ملاقات اور تعارف کرایا جائے اور ان کی خدمات میں نذرانے پیش کیے جائیں، وسائط مہیا کیے جائیں، متعدد رسائل مولوی صاحب موصوف کے پیش کر کے ان کی علمیت سے مرعوب کیا جائے اور کوشش کی جائے کہ اس فیض آبادی خاندان کو شہر بدر اور جلا وطن کر دیا جائے ایسا پہلے بہت مرتبہ ہو چکا تھا کہ کسی آفاقی عالم کا شہرۂ علمی ہوا اور اس سے علماء یا اکابر مدینۂ منورہ کو نفسانی یا واقعی خلاف پیش آیا تو اس کو بذریعہ حکومت جلا وطن کرا دیا چناں چہ علامہ شیخ محمود شنقیطی اور حجری وغیرہ سے ایسا معاملہ پیش آیا تھا کہ نفسانی اغراض مذہبی رنگ میں ظاہر ہوتی تھیں جیسا کہ عموماً دیکھا جا رہا ہے۔ چناں چہ اس پر عمل درآمد شروع کیا گیا اور بہت بڑی تعداد نقود کی خرچ کی گئی دوڑ دھوپ شروع ہو گئی اور سازشوں کا جال پوری طرح بچھا دیا گیا۔ ہم بالکل بے خبر تھے کہ خبر پہنچی کہ رسالہ پر دستخط لیے جا رہے ہیں اور ہمارے اور اساتذۂ کرام کے متعلق وہابیت کا ہر با اثر شخص سے پروپیگنڈا کیا جا رہا ہے۔ چوں کہ سلطان عبدالمجید خان مرحوم کے اوائل زمانۂ حکومت میں نجدیوں کا حجاز پر غلبہ ہو چکا تھا اور انھوں نے دس برس مکۂ معظمہ میں

اور تین برس اخیر کے مدینہ منورہ میں حکومت کی تھی۔ یہ لوگ محمد بن عبدالوہاب نجدی کے پیرو تھے اور اپنے عقائد و اعمال میں نہایت سخت غالی تھے انھوں نے اہالی حرمین پر بہت زیادہ تشددات کیے تھے اور اپنے مخالف عقائد و اعمال والوں کو بہت زیادہ ستایا تھا، اس لیے اہل حرمین کو ان سے بہت زیادہ بغض اور تنفر تھا۔ بالآخر سلطان عبدالمجید خان مرحوم نے خدیوی محمد علی پاشا مرحوم والی مصر سے بوقت صلح شرط کی کہ وہ اہل نجد کو حجاز سے نکالے۔ چناں چہ خدیوی مرحوم نے اپنے بیٹے ابراہیم پاشا کو جرار فوج کے ساتھ بھیجا اور اس نے نجدیوں کے قبضہ سے حجاز کو واگذاشت کیا۔ اس زمانہ سے حجاز میں یہ طریقہ جاری ہوگیا تھا کہ جس شخص سے تنفر پھیلانا منظور ہوا۔ اس کو وہابیت کی طرف منسوب کر دیا۔ اہل حجاز کو وہابیت سے اس قدر نفرت مظالم مذکورہ کی وجہ سے ہوگئی تھی کہ عیسائیت اور یہودیت وغیرہ سے بھی اتنی نفرت نہ تھی۔ یہی طریقے انگریزی حکومت نے بھی ہندوستان میں اپنے مخالفین کے ساتھ جاری کیا۔

بڑی مشکلوں سے رسالہ "حسام الحرمین" بعض اہم شخصوں کے پاس سے جن کے پاس تصدیق کے لیے گیا ہوا تھا دیکھنے کو مل گیا، جس پر ہم نے فوراً اس کی غلط بیانی اور افتراپردازی کا پول کھولنے کا تہیہ کرلیا۔

رسالہ حسام الحرمین کی حقیقت:

علمائے دیوبند اور ان کے اسلاف کرام رحمہم اللہ تعالےٰ ہمیشہ سے جامعین شریعت و طریقت، پکے حنفی اور متبع اسلاف اہل سنت والجماعت ہیں اور سلسلۂ تلمذ حضرت شاہ عبدالغنی صاحب مجددی ثم المدنی حضرت شاہ محمد اسحاق صاحب دہلوی ثم المکی حضرت شاہ عبدالعزیز صاحب دہلوی۔ حضرت شاہ ولی اللہ صاحب قدس اللہ اسرارہم سے رکھتے تھے جس طرح سلسلۂ ارادت حضرت قطب عالم حاجی امداد اللہ صاحب قدس اللہ سرہ العزیز اور ان کے مشائخ طریقت چشتیہ، نقشبندیہ، قادریہ سہروردیہ رحمہم اللہ تعالےٰ ورضی عنہم وارضاہم سے رکھتے ہیں۔ عقائد میں وہ اہل سنت، اشاعرہ اور ماتریدیہ کے متبع اور اعمال وفروع میں حضرت امام اعظم ابوحنیفہ رحمہ اللہ تعالےٰ کے مقلد ہیں۔ ان کا علم محض زبانی نہیں ہے، بلکہ ان کے قلوب اور جوارح بھی حقیقۃً تقوی سے مزین اور منصبغ ہیں۔ اسی بنا پر ان کا اثر محبوبیت اور مقبولیت کا مسلمانوں میں نہایت زیادہ اور گہرا ہمیشہ سے رہا ہے، جیسا کہ اسلاف اکرام میں بھی ایسے ہی لوگوں کا رہا ہے۔ قرآن شریف اور

احادیث صحیحہ ایسے لوگوں کی قبولیت عامہ کے گواہ عادل ہیں۔ سورۂ مریم میں ہے:۔ "ان الذین امنو او عملوا الصالحات سیجعل لھم الرحمن ودا" مگر چوں کہ حسب ارشاد قرآنی عادت خداوندی ہمیشہ یہ بھی جاری ہے کہ ہر پیغمبر کے لیے اہل باطل جنات وانسان میں سے کھڑے ہو کر آوازۂ عداوت وتنفیر اٹھائیں اور سچے پیغمبروں کے خلاف سازشیں کریں۔ پارہ ہشتم میں ہے:

"وکذلک جعلنا لکل نبی عدوا شیاطین الانس والجن یوحی بعضھم الی بعض زخرف القول غرورا، ولو شاء ربک ما فعلوہ فذرھم وما یفترون."

"اور اسی طرح ہم نے ہر پیغمبر کے لیے انسانوں اور جنات کے شیطانوں کو دشمن بنایا جو کہ ایک دوسرے پر سجائے ہوئے (جھوٹے) قول کو دھوکا دینے کے لیے القا کرتے رہتے ہیں اور تیرا رب اگر چاہتا تو یہ نہ کرتے۔ پس چھوڑ دے تو ان کو اور ان کی افترا کی ہوئی باتوں کو"

انیسویں پارہ میں ہے:

"وکذلک جعلنا لکل نبی عدوا من المجرمین وکفی بربک ھادیا ونصیرا."

"اور اسی طرح ہم نے اہل جرائم میں سے ہر نبی کے دشمن بنائے اور تیرا رب ہدایت اور امداد کے لیے کافی ہے۔"

غرض اس عالم امتحان وابتلا میں عادت خداوندی یہ بھی ہے کہ ہر پیغمبر کے (خواہ وہ کتنا ہی بڑا اور معجزات والا کیوں نہ ہو) دشمن انسان اور جنات میں سے کھڑے کیے جاتے ہیں اور وہ طرح طرح کی افترا پردازیاں اور سازشیں ان خدا کے سچے بندوں کے خلاف اٹھا کر مخلوق کو دھوکے دیتے اور پیغمبروں کو ستاتے رہتے ہیں۔ چناں چہ جناب رسول اللہ ﷺ اور دیگر انبیاء علیہم الصلوٰۃ والسلام کے واقعات اور سوانح اس پر پوری روشنی ڈالتے ہیں۔ جب کہ انبیاء علیہم السلام کا یہ حال ہوا تو ان کے سچے وارثوں کو اس نعمت میں سے بھی حصہ ملنا ضروری ہے۔ چناں چہ ہر زمانے میں اکابر علمائے راسخین اور اتقیا وصالحین کو ایسا ہی واقعہ پیش آیا۔ امام ابوحنیفہ، امام مالک، امام شافعی، امام احمد، امام بخاری، شمس الائمہ سرخسی وغیرہم رحمہم اللہ تعالےٰ کے ساتھ جو کچھ پیش آیا، تاریخ کے

صفحات اس سے بھرے ہوئے ہیں۔ اسی طرح اکابر صوفیۂ کرام کے واقعات بھی صفحۂ عالم پر نمایاں ہیں۔ ہندوستان میں بھی انھیں اعدائے اہل السنۃ کی ریشہ دوانیوں میں سے ملتانی وغیرہ علمائے سوء کا فتویٰ تکفیر مرتب کرنا اور اس پر حضرت مجدد رحمۃ اللہ علیہ کے خلاف علمائے حرمین شریفین سے تصدیق کرانا۔ جہانگیر کے دربار میں شکایات کرا کے قلعۂ گوالیار میں حضرت مجدد رحمۃ اللہ علیہ کو قید کرانا، حضرت شاہ ولی اللہ صاحب کے پہونچے اتروا دینا حضرت شاہ عبدالعزیز صاحب اور ان کے بھائیوں اور اہل وعیال کو پیدل شہر بدر کرانا دینا اور مکان وغیرہ کو ضبط کرا دینا۔ حضرت مرزا جان جاناں رحمۃ اللہ علیہ کو شہید کرانا۔ حضرت سید احمد صاحب شہید بریلوی اور شاہ محمد اسمٰعیل صاحب شہید رحمۃ اللہ علیہما کے خلاف طوفان کھڑا کرنا وغیرہ ایسے واقعات ہیں جن سے ایک جماعت کی عاقبت برباد ہوئی اور ان اسلاف کرام کے لیے درجات کی بلندی اور زلات وسیئات کے محو ہونے کی بے بہا نعمت ہاتھ آئی۔

بہر حال اکابر علمائے دیوبند کو بھی اسی وراثت نبوی میں سے عظیم الشان حصہ ملنا ضروری تھا چناں چہ ایسا ہی ہوا اور ایسا کھلا ہو جھوٹ ان کے خلاف استعمال کیا گیا کہ جس کی نظیر نہیں ملتی۔ اولاً ان کو اس رسالہ میں وہابی ظاہر کیا گیا حال آں کہ محمد بن عبدالوہاب اور اس کے فرقے سے ان حضرات کو دور کا بھی تعلق نہ تھا۔ وہ عقائد واقوال جو طائفۂ وہابیہ کے مشہور اور مابہ الامتیاز (بین اہل السنۃ وبینہم) ہیں۔ ان کے خلاف ان حضرات کی تصانیف بھری ہوئی ہیں، وہ وفات ظاہری کے بعد انبیاء علیہم السلام کی حیات جسمانی اور بقاعلاقۂ بین الروح والجسم کے منکر ہیں، اور یہ حضرات صرف اس کے قائل ہی نہیں بلکہ مثبت بھی اور بڑے زور شور سے اس پر دلائل قائم کرتے ہوئے متعدد رسائل اس بارے میں تصنیف فرما کر شائع کر چکے ہیں رسالہ ''آب حیات'' نہایت مبسوط رسالہ خاص اسی مسئلے کے لیے لکھا گیا ہے۔ نیز ہدیۃ الشیعہ، اجوبہ اربعین حصہ دوم اور دیگر رسائل مطبوعہ مصنفہ حضرت نانوتوی قدس اللہ سرہ العزیز اس مضمون سے بھرے ہوئے ہیں۔ وہابیہ جناب رسول اللہ ﷺ کی زیارت کے لیے سفر کرنے کو ممنوع قرار دیتے ہیں اور کہتے ہیں کہ فقط مسجد نبوی میں نماز پڑھنے کے لیے سفر کرنا چاہیے۔ وہاں پہنچنے کے بعد زیارت بھی کر لی جائی۔ ہمارے اکابر زیارت مطہرہ کے لیے سفر کرنے کو نہ صرف جائز بلکہ افضل المستحبات اور قریب واجب قرار دیتے ہیں۔ بلکہ محض زیارت کے لیے سفر کرنا جس میں اور کوئی دوسری قربت منوی اور ملحوظ ہو، افضل اور اعلیٰ قرار دیتے ہیں۔ چناں چہ رسالہ ''زبدۃ المناسک'' مصنفہ حضرت گنگوہی قدس اللہ

سرہ العزیز زیارۃ المدینہ اس پر شاہد عدل ہے۔

وہابیہ توسل بالانبیاء والاولیاء علیہم الصلوٰۃ والسلام کو بعد الوفاۃ ممنوع اور حرام قرار دیتے ہیں۔ یہ حضرات اس کو نہ صرف جائز بلکہ ''ارجی الاجابت''(۱) اور مفید تر قرار دیتے ہیں۔ شجرات حضرات چشت رحمہم اللہ تعالےٰ اور آداب زیارت وادعیۂ مدینۂ منورہ اس پر شاہد عدل ہیں، جو کہ حضرت نانوتوی اور حضرت گنگوہی اور حضرت مولانا محمد یعقوب صاحب اور حضرت حاجی امداد اللہ صاحب قدس اللہ اسرارہم کے متعدد تصانیف میں شائع ہو چکی ہیں۔

وہابیہ بارگاہ نبوت میں گستاخانہ کلمات استعمال کرتے رہتے ہیں اور یہ حضرات بارگاہ نبوت (علی صاحبہا الصلوٰۃ والسلام) میں اس قدر اظہار عقیدت فرماتے ہیں کہ ظاہر بین اس کو غلو اور تجاوز عن الحد شمار کرنے لگتا ہے۔ حضرت مولانا رشید احمد صاحب گنگوہی قدس اللہ سرہ العزیز نے اپنی مشہور اور مقبول تصنیف ''زبدۃ المناسک'' کے آخری حصہ میں زیارت مدینۂ منورہ (علی صاحبہا الصلوٰۃ والسلام) کا تذکرہ کرتے ہوئے حاضری مدینۂ منورہ داخلۂ مسجد نبوی (علی صاحبہا الصلوٰۃ والسلام) زیارۃ قبر مطہر سلام پیش کرنے کے آداب، شفاعت اور توسل کی دعائیں اور مسجد شریف اور مدینۂ طیبہ کے متبرک مقامات سے فیض حاصل کرنے کے لیے جو الفاظ تحریر کیے ہیں وہ اظہار عقیدت کے لیے واشگاف حقیقت اور اس عظمت و احترام کا بین ثبوت ہے، جس سے حضرت موصوف کا قلب معمور تھا۔

حجۃ الاسلام حضرت مولانا محمد قاسم صاحب قدس اللہ سرہ العزیز آنحضرت ﷺ کی شان مبارک میں وہ بلند پایہ مضامین ارشاد فرماتے ہیں جن کے حریم معلےٰ تک جلیل القدر علماے امت کا طائر فکر بھی پرواز نہیں کر سکا تھا۔

رسالہ آب حیات، قبلہ نما۔ تحذیر الناس، ہدیۃ الشیعہ، اجوبہ اربعین، قاسم العلوم، مناظرہ عجیبہ وغیرہ ایسے مضامین سے بھرے ہوئے ہیں۔ ان مطبوعہ تصانیف کو ملاحظہ فرما کر ہمارے بیان کی تصدیق کی جا سکتی ہے۔ صرف ایک فقرہ ملاحظہ فرمائیے۔ اجوبہ اربعین، حصہ دوم، صفحہ ۱۲۸ میں ہے:

> ''اور سر اس میں یہ ہے کہ اضافۂ وجود وکمالات وجود مخلوقات کی جانب اگرچہ خزانۂ خداوندی ہی سے ہوتا ہے مگر بشہادت آیت النبی الولی بالمومنین اور آیت خاتم النبیین چناں چہ تقریرات مرقومہ بالا

---

(۱) ارجی لاجابت۔ یعنی اس توسل کے بعد اس دعا کے قبول ہونے کی توقع زیادہ ہو جاتی ہے۔ (ناشر)

سے واضح ہو چکا اور نیز بشہادۃ دیگر آیات و تائید تحقیقات ارباب
مکاشفات وہ سب افاضہ بواسطہ حضرت خاتم المرسلین ﷺ اسی طرح ہوتا
ہے جیسے شب کو بواسطہ قمر افاضۂ نور آفتاب ہوا کرتا ہے۔''

تمام انبیاء علیہم السلام کے جملہ کمالات اور علوم بلکہ نبوت و رسالت کو بھی جناب رسول اللہ ﷺ کے واسطے سے حاصل ہونا نہایت مدلل اور مفصل طریقے پر ثابت فرماتے ہیں۔ کمالات ولایت و قرب وغیرہ تو در کنار۔ نفس وجود جملہ عوالم و عالمیان کو بھی آپ ہی کے ذریعے سے ثابت فرما رہے ہیں۔ قصیدۂ مدحیہ میں ارشاد فرماتے ہیں:

لگاتا ہاتھ نہ پتلے کو بوالبشر کے خدا ۔۔۔ اگر وجود نہ ہوتا تمھارا آخر کار
جلو میں تیرے سب آئے عدم سے تا بوجوہ ۔۔۔ بجا ہے تم کو اگر کہیے مبدا الآثار
بجز خدائی نہیں چھوٹا تجھ سے کوئی کمال ۔۔۔ بغیر بندگی کیا ہے لگے جو تجھ کو عار
جو انبیا ہیں وہ آگے تری نبوت پر ۔۔۔ کریں ہیں امتی ہونے کا یا نبی اقرار
جہاں کے سارے کمالات ایک تجھ میں ہیں ۔۔۔ ترے کمال کسی میں نہیں مگر دو چار
تو بوئے گل ہے اگر مثل گل ہیں اور نبی ۔۔۔ تو نور دیدہ ہے گر ہیں وہ دیدۂ بیدار
بجز خدا کے بھلا تجھ کو کوئی کیا جانے! ۔۔۔ تو شمس نور ہے سپر نمط اولوا الابصار

(نقشِ حیات/ حصہ اول، ۲۲۔۱۱۲)

ہم نے اپنے رسالہ ''الشہاب الثاقب علی المسترق الکاذب'' میں ان جملہ امور کے متعلق پوری تفصیل لکھ دی ہے۔

خلاصہ یہ کہ مولوی احمد رضا خان صاحب اور ان کے ہم نوا مجاورین اہل ہند (۱) نے اس رسالہ کو (جو ''حسام الحرمین علی عنق اہل الکفر والمین'' نام سے موسوم کر کے بعد میں شائع کیا گیا) تصدیق اور مہر و دستخط کے لیے وہاں کے اہل علم اور مذہبی رؤسا کے سامنے پیش کیا۔ ظاہر ہے کہ ان عنوانات سے ہر ناواقف مسلمان پورے غیظ و غضب میں آ جائے گا اور جو کچھ بھی اس سے ہو سکے گا کر گزرے گا اور جہاں تک ممکن ہوگا برا بھلا لکھ دے گا۔ چناں چہ یہی ہوا۔ بعض ناواقفوں نے تو غیظ و غضب میں آ خر بلا شرط و استثناء تکفیر و تصدیق کر دی اور اکثر سمجھ دار اور محتاط لوگوں نے شرط

(۱) مجاور عرف اہل مدینہ میں ان غیر ملکوں کے باشندوں کو کہتے ہیں جو مدینہ میں پیدا نہ ہوئے ہوں اور باہر سے آ کر اقامت پذیر ہو گئے ہوں۔

لگائی کہ اگر واقع میں ان اشخاص کے ایسے ہی اقوال وعقائد ہیں اور ان سے اس کے خلاف ثبوت نہیں ہے اور نہ انھوں نے رجوع کیا ہے تو بے شک جو کچھ مولف رسالہ نے لکھا ہے صحیح ہے۔

یہ کارروائی نہایت جدوجہد اور اخفاء کے ساتھ ہو رہی تھی ہم کو صرف اس قدر معلوم ہو سکا تھا کہ یہ اشخاص علماء اور مفتی صاحبان اور اہل اثر کے پاس دوڑ دھوپ کرر ہے ہیں، مگر کس مقصد کے لیے یہ کارروائی ہو رہی ہے؟ اس کا پتا بالکل نہیں چلتا تھا اور صرف یہ خیال تھا کہ چوں کہ حضرت مولانا خلیل احمد صاحب ابھی تشریف لائے تھے اور ان سے یہاں کے اعاظم علماء اور اکثر طلباء ملے تھے اور سند حدیث اور اجازت وغیرہ حاصل کی تھی۔ اہل علم میں ان کی بہت مقبولیت تھی اس لیے حاسدوں اور دشمنوں کو ان کے خلاف اور اسی ذریعے سے ہمارے خلاف پروپیگنڈا کرنا منظور ہے ساتھ ہی ساتھ یہ بھی خیال تھا کہ اگر کوئی بات ہمارے یا ہمارے اکابر کے خلاف ہوگی تو کم از کم ہم سے پوچھا تو جائے گا، اسی حالت میں کئی روز گزر گئے۔ پھر تجسس پر یہ معلوم ہوا کہ کسی تحریر پر تصدیق کرائی جا رہی ہے تو اس کی تلاش ہوئی کہ وہ تحریر کیا ہے۔ بالآخر شیخ عبدالقادر شبلی طرابلسی کے پاس جب وہ تحریر پہنچی تو انھوں نے مجھ کو بلا بھیجا اور یہ رسالہ دکھلایا میں نے ان کو حقیقۃ الامر سے مطلع کیا اور پھر میں امین الفتویٰ شیخ عمر حماد مرحوم کے پاس گیا اور تحذیر الناس اور فتاویٰ رشیدیہ وغیرہ کی عبارتیں دکھلائیں تو انھوں نے بہت افسوس کیا پھر مفتی احناف ''آفندی تاج الدین الیاس'' مرحوم کے پاس پہنچا اور ان سے تمام حقیقت بیان کی انھوں نے بھی افسوس کا اظہار کیا اور کہا کہ ہم کو تو حقیقت کا علم نہ تھا، تو نے ہم کو پہلے کیوں مطلع نہ کیا۔ چوں کہ میرے تعلقات ان لوگوں سے پہلے سے بہت گہرے تھے۔ مفتی صاحب موصوف کا نواسہ میرے پاس پڑھتا تھا نیز دوسرے اہل مدینہ نوجوان بڑے خاندان والے یا احباب تھے یا مجھ سے پڑھتے تھے، اس لیے میں نے ان سے کہا کہ مجھ کو اعتماد تھا کہ اگر میرے مشائخ اور اساتذہ یا میرے متعلق آپ کے پاس کسی قسم کی کوئی خبر پہنچے گی تو آپ ضرور بالضرور مجھ سے اس بات کو دریافت کریں گے۔ انھوں نے جواب دیا کہ ہم کو بالکل علم نہیں کہ یہ حضرات تیرے اساتذہ اور مشائخ ہیں۔ بہر حال اب تو جو کچھ ہونا تھا ہو چکا۔ ہم نے تصدیق میں کافی احتیاط کر لی ہے اور لکھ دیا ہے کہ اگر واقع میں ان اشخاص کے یہی اقوال اور عقائد ہیں اور رجوع ثابت نہیں ہے تو مصنف رسالہ کا قول صحیح ہے۔ اگر پہلے سے اس کا علم ہوتا تو ہم ہرگز اتنی بھی تصدیق نہ کرتے۔ اسی طرح اور دوسرے اشخاص نے جواب دیا۔ اسی اثناء میں یہ بھی پیش آیا کہ آفندی سید احمد برزنجی مرحوم مفتی شافعیہ کے پاس مولوی احمد

رضا خانصاحب پہنچے اور رسالۂ مذکورہ کے ساتھ رسالہ ''علم غیب'' بھی پیش کیا۔ مفتی صاحب نے بالشروط پہلے رسالہ کی تصدیق تو کردی تھی مگر مسئلہ علم غیب میں مخالفت کی۔ آخر میں کچھ بحث ہوئی مفتی صاحب ناراض ہوگئے اور خفا ہو کر کہا کہ میری تصدیق واپس بھیج دو مگر مولوی احمد رضا خاں صاحب چلے آئے اس کے بعد مفتی صاحب نے رسالہ غ ''اٰیۃ الماموں فی علم غیب الرسول'' (علیہ السلام) لکھا جو کہ ہندوستان میں چھپ کر شائع ہوا تھا۔ مولانا منصور علی صاحب مرحوم رام پوری کی سعی و کوشش جو کہ اس زمانے میں وہاں موجود تھے اس کی اشاعت میں زیادہ کارگر ہوئی۔

اس فتنے پر یہ کوشش بڑے زور سے عمل میں لائی گئی تھی کہ انھیں حضرات کے تلامیذ اور متبعین حسین احمد اور اس کے برادران وغیرہ ہیں۔ لوگوں نے کہا کہ آج تک ہم نے کوئی بات ان سے خلاف طریقۂ اہل سنت والجماعت نہیں دیکھی! تو یہ جواب دیا کہ وہ چھپاتے ہیں اور رفتہ رفتہ وہ سب لوگوں کو گمراہ کردیں گے۔ اس پروپیگنڈا کو سید یٰسین مرحوم کابلی کے ذریعے جو کہ عثمان پاشا والی مدینۂ منورہ کے یہاں رسوخ کامل رکھتا تھا، عثمان پاشا موصوف تک پہنچایا گیا، مگر پول کھل جانے اور عنایت ایزدی کے شامل حال ہوجانے اور جناب رسالت مآب صلی اللہ علیہ وسلم کی برکات نے ان کو ناکام کیا اور بحمد اللہ ہمارا کوئی بال بیکا نہ کرسکے۔ کچھ عرصے تک ہندوستانی مجاورین اور بعض ان کے ہم نواؤں میں کھچڑیاں پکتی رہیں، مخالفتیں بھی لوگ کرتے رہے، مگر میرا حلقۂ درس بڑھتا ہی رہا۔ قبولیت عامہ اہل مدینۂ اور اہل علم و فضل میں روز افزوں ہوتی رہی اور مخالف اشخاص کو ناکامی کے ساتھ ذلت کا بھی سامنا ہوتا رہا۔ اگرچہ ہم نے کبھی کسی سے انتقام اور توہین کا معاملہ نہیں کیا، مگر منتقم حقیقی کی آنکھیں کھلی ہوئی تھیں۔ دو تین ہی سال میں تمام مخالفین کا قلع قمع ہوگیا۔ وللہ الحمد والمنۃ (نقش حیات، حصہ اول، ص ۳۶۔۱۳۴)

امیر کابل کا دورۂ ہند:

۶ر جنوری ۱۹۰۷ء امیر حبیب اللہ خان والی کابل بعزم سیاحت ہندوستان ۲۔ جنوری ۱۹۰۷ء ''لنڈی کوتل''، ہندوستان میں داخل ہوئے۔ ان کے ہمراہ گیارہ سو آدمی سوار و پیدل ہیں۔ امیر کی بہت خاطر مدارات ہو رہی ہے اور جب وہ ۳ر جنوری سنہ الیہ کو داخل پشاور ہوئے تو ان کے قدموں کے پاس اکیس ہزار کی تھیلیاں منجانب گورنمنٹ بطور نذرانہ رکھی گئیں۔ امیر نے قبول کیا۔ (ایک نادر روزنامچہ، ص ۹۱)

۷ر جنوری ۱۹۰۷ء: جو ڈپوٹیشن اہل سلام یکم اکتوبر ۱۹۰۶ء کو حضور میں لارڈ منٹو صاحب

وائسرائے ہند بمقام شملہ گیا تھا، اس کا یہ نتیجہ نکلا کہ مسٹر شاہ دین بیرسٹر و مسٹر شرف الدین بیرسٹر ایٹ لا چیف کورٹ پنجاب وہائی کورٹ کلکتہ کے جج مقرر ہوئے جس کے معنی یہ ہیں کہ گورنمنٹ نے استدعا مسلمان ہند پذیرا فرمائی اور ان کو عہدہ ہائے جلیلہ عطا فرمائے۔ (ایک نادر روز نامچہ، ص ۱۴۱)

۱۳ر جنوری ۱۹۰۷ء: امیر حبیب اللہ خان والی کابل اب بادشاہ قرار دیے گئے ہیں اور ہمارے شہنشاہ نے ان کو خطاب ''ہز میجسٹی'' کا عطا کیا ہے جس کے معنی بادشاہ کے ہیں۔ اور اسی مضمون کا انھوں نے تار بھی بمقام ''لنڈی کوتل'' دیا تھا، جس میں لقب ہز میجسٹی درج تھا۔ امیر کابل قبل تشریف آوری آگرہ کے اول ۸ر جنوری کو بمقام سرہند علاقہ پٹیالہ کو اس غرض سے تشریف لے گئے کہ حضرت امام ربانی یعنی مجدد الف ثانی کے مزار پر فاتحہ پڑھیں جو مقام ''سرہند'' سے دو میل فاصلے پر واقع ہے۔

۱۰ر جنوری ۱۹۰۷ء: اخباروں سے معلوم ہوتا ہے کہ امیر حبیب اللہ خان امیر کابل جو ہندوستان تشریف لائے ہیں، منجانب برٹش گورنمنٹ ان کی بہت بڑی خاطر داری اور اعزاز ہو رہا ہے۔ جیسا کہ کسی اور نے کسی اور ان کے مسابق کا نہیں کیا۔ بمقام آگرہ لیفٹنٹ گورنر اضلاع متحدہ آگرہ واودھ ولارڈ منٹو گورنر جنرل وائسرائے ہند نے بڑی بڑی دعوتیں کیں، جس سے امیر بہت خوش ہوئے اور ایک موٹر کار گاڑی قیمت تین ہزار ان کی نذر کی گئی اور لارڈ منٹو نے امیر کو معزز تمغہ پہنایا۔

۱۹ر جنوری ۱۹۰۷ء: امیر حبیب اللہ خان کا یادگار حکم: چوں کہ نماز عید الاضحیٰ امیر صاحب جامع مسجد دہلی میں پڑھیں گے لہٰذا دہلی کے مسلمانوں نے چاہا کہ ایک سو گائیں قربانی کریں۔ جب امیر صاحب کو یہ کیفیت معلوم ہوئی تو انھوں نے حکم دیا کہ ہم ہندوستان کو بنا بر سیر و تفریح آئے ہیں نہ کسی فریق کے دل دکھانے کو۔ ہم یہ نئی بات جس سے اہل اسلام و اہل ہنود کے اکثر جھگڑے ہوتے ہیں ناپسند کرتے ہیں اور بجائے اس کے اگر مسلمان بکرے ذبح کریں تو باعث ہماری خوشی کا ہوگا۔ چناں چہ اب یہی ہونے والا ہے۔ اہل ہنود اس بات سے بہت خوش ہوئے اور جا بجا کمیٹیاں کر کے اظہار خوشی کے تار امیر صاحب کی خدمت میں بھیج رہے ہیں۔

۲۴ر جنوری ۱۹۰۷ء: ۱۶ر جنوری کو امیر حبیب اللہ خان امیر کابل علی گڑھ میں تشریف لائے اور مبلغ بیس ہزار روپے بنا بر اعانت کالج مرحمت فرمائے اور چھ ہزار روپیہ سالانہ دینے کا وعدہ کیا۔

۲۹ر جنوری ۱۹۰۷ء: ۲۵ر جنوری کو امیر حبیب اللہ خان نے نماز عیدالاضحیٰ مسجد عیدگاہ دہلی میں پڑھی اور نماز جمعہ جامع مسجد میں ۷۵ ہزار آدمی شریک نماز تھے۔

۱۹ر مارچ ۱۹۰۷ء: امیر حبیب اللہ خان امیر کابل کے ہندوستان میں تشریف لانے سے افغانستان کے متعصب فرقے بہت ناراض ہو رہے ہیں اور جن خاص امور پر اعتراض ہے وہ یہ ہیں کہ امیر نے انگریزی افسروں کے ساتھ کھانا کھایا۔ ان سے بہت اظہار دوستی کا کیا۔ یورپین لباس اختیار کیا اور بہت انگریزی چیزیں مول لیں۔ ایک پل کا تمام سامان خرید کیا۔ کلکتہ میں امیر فراماسن ہو گئے۔ جلال آباد کے قریب ضلع لاغمان میں ملاؤں کا ایک بہت بڑا جلسہ ہوا اور اشتعال طبع دلانے والی تقریریں کی گئیں اور یہ الزام لایا گیا کہ امیر نے فراماسن ہو کر اپنا مذہب بدل دیا۔ بعض غالی ملاؤں نے یہ بھی کہا کہ اب وہ ہم پر قابل حکمرانی نہیں۔ اس جلسے کو سردار عنایت اللہ خان خلف اکبر امیر حبیب اللہ خان نے منتشر کر دیا۔ (ایک نادر روزنامچہ۔ ص ۹۳۔۹۲)

۵ر فروری ۱۹۰۷ء: امیر حبیب اللہ خان والی کابل نے بہ فراہمی اہل ہنود و مسلمان دہلی، میں دربار کیا تو ان لوگوں کو نصیحت کی کہ رسم گاؤکشی موقوف کر دی جائے جو باعث دل دکھنے ہنود کا ہے۔ میں نے کابل میں اس طریقہ کو مسدود کر دیا ہے اور قرآن شریف میں حکم گاؤکشی کا کہیں نہیں ہے۔ لہٰذا آپ لوگ بھی اس رسم کو ترک کریں۔ امیر کی اس نصیحت کو تمام مولوی، اماموں اور رؤسائے دہلی نے منظور و قبول کیا کہ ہم آئندہ ایسا ہرگز نہیں کریں گے۔ یہ نصیحت امیر صاحب نے ۲۵ر جنوری کو کی تھی۔

۸ر مارچ ۱۹۰۷ء: امیر کابل نے جمعہ گزشتہ کو جب مسجد لاہور میں نماز جمعہ ادا کی تھی تو ستر ہزار آدمیوں کا مجمع تھا اور جس طرف آپ گزرتے تھے تو پھولوں کی برابر بوچھاڑ ہوتی تھی۔ آپ نے پیش امام مسجد کو خلعت قیمتی دیا اور موذن کو ایک دوشالہ عطا کیا۔ امیر صاحب میں مثل انگریزوں کے پابندیٔ اوقات کی تو نہ تھی ورنہ اور باتوں کے اعتبار سے وہ بہت ممتاز رہے۔
۳ر مارچ کو امیر کابل نے مسلمانوں کے لیے لاہور میں کالج کی تعمیر کے لیے بیس ہزار روپے دیے اور ترقی تعلیم کالج کے لیے چھ ہزار سے اضافہ کر کے بارہ ہزار۔ سالانہ منظور فرمائے جس کی تصریح ۶ر مارچ ۱۹۰۷ء کے اودھ اخبار میں درج ہے۔

۱۳ر مارچ ۱۹۰۷ء: امیر حبیب اللہ خان والی کابل ۷ر مارچ سنہ الیہ کو بمقام جمرود اپنے افغانستان میں داخل ہوئے۔ وہاں سے بذریعۂ تار اخباروں کو اطلاع دی کہ میں ۶۴ روز

ہندوستان کی سیر کر کے اپنے ملک کی حد میں پہنچا اور زمانۂ دورہ میں لارڈ منٹو وائسرائے ہند اور تمام حکام نے میرے ساتھ دوستانہ برتاؤ کیا۔ اگر میں سفر کو گوارانہ کرتا تو ہندوستان کے حالات سے ہنوز بے خبر رہتا۔ کلکتہ میں امیر صاحب فرامشن بھی ہوئے۔ (ایک نادر روزنامچہ، ص ۴۲)

طاعون:

۵ / مارچ ۱۹۰۷ء بمعائنہ گزٹ سرکاری واودھ اخبار واضح ہوا کہ امسال طاعون بمقابلۂ سال گزشتہ کے بہت ترقی پر ہے۔ اور بکثرت لوگ مر رہے ہیں۔ یعنی اگر گزشتہ سال میں پانچ ہزار مرتے تھے تو سال رواں میں پندرہ ہزار ہمارے ضلع ہردوئی میں بھی اس کی زیادتی ہے۔ گونی، گونڈہ میں تو کئی مہینہ سے تھا۔ اب میرے موضع گھوگیرہ کے قریب آیا ہے۔

۱۰ / مارچ ۱۹۰۷ء بمعائنہ پانیر مورخہ ۹ / مارچ ۱۹۰۷ء سے واضح ہوا کہ تمام ہندوستان میں ہفتۂ مختتمہ ۲۰ / مارچ میں ۳۲،۹۰۹ آدمی طاعون سے ضائع ہوئے اور اس کے ماقبل ہفتہ میں ۲۴،۳۰۰ مرے تھے۔

۲۹ / اپریل ۱۹۰۷ء: بمعائنہ پانیز اخبار مورخہ ۲۷ / اپریل سے واضح ہوا کہ ہفتۂ مختتمہ ۲۰ / اپریل سنہ الیہ میں تمام ہندوستان میں ۷۶،۵۱۰ آدمی طاعون سے مرے اور اس کے قبل کے ہفتے میں ۷۵،۴۲۷ ضائع ہوئے تھے۔ آج چار آدمی اشراف ٹولہ کے طاعون سے مرے۔ (ایک نادر روزنامچہ، ص ۴۳۔۴۴)

مارچ ۱۹۰۷ء: مسلم لیگ کے سیکریٹری نواب وقار الملک نے علی گڑھ کالج کے طلبہ سے خطاب کیا اور مسلمانوں کی سیاسی پالیسی یا مسلم لیگ کے بنیادی اصول سیاست سمجھاتے ہوئے فرمایا:

> ’’ہماری تعداد بمقابلہ دوسری قوموں کے ہندوستان میں ایک خمس ہے۔ اب اگر کسی وقت ہندوستان میں خدانخواستہ انگریزی حکومت نہ رہے تو ہمیں ہندوؤں کا محکوم ہو کر رہنا پڑے گا اور ہماری جان، ہمارا مال، ہماری آبرو، ہمارا مذہب، سب خطرے میں ہوگا۔ اور اگر کوئی تدبیر ان خطروں سے محفوظ رہنے کی ہندوستان کے مسلمانوں کے ہاتھ میں ہے تو وہ یہی ہے کہ انگریزی حکومت ہندوستان میں قائم رہے۔ ہمارے حقوق کی حفاظت تب ہی ہو سکتی ہے جب کہ ہم گورنمنٹ کی حفاظت پر کمربستہ

رہیں۔ ہمارا وجود اور گورنمنٹ کا وجود لازم وملزوم ہیں۔ انگریزوں کے بغیر ہم اس عزت وآسودگی کے ساتھ نہیں رہ سکتے۔ اگر مسلمان دل سے انگریزوں کے ساتھ ہیں تو ہندوستان سے میں ان کو کوئی نکال نہیں سکتا۔ ان کو اس عمدہ خیال کی تلقین کی جائے گی کہ وہ اپنے تئیں مثل ایک انگریزی فوج کے تصور کریں اور تاج برطانیہ کی حمایت میں اپنی جانیں قربان کرنے اور اپنا خون بہانے کے لیے تیار ہیں اور گورنمنٹ سے اپنے حقوق نہایت ادب اور متانت سے طلب کریں نہ کہ اس طریقے پر جس پر ہمارے دیگر ابنائے وطن کا عمل ہے اور اس سے میری مراد ایجی ٹیشن کے طریقے سے ہے۔ پس تمھارے دل میں ہر وقت جو ایک خیال موجزن رہنا چاہیے ہے کہ اس سلطنت کی حمایت کرنا تمھارا قومی فرض ہے۔ تم فٹ بال کے کھیلنے میں مشغول ہو یا کرکٹ کے میدان میں کود پھاند کر رہے ہو یا ٹینس کے کھیلنے میں سرگرمی دکھا رہے ہو۔ غرضے کہ اس قسم کی ہر ایک حالت میں تم اپنے تئیں انگریزی فوج کے سولجر خیال کرو۔ تم تصور کرو کہ انگریزی پرچم تمھارے سروں پر لہرا رہا ہے۔ تم یقین کرو کہ تمھاری یہ دوڑ دھوپ اس لیے ہے کہ تم ایک دن تاج برطانیہ پر (اگر اس کی ضرورت ہو) اپنی جانیں نثار کرو اور انگریزی سپاہیوں کے ساتھ مل کر اس سلطنت کے مخالفوں اور دشمنوں کے ساتھ کلہ بکلہ لڑو۔ اگر یہ خیال تم نے ذہن نشین رکھا تو مجھ کو امید ہے کہ تم اپنی قوم کے لیے باعث فخر ہو گے اور آیندہ نسلیں تمھاری شکر گزار ہوں گی اور تمھارا نام ہندوستان کی انگریزی حکومت کی تاریخ میں سنہری حروف میں لکھا جائے گا۔''

اس تقریر سے اس وقت کے مسلمان لیڈروں کا سیاسی منتہائے نظر صحیح طور پر معلوم ہوتا ہے۔ مگر حقیقت یہ ہے کہ اس میں ان کا ذرہ بھر کچھ قصور نہ تھا۔ اس لیے کہ ایک طرف وہ حد درجہ کی تخویف سے مرعوب تھے اور سمجھ چکے تھے کہ اس سلطنت نے انھیں صرف ہل جوتنے کے قابل بنا دینے کا تہیہ کر لیا ہے اور دوسری طرف اپنے ہمسایہ بھائیوں سے ستائے ہوئے تھے۔ ایسے نازک وقت میں جب حکام نے انھیں تھپکا تو مسلمان لیڈروں کو چکا چوند ہوگئی اور اس خوشی میں وہ نہیں سوچتے تھے کہ کیا کہہ رہے ہیں اور نہیں سمجھتے تھے کہ کیا کر رہے ہیں۔ اس قسم کے حالات اور خیالات کی موجودگی میں ان کی یہ جماعت مسلم لیگ قائم ہوئی جس کو انھوں نے غلطی سے سیاسی جماعت

سمجھا۔ حال آں کہ وہ حقیقی طور پر سیاست کے منافی اور اس کے متضاد تھی۔

۱۱رمئی ۱۹۰۷ء: راولپنڈی میں بعض وکلا اور بیرسٹرز نے خلاف گورنمنٹ مجمع عام میں اسپیچیں کیں جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ مجسٹریٹ ضلع نے ان وکلا و بیرسٹروں کو گرفتار کر کے حوالات بھیج دیا اور ضمانت قبول نہیں کی۔ اب کسی تاریخ آیندہ میں اس کی تحقیقات ہوگی۔ ان لوگوں نے اس قسم کی اسپیچیں کی تھیں کہ سرکار نے بندوبست دیہات کا سخت کر دیا ہے اور طاعون سے ہزاروں آدمی مر رہے ہیں۔ لہٰذا ہم لوگوں کے واسطے یہی مناسب ہے کہ گورنمنٹ سے جھگڑا کر کے اپنی جان دے دیں کیوں کہ اگر طاعون سے بچے تو گورنمنٹ کی سنگینی جمع سے تکلیف اٹھا اٹھا کر مرنا ہوگا۔

(ایک نادر روزنامچہ، ص ۳۳)

لاجپت رائے:

۱۵رمئی ۱۹۰۷ء: بمعائنہ اودھ اخبار مورخہ امروزہ سے واضح ہوا کہ لالہ لاجپت رائے ایک نامور وکیل لاہور بموجب حکم گورنمنٹ محکومہ ۹۔ مئی سنہ الیہ گرفتار کر کے بذریعہ اسپشل ٹرین ملک برہما کو بھیج دیے گئے کہ انھوں نے مفسدانہ اسپیچیں کیں تھیں جو حکومت کے محض خلاف تھیں اور اجیت سنگھ ان کے نائب کو بھی گرفتاری کرنے کی تجویز ہو رہی ہے جو جابجا اسپیچیں کرتا تھا اور جو بالفعل لاپتا ہے۔

۲۱رمئی ۱۹۰۷ء: لالہ لاجپت رائے ایک نامور متمول وکیل لاہور، قلعہ ''مانڈلے'' واقع ملک برہما میں بطور سلطانی قیدی مقید ہیں۔

۷رجون ۱۹۰۷ء آج کے اخبارات سے واضح ہوا کہ اجیت سنگھ پنجابی نائب لالہ لاجپت رائے امرتسر میں گرفتار ہوا جو عنقریب کسی مقام پر جلاوطن کیا جائے گا۔ اجیت سنگھ گورنمنٹ کے خلاف اسپیچیں لاہور میں دیا کرتا تھا۔ جس کی وجہ سے اس پر وارنٹ گرفتاری بہ صد تا پانچ سو روپیہ انعام کے جاری تھا۔

۱۹رجون ۱۹۰۷ء: آج کے اودھ اخبار سے واضح ہوا کہ لالہ لاجپت رائے ملک برہما میں قلعہ ''مانڈلے'' کے ایک آراستہ بنگلہ میں مقیم ہیں، جو لب سڑک واقع ہے۔ ان کے واسطے کتابیں مہیا کی گئی ہیں اور بگھی اور ایک جوڑی گھوڑے کی ان کی سواری کے واسطے ہے۔ دو افسروں کے ہمراہ باہر نکل سکتے ہیں جو ہندوستانی ان کو دیکھنا چاہتے ہیں وہ دیکھ سکتے ہیں۔ ان کے صرفۂ سالانہ کے واسطے گورنمنٹ نے ۴۸ ہزار روپیہ منظور کیا ہے۔ دوسری روایت یہ ہے کہ ان کو ۴۰ روپیہ یومیہ ملتا

ہے۔ بہر حال ان دونوں میں سے ایک رقم ان کو ملتی ہے غالباً اخیر رقم صحیح ہے۔ جس کی تعداد ماہواری ۱۲۰۰ ہے۔ (ایک نادر روزنامچہ ص ۴۳)

وفات نواب محسن الملک:

۲۰؍اکتوبر ۱۹۰۷ء: نواب محسن الملک سیکریٹری مدرسۃ العلوم علی گڑھ نے ۱۶؍اکتوبر ۱۹۰۷ء بمقام شملہ قضا کی۔ مرحوم لائق و قابل شخص تھے۔ محسن الملک ۹؍دسمبر ۱۸۳۷ء کو پیدا ہوئے اور ۱۶؍اکتوبر ۱۹۰۷ء یوم چہار شنبہ کو فوت ہوئے اور ۱۹؍اکتوبر یوم شنبہ مدرسۃ العلوم علی گڑھ متصل قبر سر سید احمد خان کے مسجد میں مدفون ہوئے۔ حساباً ان کی عمر ۶۹ سال ۹ ماہ تینتیس روز کی ہوئی۔
(ایک نادر روزنامچہ ص ۴۴)

ہڑتال:

۷؍نومبر ۱۹۰۷ء ملازمان یورپین و ہندوستانی ایسٹ انڈیا ریلوے نے ہڑتال کردی کہ یہ زمانۂ قحط سالی کا ہے۔ اگر ہماری تنخواہوں میں اضافہ نہ ہوگا تو ہم ریل نہیں چلائیں گے۔ چناں چہ ۱۸؍نومبر سے کلکتہ سے ''کالکا'' تک ریل بند ہے اور مسافروں اور مال کی آمد و رسد کی کمی ہوئی ہے۔ (ایک نادر روزنامچہ، ص ۴۴)
علی گڑھ: ۱۰؍نومبر ۱۹۰۷ء۔ آج کی کمیٹی علی گڑھ سے وقار الامرا سیکریٹری علی گڑھ کالج بجائے محسن الملک نواب مہدی علی خان متوفی سیکریٹری مقرر ہوئے۔ (ایک نادر روزنامچہ، ص ۴۴)
۲۶؍دسمبر ۱۹۰۷ء: ۲۶؍دسمبر ۱۹۰۷ء سورت میں آل انڈیا کانگریس کا تیئیسواں سالانہ اجلاس ڈاکٹر راس بہاری گھوش کی صدارت میں منعقد ہوا۔ اگرچہ یہ اجلاس ناگپور میں ہونے والا تھا اور اجلاس کی صدارت کے لیے لالہ لاجپت رائے کا نام تجویز کیا گیا تھا، مگر چوں کہ اجلاس کے قبل ہی حکومت نے لالہ جی کو سردار اجیت سنگھ کے ساتھ ملک بدر کردیا۔ اس لیے یہ اجلاس سورت میں منعقد ہوا۔ اس اجلاس میں بال گنگا دھر تلک جو خود قوت تنظیم و علمیت کے گہوارہ تھے کانگریس کا عمل سخت نہ ہونے سے تن گئے اور سورت کے اس اجلاس میں گو کھلے اور تلک کی پارٹیوں کا ٹکراؤ ہونے سے ایک ہنگامہ برپا ہوگیا اور اجلاس ملتوی کرنا پڑا۔ مولانا حسرت موہانی اور تلک مہاراج نے ٹکراؤ اور بگاڑ سے بچانے کی کافی کوشش کی مگر ناکامی ہوئی۔ آخرکار مولانا حسرت تلک مہاراج کی پارٹی کے ساتھ الگ ہوگئے۔ کیوں کہ وہ بھی عارضی رعایتوں کو ٹھکرا کر غیر مشروط آزادی کے خواہاں تھے۔ کچھ دن پہلے لارڈ کرزن کے جانشین لارڈ منٹو نے انقلابیوں کی تحریکوں کو دبانے کے لیے سخت احکامات کیے تھے اور ''وندے ماترم گیت'' کی بھی ممانعت کردی تھی۔ (حسرت موہانی......ایک سیاسی ڈائری، ص ۳۶)

تلک کی گرفتاری:

۱۹۰۸ء۔ جنوری اور فروری کا مہینہ بھی کم وبیش سیاسی ہلچل میں گزرا۔ تلک مہاراج جلسے اور تقریریں کرتے رہے۔ آخر کار حکومت نے تلک کو گرفتار کرلیا اور چھ سال کی سزا تجویز کر کے مانڈلے روانہ کردیا۔ (حسرت موہانی...... ایک سیاسی ڈائری)

سیاست سے میرا تعلق:

۱۷۔۱۹۱۵ء: یہاں تک ذاتی اور خانگی حالات تھے۔ اس جنگ عظیم نے سوانح زندگی میں ایک نئے باب کا اضافہ کیا۔ ''یعنی سیاست سے میرا تعلق اور برطانوی سامراج کے مقابلے میں عزم انقلاب''۔ جس طرح میری علمی زندگی کا منبع فیض شیخ الہند حضرت مولانا محمود حسن صاحب قدس اللہ سرہ العزیز تھے ایسے ہی سیاسی زندگی کا سرچشمہ بھی حضرت شیخ کے وہ افکار وخیالات اور وہ جذبات تھے جو عرصۂ دراز سے حضرت شیخ کے سینۂ پرنور اور ضمیر روشن میں پرورش پارہے تھے اور جن کی چنگاریاں اس جنگ عظیم نے بھڑکا دی تھیں۔ اس موقع پر ضروری معلوم ہوتا ہے کہ اپنے حالات سے پہلے حضرت شیخ الہندؒ کے سیاسی رجحانات اور ان کے اسباب ووجوہات پر تفصیل سے بحث کریں۔ اس بحث سے پہلے حضرت شیخ الہند رحمۃ اللہ علیہ کی مختصر سوانح سے ان صفحات کو مزین کیا جاتا ہے۔ (نقشِ حیات: حصۂ اول، صفحہ ۴۹۔۱۳۶)

تعداد فوج:

۱۱راپریل ۱۹۰۸ء تعداد سرکاری فوج، گورے وہندوستانی ہندوستان میں بہ تعداد ذیل ہے:

فوج گورا:۔ ۸/۷/۱۹۰۷ء: ۷۶۰۱۹۔ ہندوستانی: ۱۵۶۴۱۱۔ کل ۲۳۲۴۳۰۔ اس میں فوج کنٹنجنٹ بھی شامل ہے۔ صرف اسی قدر فوج سے حفاظت ہندوستان ہوتی ہے۔ (ایک نادر روزنامچہ، ص ۴۵۔۴۴)

مولانا حسرت پر بغاوت کا مقدمہ اور سزا:

۲۳رجون ۱۹۰۸ء کو اردوے معلیٰ'' پر مقدمہ سڈیشن قائم ہوا اور ۴راگست ۱۹۰۸ء عدالت عالیہ سے مولانا حسرت موہانی کو دو سال کی قید سخت اور پانچ سو روپے جرمانے کا حکم سنایا گیا۔ اس قید کی میعاد پوری کرنے کے لیے مولانا کو پہلے علی گڑھ جیل پھر نینی جیل، پھر الہ آباد جیل بھیج دیا

گیا۔

مذکورہ مضمون مولانا حسرت کا اپنا لکھا ہوا نہ تھا، بلکہ علی گڑھ کے ایک بیدار مغز طالب علم اقبال سہیل اعظم گڑھی کے زور قلم کا نتیجہ تھے، جسے مقدمے کے دوران حسرت نے اپنے سر لے لیا اور مذکورہ سزا کے دن پورے کرنے کے لیے تیار ہو گئے۔ (حسرت موہانی......ایک سیاسی ڈائری)

مسٹر تلک کو سزا: ۲۵؍جولائی ۱۹۰۸ء: مسٹر تلک: ۲۵؍جولائی ۱۹۰۸ء...... مسٹر تلک مرہٹہ رئیس پونا کو بمبئی کے جج صاحب نے چھ سال قید سخت کی سزا دی اور ایک ہزار روپیہ جرمانہ کیا۔ مسٹر تلک اپنی قوم میں نہایت معزز اور پراثر شخص تھے۔ قیدی نے اپنے اخبار مرہٹی زبان میں تین دفعہ گورنمنٹ کی کچھ شکایت اور توہین چھاپی تھی۔ اس وجہ سے ان کو حسب منشا دفعہ ۱۲۴۔الف و دفعہ ۱۵۳ تعزیرات ہند سزا ہوئی۔ مسٹر تلک عدن میں جلاوطن کیے گئے اور جس وقت وہ جہاز پر لیے جا رہے تھے تو ان کے ہمدرد لوگوں نے بہت کچھ یورش کی اور گارڈ کے سپاہیوں کو اینٹ اور پتھر مارے۔ کئی افسر زخمی ہوئے اور ادھر سے فوج نے گولیاں چلائیں۔ چار آدمی ہلاک اور ۳۲ آدمی زخمی ہوئے۔ کیفیت غدر کی اس وقت پیدا تھی۔ (ایک نادر روزنامچہ، ص۴۵)

کھودے رام بوس کو پھانسی:

۱۵؍اگست ۱۹۰۸ء: آج کے اودھ اخبار سے واضح ہوا کہ ''کہودے رام بوس'' کو بتاریخ ۱۱؍اگست ۱۹۰۸ء پھانسی دے دی گئی۔ ملزم پر یہ الزام تھا کہ اس نے مظفر پور میں بم کے گولہ سے دو یورپین لیڈیوں کو ہلاک کیا تھا۔ (ایک نادر روزنامچہ، ص۴۶)

ترکی کی سالمیت:

۲۶؍اگست ۱۹۰۸ء: سلطان عبدالحمید خان نے قسطنطنیہ میں اپنی گورنمنٹ قائم کی۔ اگرچہ بعض وزرا اس کے خلاف تھے لیکن سلطان نے اس کی کوئی پروا نہیں کی اور ان کو موقوف کر کے جدید وزرا مقرر کیے۔ لیکن عموماً سلطان کی مکمل رعایا نے اظہار خوشی کا کیا اور یورپین بادشاہ بھی پارلیمنٹ قائم ہونے سے بظاہر رضامند و خوش ہیں۔ (ایضاً، ص۹۴)

سرکاری گواہ نریندر ناتھ گوشائیں کا انجام:

۵؍ستمبر ۱۹۰۸ء: آج کے اودھ اخبار سے واضح ہوا کہ نریندر ناتھ گوشائیں سرکاری گواہ کو جس

نے مخبری کر کے بہت سے اپنے ہم قوم کو کلکتہ میں گرفتار کرایا تھا اس کو کنھئی لال دت اور سریندر ناتھ بوس دو قیدیوں نے علی پور کے جیل خانہ کے اندر ریوالور اور تینچہ کی گولیوں سے ۳۱راگست ۱۹۰۸ء کو ہلاک کر ڈالا اور دو یورپین قیدی جو اس کو بچانے کے واسطے آئے تھے ان کو بھی زخمی کیا۔ وہ تینچے شاید کھانے میں رکھ کر اس کے دوستوں نے قیدیوں کے پاس بھیجے تھے۔ یہ دونوں قیدی جنھوں نے گوشائیں کو ہلاک کیا محض گوشائیں کی مخبری پر زیر حوالات تھے۔ جب دونوں قیدیوں کی تلاشی لی گئی تو پانچ ریوالور اور تینچے ان کے پاس برآمد ہوئے۔ (ایک نادر روزنامچہ، ص ۴۶)

مسٹر تلک:

۲۸ر ستمبر ۱۹۰۸ء: مسٹر تلک مرہٹہ پونا جن کو سزا چھ سال بہ عبور دریائے شور بہ علت شائع کرنے، مضامین فتنہ پردازی ہوئی تھی اور بہ حکم گورنر بمبئی قید محض رہے گی اور اب وہ شہر ''مانڈلے'' واقع برہما کو بھیجے گئے۔ (ایک نادر روزنامچہ، ص ۴۶)

ترکی میں آئینی حکومت:

۱۶ر اکتوبر ۱۹۰۸ء: ۱۶ر اکتوبر ۱۹۰۸ء آج کے اودھ اخبار سے واضح ہوا کہ ۲۴ر جولائی ۱۹۰۸ء کو ترکی میں آئینی حکومت قائم ہوئی اور پارلیمنٹ کا انعقاد اور باقاعدہ گورنمنٹ قرار دی گئی۔ (ایضاً ص ۹۵)

بنگال میں حادثہ:

۱۴ر نومبر ۱۹۰۸ء:...... آج کے اودھ اخبار سے واضح ہوا کہ ایک جلسہ کلکتہ میں سرانڈر وفریزر صاحب لیفٹنٹ گورنر کی پریسیڈنسی میں ۷ر نومبر کو بوقت شام منعقد ہوا تھا جوتندر ناتھ چودھری نے ایک ریوالور تینچہ سے گورنر پر دو مرتبہ فائر کرنا چاہا۔ لیکن تینچہ نے خطا کی اور چودھری مذکور گرفتار کر لیا گیا۔ جس کی تحقیقات ہو رہی ہے۔ اسی اخبار سے یہ بھی معلوم ہوا کہ نندو لال بنرجی انسپکٹر تحقیقات فوجداری کو کسی نے ۱۰ر نومبر کو تینچہ کے دو فائروں سے قتل کیا۔ قاتلوں کی تفتیش ہو رہی ہے۔ ہنوز کوئی سراغ نہیں لگا۔

۲۸ر نومبر ۱۹۰۸ء:...... آج کے اخبار سے واضح ہوا کہ جوتندر ناتھ چودھری جس نے سرانڈرو فریزر لیفٹنٹ گورنر بنگال کو ہلاک کرنا چاہا تھا اس کو دس سال قید سخت کی سزا ملی۔ اگر مہاراجہ بردوان

لیفٹنٹ گورنر اور قاتل کے درمیان میں نہ آجاتے تو ضرور تپنچہ سر ہونے سے ہزآنر ہلاک ہوجاتے۔(ایک نادر روزنامچہ، ص۴۶)

ترکی:

۲۱ردسمبر ۱۹۰۸ء: سلطان ترکی نے ۱۷ردسمبر ۱۹۰۸ء کو پارلیمنٹ کا افتتاح کیا اور دستوری انتظام کے آغاز پر اپنی مسرت ظاہر کی۔(ایک نادر روزنامچہ، ص۹۴)

سالانہ اجلاس کانگریس:

۲۶ردسمبر ۱۹۰۸ء: کو مدراس میں ڈاکٹر راس بہاری گھوش کی صدارت میں آل انڈیا کانگریس کا سالانہ اجلاس منعقد ہوا۔ کرشن سوامی ایراس اجلاس کے روح رواں تھے۔ پنڈال کے انتظام میں گورنر مدراس کی امداد بھی شامل تھی۔ اس اجلاس میں مقررین کی دھواں دھار تقریریں ہوئیں۔ کرمنل لا اور اخباروں پر پابندیاں نرم کی جائیں، نیز عوام کی مفت تعلیم کے لیے تجویزیں پاس ہوئیں۔ کانگریس نے صوبہ بنگال سے الگ بہار کو ایک صوبہ تسلیم کرلیا۔(حسرت موہانی......ایک سیاسی ڈائری)

نکاح ثانی کے لیے میرا سفر ہندوستان:

۱۹۰۹ء:

۱۳۲۶ھ (۱۹۰۸ء) میں جب کہ میری پہلی اہلیہ کا انتقال ہوگیا تھا والد صاحب مرحوم نے فرمایا کہ تجربے سے معلوم ہوا یہاں کی عورتوں سے خواہ وہ مہاجرین کی لڑکیاں ہوں یا اہالی شہر کی، ہماری غربت اور ہمارے تمدن سے نباہ نہیں ہوسکتا۔ اس لیے تجھ کو ہندوستان جانا چاہیے اور وہاں عقد کرنا چاہیے۔ چناں چہ ۱۳۲۶ء کے آخر میں روانہ ہوکر ۱۳۲۷ھ (فروری ۱۹۰۹ء) میں دیوبند پہنچا اور وطن میں رشتہ داروں کے پاس خطوط بھیجے۔ اور متعدد مقامات پر کوششیں کیں۔ حضرت والد صاحب مرحوم نے بھی خطوط بھیجے تھے، مگر وطن میں کوئی شخص رشتہ داروں میں سے لڑکی دینے کو راضی نہ ہوا اور یہ جواب سب نے دیا کہ اگر ہندوستان ہی میں قیام کرے تو ہم عقد کرنے کو تیار ہیں۔ مگر اس کے لیے تیار نہیں ہیں کہ وہ نکاح کرکے لڑکی مدینہ منورہ لے جائے۔ اس خط وکتاب

اور گفت وشنید میں تقریباً چھ ماہ گزر گئے جب کہ اپنے کنبہ اور برادری کی طرف سے مایوسی ہوگئی تو پھر باہر گفت وشنید شروع کی گئی۔ حضرت حافظ زاہد حسن صاحب امروہی کی عنایات ہم لوگوں پر اور بالخصوص مجھ پر بہت زیادہ رہتی تھیں اور اب تک ان کی عنایات بے انتہا مجھ پر مبذول ہیں۔ مدینۂ منورہ میں بھی میری موجودگی میں وہ گئے تھے اور طالب علمی کے زمانے سے ان سے تعلقات تھے۔ انھوں نے کوشش فرمائی۔ حکیم غلام احمد صاحب مرحوم بچھرایونی نہایت نیک خیال حضرت گنگوہی قدس اللہ سرہ العزیز کے متوسل تھے اور اپنے اکابر سے بہت گہرا تعلق رکھتے تھے۔ انھوں نے حافظ زاہد حسن صاحب مرحوم سے اپنی منجھلی لڑکی کے متعلق پہلے سے کہہ رکھا تھا کہ کوئی مناسب جگہ خیال میں رکھیں۔ جب میرے ارادوں کی اطلاع حافظ صاحب موصوف کو ہوئی تو انھوں نے حکیم غلام احمد صاحب موصوف سے تحریک کی۔ چناں چہ حکیم صاحب موصوف عقد پر اس دونوں شرطوں سے راضی ہوگئے کہ عقد نکاح میں تمام بڑے اساتذہ اور حضرت حکیم مسعود احمد صاحب مرحوم اور مولانا خلیل احمد صاحب مرحوم شرکت فرمائیں اور حسین احمد جب بھی ہندوستان سے حجاز جائے تو ایک یا دو برس رہنے کے بعد ایک مرتبہ معہ اپنی اہلیہ یہاں آئے۔ ان دونوں شرطوں میں مجھے پس و پیش ہوگئی مگر حضرت شیخ الہند رحمۃ اللہ علیہ راضی اور متکفل ہوگئے۔ چناں چہ عقد ہوگیا اور حسب شرط سب حضرات وہاں تشریف لے گئے۔ مرحومہ سے دو لڑکے الطاف احمد اور اشفاق احمد پیدا ہوئے اور یکے بعد دیگرے معہ اپنی ماں کے ایام اسارت مالٹا میں وفات پاکر مدینۂ منورہ میں مدفون ہوئے۔ ہر دو خورد سالی میں فوت ہوئے۔ (نقشِ حیات حصہ اول، صفحہ ۱۱۲-۱۱۱)

سفر ہندوستان دوسری مرتبہ:

پہلے گزر چکا ہے کہ ۱۳۲۶ھ (۱۹۰۸ء) میں میری پہلی اہلیہ مرحومہ چند مہینہ تپ دق میں مبتلا رہ کر وفات کر گئیں۔ ایک لڑکی تین چار برس کی چھوڑی۔ چوں کہ معیشت کی تنگی تھی۔ تمام خاندان کی آمدنی ماہواری سو روپیہ بھی نہ تھی۔ مدینۂ منورہ کی گرانی پر یہ مقدار بڑی مشکل سے بھی اتنے بڑے خاندان کے لیے کافی نہیں ہوسکتی تھی۔ اگر چہ اس وقت بہ نسبت سابق کچھ سہولتیں مہیا ہوگئی تھیں مگر اسی کے ساتھ حضرت والد صاحب مرحوم کا یہ ارادہ کہ میں اپنی زندگی میں چھ مکان (ہر ہر اولاد کے لیے ایک ایک) بنادوں، یہ ایک ایسا عزم تھا کہ وہ کسی طرح وسعت کے ساتھ مصارف کی اجازت نہ دیتا تھا۔ ایسی صورت میں اگر مدینۂ منورہ میں کسی خاندان میں خواہ اہالی مدینۂ میں سے ہوتا یا

مجاورین میں سے نکاح کا ارادہ کیا جاتا تو انتہائی دقتوں کا سامنا ہوتا۔ عرب کی عورتیں بہ نسبت ہندوستانی عورتوں کے زیادہ تر آزاد اور مصارف میں زیادہ تر وسعت پذیر ہیں۔ خورش اور پوشش کی فضول خرچیاں معمولی آمدنی سے پوری ہونی مشکل ہوتی ہیں۔ پھر آئے دن رشتہ داروں، بالخصوص عورتوں کا آنا جانا، قیلہ[1] اور اجتماعات کرنا اور ان کے مصارف کا بارگراں اٹھانا معمولی بات نہ تھی۔ ہندوستانی مجاورین بھی رفتہ رفتہ وہاں کی عادات سے کم و بیش متاثر ہو گئے ہیں۔ بڑے بھائی صاحب مرحوم اور عزیزم محمود سلمہ کے نکاحوں سے تجربہ ہو چکا تھا۔ علاوہ ازیں کفو کا ملنا بھی سخت مشکل تھا۔ ان وجوہ کی بنا پر ہندوستان کے سفر کرنے اور یہاں کفو میں عقد کرنے کا حکم والد صاحب مرحوم نے نافذ کر دیا اور اپنے احباب رشتہ داروں کو اس کا انتظام کرنے کے واسطے خطوط بھیج دیے۔ جیسا کہ میں پہلے لکھ چکا ہوں کہ میری اس زمانے میں عین خواہش تھی کہ اب جب کہ کتب درسیہ اور مضامین عالیہ علم کلام و فقہ و اصول حدیث و تفسیر وغیرہ کے مستحضر ہو چکے ہیں اور فنونی کتابوں پر عبور حاصل ہو چکا ہے کسی طرح حضرت استاذ الاساتذہ راس المحققین مولانا شیخ الہند قدس اللہ سرہ العزیز تک باریابی ہو جائے تو اپنے اشکالات کو حل کرنے اور کتب حدیث کے دوبارہ پڑھنے کا شرف حاصل ہو، مگر اس تمنا کے پورے ہونے کے اسباب نہ تھے۔ اس حادثے کے واقع ہونے اور حضرت والد صاحب مرحوم کے اس حکم سے آرزوؤں کا باغ سرسبز ہو گیا اور بلا پس و پیش میں جناب حاجی شیخ احمد علی صاحب مرحوم و مغفور کے زیر سرپرستی روانہ ہونے کو تیار ہو گیا۔

شیخ احمد علی صاحب مرحوم کے احوال:

شیخ صاحب نہایت معمر بزرگ، تقریباً نوے برس یا اس سے زیادہ عمر تھی۔ اگرچہ اصلی باشندہ ضلع اعظم گڑھ کے کسی دیہات کے تھے، مگر مدت دراز سے اعزہ و اقارب اور زمینداری وغیرہ کو چھوڑ کر فیض آباد میں مقیم تھے۔ نہایت زاہدانہ اور مرتاضانہ زندگی بسر کرتے تھے۔ اہل فیض آباد بالخصوص حضرت مولانا فضل الرحمٰن صاحب گنج مرادآبادی قدس اللہ سرہ العزیز کے متوسلین ان سے بہت زیادہ مانوس تھے۔ حضرت والد صاحب مرحوم سے بھی ان کے تعلقات بہت گہرے تھے

(۱) قیلہ قائلہ قیلولہ سے ماخوذ ہے۔ جس کے معنی دوپہر میں آرام کرنے اور سونے کے ہیں۔ مگر اب عرف میں دن کے وقت چند احباب کا اجتماع ہونا اور کھانا پینا اور چائے وغیرہ کا ایک مجلس میں تناول کرنا بالخصوص باغوں یا پہاڑوں یا سیلاب کے کناروں وغیرہ پر اور فرح و سرور کی باتیں عمل میں لانا مراد ہوتا ہے۔ عموماً اہل حرمین اوقات فراغ میں شہر کے باہر باغوں وغیرہ میں جاتے ہیں اور اپنے ساتھ ضروریات خورد و نوش لے جاتے ہیں اور دو دو چار چار دن یا کم و بیش وہاں رہتے ہیں۔ حسب مذاق وہاں خوشگواری سے اوقات کاٹتے ہیں۔ عورتیں بھی جاتی ہیں اور بسا اوقات یہ اجتماعات گھروں ہی میں ہوتے ہیں۔

مرحوم دو سال یا کم وبیش سے مدینۂ منورہ میں ہمارے ہی مکان میں مقیم تھے۔ اس سے پہلے بھی وہ کئی مرتبہ حجاز کا سفر کر چکے تھے۔

مرحوم بہت زیادہ عابد وزاہد اور اتباع سنت کے شائق تھے۔ انھوں نے فیض آباد میں کوشش کر کے مدرسۂ دینیہ کی بنیاد بھی ڈالی ''ٹاٹ شاہ مرحوم'' کی مشہور مسجد کے ایک کمرے میں اقامت پذیر تھے اور وہیں لڑکے بھی پڑھتے تھے۔ انھیں کے نام پر یہ مدرسہ، مدرسۂ احمدیہ حنفیہ کے نام سے مشہور ہوا۔ انھوں نے اس زمانے میں لائق مدرس کی خواستگاری کی۔ چناں چہ مولانا محمد ضرغام الدین صاحب صدیقی ساکن قصبہ کوال ضلع مظفر نگر مناسب تنخواہ پر بھیجے گئے۔ مولانا موصوف ایک معزز اور شریف خاندان کے ممبر ہیں۔ ان کے اسلاف بادشاہی زمانے میں قصبہ کوال کے قاضی تھے۔ ان کے خاندان میں علمی شغف اور دلچسپی برابر چلی آتی تھی۔ اگر چہ انقلابات زمانہ سے معاشی مشکلات میں مثل دیگر شرفاے اسلام ان کا خاندان بھی مبتلا ہو گیا تھا مگر علمی مذاق اور شرفاء کے عزائم واخلاق بڑے پیمانے پر موجود تھے۔ مولانا موصوف بہت سی کتابوں میں میرے ہم سبق بھی رہے۔ ابتدا سے ان کی طبیعت نہایت صالح اور زاہد ومرتاض واقع ہوئی ہے۔ نوجوانی کی شوخیاں اور شرارتیں ان میں زمانۂ طالب علمی میں بھی نہ تھیں۔ جب مدرس ہو کر فیض آباد پہنچے تو ان سے جناب شیخ احمد علی صاحب مرحوم کی بہت موافقت آئی اور رفتہ رفتہ موصوف وہاں کے مستقل رہنما اور قطب بن گئے۔ مدرسہ بھی مستقل عمارت اور وسعت کے ساتھ بن گیا اور بحمد اللہ اب تک شیخ صاحب مرحوم کا یہ فیض جاری ہے۔

شیخ صاحب مرحوم کی سرپرستی میں یہ سفر مدینۂ منورہ سے ہندوستان تک نہایت خوشگواری اور برکات سے قطع ہوا اور راستہ میں نعمت حج وعمرہ بھی حاصل ہوئی۔ بمبئی سے روانگی پر جھانسی تک انھیں کے زیر سایہ سفر رہا۔ اس کے بعد وہ کانپور کو روانہ ہو کر فیض آباد چلے گئے۔ اور میں دہلی ہوتا ہوا دیوبند پہنچا۔ ترمذی شریف کا بہت تھوڑا حصہ حضرت شیخ الہند رحمۃ اللہ علیہ کے یہاں ہو چکا تھا۔ اس میں شریک ہو گیا اور حضرت رحمۃ اللہ علیہ ہی کے درِ اقدس پر قیام کیا۔ پھر مدرسے میں ایک مخصوص حجرہ لے کر رہنے لگا۔

دیوبندی کی حاضری کی باطنی وجہ:

۱۳۲۳ھ (۱۹۰۵ء) تک دار العلوم کی سرپرستی حضرت قطب عالم مولانا گنگوہی قدس اللہ سرہ

العزیز کے متعلق تھی۔ حضرت رحمۃ اللہ علیہ کو نہایت زیادہ خیال اس کی بہبودی اور ترقی کا تھا۔ عموماً
مدرسین اور اراکین حضرت کے تلامیذ اور متوسلین ہی تھے اور تمام مشکلات اور مہمات میں آپ
سے رجوع کرتے تھے اور بحمد اللہ کامیاب ہوتے تھے، مگر ۲۳ھ میں جب کہ حضرت قطب عالم
رحمۃ اللہ علیہ کا وصال ہوگیا تو سوائے حضرت شیخ الہند رحمۃ اللہ علیہ. جماعت میں کوئی ایسا بڑا نہ تھا جو
کہ فرائض سرپرستی کے قابل سمجھا جائے اور تمام اراکین دارالعلوم اور کارکنوں کا مربی ہوسکے۔ اس
لیے تمام جماعت نے حضرت مرحوم ہی کو سرپرست بنالیا اور طبعی طور پر ہونا بھی یہی چاہیے تھا۔
جب تک حضرت گنگوہی قدس اللہ سرہ العزیز کا سایہ تھا تو تمام ماتحتوں کو کوئی خصوصی فکر نہ ہوتی
تھی۔ جیسے ماں باپ کی موجودگی میں اولاد کو امور خانہ داری کی طرف سے اطمینان کلی ہوتا ہے۔
یہاں بھی یہی حال تھا۔ مگر اب حال دگرگوں ہوگیا۔ اب تمام افکار نے پس ماندہ بالخصوص حضرت
شیخ الہند رحمۃ اللہ علیہ صدر مدرس اور مولانا حافظ احمد صاحب صدر مہتمم اور مولانا حبیب الرحمٰن
صاحب مہتمم کو چاروں طرف سے گھیر لیا۔ اگرچہ رسمی طور پر ہردو حضرات مہتممن کے یہ عہدے بعد
میں معین کیے گئے مگر باعتبار انجام وہی فرائض پہلے ہی سے چلے آتے تھے۔ اگرچہ اس وقت میں
بھی مجلس اہل شوریٰ کی بعض بعض بہت معزز ہستیاں مولانا ذوالفقار علی صاحب مرحوم، مولانا فضل
الرحمٰن صاحب مرحوم، حاجی ظہور الدین صاحب مرحوم موجود تھیں، مگر ان پر بھی اس قدر افکار ترقی
دارالعلوم اور بہبودی نے ہجوم نہیں کیا اور نہ ان کی پیرانہ سالی اس کی اجازت دیتی تھی۔ کیوں کہ وہ
حضرات بھی چراغ سحری ت[illegible]یادہ قوت نہ رکھتے تھے۔ نیز عام اطراف و جوانب میں ان کی
شہرت بھی ایسی نہ تھی۔ یہی تینوں حضرات جزئیات وکلیات دارالعلوم میں سرگرداں رہتے تھے اور
بڑی بڑی اسکیمیں بناتے اور عمل میں لاتے رہتے تھے اور فتن وشرور کے دفع کرنے میں پوری
سرگرمی دکھاتے تھے اور بالخصوص اس کا بار شیخ الہند رحمۃ اللہ علیہ پر بہت ہی زیادہ تھا۔ اسی زمانے
میں غالباً ۱۳۲۵ھ یا ۱۳۲۶ھ (۸-۱۹۰۷ء) میں ایک ایسے مجمع میں جس میں دارالعلوم کی علمی ترقی
پر غور وخوض ہورہا تھا حضرت حافظ احمد صاحب مرحوم نے حضرت شیخ الہند رحمۃ اللہ علیہ سے کہا کہ
اگر مولوی انور شاہ کشمیری، مولوی عبیداللہ سندھی، مولوی مرتضیٰ حسن چاندپوری، مولوی سہول بھاگل
پوری، مولوی عبدالصمد کرت پوری اور حسین احمد یہاں آکر جمع ہوجاتے تو دارالعلوم کی علمی ترقی
بڑے اعلیٰ پیمانے پر پہنچ جاتی۔ اس زمانے میں حضرت مولانا انور شاہ صاحب مرحوم دہلی چھوڑ کر
کشمیر میں اقامت پذیر ہوگئے تھے۔ مولانا عبیداللہ صاحب عرصے سے سندھ ہی میں مقیم تھے۔

دیوبند کی آمدورفت بھی عرصے سے منقطع تھی۔ مولانا مرتضی حسن صاحب دربھنگہ میں مدرس اول اور بہت بڑے صاحب نفوذ تھے۔ مولانا محمد سہول صاحب مدرسۂ عالیہ کلکتہ میں بڑی تنخواہ پر ملازم تھے۔ مولانا عبدالصمد صاحب مرحوم رڑکی مدرسۂ رحمانیہ میں مدرس اول تھے۔ حضرت شیخ الہند رحمتہ اللہ علیہ کو یہ بات پسند آئی اور اگرچہ بظاہر سکوت کیا مگر خدا جانے کیا باطنی تصرف کیا کہ یہ سب اشخاص بغیر کسی ظاہری جدوجہد اور خط وکتابت کے یکے بعد دیگرے دیوبند پہنچ گئے۔ ممکن ہے کہ بعض بعض اشخاص سے کچھ ظاہری جدوجہد کی نوبت آئی ہو۔ مگر اکثروں کو کسی قسم کی خط وکتابت اور طلب وفہمایش کی نوبت نہیں آئی۔ جس سے صاف ظاہر ہوتا ہے کہ یہ اجتماع حضرت شیخ الہند رحمتہ اللہ علیہ کے باطنی تصرف سے واقع ہوا تھا۔ اس وقت مولانا عبیداللہ صاحب کا تشریف لانا کسی سیاسی اور پولیٹیکل جذبے کے ماتحت بالکل نہیں تھا۔ بلکہ ان کا نصب العین دارالعلوم کو ترقی دینا اور تمام ملک میں اس کی مضبوط ساکھ کا قائم ہوجانا، طلبائے قدیم (جو کہ دارالعلوم سے فارغ ہوچکے ہیں) ان میں یکجہتی اور مکمل تنظیم اور دارالعلوم کی ہر قسم کی بہبودی اور ترقی اعلیٰ پیمانے پر قائم ہوجاتی۔ یہی امور ان کے پیش نظر تھے اور اسی نصب العین کے ماتحت انھوں نے جمعیتہ الانصار وغیرہ حسب ارشاد حضرت شیخ الہند رحمتہ اللہ علیہ قائم کی تھی۔ مرادآباد، میرٹھ کے جلسے اسی اسکیم کے ماتحت ہوئے تھے۔ اسی نصب العین کے ماتحت اسلامی مدارس کی تنظیم بھی تھی۔ رولٹ رپورٹ میں جو ہذیانات مولانا موصوف کی آمد کے متعلق بکے گئے ہیں مثل دیگر امور کثیرہ واقعیت سے خالی ہیں۔ یہ اجتماع کچھ عرصے تک رہا اور اس نے پھل پھول، شاخیں اور کونپلیں نکالنی شروع کیں، مگر فلک کوزہ پشت کو پسند نہ آیا اور مقاصد میں کامیابی کی راہ میں اس نے سخت درسخت روڑے پیدا کردیے۔ (نقش حیات)

سلطان عبدالحمید کی تخت خلافت سے سبک دوشی:

یکم مئی ۱۹۰۹ء: آج کے اودھ اخبار سے واضح ہوا کہ ۲۷ راپریل ۱۹۰۹ء کو عبدالحمید خان سلطان روم حسب فتویٰ شیخ الاسلام تخت سے اتار دیے گئے کہ انھوں نے احکام شرع شریف کے خلاف کیا اور بے گناہوں کا خون بہایا اور رشید آفندی ان کے چھوٹے بھائی کو جن کی عمر ۶۵ سال کی ہے بہ لقب محمد پنجم تخت نشین کیا۔ سلطان عبدالحمید کی عمر ۶۸ سال کی ہے۔ انھوں نے ۳۳ برس حکومت کی۔ ان کا منشا یہ تھا کہ پارلیمنٹ بھی قائم ہو اور میرا بھی اختیار رہے۔ اس وجہ سے برگشت

دخول ہوا۔ سلطان عبدالحمید خان مع گیارہ بیگمات و دو چھوٹے بیٹوں کے سلونیکا کو منتقل ہوئے۔ اور بہ حالت جلاوطنی وہیں سکونت گزین ہوں گے۔ ۲۹/اپریل کو "سلونیکا" بھیجے گئے۔

یکم تا ۲۰/جون ۱۹۰۹ء: سلطان عبدالحمید کی ذاتی دولت پانچ کروڑ پونڈ ہے جو معرض ضبطی میں آوے گی اور مصارف سلطنت میں صرف ہوگی۔

مقدمہ لاجپت رائے:

۹/جولائی ۱۹۰۹ء جو مقدمہ لالہ لاجپت رائے لاہور نے بنام اخبار "انگلش مین" کلکتہ میں بابت اپنے ازالۂ حیثیت عرفی کے کلکتہ ہائی کورٹ میں دائر کیا تھا۔ اس میں جج فلیچر کلکتہ نے ۶/جولائی کو پندرہ ہزار کی ڈگری دی اور خرچہ مقدمہ دلوایا۔ دعویٰ پانچ ہزار کا تھا۔ (ایک نادر روزنامچہ۔ ص ۴۸)

مدن لال قاتل:

۱۰/جولائی ۱۹۰۹ء: یکم جولائی ۱۹۰۹ء کو کرنل کرزن ویلی اور ڈاکٹر لال کاکا کو مسمی مدن لال طالب علم سکنہ امرتسر نے بمقام لندن تپنچہ کی گولیوں سے قتل کر ڈالا جس کی وجہ سے مدن لال قاتل نفرت کی نگاہ سے دیکھا جاتا ہے۔ غالباً اس کو سزا پھانسی کی ہوگی۔ مقدمے کی تحقیقات لندن کورٹ میں ہو رہی ہے۔ مدن لال نے اپنی بریت کے لیے کوئی بیان نہیں دیا۔ بلکہ جو اس نے پولیس میں بیان کیا تھا وہی کافی سمجھا گیا۔

۲۷/جولائی ۱۹۰۹ء: آج کے اودھ اخبار سے واضح ہوا کہ لارڈ اورسٹون نے مدن لال قاتل سر کرزن ویلی کو پھانسی کی سزا دیتے ہوئے کہا کہ جو بات کہوں گا اس کا ملزم پر کچھ اثر نہ پڑے گا۔ جب مدن لال حکم سزا سن چکا تو اس نے فوجی سلام کیا اور کہا کہ مائی لارڈ میں آپ کا شکریہ ادا کرتا ہوں۔ میں خوش ہوں کہ مجھے میرے وطن کے لیے مرنے کا یعنی شہید ہونے کا فخر نصیب ہوا۔
(ایک نادر روزنامچہ، ص ۴۷)

۲۰/اگست ۱۹۰۹ء: ۱۷/اگست کو مسمی مدن لال ڈھینگڑا ساکن امرتسر کو بجرم قتل سر کرزن ویلی صاحب بمقام لندن پھانسی ہوئی۔ (ایضاً ص ۴۷)

۲۹/جولائی ۱۹۰۹ء: سلطنت قسطنطنیہ کی پارلیمنٹ نے چودہ ہزار تین سو پچھتر روپیہ مشاہرہ سلطان معزول عبدالحمید خان کا مقرر کیا۔ (ایک نادر روزنامچہ، ص ۹۵-۹۴)

جمعیت الانصار کا افتتاح:

۱۲/اکتوبر ۱۹۰۹ء (۲۷/رمضان المبارک ۱۳۲۷ء): آج جمعیت الانصار، دارالعلوم کا افتتاح ہوا۔ مولانا عبید اللہ سندھی لکھتے ہیں:

"رمضان ۱۳۲۷ھ کی ستائیسویں شب بھی عجیب زندگی بخش اور متبرک شب تھی، جب کہ ہم چند ضعیف الاثر طالب علموں نے اپنے حقیقی مربیوں سے جمعیت الانصار کے افتتاح کی درخواست کی۔ گو جمعیت الانصار کے وسیع مقاصد ہم غریبوں کے پیمانہ مقدرت سے زائد معلوم ہوتے تھے۔ مگر ہمارے اکابر نے اپنی عالی قدر تائید وامداد کے وعدے کے ساتھ ان کو شرف قبول بخشا اور غایت شفقت سے جمعیت کی سرپرستی منظور فرمائی۔"

مولانا سندھی جمعیت الانصار کے تعارف ومقاصد کے سلسلے میں لکھتے ہیں:

"جمعیت الانصار مدرسۂ عربی دیوبند کے فارغ التحصیل طلبہ کی اس مددگار جماعت کا نام ہے جو مخصوص شرائط کے پابند ہو کر مدرسے کی ہمدردی میں ہر طرح، پر حصہ لے یا بہ الفاظ دیگر سرپرستان مدرسۂ دیوبند کے دست بازو بن کر کام کرے۔ اس جمعیت کی غرض مدرسے کے مقاصد کی تائید وحمایت اور اس کے پاک اثر کی ترویج واشاعت ہے۔ ملکی معاملات سے اس کو کوئی تعلق نہیں ہے۔

اس جمعیت کے ارکان مدرسۂ عالیہ دیوبند کے سابق تعلیم یافتہ حضرات ہیں، جن میں سے ہر ایک کا فرض ہے کہ مدرسے کی تعلیمی، انتظامی اور مالی ترقی میں انتہائی کوشش کرے۔

ان فرائض کے ادا کرنے کے لیے جمعیت نے پانچ شعبے قرار دیے ہیں،

(الف) تکمیل التعلیم، (ب) نظام التعلیم، (ج) الارشاد، (د) التالیف والاشاعت اور (ہ) جلسہ علمیہ"۔

(ماہنامہ القاسم دیوبند۔ ربیع الثانی ۱۳۲۹ھ)

کانگریس کا سالانہ اجلاس:

۲۷/دسمبر ۱۹۰۹ء: لاہور میں آل انڈیا کانگریس کا سالانہ اجلاس پنڈت مدن موہن مالویہ کی زیر صدارت ہوا۔ اس میں ۲۳۸ مندوبین شریک ہوئے اور یہ اجلاس پھر بھی بہت کامیاب رہا۔

(حسرت موہانی......ایک سیاسی ڈائری)

دارالعلوم کی مدرسی اور جلسۂ دستار بندی:

حضرت شیخ الاسلام فرماتے ہیں:

''میں ۱۳۲۷ھ شعبان (اگست ۱۹۰۹ء) تک دارالعلوم میں کتب دورہ میں سے ترمذی اور بخاری شریف کو جد و جہد کے ساتھ پڑھتا رہا۔ ۱۳۲۷ھ شوال (اکتوبر ۱۹۰۹ء) میں اکابر نے مجھ کو تدریس کا حکم کیا۔ جلسۂ اہل شوریٰ نے حضرات مہتممین رحمہما اللہ تعالیٰ کی خواہش اور تجویز کو پاس کر دیا کہ حسین احمد کو بالفعل بمشاہرہ چونتیس روپے، مدرس کر دیا جائے اور اس کے بعد جب بھی وہ مدینۂ منورہ سے ہندوستان میں آئے اس کو بغیر تجدید اجازت از مجلس شوریٰ مدرس کیا جائے۔ چناں چہ مجھ کو متعدد اسباق اوپر کی کتابوں کے دیے گئے۔ اس سے مجھ کو علمی ترقی کے علاوہ مالی وسعت بھی حاصل ہوگئی اور دوسری بڑی نعمت یہ حاصل ہوئی کہ حضرت شیخ الہند رحمۃ اللہ علیہ جب سفر فرماتے تو میں بھی ساتھ ہوتا اور شرف خدمت گذاری سے باریابی ہوتی۔ ۱۳۲۸ھ (۱۹۱۰ء) میں تجویز ہوا کہ دستار بندی کا جلسہ عرصۂ دراز سے نہیں ہوا ہے۔ اس کو عمل میں لانا چاہیے۔

دستار بندی کی حقیقت اور رواج:

زمانہ ہائے قدیمہ میں اس امر کے ظاہر کرنے کے لیے کہ طالب علم کتب درسیہ پڑھ کر اور علوم و فنون فقہ و حدیث میں ماہر ہو کر اس درجے میں پہنچ گیا ہے کہ اس کے فتاویٰ قابل اعتماد سمجھے جائیں اور اس کی تعلیم و تدریس قابل اطمینان شمار ہو دو طریقے جاری کیے گئے تھے؛

☆ ایک سند دینا جس میں اساتذہ اپنے تلامیذ کی کتب خواندگی اور اس کی صلاحیت علمی اور عملی اور اپنی اجازت ظاہر کیا کرتے تھے اور

☆ دوسرا طریقہ دستار بندی یا خرقہ عطا کرنے کا ہوتا تھا۔ مجمع عظیم میں اساتذہ تلمیذ کے سر پر اپنے ہاتھ سے دستار باندھ دیتے تھے یا اپنا جبہ وغیرہ خرقہائے علماء عطا کرتے تھے۔ اس طریقہ ثانیہ سے عام و خاص میں تلمیذ کی قابلیت کا علم اور چرچا ہو جاتا تھا۔ بخلاف سند کے کہ اس کو سمجھنا اور پڑھنا صرف اہل علم سے ہو سکتا ہے۔

دارالعلوم دیوبند قائم ہونے کے بعد فارغ التحصیل طلبہ کی دستار بندی کا طریقہ جاری کیا گیا۔

دوسرے تیسرے سال اجتماع عظیم کیا جاتا تھا اور دستار بندی اور سند اور امتحان اور تقریر علمی کی رسوم جاری ہوتی تھیں۔ اس طریقے سے دارالعلوم کی شہرت بہت زیادہ ہونے لگی۔ نیز تعلیم عربی اور تحصیل علوم دینیہ کا جذبہ لوگوں میں بڑے پیمانے پر پیدا ہوگیا۔ یہ طریقہ غالباً ۱۳۰۴ھ تک جاری رہا۔ مگر بعد میں کچھ ایسے عوائق پیش آئے کہ اس کی انجام دہی نہیں ہوسکی۔ طلبہ کو صرف سند دی جاتی تھی۔ مگر عام لوگوں اور بالخصوص فارغ التحصیل طلبہ کے تقاضے دستار بندی کے برابر ہوتے رہتے تھے۔ جن کو لطائف حیل سے ارباب اہتمام ٹالتے رہتے تھے۔ دارالعلوم دیوبند ۱۳۰۴ھ سے ۱۳۱۳ھ تک مشکلات میں مبتلا ہوتا رہا۔ داخلی اور خارجی صدمات آئے دن پیش آتے رہے۔ مولانا محمد یعقوب صاحب مرحوم مدرس اول کا وصال۔ مولانا رفیع الدین صاحب مرحوم مہتمم کی ہجرت، مولانا سید احمد صاحب دہلوی مدرس اول کا مدرسہ سے بیزار ہوکر سفر بھوپال، ارباب اہتمام کی تبدیلی، کبھی حضرت حاجی عابد حسین صاحب مرحوم، کبھی منشی فضل حق صاحب مرحوم، کبھی مولانا محمد منیر صاحب مرحوم نانوتوی، کبھی مولانا حافظ احمد صاحب مرحوم یکے بعد دیگرے مہتمم ہوتے رہے اس تغیر اور تبدل میں اندرونی انتظامات اور افکار میں بہت کچھ قلق اور شورشوں کا ظہور ہوتا رہا۔ جس سے ارباب انتظام کو اتنی مہلت نہیں مل سکی کہ وہ اس جلسۂ دستار بندی کا نظام قائم کریں۔ ۱۳۱۳ھ (۹۶۔۱۸۹۵ء) میں انھیں شورشوں کے دبانے کے لیے حضرت قطب عالم مولانا گنگوہی رحمتہ اللہ علیہ اور نواب محمود علی خاں صاحب آف چھتاری مرحوم اور ملک کے دیگر اکابر جمع ہوئے اور مولانا حافظ احمد صاحب مرحوم کو مستقل مہتمم بنایا گیا۔ امید تھی کہ اب شورشوں کا قلع قمع ہوجائے گا۔ مگر ۱۳۱۸ھ (۱۹۰۱ء) تک قلع قمع بالکلیہ نہ ہوسکا۔ اس کے بعد مکمل سکون پیدا ہوا۔ اس وقت سے ترقیات دارالعلوم کا دروازہ بڑے پیمانے پر کھلنے لگا۔

چوں کہ ایک طرف تو فارغ التحصیل طلبہ کی مقدار بہت زیادہ ہوگئی تھی۔ جن کا اندازہ ہزار سے زیادہ تھا۔ اس لیے صرف عماموں کی بہم رسانی کے لیے زر کثیر کی ضرورت ہوتی۔ مگر اس سے بڑھ کر مصاریف مہمانداری جو کہ ایسے اجتماع پر ضروری ہیں، ان سے منتظم حضرات بہت گھبراتے تھے۔ اول تو خود علماء فارغ التحصیل ہی کا شمار اتنا تھا کہ ان کی مہمانداری کے لیے کافی مقدار کی ضرورت تھی۔ ثانیاً دارالعلوم کی شہرت اس قدر بڑھ چکی تھی کہ اندازہ کیا جاتا تھا کہ معمولی اعلان پر دس پندرہ ہزار مسلمان ضرور اطراف و جوانب سے جمع ہوجائیں گے۔ چوں کہ لیے لوگوں کے مطالبے بہت زور کے اور زیادہ ہوئے اس لیے ہر دو حضرات مہتممین مرحومین نے حضرت شیخ الہند

رحمۃ اللہ علیہ پر اس کی انجام دہی کا زور دیا۔ اور اس کے فوائد اور تقاضوں وغیرہ کا ذکر کیا۔ حضرت رحمۃ اللہ علیہ بھی موافق ہو گئے اور پھر تینوں حضرات نے مجلس شوریٰ میں پیش کر کے منظوری لی اور ۱۶، ۱۷، ۱۸، ۱۸ اپریل ۱۹۱۰ء جلسہ کا اعلان کر دیا۔ ضروریات جلسہ کے لیے بہت بڑی رقم کی ضرورت تھی۔ اس لیے طلبہ کے وفود اطراف و جوانب سے تحصیل چندہ کے لیے روانہ کیے گئے۔ مسلمانوں نے ہر صوبے اور ہر گوشے سے لبیک کہا اور تقریباً ایک ماہ سے کم میں جب کہ وفود واپس آئے تو اٹھارہ بیس ہزار روپے جمع ہو گئے تھے اور شہرہ بھی جلسہ کا اس کے ذریعے سے بہت زیادہ ہو گیا تھا۔ تمام انتظامات لازمہ بڑے پیمانے پر انجام دیے گئے اور بحمد اللہ اس حسن و خوبی سے امور تکمیل پائے کہ عوام تو درکنار، خواص اور ماہرین کو سخت تعجب ہوتا تھا کہ ان بوریہ نشین غریب علماء نے اس قدر عظیم الشان شاہانہ کام کو کس طرح انجام دے دیا۔ مسلمان جوق در جوق اطراف اور جوانب سے نہایت شوق اور محبت سے آ کر جمع ہو گئے۔ اہل شہر نے اپنے اپنے مکانات مہمانوں کے لیے خالی کر دیے۔ مہمانی کے لیے نہایت بڑے پیمانے پر مطبخ بنایا گیا۔ دہلی سے مشہور باورچی بلائے گئے۔ ہر قسم کی ضروریات کا مکمل انتظام کیا گیا۔ جملہ امور متعلقہ کے لیے شعبے قائم کیے گئے۔ طلبہ اور ملازمین و مدرسین کی پارٹیاں تقسیم کار کے اصول پر بنائی گئیں۔ ہر ذمہ دار اپنے اپنے کام میں منہمک اور مشغول رہتا تھا۔ مگر حضرت شیخ الہند رحمۃ اللہ علیہ نہایت ساکت و صامت تفکر کے دریا میں غرق نظر آتے تھے۔ کبھی یہاں بیٹھ گئے، کبھی وہاں۔ ان تمام ایام میں حضرت رحمۃ اللہ علیہ مراقب پائے جاتے تھے اور ایسا معلوم ہوتا تھا کہ کوئی نہایت ہی عظیم الشان بار آپ پر پڑا ہوا ہے۔ جس کی فکر میں ڈوبے ہوئے اپنے پروردگار سے عرض معروض کر رہے ہیں اور واقعہ بھی یہی تھا۔ مشکلات خود بخود حل ہو جاتی تھیں۔ جن امور کو عقدۂ لاینحل اور معمولی طاقتوں سے بالاتر سمجھا جاتا تھا وہ چٹکیوں میں انجام پاتے تھے۔ لوکل حکام نے بھی مدد دینے میں کوتاہی نہیں کی۔ مدرسہ کے تالاب میں نہر سے پانی لایا گیا۔ جس کی وجہ سے مجمع کے لیے وضو وغیرہ میں بہت آسانی ہوئی۔ ٹیوب ویل جگہ جگہ گاڑے گئے۔ پنڈال بنہایت وسیع بنایا گیا۔ علاوہ ظاہری انتظامات کی تکمیل کے باطنی تصرفات اور روحانی برکات کا ہر جگہ ظہور تھا۔ غیر معمولی بات یہ تھی کہ باوجودے کہ ہر وقت کئی کئی سو من غلہ اور گوشت پکتا تھا مگر کسی جگہ کتا نظر نہیں آتا تھا۔ باوجودے کہ گرمیوں کا زمانہ تھا مگر مکھیوں کا اجتماع کہیں نہ تھا۔ غلاظت اور گندگی جو کہ ایسے مجامع میں عموماً پائی جاتی ہے، کہیں دیکھنے میں نہیں آتی تھی۔ اس قدر عظیم الشان مجمع میں کوئی شخص کھانے اور مہمانی کے فرائض

سے محروم اور شاکی نہیں پایا گیا۔ حال آں کہ معمولی معمولی باتوں اور مجامع میں اس قسم کی بے عنوانیاں سیکڑوں پائی جاتی ہیں۔ اس زمانے میں اخبار نے جلسے کی غیر معمولی کامیابی پر زوردار اور طویل طویل آرٹیکل شائع کیے۔

میرے ذمے طلبہ کو عربی میں تقریر کرانے کی خدمت تعین کی گئی تھی۔ چناں چہ تھوڑے ہی دنوں میں مختلف عنوانات پر تقریباً بارہ یا پندرہ طالب علم عربی تقریر کے ماہر ہو گئے تھے۔ ارباب انتظام کی خواہش تھی کہ ان سبھوں سے مجمع عام میں تقریر کرائی جائے۔

جلسے میں اولاً جناب قاری عبدالوحید خاں صاحب مرحوم مدرس تجوید اور ان کے شاگردوں بالخصوص مولانا محمد طیب صاحب اور مولانا محمد طاہر صاحب وغیرہ نے باتجوید قرآن سنایا۔ اس کے بعد حضرت مولانا احمد صاحب مرحوم و مغفور نے اپنا مطبوعہ خطبہ موسومہ ''دارالعلوم دیوبند کا زریں ماضی اور مستقبل'' جو کہ نہایت مبسوط تھا اور اس میں دارالعلوم کی ماضی کی خدمات دینیہ اور علمیہ کو واضح طور پر ظاہر کیا گیا تھا، سنایا۔ اس میں مستقبل کی ضروریات اور اراکین کے ارادوں پر بھی روشنی ڈالی گئی تھی۔ اس کے بعد سب سے پہلے عربی زبان میں حضرت مولانا انور شاہ صاحب رحمۃ اللہ علیہ نے مبسوط تقریر فرمائی۔ ان کے بعد میں نے تقریر کی جو کہ جناب رسول اللہ ﷺ کے فضائل کے متعلق تھی۔ پھر دو تین طلبہ نے تقریر کی۔ مگر طلبہ کی امنگیں مایوسی سے تبدیل ہو گئیں جب کہ عام حاضرین نے مطالبہ کیا کہ تقاریر اردو میں ہونی چاہییں۔ ہم لوگ کچھ نہیں سمجھتے۔ چناں چہ ارباب انتظام نے مجبور ہو کر عربی تقریریں بند کرادیں اور اردو میں تقریروں کا سلسلہ جاری کیا۔ اس کے بعد دوسرے اجلاس میں دستار بندی کا سلسلہ شروع کیا گیا۔ سب سے پہلے حضرت مولانا انور شاہ صاحب رحمۃ اللہ علیہ کی دستار بندی ہوئی اس کے بعد میری دستار بندی کی گئی۔

میری دستار بندی اور اس کا تعدد:

مجھ کو ایک عمامہ سبز حسب اصول مدرسہ دوسرے حضرات کی طرح مدرسہ سے از دست حضرت شیخ الہند رحمۃ اللہ علیہ بندھوایا گیا اور مجھ کو خصوصی طور پر علاوہ دستار مدرسہ حضرت مولانا حکیم مسعود احمد صاحب، صاحبزادہ حضرت قطب العالم گنگوہی رحمۃ اللہ علیہما نے دوسری دستار عطا فرمائی۔ پھر جناب حکیم مولانا احمد صاحب رامپوری رکن مجلس شوریٰ نے تیسری دستار عطا فرمائی۔ علاوہ عربی تقریر کے اردو میں بھی مجھ کو تقریر کرنے کی نوبت آئی۔ حضرت مولانا احمد حسن صاحب امروہوی

رحمۃ اللہ علیہ اور حضرت مولانا اشرف علی صاحب رحمۃ اللہ علیہ کی تقریروں اور مواعظ سے
لوگوں نے بہت حظ لیا اور بہت زیادہ فوائد عام حاضرین کو حاصل ہوئے۔ افسوس کہ اتنے بڑے
عظیم الشان مجمع کے لیے باوجود پنڈال کی وسعت کے مقرر کو آواز سب تک پہنچانا سخت مشکل ہوتا
تھا۔ اس وقت تک لاؤڈ اسپیکر جاری نہیں ہوا تھا۔ ورنہ یہ مشکل پیش نہ آتی۔ اس مجمع میں صاحبزادہ
آفتاب احمد خاں صاحب مرحوم نے بھی تقریر فرمائی تھی۔ خلاصہ یہ کہ یہ جلسہ اپنی معنوی اور مادی
برکات اور عظمتوں کی بناء پر اپنا آپ ہی نظیر تھا۔ دوسری جگہ اس کی مثال نہیں پائی گئی۔ پوری
تفصیلات اس کی مستقل رسالہ کی شکل میں شائع کی گئی تھیں جو کہ دارالعلوم کے ریکارڈ میں محفوظ
ہے۔ اس میں دارالعلوم کو بعد منہائی مصاریف بڑی مقدار چندہ کی بھی حاصل ہوئی اور اس کے
بعد دارالعلوم نے نمایاں شہرت اور قبولیت ملک میں پیدا کر کے ایسی ترقیاں کیں جن کا وہم وگمان
بھی پہلے نہ تھا۔ وللہ الحمد والمنۃ۔

۱۹۱۱ء ہندوستان سے واپسی حجاز:

چوں کہ مدینۂ منورہ میں والد صاحب مرحوم اور دیگر اعزہ موجود تھے۔ اس لیے طبعی تقاضا
وہاں پہنچنے کے علاوہ اس روحانی تقاضے کے جو کہ ان دیارِ مقدسہ کی حاضری کا ہر مسلمان کے دل
میں ہوتا ہے، جاری تھا۔ مگر اس سے بڑھ کر حضرت والد صاحب مرحوم کا آئے دن کا حکم تھا کہ جلد
از جلد یہاں پہنچنا چاہیے۔ نیز طلبا مدینۂ منورہ کے اور دیگر اعزہ کے تقاضے تھے جو کہ بذریعہ والد
صاحب مرحوم بار بار ہوتے رہتے تھے۔ اسی بناء پر ۱۳۲۹ھ (۱۹۱۱ء) میں ارادہ سفر حجاز کیا گیا۔ اور
چوں کہ حیفا سے (جو فلسطین کا مشہور بندرگاہ ہے اور بحر ابیض کے مشرقی کنارے پر واقع ہے)
مدینۂ منورہ تک ریلوے کا سلسلہ متصل ہو چکا تھا اس لیے یہی مناسب معلوم ہوا کہ بمبئی سے پورٹ
سعید کا ٹکٹ لیا جائے اور وہاں سے حیفا جانے والے جہاز میں سفر کیا جائے اور وہاں سے مدینۂ
منورہ ریل میں سفر کیا جائے۔ عبدالباقی خاں صاحب مرحوم الٰہ آبادی نے خواہش ظاہر فرمائی کہ وہ
اپنی والدہ ماجدہ کو بمعیت اپنے چھوٹے بھائی قاری عبدالوحید خاں صاحب مرحوم مدرس دارالعلوم
اور ایک ملازم حج کے لیے بھیجنا چاہتے ہیں۔ نیز اپنے والد ماجد مرحوم کی طرف سے حج بدل بھی
کرانا چاہتے تھے۔ اس بناء پر انھیں کے حسب منشا سفر کی تیاری کی گئی۔ چوں کہ ان کی والدہ ماجدہ
مرحومہ نہایت ضعیف العمر اور بھاری بدن کی تھیں اس لیے اونٹوں کا اس قدر سفر ان کے لیے

موزوں نہیں ہوسکتا تھا۔ اسی بناء پر ان کی رائے یہی تھی کہ بذریعہ حجاز ریلوے سفر کیا جائے۔ بہرحال مع متعلقین بمبئی پہنچ کر ایک آسٹریلین جہاز میں تقریباً اڑسٹھ روپے فی کس کرایہ پر پورٹ سعید کا ٹکٹ لیا گیا۔ دسویں دن جہاز پورٹ سعید پہنچ گیا۔ وہاں بطور قرنطینہ [1] اور بانتظار جہاز حیفا پانچ چھ روز قیام کر کے پہنچا ہوا اور وہاں سے ایک دن قیام کر کے مدینۂ منورہ کو روانگی ہوگئی۔ غالباً اٹھارھویں دن مدینۂ منورہ میں پانچوں آدمی پہنچ گئے۔ مدینۂ منورہ میں تقریباً ایک ماہ قیام کرنے کے بعد متعلقین کو وہاں چھوڑ کر مکۂ معظمہ کو روانگی ہوئی۔ راستے میں قاری عبدالوحید صاحب مرحوم کی والدہ ماجدہ جو کہ نہایت معمر تھیں بیمار ہوگئیں اور بعد از فراغت حج انتقال کر گئیں۔ مکۂ معظمہ میں مدفون ہوئیں۔ حج سے فارغ ہونے کے بعد قاری عبدالوحید صاحب معہ اپنے ملازم کے ہندوستان واپس آگئے اور میں مدینۂ منورہ واپس ہوگیا۔ جیسا کہ پہلے گزر چکا ہے۔

مارلے۔منٹو اصلاحات:

۱۹۰۹ء:

مارلے۔منٹو اصلاحات سے مراد برطانوی ہند کے دستوری نظام میں اصلاحات کی وہ تجاویز ہیں جنھیں وزیر ہند لارڈ مارلے اور وائسرائے لارڈ منٹو نے باہمی صلاح ومشورہ سے تیار کیا اور جنھیں انڈین کونسلز ایکٹ ۱۹۰۹ء کے ذریعے قانون اور عملی شکل دی گئی۔

اس ایکٹ کے ذریعے ہندوستان کو وزیر ہند کی انڈیا کونسل اور گورنر جنرل کی ایگزیکٹو کونسل میں شامل کیا گیا۔ ہندوستان کی مجالس قانون ساز کی اصلاح اور توسیع کی گئی۔ ان کے ارکان تین زمروں میں تقسیم کیے گئے۔ سرکاری، منتخب اور نامزد غیر سرکاری،

امپیریل لے جس لیٹو کونسل میں سرکاری اکثریت برقرار رکھی گئی۔ لیکن صوبائی کونسلوں میں غیر سرکاری اکثریت کا اصول مان لیا گیا۔ کونسل کے ۲۷ منتخب ارکان کے چناؤ کے لیے فرقوں اور مفادات کی نمائندگی کا اصول نافذ کیا گیا۔ رائے دہندگان کو تین بڑے حلقوں میں تقسیم کیا گیا:

(۱) عام جو صوبائی کونسلوں کے غیر سرکاری ارکان یا میونسپل اور ڈسٹرکٹ بورڈوں کے ارکان پر مشتمل ہوتے ہیں۔

(۲) فرقہ وارانہ، جو (الف) زمینداروں کے حلقوں اور (ب) مسلمانوں کے حلقوں اور

(۳) خصوصی حلقوں سے جو پریزیڈنسی کارپوریشنوں، یونیورسٹیوں، بندرگاہ ٹرسٹوں، باغبانی وتجارتی مفادات اور ایوانہائے تجارت پر مشتمل تھے، پر مشتمل ہوتے تھے۔

اسی طرح صوبائی کونسلوں کے منتخب ارکان کے چناؤ کے لیے بھی تین جداگانہ حلقے؛ عام، فرقہ وارانہ اور خصوصی قائم کیے گئے۔ اس ایکٹ کے تحت بنائے گئے ضابطے کے ذریعے نہ صرف کونسلوں کے سرکاری ارکان کی تعداد بڑھائی گئی بلکہ ان کے دایرہ کار کو وسیع کیا گیا اور ارکان کو ایوان میں بجٹ پر بحث کرنے اور سوالات اور ضمنی سوالات پوچھنے کی بھی اجازت دی گئی۔ لیکن مارلے منٹو اصلاحات کا مقصد ہندوستان میں ذمہ دار حکومت یا پارلیمانی نظام حکومت قائم کرنا قطعاً نہیں تھا۔ (فرہنگ سیاسیات، ص ۱۷-۳۷۰)

منٹو مارلے اصلاحات کا نفاذ:

مجالس قانون ساز میں غیر سرکاری ممبروں کی تعداد اور سرکاری ممبروں سے زیادہ ممبروں کو سوالات کرنے اور بجٹ پر بحث کا اختیار۔ حکومت کی پالیسی پر نکتہ چینی کی اجازت، وائسرائے کی انتظامیہ کونسل میں لارڈ ستیندر پرشاد سنہا پہلے ہندوستانی ممبر بنے اور جداگانہ طریقۂ انتخاب رائج ہوا۔ اور اس طرح گویا اب سرسید احمد خان کی جداگانہ حقوق والی تحریک کو کامیابی حاصل ہوئی اور مسلمانوں کو علاحدہ نیابت ونمایندگی کا حق مل گیا اور اب یہ مطمح نظر ہوگیا کہ سب سے پہلے مسلمانوں کے حقوق کی حفاظت کی جائے کیوں کہ ان کی مستقل اقلیت ہے اور اکثریت سے ان کا منشا جداگانہ ہے۔ (حسرت موہانی......ایک سیاسی ڈائری، ص ۴۱)

۱۹۱۰ء

نریندر ناتھ سین کو پھانسی:

۴ر فروری ۱۹۱۰ء: آج کے اودھ اخبار سے واضح ہوا کہ نریندر ناتھ سین کو ہائی کورٹ کلکتہ نے حکم پھانسی کا صادر کیا۔ جس نے ۲۵ر جنوری ۱۹۱۰ء کو شمس العالم ڈپٹی سپرنٹنڈنٹ پولیس کو تپنچہ کی گولی سے ہلاک کیا تھا۔ (ایک نادر روزنامچہ، ص ۴۷)

ایڈورڈ ہفتم کا انتقال اور ہندوستان کے نئے گورنر:

اسی سال ایڈورڈ ہفتم کا انتقال ہوگیا۔ اب ہندوستان کے لیے نئے وائسرائے لارڈ ہارڈنگ

کا تقرر ہوا۔ ان سے کانگریس نے سیاسی قیدیوں کی رہائی کی درخواست کی۔ حالات انتہائی نازک دور سے گزر رہے تھے۔ سر ڈبلیو ایم ویڈر بن کانگریس کے نئے صدر چنے گئے۔ انھوں نے ہندو مسلم اتحاد پر بہت زور دیا اور ایک متحدہ کانفرنس بلانے کی اپیل کی۔

کانگریس کا پچیسواں اجلاس:

۲۶/دسمبر ۱۹۱۰ء میں سر ولیم ویڈر بن کی صدارت میں آل انڈیا کانگریس کا پچیسواں سالانہ اجلاس منعقد ہوا۔ ۶۳۶ نمایندوں کے ساتھ اجلاس کی کارروائی شروع ہوئی۔ اس میں مسٹر جناح اور مولوی مظہر الحق بھی کانگریسی کی حیثیت سے شریک ہوئے۔ اس اجلاس میں بہار کانگریس کے زبردست نیشنلسٹ لیڈر مولانا مظہر الحق نے جو اپنی جسمانی و دماغی توانائی کے باعث آل انڈیا کانگریس میں بہت مقبول ہو گئے تھے، زبردست ولولہ انگیز تقریر کی۔ اپنی اس تقریر میں مولانا نے ہندو مسلم اتحاد پر زور دیتے ہوئے کہا کہ ہندو اور مسلمانوں کو متحدہ طور پر ملک کی فلاح و بہبود کے لیے شانہ بشانہ چلنا چاہیے۔ جس سے اتحاد بین القوم کی زندہ مثال دنیا کے سامنے لائی جا سکے۔

(حسرت موہانی......ایک سیاسی ڈائری، ص ۴۵)

جنگ بلقان میں تیزی:

جنگ بلقان کی تیزی سے مسلمانوں کے دلوں میں انگریزوں کے خلاف نفرت و بیزاری کا جذبہ پھیلتا گیا۔ بھارت کے ہندوؤں نے بھی یہ دیکھا کہ سامراجی حکومتوں کا مشرقی ممالک پر قبضہ ہندوستان کی غلامی کی زنجیروں کو اور بھی مضبوط کر دے گا۔ چناں چہ مسلمانوں کے دوش بدوش ہندو عوام بھی برطانوی سامراج کے مقابلے کے لیے میدان عمل میں کود پڑے۔ اس طرح ترکوں کو کافی طاقت پہنچی اور ان کے حوصلے بڑھ گئے اور بالآخر ترکی کو فتح حاصل ہوئی اور بلقانیوں کو شکست فاش۔

اس خبر سے دنیائے اسلام میں شکرانے کی نماز ادا کی گئی اور سارے ہندوستان میں مسرت کی لہر دوڑ گئی۔ (مولانا حسرت موہانی......ایک سیاسی ڈائری)

لارنس آف عربیا اور اس کا مشن:

۱۹۱۰ء میں لائیڈ جارج نے لارنس کو شرف ملاقات بخشا۔ لارنس کو ''اتحاد عرب'' یا ''عرب

نیشنلزم'' کا داعی بنا کر ایک ایسے قافلے کے ساتھ عراق روانہ کیا گیا جس قافلے میں ہندوستان کے میجر فضل الدین اور مفتی فلسطین کے نمائندے شامل تھے۔ لائیڈ جارج وزیر اعظم برطانیہ نے لارنس کو روانہ کرتے وقت کہا تھا:

''عربی حکمرانوں کے قدموں پر پونڈوں کا ڈھیر لگا دو اور ان میں عربی حکومت قائم کرنے کی روح پھونک دو۔ ہر عرب شیخ سے مل کر کہو برطانیہ خطۂ عرب میں عربوں کی حکومت کا اس لیے حامی ہے کہ عربوں کا اپنا ایک کلچر ہے۔ عربوں کی اپنی ایک تہذیب ہے۔ عرب ترکوں سے زیادہ مقدس ہیں۔ عالم اسلام کو عربوں کی رہنمائی کی ضرورت ہے۔''

ترکوں کے ظلم و ستم کی فرضی داستانیں عالم عرب میں بیان کرو، عرب میں جا کر تمہارا قافلہ اس طرح کام کرے کہ تم لوگ ایک سچے پکے مسلمان نظر آؤ ''لارنس'' تمہارے مشن کی کامیابی پر برطانیہ عظمیٰ کی کامیابی ہے۔ آسمانی باپ عیسائیت کی ترقی کا سہرا تمہارے سر باندھے''۔

لارنس کے قافلے نے مفتی فلسطین امین الحسینی کی مدد اور شریف مکہ کے تعاون سے تمام عرب میں سازش کا جال پھیلا دیا اور عالم عرب میں ''لارنس'' کی عزت افزائی کا یہ عالم تھا کہ شریف مکہ کے بیٹے امیر فیصل لارنس کو یا اخی کہہ کر پکارتے تھے ہر صبح اور ہر شام ''لارنس'' کی پارٹی عربی شیوخ اور حکمرانوں کا ''قبلہ'' بن گئی۔

عرب اتحاد کا فتویٰ دینے والا لائیڈ جارج بذات خود عربوں کو گمراہ کرنے کی سازش کی نگرانی کر رہا تھا۔ لاکھوں روپے کا برطانوی اسلحہ، عربی میں چھپے ہوئے خوبصورت لاکھوں پمفلٹ مفتی فلسطین کی رہنمائی میں برطانیہ سے فلسطین آتے رہے اور تمام عرب میں تقسیم ہوتے رہے۔ عرب جوانوں کو لندن کے ملٹری کالج میں کپتان اور کرنل بنا کر بھیجا گیا۔ عرب عوام کو گوریلا جنگ کی ٹریننگ دی گئی۔

نتیجے کے طور پر ہر عرب مشتعل تھا۔ ترکی کی حکومت کے خلاف سازش کا یہ حال تھا کہ عربوں کے نزدیک اسلام کے سب سے بڑے مجرم صرف ترک تھے۔ ۱۹۱۴ء کی جنگ میں عربوں نے کرنل لارنس کی رہنمائی میں انگریزی فوجوں سے قدم سے قدم ملا کر پورے عرب میں ترکوں کا قتل عام کیا۔ آخر خلافت اسلامیہ کا چراغ گل ہو گیا۔

(مسائل امروز: عزیز الرحمٰن جامعی لودھیانوی، دہلی، ۱۹۶۶ء ص ۱۸۴)

جشن تاج پوشی:

۲۸ر مارچ ۱۹۱۱ء: آج کے اودھ اخبار سے واضح ہوا کہ ہمارے ملک معظم کا دربار تاش پوشی ۱۲ر دسمبر کو بہ مقام دہلی ہوگا۔ (ایک نادر روزنامچہ، ص ۵۰)

وائسرائے کی خدمت میں وائسرائے مسلم لیگ کا سپاس نامہ:

یکم اپریل ۱۹۱۱ء: یکم اپریل ۱۹۱۱ء کی شام کو یونیورسٹی ہال لاہور میں ہز ایکسیلنسی وائسرائے کی خدمت میں پنجاب پراونشل مسلم لیگ کی جانب سے اڑتالیس اصحاب پر مشتمل ایک وفد پیش ہوا اور مندرجۂ ذیل سپاسنامہ پیش کیا۔ اس وفد میں علامہ اقبال بھی شریک تھے۔ اس سپاسنامے پر دستخط کرنے والے اڑتالیس افراد میں فضل حسین اور ان کے ترقی پسند مسلمان دوستوں کے نام، علاوہ اقبال کے نہیں ملتے۔ اس سپاسنامہ کے اقتباسات کا مطالعہ بھی دلچسپی سے خالی نہ ہوگا۔

> ”بگرامی خدمت ہز ایکسیلنسی دی رائٹ آنرایبل چارلس بیرن ہارڈنگ آف پنشرسٹ...... وائسرائے و گورنر جنرل ہندوستان!
>
> حضور عالی! ہم پراونشل مسلم لیگ پنجاب اور اس کی ۱۹ ڈسٹرکٹ برانچوں کے عہدیداران اس کی اجازت چاہتے ہیں کہ صوبۂ ہذا کی اسلامی آبادی کی طرف سے یور ایکسیلنسی کے اول مرتبہ دارالامارۃ پنجاب میں تشریف لانے پر آپ کا نہایت مؤدبانہ و عقیدت مندانہ خیر مقدم کریں۔ اول واسکونٹ ہارڈنگ آف لاہور، فاتح مدکی و فیروز شہر کے پوتے کے لیے پانچ دریاؤں کی سرزمین میں آنا ایسی باتوں سے لبریز ہونا چاہیے جن کی یاد کرنے سے بہت بڑی مسرت کا احساس پیدا ہونا لازمی ہے۔ ۱۸۴۶ء کا مشہور عہد نامہ جس کے کوئی تین سال بعد اس سارے صوبے کا الحاق کیا گیا پنجاب کی تاریخ میں ایک بہتری کی سمت موڑنے والا پہلا موقع تھا...... اس شائستہ گورنمنٹ کی شکر گذاری کا، جس کے تحت ہم امن و خوشحالی کی برکات اٹھا رہے ہیں، جو بار عظیم ہم پر ہے وہ کبھی ماسوائے ازیں پورے طور پر ادا نہیں کیا جاسکتا کہ ہم اس کی پائیداری و استقلال

کی تائید میں ہر قربانی اپنی طرف سے اٹھانے کے لیے خلوص کے ساتھ تیار رہیں۔

ہم اس موقع سے فائدہ اٹھانے کی جرأت کرتے ہیں کہ یور ایکسیلنسی کو جو ہندستان میں ہمارے نہایت مہربان فرمانروا کے نائب ہیں اسلامی جماعت کی تاج برطانیہ کے ساتھ غیر متبدل وفاداری و جاں نثاری کا یقین دلائیں۔ ہم درحقیقت ایسی شاندار سلطنت کی شہریت پر متفخر ہیں۔

......پنجاب کے اہل اسلام نے ہمیشہ اس کو اپنا ایک مقدس فرض سمجھا ہے کہ حکام کو امن و انتظام برقرار رکھنے میں پوری مدد دیں اور انھوں نے بار بار نہ صرف الفاظ بلکہ افعال و اعمال کے ذریعے سے برٹش مقصد کے ساتھ اپنی تمام تر دلی عقیدت کا کافی ثبوت دیا ہے جب گذشتہ چند سال سے ہندوستان کا پولیٹیکل مطلع اس صوبے میں سیڈیشن اور بے چینی کے بادلوں سے مکدر ہو رہا تھا۔ مسلمانوں نے کبھی ایک لمحے کے لیے بھی اپنی برٹش گورنمنٹ کی مستحکم عقیدت میں پس و پیش نہیں کیا۔

ہز میجسٹی کی رعایا کے دوسرے فرقوں کے ساتھ مسلمان بھی گورنمنٹ کے تہ دل سے ان اعلیٰ پولیٹیکل مراعات کے واسطے جو کہ عظیم الشان اصلاحی اسکیم (ماٹیگو چیمسفورڈ اصلاحات) کے متعلق (جو حال میں اس ملک میں جاری کی گئی ہے) ہندوستانی رعایا کو عطا کی گئی ہیں، مشکور ہیں۔ یور ایکسیلنسی کے شریف دل پیش رو نے مسلمانوں کے ضروری مقاصد کی نگہداشت کے لیے مسلمانان ہندوستان کی علاحدہ قائم مقامی (جداگانہ نیابت) کے وہ قیمتی حقوق امپیریل اور پراونشل کونسلوں میں عطا فرمائے اور ہم یہ دیکھ کر نہایت خوش ہوتے ہیں کہ یور ایکسیلنسی کی گورنمنٹ نے حال ہی میں ایک موقع پر اس عہد کی تجدید کی ہے، جو کہ اس وقت نہیں عطا کیا گیا تھا۔

ہم حضور کو یقین دلاتے ہیں کہ اس فیاضانہ اظہار نے (عہد کی تجدید نے) تمام مسلمانان کی بے اندازہ شکر گزاری یور ایکسیلنسی کی گورنمنٹ کے لیے حاصل کر لی ہے اور مسلسل انگریزی حکمت عملی اور برٹش کے ناقابل شکست وعدوں کی

نمایاں اور مستحکم ثبوت بہم پہنچا دیا ہے جو کہ اس چٹان کو بناتے ہیں جس پر حکومت برطانیہ کے شاندار ایوان کی بنیاد قائم ہے۔
ہم ایک بار پھر اپنی دلی نفرت کا اظہار ان انارکسٹوں کی کارروائیوں پر کرتے ہیں جنھوں نے گذشتہ سالوں میں اہل ہند کی بے عیب نیک نامی پر ایک بدصورت داغ لگا دیا ہے اور بہ نظر انارکستانہ جرائم کے پھر پھوٹ پڑنے کے جیسا کہ کلکتہ میں حال کے جرائم سے ظاہر ہوا ہے۔ ہم اپنا قومی فرض سمجھتے ہیں کہ اس شرمناک تحریک پر اپنی زوردار نارااضگی کا اظہار کریں، جس کے نتیجے میں یہ خوفناک جرائم ہیں......" (اقبال...... جادوگر ہندی نژاد، از عتیق صدیقی)

جمعیت الانصار کا پہلا جلسہ مراد آباد

۱۵ تا ۱۷ اپریل ۱۹۱۱ء: جمعیۃ الانصار کا پہلا جلسہ مراد آباد میں مولانا احمد حسن امروہوی کی صدارت میں ہوا۔ یہ جلسہ تین دن جاری رہا۔ صبح اور سہ پہر کو روزانہ دو اجلاس ہوئے۔ بڑی تعداد میں علماء نے شرکت فرمائی اور شوق و سرگرمی سے حصہ لیا۔ مقامی حضرات نے بھی اس کے اجلاس میں شوق سے حصہ لیا۔ ہر اجلاس میں تقریباً دس ہزار حاضرین کا اندازہ لگایا گیا ہے۔ اس جلسے میں (شیخ الاسلام) مولانا سید حسین احمد مدنی نے بھی شرکت فرمائی۔

مولانا احمد حسن امروہوی کی صدارت میں جمعیت کا پہلا اجلاس صبح ساڑھے سات بجے شروع ہوا۔ قاری عبدالوحید خاں الہ آبادی مدرس دارالعلوم دیوبند نے قرآن کی تلاوت فرمائی اور جلسہ کا آغاز ہوا۔ قاضی محمد شوکت حسین خاں، صدر مجلس استقبالیہ نے خطبۂ استقبالیہ پڑھا۔ اس کے بعد مولانا احمد حسن نے اپنی افتتاحی تقریر پڑھنی شروع کی۔ تقریر عربی میں تھی لیکن تکان سفر اور کمزوری کی وجہ سے حضرت اپنی پوری تقریر خود نہ پڑھ سکے۔ کچھ حصہ پڑھنے کے بعد معذرت کے ساتھ مولانا عبیداللہ سندھی کو دی اور انھوں نے پڑھ کر مکمل کی۔

اس تقریر میں مولانا احمد حسن صاحب نے دارالعلوم دیوبند کے قیام اور حضرت مولانا محمد قاسم صاحب رحمۃ اللہ علیہ بانی مدرسہ کے دلچسپ حالات بیان کیے اور مدرسۂ دیوبند اور جمعیۃ الانصار کے قیام کے متعلق بہت سے اکابر علماء کی آراء کا اقتباس دیا گیا تھا جو کہ اس بات کا ثبوت تھا کہ بانی علیہ الرحمۃ کا خیال بناء و قیامِ مدرسہ سے مسلمانوں کی دینی و مذہبی تعلیم کو معراج ترقی پر پہنچانے کی

متعلق تھا۔ جو خدا کے فضل و کرم سے آج عملاً کر کے دکھایا گیا ہے۔ دوران تقریر میں بعض ان اعتراضات کا بھی ذکر تھا جو بعض نئی روشنی کے دلدادہ مدرسہ اور جمعیۃ الانصار کے متعلق کیا کرتے تھے۔ منجملہ ان کے یہ بات قابل ذکر ہے کہ بعض نئی روشنی کے شیدائی یہ کہتے ہیں کہ جمعیۃ الانصار اولڈ بوائے ایسوسی ایشن کی نقل ہے۔ لیکن یہ بات ہرگز صحیح نہیں ہے۔ جمعیۃ الانصار کی تحریک غالباً اب سے تیس برس پہلے شروع ہوگئی تھی اور اس تحریک کے بانی مدرسۂ عالیہ کے وہ طالب علم تھے جو آج علوم کے سرچشمہ اور آفتاب فنون ہیں اور جن کی ذات بابرکات پر آج زمانہ جس قدر ناز کرے بجا ہے۔ لیکن چوں کہ یہ تحریک اس وقت ضروریات زمانہ سے متعلق نہ تھی اس لیے رک گئی اور آخر اس کلیہ کی بناء پر کہ ضرورت ہر چیز کو خود بخود پیدا کر لیتی ہے ۱۳۲۷ھ سے اس انجمن کو پھر دوبارہ زندہ کر کے جمعیۃ الانصار نام رکھا گیا۔ جمعیۃ الانصار ہرگز کسی انجمن کی نقل نہیں ہے اور نہ کسی کے ذاتی مقاصد سے بحیثیت دنیاوی اس کا تعلق ہے، بلکہ اس کے مقاصد وہ ضروری مقاصد ہیں جن کی آج کل بہت کچھ ضرورت ہے۔

حضرت مولانا کی تقریر دس بجے ختم ہوئی۔ اس کے بعد ایس ابن علی ایڈیٹر ''نیر اعظم'' مراد آباد نے شاہ ایڈورڈ ہفتم کی وفات پر اظہار تاسف کیا اور نائب ناظم مجلس استقبالیہ مؤتمر الاسلام مراد آباد نے شاہ جارج پنجم کی تخت نشینی پر تہنیت پیش کی۔ اس کے بعد بعض حضرات کے اصرار سے حضرت مولانا احمد حسن صدر جلسہ نے تقریباً ایک گھنٹہ تک وعظ فرمایا اور اس کارروائی پر جلسے کی پہلی نشست کی کارروائی بخیر و خوبی اختتام کو پہنچی۔

سہ پہر کو دوسرا اجلاس شروع ہوا۔ اس اجلاس میں ناظم جمعیۃ الانصار مولانا عبید اللہ سندھی نے جمعیت کے اغراض و مقاصد کو بیان فرمایا۔ اس کے بعد مولوی سراج احمد نے اپنا مسدس پڑھا۔ جسے غور و توجہ سے سنا گیا۔ مغرب کے بعد مولوی ہادی حسن کا وعظ ہوا۔

تیسرا اجلاس ۱۶؍اپریل کو صبح سات بجے شروع ہوا۔ جلسے کا آغاز قاری عبدالوحید خاں اور ان کے ایک شاگرد کی تلاوتِ قرآن پاک سے ہوا۔ اس کے بعد مولانا انور شاہ کشمیری نے عربی زبان میں ایک فصیح و بلیغ قصیدہ پڑھا۔ اس کے بعد مولانا عبدالرحمٰن سیوہاروی رکن مجلس العلماء بھوپال کا وہ عربی قصیدہ جو جمعیۃ الانصار کے قیام اور دارالعلوم دیوبند کی اعلیٰ دینی و مذہبی خدمات کے تذکرے میں مولانا کفایت اللہ صدر مدرس مدرسۂ امینیہ دہلی نے پڑھ کر سنایا۔ دونوں قصیدوں کو اہل علم نے بہت شوق سے سنا اور پسند کیا۔ یہ کارروائی ایک گھنٹے میں تکمیل کو پہنچی۔ اس کے بعد آٹھ

بجے مولانا شبیر احمد عثمانی دیوبندی نے ''اسلام'' کے موضوع پر تقریر فرمائی۔ مولانا کی تقریر نہایت عالمانہ اور محققانہ تھی اور اسلام کی حقانیت کا منہ بولتا ثبوت۔ پورے دو گھنٹے تک فصاحت و بلاغت کا دریا زور وشور سے بہتا رہا۔ ۱۰ بجے تقریر ختم ہوئی تو مولانا اشرف علی تھانوی نے تقریر فرمائی۔ حضرت تھانوی کی تقریر بہت پسند کی گئی۔ حضرت کی تقریر کا خلاصہ یہ بیان کیا گیا ہے:

''خدا تعالیٰ نے انجمنوں کی حالت بیان کر کے باخیر و برکت اور مقبول انجمنوں کو ظاہر فرما دیا ہے۔ اس لیے جو انجمنیں اس کے موافق کام کرتی ہیں وہ درست اور ٹھیک ہیں۔ لیکن آج کل اکثر انجمنیں ایسی ہیں جن کے ڈھنگ شریعت کے مخالف ہیں۔ انجمنوں کا مقصد یہ ہونا چاہئے کہ وہ اسلام کے مطابق کام انجام دیں اور خود اس کے کارکن بھی اسلام کا اعلیٰ نمونہ بنیں۔''

مولانا اشرف تھانوی کی تقریر تقریباً دو گھنٹے جاری رہی۔ حضرت تھانوی نے ایک جگہ خود یہ اعتراف کیا کہ تقریر کے لیے کھڑا ہوا تھا تو دس منٹ کا مضمون بھی ذہن میں نہ تھا''۔ لیکن یہ مولانا عبیداللہ سندھی کا تصرف تھا کہ دو گھنٹے تک مضمون پھیلتا چلا گیا''۔

تقریباً بارہ بجے یہ اجلاس اختتام کو پہنچا۔

اجلاس چہارم سہ پہر کو تین بجے شروع ہوا اور ساڑھے پانچ بجے تک جاری رہا۔ اس اجلاس میں مولانا سید حسین احمد مدنی نے حصہ لیا۔

قاری عبدالوحید نے تلاوت کلام پاک فرمائی۔ پھر مولوی عبدالسمیع نے ''مذہبی تعلیم'' کے موضوع پر اور ان کے بعد مولوی محمد ابراہیم نے ''اخلاق محمدی'' کے موضوع پر تقاریر فرمائیں۔ اس کے بعد مولانا سید حسین احمد مدنی نے مولوی جمیل الدین کی ''عقل و نقل'' کے موضوع پر ایک تحریر پڑھ کر سنائی۔ سوا پانچ بجے نماز عصر کے لیے وقفہ دیا گیا۔

عصر کی نماز کی بعد مولانا شبیر احمد عثمانی نے ''وجود واجب الوجود اور بحث خلق افعال'' کے متعلق فلسفیانہ رنگ کی ایک نہایت عمدہ تقریر فرمائی۔ یہ تقریر نماز مغرب کے وقت تک جاری رہی۔ اسی روز عشاء کی نماز کی بعد مولانا سید حسین احمد مدنی کا وعظ ہوا جو عام طور پر پسند کیا گیا۔

جلسے کا پانچواں اجلاس ۱۷ اپریل کی صبح کو سات بجے شروع ہوا۔ قاری عبدالوحید نے کلام اللہ کی تلاوت سے جلسے کا آغاز کیا۔ اس کے بعد مولوی شائق احمد (عثمانی) نے ایک عربی نظم سے سامعین کو لطف اندوز کیا۔ اس کے بعد ناظم جمعیۃ الانصار مولانا عبیداللہ سندھی نے ان تجاویز کا اعلان کیا جو اس جلسے کے واسطے تیار کی گئی تھیں۔ یہ کل سات تجاویز تھیں ان کا خلاصہ یہ ہے اور ان

کی اہمیت مطالعے سے واضح ہو جاتی ہے۔

(۱) انگریزی مدارس، گورنمنٹ اسکول وکالجوں میں طلبہ کی مذہبی تعلیم جس قدر کہ ان کو ضروری ہو، خواہ ہفتہ میں ایک ہی مرتبہ ہو اور ان کے دارالاقامت (بورڈنگ ہاؤس) میں مسلمان طلبہ کی مذہبی تربیت یعنی وضع وطریقۂ اسلام کی پابندی اور اسلامی شعار واخلاق کے لیے جمعیۃ الانصار دیوبند ہر ایک اسکول وکالج میں حسب ضرورت لائق معلم مقرر کرے۔ جن کی تنخواہ پچیس، تیس روپے سے کم نہ ہو۔

(۲) ہر ایک انگریزی مدرسہ (اسکول وکالج) میں کم از کم ۲۵ فیصدی وہ طلبہ جن کی دوسری زبان عربی ہو ان کے لیے جمعیۃ انعامی وظائف جاری کرے اور ان کی تعلیم کے لیے لائق استاد بہم پہنچائے۔

(۳) ایسے منتہی گریجویٹ یا انڈر گریجویٹ طلبہ جن کی دوسری زبان عربی ہو اس کے لیے مدرسۂ عربیہ دیوبند میں تعلیم دینیات کا خاص انتظام ہو اور جمعیۃ تیس سے چالیس تک ماہوار وظائف ان کے واسطے جاری کرے۔

(۴) جمعیۃ مدرسۂ عالیہ دیوبند میں ایک ایسی جماعت کھولے جو قرآن شریف پر مخالفین اسلام کے ان اعتراضات کا جواب دے سکے جو عربی واردو زبان میں ہوں۔ ان زبانوں کے سوا دوسری زبانوں کے اعتراضات متعلقہ قرآن مجید کے جوابات جمعیۃ دینے کی ذمہ دار نہیں ہے۔

(۵) مساجد کے انتظام وامامت کے لیے اگر کسی جگہ کے لوگ جمعیۃ سے خواہش کریں تو وہ ان کے لیے لائق عالم امامت ووعظ کے لیے بہم پہنچائے۔

(۶) قرآن شریف اور دینی کتب کی طبع وتجارت کے لیے مسلمانوں کو آمادہ کرنا اور ان کے لیے ان کو دوسری قوموں کا محتاج نہ رہنے دینا۔

(۷) ایسے چھوٹے چھوٹے رسائل بکثرت مفت شائع کرنا، جن میں عقائد اسلام کی تعلیم اور فرقۂ آریہ کے جوابات وغیرہ ہوں''۔

اس کے بعد مولوی حکیم اظہر الدین احمد صاحب نے مذہبی تعلیم کے تقدم کی ضرورت پر تقریر کی اور مجلس انتظامی کی روداد اور اخراجات کی تفصیل پیش کی۔ اس کے بعد مولانا اشرف علی تھانوی کو تقریر کی دعوت دی گئی اور انھوں نے گزشتہ نشست میں اپنی تقریر کا بقیہ مضمون انجمنوں کے حالات اور ضرورت کے سلسلے میں پیش فرمایا جو عام طور پر بہت پسند کیا گیا۔

اسی روز سہ پہر کو ڈھائی بجے چھٹا اجلاس شروع ہوا۔ تلاوت کلام پاک کے بعد سب مذہبی تعلیم کے موضوع پر مولانا حبیب الرحمٰن عثمانی مددگار مہتمم دارالعلوم کی تقریر پیش کی گئی۔ چوں کہ وہ خود ناسازی طبع کی بناء پر تقریر پیش نہ کر سکے اس لیے ان کے بھائی مولانا شبیر احمد عثمانی نے تقریر پڑھ کر سنائی۔ تقریر نہایت مفید مطالب پر مشتمل تھی اور خواص وعوام نے اسے بہت پسند فرمایا۔

اس کے بعد دارالعلوم کے متعدد طلبہ نے عربی زبان میں تقریریں اور آخر میں نہایت خیر و خوبی کے ساتھ امید سے زیادہ کامیاب جلسہ مجلس استقبالیہ و ناظم جمعیت کے شکریہ و دعا پر ختم ہوا۔

مولانا سندھیؒ کے سے یہ یادگار اور اولین جلسۂ جمعیت امیر کے اس شعر پر ختم ہوئی اور کیا ہی خوب تبصرہ جلسے کے اثرات و نتائج پر ہے:

اب تک مرے نہ آیا ابھی نالہ بھی امیرؔ
زلزلہ سے ہے یہ عالم تہ و بالا کیسا!

(روداد جلسہ جمعیۃ الانصار: ناظم جمعیۃ مولانا عبیداللہ سندھی، ماہنامہ القاسم دیوبند۔ ربیع الثانی ۱۳۲۹ھ، ص ۱۶۔۵)

وفاتِ نظام حیدرآباد:

یکم ستمبر ۱۹۱۱ء: آج کے اودھ اخبار سے واضح ہوا کہ نواب میر محبوب علی خان بہادر نظام حیدرآباد دکن مورخہ ۱۴ر اگست ۱۸۶۶ء کو پیدا ہوئے تھے اور ۲۹ر اگست ۱۹۱۱ء کو عارضۂ فالج میں وفات پائی۔ عمر ۴۵ سال تھی۔ مرحوم تعلیم یافتہ اور شکار دوست تھے۔ متوفی کے بجائے ان کے بیٹے میر عثمان علی خان مسند نشین ہوئے جن کی عمر اس وقت پچیس سال کی ہے۔

۲۱ر ستمبر ۱۹۱۱ء بمعائنہ اودھ اخبار امروزہ واضح ہوا کہ ہز ہائی نس نواب میر عثمان علی خان جدید نظام دکن حیدرآباد تاریخ ۲۹ر جمادی الثانی ۱۳۰۳ھ یوم سہ شنبہ وقت ۹ بجے رات کو پیدا ہوئے تھے۔ (ایک نادر روزنامچہ، ص ۶۹)

۲ر دسمبر ۱۹۱۱ء: ۲ر دسمبر ۱۹۱۱ء کو شہنشاہ انگلستان جارج پنجم معہ اپنی ملکہ میری کے باب الہند عروس البلاد بمبئی میں داخل ہوئے۔ شہنشاہ بمبئی کی سیر وتفریح کے بعد دہلی روانہ ہوئے۔ شہنشاہ کی آمد پر تقسیم بنگالہ منسوخ کردی گئی۔ (حسرت موہانی......ایک سیاسی ڈائری، ص ۴۶)

دوبار۔ قیصری دہلی:

۱۲ر دسمبر ۱۹۱۱ء: ۱۲ر دسمبر ۱۹۱۱ء کو دہلی میں دربار قیصری کے نام سے شاہی دربار منعقد ہوا۔

اس دربار قیصری میں والیان ریاست کے ساتھ روٗساؤاکابرین نے گرمجوشی کے ساتھ جارج پنجم کا خیر مقدم کرتے ہوئے اپنی وفاداری کا ثبوت پیش کیا۔ (حسرت موہانی......ایک سیاسی ڈائری، ص ۴۷)

وائسرائے ہند کی تقریر ۱۹۱۱ء:

۱۵ ر دسمبر ۱۹۱۱ء: ۱۲ ر دسمبر کو جب ملک معظم نے تخت نشینی بمقام دہلی اختیار فرمائی تو لارڈ ہارڈنگ گورنر جنرل نے حسب ذیل اسپیچ فرمائی:

(۱) دہلی بجائے کلکتہ کے دارالسلطنت قرار پائے۔

(۲) بہ عہد لارڈ کرزن صاحب جو تقسیم بنگالہ کی ہوئی تھی اور جس کی وجہ سے بنگالیوں میں ایک شورش پیدا تھی وہ منسوخ کی جاتی ہے۔

(۳) ۵۰ لاکھ روپیہ واسطے تعلیم کے دیا گیا۔

(۴) ملازمان سول وفوجی جن کی تنخواہ پچاس روپے ماہوار ہے، ان کی تنخواہ ۱۵ دن کی مضاعف کی جائے۔ آج کی تاریخ میں اعزاز تقسیم ہوئے جن میں تعداد کثیر انگریزوں اور والیان ملک وغیرہ کی ہے۔ (ایک نادر روزنامچہ، ص ۵۱)

دسمبر ۱۹۱۱ء: کانگریس کا چھبیسواں سالانہ اجلاس دسمبر کے آخری ہفتے میں پنڈت بشن نرائن دار کی صدارت میں کلکتہ میں ہوا۔ پنڈت بشن نرائن کا تعلق یوپی سے تھا۔ کانگریس کے ابتدائی رہنماؤں میں تھے۔ حریت پسند اور انقلابی فکر کی حامل شخصیت تھے۔ اجلاس میں جنوبی افریقہ میں مزدوروں کے مسئلے پر اور اینٹی ایشیاٹک ''لے جس لیشن'' کے خلاف جدوجہد کے سلسلے میں گاندھی جی کو مبارک باد کا ریزولیشن پاس کیا گیا۔ (سکسٹی ایئرز آف کانگریس، ص ۹۱۔۱۸۹)

علامہ اقبال کا خراج عقیدت:

دسمبر ۱۹۱۱ء: ''ہمارا تاجدار'' کے عنوان سے علامہ اقبال کے چند اشعار ماہنامہ زمانہ کان پور کے ''دربار شاہی نمبر'' (دسمبر ۱۹۱۱ء) میں شائع ہوئے ہیں۔ بعد میں یہ اشعار ماہنامہ مخزن لاہور کے جنوری ۱۹۲۱ء کے شمارے میں بھی شائع ہوئے۔ اشعار یہ ہیں:

ہمائے اوج سعادت ہو آشکار اپنا
کہ تاج پوش ہوا آج تاجدار اپنا

اسی کے دم سے ہے عزت ہماری قوموں میں
اسی کے نام سے قائم ہے اعتبار اپنا
اسی سے عہدِ وفا ہندیوں نے باندھا ہے
اسی کے خاک قدم پر ہے دل نثار اپنا

۱۹۱۱ء: کانگریس کی تحریک پر حکومت نے پرائمری تعلیم کا محکمہ قائم کیا۔ سال رواں میں اٹلی نے طرابلس پر حملہ کر دیا۔ ترکوں اور عربوں نے متحد ہو کر اٹلی کا مقابلہ کیا۔ گھمسان کی لڑائی چھڑ گئی۔ یورپی ممالک نے اٹلی کو شہ دینا شروع کیا۔ جس سے ساری دنیائے اسلام میں یورپ کے خلاف نفرت و بیزاری کی لہر دوڑ گئی۔ ہندوستانی عوام بھی بہت متاثر ہوئے اور ہندوستان جوش و خروش کا طوفان خیز سمندر بن گیا۔ (حسرت موہانی......ایک سیاسی ڈائری، ص ۴۶)

۱۹۱۲ء

سول میرج بل پر مسٹر جناح علی کی تقریر:

۲۶ر فروری ۱۹۱۲ء: مسٹر محمد علی جناح نے امپیریل لے جس لیٹو کونسل میں ''اسپیشل میرج بل'' پر تقریر کرتے ہوئے کہا:

یہ واقعہ ہے کہ اس کونسل میں ایک پبلک نمائندہ خواہ وہ ہندو ہو یا مسلمان ایسے مسئلے میں بڑی مشکل میں ہے کیوں کہ کٹر عقیدے کے لوگوں کی اکثریت اس کے خلاف رہے گی، لیکن میں سمجھتا ہوں کہ عوام کے کسی سچے نمائندے کے لیے کوئی وجہ نہیں کہ وہ جس بات کو صحیح جانتا ہو اس کے بے خوف اظہار سے باز رہے۔ اگر کسی قوم کی اکثریت کسی ایک خیال یا عقیدہ کی پیرو ہے۔ تو لازم نہیں کہ وہ خیال صحیح بھی ہو اور وہ لوگ صحیح راستہ پر ہوں۔ اگر اس کونسل میں کسی نمائندے کی پختہ طور پر یہ رائے ہے کہ یہ ترمیم اس کے ملک اور اس کی قوم کے لیے مفید ہے تو اس کا فرض ہے کہ وہ اس ترمیم کی حمایت کرے۔

آنریبل ممبر قانون (سر علی امام) نے کہا ہے کہ جہاں تک مسلمانوں کا تعلق ہے۔ قرآن میں صریح حکم ہے کہ مسلمان سوائے کتابیہ کے کسی غیر مسلمہ سے

شادی نہیں کر سکتا، لیکن میں اس ترمیم کو صحیح ثابت کر دکھاؤں گا۔ میں آنریبل ممبر سے دریافت کرتا ہوں کہ آیا اس بل کی قانون سازی میں کیا یہ پہلا موقعہ ہے کہ اس کونسل کو مسلم قانون (شریعت) کو منسوخ کرنے کی ضرورت پیش آئی ہے؟ نہیں! ہمارے سامنے نظیریں موجود ہیں:

۱) شرعی قانونِ معاہدہ پر اب عملدر آمد نہیں ہوتا۔

۲) اسلامی قانون فوجداری جس پر انگریزی حکومت کی آمد کے بعد تک عمل در آمد ہوتا رہا، اب قطعی منسوخ ہو چکا ہے۔

۳) قانونِ شہادت، جس سے اب تک مسلمان آشنا رہے ہیں، اب اس ملک میں ختم ہو گیا ہے۔

۴) اس سے زیادہ اور لیجیے ۱۸۵۰ء کے قانون (منسوخی امتناع فرقہ واری) کا حال ہی نفاذ ہوا ہے۔ اور میں کونسل کو توجہ دلاتا ہوں کہ یہ وہی قانون ہے جس کے خلاف قرآن میں صاف حکم موجود ہے۔ کہ کسی مسلمان کے مرتد ہو جانے پر اس کا حق وراثت ضبط کر لیا جاتا ہے۔ ممبر قانون نے شادی کے متعلق جیسا صاف حکم قرآن کا بتایا ہے، ایسا ہی یہ حکم بھی ہے پھر بھی قانون کے ذریعے اسے منسوخ کیا جا چکا ہے اور اب اگر کوئی مسلمان اسلام ترک کر دے (مرتد ہو جائے) تب بھی اس کا حقِ وراثت محفوظ رہے گا اور شریعتِ اسلام کے بل پر اس کا یہ حق اس سے کوئی نہیں چھین سکتا۔ قرآن کا یہ حکم اب قطعی منسوح ہو گیا۔ اب اس کا کوئی اثر نہیں ہے"۔ میرا دعویٰ ہے کہ یہ ایسی نظیریں موجود ہیں، جن کی پیروی کر کے ہم دورِ جدید کی ضروریات اور وقت کے تقاضوں کا ساتھ دے سکتے ہیں۔

بیشک جناب صدر! ہندو قانون ہو یا محمدی قانون جسے بھی آپ پیش نظر رکھیں، ان کی وجہ سے بہت سی دقتوں اور مشکلوں کا سامنا کرنا پڑتا ہے۔ اگر کوئی ہندو/غیر ہندو، (مسلمان عورت) سے شادی کرنا چاہے یا کوئی مسلمان غیر کتابیہ سے شادی کرنے کا ارادہ کرے تو یہ مذہبی قانون اس کے حق میں جنجال بن جاتے ہیں ایسی تکلیف دہ مداخلت کو ختم کرنے کے لیے جدید قانون سازی سے امداد لینا لازمی ہے۔ قانون یہ نہیں کہتا کہ ہر مسلمان کو غیر مسلم کے ساتھ یا ہر ہندو کو غیر

ہندو کے ساتھ ضرور ہی شادی کرنا ہوگی۔ البتہ اگر تعلیم یافتہ روشن خیال اور ترقی پسند ہندوستانیوں کی کافی تعداد موجود ہے۔ خواہ ہندو ہوں یا مسلمان یا پارسی اور وہ شادی کا ایسا دستور اختیار کرنا چاہیں، جس میں زمانۂ حال کے خیالات اور مذاق سے مطابقت ہو تو کوئی وجہ نہیں کہ ایسے لوگوں کو انصاف سے محروم رکھا جائے۔ (گورنمنٹ آف انڈیا گزٹ ۱۹۱۲ء شعبۂ قانون سازی ۶۰ تا ۱۶۱)

اب مسٹر محمد علی جناح کی یہ پوری تقریر جو انھوں نے امپیریل لی جس لیٹو کونسل میں ۲۶ر فروری ۱۹۱۲ء کو ''اسپیشل میرج بل'' پر بحث میں حصہ لیتے ہوئے کی تھی، ''دی کلیکٹڈ ورکس آف قائد اعظم محمد علی جناح'' جلد اول (۱۹۰۷ تا ۱۹۲۱ء)، مرتبہ سید شریف الدین پیرزادہ، کراچی، ۱۹۸۴ء (صفحہ ۳۵ تا ۳۸) میں مرتب ہوگئی ہے۔

انجمن خدامِ کعبہ کا قیام:

۶ر مئی ۱۹۱۲ء: مولانا عبدالباری فرنگی محل نے انجمن خدام کعبہ کے نام سے کعبہ اور مقامات مقدسہ کی حفاظت اور ان کے انتظامات کے لیے ایک انجمن بنائی ہے۔ ۳۱ر دسمبر کو مولانا محمد علی اور شوکت علی نے مولانا فرنگی محل سے ملاقات کی اور انجمن میں شریک ہوگئے۔ انجمن کے صدر مولانا عبدالباری بنائے گئے جو خادم الخدام کہلائیں گے۔ مولانا شوکت علی اور جناب مشیر حسین قدوائی ان کے معتمد اور حکیم عبدالوالی، ڈاکٹر ناظر الدین حسن اور مولانا محمد علی انجمن کے ارکان مقرر ہوئے ہیں۔ اس کے اراکین شیدائی کعبہ کہلائیں گے۔

(انجمن خدام کعبہ۔ تاریخ قیام اور مقاصد و خدمات: مولفہ ڈاکٹر ابوسلمان شاہ جہان پوری)

انجمن خدام کعبہ:

ولی اللہی جماعت کی دیوبندی شاخ نے ۱۸۵۷ء کے تھوڑے عرصے بعد ہی احیائے ملت اور استخلاص وطن کی تحریک شروع کر دی تھی اور خارج میں جلد ہی اس کے برگ و بار بھی نمایاں ہونا شروع ہو گئے تھے۔ دارالعلوم میں ثمرۃ التربیت (۱۲۹۵ھ/ ۱۸۷۸ء) کا قیام حضرت قاسم العلوم مولانا محمد قاسم نانوتویؒ (ف ۱۲۹۷ھ/ ۱۸۸۰ء) کی حیات مسعود کا واقعہ ہے۔ یہ گویا کہ نئے موسم

میں تخم ریزی کا عمل صالح تھا اور حضرت شیخ الہند مولانا محمود حسن دیوبندی (ف ۱۹۲۰ء) کے عہد مبارک میں جمعیۃ الانصار (۱۳۲۷ھ/۱۹۰۹ء) کا قیام اس کے نشو و ارتقا کے دورِ انقلاب کا آغاز تھا۔

حضرت قاسم العلوم کے عمل صالح کی روح انقلاب و سعادت کو ایسی وقت محسوس کرلیا گیا تھا۔ جمعیۃ الانصار کے قیام سے جس دور انقلاب کا آغاز ہوا تھا اس کا اعتراف نہ صرف دارالعلوم میں بلکہ اس کے باہر بھی کیا گیا تھا۔ اس کے ساتھ ہی یہ احساس بھی ہوگیا تھا کہ کسی سیاسی انقلابی تحریک کے لیے حالات سازگار نہیں۔ لیکن جب کسی تخم کی خوابیدہ روح بیدار ہو جاتی ہے اور اپنے چہرے سے ردائے خاکی الٹ کر فرش زمین سے اپنا سر اٹھاتا ہے، تو پھر اس کی بیدار روح پر دوبارہ نوم و غفلت کی حالت طاری نہیں کی جاسکتی۔ اگر اس کی بیداری و عمل کی راہ روکی جاتی ہے تو وہ اپنے نشو و نمائے حیات کے لیے اپنے ہی گرد و پیش سے سروسامان حیات فراہم کرلیتا ہے۔ دہلی میں نظارۃ المعارف القرآنیہ (۱۹۱۳ء) کا قیام اسی سنت الٰہی کے مطابق تھا۔ انقلاب سیاسی کا جو بیج نئے موسم میں حضرت قاسم العلوم نے زمین کے سپرد کیا تھا، اور حضرت شیخ الہند کے دورِ حیات میں اس نے نوم و غفلت سے بیداری کی کروٹ لی تھی اور فرش زمین سے اپنا سر اٹھایا تھا، دور عبیدی (اگست ۱۹۴۴ء) و حسینی (دسمبر ۱۹۵۷ء) میں اس کے انقلابی اثرات نے اسلامیان ہند کی پوری سیاسی و سماجی اور مذہبی زندگی کا احاطہ کرلیا تھا۔

ٹھیک اسی زمانے میں جب کہ مولانا عبیداللہ سندھی اپنے استاد حضرت شیخ الہند مولانا محمود حسن کے مشورے سے دہلی میں نظارۃ المعارف القرآنیہ کے قیام سے ایک نئے دور کا آغاز کررہے تھے، اودھ کے مرکز لکھنو میں ملی خدمت کے سفر کے لیے ایک اور کارواں کی ترتیب و تنظیم کا سروسامان ہورہا تھا۔ تاریخ ملی میں اس کارواں نے ''انجمن خدام کعبہ'' کا نام پایا ہے۔

اس انجمن کی تاریخی اہمیت ہے۔ اس کی ایک اہم خصوصیت یہ ہے کہ امام الہند مولانا ابوالکلام آزاد نے جماعت ''حزب اللہ'' کے اغراض و مقاصد کا اظہار اور اس کی تشکیل کا فیصلہ انجمن خدام کعبہ کے قیام و مقاصد کے اعلان کے بعد فرمایا۔ اگرچہ مولانا مرحوم حزب اللہ کے مقاصد کا تعین اور اس کے قیام کا فیصلہ بہت پہلے کرچکے تھے حزب اللہ کے مقاصد کی جامعیت اور اس کے خصائص کو تو اس عہد کی کوئی انجمن نہیں پہنچتی، لیکن دوسری انجمنوں کی اہمیت اور ان کی اپنی خدمات ہیں جن کا اعتراف کرنا چاہیے۔

اس انجمن کی تاریخ قیام ومقاصد، خدمات اور اس کے دائرۂ اثر درسوخ کے تذکرے میں ''انجمن خدام کعبہ'' کے نام سے ایک تالیف ادارۂ تحقیقات افکار وتحریکات ملی، کراچی (۱۹۸۷ء) نے شائع کی ہے تفصیلی مطالعے کے لیے اس سے رجوع کرنا چاہیے۔ (ا۔س۔ش)

الہلال، کلکتہ: کا اجرا:

۱۳ر جولائی ۱۹۱۲ء: مولانا ابو الکلام آزاد نے الہلال پریس'' قائم کیا اور ۱۹۱۲ء میں ''الہلال'' کے نام سے ایک ہفتہ وار اخبار جاری کر دیا۔ (اس کا پہلا نمبر ۱۳ر جولائی کو نکلا تھا) اس کی اشاعت سے اردو صحافت کی تاریخ کا ایک نیا دور شروع ہوتا ہے۔ اس اخبار کو قلیل مدت کے اندر بے نظیر ہر دل عزیزی حاصل ہوئی۔ پبلک کے لیے صرف اس کی اعلیٰ طباعت اور گیٹ اپ ہی باعث کشش نہ تھا، بلکہ اس سے زیادہ قومیت کا وہ قومی جذبہ تھا، جس کی وہ دعوت دیتا تھا۔'' ''الہلال'' نے عوام میں ایک انقلابی تحریک پیدا کر دی اور لوگوں میں وہ ایسا مقبول ہوا اور اس کی اتنی مانگ ہوئی کہ تین مہینوں کے اندر اندر اس کے تمام ابتدائی نمبروں کو دوبارہ شائع کرنا پڑا۔ اس لیے کہ ہر نیا خریدار چاہتا تھا کہ اس کے پاس ابتدائی نمبروں کا بھی مکمل سیٹ ہو۔

مسلمانوں کی سیاسی رہنمائی اس وقت تک علی گڑھ پارٹی کے ہاتھ میں تھی، اس کے نمائندے اپنے آپ کو سرسید کی پالیس کا امین سمجھتے تھے۔ ان کی سیاسی پالیسی کا بنیادی نکتہ یہ تھا کہ مسلمانوں کو بہرصورت برطانوی تاج کا وفادار اور قومی تحریک اور سیاسی جدوجہد سے الگ تھلگ رہنا چاہیے۔ جب ''الہلال'' نے اپنی صدائے حق بلند کی اور بالکل ایک دوسری قسم کی دعوت دی، تو انھیں محسوس ہوا کہ ان کی جاہ وعزت خطرے میں ہے، اس لیے انھوں نے ''الہلال'' کی دعوت کی شدید مخالفت کی۔ یہاں تک کہ ایڈیٹر کو قتل کر دینے کی دھمکی دی، لیکن بعض مقتدر رہنماؤں کی مخالفت کے باوجود ''الہلال'' روز بروز ہر دل عزیز ہوتا چلا گیا۔ دو سال کے اندر ''الہلال'' کی اشاعت ۲۶ ہزار فی ہفتہ ہوگئی۔ اس وقت تک اردو صحافت کی تاریخ میں اس تعداد اشاعت کا کسی کو گمان بھی نہ ہوا ہوگا۔

''الہلال'' کی اس کامیابی کو دیکھ کر حکومت کو تشویش ہوئی۔ اس نے دو ہزار کی ضمانت طلب کی۔ اس خیال سے کہ شاید اس طرح ''الہلال'' کے انداز بیان میں کچھ فرق پیدا ہو جائے۔ اس ہلکی سی چبھن کا مولانا آزاد کی ہمت پر کچھ اثر نہ پڑا۔ جلد ہی حکومت نے ضمانت ضبط کر لی اور دس

ہزار کی مزید ضمانت کا مطالبہ کیا۔ اس دوران میں ۱۹۱۴ء کی جنگ چھڑ گئی تھی۔ ۱۹۱۵ء میں الہلال پریس ضبط کر لیا گیا۔ پانچ مہینے بعد مولانا نے ''البلاغ'' کے نام سے ایک نیا پریس قائم کیا اور اسی نام کا اخبار نومبر ۱۹۱۵ء سے جاری کر دیا۔ حکومت کو اب احساس ہوا کہ پریس ایکٹ کے ماتحت کارروائی کر کے مولانا سرگرمیوں کو بند نہیں کیا جا سکتا، اس لیے اس نے ڈیفنس آف انڈیا ریگولیشنز سے کام لے کر مولانا کو کلکتہ چھوڑ دینے کا حکم دیا۔ ان ہی ریگولیشنز کے تحت پنجاب، دہلی، یوپی اور بمبئی کی حکومتوں نے مولانا کو اپنے حدود کے اندر داخل ہونے کی پہلے ہی ممانعت کر دی تھی۔ اب مولانا صرف بہار جا سکتے تھے۔ چناں چہ مولانا رانچی چلے گئے۔ چھ مہینے بعد، مولانا کو رانچی میں نظر بند کر دیا گیا یہ سلسلہ ۳۱ر دسمبر ۱۹۱۹ء تک جاری رہا۔ یکم جنوری ۱۹۲۰ء کو مولانا بھی دوسرے نظر بندوں اور قیدیوں کے ساتھ شاہِ انگلستان کے اعلان کے تحت رہا کر دیے گئے۔

صلح نامۂ توران:

۱۸ر اکتوبر ۱۹۱۲ء: اطالوی اس صورت حال سے بدحواس ہو گئے۔ انھوں نے شجاعت کا جواب درندگی سے دینا شروع کیا اور ایسے مظالم کیے کہ خود یورپین نامہ نگاروں نے جو اٹالین فوج کے ساتھ طرابلس میں تھے، ان کے خلاف صدائے احتجاج بلند کی۔ لیکن جب اس سے بھی کام نہ چلا تو وہ زیادہ زور بحری جنگ پر دینے لگے۔ چناں چہ مئی ۱۹۱۲ء میں روڈس اور بعض دوسرے جزائر اَیجین پر قبضہ کر لیا۔ انھیں توقع تھی کہ ترک اب آسانی کے ساتھ صلح کے لیے راضی ہو جائیں گے۔ لیکن ترکوں نے صلح کرنے سے قطعی طور پر انکار کر دیا۔ وہ اس وقت تک جنگ کو جاری رکھنے کا عزم کر چکے تھے، جب تک دشمنوں کو شکست دے کر بھگا نہ دیں۔ لیکن بدقسمتی سے اس درمیان میں البانیا میں بغاوت برپا ہو گئی اور پھر بلقان کے افق سے ایک متحدہ اور خوفناک جنگ کے بادل اٹھتے ہوئے دکھائی دینے لگے۔ ان حالات کے پیش نظر باب عالی نے بادل ناخواستہ صلح کی گفتگو شروع کی اور ۱۹۱۲ء اکتوبر ۱۸ر کو صلح نامہ پہ محاربین کے دستخط ہو گئے۔ طرابلس پر اٹلی کا قبضہ تسلیم کر لیا گیا۔ اٹلی نے وعدہ کیا کہ بحر ایجین کے مفتوحہ جزائر دولت علیہ کو واپس کر دے گا۔ لیکن یہ وعدہ کبھی شرمندۂ ایفا نہ ہوا۔

بلقانی ریاستوں کا اتحاد اور جنگِ بلقان:

جس خطرے کو محسوس کر کے ترکوں نے اٹلی سے صلح کی تھی وہ بہت جلد سامنے آ گیا۔ ریاست

ہائے بلقان نے تاریخ میں پہلی بار متحد ہو کر سلطنت عثمانیہ کے خلاف اعلان جنگ کر دیا۔ جنگ بلقان بقول خالدہ ادیب خانم گویا جنگ عظیم کی ایک مشق تھی۔ دونوں کی تیاری اور تحریک میں روس کے وزیر خارجہ اسوویسکی کی عقل شیطانی کارفرما تھی۔ اسوویسکی نے یہ تدبیر سوچی کہ بلقانی ریاستوں کو متحد کر کے ترکوں کو بلقان سے نکال دے اور پھر آبنائے باسفورس اور قسطنطنیہ پر قبضہ کر لے۔ چناں چہ اسی کوشش سے مارچ ۱۹۱۲ء میں سرویا اور بلغاریہ میں ترکی کے خلاف ایک معاہدہ ہوا۔ اسوویسکی نے اس معاہدے کی اطلاع فرانسیسی وزیر خارجہ موسیو پوانکارے کو دی اور لکھا کہ ابھی یہ کسی پر ظاہر نہ کیا جائے۔ بلغاریہ کو ۱۸ کروڑ فرانک سامان جنگ فراہم کرنے کے لیے قرض دیا گیا۔

(ترکی میں مشرق و مغرب کی کشمکش ص ۸۲-۸۳) دولت عثمانیہ ص ۳۰۷)

اس معاہدے کی ایک خفیہ دفعہ کی رو سے یہ طے پایا کہ اگر مقدونیہ کا کوئی حصہ فتح ہو جائے تو جو علاقے ان دونوں ریاستوں سے متصل واقع ہیں وہ ان میں شامل کر دیے جائیں اور درمیانی علاقوں کی تقسیم روس کے فیصلہ پر چھوڑ دی جائے۔ (ایور سلے، ص ۳۵۷)

روس ہی کی وساطت سے مئی ۱۹۱۲ء میں یونان اور بلغاریہ کے درمیان بھی ایک معاہدہ ہو گیا۔ یہ سرویا اور بلغاریا کے معاہدے سے ایک خاص امر میں مختلف تھا یعنی اس میں مقدونیہ کی تقسیم کا کوئی ذکر نہ تھا۔ (میریٹ، ص ۴۴۷) دولت عثمانیہ ص ۳۰۷

پھر ستمبر ۱۹۱۲ء میں سرویا اور مونٹی نیگرو کے درمیان بھی ایک معاہدہ ہوا، جس میں طے پایا کہ فریقین ترکی سے علاحدہ علاحدہ جنگ کریں اور کسی ترکی شہر یا گاؤں پر سرویا اور مونٹی نیگرو کی فوجیں متحدہ طور پر قابض نہ ہوں۔

البانیہ کی بغاوت:

ان معاہدوں کے بعد اتحادی (انگلستان، روس، فرانس) چاہتے تھے کہ جنگ جلد از جلد شروع کر دیں۔ طرابلس کی جنگ جاری تھی اور وہ اس موقع سے فائدہ اٹھانا چاہتے تھے۔ دوسری طرف البانیا کی بغاوت سے مقدونیہ کی تقسیم کا مسئلہ جو اس اتحاد کی اصلی غرض اور غایت تھی، بہت مشکل ہوتا نظر آرہا تھا۔ البانیہ کا مطالبہ حکومت خود اختیاری تھا۔ وہ ستوطری، یانینا، مناستر اور قوصوہ کی ولایتوں کو متحد کر کے دولت علیہ عثمانیہ کے زیر سیادت ایک خود مختار مملکت قائم کرنا چاہتا تھا۔

ابتدا میں انجمن اتحاد و ترقی نے البانیہ کی بغاوت کی طرف زیادہ توجہ نہیں کی۔ لیکن جب سلطنت کی فوج نے بھی جو البانیہ میں تھی باغیوں کا ساتھ دینا شروع کیا اور جون ۱۹۱۲ء میں مناستر کے فوجی دستے نے علانیہ بغاوت کر دی اور موجودہ وزارت توڑ دینے کا مطالبہ کیا تو البانیا کا مسئلہ اپنی پوری اہمیت کے ساتھ حکومت کے سامنے آیا۔ نتیجہ یہ ہوا کہ جولائی میں محمود شوکت پاشا نے استعفا دے دیا اور ان کی جگہ ناظم پاشا جو انجمن اتحاد و ترقی کا شاید مخالف تھا وزیر جنگ مقرر ہوا۔ اگست میں حلمی پاشا صدر اعظم کو بھی استعفا دینا پڑا۔ باغیوں کی یہ کامیابی دیکھ کر بلقانی ریاستوں کو یہ خطرہ ہوا کہ ممکن ہے البانیہ ایک خود مختار مملکت تسلیم کر لی جائے اور سقوطری، یانینا، مناستر اور قوصوہ کی ولایتیں اس میں شامل کر دی جائیں۔ اگر ایسا ہوا تو ان ریاستوں میں سے ہر ایک کو اس علاقے سے محروم ہونا پڑے گا، جس کی وہ خصوصیت کے ساتھ خواہش مند تھی۔ چناں چہ اس خوف سے کہ کہیں یہ موقع ہاتھ سے نہ نکل جائے انھوں نے عجلت کی اور ۸/ اکتوبر ۱۹۱۲ء کو شاہ نکولس والی مونٹی نیگرو نے باب عالی کے خلاف اعلان جنگ کر دیا۔

بلقان کا اعلان جنگ:

اس زمانے میں ترکی کی اندرونی حالت بہت نازک تھی۔ قدامت پسند گروہ نوجوان ترکوں کی انتہا پسندی کا مخالف تھا۔ خود حکمراں جماعت میں پھوٹ پڑ گئی تھی۔ فوج کے اس حصے کو جو قدامت پسند تھا غلبہ حاصل ہو گیا تھا۔ محمود شوکت پاشا کے استعفا دینے کے بعد فوج کی تنظیم بوڑھے افسروں کے ہاتھ میں چلی گئی تھی، جو قابلیت میں نوجوان ترکوں سے بہت کم تھے۔ کامل پاشا صدر اعظم تھا اور اسے انگلستان کی حمایت پر اس قدر یقین تھا کہ وہ بلقان کے خطرے کو زیادہ اہم نہیں خیال کرتا تھا اسے یقین تھا کہ انگلستان بلقان پر حملہ نہ ہونے دے گا۔ اسی یقین کی بنا پر اس نے ۱۹۱۲ء میں (۶۷) ہزار تربیت یافتہ فوج کو جو بلقان کی سرحد پر جمع تھی، منتشر کر دیا۔ لیکن جب جنگ چھڑ جانے میں کسی شبہے کی گنجائش نہ رہی تو یورپین حکومتوں سے مداخلت کی درخواست کی گئی۔ چناں چہ ستمبر میں روس اور آسٹریا نے دول عظمیٰ کی طرف سے ایک احتجاجی نوٹ اتحادیوں کے پاس بھیجا۔ ظاہر ہے کہ اسوویسکی کی سازشوں کے بعد اس احتجاج کا اثر کیا ہو سکتا تھا۔ یہ دیکھ کر کہ دولت علیہ اپنی کمزوری محسوس کر رہی ہے پہلے مونٹی نیگرو اور پھر دوسری ریاستوں نے اعلان جنگ کر دیا۔ ترکی کے پاس ایک لاکھ فوج تھی اور وہ بھی زیادہ تر نئے رنگروٹوں کی۔ بلغاریہ کی فوج

؛ایک لاکھ اسی ہزار تھی۔ سردیا کی اسی ہزار، یونان کی پچاس ہزار
ان ریاستوں نے سلطنت عثمانیہ سے علاحدہ ہونے کے بعد اپنی تنظیم یورپین حکومتوں کے طرز پر کر لی تھی اور ان کی فوجیں یورپ کے فوجی نظام کے مطابق تربیت یافتہ تھیں۔ برخلاف اس کے نوجوان ترک ملک کی اصلاح کافی طور پر نہ کر سکے تھے۔ جس کا ایک سبب تو یہ تھا کہ انھیں عنانِ حکومت ہاتھ میں لیے ہوئے صرف چار ہی سال گزرے تھے اور دوسری بڑی وجہ قدامت پسند گروہ کی مخالفت تھی۔ نئے قانون کے مطابق ترکی فوج میں عیسائی اور یہودی بھی بھرتی کیے گئے تھے۔ ان کو فوجی خدمت جس سے وہ اب تک بالکل بری تھے، نہایت شاق تھی۔ چناں چہ جب لڑائی شروع ہوئی تو انھیں عیسائی اور یہودی سپاہیوں نے دھوکا دیا اور سب سے پہلے میدان سے بھاگ کھڑے ہوئے۔ ایک تو عثمانی فوجوں کی تعداد اتحادیوں کے مقابلے میں یونہی کم تھی دوسرے عیسائیوں اور یہودیوں کی غداری سے اور زیادہ نقصان پہنچا۔

جنگِ بلقان:

اتحادیوں نے جنگ کا مقصد سلطنت عثمانیہ کے عیسائی صوبوں کی اصلاح حال ظاہر کیا تھا مگر حقیقتاً ان کے پیش نظر ذاتی اغراض تھیں۔ یونان، کریٹ اور بحر ایجین کے دوسرے جزیروں پر قبضہ کرنے کے علاوہ خود براعظم پر بھی اپنی سرحدوں کی توسیع کا خواہش مند تھا۔ بلغاریہ کو اس بلغاریۂ عظمیٰ کی آرزو تھی جس کا نقشہ صلح نامہ سان اسٹیفانو میں مرتب کیا گیا تھا۔ سردیا ان تمام علاقوں کو اپنے اندر شامل کر لینا چاہتا تھا کہ جو اسٹیفن ڈوشن کے زمانے میں اس کی قدیم سلطنت کے جزو تھے۔ وہ یہ بھی چاہتا تھا کہ اس کی مملکت کے حدود بحر ایجین اور بحر ایڈریاٹک کے ساحلوں تک پہنچ جائیں۔ مونٹی نیگرو کی نظر البانیا کے ایک حصے پر تھی۔ (لارڈ ایور سلے ص ۳۵۹ و دولت عثمانیہ ص ۳۱۰)

۸؍اکتوبر کو مونٹی نیگرو نے اعلان جنگ کر دیا۔ بقیہ ریاستوں نے ۱۸؍اکتوبر کو اعلان کر کے اسی روز اپنی فوجیں عثمانی مقبوضات کی طرف روانہ کیں۔ حملے کا سب سے زیادہ زور بلغاریہ کی طرف سے تھا جس کا مقصد خود قسطنطنیہ پر قبضہ کرنا تھا۔ چناں چہ ۱۸؍اکتوبر کو بلغاری فوجیں تھریس میں داخل ہوئیں اور ۲۲؍اکتوبر کو قرق کلیسا اور ۲۸؍ کو لولو برگاس کے معرکوں میں ترکوں کو شکست دی۔ عثمانی فوج نے شتلجہ کے حصار میں پناہ لی جو قسطنطنیہ سے تقریباً بیس میل کے فاصلہ پر واقع

ہے۔ بلغاریوں نے شتلجہ پر کئی حملے کیے مگر نقصان اٹھا کر پسپا ہونا پڑا۔ وسط نومبر تک ادرنہ کے سوا تھریس کے اور تمام حصوں پر ان کا قبضہ ہو گیا۔ اس درمیان میں مونٹی نیگرو، سرویا، اور یونان نے بھی متعدد فتوحات حاصل کر لی تھیں۔ سرویا کی فوجیں سرحد عبور کر کے قدیم سرویا میں داخل ہوئیں۔ کسانو دو کے میدان میں ۲۳؍اکتوبر کو ترکوں سے مقابلہ ہوا۔ دو روز تک جنگ جاری رہی۔ آخر میں ترکوں کو شکست ہوئی۔ سروی فوجوں نے اسکوب پر قبضہ کر لیا، جو ان کی قرونِ وسطیٰ کی سلطنت کا پایۂ تخت تھا۔ اس کے بعد وہ مقدونیا میں بڑھتی ہوئی مناستر تک پہنچ گئیں۔ دوسری طرف نیگرو کی فوجوں نے سقوطری کے زبردست قلعے کا محاصرہ کر لیا۔ یونانیوں کی فتوحات کا بھی یہی حال تھا۔ وہ بھی قریب قریب ہر معرکے میں کامیاب رہے۔ ۸؍نومبر کو یونانی فوجوں نے سالونیکا پر قبضہ کر لیا مگر ان کی بحری فتوحات زیادہ اہم تھیں۔ آخر نومبر تک بحرِ ایجین کے تقریباً تمام عثمانی جزائر پر یونان کا قبضہ ہو گیا تھا۔ ترکی بحریہ کی کمزوری بری فوجوں کی حالت سے بھی زیادہ افسوس ناک ثابت ہوئی۔''

(نقشِ حیات: حصہ دوم، ص ۲۹۔۱۲۵)

یوروپ کا عہد ناموں کا پابند ہونا:

آغازِ جنگ میں دول عظمیٰ نے اعلان کیا تھا کہ خواہ کوئی فریق بھی کامیاب ہو، بلقان کی موجودہ حالت برقرار رکھی جائے گی۔ اس اعلان کا سبب یہ تھا کہ انھیں ترکی کی کامیابی کا قوی اندیشہ تھا اور جس طرح ۱۸۹۷ء میں انھوں نے ایک ایسے ہی اعلان سے یونان کی پشت پناہی کی تھی اور ترکوں کو یونانی فتوحات سے دست بردار ہونا پڑا تھا۔ اسی طرح ریاست ہائے بلقان کا تحفظ بھی پہلے ہی کر لیا گیا تھا۔ لیکن جب خلاف توقع عثمانی فوجوں کو تقریباً ہر معرکے میں شکست ہوئی اور دشمن حیرت انگیز طور پر کامیاب ہونے لگے تو انھیں زبانوں نے جو یہ اعلان کر چکی تھیں، اب اس کے خلاف آواز اٹھائی اور یہ کہا جانے لگا کہ بلقانیوں کو ان کی فتوحات سے محروم کر دینا ہرگز قرینِ انصاف نہیں۔ مسٹر ایسکو ۔تھ وزیر اعظم برطانیہ نے دول عظمیٰ کی ترجمانی کرتے ہوئے فرمایا:
''مشرقی یورپ کے نقشہ کو از سرِ نو مرتب کرنا ضروری ہے اور فاتحین کو ان ثمرات سے محروم نہیں کرنا چاہیے جو اتنی گراں قیمت پر انھیں حاصل ہوتے ہیں۔'' (ملر، ص ۵۰۴ و دولت عثمانیہ، ص ۳۱۳)

عارضی صلح:

دول عظمیٰ کی تحریک پر ۳؍دسمبر (۱۹۲۰ء) کو ترکی اور بلغاریہ اور سرویا کے درمیان ایک عارضی

صلح ہوگئی۔ یونان اور مونٹی نیگرو سے جنگ جاری رہی۔ اب تک جنگ کا نتیجہ یہ تھا کہ ترک مقدونیا اور تقریباً تمام تھریس اور ایپائرس سے خارج ہو چکے تھے۔ قسطنطنیہ کے علاوہ یورپ میں صرف ادرنہ یانینا اور سقوطری پران کا قبضہ باقی رہ گیا تھا۔ لیکن یہ تینوں شہر بھی دشمن کے محاصرے میں تھے۔

صلح کانفرنس لندن:

۱۶ر دسمبر ۱۹۱۲ء کو لندن میں صلح کانفرنس کا اجلاس شروع ہوا۔ ادرنہ (ایڈریانوپل) کے مسئلے پر سب سے زیادہ مشکل پیش آئی اور یہی مسئلہ کانفرنس کی ناکامی کا باعث ہوا۔ بلغاریہ نے مستقل صلح کے لیے ادرنہ کے حصول کو ایک لازمی شرط قرار دیا تھا۔ باب عالی اس پر راضی نہ تھا۔ لیکن جب ۱۷ر جنوری ۱۹۱۳ء کو دول عظمٰی کی طرف سے ایک نوٹ باب عالی میں بھیجا گیا اور اس میں یہ مشورہ دیا گیا کہ ادرنہ ریاست ہائے بلقان کے حوالے کر دیا جائے اور جزائر ایجین کا مسئلہ دول عظمٰی کے فیصلے پر چھوڑ دیا جائے تو صدر اعظم کامل پاشا نے جو کہ انگلستان کا دوست تھا ترکی کی کمزوریوں کا لحاظ کرتے ہوئے اس مشورے کو قبول کرنے پر آمادگی ظاہر کی۔ قریب تھا کہ مجلس وزرا کامل پاشا کی اس تحریک سے متفق ہو کر دول عظمٰی کے نوٹ کا جواب روانہ کر دے اور ترکی کے قتل نامے پر خود اسی کی مہر ثبت کر دی جائے کیوں کہ ادرنہ سے دست برداری حقیقتاً قسطنطنیہ کی دست برداری کا مقدمہ ہوتی۔ لیکن عین وقت پر ایک غیبی ہاتھ نمودار ہوا جس نے مجلس وزرا کی یاد داشت کو جو دول عظمٰی کے پاس جانے کے لیے مرتب ہو چکی تھی، ٹکڑے ٹکڑے کر کے خود موجودہ وزارت کا خاتمہ کر دیا۔ اس کے بعد جو وزارت قائم ہوئی اس نے ادرنہ کو حوالے کرنے سے قطعاً انکار کر دیا، جس کے بعد ہی صلح کانفرنس بھی برخاست ہو گئی۔ (دولتِ عثمانیہ، ص ۳۱۴)

انقلابِ وزارت:

یہ انقلابِ وزارت اسی بطل حریت کا رہین منت تھا جس نے ۱۹۰۸ء میں ملک کو سلطان عبدالحمید کے استبداد سے نجات دلا کر دستوری حکومت قائم کر دی تھی۔ انور بے طرابلس کی مہم سے فارغ ہو کر قسطنطنیہ پہنچ چکے تھے۔ اسی خاموشی اور جرأت کے ساتھ جو ۱۹۰۸ء کے انقلاب میں اس درجہ کامیاب ہوئی تھی وہ چند جانفروشوں کو لے کر دفعتہً ایوان وزارت میں داخل ہوئے۔ ان کے ہاتھ میں ایک کاغذ تھا جس پر افسران جنگ اور عام پبلک کے دستخط تھے اور اس میں تبدیل وزارت

یا انکار صلح پر زور دیا گیا تھا۔ فوج کا جو حصہ وزارت کے ہاتھ میں تھا اسے پہلے ہی کسی بہانے سے قسطنطنیہ سے باہر بھیج دیا گیا تھا اور جس قدر فوج شہر میں تھی وہ سب قومی جماعت کی ساتھ تھی، جس کی سیادت انور بے کر رہے تھے۔ وزراان حالات سے بے خبر اپنے کام میں مشغول تھے کہ انور بے اندر داخل ہوئے۔ ناظم پاشا وزیر جنگ کے اے ڈی کانگ نے اس جماعت کو روکنے کی کوشش کی اور پستول چلائی معاً دوسری طرف سے بھی گولی چلی اور ناظم پاشا گر کر وہیں ٹھنڈا ہو گیا۔ بہت جلد انور بے نے وزارت خانے پر قبضہ کر لیا۔ کامل پاشا کو استعفا دینا پڑا۔ اس کی جگہ محمود شوکت پاشا صدر اعظم مقرر ہوئے۔ (دولتِ عثمانیہ ص ۳۱۵)

البانیہ کی آزادی:

عین اس وقت جب کہ بلقانی ریاستیں لڑ رہی تھیں اہل البانیا نے ولونا میں ایک مجلس منعقد کر کے سلطنتِ عثمانیہ سے اپنی کامل آزادی کا اعلان کر دیا۔ ان کو خطرہ تھا کہ اگر ایسا نہ کیا گیا تو البانیا کا بھی وہی حشر ہوگا جو بلقان کے دوسرے عثمانی مقبوضات کا ہونے والا ہے۔ اس اعلان سے دول عظمیٰ کے ہاتھ مضبوط ہو گئے اور انھوں نے لندن کانفرنس میں نہ صرف یہ کہ سرویا کو مجبور کر کے البانی بندرگاہوں سے دستبردار کرایا بلکہ البانیا کا استقلال بھی باضابطہ طور پر تسلیم کر لیا۔ البانیا ایک خود مختار ریاست قرار دی گئی جس کے فرمانروا کا انتخاب دول عظمیٰ کے فیصلے پر رکھا گیا۔ اس فرمانروا کی مدد کے لیے ایک بین الاقوامی کمیشن کا تقرر طے ہوا۔ سرحدوں کی تعین بھی ایک خاص کمیشن کے سپرد کی گئی۔ (یہ صوبۂ البانیا ارنوط قوم کا وطن ہے جو کہ ترکی مملکت میں نہایت زیادہ بہادر اور سلطان عبدالحمید مرحوم کے خصوصی محافظ تھے اور سب کے سب مسلمان ہیں) انھیں کی بغاوت اور البانی فوج کی ہمدردی اور مطالبہ تبدیل وزارت کی بناء پر محمود شوکت نے استعفاء دیا تھا اور کامل پاشا کی وزارت قائم ہوئی تھی۔

۱۹/اپریل ۱۹۱۳ء: لندن صلح کانفرنس تبدیلی وزارت کی وجہ سے ناکام ہو کر چوں کہ ٹوٹ گئی تھی تو عارضی صلح بھی جاتی رہی اور پھر تمام بلقان میں جنگ جاری ہو گئی۔ وزارت جدیدہ اس قلیل مدت میں کوئی معتدبہ انتظام نہ کر سکی جس کی وجہ سے جو مقامات بلقان میں ترکون کے پاس باقی رہ گئے تھے، وہ بھی ہاتھ سے نکل گئے۔ بالآخر ۱۹/اپریل ۱۹۱۳ء کو ترکوں اور بلغاریوں میں بولیر میں عارضی طور پر صلح ہوئی اور مستقل صلح کے لیے لندن میں دوبارہ صلح کانفرنس کے انعقاد کی کوشش

شروع کی گئی۔ چناں چہ کانفرنس کا انعقاد ہوا اور بہت زیادہ بحث اور گفتگو کے بعد ۳۰ رمئی کو صلح نامہ لندن پر فریقین کے دستخط ہو گئے۔ جس کی بنا پر یورپین ترکی کے تمام علاقے بہ استثناء البانیا جو خط اینوس ومیڈیا کے مغرب میں واقع تھے ریاست ہائے بلقان کو دے دیے گئے۔ البانیا کی سرحدوں نیز اس کے متعلق تمام دوسرے مسائل کا فیصلہ دول عظمیٰ پر چھوڑ دیا گیا۔ کریٹ کے علاوہ اور تمام ''جزائر ایجین'' کی قسمت کا فیصلہ بھی دول عظمیٰ ہی پر چھوڑا گیا۔ باب عالی نے کریٹ کا الحاق یونان سے منظور کرلیا۔ مالی معاملات کا تصفیہ پیرس کے بین الاقوامی کمیشن کے سپرد کیا گیا اور حکومتی اختیارات قومیت اور تجارت کے مسائل کا مخصوص معاہدوں سے طے ہونا قرار پایا۔ (ملز، ص ۵۰۸-۹ و دولت عثمانیہ ص ۳۱۸ بہ حوالہ نقش حیات: حصہ دوم، ص ۳۲-۱۳۰)

جنگ تقسیم بلقان:

۲۹ رجون ۱۹۱۳ء: ترکی یورپین علاقوں کی تقسیم میں جو کہ دوسری لندن کانفرنس میں ریاست بلقان کو دے دیا گیا تھا، نہایت زیادہ اختلاف ہوا۔ ہر ایک اپنے لیے زیادہ سے زیادہ چاہتا تھا اور ایسے مقام کو انتخاب کرتا جو کہ دوسرے کے نزدیک بہت اہم اور ضروری تھا۔ یہاں تک کہ نوبت جنگ کی آگئی۔ اگر چہ اپنی اپنی کامیابی پر ہر ایک سرمست اور سرشار تھا مگر ان میں بلغاریہ سب سے زیادہ مغرور اور سرمست تھا اس نے حریفوں کی طاقت سے بے پروائی کرتے ہوئے ۲۹ رجون ۱۹۱۳ء کو آدھی رات میں بغیر کسی اطلاع یا اعلان جنگ کے یونانی اور سروی دستوں پر اعلان حملہ کر دیا۔ دوسرے روز ایک لاکھ بلغاری فوج نے اس سروی فوج پر جو کہ اس کے قریب تھی بلہ بول دیا۔ سروی فوج اس ناگہانی حملے سے پہلے تو پسپا ہوئی لیکن یکم جولائی کو مونٹی نیگرو کی مدد سے جم کر مقابلہ کیا۔

(بلغاریہ کے تیور دیکھ کر پہلے تو اتحادیوں (سرویا، مونٹی نیگرو، یونان، رومانیہ) نے آپس میں معاہدۂ اتحاد کرلیا تھا) اور ۲ رجولائی کو بلغاری فوج کو شکست دے کر اس کی بہت سی توپیں چھین لیں۔ ۴ رجولائی کو پھر مقابلہ ہوا اور پھر بلغاریہ کو شکست ہوئی۔

۸ رجولائی کو سروی فوج نے استیب پر قبضہ کرلیا اور اب بلغاری پسپا ہو کر اپنی سرحد کی طرف روانہ ہو گئے۔ اس درمیان میں یونانی فوجوں نے بھی پیشقدمی کر کے بلغاری فوج سے بمقام کلکیتش جنگ کی۔ بلغاری بری طرح ہارے۔ اس کے علاوہ متعدد لڑائیاں اور ہوئیں جن میں بلغاریوں کو لگاتار شکستیں کھانی پڑیں اور ان کے لیے صرف اپنی سرحد کی راہ کھلی رہ گئی۔ بلغاریہ کی اس نازک

حالت کو دیکھ کر ترکوں نے بھی فائدہ اٹھایا اور ۱۵ر جولائی کو انور پاشا تھریس میں داخل ہوئے اور ۲۰ر جولائی کو ادرنہ پر قبضہ کرلیا۔ اس کے بعد ڈیموٹیکا اور قرق کلیسا بھی انھوں نے دوبارہ فتح کرلیے۔

عارضی صلح:

جنگ تقسیم صرف ایک ماہ تک جاری رہی۔ لیکن اس قلیل مدت میں بلغاریہ کی حالت نہایت نازک ہوگئی۔ اس کی فوجوں کو ہر معرکے میں شکست ہوئی۔ دشمن کی فوجیں ہر طرف سے بڑھتی ہوئی آرہی تھیں۔ بالآخر اسے مجبور ہو کر دول عظمٰی سے صلح کی درخواست کرنی پڑی۔ ۳۱ر جولائی کو فریقین ایک عارضی صلح پر راضی ہوئے اور طے پایا کہ ایک صلح کانفرنس منعقد کی جائے، جس میں ریاست ہائے بلقان کے نمایندے شریک ہوں۔ لیکن دول عظمٰی کے نمایندے شرکت نہ کریں۔

صلح نامہ بخارست:

۱۰ر اگست ۱۹۱۳ء: بخارست میں صلح کانفرنس کا اجلاس ہوا۔......۱۰ر اگست ۱۹۱۳ء کو محاربین نے صلح نامے پر دستخط کردیے۔ سب سے زیادہ نقصان بلغاریہ کو برداشت کرنا پڑا۔ مقدونیہ (جس کے لیے اس نے جنگ تقسیم چھیڑی تھی) یونان اور سردیا میں تقسیم کردیا گیا اور اس کو تقریباً کلیتاً محروم کردیا گیا۔

دولتِ عثمانیہ کے ساتھ کوئی معاہدہ ۲۹ر ستمبر تک نہ ہوسکا۔ ۲۹ر ستمبر کو بالآخر باب عالی اور بلغاریہ کے درمیان بھی صلح ہوگئی۔ تھریس کا بڑا حصہ ترکوں کو واپس مل گیا۔ اس میں ادرنہ، ڈیموٹیکا اور قرق کلیسا کے اہم شہر شامل تھے۔ یورپ میں دولت علیہ کی کائنات صرف اسی قدر او رہ گئی تھی۔ باقی سارا علاقہ ریاست ہائے بلقان میں تقسیم ہوگیا۔

بلقان کی دونوں جنگوں میں ترکوں کے مقتولوں اور زخمیوں کا شمار ایک لاکھ نفوس کا کیا گیا اور مصارف ۸ کروڑ پونڈ کیا گیا ہے۔ علاقہ اور آبادی کے لحاظ سے اس کی آبادی میں سے بیالیس لاکھ انتالیس ہزار دو سو نفوس اس کی حکومت سے نکل گئے اور صرف دس ہزار آٹھ سو بیاسی مربع میل اس کی حکومت میں رہ گئے۔

مظالم بلقان پر ایک نظر:

خالدہ ادیب خانم بلقان کے نتائج اور اثرات میں منجملہ دیگر امور مندرجۂ ذیل

امور بھی تحریر فرماتی ہیں:

(الف) شکست کی مصیبت تو تھی ہی اس پر طرہ یہ ہوا کہ بلقانیوں نے مسلمانوں کی آبادی جو جنگ میں شریک نہیں تھی اور جس میں زیادہ تر عورتیں، بچے اور بوڑھے تھے، قتل کرنا شروع کردیا۔ اور یہ لوگ بھاگ بھاگ کر ترکی میں پناہ لینے لگے۔ اسیران جنگ کو قتل کرنا، ان کو فاقوں مارنا، ان کے ہاتھ پیر کاٹنا، عام باشندوں کو اذیت پہنچانا اور ان کا خون بہانا، ان سب چیزوں کی ابتداے زمانۂ حال میں بلقانیوں نے مسلمانوں کے مقابلے میں کیں۔ مغرب ان تمام ہولناک مظالم کو چپ چاپ دیکھا رہا۔

(ب) مگر جب بلقان کی ریاستوں نے ایک دوسرے کی عیسائی رعایا کے ساتھ بھی یہی حرکتیں شروع کیں تو مغرب سے مخالفت کی آواز اٹھی۔ دوسری جنگ بلقان کے بعد کارنیگی نے ایک بین الاقوامی کمیشن تحقیقات کے لیے بھیجا۔

(ج) جب ترکی عورتوں نے استنبول کے یونیورسٹی ہال میں جمع ہوکر یورپ کی بادشاہ بیگموں سے اپیل کی تھی کہ انسانی ہمدردی کی خاطر بلقان کی مسلم آبادی کی حمایت کریں تو جواب تک نہیں ملا تھا۔ ترکوں نے دیکھا کہ مسلمانوں کی فریاد سے یہ بے اعتنائی اور عیسائیوں کو اسی حال میں دیکھ کر یہ جوش وخروش تو ان پر بہت برا اثر پڑا۔ مقدونیہ سے ہزار ہا مسلمان بھاگ کر اناطولیہ میں آتے تھے اور اپنی مظلومی کی داستان سناتے تھے۔ اس کی وجہ سے اناطولیہ میں مسلمانوں اور عیسائیوں کے تعلقات جواب تک بہت اچھے تھے بہت خراب ہو گئے''۔

(ترکی میں مشرق ومغرب کی کشمکش، ص ۸۹۔۸۶، بحوالہ نقش حیات: حصہ دوم، ص ۳۵۔۱۳۴)

۱۲ر دسمبر ۱۹۱۲ء: بلقان کے خلاف ترکی کی ہمدردی میں شہر لکھنو میں والی رام پور جناب حامد علی خان کی زیرِ صدارت ایک زبردست جلسہ منعقد ہوا۔ جلسے کا مقصد ترکوں کے لیے چندہ جمع کرنا تھا۔ اس جلسے میں حکومت برطانیہ کے خلاف مولانا حسرت موہانی نے بڑی سخت تقریر کی۔ بے چارے والی رام پور نواب صاحب دم بخود جلسے کی صدارت کرتے رہے۔ اسی جلسے میں مولانا شبلی نعمانی نے مسلمانوں کی ''پولیٹیکل کروٹ'' کے عنوان سے ایک مختصر مگر ولولہ انگیز تقریر کی۔ تقریر کے بعد بلقان سے متعلق مندرجۂ ذیل نظم کچھ اس انداز سے پیش کی کہ مولانا خود چشم گریاں ہو گئے اور

سامعین کا یہ عالم ہوا کہ سسکیاں لے لے کر رونا شروع کر دیا۔ (حسرت موہانی...... ایک سیاسی ڈائری، ص ۵۳)

سید سلیمان ندوی نے لکھا ہے کہ علامہ شبلی کی سیاسی نظموں میں سب سے پہلے قابل ذکر وہ نظم ہے جو انھوں نے ''شہر آشوبِ اسلام'' کے نام سے جنگ بلقان کے زمانے میں لکھی تھی۔ یہ نظم ''رفاہِ عام لکھنؤ'' کے جلسے مین پڑھی گئی تھی اور جب پڑھی گئی تھی تو اس کا یہ اثر تھا کہ صدر سے لے کر پائیں تک ماتم برپا ہو گیا تھا۔ چوبیس اشعار کی یہ لاجواب نظم ''کلیات شبلی'' (اردو) میں موجود ہے۔ ابتدائی تین شعر ہیں:

حکومت پر زوال آیا تو پھر نام ونشان کب تک
چراغِ کشتۂ محفل سے اٹھے گا دھواں کب تک

قبائے سلطنت کے گر فلک نے کردئے پرزے
فضائے آسمانی میں اڑیں گی دھجیاں کب تک

مراکش جا چکا، فارس گیا، اب دیکھنا یہ ہے
کہ جیتا ہے یہ ٹرکی کا مریض خستہ جاں کب تک

آخر نظم کے چند شعر یہ ہیں:

زوالِ دولت عثمان زوالِ شرع و ملت ہے
عزیز و فکر فرزند و عیال و خانماں کب تک

پرستاران خاک کعبہ دینا سے اگر اٹھے!
تو پھر یہ احترامِ سجدہ گاہ قدسیاں کب تک

جو گونج اٹھے گا عالم شور ناقوسِ کلیسا سے
تو پھر یہ نغمۂ توحید وگلبانگ اذان کب تک

کہیں اڑ کر یہ دامان حرم کو بھی نہ چھو آئے
غبار کفر کی یہ بے محابا شوخیاں کب تک

حرم کی سمت بھی صید افگنوں کی جب نگاہیں ہیں
تو پھر سمجھو کہ مرغان حرم کے آشیاں کب تک

جو ہجرت کر کے بھی جائیں تو شبلی اب کہاں جائیں
کہ اب امن وامان شام ونجد وقیرواں کب تک

۲۳ر دسمبر ۱۹۱۲ء: ہز ایکسی لینسی وائسرائے بہادر لارڈ ہارڈنگ پر بہ وقتِ شاہی داخلۂ دہلی مین ایک شخص نے بمب پھینک کر ہلاک کرنا چاہا۔ وہ اگرچہ بچ گئے لیکن زخمی ہو گئے۔ لیڈی لارڈ ہارڈنگ جو اس وقت ان کے ساتھ تھیں محفوظ رہیں۔

۲۶ر دسمبر ۱۹۱۲ء: بانکی پور میں آل انڈیا کانگریس کا ستائیسواں سالانہ اجلاس آر این مدھولکار کی صدارت میں منعقد ہوا۔ اجلاس میں پریس پر پابندیوں کی پرزور مخالفت کی گئی اور ہندوستان کی آزادی وسلامتی پر تجویزیں پاس ہوئیں۔ صدر اجلاس نے خوب کارآمد تقریر کی۔ ان کی تقریر کے بعد ایک تار لارڈ ہارڈنگ کے نام بم کے حادثے پر بطور اظہار ہمدردی روانہ کیا گیا۔ ہندو مسلم اتحاد

پر خاص زور دیا گیا۔ (حسرت موہانی......ایک سیاسی ڈائری، ص ۵۵)

۳۱ر دسمبر ۱۹۱۲ء: مولانا محمد علی اور شوکت علی مسلم لیگ کونسل، یونیورسٹی فاؤنڈیشن اور ہلال احمر کے جلسوں میں شرکت کے لیے لکھنو تشریف لائے تھے۔ ۳۱ر دسمبر کو فرنگی محل میں مولانا عبدالباری سے ملاقات کی اور ایک انجمن خدام کعبہ کے قیام کا فیصلہ کیا۔ علی برادران کی مولانا عبدالباری سے یہ پہلی ملاقات تھی۔ اسی سفر کے موقع پر انجمن کے اغراض و مقاصد اور دستور کی تدوین کے ایک کمیٹی بنادی گئی۔

(انجمن خدام کعبہ، تاریخ قیام اور مقاصد خدمات از ڈاکٹر ابوسلمان شاہ جہان پوری، کراچی، ۱۹۸۷ء، صفحہ ۱۳)

حضرت شیخ الاسلام کا تیسرا سفرِ ہندوستان:

اپنے اعزہ و اقارب میں سے نکاح کے لیے کوئی اس وجہ سے راضی نہ ہوا کہ جب مدینۂ منورہ میں قیام ہے تو لڑکی وہاں چلی جائے گی اور پھر ملاقات نہ ہو سکے گی۔ باوجود انتہائی کوششوں کے ناکامی ہوئی تو خاندان کے باہر کوشش کی گئی اور جناب حافظ زاہد حسن صاحب امروہوی دامت برکاتہم کی کوشش سے حکیم غلام احمد صاحب بچھرایونی مرحوم راضی ہوگئے تھے۔ مگر انھوں نے دو شرطیں کیں۔ ایک تو یہ کہ بارات میں جملہ اکابر دیوبند معہ صاحبزادہ جناب حکیم مسعود احمد صاحب مرحوم تشریف لائیں اور دوسرے یہ کہ مدینۂ منورہ پہنچ جانے کے دو برس بعد لڑکی کو یہاں پہنچایا جائے اور چند دنوں لڑکی ہمارے پاس رہ کر پھر مدینۂ منورہ جائے۔ پہلی شرط تو حضرت شیخ الہند رحمۃ اللہ علیہ کی توجہ اور حکم سے بآسانی پوری ہوگئی تھی مگر دوسری شرط اگرچہ حضرت رحمۃ اللہ علیہ کے حکم پر مان لی گئی تھی مگر اس میں بہت تشویش تھی کہ اتنا بڑا سفر اور اس قدر مصاریف کس طرح آسان ہوں گے۔ چوں کہ نکاح کے بعد دو برس سے زیادہ ہندوستان میں ہی اقامت ہوگئی تھی تو حکیم صاحب مرحوم سے عرض کیا گیا کہ اب تو اتنی طویل مدت یہاں گزر گئی اور آپ نے تمام معاملات اطمینان بخش ملاحظہ فرمالیے۔ اب اس شرط کو ساقط کر دیجیے۔ مگر وہ نہ مانے۔ میرے مدینۂ منورہ پہنچنے کے ایک سال بعد ۱۳۳۰ھ میں وہ خود بھی حج کے لیے تشریف لائے اور مکان ہی پر ٹھہرے اور تمام معاملات اطمینان بخش دیکھے۔ اس پر بھی ان سے کہا گیا کہ اب تو آپ کو وہ شرط ساقط کر دینی چاہیے، آپ نے اپنی لڑکی سے ملاقات بھی کر لی اور ہر طرح سے معاملات دیکھ لیے

مگر وہ اس پر بھی راضی نہ ہوئے۔ فرمایا کہ میں اگر چہ مل لیا ہوں، مگر لڑکی کی ماں اور بہنوں کو بجز ملاقات کوئی وجہ تسلی کی نہیں ہو سکتی۔ اس لیے بمجبوری ان کی شرط پوری کرنی ضروری ہوئی۔ مدینۂ منورہ پہنچنے کے کچھ عرصے بعد برخوردار الطاف احمد پیدا ہوا تھا۔ کہا گیا کہ یہ بچہ ابھی بہت چھوٹا ہے۔ سفر طویل اور سخت ہے اس لیے بھی مناسب نہیں کہ حسب شرط سفر ہندوستان کیا جائے۔ مگر انھوں نے کچھ نہ مانا۔ بالآخر کچھ صورتیں مصاریف کی کر کے اوائل ۱۳۳۱ھ (۱۹۱۳ء) میں ہندوستان کے سفر کا ارادہ کیا گیا۔ چوں کہ حجاز ریلوے میں طلبہ اور ارباب علم کو حکومت ترکی کی طرف سے مفت ٹکٹ مل جایا کرتا تھا۔ ہمارے تعلقات ارباب دفاتر وغیرہ سے بہت وسیع ہو چکے تھے اس لیے حیفا تک ٹکٹ حاصل کرنے میں خرچ بہت کم ہوا۔

عزیزم وحید احمد مرحوم کی معیت:

بڑے بھائی مولانا صدیق احمد صاحب مرحوم ۱۳۳۰ھ (۱۹۱۲ء) میں بیمار ہو کر انتقال فرما گئے تھے۔ ان کی اگر چہ پہلی اور دوسری بیویوں سے اولادیں متعدد پیدا ہوئی تھیں مگر بجز پہلی اولاد وحید احمد مرحوم کے اور کوئی ان کی وفات کے

موجود نہ تھی۔ وحید احمد مرحوم اس وقت ترکی مدرسہ میں پڑھتا تھا اور علوم جدیدہ اور زبان ترکی میں اچھی طرح ماہر ہو چکا تھا۔ عربی کی بھی تعلیم ایک درجہ تک حاصل کر چکا تھا مگر وہ قابل اطمینان نہ تھی۔ میرے سفر ہندوستان اور وہاں تین برس قیام کی وجہ سے اس کی تعلیم عربی میں بہت خلل پڑ گیا تھا۔ بڑے بھائی صاحب مرحوم (اس کے والد) اس کی تعلیم اور تربیت پوری طرح نہیں کر سکتے تھے۔ ان کے دوسرے نکاحوں اور سوتیلی ماؤں کے معاملات کی وجہ سے نیز ان کے مغلوب الغضب اور زیادہ سخت ہونے کی بناء پر بھی طبعی طور پر اپنے والد مرحوم سے اس کو اتنا تعلق نہیں تھا بلکہ مجھ سے اور والد صاحب مرحوم سے اس کو زیادہ تعلق تھا۔ اسی بناء پر والد صاحب مرحوم نے اس کو ترکی اسکول میں داخل کر دیا تھا۔ مگر وہاں کے لڑکوں کی صحبت میں اس کے اعمال و اخلاق پر غیر مستحسن اثر پڑ رہا تھا۔ وہ طبعی طور پر نہایت ذہین تھا۔ زبان ترکی اور فنون جدیدہ ورائجہ میں وہ اپنے درجوں میں ممتاز رہتا تھا۔ مگر علوم جدیدہ اور فلسفۂ طبیعات اور یورپین فیشن کا جو زہریلا اثر مذہب کے خلاف اہل اسکول اور کالجوں پر پڑتا ہے، اس سے وہ بھی مسموم ہو رہا تھا۔ اس لیے والد صاحب مرحوم کا ارشاد ہوا کہ اس کو ہندوستان لے جا اور دارالعلوم دیوبند میں علوم عربیہ کی تکمیل کرا۔

اواخر محرم ۱۳۳۱ھ (دسمبر ۱۹۱۲ء) میں، میں اور وحید اور الطاف اور اس کی والدہ مرحومہ مدینۂ منورہ سے روانہ ہوکر تین چار دن میں حیفا ہوتے ہوئے پورٹ سعید پہنچے۔ وہاں چند روز ٹھہر کر ایک اٹالین جہاز میں بہ کرایہ پچپن روپے فی کس بمبئی روانہ ہوئے۔ جہاز میں مال تھا، مسافر بہت کم تھے، بالخصوص ڈیک کے مسافر صرف دو چار ہی تھے۔ اواخر (جنوری ۱۹۱۴ء) میں کراچی ہوتا ہوا یہ جہاز بمبئی پہنچا۔ وہاں سے متعلقین کو بچھراؤں پہنچا کر دیوبند پہنچا۔ الطاف مرحوم کی صحت اچھی تھی۔ چہرہ پر ذکاوت اور نجابت کے آثار نمایاں تھے۔ عورتوں کے ڈبے میں متعدد عورتیں اس کو گھور گھور کر دیکھتی تھیں۔ ایک عورت نے اس کی ماں سے کہا کہ یہ بچہ یہاں کا نہیں معلوم ہوتا۔ اس کی چہرہ کے چمک اور آثار یہاں کے بچوں جیسے نہیں ہیں۔ اس نے کہا یہ مدینۂ منورہ میں پیدا ہوا ہے اور حجرہ نبویہ علیٰ صاحبہا الصلوٰۃ والسلام میں وہاں کی عادت کے موافق چلہ کے بعد داخل کیا جاچکا ہے۔ اس پر اور بھی عورتوں نے اس کو گھور کر دیکھنا شروع کیا اور اس کی تیزی اور شوخی اور چہرہ کی نجابت وغیرہ کو سراہنے لگیں۔ تقدیر الٰہی کہ ان میں سے کسی کی نظر لگ گئی اور فوراً اس کو قے آئی اور بخار شروع ہوگیا۔ آگرہ جب گاڑی پہنچی تو اس کا بہت برا حال تھا۔ اسی بیماری کی حالت میں وہ اپنے ننھیال بچھراؤں پہنچا اور تپ دق میں مبتلا ہوگیا۔ حضرت حکیم رحیم اللہ صاحب مرحوم بجنوری کے علاج سے فائدہ ہوا مگر اصلی حالت نے آخر تک عود نہیں کیا۔ بالآخر مدینۂ منورہ لوٹنے کے چند مہینے بعد چیچک میں مبتلا ہوکر انتقال کر گیا۔

اس مرتبہ میرا قیام ہندوستان میں صرف چند مہینوں رہا۔ جس میں دیوبند میں رہنا زیادہ ہوا اور متعدد اسفار بھی پیش آئے۔ الطاف کی بیماری کی وجہ سے اطمینان نصیب نہیں ہوا۔

واپسی مدینۂ منورہ تیسری مرتبہ:

بہر حال اواخر ۱۳۳۱ھ (نومبر ۱۹۱۳ء) میں بطور حج بدل حجاج کے جہاز میں واپسی کا سامان کیا گیا۔ یہ وہ زمانہ ہے کہ جنگ عظیم شروع ہوچکی تھی۔ مگر ترکی اور برطانیہ کے درمیان اعلان جنگ نہیں ہوا تھا۔ اگرچہ خبریں گرم تھیں۔ اسٹیمر میں رات کو روشنی نہیں کی جاتی تھی اور آبدوزوں اور جنگی جہازوں کے خطرات ہمیشہ ظاہر کیے جاتے تھے۔ بہر حال دسویں یا بارھویں دن جدہ پہنچنا ہوا اور پھر مکہ معظمہ میں ایام حج میں قیام کرکے اونٹوں کی سواری سے مدینۂ منورہ ۱۳۳۲ھ محرم (دسمبر ۱۹۱۳ء) میں پہنچنا ہوا۔ اسی زمانے میں ترکی کا اعلان جنگ بھی ہوگیا اور فوج کشی وغیرہ کے

سامانوں اور جنگی تحفظات وغیرہ کا اثر حجاز میں اور بالخصوص حرمین شریفین میں شروع ہوگیا۔ میں متعلقین کے ساتھ مدینۂ منورہ پہنچ کر مشاغل تعلیمیہ وغیرہ میں حسب سابق مشغول ہوگیا۔ اسی اثناء میں جب کہ ترکی کی فوجیں حدود مصر کی طرف بھیجی جارہی تھیں اور مجاہدین منطوعین (والنٹیر وں) کی بھرتی کی جارہی تھی تو ترغیب جہاد کے لیے منافہ (۱) مدینۂ منورہ میں ایک بڑا جلسہ کیا گیا اور مجھ کو تقریر کرنے کی نوبت آئی۔ مگر یہ تقریر اردو میں تھی اور دوسرے حضرات نے بھی تقریریں کیں۔ مشہور خیری برادران بھی اس زمانے میں وہاں پہنچ گئے تھے۔ ان کی بھی تقریریں ہوئیں اور ایک مجمع مجاورین اہل ہند وغیرہ کا منطوع (والنٹیر) کور میں داخل ہوگیا۔ جن میں مولانا محمد جان قازانی اور مولانا حرمت اللہ قازانی بھی تھے۔ یہ ہر دو صاحبان روس کے باشندہ تھے اور بغرض تحصیل علوم دینیہ اولاً مدینۂ منورہ پھر دیوبند آگئے تھے اور کتب درسیہ سے فراغت حاصل کر کے اسی سال مدینۂ منورہ پہنچ گئے تھے۔ جمال پاشا کے زیر کمان جو حملے اور کارروائیاں کنال سوئز اور بیر سبع وغیرہ پر میدان تیہ میں واقع ہوئیں ان میں یہ جماعت شریک رہی اور بہت کچھ داد شجاعت و جوانمردی دیتی رہی۔ (نقش حیات (حصہ دوم): ص ۱۴۹ تا ۱۴۶)

---

(۱) کیونکہ حکم یہ تھا کہ کوئی بڑی سے بڑی ہستی مدینہ میں آنے کے بعد جب تک چند دن وہاں قیام نہ کرے سفر نہیں کرسکتا۔

دلی کا محاذ:

۵ رجولائی تا ۱۹ رستمبر ۱۸۵۷ء: پنجاب میں سپاہیوں کی بغاوت فرو کرنے کے بعد سر جان لارنس اس قابل ہو گیا تھا کہ (دلی کے) محاصرین کو زیادہ سے زیادہ کمک اور رسد بھیج سکے۔ سکھ، گورکھے اور پنجابی مسلمان (دو ہزار کی تعداد میں) محاصرین کی مدد کو پہنچ گئے۔ ان کی آمد سے انگریزی فوج کے حوصلے بڑھ گئے۔ اگلی صبح بریلی، مرشد آباد اور شاہ جہان پور سے باغی سپاہیوں کی رجمنٹیں دلی میں داخل ہو گئیں۔ ان کی آمد سے باغیوں کو یقین ہو گیا کہ انگریز دلی میں داخل نہیں ہو سکیں گے۔ اسی شام بریلی کی خباغی رجمنٹ کے افسر نے علی پور پر قبضہ کرنا چاہا لیکن ناکام رہا۔ ۵ رجولائی ۱۸۵۷ء کو جنرل سر برنارڈ چل بسا۔ اس کی جگہ میجر جنرل ریڈ نے کمان سنبھالی۔ بارش کی کثرت نے انگریزی فوج میں وبا پیدا کر دی۔ میجر جنرل ریڈ نے مایوس ہو کر استعفیٰ دے دیا۔ اب انگریزی فوج کا کمانڈر ولسن تھا۔ اس وقت انگریزی فوج میں کل آٹھ ہزار سپاہی تھی۔ ان میں سے آدھے انگریز تھے اور آدھے دیسی۔ ۱۸ راگست کو جنرل نکلسن کمک لے کر پہنچ گیا۔ اس کی فوج میں گیارہ سو گورے اور پندرہ سو پنجابی سپاہی تھے۔ اس کمک کی آمد کے علاوہ باغیوں کو اس بات کا بھی پتا چل گیا تھا کہ محاصرین کی کمک کے لیے پنجاب سے ایک توپ خانہ آرہا ہے۔ چناں چہ باغیوں کی ایک فوج بخت خان کی کمان میں رات کے وقت بہادر گڑھ کی طرف روانہ ہوئی تاکہ توپ خانے کو تباہ کر دے۔ اس روانگی کی اطلاع پا کر جنرل نکلسن توپ خانہ بچانے کے لیے نکل پڑا۔ بہادر گڑھ کے قریب دونوں فوجوں میں تصادم ہوا۔ بخت خان شکست کھا کر واپس ہوا۔ اسی اثناء میں باغیوں نے جنرل نکلسن کی غیر حاضری سے فائدہ اٹھاتے ہوئے انگریزی مورچوں پر شدید حملہ کر دیا۔ جنرل ولسن نے اس حملے کو روک دیا۔ اس حملے میں باغیوں کا زیادہ نقصان ہوا۔

ستمبر ۱۸۵۷ء کے ابتدائی دنوں میں توپ خانہ پہنچ گیا۔ ۷ رستمبر کو باغیوں نے اندازہ کر لیا کہ انگریزی فوج بڑی شدت سے شہر پر گولے برسانے کی تیاریاں کر رہی ہے۔ ۱۱ رستمبر تک انگریزی توپیں اہم مقامات پر نصب ہو چکی تھیں۔ ۱۱، ۱۲، ۱۳ راور ۱۴ رستمبر کو شہر پر گولے برستے رہے۔ باغیوں نے اس موقع پر بڑی بہادری کا ثبوت دیا۔ انھوں نے فصیل میں بڑے بڑے سوراخ کر کے ہر انگریزی فوج کے سامنے اپنی توپ لگا دی۔ ۱۱ رستمبر کو دونوں طرف سے گولہ باری شروع

ہوئی۔ ۱۳ر ستمبر کی شام کو کشمیری دروازے کے قریب فصیل میں شگاف ہو گئے۔ چناں چہ فیصلہ کیا گیا کہ اگلے دن دلی پر حملہ کیا جائے گا۔ ۱۴ر ستمبر کی صبح کو جنرل نکلسن کشمیری دروازے کی فصیل کی طرف بڑھا۔ باغیوں نے آگ برسانا شروع کر دی۔ لیکن اس پر بھی جنرل نکلسن سیڑھی لگا کر فصیل پر چڑھ گیا۔ جنرل نکلسن کے حکم سے فوج کا ایک دستہ اجمیری دروازے کی طرف روانہ ہوا اور دوسرے دستے کو کابلی دروازے سے جامع مسجد پہنچنے کا حکم ملا۔ سر تھیوفیلس مٹکاف فوج کے ایک دستہ سمیت جامع مسجد پہنچ کر دوسرے دستوں کی آمد کا انتظار کرنے لگا۔ ان سپاہیوں کی آمد سے جامع مسجد کے نمازیوں میں یہ مشہور ہو گیا کہ انگریزی فوج جامع مسجد کو گرانے کے لیے جمع ہو رہی ہے۔ ہجوم نے تلواروں سے مسلح ہو کر حملہ کرنا چاہا۔ انگریزی فوج نے ان پر گولی چلا دی۔ ہجوم آگے بڑھا۔ دست بدست لڑائی ہونے لگی۔ انگریزی دستہ کشمیری دروازے کی طرف بھاگ نکلا۔

انگریزی فوج اگر چہ ۱۴ر ستمبر کو شہر میں داخل ہو چکی تھی۔ پھر بھی پورے شہر پر اس کا قبضہ نہیں ہوا تھا۔ چار دن مزید گلی کوچوں میں لڑائی ہوتی رہی۔ باغی آہستہ آہستہ شہر چھوڑ کر بھاگ رہے تھے۔ ۱۹ر ستمبر کو انگریزی فوج کا سارے شہر پر قبضہ ہو گیا۔ انگریزی سپاہیوں نے ہر اس شخص کو قتل کر دیا جو ان کے سامنے آیا۔ انتقام اپنی پوری شدت سے ظاہر ہونے والا ہے۔ قتل و غارت گری، لوٹ مار اور تباہی کے مناظر ایک ایک کر کے سامنے آنے والے ہیں۔ باغیوں نے جو کچھ کیا اس کا اعادہ ہونے والا ہے۔ مگر بڑے پیمانے پر۔

بخت خان کے کہنے پر بہادر شاہ لال قلعہ چھوڑ کر ہمایوں کے مقبرے میں جا پہنچا۔ بخت خان چاہتا تھا کہ بہادر شاہ کو کسی دوسرے شہر میں لے جائے اور وہاں اس کے گرد فوج جمع کر کے دلی پر حملہ کرے۔ انگریز چاہتے تھے کہ بہادر شاہ کو باغیوں سے الگ کر لیا جائے۔ جب بہادر شاہ ہمایوں کے مقبرے میں پہنچ گیا تو مرزا الٰہی بخش نے ہڈسن کو اطلاع دی کہ وہ اگلے دن ایک دستہ لے کر مقبرہ کے مغربی دروازے پر پہنچ جائے۔ ہڈسن نے مرزا الٰہی بخش کو منشی رجب علی کے ذریعے یہ اطلاع پہنچا دی کہ وہ کسی نہ کسی طرح بہادر شاہ کو بخت خان کے ساتھ جانے سے روک دے۔ اگلے دن بخت خان نے بادشاہ سے ملاقات کی اور اسے اپنے ساتھ جانے پر رضامند کر لیا لیکن مرزا الٰہی بخش نے مخالفت کی اور بادشاہ سے کہا کہ ”بخت خان چوں کہ پٹھانوں کی حکومت قائم کرنا چاہتا ہے اس لیے حضور کو اس کے ساتھ نہیں جانا چاہیے۔“ بہادر شاہ نے جسمانی کمزوری کا

عذر پیش کرتے ہوئے بخت خان کا ساتھ دینے سے انکار کر دیا۔ اس انکار کے بعد بخت خان مقبرہ کے مشرقی دروازے سے نکل کر اپنی فوج سمیت ایسا غائب ہوا کہ کسی کو پتا نہ چل سکا۔ مرزا الٰہی بخش نے میجر ہڈسن کو تمام حالات سے آگاہ کیا۔ میجر ہڈسن پچاس سوار لے کر مقبرے کے مغربی دروازے پر آن پہنچا اور بادشاہ کو اطلاع دی کہ وہ اپنے آپ کو گرفتاری کے لیے پیش کر دے۔ میجر ہڈسن نے بادشاہ، زینت محل اور جوان بخت کی جان بخشی کا وعدہ کیا۔ اس پر بہادر شاہ نے اپنے آپ کو میجر ہڈسن کے حوالے کر دیا۔ لال قلعے کے اندر زینت محل کے مکان میں بادشاہ کو قید کر دیا گیا۔

میجر ہڈسن کو بتایا گیا کہ بہادر شاہ کے دو بیٹے مرزا مغل اور مرزا خضر سلطان اور ایک پوتا مرزا ابوبکر جو باغی سپاہیوں کے لیڈر تھے ہنوز ہمایوں کے مقبرے میں مقیم ہیں۔ چناں چہ اگلے دن میجر ہڈسن سو سواروں کو ساتھ لے کر مقبرہ پہنچا اور تینوں شہزادوں سے مطالبہ کیا کہ وہ اپنے آپ کو اس کے حوالے کر دیں۔ شہزادوں نے میجر سے جان بخشی کا وعدہ لینا چاہا۔ اس پر میجر نے کہا کہ جان بخشی کا اختیار صرف جنرل ولسن کو ہے۔ مرزا الٰہی بخش کے کہنے سننے پر شہزادوں نے اپنے آپ کو میجر ہڈسن کے حوالے کر دیا۔

میجر ہڈسن نے شہزادوں کو رتھوں پر سوار ہونے کا حکم دیا۔ سواروں کے محاصرہ میں رتھ دلی کی طرف روانہ ہوئے۔ جب دلی ایک میل رہ گئی تو رتھوں کو روک لیا گیا۔ شہزادوں کو حکم دیا گیا کہ وہ رتھوں سے باہر نکل آئیں اور شاہی لباس کو اتار دیں۔ شہزادے رتھوں سے اترے۔ انھوں نے شاہی لباس (بالائی پوشش) اتار دیا۔ میجر ہڈسن نے ایک سوار سے بندوق لے کر تین فائر کیے۔ تینوں شہزادے زمین پر گرے، تڑپے اور مر گئے۔ میجر ہڈسن شہزادوں کی لاشوں کو لے کر دلی پہنچا اور ان نعشوں کو کوتوالی پر لٹکا دیا۔ دلی میں یہ بات مشہور ہے کہ میجر ہڈسن نے شہزادوں کو قتل کرنے کے بعد ان کا خون پیا تھا۔ خون پیتے ہوئے کہا تھا: ''ان شہزادوں نے میری قوم کی بے بس عورتوں اور بے کس بچوں کے قتل میں حصہ لیا تھا۔ انھیں دیکھ کر میرا خون کھولنے لگا ہے۔ اس لیے اگر میں ان کا خون نہ پیتا تو میں پاگل ہو جاتا۔'' شہزادوں کی نعشیں چوبیس گھنٹے کوتوالی پر لٹکی رہیں۔ شہزادوں کے سر کاٹ کر میجر ہڈسن نے انھیں بہادر شاہ ظفر کے سامنے پیش کرتے ہوئے کہا کہ ''یہ آپ کی نذر ہے۔ جو بند ہو گئی تھی اور جسے دوبارہ حاصل کرنے کے لیے آپ نے باغی سپاہیوں کا ساتھ دیا۔''

انتقام کی تلوار نیام سے باہر نکل آئی۔تلوار کی پیاس انسانی خون ہی سے بجھ سکتی تھی۔تلوار کو جی بھر کر انسانی خون پلایا گیا۔جنرل نکلسن نے یہ خواہش ظاہر کی تھی کہ ''انگریز عورتوں اور بچوں کے قاتلوں کے خلاف ایک ایسا قانون بنانا چاہیے جس کی رو سے ہم انھیں زندہ جلا سکیں۔یا گرم سلاخوں سے اذیت دے کر انہیں ہلاک کر سکیں۔ایسے ظالموں کو صرف پھانسی سے ہلاک کر دینے کا خیال ہی مجھے دیوانہ کیے دیتا ہے۔کاش میں دنیا کے کسی ایسے دور افتادہ گوشے میں جا سکوں جہاں مجھے صرف یہ حق حاصل ہو کہ میں اپنی مرضی کے مطابق انتقام لے کر اپنے دل کی بھڑاس نکال سکوں۔'' جنرل نکلسن کی اس خواہش میں موت حائل ہو گئی وہ اسے پورا نہ کر سکا۔اس کے ساتھیوں نے اسے پورا کر دیا۔

۱۹ ستمبر ۱۸۵۷ء تک باغی سپاہی دلی چھوڑ کر بھاگ چکے تھے۔پچھلے چار دن سے شہری آبادی اپنا مال و اسباب چھوڑ کر اپنی جان بچانے کے لیے بھاگ رہی تھی۔جب دلی کے گلی کوچوں میں باغیوں کی مزاحمت ختم ہو گئی تو انگریزی فوج کے سپاہیوں نے شہری آبادی کو قتل کرنا شروع کیا۔شروع شروع میں مقتولین میں کوئی تمیز نہیں کی جاتی تھی۔ہندو اور مسلمان ایک ہی تلوار سے کاٹے جاتے تھے۔لیکن جب بہت جلد انگریزی فوج کے سکھ سپاہیوں نے فرقہ وارانہ انداز قتل اختیار کر لیا۔انھوں نے دلی کی مسلم آبادی سے مغل شہنشاہیوں کے ان مظالم کا انتقام لیا جو صدیوں پہلے کیے جا چکے تھے۔انگریزی فوج کے سکھ سپاہی مسلمانوں کو قتل کرنے میں مصروف ہو گئے۔

کوچہ چیلاں میں انگریز سپاہی حکیم فتح اللہ خان کے زنانے میں داخل ہو گئے۔ان کی نیت ظاہر ہے۔حکیم فتح اللہ خان نے ایک انگریز سپاہی کو جو پیش پیش تھا زخمی کر دیا۔اس پر انگریزی فوج کے افسر اعلیٰ کے حکم سے کوچہ چیلاں کے تمام مردوں کو گولی سے اڑا دیا گیا۔ان مقتولین میں مولانا صہبائی اور اپنے زمانے کے نامور خطاط سید محمد امیر بھی تھے۔تڑپ تڑپ کر مرنے والوں اور خاک و خون میں لپٹے ہوئے شہریوں کا نظارہ فاتح سپاہیوں کے لیے ایک کھیل تھا۔لیفٹننٹ (بعد میں لارڈ) رابرٹس اس نظارے کو اس طرح پیش کرتا ہے:

''ہم لاہوری دروازے سے ہوتے ہوئے چاندنی چوک گئے تو ہمیں دلی مردوں کا شہر دکھائی دیا۔چاروں طرف خاموشی تھی۔ہمارے گھوڑوں کی ٹاپوں سے یہ خاموشی ٹوٹتی۔ہم کسی زندہ انسان کی صورت نہ دیکھ سکے۔ہر طرف مردے ہی مردے تھے۔زمین مردوں کا بچھونا بنی ہوئی تھی۔چلتے وقت ہم آہستہ آہستہ باتیں کرتے۔ڈر تھا کہ کہیں ہماری آواز سے مردے چونک نہ پڑیں۔ایک

طرف نعشوں کو کتے کھارہے تھے اور دوسری طرف گدھ انھیں نوچ رہے تھے۔ بعض مردوں کے ہاتھ اوپر اٹھے ہوئے تھے، یوں معلوم ہوتا تھا کہ وہ کسی کو اشارے کررہے ہیں۔ ہماری طرح ہمارے گھوڑے بھی انھیں دیکھ کر ڈرتے تھے۔"

چاندنی چونک کی کوتوالی کے سامنے ایک حوض کے تین طرف پھانسیاں دی جاتی تھیں اور ایک طرف تماشائیوں کے لیے کرسیاں بچھی ہوئی تھیں۔ تیسرے پہر ادھر بینڈ بجتا ادھر لال قلعے سے مجرموں کی قطار روانہ ہوتی۔ ان کے ہاتھ پیٹھ کی طرف بندھے ہوتے تھے۔ مجرموں کو ایک قطار میں کھڑا کردیا جاتا۔ ان میں آدھے پھانسی پر لٹکادیے جاتے اور آدھے موت کے انتظار میں کھڑے رہتے۔

دلی پر قبضہ ہوجانے کے بعد فوجی سپاہیوں کو تین دن کے لیے لوٹ مار کی اجازت دی گئی۔ لوٹ مار اس انداز میں کی گئی گویا آثار قدیمہ کے ماہروں کی جماعت کسی مدفون شہر کی کھدائی کررہی ہے۔ دلی کی دولت کی شہرت ایک زمانے سے چلی آرہی تھی۔ اسی شہرت کے سبب وہ کئی بار اجڑی اور بسی۔ ویران ہوئی اور پھر آباد ہوئی۔ انیسویں صدی کے آغاز سے ۱۸۵۷ء تک دلی کی دولت میں نمایاں اضافہ ہوچکا تھا۔ پرامن زندگی سے کاروبار میں فروغ ہوگیا تھا۔ محاصرے کے دنوں میں انگریزی فوج کے سپاہیوں میں دلی کی لوٹ کا خیال پیدا ہوچکا تھا۔ جب دلی پر انگریزی فوج کا پوری طرح سے قبضہ ہوگیا تو چارلس گرفتھس کے الفاظ میں:

"شہر میں کافی لوٹ مار ہوتی رہی۔ ہمارے سپاہی (انگریز اور دیسی دونوں) لوٹ مار کی غرض سے مکانوں میں داخل ہوجاتے اور اپنے کپڑوں میں بہت سی قیمتی چیزیں چھپالیتے۔ میں یہ بات یقین سے کہہ سکتا ہوں کہ انگریزی رجمنٹوں کے بہت سے سپاہیوں کو جواہرات اور سونے کے زیور ملے تھے۔ میری اپنی رجمنٹ کے سپاہیوں نے مجھے موتیوں کی لڑیاں اور اشرفیاں دکھائیں جو انھوں نے لوٹ میں حاصل کی تھیں۔ افسروں اور سپاہیوں کی ایک بڑی تعداد نے بڑی بڑی رقمیں دے کر فوج سے علاحدگی حاصل کرلی تھی"۔

"شروع شروع میں کئی ایک سپاہی لوٹ مار سے باز رہے، لیکن جب انھوں نے دیکھا کہ ان سے کہیں بلند درجہ کے افسر لوٹ مار میں شریک ہیں تو ان کی دیانت بھی ختم ہوگئی۔ ہر شخص میں یہ خواہش پیدا ہوچکی تھی کہ وہ لوٹ کھسوٹ کے مال سے اپنے آپ کو دولت مند بنالے۔ جب میں اپنے دوستوں کے ساتھ لوٹ مار کے ارادوں سے شہر میں جاتا تو میں دوسرے افسروں کو بھی لوٹ

کی تلاش میں پاتا۔ یہ اتفاقی ملاقاتیں بہت دلچسپ ہوتی تھیں۔ دونوں طرف سے یہ ظاہر کرنے کی کوشش کی جاتی تھی کہ ان کا مقصد لوٹ مار نہیں بلکہ محض سیر و تفریح ہے“۔

ایک دن ایک چھوٹے سے مندر میں داخل ہوئے۔ یہ مندر چاندنی چوک سے زیادہ فاصلے پر نہ تھا۔ مندر کی عمارت کے درمیان ایک بہت بڑا بت تھا جسے ہمارے ہتھوڑوں نے ٹکڑے ٹکڑے کر دیا۔ بت نے جواہرات، ہیرے، لعل، زبرجد (زمرد) اور اشرفیاں اگل دیں۔ ہم نے بہت سی قیمتی چیزیں اپنے پاس رکھ لیں اور کچھ سامان پرائز ایجنسی میں بھیج دیا۔

”ان واقعات کو کئی سال گزر چکے ہیں۔ لیکن ان تین ہفتوں کی لوٹ مار کی یاد اب تک میرے ذہن میں باقی ہے۔ میری زندگی کے یہ واقعات پریوں کے قصوں یا الف لیلہ کی کہانیوں سے زیادہ ملتے جلتے ہیں“۔

”انگلستان کے جس شہر میں ہم رہتے تھے وہاں کے جوہریوں کی دکانیں مشرقی وضع کے زیوروں سے بھری پڑی تھیں۔ جوہریوں نے یہ سارا سامان ہمارے سپاہیوں سے خریدا تھا۔ ۱۸۵۷ء میں لندن میں دلی کے جواہرات اور زیورات کی بڑی مانگ تھی۔ لندن کے ایک صراف نے مجھے ان چیزوں کی زیادہ سے زیادہ قیمتیں پیش کیں۔ لیکن میں دلی کے مال غنیمت کو ہندوستان چھوڑنے سے پہلے بیچ چکا تھا۔ اگر میں لوٹ کا سارا سامان لندن لے آتا تو مجھے انبالہ کی نسبت اس کی قیمت بہت زیادہ ملتی۔“ (کمپنی کی حکومت، ص ۹۹-۳۹۳)

پرائز ایجنسی کا قیام:

تین دن کی عام لوٹ مار کے بعد ”پرائز ایجنسی“ کے نام سے ایک محکمہ قائم کیا گیا تاکہ لوٹ سے بچے ہوئے ہر قسم کے سامان کو جمع کر کے اسے نیلام کرایا جائے۔ اس محکمے نے مختلف قسم کے سامان کے لیے مختلف مقامات پر گودام کھول دیے تھے۔ ایک گودام میں کتابیں جمع ہو رہی تھیں تو دوسرے میں برتن۔ جب لوگوں کو شہر میں واپس آنے کی اجازت ملی تو اس سامان کو ان کے ہاتھ فروخت کیا گیا۔ سب سے پہلے ہندوؤں کو شہر میں آباد ہونے کی اجازت ملی۔ پرائز ایجنسی نے ان سے جرمانے وصول کیے۔ مارچ ۱۸۵۸ء میں مسلمانوں کو بھی شہر میں آباد ہونے کی اجازت مل گئی۔

بہت سے انگریز یہ چاہتے تھے کہ جامع مسجد کو گرا دیا جائے یا پھر اسے گرجا بنا دیا جائے۔ لیکن سر جان لارنس نے ان کی یہ بات نہ مانی۔ سر جان لارنس ہی کی کوششوں سے بہادر شاہ کی جان نہ لی گئی، بلکہ اس پر مقدمہ چلا گیا۔ اسے جلا وطن کر کے رنگون بھیج دیا۔ زینت محل اور جواں بخت کے

علاوہ بہادر شاہ کے ساتھ ضروری ملازم بھی تھے۔ بہادر شاہ رنگون میں ۱۸۶۲ء تک شاہی قیدی کی حیثیت سے زندہ رہا۔ (کمپنی کی حکومت، ص ۳۹۹)

شاملی کا معرکۂ جہاد اور ضلع سہارن پور کے دیگر حالات:

شاملی کے معرکۂ جہاد کا بعض مصنفین نے انکار کیا ہے۔ لیکن یہ ایسی بات نہیں، ہے جس سے انکار کیا جا سکے۔ ثناء الحق صدیقی نے ''جہاد شاملی و تھانہ بھون'' کے عنوان سے ایک تحقیقی کتاب لکھ دی ہی جس میں سہارن پور کی تاریخ، ۱۸۵۷ء کی ڈائریوں وغیرہ سے جو انگریز فوجیوں نے لکھی تھیں اور دیگر مأخذ سے استفادہ کیا ہے۔ ایک کتاب جو معرکۂ شاملی کے شہید ''حافظ ضامن'' مولانا امداد صابری نے لکھی ہے، اس سے بھی اس معرکے کی بعض تفصیلات پر روشنی پڑتی ہے۔ نیز مولانا مناظر احسن گیلانی کی، حضرت مولانا قاسم نانوتوی پر تالیف لطیف اور مولانا محمد میاں کی ''علمائے ہند کا شاندار ماضی'' میں اس واقعے کی تفصیلات موجود ہے۔

۱۴ ستمبر ۱۸۵۷ء: شاملی کے اس معرکے کا حال سر سید احمد خان مرحوم کی زبان قلم سے بھی سنیے۔ ارشاد ہوتا ہے:

> ''ستمبر ۱۸۵۷ء میں دفعتاً مسلمانان ساکنان تھانہ بھون نے جس کا افسر قاضی عنایت علی تھا فساد برپا کر دیا اور ایک بڑے گروہ نے تحصیل شاملی پر حملہ کیا۔ اس وقت تحصیل شاملی میں تخمیناً دس سوار پنجابی رسالے کے اور اٹھائیس سوار جیل خانہ کے اور پچاس سے زائد سپاہی متعینہ تھانہ اور تحصیل کے باقی آدمی اس افسر کے خاندان کے مع اکبر خان اس کے بھائی کے جو رام پور سے گئے تھے اور وہاں موجود تھے۔ یہ افسر بہ کمال دلاوری و بہادری بمقابلہ پیش آیا اور تحصیل شاملی کو مستحکم کرا کر اور اس میں محصور ہو کر لڑا۔ اور ہر دفعہ مفسدان کے حملہ کناں کو ہٹا دیا۔ اور بہت سے آدمی ان میں کے مارے گئے۔ آخر کار گولی دباروت تحصیل میں ختم ہو چکی اور نہایت مجبوری کا وقت آیا اور مفسدوں کو قابو ہو گیا اور وہ لوگ تحصیل کے قریب آ گئے۔ یہاں تک کہ تحصیل میں گھس آئے۔ وہاں بھی مقابلہ ہوا اور یہ افسر بہادری سے مع اکثر آدمیوں اپنے خاندان کے کام آیا۔ اور شرط نمک حلالی کو پورا کیا۔ یہ قتل و خونریزی شاملی میں ۱۴ ستمبر ۱۸۵۷ء کو واقع ہوئی، جو دن کہ فتح دہلی کا تھا۔ مگر نہایت افسوس ہے کہ اس افسر کے

کان تک مژدہ فتح دہلی جس کا وہ ہر دم مشاق تھا پہنچنے نہیں پایا تھا۔ اس ہنگامے میں ۱۱۳ آدمی جن میں سو سے زیادہ مسلمان تھے کام آئے اور ہر ایک تمغۂ خیر خواہی سرکار کا اپنے نام کے ساتھ لے گیا۔ یہ ہنگامہ جو تحصیل شاملی میں تھانہ بھون کے مفسدوں کے ساتھ ہوا وہ ہنگامہ ہے جس کا مفسدان تھانہ بھون نے جہاد نام رکھا تھا۔ مگر ان تمام حالات کو دیکھنے سے واضح ہوگا کہ جو لوگ ان مفسدوں کے مقابلے میں آئے اور دو بدو ہو کر لڑے اور بہتوں کو جان سے مارا اور مرتے دم تک مقابلہ و مقاتلہ سے باز رہے۔ وہ بھی مسلمان تھے اور نیک بخت اور اپنے مذہب کے پکے۔ اس سے صاف ثابت ہوتا ہے کہ مفسدوں نے صرف فساد مچانے اور غلغلہ ڈالنے اور ہنگامہ کرنے کو اپنے فسادوں کو جھوٹا جہاد کے نام سے مشہور کیا تھا۔''

سرسید کے اس بیان پر ثناء الحق صدیقی نے یہ تبصرہ کیا ہے۔ اس پر بھی ایک نظر ڈال لینی چاہیے:

''اس بیان میں کئی باتیں قابل توجہ ہیں!

(۱) ہمارے قومی رہنما سرسید رحمۃ اللہ علیہ کے نزدیک یہ جہاد، جہاد نہیں بلکہ فساد تھا اور جن علماء نے فتویٰ جہاد دیا تھا وہ مفسد تھے۔

(۲) اکبر خان کا تحصیل میں محصور ہو کر بیٹھ جانا اور بقول سرسید مفسدان تھانہ بھون کو گولیوں کا نشانہ بنانا اس کے کمال دلادری کا ثبوت تھا۔

(۳) جو علماء جہاد کا اعلان کر کے تھانہ بھون سے آئے تھے وہ سرسید کے نزدیک مفسد تھے۔ ان مفسدوں میں حضرت حافظ ضامن علی شہیدؒ، حضرت مولانا قاسم نانوتویؒ، حضرت مولانا رشید احمد گنگوہیؒ، اور حضرت مولانا منیر نانوتوی شامل تھے۔

(۴) سرسید صاحب کے نزدیک مفسدین تھانہ بھون کے غلبہ کا سبب یہ ہوا کہ ''آخر کو گولی باروت تحصیل میں ختم ہو چکی اور نہایت مجبوری کا وقت آیا اور مفسدوں کو قابو ہو گیا اور وہ تحصیل کے قریب آ گئے۔'' گویا اکبر خان کی کمال دلیری اور بہادری کی بنیاد کلیۃً ''گولی باروت'' پر تھی۔ وہ ختم ہوئی تو اس کی بھی ترکی تمام ہو گئی۔

(۵) اکبر خان اور اس کے آدمیوں کا دشمنان اسلام کی حمایت میں لڑنا سرسید کے نزدیک۔'' شرط نمک حلالی کو پورا کرنا تھا۔'' اس عقیدے کے تحت انھوں نے خود بھی کھل کر اپنے آقاؤں کی حمایت کی تھی۔

(۶) سرسید کے نزدیک دشمنان اسلام کے ہاتھوں دہلی کا فتح ہونا اور مسلمانوں کی حکومت ختم ہوجانا ''مژدۂ جانفزا'' تھا۔

(۷) سرسید کو زندگی بھر اس بات کا ملال رہا کہ اکبر خان (انگریزوں کے ہاتھوں) مژدہ فتح دہلی جس کا وہ ہر دم مشتاق رہتا تھا'' سننے سے محروم رہ گا۔

اے بسا آرزو کہ خاک شدہ

(۸) ''اس ہنگامہ میں ۱۱۳ آدمی جن میں سو سے زیادہ مسلمان تھے کام آئے اور ہر ایک تمغہ خیر خواہی سرکار کا اپنے نام کے ساتھ لے گیا۔'' اگر چہ اس ہنگامے میں کام آنے کی وجہ سے یہ ایک سو تیرہ آدمی ''سات پارچہ کے خلعت، وظیفہ اور سر کے خطاب، سے محروم رہے۔'' تاہم یقین ہے کہ اس تمغہ خیر خواہی سرکار کی وجہ سے جو وہ اپنے ساتھ لے گئے انھیں آخرت میں بلند مراتب عطا ہوئے ہوں گے۔ اور شہدا میں ان کا شمار ہوا ہوگا۔

(۹) اہل تھانہ بھون کا تو یہ جہاد نہیں بلکہ فساد تھا اس لیے کہ انھوں نے ''مہربان حکومت'' کے خلاف ہتھیار اٹھائے تھے لیکن دشمنان اسلام کی حمایت میں لڑنے والے اکبر خان اور ان کے رفقاء (جن میں چند غیر مسلم بھی تھے) نہ صرف مسلمان بلکہ نیک بخت اور اپنے مذہب کے پکے تھے۔

(۱۰) ''تھانہ بھون کے مفسدوں نے صرف فساد مچانے اور غلغلہ ڈالنے اور ہنگامہ کرنے کو اپنے فسادوں کو جھوٹا جہاد کے نام سے مشہور کیا تھا'' ایک انتہائی مہربان حکومت کے خلاف ہتھیار اٹھانا سراسر فساد تھا۔ پھر اکبر خان جیسے مومنین کے مدمقابل ہونا تو بدترین فساد قرار دیا جانا چاہیے؟ اگر تھانہ بھون کے حملہ کناں انگریزوں سے لڑنے کے لیے گئے تھے تب بھی اکبر خان جیسے مومنین کو مقابلہ میں آتا دیکھ کر انھیں لوٹ جانا چاہیے تھا ۔ اکبر خان اور اس کے ساتھیوں کو شرط نمک حلالی پورا کرنا تھا۔ لہذا وہ لڑے مگر تھانہ بھون کے حملہ کناں کے لیے کیا جواز تھا کہ انھوں نے ان مومنین کے خلاف ہتھیار اٹھائے ہیں۔ گرانٹ کے بیان سے صاف ظاہر ہوتا ہے کہ حق نمک حلالی کو اکبر خان

جہاد سے افضل سمجھتا تھا۔ وہ لکھتا ہے کہ

''جب گروہ باغیوں کا جس میں غازی دارانگر وغیرہ قصبہ جات کے کثرت سے تھے بسر داری قاضی عنایت علی خان کے تحصیل پر چڑھ آئے اور محمدی جھنڈا کھڑا کیا۔ باوجود اس کے تحصیل دار نے ان کا مقابلہ کیا......'' (جہاد شاملی وتھانہ بھون، کراچی ۱۹۸۶ء، صفحہ ۵۶ تا ۶۰)

معرکۂ شاملی میں حافظ محمد ضامن کی شہادت:

حضرت حافظ محمد ضامن شہید کے ایک مرید حکیم ضیاء الدین رام پوری نے حافظ صاحب کے تذکرے میں ''مونس مہجوراں'' کے نام سے ایک کتاب لکھی ہے۔ جس کا قلمی نسخہ مدرسہ صولتیہ مکۂ معظمہ کے کتب خانے میں ہے اور اسے مولانا امداد صابری نے مرتب کر کے دہلی سے چھپوا دیا ہے۔ اس میں حکیم صاحب لکھتے ہیں:

''حضرت پیر و مرشد کو اس جاہ جلال کے باوجود ستر کا بہت خیال تھا۔ روزانہ سادہ وضع رکھتے تھے اور بہت کم مرید فرمایا کرتے تھے۔ میں بھی جناب حاجی امداد اللہ صاحب کی سفارش کی وجہ سے بیعت ہوا۔ الحمد للہ مجھ جیسے گنہگار کو اللہ تعالیٰ نے یہ بیعت کی نعمت ایسے مخلصان خاص کی عنایت فرمائی۔ گویا مغفرت کی قوی امید ہوگئی ہے۔ ورنہ نابکار کا حال نہایت ابتر تھا۔ اب کیا ظاہر کروں اللہ جل شانہ حشر میں میرے گناہوں کی پردہ پوشی فرمائے اور خاتمہ خیر سے کرے اور چوں کہ گناہوں کے علاوہ مجھ میں کوئی لیاقت خدمت گذاری میں لائق بارگاہ حضرت مرشد کے نہ تھی، حتی المقدور رضا جوئی میں رہتا اپنی طرف سے کچھ نہ کہتا تھا۔ صفت کریمی اور رحیمی شان اولیائے کرام ہے اور اچھوں کو ہمارے اطوار پر کیا خیال ہوتا ہے، اس لیے حضرت پیر و مرشد رحمۃ اللہ علیہ مربیانہ نظر توجہ میرے حال پر مبذول فرمایا کرتے تھے۔ اور یہ نالائق بھی کبھی کبھی خدمت شریف میں حاضر ہوا کرتا اور تعلیم و تلقین حضرات ادام اللہ فیوضہم اور حالات ذوق وشوق مریدان مخلص کے دیکھ کر اپنی عمر گزشتہ پر تاسف کیا کرتا تھا۔ اور اس تمنا اور تجسس میں رہتا کہ حق تعالیٰ کسی طرح مجھ کو بھی اس طریق سے کچھ حصہ عنایت فرمادے اور کبھی یہ خیال آتا تھا کہ کیا بعید ہے کہ حضرت پیر و مرشد رحمۃ اللہ علیہ کے تصدق سے اللہ تعالیٰ اپنی محبت اور اخلاص بھی عطا فرمائے مگر یہ خبر نہ تھی کہ پردۂ غیب سے کچھ اور ظاہر ہوا چاہتا ہے۔

اسی موقع اور کشاکش میں تھا کہ ناگاہ گردش ایام اور شامت افعال اس شکستہ حال سے یہ

صورت پیش آئی کہ دفعتاً جہان میں ایک شور پیدا ہوا۔ ہنگامۂ قتل وغارت کا چار طرف سے ایسا گرم ہوا کہ شاید کبھی نہ ہوا ہوگا۔ جو لوگ دیندار اور جری تھے غیرت اور حمیت اسلامی سے اکثر شہید ہو کر سوے دار البقار حلت فرما ہوئے۔ یا خانہ ویران ہو کر در بدر راہی۔ اس ملک کا حال دیکھ کر بیت اللہ شریف یا کسی اور دار الاسلام کو تشریف لے گئے۔ اب ہندوستان میں گویا دنیا پلٹ گئی۔ دین دنیا کی اچھی بات گم ہو گئی۔ کیا عرض کروں یہاں فسانۂ غیر مقصود ہے۔ اپنا درد وغم اور قصۂ حسرت والم اور ہے کوئی اپنی بلا میں مبتلا ہے۔ آتش مفارقت میں جی جلائے دیتا ہے۔ دل مہجور گھبراتا ہے، سوزش دروں کو بیان کیا چاہتا ہے اور کوئی ذکر خوش نہیں آتا۔ حاصل کلام اس ہنگامے میں جلال کبریائی کو جوش وخروش تھا اور مدہوشان شیون الٰہی کو بھی ایک ولولہ اور شوق تھا چناں چہ حضرت مرشدی رحمۃ اللہ علیہ ونور اللہ مرقدہٗ وقدس سرہٗ نے بھی کمر ہمت چست باندھ کر امر حق پر جان ومال کو قربان کیا اور ذوق وشوق الٰہی میں ایسے مست ہوئے کہ کسی طرح کا تردد نہ ہوا اور تمنائے شربت شہادت اور جام کوثر میں ہماری بیکسی کا بھی کچھ خیال نہ فرمایا۔ سبحان اللہ کیا ہمت مردانہ اور مدد خدا کا تماشہ دکھا کر مردانہ اور مشتاقانہ بتاریخ چوبیسویں محرم الحرام بارہ سو چوہتر نبوی ﷺ بر سر معرکہ جام شہادت نوش فرمایا۔ واہ کیا داد ہمت لے گئے اور داغ حسرت دے گئے:

ساجن دکھیا کر گئے اور سکھ کو لے گئے ساتھ
جیم بچھوہا دے گئے اور پھر نہ پوچھی بات
ساجن ایسے چل بسے مڑ کر خبر نہ لی
میں دکھیا تکتی رہی، پھر ملیں گے پی
رفتی و مرا خبر نہ کر دی
بر بے کسم نظر نہ کر دی

دفعتاً حشر بپا ہوا۔ جہاں تہ وبالا ہو گیا:

چلی سمت غیر سے اک ہوا وہ چمن سرور کا جل گیا
مگر ایک شاخ نہال غم جسے دل کہیں وہ ہری رہی

واہ کیا بے نیازی کی شان تھی، کیا تھا، کیا کر دکھایا! آخر ہم لوگ بھی منتشر و پریشان ہو گئے۔ ایک کو ایک کی خبر نہ رہی اس حالت زار اور وقت اضطرار میں ایک دوسرے کی صورت تکتا تھا۔ اور کلیجہ پکڑ کر رہ جاتا تھا۔ ناگاہ یہ قیامت کا نمونہ اور حشر کی کیفیت پیدا ہو گئی کہ ہر بشر مقام استقامت

سے ڈگ گیا۔ سراسیمہ ہو کر دیوانہ اور مایوس پھرتا تھا۔ آخر یہ دل ناشاد اس قدر گھبرایا کہ کچھ ہوش نہ رہا۔ پائے ثبات کا قیام اس دلربائے عالی مقام کے ساتھ گیا۔ کسی جگہ صورت امن اور قرار دلی نظر نہ آیا۔ در و دیوار سے حسرت برستی تھی۔ زمین و آسمان سے اسباب ماتم نمایاں تھے۔ شجر و حجر سے آواز نوحہ و زاری کا شور و غل تھا۔ صحرائے سبزہ زار سے دل مضطر کو ایک نیا آزار پیدا ہوتا تھا۔ سامان غم اور ہجوم درد و الم اس قدر برپا ہوا تھا کہ ہر ایک کا قلب گھبرا اٹھا۔ سوائے حسرت و یاس کے کچھ نہ پایا۔ واہ وایا وہ عیش و طرب رہتا تھایا اب یہ ہر جگہ ماتم کدہ ہو گیا اور جہاں عشرت کدہ تھا اب وہاں ماتم سرا ہوا۔ وائے میری اس زندگی پر کہ وہ راحت جان اور فرحت روان دفعتاً نظر سے دور ہوا۔ اس دل ناشاد کو ایسے درد و الم میں چھوڑا کہ کوئی پرسان حال زار نہ رہا۔ جس طرف نظر کیجیے کوہ غم اور دریائے حسرت بے پایاں نظر آتا ہے۔ ہر شے سے صدائے یاس اور نعرۂ الم صدمہ رسان ہے......
ہر چند جزع اور فزع کیا مگر کچھ کارگر نہ ہوا اور سرمایۂ سعادتِ ابدی کی صورت نظر نہ آئی۔ یا ر دو دہ گل گلزار حقیقت ایسا دست برد بدقدرت ہوا کہ دفعتاً ہاتھوں سے نکل گیا اور وہ آفتاب شریعت ملک ملائک قدس میں ایسا سریع اکسیر ہوا کہ آن کی آن میں عرش معلیٰ پر جا چکا۔ ادھر رفعت اور شان دوبالا ہوئی، ادھر جہان تیرہ و تاریک نظر آیا۔ یہ جان ناتواں سخت گھبراتی تھی،۔ سینہ پھٹا جاتا تھا، عقل حیران ہوئی جاتی تھی، دل یہ کہتا تھا۔ وائے بے مہری آہ بیدادی:

یہ نہ تھی امید ہم کو ساقی گلفام سے
دور ساغر میں ہمیں محروم رکھا جام سے

واہ کیا شان قہاری کا ظہور تھا کہ ہر ایک بشر مضطر و پریشان ہو گیا۔ اور خاص مجھ جیسے ناکام کو جہان زہر سیاہ نظر آیا، ہوش جاتا رہا۔ مگر زندگی سخت شے ہے ہر دم ہجر میں زہر کا سا گھونٹ پیتا ہوں اور جیتا ہوں۔ افسوس اس زندگی پر کہ جیتا ہوں اور نہ مرتا ہوں۔ رات دن اسی حسرت و یاس میں بسر ہوتا ہے۔ ایک زمانہ اس فرقت محبوب میں سر پٹکتے ہو چکا، کوئی چارہ ساز نہ ملا، اللہ اللہ! ذات خدا کیا بے پرواہے کہ عقل و تدبیر محض بیکار ہے۔ گردش ایام نے صدمۂ مفارقت حضرت مرشد رحمۃ اللہ علیہ پر ہی بس نہ کیا۔ اس دل ناشاد کو یک لخت بالکل تباہ کر ڈالا کہ ناگاہ جناب حاجی (امداد اللہ) صاحب سلمہٗ اللہ تعالیٰ کو جناب باری سے الہام ہوا کہ بیت اللہ آؤ۔ چناں چہ وہ جبھی بالہام حق، بیت اللہ شریف کو تشریف لے گئے۔ وائے محرومی کہ بجائے حضرت پیر و مرشد رحمۃ اللہ علیہ جو باقی تھے ان سے یوں مفارقت ہوئی واحسرتا، اب کوئی مونس و غمخوار نہیں کہ دل پژمردہ کو تسلی دے۔ آہ و

نالہ کے سوا کوئی رفیق نہ رہا......(تذکرہ حضرت حافظ محمد ضامن صاحب شہید فرنگ'' سردار شہیداں مع مونس مہجوراں'' دہلی، ۱۹۸۲ء، صفحہ ۸۵_۸۲)

۱۴ر ستمبر ۱۸۵۷ء: مجاہدین تھانہ بھون انگریز حکام کی طرف سے غافل نہیں تھے۔ انھیں یقین تھا کہ وہ کسی نہ کسی وقت تھانہ بھون کا رخ کریں گے اور اپنے نقصان کا بدلہ لیں گے۔ چناں چہ وہ خفیہ طور پر ان کی نقل و حرکت اور پروگرام کے بارے میں معلومات حاصل کرتے رہے تھے۔ جب انھیں انگریز حکام کے آیندہ پروگرام کا پتا چلا تو وہ انتظار میں رہے کہ کب انگریزی فوج بڈھانہ کی مہم پر روانہ ہو اور کب وہ تھانہ بھون پر حملہ ہونے سے قبل اس کے مستقر اور مرکز شاملی کو جس کے استحکامات کافی عرصے سے کیے جا رہے تھے خود حملہ کر کے کمزور کر دیں......

ہنری مالکم لو کی مرتبہ روداد سے اس قیاس کی پوری طرح تائید ہوتی ہے۔ وہ کہتا ہے:

''شاملی میں مسٹر ایڈورڈس کے ساتھ مل کر ہم لوگ ۱۰ر ستمبر کو ایک گاؤں ہرہر کی جانب روانہ ہوئے جس نے علم بغاوت بلند کیا تھا۔ لیکن جب ہم وہاں پہنچے۔ تو گاؤں کے لوگوں نے کوئی مزاحمت نہیں کی۔ سوار فوج نے گاؤں کا محاصرہ کر لیا۔ پیدل فوج آبادی میں داخل ہو گئی اور اس نے بہت سے آدمیوں کو گرفتار کر لیا۔ سرکاری مال جو ان لوگوں نے لوٹ لیا تھا برآمد کر لیا گیا۔ اور بڑی تعداد میں ہتھیار ضبط کر لیے گئے۔ اس مہم کے بعد جب ہم شاملی کی جانب لوٹ رہے تھے تو باغیوں کے ایک بڑے جتھے نے ہمارا سامان چھیننے کی کوشش کی۔ لیکن دفعدار الطیف خان اور چار سواروں نے فوری طور پر نہایت بہادری سے مقابلہ کیا۔ باغی منتشر ہو گئے۔ ان کا ایک آدمی مارا گیا۔ اور ایک دوسرا آدمی قید کر لیا گیا۔ جس کو بعد میں پھانسی دے دی گئی۔

''جن افسران کے ہاتھ میں فوج کی کمان تھی، ان کی علالت کے سبب میدانی فوج شاملی میں رکی رہی۔ اس عرصے میں کمک آ گئی اور آخر میں ہمارے پاس فوج کی تعداد حسب ذیل ہو گئی!

پہاڑی توپیں	۲
پہلی پنجاب کیولری کے رسالہ کے سوار	۱۰۰

افغان سوار	۹۰
سکھ پیدل جوتلواروں سے مسلح تھے	۶۰
تیسری لائٹ کیولری کے رسالہ کے سوار	۲۸

اس وقت یہ جمعیت افغان سوار فوج کے کپتان اسمتھ کے زیر کمان تھی۔

اطلاع ملی تھی کہ بڈھانہ کے قلعے کے جو جانب جنوب تقریباً ۱۷ میل دور ہے سرکاری پولیس کے کچھ آدمی اور نوکر چاکر ایک جمعیت کے ہاتھوں قتل ہو گئے ہیں۔ اس جمعیت کا سرغنہ ایک مشہور باغی خیراتی خان تھا۔ اس نے شاہ دہلی کی بادشاہت کا اعلان کر کے اپنے نام سے تحصیل قائم کر لی تھی۔ فوج ۱۴ر تاریخ کو قلعہ بڈھانہ کی جانب روانہ ہوئی۔ اس فوج کا منصوبہ یہ تھا کہ بعد میں جوراہا کے شہر پناہ سے گھرے ہوئے قریہ کو تباہ کر دیا جائے گا، جس نے بے انتہا سرکشی اختیار کی تھی، لیکن جب ہم کوچ کرتے ہوئے آگے بڑھ رہے تھے تو جوراہا کے لوگ ۳۰۰ کی تعداد میں ڈھول پیٹتے ہوئے مقابلے کے لیے نکل آئے۔ کپتان اسمتھ نے مجھے ہدایت کی کہ ان کے دائیں بازو پر حملہ کر دوں۔ خود انھوں نے بائیں بازو پر حملہ کر دیا۔ میری جمعیت نے جس میں پنجاب کیولری کے رسالہ کے ۴۰ سوار تھے۔ باغیوں کو پوری طرح منتشر کر دیا اور تنہا اس پارٹی نے ان کے کم از کم ۵۰ آدمیوں کو موت کے گھاٹ اتار دیا۔ گاؤں پر پیدل فوج کا قبضہ ہو چکا تھا۔ باغیوں کو تین سو سے زیادہ جانوں کا نقصان اٹھانا پڑا اس معرکے کے بعد فوج بڈھانہ کے قلعہ کی طرف روانہ ہوئی۔ لیکن یہ قلعہ پہلے ہی خالی کر دیا گیا تھا۔ ہم نے قلعے کے پھاٹکوں کو مسمار کر دیا اور اس جگہ کو بری طرح تاراج کیا۔ یہاں ہمارے ساتھ لیفٹننٹ فریزر کی سرکردگی میں دو توپیں اور لیفٹننٹ جانسٹن کی قیادت میں ۱۰۰ سکھ پیدل اور آملے۔

ہنری جارج کین کا بیان ہے کہ:

> ''فوج میں اس اضافے سے اسمتھ کو شاملی کی طرف لوٹتے وقت یہ خیال ہو گیا تھا کہ ہم لوگوں کے شاملی پہنچنے پر وہاں کی فوج کو بڑی تقویت ملے گی۔ مگر جب ۱۶ر ستمبر بدھ کو اسمتھ مع اپنی فوج کے وہاں پہنچا تو یہ پتا چلا کہ اس کی عدم موجودگی میں مجاہدین تھانہ بھون نے تحصیل پر حملہ کر کے اسے پوری طرح تباہ کر دیا ہے۔''

جیسا کہ پہلے بتایا جا چکا ہے، مجاہدین تھانہ بھون نے ایسے انتظامات کیے تھے جن سے انھیں

انگریزوں کے پورے پروگرام کا علم ہوگیا تھا۔ چناں چہ ۱۴ ر ستمبر کو جب انگریزی فوج بڈھانہ کی طرف گئی وہ یلغار کر کے تھانہ بھون سے شاملی جا پہنچے۔ مالکم لو خود اپنی رپورٹ میں لکھتا ہے:

''ہمارے وہاں سے فورٹ بڈھانہ کے لیے روانگی کے دس گھنٹے بعد تھانہ بھون کے باغیوں نے بڑی تعداد میں (شاملی پر) حملہ کردیا۔''

انگریز وقائع نگار ہنری جارج کین اور سرسید کے بیان سے بھی یہی پتا چلتا ہے کہ مجاہدین کا شاملی پر حملہ ۱۴ ر ستمبر ۱۸۵۷ء بروز پیر ہوا تھا۔ حکیم ضیاء الدین رام پوری کے رسالہ ''مونس مہجوراں'' کے اس بیان سے کہ حضرت حافظ ضامن علی شاہ کی شہادت ۲۴ ر محرم الحرام ۱۲۷۴ھ کو پیر کے دن ظہر کے وقت ہوئی، اس بیان کی تصدیق ہوتی ہے۔ ۲۴ ر محرم ۱۲۷۴ھ کی مطابقت ۱۴ ر ستمبر ۱۸۵۷ء سے ہوتی ہے اور دن بھی پیر کا نکلتا ہے۔ لہذا یہ کہنا غلط نہ ہوگا کہ حملہ کی تاریخ بھی ۱۴ ر ستمبر ہے اور حضرت حافظ ضامن علی شاہ رحمۃ اللہ علیہ کی شہادت کا دن بھی یہی ہے۔

مجاہدین تھانہ بھون کی صحیح تعداد مولانا عاشق الٰہی نے بتائی ہے اور نہ کسی اور تحریر میں اس کا ذکر دکھائی دیتا ہے۔ مولانا عاشق الٰہی نے صرف اتنا لکھا ہے کہ ''جتھے کا جتھا تحصیل شاملی پر چڑھ دوڑا۔'' سرسید نے اس کو ''ایک بڑا گروہ'' کہا ہے۔ ہنری جارج کین نے ''حملہ آوروں کی تعداد زیادہ تھی'' کہہ کر چھوڑ دیا ہے۔ مالکم لو نے بھی یہ رپورٹ پیش کرتے ہوئے یہی تحریر کیا ہے کہ ''تھانہ بھون کے باغیوں نے بڑی تعداد میں حملہ کردیا تھا۔'' زبانی روایتوں سے اس مسئلے پر اتنی بھی روشنی نہیں پڑتی۔ البتہ قیاس ہے کہ ''چوں کہ جہاد کا فتویٰ دینے والے سب حضرات چوٹی کے علماء اور مشائخ تھے اس لیے ان کے مریدین و معتقدین سیکڑوں بلکہ ہزاروں کی تعداد میں آس پاس کے دیہات سے آ کر ان کے جھنڈے کے نیچے جمع ہوگئے ہوں گے۔ اور خود تھانہ بھون کے لوگ بھی بڑی تعداد میں شامل ہوں گے، اس زمانے میں مسلمانوں میں بہت سی کمزوریوں کے باوجود دینی جوش و جذبہ آج کل سے کہیں زیادہ تھا۔ اس لیے شوق شہادت میں بکثرت مسلمان مجاہدین کا ساتھ دینے کے لیے تیار ہوگئے ہوں گے۔''

جمعیت مجاہدین کے محض پانچ افراد کے ناموں کا پتا چل سکا ہے:

(۱) قاضی عنایت علی جو فنون حرب میں بڑے ماہر تھے اور جن کی وجہ سے یہ مہم ہوئی تھی۔ سرسید کے بیان سے تو یہ مترشح ہوتا ہے کہ مجاہدین کی فوج کی قیادت وہی کر رہے تھے۔

(۲) حافظ ضامن علی شاہ'' جو قاضی عنایت علی کے سگے خالو تھے اور جو اس معرکے میں جام شہادت نوش فرما کر ان خوش نصیبوں کی جماعت میں شامل ہوگئے۔ جن کے بارے

میں باری تعالیٰ کا ارشاد ہے **ولا تقولوا لمن یقتل فی سبیل الله اموات، بل احیاء ولکن لاتشعرون.(۲:۱۵۴)**

(۳) مولانا رشید احمد گنگوہی جن کے زانو پر سر رکھے ہوئے حافظ ضامن علی شاہؒ نے آخری ہچکی لی اور خود کو آغوش رحمت پروردگار میں دے دیا۔

(۴) مولانا محمد قاسم نانوتویؒ جنھوں نے اس معرکے میں اپنی مجاہدانہ سرگرمی کا پوری طرح اظہار کیا۔

(۵) مولانا محمد منیر نانوتویؒ جو مولانا مناظر احسن گیلانیؒ کی روایت کے بموجب حاجی امداد اللہ کی ہدایت پر عمل کرتے ہوئے قاسم صاحبؒ کے محافظ و نگراں کی حیثیت سے ساتھ تھے۔

خیال ہے کہ مجاہدین کا یہ لشکر ۱۳ر ستمبر کو کسی وقت تھانہ بھون سے روانہ ہو کر ۱۳ر اور ۱۴ر کی درمیانی شب میں شاملی کے قریب کسی جگہ ٹھہر گیا ہوگا اور جب یہ بات متحقق ہو گئی کہ انگریزی فوج بڑھانہ کی جانب جا چکی ہے، اس وقت وہاں سے چل کر ۱۴ر ستمبر کو پیر کے دن ۱۰، ۱۱ بجے تک شاملی پہنچ گیا ہوگا۔ (جہاد شاملی و تھانہ بھون)

۶ر جولائی تا ۲۸ر ۱۸۵۷ء: اگست: ۶ر جولائی ۱۸۵۷ء ایک حکم جس پر مہر شاہی ثبت تھی بنام کمانڈر ان چیف جاری کیا گیا، جس میں فوج کے روزانہ الاؤنس کی بابت تحقیقات کی ہے، اور حکم دیا ہے کہ تمام فوجی امور اپنے ہاتھ میں لے لیا جائے۔

۷ر جولائی ۱۸۵۷ء ایک مراسلہ راجہ گلاب سنگھ والی کشمیر نے اس اطلاع کے لیے کہ ان کا اقتدار حکومت لاہور اور لاہور کے قرب و جوار میں مستحکم ہو گیا ہے بھیجا، اور ایک درخواست دوست محمد خان کی ہے کہ حاضر دربار ہونا چاہتا ہوں۔ ہر دو درخواستیں جنرل بہادر کے پتے پر موصول ہوئی ہیں، جن کے جواب میں مراسلات جاری کرنے کا حکم دے دیا گیا ہے۔

۹ر جولائی ۱۸۵۷ء خبر موصول ہوئی ہے کہ بختیار خان نے ایک فوج تیار کر کے دشمنوں سے لڑنے کے لیے روانہ کی ہے، جو جوہر مردانگی دکھا رہی ہے۔ قاصد دم بدم فتح کی خبریں لا رہے ہیں۔

بہادر شاہ کا روزنامچہ:

۱۱ر جولائی ۱۸۵۷ء اقتباس کورٹ گزٹ (سراج الاخبار): "یہ سب پر روشن ہو چکا ہے کہ بادشاہ نے دربار منعقد کرنا شروع کر دیا ہے۔ آج رؤسا اور معززین کو باریاب فرمایا گیا۔ ملعون

دشمنوں کی نقل و حرکت اور انتظامات جنگ کا مشورہ اور بہادران شاہی کی کارگزاریاں بادشاہ اور اہل دربار کی واقفیت کے لیے پڑھ کر سنائی گئیں۔ غلام نبی خان کے نام حکم جاری ہوا کہ نواب جھجر کا مکان واقع محلہ دریا گنج مجروحین کے لیے صاف کرایا جائے۔ مجاہدین کے خرچ کے لیے کچھ روپیہ عنایت فرمایا۔

۱۲ر جولائی ۱۸۵۷ء سید علی وبکر علی رؤسائے بنارس کی ایک درخواست موصول ہوئی۔ انھوں نے لکھا تھا کہ مردو کفار کی بڑی تعداد انھوں نے قتل کر دی ہے اور اب حضور اقدس کی خدمت میں مشرف ہونا چاہتے ہیں۔ فی الفور انھیں عنایت نامے سے سرفراز فرمایا گیا۔

۱۳ر جولائی ۱۸۵۷ء جنرل بہادر نے عرضی روانہ کی کہ بحکم خدا آگرہ فتح کر لیا گیا ہے۔ ۲۱ توپوں سے بادشاہ کو سلامی دی گئی۔ باجے والوں نے انگریزی باجہ بجایا۔ انگریزی سارنگیاں، ڈھول، شہنائیاں وغیرہ خوشی کے اظہار میں بجائی گئیں۔ دو جاسوس مع انگریزی خطوط کے گرفتار کیے گئے۔ اور تحقیقات کی غرض سے مرزا مغل کے پاس روانہ کیے گئے۔ افسران جھانسی رجمنٹ کی ایک درخواست قتل کفار کے متعلق موصول ہوئی۔ جس کا جواب ارسال فرما دیا گیا۔

۱۵ر جولائی ۱۸۵۷ء حسین بخت خان کو ایک شاہی مراسلہ روانہ کیا گیا کہ جھانسی کی فوج سے میس جو کل صبح آکر اجمیری دروازے کے باہر قیام کرے گی۔

۱۶ر جولائی ۱۸۵۷ء افسران جھانسی فوج حاضر ہوئے اور اپنی وفاداری کے اظہار میں تلواریں اور بندوقیں زمین پر ڈال دیں۔ بادشاہ نے شفقت فرمائی اور سردست ۲۰۰۰ روپیہ خرچ کے لیے عنایت کیا۔

۱۷ر جولائی ۱۸۵۷ء ایک اطلاع موصول ہوئی کہ پیدل کی دو رجمنٹیں انبالے سے حاضر ہوئی ہیں۔ مرزا مغل کو حکم ہوا کہ پہلے آئی ہوئی رجمنٹوں میں کہیں ان کو بھی ٹھہرا دیا جائے۔

۱۸ر جولائی ۱۸۵۷ء قبرستان میں کئی جاسوسوں کو گرفتار کیا گیا ہے۔

۲ر اگست ۱۸۵۷ء ایک عرضی گورنر جنرل کی طرف سے موصول ہوئی کہ غنیم پسپا ہو رہا ہے۔ اس پر حکم لکھا گیا کہ عرضی ہذا داخل دفتر کی جائے۔

۴ر اگست ۱۸۵۷ء جنرل سدھاری سنگھ افسران نیچ فوج و دیگر ممتاز افسران حاضر ہوئے۔ ماجرا عرض کیا اور میدان جنگ سے دفعیۂ کفار کی تدابیر پیش کیں۔ بادشاہ سے بہت دیر تک گفتگو کرتے رہے۔

۵ر اگست ۱۸۵۷ء بادشاہ نے دو احکام جاری فرمائے، ایک نواب ولی داد خان کی درخواست کا جواب جس میں لکھا گیا کہ انگریزوں کو سامنے سے ہٹا دینے کے بعد افواج روانہ کی جائیں گی۔ دوسرا راجہ الور کے نام کہ خراج معہ عرضی فی الفور روانہ کرو۔

۶ر اگست ۱۸۵۷ء بادشاہ افواج کی مردانگی و شجاعت کے کارنامے سن رہے تھے کہ معاً خبر آئی، دلیر فوج نے مورچوں پر قبضہ پانے کی عزت حاصل کی۔ فوراً افواج اور بارود ان کی ہمت افزائی کے لیے بھیجنے کا حکم دیا گیا۔

۷ر اگست ۱۸۵۷ء خبر موصول ہوئی کہ ہماری سپاہ مورچوں میں جا کر نہایت دلیری سے غنیم سے برسرپیکار ہے۔ شام کے وقت افسوسناک خبر ملی کہ میگزین واقع محلہ چوڑی والاان میں یک بیک آگ لگ گئی جس سے وہاں کے کام کرنے والے صدہا مرد و عورت جل کر کوئلہ ہو گئے اور بارود نے عمارت کو بالکل مسمار کر دیا۔ پیدل سپاہ نے جو ہمیشہ ایسے مواقع سے فائدہ اٹھاتی رہتی ہے، یہ سنا تو بگڑ گئی اور جناب وقار الملک (حکیم احسن اللہ خان طبیب شاہی) پر میگزین میں آگ لگانے کا جھوٹا الزام لگا کر ان کے مکان کا صفایا کر دیا۔ جو چیز جس کے ہاتھ آئی لے کر چل دیا۔ نیز ہمسایوں کے مکانات لوٹ لیے۔ بادشاہ یہ سن کر بہت غضب ناک ہوئے اور حکیم صاحب کو بہت تسلی و تشفی دی اور اعلان کر دیا کہ حکیم صاحب کا جو کچھ مال جس شخص نے لیا ہو فی الفور یہاں لا کر حاضر کر دے۔ پھر اعلیٰ حضرت نے یہ دعا پڑھی۔ میرے دشمن ہر طرف سے جمع ہو کر طاقت پکڑ رہے ہیں۔ یا خدا مدد کر، تو نے میری مدد کے لیے غیبی فوج روانہ کی ہے۔ پس تجھ ہی سے فتح و ظفر کی دعائیں مانگتا ہوں۔"

اقتباسات سراج الاخبار جو فارسی میں پڑھے گئے تھے، انکا ترجمہ ذیل میں درج کیا جاتا ہے۔

روز منگل، ۲۵ر اگست ۱۸۵۷ء صبح صادق سے طلوع آفتاب تک مذہبی مراسم کی ادائیگی میں وقت صرف ہوا۔ وقار الملک طبیب کو نبض شاہی دیکھنے کی عزت نصیب ہوئی، پھر بادشاہ مسند شاہی پر جلوہ افروز ہوئے اور ممتاز شرفا کو دربار شاہی میں باریاب ہونے کی عزت بخشی۔ انھوں نے بے حد ادب و احترام کا اظہار کیا۔ اعلیٰ حضرت نے دو فرمانوں کا معائنہ کیا، جو دفتر خاص میں تیار کیے گئے تھے۔ ایک بہادر علی خان، حسن علی خان، درگا پرشاد، بھوپ سنگھ افسران فوج پشاور کے نام تھا۔ جس میں انھیں تاکید کی تھی کہ مع فوج فی الفور دربار شاہی میں حاضر ہوں، اور معقول خزانہ بھی ہمراہ

لیتے آئیں، اور دوسرا بنام شہزادہ مرزا کوچک، جس میں تحریر تھا کہ نصیرآبادی فوج کی تنخواہ تقسیم کردی جائے۔ بعد ملاحظہ شاہی ان پر مہر خاص ثبت کی گئی، پھر حکم شاہی سے انھیں روانہ کرادیا گیا۔ پھر اعلیٰ حضرت نے ان درخواستوں پر توجہ مبذول فرمائی۔ اول تن آور علی خان پسر محمد عبدالغفار خان سکنہ مصطفیٰ آباد عرف رام پور کی درخواست جس میں وفاداری اور خیرخواہی کا اعتراف کیا گیا تھا اور تحریر تھا کہ دربار شاہی میں حاضر ہونے کی خواہش ہے۔ دوم راجہ ناہر سنگھ والی بلب گڑھ کی، جس میں اطاعت شعاری و خیرخواہی و وفاداری کا اظہار کیا گیا اور میر فتح علی خان کی معرفت روانہ کی گئی تھی۔ سوم وارث محمد خان بھوپالی کی درخواست جس میں ۵۶ انگریزوں کو قتل کردینے کی خبر درج کی ہوئی تھی اور ایک اعلان کی کاپی بھی درخواست کے ساتھ شامل تھی، جو شہر اور ملک کے باشندوں کو کفار کے قتل کی تحریص و ترغیب دلانے کے لیے تقسیم کیا گیا تھا۔ نیز ایک فرمان شاہی مانگا تھا، چہارم کاشی راؤ ہلکر والی اندور کی درخواست جس میں انھوں نے محبت و وفاداری جتائی تھی اور خیرخواہی بادشاہ کا اعتراف کیا تھا اور اپنے عزم بالجزم سے مطلع کیا تھا، جو انھوں نے انگریزوں کے قتل پر کیا تھا اور پانچ انگریزوں کے سر روانہ کیے تھے۔ پنجم میر محمد امیر خان پسر غلام محمد خان، ابن عبدالصمد خان رئیس وجانہ کی ایک درخواست تھی، متذکرہ بالا درخواستوں کو پڑھ کر اعلیٰ حضرت نے حکم دیا کہ بعد مزید غور ان کا جواب لکھا جائے۔ افسران فوج نے دربار شاہی میں حاضر ہوکر کہا کہ محمد بخت خان گورنر جنرل بہادر حضور کی فوج ظفر موج کے ہمراہ دشمنان دین سے لڑنے تشریف لے گئے ہیں اور بہت جانفشانی دکھا رہے ہیں۔ لہٰذا ان کے لیے کمک روانہ کرنی ضروری ہے۔ اسی وقت ایک حکم جاری کیا گیا کہ ایک دستہ فوج اور روانہ کردیا جائے۔

اس کے بعد اعلیٰ حضرت کمرۂ خاص میں تشریف لے گئے، دوپہر کو خاصہ تناول فرمایا، جس کی بعد دل بہلاتے رہے۔ پھر نماز ظہر ادا کی اور اس میں اتنے عرصے مصروف رہے کہ عصر کا وقت آگیا اور وہیں عصر کی نماز بھی ادا کی۔ دن ختم ہونے کے قریب وقارالملک (طبیب شاہی) کو نبض دکھانے کی عزت عطا فرمائی۔ بعض ازاں سیر و تفریح کی غرض سے سلیم گڑھ باغ تشریف لے گئے۔ سلیم گڑھ سے واپس ہوکر اپنے کمرۂ خاص میں چلے گئے۔ افسران فوج مقیم تیلی واڑہ حاضر ہوئے اور عرض کی کہ انھیں مدد نہیں پہنچائی گئی۔ پھر حضور دیوان خاص میں برآمد ہوئے اور دربار کیا۔ مگر فوراً ہی بہت خفا اور ناراض ہوکر واپس تشریف لے گئے اور غروب آفتاب کے بعد حاضرین دربار کو جانے کی اجازت مل گئی۔

بدھ ۲۶ راگست ۱۸۵۷ء صبح سے طلوع آفتاب تک اعلیٰ حضرت نماز و وظائف میں مشغول رہے۔ جس کے بعد وقار الملک (طبیب شاہی) کو نبض دکھائی۔ پھر تخت پر رونق افروز ہوئے۔ معزز عمائد نے چاند کے گرد ہالے کے حلقے کی طرح اعلیٰ حضرت کو گھیر لیا۔ افسران فوج نے آکر عرض کی کہ فوجیں غنیم سے مقابلہ کر رہی ہیں اور داد شجاعت دے رہی ہیں۔ لہٰذا ان کے لیے کمک روانہ کی جائے۔ احکام جاری کیے گئے کہ تمام پیدل و سوار مہم پر جائیں۔ بعدہ بادشاہ نے ان تین احکام کا ملاحظہ کیا، جو دفتر خاص میں تیار کیے گئے تھے اور مہر شاہی ثبت کر کے فوراً روانہ کرنے کی ہدایت کی۔

حکم اول بنام افسران افواج کہ نصف فوج نجف گڑھ کے مورچے پر اور نصف تیلی واڑے کے مورچے کو روانہ کی جائے۔ حکم دوم بنام مرزا ظہور الدین بہادر کہ محاصرہ کیا جائے اور فوج کو اپنے اختیار کامل میں رکھا جائے۔ حکم سوم بنام ٹھاکر چمن سنگھ، برائے طلبی برادران ٹھاکر مذکور شہزادہ محمد عظیم بہادر کی ایک درخواست موصول ہوئی جس میں اپنی مشکلات کا اظہار کیا، جو غنیم کی فوجوں کے اچانک آپڑنے سے پیش آئی تھی اور سپاہ و توپ خانہ کی مدد مانگی تھی۔ بادشاہ نے حکم دیا کہ ایک مراسلہ شاہی اس درخواست کے جواب میں لکھ دیا جائے۔ پھر بادشاہ دربار سے اٹھ کر اپنے کمرۂ خاص میں تشریف لے گئے۔ دوپہر کو خاصہ تناول فرما کر آرام کیا۔ نماز ظہر سے فارغ ہو کر ذکر و شغل میں مصروف ہو گئے۔ پھر عصر کی نماز پڑھی۔ غروب آفتاب کے قریب اعلیٰ حضرت مع اپنے تمام اراکین کے باغ سلیم گڑھ برائے تفریح تشریف لے گئے۔ شام کو واپس آئے اور کمرۂ خاص میں تشریف لے گئے۔

جمعرات ۲۷ راگست ۱۸۵۷ء علی الصباح اٹھے اور فرائض مذہبی انجام دے کر اعلیٰ حضرت نے طبیب شاہی وقار الملک کو نبض دکھائی۔ پھر اعلیٰ حضرت سریر آرائے مسند ہوئے۔ اور ان کے مشہور فرزندوں اور عمائد دربار نے مجرے عرض کیے، پھر بلدیو سنگھ کندے کش نے نذر گزرانی کی تو اعلیٰ حضرت نے بے انتہاء الطاف و شفقت سے ایک دوشالہ عطا کیا۔ اس نے دوبارہ نذر بطور شکرانہ پیش کی، جو قبول کر لی گئی۔ بادشاہ نے حسب ذیل چھ فرمانوں کا جو دفتر خاص میں تیار کیے گئے تھے ملاحظہ کر کے حکم دیا کہ مہر شاہی لگا کر روانہ کر دیے جائیں۔

اول حکم: بنام مرزا محمد خضر خان بہادر کہ انھیں چندہ وصول کرنے کا پورا پورا اختیار ہے، اور اس معاملے میں کوئی مانع نہ ہوگا۔

دوم حکم بنام مرزا مغل بہادر و مرزا خضر سلطان بہادر اور افسران فوج اور ممبران کورٹ کہ رام جی داس اگروال سے دو مرتبہ روپیہ وصول کرلیا گیا ہے، اب کسی حال میں مطالبہ نہ کیا جائے۔

سوم حکم بنام مرزا عبدالحسن عرف مرزا عبداللہ بجواب درخواست امیر خان ساکن دوجانہ جسے دربار میں حاضر ہونے کی ہدایت کی گئی تھی۔

فرمان چہارم بنام کاشی راؤ ہلکر والی اندور جن کو دربار میں مدعو کیا گیا تھا۔

حکم پنجم راجہ ناہر سنگھ رئیس بلب گڑھ کے نام کہ ابلق گھوڑا پہنچ گیا اور تم فوج کی چھیڑ چھاڑ سے خوف نہ کھاؤ۔

فرمان ششم بنام تن آور علی خان پسر عبداللہ خان رام پوری معرفت فتح علی خان لکھا گیا، جس میں انھیں حاضر دربار ہونے کا ارشاد ہوا تھا۔

کچھ سواروں نے افواج شاہی کی کارگزاریاں اور خصوصاً فوج نیمچ کے کارنامے سنانے شروع کیے اور علاقہ نجف گڑھ کے کسانوں کا ساتھ دینا بھی بیان کیا۔ طبیعت ناساز ہو جانے کی وجہ سے اعلیٰ حضرت نے طبیب شاہی کو طلب کیا اور محل سرا میں تشریف لے گئے۔ دوپہر کو اعلیٰ حضرت نے خاصہ تناول فرمایا، پھر آرام کیا۔ اس کے بعد ظہر کی نماز پڑھی، پھر ذکر و شغل میں مصروف ہو گئے، یہاں تک کہ عصر کا وقت آ گیا اور عصر کی نماز پڑھی، طبیب شاہی نے جو حاضر تھے دواء المسک بارد تیار کر کے دی۔ دن ختم ہونے کے قریب تمام حاضرین دربار کو جانے کی اجازت ملی۔

جمعہ ۲۸ راگست ۱۸۵۷ء صبح بعد ادائے فرائض مذہبی اعلیٰ حضرت نے طبیب شاہی کو نبض دکھائی، پھر دیوان خاص میں تشریف فرما ہوئے۔ جہاں رؤسا و عمائد نے مجرے عرض کیے، خواجہ اسماعیل خان کالپی کے ایک باشندے آئے اور باریاب ہونے کے بعد موافق معمول نذر پیش کی۔ اعلیٰ حضرت پر ضعف و ناتوانی کا غلبہ ہو گیا اور اٹھ کر کمرۂ خاص میں چلے گئے۔ دوپہر کا خاصہ تناول فرما کر آرام کیا۔ پھر حسب معمول ظہر و عصر کی نماز ادا کی۔ اس کے بعد حکیم صاحب کا تیار کردہ نقوع بارد پیا، آج دربار برخاست رہا۔ حسب ذیل احکام بحکم شاہی مہر ثبت کر کے جاری کیے گئے۔

(۱) بنام محمد شفیع برگیڈیئر و دیگر اشخاص بجواب درخواست کہ ''اعلیٰ حضرت ان سے ناراض یا خفا نہیں ہیں۔ اور نہ نیمچ کی فوج پر انھیں کسی قسم کا اشتباہ ہے۔''

(۲) بنام مرزا رحمت بہادر کہ ''امام باڑے کا کرایہ ادا کر دیا جائے۔ اس مد سے جو نیاز نذر

کے خرچ کے لیے وقف ہے۔"

(۳) بنام احمد علی خان رئیس فرخ نگر جنھیں چند توڑے دار بندوقیں بھیجنے کی ہدایت کی گئی۔

(۴) بنام بہادر جنگ، ان کے حدود میں چودہ اونٹوں کے چوری ہو جانے کی اطلاع۔ ایک درخواست عبداللطیف خان رئیس خان پور کی موصول ہوئی، جس میں انھوں نے اپنی ناسازی طبیعت کا عذر کیا تھا یا اور پھر کبھی دربار میں حاضر ہونے اور کئی ہاتھی ہمراہ لانے کا وعدہ کیا تھا۔

(بہادر شاہ کا مقدمہ۔ مرتبہ خواجہ حسن نظامی)

پنجاب میں بربریت:

۳۰ر جولائی ۱۸۵۷ء: جب لاہور میں میرٹھ کے دیسی سپاہیوں کی خبر پہنچی تو اس وقت لاہور میں مقیم دیسی سپاہیوں میں جوش و خروش پیدا ہو گیا۔ اس وقت سر جان لارنس لاہور میں موجود نہیں تھا۔ لاہور میں مقیم انگریز حکام نے پنجاب کو بغاوت سے دور رکھنے یا بغاوت ہونے کی صورت میں اس پر فوراً قابو پا لینے کے لیے ایک اجلاس کیا۔ اس اجلاس میں یہ فیصلہ ہوا کہ میاں میر (لاہور چھاؤنی) کے دیسی سپاہیوں سے ہتھیار چھین لیے جائیں اور لاہور کے قلعے کو مزید مضبوط کرنے کے لیے وہاں انگریز سپاہیوں کو بھیج دیا جائے۔ دیسی سپاہیوں سے ہتھیار چھین لیے گئے اور ان کی نقل و حرکت کی نگرانی ہونے لگی۔

۳۰ر جولائی کو پرکاش سنگھ اپنی تلوار لے کر نکلا اور اپنے ساتھی سپاہیوں سے کہنے لگا کہ وہ فرنگیوں کو قتل کر دیں۔ سب سے پہلے اس نے میجر اسپنسر کو قتل کیا۔ اسی اثناء میں آندھی چلنے لگی۔ باغی سپاہی میاں میر سے بھاگ نکلے۔ گرفتار ہونے والوں کو توپ دم کر دیا گیا۔ اب باغی سپاہیوں کا تعاقب شروع ہوا۔ باغیوں کی ایک بہت بڑی تعداد راوی پار ہو کر ایک چھوٹے سے ٹاپو میں اتر پڑی۔ انگریزی فوج کا ایک دستہ کشتیوں میں سوار ہو کر ٹاپو کی طرف بڑھا۔ باغیوں نے ہاتھ اٹھا دیے۔ انھیں کنارے پر لایا گیا۔ باغی سپاہیوں کے ہاتھ باندھ کر انھیں اجنالہ کے تھانے میں پہنچا دیا گیا۔ فریڈرک کوپر کے الفاظ میں "آدھی رات تک سارے باغیوں کو اجنالہ کے تھانے میں پہنچا دیا گیا۔ بارش ان سپاہیوں کی موت میں حائل ہو گئی۔"

یکم اگست ۱۸۵۷ء: سپاہیوں کے قتل کو اگلے دن پر اٹھا رکھا۔ پھانسیوں کے لیے رسے بھی تھے اور باغیوں کو ایک ساتھ قتل کرنے کے لیے پچاس سکھوں کا ایک دستہ بھی موجود تھا۔ گرفتار

ہونے والے سپاہیوں کی تعداد دو سو بیاسی تھی۔ چوں کہ یکم اگست کو عید الاضحیٰ تھی اس لیے انگریزی فوج کے مسلمان سواروں کو امرتسر بھیج دیا گیا تاکہ وہ وہاں عید منائیں۔ اس بہانے سے مسلمان سواروں کو اجنالہ سے امرتسر بھیج دیا گیا۔ ایک عیسائی افسر اپنے وفادار سکھوں کی مدد سے اگلی صبح ایک مختلف قسم کی قربانی کرنے کے لیے وہاں رہ گیا۔

''اگلی صبح سنتریوں نے لوگوں کے ہجوم کو اس طرف آنے سے روکے رکھا۔ افسروں کو جمع کرکے اس منظر کے اسباب سے آگاہ کیا گیا جو بہت جلد ان کے سامنے پیش کیا جانے والا تھا۔ باغیوں کو دس دس کی ٹولیوں میں تھانے سے باہر نکالا جاتا۔ پشت کی طرف ایک ہی رسی سے ان کے ہاتھ باندھ دیے جاتے۔ فائرنگ پارٹی انھیں اپنی گولیوں کا نشانہ بنالیتی۔ جب ایک سو پچاس باغی مارے جاچکے تھے تو ایک جلاد غش کھا کر گر پڑا۔ لہٰذا جلادوں کو آرام کرنے کا تھوڑا سا وقفہ دیا گیا۔ آرام کے بعد پھر قتل کا سلسلہ شروع ہوا۔ جب دو سو سینتیس سپاہی مارے جاچکے تو اطلاع دی گئی کہ باقی ماندہ سپاہی برج سے نکلنے سے انکار کر رہے ہیں۔ دروازے کھولے گئے۔ وہ سب کے سب تقریباً مر چکے تھے۔ غیر شعوری طور پر بلیک ہول کے حادثے کا اعادہ ہو چکا تھا۔ پینتالیس نعشوں کو کھینچ کر باہر نکالا گیا اور دوسرے باغیوں کی نعشوں کے ساتھ سب کو ایک مشترک گڑھے میں دفنا دیا گیا۔'' (کمپنی کی حکومت)

۱ر اگست ۱۸۵۷ء: سر جان لارنس نے فریڈرک کوپر کے افعال (وحشت و بربریت جس کا مظاہرہ اس نے مجاہدین آزادی کے قتل میں کیا تھا) کی تائید کرتے ہوئے، اسے ۲۔ اگست ۱۸۵۷ء کو لاہور سے ایک خط لکھا:

''ہندوستانی پیادوں کی ۲۶ رویں پلٹن پر تم نے جو فتح حاصل کی ہے، اس پر میں تمھیں مبارک باد دیتا ہوں۔ تم نے اور تمھاری پولیس نے بڑی دلیری سے باغیوں کی سرکوبی میں حصہ لیا۔ حکومت تمھاری بہت ممنون ہے۔ مجھے یقین ہے کہ باغیوں کی یہ سزا دوسروں کے لیے عبرت ہوگی۔ میں امید کرتا ہوں کہ تمام ایسے لوگوں کو قابو میں لانے کی تدبیروں پر عمل کیا جائے گا جو اس وقت تک مفرور ہیں۔''

رابرٹ مونٹ گمری نے بھی اپنے خط میں اسی قسم کے جذبات کا اظہار کرتے ہوئے لکھا ہے کہ:

''تم نے جو درست قدم اٹھایا اس کی جتنی بھی تعریف کی جائے کم ہے۔ ایسے نازک وقت

میں سوچنا، دیر کرنا یا لوٹنا فائدہ مند نہیں ہوتا۔ جب تک تم لوگ زندہ رہو گے تمھاری یہ کامیابی تمھارے اعزاز کی ٹوپی پر ایک قیمتی موتی کی طرح چمکتی رہے گی۔ یہاں کی باقی تین پلٹنیں بھی مذبذب تھیں۔ لیکن اب مجھے یقین ہے کہ وہ کوئی ایسی ویسی حرکت نہیں کریں گی۔ حال آں کہ میری دلی خواہش ہے کہ وہ اس قسم کی کوئی حماقت کریں تا کہ ان میں سے ایک سپاہی کو بھی زندہ نہ چھوڑا جائے۔'' (کمپنی کی حکومت، ص ۱۶-۴۱۲)

بڈھانہ کی تباہی:

۱۶ر ستمبر ۱۸۵۷ء بہر کیف شاملی میں تو یہ واقعات رونما ہوئے۔ ادھر بڈھانہ کے قلعے کو سرکر کے انگریزی فوج ۱۶ر ستمبر کو اسمتھ کی سرکردگی میں واپس آئی۔ جیسا کہ اس سے قبل بتایا جاچکا ہے۔ بڈھانہ کے قیام کے دوران لیفٹنٹ فریزر مع دو توپوں اور دو لیفٹنٹ جانسٹن مع سو سکھ پیدل فوج کے آملے تھے۔ اسمتھ کو اطمینان تھا کہ جب میں شاملی پہنچوں گا تو میرے اپنے آدمیوں اور جانسٹن کے ساتھ آئے ہوئے فوجی دستے اور فریزر کے ہمراہ آئی ہوئی توپوں سے وہاں کی فوج کو تقویت پہنچے گی۔ لیکن وہ رستہ ہی میں تھا کہ اسے تحصیل کی تباہی وتاراجی کی اطلاع مل گئی۔ پھر جب موقع پر پہنچا تو اپنی آنکھوں سے ویرانی کا منظر دیکھ لیا۔

اس کا اس کو یقیناً افسوس ہوا ہوگا اور غصہ! اور جوش میں ممکن ہے اس کے منہ میں یہ فقرہ جو مولانا عاشق الٰہی نے ''تذکرۃ الرشید'' میں درج کیا ہے نکل گیا ہو:

''تھانہ بھون کو بھی اسی طرح سے مسمار کرا کر چھوڑوں گا۔''

اس موقع پر یہ بات ذکر کے قابل ہے کہ مجاہدین کے ہاتھوں شاملی کے خزانے کے لوٹے جانے کا ذکر نہ انگریز وقائع نگار جارج کین نے کیا ہے نہ سرسید نے اور نہ اپنی رپورٹ میں مالکم لو نے اس کی طرف کوئی اشارہ کیا ہے۔ معلوم نہیں مولانا عاشق الٰہی نے کس بنیاد پر لکھ دیا کہ ''جس وقت گورنمنٹ کو اہلکاران تحصیل کے مارے جانے اور خزانے کے لوٹے جانے کی اطلاع ملی تو حاکم (غالباً مظفر نگر کا کلکٹر) شاملی پہنچا اور چاروں طرف نعشوں اور قصبہ کی ویرانی و بربادی کو دیکھ کر غصہ سے تھرا اٹھا۔''

ایسا معلوم ہوتا ہے کہ یہ فقرہ افواہوں کی بنیاد پر زیب قرطاس کر دیا گیا اور کسی مصدقہ بیان کی روشنی میں نہیں لکھا گیا۔ (جہاد شاملی اور تھانہ بھون، صفحہ ۶۱-۶۰)

ضلع سہارن پور کے حالات

تھانہ بھون کی تاراجی:

۱۷ ستمبر ۱۸۵۷ء: تحصیل شاملی کی تاراجی کے بعد انگریز حکام کے لیے ناممکن تھا کہ وہ درگزر سے کام لیتے۔ چناں چہ انھوں نے پوری تیاری کیے بغیر بعجلت تمام تھانہ بھون پر حملہ کر دیا۔ ہنری جارج کین رقم طراز ہے کہ:

''شاملی کی شکست نے انگریزوں کو بے انتہا مشتعل کر دیا۔ ایڈورڈس بڈھانہ کے قلعے کو فتح کر کے لوٹا تو اس کی فوج میں دو توپوں اور ۱۰۰ سکھ سپاہیوں کا اضافہ ہو گیا تھا۔ وہ سمجھ رہا تھا کہ میرے شاملی پہنچنے سے وہاں کی فوج کو تقویت ہوگی۔ لیکن راستہ ہی میں تھا کہ اسے تحصیل پر مجاہدین کے قبضے کی اطلاع ملی۔ اس نے تاراجی کا بدلہ لینے کے لیے اسی وقت تھانہ بھون پر حملہ کرنا چاہا۔ لیکن یہ معلوم کر کے کہ مظفر نگر کی حالت زیادہ تشویش ناک ہے وہ تھانہ بھون کو چھوڑ کر اس طرف متوجہ ہو گیا۔''

۱۴ ستمبر ۱۸۵۷ء کو انگریزوں کا دہلی پر مکمل قبضہ ہو گیا تھا۔ ادھر ایڈورڈس نے مظفر نگر پہنچ کر وہاں کے حالات درست کیے۔ جب ہر طرف سے اطمینان ہو گیا تو پھر تھانہ بھون کی جانب توجہ کی۔ ان ہی ایام میں کمشنر میرٹھ اور کلکٹر سہارن پور رابرٹ اسپنکی کے پاس کمک آ گئی اور کمشنر کا اشارہ پا کر ایڈورڈس نے تھانہ بھون کی طرف کوچ کر دیا۔ یہ پتا نہ چل سکا کہ اس کے پاس کل کتنی فوج تھی۔ اتنا ضرور معلوم ہوا کہ اس فوج میں کچھ سکھ پیدل اور سوار، کچھ گورکھے اور دو توپیں تھیں۔ اس فوج کے ساتھ دو سول افسر بھی تھے۔ ایک سوئنٹن میلول اور دوسرا مالکم لو۔ موخر الذکر کو رابرٹ اسپنکی نے آخری امدادی فوج کے ساتھ بھیجا تھا۔

کپتان اسمتھ اور لیفٹنٹ کوئیلر کی ماتحتی میں سکھوں اور گورکھوں کی ایک جمعیت نے حملہ کیا اور آبادی سے باہر کی چند عمارتوں پر قبضہ کر لیا۔ کچھ فوج شہر میں داخل ہو گئی۔ لیکن مجاہدین نے یہ حملہ بری طرح پسپا کر دیا۔ انگریزی فوج کے ۱۷ آدمی مارے گئے اور ۲۵ زخمی ہوئے۔ جن میں دو افسر تھے۔ پسپائی کے وقت میلول اور مالکم لو نے بڑی سمجھ داری سے کام لیا اور وہ اپنی فوج کو تباہی سے بچا کر نکال لے گئے۔ حال آں کہ مالکم لو ایک معرکے میں زخمی ہو گیا۔ اس کے زخمی ہونے کا واقعہ

اس طرح بیان کیا جاتا ہے کہ ''جب وہ اپنی فوج کو لیے ہوئے ایک گاؤں کی تنگ گلیوں میں گزر رہا تھا تو ایک جتھے نے اس کو گھیر لیا۔ دست بدست لڑائی جس میں اس کو تلوار کے تین گہرے زخم آئے۔''

اس شکست نے انگریزوں میں کافی کھلبلی مچادی۔ کمشنر اسپنکی کو اور اسپنکی فوجی افسروں اور کلکٹر مظفر نگر ایڈورڈس کو متہم گردانے لگی۔ لیکن کین کی رائے ہے کہ اس کی پوری ذمہ داری درحقیقت کمشنر پر عائد ہوتی ہے۔ اس لیے کہ اس نے تھوڑی سی فوج بھیج کر ایڈورڈس کو یہ نادر شاہی حکم دیا تھا کہ:

''فوراً بڑھو اور مفسدوں کا سر کچل دو۔''

مگر جب دوبارہ غور کرنے پر اسے محسوس ہوا کہ یہ احکامات قبل از وقت نافذ کردیے گئے ہیں تو اس نے حملہ کو کچھ عرصے کے لیے ملتوی کردینا چاہا مگر کامیاب نہ ہوسکا۔ اس لیے کہ اس کے پہلے حکم کے مطابق حملہ کیا جاچکا تھا اور وہ پسپا بھی ہو چکا تھا۔

اس شکست کے تھوڑے ہی عرصے کے بعد مزید کمک آگئی اور ستمبر کا مہینہ ختم ہونے سے پہلے انگریز فوج نے بغیر کسی مزاحمت کے تھانہ بھون پر قبضہ کرلیا۔ مجاہدین اور ان کے متعلقین اپنے گھروں کو چھوڑ کر مختلف شہروں اور قصبوں کی طرف چلے گئے۔

اس اجمال کی تفصیل ہمیں ہنری مالکم لو کے بیان میں ملتی ہے۔ اس لیے کہ وہ خود اول سے آخر تک اس معرکہ میں شریک رہا۔

۱۶ ستمبر ۱۸۵۷ء بڑھانہ سے فوج کی واپسی ۱۶ ستمبر کو ہوئی تھی۔ اگلے ہی دن افسر متعلقہ فوج لے کر تھانہ بھون کی طرف چل دیا۔ چناں چہ ہنری مالکم لکھتا ہے:

''۱۷ ستمبر (بروز جمعرات) جب فوج شاملی سے تھانہ بھون کی طرف جارہی تھی تو اطلاع ملی کہ باغیوں نے وہاں سے مظفر نگر پر حملے کے لیے کوچ کردیا ہے۔ لہٰذا ہم واپس لوٹے اور مظفر نگر کی طرف چل دیے۔ لیکن وہاں پہنچ کر معلوم ہوا کہ یہ اطلاع غلط ہے۔

جب اس طرف سے اطمینان ہوگیا تو پھر تھانہ بھون کی جانب یلغار کی اور نہایت سرعت سے قطع منازل کرتی ہوئی انگریزی فوج ۱۹۔ ستمبر کی صبح تھانہ بھون پہنچ گئی۔ یہ تفصیل بھی ہمیں خود مالکم لو ہی کی رپورٹ سے معلوم ہوتی ہے۔ وہ لکھتا ہے:

۱۹ ستمبر ''۱۹ ویں تاریخ (سنیچر) کو چھ بجے صبح فوج تمام رات سخت یلغار کرتی ہوئی تھانہ

بھون جا پہنچی۔"

ایسا معلوم ہوتا ہے یا تو انگریزی فوج کی نقل وحرکت کی اطلاع پہلے ہی تھانہ بھون پہنچ چکی تھی یا وہاں کے لوگوں نے یہ بات سمجھ لی تھی کہ شاملی کا بدلہ انگریز ضرور لے گا۔ مولانا عاشق الٰہی کی تحریر سے پہلے قیاس کی تائید ہوتی ہے۔ وہ لکھتے ہیں:

"تھانہ میں خبر گرم ہوئی کہ علی الصباح فوج یہاں پہنچنا چاہتی ہے۔"

لہٰذا تھانہ میں مدافعت کی تیاریاں پہلے ہی کر لی گئی تھیں۔ مالکم لو نے اپنی رپورٹ میں لکھا ہے:

"جس سڑک سے ہو کر ہم گزرے اس کے آخری تین میل پر وقفہ وقفہ سے دشمن کے تھوڑے تھوڑے آدمی متعین ہوئے۔"

مالکم لو کی مکمل رپورٹ یہ ہے:

"۱۹ر تاریخ (سنیچر) کی چھ بجے صبح فوج تمام رات سخت یلغار کرتی ہوئی تھانہ بھون پہنچی۔ جس سڑک سے ہو کر ہم گزرے اس کے آخری تین میل پر وقفے وقفے سے دشمن کے تھوڑے تھوڑے آدمی متعین تھے، لیکن جیسے جیسے ہماری پیش قدمی ہوتی گئی وہ تھانہ بھون کی جانب ہٹتے گئے۔ دشمن کی ایک ٹولی جو ایک گنبد میں متعین تھی، چھروں کی چند باڑیں چلنے سے دہل کر شہر پناہ کے اندر داخل ہو گئی اور ہماری فوج نے تھوڑی سی گولہ باری کر کے ہلا بول دیا اور شہر کے ایک حصے پر قبضہ کر لیا۔ دو توپیں بھی ہمارے ہاتھ آئیں۔ لیکن گورکھوں اور سکھوں کی بدتدبیری اور غلط طریقۂ کار کی بنا پر حملہ آور فوج (انگریزی فوج) کو پھر شہر کے باہر دھکیل دیا گیا۔ ایک بڑی تعداد ہلاک اور زخمی ہوئی اور توپوں پر پھر دشمن کا قبضہ ہو گیا۔ آخر کار طے پایا کہ انگریز فوج مظفر نگر کی طرف پسپائی اختیار کرے۔"

غرض اس پہلے حملے میں انگریزی فوج کو مکمل طور پر شکست ہوئی اور مجاہدین اس مرتبہ بھی کامیابی سے ہم کنار ہوئے۔ مجاہدین تھانہ بھون کے مقابلے میں انگریزی فوج کی یہ دوسری شکست تھی۔ انگریز فوج کو پسپا ہوتے وقت ایک گاؤں سے گزرنا پڑا۔ گاؤں کے ایک بڑے جتھے سے اس فوج کا مقابلہ ہوا۔ دست بدست جنگ ہوئی جس میں "مالکم لو" کے تلوار کا زخم آیا۔

اس واقعے کا ذکر بھی مالکم نے اپنی رپورٹ میں تفصیل سے کیا ہے۔ وہ لکھتا ہے:

''جب ہم پسپا ہو رہے تھے تو سواروں اور پیدلوں کی ایک بڑی جماعت نے جس کا اندازہ ایک ہزار سے ڈیڑھ ہزار نفر تک کیا گیا ہے ہمارا سامان لوٹنے کی کوشش کی۔ ہمارے سواروں نے تین ٹکڑیوں میں ان پر حملہ کیا۔ افغان سواروں کی کمان مسٹر پامر کر رہے تھے۔ جو سول سروس کے آدمی تھے۔ اس کی وجہ یہ تھی کہ کپتان اسمتھ زخمی ہو چکے تھے۔ پنجاب کیولری کو دو حصوں میں بانٹ کر ترتیب وار مسٹر میلول کی جو سول سروس کے آدمی تھے اور میری سرکردگی میں دے دیا۔ باغیوں کو پوری طرح ہزیمت ہوئی۔ دو میل سے زیادہ فاصلہ تک ان کا تعاقب کیا گیا۔ یہاں تک کہ وہ اپنے گاؤں کی چہار دیواری تک پہنچ گئے اور ان کے تقریباً سو آدمی ہلاک ہوئے۔ مارے جانے والوں میں کئی نہایت سربرآوردہ لوگ تھے۔ انھوں نے ہی ان باغیوں کی قیادت کی تھی۔ اس حملے کے دوران مجھے تلوار کا ایک شدید زخم آیا اور پہلی پنجاب کیولری کے دو سوار اور چند افغان سوار زخمی ہوئے۔''

تھانہ بھون پر پہلے حملے میں پسپائی و ناکامی کوئی معمولی بات نہیں تھی۔ تحصیل شاملی کی تباہی کا جو اثر انگریز حکمرانوں پر ہوا ہو گا وہ تو اپنی جگہ ہے لیکن اس شکست نے اس کو بھی پس منظر میں ڈال دیا۔ اس سے انگریز حکمرانوں میں کافی کھلبلی مچ گئی۔ حکام ایک دوسرے کو مورد الزام ٹھہرانے لگے۔ چناں چہ ہنری جارج کین نے کمشنر کو اس کا ذمہ دار قرار دیا اور مالکم لو کے نزدیک:

''گورکھوں اور سکھوں کی بدتدبیری سے یہ حادثہ پیش آیا۔''

قرین صحت امر یہ ہے کہ شاملی کی تباہی نے فوجی افسروں کو اتنا مشتعل کر دیا کہ انھوں نے نتائج و عواقب پر غور کیے بغیر فوراً جوابی کارروائی کرنے کا فیصلہ کر لیا۔ بڈھانہ پر قبضہ اور دوسری چھوٹی چھوٹی مہمات میں کامیابی نے ان افسران کو حد سے زیادہ مغرور بھی کر دیا تھا۔ چناں چہ وہ مجاہدین تھانہ بھون کو بھی اپنے لیے نرم چارہ سمجھ کر شاملی پہنچنے کے دوسرے ہی دن تھانہ بھون کی طرف چل پڑے تھے۔ وہ تو راستے میں انھیں یہ غلط اطلاع ملی گئی کہ مجاہدین تھانہ بھون مظفر نگر پر حملہ آور ہوئے ہیں۔ اس لیے انھوں نے اپنے قدم تھانہ بھون کے راستے سے مظفر نگر کی طرف موڑ

دیے اور پھر جب وہاں پہنچ کر معلوم ہوا کہ یہ اطلاع غلط ہے تو وہ کچھ توقف کیے بغیر تھانہ بھون کی طرف چل دیے اور مالکم لو کے الفاظ میں:

"فوج تمام رات سخت یلغار کرتی ہوئی تھانہ بھون جا پہنچی۔"

چوں کہ یہ فوج مظفر نگر ہوتی ہوئی آئی تھی، اور کلکٹر مظفر نگر ایڈورڈس کو ان سب باتوں کا علم تھا نیز اس نے بھی فوجیوں کو اس جلد بازی سے نہیں روکا تھا۔ لہٰذا یہ کہنا بیجا نہ ہوگا کہ یہ ناکامی فوجی افسروں اور کلکٹر ایڈورڈس کی جلد بازی اور بدتدبیری کے سبب ہوئی۔ بعد میں کین نے کسی مصلحت کی بناء پر اس کی ذمہ داری کمشنر میرٹھ پر ڈالی اور ہنری مالکم لو نے خود کو اور دیگر انگریز افسران کو ہائی کمان کے عتاب سے بچانے کے لیے جو رپورٹ پنجاب کے فوجی کیمپ کو بھیجی اس میں سارا الزام گورکھوں اور سکھوں کے سر منڈھ دیا۔

پہلے حملے میں انگریزی فوج کی پسپائی کے بعد کے حالات کا زبانی روایتوں اور مولانا عاشق الٰہی میرٹھیؒ کے مجمل بیان کے سوا کوئی مستند ذریعہ یا مآخذ موجود نہیں ہے۔ اس لیے نہ واقعات کو پوری جزئیات و تفصیلات ساتھ بتایا جاسکتا ہے، نہ واقعات کو تاریخ کی روشنی میں پیش کیا جاسکتا ہے اور نہ تاریخوں کا صحیح تعین کیا جاسکتا ہے۔

قیاس کی بنیاد پر یہ کہا جاسکتا ہے کہ دو مکمل شکستوں کے بعد انگریز حکام نے سمجھ لیا تھا کہ تھانہ بھون کی تحریک دوسری وقتی اور معمولی شورشوں کی طرح نہیں ہے۔ اس میں ظاہری تیاریوں اور مادی وسائل کے علاوہ ایک خاص جوش اور جذبہ بھی کارفرما ہے۔ لہٰذا اس کو دبانے کے لیے کافی فوجی طاقت اور اسلحہ جنگ کی ضرورت ہے۔

اس حقیقت کو پالینے کے بعد اس دفعہ حکام نے نری جذباتیت اور جلد بازی سے کام نہیں لیا بلکہ پوری توجہ وسائل کی فراہمی پر مرکوز کردی۔ کچھ عرصے تک سپاہ اور اسلحہ کے جمع کرنے کا کام ہوتا رہا۔ کئی جگہ سے کمک آگئی اور ستمبر کا مہینہ ختم ہونے سے پہلے انگریزی فوج نے تھانہ بھون پر دوسرا حملہ کردیا۔

اس اثناء میں مجاہدین بھی غافل نہیں رہے۔ وہ برابر تیاری اور شہر کے استحکامات میں لگے رہے۔ جب انگریزی فوج کی آمد کی اطلاع ملی تو وہ شہر پناہ کے تمام پھاٹک بند کرکے محصور ہوگئے اور مدافعانہ جنگ کا انتظام مکمل کرلیا۔

زبانی روایتوں سے معلوم ہوا ہے کہ اس مرتبہ انگریزی فوج نے تھانہ بھون پہنچ کر اپنا مورچہ

شہر کے مشرقی جانب کرشنی ندی کے قریب قائم کیا اور توپیں ایک بڑا دے پر نصب کیں، جو ماضی قریب تک موجود تھا اور جس کو راقم الحروف (ثناء الحق صدیقی) نے بھی اپنے بچپن میں دیکھا تھا۔

مالکم لو کی رپورٹ سے یہ تو معلوم ہوا ہے کہ کم از کم دو توپیں مجاہدین کے پاس بھی موجود تھیں۔ جن کو انھوں نے مناسب جگہوں پر نصب کر کے جوابی گولہ باری کے لیے تیاری کر لی۔

انگریزی مورچے سے شہر پر گولہ باری شروع ہوئی۔ مجاہدین نے بھی اس کے جواب میں گولہ باری کی۔ ساتھ ہی دونوں جانب سے گولیوں کا بھی تبادلہ ہونے لگا۔ جو کافی عرصے تک جاری رہا۔ مجاہدین میں نہ جوش و جذبہ کی کمی تھی اور نہ ہمت و مردانگی اور جنگی صلاحیت میں وہ کچھ کم تھے۔ لیکن جہاں تک اسلحہ کا تعلق ہے اس میں وہ ہمیشہ انگریزی فوج سے کمتر رہے۔ چناں چہ بہت جلد ان کے گولہ بارود کا ذخیرہ ختم ہو گیا اور آخر کار یہ نوبت آگئی کہ انگریزی مورچے سے گولے آ آ کر گرتے اور پھٹتے رہے اور گولیوں کی بارش ہوتی رہی۔ عمارتوں کو نقصان پہنچتا رہا اور جانیں تلف ہوتی رہیں۔ اس صورت میں مجاہدین کے پاس اس کے سوا کوئی چارۂ کار نہ رہا کہ یا تو شہر سے باہر نکل کر دست بدست جنگ کریں یا ہتھیار ڈال کر خود کو دشمنوں کے حوالے کر دیں۔ دونوں صورتوں میں تباہی لازمی تھی۔ خصوصاً عورتوں، بچوں اور ان لوگوں کے لیے جو لڑنے کے قابل نہیں تھے۔ لہٰذا مناسب سمجھا گیا کہ عورتوں بچوں کو سب سے پہلے مختلف دروازوں سے نکال دیا جائے۔ اس تجویز پر عمل کیا گیا۔ مختلف خاندان قافلوں کی شکل میں گاڑیوں، بہلیوں وغیرہ پر سوار ہو کر جس طرف کو ممکن ہوا نکل گئے اور چھپتے چھپاتے رام پور، گنگوہ، انبیٹھہ چلے گئے۔ قاضی عنایت علی کا بھرا پرا گھر چشم زدن میں خالی ہو گیا۔ ان کے دوسرے اعزا بھی وطن چھوڑنے پر مجبور ہو گئے۔ جب اس طرف سے اطمینان ہو گیا تو مجاہدین خود بھی ایک ایک دو دو کر کے رخصت ہو گئے۔

جب مجاہدین اور ان کے لواحقین سے شہر خالی ہو گیا تو انگریزی فوج شہر میں داخل ہوئی اور لوٹ مار اور غارت گری کا بازار گرم ہو گیا۔ موقع پرست لوگ انگریزی فوج کے ہمدرد بن گئے اور انھوں نے مخبری کر کے اپنا اعمال نامہ سیاہ کیا اور بعض نے اپنی اگلی پچھلی دشمنیاں نکالیں۔ مخالفین پر جھوٹے الزامات لگا کر ان کو تختۂ دار پر کھنچوایا۔ مال و املاک پر قبضہ کرایا اور گھروں کو تاراج کرایا۔ غرض جو کچھ ممکن ہو سکا کیا۔ صلے میں زمینیں اور جائیدادیں پائیں اور انعامات حاصل کیے۔

بڑے بوڑھوں کی زبانی معلوم ہوا ہے کہ قاضی عنایت علی کے گھر والے خود تو بے سروسامانی کی حالت میں نکل کھڑے ہوئے تھے۔ لیکن جانے سے پہلے اندر کی کوٹھری میں جلدی جلدی ایک

بڑا گڑھا کھدوا کر اپنے تمام زیورات، اشرفیاں اور جواہرات اس میں بھروا دیے تھے اور پھر اس جگہ اناج کا ڈھیر لگا دیا تھا۔ خیال تھا کہ اگر پھر واپس آئے تو نکال لیں گے۔ لیکن جن لوگوں کے ذریعے یہ کام کرایا گیا تھا وہی انگریزوں کے خیر خواہ بن گئے اور انھوں نے اس کی نشان دہی کر کے وہ سب نکلوا دیا۔

بعض لوگ ایسے بھی تھے جنھوں نے اپنی وفاداری کو نہیں بدلا۔ وہ اس لوٹ اور غارت گری کو دیکھ کر اشکبار ہوئے۔ انگریزی فوج کے افسران نے ان کو روتا دیکھ کر پوچھا۔ ''ویل! کیا عنایت علی تمھارا رشتہ دار تھا جس کی وجہ سے تم رو رہا ہے؟'' انھوں نے اپنی جان کے خوف سے کہہ دیا ''نہیں صاحب! ہمیں تو زکام ہو رہا ہے جس کی وجہ سے آنکھوں اور ناک سے پانی بہہ رہا ہے۔''

مولانا عاشق الٰہی کی کتاب تذکرۃ الرشید سے تھانہ بھون کی تباہی و تاراجی کے متعلق ایک مختصر سا بیان نقل کر کے انگریز قوم کی تہذیب و شائستگی کا ایک ہلکا سا نمونہ پیش کیا جاتا ہے۔ وہ لکھتے ہیں:

> ''صبح صادق نمودار ہوئی تو بے درماں ساتھ لائی، تھانہ بھون کو انگریزی فوج نے گھیر لیا اور مشرقی سمت سے گولہ باری شروع ہوگئی۔ دن ہوا تو فوج قصبے میں داخل ہوگئی۔ قتل و قتال اور لوٹ مار کا بازار گرم ہوا۔ رات کی تاریکی چھانے سے پہلے شہر پناہ کے چاروں دروازے مسمار کر دیے گئے اور مکانات پر مٹی کا تیل چھڑک کر آگ لگا دی گئی...... حاکم ضلع کا وہ قول صحیح ہوا کہ اسی طرح تھانہ بھون کو مسمار کر کے چھوڑوں گا۔''

بزرگوں کی زبانی سنا ہے کہ جس محل میں قاضی عنایت علی کی سکونت تھی اور جہاں سے علم آزادی بلند ہوا تھا اس کا دروازہ اتنا اونچا تھا کہ اس کے پیچھے کی ڈیوڑھی تین منزلہ تھی۔ تینوں منزلوں پر موٹے موٹے لکڑی کے شہتیر ڈال کر مضبوط کڑیوں اور تختوں سے انھیں پاٹا گیا تھا۔ گولہ باری سے اوپر کی چھت میں آگ لگ گئی اور وہی پھیل کر نیچے کی چھتوں تک پہنچ گئی۔ ان چھتوں سے کافی عرصے تک دھواں نکلتا رہا۔ اور آخر کار تینوں چھتیں جل کر ختم ہوگئیں۔ لیکن توپ کے گولے دروازے کو براہ راست زیادہ نقصان نہیں پہنچا سکے۔ صرف سامنے کی طرف لگی ہوئی پتھر کی جالیاں ٹوٹ گئیں۔ دروازہ ایک صدی بعد تک جوں کا توں کھڑا رہا اور اس وقت بھی وہ اس حالت میں تھا کہ اگر انسان کا تخریبی عمل بروئے کار نہ آتا تو آیندہ صدیوں تک کھڑا ہوا اپنی عظمت رفتہ کی داستان سناتا رہا۔ ۱۹۴۷ء کے انقلاب نے اس محل کے مکینوں کو دوسری مملکت میں لا ڈالا۔ اور کسی

بدذوق شرنارتھی کو لے جاکر اس میں بٹھادیا۔ مشہور ہے کہ اس شرنارتھی نے اس خیال سے کہ اس دروازے کے نیچے بڑا خزانہ دفن ہے، بہت سارو پیہ خرچ کر کے ساڑھے تین سو سال کی اس یادگار کو جڑ بنیاد سے کھدوادیا۔ لیکن یہ ایک من گھڑت داستان معلوم ہوتی ہے۔ زیادہ امکان اس کا ہے کہ شرنارتھی صاحب کے ذوق سلیم نے اس طرز تعمیر کو پسند نہیں کیا ہوگا۔ اس کی بلند بالا برجیوں کو دیکھ دیکھ کر ان کو وحشت ہوتی ہوگی لہذا اس وحشت کو دور کرنے کی تدبیر ان کے ذہن میں یہ آئی ہوگی کہ دہشت پیدا کرنے والے اس نشان ہی کو مٹادیں۔ غرض انھوں نے تو ماضی کی اس یادگار کو منہدم کرا کر اپنی وحشت کا علاج کرلیا لیکن نہ معلوم کتنے دلوں کو پارہ پارہ کردیا۔

مجاہدین آزادی

مجاہدین میں خصوصیت سے ان حضرات کے جنھوں نے قیادت کی تھی یا وہ قاضی عنایت علی کے قریبی عزیز تھے، وارنٹ گرفتاری جاری ہوئے۔ لہذا انھیں خود کو پوشیدہ رکھنا پڑا۔ وہ حضرات کافی عرصے تک مختلف مقامات پر چھپتے پھرے۔ جب حکومت برطانیہ کی جانب سے عام معافی کا اعلان ہوا تو ان میں سے اکثر کو کچھ سکون نصیب ہوا۔ لیکن بعض اس وقت بھی پریشان رہے۔ ان میں سب سے اہم شخصیت قاضی عنایت علی کی تھی۔

حضرت مہاجر مکیؒ:

حضرت حاجی امداد اللہؒ تو معافی کے اعلان سے پہلے ہی مکۂ معظمہ کی جانب ہجرت کر گئے تھے۔ آپ تھانہ بھون سے نکل کر گنگوہ، انبالہ، نکھری، پنجلاسہ تھوڑے تھوڑے عرصے مقیم رہے اور پھر براہ پنجاب و سندھ بندرگاہ کراچی پہنچے۔ وہاں سے بذریعۂ بحری جہاز مکۂ معظمہ تشریف لے گئے اور وہیں حیات مستعار کے باقی دن گزارے۔ ہندوستان سے نکلنے میں آپ کو تقریباً سوا دو سال لگ گئے۔ اس اثناء میں حکومت نے آپ کو گرفتار کرنے کی پوری پوری کوشش کی۔ لیکن تائید غیبی آپ کے شامل حال رہی اور آپ گرفتار نہ ہوسکے۔ ذیقعدہ ۱۲۷۶ھ میں آپ مکۂ معظمہ پہنچے اور جمادی الاخریٰ ۱۳۱۷ھ میں رہگزائے عالم بقا ہوئے۔ اس طرح چالیس سال سے زیادہ آپ نے بیت اللہ کے جوار میں گزارے اور جنت المعلا میں آخری آرام گاہ نصیب ہوئی۔

حضرت نانوتویؒ:

حضرت مولانا قاسم نانوتوی کو بھی حکومت نے گرفتار کرنے کی کوشش کی۔ لیکن تین دن تک

آپ گھر میں چھپے رہے۔ پھر آزادی سے باہر پھرنے لگے۔ کچھ عرصے کے لیے اپنے برادر نسبتی شیخ نہال احمد دیوبندی کے گاؤں پر تشریف لے گئے۔ کئی مرتبہ پولیس کا سامنا بھی ہوا۔ لیکن خدا کے فضل وکرم سے گرفتاری سے محفوظ رہے۔ معافی کا اعلان ہونے کے بعد آپ نے تبلیغ اور دینی علوم کی اشاعت کا کام پوری لگن سے انجام دیا۔ دارالعلوم دیوبند آپ کی علمی یادگار ہے۔ عمر نے وفا نہ کی اور آپ ۱۲۹۵ھ میں فوت ہو گئے۔ آپ کا مزار پرانوار دیوبند میں ہے۔

حضرت گنگوہیؒ:

حضرت مولانا رشید احمد گنگوہی تھانہ بھون سے چل کر رام پور منہاران پہنچے۔ وہاں حکیم ضیاء الدین کے مکان میں پوشیدہ رہے۔ لیکن کسی بد باطن نے مخبری کر دی۔ آپ گرفتار ہوئے اور چھ مہینے جیل میں رہے۔ لیکن کوئی ٹھوس ثبوت نہ ملنے پر چھ ماہ بعد رہا کر دیے گئے۔

حضرت محمد تھانویؒ:

حضرت مولانا شیخ محمد تھانوی بھی قاضی عنایت علی کے پھوپھی زاد بھائی اور بہنوئی ہونے کی وجہ سے انگریزی حکومت کے نزدیک مجرم تھے۔ لہٰذا ان کی گرفتاری کے بھی وارنٹ جاری ہو گئے۔ جس کی وجہ سے ان کو رام پور منہاران میں کافی مدت تک شیخ سالار چشتی رحمۃ اللہ علیہ کے مکان میں پوشیدہ رہنا پڑا۔ وہاں سے ۱۲۷۷ھ/۱۸۶۱ء میں ٹونک تشریف لے گئے۔

حضرت شیخ محمد صاحب کے تھانہ بھون سے رام پور تک کے سفر کا حال ان کی اہلیہ بی عائشہ کے پاس رہنے والی ایک خاتون ''بی کیمو'' نے راقم الحروف کی والدہ کو سنایا تھا۔ انھوں نے کہا:

> ''بیٹی میں تمھاری دادی بی عائشہ کے ساتھ گھر سے نکلی۔ بی عائشہ نے اپنے ساتھ کچھ بھی نہیں لیا۔ صرف حمائل شریف گلے میں لٹکائی اور نکل کھڑی ہوئیں۔ ہم لوگ ایک بہلی میں سوار ہو کر گھر سے روانہ ہوئے۔ اس وقت تو کچھ سمجھ میں نہیں آیا کہ کہاں جائیں۔ جب آبادی سے نکل کر چند کوس کا فاصلہ طے کر لیا اور کسی قدر اطمینان ہوا تو رام پور منہاران جانے کی صلاح ہوئی لیکن سیدھے راستے سے جانا خطرہ سے خالی نہ تھا۔

لہٰذا ایک لمبا راستہ اختیار کیا گیا۔ سب یا سلام! یا سلام کا ورد کر رہے تھے۔ کئی وقت سے کچھ کھایا نہیں تھا۔ لیکن ڈر اور خوف میں کسی کو بھوک کا احساس بھی نہیں ہوا...... دوسرے دن شام کو ایک

گاؤں میں پہنچے، وہاں ایک تیلی نے انسانیت برتی۔ ہمیں رات کو اپنے ہاں ٹھہرالیا۔ ایک کوٹھری جس میں چندروز پہلے بھوسا بھرا ہوا تھا۔ ہمارے قیام کے لیے دی۔ بھوسے کی بدبو سے رات کو نیند بہت کم آئی۔ لیکن اس وقت اتنا ہی غنیمت تھا۔ رات کو تیلی کی بیوی نے ہمیں کھانے کے لیے چنے کا ساگ اور مکئی کی روٹیاں دیں۔ ساگ بہت سے تیل میں بگھرا ہوا تھا۔ ادھر اب ہمیں بھوک بھی محسوس ہونے لگی تھی۔ اس حالت میں مکئی کی روٹیاں اور چنے کے ساگ نے وہ مزا دیا جو زندگی بھر کسی کھانے میں نہیں ملا تھا۔

بٹی! تیلی تھا تو غریب، مگر اس میں اتنی انسانیت تھی کہ میں اب تک اس کے اچھے برتاؤ کو نہیں بھولی۔ رات گاؤں میں گزار کر صبح کو رام پور کی طرف روانہ ہو گئے اور خیریت سے منزل مقصود پر جا پہنچے۔ وہاں لوگوں نے ہمیں اس حال میں دیکھا تو رونے لگے۔ لیکن ہمارے خیریت سے پہنچنے پر اللہ کا شکر ادا کیا۔ تقریباً دو سال ہم رام پور میں رہے۔ لیکن انگریزی حکومت کے خوف سے ہم نے اپنے قیام کو پوشیدہ رکھا۔ تمھارے دادے ابا (مولانا شیخ محمد) زیادہ تر گھر ہی میں رہتے تھے اور اپنا وقت یادِ الٰہی اور لکھنے پڑھنے میں صرف کرتے تھے۔"

قاضی محبوب علی:

قاضی عنایت علی کے چچا قاضی محبوب علی اور ان کے بیٹے قاضی عبدالواحد کو بھی تھانہ بھون چھوڑنا پڑا اور رام پور منہاران میں پناہ لینی پڑی۔ اگرچہ قاضی محبوب علی نے زندگی بھر اپنی اطاعت اور وفاداری سے انگریز حکام کو راضی رکھا مگر بقول مولانا شیخ محمد:

"بحکم تقدیر اس ہنگامے میں وہ بھی موردِ عتابِ شاہی ہوئے اور ریاست و جائیدادیں ان کی ضبط ہوئیں۔" ۱۲۷۵ھ یا ۱۲۷۶ھ میں قاضی محبوب علی اچانک فوت ہو گئے اور ان کے صاحبزادے قاضی عبدالواحد بعد اعلان معافی تھانہ بھون لوٹ آئے اور باقی زندگی نامساعد حالات میں گزار کر دنیا سے رخصت ہوئے۔ دو بیٹے قاضی محمد منعم اور قاضی محمد ارحم چند سال بعد بھوپال چلے گئے اور وہاں ملازم ہو کر اور اپنے فرضِ منصبی کو بحسن و خوبی انجام دے کر انھوں نے پھر کچھ عزت حاصل کر لی۔ لیکن خاندان کی دیرینہ عظمت کو واپس نہ لا سکے۔ دونوں کا انتقال بھوپال میں ہوا۔

قاضی عنایت علی:

قاضی عنایت علی بھی تھانہ بھون کو چھوڑنے پر مجبور ہوئے۔ لیکن ان کی تلوار اس کے بعد بھی

بہت عرصے تک نیام میں نہیں گئی۔ وہ اپنے وطن سے نکل کر نجیب آباد گئے اور وہاں نواب محمود خان اور دوسرے مجاہدین کے ساتھ مل کر کئی ماہ تک انگریزی فوج کا مقابلہ کرتے رہے۔ سرسید نے اپنی تصنیف سرکشی ضلع بجنور میں لکھا ہے کہ:

> ''پرتاب سنگھ کے گڑھ مکٹیشر چلے جانے کے بعد (یعنی اوائل نومبر میں) جنرل نا محمود خان چودھری کی جانب سے مطمئن ہو گیا۔ گنگا پار کے جو باغی تھے انھوں نے بھی اپنے لیے بجنور سے زیادہ کوئی مامن نہ دیکھا۔ چناں چہ دلیل سنگھ اور قدم سنگھ گوجر اور حسن رضا عرف چھٹن اور عنایت علی قاضی تھانہ بھون مع اپنے رفیقوں اور ساتھیوں کے اس ضلع میں آئے۔ اس ضلع کے باغیوں نے ان کو امن دیا...... قاضی عنایت علی اور دلیل سنگھ گوجر اور حسن رضا عرف چھٹن دو ضرب توپ اور دو ہزار آدمی کی جمعیت سے میران پور اتر آئے اور میران پور کے تھانے کو لوٹ لیا اور کئی آدمیوں کو قتل کیا اور نا محمود خان کے نام کی منادی پٹوادی اور پھر بھاگ آئے۔''
>
> (جہاد شاملی و تھانہ بھون، صفحہ ۷۸۔۶۱)

قاضی عنایت علی کی دربدری:

شہزادہ فیروز کے مکۂ معظمہ چلے جانے کے بعد قاضی عنایت علی کہیں روپوش ہو گئے۔ ان کے بارے میں کوئی مصدقہ اطلاع نہیں ملتی۔ زبانی روایت سے پتا چلتا ہے کہ مراد آباد سے وہ میرٹھ چلے گئے۔ جہاں ان کی سوتیلی والدہ مقیم تھیں۔ کچھ عرصے وہاں قیام کیا۔ پھر بھوپال تشریف لے گئے۔ وہاں اس زمانے میں سکندر جہاں بیگم والیۂ ریاست تھیں۔ وہ ان کی جنگی صلاحیت اور شہ سواری سے بے حد متاثر ہوئیں۔ چناں چہ انھیں اپنے باڈی گارڈ میں شامل کر لیا۔ مولانا محمد میاں صاحب مرحوم نے اپنی گرانقدر تالیف ''علماے ہند کا شاندار ماضی'' میں بعض زبانی روایتوں کی بنیاد پر قاضی صاحب کے بھوپال کے قیام کے بعض واقعات بھی بیان لیے ہیں، جن سے پتا چلتا ہے کہ وہ گھوڑے کی سواری میں بے حد مہارت رکھتے تھے۔

قاضی صاحب کے بھوپال میں قیام کو کچھ عرصے ہوا تھا کہ کسی نے مخبری کر دی اور آپ کو بھوپال چھوڑ دینا پڑا۔ وہاں سے چل کر آپ آگرہ آ گئے اور عدالت ججی میں وکالت کرنے لگے۔ اس پیشے میں اپنی مہارت کے ایسے نمونے پیش کیے کہ جج بھی آپ کی قابلیت سے بے حد متاثر

ہوا۔ لیکن وہاں بھی چین سے نہ رہ سکے۔ کچھ ہی دنوں بعد حکومت کو شبہ ہو گیا۔ چوں کہ جج کو آپ سے ہمدردی ہو گئی تھی اس نے آپ کو آگرہ سے چلے جانے کا مشورہ دیا۔ لہٰذا وہاں سے الور جا پہنچے۔ مہاراجہ الور نے آپ کی کافی پذیرائی کی اور آپ کو ایک اعلیٰ منصب پر فائز کیا۔ حیات مستعار کے باقی ایام الور میں گزارے اور جنگ آزادی کے پچیس سال بعد وہیں فوت ہوئے۔

''علمائے ہند کا شاندار ماضی'' میں ان کا سنہ وفات ۱۹۱۰ء تحریر ہے جو صحیح معلوم نہیں ہوتا۔

تدفین کی بارے میں قاضی محمد مکرم مائل تھانوی کی روایت ہے کہ ''انتقال کے موقعے پر مولانا شیخ محمدؒ کے بہنوئی حکیم شیخ احمد ریاست میں حاکم ضلع تھے۔ انھوں نے خفیہ طور پر تجہیز و تکفین کا انتظام کیا۔ رات ہی میں چند آدمیوں نے نماز جنازہ ادا کی اور تاریکی شب میں دفنانے کے لیے قبرستان لے گئے۔ اتفاق سے قبر مکمل ہونے میں دیر ہو گئی۔ اسی میں دن نکل آیا۔ مسلمان سپاہیوں پر مشتمل کئی فوجی دستے یکے بعد دیگرے ادھر سے گزرے اور انھوں نے نماز جنازہ ادا کی۔ پھر کچھ میواتی آئے اور انھوں نے جنازے کی نماز پڑھی اور قبر تیار ہونے پر جسد خاکی کو آسودۂ خاک کر دیا گیا۔''

اگر یہ روایت صحیح ہے تو اس سے یہ نتیجہ نکالنا غلط نہ ہوگا کہ ''عام معافی کا اعلان ہونے کے باوجود ہماری مہربان انگریزی حکومت نے قاضی عنایت علی کو آخر تک معاف نہیں کیا تھا۔''

بہر حال قاضی صاحب انگریزی حکومت کا تو کچھ نہ بگاڑ سکے۔ مگر اپنے قول کے مطابق خود مٹ گئے۔ سچ ہے ''سدا رہے نام اللہ کا۔'' (جہاد شاملی و تھانہ بھون، صفحہ ۸۳۔۸۲)

ضلع بجنور کے معرکے:

اس کے بعد جب احمد اللہ خان کو (بجنور کا) انتظام حکومت سپرد ہو گیا تو انھوں نے انگریزی افواج کو روکنے کے لیے مختلف مقامات پر اپنی فوجیں متعین کر دیں۔ دارانگر میں ماڑے خان، قاضی عنایت علی اور دلیل سنگھ کو تعینات کیا گیا۔ ان تینوں کے زیر کمان ۴۵۰۰ پیادہ اور ۶۹۸ سوار فوج تھی۔ یہ انتظامات ماہ مارچ ۱۸۵۸ء میں کیے گئے تھے۔

انگریزی افواج مختلف مورچوں پر لڑتی اور ان کو سر کرتی نجیب آباد میں داخل ہو گئیں۔ ماڑے خان خبر پاتے ہی دارانگر سے مع اپنی افواج نگینہ آ گیا اور نگینہ کے باغوں میں مورچے قائم کیے اور احمد اللہ خان کو بلانے کے لیے سوار بھیجے اور جتنی فوج متفرق ہو گئی تھی اور جتنے لوگ فرار ہو گئے تھے سب کو بلا کر جمع کیا۔ چناں چہ ماڑے خان، قاضی عنایت علی، دلیل سنگھ گوجر، احمد اللہ خان، شفیع اللہ خان، حبیب اللہ خان، کلن خان اور نتھو خان متعین افضل خان کل اپنی جمعیت اور

توپوں کو لے کر بمقام نگینہ جمع ہو گئے۔ مگر محمود خان نہیں آیا۔ بلکہ سیوہارہ میں جا کر مع ایک ضرب توپ اور کچھ سواروں کے مقیم رہا۔ نگینہ کی لڑائی ۲۱/اپریل ۱۸۵۸ء کو ہوئی۔ مجاہدین پسپا ہو کر شہزادہ فیروز کے پاس مراد آباد چلے گئے۔''

قاضی عنایت علی شہزادہ فیروز کی فوج میں شامل ہوئے یا نہیں؟ اس کا حال ''تاریخ سرکشی ضلع بجنور'' سے معلوم نہیں ہوتا۔ البتہ زبانی روایتوں سے پتا چلا ہے کہ وہ شہزادے کے ساتھ مل کر بھی کچھ عرصے تک انگریزوں کا مقابلہ کرتے رہے۔ لیکن جب شہزادہ ہجرت کر کے مکۂ معظمہ چلا گیا تو قاضی عنایت علی بھی کسی اور جگہ جا کے روپوش ہو گئے۔

''تاریخ سہارن پور'' کے مصنف منشی نند کشور نے اپنی ضخیم تصنیف میں نا معلوم کس مصلحت کی بناء پر شاملی اور تھانہ بھون کے واقعات کے سلسلہ میں ایک لفظ بھی نہیں لکھا۔ لیکن نجیب آباد کے معرکوں کا ذکر کافی تفصیل سے کیا ہے اور ان معرکوں میں قاضی عنایت علی کو شریک بتایا ہے۔ وہ لکھتے ہیں:

> ''ضلع بجنور میں سرکشی زیادہ ہوگئی اور محمود خان اور اس کے ہمراہی سب طرف سے متفکر ہو گئے۔ دلیل سنگھ اور قدم سنگھ گوجران اور رضا حسن عرف چھٹن اور عنایت علی خان قاضی تھانہ بھون مع اپنے رفیقوں اور ساتھیوں کے اس ضلع میں آئے۔ اس ضلع کے باغیوں نے ان کو امن دیا۔ اس کے سوا مرزا الطاف اور مرزا حاجی اور مرزا مبارک شاہ شاہزادگان مفرور دہلی اس ضلع میں آئے اور محمود خان نے ان کی بہت عزت و توقیر کی۔ ان باغیوں نے اس ضلع میں آ کر زیادہ فساد مچایا اور محمود خان اور احمد اللہ خان اور شفیع اللہ خان اور ماڑے کو ورغلانے اور گنگا پار اترنے اور ضلع مظفر نگر اور سہارن پور میں فساد مچانے اور غدر ڈالنے پر ترغیب کی۔ یہ جاہل ان کے داموں میں آ گئے اور پار اترنے پر مستعد ہو گئے اور کئی دفعہ پار اترے اور چند چوکیات سرکاری میں نقصان پہنچایا۔ چناں چہ رضا حسن عرف چھٹن ساکنان موضع سرائے ضلع مظفر نگر نے مع پچاس آدمیوں کے گنگا اتر کر چوکی دھرم پورے کو پھونک دیا اور چار برقنداز چوکی کے مار ڈالے اور دو گھوڑے وہاں سے چھین کر گنج اکیس میں چلا آیا۔ سرذار خان ساکن علاقہ ٹھاکر دوارہ اور دلیل سنگھ گوجر نے اپنے ساتھ بہت سے گوجر لے کر

رات کے وقت سونے کے نانگل سے اترے اور سرکاری بکٹ سے مقابلہ کیا اور کچھ گھوڑے لوٹ لایا۔ انھیں گوجروں اور پارسا کے باغیوں نے الہ آباد اور تھانہ بھوکریڑی کوراول کے گھاٹ سے اتر کر لوٹ لیا۔ عنایت علی قاضی کھیڑہ مجاہد پور کی چوکی پر آپڑا۔ اور دو ہندو برقنداز پکڑ لایا۔ ایک کو مار ڈالا اور ایک کو مسلمان کرلیا۔ اسی طرح قاضی عنایت علی خان اور دلیل سنگھ گوجر اور رضا حسن عرف چھٹن دو ضرب توپ اور دو ہزار آدمی کی جمعیت سے میران پور اتر آئے اور میران پور کے تھانہ کو اور کچھ دو کانوں کو لوٹ لیا اور کئی آدمیوں کو قتل کیا اور محمود خان کے نام کی منادی پٹوائی اور پھر بھاگ آیا۔ ان وارداتوں کے بعد باغیوں کو اور زیادہ حوصلہ ہوا اور شفیع اللہ خان نے روڑ کی پر حملہ کرنے کا ارادہ کیا۔

''سولھویں فروری ۱۸۵۸ء کو چٹھی صاحب سیکریٹری گورنمنٹ مورخہ ۱۵ر فروری ۱۸۵۸ء نمبر ۸۵۰ بنام صاحب کلکٹر بہادر ضلع بجنور بمقام میرٹھ پہنچی کہ تم مع عملہ ضلع بجنور بمقام روڑکی روانہ ہو اور واسطے انتظام روہیل کھنڈ کے فوج کالام بندھنے کا بمقام روڑکی حکم دیا۔ چناں چہ الگزینڈر شیکسپیئر صاحب اور کلکٹر و مجسٹریٹ ضلع بجنور اور جناب مسٹر جارج پامر صاحب بہادر جنٹ مجسٹریٹ ضلع روڑکی میں تشریف لائے اور باقی عملہ اور رئیسان ضلع بجنور جو گنگا پار کے حسب ذیل اور بتواریخ مختلف روڑکی میں پہنچے:

سید احمد خان صدر امین بجنور	۲۱ر فروری ۱۸۵۸ء
مولوی قادر علی تحصیلدار نگینہ	۲۱ر فروری ۱۸۵۸ء
سید تراب علی تحصیلدار بجنور	۱۸ر مارچ ۱۸۵۸ء
کالکا پرشاد منصف نگینہ	۲۲ر مارچ ۱۸۵۸ء

بادشاہ کی گرفتاری:

اپریل ۱۸۵۸ء میں کل بجنور تحت عملداری سرکار ہوا۔ (جہاد شاملی و تھانہ بھون، صفحہ ۸۱۔۷۸)

۱۹ر ستمبر ۱۸۵۷ء: بخت خان نے بادشاہ بہادر شاہ ظفر سے کہا کہ اودھ میں ساری جاں نثار سپاہ

موجود ہے۔ اگر دہلی پر قبضہ ہوگیا تو سارا ملک تو موجود ہے۔ بادشاہ نے کہا کہ کل تم ہمایوں کے مقبرے میں ملو، رات کو مرزا الٰہی بخش نے بہادر شاہ کو شیشے میں اتار لیا۔ بخت خان کے ساتھ جانے سے باز رکھا اور امید دلائی کہ انگریز اس کو معاف کر دیں گے۔ صبح کو بادشاہ نے بخت خان کے ساتھ جانے سے انکار کر دیا۔ بخت خان اور انقلابی سپاہی نے دہلی چھوڑ کر اودھ کا راستہ لیا۔ مرزا الٰہی بخش کی تدبیر کامیاب ہوئی۔ جب مولوی رجب علی کو یہ معلوم ہوا تو اس نے مرزا الٰہی بخش کو لکھا۔

''آپ فقط یہ کام کیجیے کہ باغیوں کے چلے جانے کے بعد بادشاہ کو چوبیس گھنٹہ تک ہمایوں کے مقبرے سے کہیں جانے نہ دیجیے۔ باقی کام مجھ پر چھوڑ دیجیے۔ میں اس کو کروں گا۔''

مولوی رجب علی نے ہڈسن کو اطلاع دی۔ انگریز افسران بمشکل بادشاہ کی جان بخشی پر راضی ہوئے۔ ہڈسن مقبرے کے پاس ایک شکستہ عمارت میں کھڑا رہا۔ کمال الدین حیدر حسینی لکھتے ہیں:

''سو سوار مولوی رجب علی خان کے ساتھ بادشاہ کے لینے کو بھیجے۔ مولوی صاحب نے دو روپے نذر دیے۔ بادشاہ ہوا دار میں سوار ہو چکے تھے۔ پھر پالکی انگریزی پر سوار ہوئے۔''

مولوی ذکاء اللہ لکھتے ہیں:

''بادشاہ نے پوچھا کہ میرا گرفتار کرنے والا ہڈسن صاحب بہادر ہیں تو صاحب نے جواب دیا کہ ہاں۔ تو بہادر شاہ نے کہا کہ میں آپ کی زبان سے اپنے اور اپنی بیوی اور اپنے بیٹے کی جاں بخشی کا وعدہ سننا چاہتا ہوں۔ ہڈسن نے وعدہ کیا۔''

کمال الدین حیدر لکھتے ہیں:

''مرزا جواں بخت شاہزادہ، نواب زینت محل، نواب تاج محل، حکیم احسن اللہ خان، مرزا قیصر شکوہ، میر فتح علی، فوجدار خان اور اشخاص نامی وغیرہ، یہ سب ۹۶ شمار میں تھے۔ حلقہ سواروں میں چلے...... داخل شہر ہوئے اور سب نواب زینت محل کے مکان میں رہے۔''

بادشاہ کی پالکی دیوان عام میں رکھ دی گئی۔ انگریز افسروں نے بادشاہ پر طعن و تشنیع کی اور

گالیاں دیں۔ تھوڑی دیر یہ عالم رہا۔ پھر ایک انگریز نے بادشاہ کی ران پر ہاتھ مارا۔ ایک حبشی غلام نے اسے اٹھا کر زمین پر دے مارا۔ وہیں دو تین انگریزوں نے اس کو ختم کر دیا۔ بہر حال اس نے حق نمک ادا کیا۔

شام کو بادشاہ نواب زینت محل کے مکان میں قید کر دیے گئے۔

شہزادوں کا قتل:

۲۱/۲۲ ستمبر ۱۸۵۷ء: صفر ۱۲۷۴ھ کی پہلی یا دوسری تاریخ (۲۱ یا ۲۲ ستمبر ۱۸۵۷ء) کو بادشاہ کے سمدھی الٰہی بخش کی جاسوسی سے مسٹر ہڈسن نے تین شہزادوں مرزا مغل، مرزا حضرت سلطان اور مرزا ابوبکر وغیرہ کو ہمایوں کے مقبرے سے گرفتار کیا۔ اور تینوں کا سر قلم کر کے بادشاہ کے سامنے پیش کیا۔ بادشاہ نے ہنس کر فرمایا۔ تیموری خاندان کے بہادر فرزند اسی طرح سرخرو ہو کر باپ کے سامنے آیا کرتے ہیں۔ (پنڈت سندر لال)۔

آخر کی چند سطور کے علاوہ آپ نے جو کچھ واقعات پڑھے، وہ انقلاب ''۱۸۵۷ء کی تصویر کا دوسرا رخ'' یعنی مسٹر ایڈورڈ ٹامسن کی کتاب ''دی اور سائڈ آف دی مڈل'' سے نقل کیے گئے ہیں جن کے متعلق مصنف (ایڈورڈ ٹامسن) کا دعویٰ ہے کہ جتنے واقعات یہاں قلم بند کیے گئے ہیں، ان میں سے ایک بھی کسی ہندوستانی قلم یا زبان سے نکلا ہوا نہیں ہے، اور میں نے شاذ و نادر ہی کوئی ایک فقرہ اینگلو انڈین اخبارات یا اس سے کم درجہ پر اپنے ملک کے اخبارات سے نقل کیا ہوگا نیز یہ کہ ان بہت سے واقعات کو چھوڑ دیا جن سے اس سے زیادہ سنگ دلی اور درندگی کا اظہار ہوتا ہے۔'' (تصویر کا دوسرا رخ، ص ۷۹۔۷۸)

نیز اس موقعہ پر آپ کو یہ فراموش نہ ہونا چاہیے کہ لارڈ رابرٹس کے نزدیک اس قسم کی تمام درنگی کا مقصد یہ تھا کہ:

''ان بدمعاش مسلمانوں کو بتا دیا جائے کہ خدا کے حکم سے صرف انگریز ہی ہندوستان پر حکومت کریں گے۔'' (ایضاً، ص ۳۱۴)

اس دہشت انگیزی، بربریت اور درندگی کا نتیجہ انگریز کے حق میں نہایت مبارک تھا۔ مسلمان اس قدر خائف ہو گئے کہ کانگریس وزارتوں کے قیام سے پیشتر تک قومی اداروں کے دستور اساسی میں بسم اللہ کے بعد پہلا جملہ یہ ہوتا تھا کہ اس ادارے کا تعلق سیاست سے قطعاً نہ ہوگا۔'' (علمائے ہند کا شاندار ماضی (جلد چہارم) از مولانا سید محمد میاں)

شمالی اضلاع یوپی کے حالات پر ایک سرسری نظر

ستمبر ۱۸۵۷ء: شاملی، بڑھانہ، تھانہ بھون اور ضلع بجنور کے بعض مقامات میں جو واقعات رونما ہوئے تھے، ان کے مآخذ اور واقعات کی ترتیب کے بارے ثناء الحق صدیقی نے اپنی تالیف ''جہاد شاملی اور تھانہ بھون'' میں نہایت تحقیق کے ساتھ روشنی ڈالی ہے۔ وہ لکھتے ہیں:

''جو واقعات رونما ہوئے ان کے متعلق معلومات کے لیے ہماری پاس کئی مآخذ ہیں۔ ان میں اہم ترین (۱) تذکرۃ الرشید (۲) میوٹنی رکارڈس۔ (کارسپونڈنس) (۳) سم اکاؤنس آف دی ایڈمنسٹریشن آف انڈین ڈسٹرکٹس ڈیورنگ دی ریوولٹ آف بنگال آرمی اور (۴) لائل محمڈنس ہیں۔ ان کے علاوہ دیگر تذکرہ نگاروں نے اپنے بیانات کی بنیاد ان میں سے بعض مآخذ پر رکھی ہی، یا کچھ زبانی روایتوں پر انحصار کیا ہے۔

ترتیب کے لحاظ سے باغ شیر علی کی سڑک کا واقعہ پہلے نمبر پر آتا ہے۔ یہ واقعہ مجلس شوریٰ اور شرعی حکومت کے قیام کے چند روز بعد رونما ہوا۔

میوٹنی رکارڈس کے مطابق ہنری مالکم لو اسسٹنٹ مجسٹریٹ نے ۲۰ رستمبر ۱۸۵۷ء کو جو رپورٹ لیفٹنٹ ڈبلیو۔ ٹی۔ ہوگئی کمانڈر پہلی پنجاب کیولری کو پیش کی تھی۔ اس میں وہ لکھتا ہے:

''مجسٹریٹ سہارن پور مسٹر اسپنکی سے جو ہدایت موصول ہوئی تھیں ان کی تعمیل میں، میں ۸ رماہ رواں ۱۸۵۷ء بروز منگل ایک جمعیت کے ساتھ جس کی تفصیل حاشیے میں درج ہے۔ رام کنڈی سے براہ مظفر نگر شاملی کی جانب روانہ ہوا۔ (جمعیت میں یہ افراد شامل تھے۔ ایک دیسی افسر، تیس دفعہ دار اور ۴۵ سوار) میں نے اپنے طور پر ایک دفعہ دار اور پانچ سواروں کو اس غرض سے علاحدہ کردیا کہ وہ اس دستے کا سامان اور بقدر باریک شتر گولہ بارود لے کر آئیں۔ میں نے اس دستہ کو ہدایت کردی تھی کہ وہ اسی راستے سے سفر کرے جو میں نے اختیار کیا تھا۔ لیکن مجھے یہ بیان کرتے ہوئے ملال ہوتا ہے کہ تحصیل دار دیوبند (کی) غلط ہدایات کی بنا پر اور اس علاقے سے ناواقفیت کی وجہ سے یہ مختصر سی جماعت تھانہ بھون کے راستے سے شاملی کی طرف روانہ ہوئی۔ ویسے تو یہ راستہ سیدھا تھا، لیکن اس میں قباحت یہ تھی کہ اس جگہ (تھانہ بھون کے لوگوں نے حکومت کے خلاف ہتھیار اٹھالئے تھے۔ موخر الذکر قصبے (تھانہ بھون) کے نزدیک سے گزرتے وقت اس جماعت پر باغیوں نے جو وہاں پہلے سے جمع تھے حملہ کردیا۔ چوتھے رسالہ کا ایک سردار پرتاب سنگھ

مارا گیا اور گولہ بارود کا ذخیرہ دشمن کے قبضے میں پہنچ گیا۔ ہمارے آدمیوں نے نہایت پامردی سے مقابلہ کیا، لیکن وہ دشمن کی کثرت تعداد کی وجہ سے مغلوب رہے۔''

یہی باتیں مختصر الفاظ میں مولانا عاشق الٰہی میرٹھی نے تذکرۃ الرشید میں بیان کی ہیں۔ وہ لکھتے ہیں:

''قاضی عنایت علی صاحب اپنے چند رفقا اور رعایا کو ساتھ لے کر شیر علی کے باغ کی سمت کی سڑک پر جا پڑے جس وقت سوار سامنے سے گزرے ان کا اسباب لوٹ لیا۔ ایک سوار جنگ میں زخمی ہو کر سمت مشرق جنگل کو بھاگا۔ مگر تھوڑے سے فاصلہ پر گھوڑے سے گر کر مر گیا۔''

دونوں بیانات سے یہی ظاہر ہوتا ہے کہ اس معرکہ میں گولہ بارود لے جانے والے آدمیوں میں سے صرف ایک آدمی مارا گیا۔ اور باقی نکل گئے۔ البتہ گولہ بارود تمام کا تمام قاضی صاحب اور ان کے رفقا کے ہاتھ لگا۔

۹،۱۰ ستمبر: بہرحال ہنری مالکم لو اپنی جمعیت کو مظفر نگر کے راستے سے لے کر غالباً ۹ یا ۱۰ ستمبر کو شاملی پہنچ گیا۔ اس کے آگے پیچھے وہ لوگ بھی جو باغ شیر علی کے واقعے سے جان بچا کر بھاگ نکلے تھے، جا پہنچے ہوں گے۔ اور ان کی زبانی اس سانحے کی اطلاع ان انگریز افسران کو فوراً مل گئی ہوگی۔ جو اس وقت شاملی میں موجود تھے۔ ان افسران میں مالکم لو کے علاوہ ضلع مظفر نگر کا کلکٹر آر۔ ایم ایڈورڈس اور جائنٹ مجسٹریٹ سی۔ گرانٹ سب سے زیادہ اہم اور قابل ذکر ہیں۔

اس وقت ان ذمہ دار افسران کا اجتماع شاملی میں کیوں ہو رہا تھا؟ اور اس پر آشوب دور میں کلکٹر اور جائنٹ مجسٹریٹ دونوں ہی ضلع کے صدر مقام کو چھوڑ کر وہاں کس لیے آئے ہوئے تھے؟ اس بات کو سمجھنے کے لیے شاملی کی اس وقت کی حالت کو جاننا ضروری ہے۔

جن دنوں کا یہ واقعہ ہے، اس وقت شاملی، ضلع مظفر نگر کی ایک تحصیل کا صدر مقام اور ایک اہم تجارتی منڈی تھی۔ وہاں ہندوؤں کی آبادی زیادہ تھی۔ اور مہر سنگھ اس قصبہ کا ایک بڑا زمیندار اور ذی اثر رئیس تھا۔ مہر سنگھ سے اس کے تعلقات اچھے نہیں تھے۔ جیسا کہ پہلے بتایا جا چکا ہے یا تو اس سے واقعی بغاوت کا اندیشہ تھا، یا سابقہ مخالفت کی بنا پر ابراہیم خان نے اس کی جھوٹی رپورٹ کلکٹر مظفر نگر کو کر دی تھی۔ جس کی وجہ سے انگریز حکام تمام ممکنہ حفاظتی تدابیر اختیار کرنے پر مجبور ہوئے۔ کئی مرتبہ کلکٹر ضلع مظفر نگر ایڈورڈس نے جائنٹ مجسٹریٹ سی۔ گرانٹ کو وہاں انتظامات کرنے کے

لیے بھیجا۔ چناں چہ جنگ آزادی کے بعد ابراہیم خان کے بیٹے کی درخواست پر اس کو سی۔ گرانٹ نے ایک سرٹیفکیٹ دیا تھا۔ جس میں ابراہیم خان کی خدمات کو سراہا تھا۔ اور اس کی وفاداری کی تعریف کی تھی۔ اس سرٹیفکیٹ کا ایک فقرہ یہ تھا:

''خصوصاً شروع میں اس غدر کے، میرٹھ سے ہم شاملی کو تشریف لے گئے تھے۔ اور دو روز ماہ جون اور بارہ روز ماہ جولائی اور چودہ روز ماہ ستمبر میں ہم وہاں مقیم رہے......''

سی۔ گرانٹ کے ماہ ستمبر کے قیام کے دوران ایڈورڈس نے اس کی مدد کے لیے کچھ پیدل فوج اور دو توپیں بھیج دیں اور دو چار دن بعد وہ خود بھی وہاں پہنچ گیا۔ اس کی موجودگی میں ہنری مالکم لو سہارن پور سے وہ امدادی سپاہ وغیرہ لے کر آ گیا جو اسپنکی نے اس کی ماتحتی میں سہارن پور سے بھیجی تھی۔ اس طرح اس وقت شاملی میں افسران اور سپاہیوں کی اچھی خاصی تعداد جمع ہو گئی تھی۔

یہ وہ موقع تھا جب ان لوگوں کو بہ یک وقت کئی مسئلے درپیش تھے اور انھیں ان سب کو نمٹانا تھا۔ قریب کے ایک قصبے ہر ہر (HUR HUR) نے بغاوت کر دی تھی۔ شاملی سے ۱۷ میل دور بڑھانے کے قلعے میں تعینات سرکاری پولیس کے کچھ آدمیوں کو ایک جمعیت نے قتل کر دیا تھا اور جمعیت کے سردار خیراتی خان نے اپنے نام کی تحصیل قائم کر لی تھی۔ ادھر خود شاملی کے حالات سے بھی انگریزی حکومت مطمئن نہیں تھی۔

غرض انگریز افسران ان گتھیوں کو سلجھانے کے لیے اپنا پروگرام مرتب کرنے میں لگے ہوئے تھے کہ تھانہ بھون سے بھاگے ہوئے سپاہیوں نے وہاں پہنچ کر باغ شیر علی کی تفصیلی روداد پیش کی۔ ان لوگوں کو یہ حالات معلوم کر کے غصہ تو بہت آیا ہوگا لیکن اہل تھانہ بھون کے خلاف مذکورہ بالا مصروفیات کے سبب وہ فوری کارروائی نہ کر سکے، انھوں نے اس اقدام کو مؤخر کیا اور اپنے سابقہ پروگرام کو عملی جامہ پہنانا ضروری سمجھا۔

خیال ہے کہ مجاہدین کا یہ لشکر ۱۳ ستمبر کو کسی وقت تھانہ بھون سے روانہ ہو کر ۱۳ اور ۱۴ کی درمیان شب میں شاملی کے قریب کسی جگہ ٹھہر گیا ہوگا اور جب یہ بات متحقق ہو گئی ہوگی کہ انگریزی فوج بڑھانہ کی جانب جا چکی ہے اس وقت وہاں سے چل کر ۱۴ ستمبر کو پیر کے دن ۱۰، ۱۱ بجے تک شاملی پہنچ گیا ہوگا اور اس نے تحصیل کے سامنے پڑاؤ ڈال دیا ہوگا۔ سر سید صاحب کی تحریر سے پتا چلتا ہے کہ اس وقت شاملی میں

''تخمیناً دس سوار پنجابی رسالے کے اور اٹھائیس سپاہی جیل خانے کے اور پچاس سے زائد سپاہی متعینہ تھانہ اور تحصیل کے، باقی آدمی اس افسر کے خاندان کے مع اکبر خان اور اس کے بھائی کے جو رام پور سے گئے تھے وہاں موجود تھے۔''

اس بیان سے اور لڑائی میں مارے جانے والوں کی تعداد کو دیکھتے ہوئے پتا چلتا ہے کہ مدافعین کی تعداد سو سے زیادہ تھی۔ اور تحصیل میں اسلحہ کا کافی ذخیرہ تھا۔ جو بہت پہلے سے وہاں جمع کیا جا رہا تھا۔ جب کہ مجاہدین میں سے بہت سوں کے پاس نہ سواریاں تھیں نہ ہتھیار۔ وہ تو امداد خداوندی کے بھروسے پر گھروں سے نکل پڑے تھے۔

لڑائی کی کیفیت کو سمجھنے کے لیے محاذ جنگ کا نقشہ ذہن میں رکھنا ضروری ہے۔ ہم عصر تذکرہ نویسوں اور وقائع نگاروں نے بعض اور تفصیلات کی طرح اس موضوع کو بھی تشنہ چھوڑ دیا ہے۔ مولانا مناظر احسن گیلانی نے کچھ تحریری اشاروں اور زبانی روایتوں کی بنا پر اس محاذ کا جو حال بیان کیا ہے وہ یہ ہے:

لڑائی کا محاذ شاملی کی تحصیل اور اس کے قریب ایک کھلا میدان تھا۔ اس وقت تحصیل کے دفاتر اور عملہ کے لوگ ایک گڑھی کے اندر تھے اور گڑھی ایک وسیع میدان میں واقع تھی۔ اس میدان میں ایک چھوٹی سی مسجد کے علاوہ اور کوئی عمارت نہیں تھی۔ گڑھی کا پھاٹک مسجد کی طرف تھا جس کو تحصیل میں متعین عملے نے مضبوطی سے بند کر کے خود کو ہر طرح محفوظ کر لیا تھا۔ اس کے برعکس بقول مولانا مناظر احسن گیلانی، ''تھانہ بھون کے مجاہدوں کا جتھا گڑھی کے باہر والے میدان میں پتنگوں کی طرح پھیلا ہوا تھا۔ ان غیر محفوظ اور بے سہارا مجاہدین پر انگریزی فوج کے بدوقچی دیواروں کی آڑ لے کر بندوقوں سے مسلسل فائر کرتے رہے اور اس مختصر سی مسجد کے سوا جو میدان میں بنی ہوئی تھی غریب مجاہدین کو گولیوں سے بچانے والی کوئی جائے پناہ نہیں تھی۔

تمام بیانات سے ظاہر ہوتا ہے کہ لڑائی کھلے میدان میں نہیں ہوئی بلکہ تحصیل میں متعین عملہ شروع ہی سے قلعہ بند ہو کر بیٹھ رہا تھا اور بہت دیر تک بغیر کوئی نقصان اٹھائے شمع حریت کے پروانوں کو آتش توپ و تفنگ سے سوختہ کرتا رہا تھا۔ چناں چہ سر سید مرحوم نے لکھا ہے:

''یہ افسر اکبر خان بہ کمال دلاوری و بہادری بمقابلہ پیش آیا اور تحصیل شاملی کو مستحکم کرا کر اور اس میں محصور ہو کر بخوبی لڑا اور ہر دفعہ مفسدوں کے حملہ کناں کو ہٹا دیا۔ اور بہت سے آدمی ان کے مارے گئے۔''

غرض جیسا کہ بتایا جا چکا ہے محصورین کے پاس گولہ بارود کا ذخیرہ کافی تھا۔ لہٰذا وہ برابر تحصیل کے اندر سے گولیاں اور گولے برساتے رہے۔ اور مجاہدین جام شہادت نوش کرتے رہے۔ مگر مؤثر الذکر کا جوش و جذبۂ جہاد اتنا بڑھا ہوا تھا کہ انھوں نے اس جانی نقصان کی پروا کیے بغیر محاصرے کو نہ صرف جاری رکھا بلکہ وہ اس کو سخت سے سخت تر کرتے گئے اور کئی گھنٹوں کی جدو جہد کے بعد تحصیل کی دیواروں کے نیچے تک پہنچ گئے۔ اس کوشش میں کتنے مجاہدین شہید ہوئے اس کا صحیح اندازہ لگانا مشکل ہے کیوں کہ معاصر تذکرہ نگاروں کے بیانات سے اس سلسلے میں کوئی مدد نہیں ملتی۔ انھوں نے سرکاری عملے کے کشتوں کی تعداد تو بتائی ہے مگر مجاہدین کے شہداء کی تعداد کا کوئی ذکر نہیں کیا۔ مولانا مناظر احسن گیلانی نے تعداد کی زیادتی کو بتانے کے لیے لکھا ہے کہ

"سیکڑوں مجاہدین شہید ہو گئے!"

حضرت مولانا کے اس اندازہ کو مبالغہ پر محمول نہیں کیا جا سکتا۔ اس لیے کہ مجاہدین جس پوزیشن میں تھے، اس کو دیکھتے ہوئے شہداء کی تعداد یقیناً سیکڑوں ہی ہوگی۔

مجاہدین نے شروع ہی میں محسوس کر لیا تھا کہ جب تک محصورین کو تحصیل سے باہر نہیں نکالا جائے گا اور آمنے سامنے ہو کر مقابلہ کرنے پر مجبور نہیں کیا جائے گا اس وقت تک ان کے آدمی برابر گولیوں کا نشانہ بنتے رہیں گے۔ اور محصورین اطمینان سے اندر بیٹھے ہوئے اپنا دفاع کرتے رہیں گے۔ لہٰذا وہ اپنی جانوں پر کھیل کر آگے طرف بڑھے۔ وہ تحصیل کے پھاٹک تک پہنچ کر اس کو توڑنا اور اندر گھسنا چاہتے تھے۔ آخر کار ایک مرتبہ ہلا کر کے گولیوں کی بوچھار ہی میں وہ پھاٹک تک پہنچ گئے۔ اور کسی نہ کسی طرح پھاٹک کو توڑنے میں کامیاب ہو گئے۔ مولانا مناظر احسن گیلانی تحریر فرماتے ہیں کہ مولانا قاری محمد طیب کی یادداشت کے بموجب

"دروازے کے قریب چھپر کی ایک کٹی تھی جو غالباً محافظ سپاہیوں کے سایے کے لیے بنائی گئی تھی۔ حضرت مولانا قاسم صاحب نے پھرتی سے بڑھ کر اس چھپر کو اپنی جگہ سے جلد سے جلد اکھاڑ کر تحصیل کے دروازے سے لا ملایا اور اس میں آگ دے دی۔ آگ کا لگنا تھا کہ گڑھی کے پھاٹک کے کواڑ بھی جل اٹھے۔"

چھپر میں آگ لگانے کا ذکر انگریز وقائع نگار ہنری کین نے بھی کیا ہے۔ وہ لکھتا ہے:

"انھوں نے بہت سی عمارتوں کے چھپروں میں جو احاطے کی دیوار سے

باہر نکلے ہوئے تھے آگ لگادی۔''

تھوڑی دیر میں دروازہ جل کر راکھ کا ڈھیر ہو گیا۔ اور مجاہدین کو گڑھی یا تحصیل کے اندر گھس کر دست بدست جنگ کرنے کا موقع مل گیا۔ ابھی تک انھوں نے جان فروشی کے نمونے پیش کیے تھے۔ اب شمشیر زنی کے جوہر دکھانے شروع کیے۔ اس کے خلاف محصورین اس وقت تک تقریباً گوشۂ عافیت میں بیٹھ کر نشانہ بازی کی مشق کر رہے تھے۔ اور تقریباً نہتے اور نیم مسلح مجاہدین کو اپنی گولیوں سے جام شہادت پلا رہے تھے۔ لیکن اب تحصیل کا حصار ٹوٹ چکا تھا اور محصورین خود اسی حالت میں آ گئے تھے جس میں محاصرہ کرنے والے تھے۔ لہٰذا مجاہدین کی تلواریں انھیں ایک ایک کر کے خاک وخون میں لوٹا رہی تھیں۔ سرسید مرحوم نے حالت کی اس تبدیلی کی یہ وجہ بتائی ہے کہ

''آخر کو گولی باروت تحصیل میں ختم ہو چکی اور نہایت مجبوری کا وقت آیا اور مفسدوں کا قابو ہو گیا اور وہ لوگ تحصیل کے قریب آ گئے یہاں تک کہ تحصیل میں گھس آئے۔''

سچ پوچھیے تو اصل معرکہ پھاٹک جلنے یا ٹوٹنے کی بعد ہی ہوا۔ اس وقت دست بدست جنگ ہوئی۔ گولیاں بھی برابر چلتی رہیں۔ اسی ہنگامۂ کارزار میں یکا یک ایک گولی حضرت حافظ ضامن علی شاہ کی ناف پر لگی جس سے خون کا فوارہ جاری ہو گیا۔ حضرت مولانا رشید احمد گنگوہی چند آدمیوں کی مدد سے ان کو اٹھا کر مسجد میں لے آئے۔ اور ان کا سر اپنے زانوں پر رکھ لیا۔ اور اسی حالت میں اس مرد باخدا نے جان جاں آفریں کے سپرد کی۔ یہ واقعہ حکیم ضیاء الدین رام پوری کی روایت کے مطابق ظہر کے وقت پیش آیا۔ (جہاد شاملی وتھانہ بھون، صفحہ ۵۲۔۳۶)

شاملی بڈھانہ تھانہ بھون:

۱۴ر ستمبر ۱۸۵۷ء: بہرکیف شاملی میں تو یہ واقعات رونما ہوئے۔ ادھر بڈھانے کے قلعے کو سر کر کے انگریزی فوج ۱۶ر ستمبر کو اسمتھ کی سرکردگی میں واپس آئی۔ جیسا کہ اس سے قبل بتایا جا چکا ہے بڈھانے کے قیام کے دوران لفٹنٹ فریزر مع دو توپوں اور لفٹنٹ جانسٹن مع سکھ پیدل فوج کے آملے تھے۔ اسمتھ کو اطمینان تھا کہ جب میں شاملی پہنچوں گا تو میرے اپنے آدمیوں اور جانسٹن کے ساتھ آئے ہوئے فوجی دستے اور فریزر کے ہمراہ آئی ہوئی توپوں سے وہاں کی فوج کو تقویت پہنچے گی۔ لیکن وہ راستے ہی میں تھا کہ اسے تحصیل کی تباہی وتاراجی کی اطلاع مل گئی۔ پھر

جب موقع پر پہنچا تو اپنی آنکھوں سے ویرانی کا منظر دیکھ لیا۔

اس کا اس کو یقیناً افسوس ہوا ہوگا اور غصے اور جوش میں ممکن ہے اس کے منہ سے یہ فقرہ جو مولانا عاشق الٰہی نے تذکرۃ الرشید میں درج کیا ہے نکل گیا ہو:

''تھانہ بھون کو بھی اسی طرح سے مسمار کرا کر چھوڑوں گا۔''

تحصیل شاملی کی تاراجی کے بعد انگریز حکام کے لیے ناممکن تھا کہ وہ درگزر سے کام لیتے۔ چناں چہ انھوں نے پوری تیاری کیے بغیر بعجلت تمام تھانہ بھون پر حملہ کر دیا۔ ہنری جارج کین رقم طراز ہے کہ

''شاملی کی شکست نے انگریزوں کو بے انتہا مشتعل کر دیا۔ ایڈورڈس بڈھانہ کے قلعے کو فتح کر کے لوٹا تو اس کی فوج میں دو توپوں اور ۱۰۰ سکھ سپاہیوں کا اضافہ ہو گیا تھا۔ وہ سمجھ رہا تھا کہ میرے شاملی پہنچنے سے وہاں کی فوج کو تقویت ہوگی۔ لیکن راستہ ہی میں تھا کہ اسے تحصیل پر مجاہدین کے قبضے کی اطلاع ملی۔ اس نے اس تاراجی کا بدلہ لینے کے لیے اسی وقت تھانہ بھون پر حملہ کرنا چاہا۔ لیکن یہ معلوم کر کے مظفر نگر کی حالت زیادہ تشویش ناک ہے۔ وہ تھانہ بھون کو چھوڑ کر اس طرف متوجہ ہو گیا۔''

۱۴ر ستمبر ۱۸۵۷ء کو انگریزوں کا دہلی پر مکمل قبضہ ہو گیا تھا۔ ادھر ایڈورڈس نے مظفر نگر پہنچ کر وہاں کے حالات درست کیے۔ جب ہر طرف سے اطمینان ہو گیا تو پھر تھانہ بھون کی جانب توجہ کی۔ ان ہی ایام میں کمشنر میرٹھ اور کلکٹر سہارن پور رابرٹ اسپنکی کے پاس سے کمک آ گئی اور کمشنر کا اشارہ پا کر ایڈورڈس نے تھانہ بھون کی طرف کوچ کر دیا۔ یہ پتا نہ چل سکا کہ اس کے پاس کل کتنی فوج تھی۔ اتنا ضرور معلوم ہے کہ اس فوج میں کچھ سکھ پیدل اور سوار، کچھ گورکھے اور دو توپیں تھیں۔ اس فوج کے ساتھ دو سو سال افسر بھی تھے۔ ایک سوئنٹن میلول اور دوسرا مالکم لو۔ موخر الذکر کو رابرٹ اسپنکی نے آخری امدادی فوج کے ساتھ بھیجا تھا۔

کپتان اسمتھ اور لفٹنٹ کوئیلر کی ماتحتی میں سکھوں اور گورکھوں کی ایک جمعیت نے حملہ کیا اور آبادی سے باہر کی چند عمارتوں پر قبضہ کر لیا۔ کچھ فوج شہر میں داخل ہو گئی۔ لیکن مجاہدین نے یہ حملہ بری طرح پسپا کر دیا۔ انگریزی فوج کے ۱۷ آدمی مارے گئے اور ۲۵ زخمی ہوئے جن میں دو افسر تھے۔ پسپائی کے وقت میلول اور لو نے بڑی سمجھ داری سے کام لیا اور وہ اپنی فوج کو تباہی سے بچا کر

نکال لے گئے۔ حال آں کہ خود لُو ایک معرکہ میں زخمی ہوگیا۔ اس کے زخمی ہونے کا واقعہ اس طرح بیان کیا جاتا ہے کہ ''جب وہ اپنی فوج کو لیے ہوئے ایک گاؤں کی تنگ گلیوں سے گزر رہا تھا تو ایک جتھے نے اس کو گھیر لیا۔ دست بدست لڑائی ہوئی جس میں اس کے تلوار کے تین گہرے زخم آئے۔''

اس شکست نے انگریزوں میں کافی کھلبلی مچادی۔ کمشنر اسپنکی کو اور اسپنکی فوجی افسروں اور کلکٹر مظفر نگر ایڈورڈس کو متہم گردانتے لگے۔ لیکن کین کی رائے ہے کہ اس کی پوری ذمہ داری درحقیقت کمشنر پر عائد ہوتی ہے۔ اس لیے کہ اس نے تھوڑی سی فوج بھیج کر ایڈورڈس کو یہ نادر شاہی حکم دیا تھا کہ

''فوراً بڑھو اور مفسدوں کا سر کچل دو۔''

مگر جب دوبارہ غور کرنے پر اسے محسوس ہوا کہ یہ احکامات قبل از وقت نافذ کر دیے گئے ہیں تو اس نے حملہ کو کچھ عرصے کے لیے ملتوی کر دینا چاہا لیکن کامیاب نہ ہوسکا۔ اس لیے اس کے پہلے حکم کے مطابق حملہ کیا جا چکا تھا اور پسپا بھی ہو چکا تھا۔

اس شکست کے تھوڑے ہی عرصے بعد مزید کمک آگئی اور ستمبر کا مہینہ ختم ہونے سے پہلے انگریز فوج نے بغیر کسی مزاحمت کے تھانہ بھون پر قبضہ کر لیا۔ مجاہدین اور ان کے متعلقین اپنے گھروں کو چھوڑ کر مختلف شہروں اور قصبوں کی طرف چلے گئے۔

اس اجمال کی تفصیل ہمیں ہنری مالکم لو کے بیان میں ملتی ہے اس لیے کہ وہ خود اول سے آخر تک اس معرکہ میں شریک رہا...... (جہاد شاملی)

ستمبر ۱۸۵۷ء: حافظ ضامن شہید کے واقعۂ شہادت پر مرزا غالب کے ایک شاگرد مولوی عبدالسمیع بیدل رام پوری نے چھ شعر کا ایک قطعہ لکھا ہے، جس میں تاریخ کا شعر یہ ہے:

جو پوچھا سن شہادت کہا فلک نے ''ہائے
ہوئے شہید وہ شاہ جری محرم میں''

۱۶+۱۲۵۸=۱۲۷۴ھ

دو شعر کا ایک دوسرا قطعہ یہ ہے:

بیدل آن وقت کہ حافظ ضامن
رفت و آراست بہ جنت مسند
شاد رضوان شد و گفت ایں تاریخ

حافظ مصحف ازد آوید!"

/۱۲۷۴ھ

ایک اور بزرگ میاں جی عبدالغفور نے یہ تاریخ نکالی تھی:

حوریں سب مل کے بولیں واہ واہ

"پیر کے دن خلد میں پیر آگئے"

/۱۲۷۴ھ

حضرت حافظ ضامن علی شاہ کی شہادت کا صدمہ تو سب ہی کو ہوا لیکن یہ موقع ایسا نہیں تھا کہ لوگ گریہ وبکا اور نالہ وشیون میں مشغول ہو جاتے۔ ابھی اس مقصد کو تکمیل کی منزل تک پہنچانا تھا جس کے لیے شمع حق کے پروانے اپنی جانیں ہتھیلیوں پر رکھ کر اپنے گھروں سے نکلے تھے۔ چناں چہ لڑائی اس کے بعد بھی جاری رہی، اور غالباً غروب آفتاب تک قتل وقتال کا سلسلہ چلتا رہا۔ ہنری کین نے اس قیاس کی تصدیق ان الفاظ میں کی ہے:

"لڑائی تمام دن جاری رہی لیکن چوں کہ حملہ آوروں کی تعداد زیادہ تھی اس لیے ان کا پلہ بھاری رہا...... محصورین میں سے ۱۱۳ آدمی مارے گئے، جن میں ابراہیم خان سب کلکٹر بھی تھا۔"

تمام رپورٹوں اور بیانات سے ظاہر ہوتا ہے کہ اس وقت محصور سپاہیوں اور عملہ کی مجموعی تعداد سو سے کچھ زیادہ تھی۔ اور دست بدست جنگ میں وہ سب ہی کام آئے۔ چناں چہ مالکم لو اپنی رپورٹ میں لکھتا ہے:۔

"ہماری فورٹ بڈھانہ کے لیے روانگی کے دس گھنٹے کے بعد تھانہ بھون کے باغیوں نے بڑی تعداد میں حملہ کر دیا تھا اور تحصیل دار اور سرکاری ملازمین نیز فرسٹ پنجاب کیولری کے دس سواروں کو مار ڈالا تھا۔ مسٹر ایڈورڈس نے محصورین کی تعداد میں اضافے کی غرض سے گیارہ سوار چھوڑ دیے تھے۔ جن میں چند برقنداز اور چند پولیس کے آدمی تھے۔ صرف ایک سوار جان بچا کر بھاگ سکا۔ وہ بھی بری طرح زخمی ہو گیا تھا۔"

غرض دن بھر کی جنگ وپیکار کے نتیجے کو سامنے رکھا جائے تو پتا چلتا ہے کہ دشمن کے محض ۱۱۳ آدمی مارے گئے اور مجاہدین کا کافی جانی نقصان ہوا۔ اور حافظ ضامن علی شاہؒ کی شہادت ان کے

لیے ایک عظیم سانحہ تھا۔ تاہم اتنی قیمت دے کر انھوں نے اپنا مقصد حاصل کر لیا تھا۔ انگریزوں کا تحصیل میں متعین عملہ نہ صرف مغلوب ہو گیا تھا بلکہ ایک زخمی سپاہی کے سوا اس واقعے کی خبر دینے والا کوئی نہیں بچا تھا۔ شاملی میں قائم کردہ انگریز کا جنگی مستقر تباہ ہو گیا اور مجاہدین مظفر و منصور رہے۔

ہم عصر بیانات اور واقعات کی کڑیوں کو ملانے سے یہ نتیجہ نکلتا ہے کہ شاملی کا معرکہ صرف ایک دن رہا۔ وہ بھی دن کے دس یا گیارہ بجے شروع ہوا تھا اور غروب آفتاب کے وقت ختم ہو گیا۔ مولانا محمد میاں ناظم جمعیت العلماء ہند کا یہ بیان کہ لڑائی تین دن جاری رہی اور مولانا مناظر احسن گیلانی کا یہ کہنا کہ یہ سلسلہ کئی دن چلا کسی طرح بھی صحیح نہیں ہے۔

۱۴ ستمبر کی شام کو جنگ ختم ہو گئی۔ اس کے بعد مجاہدین کے وہاں ٹھہرنے کی کوئی وجہ نہ تھی۔ چناں چہ وہ حافظ ضامن علی شہیدؒ کے جسد مبارک کو ایک چار پائی پر رکھ کر نہایت تعظیم سے تھانہ بھون لے آئے اور لعل بے بہا کو اسی خاک کے سپرد کر دیا جس سے وہ نکلا تھا...... (جہاد شاملی و تھانہ بھون، ص ۵۵۔۵۳)

اودھ اور دیگر اضلاع کا محاذ آزادی

مئی ۱۸۵۷ء تا یکم نومبر ۱۸۵۸ء

مئی ۱۸۵۷ء میں دیسی فوجوں نے بے چینی کے مظاہرے کیے۔ جون میں اودھ کے گورنر سر ہنری لارنس نے کرنل نیل کو جو اس وقت الہ آباد میں تھا، اطلاع دی کہ باغیوں نے سیتاپور، شاہ جہان پور اور فیض آباد پر قبضہ کرلیا ہے اور یہ کہ باغی سپاہی لکھنو کی طرف بڑھ رہے ہیں۔ جون کے ختم ہونے سے پہلے باغی سپاہیوں نے لکھنو کو گھیر لیا تھا۔ اسی اثناء میں سارا اودھ انگریزوں کے خلاف اٹھ کھڑا ہوا۔

۳۰ر جون کو سر ہنری لارنس نے باغیوں کی ایک فوج پر حملہ کیا۔ لیکن شکست کھا کر واپس ہوا۔ اب سر ہنری نے ریزیڈنسی میں چلے جانے کا ارادہ کیا۔ چناں چہ اگلے دن قلعہ میں آگ لگا کر سر ہنری ریزیڈنسی میں چلا گیا۔ جہاں وہ زخمی ہوا اور ۱۰ر جولائی کو چل بسا۔ بریگیڈیئر جنرل انگلس باغیوں کا مقابلہ کرتا رہا۔ سر ہنری لارنس کی موت اور لکھنو ریزیڈنسی میں جنرل ہیولاک کی آمد کی درمیانی مدت میں باغیوں نے ریزیڈنسی پر شدید حملے کیے۔ جنرل ہیولاک کان پور سے دو ہزار سپاہی لے کر لکھنو کی طرف آرہا تھا۔ باغیوں کی تعداد اس سے بیس گنا زیادہ ہوگی۔ باغیوں نے فیصلہ کر رکھا تھا کہ جنرل ہیولاک کو ریزیڈنسی میں داخل نہیں ہونے دیں گے۔ ریزیڈنسی میں محصور انگریزوں نے توپوں کی آواز سنی۔ اگلے دن یہ آواز زیادہ قریب ہوگئی۔ جنرل ہیولاک کی فوج شہر میں داخل ہوچکی تھی۔ ہر گلی اور ہر بازار میں لڑائی شروع ہوگئی۔ جنرل ہیولاک اور جیمز آؤٹ رم کی فوجیں ریزیڈنسی میں داخل ہوگئیں۔ ان فوجوں میں اتنی قوت نہیں تھی کہ وہ باغیوں پر غلبہ پاسکتیں۔ پھر بھی ان کے آنے سے ریزیڈنسی میں محصور انگریزوں نے اطمینان کا سانس لیا۔ مزید کمک کا انتظار ہونے لگا۔ سر جیمز آؤٹ رم نے اب اپنے مورچے کو وسیع کرنا چاہا۔ چناں چہ آس پاس کے محلوں، باغوں اور مکانوں پر قبضہ کیا تو سپاہیوں نے ہیروں، کپڑوں، شالوں، ٹوپیوں، کتابوں، قلمی نسخوں، پستولوں اور دوسری چیزوں کو اس کثرت سے لوٹا کہ ان سے ''لندن کے پچاس سوداگروں کی دکانیں بھر جاتیں۔''

مسجدوں، محلوں، پبلک عمارتوں کو مسمار کرتا ہوا سر کولن ریزیڈنسی کی طرف بڑھا۔ سر کولن کا ارادہ تھا کہ وہ ریزیڈنسی کی فوج کو کان پور پہنچا دے۔ کیوں کہ اس کے خیال میں اتنی تھوڑی فوج ــــ

باغیوں کا مقابلہ کرنا مشکل تھا۔ باغیوں کی تعداد پچاس ہزار تک پہنچ چکی تھی۔ لکھنو چھوڑنے کا حکم دیا گیا۔ سب سے پہلے زخمیوں کو دل کشا میں پہنچایا گیا۔ دوسرے دن عورتوں اور بچوں کو، تیسرے دن ریزیڈنسی کو ایک ایسی فوجی چال سے خالی کیا گیا کہ اس کے خالی کیے جانے کے بعد باغی اس پر گولے برساتے رہے۔ انگریزی فوج ایک سپاہی ضائع کیے بغیر ریزیڈنسی سے دل کشا پہنچ گئی۔ جنرل ہیولاک کو تھکاوٹ، محنت اور پریشانی نے موت کی نیند سلا دیا۔

سرکولن کو کان پور سے اطلاع ملی کہ وہاں باغیوں کا پلہ بھاری ہو رہا ہے۔ چناں چہ ۲۸ رنومبر ۱۸۵۷ء کو وہ کان پور روانہ ہوا۔ جنرل آوٹ رم عالم باغ ہی میں رہا۔ سرکولن کے کان پور پہنچ جانے سے حالات انگریزوں کے حق میں ہو گئے۔ سرکولن نے انگریز عورتوں اور بچوں کو الہ آباد میں بھیج دیا جہاں سے وہ کلکتہ چلے گئے۔

اب سرکولن دوبارہ لکھنو کی طرف بڑھنا چاہتا تھا۔ اسی اثناء میں انگلستان سے تیئیس ہزار سپاہی مدراس، بمبئی اور کلکتہ میں اتر چکے تھے۔ کان پور کے اردگرد سے باغیوں کو نکالنے کے بعد سرکولن ۱۱رفروری ۱۸۵۸ء کو لکھنو کی طرف بڑھا۔ چوں کہ سرکولن کے پاس بہت بڑا توپ خانہ تھا اس لیے وہ آہستہ آہستہ لکھنو کی طرف بڑھا۔ راہ میں ناظم محمد حسین اور بندہ حسین نے مقابلہ کیا لیکن شکست کھائی۔ لکھنو میں حفاظتی تیاریاں مکمل ہو چکی تھیں۔ یکم مارچ ۱۸۵۸ء کو سرکولن نے بنتارا میں لکھنو پر حملہ کرنے کی اسکیم تیار کی۔ سب سے پہلے وہ دریا کو پار کرنا چاہتا تھا۔ محافظوں نے کشتیوں کا پل تباہ کر دیا تھا۔ سنگین اور آہنی پلوں پر توپیں چڑھا دی گئیں تھیں۔ سرکولن نے دل کشا پہنچ کر اپنی فوجوں کی صف بندی کی اور اپنی توپوں کا منہ شہر کی طرف کر دیا۔ اس کی فوج کے دائیں طرف گومتی (دریا) تھا اور بائیں طرف اس کی فوج عالم باغ تک پھیلی ہوئی تھی۔ دل کشا سرکولن کا ہیڈ کوارٹر تھا۔ سرکولن کی فوج تیئیس ہزار تک پہنچ چکی تھی۔

۶ر مارچ کو باقاعدہ لڑائی شروع ہوئی۔ ۷ر مارچ نے لڑائی میں مزید تیزی دیکھی۔ ۹ر مارچ کو توپوں نے شہر پر گولے برسانے شروع کیے۔ محافظوں نے شکست کھائی۔ انگریزی فوج شاہی باغ کی طرف بڑھی۔ یہاں سے انگریزوں نے قیصر باغ کی حفاظتی لائنوں پر گولے برسانے شروع کیے۔ ۱۰ر مارچ کو انگریزی فوج نے آہنی دروازے کے ایک حصے پر قبضہ کر لیا۔ لکھنو کی پہلی حفاظتی لائن ٹوٹ چکی تھی۔ ۱۴ر مارچ کو امام باڑے پر انگریزوں کا قبضہ ہو گیا۔ اسی دن انگریزی فوج قیصر باغ میں داخل ہوئی۔ لوگوں نے شہر سے بھاگنا شروع کر دیا۔ جن محلوں میں انگریزی

قبضہ ہوتا ان میں لوٹ مار ہوتی۔ اگلے دن باغی سپاہیوں کی ایک بہت بڑی تعداد بالائی اودھ اور روہیل کھنڈ کی طرف بھاگ گئی۔ ۱۷؍ مارچ کو شہر پر انگریزوں کا پورا پورا قبضہ ہو گیا۔ لکھنؤ انگریزی قبضے میں آ چکا تھا لیکن باغی فوج ہنوز میدان میں تھی۔

لکھنؤ سے باغیوں کے نکل جانے کی اطلاع پر کلکتہ اور لندن میں شدید نکتہ چینی ہوئی۔ سر جیمز آؤٹ رم کی جگہ مونٹ گمری سول کمشنر مقرر کیا گیا۔ سر جیمز آؤٹ رم گورنر جنرل کی کونسل کا فوجی ممبر مقرر ہوا۔ روہیل کھنڈ میں بہادر خان باغیوں کی رہنمائی کر رہا تھا۔ نانا صاحب بھی لکھنؤ سے بھاگ کر بریلی پہنچ چکا تھا۔ باغیوں نے یہ فیصلہ کر لیا تھا کہ اگر انھیں روہیل کھنڈ میں ناکامی ہوئی تو وہ وسطی ہندوستان کی طرف چلے جائیں گے۔ اس فیصلے سے مطلع ہو کر سر کولن نے باغیوں کو روہیل کھنڈ میں محصور کرنے کی اسکیم مرتب کی اور وسطی ہندوستان کے باغیوں کی سرگرمیوں کا مقابلہ کرنے کے لیے بمبئی اور مدراس کی حکومتوں کو لکھ دیا۔ انگریزی فوج کا مقابلہ کرنے کے لیے بہادر خان نے بریلی میں تیاریاں کر لی تھیں۔ انگریزی فوج نے چاروں طرف سے روہیل کھنڈ پر حملے کیے تھے لیکن انھیں کامیابی نہ ہو سکی۔ اپریل ۱۸۵۸ء گزر گیا۔

۲ ؍مئی ۱۸۵۸ء کو سر کولن، شاہ جہان پور سے بریلی کی طرف بڑھا۔ ۷؍ مئی کو باغیوں نے شہر کو خالی کر دیا۔ سر کولن کی غیر حاضری میں باغیوں نے شاہ جہان پور کو گھیر لیا۔ بیگم اودھ، نانا صاحب اور شہزادہ (فیروز شاہ) اپنے سپاہیوں سمیت شاہ جہان پور پہنچ گئے۔ اسی اثناء میں سر کولن بھی کمک لے کر آ گیا۔ باغی پھر منتشر ہو گئے۔

میرٹھ، دلی، کان پور، لکھنؤ اور بریلی کے علاوہ ہندوستان کے جن گوشوں تک بغاوت کا اثر پہنچا تھا، ان کا تذکرہ بہت طویل ہے۔ اس کتاب کا ایک باب اس کا متحمل نہیں ہو سکتا۔ اس کے بیان کے لیے ایک دفتر درکار ہے۔ مختصر طور پر چند واقعات کو پیش کیا جا رہا ہے۔

اودھ اور بنگال کے درمیان دیناپور (بہار) میں بھی جولائی ۱۸۵۷ء میں دیسی سپاہیوں نے بغاوت کی۔ اگست میں سارا بہار بغاوت پر آمادہ تھا۔ ہر طرف بے چینی پھیلی ہوئی تھی۔ ستمبر تک مشرقی بنگال اور آسام بھی بغاوت سے متاثر ہوئے۔

چوں کہ آگرہ کمپنی کے شمال مغربی صوبوں کا صدر مقام تھا اس لیے وسطی ہندوستان، بریلی، اودھ اور دوسرے مقامات سے بھاگے ہوئے انگریز وہاں پہنچتے رہے۔ پناہ گزینوں کو قلعے میں رکھا گیا۔ آگرے میں بھی بغاوت ہوئی۔ اس بغاوت میں سپاہی اور غیر سپاہی دونوں شریک تھے۔

ناگ پور میں مقیم انگریزی فوج میں دیسی سپاہیوں کی کافی تعداد تھی۔ لیکن انگریزی کمشنر نے

جسارت اور ہوشیاری سے ان کے ہتھیار چھین لیے۔ جن سپاہیوں سے ہتھیار چھینے گئے تھے وہ زیادہ تر شمالی ہندوستان کے رہنے والے تھے۔ مدراسی سپاہیوں نے چوں کہ اپنی وفاداری کا ثبوت دیا تھا اس لیے انھیں مسلح رہنے دیا۔ جون کے اختتام تک بغاوت کے سارے آثار مٹائے جا چکے تھے۔ ناگ پور کے شمالی علاقوں میں بھی انگریز افسر دیسی سپاہیوں کو غیر مسلح کرنے میں کامیاب ہو گئے۔

بندھیل کھنڈ میں بغاوت کا بہت زور تھا اس بغاوت کا مرکز جھانسی میں تھا۔

۴ر جون ۱۸۵۷ء کو دیسی سپاہیوں نے بغاوت کی اور چھاؤنی میں کئی انگریز قتل کر دیے۔ بہت سے انگریزوں نے شہر کے قلعے میں پناہ لی۔ کافی مدت تک باغیوں کا مقابلہ کرنے کے بعد انگریزوں نے ہتھیار ڈال دیے۔ باغیوں نے انھیں گرفتار کر کے مردوں کو ایک قطار میں کھڑا کر دیا اور بچوں اور عورتوں کو دوسری قطار میں۔ پہلے مردوں کو قتل کیا گیا اور بچوں کو ان کی ماؤں کے سامنے ٹکڑے ٹکڑے کیا گیا۔ آخر میں عورتوں کو بھی قتل کر دیا گیا۔

اگرچہ ہلکر اور سندھیا کمپنی کے وفادار رہے، پھر بھی بغاوت ان کی ریاست تک جا پہنچی۔ ہلکر کی فوجوں نے بغاوت کی۔ اندور میں کئی انگریز قتل کر دیے گئے۔ جولائی میں ہلکر کی ساری ریاست میں بغاوت پھیل چکی تھی۔ سندھیا بھی انگریزوں کا وفادار رہا۔ لیکن اس کی ریاست میں بھی بغاوت ہوئی۔ گوالیار کی ساری دیسی فوج نے بغاوت کر دی۔ لیکن جب انھیں یقین ہو گیا کہ مہاراجہ ان کا شریک کار نہیں ہو سکتا تو باغی سپاہی بغاوت کے دوسرے مرکزوں کی طرف چل دیے۔

سر ہیوروز کو ان علاقوں کی بغاوت کی روک تھام کے لیے بھیجا گیا وہ سب سے پہلے جھانسی کی طرف بڑھا۔ نانا صاحب کا بھائی باغیوں کا سرغنہ تھا۔ کھلے میدانوں میں باغیوں اور انگریزوں میں کئی لڑائیاں ہوئیں۔ سر ہیوروز نے جھانسی کا محاصرہ کر لیا۔ اپریل ۱۸۵۸ء میں تانتیا توپی نے محاصرہ اٹھانے کے لیے ہلا کیا۔ وہ بڑی بہادری سے لڑتا رہا۔ یہاں تک کہ وہ جنگلوں کی طرف نکل گیا۔ جھانسی کی رانی لکشمی بائی فصیل کی دیواروں پر سے اپنی فوج کی شکست دیکھ رہی تھی۔ وہ اسی رات اپنے ہمراہیوں سمیت جھانسی سے بھاگ گئی۔ انگریزی فوج جھانسی میں داخل ہو گئی۔ لوٹ مار اور قتل عام!

تانتیا توپی، کالپی میں اپنی فوجوں کو جمع کر رہا تھا۔ آس پاس کے علاقوں سے باغی سپاہی وہاں جمع ہو رہے تھے۔ تانتیا توپی کی فوج میں دس ہزار سپاہی شامل ہو گئے۔ تین ہزار مرہٹے اور سات

ہزار مسلمان، لکشمی بائی بھی تانتیا توپی کے پاس پہنچ چکی تھی۔ دونوں نے ملک کر سر ہیوروز کو کالپی پہنچنے سے روکا۔ لیکن دونوں نے شکست کھائی۔ ہیوروز کالپی کی طرف بڑھتا چلا گیا۔ کالپی میں انگریزوں اور باغیوں میں شدید لڑائیاں ہوئیں۔ باغیوں نے رات کی تاریکی میں شہر خالی کر دیا۔ سر ہیوروز کالپی میں داخل ہوا۔ اگلے روز باغی سپاہی گوالیار میں داخل ہوئے۔ سندھیا کو گدی سے اتار دیا گیا۔ سندھیا نے آگرہ کی راہ لی۔ نانا صاحب کے پیشوا ہونے کے اعلان کو دہرایا گیا۔ باغیوں نے سندھیا کے خزانوں پر قبضہ کر لیا۔

جب سر ہیوروز کو اطلاع ملی کہ باغیوں نے گوالیار پر قبضہ کر لیا ہے تو وہ فوج لے کر سندھیا کی راہ دھانی کی طرف بڑھا۔ لکشمی بائی نے اس کمک کو ہیوروز تک نہ جانے کے لیے اس پر حملہ کر دیا۔ شدید لڑائی ہوئی۔ لکشمی بائی زخمی ہو کر گھوڑے سے گر پڑی۔ تانتیا توپی نے اس کی ہدایات پر عمل کرتے ہوئے لڑائی کو جاری رکھا۔ لیکن شکست کھائی۔ تانتیا توپی آٹھ ہزار سپاہیوں کو لے کر جے پور کی طرف چل دیا۔ باغیوں کی مرکزیت ٹوٹ چکی تھی۔ ستمبر ۱۸۵۸ء کے بعد گوریلا لڑائیاں ہوتی رہیں۔ یہاں تک کہ نانا صاحب نیپال میں چلا گیا۔ تانتیا توپی نے اپنی سرگرمیوں کو جاری رکھا، یہاں تک کہ اس نے گرفتار ہو کر موت کی سزا پائی۔ منگل پانڈے نے جس بغاوت کو شروع کیا تھا اسے تانتیا توپی کی موت نے ختم کر دیا۔

تنگ نظر مورخوں نے ۱۸۵۷ء کی تصویر کا صرف ایک ہی رخ پیش کیا۔ باغی سپاہیوں کے مظالم کو تاریک ترین لفظوں میں بیان کیا گیا۔ ان مؤرخوں کی وقائع نگاری نے ساری انگریز قوم کے دل میں ہندوستان کے خلاف نفرت پیدا کرنے کی کوشش کی۔ جب تصویر کا صرف ایک رخ ہی سامنے ہو تو دوسرا رخ دیکھنے کے لیے ایک تڑپ پیدا ہوتی ہے۔ دوسرا رخ دیکھتے ہی جذبات میں جوش پیدا ہوتا ہے۔ جوش کے جذبے سے متاثر ناظر تصویر کے پہلے رخ کو نظر انداز کر دیتا ہے۔ ۱۸۵۷ء کی تصویر سے یہی سلوک ہوتا رہا۔ دیکھنے والوں کو صرف ایک ہی رخ سے مشتعل کرنے کی کوشش ہوتی رہی۔ ظاہر ہے کہ جب تک اس تصویر کے دونوں رخ پیش نہ کیے جائیں اس وقت تک اس واقعے کے اسباب و نتائج مرتب نہیں ہو سکتے۔ صرف ہندوستانیوں کے ظلم و ستم پیش کرنے والے مؤرخوں نے اپنی جماعت کی ضد پیدا کی۔ مؤرخوں کی اس نئی جماعت نے صرف دوسری طرف کے مظالم کو اجاگر کرنا چاہا جس سے اسباب و نتائج کی ترتیب میں وہی دقت باقی رہی۔ وقائع نگاری کی دیانت کا یہی تقاضا ہے کہ اس تصویر کے دونوں رخ پیش کیے جائیں۔ جس

ہندوستانی طالب علم کو نانا صاحب کے مظالم پڑھائے جاتے ہیں، اسے یہ بھی بتانا چاہیے کہ جب کرنل نیل الہ آباد سے کان پور پہنچا تو اپنے پیچھے سڑک کے دونوں کناروں کے درختوں پر ہندوستانیوں کی نعشوں کو لٹکتا ہوا چھوڑ گیا۔

میرٹھ کی فوجی بغاوت نے صوبہ جات متحدہ، دلی اور کسی حد تک صوبہ جات متوسط بہار میں ایک عام بغاوت کی صورت اختیار کر لی تھی۔ پنجاب کے کئی ایک مقامات میں فوجی سپاہیوں نے بغاوت کی۔ عام پنجابی اس بغاوت میں شریک نہ ہوئے۔ پنجاب کی کثیر آبادی پچھلے سو سال سے کچلی جا رہی تھی۔ اس میں نہ ملکی شعور تھا اور نہ قومی بیداری۔ سکھوں کی شکست سے سپاہی منتشر ہو چکے تھے۔ ان کا پیشہ سپہ گری تھا۔ ان سپاہیوں کا انگریزی فوج میں بھرتی ہو کر دوسرے صوبوں میں جانا کسی قسم کی حیرت پیدا نہیں کرتا۔ چند سال پہلے ان صوبوں کے سپاہی بھی تو انگریزی فوج میں بھرتی ہو کر پنجاب کو شکست دے چکے تھے۔ یہ کہنا کہ ۱۸۵۷ء کی بغاوت اس لیے ناکام رہی کہ پنجابی سپاہیوں نے دلی کے محاصرے میں انگریزوں کی، مدد کی تاریخی واقعات کے نتائج کے اسباب کو جھٹلاتا ہے۔ ۱۸۵۷ء کی بغاوت کی ناکامی یقینی تھی۔ فوجوں نے بغاوت کی۔ عوام ان کے ساتھ ہو لیے۔ انگریز دشمنی کے جذبات کو بھڑکایا گیا۔ جوش میں آ کر لوگوں نے ایسے کام کیے جو انقلاب پسندوں کے شایان شان نہیں ہوتے۔ عوام کو ایک ایسے نظام کے بچانے کے لیے لڑایا جا رہا تھا جو اپنے طبعی عمر تک پہنچ چکا تھا۔ ان باغیوں نے دلی پر قبضہ کرنے کے بعد بہادر شاہ کی بادشاہت کا اعلان کر دیا۔ شاید یہ بات بھی سکھوں کے لیے ناقابل قبول ہو۔ بوڑھا، کمزور اور شاعر بہادر شاہ بیاسی کے سن میں ہندوستانی عوام کے حقوق کے متعلق کیا اعلان کر سکتا تھا؟ اس کی ذات اور اس کے تخت سے اشاریت کا کام نہیں لیا جا سکتا تھا؟ ہندوستان کی کون سی قوم تھی جو اس تخت پر کلہاڑے نہیں چلا چکی تھی؟ بہادر شاہ کے نام پر مغلوں، افغانوں، سکھوں، راجپوتوں، روہیلوں اور مرہٹوں کو یکجا نہیں کیا جا سکتا تھا۔ ان سب کو اکٹھا کرنے کے لیے کسی ''انسانی حقوق کی آزادی کے اعلان'' کی ضرورت تھی۔ باغی سپاہی اور باغی عوام نہ انسانی حقوق سے واقف تھے اور نہ آزادی کے مفہوم سے آشنا۔

بغاوت کا نعرہ ''انگریزوں کو نکال دو'' تھا۔ اس لیے اس بغاوت میں تمام ایسے عناصر شریک ہو گئے جنھیں انگریزوں سے نقصان پہنچا تھا۔ ان عناصر میں کوئی ہم رنگی نہیں تھی۔ وہ سب کے سب اپنے اپنے خیال کے مطابق ''ہندوستان کی آزادی'' کے لیے لڑ رہے تھے۔ آزادی کے متعلق ہر پارٹی کا اپنا اپنا خیال تھا۔ یہ خیالات اگرچہ ظاہر نہیں کیے گئے تھے لیکن ان کے وجود سے انکار نہیں

ہوسکتا۔ ایک مشترکہ دشمن نے مخالف اور متضاد عناصر کو یکجا تو کر دیا تھا، لیکن ان عناصر کے تحت الشعور میں اپنی اپنی عظمت اور اپنے اپنے راج کا جذبہ کام کر رہا تھا۔ جب بہادر شاہ قلعہ چھوڑ کر ہمایوں کے مقبرہ میں پناہ گزین ہوا تو اس وقت بخت خان نے اس سے کہا کہ وہ باغیوں کے ساتھ دلی چھوڑ کر کسی دوسرے شہر میں چلا جائے تاکہ انگریزوں کے خلاف لڑائی جاری رکھی جاسکے۔ بہادر شاہ نے ارادہ کرلیا تھا کہ وہ بخت خان کے ساتھ چلا جائے گا۔ لیکن جب بہادر شاہ سے کہا گیا کہ ''بخت خان پٹھان ہے اور وہ حضور کو مروا کر خود بادشاہ بننا چاہتا ہے'' تو بہادر شاہ نے اس کا مزید ساتھ دینے سے انکار کر دیا۔ اس ایک واقعہ سے اندازہ لگایا جاسکتا ہے کہ بغاوت کرنے والوں کے خیالات اور مقاصد کس قدر مختلف تھے؟

ایک ہنگامی مقصد نے جن مخالف اور متضاد عناصر کو اکٹھا کر دیا تھا ان کا زیادہ دیر تک ایک ساتھ رہنا ناممکن تھا۔ ہندوستان وطنیت اور قومیت کے تصور سے ناآشنا تھا۔ ہندوستان جن عناصر سے عبارت تھا وہ ایک دوسرے کے مخالف تھے۔ ان مخالف عناصر کو انگریزوں سے لڑایا گیا۔ اگر یہ عناصر کامیاب بھی ہوجاتے تب بھی ان کا زیادہ دیر تک ایک ساتھ رہنا ناممکن تھا۔ ان عناصر کے تصادم سے ایک طویل اور خوفناک خانہ جنگی شروع ہوجاتی۔

۱۸۵۷ء کی بغاوت ناکام رہی۔ لیکن اس ناکامی نے بھی کمپنی کی حکومت ختم کر دی۔ ہندوستان کمپنی کے قبضے سے نکل کر تاج برطانیہ کے ماتحت ہوگیا۔

۲۷ر جنوری ۱۸۵۸ء کو بہادر شاہ کا مقدمہ برطانوی افسروں کی ایک عدالت میں پیش ہوا۔ طویل سماعت کے بعد بہادر شاہ کو جلاوطنی کی سزا دی گئی۔ اسے رنگون میں نظربند کر دیا گیا۔ قریباً پانچ سال بعد بہادر شاہ نے رنگون میں وفات پائی۔

۱۸۵۸ء کے اختتام تک ہندوستان کے حالات پہلی صورت پر آ گئے۔ یکم نومبر ۱۸۵۸ء کو ملکہ وکٹوریہ کے ایک اعلان نے ہندوستان کو کمپنی کی حکومت سے نکال کر اسے تاج برطانیہ کے ماتحت کر دیا۔ یہ اعلان محض رسمی طور پر کیا گیا تھا کیوں کہ ۱۸۵۳ء کے چارٹر ایکٹ نے کمپنی کے سیاسی اقتدار کو پہلے ہی ختم کر دیا تھا۔ لارڈ کیننگ جو کمپنی کے دور حکومت کا آخری گورنر جنرل تھا، تاج برطانیہ کے ماتحت ہندوستان کا پہلا وائسرائے مقرر کیا گیا۔ (کمپنی کی حکومت، ص ۹-۴۰۱)

جنگ آزادی کے ابتدائی دو تین ماہ کے دوران تھانہ بھون میں پوری طرح امن و امان قائم رہا۔ چناں چہ دوسرے قصبوں اور شہروں کو یہاں کے لوگ نہایت آزادی سے آتے جاتے رہتے

تھے اور کسی کے دل میں کسی قسم کا کوئی خوف و ہراس نہیں تھا۔ ان حالات میں قاضی عبدالرحیم نے اپنے مجوزہ مکان کے لیے کچھ قیمتی سامان سہان پور سے لانے کا ارادہ کیا۔ ان کا دل صاف تھا اور ساتھ ہی ان معاہدوں پر جو ان کے بڑوں نے وقتاً فوقتاً کیے تھے پورا اعتماد تھا۔ لہذا انگریزی حکومت کی جانب سے کسی بدسلوکی کا ان کو وہم بھی نہیں ہو سکتا تھا۔ اسی بناء پر انھوں نے اس پرآشوب زمانے میں سہارن پور کا سفر اختیار کیا۔

اس زمانے میں رئیسوں کی سواری کے لیے ہاتھی ہوتا تھا۔ چناں چہ قاضی عبدالرحیم اپنے چند مصاحبوں کے ساتھ ہاتھی پر سوار ہو کر سہان پور گئے اور وہاں پہنچ کر ایک سرائے میں مقیم ہوئے۔ شہر میں ان کے ایک خالو بھی رہتے تھے جن کا نام شیر علی تھا اور جو شہر کے رؤسا میں شمار کیے جاتے تھے۔ غالباً قاضی عبدالرحیم نے اتنے مصاحبین کے ساتھ خالو کے مکان میں ٹھہرنا مناسب نہ سمجھا اور سرائے میں قیام کو ترجیح دی۔

قاضی عنایت علی اور قاضی عبدالرحیم تھانہ بھون میں بے حد ہردل عزیز تھے۔ ہندو اور مسلمان دونوں ہی ان سے محبت کرتے اور ان کو عزت کی نظر سے دیکھتے تھے۔ پھر بھی قصبہ میں بعض ایسے نفوس موجود تھے جن کو ان دونوں بھائیوں سے عناد تھا۔ ان ہی لوگوں میں قوم کائستھ کا ایک شخص بھی تھا۔ جو دفتر کلکٹری سہارن پور میں سررشتہ داری کے عہدے پر متعین تھا۔ غالباً قاضی عنایت علی سے جائیداد کا معاملہ تھا۔ اس کا کچھ جھگڑا عرصے سے چلا آ رہا تھا۔ اپنی سابقہ رنجش اور عداوت کا بدلہ لینے کا اسے نہایت زریں موقع ملا۔ قاضی عبدالرحیم کی سہارن پور آمد سے اس نے خاطر خواہ فائدہ اٹھایا اور حاکم ضلع رابرٹ اسپنکی سے یہ جھوٹی شکایت کی کہ ''تھانہ بھون کا رئیس عنایت علی انگریزی حکومت سے باغی ہو گیا ہے اور اس کا چھوٹا بھائی عبدالرحیم شاہ دہلی کے باغیوں کے لیے سامان حرب خریدنے کے لیے سہارن پور آیا ہوا ہے۔''

رابرٹ اسپنکی کو ضلع سہارن پور کی اہمیت کے پیش نظر حکومت انگلشیہ سے فوجی اور سول دونوں کے وسیع اختیارات ملے ہوئے تھے۔ مختلف محاذوں پر فوج، اسلحہ اور رسد بھیجنا، فوجی افسروں کا تقرر و تنزل اور ان کے لیے حکم احکام جاری کرنا اس کے دائرہ اختیار میں تھا۔ کچھ تو ان وسیع اختیارات کا نشہ، کچھ اپنی ذمہ داریوں کا احساس اور کچھ ان سب باتوں پر مستزاد یہ کہ شکایت ایک سرکاری ملازم کی طرف سے ہوئی تھی۔ وہ بھی خاص تھانہ بھون کا باشندہ۔ لہٰذا وہ ایک دم مشتعل ہو گیا اور اپنی قومی خصوصیت ضبط و تحمل کو یکسر فراموش کر کے قاضی عبدالرحیم کو سرائے سے بلوا بھیجا

اوران سے حاکمانہ انداز سے سہارن پور آنے کی وجہ دریافت کی۔ قاضی عبدالرحیم نے جو بات تھی بے کم وکاست بیان کردی۔ اس نے اس بیان کی تصدیق چاہی۔ قاضی صاحب نے کہا کہ میرے خالو شیر علی صاحب سے جو شہر میں موجود ہیں بلا کر میرے بیان کی تصدیق کی جاسکتی ہے۔

اسپنکی نے شیر علی صاحب کو طلب کرلیا۔ وہ کلکٹر کی تیز مزاجی اور فرعونیت سے بخوبی واقف تھے لہٰذا اس خوف سے کہ وہ کہیں الٹا مجھے بھی نہ پھانس لے صاف طور پر کہہ دیا:

''مجھے ان کے سہارن پور آنے کی وجہ قطعاً معلوم نہیں ہے۔''

یہ بھی ممکن ہے کہ ان کے اس بیان میں حقیقت وصداقت ہو اور وہ واقعی اس بات سے بے خبر ہوں۔ لیکن اسپنکی جو پہلے سے کافی بدظن تھا ان کے اس بیان سے بھڑک اٹھا اور اس نے مزید تحقیق وتفتیش کیے بغیر قاضی عبدالرحیم صاحب اور ان کے رفقاء کو پھانسی دے دی۔ (جہاد شاملی)

قاضی عنایت علی اپنے بھائی عبدالرحیم کی پھانسی کی اطلاع سے ہوش وحواس کھو بیٹھے۔ کیرانہ، شاملی اور تھانہ بھون کے علاقے میں آگ لگ گئی۔ دیوبند، گنگوہ، نانوتہ وغیرہ سے لوگ تھانہ بھون پہنچے اور ایک مجلس شوریٰ منعقد ہوئی جس کے خاص خاص حضرات کے نام یہ ہیں۔ حاجی امداداللہ مہاجر مکیؒ، حافظ محمد ضامنؒ، مولانا مظہرؒ نانوتوی بانی مدرسہ مظاہر العلوم سہان پور، مولانا محمد منیر نانوتوی، مولانا محمد قاسم نانوتویؒ، مولانا رشید احمد گنگوہیؒ، مولانا محمد احسن نانوتوی اور مولانا شیخ محمد تھانویؒ۔ آخرالذکر دونوں حضرات نے جہاد کے خلاف رائے دی۔ آخر فیصلہ جہاد کے حق میں ہوا۔ حضرت حاجی امداداللہ صاحب امیر جہاد مقرر ہوئے۔ حربی سکریٹری مولانا محمد منیر نانوتوی اور فصل قضایا کا عہدہ مولانا رشید احمد گنگوہی کو ملا۔ مولوی عاشق الٰہی میرٹھی بڑی احتیاط سے لکھتے ہیں:

> ''اس بدامنی کی حالت میں...... عام باشندگان قصبہ کی یہ حالت ہوئی گویا ان کا مربی ومنتظم بادشاہ سر سے اٹھ گیا اور شرعی وطبعی ضروریات ومخصمات میں بھی کوئی خبر گیراں نہ رہا، جس کی رائے پر عمل کریں۔ پس یہ لوگ اعلیٰ حضرت حاجی صاحب کی خدمت میں حاضر ہوئے اور عرض کیا کہ بلا کسی حاکم کی سرپرستی کے گزران دشوار ہے...... اس لیے آپ چوں کہ ہمارے دینی سردار ہیں، دنیاوی نظم حکومت کا بھی بار اپنے سر رکھیں اور امیرالمومنین بن کر ہمارے باہمی قضیے چکادیا کریں۔'' (جہاد شاملی)

۱۹ر جولائی کو کمپنی ۲۹ر رجمنٹ جو سہارن پور کے خزانے پر متعین تھی بھاگ گئی۔ بھاگنے والوں

کی تعداد ۹۷ تھی۔ ان ہی تاریخوں میں یہ اطلاع ملی کہ کوتوال شہر سہارن پور علیم اللہ خان باغیوں کے ساتھ سازش کررہا ہے۔ یہ اطلاع پاکر پہلے اس کو نکوڑ کی تحصیلداری پر بھیج دیا گیا اور پھر وہاں سے گرفتار ہو کر انبالہ گیا اور آخرکار اس کو پھانسی دے دی گئی۔ گنگھل میں بھی کچھ شورش ہوئی مگر جلد دبا دی گئی۔ دیوبند میں بھی لوٹ مار اور قتل وغارت گری ہوئی اور اکثر ہندو مہاجنوں کے گھر لوٹے گئے۔ اس زمانے میں وہاں کا کوتوال ایک عیسائی تھا۔ وہ اپنی جان بچا کر سہارن پور چلا گیا اور ایک ہندو مان سنگھ کوتوال مقرر ہوا۔ اس نے امن وامان کو بحال کیا۔ قصبہ انبیٹھہ اور قصبہ سرسادہ میں بھی گوجروں نے تاخت وتاراج کیا لیکن گورکھا فوج کے آجانے سے نہ صرف ان مقامات پر بلکہ پورے ضلع میں امن وامان قائم ہوا۔ (جہاد شاملی)

فتویٰ جہاد:

۲۶ر جولائی ۱۸۵۷ء: صادق الاخبار، دہلی میں فتویٰ جہاد شائع ہوا تھا۔ اس فتوے کے حوالے سے کئی شخصیات کے بارے میں جو روایات بیان کی جاتی ہیں، فتویٰ کی دریافت اور تحقیق نے ان کی قلعی تغلیط کردی ہے۔ فتوے کی عدم دستیابی کی وجہ سے اس کے مفتیانِ کرام کے بارے میں کئی غلط فہمیاں کارفرما رہی ہیں۔ مثلاً:

(۱) مولانا فضل حق خیرآبادی کے بارے میں کہا گیا کہ وہ نہ صرف اس پر دستخط کرنے اور تصدیق کرنے والے مفتی ہیں بلکہ فتوے کے اصل محرک وہی ہیں۔

(۲) میاں نذیر حسین محدث دہلوی کے بارے میں روایت تھی کہ فتوے پر ان کے دستخط نہیں ہیں۔

(۳) مولوی محمد محبوب علی کے بارے میں مشہور ہوا کہ انھوں نے فتوے پر دستخط کرنے سے انکار کردیا۔

(۴) حضرت مفتی صدرالدین آزردہ کے بارے میں تحریر ہوا کہ انھوں نے فتوے پر اپنے دستخط کے ساتھ کتبت بالخیر یا شہدت بالخیر لکھا تھا۔ لیکن ''خ'' کا نقطہ چھوڑ دیا تھا۔ سقوط دہلی کے بعد جب ان کی گرفت ہوئی تو انھوں نے کہہ دیا کہ ان سے بالجبر دستخط کرائے گئے تھے اور ''بالجبر'' انھوں نے لکھ دیا تھا۔ دیکھا گیا تو واقعی ایسا ہی تھا۔ اس طرح ان کی گلو خلاصی ہوئی۔

(۵) اسی طرح قاضی فیض اللہ، مولوی فیض احمد بدایونی، ڈاکٹر وزیر خان اور سید مبارک شاہ

رام پوری کو فتوے کا تصدیق و توثیق کنندہ بیان کیا گیا ہے۔

اب فتویٰ دستیاب ہوا تو پتا چلا کہ یہ سب افسانے ہیں۔ مولانا فضل حق کے اس پر دستخط ہی نہیں۔ وہ اس کے محرک بھی کیسے ہو سکتے ہیں جب کہ اولاً فتویٰ جون میں یا جولائی کے اوائل میں شائع ہو چکا تھا اور وہ خود وسط اگست میں دہلی پہنچے تھے۔ میاں نذیر حسین اور مولوی سید محبوب علی، دونوں کے دستخط اس پر موجود ہیں اور مفتی صاحب کے دستخط کے ساتھ کتبت بالجبر یا شہدت بالجبر کوئی جملہ موجود نہیں اور موخر الذکر چار حضرات سے میں سے کسی کے دستخط نہیں۔

یہ فتویٰ سب سے پہلے اخبار الظفر دہلی میں شائع ہوا۔ اس سے صادق الاخبار، دہلی نے ۲۶ر جولائی ۱۸۵۷ء کی اشاعت میں نقل کیا۔ صادق الاخبار کے مدیر نے اس کی سرخی یہ دی تھی۔ ''نقل استفتاء از اخبار الظفر دہلی، اردو'' لیکن اخبار الظفر کا متعلقہ شمارہ ابھی تک دستیاب نہیں ہوا۔ صادق الاخبار سے یہ فتویٰ عتیق صدیقی، مولانا سید محمد میاں، خورشید مصطفیٰ رضوی، عبدالرزاق قریشی، امداد صابری، ڈاکٹر محمد ایوب قادری کی تالیف اور دیگر متعدد کتب اور بے شمار رسائل میں سے نقل کیا جا چکا ہے۔ بعض نے اس کا عکس شائع کیا ہے۔ ہمارے سامنے مولانا سید محمد میاں کی تالیف ''علماء ہند کا شاندار ماضی'' اور ڈاکٹر محمد ایوب قادری کی تالیف ''جنگ آزادی ۱۸۵۷ء (واقعات وشخصیات) ہے۔ لیکن یہاں ''دستخط و مواہیر'' کو عتیق صدیقی کی تالیف ''۱۸۵۷ء کے اخبارات و دستاویزات'' سے صادق الاخبار کے عکس کے مطابق پیش کیا جا رہا ہے:

استفتاء:

کیا فرماتے ہیں علمائے دین اس امر میں کہ اب جو انگریز دلی پر چڑھ آئے اور اہل اسلام کی جان و مال کا ارادہ رکھتے ہیں۔ اس صورت میں اب اس شہر والوں پر جہاد فرض ہے یا نہیں اور اگر وہ فرض ہے تو فرض عین ہے یا نہیں؟ اور لوگ جو اور شہروں اور بستیوں کے رہنے والے ہیں ان کو بھی جہاد کرنا چاہیے یا نہیں؟ بیان کرو اللہ تم کو جزا دے:

جواب: درصورت مرقومہ فرض عین ہے۔ اوپر تمام اس شہر کے لوگوں کے اور استطاعت ضرور ہے اس کی فرضیت کے واسطے۔ چناں چہ اب اس شہر والوں کو طاقت مقابلہ اور لڑائی کی ہے۔ بہ سبب کثرتِ اجتماع افواج کے اور مہیا اور موجودہ ہونے والے آلات حرب کے تو فرض عین ہونے میں کیا شک رہا اور اطراف و حوالی کے لوگوں پر جو دور ہیں باوجود خبر کے فرض کفایہ ہے۔ ہاں اگر اس شہر کے لوگ باہر ہو جائیں مقابلے سے یا سستی کریں اور مقابلہ نہ کریں تو اس صورت میں ان پر بھی فرض عین ہو جائے گا اور

اسی طرح اور اسی ترتیب سے سارے اہل زمین پر شرقاً وغرباً فرض عین ہوگا۔ اور جو عدو اور بستیوں پر ہجوم اور قتل اور غارت کا ارادہ کریں تو اس بستی والوں پر بھی فرض ہو جائے گا۔ بشرط ان کی طاقت کے۔

دستخط اور مواہیر:

المجیب المصیب احقر العباد نور جمال عفی عنہ۔ العبد محمد عبدالکریم۔ العبد فقیر سکندر علی۔

سید محمد نذیر حسین — رحمت اللہ — مفتی محمد صدر الدین — مفتی اکرام الدین معروف سید رحمت علی — محمد ضیاء الدین

صح ہذا الجواب عبدالقادر — فقیر احمد سعید احمدی — العبد محمد میر خاں — محمد مصطفیٰ خان ولد حیدر شاہ نقشبندی

محمد کریم اللہ — العبد مولوی عبدالغنی — خادم العلما محمد علی — فرید الدین

محمد سرفراز علی — سید محبوب علی جعفری — حامی الدین، محمد ابو احمد — العبد سید احمد علی — الٰہی بخش

محمد انصار علی — مولوی سعد الدین — نام پڑھا نہیں جاتا — سراج العلماء ضیاء الفقہا۔ مفتی عدالت العالیہ محمد رحمت علی خان

حیدر علی — حفیظ اللہ خاں — محمد نور الحق چشتی — واللہ الغنی داشم الفقرا

العبد سیف الرحمٰن — محمد امداد علی عفی عنہ — خادم شرع شریف رسول الثقلین قاضی القضات محمد علی حسین

سید عبدالحمید عفا اللہ عنہ — محمد ہاشم — ماخطہ سید محمد

اس فتوے پر استفتاء کا جواب لکھنے والے ''نور جمال'' کے علاوہ تینتیس (۳۳) علمائے کرام و مفتیان عظام کے دستخط ہیں۔ ایک نام پڑھا نہیں جا سکا۔

۲/ اکتوبر ۱۸۵۷ء: جو شہزادے قید میں تھے ان پر سخت مظالم ہوتے تھے۔ نواب احمد قلی خان والد زینت محل انگریزوں کے دہلی میں داخل ہوتے ہی جھجر بھاگ گئے تھے۔ لیکن جھجر سے پکڑے ہوئے آئے۔ ان سے بڑھاپے کی وجہ سے قید کی سختیاں برداشت نہ ہو سکیں۔ آخر جیل خانے ہی میں ان کا انتقال ہو گیا۔ ان کا مکان جو ایک لاکھ روپے کی مالیت کا تھا انگریزوں نے ضبط کر لیا۔ (دلی کی سزا، صفحہ ۵۷)

بعض شہزادوں کو سرسری مقدمات کے بعد پھانسی دے دی گئی۔ سر ولیم میور لکھتا ہے (۲/ اکتوبر ۱۸۵۷ء):

> ''بریگیڈیئر شاور نے بادشاہ کے دو اور بیٹوں کو بھیجا۔ کمیشن کے سامنے ان کا بھی مقدمہ ہوا۔'' (میور، جلد اول، ص ۱۶۶)

مقدمے کا نتیجہ ملاحظہ ہو:

> ''بادشاہ کے دو لڑکوں مرزا بختاور اور مینڈھو کو جن کا مقدمہ زیر سماعت تھا گولی ماردی گئی۔ ان کی نعشیں کوتوالی پر لٹکائی گئیں۔ تیسرے کا مقدمہ زیر سماعت ہے۔'' (ایضاً ص ۱۹۶)

ولیم میور ۱۸۔ نومبر ۱۸۵۷ء کی روداد بیان کرتا ہے:

> ''کل صبح دہلی میں چوبیس شہزادے یا سلاطین پھانسی پر لٹکائے گئے۔ ان میں دو بادشاہ کے برادر نسبتی اور دو داماد تھے، باقی (بادشاہ کے) بھتیجے وغیرہ تھے۔'' (میور، جلد اول، ص ۱۷۳)

۲۰/ اکتوبر ۱۸۵۷ء: نواب جھجھر پر الزام لگا کر انھوں نے مٹکاف کو پناہ دینے سے انکار کر دیا تھا۔ ۲۰/ اکتوبر ۱۸۵۷ء کو انھیں پھانسی دے دی گئی۔ شہر کا سب سے آباد، بارونق اور شاندار محلہ ''خانم بازار'' پورا کا پورا خاک کا ڈھیر بنا دیا گیا۔ (کاررواں گم گشتہ: رئیس احمد جعفری، ۱۹۷۱ء، کراچی، ص ۹۲)

۱۸۵۷ء: مولانا اخلاق حسین قاسمی کی تحقیق کے مطابق ۱۸۵۷ء میں مسلمانوں کے گھر بار، جائیداد، خاندانوں کی دربدری اور تباہی و بربادی کے علاوہ پانچ لاکھ مسلمانوں کو سزائے موت دی گئی اور تین ہزار مسلمان جلاوطن کر کے جزائر انڈمان بھیج دیے گئے۔

(مسلمانان ہند کی ڈیڑھ سو سالہ قربانیوں کا مستند اور معتبر تاریخی جائزہ، ص ۱۰)

بہادر شاہ کا مقدمہ

۲۷ر جنوری ۱۸۵۸ء: بہادر شاہ کے مقدمے کی کارروائی دہلی میں ۲۷ر جنوری ۱۸۵۸ء کو ایک یورپین فوجی کمیشن کے تحت شروع ہوئی۔ یہ کمیشن میجر جنرل پینی سی، بی کمانڈرنگ ڈویژن وحسب ہدایات سرجان لارنس چیف کمشنر پنجاب مقرر کیا گیا تھا۔ کمیشن کے صدر لیفٹنٹ کرنل ڈاس افسر توپ خانہ اور ممبران حسب ذیل تھے:

میجر پامر رسالہ نمبر ۶۰، میجر ریڈمنڈ رسالہ نمبر ۶۱، میجر سائرس کمپنی نمبر ۶، کپتان راتھن کپتان سکھ پیدل نمبر ۴، مترجم مسٹر جیمس مرفی، وکیل سرکار میجر ایف جے ہیرٹ، ڈپٹی جج ایڈووکیٹ جنرل۔

پہلے روز کی کارروائی:

دیوان خاص قلعہ دہلی میں پہلا اجلاس ۲۷ر جنوری ۱۸۵۸ء کو بوقت صبح شروع ہوا۔ پریسیڈنٹ، ممبران، مترجم، وکیل سرکار موجود تھے۔ ملزم محمد بہادر شاہ سابق شاہ دہلی کو لایا گیا۔

اجلاس کے مجتمع کرنے اور لیفٹنٹ کرنل ڈاس کو پریسیڈنٹ بنانے کے احکام پیش ہوئے اور پڑھے گئے۔ افسران متعینہ کے نام ملزم کی موجودگی میں پڑھے گئے۔

بادشاہ سے عدالت کا سوال: آپ کو موجودہ ممبران جیوری و پریذیڈنٹ کے مقدمے کی سماعت کرنے میں کوئی اعتراض ہے؟

جواب: مجھے کوئی اعتراض نہیں ہے!

اس کے بعد ممبران جیوری و پریذیڈنٹ سے حلف لیا گیا اور گواہان کو عدالت سے جانے کی ہدایت کی گئی۔ فرد قرارداد جرم جو لگائی گئی مندرجہ ذیل ہے:

"اول یہ کہ گورنمنٹ ہند کے پنشن خوار ہونے کے باوجود انھوں نے ۱۰ر مئی اور یکم اکتوبر ۱۸۵۷ء کے درمیان مختلف اوقات میں محمد بخت خان صوبہ دار رجمنٹ توپ خانہ اور دیگر متعدد اشخاص و دیسی افسروں اور سپاہیوں کو جو ایسٹ انڈیا کمپنی کی فوج کے ملازم تھے، غدر اور بغاوت کرنے کی ترغیب اور امداد دی۔

دوم یہ کہ ۱۱ر مئی اور یکم اکتوبر کے درمیان انھوں نے اپنے بیٹے مرزا مغل کو جو گورنمنٹ ہند کی رعایا تھا، اور دیگر نامعلوم باشندگان دہلی و ممالک مغربی و شمالی کو جو گورنمنٹ ہند کی رعایا تھے،

سلطنت کے خلاف ہتھیار اٹھانے میں مدد دی اور سازش کی۔

سوم یہ کہ سلطنت برطانیہ کی رعایا ہونے کے باوجود انھوں نے خود گورنمنٹ کی وفاداری نہیں کی جو کہ ان کا فرض تھا اور دہلی میں ۱۱رمئی ۱۸۵۷ء یا اس کے قریب قریب اپنے تئیں بادشاہ ہند مشہور کیا اور شہر دہلی پر ناجائز طور سے قبضہ کرلیا اور ۱۰رمئی تا یکم اکتوبر ۱۸۵۷ء کے درمیان مرزا مغل اپنے فرزند اور محمد بخت خان صوبہ دار توپ خانہ سے سازش کی اور علم بغاوت بلند کیا۔ برطانیہ عظمیٰ کے خلاف جنگ کرنے پر آمادہ ہوئے۔ گورنمنٹ برطانیہ کا تختہ الٹ دینے کی غرض سے ہتھیار بند سپاہیوں کو مغویانہ دہلی میں جمع کر کے متذکرہ سلطنت کے خلاف لڑنے کے لیے آمادہ کیا۔

چہارم یہ کہ ۱۶رمئی ۱۸۵۷ء یا اس کے قریب قریب قلعۂ دہلی کے اندر ۴۹ نفر انگریزوں کو جن میں عورتیں اور بچے بھی تھے قتل کرایا یا کرانے میں حصہ لیا۔ ۱۰رمئی و یکم اکتوبر کے درمیان انگریز افسران و برطانوی رعایا کے جن میں عورتیں اور بچے بھی شامل تھے قتل کرانے میں مدد دی اور قاتلوں سے ملازمت، ترقی اور عہدہ دینے کا وعدہ کیا۔ مزا بر آں انھوں نے مختلف والیان ریاست کے نام احکام جاری کیے کہ وہ عیسائیوں اور انگریزوں کو اپنی حدود میں جہاں پائیں قتل کریں، بموجب ایکٹ ۱۶، ۱۸۵۷ء اس قسم کا طرزِ عمل نہایت سنگین جرم ہے، فریڈ جے ہیرئیٹ میجر دہلی۔

ڈپٹی جج ایڈووکیٹ جنرل و وکیل سرکار جنوری ۱۸۵۸ء

سوال: محمد بہادر شاہ بموجب بیان مذکورہ آیا آپ مجرم ہیں یا نہیں؟

بادشاہ نے جواب دیا میں مجرم نہیں ہوں!

اس کے بعد وکیل سرکاری نے استغاثہ کے اثبات میں ایک تقریر کی۔

پہلے گواہ کی حیثیت سے احسن اللہ خاں الجیب سابق شہنشاہ ہند کو عدالت میں طلب کیا گیا۔ ان کے سامنے مختلف کاغذات پیش کیے گئے اور سوالات کیے گئے۔ انھوں نے کہا بعض دستخط اور تحریرات وہ نہیں پہچانتے۔ بعض مہریں اور تحریریں وہ پہچانتے ہیں۔ جو متذکرہ بادشاہ کے اسپشل سیکریٹری یا مرزا مغل یا بہادر شاہ کی ہیں۔

اس کے بعد مقدمے کی کارروائی دوسرے روز کے لیے ملتوی کردی گئی۔

دوسرے روز کی کارروائی:

جمعرات ۲۸رجنوری ۱۸۵۸ء: آج پھر عدالت بوقت گیارہ بجے صبح قلعۂ دہلی کے دیوان

خاص میں منعقد ہوئی۔ پریذیڈنٹ، ممبران، مترجم اور ڈپٹی جج ایڈووکیٹ جنرل سب حاضر ہیں۔ بادشاہ عدالت میں حاضر کیے گئے۔ حکیم احسن اللہ خان عدالت میں طلب کیے گئے اور گذشتہ تصدیق کی یاددہانی کی گئی۔

اب بادشاہ استدعا کرتے ہیں کہ ایک قانون پیشہ غلام عباس نامی ان کی طرف سے عدالت میں باریاب کیا جائے، تاکہ انھیں قانونی مدد دے سکے۔

عدالت منظور کرتی ہے اور غلام عباس اپنے مقام پر بلالیے جاتے ہیں، پھر مترجم اصلی کاغذات پڑھتا ہے جس کا ترجمہ جج ایڈووکیٹ نے کل پڑھا تھا اور بادشاہ کے مددگار کو سمجھایا جاتا ہے کہ کل گواہ نے نے ہر ایک کاغذ کی کیسی شہادت دی، جب مترجم اصلی فارسی کاغذات کو نمبر ۳۶ تک پڑھ چکتا ہے تو جج ایڈووکیٹ نمبر ۵۶ تک انگریزی ترجمہ پڑھتا ہے۔ اس وقت بادشاہ یکایک بے ہوش ہو کر گر پڑے۔

تیسرے روز کی کارروائی:

یوم جمعہ ۲۵ جنوری ۱۸۵۸ء: عدالت گیارہ بجے دیوان خاص واقع قلعہ میں منعقد ہوئی۔ پریذیڈنٹ، ممبران، مترجم، جج، ایڈووکیٹ سب موجود تھے۔ بادشاہ عدالت میں لائے گئے اور غلام عباس مختار بھی موجود تھے۔ مترجم نے نمبر ۵۶ تک اصلی فارسی کاغذات پڑھے، کل جن کو ایڈووکیٹ نے انگریزی میں پڑھ کر سنایا تھا۔ وکیل غلام عباس نے گواہ کی حیثیت سے اظہار دیا ہے۔

جج ایڈووکیٹ نے اظہار لیے:

سوال: ۱۰ مئی ۱۸۵۷ء کو جب باغی فوجی میرٹھ سے آئی تھیں، تم کہاں تھے؟

جواب: میں اس دیوان خاص میں تھا۔

سوال: تم نے جو کچھ اس موقعے پر دیکھا ہو بیان کرو۔

جواب: ۸ بجے صبح پانچ چھ سواروں کی آمد سنی گئی اور وہ بادشاہ کی نشست گاہ کے باہر تھے۔ پہلے انھوں نے بہت زور زور سے چلانا شروع کیا، جس پر بادشاہ نے اپنے غلاموں کو دیکھنے کے لیے کہا کہ یہ کون لوگ شور مچاتے ہیں۔ ایک غلام برآمدے میں آیا اور تھوڑی دیر گفتگو کرنے کے بعد بادشاہ کے پاس واپس چلا گیا۔ مجھے نہیں معلوم کہ اس نے بادشاہ سے جا کر کیا کہا۔ مگر اسی وقت بادشاہ نشست گاہ سے ملے ہوئے دوسرے کمرے میں آئے اور مجھے طلب کیا، انھوں نے مجھ سے کہا کہ یہ سوار میرٹھ میں بغاوت پھیلا کر چلے آرہے ہیں اور اب چاہتے ہیں کہ مذہب کی حمایت میں

انگریزوں سے لڑیں اور انھیں قتل کریں۔ پھر مجھے فی الفور کپتان ڈگلس کے پاس جانے کی ہدایت کی اور کہا کہ انھیں سب حال بتا دینا اور انتظام کے لیے درخواست کرنا۔ بعدہ اپنے کسی شاہی خدمت گار سے کہہ کر دروازہ بند کرالیا۔ حسب الحکم میں کپتان ڈگلس کے پاس گیا اور پیام سنا دیا۔ کپتان ڈگلس سنتے ہی میرے ہمراہ ہو گئے اور کہا کیا معاملہ ہے؟ خیر سمجھ لوں گا۔ پھر وہ اسی دیوان خاص میں آئے اور بادشاہ بھی ان سے ملنے کے لیے آگئے۔ بادشاہ میں اس وقت خاصی طاقت تھی اور بدون کسی کے سہارا دیے صرف لکڑی ٹیکتے ہوئے آگئے تھے۔ پھر انھوں نے کپتان ڈگلس سے دریافت کیا کہ آپ کو معلوم ہوا کہ کیا معاملہ ہے؟ یہ فوجی سوار آئے ہیں اور اپنی حسب منشاء کارروائی بہت جلد شروع کرنا چاہتے ہیں۔ حکیم احسن اللہ خان اور میں اس وقت موجود تھے۔ کپتان ڈگلس نے درخواست کی کہ نشست گاہ کا دروازہ کھلوا دیجیے تا کہ میں ان سواروں سے دو بدو گفتگو کر سکوں۔ بادشاہ نے کہا کہ میں ایسا نہ کرنے دوں گا کیوں کہ وہ لوگ قاتل ہیں اور مبادا کہ تمھارے ساتھ بھی کوئی خراب برتاؤ نہ کر بیٹھیں۔ کپتان ڈگلس نے پھر دروازہ کھلوانے کے لیے اصرار کیا۔ مگر بادشاہ اس پر رضامند نہیں ہوئے اور کپتان ڈگلس کا ہاتھ تھام کر کہا کہ میں تمھیں جانے نہ دوں گا۔ اسی وقت حکیم احسن اللہ خان نے دوسرا ہاتھ پکڑ لیا اور کہا اگر آپ کو بات چیت ہی کرنی ہے تو برآمدے میں سے کر لیجیے۔ چناں چہ کپتان ڈگلس دیوان خاص اور کمرۂ شاہی کے درمیانی کٹہرے میں آئے اور اس جگہ کو دیکھنے لگے جہاں وہ سوار جمع ہو رہے تھے۔ میں بھی کپتان ڈگلس کے ہمراہ کٹہرے میں گیا۔ وہاں تیس چالیس سوار نیچے کھڑے نظر آئے۔ جن میں سے بعض کے پاس برہنہ تلواریں تھیں اور بعض پستول اور کارتوس ہاتھ میں لیے ہوئے تھے، اور کئی ایک پل کی طرف سے چلے آرہے تھے۔ ان کے ہمراہ پیدل بھی تھے۔ جو شاید سائیس تھے، جن کے سروں پر گٹھریاں تھیں۔ کپتان ڈگلس نے سواروں کو للکار کہا، ادھر نہ آنا یہ شاہی بیگمات کے کمرے ہیں۔ تم ان کے پاس کھڑے ہو کر بادشاہ کی بے عزتی کر رہے ہو۔ یہ سنتے ہی وہ سب ایک ایک کر کے راج گھاٹ کے پھاٹک سے چلے گئے۔ ان کے جانے کے بعد کپتان ڈگلس بادشاہ کے پاس پھر حاضر ہوئے۔ بادشاہ نے قلعے اور شہر کے دروازے بند کرنے کے لیے کہا تا کہ باغی اندر نہ داخل ہو سکیں۔ کپتان ڈگلس نے بادشاہ کو اطمینان دلایا کہ خوف کی کوئی بات نہیں ہے، اور ان کا فرض ہے کہ خاطر خواہ انتظام کریں۔ یہ کہہ کر کپتان ڈگلس چلے گئے اور بادشاہ اپنے کمرے میں تشریف لے گئے۔ میں اور حکیم احسن اللہ خان دونوں یہاں دیوان خاص میں آ کر بیٹھ گئے۔ اس کمرے میں

ہمیں بیٹھے ہوئے ابھی گھنٹہ گزرا ہوگا کہ کپتان ڈگلس کا خدمت گار ایک رقعہ لیے دوڑتا ہوا آیا، جس میں حکیم احسن اللہ خان کو طلب کیا گیا تھا۔ احسن اللہ خاں کے اصرار سے میں بھی ان کے ہمراہ ہولیا۔ جو شخص ہمیں لینے کے لیے آیا تھا کہنے لگا کہ کپتان ڈگلس اس وقت کلید خانے میں ہیں۔ مگر وہاں پہنچ کر معلوم ہوا کہ وہ اپنی قیام گاہ پر چلے گئے ہیں۔ اس وقت میں نے شہر کے ایک حصے دریا گنج میں بہت دھواں اٹھتے دیکھا اور راہ گزاروں کی زبانی سنا کہ سوار بنگلوں پر فیر کر رہے ہیں، پھر ہم گشت کرتے ہوئے کپتان ڈگلس کی جائے رہائش لاہوری دروازے پر پہنچ گئے تو معلوم ہوا کہ تیسرے کمرے میں ہیں۔ درمیانی کمرے میں ہمیں مسٹر سیمیں فریزر ملے۔ حکیم احسن اللہ خان کپتان ڈگلس سے ملنے اندر چلے گئے اور میں مسٹر فریزر کی درخواست پر ان کے ہمراہ واپس ہوگیا۔ جو بادشاہ سے دو توپیں اور چند پیدل سوار کپتان ڈگلس کی قیام گاہ کی حفاظت کے لیے مانگنے جارہے تھے۔ میں اور مسٹر فریزر سیڑھیوں سے اتر آئے۔ ان کے ہمراہ ایک صاحب اور تھے جن کا نام مجھے معلوم نہیں۔ مسٹر فریزر کے پاس ایک تلوار تھی، اور ان کے ہمراہی کے ایک ہاتھ میں پستول اور دوسرے میں بندوق تھی۔ مسٹر فریزر نے میرے جلد پہنچنے کی خواہش کی۔ گو وہ خود بھی آرہے تھے، مگر میں پہلے ہی پہنچ گیا۔ بادشاہ کے کمرے میں پہنچ کر میں نے انھیں خبر کرائی اور جب وہ باہر آئے تو میں نے مسٹر فریزر کی درخواست گوش گذار کی، بادشاہ نے سنتے ہی تمام فوج کو جو اس وقت حاضر تھی معہ ایسے افسروں کے جو میسر آسکیں دو توپیں لے کر فوراً کپتان ڈگلس کے مقام رہائش پر پہنچنے کا حکم دیا، اسی وقت حکیم احسن اللہ خان بھی آگئے۔ انھوں نے بادشاہ سے کہا کہ کپتان ڈگلس نے دو پالکیوں کی درخواست کی ہے تاکہ ان دو لیڈیوں کو جوان کے مکان میں مقیم ہیں، حرم سرا میں لے جا کر پوشیدہ کر دیا جائے۔ بادشاہ نے حکیم احسن اللہ خان سے بندوبست کرنے کے لیے کہا اور مقرب خدمت گاروں کو دو پالکیاں اور ان کے اٹھانے کے لیے معتمد کہاروں کو روانہ کرنے کا حکم دیا اور کہا انھیں سیدھی راہ سے نہ لائیں، بلکہ پائیں باغ سے چکر دے کر لائیں، تاکہ باغی سواروں کو جو قلعے میں گھس آئے ہیں، یہ نہ معلوم ہونے پائے۔ بادشاہ احکام دے کر اندر کھڑے ہوئے ،جلدی کی تاکید کر رہے تھے، اور حکیم احسن اللہ خان ان کے قریب کھڑے ہوئے تھے۔ تھوڑی دیر بعد ایک خدمت گار نے جو پالکیاں لینے گیا تھا واپس آکر عرض کی کہ پالکیاں روانہ کر دی گئی ہیں۔ پالکیوں والے بھی تھوڑے عرصے بعد پلٹ آئے اور کہا مسٹر فریزر قتل کر دیے گئے۔ یہ دس بجے سے قبل کا واقعہ ہے۔ حکیم احسن اللہ خان نے پھر دوسرا آدمی صحیح خبر لانے کے لیے روانہ کیا دنیز یہ

کہ کپتان ڈگلس کہاں ہیں؟ وہ لوگ بھی کچھ دیر بعد واپس آئے اور کہا، مسٹر فریز رہی نہیں بلکہ کپتان ڈگلس اوران کی ہمراہی لیڈیاں سب قتل کر ڈالے گئے۔ بادشاہ یہ سن کر اندر چلے گئے۔

چوتھے روز کی کارروائی:

یوم یک شنبہ، ۳۰/جنوری ۱۸۵۸ء: عدالت آج گیارہ بجے پھر منعقد ہوئی۔ پریذیڈنٹ، ممبران، مترجم، ڈپٹی جج، ایڈووکیٹ جنرل سب موجود تھے۔ بادشاہ عدالت میں لائے گئے۔ غلام عباس گواہ پھر طلب کیے گئے اور گذشتہ بیان کے سلسلہ میں اظہار لیا گیا۔

اس کے بعد حکیم احسن اللہ خان طلب کیے گئے اوران سے اظہار لیے گئے۔

پانچویں روز کی کارروائی:

یوم دوشنبہ، یکم فروری ۱۸۵۸ء: دیوان خاص قلعۂ دہلی مین آج پھر عدالت کا اجلاس شروع ہوا، پریذیڈنٹ، ممبران، مترجم، ڈپٹی جج، ایڈووکیٹ وغیرہ موجود ہیں۔ بادشاہ عدالت میں لائے گئے۔ مترجم۔ نے ضمن قرض کے تمام کاغذات فارسی میں پڑھے، جن کا ترجمہ گذشتہ ماہ کی ۳۰/تاریخ کو پڑھا گیا تھا۔

حکیم احسن اللہ خان پھر طلب کیے گئے اور آٹھ کاغذات ضمن تنخواہ میں ترتیب دے کر انھیں دکھائے گئے۔

جج ایڈووکیٹ کا اظہار لینا:

سوال: ان کاغذات کی مہروں اور خط کی بابت تمھیں کیا معلوم ہے؟

جواب: چھ کاغذات خود بادشاہ کے لکھے ہوئے ہیں اور نمبر ۲ بادشاہ کے سیکریٹری مکند لال کا لکھا ہوا ہے۔ اوراس پر مہر شاہی ثبت ہے۔ نمبر ۳ مرزا مغل بادشاہ کے فرزند کی درخواست ہے، جو ان کے منشی جوالا ناتھ کے ہاتھ کی ہے، اور اس پر سرکاری مہر ''کمانڈر انچیف'' لگی ہوئی ہے۔ اب کاغذات مذکورہ کا ترجمہ اور اصل فارسی میں بادشاہ کے سمجھنے کے لیے پڑھے گئے۔

چھٹے روز کی کارروائی:

یوم سہ شنبہ ۲/فروری ۱۸۵۸ء: عدالت دیوان خاص قلعۂ دہلی میں آج بوقت گیارہ بجے پھر

منعقد ہوئی۔ تمام ارکان موجود ہیں۔ بادشاہ عدالت میں لائے گئے۔ غلام عباس ان کا مددگار بھی حاضر ہے۔ مترجم نے اصل کاغذات پڑھے، جن کا ترجمہ کل پڑھا گیا تھا۔

حکیم احسن اللہ خان عدالت میں طلب کیے گئے اور ان کا اظہار لیا گیا۔

ڈپٹی جج ایڈووکیٹ نے اظہار لیے:

سوال: ان چھ کاغذات کو دیکھو اور بتاؤ کہ ان میں سے کسی کا خط پہچان سکتے ہو؟ چھ کاغذات فارسی کے ضمن "قتل" میں ترتیب دے کر گواہ کو دکھائی گئے۔

جواب: نمبر ا و ۶ پر بادشاہ کے ہاتھ کے لکھے ہوئے احکام ہیں۔ کاغذات نمبر ۲، ۳، ۴ خیرات علی کے لکھے ہوئے ہیں، جو بخت خان گورنر جنرل کا محرر تھا۔ اس شخص کی عادت تھی کہ کاغذات پیشتر سے تیار کر رکھتا تھا اور بادشاہ کی مہر وغیرہ بھی ثبت کر دیتا تھا۔ بعد میں بادشاہ کی منظوری کے لیے کاغذات روانہ کیا کرتا تھا۔

سوال: کیا ممکن ہے کہ یہ دفتر میں رکھنے کی نقل ہو اور کسی نئے محرر نے لکھی ہو جس کا خط تم نہ پہچانتے ہو؟

جواب: جی ہاں، مجھے محمد بخت خان کے دفتر کے کسی منشی کا خط معلوم ہوتا ہے۔ کچھ کاغذات پھر ترتیب دیے گئے اور ڈپٹی جج ایڈووکیٹ نے ان کا ترجمہ اور مترجم نے اصل فارسی میں انھیں پڑھا۔ کاغذات جن پر الف کا نشان تھا، مع ان کے اصلی لفافے کے جس پر دہلی پوسٹ آفس کی مہر ہے لایا گیا۔ اس سے ثابت ہوتا ہے کہ وہ ۲۵ر مارچ ۱۸۵۷ء کو دہلی کے ڈاک خانے میں ڈالا گیا تھا اور ۲۷ر مارچ ۱۸۵۷ء کی مہر ظاہر کرتی ہے کہ یہ اسی تاریخ کو آگرے پہنچا تھا۔ جج ایڈووکیٹ نے بیان کیا کہ یہ اہم دستاویز کالون سابق لیفٹنٹ گورنر آگرہ کے کاغذات میں پائی گئی۔ پھر اس کا ترجمہ پڑھا گیا اور گواہ سے سوالات کیے گئے۔

۳ر فروری ۱۸۵۸ء: آج عدالت کی کارروائی کا ساتواں روز تھا۔ حکیم احسن اللہ خان سے عدالت میں سوال جواب جاری تھے۔ اسی تاریخ سے جاٹ مل کا بیان بھی لیا گیا۔

۵ر فروری ۱۸۵۸ء: آج بہادر شاہ کے مقدمے کی کارروائی کا آٹھواں روز تھا۔ جاٹ مل سے عدالت کے سوال و جواب شروع ہوئے۔ اسی تاریخ کو کپتان فارسٹ اسسٹنٹ کمشنر آف آرڈی ننس کو طلب کیا گیا اور پھر ان سے بیان لیا گیا۔ کپتان فارسٹ میگزین کے انچارج تھے اور جب انھوں نے دیکھا کہ وہ میگزین کی حفاظت نہیں کر سکتے اور خطرہ تھا کہ باغیوں کے قبضے میں

چلا جائے گا تو انھوں نے بارود میں آگ لگا کر اسے اڑا دیا۔

۶ رفروری ۱۸۵۸ء: آج مقدمے کی کارروائی کا نواں روز تھا۔ تمام ارکان عدالت میں موجود تھے۔ ملزم (بہادر شاہ ظفر) مع ان کے مختار غلام عباس بھی لائے گئے۔ کپتان فارسٹ اسسٹنٹ کمشنر آف آرڈی ننس کا بیان میگزین اڑانے کے سلسلے میں جاری رہا۔ اس سلسلے میں بعض سوالات بہادر شاہ سے بھی کیے گئے۔ اس کے علاوہ کپتان ڈگلس کا چوبدار مکھن نامی شخص طلب کیا گیا اور عدالت نے ۱۱رمئی ۱۸۵۷ء کو پیش آنے والے واقعات اس سے دریافت کیے اور بعض سوالات بادشاہ سے بھی کیے۔

۸رفروری ۱۸۵۸ء: آج بہادر شاہ ظفر کے خلاف مقدمہ کی دسویں پیشی تھی۔ تمام ارکان عدالت اور ملزم (بہادر شاہ) حاضر تھے۔ ۱۱ بجے اجلاس شروع ہوا۔ آج سر تھیوفلس میٹکاف کا بیان شروع ہوا۔ اس کی طرف سے چسپاں کیے گئے ایک اشتہار، دہلی میں انگریزوں کے خلاف بغاوت کے پروپیگنڈے، چپاتیوں کی حقیقت، ہندوستان پر روسی حملے اور ایران کو بہادر شاہ کی سفارت کے بارے میں سوال کیے گئے۔ آج پیرزادہ حسن عسکری کو عدالت میں لایا گیا اور سوالات کیے گئے۔ انھوں نے دہلی میں اپنے مزار سے گرفتاری تک کے حالات بیان کیے۔ اس کے بعد بختاور سنگھ نامی چپراسی سرکاری گواہ کی حیثیت سے پیش ہوا۔ اس نے ۱۱رمئی ۱۸۵۷ء کو مسٹر فریزر کے قتل اور ڈگلس کے زخمی ہونے کے اور دیگر حالات بیان کیے۔ اس کے بعد کشن سنگھ چپراسی کو طلب کیا گیا اور ۱۱رمئی ۱۸۵۷ء کے حالات دریافت کیے۔ بہادر شاہ (ملزم) نے اس کے بعض اظہارات پر جرح بھی کی۔

۹رفروری ۱۸۵۸ء: قلعۂ دہلی کے دیوان خاص میں ۱۱ بجے عدالت قائم ہوئی۔ آج عدالتی کارروائی کا گیارھواں روز تھا۔ تمام ارکان عدالت، ملزم (بہادر شاہ) موجود تھے۔ آج صرف چنی مالک دہلی اخبار کا بیان ہوا۔ ۱۱رمئی ۱۸۵۷ء اور قبل و بعد کے حالات و واقعات اور انگریز مرد اور عورتوں کے قتل، روس و ایران کے ہندوستان پر حملے، چپاتیوں کی تقسیم، صادق الاخبار اور سراج الاخبار وغیرہ کے بارے میں بہت سے سوالات کیے گئے۔

۱۰رفروری ۱۸۵۸ء: یوم چہار شنبہ حسب معمول عدالت قائم ہوئی۔ تمام ارکان عدالت اور ملزم (بہادر شاہ) موجود تھے۔ آج عدالت کی کارروائی کا بارھواں روز تھا۔ گواہ چنی کو دوبارہ طلب کیا گیا اور ۱۱، ۱۲رمئی ۱۸۵۷ء کو دہلی میں پیش آنے والے حالات و واقعات کے بارے میں

سوالات کیے گئے۔

۱۱رفروری ۱۸۵۸ء: جمعرات، آج عدالتی کارروائی کا تیرھواں روز تھا۔ عدالت کے صدر، ارکان، جج، ایڈوکیٹ جنرل، ملزم (بادشاہ) وغیرہ سب عدالت میں موجود تھے۔ حکیم احسن اللہ خان کو آج پھر عدالت میں طلب کیا گیا اور ان سے مختلف سوالات پوچھے گئے اور ان سولات کی روشنی میں بادشاہ سے بھی جرح کی گئی۔ اس کے بعد مسز الگزینڈر گورنمنٹ پنشن خوار کو عدالت میں طلب کیا گیا۔ مسز چوں کہ ۱۱رمئی ۱۸۵۷ء کو دہلی میں تھیں، اس لیے ان سے ۱۱رمئی کے حالات کے بارے میں دریافت کیا گیا۔ عدالت کی کارروائی چار بجے تک جاری رہی۔ پھر اگلے روز کے لیے اجلاس ملتوی ہو گیا۔

۱۲رفروری ۱۸۵۸ء: گیارہ بجے عدالت کی کارروائی شروع ہوئی۔ آج عدالت کی کارروائی کا چودھواں دن تھا۔ آج عدالت میں سی بی سانڈرس قائم مقام کمشنر اور لیفٹنٹ گورنر کے ایجنٹ، میجر پیٹرسن اور مکند لال سیکریٹری سابق شاہ دہلی کو طلب کیا گیا اور ان سے غدر کے حالات کی تفتیش کی۔

۱۳رفروری ۱۸۵۸ء: آج عدالت کی کارروائی کا پندرھواں دن تھا۔ تمام ارکان عدالت اور بادشاہ (ملزم) عدالت میں موجود تھے۔ مکند لال سے آج بھی تفتیش جاری رہی۔ اس کے علاوہ کپتان ٹٹلر، سارجنت فلیمنگ سے غدر کے حالات دریافت کیے گئے۔ بادشاہ نے کسی گواہ پر جرح نہیں کی۔

۱۶رفروری ۱۸۵۸ء: ''سولھویں فروری ۱۸۵۸ء کو چٹھی صاحب سیکریٹری گورنمنٹ مورخہ ۱۵رفروری ۱۸۵۸ء نمبر ۸۵۰ بنام صاحب کلکٹر بہادر ضلع بجنور بمقام میرٹھ پہنچی کہ تم مع عملہ ضلع بجنور بمقام روڑکی روانہ ہو اور واسطے انتظام روہیل کھنڈ کے فوج کالام بندھنے کا بمقام روڑکی حکم دیا۔ چناں چہ الیگزینڈر شیکسپیئر صاحب اور کلکٹر و مجسٹریٹ ضلع بجنور اور جناب مسٹر جارج پامر صاحب بہادر جنٹ مجسٹریٹ ضلع روڑکی میں تشریف لائے اور باقی عملہ اور رئیسان ضلع بجنور جو گنگا پار کے حسب ذیل اور بتواریخ مختلف روڑکی میں پہنچے۔

سید احمد خان صدر امین بجنور	۲۱رفروری ۱۸۵۸ء
مولوی قادر علی تحصیلدار نگینہ	۲۱رفروری ۱۸۵۸ء
سید تراب علی تحصیلدار بجنور	۱۸رمارچ ۱۸۵۸ء
کالکا پرشاد منصف نگینہ	۲۲رمارچ ۱۸۵۸ء

اپریل ۱۸۵۸ء میں کل بجنور تحت عملداری سرکار ہوا۔

۲۴ر فروری ۱۸۵۸ء: آج منگل کا دن اور سولھویں روز کی عدالتی کارروائی تھی۔ تمام ارکان عدالت اور ملزم موجود تھے۔ سب سے پہلے کپتان مارٹینو کو عدالت میں طلب کیا گیا اور حلف کے بعد مئی اور اس کے بعد کے ۱۸۵۷ء کے حالات کے بارے میں سوالات کیے گئے۔ اس کے بعد مسز فلیمنگ کو پیش کیا گیا۔ اس کے بعد منی لال اخبار نویس کی لکھی ہوئی کچھ تاریخی روداد یں پیش کی گئیں۔ (۱۱ر مئی تا ۲۰ر مئی ۱۸۵۷ء) چار بجے عدالت اگلے روز ۱۱ بجے تک کے لیے برخاست ہوگئی۔

سترھویں روز کی کارروائی:

یوم چہار شنبہ مورخہ ۲۴ر فروری ۱۸۵۸ء: عدالت قلعۂ دہلی کے دیوان خاص میں منعقد ہوئی۔ سب لوگ حسب دستور موجود تھے۔ بادشاہ معہ اپنے مختار غلام عباس کے لائے گئے۔ اقتباسات صادق الاخبار فارسی زبان میں پڑھے گئے، پھر ان کا ترجمہ سنایا گیا۔

۲۷ر فروری ۱۸۵۸ء: ۲۷ر جنوری ۱۸۵۸ء: مقدمے کی کارروائی کو آج اٹھارھواں روز تھا۔ عدالت قلعۂ دہلی کے دیوان خاص میں منعقد ہوئی۔ ارکان عدالت اور بادشاہ (ملزم بہادر شاہ) مع اپنے مختار غلام عباس کی موجود تھے۔ سب سے پہلے جان ایوریٹ رسالدار کا بیان لیا گیا۔ جس سے ۱۱ر مئی ۱۸۵۷ء سے چند روز پہلے اور بعد میں پیش آنے والے واقعات دہلی پر روشنی پڑتی ہے۔ جان ایوریٹ کے بیان اور اس سے سوال وجواب کے سوا آج اور کوئی کارروائی نہیں ہوئی۔

مارچ ۱۸۵۸ء: جب احمد اللہ خان کو انتظام حکومت سپرد ہو گیا تو انھوں نے انگریزی حکومت کو روکنے کے لیے مختلف مقامات پر اپنی فوجیں متعین کر دیں۔ دارانگر میں ماڑے خان، قاضی عنایت علی اور دلیل سنگھ کو تعینات کیا گیا۔ ان تینوں کے زیر کمان ۴۵۰۰ پیادہ اور ۶۹۸ سوار فوج تھی۔ یہ انتظامات ماہ مارچ ۱۸۵۸ء میں کیے گئے تھے۔

قاضی عنایت علی بھی تھانہ بھون کو چھوڑنے پر مجبور ہوئے۔ لیکن ان کی تلوار اس کے بعد بھی بہت عرصے تک نیام میں نہیں گئی۔ وہ اپنے وطن سے نکل کر نجیب آباد گئے اور وہاں نواب محمود خان اور دوسرے مجاہدین کے ساتھ مل کر کئی ماہ تک انگریزی فوج کا مقابلہ کرتے رہے۔

انیسویں روز کی کارروائی:

یوم بدھ مورخہ ۳ر مارچ ۱۸۵۸ء، آج پھر قلعۂ دہلی کے دیوان خاص میں عدالت منعقد

ہوئی۔ سب لوگ حسب دستور حاضر تھے۔ بادشاہ اور ان کے مختار غلام عباس عدالت میں لائے گئے۔

آج اٹھارہ کاغذات اصل مترجم نے پڑھے اور ان کا ترجمہ سنایا۔

بیسویں روز کی کارروائی:

یوم جمعرات، مورخہ ۴؍مارچ ۱۸۵۸ء: کل کی کارروائی کے سلسلے میں آج پھر گیارہ بجے عدالت منعقد ہوئی، حسب دستور سب لوگ حاضر تھے۔

بادشاہ نے اپنی تحریری جواب دہی آج عدالت میں پیش کی جسے مترجم نے پڑھا۔ عدالت ساڑھے بارہ بجے برخاست ہوگئی اور منگل مورخہ ۹؍مارچ کو پیشی مقرر ہوئی، تاکہ ترجمہ کرنے اور ڈپٹی جج ایڈووکیٹ کو اس کا جواب دینے اور شہادتوں کو خلاصہ کرنے کی مہلت ملے۔

اکیسویں روز کی کارروائی:

یوم سہ شنبہ مورخہ ۹؍مارچ ۱۸۵۸ء: عدالت آج پھر دیوان خاص قلعۂ دہلی میں منعقد ہوئی، سب لوگ حسب دستور حاضر تھے۔ بادشاہ، ان کے مختار غلام عباس کے ہمراہ لیے گئے۔

جج ایڈووکیٹ نے بادشاہ کی جواب دہی پڑھ کر سنائی جو ذیل میں درج کی جاتی ہے۔

جواب تحریری از بہادر شاہ سابق بادشاہ دہلی:

اصل حقیقت یہ ہے کہ غدر کے دن کی مجھے پہلے سے خبر نہیں تھی۔ آٹھ بجے کے قریب باغی سوار دفعتاً آگئے اور محل کی کھڑکیوں کے نیچے شور وغل مچانے لگے۔ انھوں نے کہا کہ وہ انگریزوں کو قتل کر کے میرٹھ سے آئے ہیں اور اپنے ایسا کرنے کا عذر یہ پیش کیا کہ ان سے گائے اور سور کی چربی سے بنے ہوئے کارتوسوں کو منہ میں رکھ کر دانتوں سے کاٹنے کے لیے کہا گیا تھا، جو سراسر ہندو اور مسلمانوں کے دین دھرم کو ستیاناس کرنا تھا، میں نے یہ سن کر قلعے کے دروازے بند کرادیے اور فی الفور قلعہ دار کو اس کی اطلاع پہنچادی، وہ خبر سنتے ہی خود میرے پاس آئے اور جہاں باغی جمع تھے جانا چاہا اور دوسرے دروازے کھول دینے کی درخواست کی۔ میں نے انھیں اس ارادے سے باز رکھا۔ بہرکیف جب دروازہ نہ کھولنے دیا تو وہ اوپر گئے اور برآمدے میں کھڑے ہوکر سیڑھیوں سے کچھ کہا۔ جسے سنتے ہی وہ لوگ چلے گئے، اس کے بعد قلعہ دار یہ کہہ کر کہ وہ ہنگامے کو روکنے کا بندوبست کریں گے: میرے پاس سے چلے گئے۔ کچھ دیر کے بعد مسٹر

فریزر نے دو توپوں کے لیے اور قلعہ دار نے دو پالکیوں کے لیے خبر بھیجی اور کہا کہ ان کے پاس دو لیڈیاں ٹھہری ہوئی ہیں، وہ چاہتے ہیں کہ انھیں محل سرا میں پہنچا دیا جائے، میں نے دو پالکیاں روانہ کیں اور حکم دے دیا کہ توپیں بھی بھیج دی جائیں، اس کے بعد میں نے سنا کہ پالکیاں پہنچنے بھی نہ پائی تھیں کہ مسٹر فریزر اور قلعہ دار اور وہ لیڈیاں سب کے سب قتل کر دیے گئے۔ اسے زیادہ دیر نہیں ہوئی تھی کہ باغی سپاہ دیوان خاص میں گھس آئی، عبادت خانے میں ہر طرف پھیل گئی، اور مجھے چاروں طرف سے گھیر کر پہرہ لگا دیا۔ میں نے ان کا مطلب دریافت کیا اور چلے جانے کے لیے کہا۔ جس کے جواب میں انھوں نے خاموش کھڑے رہنے کو کہا اور کہا کہ جب انھوں نے اپنی زندگیوں کو خطرے میں ڈالا ہے تو اب اپنی طاقت کے موافق سب کچھ کر کے چھوڑیں گے۔ خوف کھا کر کہ کہیں میں قتل نہ کر دیا جاؤں، میں نے منہ سے اف تک نہ کی اور چپ چاپ اپنے کمرہ میں چلا گیا۔ شام کے وقت یہ نمک حرام کئی انگریز مردوں اور عورتوں کو گرفتار کر کے لائے۔ جن کو انھوں نے میگزین میں پکڑا تھا اور ان کے قتل کا ارادہ کیا۔ میں نے کہا ایسا ہرگز نہ کرو۔ اس وقت تو میں ان انگریزوں کی جان بچانے میں کامیاب ہو گیا۔ مگر باغی سپاہیوں نے انھیں اپنی ہی حراست میں رکھا۔ متواتر دو موقعوں پر انھوں نے انگریزوں کے قتل کا قصد کیا اور میں نے منت سماجت کر کے باز رکھا اور قیدیوں کی جانیں بچالیں۔ آخری وقت تک اگرچہ میں مفسد بلوائیوں کو حتی المقدر باز رکھنے کی کوشش کرتا رہا۔ مگر انھوں نے میری طرف مطلق التفات نہیں کیا۔ ان بے چارو ں کو قتل کرنے باہر لے گئے۔ میں نے انھیں قتل کے لیے کچھ بھی حکم نہیں دیا۔ مرزا مغل، مرزا خضر سلطان، مرزا ابوبکر اور میرا ایک خاص مصاحب بسنت سپاہ سے مل گئے تھے۔ انھوں نے میرا نام شاید لیا ہو، لیکن میں نہیں جانتا تھا کہ انھوں نے کیا کہا؟ نہ میں یہ جانتا ہوں کہ میرے خاص مصاحبین میرے حکم سے سرتابی کر کے قتل میں شریک ہوئے ہوں۔ اگرچہ انھوں نے ایسا کیا تو وہ مرزا مغل سے مرعوب ہو کر کر گزرے ہوں گے۔ نیز قتل کے بعد تک مجھے اس کے متعلق کسی نے خبر نہیں دی۔ بعض گواہاں نے شہادت میں میرے ملازمین کا مسٹر فریزر اور قلعہ دار کے قتل میں شریک رہنا بیان کیا ہے۔ میں اس کا بھی وہی جواب دیتا ہوں۔ یعنی میں نے انھیں ایسا کرنے کا حکم نہیں دیا تھا۔ اگر انھوں نے ایسا کیا تو اپنی مرضی سے کیا۔ مجھے اس کا بھی علم نہیں اور یہ بات بھی مجھے نہیں بتائی گئی۔ میں خدا کی قسم کھا کر کہتا ہوں کہ جو میرا گواہ ہے، میں نے مسٹر فریزر یا اور کسی انگریز کے قتل کا حکم نہیں دیا۔ مکند لال و دیگر گواہان نے کہا ہے کہ میں نے حکم دیا تھا مگر یہ غلط کہا ہے۔ مرزا

مغل و مرزا خضر سلطان نے احکام دیے ہوں تو تعجب نہیں، کیوں کہ وہ سپاہ سے مل گئے تھے۔ بعد ازاں فوجیں مرزا مغل و مرزا خضر سلطان و مرزا ابوبکر کو میرے سامنے لائیں اور کہا کہ ہم انھیں اپنا سردار بنانا چاہتے ہیں۔ میں نے ان کی درخواست رد کر دی۔ لیکن جب سپاہ ضد کرنے لگی اور مرزا مغل غصے ہو کر اپنی والدہ کے مکان میں چلا گیا تو میں سپاہیوں کے خوف سے ساکت رہ گیا اور پھر طرفین کی رضامندی سے مرزا مغل کمانڈر انچیف افواج مقرر ہوا۔ میری مہر کے ثبت شدہ اور دستخط کیے ہوئے احکام کی نسبت معاملے کی اصل حالت یہ ہے کہ جس روز سے سپاہ آئی، انگریزی افسروں کو قتل کیا اور مجھے قید کر لیا، میں ان کے اختیار میں رہا۔ جیسا کہ اب ہوں، تمام کاغذات جو مناسب سمجھتے میرے پاس لاتے، اور مجھے مہر ثبت کرنے پر مجبور کرتے، بسا اوقات احکام کے مسودے لاتے اور میرے سیکریٹری سے انھیں صاف کرواتے۔ کبھی اصلی کاغذات لاتے اور ان کی نقلیں دفتر میں رکھ دیتے۔ اس لیے کئی خطوط اور مختلف تحریریں روئیداد کی فائل بن گئی ہیں۔ بارہا انھوں نے خالی لفافوں پر مہر ثبت کرالی ہے۔ نہیں معلوم ان میں انھوں نے کون سے کاغذات بھیجے اور کہاں بھیجے۔ عدالت میں ایک درخواست پیش ہوئی ہے، جو مکند لال کی طرف سے کسی گمنام شخص کے نام ہے، جس میں ایک روز کے جاری شدہ احکام کی تفصیل دی گئی ہے۔ اس فہرست میں صاف مرقوم ہے کہ ''اتنے احکام فلاں کی ہدایت سے لکھے گئے ہیں اور اتنے احکام فلاں کی ہدایت سے۔ لیکن کہیں میری ہدایت سے لکھے ہوئے ایک حکم کا بھی حوالہ نہیں ہے۔ بس اس سے صاف ثابت ہوتا ہے کہ بدون میرے حکم کے جتنے احکام چاہے لکھ لیے اور مجھے ان کے خلاصے تک سے اطلاع نہیں دی جاتی تھی۔ میں اور میرا سیکریٹری جان کے خوف سے کسی معاملے میں کچھ نہیں کہتے تھے۔ ٹھیک یہی حالت ان درخواستوں کی بھی ہے جن پر میری دستی تحریر ہے، جب سپاہ یا مرزا مغل یا مرزا خضر سلطان یا مرزا ابوبکر کو کچھ لکھوانا ہوتا تو وہ درخواستیں لے آتے اور افسران فوج کو بھی ہمراہ لاتے، اور احکام لکھنے کے لیے مجھے مجبور کرتے، وہ میرے سنانے کے لیے اکثر کہا کرتے تھے تاکہ میں ان سے مرعوب ہو کر ان کی خواہشات کی تعمیل کر دیا کروں کہ وہ جو ان کی خواہشات کی تعمیل نہ کرے گا اپنی حالت کے موافق سزا پائے گا۔ علاوہ ازیں میرے ملازموں پر انگریزوں کے پاس خط بھیجنے اور سازش کرنے کی تہمت لگایا کرتے تھے۔ علی الخصوص حکیم احسن اللہ خان، محبوب علی خان، ملکہ زینت محل پر سازش کا الزام لگایا جاتا تھا اور کہا جاتا تھا کہ اب اگر ایسا معلوم ہوا تو ہم ان کو مار ڈالیں گے، اسی طرح ایک روز حکیم صاحب کا مکان لوٹ لیا اور بارادۂ قتل انھیں مقید کر لیا تھا۔

بہ ہزار دشواری اور میری منتیں کرنے پر اپنے ارادے سے باز رہے، لیکن پھر بھی حکیم صاحب کو قید رکھا۔ اس کے بعد میرے دیگر ملازموں کو گرفتار کر لیا۔ مثلاً شمشیر الدولہ والد ملکہ زینت محل وغیرہ کو۔ نیز انھوں نے کہا کہ وہ مجھے معزول کر کے میری جگہ مرزا مغل کو بادشاہ بنائیں گے۔ پھر یہ معاملہ سنجیدگی وانصاف سے قابل غور ہے کہ میرے پاس کسی قسم کی کون سی طاقت تھی، یا ان کو خوش رکھنے کا کون سا سبب میرے پاس تھا؟ افسران فوج یہاں تک سرچڑھ گئے تھے کہ ملکہ زینت محل کا مطالبہ کرتے تھے کہ میں ان کو ان کے حوالے کر دوں تا کہ وہ انھیں قید میں رکھیں اور کہا کہ ملکہ نے انگریزوں سے دوستانہ تعلقات قائم کیے ہیں۔ پھر اگر مجھے پوری طاقت یا اختیار ہوتا تو کیا میں حکیم احسن اللہ خان، اور محبوب علی خان کو مقید ہونے دیتا؟ یا حکیم صاحب کے مکان کو لٹتا ہوا دیکھتا؟ باغی سپاہ نے ایک کورٹ قائم کیا تھا، جہاں تمام معاملات طے ہوتے تھے، اور جن معاملات کو وہاں طے کیا جاتا تھا انھیں یہ کونسل اختیار کرتی تھی، لیکن میں نے کبھی ان کی کانفرنس میں شرکت نہیں کی۔ انھوں نے اسی طرح بدوں میری مرضی یا خلاف حکم صرف میرے ملازموں کو ہی نہیں لوٹا بلکہ کئی محلوں کو لوٹ لیا۔ چوری کرنا، قید کرنا ان کے بائیں ہاتھ کا کھیل تھا اور جو جی چاہتا تھا کر گزرتے تھے، جبراً معزز اہل شہر سے اور تاجروں سے جتنی رقم چاہتے وصول کرتے تھے اور یہ مطالبات ذاتی اغراض کے لیے کرتے تھے، جو کچھ گزرا ہے وہ سب مفسدہ پرداز فوج کا کیا دھرا ہے۔ میں ان کے قابو میں تھا اور کیا کر سکتا تھا۔ وہ اچانک آپڑے اور مجھے قیدی بنا لیا۔ میں لاچار تھا اور دہشت زدہ۔ جو انھوں نے کہا میں نے کیا۔ ورنہ انھوں نے مجھے کبھی کا قتل کر ڈالا ہوتا۔ یہ سب کو معلوم ہے کہ مجھے ایسی مایوسی ہوئی تھی کہ زندگی سے ہاتھ دھو بیٹھا تھا، جب کہ میرے ماتحت عہدہ داروں کو بھی جان بری کی امید نہیں تھی۔ اسی لیے میں نے فقیری کا تہیہ کر لیا تھا، اور گیروے رنگ کی صوفیانہ پوشاک پہننی شروع کر دی تھی۔ پہلے قطب صاحب کے درگاہ، وہاں سے اجمیر شریف اور اجمیر شریف سے بالآخر مکہ معظمہ جانے کا عزم تھا، لیکن فوج نے مجھے اجازت نہیں دی اور اس نے میگزین وخزانہ لوٹا اور جو چاہا کیا۔ میں نے کسی سے کچھ نہیں کہا، نہ ان لوگوں نے لوٹ کا کچھ مال لا کر مجھے دیا۔ ایک روز یہی لوگ ملکہ زینت محل کا مکان لوٹنے کی نیت سے گئے تھے، مگر دروازے توڑنے میں کامیاب نہ ہو سکے۔ اب غور کرنا چاہیے کہ اگر وہ میرے ماتحت ہوتے، یا میں ان کی سازش میں شریک ہوتا تو یہ باتیں کیوں کر ظہور پذیر ہوتیں، ان سب کے ساتھ ہی یہ قابل غور ہے کہ کوئی شخص غریب ترین انسان کی عورت کا مطالبہ بھی یوں نہیں کرتا ہے کہ ''لاؤ اسے مجھے دے دو،

میں قید کروں گا۔'' حبشی قنبر کی نسبت یہ ہے کہ اس نے مجھ سے حج کرنے اور مکہ شریف جانے کی رخصت لی تھی۔ میں نے اسے ایران روانہ نہیں کیا، نہ میں نے شاہ ایران کو کوئی خط بھیجا۔ یہ قصہ کسی نے غلط مشہور کیا ہے۔ محمد درویش کی درخواست میری دستاویز نہیں ہے کہ اس پر بھروسا کیا جائے، ممکن ہے کسی میرے یا میاں عسکری کے دشمن نے وہ درخواست بھیجی ہو تو اس پر اعتماد نہیں، اور نہ کرنا چاہیے۔ باغی فوج کی عادتوں کی نسبت معلوم ہو کہ انھوں نے کبھی مجھے سلام تک نہیں کیا، نہ میرا کسی قسم کا ادب ولحاظ کیا۔ وہ دیوان خاص و دیوان عام میں بے دھڑک جوتیاں پہنے چلے آتے تھے۔ میں ان فوجوں پر کیا اعتبار کرتا، جنھوں نے اپنے ذاتی آقاؤں کو قتل کر دیا ہو، جس طرح انھوں نے ان کو قتل کیا مجھے بھی مقید کر لیا، مجھ پر جبر کیے، مجھے حکم میں رکھا اور میرے نام سے فائدہ اٹھایا، تا کہ میرے نام کی وجہ سے ان کے افعال مقبول ہوں، یہ دیکھ کر کہ ان فوجوں نے اپنے ذی وجاہت و صاحب فرماں افسروں کو مار ڈالا۔ میں بے فوج، بے خزانہ، بے سامان جنگ، بے توپ خانہ کیوں کر انھیں روک سکتا تھا، یا ان کے خلاف صدائے احتجاج بلند کر سکتا تھا، لیکن میں نے کبھی کسی طرح کی انھیں مدد نہیں دی، جب باغی افواج قلعے کے پاس آئیں، میری طاقت میں تھا، میں نے دروازے بند کرا دیے۔ میں نے قلعہ دار کو طلب کیا، اور جو کچھ گزرا من وعن بیان کر دیا اور انھیں باغیوں میں جانے سے باز رکھا۔ میں نے لیڈیوں کے لیے دو پالکیاں اور دو توپیں قلعے کے پھاٹک کی حفاظت کے لیے قلعہ دار (کپتان ڈگلس) اور ایجنٹ لیفٹنٹ (سمن فریزر) گورنر کی درخواستوں پر روانہ کر دی ہیں۔ مزید برآں اسی شب کو تیز سانڈنی سوار کو جو کچھ ہنگامہ یہاں برپا ہوا تھا اس کا اطلاعی خط دے کر ہز آنر لیفٹنٹ گورنر آگرہ کی خدمت میں روانہ کر دیا تھا۔ مجھ سے جو کچھ ہو سکا کیا، میں نے اپنی خود مختار مرضی سے کوئی حکم نہیں دیا۔ میں سپاہ کے اختیار میں تھا، اور انھوں نے جبراً و قہراً جیسا چاہا کرایا۔ چند ملازمین جو میں نے رکھے تھے باغی اور بلوائی فوجوں سے ڈر کر اور اپنی جان کے خوف سے رکھے تھے۔ جب یہ فوجیں فرار ہونے پر آمادہ ہوئیں تو میں موقع پا کر چپ چاپ قلعہ کے پھاٹک سے نکلا اور مقبرہ ہمایوں میں جا کر ٹھہر گیا۔ اس جگہ سے میں ضمانتاً طلب کیا گیا کہ میری جان محفوظ رہے گی۔ اور میں نے فوراً اپنے آپ کو لیفٹنٹ گورنر کی حفاظت میں دے دیا۔ باغی فوجیں مجھے اپنے ہمراہ لے جانا چاہتی تھیں مگر میں نہ گیا'' [جس وقت افسران فوج نے بادشاہ کو لے جانے کا اصرار کیا میرے نانا وہاں موجود تھے۔ حسن نظامی]

مذکورۂ بالا جواب میرا خود تحریر کیا ہوا ہے اور بلا مبالغہ ہے۔ حق سے اصلاً انحراف نہیں کیا ہے،

خدا میرا عالم وشاہد ہے کہ جو کچھ بالکل صحیح تھا اور جو کچھ مجھے یاد تھا وہ میں نے لکھا ہے۔ شروع میں، میں نے حلفیہ کہا تھا کہ میں بغیر بناوٹ اور بغیر ملاوٹ کے وہی لکھوں گا جو حق اور راست ہوگا، چناں چہ ایسا ہی میں نے کیا ہے۔

دستخط (بہادر شاہ بادشاہ)

تتمہ خط: مرزا مغل کے نام کے ایک خط کا حوالہ دیتے ہوئے جس میں سپاہ کے کردار کی شکایت اور میرے آخری ارادے درگاہ خواجہ صاحب کو اور وہاں سے مکہ معظمہ جانے کا بیان ہے۔ میں اظہار کرتا ہوں کہ مجھے ایسے کسی حکم کا اجرا یاد نہیں۔ حکم زیر بحث برخلاف میرے دفتر کے قوانین کے اردو زبان میں ہے جہاں اس قسم کی ہر ایک تحریر فارسی زبان میں لکھی جاتی تھی۔ میں یہ نہیں جانتا کہ یہ حکم کس نے اور کہاں تیار کیا ہے۔ معلوم ہوتا ہے کہ فوج مجھے بالکل عاجز آیا ہوا دیکھ کر اور میرے تارک الدنیا ہو کر فقیری لے لینے، پھر مکۂ معظمہ جانے کا خیال کر کے مرزا مغل نے یہ حکم اپنے دفتر میں لکھوایا ہوگا اور میری مہر اس پر ثبت کردی ہوگی۔ بہر حال فوج سے میری ناراضگی اور میری پوری بے بسی کی، جس کا میں پہلے ذکر کر آیا ہوں، حکم زیر بحث سے بھی تصدیق ہو سکتی ہے۔ دیگر دستاویزوں کی بابت جو اس کے ماسوا ہیں جیسے راجہ گلاب سنگھ کے مراسلات کی نقل یا بخت خان کی درخواست پر میرے احکام اپنے ہاتھ کے لکھے ہوئے اور مہر ثبت کیے ہوئے و دیگر کاغذات جو کارروائی میں شامل ہیں، میں یقین دلاتا ہوں کہ مجھے ان کی یاد نہیں ہے، بلکہ میں ابھی جیسا بیان کر چکا ہوں کہ افسران فوج نے بلا اطلاع جیسا چاہا لکھا اور اس پر میری مہر ثبت کردی اور مجھے یقین ہے کہ یہ بھی ضرور اسی قسم کے ہیں اور بخت خان کی درخواست پر ضرور مجھے حکم لکھنے کے لیے مجبور کیا گیا ہوگا، جس طرح دوسری درخواستوں پر لکھوایا کرتے تھے۔

دستخط (بہادر شاہ)

ضمیمۂ کارروائی مقدمہ

شہادت حکیم احسن اللہ خان سابق طبیب بادشاہ دہلی

لارڈ ایلنبر وف گورنر جنرل کی طرف سے بادشاہ کا نذرانہ دیا جانا موقوف ہو گیا تو ہمیشہ مغموم

رہتے تھے، پہلے تو انھوں نے اس معاملے کے متعلق انگلستان کو لکھا، اور پھر ہمیشہ اس حکم کے برخلاف شکایت اور اپنی ناراضگی کا اظہار کیا کرتے تھے۔ نیز اس نے بہت رنجیدہ تھے کہ ان کی خواہش تھی کہ چھوٹا لڑکا مرزا جواں بخت ولی عہد مقرر کر دیا جائے، اور حق تھا سب سے بڑے لڑکے مرزا فتح الملک کا۔ اور جواں بخت کی ولی عہدی کی مخالفت کی تھی۔ تھوڑے عرصے بعد مرزا حیدر ولد مرزا خان بخش پسر مرزا سلیمان شکوہ اپنے بھائی مرزا مراد کے ہمراہ لکھنو سے آئے اور انھوں نے بادشاہ کو رضامند کر کے ایجنٹ لیفٹنٹ گورنر کو لکھنے کی ترغیب دی کہ انھوں نے (بادشاہ نے) شہزادوں کو گورنمنٹ آفس میں اپنا ایجنٹ مقرر کیا ہے، مگر لیفٹنٹ نے منظور نہ کیا کیوں کہ شہزادوں کو ایسے مقام پر مقرر کرنے کا قاعدہ نہیں تھا۔ جاتے وقت لکھنو کے شہزادے اپنے ہمراہ کئی کاغذات لیتے گئے، جن پر بادشاہ کی مہر ثبت کرالی گئی تھی اور ان شہزادوں کو حرم سرائے شاہی میں بھی بڑا رسوخ تھا۔

لکھنو میں مرزا حیدر نے شاہ عباس کی درگاہ میں بادشاہ دہلی کی طرف سے ایک علم چڑھایا اور مجتہد کو ایک تحریری رقعہ دیا جو پنسل کا لکھا ہوا تھا اور جس پر بادشاہ دہلی کی مہر ثبت تھی۔ اس رقعے میں تحریر تھا کہ بادشاہ دہلی نے شیعہ عقائد اختیار کر لیے ہیں۔ یہ اطلاع دو تین شہزادوں سے ملی ہے، جو سنی مذہب رکھتے تھے، نیز کئی سنیوں کی عرضیوں سے بھی معلوم ہوا، جو بادشاہ دہلی کے نام سے موصول ہوئی تھی، ان میں سے میں ان لوگوں کو جانتا ہوں، امین الرحمٰن خان باشندۂ دہلی مگر لکھنو میں بود و باش اختیار کر لی تھی۔ شیدی بلال جو پہلے بادشاہ کے ہاں ملازم تھا، مگر پھر لکھنو جا کر ملازمت کر لی تھی، جب یہ حالات دہلی میں معلوم ہوئے تو کئی علماء بادشاہ کے پاس حاضر ہوئے اور درخواست کی کہ ہمیں آگاہ کیا جائے کہ یہ کیا بات ہے۔ بادشاہ نے جواب دیا کہ مرزا حیدر نے بادشاہ کی مہر تمام کاغذات پر لگائی ہے، جو خود اپنے ہاتھ سے لکھے تھے، اور بادشاہ نے بھی ایک فرمان مجتہد کو دیا ہے۔ پھر بادشاہ نے آگے کہا کہ ان کے فرمان میں صرف یہ لکھا ہے کہ وہ (بادشاہ) اہل بیت سے بہت محبت کرتے ہیں اور جو ان سے محبت نہ کرے وہ مسلم نہیں ہے۔ بعد ازاں بادشاہ کی درخواست پر لیفٹنٹ گورنر کے ایجنٹ نے اس فرمان کی نقل لکھنو سے منگوادی اور اس کاغذ میں بعینہ وہی مضمون نکلا جو درخواستوں میں ظاہر کیا گیا تھا۔ اس وقت یہ یقین کر لیا گیا تھا کہ بادشاہ نے علاوہ مجتہد کے فرمان کے کچھ شاہ اودھ کو بھی لکھا ہوگا جو خود شیعہ تھے، اور مرزا حیدر نے ضرور بادشاہ دہلی کو ان سے مل کر فتح پانے کی امید دلائی ہوگی۔

ایک سال بعد معتبر خبر ملی تھی کہ مرزا نجف ایران گیا ہے جو مرزا حیدر کا بھائی اور بادشاہ دہلی کا

بھتیجا تھا۔ مولوی بکر کی بتائی ہوئی یہ خبر بھی اخبار میں شائع کی گئی تھی کہ مرزا سے شاہ ایران نہایت عمدگی سے پیش آیا۔ میں نے مرزا علی بخت سے جو مرزا نجف کا بڑا گہرا دوست تھا، دریافت کیا کہ آیا مرزا نجف بادشاہ دہلی کا کوئی خط شاہ ایران کے پاس لے کر گیا ہے۔ اس نے اس کی تصدیق کی اور بتایا کہ خط کا مضمون یہ تھا کہ بادشاہ دہلی نے شیعہ مذہب قبول کرلیا ہے اور آپ ان کی امداد کیجیے۔ مزید برآں اس خط میں بادشاہ دہلی نے اپنی خراب حالت کا شکوہ کیا تھا اور مفلوک الحالی ظاہر کی تھی۔ مرزا علی بخت نے ساتھ ہی یہ بھی کہا کہ ابھی تک کوئی جواب موصول نہیں ہوا ہے۔ چند ماہ بعد شیدی قنبر نے حج کی تیاری کی اور مکے جانے کی اجازت چاہی۔ پیرزادے حسن عسکری کی معرفت رخصت مل گئی اور زادراہ کے لیے کچھ خرچ بھی دے دیا گیا۔ اس کے چند ماہ بعد جاٹ مل ملازم گورنمنٹ برطانیہ نے مجھ سے پوچھا کہ کیا دراصل شیدی قنبر حج کرنے گیا ہے۔ اس نے پھر کہا کہ مجھے یقین نہیں کہ وہ حج کو گیا ہو، بلکہ معلوم ہوتا ہے کہ وہ ایران گیا ہے۔ میں نے کہا مجھے علم نہیں، لیکن خواجہ سراؤں سے خفیہ دریافت کرنے پر معلوم ہوا کہ دراصل وہ ایران گیا ہے اور پیرزادے حسن عسکری کی معرفت رات کے وقت اسے چند کاغذات دیے گئے تھے، جس میں بادشاہ دہلی کی مہر ثبت تھی۔ اس سے مجھے معلوم ہوتا ہے کہ شیدی قنبر مرزا نجف کے پاس گیا تھا کہ پچھلی خط و کتابت کا جواب لائے۔ یہ تمام حالات سنیوں سے پوشیدہ رکھے گئے تھے (اور میں بھی ان میں شامل تھا) کیوں کہ بادشاہ کا مذہب مرزا حیدر نے تبدیل کروادیا تھا۔ اس کا ذکر بھی کرنا چاہیے کہ بادشاہ دہلی ان تمام خبروں کے سننے کے مشتاق رہتے تھے جو ایران اور بوشہر سے تعلق رکھتی تھیں۔

مرزا حیدر کوئی معمولی آدمی نہیں تھا بلکہ وہ بادشاہ دہلی کا خاص رشتے دار یعنی بھتیجا تھا اور لکھنو سے ایک ہزار روپیہ ماہوار وظیفہ پاتا تھا۔ وہ خاندانی شیعہ تھا اور اس کے دادا سلیمان شکوہ اور اس کے والد خان بخش دونوں شیعہ مذہب کے تھے۔ ان کے مذہب میں یہ بڑا ثواب ہے کہ غیر مذہب والے کو اپنا ہم مذہب بنا لیا جائے۔ علاوہ ازیں اس نے دنیاوی فائدے کو بھی نظر انداز نہ کیا ہوگا، جو اسے تین ہم عقیدہ بادشاہوں کے ہونے سے حاصل ہو سکتے تھے۔ یعنی بادشاہ دہلی و لکھنو و ایران۔

اس میں شک نہیں کہ شاہ ایران سے خط و کتابت کرنے کی تجویز سب سے پہلے مرزا حیدر نے بتائی تھی، جس نے اپنا ذاتی نفع بھی سوچا تھا اور یہ بھی خیال کرلیا ہوگا کہ بادشاہ دہلی کے شیعہ ہونے کا حال شاہ ایران کو بذریعہ اخبارات مرزا نجف کے جانے کے قبل ہی معلوم ہوجائے، تاکہ بادشاہ

اس سے خاطر ومدارت سے پیش آئے۔ بہادر شاہ بادشاہ اپنے پولیٹیکل منصوبوں کو پوشیدہ رکھنے کی بہت کم پروا کرتے تھے، ان کے معمولی معمولی ملازم ان پر اچھا خاصہ اثر رکھتے تھے، چناں چہ خواجہ سراؤں سے کچھ بھی مخفی نہیں تھا، کیوں کہ وہ ہر ایک مقام پر جا سکتے تھے۔ بادشاہ اپنی بیگمات کو پولیٹیکل معاملات میں شریک کرتے تھے، اور ان کی سنتے تھے، چناں چہ زینت محل بیگم کے خوش کرنے کو انھوں نے ان کے لڑکے مرزا جواں بخت کو اپنا ولی عہد بنانا چاہا تھا، حال آں کہ وہ بالکل کم سن اور اس مرتبے کے لائق نہ تھا۔ خواجہ سراؤں کے قبضے میں تمام راز رہتے تھے، کیوں کہ انھیں کہیں جانے کی ممانعت نہ تھی، حتیٰ کہ خلوت خانوں میں بھی بے دھڑک جا سکتے تھے۔ چناں چہ محبوب علی خواجہ سرا بادشاہ کے تمام معاملات کا مختار تھا۔

میں نے وہ خط کبھی نہیں پڑھا جو بادشاہ دہلی نے شاہ ایران کو لکھا تھا۔ البتہ جو کچھ سنا تھا من و عن بیان کردیا۔ میرے خیال میں بادشاہ دہلی نے ضرور مالی اور فوجی امداد چاہی ہوگی۔ بادشاہ روپے کی پرستش کرتے تھے۔ جس کا ثبوت یہ ہے کہ طمع میں پڑ کر باوجود ضعیف العمری کے اپنا مذہب تک تبدیل کردیا تھا۔

میں نے کبھی نہیں سنا کہ شاہ ایران کے خط میں دیسی فوج کو گورنمنٹ سے باغی کرانے کی تجویز بادشاہ نے کی ہو اور نہ میں سمجھتا ہوں کہ ایسا کیا گیا ہوگا۔ کیوں کہ اس وقت ایسا چرچہ نہیں تھا۔ بادشاہ دہلی نے صرف ایران سے قرابت کرنے کا خیال کیا تھا۔ مجھے خواجہ سراؤں سے معلوم ہوا تھا اور اسی وقت ان پر مہر ثبت کی گئی تھی، اور شیدی قنبر کو دے کر ہدایت کی گئی تھی کہ انھیں لے جا کر مرزا نجف کو دے دے اور گزشتہ خطوط کا اور اس کا جواب لائے۔

میں جانتا ہوں کہ ان کاغذات میں جو شیدی قنبر کو دیے گئے تھے کوئی نئی بات نہیں تھی، اگر ہوتی تو خواجہ سرا ضرور بتاتے۔ شیدی قنبر ایران روانہ ہوگیا، اور اس کے بعد اخبار میں شائع ہوا کہ مرزا نجف ایران پہنچ گیا ہے۔ شیدی قنبری کے جانے کے ایک سال بعد صوبہ اودھ گورنمنٹ کے زیر نگیں آگیا اور ہنومان گڑھی میں بھی شیدی کی روانگی کے بعد ہنگامہ ہوا تھا۔

بہادر شاہ گورنمنٹ کی مرضی کے موافق نہیں تھے۔ گورنمنٹ کا خیال تھا کہ ان کی وفات کے بعد قلعہ نوشاہی خاندان سے خالی کرالیا جائے گا اور گورنمنٹ کا یہ ارادہ مرزا فتح الملک کو ولی عہدی مل جانے کے بعد ظاہر ہوا تھا۔ اس وجہ سے بادشاہ اکثر کہا کرتے تھے کہ مرزا فتح الملک کو (جس کی جانشینی کے بادشاہ مخالف تھے) اپنی ولی عہدی پر خوشی منانے کا بہت کم موقع ملے گا، کیوں کہ بادشاہ

کے بعد ان کے جانشین کا کچھ اختیار نہ رہے گا، نہ اسے قلعہ میں رہنے دیا جائے گا۔

ایران کی لڑائی کے دوران بعض شہزادوں کو خیال تھا کہ اگر روس نے ایران کی مدد کی ہوگی تو انگریزوں کو ضرور شکست فاش ہوگی اور ایرانی ضرور ہندوستان کے مالک ہو جائیں گے۔ بادشاہ کو بھی اس رائے سے اتفاق تھا، میں نے کبھی نہیں سنا کہ مرزا نجف نے ایران سے کوئی خط لاکر دہلی پہنچایا ہو، البتہ (اگر کوئی خبر بھیجی ہو) تو اپنے بھائی مرزا حیدر کو براہ راست لکھنو بھیجی ہوگی۔

جب بادشاہ کو ایران سے مدد پہنچنے کی امید تھی تو انھوں نے ہندوستانی والیان ریاست پر اثر قائم رکھنے کی کوئی کوشش نہیں کی تھی اور اس کا سبب یہ ہے کہ مرزا حیدر جب سے یہاں سے گیا تو پھر واپس نہ آیا اور یہی شخص سازشوں کا بانی مبانی تھا۔ پہلے اس نے ہی شاہ ایران کو خط روانہ کرنے کی صلاح دی تھی۔

بادشاہ لارڈ ایلنبرو کا مخالف تھا، کیوں کہ انھوں نے مرزا جواں بخت کو ولی عہد نہ کر کے مرزا فتح الملک کو ولی عہدی دے دی تھی۔ حکومت برطانیہ سے یا کسی اور افسر سے عموماً وہ ناخوش نہ تھے، اور مذہب مسیحیت کے دشمن تھے۔

مرید کرنے کی وجہ سے بادشاہ بہ نسبت دنیاوی رہنما ہونے کے دینی رہنما زیادہ مانے جاتے تھے، صرف فوجی لوگ ہی ان کے مرید نہ ہوتے تھے بلکہ ان کو تو ہزاروں آدمی اپنا پیشوا ماننے لگے تھے۔ یہ رسم بہت قدیمی ہے۔ بہادر شاہ کے والد ماجد بھی مرید کیا کرتے تھے اور بادشاہ نے سرخ رنگین رومال دینا خود ایجاد کیا تھا۔ پیرزادگان دہلی نے جو شاہان دہلی کے روحانی معلم تھے، لوگوں کو تعلیم دی تھی کہ بادشاہ روحانی معاملات میں زمین پر روحانی خلیفہ الٰہی ہوتا ہے اور اس کی پیشوائی ہر طرح مسلم ہے۔ [میرے نانا حضرت خواجہ شاہ غلام حسن صاحب نے ایک روز حکیم صاحب کے سامنے بادشاہ سے اس قسم کا ذکر کیا تھا کہ بادشاہ اسلام خلیفہ کا درجہ رکھتا ہے۔ مگر یہ کوئی تعلیم نہ تھی اور بادشاہ خود اس کو جانتے تھے، اور یہ اسلام کا مسلمہ مسئلہ ہے۔ حسن نظامی]

علاوہ ازیں اس میں ایک فائدۂ عظیم یہ ہے کہ مرید اپنے پیر کے تمام دنیاوی اور دینی احکام قبول کر لیتا ہے۔ سب سے پہلے بادشاہوں میں مرید کرنے کا رواج بہادر شاہ کے والد نے قائم کیا تھا۔ اول الذکر نے بہت سے لوگوں کو مرید کر لیا تھا اور مریدوں سے صرف ایک سلسلے میں بیعت لیتے تھے۔ میں نے یہ کبھی نہیں سنا کہ جن سپاہیوں نے بادشاہ سے بیعت کی تھی، ان کے ہاں ملازمت بھی کی ہو۔ غدر سے پہلے کوئی مرید نہیں آیا، اور نہ کسی کو سرخ رومال دیا گیا۔ مزید برآں

پانچ مہینے تک زمانۂ قیام دہلی میں کوئی سپاہی بیعت کے لیے بھی حاضر نہیں ہوا، بلکہ مرزا مغل کے ضبط شدہ کاغذات میں بھی کسی مرید کی کوئی ایک درخواست دستیاب نہیں ہوئی، اور نہ ان کا تذکرہ پایا گیا، اور یہ کاغذات میری نظر سے گزر چکے ہیں۔ کارتوس کے ہنگامے کے بعد پانچ مہینے تک کوئی شخص آ کر مرید نہیں ہوا، اگر کوئی ہوتا تو مجھے ضرور معلوم ہوتا۔ ہمیشہ مسلمان ہی بادشاہ کے مرید ہوتے تھے اور کسی ذات کا کوئی شخص مرید نہ ہوتا تھا۔ میں نے نہیں سنا کہ بادشاہ نے ہندوستانی فوجوں سے کوئی خط و کتابت کی ہو، لیکن وہ دیسی فوج کی نسبت جب کبھی کہیں لڑائی ہوا کرتی تو متفکرانہ طور سے دریافت کیا کرتے تھے اور چوں کہ وہ گورنمنٹ برطانیہ سے ناخوش تھے، اس لیے اس کی زک اور ہزیمت کی خبریں شوق سے سنتے تھے، ان کا خیال تھا کہ ماسوا برطانیہ کے جو حکمران آئے گا وہ ان سے بوجہ نسل شاہی ہونے کے نہایت عزت و توقیر سے پیش آئے گا۔ مگر تھوڑے دنوں بعد ان کو یقین ہو گیا تھا کہ گورنمنٹ برطانیہ کی تباہی کے ساتھ ہی ان کی خوش اقبالی بھی ان کے ہاتھوں سے چلی جائے گی۔

مجھے اچھی طرح یاد نہیں ہے، لیکن میں یقین کرتا ہوں کہ الحاق پنجاب کے بعد بسبب موقوفی بھتا کے دیسی رجمنٹوں کی بغاوت کی خبر بادشاہ کو پہنچی تھی اور مجھے وہ مہینے تو یاد نہیں، جب کہ کلکتہ کی رجمنٹ کے سب سے پہلے نئے کارتوس لینے سے انکار کرنے کی خبر پہنچی تھی۔ مجھے صرف اتنا یاد ہے کہ کلکتہ کے کسی اخبار سے اطلاع موصول ہوئی تھی اور جب کارتوسوں کا چرچہ جابجا پھیلا ہوا تھا، تو یہ قیاس کیا گیا تھا کہ جتنا زیادہ چرچا ہو رہا ہے، اتنا ہی جوش و غضب ملک کے ایک سرے سے دوسرے سرے تک پھیل جائے گا اور دیسی فوج برطانیہ کو تاراج کر کے اس کی حکومت کا خاتمہ کر دے گی۔ اس وقت بادشاہ نے ظاہر کیا تھا کہ اس وقت ان کی حالت نہایت عمدہ ہو گی، کیوں کہ جو طاقت حکمراں ہو گی وہ ان کی قدر و منزلت کرے گی۔

خاندان شاہی کے شہزادے کہا کرتے تھے کہ بہ سبب قلت روپیہ فوج یا تو نیپال چلی جائے گی یا ایران، مگر بادشاہ کے پاس نہ ٹھہرے گی۔

گو نئے کارتوسوں کا اجرا ظاہری بغاوت کا باعث مانا جاتا ہے، مگر دراصل ایسا نہیں ہے۔ دیسی فوج کے بعض افرد بہت زور سے اس کی کوشش کر رہے تھے، کیوں کہ گورنمنٹ برطانیہ سے ناخوش تھے اور کہتے تھے کہ ان سے بہت جابرانہ برتاؤ کیا جاتا ہے۔ نئے کارتوسوں کا بہانا اپنے حسب مطلب پا کر انھوں نے اپنا کام نکالا، انھی باغیوں اور سازشیوں نے اسے اپنے اغراض کی

ٹی بنا کر اور کچھ اور مذہبی عنصر ملا کر تمام فوجوں کو حکمرانوں سے برگشتہ کر دیا۔ نیز انھیں یقین تھا کہ انھی کی بدولت گورنمنٹ قائم ہے اور گورنمنٹ ان سے نہیں لڑ سکتی۔ عام لوگ (اصلیت سے) بالکل بے بہرہ تھے اور خیال کرتے تھے کہ گورنمنٹ نے ہمارے مذہب کو برباد کرنے کی ٹھانی ہے، اور دراصل یہی امر غور طلب ہے، کیوں کہ کمانڈر انچیف نے خود تہیہ کیا تھا کہ وہ دو سال میں تمام ہندوستان کو عیسائی کر لیں گے اور اسی وجہ سے باغیوں کی عیارانہ چال چل گئی اور ناواقف پبلک نے ان کی بات کو سچ جانا۔

میرے خیال میں تو دیسی فوج بہت پہلے سے گورنمنٹ کی مخالف تھی اور اگر نئے کارتوس جاری بھی نہ کیے جاتے، تاہم وہ بغاوت کا کوئی دوسرا بہانا ڈھونڈ لیتی، کیوں کہ اگر سپاہیوں کو محض مذہبی وجوہات مانع ہوتے تو وہ فوراً نوکری چھوڑ دیتے (۱)۔ اور اگر انھیں ملازمت کرنی ہوتی تو وہ بغاوت نہ کرتے۔

بادشاہ کا خیال تھا کہ گورنمنٹ لوگوں کے مذہب میں مخل ہونا چاہتی تھی۔ مگر میں سمجھا دیا کرتا تھا کہ یہ صرف بدمعاشوں کی اڑائی ہوئی بات ہے اور انگریز بڑے عقلمند ہیں وہ کوئی ایسا کام نہیں کریں گے جس سے کسی کے مذہب میں مداخلت ہو اور وہ کسی فوج کو جس سے عمدہ خدمات کی توقع رکھتے ہوں، کبھی صدمہ نہ پہنچائیں گے۔ جب بھی میں سمجھاتا، بادشاہ میری رائے سے اتفاق کرتے، مگر پھر خواجہ سراؤں اور مصاحبوں کے بہکانے سے اپنے دیرینہ خیالات پر آ جاتے تھے۔

میری موجودگی میں میرٹھ سے کوئی خبر موصول نہیں ہوئی تھی، دوشنبے کو طلوع آفتاب کے بعد ایک والنٹیر سپاہی جو لاہوری دروازے پر تعینات تھا، آیا اور دیوان خاص کے خدمت گاروں سے کہا کہ میرٹھ میں سرکاری فوجیوں نے بغاوت کر دی ہے اور وہ بہت جلد دہلی پہنچنے والے ہیں۔ اس خبر کے ایک گھنٹے بعد ہی دہلی چھاؤنی کی رجمنٹ قلعے میں گھس گئی اور اس کے بعد میرٹھ کی فوج آئی۔

میری موجودگی میں کبھی ایسا تذکرہ نہیں کیا گیا کہ میرٹھ میں کارتوسوں سے انکار کرنے کی بنا پر سپاہیوں کا کورٹ مارشل ہوا ہے، اور یہ غیر ممکن نہیں ہے کہ پانچ یا چھ روز بعد بذریعۂ اخبارات معلوم ہو گیا ہو۔

مجھے یقین نہیں ہے کہ کوئی شخص بادشاہ کی طرف سے تحقیق حالات کے لیے میرٹھ بھیجا گیا ہو،

---

(۱) انسانی خیالات گاہے گاہے پاکیزہ ہوتے ہیں۔ سپاہیوں کو یقین تھا کہ ان کا مذہب خطرے میں ہے، اور اس کی حمایت میں وہ اٹھ کھڑے ہوئے۔ اگر ملازمت ترک کر دیتے تو کیا ہوتا۔ مذہب اور عہدہ ان کو ایسا کرنے سے روکتے تھے۔
(احسن اللہ خاں)

نہ میں سنا کہ زینت محل نے میرٹھ کسی کو روانہ کیا ہے۔

بادشاہ کو اس وقت حیرت ہوئی جب یک بیک فوجیں ان کے پاس آ گئیں۔ مجھ کو خود تعجب تھا کہ بغیر اطلاع اور بے شان و گمان یہ کیوں کر آ گئیں۔ تاہم جب سے کارتوسوں کا ذکر سنا تھا، یہ خیال کر لیا تھا کہ کچھ نہ کچھ آفت ضرور آ کر رہے گی۔

اسی روز شام کو جبکہ فوجیں آئی تھیں، میں نے بادشاہ کو سمجھا دیا تھا کہ ایسے لوگوں سے بھلائی کی امید رکھنا بے سود ہے جنھوں نے اپنے مالکوں سے بغاوت کی ہو اور پھر میں نے لیفٹنٹ گورنر آگرہ کو بادشاہ کی طرف سے لکھ دیا تھا اور اطلاع دے دی تھی کہ فوجوں نے اپنے انگریز افسروں کو قتل کر ڈالا ہے اور بادشاہ کی بے بسی کا ذکر کر کے مدد طلب کی گئی تھی۔

صبح مجھے بادشاہ سے دوبدو ہو کر گفتگو کرنے کا موقع نہیں ملا، کیوں کہ قلعہ فوجوں سے بھرا پڑا تھا اور میں کوئی گفتگو نہیں کر سکتا تھا۔

بادشاہ باغیوں کی آمد کے پہلے سے تیار نہیں تھے، چناں چہ جب میں نے اور غلام عباس وکیل نے آکر کہا کہ قلعدار صاحب اور ایجنٹ لیفٹنٹ گورنر نے درخواست کی ہے کہ دو توپیں لاہوری دروازے پر اور دو پالکیاں کپتان ڈگلس کے مکان پر پہنچا دی جائیں تو انھوں نے فوراً حکم دے دیا اور کچھ عذر نہ کیا۔

کوئی نہیں بتا سکتا کہ چپاتیوں کی تقسیم کا کیا مطلب تھا، یہ بھی معلوم نہیں ہے کہ سب سے پہلے یہ تدبیر کس نے نکالی تھی۔ قلعے کے تمام لوگ حیرت میں تھے کہ یہ کیا معاملہ ہے اور میں نے بذات خود بادشاہ سے اس مسئلے پر گفتگو نہیں کی، مگر دیگر لوگ ان کے روبرو ان کا چرچہ کرتے اور متحیر ہوتے تھے کہ یہ کیا اسرار ہے۔ میں سمجھتا ہوں کہ چپاتیوں کی ابتدا فوجوں میں صوبہ اودھ سے شروع ہوئی تھی، پہلے پہل میں خود حیرت میں تھا کہ یہ کیا معاملہ ہے، مگر سمجھتا تھا کہ یہ کسی خاص معاملے کی طرف دلالت کرتی ہیں، بعض کا خیال یہ تھا کہ چپاتیوں کی ایجاد فوج سے ہوئی جو کسی رمز کی طرف اشارہ کرتی ہیں۔ بعض کا اعتقاد تھا کہ ان میں کچھ جادو ہے کیوں کہ وہ تمام ملک میں پھیل گئی تھیں۔ مگر پتا نہیں چلا کہ کس جگہ سے پہلے نکلی تھیں اور ابتدا کس شخص نے کی تھی۔ بعض کا قیاس تھا کہ کسی کامل بزرگ کی ایجاد کی ہوئی ہے، تا کہ ملک کے لوگوں کا مذہب اچھوتا رہے، جس کی نسبت خیال تھا کہ گورنمنٹ خراب کرنا چاہتی ہے۔ مجھے افسران فوج سے معلوم ہوا تھا کہ انھوں نے بغاوت اس وجہ سے کی کہ گورنمنٹ نے کارتوسوں میں چربی اور آٹے میں ہڈیاں ملائی تھیں، تا کہ لوگوں کا

دھرم خراب ہو جائے اور عموماً ان کے ہتھیار اٹھانے کا یہی سبب بتایا جاتا ہے، لیکن میں نے حیدر حسن سے جو دیسی افسروں کا گہرا دوست تھا، یہ سنا ہے کہ وہ لوگ کہتے تھے کہ اگر ہم لوگ باہم متفق رہے تو گورنمنٹ کی فوجیں ہمیں شکست نہ دے سکیں گی اور ایک روز ہم تاج و تخت کے مالک بن جائیں گے۔

میں سمجھتا ہوں کہ دیسی فوجوں نے ملک گیری کی ہوس میں بغاوت کی تھی، اور مذہب کی آمیزش صرف ان کے اصل ارادوں کی پردہ پوشی تھی، اگر وہ مذہب کے لیے لڑ رہے ہوتے، تو کبھی لوگوں کے مکانات نہ لوٹتے اور طرح طرح کے ظلم نہ کرتے، بلکہ صرف گورنمنٹ برطانیہ سے سرگرم جدال رہتے، بغاوت کرنے کے بعد مفسد فوجیں اکثر کہا کرتی تھیں کہ اب وہ تاج و تخت کی مالک ہیں اور مختلف شہزادوں کو مختلف صوبہ جات میں لے جا کر حکومت دیں گی۔

نمبر ۳۷ دیسی پیادہ رجمنٹ نے کہا کہ انھوں نے غدر سے قبل ہی میرٹھ کی فوجوں سے مشورہ کر لیا تھا اور تمام چھاؤنیوں سے بذریعۂ خط و کتابت طے کر لیا تھا کہ سب دہلی میں آ کر جمع ہوں۔ دیسی پیدل کے اس بیان سے مجھے خیال گزرا کہ دہلی کے سپاہیوں کے نام جو خطوط موصول ہوتے تھے، ان میں اسی قسم کی باتیں ہوتی ہوں گی۔

دہلی کی باغی رجمنٹوں نے کئی اور رجمنٹوں کو اپنے ہمراہ شامل کرنے کے لیے تحریر کیا تھا اور بادشاہ نے بے شک باغی افسروں کی درخواست پر نیچ، فیروز پور وغیرہ کی فوجوں کو آ کر شامل ہونے کے احکام جاری کیے تھے۔ دہلی کے باغیوں کے خطوط کا مضمون بالعموم یہی ہوتا تھا کہ ''ہم میں کے بے شمار یہاں آ گئے ہیں، کیا تم بھی حسب وعدہ فوراً آ ؤ گے۔ باغی افسروں کی استدعا پر بادشاہ منشیوں کو حکم دے دیا کرتے تھے کہ جیسا وہ (افسر) چاہیں لکھ دو، فوج کی بغاوت کے متعلق میں اور کچھ نہیں کہہ سکتا، جو کچھ مجھے معلوم تھا، وہ بتا دیا۔

قبل از بغاوت فوجوں نے طے کر لیا تھا کہ اپنی اپنی چھاؤنی کے انگریز مرد و عورتوں اور بچوں کو قتل کر ڈالیں گے، مگر میں مفصل نہیں بتا سکتا کہ انھوں نے کیا بندوبست کیا تھا۔ اتنا میں جانتا ہوں کہ ان کی جملہ تدابیر اس وقت کی تیار کردہ نہیں تھیں، جب ہنگامہ برپا ہو چکا تھا۔

☆ میں نے نہیں سنا کہ باغیوں نے اپنا کام شروع کرنے کے لیے کوئی خاص تاریخ مقرر کی ہو، اگر کی ہوتی تو ان کے خطوط میں ضرور اس کا حوالہ ہوتا، حال آں کہ کسی خط میں کچھ نہیں تھا، میرا مدعا اس قسم کے حسب ذیل جملوں سے ہے:

تم نے فلاں تاریخ کو بغاوت کا وعدہ کیا تھا، لیکن اب تک نہیں آئے، پس تم نے اپنا وعدہ وفا نہ کیا۔

☆ میں نے ہنگامہ برپا ہونے کا اوپر ذکر کیا ہے، میرا مقصد میرٹھ کے ہنگامے سے ہے، اور میں یقین کرتا ہوں کہ ہنگامۂ مذکور اچانک نہیں برپا ہوا، بلکہ عرصۂ دراز سے تدبیریں پخت وپز ہو رہی ہوں گی۔

☆ میرٹھ کی بغاوت کا دفعتاً ہو جانا، اس سبب سے ہوگا کہ ان کو انگریز افسروں کے جبر و انتقام کا خوف تھا، چناں چہ گلاب شاہ افسر کیولرائی نمبر ۳ میرٹھ یہاں آ کر بیان کرتا تھا کہ انھوں نے (گورنمنٹ نے) فوجوں کو بے ہتھیار کر دیا ہے اور سواروں کو ماخوذ کر لیا ہے۔

☆ نئے کارتوسوں کے ساتھ ہی سپاہیوں کو اور کئی تکالیف درپیش تھیں۔ جس سے ان میں گورنمنٹ کی طرف سے بدظنی پیدا ہو گئی تھی، فوجوں کو کم رخصت ملنے لگی تھی، بھتا بند کر دیا گیا تھا، فوجوں کو جہازوں پر سمندروں میں روانہ کیا جاتا تھا وغیرہ۔ لیکن انھوں نے سب سے بڑھ کر اپنی بغاوت کا باعث اجرائے کارتوس قرار دیا تھا، ان کی دیگر تکالیف پر چنداں التفات نہیں کیا جا سکتا تھا اور اس کا سبب بالکل روشن ہے۔ یہ یعنی کارتوس کو بدنام کرنے سے انھیں ایک مذہبی موقع ہاتھ آ گیا تھا اور انجان لوگوں کو پورا یقین تھا کہ بے شک وہ مذہب کے لیے لڑ رہے ہیں۔

☆ باغی گورنمنٹ برطانیہ کے لیے بہت حقارت آمیز الفاظ استعمال کرتے تھے۔ وہ انھیں نصاریٰ کفار وغیرہ کے ناموں سے یاد کرتے تھے، لیکن بالکل پایۂ ثقاہت سے گرے ہوئے الفاظ استعمال نہ کرتے تے۔ وہ اکثر کہتے تھے کہ گورنمنٹ کسی رئیس کو کچھ زمین یا کوئی علاقہ نہ دے گی اور ہندوستانیوں سے مہربانی سے پیش نہ آئے گی۔

☆ دیسی فوج میں ہندو، مسلمان دونوں گورنمنٹ سے ناخوش تھے۔ مگر شہر میں (دہلی میں) مسلمان بہ نسبت ہندوؤں کے زیادہ ناراض تھے اور ان کی ناراضگی کا سب سے بڑا سبب یہ تھا کہ بقرعید کے موقع پر گاؤ کشی کا جھگڑا ہو گیا تھا اور مقامی حکام کا فیصلہ مسلمان آبادی کے موافق نہ ہوا تھا۔ اس کے ساتھ یہ بھی مشہور تھا کہ گورنمنٹ سور کا گوشت کھلا کر ہندوستانیوں کو عیسائی بنانا چاہتی ہے۔

☆ بعدازاں یہ افواہ ہوئی کہ نمبر ۱۱، دیسی پیدل سپاہیوں نے اپنے افعال شنیعہ سے توبہ کی ہے، اوران کی توبہ کا ثبوت یہ ہے کہ مخفی طور پر وہ رجمنٹ سے علاحدہ ہو گئے ہیں، حال آں کہ بات یہ تھی کہ بعض لوگوں نے ترقی تنخواہ اور سرفرازی عہدوں کے لیے اپنے افسروں کو درخواستیں دی تھیں، چوں کہ ان کی درخواستیں نامنظور کی گئیں، اس وجہ سے وہ نوکری چھوڑ کر چلے گئے۔

☆ شہزادے یا اہل قلعہ پہلے سے آگاہ نہیں تھے کہ دلی والنٹیئرز رجمنٹ نے گورنمنٹ کے خلاف میرٹھ کی فوجوں سے سازش کی ہے۔ یہ صرف اس وقت آشکارا ہوا جب باغی فوجوں کے افسروں نے دہلی میں اس کا تذکرہ کیا۔

میرے خیال میں ہندوستانی رؤسا اور سپاہیوں کے مابین بغاوت کے قبل کوئی خط و کتابت نہیں تھی، کیوں کہ اگر ایسا ہوتا تو رؤسا کے خطوط میں ضرور کچھ نہ کچھ اشارات ہوتے، مزید برآں باغی فوجوں کا کچھ حصہ ان والیان ریاست کے پاس چلا جاتا، جو سازش میں شریک ہوئے تھے، مگر ایسا نہیں ہوا۔ لہذا میرے خیال میں باغیوں نے خود ہی اپنی مرضی سے ہنگامہ برپا کیا، کسی والیِ ملک کی تحریک پر نہیں کیوں کہ موخرالذکر حالت میں خود باغی ہی جاکر اپنے محرکوں سے مل جاتے اور انھیں شرکت کے لیے طلب کرتے۔

☆ دیہاتی باشندوں پر باغی فوجوں کا کچھ اثر نہیں تھا، اس لیے کہ اگر ایسا ہوتا تو وہ ان سے بہت نرمی سے پیش آتے، نہ کہ ان کے مکانات کی لوٹ مار اور ان پر جبر و تعدی روا رکھتے۔

☆ ہنگامہ بپا کرنے کے پیشتر باغی دہلی کی مسلمان آبادی سے ملے ہوئے نہیں تھے، اگر ملے ہوئے ہوتے تو دہلی کے مسلمانوں پر ایسا ستم نہ توڑتے جیسا کہ انھوں نے توڑا۔

☆ شہر کے رذیل طبقوں کو تحریک کی ضرورت نہ تھی، اس وقت کی بل چل اور محشر خیزی نے انھیں سپاہیوں سے متفق ہونے کی جرات دلائی تھی۔

☆ میرا خیال ہے کہ گوجروں اور سپاہیوں کے درمیان کوئی معاہدہ نہیں ہوا تھا۔ لیکن سپاہیوں نے بعد میں دہلی کے قرب و جوار میں رہنے والے چند گوجروں کو بادشاہ سے دو نقارے دلوائے تھے جو انگریزی کیمپ کی رسد لوٹ لیا کرتے تھے۔ اسی طرح ایک

شخص راؤ نامی کو ضلع بلند شہر میں سکندرہ کے متصل ایک نقارہ عطا کیا گیا تھا جو ابھی منصب پر مامور تھا۔

☆ دوران ہنگامہ میں حکومت انگریزی کو برا اور خراب نہیں کہا گیا، جن لوگوں نے سپاہیوں کا حد سے بڑھا ہوا ظلم دیکھا تھا، وہ کیوں کر حکومت انگریزی کے خلاف کہہ سکتے تھے۔

کیولرائی افسروں میں گلاب شاہ پیدل رجمنٹوں میں افسران الگزینڈر رجمنٹ بادشاہ کے ملازموں میں شیدی ناصر خان اور بسنت خواجہ سرا ہی خاص اشخاص تھے۔ جنھوں نے انگریزوں کے قتل کی تحریک کی۔ سبب یہ ہے کہ گلاب شاہ اور اس کی جماعت باغ حیات میں مقیم تھی اور شاہی ڈیوڑھی پر خواجہ سراؤں کی صحبت میں بیٹھا کرتے تھے۔

میں نے اس معاملے میں بادشاہ سے گفتگو کی تھی اور اس وقت خواجہ سرا بھی موجود تھے۔ ان لوگوں نے (خواجہ سراؤں نے) گلاب شاہ کی درخواست پر انگریزوں کے قتل کا حکم دینے کے لیے التماس کیا اور میں نے بادشاہ کو سمجھایا کہ عورتوں اور بچوں کو قتل کرنا ہمارے مذہب کے خلاف ہے۔ میں نے یہ بھی کہا کہ دنیاوی فوائد کو ملحوظ رکھتے ہوئے بھی ان کا رہا کر دینا زیادہ مفید ہوگا اور پھر میں نے ان سے کہا کہ مفتیانِ شرع سے عورتوں اور بچوں کے خلاف قتل کا فتویٰ لے کر افسران کو دکھائیں اور یہ بھی سمجھایا کہ انھیں اگر حوالات میں رکھا جائے تو کسی محفوظ مقام پر اپنے ہی بچوں جیسا سمجھا جائے اور اس کے نتائج بھی بتائے تھے، اور سردار محمد اکبر خان والی کابل کی نظیر پیش کی جنھوں نے دوران جنگ کے گرفتار شدہ انگریزوں کو بچایا تھا اور اسی سبب سے امیر دوست محمد خان (محمد اکبر خاں کے والد) کو کس طرح آزادی ملی جو انگریزوں کے ہاتھوں گرفتار ہو گئے تھے۔

میری باتوں کا اثر تھا کہ بادشاہ نے انگریزوں کے قتل کو منسوخ کر دیا اور دو روز تک یہی حالت رہی۔ لیکن بعد میں درخواست کنندوں نے بادشاہ پر بہت زور ڈالا کہ وہ اس کی منظوری دیں اور خواجہ سرا یعنی بسنت و ناصر نے قیدیوں کو گلاب شاہ کے حوالہ کر دیا۔ جس نے لب حوض لے جا کر قتل کر ڈالا۔

اگر بادشاہ ان عورتوں اور بچوں کو اپنے زنان خانے میں رکھتے اور سپاہیوں کے مطالبہ کرنے پر سمجھا دیتے کہ پہلے وہ ہماری عورتوں اور بچوں کو قتل کر ڈالیں تو اغلب تھا کہ سپاہی حرم سرائے شاہی میں گھس کر جبراً قیدیوں کو نہ نکال سکتے اور قتل کرنے کی جرات نہ کرتے۔

بادشاہ نے جان بوجھ کر ایسا حکم نہ دیا۔ وہ اکثر سپاہیوں سے اپنے ارادے کی نسبت کچھ نہ کچھ

کہا کرتے تھے، اگر بادشاہ کی منظوری نہ ہوتی تو یہ ممکن نہ تھا کہ سرکاری کاغذات میں بادشاہ کا نام نہ ہوتا کہ انھوں نے منظوری دی۔

درن ست اور الگزینڈر رجمنٹوں کے افسر انگریزوں اور عیسائیوں کے سخت مخالف تھے اور اگر گلاب شاہ اور بسنت و ناصر ہر دو خواجہ سرا قیدیوں کو قتل نہ کر دیتے تو خود وہ لوگ جا کر عیسائیوں کے قتل کا مطالبہ کرتے، لیکن میں نہیں جانتا کہ ان سے بڑھ کر کوئی عیسائیوں کا دشمن جانی تھا اور عیسائی شیدی ناصر الہ داد خان ولایتی گلاب شاہ کے سواروں کے ہاتھوں تہ تیغ کیے گئے جن میں کچھ بادشاہی ملازم بھی تھے۔ الہ داد خان ولایتی بادشاہ کی ملازمت میں تھا۔

سب سے پہلے باقاعدہ سوار آئے، پھر والنٹیئر رجمنٹ دہلی قلعے میں داخل ہوئی، سواروں کے ہمراہ والنٹیئروں کی دو کمپنیاں تھیں، جو قلعے کے دروازوں پر متعین کی گئی تھیں، والنٹیئر رجمنٹ کے افسروں نے چلا کر کہا۔ ''یہ میرٹھ سے آئے ہوئے سوار ہیں اور دیسی پیدل بھی بہت جلد آنے والے ہیں۔ چناں چہ میں نے دہلی رجمنٹ کے افسروں کے اقوال سے استنباط کیا کہ دہلی اور میرٹھ کی رجمنٹوں میں گہری سازش تھی، دیگر چھاؤنیوں کے سپاہیوں کو ان لوگوں نے کبھی دہلی آنے کے خطوط یا احکام نہیں لکھے۔ البتہ صرف ان کے خطوط میں یہ تحریر ہوتا تھا کہ ''کیا تم بھی آتے ہو؟''

میرے خیال میں کئی وجوہات ہیں، جن کی بناء پر باغیوں نے دہلی کو منتخب کیا۔

اول: دہلی میرٹھ سے جہاں سے بغاوت اٹھنے والی تھی، بالکل نزدیک تھی اور میرٹھ کی فوجیں دہلی والی فوجوں کی ہم خیال تھیں۔

دوم: دہلی میں معقول خزانہ اور بافراط ذخائر حرب تھے۔

سوم: دہلی میں شہر پناہ تھی جس سے شہر بالکل محفوظ رہ سکتا تھا۔

چہارم: شاہ دہلی کے پاس فوج نہیں تھی اور وہ کمزور و بے کس تھے۔

پنجم: بادشاہ کی شخصیت ایسی تھی جس کی توقیر اور فرماں برداری ہر ہندو اور مسلمان فرض گردانتا تھا۔

☆ فوجوں نے بادشاہ کو اپنے ارادے کی کوئی اطلاع نہیں دی، اور نہ بادشاہ کو علم تھا کہ والنٹیئر رجمنٹوں نے میرٹھ کی فوجوں سے سازش کی ہے۔

☆ میں نے نہیں سنا کہ اہل دہلی نے انعامات یا آراضی معافی کی ضبطی کی شکایت کی ہو۔

لیکن سپاہی کہا کرتے تھے کہ گورنمنٹ رفتہ رفتہ تمام انعام اور وظیفے ضبط کرلے گی اور کسی کو فارغ البال نہ چھوڑے گی۔

☆ الحاق اودھ کا دہلی میں بہت چرچا ہوتا تھا۔ مگر دہلی کی اسلامی آبادی بسبب سنی ہونے کے اسے بری نگاہوں سے نہ دیکھتی تھی۔ نیز ان کے ایک مولوی امیر علی نامی کو معہ چار پانچ سو سنیوں کے ہنومان گڑھی کے موقع پر بادشاہ اودھ کے حکم سے توپ سے اڑا دیا گیا تھا...... اور وہ لوگ تو کہا کرتے تھے کہ شاہ اودھ کو اتنے بے گناہ سنیوں کا خون بہانے کی سزا ملی ہے جو اس کا ملک چھن گیا، دہلی کے ہندو باشندوں سے بھی میں نے کوئی ایسی بات نہ سنی جس سے معلوم ہو کہ وہ الحاق اودھ سے ناراض تھے، البتہ سپاہی کہا کرتے تھے کہ جس طرح انگریزوں نے اودھ پر قبضہ کیا ہے وہ رفتہ رفتہ تمام ملک پر قابض ہو جائیں گے۔ میں نہیں خیال کرتا کہ اسباب بغاوت میں الحاق اودھ بھی ایک سبب ہو۔

میرا خیال تو یہ ہے کہ سپاہیوں کے اظہار خفگی و رنج کا کوئی محل ہی نہ تھا، کیوں کہ ان کا کچھ کھویا نہیں گیا تھا، بلکہ برخلاف اس کے انھیں حکومت اودھ کے ظلموں سے نجات مل گئی تھی، جو سپاہی دہلی میں تھے، انھوں نے تو بالخصوص الحاق اودھ پر کبھی ناراضگی ظاہر نہیں کی۔ میں کہتا ہوں اگر الحاق اودھ نہ بھی ہوتا، تب بھی سپاہی بغاوت کرتے، کیوں کہ ان کی تدابیر بار آور ہو چکی تھیں۔ لکھنو کی تین یا چار رجمنٹوں نے بادشاہ کو عرضی بھیجی تھی کہ اودھ پر پورا قبضہ کر لینے کے بعد وہ دہلی کی طرف بڑھیں گی اور انھوں نے انگریزوں کو بیلی گارد میں محصور کر لیا ہے۔ قدرت اللہ خان رسالدار ایک سو سواروں کے ساتھ تمام اودھ کی فوجوں کی طرف سے عرضی لے کر آئے تھے اور جواں بخت کے ذریعے دربار شاہی میں باریاب ہوئے تھے۔ انھوں نے ایک سکہ بادشاہ کے حضور پیش کیا جو بادشاہ کے نام کا ڈھالا ہوا تھا۔ سکہ پر مندرجہ ذیل الفاظ کندہ تھے۔ ''سراج الدین بہادر شاہ غازی۔'' عرضی دہندوں نے یہ بھی کہا کہ فی الحال واجد علی شاہ کو انھوں نے گدی نشین کر دیا ہے تاکہ وہ وزیر بادشاہ کی حیثیت سے رہے اور ان کی فرمانبرداری کرے، انھوں نے کہا کہ اس سے اس قسم کا اقرار نامہ بھی لکھوا لیا گیا ہے کہ جب بادشاہ کی مرضی ہوگی تب مستقل طور پر گدی نشین کیا جائے گا۔ بادشاہ نے بخت خان کو حکم دیا کہ منظوری اور بندوبست کا ایک فرمان لکھ دیا جائے۔ وہ سنہری اشرفیاں جنھیں قدرت اللہ خان نے پیش کیا تھا اور جن پر بادشاہ کا سکہ تھا، ابھی کمشنر صاحب

دہلی کے قبضے میں موجود ہیں۔ میری دانست میں واجد علی شاہ نے ان کارروائیوں میں حصہ نہیں لیا اور اگر واجد علی شاہ و علی نقی خان نے حصہ لیا ہوتا تو پوشیدہ نہ رہتا اور علاوہ اس کے موخرالذکر لکھنو میں موجود نہ تھے۔ خود واجد علی شاہ اور ان کے فرزند کے ہوتے ہوئے چھوٹا لڑکا کبھی گدی نشین نہیں ہوسکتا تھا۔

میرا خیال ہے کہ اودھ کی فوجیں بیلی گارد پر قبضہ کرنے کے بعد ہی دہلی روانہ نہیں ہوئی ہوں گی، بلکہ انتظام اودھ میں مصروف ہوگئی ہوں گی۔ میں جانتا ہوں کہ واجد علی شاہ کے فرزند کا حکم جسے باغیوں نے گدی نشین کیا تھا، برائے نام تھا۔

☆ میں نے کبھی نہیں سنا کہ قیام کلکتہ کے زمانے میں واجد علی شاہ (اور بادشاہ سے) کوئی خط وکتابت ہوئی ہو، نہ مجھے ایسا یقین ہے کہ ایسا ہوا ہوگا۔ علی نقی خان سے کوئی خط و کتابت نہیں ہوئی۔ البتہ سابق میں کچھ عرصے تک مرزا حیدر کی وساطت سے ہوتی رہی تھی، لیکن جب اس نے لکھنو میں مشہور کردیا کہ بادشاہ دہلی نے مذہب شیعت اختیار کرلیا ہے اور بادشاہ نے دہلی میں انکار کیا کہ انھوں نے نہیں کیا تو مرزا حیدر نے بادشاہ کو لکھنا چھوڑ دیا اور پھر دہلی بھی نہیں آیا، اور چوں کہ شاہ دہلی و شاہ اودھ کا قاصد بھی مرزا حیدر تھا، اور وہ شاہ اودھ کے ساتھ کلکتہ بھی نہیں گیا تھا، لہٰذا ان دونوں میں خط وکتابت نہیں ہوئی۔ میں نے کسی سپاہی سے نہیں سنا کہ خود بادشاہ اودھ یا ان کے کسی اہل خاندان نے انھیں بغاوت کی تحریک کی ہو، اودھ کی فوجوں کی نسبت اور کچھ میں کہہ نہیں سکتا، کیوں کہ وہ دہلی نہیں آئی تھیں۔

دوران بغاوت میں، میں نے سنا تھا کہ مرزا حیدر لکھنو میں ہے۔ مگر دیگر باثر روسا کی طرح وہ بھی گورنمنٹ برطانیہ کے زیر نگین بیلی گارد میں محصور ہے۔

دوران ہنگامہ میں بادشاہ دہلی اور مرزا حیدر میں کوئی خط وکتابت نہیں ہوئی، بلکہ ان کے تمام تعلقات اسی روز سے منقطع ہوگئے، جب کہ مرزا نے بادشاہ کا شیعہ ہونا لکھنو میں مشتہر کردیا۔ اب میں بیان کرتا ہوں کہ کن رجمنٹوں اور کن مقامات سے عرضیاں موصول ہوئیں۔

نیمچ: نیمچ کی فوج نے درخواست بادشاہ کی خدمت میں روانہ کی تھی کہ وہ آگرے پہنچ گئے ہیں اور شہر پر قبضہ کرلیا ہے، مگر انگریز قلعہ بند ہوگئے ہیں، جن کا محاصرہ کرلیا گیا ہے، آگے لکھا تھا کہ ان کے پاس بھاری توپیں نہیں ہیں لہٰذا وہ دہلی آکر توپیں لے جائیں گے اور قلعہ فتح کریں گے۔

اپنی درخواست میں ذکر کیا تھا کہ وہ انگریز افسروں کو مار کر آ گئے ہیں۔ یہ عرضی متھرا نے لکھی تھی اور غوث خان دہیرا سنگھ صوبہ داران کی طرف سے تحریر کی گئی تھی۔ درخواست مذکورہ ایک شتر سوار لایا تھا، جو بخت خان نے بادشاہ کے حضور میں پیش کی تھی اور نیچ فوج کی بہت تعریف بیان کی، بادشاہ نے ایک حکم جاری کرنے کی ہدایت کی کہ وہ دہلی آ جائیں اور پھر ایک حکم لکھا گیا۔

جھانسی: قاصد نے جھانسی افواج کی درخواست لا کر خواجہ سراؤں کو دی جنھوں نے بادشاہ کے سامنے پیش کی۔ لکھنے والوں نے درخواست کی تھی کہ انھوں نے اپنے انگریز افسروں کو مار ڈالا ہے اور اب دہلی آنا چاہتے ہیں۔ بادشاہ نے جواب میں یہ لکھ دینے کی ہدایت کی کہ وہ آ جائیں۔

دانا پور (دینا پور): غدر کے ڈھائی ماہ بعد دہلی فوج کے افسر کے ذریعے دینا پور کی ایک درخواست موصول ہوئی تھی، جس میں لکھا تھا کہ یا تو ہم لوگ روانہ دہلی ہو گئے یا ہونا چاہتے ہیں۔ بادشاہ نے حکم دیا کہ آ جانے کے لیے لکھ دیا جائے۔ میں یقیناً نہیں کہہ سکتا کہ واقعی فوجیں آئیں یا نہیں!

الہ آباد: دو سپاہی مسافروں کے بھیس میں آئے اور الہ آباد کی فوجوں کی درخواست پیش کی جو غدر کے ڈیڑھ ماہ بعد افسران والنٹیر رجمنٹ کے ذریعے بادشاہ کے حضور میں پہنچائی گئی۔ انھوں نے بادشاہ کی خیر خواہی کا اظہار کیا تھا اور لکھا تھا کہ وہ دلی آنا چاہتے ہیں، انھیں جواب بھیج دیا گیا کہ آ جائیں۔

علی گڑھ: غدر کے ڈھائی ماہ بعد دہلی کے ایک فوجی افسر کی معرفت ایک درخواست پیش ہوئی تھی، میں نہیں جانتا کہ وہ قاصد کے ذریعہ آئی تھی یا بذریعۂ ڈاک، بہرحال مضمون یہی تھا کہ عرضی دینے والے روانہ ہونے والے ہیں، انھیں جواب لکھ دیا گیا کہ وہ آ جائیں۔

متھرا: غدر کے بیس روز بعد قاصد متھرا سے ایک درخواست لایا تھا جو والنٹیر رجمنٹ کے افسروں نے بادشاہ کے سامنے پیش کی۔ لکھنے والوں نے اطلاع دی تھی کہ وہ دہلی روانہ ہو گئے ہیں اور اپنے ہمراہ ایک خزانہ لا رہے ہیں۔ حسب معمول جواب دیا گیا تھا۔ تھوڑے عرصے بعد فوجیں ایک لاکھ روپیہ لے کر حاضر ہوئیں۔

بلند شہر: مرزا مغل نے ایک سپاہی کو جو بلند شہر کا تھا بادشاہ کے حضور میں پیش کیا، وہ ایک درخواست ہمراہ لایا تھا، جس میں مذکور تھا کہ فوجیں تمام خزانہ جو ان کے قبضے میں ہے لے کر دہلی آ رہی ہیں۔ چناں چہ وہ اپنے ہمراہ تیس ہزار روپیہ لائی تھیں، مگر مجھے معلوم ہوا ہے کہ دہلی آتے

آتے آتے وہ پاؤ حصہ خود ہضم کر چکی تھیں۔

روڑکی: مجھے یقین ہے کہ ایک سپاہی مسافر کے بھیس میں آیا اور روڑکی افواج کی طرف سے ایک عرضی ہمراہ لایا گیا، جو غدر کے ڈیڑھ ماہ بعد بذریعۂ افسران نمبر ۵۴ رجمنٹ بادشاہ کے حضور میں پیش کی گئی، مضمون یہ تھا کہ سائلان دہلی روانہ ہونے کے خواہش مند ہیں اور دل و جان سے بادشاہ کی خدمت کرنی چاہتے ہیں، حسب دستور جواب دیا اور تقریباً ۳۰۰ خندق کھودنے والے مزدور قادر بخش کی زیر کمان آئے۔ مرزا خضر سلطان سے اور اس افسر سے بہت راہ و رسم تھی، اور بادشاہ پر بھی اس کا اچھا اثر تھا۔ وہ اکثر فوج کی روانگی کے وقت (مشورے کے لیے) طلب کیا جاتا تھا اور بخت خاں سے مل کر شہر کے ساہوکاروں سے روپیہ فراہم کرنے کا حکم حاصل کر چکا تھا۔

فرخ آباد: بخت خان نے دہلی آتے وقت فوج کا کچھ حصہ فرخ آباد میں چھوڑ دیا تھا۔ غدر کے دو ماہ بعد بادشاہ کو حقیقت حال سے اس نے مطلع کیا۔

ہانسی: دو سو سوار ہانسی سے درخواست لائے جس میں تحریر تھا کہ وہ لوگ بادشاہ کے لیے جنگ کر رہے ہیں، اور مذہب کی خاطر لڑنے کے لیے دہلی روانہ ہونے والے ہیں۔ مجھے خیال ہے کہ اغلباً گلاب شاہ کمانڈر افواج میرٹھ نے بغاوت کے چھ ہفتے بعد یہ درخواست پیش کی تھی۔

سرسہ: سرسہ سے تین درخواستیں موصول ہوئی تھیں۔ ایک منجانب گوری شنکر افسر تکیور رجمنٹ، دوسری ایک کیولرائی رسالدار کی طرف سے جس کا نام یاد نہیں رہا، تیسری شہزادہ محمد عظیم متعلق محکمہ کمسریٹ کی تھی، ان میں انھوں نے لکھا تھا کہ وہ شاہی خدمات کو اعلیٰ طریقے سے انجام دے چکے ہیں اور تمام زر وصول شدہ لے کر دہلی آرہے ہیں۔ غدر سے چھ ہفتہ بعد دو قاصدوں کے ذریعے یہ عرضیاں موصول ہوئی تھیں، حسب دستور جواب تحریر کر دیا گیا۔ تھوڑے روز بعد فوجیں تیس ہزار روپیہ دو سو بیل اور پچاس یا ساٹھ بھیڑیں لے کر دہلی وارد ہوئیں۔

کرنال: کرنال کی فوجوں کی کوئی درخواست موصول نہیں ہوئی۔

نصیر آباد: دو سپاہیوں نے ایک درخواست لاکر پیش کی، جس میں حسب معمول تحریر تھا کہ ہم دہلی آنا چاہتے ہیں۔ مرزا مغل نے بادشاہ کے حضور میں پیش کی، اور حسب دستور جواب تحریر کیا گیا۔ دو یا ڈھائی ہزار کے درمیان پیدل سپاہ توپوں کی معقول تعداد لے کر وارد ہوئی۔

ساگر و جبل پور: مجھے یقین ہے کہ غالباً ان مقامات سے درخواستیں آئی تھیں اور جواب روانہ کر دیے گئے تھے۔

فیروز پور (پنجاب): ایک سپاہی نے جو فقیر کے بھیس میں تھا، فیروز پور افواج کی ایک درخواست پہنچائی تھی۔ مرزا مغل نے وہ بادشاہ کے حضور میں گزرانی، قاصدوں سے کہا گیا کہ دوسرے روز حکم لکھا جائے گا، اس شخص نے مجھ سے کہا تھا کہ وہ فیروز پور سے آ رہا ہے اور فیروز پور کی فوجیں دہلی آنے کے لیے آمادہ ہیں اور انھوں نے گورنمنٹ برطانیہ سے بغاوت کر لی ہے۔ میں نے بچشم خود اس درخواست کو نہیں دیکھا، نہ مرزا مغل نے مجھے بتایا کہ فیروز پور سے کوئی درخواست موصول ہوئی ہے۔ غدر سے چھ ہفتے بعد اور بخت خان کے آنے کے قبل یہ درخواست آئی تھی۔

انبالہ: ایک سپاہی انبالہ چھاؤنی سے فقیر کے بھیس میں آیا تھا اور درخواست ہمراہ لایا تھا، لیکن میں یقینی نہیں بتا سکتا کہ آیا جواب تحریر کیا گیا تھا یا نہیں؟

پھلور: اگر مجھے ٹھیک یاد ہے تو شاید ایک افسر بیلی رجمنٹ نمبر ۲۰ پیدل رجمنٹ فوج پھلور کی طرف سے ایک درخواست لایا تھا، لیکن ان کے ہمراہ کوئی فوج نہیں تھی، ابتدائے ہنگامہ کے دو ماہ بعد عرضی آئی تھی اور سائلان نے تحریر کیا تھا کہ وہ پھلور میں بادشاہ کی خدمت انجام دینے کے بعد دہلی روانہ ہو جائیں گے۔ معمولی جواب روانہ کیا گیا تھا۔ بہت عرصے بعد دو سو آدمی دہلی پہنچے۔

جالندھر: مجھے خیال ہے کہ شاید مسافروں کے بھیس میں چند سپاہی دہلی آئے تھے اور جالندھر فوج ''درن ست رجمنٹ'' (نمبر ۱۱ دیسی پیدل) کی طرف سے درخواست پیش کی تھی۔ موافق معمول مضمون تھا اور ویسا ہی جواب دیا گیا۔

سیالکوٹ: کوئی سپاہی سیالکوٹ سے درخواست لے کر نہیں آیا۔ البتہ عذر سے دو مہینے سے بھی زیادہ عرصے بعد باغی رجمنٹ کے ایک افسر نے، ایک درخواست بادشاہ کے حضور میں پیش کی تھی، سائلوں نے دہلی آنے کا اشتیاق ظاہر کیا تھا۔ جواب روانہ کر دینے کا حکم ہوا، میں نے خیال نہیں کیا کہ آیا کوئی فوج آئی یا نہیں؟

جہلم: جہلم سے آغاز عذر کے تین ماہ بعد درخواست موصول ہوئی تھی اور میرا خیال ہے کہ قادر بخش کمانڈر رسٹر مینارڈ کی معرفت پیش کی گئی تھی۔ مضمون حسب معمول اور ویسا ہی جواب تھا۔

راولپنڈی: دو سپاہی برہمن سیاحوں کے بھیس میں راولپنڈی سے عرضی لائے تھے، جس میں دہلی آنے کی خواہش اور بادشاہ کی خدمت کرنے کی التجا تھی۔ عرضی مذکورہ افسران میپرٹ رجمنٹ نے بادشاہ کے حضور میں پیش کی، جواب موافق مضمون لکھایا گیا۔ بغاوت کے دو ماہ بعد یہ

درخواست موصول ہوئی تھی۔

لدھیانہ: میں نے سنا تھا کہ ایک درخواست لدھیانہ سے موصول ہوئی لیکن یہ نہیں جانتا کہ کس کے توسل سے آئی۔ لیکن میں سمجھتا ہوں کہ غالباً جواب بھی دے دیا گیا تھا۔ مجھے اس کا مضمون یاد نہیں رہا۔ البتہ اتنا یاد ہے کہ انھوں نے دہلی آنے کی خواہش کی تھی، اور غالباً عذر سے دو ماہ بعد درخواست موصول ہوئی تھی۔

ان مقامات کی افواج نے کوئی درخواست نہیں روانہ کی۔ بنارس، اعظم گڑھ، گورکھ پور، کان پور، میرٹھ، سہارن پور، بجنور، مرادآباد، فتح گڑھ، فتح پور، بریلی، بدایوں، آگرہ، شاہ جہان پور، غازی پور۔

نیز ان افواج کی طرف سے کوئی عرضی موصول نہیں ہوئی، امرتسر، ہوشیار پور، کانگڑہ، لاہور، اٹک، پشاور، ملتان، گوکیرہ، ڈیرہ اسمٰعیل خان، ڈیرہ غازی خان، شاہ پور، خان گڑھ، یالیا، نیز کلکتہ، بارک پور یا دیگر مشرقی چھاؤنیوں سے کوئی درخواست موصول نہیں ہوئی۔ بمبئی یا سندھ کی فوجوں کی کوئی درخواست نہیں آئی، لیکن باغیوں نے بادشاہ سے کہا تھا کہ انھیں بمبئی کی فوج نے لکھا ہے کہ وہ دہلی آرہی ہے۔ میں نے یہ ایک بار یا دو بار سنا تھا، لیکن میں یقینی نہیں کہہ سکتا کہ آیا کوئی درخواست آئی تھی یا نہیں؟

ایک درخواست علاقۂ گوالیار کے کسی مقام سے، جس کا نام میں بھول گیا ہوں، موصول ہوئی تھی، جس میں تحریر تھا کہ وہاں پچاس توپیں اور میگزین کا اتنا سامان ہے کہ پانچ سو گاڑیاں اس کے لے جانے کے لیے چاہییں، لیکن دریائے چنبل جو درمیان میں حائل تھا، طغیانی پر تھا۔ اس وجہ سے وہ عبور نہیں کر سکتے۔ عذر کے دو ماہ بعد درخواست مذکورہ موصول ہوئی تھی اور جواب لکھ دیا گیا تھا، کہ جب دریا کا زور کم ہو جائے، تب آئیں۔

دہلی کے باغیوں اور بیکانیر، جیسلمیر، جودھ پور، جے پور، جھجر، الور، کوٹہ بوندی کی فوجوں کے درمیان کوئی خط و کتابت نہیں ہوئی، نہ ان کی کوئی درخواست دہلی میں موصول ہوئی، بادشاہ کے پاس جھجر، بلب گڑھ اور فرخ نگر کے رؤساء کی اور ولی داد خان، والیِ مالاگڑھ، ضلع بلند شہر کی درخواستیں آئی تھیں، انھوں نے بادشاہ کی وفاداری کا اعتراف کیا تھا، اور حاضر دربار ہونے کے لیے معذرت چاہی تھی اور لکھا تھا کہ اگر وہ آجائیں تو تمام امور مملکت درہم برہم ہو جائیں گے۔ نواب جھجر نے تین سو سواروں کو اپنے خسر عبدالصمد خان کے زیر کمان روانہ کیا تھا۔ بلب گڈھ

سے پندرہ سو سوار آئے تھے، فرخ نگر سے کچھ فوج نہیں آئی، ولی داد خان نے فوج اور توپوں کے لیے لکھا تھا، مگر عرصے تک کچھ روانہ نہ کیا۔ بغاوت کے وقت فقط ولی داد خان دہلی میں موجود تھے۔ پھر انھیں دوآب کی حکومت دے دی گئی اور وہ دہلی سے چلے گئے۔

خان بہادر خان نے ایک درخواست اور ایک سفیر بخت خان کی معرفت روانہ کیا تھا، نیز ایک ہاتھی، ایک کوتل گھوڑا جس پر چاندی کا ساز و سامان تھا، اور ایک سو ایک طلائی اشرفیاں پیش کی تھیں۔ راؤ تلا رام نے کئی بار فوج طلب کی۔ راؤ مذکور نے چالیس ہزار روپیہ روانہ کیا جو بذریعۂ بخت خان خزانے میں داخل کر دیا گیا۔ باغیوں کی استدعا پر مندرجۂ ذیل رؤساء کو شقتے تحریر کیے گئے کہ فوج و سامان جنگ لے کر فی الفور چلے آئیں۔

جھجر، بلب گڈھ، فرخ نگر، خان بہادر خان بریلی، جے پور، الور، جودھ پور، بیکانیر، گوالیار، بیجا بائی اور جیسلمیر، بیجا بائی کو دو شقتے لکھے گئے، مگر انھوں نے کسی کا جواب نہیں دیا۔ بخت خان کی معرفت راجہ پٹیالہ کو ایک شقہ تحریر کیا گیا جس میں مذکور تھا ابو الاسلام کی سفارش سے مہاراجہ کا قصور بادشاہ نے معاف کر دیا ہے، اور انھیں مدد دینے اور بہ نفس نفیس آ کر انگریزوں سے جنگ کرنے کے لیے لکھا گیا۔ ایک شقہ رئیس جموں کے نام لکھ کر بخت خان کے حوالے کیا گیا کہ اسے روانہ کر دیں۔ انھوں نے پہلے ایک درخواست (جسے جعلی تصور کیا گیا تھا) روانہ کی تھی، جس کی نسبت کہا جاتا تھا کہ راجہ گلاب سنگھ نے لکھی ہے، اس میں راجہ نے لکھا تھا کہ وہ فوجیں لے کر دہلی روانہ ہوں گے، اور راہ میں مہاراجہ پٹیالہ کی سرکوبی کریں گے اور امیر دوست محمد خان راجہ جموں کے دوست ہیں۔ لہٰذا وہ بھی بادشاہ کی خدمات سے محروم نہ رہیں گے۔ رئیس اعظم جموں کو اپنی فوج لے کر دہلی میں آنے کا شقہ تحریر کیا گیا۔

رئیس جھجر، بلب گڑھ، فرخ نگر اور خان بہادر خان بریلوی کے جواب آئے۔ مگر مندرجۂ ذیل ریاستوں میں سے کوئی جواب نہیں آیا۔

جے پور، الور، جودھ پور، بیکانیر، گوالیار، جیسلمیر، پٹیالہ، جموں، ان رؤساء نے جواب نہیں بھیجے کیوں کہ وہ بادشاہ کے طرف دار نہ تھے، جودھ پور اور گوالیار کے راجگان نے برٹش گورنمنٹ کی وفاداری میں ثابت قدمی رکھائی، اور گو ان کی فوج باغی ہو گئی تھی، تاہم وہ خود برٹش گورنمنٹ کے سچے خیر خواہ بنے رہے۔ بھرت پور میں کوئی شقہ نہیں بھیجا گیا کیوں کہ دہلی کے سپاہیوں نے کہا کہ راجہ بالکل نابالغ ہے، اور وہاں کا کام گورنمنٹ برطانیہ خود کرتی ہے۔

اندور سے کوئی خط و کتابت نہیں ہوئی، نہ وہاں سے کوئی پیام آیا۔

باغی کنور سنگھ شاہ آباد کو کوئی خط نہیں لکھا گیا، نہ پیام بھیجا گیا۔

راجہ بنارس یا راجہ ریواں یا نواب باندا سے کوئی خط و کتابت نہیں ہوئی، نہ وہاں کا کوئی پیام آیا، نہ ان میں سے کوئی خود آیا۔

راجگان ناگ پور اور بادشاہ کے مابین کوئی خط و کتابت نہیں ہوئی۔

بہاول پور، کپورتھلہ، یا شملہ پہاڑ کے رؤساء کو بھی خطوط نہیں بھیجے گئے۔

راجہ نیپال کو کوئی خط نہیں لکھا گیا، نہ وہاں سے کوئی آیا۔ باغی فوجوں کے دہلی میں مجتمع ہو جانے کے بعد ان کی رائے کے موافق راجگان و والیان ریاست کو شقے لکھے گئے، اس وقت انھوں نے راجہ نیپال کو لکھنے کی خواہش ظاہر نہیں کی، اس لیے نہیں لکھا گیا۔

والیِ گجرات یا نظام دکن یا رؤسائے بلوچستان، امیر افغانستان و رؤسائے درۂ خیبر سے بادشاہ کی کوئی خط و کتابت نہیں ہوئی۔

پہلے تو فوجوں نے الزام لگایا کہ شاہی ملازموں نے ان رؤساء کو جنھوں نے کچھ جواب نہیں دیا تھا شقے نہیں لکھے، مگر جب خود انھوں نے لکھے اور کوئی جواب نہیں آیا تو وہ کہنے لگے کہ یہ سب غیر وفادار ہیں، اور گورنمنٹ برطانیہ کو نیست کر دینے کے بعد ان سے بھی سمجھیں گے۔ مخبروں نے فوج سے کہا کہ والیان ریاست نتیجے کا انتظار کر رہے ہیں۔ اور ابھی ملتے ہوئے خوف کھاتے ہیں۔

گوری شنکر مخبروں کا ممتاز افسر کہا کرتا تھا کہ دہلی کے سامنے والی پہاڑی کی انگریزی فوجیں کانٹے کی طرح کھٹک رہی ہیں اور جونہی یہ نکال دی جائیں تو سب تدابیر درست ہو جائیں گی سپاہی کہتے تھے کہ پہاڑی پر صرف دو انگریز رجمنٹیں ہیں، جن میں سے دو تین سو آدمی تو مارے جا چکے ہیں، جب باقی ماندہ بھی مارے جائیں گے تو برٹش فوج خود بخود پہاڑی چھوڑ دے گی۔

فوج کے کسی افسر نے نواب بہاول پور کو لکھنے کی خواہش نہیں کی اور نہ وہاں سے کوئی درخواست آئی۔ میرا ایسا خیال ہے کیوں کہ بادشاہ اور نواب مذکور کے درمیان پرانی عداوت تھی، وہ یہ کہ جب نواب بہاول خان سابق رئیس بہاول پور دہلی سے گزرے تو ان کے فرزند کو دیوان خاص میں داخل ہونے سے روک دیا گیا تھا اور کہا تھا کہ جب تک وہ ہتھیار کھول کر اور زیورات اتار کر نہ آئے، اندر آنے کی اجازت نہیں ہے۔

اودھ کے کسی حاکم کی درخواست موصول نہیں ہوئی۔ مولوی لیاقت علی پیشوائے مجاہدین کی

ایک درخواست الہ آباد سے موصول ہوئی تھی جس میں انھوں نے لکھا تھا کہ دہلی آ رہا ہوں، اور کچھ گارو طلب کیا تھا تا کہ سفر جلد طے ہو جائے، انھیں کوئی جواب روانہ نہیں کیا گیا، کیوں کہ وہ خود آ رہے تھے، لیکن جب وہ آئے تو بخت خان نے بادشاہ سے ملاقات کرائی اور وہ فی الفور لکھنؤ واپس چلے گئے۔ یہ بغاوت شروع ہونے کے تین ماہ بعد کا واقعہ ہے۔ نانا (مرہٹہ) کے پاس سے کوئی درخواست موصول نہیں ہوئی، لیکن آغاز عذر کے دو ماہ بعد ایک ایجنٹ نانا کی طرف سے آیا تھا، اور مرزا مغل نے اسے دربار میں حاضر کیا تھا۔ مرزا مغل کی استدعا پر نانا کو بھی شریک جنگ ہونے کی دعوت دی گئی تھی، ایجنٹ مذکور پھر واپس چلا گیا۔

کسی ساہوکار کی درخواست موصول نہیں ہوئی۔ البتہ فوج کے منشاء سے سیٹھ لکشمی چند کو ایک حکم لکھا گیا تھا کہ وہ ایک لاکھ روپیہ قرض دے، اور اپنا کوئی معتمد نیب خزانچی مقرر کرنے کو سیٹھ سے کہا گیا کہ جو مال گزار آمدنی اطراف و جوانب سے جمع ہوگی، اسے دے دی جائے گی، اور قرضے پر سود بھی ملے گا، مگر سیٹھ نے کوئی جواب نہیں دیا۔

جہاں تک میں واقف ہوں کسی گورنمنٹ ملازم کی کوئی درخواست نہیں آئی، لیکن یہ سنا تھا کہ ایک شخص مسلمان جسے گورنمنٹ نے اعلیٰ عہدے پر ممتاز کیا تھا عہدہ چھوڑ کر ولی داد خان سے مل گیا ہے مگر میں اس کا نام نہیں جانتا۔ مفتی صدرالدین صدر امین، کرم علی خان منصف، مولوی عباس علی صدر امین دہلی اور مرزا محمد علی بیگ تحصیلدار مہرولی کو بھی شقے لکھے گئے کہ گورنمنٹ کی ملازمت چھوڑ کر ہماری ملازمت کرو، مگر انھوں نے منظور نہ کیا۔ جب بخت خان نے علمائے دین کو جامع مسجد میں اکٹھا کر کے مجبور کیا کہ بیان کریں کہ گورنمنٹ برطانیہ سے جہاد کرنا چاہیے تو مجھ سے کہا گیا ہے کہ اس نے (بخت خان) نے مفتی صدرالدین کو مہر لگانے پر مجبور کیا تھا، مگر مولوی عباس علی بخت خان کے وہاں پہنچنے کے قبل ہی دہلی چھوڑ کر اپنے وطن چلے گئے تھے، آگرہ یا کسی اور حصے سے کوئی درخواست موصول نہیں ہوئی۔ البتہ مولوی فیض احمد جو صدر بورڈ کے آفس میں ملازم تھے بذات خود دہلی آئے اور بادشاہ کی ملازمت اختیار کی، انھیں عدالت کا حاکم مقرر کیا تھا۔ ایک شقہ نواب رام پور کو بھی لکھا گیا، مگر انھوں نے کوئی جواب نہیں دیا، بخت خان نے نواب رام پور کا ذکر کرتے ہوئے کہا کہ جب وہ (بخت خان) نواب صاحب کے ہاں گئے تھے تو انھوں نے ظاہر کیا تھا کہ وہ غیر جانبدار رہیں گے۔

نواب امین الدین خان، ضیاء الدین خان جاگیرداران لوہارو برادر نواب جھجر حسن علی خان،

نواب حمید خان کے نام شقے تحریر کیے گئے یہ سب دہلی میں رہتے تھی اور اجیت سنگھ چچا مہاراجہ پٹیالہ کو بھی تحریر کیا تھا، حسب ہدایت یہ سب دربار شاہی میں حاضر ہوئے، مگر شقوں کا جواب کسی نے نہ دیا، اور جب فوج و روپے کا مطالبہ کیا گیا تو ہر ایک نے کچھ نہ کچھ عذر پیش کیا، اور دیا کچھ نہیں، چناں چہ فوج نے انہیں لوٹنے کا قصد کیا تھا، اور ایک مرتبہ اپنے ارادے کو حد تکمیل تک بھی پہنچا دیا تھا۔ مرزا ابوبکر بادشاہ کے پوتے جو قواعددان کیولرائی کے افسر تھے، حمید علی خان کے مکان پر جا پڑے اور خوب لوٹ مار مچائی، بعد ازاں نواب کو گرفتار کر کے قلعے میں لے آئے۔ ضیاء الدین خان و امین الدین خان نے فوج کی سرپرستی پر آمادگی ظاہر کی۔ اس وجہ سے وہ لوٹ سے بچے رہے۔ ایک شقہ رئیس پٹودی کو بھیجا گیا، مگر کچھ جواب نہیں ملا۔ اب میں بیان کرتا ہوں کہ ملک کی عام آبادی میں کہاں کہاں سے درخواستیں موصول ہوئیں۔

ضلع گوڑ گانوہ: زمینداران گوڑ گانوہ نے بادشاہ کو ایک درخواست ارسال کی جس میں بدنظمی کا ذکر کر کے التجا کی تھی کہ کوئی افسر نظم و نسق کے لیے وہاں مقرر کر دیا جائے مولوی فیض الحق نے جو الور سے آئے تھے اپنے بھانجے (جس کا نام مجھے یاد نہیں رہا) کی سفارش کی کہ وہ وہاں مقرر کر دیا جائے۔ کیوں کہ گورنمنٹ برطانیہ کے دور حکومت میں وہ اسی ضلع میں مقرر تھا، چناں چہ یہ شخص ضلع دار (ڈپٹی کمشنر یا حاکم ضلع) مقرر کیا گیا، مگر میں آگاہ نہیں ہوں کہ آیا وہ گوڑ گانوہ گیا یا نہیں، البتہ اتنا معلوم ہے کہ زوال دہلی (دربارۂ انگریزی قبضہ) کے پندرہ یا بیس روز قبل یہ تقرر ہوا تھا۔ فیض الحق نے بھی کئی تحصیل داروں کو ضلع داری کی نیابت میں مقرر کیا تھا۔

ریواڑی: راؤ تلارام مستقل ناظم ریواڑی نے بخت خان کی معرفت اپنا ایک ہمبٹ اور ایک درخواست بادشاہ کے حضور میں ارسال کی تھی، تحریر کیا تھا کہ علاقے کا انتظام ہو رہا ہے، اور فصل خریف کی جو آمدنی ہوئی تھی، وہ سب مصارف فوج میں خرچ ہوگئی، اور اگر علاقہ مذکورہ اسے جاگیر میں دے دیا جائے تو وہ پینتالیس ہزار روپیہ کا نذرانہ پیش کش کرے گا۔ بغاوت کے تین ماہ بعد یہ لکھا تھا۔ اور زوال دہلی کے دس روز قبل پینتالیس ہزار روپیہ تلارام نے خزانہ شاہی میں داخل کرا دیا تھا۔

بادشاہ پور: زمینداران بادشاہ پور نے ایک تحصیل دار کے لیے درخواست کی۔ ضلع دار کو ایک تحصیل دار مقرر کرنے کی ہدایت کی تھی۔

ضلع دہلی: شہر پناہ کے باہر نہ کسی سے خط و کتابت ہوئی، نہ کوئی قابل ذکر بات وقوع میں آئی۔

ضلع روہتک: باشندگانِ رہتک نے کوئی درخواست نہیں بھیجی، مگر انھوں نے فوج کو رسد پہنچانے کا بندوبست کیا تھا۔

حصار: گارد حصار جیل اور افسران محکمۂ مالگزاری آمدنی نے بادشاہ کو عرضیاں بھیجی تھیں، لکھنے والوں کے نام یاد نہیں، انھوں نے بیان کیا تھا کہ وہ دہلی آنے کے لیے بے چین ہیں۔ غدر شروع ہونے کے دو ماہ بعد یہ خبریں موصول ہوئی تھیں۔

کرنال: اس ضلع سے کوئی درخواست موصول نہیں ہوئی۔

میرٹھ: اس ضلع سے بھی کوئی درخواست نہیں آئی۔

بلند شہر: ولی داد خان کا حال بیان کر دیا ہے، اور کسی دوسری جماعت سے بالکل خط و کتابت نہیں ہوئی۔

سہارن پور و مظفر نگر: ان اضلاع میں کہیں سے کوئی درخواست نہیں آئی۔

بجنور: اس ضلع کے زمینداروں کی ایک درخواست موصول ہوئی تھی، جس میں بادشاہ سے التجا کی گئی تھی کہ بندوبست کر دیا جائے، جواب میں ہدایت کی گئی کہ فوجیں ضلع مذکور کی طرف آ کر انتظام کر دیں گی۔

مراد آباد: نہ کسی جماعت نے کچھ لکھا، نہ وہاں کے کسی مفسد کی کوئی درخواست آئی۔

بریلی: خان بہادر خان کی ایک درخواست موصول ہوئی تھی، جنھیں بخت خان نے گورنر کر دیا تھا۔ انھوں نے ایک گھوڑا، ایک ہاتھی اور ایک سو ایک طلائی مہریں بادشاہ کے نذر کیں۔ میں ایجنٹ کا نام بھول گیا، جو بخت خان کے ذریعے دربار میں حاضر ہوا تھا ایک شقہ تحریر کیا گیا اور ہدایت کی گئی کہ مال گزاری کی وصول شدہ آمدنی میں سے اپنا خرچ نکال کر باقی روانہ کر دے۔

بدایوں: اس ضلع کے کسی حصے سے کوئی درخواست نہیں آئی۔

پیلی بھیت: یہاں سے بھی کوئی درخواست نہیں آئی۔

ضلع متھرا: برادر ڈنڈی خان جاگیر دار گڑھی ضلع متھرا نے اپنے بھتیجے کے ہاتھ ایک درخواست اپنی جاگیرات ضبط شدہ کو از سر نو عطا کیے جانے کے لیے روانہ کی تھی جنھیں گورنمنٹ برطانیہ نے ضبط کر لیا تھا۔ ابتدا بے عذر کے تین ماہ بعد یہ درخواست موصول ہوئی تھی۔ بخت خان نے اس پر سفارش کی اور قاصد کو فوج میں شامل کر کے گورنمنٹ کی فوجوں پر حملہ کر دیا، وہ شخص اس موقع پر زخمی ہوا اور ایک ہفتے کے بعد مر گیا (اس کا نام امراؤ بہادر تھا) بخت خان نے اس کے

متعلقین کے لیے حقوق دوامی منظور کرائے مگر ان تک منظوری پہنچ نہ سکی۔

ضلع آگرہ: اس ضلع سے کوئی پیام نہیں آیا۔ البتہ مولوی فیض احمد خود اس شہر سے آئے تھے، جیسا میں ذکر کر چکا ہوں۔ وزیر خان ڈاکٹر (سب اسسٹنٹ سرجن) بھی یہاں سے آئے تھے، بخت خان ان کے سفارشی تھے، اور انھیں آگرہ کا گورنر مقرر کرا دیا تھا جب بخت خان دہلی سے فرار ہوئے، تو وزیر خان بھی ان کے ہمراہ تھے۔

اضلاع علی گڑھ کان پور، فتح گڈھ: دہلی اور ان اضلاع کے درمیاں کوئی نامۂ و پیام نہیں ہوا۔

مین پوری: راجہ مین پوری کی ایک درخواست فوجیں مانگنے کی آئی تھی۔ مرزا مغل کو حکم ہوا کہ افسران فوج سے مشورہ کر کے کچھ فوج مین پوری روانہ کر دی جائے مگر دوسرے روز افسروں نے کہہ دیا کہ فوجیں یہاں سے جانا اس وقت پسند نہیں کرتیں جب تک کہ گورنمنٹ برطانیہ کو دہلی سے نہ نکال دیں۔ اسی قسم کا جواب راجہ مذکور کو بھیج دیا گیا، اس ضلع کی کسی اور جماعت کی کوئی درخواست نہیں آئی۔

اضلاع گورکھ پور و فتح پور مہوہ: میری یادداشت میں نہیں ہے کہ ان اضلاع یا ضلع کماؤں سے کوئی درخواست موصول ہوئی ہو۔

ضلع الٰہ آباد: میں کہہ آیا ہوں کہ مولوی لیاقت علی اس ضلع سے آئے تھے، اور مستقل گورنر مقرر ہوئے تھے، کسی اور جماعت کی کوئی درخواست نہیں آئی۔

راجہ باندہ متصل ریواں: ان رئیس کو کوئی شقہ نہیں بھیجا گیا تھا۔ نہ انھوں نے یہاں کوئی درخواست بھیجی۔

اضلاع اعظم گڈھ، شاہجہان پور، اٹاوہ، غازی پور، بنارس، گیا: بادشاہ اور ان اضلاع کے درمیان کوئی پیام رسانی نہیں ہوئی۔

بندیل کھنڈ، جبل پور، ساگر، مالوہ واملاک دکن: میری یادداشت میں نہیں ہے کہ ان اضلاع اور دہلی کے مابین کوئی خط وکتابت ہوئی ہو۔

نظام حیدرآباد (دکن)، کچھ، گجرات، مشرقی صوبجات، کلکتہ، بارک پور، مونگیر، دیناپور وغیرہ: نظام اور بادشاہ کے مابین کوئی خط وکتابت نہیں ہوئی۔ نہ گجرات سے خط وکتابت ہوئی۔

صوبجات مشرقی کی نسبت بھی مجھے خیال ہے کہ نہیں ہوئی۔

پٹنہ: نہ نواب پٹنہ نے یا اور کسی جماعت نے بادشاہ کو کچھ لکھا، نہ بادشاہ نے انھیں دہلی سے کوئی شقہ وغیرہ تحریر کیا۔

پنجاب: پنجاب میں کسی جماعت نے کوئی درخواست نہیں بھیجی۔ زمینداران باری دوآب ضلع کو نہ بادشاہ نے کچھ لکھا، نہ وہاں سے انھوں نے کوئی درخواست بھیجی۔ مجھے اس کی خبر نہیں کہ فوجیں اہل پنجاب کو اشتعال دلا رہی تھیں یا نہیں۔ اقوام بندیلہ اور بادشاہ میں کوئی پیام رسانی نہیں ہوئی، اخوند سوات اور بادشاہ میں کوئی پیام رسانی نہیں ہوئی۔ مگر دو آدمی بخت خان کے ذریعے دربار شاہی میں باریاب ہوئے تھے، اور کہا گیا تھا کہ یہ اخوند صاب کے بھیجے ہوئے ہیں، حسن عسکری انھیں بادشاہ کے سامنے لے گئے، یہ لوگ ولایتی (افغانی) تھے ایک نے جو معزز شخص معلوم ہوتا تھا اخوند صاحب کی طرف سے ایک تلوار بادشاہ کی نذر کی نیز ایک تحریر دی جس پر اخوند صاحب کی مہر تھی اور لکھا تھا کہ یہ قاصد اخوند صاحب کے خلیفہ ہیں۔ اس میں یہ بھی لکھا تھا کہ شہر میں مشتہر کر دیا جائے کہ اخوند صاحب سوات اور ان کے پیرو جہاد میں شامل ہونے کے لیے دہلی آ رہے ہیں۔ مگر دوسرے روز ایک سید صاحب نے جن کا نام میں نہیں جانتا، بادشاہ سے کہا یہ شخص اخوند صاحب کا بھیجا ہوا نہیں ہے، اور نہ یہ خط اخوند صاحب کا ہے، بلکہ اس نے جعل کیا ہے۔ بادشاہ نے بخت خان کو تحقیقات کرنے کا حکم دیا، مگر میں نہیں جانتا کہ بخت خان نے اس معاملے میں کیا کیا بہرحال اتنا مجھے یاد ہے کہ یہ شخص تین روز کے بعد دہلی سے چلا گیا۔

بادشاہ کی پالیسی:

فوج اور شہزادوں کو ایک مرتبہ حکم دیا گیا تھا کہ خاص معاملاتِ سلطنت میں وہ دخل نہ دیں، عدل وانصاف قاضیوں اور مفتیوں کا کام ہے، اور انھیں سے کرایا جائے گا۔ افسران افواج اور محکمہ مال گزاری بھی اس میں کچھ دخل نہ دیں، مگر کبھی اس حکم پر عمل درآمد نہیں کیا گیا، شہزادے ہمیشہ فوج کی حمایت سے دخل دیتے رہے، بادشاہ نے خود مختلف اضلاع میں تحصیلدار مقرر نہیں کیے تھے، بلکہ بخت خان نے ہوڈل، بلول، شاہدرے میں تحصیل دار اور گوڑ گانوہ میں ایک ضلع دار مقرر کیا تھا، مگر کوئی آمدنی جمع نہیں ہوئی، شہزادے بھی اپنی فوج کو آمدنی جمع کرنے کے لیے بھیجنے کا ارادہ کرتے تھے، مگر کبھی بھیجا نہیں، مولوی فیض احمد جو آگرے سے آئے تھے اور شہزادگان مرزا خضر سلطان و مرزا مغل عدالت کیا کرتے تھے، شہر میں ایک کوتوال (چیف پولیس آفیسر) اور کئی تھانیدار مقرر تھے، تھانیداروں کے نام مجھے یاد نہیں۔ سب سے پہلے معین الدین خان پسر نواب قدرت اللہ خان باشندۂ دہلی کوتوال مقرر ہوئے تھے، مگر لوگوں پر ظلم وزیادتی کرنے کی وجہ سے تھوڑے عرصے بعد برخاست کر دیے گئے۔ اس کے بعد خواجہ واجب الدین کی سفارش سے یہ عہدہ قاضی فیض اللہ کو دیا

گیا، جو باشندۂ دہلی تھا۔ پھر سید مبارک شاہ رام پوری کو عطا کیا گیا۔ مگر میں ان کو نہیں جانتا، شہزادوں کے علاوہ بخت خان کو بھی ان معاملات میں دخل تھا۔ بلکہ بادشاہ سے انھوں نے تمام تھانیداروں وکوتول کے نام احکام جاری کرائے تھے کہ بخت خان کے احکام کو قبول کریں۔

سپاہی کہا کرتے تھے کہ جب وہ مالک ملک ہو جائیں گے تو مختلف شہزادوں کو مختلف صوبجات دے دیں گے، امور مملکت کے انتظام کے لیے شہزادوں اور بخت خان نے متفرق لوگ مقرر کیے تھے۔ میرٹھ کے لیے کوئی گورنر مقرر نہیں ہوا، بلند شہر کی گورنری ولی داد خان کو عطا کی گئی۔ وزیر خان ڈاکٹر کو سند عطا ہوئی تھی کہ وہ اودھ کے گورنر مقرر کیے گئے۔ مگر وہ اپنے منصب پر کبھی دہلی سے گئے نہیں، علی گڑھ کے لیے کسی شخص کا تقرر نہیں ہوا۔ خان بہادر خان روہیل کھنڈ کے گورنر تھے، اور کوئی تقرر نہیں ہوا۔ کوئی شخص راجپوتانہ نہیں گیا۔ اور اگرچہ گورگانوہ میں ایک شخص مقرر ہوا تھا، مگر وہ کبھی اپنے منصب پر نہیں گیا۔

فوج کی قواعد دانی کی بابت میں کوئی مفصل حال نہیں بتا سکتا، بادشاہ سے اس معاملے میں کبھی مشورت نہیں کی گئی۔ مگر میں جانتا ہوں کہ گورنمنٹ کی فوجوں سے مقابلہ کرنے جو افواج جاتی تھیں، وہ علی العموم نیچ اور نصیر آباد کی ہوتی تھیں اور ایسے ہی دیگر رجمنٹیں جو حملہ کرنا جانتی تھیں مقابلے کو نکلتی تھیں، مرزا مغل کے مکان پر مختلف افسران مل کر فیصلہ کر لیتے تھے کہ آج کس کی باری ہے اور کل کس کی۔ سپاہی خود مختار تھے، بلا تمیز جس رجمنٹ میں چاہتے تھے رہتے تھے۔

گوری شنکر نے افسروں کو جو گورنمنٹ ملازمت میں ہوں جمع کر کے عہدے دینے کی اجازت حاصل کر لی تھی۔ مگر ایسا ہمیشہ جاری نہ رہا کیوں کہ جو جگہیں خالی ہوتیں ان پر کوئی مقرر نہیں ہوتا اور ہر ایک شخص اپنی پچھلی جگہ چاہتا تھا۔

میری دانست میں فوج میں بندوبست پورا پورا نہیں تھا۔ فوجوں نے بخت خان کو گورنر جنرل کا خطاب دینے کی مخالفت کی اور بادشاہ کو ایک درخواست دی تھی کہ ہم بخت خان کے زیر کمان رہنا نہیں چاہتے۔

انھوں نے یہ بھی لکھا تھا کہ بخت خان صرف توپخانے کا افسر ہے، اور گورنر جنرل کا عہدہ پانے کے لائق نہیں، نہ اس نے کوئی خزانہ لا کر دیا ہے اور نہ کوئی معرکتہ الآرا کارگزاری کی ہے۔ پھر لکھا تھا کہ مرزا مغل فرزند بادشاہ جنھیں پہلے فوجی امور میں پورا اختیار تھا، گورنر جنرل ہونے کے لائق ہیں، اور تمام افواج ان کے زیر کمان رہنا چاہتی ہیں۔ بادشاہ نے یہ درخواست بخت خان کو

بھیج دی اور استدعا کی کہ اس کا مناسب جواب تحریر کیا جاوے۔ انھوں نے جواب دیا کہ "فوج تین حصوں میں منقسم کی جائے۔ اول دہلی و میرٹھ کی رجمنٹوں کو ملا دیا جائے۔ دوم وہ فوجیں جو بخت خان کے ہمراہ نیچ اور سرسہ سے آئی ہیں، بدستور رہیں، اور تیسرا حصہ باقی تمام فوج کا ہو۔" بادشاہ نے مرزا مغل کو بلا کر سب سمجھایا۔

بخت خان کے عروج کا سبب یہ تھا کہ جب وہ پہلے آئے تو انھوں نے بادشاہ کو نصیحت کی کہ وہ اپنے فرزندوں کو زیادہ اختیارات نہ دیں، جو ارشاد ہوا کرے مجھ کو براہ راست حکم دیا جائے، تاکہ ہر ایک کام بادشاہ کی حسب مرضی ہو۔ واقعی بات ہے کہ بادشاہ اپنے فرزندوں کی عدول حکمی سے ناراض تھے اور بخت خان کی یہ خواہش ان کی مرضی کے موافق تھی۔ چناں چہ بخت خان اس روز سے برابر روز بروز بادشاہ کے الطاف خاص سے سرفراز ہوتے گئے۔

وہابیان:

دوران ہنگامہ میں ایک جماعت ٹونک سے وہابیوں کی آئی اور شکایت کہ کہ نواب نے کچھ مالی امداد نہیں کی۔ وہابی اور کئی مقامات سے بھی آئے تھے۔ بخت خان خود بھی وہابی تھے، اور محمد رفیع رسالدار، مولوی امام خان رسالدار، مولوی عبدالغفور، مولوی سرفراز علی بھی وہابی تھے، بخت خان نے سرفراز علی کو پیشوائے مجاہدین مقرر کیا تھا، اور وہی ان کی سرپرستی کرتے تھے۔

بخت خان کے آتے ہی وہابیوں کی کثیر تعداد آ کر شامل ہو گئی تھی۔ ان وہابیوں نے ایک اعلان چھپوا کر شائع کرایا تھا، جس میں تمام مسلمانوں کو جہاد کے لیے مسلح ہو کر آنے کی دعوت دی تھی اور لکھا تھا کہ اگر وہ نہ آئیں گے تو ان کے عیال و اطفال برباد ہو جائیں گے، یہ اعلان بہادر خان کے اعلان سے زیادہ فصیح نہیں تھا۔

وہابی ملک کے متعدد حصوں مثلاً جے پور، بھوپال، ہانسی، حصار سے آئے تھے، اور کچھ ولایتی بھی تھے۔ مگر میں جن مقامات سے کہ وہ آئے تھے، تفصیلاً نہ یاد رکھ سکا۔ البتہ مرزا مغل کے دفتر میں تفصیل موجود تھی۔

دہلی سے باہر ہندو بھی برٹش گورنمنٹ کے اتنے ہی مخالف تھے، جتنے مسلمان اور خاص دہلی میں بھی یہی حالت تھی۔ مگر جب بخت خان نے علماء و فقہا کو جمع کر کے جہاد کا فتویٰ لیا کہ تمام مسلمانوں کو انگریزوں سے جہاد کرنا چاہیے تو مسلمانوں میں حد سے زائد جوش و تعصب بھڑک اٹھا اور وہ گورنمنٹ سے لڑنے کے لیے تیار ہو گئے۔

بلند شہر اور علی گڑھ اور میرٹھ وغیرہ میں ہندو بھی برطانوی گورنمنٹ کے اتنے ہی خلاف تھے جتنے مسلمان تھے۔ (بہادر شاہ کا مقدمہ: خواجہ حسن نظامی)

فیصلۂ مقدمہ:

۲؍اپریل ۱۸۵۸ء: سر جان لارنس کے حکم سے بادشاہ کے جرائم کی تحقیقات کے لیے جو کمیشن ۲۵؍جنوری ۱۸۵۸ء کو مقرر ہوا تھا، جس میں بادشاہ کا وکیل غلام عباس اور میجر ایف۔ جی گورنمنٹ کا وکیل تھا۔ اس کمیشن کا اجلاس دیوان خاص میں ہوتا رہا تھا۔ ۹؍مارچ ۱۸۵۸ء تک اجلاس ہوئے۔ پھر عدالت نے اپنی تجویز پر غور کیا اور ۲؍اپریل ۱۸۵۸ء کو فیصلہ ہوا:

"جو شہادت عدالت کے روبرو ہے۔ اس کی رائے یہ ہے کہ قیدی محمد بہادر شاہ معزول شدہ بادشاہ ان کل وجز والزامات کا جو اس پر لگائے گئے تھے مجرم ہے۔"

۲۱؍اپریل ۱۸۵۸ء: انگریزی افواج مختلف مورچوں پر لڑتی اور ان کو سر کرتی نجیب آباد میں داخل ہوگئیں۔ ماڑے خان خبر پاتے ہی دارانگر سے مع اپنی افواج نگینہ آ گیا اور نگینہ کے باغوں میں مورچے قائم کیے۔ اور احمد اللہ خان کو بلانے کے لیے سوار بھیجے اور جتنی فوج متفرق ہوگئی تھی اور جتنے لوگ فرار ہوگئے تھے۔ سب کو بلا کر جمع کیا۔ چناں چہ ماڑے خان، قاضی عنایت علی، دلیل سنگھ گوجر، احمد اللہ خان، شفیع اللہ خان، حبیب اللہ خان، کلن خان اور نھتو خان، افضل خان کل اپنی جمعیت اور توپوں کو لے کر بمقام نگینہ جمع ہوگئے۔ مگر محمود خان نہیں آیا۔ بلکہ سیوہارہ میں جا کر مع ایک ضرب توپ اور کچھ سواروں کے مقیم رہا۔

نگینہ کی لڑائی ۲۱؍اپریل ۱۸۵۸ء کو ہوئی۔ مجاہدین پسپا ہو کر شہزادہ فیروز کے پاس مرادآباد چلے گئے۔

قاضی عنایت علی شہزادہ فیروز کی فوج میں شامل ہوئے یا نہیں اس کا حال "تاریخ سرکشی ضلع بجنور" سے معلوم نہیں ہوتا۔ البتہ زبانی روایتوں سے پتا چلا ہے کہ وہ شہزادوں کے ساتھ مل کر بھی کچھ عرصے تک انگریزوں کا مقابلہ کرتے رہے لیکن جب شہزادہ ہجرت کر کے مکۂ معظمہ چلا گیا تو قاضی عنایت علی بھی کسی اور جگہ جا کے روپوش ہوگئے۔

۷؍جون ۱۸۵۸ء: "مسٹر ڈرمنڈ" ممبر پارلیمنٹ تھے جنھوں نے ۱۸۵۷ء کے ہنگامے کے بعد اپنی ۷؍جون ۱۸۵۸ء کی اسپیچ کہا تھا:

"جب کہ ہمارا برتاؤ ہندوستانیوں کے ساتھ ایسا خراب ہے تو اس میں کیا تعجب کی بات کہ وہ ہم سے نفرت

کرتے ہیں۔ مجھے مسٹر فریزر سے معلوم ہوا ہے کہ ہندوستان میں ناراضی کا اتنا مواد موجود ہے کہ اس سے نصف درجن بغاوتیں ہو جائیں۔ اصل وجہ ناراضی کی یہ ہے کہ ہندوستان کو سول سروس کے نفع کے لیے چوسا جاتا ہے۔ پس اگر ہم اب ہندوستان کو انگریز عہدہ داروں کی لوٹ کا مقام سمجھتے ہیں۔ تو ہم نہ صرف اسے کھو بیٹھیں گے بلکہ اسی کے مستحق ہیں کہ اسے کھو دیں۔" (تاریخ میجر باسو، جلد ۵)

ہندوستان کے عہدہ دار:

انگلستان کے علاوہ خود ہندوستان کے انگریز عہدہ دار ہندوستانیوں کی حمایت صاف الفاظ میں کرتے تھے۔ جس کی صدہا مثالیں ہیں۔ ان میں سے ایک صاحب مسٹر جان سیلون ممبر اگزیکٹو کونسل مدراس تھے۔ انھوں نے انگریز عہدہ داروں کی نسبت لکھا کہ:

"انقلاب کی بعد بادشاہ کی جگہ کمشنر لیتا ہے۔ اور اس کے تین چار ساتھی ایک درجن بڑے دیسی عہدہ داروں کی جگہ لے لیتے ہیں۔ اسی کے ساتھ ہمارے چند سو گورے ہزاروں دیسی سپاہیوں کی جگہ لے لیتے ہیں جن کی پرورش ہر ہندوستانی سردار کرتا تھا۔ اس طرح وہ چھوٹا سا دربار غائب ہو جاتا ہے، تجارت گر جاتی ہے، سرمایہ ختم ہو جاتا ہے، لوگ غریب ہو جاتے ہیں اور انگریز خوش حال بنتا ہے۔ اور ایک اسپنج کی طرح گنگا کے کنارے سے دولت چوس کر دریائے ٹیمس کے کنارے لے جا کر نچوڑ دیتا ہے۔" (ہندوستان تاج برطانیہ کے عہدہ میں از میجر باسو، صفحہ ۲۲)

تقسیم ہند کی اولین تجویز:

۲۴ رجون ۱۸۵۸ء: ۱۸۵۷ء کی جنگ آزادی میں ہندوستانیوں کی شکست کے ایک سال بعد، مسٹر جان برائٹ نے جو گلیڈ اسٹون کی کابینہ کا رکن تھا ۲۴ رجون ۱۸۵۸ء کے ایک مباحثے میں حصہ لیتے ہوئے تجویز پیش کی:

"بجائے ایک، سلطنت شاہی کے درمیان پانچ ایسی پریذیڈنسیاں ہونی چاہییں جن کی حیثیت مساویانہ ہو اور جن کی اپنی کونسل، خزانہ، محصولات، انصاف، پولیس اور فوج ہو اور ان کے دارالحکومت کلکتہ، مدراس، بمبئی، آگرہ اور لاہور ہوں۔"

مسٹر جان برائٹ نے اس تجویز کے پیش کرنے سے پہلے کہا:

''۱۸۵۷ء کے نام نہاد غدر نے مزید تقویت پیدا کر دی ہے کہ ایسٹ انڈیا کمپنی کو اس امر کی اجازت نہیں ہونی چاہیے کہ وہ سیاسی اقتدار کو برقرار اور جاری رکھے۔ بورڈ آف کنٹرول کی عدم ساکھ اور بے آبروئی کے بارے میں ایسٹ انڈیا کمپنی نے جو کچھ کیا ہے، میں اس پر یقین کرتا ہوں۔ لیکن میں اس پر بضد ہوں کہ ہندوستان اب تاج برطانیہ کے اقتدار کے تحت آ جائے۔'' کتاب ''ورڈکٹ آن انڈیا'' مصنفہ بیورلی نکلسن ص ۳۳۶۔

۱۱ر دسمبر ۱۸۷۷ء کو مسٹر جان برائٹ نے مذکورہ بالا تجویز کو مانچسٹر کے ٹاؤن ہال میں انڈین ایسوسی ایشن کے ارکان سے خطاب کرتے ہوئے بھی دہرایا۔

ڈاکٹر عبدالسلام خورشید ''اپنی کتاب قائداعظم اور پاکستان'' کے ص ۳۰۰ پر ایک اور برطانوی سیاستدان ولفرڈ سکیوں بلنٹ کے حوالے سے لکھتے ہیں کہ ۱۸۸۳ء میں انھوں نے یہ تجویز پیش کی کہ:

''شمالی ہند میں مسلمانوں کی حکومت اور جنوبی ہند میں ہندو کی۔''

(کاروان احرار: جلد ۴، صفحہ ۳۴)

مستقبل کا سیاسی نظام --- برطانوی نقطۂ نظر:

۲۴ر جون ۱۸۵۸ء: مذکورہ تاریخ کو رائٹ آنریبل جان برائٹ ممبر پارلیمنٹ نے دارالعوام میں ہندوستان کے بارے میں برٹش گورنمنٹ کی پالیسی کے موضوع پر جو تقریر کی تھی، اس میں کہا تھا:

''میری تجویز یہ ہے کہ ایک سلطنت ہند اور اس کے لیے ایک گورنر جنرل مقرر کرنے کی بجائے ہم نہ پہلی صورت اختیار کریں نہ دوسری (دونوں سے دستکش ہو جائیں) بلکہ میں یہ تجویز پیش کرنا چاہتا ہوں کہ ہم ایک سلطنت قائم کرنے کی بجائے ہندوستان میں صوبے یا یونٹ قائم کریں......

میں چاہتا ہوں کہ ہندوستان میں کم از کم پانچ صوبے یا احاطے قائم کیے جائیں اور ان کی حکومتیں مرتبے اور مالی ذرائع کے اعتبار سے بالکل مساوی ہوں۔ میرا نقطۂ نظر ہے کہ ان یونٹوں کے دارالحکومت کلکتہ، مدراس، بمبئی، آگرہ، اور لاہور ہوں۔ میری خواہش ہے کہ ہر یونٹ کا محکمۂ مالیات، محکمۂ وصولی ٹیکس، محکمۂ انصاف، پولیس، امور رفاہ عامہ اور محکمۂ فوج ایک دوسرے سے علاحدہ ہو، گویا ہر علاقہ ایک بالکل خود مختار اسٹیٹ (ریاست) ہو، جس کا ہندوستان کے دوسرے

حصوں (صوبوں) سے کوئی تعلق نہ ہو۔ بلکہ ہر یونٹ کو اس ملک (انگلستان) کا صرف ایک تابع (DEPENDENCY) تسلیم کیا جائے۔ اگر آیندہ کبھی انگلستان کو اپنے اقتدار اعلیٰ سے...... دست بردار ہونا پڑے تو ہم ایک ملک کی بجائے ان خود مختار یونٹوں سے دست بردار ہوں، جن میں سے ہر علاقہ اپنی آزادی اور اپنی حکومت کو قائم رکھ سکے......" (روزگار فقیر: جلد اول، ص ۱۴۵ از فقیر سید وحید الدین، لاہور، ۱۹۸۸ء)

بہادر شاہ کی رنگون روانگی:

نومبر ۱۸۵۸ء: نومبر ۱۸۵۸ء میں بہادر شاہ رنگون روانہ کر دیے گئے ان کے ہمراہ جو حضرات تھے ان میں سے خاص یہ ہیں

(۱) نواب زینت محل (۲) نواب تاج محل

(۳) خیرا بائی (۴) ظہورا بائی

(۵) مرزا جوا بخت (۶) شاہزادہ مرزا شاہ عباس

(۷) مرزا قیصر پرستار (۸) نواب شاہ بادی بیوی جوان بخت

(۹) جواں بخت کے سالے، مرزا عبداللہ

(۱۰) جواں بخت کی ساس (۱۱) احمد بیگ آبدار

(۱۲) باسط علی، وغیرہ

کمال الدین حیدر لکھتے ہیں

"ایک دوست نے کان پور میں اس طور سے دیکھا کہ ایک پنیس میں بادشاہ گیرو الباس پہنے، ۲۵ گورے گرد اور دو پینتیس کرانچیاں زنانی مردانی۔"

رنگوں پہنچنے کے بعد گوروں کی حراست میں بندرگاہ سے صدر بازار کے ایک دو منزلہ بنگلے میں لایا گیا۔ اس بنگلے کے گرد گوروں کا پہرہ بہادر شاہ ظفر کی آخری زندگی تک رہا۔

واجد علی شاہ سے سرکاری وعدے اور ان کا ایفا:

۱۳؍ اکتوبر ۱۸۵۸ء: ۴؍ فروری ۱۸۵۶ء کو نواب واجد علی شاہ کو معزول کیا گیا تھا تو ان سے کچھ وعدے کیے گئے تھے۔ یہ وعدے کیا تھے اور انھیں کس طرح ایفا کیا گیا تھا۔ اس کا اندازہ لارڈ اسٹینلی کی اس مراسلے سے ہوتا ہے جو انھوں نے ۱۳؍ اکتوبر ۱۸۵۸ء کو لکھا تھا:

وہ وعدے یہ تھے کہ نواب صاحب کی معزولی کے وقت تعلقداران اودھ، شاہی خاندان اور وابستگان در دولت کو یہ امید دلائی گئی تھی کہ ان کے حقوق محفوظ رکھے جائیں گے مگر ہوا یہ کہ برخلاف سرکاری اعلانات کے مالگزاری میں اضافہ شروع کیا گیا اور بجائے تعلقداروں کے براہ راست آراضی کے قابضوں سے بندوبست کی کارروائی کی جانے لگی جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ بہت سے تعلقداروں کی آمدنیاں آدھی کے قریب رہ گئیں۔

شاہی خاندان کے لوگوں کے ساتھ جس قسم کا برتاؤ کیا گیا تھا اس کا پتہ لارڈ اسٹینلی کے مراسلہ مورخہ ۱۳/اکتوبر ۱۸۵۸ء سے چلتا ہے کہ جس میں تحریر تھا۔

> ''شاہی خاندان کے لوگوں اور وظیفہ خواروں کے ساتھ بے تمیزی کا برتاؤ کیا گیا اور وظائف روک دیے جانے سے ان کا حال پتلا ہو گیا۔ سابق ملازموں اور بااثر لوگوں کو خاص طور پر ملازمتوں اور عہدوں سے محروم کیا گیا، جن کے وہ متوقع تھے۔''
>
> (فوجی بغاوت از لیفٹنٹ جنرل میک'' بحوالہ ''مسلمانوں کا روشن مستقبل، ص ۸۴)

اقتدار کی منتقلی اور اعلان معافی:

یکم نومبر ۱۸۵۸ء: ۱۸۵۷ء کے انقلاب میں جو وحشیانہ مظالم اور جس درندگی کا مظاہرہ ایسٹ انڈیا کمپنی کے سخت دل اور وحشی انگریزوں نے ہندوستانیوں اور بالخصوص مسلمانوں کے ساتھ جاری کیا تھا اس سے برطانوی حکومت بھی متاثر ہونے سے باز نہ رہ سکی۔ وہاں کی ذمہ دار جماعتوں اور سمجھ دار حکام کو ضرور معلوم ہوا کہ ہندوستان کی حکومت کی باگ ان تجارت پیشہ لوگوں اور خودغرض حریصوں کے ہاتھ سے نکالنی ضروری ہے۔ ورنہ تمام انگلش قوم اور برطانوی تاج دنیا بھر میں بدنام ہو جائیں گے اور تمدن و تہذیب کا دعویٰ نیست و نابود ہو جائے گا۔ نیز ملک ہندوستان قبضہ سے نکل جائے گا۔ کلاؤ اور ہیسٹنگز وغیرہ کی سیاہ کاریوں کا بھانڈا کوڑیوں میں پھوٹ چکا تھا جو کہ برٹش قوم کے لیے انتہائی سیاہ دھبا تھا۔ انھیں امور کی بنا پر امریکہ قریبی زمانے میں آزاد ہو چکا تھا۔ اس لیے ضروری معلوم ہوا کہ تاج برطانیہ کمپنی سے ہندوستانیوں کی حکومت اپنے ہاتھ میں لے لے اور وہاں ملکہ وکٹوریہ کی بادشاہت کا اعلان کر دیا جائے۔ نیز ہندوستان کو اطمینان بخش امور کا یقین دلایا جائے تاکہ آئندہ اس قسم کی بغاوتوں اور بے چینیوں کا احتمال باقی نہ رہے

(۱)۔ چناں چہ ۱۸۵۸ء میں کوئن وکٹوریہ کا مشہور اعلان نافذ کیا گیا۔ مجرمین اور مشتبہین کے معاف کر دینے کا عام اعلان ہوا اور حسب قابلیت بغیر تفرقۂ مذہب و نسل و رنگت تمام عہدہ ہائے مُلکیہ سب کو دینے کا اور سب کے ساتھ برابر برتاؤ کرنے کا وعدہ کیا گیا۔ آیندہ کسی صوبے یا ریاست پر حملہ کرنے اور اپنے مقبوضہ ملک کو بڑھانے کی مخالفت کی گئی اور اطمینان دلایا گیا کہ ہم کسی قطعۂ زمین کو اپنی ملکیت میں شامل نہ کریں گے نیز وعدہ کیا گیا کہ ہم ہندوستان کو ہمیشہ اپنا مقبوضہ ملک نہیں رکھنا چاہتے۔ جب بھی ہندوستانی باشندے حکومت کے قابل ہو جائیں گے تو ہم وہاں سے چلے آئیں گے۔ وغیرہ وغیرہ۔

اعلان مذکور کے الفاظ حسب ذیل ہیں:

''اعلان ملکہ معظمہ بنام والیان و سرداران و جمہور انام ہند'' جناب ملکۂ معظمہ وکٹوریہ بفضل خدا خدیو مملکت گریٹ برٹن و آئر لینڈ و آبادی ہائے مضافات واقع یورپ و ایشیا و افریقہ و امریکہ و آسٹریلیا کی طرف سے خاص و عام کی اطلاع کے لیے حسب تفصیل ذیل مشتہر کیا جاتا ہے:

(۱) ڈائریکٹران کمپنی نے عذر کیا کہ کمپنی کا بہت بڑا سرمایہ ہندوستان میں لگا ہوا ہے تو قرار پایا کہ سرمایہ کا حساب کر کے کمپنی کو دے دیا جائے اور ہندوستان کو اس کے معاوضہ میں خرید لیا جائے۔ حساب کیا گیا تو ثابت ہوا کہ پونے چار کروڑ پونڈ کمپنی کا سرمایہ ہندوستان میں لگا ہوا ہے، اس کے دینے کا وعدہ کیا گیا۔
اور انگلستان سے قرض لے کر کمپنی کو ادا کر دیا گیا۔ جس کو بطور قرض ہندوستان ہی کے کندھے پر رکھا گیا اور سود در سود کی صورت میں وصول کیا جانے لگا۔ جب کہ تاج برطانیہ نے خریدا تھا تو ضروری تھا کہ شہنشاہی خزانہ سے روپیہ ادا کیا جاتا جیسا کہ ٹانگیر یا وغیرہ میں عملدرآمد کیا گیا تھا۔ مگر ہندوستان کی بدقسمتی یہاں بھی رنگ لائے بغیر نہ رہ سکی۔ صاحب ''علم معیشت'' لکھتا ہے:
''فرد کرنے کے کل مصارف ہندوستان سے وصول کرنے قرار پائے اور یہ کل رقم بطور قرض عامہ انگلستان میں لے کر ہندوستان کے نام لکھ دی گئی اور اس روز سے آج کے دن تک ایک رقم کثیر بطور سود ہندوستان سے انگلستان وصول کر رہا ہے۔ ذرا خیال تو کرو کہ گذشتہ نصف صدی میں ہندوستان کتنی رقم بطور سود انگلستان کو ادا کر چکا ہوگا۔'' صفحہ ۶۱۶۔
دوسری جگہ لکھتا ہے:
''جب ۱۸۵۸ء میں اس کے (کمپنی کے) مقبوضات سرکار برطانیہ نے اپنے تحت میں لئے تو اس کو معاوضہ کیا دیا۔ اور کیوں کر دیا؟ کمپنی کا ہندوستان میں جس قدر روپیہ صرف ہوا تھا وہ سب قرض لے کر ادا کر دیا گیا۔ اور یہ قرض ہندوستان کے نام لکھا گیا۔ جس پر اب تک ہندوستانی محاصل میں سے منجانب ہندوستان سود دیا جا رہا ہے۔ گویا سرکار برطانیہ نے انگریزی کمپنی سے سلطنت ہند خریدی اور زر قیمت ہندوستانیوں نے ادا کیا۔ ایسی خرید و فروخت کی مثال تاریخ عالم میں ملنا دشوار ہے۔
ابھی حال میں یعنی ۱۹۰۰ء میں اسی طرح ایک انگریزی کمپنی سے سرکار برطانیہ نے ٹانگیر یا خریدا مگر قیمت خود اپنی جیب سے ادا کی۔ ہندوستان کی طرح اس کا بار ٹانگیر یا پر نہیں پڑا۔ جنوبی افریقہ میں جو برطانوی مقبوضات حاصل کیے گئے تو وہاں بھی آخر الذکر اصول برتا گیا۔ لیکن ہندوستان کی تو تمام دنیا سے بات ہی نرالی ہے۔ جو کچھ بھی ہو کم ہے۔'' صفحہ ۵۷۸۔

(۱) ''واضح ہو کہ بوجہ کاملہ ہمارے اس ارادہ کا کہ ہم نے بصلاح واتفاق راے امراے ملی وملکی ومختاران عام حاضرین جلسئہ پارلیمنٹ اس ارادے کو مصمم کرلیا ہے کہ ممالک ہند کا انتظام جس کا انصرام آنریبل ایسٹ انڈیا کمپنی کو آج تک امانتاً مفوض تھا اپنے اہتمام میں لیویں۔ پس اس قرطاس کی رو سے ہم اطلاع دیتے ہیں اور اعلان کرتے ہیں کہ بصلاح واتفاق راے مذکورہ بالا کے ہم نے انتظام ملک مذکور کا اپنے اہتمام میں لیا اور اس قرطاس کی رو سے اپنی تمام رعایا کو جو قلمرو مذکور میں موجود ہیں تاکید فرماتے ہیں کہ ہماری اور ہمارے وارثوں اور جانشینوں کی وفاداری اور اطاعت کریں اور جس کسی کو ہم اپنے نام اور اپنی طرف سے ملک کے انتظام کے لیے وقت آیندہ مقرر کرنا مناسب سمجھیں اس کی فرمانبرداری کیا کریں اور جو فرزند ارجمند مقرر ومعتمد علیہ مشیر خاص نواب چارلس جان وائی کاونٹ کیننگ صاحب کی وفاداری قابلیت اور فہم وفراست کی نسبت ہم کو اطمینان اور خاطر جمعی کلی حاصل ہے، اس لیے ہم نے صاحب موصوف یعنی وائی کاونٹ کیننگ صاحب کو واسطے کرنے انتظام ممالک مذکور کے ہماری طرف اور ہمارے نام سے برعایت ہمارے احکام اور ان آئین کے جو اس کے پاس معرفت ہمارے وزیر اعظم کے بھیجے جائیں، قائم مقام اول اور ممالک مذکور کا گورنر جنرل مقرر کیا اور جو لوگ بالفعل کسی عہدے پر کیا ملکی و کیا فوجی سرکار آنریبل ایسٹ انڈیا کمپنی کے مامور ہیں ان کو اس قرطاس کی رو سے اپنے اپنے عہدہ پر بحال اور قائم فرماتے ہیں لیکن وہ ہماری مرضی آیندہ کے مطیع رہیں اور سب آئین وقوانین کی اطاعت کرتے رہیں۔ جو آیندہ نافذ کیے جاویں گے۔

(۲) اور والیان ہند کو اطلاع دی جاتی ہے کہ جس جس عہد وپیمان کو خود آنریبل ایسٹ انڈیا کمپنی نے کیا یا اس کی اجازت سے منعقد ہوا ان سب کو ہم پذیرا اور قبول کرتے ہیں اور ان کا ایفا بکمال احتیاط ہوتا رہے گا۔ اور چشم داشت ہے کہ ان والیوں کے طرف سے بھی اسی طرح تعمیل ہوتی رہے گی۔

(۳) جو ملک بالفعل ہمارے قبضہ میں ہے، اسے زیادہ کرنا نہیں چاہتے اور جب ہم کو یہ گوارا نہیں ہے کہ کوئی شخص ہماری مملکت یا حقوق میں دست اندازی کرے تو ہم بھی پیش قدمی کی اپنی طرف سے بہ نسبت ملکیت یا حقوق اوروں کے اجازت نہ دیں گے اور والیان ہند کے حقوق ومنزلت اور عزت مثل اپنے حقوق ومنزلت اور عزت کے عزیز سمجھیں گے۔

(۴) اور ہم کو آرزو ہے کہ والیان ہند اور ہماری رعایا کو بھی وہ سعادت اور حسن اخلاق کی ترقی جو ملک میں صلح اور حسن انتظام سے ہوتی ہے۔ جو لوازم بہ نسبت اپنی دوسری رعایا کے ہم پر واجب ہیں وہی لوازم بہ نسبت اپنی رعایاے ہند کے ہم اپنے ذمہ لازم بنائیں گے اور بفضل خدا وفاداری اور راستی کے ساتھ ہم لوازم مذکور کا لحاظ کرتے رہیں گے۔

(۵) اگرچہ ہم کو مذہب عیسوی کے صدق کی نسبت یقین کلی حاصل ہے اور جو تسلی خاطر اس سے ہوتی ہے اس کا بکمال شکرگزاری اعتراف ہے تو بھی ہم کو نہ یہ منصب نہ یہ آرزو ہے کہ کسی نوعیت سے خواہ مخواہ اپنے عقیدے کو تسلیم کرائیں بلکہ یہ حکم ہمارا اور شاہانہ مرضی ہے کہ نہ کسی اہل مذہب کی بوجہ ان کے مذہب کے تائید کی جائے اور نہ کسی کو بوجہ اس کے اعتقادات کے تکلیف دی جائے۔ بلکہ سب رعیت کی موجب قانون کے بغیر طرف داری حفاظت ہوتی رہے اور جو لوگ ہمارے فرمان پذیر انتظام ملک ہند کے لیے مامور ہیں ان کو بکمال تاکید ارشاد

فرماتے ہیں کہ ہمارے کسی رعیت کے اعتقاد اور عبادت مذہبی کی نسبت دست اندازی والا ہمارا نہایت موجب غضب ہوگا۔

(۶) اور یہ بھی ہمارا حکم ہے کہ جہاں تک ممکن ہو ہماری سب رعیت کو گو کسی قوم اور مذہب کی ہو بلا تعرض و طرفداری کے ہماری ملازمت میں اور عہدوں پر جن کو وے اپنی علمیت اور قابلیت اور دیانت سے انجام دے سکتے ہوں، مقرر کرتے ہیں۔

(۷) اس کا ہم کو بخوبی علم ہے کہ اہل ہند اس آراضی کو جو ان کے بزرگوں سے انھیں وراثتاً پہنچی ہے، بہت عزیز رکھتے ہیں۔ اس لیے ہم کو بھی ان کا بڑا لحاظ ہے بلکہ چاہتے ہیں کہ یہ حقوق ان کے جو آراضی سے متعلق ہیں بشرط ادا کرنے مطالبۂ سرکاری کے محفوظ رہیں اور ہمارا حکم ہے کہ بوقت تجویز و نفاذ قانون کے عموماً حقوق قدیمی اور ملک کے رسم و رواج پر لحاظ کامل ہوتا رہے۔

(۸) یہ اجتماع اس حال کے بعض مفسدین نے جھوٹھ موٹھ افواہیں اڑا کر اپنے ہم وطنوں کو ورغلا کر ان سے بغاوت فاش کرائی اور ملک ہند پر ایک بلا نازل کرائی۔ ہم کو نہایت افسوس ہوا اور ہمارے اقتدار کی کیفیت تو لوگوں کو فرو کرنے فساد باغیوں میں بیچ میدان کارزار کے معلوم ہوگئی ہے۔ لیکن اب ہمارا یہ منشاء ہے کہ ان لوگوں کو عفو جرائم کر کے جو اس طرح دھوکا کھا گئے ہیں اور پھر اطاعت میں آنا چاہتے ہیں اپنا اظہار ترحم کریں اس نیت سے کہ آیندہ خونریزی نہ ہونے پائے اور ہمارے ممالک ہند میں جلدی سے امن و امان ہو جائے۔ قائم مقام اور گورنر جنرل بہادر ایک علاقے میں کہ جہاں لوگوں کے ایام غدر کردہ، میں جرم مخالف سرکار کیے تھے، ان میں سے اکثروں کو مترصد عفو قصورات کا بشرائط بخشش کر دیا ہے اور جن کی تقاصیر نے ان کو احاطۂ ترحم سے باہر کر دیا ہے ان کی سزاؤں کی بھی تشریح کر دی ہے۔ چناں چہ ہم اپنے قائم مقام اور گورنر جنرل کے اس عمل مذکور کو پذیرا اور قبول کرتے ہیں۔ علاوہ اس کے حسب ذیل اعلان فرماتے ہیں یعنی

سوائے ان لوگوں کے جن کی نسبت ثابت ہوا یا اب ثابت ہو کہ وہ رعیت سرکار انگریزی کے قتل میں بذات خود شریک ہوئے اور باقی جملہ مجرموں کی نسبت اظہار ترحم کیا جائے گا۔ مگر بہ نسبت شرکائے قتل کے انصاف مقتضی اس بات کا ہے کہ ان پر ترحم نہ ہو، جن لوگوں نے جان بوجھ کر قاتلوں کو پناہ دی ہو یا جو لوگ باغیوں کے سردار ہوئے ہوں یا ترغیب دیتے ہوں، ان کی نسبت صرف یہی وعدہ ہو سکتا ہے کہ ان کی جان بخشی ہوگی۔ لیکن ایسے لوگوں کی تجویز سزا میں ان سب احوال پر جن کے اعتبار سے وہ اپنی اطاعت سے پھر گئے کامل غور کیا جائے گا۔ اور ان لوگوں کی نسبت جو بے سوچے سمجھے مفسدوں کی جھوٹی باتوں میں آکر مجرم ہو گئے، بڑی رعایت کی جاوے گی۔ باقی اور سب اشخاص سے جو سرکار کے بالمقابل ہتھیار بند ہیں بموجب اس قرطاس کے وعدہ ہوتا ہے کہ اگر وہ اپنے اپنے گھر چلے جاویں اور اپنے اپنے پیشہ صلح و سداد میں مصروف ہوں تو ان کے قصورات جو ہماری نسبت اور ہماری سلطنت و منزلت کی نسبت سرزد ہوئے بلا شرط معاف اور درگزر اور فراموش کر دیے جائیں گے۔ ہماری یہ مرضی شاہانہ ہے کہ رحم و عفو کی شرائط مذکور ان سب شخصوں کے متعلق ہوں جو قبل از یکم جنوری ۱۸۵۹ء کی شرائط کی تعمیل کریں۔

(۹) ہماری بدل و جان یہ تمنا ہے کہ جب ملک ہند میں امن ہو جائے تو وہ فلاح و مصالح کی ترقی کریں اور فائدہ خلائق کے لیے کام مثل تیاری سڑک و نہر وغیرہ جاری کریں۔ اور ملک کا ایسا انتظام کیا جائے کہ جس سے ہماری ساری رعایا باشندہ ملک مذکور کو فائدہ ہو کیوں کہ ان کی فارغ البالی ہمارے لیے موجب اقتدار اور ان کی فراغت ہمارے لیے باعث بے خطری اور ان کی شکر گزاری ہمارے لیے پورا صلہ ہے اور خدائے قادر ہم کو اور ہمارے فرمانبرداران ماتحت کو ایسی توفیق دے کہ یہ ہماری مرادیں واسطے فائدہ رسانی خلائق کے اچھی طرح حسن اختتام کو پہنچیں۔'' (یکم نومبر ۱۸۵۸ء کے گزٹ میں یہ اعلان شائع ہوا(۱)۔ (نقش حیات: حصہ دوم، صفحہ ۴۷-۷۰)

---

(۱) مسٹر گلیڈ اسٹون نے ہاؤس آف کامنس میں یکم مئی ۱۸۹۳ء میں تقریر کرتے ہوئے کہا:

''اور نہ صرف مصر بلکہ ہندوستان کے متعلق بھی میں یہ کہوں گا کہ کسی ملک پر دائمی قبضہ کر لینا برٹش گورنمنٹ کی قدیم روایات کے خلاف ہے۔ ہندوستانیوں کو بھی یہی امید رکھنا چاہیے کہ ہم ہندوستان کا قبضہ اسی وقت تک اپنے ہاتھ میں رکھیں گے کہ جب تک وہاں کی ضروریات اور ملکی ترقی و خوشحالی اس درجہ پر نہ پہنچ جائے کہ جو ایک مہذب ملک کے لیے ضروری ہے''

(رسالہ ''سرزمین فراعنہ میں'' ان دی لینڈ آف دی فیروز مصنفہ دوست محمد ایڈیٹر امریکن ٹائمز لندن)

سر ایلڈن گورسٹ نے ۲۷ مارچ ۱۹۰۹ء کو ہاؤس آف کامنس میں حسب ذیل تقریر کی:

''ہندوستان کی نیشنل کانگریس کے ممبروں کو کوئن وکٹوریہ کی وہ مشہور تقریر نہیں بھولنا چاہیے جس میں صاف صاف یہ اعلان کیا گیا تھا کہ ہم اس ملک پر زبردستی کا قبضہ نہیں رکھنا چاہتے۔ ہم وہاں کی خوشحالی، ان کی آزادی اور امن وامان کے خواہاں ہیں اور اگر ہم کو یہ یقین دلایا جائے کہ تعلیم نے اس ملک میں ایسی ترقی کر لی ہے کہ وہاں والوں کو اپنے معاملات میں ہماری سرپرستی کی ضرورت نہیں ہے تو ہم آج اس کا اعلان کرنے کے لیے تیار ہیں کہ ہندوستان کو بھی مثل دیگر برطانوی مقبوضات کے خود مختار بنا دیا جائے گا'' (رسالہ مذکورہ بالا)

۱۸۷۵ء

حالات مابعد:

۱۸۵۷ء کی جنگ آزادی میں ہندوستانی مسلمان ناکام رہے اور انگریزوں کو ان سے انتقام لینے کا پورا موقع مل گیا۔ انگریزوں کی بربریت کا اندازہ اس ایک واقعہ سے ہوگا کہ صرف دہلی میں انھوں نے ۲۷ ہزار مسلمانوں کو پھانسی پر لٹکایا اور باغیوں کی جائیداد اور مکانوں کی ضبطی کے علادہ بہت سے محلوں پر ہل چلوا دیا گیا۔ ایک زمانے تک جامع مسجد دہلی انگریزی فوج کا پکٹ بنی رہی۔ جو بچ گئے وہ فوج اور پولیس کی ملازمت سے محروم ہو گئے۔ دوسری جانب ولایتی کارخانوں کے مال کی درآمد نے مسلمان دستکاروں اور محنت کشوں کو بے روزگاری کی لعنت میں مبتلا کر دیا۔

امرا اور جاگیری عناصر کی رہنمائی میں مسلم عوام کا جہاد آزادی میں یہ پہلا تجربہ تھا۔ ضرورت تھی کہ اس سامراجی دور کے تقاضوں کو سمجھ کر ہم ایک وسیع سامراج دشمن محاذ قائم کرتے مگر ہمارے حکمران اور اہل علم کی ساری روایتیں جاگیری نظام کی بوسیدگی سے وابستہ تھیں۔ چناں چہ مسلم عوام کی ساری قربانیاں رایگاں گئیں۔ بچی کچی البتہ ایک ترک موالات کی روایت علمائے دیوبند کے ورثے میں آئی اور بانی مدرسۃ العلوم دیوبند حضرت مولانا محمد قاسم (نانوتوی) نے اپنی وصیت میں لکھ دیا کہ یہ درس گاہ حکومت وقت کی کوئی اعانت قبول نہیں کرے گی۔

(ہندوستانی مسلم سیاست، : ڈاکٹر محمد اشرف، دہلی، ۱۹۶۳ء، ص ۱۷-۱۶)

برٹش دور حکومت:

ایک دور آیا کہ مسلمانوں کی حکومت ختم ہوئی۔ سات سمندر پار کر کے ایک قوم یہاں پہنچی۔ اس نے دھوکا، مکر، فریب اور پھر جبر، تشدد اور ہولناک مظالم سے مسلمانوں کی حکومت ختم کی۔ اپنی قاہر اور جابر سلطنت قائم کی۔ اس کے بے پناہ مظالم کا تذکرہ بھی لرزہ خیز ہے۔ مثلاً مسٹر ایڈورڈ ٹامسن نے انگریزوں کے بیانات کے حوالے سے لکھا ہے:

> "بنارس اور الٰہ آباد میں کان پور کے واقعے سے پہلے ایک موقع پر چند نوجوان لڑکوں کو محض اس بنا پر پھانسی دی گئی کہ انھوں نے شوقیہ طور پر باغیوں کی جھنڈیاں اٹھا کر بازاروں میں منادی کی تھی۔ سزائے موت دینے والی عدالت کے ایک افسر کے پاس جا کر درخواست کی کہ ان نابالغ مجرموں پر رحم کر کے پھانسی کی سزا کو تبدیل کر دیا جائے! لیکن بے سود!

اس تمام سلسلہ میں ایسے بے شمار واقعات ہیں، جن میں اس قسم کی نمائشی عدالتوں سے بھی گریز کیا گیا اور بے گناہ انسانوں کو بے دریغ قتل کیا گیا۔ پھانسیاں دینے کا سامان بھی مکمل نہ تھا اور نہ ہی کسی کو پھانسی دینے کے طریقے سے پوری طرح واقفیت تھی۔ چناں چہ ان میں سے ایک شریف آدمی اپنی شاندار کامیابی کا اس طرح فخریہ اظہار کیا کرتا تھا کہ ہم پھانسی دیتے وقت عام طور پر آم کے درخت اور ہاتھی کو استعمال کیا کرتے تھے۔ یعنی ملزم کو ہاتھی پر بٹھا کر درخت کے نیچے لے جاتے تھے اور گلے میں اوپر رسہ ڈال کر ہاتھی کو ہانک دیتے تھے۔ یہاں تک کہ ملزم اس طرح تڑپنے اور جانکنی کی حالت میں انگریزی کے آٹھ کے ہندسے (8) کی دل چسپ شکل بن کر رہ جاتا تھا۔"

(انقلاب ۱۸۵۷ء کی تصویر کا دوسرا رخ، ص ۴۶)"

مولانا فضل حق خیر آبادی

مقدمہ، اپیل اور سزا:

۲۲ر فروری ۱۸۵۹ء: مولانا فضل حق خیر آبادی ۱۸۵۷ء کی جنگ آزادی میں حصہ لینے کے الزام میں گرفتار کر لیے گئے۔ ان کے مقدمے کی ابتدائی سماعت کپتان ایف۔ ا۔ و۔ تحربرن لکھنو کی عدالت میں ہوئی۔ یہ مقدمہ ۲۲ر فروری ۱۸۵۹ء کو عدالت میں پیش ہوا۔ استغاثہ کی طرف سے پانچ گواہ۔ ۱۔ عبدالحکیم اکسٹرا اسسٹنٹ دریاباد۔ ۲۔ تجمل حسین، ۳۔ فضل حسین، ۴۔ رام دیال اور ۵۔ مرتضٰی حسین پیش ہوئے۔

مولانا فضل حق نے اپنے بیان صفائی میں الزامات کی صحت سے قطعی انکار کیا اور کہا:

"میں راجہ الور کے ہاں ملازم تھا اور بغاوت شروع ہونے کے زمانے میں اسی کے پاس تھا۔ راجہ بنے سنگھ کی وفات کے بعد ایک مہینے تک میں الور میں رہا۔ میں اگست ۱۸۵۷ء میں الور سے روانہ ہوا اور دہلی آیا۔ وہاں میں پندرہ دن رہا اور پھر الور واپس چلا گیا۔ میں نے اپنے اہل وعیال کو یہاں الور میں چھوڑا اور دسمبر ۱۸۵۷ء میں خیر آباد کی راہ لی۔ جب سے میں اپنے

مکان پر مقیم ہوں؛ نہ میں نے کسی کی ملازمت کی، نہ باغیوں میں شامل ہوا۔ میر فتح حسین، محمد حسین اور احمد علی خان میرے گواہ ہیں۔ نبی بخش اور قادر بخش، امام علی، علی محمد اور ممو خان خیرآباد کے رہنے والے میرے چال چلن سے واقف ہیں۔ میں خیرآباد سے اس لیے نکلا تھا، کیوں کہ یہاں کے تمام باشندے بیگم (حضرت محل) کے ساتھ بھاگ گئے تھے۔ میں یہاں سے نکل کر چند دن کھیڑی، ہرگاؤں، تنبول، سہور پور وغیرہ میں رہا۔ چند دن ڈریہ میں بھی گزارے۔ ۲۶ر دسمبر ۱۸۵۸ء کو میں نے کرنل کلارک سے بیہا کے مقام پر ملاقات کی۔ اس سے پہلے میں بریگیڈیر ٹروپ سے مل چکا تھا۔ بریگیڈر ٹروپ ہی نے مجھے کرنیل کے پاس بھیجا تھا۔ کرنیل کلارک نے ایک روب کار لکھی اور حکم دیا کہ اسے ڈپٹی کمشنر ضلع کی تحویل میں دے دیا جائے۔ میں ۳۰ر دسمبر کو ڈپٹی کمشنر کے سامنے حاضر ہوا اور اپنے مکان پر ہی ٹھہرا رہا۔ ۳۰ر جنوری ۱۸۵۹ء کو ڈپٹی کمشنر نے مجھے بلا بھیجا اور لکھنو روانہ کر دیا۔

''فضل حق ایک اور شخص کا نام ہے۔ مجھے اس کی جگہ گرفتار کر لیا گیا ہے۔ وہ آج کل (شاہزادہ) فیروز شاہ (بن بہادر شاہ ظفر) کے ساتھ ہے۔ یہ (فضل حق) آنولہ کا تحصیل دار تھا اور اس نے خان بہادر خان اور بیگم (حضرت محل) کی ملازمت بھی کی ہے۔ وہ ذات کا سید اور شاہ جہان پور کا رہنے والا ہے۔''

(علامہ فضل حق خیرآبادی اور جہاد آزادی، مرتبہ: سعید الرحمٰن علوی، لاہور ۱۹۸۷ء، ص ۳۹۔۲۳۸)

۴ر مارچ ۱۸۵۹ء: مسٹر تھربرن کی عدالت میں مقدمے کی ابتدائی سماعت کے بعد استغاثے اور صفائی کے گواہوں اور مولانا فضل حق کے بیان صفائی کے بعد جملہ کوائف کے ساتھ مقدمہ جوڈیشل کمشنر اودھ مسٹر جارج کیمبل اور میجر بارو قائم مقام کمشنر خیرآباد ڈویژن کی مشترکہ عدالت میں پیش کر دیا گیا۔ عدالت نے انھیں ۴ر مارچ ۱۸۵۹ء کو سیاسی قیدی کی حیثیت سے حبس دوام بہ عبور دریائے شور اور تمام جائیداد کی ضبطی کی سزا سنا دی۔''

مارچ ۱۸۵۹ء: مولانا فضل حق نے اپنے وکیل میسرز سون ہو، بیبی لینڈ ویزلی کی وساطت سے گورنر جنرل کی خدمت میں درخواست دی کہ ان کے ساتھ انصاف نہیں ہوا۔ اس لیے جوڈیشل کمشنر کا فیصلہ منسوخ کر دیا جائے۔ لیکن اس سے پہلے کہ مولانا کی درخواست گورنر جنرل کے اجلاس تک پہنچتی جوڈیشل کمشنر کے فیصلے کی توثیق کی جا چکی تھی۔ اس لیے درخواست رد کر دی گئی۔

مولانا نے ایک درخواست دی ہے جس میں انھوں نے الزامات سے انکار کیا اور لکھا ہے کہ مجھے جو سزا دی گئی ہے، وہ حضور ملکہ معظمہ کے عام معافی کے اعلان کے خلاف ہے۔ اس لیے بھی فیصلہ منسوخ کیا جائے۔ درخواست کے آخر میں مولانا نے یہ عاجزانہ التجا بھی کی۔

> ''اس لیے اب میری عاجزانہ درخواست ہے کہ جو کچھ صدر میں اسپیشل کمشنروں کے فیصلے کے خلاف قانون ہونے سے متعلق لکھا گیا ہے۔ اس پر غور کیا جائے۔ مجھے یقین ہے اس کا نتیجہ یہ ہوگا کہ خواہ شاہی اعلان کے مطابق انصاف کیا جائے یا ایک پیرانہ سال بوڑھے اور اس کے متعدد بے بس افراد خاندان پر رحم کو مدنظر رکھا جائے۔ بہر حال میری رہائی اور مختصر جائداد کی بحالی کے احکام صادر فرمائے جائیں گے۔''
>
> (علامہ فضل حق خیر آبادی اور جہاد آزادی، ص ۲۵۳)

۱۱ رمئی ۱۸۵۹ء: مولانا فضل حق خیر آبادی نے اپنی سزا کی منسوخی اور جائیداد کی بحالی کے سلسلے میں اپنے وکیل میسرز سون ہو، بیبی لینڈ ویزلی کے ذریعے جو دوسری درخواست دی تھی۔ اس کا جواب ۱۱ رمئی کو وکیل کی معرفت موصول ہوا کہ یہ مقدمہ گورنر جنرل بہ اجلاس کونسل کی خدمت میں پیش ہوا۔ جہاں سے اسپیشل کمشنر کی دی ہوئی سزا کی توثیق کر دی گئی۔ اس طرح سزا تو بحال رہی لیکن معلوم ہوتا ہے کہ گورنر جنرل نے یہ حکم دے دیا تھا کہ ان سے مشقت نہ لی جائے اور ان کے بڑھاپے کے پیش نظر ان سے کسی طرح کی سختی نہ کی جائے۔

اس حکم کے بعد جوڈیشل کمشنر نے اسی ماہ میں ڈپٹی کمشنر لکھنؤ کو اطلاع دی کہ اب سزا کا حکم نافذ کر دیا جائے۔ چناں چہ اسی حکم کی تعمیل میں انھیں کالے پانی (جزائر انڈمان) بھیجنے کے لیے لکھنؤ سے کلکتے روانہ کر دیا گیا اور جب تک انڈمان کے لیے جہاز کا انتظام نہیں ہوا، انھیں علی پور جیل میں رکھا گیا۔ (علامہ فضل حق خیر آبادی اور جہاد آزادی)

۸ راکتوبر ۱۸۵۹ء: اور ۲ راکتوبر میں مولانا فضل حق کو کلکتے سے ''فائر کوئین'' نامی جہاز سے انڈمان بھیج دیا گیا۔ ان کا جہاز ۸ راکتوبر ۱۸۵۹ء کو پورٹ بلیر پہنچا۔ قیدیوں میں ان کا دفتری نمبر

۳۶۸۷ تھا۔

۹ رجنوری ۱۸۶۰ء: پورٹ بلیر جزائر انڈمان سے مولانا فضل حق نے اپنی بے گناہی اور الزامات سے بریت میں ایک درخواست وزیر ہند (انگلستان) کی خدمت میں بھیجی۔ اس درخواست میں چوں کہ انھوں نے اپنی زندگی اور تاریخ کے چند واقعات بیان کیے ہیں اس لیے اسے یہاں نقل کیا جاتا ہے:

درخواست بنام وزیر ہند

۱۔ مجھے ملکہ معظمہ کے اعلان معافی کے خلاف حبس دوامی بہ عبور دریائے شور اور ضبطی جائیداد کی سزا دی گئی ہے۔ میں نے ہندوستان میں تمام حکام مجاز کی خدمت میں انصاف کی یا کم از کم میری عمر کا خیال رکھتے ہوئے رحم کی درخواست کی، لیکن بے سود! اب میں اپنے آپ کو دادرسی کے لیے آپ کے قدموں میں ڈالتا ہوں۔

۲۔ میں زیادہ تفصیل میں نہیں جاتا اور صرف اسپیشل کمشنر کے فیصلے کی اور حکومت ہند سے اپنی درخواست کی نقلیں ملفوف کرتا ہوں۔ انھی سے معلوم ہو جائے گا کہ مجھ پر مقدمہ چلانے، میرا جرم ثابت کرنے اور پھر مجھے سزا دینے میں حضور ملکۂ معظمہ کے اعلان کے منشا کی خلاف ورزی کی گئی ہے۔ میں اس کے ساتھ ایک درخواست کی نقل بھی بھیج رہا ہوں، جو کلکتہ کے مقتدر مسلمانوں نے حکومت ہند کی خدمت میں میری رہائی کے لیے دی تھی۔ میں ذیل میں مختصراً چند باتیں بیان کر دیتا ہوں تاکہ میرے معاملے کی نوعیت واضح ہو جائے۔

۳۔ جیسا کہ اسپیشل کمشنر نے بھی اپنے فیصلے میں ذکر کیا ہے، میرا خاندان اپنی دنیوی حیثیت کے لیے بہت حد تک سرکار انگریزی کا مرہون منت ہے۔ ایک زمانے میں خود میں بھی انگریزی ملازمت میں بہت اچھے عہدے پر متمکن تھا۔ اس سے ظاہر ہے کہ میں انگریزی حکومت کے خلاف کسی تحریک میں حصہ نہیں لے سکتا تھا۔ حقیقت یہ ہے کہ جب سے شورش کا آغاز ہوا ہے، میں ریاست الور میں ملازم تھا۔ میں اس کے چار مہینے بعد دہلی گیا تاکہ وہاں سے اپنی بیوی کو نکال لاؤں جو خطرے میں گھر گئی تھی۔. میں اسے ساتھ لے کر اپنے وطن خیر آباد چلا گیا اور مئی ۱۸۵۸ء تک وہاں رہا۔ وہاں سے ہمیں ایک شخص احمد اللہ شیخ کے تشدد مجرمانہ کی بدولت بھاگ کر بونڈی جانا پڑا، وہاں ہماری

جان خطرے میں تھی۔ بوندی میں دو شخص...... عبدالحکیم اور مرتضیٰ حسین میرے خلاف ہو گئے، یہ دونوں شیعہ تھے، مجھے نقصان پہنچانے کی خاطر ان دونوں نے بیان دیا کہ انھوں نے سنا تھا کہ میں ممو خان اور دوسرے باغیوں کے مشوروں میں شامل تھا اور قتل کے جواز کے فتوے دیتا تھا۔ بات صرف اتنی ہے کہ جب ہم بھاگ کر بوندی آ رہے تھے تو ایک باغی سرغنے مسیح الزماں نے ہمیں راستے میں گرفتار کر لیا۔ اس نے ہمارے ساتھ بہت سختی کا سلوک کیا اور ہمیں کھیڑی میں نظر بند کر دیا۔ خوش قسمتی سے کھیڑی کے باشندے مجھے جانتے تھے۔ ان لوگوں کے کہنے پر مسیح الزمان نے ہمیں رہا کیا۔ اس سے معلوم ہوگا کہ اگر کسی طرح کا میرا باغیوں سے تعلق پیدا ہوا بھی تو میری مرضی کے خلاف تھا۔

ملکۂ معظمہ کے اعلان میں آخری تاریخ دسمبر ۱۸۵۸ء مقرر کی گئی تھی۔ اس معیاد کے گزرنے سے پہلے ہی میں سیتا پور کے اعلیٰ فوجی افسر کی خدمت میں حاضر ہو گیا اور ان سے اس مفاد کی سند بھی حاصل کر لی۔ اس کے بعد میں انھی کی زیر ہدایت اپنے مکان پر خیر آباد چلا آیا اور یہاں پہنچ کے میں نے وہ سند خیر آباد کے ڈپٹی کمشنر کے دفتر میں داخل کرا دی۔ جنوری ۱۸۵۹ء میں مجھے زیر حراست لکھنو لائے اور یہاں مجھ پر مقدمہ قائم ہوا اور مارچ میں میرے خلاف فیصلہ ہوا۔ میں نے اس سلسلے میں جو درخواست حکومت ہند کی خدمت میں پیش کی تھی، اس سے اس فیصلہ کی غلطی ثابت ہو سکتی ہے۔ اس کی نقل لف ہذا ہے۔

۴۔ جب میں نے چیف کمشنر سے اس فیصلے کے خلاف اپیل کی تو مجھے ۷/اپریل ۱۸۵۹ء کو اطلاع ملی کہ وہ اپیل کی سماعت نہیں کر سکتے بلکہ مقدمہ اس سے پہلے ہی حکومت ہند کے پاس بھیجا جا چکا ہے۔ اس پر جب میں نے اپنی اپیل حکومت کو بھیجی تو میرے وکیل میسرز سون ہو، بیبی ویزلی کو خط مورخہ ۱۱/مئی ۱۸۵۹ء کے ذریعے مطلع کیا گیا کہ یہ مقدمہ گورنر باجلاس کونسل کی خدمت میں پیش ہوا تھا جہاں سے اسپیشل کمشنر نے جو سزا دی تھی، اس کی توثیق کر دی گئی ہے۔ اس سے ظاہر ہے کہ اس فیصلے کے خلاف جو دلائل میں پیش کرنا چاہتا تھا، ان پر غور کیے بغیر ہی آخری فیصلہ میرے خلاف کر دیا گیا۔ اس پر میں نے درخواست ارسال کی، جس کا جواب مجھے ۷/اکتوبر کے مکتوب میں ملا کہ یہ رد کی جاتی ہے۔

۵۔ کلکتہ کے معزز ترین مسلمانوں نے، جن کی وفاداری سے متعلق کسی قسم کا شبہ نہیں، قاضی القضاۃ کی سرکردگی میں جو حکومت کا سب سے بڑا مسلمان افسر ہے، حکومت ہند سے اکتوبر ۱۸۵۹ء میں درخواست کی کہ میری بے گناہی کے علاوہ میری پیری اور ضعف جسمانی کے پیش نظر مجھے رہا کر دیا جائے لیکن حکومت نے اس درخواست پر بھی کوئی توجہ نہ دی۔

۶۔ ان حالات میں اب میرے پاس اس کے سوائے کوئی چارۂ کار نہیں رہا کہ میں آپ سے درخواست کروں کہ میرے خلاف نفس مقدمہ، اس کے فیصلے اور سزا سے ملکہ معظمہ کے اعلان معافی کی خلاف ورزی ہوئی ہے، جس کی رو سے قاتلوں اور بغاوت کے سرغنوں اور محرکوں کے علاوہ اور سب کو معافی کا وعدہ دیا گیا تھا۔ میری حیثیت ہی کیا ہے! میں نہ باغی ہوں نہ باغیوں کا ساتھی! کمشنر نے اپنے فیصلے میں لکھا ہے کہ میں بہت خطرناک آدمی ہوں۔ اس لیے انصاف اور امن عامہ کا تقاضا یہ ہے کہ مجھے ملک سے باہر بھیج دیا جائے۔ بڑے بڑے سردار جو بغاوت کے سرغنے اور مشہور قاتل تھے، وہ تو رہا کر دیے گئے، بلکہ ان میں سے بعض کو پنشن بھی مل رہی ہے، لیکن برطانوی حکومت مجھ ناچیز بوڑھے سے ڈرتی ہے جو کہ قبر کے کنارے پہنچ چکا ہے۔

میری درخواست یہ ہے اور انصاف کا بھی یہی تقاضا ہے کہ مجھے رہا کر دیا جائے اور میری ضبط شدہ جائیداد بحال کر دی جائے۔ ورنہ کم از کم رحم ہی کے طور پر یہ کیا جائے''۔ (۹ رجنوری ۱۸۶۰ء)

۱۲ راگست ۱۸۶۱ء: وزیر ہند نے مولانا فضل حق خیرآبادی کی درخواست پر حکم دیا تھا کہ ان کی یہ درخواست تمام متعلقہ کاغذات کے ساتھ ہندوستان کے مقامی حکام کو بھیجی جائے اور ان سے دریافت کیا جائے کہ اگر درخواست گذار کو رہا کر دینے کی کوئی صورت ہے تو وزیر ہند کو انھیں رہا کر دینے میں کوئی عذر نہیں جب یہ کاغذات چیف کمشنر اودھ کے پاس پہنچے تو اس نے ۱۲ راگست ۱۸۶۱ء کو جواب دیا کہ اگر اس قیدی کے ساتھ کسی طرح معمولی سے رعایت بھی کی گئی تو وہ اس کی سخت مخالفت کریں گے۔

۲۰ راگست ۱۸۶۱ء: چیف کمشنر اودھ کو مولانا فضل حق کی رہائی تو کجا، ان کے ساتھ کسی معمولی سی رعایت پر بھی اعتراض تھا اور جہاں تک گورنر جنرل اور وزیر ہند کا تعلق تھا وہ اپنے ماتحت عملے کی رائے کو نظر انداز کر دینا نہ چاہتے تھے اس سے یہی خیال ہوتا ہے کہ انہیں ہرگز رہا نہ کیا جاتا۔ لیکن

افسوس کہ ۲۰ راگست ۱۸۶۱ء کو مولانا کا پورٹ بلیر میں انتقال ہو گیا اور وہ مظلوم ستم بہ یک وقت قید حیات وقیدِ فرنگ دونوں سے رہا ہو گیا۔ انا للہ وانا الیہ راجعون۔

۱۸۶۱ء

حضرت حاجی امداد اللہؒ تو معافی کے اعلان سے پہلے ہی مکۂ معظمہ کی جانب ہجرت کر گئے تھے۔ آپ تھانہ بھون سے نکل کر گنگوہ، انبالہ، تکھری، پنجلاسہ تھوڑے تھوڑے عرصے مقیم رہے اور پھر براہ پنجاب وسندھ بندرگاہ کراچی پہنچے۔ وہاں سے بذریعۂ بحری جہاز مکۂ معظمہ تشریف لے گئے۔ اور وہیں حیات مستعار کے باقی دن گزارے۔ ہندوستان سے نکلنے میں آپ کو تقریباً سوا دو سال لگ گئے۔ اس اثناء میں حکومت نے آپ کو گرفتار کرنے کی پوری پوری کوشش کی لیکن تائید غیبی آپ کے شامل حال رہی اور آپ گرفتار نہ ہو سکے۔ ذیقعدہ ۱۲۷۶ھ میں آپ مکۂ معظمہ پہنچے اور جمادی الاخریٰ ۱۳۱۷ھ میں رہگزائے عالم بقا ہوئے۔ اس طرح چالیس سال سے زیادہ آپ نے بیت اللہ کے جوار میں گزارے اور جنت المعلا میں آخری آرام گاہ نصیب ہوئی۔

حضرت مولانا قاسم نانوتوی کو بھی حکومت نے گرفتار کرنے کی کوشش کی۔ تین دن تک تو آپ گھر میں چھپے رہے پھر آزادی سے باہر پھرنے لگے۔ کچھ عرصے کے لیے اپنے برادر نسبتی شیخ نہال احمد دیوبندی کے گاؤں پر تشریف لے گئے۔ کئی مرتبہ پولیس کا سامنا بھی ہوا لیکن خدا کے فضل وکرم سے گرفتاری سے محفوظ رہے۔ معافی کا اعلان ہونے کے بعد آپ نے تبلیغ اور دینی علوم کی اشاعت کا کام پوری لگن سے انجام دیا۔ دارالعلوم دیوبند آپ کی علمی یادگار ہے۔ عمر نے وفا نہ کی اور آپ ۱۲۹۵ھ میں فوت ہو گئے۔ آپ کا مزار پرانوار دیوبند میں ہے۔

حضرت مولانا رشید احمد گنگوہی تھانہ بھون سے چل کر رام پور منہاران پہنچے۔ وہاں حکیم ضیاء الدین کے مکان میں پوشیدہ رہے۔ لیکن کسی بدباطن نے مخبری کر دی۔ آپ گرفتار ہوئے اور چھ مہینے جیل میں رہے۔ لیکن کوئی ٹھوس ثبوت نہ ملنے پر چھ ماہ بعد رہا کر دیے گئے۔

حضرت مولانا شیخ محمد تھانوی بھی قاضی عنایت علی کے پھوپی زاد بھائی اور بہنوئی ہونے کی وجہ سے انگریزی حکومت کے نزدیک مجرم تھے۔ لہٰذا ان کی گرفتاری کے بھی وارنٹ جاری ہو گئے۔ جس کی وجہ سے ان کو رام پورر منہاران میں کافی مدت تک شیخ سالار چشتی رحمۃ اللہ علیہ کے مکان میں پوشیدہ رہنا پڑا۔ وہاں سے ۱۸۶۱ء/ ۱۲۷۷ھ میں ٹونک تشریف لے گئے۔

۷ر نومبر ۱۸۶۲ء: آج کی تاریخ میں بروز یک شنبہ بہادر شاہ ظفر کا وطن سے سیکڑوں میل دور

رنگوں میں بہ عالم غربت انتقال ہو گیا۔ اور ان کا اپنا ایک شعر جو انھوں نے کبھی کہا تھا، ان پر صادق آیا:

کتنا ہے بد نصیب ظفر دفن کے لیے
دو گز زمین بھی نہ ملی کوئے یار میں

جنگ امبیلہ ۱۸۶۳ء کے بعد:

جنگ امبیلہ ۱۸۶۳ء کے فوراً بعد انگریزوں نے جہاد کی پاداش میں پانچ مقدمہ ہائے سازش قائم کیے۔ پہلا مقدمہ سازش انبالہ ۱۸۶۴ء میں، اس میں گیارہ ۱۱ ملزم تھے۔ دوسرا مقدمہ سازش پٹنہ ۱۸۶۵ء میں، تیسرا مقدمۂ سازش راجہ محل ۱۸۷۰ء میں، چوتھا مقدمہ سازش مالوہ ۱۸۷۰ء میں اور پانچواں مقدمہ سازش ۱۸۷۱ء پٹنہ ہی میں۔ اس کے سات ملزم تھے۔ ان مشہور مقدمات کے علاوہ اور کئی مقدمے قائم کیے گئے۔ ان کے ماخوذین کی استقامت نے انگریزی حکومت کو تخت پریشان کیا۔ کئی ایک ملزم جنھیں موت کی سزا دی گئی۔ ان کی سزا اس بنا پر عمر قید میں بدلی گئی کہ وہ موت کو پیار کرتے تھے اور شہادت کی لگن میں ان کا وزن بڑھ گیا تھا۔ انگریز محسوس کرتا تھا کہ جہاد کا شعلہ کسی وقت بھڑک سکتا ہے۔ گو انگریزوں نے پنجاب کے بل پر ۱۸۵۷ء کی جنگ آزادی کو ختم کیا اور تجربے سے معلوم ہو چکا تھا کہ اس صوبہ کا سپاہی اس کے لیے بہت بڑی متاع ہے۔ لیکن برطانوی استعمار کے آئندہ ارادے مسلمان رعایا کو جس سانچے میں ڈھالنا چاہتے تھے، ان کا خاکہ عجیب و غریب تھا۔ خلافت عثمانیہ، برطانیہ اور اس کے نصرانی اتحادیوں کی نگاہ میں تھی اور وہ اس کی بندر بانٹ کا منصوبہ تیار کر چکے تھے۔ ان کے پیش نظر ترکوں اور عربوں کو ایک دوسرے سے بھڑانا ہی نہیں تھا بلکہ عربوں کو مختلف ریاستوں میں بانٹ دینے کا منصوبہ ان کے ذہن میں تھا۔ اس منصوبے کے لیے پنجابی سپاہی منتخب کیا گیا۔ پنجاب کی سرحدوں سے ملحق سرحدی صوبوں میں روح جہاد کا ولولہ باقی تھا۔ اس سے آگے افغانستان اور ایران واقع تھے۔ ان سے پیوست اسلامی ریاستوں کا سلسلہ تھا۔ ان مملکتوں کے شانے پر روس تھا اور اس کو برطانوی عمل داری اپنے لیے خطرہ محسوس کرتی تھی۔ انگریزوں نے پنجاب پر قبضہ کرتے ہی قبائلی علاقے کو مطیع و منقاد کرنے کے لئے ہمہ جہت کوشش کی۔ بیل منڈھے نہ چڑھی تو لارڈ کرزن نے اس پالیسی کو بدل ڈالا۔ قبائلی خوانین کے وظیفے مقرر کیے، افغان ملیشیا کی نیو اٹھائی اور ۱۹۰۱ء میں سرحد کے موجودہ اضلاع کو پنجاب سے الگ کر کے علاحدہ صوبہ بنا دیا۔ ڈاکٹر ہنٹر نے ''ہمارے ہندوستانی مسلمان'' میں

لکھا ہے کہ ''وہ ان علاقوں میں مذہب کے دیوانوں کو سر نہیں کر سکتے اور نہ انھیں گھروں میں واپس لا سکتے ہیں۔ ان میں جہاد کا شعلہ سرد نہیں ہوا۔ ان پر مذہبی دیوانوں اور جہادی ملاؤں کا اثر نہایت قوی ہے اور وہ کسی لحظہ بھی ان کے جذبات کا آتش کدہ بھڑکا سکتے ہیں۔''

(تحریک ختم نبوت از شورش کاشمیری، لاہور، ۱۹۸۰ء، ص ۲۲۔۱۲۱)

مئی ۱۸۶۳ء تا نومبر ۱۸۶۴ء:

مقدمۂ انبالہ:

حضرت سید احمد شہید کی جماعت کے جو باقیات آزاد قبائل میں موجود تھے اور انگریزوں کے خلاف جہاد میں مصروف تھے۔ ان کی امداد کا ایک نظام پنجاب سے لے کر بنگال تک قائم تھا۔ ابتدا میں تو انگریزوں نے اس طرف توجہ نہیں کی لیکن بہت جلد انھیں اس نظام کی خطرناکی اور سنگینی کا احساس ہو گیا اور پکڑ دھکڑ شروع کر دی۔ مئی ۱۸۶۳ء میں کرنال میں چار آدمی اس شبھے میں پکڑے گئے کہ وہ مجاہدین کو امداد پہنچانے والے ہیں۔ انھیں ایک شخص غزن خان نامی نے پکڑا تھا۔ وہ انھیں پانی پت لے گیا اور تھانے میں مقدمہ درج کرا کے مجسٹریٹ کے سامنے پیش کر دیا۔ مجسٹریٹ نے انھیں عدم ثبوت کی بنا پر رہا کر دیا۔ غزن خان کو اس پر سخت غصہ آیا اور اس کے دل میں انتقام کی آگ بھڑک اٹھی۔ اس نے اپنے بیٹے فیروز خان کو ملکا بھیجا جہاں سے ان لوگوں نے اپنا آنا اور تھانیسر جانا بتایا تھا۔ فیروز خان دس دن بعد آیا اور جو معلومات لایا ان کی مدد سے بہار سے لے کر دہلی، پنجاب تھانیسر اور ستھانہ تک امداد کی زنجیر کی کچھ کڑیاں دریافت کر لی گئیں۔ جن کی بنیاد پر تحقیق شروع ہوئی جس کے نتیجے میں ۱۔ شیخ محمد شفیع ٹھیکے دار ۲۔ مولوی محمد جعفر تھانیسری، ۳۔ مولوی یحییٰ علی جعفری عظیم آبادی، ۴۔ مولوی عبدالرحیم، ۵۔ میاں عبدالغفار ۶۔ قاضی میاں جان، ۷۔ عبدالکریم انبالوی، ۸۔ عبدالغفور، ۹۔ حسینی تھانیسری، ۱۰۔ حسینی عظیم آبادی اور ۱۱۔ الٰہی بخش کو گرفتار کر لیا گیا، ان پر مقدمہ چلا اور نمبر ۱ اور ۳ کو سزائے موت معہ ضبطی جائیداد اور لاشوں کو جیل کے قبرستان میں دفن کرنے کی، نمبر ۲ کو سزائے موت معہ ضبطی جائیداد کی اور دیگر تمام ملزمان کو حبس دوام بہ عبور دریائے شور معہ ضبطی جائیداد کی سزا سنا دی گئی۔

یہ فیصلہ ۲ر مئی ۱۸۶۴ء کو دیا گیا تھا۔ لیکن اپیل میں پہلے تین ملزمان کی سزائے موت بھی عمر قید میں تبدیل ہو گئی۔ یہ فیصلہ ۲۴ر اگست کو ہو گیا تھا، لیکن ملزمان کو اس کی اطلاع ۱۶ر ستمبر ۱۸۶۴ کو دی گئی۔

پہلے تمام ملزمان کو انبالہ جیل میں رکھا گیا، پھر وہاں سے لاہور، بعدہ ملتان جیل میں منتقل کیا گیا، ملتان سے انھیں دریائے سندھ کے راستے کراچی اور کراچی سے جزائر انڈمان بھیجا گیا۔ جہاں وہ ۱۱ر جنوری ۱۸۶۶ء کو پہنچے تھے۔ اس مقدمے کا ایک الم ناک پہلو یہ ہے کہ جن بزرگوں

کے دلوں میں خلاف سنت یا ترک سنت کا کبھی خیال بھی نہ آیا ہوگا، ان کی ڈاڑھیاں مونچھیں زبردستی مونڈ دی گئی تھیں۔ مولانا یحییٰ علیؒ نے ڈاڑھی کے بال اپنے دونوں ہاتھوں میں اٹھائے اور کہا تو مجھے بہت عزیز تھی لیکن تو اللہ کے راستے میں مونڈی گئی ہے۔ میری فریاد اسی سے ہے۔ مولانا یحییٰ علی نے پورٹ بلیر میں ۲۰ر فروری ۱۸۶۸ء کو انتقال فرمایا۔ مولانا عبدالرحیم کی زندگی نے وفا کی اور رہائی پا کر اپریل ۱۸۸۳ء میں وطن لوٹ آئے تھے۔ ان کا انتقال ۲۵ر جولائی ۱۹۲۳ کو پٹنہ میں ہوا۔ انبالہ کے مقدمے کی روداد انگریزی زبان میں چھپ چکی ہے۔

مولانا محمد جعفر تھانیسری نے ''تواریخ عجیب عرف کالا پانی'' میں، مولانا محمد میاں نے ''علمائے ہند کا شاندار ماضی'' کا ایک مستقل حصہ ''علمائے صادق پور'' کے اصحاب عزم وایثار کے تذکرہ کے لیے وقف کر دیا ہے۔

مولانا غلام رسول مہر نے ''سرگزشت مجاہدین'' میں اور دیگر مورخین اور سوانح نگاروں نے مختلف کتابوں میں مقدمے کی روداد بیان کی ہے۔

''تواریخ عجیب'' مرتبہ محمد ایوب قادری نہایت معلومات افزا ہے۔ سلمان اکیڈمی، کراچی سے ۱۹۶۲ء میں شائع ہوئی تھی۔ اور ایک نہایت عمدہ مقالہ قیوم خضر نے (پٹنہ ۱۹۷۹ء) سے شائع کیا ہے۔

مقدمۂ عظیم آباد:

نومبر ۱۹۶۴ء: مولانا احمد اللہ مولانا یحییٰ علی کے بڑے بھائی تھے۔ اگرچہ اپنے دونوں بھائیوں اور دیگر اعزہ کی تحریک سید احمد شہید سے عملی وابستگی کی وجہ سے وہ تحریک کے کارکن نہیں تھے لیکن ذہناً اور فکراً ان کی تمام تر ہمدردیاں تحریک کے ساتھ تھیں اور یہ جرم حق پسندی اور خدمت گزاران دین وملت سے ان کا رشتہ ان کی گرفتاری اور سزایابی کے لیے کافی تھا، چناں چہ نومبر ۱۸۶۴ء میں، پٹنہ میں انھیں بھی گرفتار کر لیا۔ ۱۶ر جنوری ۱۸۶۵ء سے مقدمہ شروع ہوا اور اواخر فروری میں سزائے موت اور ضبطی جائیداد کا فیصلہ سنا دیا گیا۔ بعد میں موت کی سزا کو دریائے شور کی قید سے بدل گیا گیا۔ اور پھر جلد ہی انھیں جزائر انڈمان روانہ کر دیا گیا۔ جون ۱۸۶۵ء میں وہ پورٹ بلیر پہنچ گئے تھے۔

مقدمۂ انبالہ میں چوں کہ ان کے بھائی اور کئی عزیز ماخوذ تھے اور جائیدادیں ان کی بھی ضبط ہوئی تھیں۔ اس لیے تمام خاندان کی جائیداد ضبط کر لی گئی۔ یہ واقعہ ۲۷ر فروری ۱۸۶۵ء کو عین

عیدالفطر کے دن پیش آیا۔ گھر کی خواتین اور بچوں، بوڑھوں کو باہر نکال دیا گیا اور مکانات، تمام جائداد، اثاث البیت، کتب خانہ نہایت معمولی بولی پر دے دیا گیا۔ پھر بھی ان کی جائیداد منقولہ اور غیر منقولہ کا یہ اندازہ لگایا گیا ہے:

۱۔ مولانا عبدالرحیم: (منقولہ)	۱۰۔۷۔۶۳۲	(غیر منقولہ)	۰۔۰۔۱۲۸۶۶
۲۔ مولانا یحییٰ علی: (منقولہ)	۰۔۰۔۰۶۴۵	(غیر منقولہ)	۰۔۴۔۰۲۰۶۰
۳۔ مولانا احمداللہ: (منقولہ)	۹۔۱۲۔۴۵۱۷	(غیر منقولہ)	۰۔۴۔۵۸۷۷۶

یہ حساب روپے، آنے والی پائی میں ہے۔

مولانا احمداللہ کے بڑے صاحبزادے حکیم عبدالحمید پریشاں نے اس حادثۂ نابعہ پر ''شہر آشوب'' کے عنوان سے ایک مثنوی بھی لکھی تھی۔ ۲۳ر نومبر ۱۸۸۱ء کو انڈمان میں مولانا احمداللہ کا انتقال ہو گیا۔

''سرگزشت مجاہدین'' (مولانا غلام رسول مہر) و ''صادق پور پٹنہ --- قربان گاہ آزادی وطن'' (قیوم خضر)

۱۸۶۵ء

محمد حسین آزاد کے والد مولوی محمد باقر کو دہلی کالج کے ایک استاد مسٹر ٹیلر کے قتل کی پاداش میں جنرل ہڈسن نے گولی سے اڑا دیا۔ یہ کوئی معمولی داغ نہ تھا، لیکن انگریزوں نے اپنے دام تزویر کو جس طرح پھیلا رکھا تھا۔ اس کے سحر سے انگریزی حکومت نے محمد حسین آزاد کو حاصل کیا اور چار آدمیوں پر مشتمل ایک جاسوسی مشن ۱۸۶۵ء میں وسطی ایشیا روانہ کیا۔ اس مشن میں پنڈت من پھول، محمد حسین آزاد، منشی فیض بخش پشاوری اور لالہ کرم چند تھے۔ آزاد نے روسی ترکستان کے مختلف علاقوں میں اپنے سیاسی فرائض کی بجا آوری میں سخت سے سخت مصائب برداشت کیے، مختلف روپ دھارے، ان کے اپنے الفاظ ہیں کہ ''میں ۱۸ مہینے وسطی ایشیا کے دورانِ سفر ریگستان میں مارا مارا پھرتا رہا۔ بعض اوقات میری جان خطرے میں پڑ گئی۔'' لیکن ان خدمات کے صلے میں ملا کیا۔ تین سو روپے کا انعام اور ایک سو روپیہ ماہوار تنخواہ۔ اس کے بعد گورنمنٹ کالج لاہور میں استاد کی حیثیت سے ملازم ہو گئے۔ (تحریک ختم نبوت از شورش کاشمیری، ص ۱۷)

۱۸۶۶ء

دارالعلوم دیوبند

ہندوستان میں عظمت اسلام کی ایک زندہ جاوید یادگار

تحریکات کا منبع:

دارالعلوم دیوبند کا نام زبان پر آتا ہے تو تصور صرف ایک دینی مدرسے کے دائرے تک محدود نہیں رہتا۔ دارالعلوم معقول ومنقول کی محض ایک رسمی وروایتی درس گاہ کا نام نہیں، بلکہ وہ بہت سے تعلیمی، ثقافتی، علمی، سیاسی اداروں اور تحریکوں کا جامع ہے۔ یہ ہندوستان کی سرزمین میں ایک شجرۂ طیبہ کے مانند ہے جس کی جڑیں گہرائیوں میں چھپی ہوئی ہیں، اس کی شاخیں فضا میں دور دور تک پھیل گئی ہیں، اس کا سایہ راستہ چلنے والوں کے لیے سکون وطمانیت کا باعث ہوا ہے اور اس کی ثمرات شیریں نے ملت اسلامیہ کے ذوق معنوی کو تسکین اور حیات قومی اور نظم جماعتِ ملّی کو تقویت بخشی ہے۔ وہ تاریخ کے کئی نشیب وفراز سے گزرا، اسے زندگی میں کئی دشوار گذار مراحل پیش آئے۔ دشمن تو دشمن ہی تھے انھوں نے اس کے وجود کو مٹانے کی کوششوں میں کمی نہیں کی۔ اپنوں کی کوتاہ نظری نے بھی اس کے امتیازات کو ملیامیٹ کرنے میں نادانیوں کی مثال قائم کردی، لیکن اس شجرۂ طیبہ کی شاخوں کا گھنا سایہ نہ تو نادانوں پر سمٹا، نہ بیگانوں پر تنگ ہوا۔ اس کے ثمرات تعلیم وتربیت سے سب نے فیض اٹھایا۔ اس کے اسلاف واخلاف کا ذوق خدمت بلا تمیز مذہب وملت سب کے لیے ایک فیضان الٰہی تھا۔ اس کے متقدمین اسلامی اطوار اور انسانی اوصاف کا بہترین نمونہ تھے تو اس کے متوسطین اور متاخرین بھی زندگی کے ہر دایرۂ عمل میں اپنے اسلاف کے صحیح جانشین اور ان کی روایات کے امین تھے۔ اس کے اکابر تو ہر دایرہ علم وعمل میں اکابر ہی تھے۔ اس کے اصاغر واخلاف کی سیرتوں کی پختگی وتابانی اور ایثار وقربانی کی مثالوں نے بھی زندگی کی کٹھنائیوں میں قوم کے عزائم کو پختہ کیا اور حوصلوں کو مضبوط اور ہمتوں کو بلند رکھا۔

دارالعلوم دیوبند۔ ایک سیرت!

اللہ تعالیٰ نے دارالعلوم کے بزرگوں اور اس کے فرزندوں کو ایمان کی محکمی، عقاید کی صحت، علم کے رسوخ، نظر کی بلندی، قلب کی وسعت، ذہن کی فراخی، سیرت میں اعتدال، عمل میں استقامت

اور دین و دنیا کے توازن کی بہترین خوبیوں سے نوازا تھا۔ ان کا ایک ایک فرد حسن سیرت کی مثال، اخلاق کا مجسمہ، عمل کا پیکر اور ایثار کا نمونہ تھا۔ وہ فرشتے نہیں تھے، لیکن ایسے نیک سرشت تھے کہ فرشتے ان پر رشک کریں۔ ان میں کوئی معصوم نہ تھا، لیکن نیک نفسی، پاکیزگی عمل، سلامت روی، خوش خلقی، تقویٰ و تدین اور بر و احسان کے خصایص و خصایل سے ان کی زندگیاں آراستہ تھیں۔ وہ خود اپنی مثال اور آپ اپنا نمونہ تھے۔ علوم و فنون کے مختلف میدانوں میں اور خدمات قومی و ملی کے مختلف دائروں میں دوسرے مذاہب و فرق کے بڑے بڑے لوگ پیدا ہوئے اور تاریخ میں اپنا نام یادگار چھوڑ گئے، لیکن بہ حیثیت مجموعی کسی ایک جماعت اور مکتبۂ فکر کے ہر دور میں خصایص علم و عمل کے اتنے اعلیٰ درجات پر اتنی بڑی تعداد کہیں نہ ملے گی۔ وہ ایک عظیم الشان سلسلۂ ذہب ہے، جس کی ہر کڑی اپنی ماسبق سے زیادہ شان دار نظر آتی ہے۔ وہ تعلیم و تربیت کی ایسی ٹکسال ہے، جس کے کھوٹے بھی دوسروں سے زیادہ کھرے نکلے۔ اس کی تعمیر کے حسن اور منظر کی دل ربائی نے دیکھنے والوں کو سرور بخشا ہے۔ اس کا وجود سرزمین ہند میں عظمت اسلام کی ایک زندہ اور مقدس یادگار ہے۔ وہ ایک باران رحمت تھا جس نے مسلمانوں کی کھیتیوں ہی کو سیراب نہیں کیا، اس سے بہ قدر ذوق و استعداد غیر مسلم سوسائٹی بھی مستفیض ہوئی اور جس کا فیضان ہندوستان کے کناروں سے نکل کر ایشیا اور افریقہ و یورپ کے دور دراز ممالک اور ان کے دیار و امصار تک پھیلتا چلا گیا۔ وہ ایک سلسبیل تھی جس کا عرفان کسی کو تھا یا نہیں، لیکن اس کا فیضان عام تھا اور اس نے ملت کی سب کھیتیوں کو سیراب کیا۔

مقبولِ بارگاہِ الٰہی:

اس کے وجود کا خمیر صبر و توکل اور اخلاص و للٰہیت کی مٹی سے اٹھا تھا، اس لیے عند اللہ وہ ہمیشہ مقبول رہا اور عند الناس اسے ہر دور میں عزت اور مرجعیت کا مقام حاصل رہا۔ تاریخ کے سنین و شہور کا شمار کیجیے تو اس کے قیام پر ڈیڑھ سو برس پورے ہونے والے ہیں۔ اس کا وجود ۱۲۸۳ھ ۱۸۶۶ء میں نقش پذیر ہوا تھا۔ اس وقت سے اب تک برعظیم پاک و ہند کی تاریخ مذہب و سیاست میں وہ اسلام اور مسلمانوں کی شان اور عظمت کی علامت کے طور پر اپنا سر اونچا کیے ہوئے کھڑا ہے۔ اس مدت میں حوادث کے کتنے ہی طوفان آئے اور اس کے سر و شانہ سے ٹکرا کر اور اس کے جیب و داماں سے کھیل کر گزر گئے۔ زمانے کی شکست و ریخت نے دنیا کا نقشہ بدل دیا، انقلابات

نے عظیم ہندوستان کو ٹکڑوں میں تقسیم کر دیا۔ بعض نادان یہ سمجھتے تھے کہ عظمت اسلام کی یہ یادگاران حوادث میں اپنا وجود برقرار اور تشخص قائم نہ رکھ سکے گی، لیکن دنیا نے دیکھا کہ وقت آیا تو حوادث نے اپنا راستہ بدل لیا، خطرات موہوم ثابت ہوئی، اس کی ہستی مزید بلند ہوئی اور اس کی اہمیت اور بڑھ گئی۔ اس کی زندگی کی ہر آنے والی صبح روشن تر از سابق ثابت ہوئی۔ ۱۹۴۷ء کے حوادث کے بعد بھی اگر ایشیا میں ہندوستان کی سرزمین میں مسلمانوں کی تہذیب وثقافت کا کوئی اجلا نقش اور وطن وملت کی خدمت کا کوئی یادگار مرکز ہے، جس کا ہر دور شان دار، جس کے فیصلے مستحسن اور جس کا وجود فی نفسہ قابل فخر نظر آتا ہے، تو وہ صرف دارالعلوم دیوبند ہے۔ اس کا قیام و وجود مشیت ایزدی کی نمود اور منشاے خداوندی کا اظہار تھا۔ اس لیے انقلاب اور زمانے کی شکست وریخت کا اس کے وجود پر کوئی اثر نہ پڑا۔ دارالعلوم تاریخ کا ایک روشن باب ہی نہیں بلکہ برعظیم کے مسلمانوں کی دینی وتعلیمی، علمی وتہذیبی اور سیاسی ملی تاریخ کے ایک جلی نقش کا نام ہے۔ اگر دارالعلوم دیوبند کی تاریخ کو نظر انداز کر دیا جائے تو برعظیم کے مسلمانوں کی تاریخ ثقافت وسیاست کا تمام قابل فخر سرمایہ نظروں سے چھپ جاتا ہے، دینی خدمات نہ ہونے کے برابر رہ جاتی ہے اور ملک کی آزادی، ملت اسلامیہ کی سربلندی، اسلامی علوم وثقافت کے تحفظ کی جدوجہد اور عزیمت دعوت کی تاریخ میں ایک طبقے کی گداگری، ایک جماعت کی منت گذاریوں اور ایک گروہ کی ملت فروشیوں اور غداریوں کے سوا کچھ بھی نہیں رہ جاتا۔

دارالعلوم دیوبند ایک سرچشمہ تھا، جس کی فیض رسانیوں اور نفع بخشیوں نے ملت کے نخل امید کو سرسبز وشاداب کر دیا اور زندگی کے ہر گوشے اور علم وعمل کے ہر میدان میں ملت اسلامیہ کے دماغوں کو افکار حقہ اور دلوں کو امنگوں اور ولولوں سے معمور کر دیا۔ اس نے مسلمانوں کے سامنے زندگی کے ہر گوشے میں راہ عمل کھولی اور اپنے اخلاق اور سیرت کی روشنی سے راہوں کو منور کر دیا۔ مسلمان چاہیں تو وہ نئے حالات میں یمین ویسار کے تذبذب کے بغیر پورے اعتماد کے ساتھ زندگی کا سفر طے کر سکتے ہیں اور منزل مقصود تک پہنچ سکتے ہیں۔

مقصد قیام

علوم دینیہ کی تعلیم واشاعت:

دارالعلوم دیوبند کی خدمات کے متعدد پہلو ہیں اور ہر پہلو روشن اور تابناک! اس نے علوم

دینیہ کی تعلیم واشاعت میں جو کارنامہ انجام دیا اس کا اندازہ صرف اس امر سے لگایا جا سکتا ہے کہ ہندوستان، پاکستان اور بنگلہ دیش کا کوئی دور دراز گوشہ ایسا نہیں ہو سکتا، جہاں مسلمان ہوں اور عقاید واخلاق وسیرت اسلامی میں دیو بند کے اکابر اور فیض یافتگان کے دست تعلیم وتربیت کا کوئی اثر موجود نہ ہو۔ دنیا کی نظروں میں دارالعلوم دیو بند کے قیام کا خاص مقصد علومِ دینیہ کی اشاعت و تعلیم تھا۔ اور اگر صرف یہی مقصد تھا تب بھی مسلمانوں کی علمی وعملی زندگی کا کون سا گوشہ، ذہنی و فکری تربیت کا کون سا اصول، اسلامی تہذیب وثقافت کے تحفظ کا کون سا کام، اخلاق وسیرت کی تعمیر کی کون سی ضرورت، دین ودنیا کی بھلائی کا کون سا میدان اور فلاح فرد وملت کے نصب العین کا کون سا پہلو تھا، جو اس میں نہیں آ گیا۔

مسلمانوں کے کھوئے ہوئے وقار کا حصول:

لیکن اگر کسی کو اصرار ہو کہ تاریخ کے حروف وسواد میں اس کے مقاصد قیام کے دیگر خصایص بھی بتلا دیے جائیں تو جان لینا چاہیے کہ اس کا قیام ہندوستان میں مسلمانوں کے کھوئے ہوئے وقار کا حصول اور قیام ملتِ اسلامیۂ ہندیہ کی تدابیر کے لیے ایک مرکز اور نظام فکر کے ایک بنیادی نقطے کی حیثیت بھی رکھتا تھا۔ مولانا مناظر احسن گیلانیؒ نے دارالعلوم کے قیام کے پس منظر اور مقصد کے بارے میں ''سوانح قاسمی'' میں بہ تفصیل لکھا ہے۔ یہاں مختصراً عرض کیا جاتا ہے۔

۱۔ پس منظر کے بارے میں لکھتے ہیں:

> جس وقت شاملی کے میدان سے وہ خود (حضرت قاسم نانوتوی) اور ان کے رفقاے کار بہ ظاہر ناکامی کے ساتھ واپس ہوئے تو...... یہ واپسی
> ''متحرفا لقتال اور متحیزا الی فئۃ (انفال)
> جنگ ہی کی لیے کتراتے ہوئے یا کسی ٹولی سے ملنے کے لیے ہو سکتی تھی اور یقیناً اسی کے لیے تھی۔''

(سوانح قاسمی: ج ۲، ص ۲۲۳۔۲۲۲)

۲۔ اور اسی چیز کو دارالعلوم کے تعلیمی نظام کا نمایاں ''مرکزی'' اور ''جوہری'' عنصر قرار دیتے ہیں۔ مولانا گیلانی تحریر فرماتے ہیں:

> ''۱۸۵۷ء کی کشمکش کی ناکامی کے بعد قتال اور آویزش کے نئے محاذوں اور میدانوں کی تیاری میں آپ (حضرت نانوتوی) کا دماغ

مصروف ہوگیا۔ دارالعلوم دیو بند کا تعلیمی نظام، اس لائحہ عمل کا سب سے زیادہ نمایاں اور مرکزی وجوہری عنصر تھا۔'' (ایضاً ص ۲۲۳)

۳۔ حضرت مولانا سید محمد میاںؒ نے لکھا ہے کہ جب حاجی رفیع الدین نے مکۂ مکرمہ میں حضرت حاجی امداد اللہؒ کی خدمت میں عرض کیا کہ انھوں نے دیو بند میں ایک مدرسہ قائم کیا ہے، اس کے لیے دعا فرمائیں تو آپ نے عرض کیا:

''سبحان اللہ آپ فرماتے ہیں ہم نے مدرسہ قائم کیا ہے! یہ خبر نہیں کہ کتنی پیشانیاں اوقات سحر میں سر بہ سجود ہو کر گڑ گڑائی ہیں کہ خداوندا! ہندوستان میں بقائے اسلام اور تحفظ علم دین کا کوئی ذریعہ پیدا کر!''

(علماے حق اور ان کے مجاہدانہ کارنامے: ج ۱، ص ۱۷)

۴۔ مولانا مناظر احسن گیلانیؒ نے لکھا ہے کہ جب انھوں نے ایک مرتبہ حضرت شیخ الہندؒ سے دریافت فرمایا کہ سیاسیات میں حضرت کا مسلک کیا ہے؟ تو حضرت پر ایک خاص کیفیت طاری ہوگئی اور حضرت نے فرمایا:

'' حضرت الاستاذ (حضرت نانوتوی) نے اس مدرسے کو کیا درس و تدریس اور تعلیم و تعلم کے لیے قائم کیا تھا؟ مدرسہ میرے سامنے قائم ہوا۔ جہاں تک میں جانتا ہوں ۱۸۵۷ء کے ہنگامے کی ناکامی کے بعد یہ ادارہ قائم کیا گیا کہ کوئی ایسا مرکز ہو جس کے زیر اثر لوگوں کو تیار کیا جائے، تاکہ ۱۸۵۷ء کی ناکامی کی تلافی کی جائے۔'' (سوانح قاسمی: ج ۲، ص ۲۲۶)

مولانا گیلانیؒ نے اسے دارالعلوم کی ''اساسی خصوصیت'' قرار دیا ہے۔ وہ لکھتے ہیں:

''مدرسۂ دیو بند کی یہی وہ ''اساسی خصوصیت'' تھی، جس نے اس مدرسے کے تمام کاروبار حتی کہ تعلیم میں بھی ایسی ہی حریت پرور خصوصیات پیدا کیں اور وہ دینی اور مذہبی حمیت اور غیرت کا ہند گیر ہی نہیں، عالم گیر جامعہ اور اقامتی ادارہ بن گیا۔ اس کے فضلا کا ایک خاص مکتب خیال نمایاں ہوا اور اس کے مستفیدین ایک ایسا خاص بلا جلا اور مرکب نصب العین لے کر باہر نکلے، جس میں سب پر چھا جانے کی اسپرٹ موجود تھی۔''

اب تو دارالعلوم کے ان اصحاب رخصت نے بھی اس حقیقت کو تسلیم کر لیا ہے، جن کے

بزرگ سیاست کے نام سے کانوں پر ہاتھ رکھتے تھے۔ یہ بات کچھ حضرت شیخ الہندؒ یا کسی استاد کے دل میں چھپی ہوئی نہ رہی تھی، بلکہ غیر درسی طور پر حضرت کے ذہن سے نکل کر تلامذہ کی زبانوں تک پہنچ چکی تھی۔ چناں چہ ۱۹۰۵ء کے آغاز میں سر جیمس ڈگس لاٹوش جب دار العلوم دیکھنے کے لیے دیو بند آئے اور اساتذہ سے ملے، طلبہ سے بات چیت کی اور دار العلوم کی تعلیم کی غرض و غایت دریافت کی اور ان کی اپنی زندگی کا مقصد پوچھا، تو انھوں نے جوب دیا:

''ہمارا نصب العین احیاے دین اور خدمت ملک وملت ہے۔''

(تاریخ دار العلوم دیو بند، از سید محبوب رضوی، کراچی، ۱۹۸۹ء ج ا، ص ۲۰۹)

یہ ۱۹۰۵ء کے آغاز کی بات ہے۔ اس کے بارے میں اگر ۱۹۱۵ء میں کوئی شخص کہتا ہے کہ اس کا مقصد صرف اور صرف مذہبی تعلیم کی آزادی ہے، سیاست سے اس کو کوئی غرض نہیں یا آج کوئی پوچھتا ہے کہ دار العلوم دیو بند کے قیام کا کیا مقصد تھا تو اس کی سادگی پر حیرت اور تجاہل پر افسوس ہوتا ہے۔ آخر یہ انداز گفتگو کیا ہے اور اس پوچھنے کا کیا مقصد ہے؟

اگر کسی کو مزید اصرار ہو کہ اس کی خدمات کے ہر پہلو پر وقت کے اصول تالیف وتصنیف کے مطابق الگ الگ بحث کی جائے۔ تو اس صحبت میں بھی گنجایش وفرصت کے مطابق اس کی خصوصیات کے مختلف پہلوؤں کی طرف ضروری اشارات کیے جا سکتے ہیں۔

مدارس کے قیام کی ہمہ گیر تحریک:

دار العلوم دیو بند ملت کے چند بہی خواہوں نے جن مقاصد کے لیے قائم کیا تھا، وہ مقاصد سہارن پور کے ایک گم نام قریے میں صرف ایک مدرسہ قائم کر دینے سے پورے نہیں ہو سکتے تھے۔ ضرورت تھی کہ اس جذبے کو عام کیا جائے اور مدارس دینی کا ایک جال پورے ملک میں پھیلا دیا جائے۔ چناں چہ دار العلوم کے بانیان کرام نے ایک ایسا دینی جذبہ پیدا کیا کہ اسی زمانے میں ملک کے طول وعرض میں کئی مدرسے قائم ہوئے ۱۲۹۶ء (۱۸۷۹ء) میں ''مدرسہ قاسمیہ، مراد آباد'' کا قیام عمل میں آیا، جو اب عام طور پر ''مدرسہ شاہی مسجد'' کے نام سے مشہور ہے۔ اس کی بنیاد حضرت قاسم العلوم حجۃ الاسلام مولانا محمد قاسم نانوتویؒ کے مقدس ہاتھوں سے رکھی گئی۔ اس کے چند سال بعد حضرت قاسم العلوم ہی کے ایما و تحریک پر ''جامعۂ اسلامیۂ عربیہ'' کے نام سے امروہہ میں ایک مدرسہ قائم کیا گیا۔ نگینہ (یو۔ پی) میں ۱۲۹۲ء سے ایک مکتب قائم تھا حضرت حجۃ الاسلامؒ کے

مشورے سے اسے ترقی دے کر علوم اسلامی کی ایک قابل فخر درس گاہ بنادیا گیا اور حضرت ہی کے نام پر اس کا نام ''مدرسۂ قاسمیہ عربیہ'' رکھا گیا۔ ''مظاہر العلوم، سہارن پور'' کا قیام ۱۸۹۶ء میں عمل میں آیا۔ اس کے آغاز و بنا میں بھی بانیان دارالعلوم دیو بند کے احباب و اخلاف کا ہاتھ تھا اور دارالعلوم دیو بند کے مقاصد تعلیم و تربیت ہی اس کے مقاصد قرار پائے تھے۔ بانیان دارالعلوم دیو بند کے احباب اور شاہ محمد اسحاق اور حضرت مولانا عبدالحی و شاہ اسماعیل شہید رحمہم اللہ کے تلامذہ میں سے مولانا سخاوت علی جون پوری نے جون پور میں گذشتہ صدی کے اواخر میں مدرسۂ قرآنیہ قائم کیا۔

مدارس کے قیام کا یہ سلسلہ دارالعلوم، دیو بند کے آغاز ہی سے شروع ہو گیا تھا اور ملک کے طول و عرض میں متعدد مدارس قائم ہو چکے تھے، لیکن یہ چمن بندی کا آغاز تھا، فصل گل کا موسم ابھی دور تھا۔ اس موسم کا آغاز حضرت شیخ الہند مولانا محمود حسن دیو بندی علیہ الرحمۃ کے عہد سعادت سے ہوتا ہے۔ آپ کے زمانے میں اور آپ کے تلامذہ کی کوششوں سے برعظیم پاک و ہند کا چپہ چپہ علوم دینی کی ضیا پاشیوں سے جگمگا اٹھا اور ملی تحریکات اور ملک کی آزادی کی جدو جہد میں ایک نئی روح دوڑ گئی۔ آپ کے مساعی مشکور سے ملت کے مضمحل و منتشر قوئی میں ایک نئی قوت اور اعضا و جوارح کے افعال و اعمال میں ایک نظم پیدا ہو گیا اور دارالعلوم کا فیضان عام ہوتا چلا گیا۔

۱۸۹۵ء میں مولانا رشید احمد گنگوہی کے خلیفہ و مجاہد ملت حافظ محمد صالح، مولانا فضل احمد، منشی رحمت اللہ اور دیگر حضرات نے ''مدرسۂ رشیدیہ'' کے نام سے رائے پور ضلع جالندھر میں ایک مدرسہ قائم کیا۔ ۱۹۰۵ء میں ''مدرسہ نعمانیہ'' کے نام سے امرتسر میں اسی سلسلے کے وابستگان نے ایک دینی درس گاہ قائم کی۔

دہلی کی مشہور دینی درس گاہ ''مدرسۂ امینیہ'' حضرت شیخ الہند کے شاگرد رشید مولانا امین الدین نے قائم کی اور دوسرے نامور شاگرد حضرت مفتی اعظم مولانا کفایت اللہ شاہ جہان پوری ثم دہلوی کے اخلاص و ایثار نے اسے ایشیا کی چند مشہور دینی جامعات کی صف میں شامل کر دیا۔ سندھ میں حضرت شیخ الہند کے نامور شاگرد مولانا عبیداللہ سندھی نے گوٹھ پیر جھنڈا (ضلع حیدرآباد) میں ''دارالرشاد'' کے نام سے ۱۹۰۱ء میں ایک مدرسہ قائم کیا، پھر ۱۹۱۲ء میں اسی نام سے نواب شاہ (سندھ) میں ایک مدرسہ قائم کیا، اس سے پہلے ۱۸۸۴ء میں مولوی عبداللہ مرحوم نے ایک مدرسہ کراچی کے محلہ کھڈا (اسلام آباد، شاہ ولی اللہ روڈ) میں قائم کیا تھا۔ مرحوم کے فرزند ارجمند مولانا

محمد صادق حضرت شیخ الہندؒ کے ارشد تلامذہ میں سے ایک تھے، جنھوں نے سندھ میں علوم اسلامی کی ترویج واشاعت، تبلیغ اسلام، رد بدعات ومحدثات اور تحریک آزادی میں نمایاں خدمات انجام دیں۔ مولانا محمد صادق کے مساعی حسنہ کا مرکز ان کے والد کا قائم کردہ مدرسہ تھا، جو تاریخ میں ''مدرسہ مظہر العلوم'' کے نام سے مشہور ہے۔ لاہور میں حضرت شیخ الہند کے شاگرد رشید مولانا احمد علی لاہوری نے جو علوم قرآنی میں اپنے امتیاز وتبحر کی بنا پر شیخ التفسیر کے لقب سے یاد کیے جاتے ہیں، ۱۹۲۴ء میں ''مدرسہ قاسم العلوم'' کے نام سے علوم دینی کی ایک درس گاہ کا آغاز کیا۔ ۱۳۵۰ء (۱۹۳۲ھ) میں ڈھابیل (سورت) میں ''جامعۂ اسلامیہ'' کے نام سے مولانا انور شاہ کاشمیری اور مولانا شبیر احمد عثمانی کی کوششوں سے ایک اسلامی یونیورسٹی کا قیام عمل میں آیا، جس نے بہت تھوڑی مدت میں دینی وتعلیمی حلقوں میں اعتماد پیدا کرلیا۔ حضرت شیخ الہند کے تلامذہ کی صف میں ہر دو حضرات کسی تعارف کے محتاج نہیں، ۱۳۲۷ھ (۱۹۰۹ء) میں سرائے میر (ضلع اعظم گڑھ) میں چند مخلصین ملت نے جو اس سے پہلے انجمن اصلاح قائم کر چکے تھے، ایک دینی مدرسہ قائم کیا، جس کا سنگ بنیاد حضرت شیخ الہند کے شاگرد مولانا سید میاں اصغر حسین دیوبندی کے مبارک ہاتھوں سے رکھا گیا۔ ۱۹۲۴ء میں گجرات کے ضلع کھیڑ میں آنند کے مقام پر حضرت مفتی اعظم مولانا کفایت اللہ علیہ الرحمہ کے ہاتھوں ''جامعۂ عربیہ تعلیم الاسلام'' کے نام سے ایک مدرسے کی بنیاد پڑی، جس نے گجرات کے علاقے میں علوم دینی کی اشاعت اور تبلیغ اسلام میں نمایاں کردار ادا کیا۔ ۱۹۱۳ء حضرت شیخ الہندؒ کے مشورے سے مولانا عبید اللہ سندھی نے دہلی میں ''مدرسہ نظارۃ المعارف القرآنیہ'' کے نام سے ایک مدرسہ قائم کیا۔ اگرچہ یہ ایک چھوٹا سا مدرسہ تھا، جس میں دو تین استاد درس قرآن حدیث کی خدمت میں مصروف تھے اور ایک خاص جماعت جو دارالعلوم دیوبند اور علی گڑھ کالج کے فارغین پر مشتمل تھی، مولانا سندھی مرحوم کے زیر تعلیم وتربیت تھی، لیکن انگریزی حکومت اس چھوٹے سے ادارے سے جس طرح لرزہ براندام تھی اس کا کچھ اندازہ ''تحریک شیخ الہندؒ'' کے مطالعے سے ہوتا ہے۔ ۱۳۵۰ء (۱۹۳۲ء) میں مدرسۂ دینیۂ اسلامیہ غازی پور، ملت کے چند بہی خواہوں اور علوم اسلامی کے شائقین کے ہاتھوں قائم ہوا، لیکن اس کا نظام تعلیم وتدریس دارالعلوم سے مستعار اور زمام تعلیم وتدریس شروع سے اب تک فاضلین دیوبند کے ہاتھوں میں رہی ہے۔ غازی پور کا مشہور اور تاریخی مدرسہ ''چشمۂ رحمت'' ۱۲۸۶ء میں قائم ہوا اگرچہ اس کے بانیوں کا پہلا تعلق علمائے فرنگی محل سے تھا، لیکن آغاز کے بعد مدرسۂ ہر دور میں فرزند

ان دارالعلوم دیو بند کے مساعی اور خدمات کا منت گزار رہا ہے۔ جون پور کے قصبہ صبر حد کی مثالی درس گاہ ''مدرسۂ فاروقیہ'' کی تعلیمی و اصلاحی روح وہی ہے، جو دارالعلوم دیو بند کے نظام تعلیم و تربیت میں رواں ہے۔ پٹنہ کے مشہور و معروف ''مدرسۂ اسلامیہ شمس الہدیٰ'' کا قیام ۱۹۱۲ء اور اس کی ترقی دارالعلوم دیو بند کے چشمۂ علم و عرفان سے سیراب ہونے والوں کی رہین منت ہے۔ اس سلسلے میں ''جامعۂ ملیہ نوا کھالی'' کا ذکر بھی ضروری ہے۔ اسے دارالعلوم دیو بند کی ایک شاخ سمجھنا چاہیے۔ اس کے امتحانات اور کارگذاری کی نگرانی دارالعلوم کی طرف سے ہوتی ہے۔

یہ عہد سعادت تو حضرت شیخ الہند اور آپ کے تلامذہ کا دور تھا۔ یہ تحریک اس دور کے بعد ختم نہیں ہوگئی بلکہ گذشتہ ۲۵، ۳۰ سال کے عرصے میں پاکستان کے مختلف شہروں میں چند ایسے دینی مدارس کا قیام عمل میں آیا ہے جن کے ذکر کے بغیر یہ مضمون مکمل نہیں ہوسکتا۔ ان مدارس میں جامعۂ اشرفیہ، لاہور، (۱۹۴۷ء)، جامعۂ رشیدیہ ساہیول، (۱۹۴۷ء)، دارالعلوم خیر المدارس ملتان (۱۹۴۷ء)، دارالعلوم حقانیہ اکوڑہ خٹک، (۱۹۴۷ء)، دارالعلوم الاسلامیہ، ٹنڈوالہ یار حیدرآباد، (۱۹۴۷ء)، دارالعلوم کراچی (۱۹۵۰ء)، جامعۂ اشرفیہ پشاور (۱۹۵۳ء)، جامعۂ مدنیہ، لاہور، (۱۹۵۵ء)، مدرسہ عربیہ اسلامیہ نیوٹاؤن کراچی (۱۹۵۵ء) خاص طور پر قابل ذکر ہیں۔ لیکن اس سلسلۂ ذہب کی یہ آخری کڑیاں نہیں ہیں۔ ان مدارس کے بعد بھی بے شمار مدارس پاکستان کے طول و عرض اور ہندوستان اور بنگلہ دیش کے دور دراز علاقوں میں قائم ہوئے ہیں۔

یہ تمام ادارے برعظیم میں علوم اسلامی کی تعلیم و تدریس، اسلامی شعائر اور تہذیب و ثقافت کے تحفظ، ملک کی آزادی کی جدو جہد اور ملی تحریکات اور اسلامی علوم و فنون کی ترویج و اشاعت کی تاریخ میں نمایاں مقام رکھتے ہیں۔ یہ تمام مدارس اپنا اپنا جداگانہ اور مستقل نظام اور حلقۂ اثر رکھتے تھے، لیکن ہندوستان، پاکستان اور بنگلہ دیش میں اسلامی تعلیم و تربیت کے نظام میں دارالعلوم دیو بند اور ان اداروں کا تعلق وہی تھا جو نظام فلکی میں سورج اور دوسرے سیاروں کا ہے۔

ان سطروں کے مطالعے سے دارالعلوم دیو بند کے دائرۂ فیضان کا جو تصور ذہن میں قائم ہوتا ہے، وہ حقیقت کے مقابلے میں بہت کم ہے۔ بات یہ ہے کہ ابھی تک اس موضوع پر کوئی کام ہی نہیں کیا گیا اور کوئی سنجیدہ کوشش ایسی نہیں کی گئی ہے، جس سے دارالعلوم دیو بند کی افادہ و فیضان کا واقعی اندازہ ہوسکے۔

توجہ کی ضرورت

یہ تو دارالعلوم، دیو بند کے سلسلے کے چند خاص مدرسے تھے، لیکن اگر صوبہ یا علاقہ وار جائزہ لیا

جائے تو صرف ایک مضمون اس مواد کا متحمل نہیں ہوسکتا، اس کے لیے ایک کتاب کی ضرورت ہے ہوگی، ہندوستان پاکستان اور بنگلہ دیش کا کون سا گوشہ ایسا ہے، جہاں دارالعلوم دیوبند کے سلسلے کا چھوٹا یا بڑا کوئی مدرسہ قائم نہیں ہے۔

ہندوستان میں اہم مدارس کی ایک مختصری فہرست غلام رسول نے مرتب کی ہے۔ دوسری فہرست جو بہار واڑیسہ کے اہم مدارس کی ہے پروفیسر عبدالمنان کی کوشش کا نتیجہ ہے۔ گجرات کے باکمال اور برگزیدہ علمائے کرام کی دینی خدمات کا ایک مختصر جائزہ حضرت مفتی اعظم محمد کفایت اللہ نے لیا ہے اسی طرح مالا بار میں دینی تعلیم کی مرکزی درس گاہوں کے بارے میں محمد اسلم نے معلومات فراہم کی ہیں۔ (ان مضامین کے لیے دیکھیے البلاغ بمبئی (تعلیمی نمبر) سابق مغربی پاکستان (موجودہ پاکستان) کے عربی مدارس کا ایک مفصل جائزہ حافظ نذر احمد نے مرتب کیا۔[۱] ''علم وآگہی'' کراچی کے دو ضخیم نمبروں (برصغیر پاک و ہند کے علمی، ادبی اور تعلیمی ادارے جلد اول دوم): مولفہ و مرتبہ ابوسلمان شاہ جہان پوری و دیگر حضرات، میں دیوبندی مکتبۂ فکر کے بہت سے تعلیمی اور علمی ادبی اداروں اور انجمنوں کے حالات سمیٹ لیے گیے ہیں۔ اس سلسلے میں ''برگ گل'' کراچی کا تعلیمی پالیسی نمبر بھی قابل توجہ ہے۔

ان کتب ورسائل میں مدارس کی تاریخ اور اس کے بانیوں کے حالات کے مطالعے سے بخوبی اندازہ ہوسکتا ہے کہ دارالعلوم دیوبند کی فیض رسانیوں اور اس کے اکابر و اصاغر کی نفع بخشیوں کا دایرہ کتنا وسیع ہے!

دارالعلوم دیوبند کے اثرات

مرکز علی گڑھ میں انقلاب فکر ونظر کا پس منظر:

قدیم وجدید کی تفریق ہندوستان پاکستان میں مسلمانوں کی ملی زندگی کا ایک اہم مسئلہ رہا ہے۔ دیوبند کو قدامت کا پرستار اور علی گڑھ کو جدت کا دالہ وشیدا بتایا گیا ہے۔ اس خلیج کو پاٹنے کی مختلف دردمندانِ قوم نے کوشش کی۔ لیکن یہ عجیب بات ہے کہ الزام جدت کے پرستاروں کی طرف سے قدیم طرزِ فکر کے علما پر اور قدیم وجدید کے مابین خلیج کو پاٹنے کی تمام تر کوششیں بھی انھیں کی طرف سے عمل میں آئیں! اور حیرت ہے کہ انھیں پر قدامت پرستی کا طعنہ! ندوۃ العلماء اس کی ایک مثال ہے، جس کے محرکوں اور بانیوں میں دیوبند کے سلسلے کے بزرگ واکابر نمایاں

ہیں۔ حضرت شیخ الہندؒ نے دیو بند اور علی گڑھ کے مابین خلیج کو پاٹنے کی نہایت مخلصانہ کوششیں کیں۔ علی گڑھ کے فارغ التحصیل طلبہ کے لیے خصوصی نصاب کا بندوبست کیا اور دار العلوم کے فارغین کی علی گڑھ جانے اور جدید علوم سیکھنے میں ان کی ہمت افزائی کی۔ مدرسۂ نظارۃ المعارف القرآنیہ دہلی قائم ہوا تو اس کے سرپرستوں میں حکیم اجمل خاں مرحوم کے ساتھ نواب وقار الملک کو برابر کا شریک بنایا۔ اپنی زندگی کے آخری دور میں بیماری کی انتہائی شدت کے باوجود حضرت شیخ الہند نے علی گڑھ کا سفر کیا۔ اپنے وصال سے چند دن قبل جامعۂ ملیہ، دہلی کا سنگ بنیاد رکھا اور زندگی کے آخری لمحوں تک وہ اس کوشش میں مصروف رہے کہ علی گڑھ کے قلب کی سیاہی ایمان کی روشنی میں بدل جائے، لیکن ان مخلصانہ مساعی کے صلے اور جواب میں علی گڑھ کے فرزندوں نے حضرت شیخ الہندؒ، آپ کے ساتھیوں، شاگردوں، جاں نثاروں، مولانا سندھی وغیرہ کی جاسوسی کی، ان کے لیے مشکلات پیدا کیں، قید و بند کے دروازے کھولے، گورنمنٹ میں عہدے اور منصب اور سرٹیفکیٹ حاصل کیے اور اس طرح دار العلوم کے اکابر اور مخلصین ملت کی ایک ایک سعی کو ناکام بنا دینے کی کوشش کی۔ حتیٰ کہ ان بزرگوں کی توہین و تضحیک اور انھیں رسوا و بدنام کرنے کے لیے افترا و بہتان اور ان کی جان تک لینے کی کوشش سے بھی دریغ نہ کیا۔ دیو بند اور علی گڑھ کی یہ کشمکش تھی جس نے بعد میں مسلم لیگ اور جمعیت علماے ہند کی چپقلش کی صورت اختیار کی۔ انتہائی تلخ تجربات کے باوجود اس دور میں علماے دیو بند کو مسلمانوں کے اتحاد و اتفاق اور قدیم و جدید کی ہم آہنگی سے مایوس نہیں ہوئی، لیکن مسلم لیگ کے اکابر نے جو رویہ اختیار کیا، اس کی دردناک روداد مولانا شبیر احمد عثمانیؒ نے اپنے ایک انٹرویو میں بیان کر دی ہے۔ یہ انٹرویو خواجہ عبد الوحید مرحوم نے لیا تھا اور علامہ عثمانی کی زندگی ہی میں لاہور کے اخبار سہ روزہ زمزم میں چھپوا دیا تھا۔ اس کے باوجود کہ علی گڑھ دیو بند کو کبھی گوارا نہیں کر سکا لیکن ملت کی غم گساری اور اسلامی اخلاق و سیرت اور اخلاص و عمل میں دیو بند سے متاثر ہوئے بغیر بھی نہ رہا۔

علی گڑھ کے جامد اور انگریز پرست ماحول سے جو چند آزادی کے متوالے اور ملت کے بہی خواہ نکلے، جنھوں نے علی گڑھ کی پیشانی سے کلنگ کا ٹیکا مٹانے کی کوشش (۱) کی لیکن وہ اپنی اس

---

(۱) علی گڑھ کالج کے قیام کا خاص مقصد مسلمانوں کے طبقۂ اشرافیہ میں یورپین سائنسز اور لٹریچر کا رواج اور انگریزوں کے خدمت گزاروں کا ایک طبقہ پیدا کرنا تھا۔ نواب محسن الملک نے جو ایڈریس اور اسپیچیں متعلق محمڈن اینگلو اورینٹل کالج علی گڑھ (از ابتداے فونڈیشن ۱۸۷۵ء لغایت ۱۸۹۸ء) مرتب کیے اور علی گڑھ انسٹی ٹیوٹ پریس میں چھپوائے اور (بقیہ حاشیہ اگلے صفحے پر)

کوشش میں کامیاب نہ ہوئے، نہ بنیاد کی ٹیڑھ کو دور کر سکے اور نہ نیت وعمل کی کالک اس کی تاریخ کے چہرے سے دھوئی جا سکی۔ لیکن اس کے بعض اخلاف اپنے اخلاص اور بہی خواہی ملت کا نقش ضرور لوگوں کی دلوں پر ثبت کر گئے۔ ان میں مولانا محمد علی، شوکت علی، تصدق احمد خان شیروانی، حسرت موہانی، مولانا ظفر علی خان، مہدی افادی، مولانا حمید الدین فراہی، اقبال سہیل، عبدالمجید خواجہ، طفیل احمد منگلوری، قاضی عبدالغفار، ڈاکٹر سید محمود، ڈاکٹر ذاکر حسین، شیخ عبداللہ (کشمیری) اور چند ایسے ہی اور حضرات ہیں۔ یہ تمام اصحاب کسی نہ کسی درجے میں حضرت شیخ الہندؒ سے متاثر اور آپ کے نقش سیرت کے گرویدہ تھے اور اسی تاثر اور گرویدگی کے نتیجے میں قومی خدمت کو اپنی زندگی کا مقصد ٹھہرایا تھا۔ علی گڑھ میں سرسیدؒ کی گدایانہ پالیسی کے خلاف جو احساس اور جذبہ پیدا ہوا، اس میں سب سے نمایاں اثر دیوبند کا تھا۔ حال آں کہ دیوبند کے اکابر نے علی گڑھ کے خلاف نہ تو کبھی پر جوش تقریریں کی تھیں، نہ لوگوں کے جذبات کو بھڑکایا تھا اور نہ محمد علی کی طرح اس کی اینٹ سے اینٹ بجا دینے کی دھمکی دی تھی۔ لیکن دیوبند کی ایک سیرت تھی جس نے علی گڑھ کی آنکھوں کی خیرہ کر دیا تھا۔ یہ سیرت اپنا کام کر رہی تھی اور اس کے اثرات رفتہ رفتہ پھیل رہے تھے۔

علمی اشخاص اور دائروں میں دیوبند کے اثرات:

علی گڑھ کے علاوہ ملک میں دوسرے سیاسی و دینی ادارے اور ثقافتی و تہذیبی حلقے بھی دیوبند سے متاثر ہونے۔ نواب وقار الملک ظاہر ہے کہ علی گڑھ کی پیداوار نہ تھے۔ حکیم اجمل خان ایک دوسرے دائرے سے تعلق رکھتے تھے۔ ڈاکٹر انصاری (مختار احمد) کا میدان دوسرا تھا، وہ ایک مختلف فن کے شخص تھے۔ علامہ اقبال کی ابتدائی تعلیم و تربیت کے سانچے دوسری مٹی سے تیار ہوئے تھے۔ بعد میں بھی ان کی شخصیت اور فکر کے نشو و نما کی دنیا دوسری تھی۔ وہ اپنے ہی عالم افکار کے بلند پرواز شاہین تھے۔ حالی و شبلی اپنی الگ الگ دنیائیں رکھتے تھے۔ اکبر الہ آبادی کا اپنا الگ

(گذشتہ صفحے کا بقیہ)

دسمبر ۱۸۹۸ء میں شائع کیے تھے، اس کی تمہید (پیش لفظ) میں فرماتے ہیں:

"اصلی مقصد اس کالج کا یہ ہی ہے کہ مسلمانوں میں عموماً اور بالتخصیص اعلیٰ درجے کے مسلمان خاندانوں میں یورپین سائنس اور لٹریچر کو رواج دے اور ایک ایسا فرقہ پیدا کرے جو از روے مذہب کے مسلمان اور از روے خون اور رنگ کے ہندوستانی ہوں، مگر باعتبار مذاق اور راے و فہم کے انگریز ہوں۔" (صفحہ ۲)

یہ محسن الملک کا بیان ہے۔ سرسید کے بعد ان سے زیادہ ذمہ دار کون تھا؟ وہ علی گڑھ تحریک کے رکن رکین تھے، کالج کے ٹرسٹی تھے، کالج کے سیکریٹری ہوئے اور ہر طرح تحریک کی نمائندہ شخصیت اور اس کے ترجمان تھے!

مزاج تھا لیکن حضرت شیخ الہندؒ کی شخصیت اور دارالعلوم دیو بند کے کردار سے سب متاثر تھے۔ ان میں ایسی کشش تھی کہ جو ایک نظر ان پر ڈالتا تھا، انھی کا ہو رہتا تھا۔

دیو بند کے اثرات ملک کے اداروں اور شخصیات ہی پر نہیں، بیرون ملک کی اکابر شخصیات پر بھی پڑے اور ادارے بھی ان سے متاثر ہوئے۔ سفرنامۂ اسیر مالٹا، نقش حیات، تحریک شیخ الہندؒ، ریشمی رومال تحریک، مولانا عبیداللہ سندھی کی تحریرات، اقبال شیدائی کی سرگزشت، ظفر حسن کی آپ بیتی وغیرہ کے مطالعے سے اندازہ ہوتا ہے کہ دارالعلوم دیو بند کی ملی و سیاسی تحریک سے افغانستان، ترکی اور حجاز کی متعدد اہم شخصیات متاثر تھیں۔

دارالعلوم دیو بند کے اثرات بعض مستقل مکاتب فکر اور علمی خانوادوں پر بھی پڑے۔ اس سلسلے میں پنجاب کے غزنوی خاندان اور یوپی کے بعض اہل حدیث علماء کے نام لیے جاسکتے ہیں۔ علمائے اہل حدیث خصوصاً غزنوی خاندان اپنی ایک مستقل علمی اور تعلیمی، تہذیبی روایت رکھتا ہے۔ اس کے فکر و خدمات کا پیمانہ بہت بلند ہے۔ وہ دین اور ملت کی خدمت گذاری کی عظیم الشان تاریخ میں اپنا امتیاز رکھتا ہے۔ اسی طرح لدھیانہ کا خانوادۂ علمی جس کے آخری دور کے ورثائے علم و عمل میں مفتی محمد نعیم اور مولانا حبیب الرحمٰن کے سے اصحاب عزیمت دعوت گزرے ہیں۔ دایرۂ شاہ اجمل (الٰہ آباد)، فرنگی محل (لکھنو) اور بدایوں، رام پور، خیرآباد، ٹونک، اجمیر وغیرہ کے خانوادہ ہائے علم و تصوف اور تعلیم و تدریس کے دور آخر کے اکابر کے حالات ہمارے سامنے ہیں، تمام حضرات حضرت شیخ الہندؒ کی فکر کی تابانیوں سے متاثر اور حضرت کی شخصیت کی عظمت واجلال کے معترف تھے۔ مولانا ابوالکلام آزاد اپنی ذات سے ایک انجمن اور ایک مستقل حیثیت کے مالک تھے۔ ان کی تعلیم و تربیت ان کا ابتدائی ماحول بالکل دوسرا تھا۔ ان کے والد کا مکتبۂ فکر دوسرا تھا۔ وہ اپنی زندگی کی تعمیر میں اپنے والد کی شخصیت کے بھی رہین منت تھے۔ بلاشبہ انھوں نے اپنے والد کی سیرت کے کچھ اجلے نقوش کو اپنا لیا تھا، لیکن دارالعلوم دیو بند کی خدمات اور حضرت شیخ الہند کی سیرت کی جلوہ سامانیوں نے انھیں بھی اپنا گرویدہ بنالیا تھا۔

بیسویں صدی کی ایک بڑی علمی شخصیت علامہ سید سلیمان ندوی کی تھی۔ انھیں ندوۃ العلماء کا فرزند عظیم کہنا چاہیے، لیکن دارالعلوم دیو بند کے دایرہ اثر سے وہ بھی باہر نہ رہے۔ وہ مولانا اشرف علی تھانویؒ سے سلسلۂ بیعت میں منسلک اور مجازِ بیعت وارشاد تھے۔ یہ حضرت تھانویؒ کا فیضان نظر تھا یا مکتب دیو بند کی کرامت کہ اس تعلق بیعت کے بعد ان کے خیالات میں انقلاب

عظیم پیدا ہوا۔ معراج روحانی کے اثبات میں ان کی پاس عقل و منطق کے استدلالات کی کمی نہ تھی۔ وہ روایات کا سہارا لے سکتے تھے۔ بعض صحابہ اور علماء و حکما کے اختلافات سے اپنے مقدمے کو مستحکم کر سکتے تھے۔ لیکن ان کی روح سعید و قلب سلیم نے ان بنیادوں پر افکار کی تعمیر گوارا نہ کی اور اسی مسلک کو اختیار کیا، جس کی طرف حضرت تھانوی کے فکر نے رہنمائی کی تھی اور علمائے دیو بند کا مسلک تھا۔

اسی سلسلے میں مولانا عبدالباری ندوی اور مولانا عبدالماجد دریابادی کا نام بھی آتا ہے۔ ان کی عقیدتوں اور ارادتوں کے رشتے اکابر دیو بند سے ہمیشہ استوار رہے۔ دور حاضر کی آخری شخصیتوں میں مولانا سید ابوالحسن علی ندوی کی نامور شخصیت تھی۔ ان کا تعلق رائے بریلی کی ایک تاریخی خانوادۂ علم و عرفان سے ہے۔ وہ خود دعوت و ارشاد کے سلسلے کی ایک اہم شخصیت ہیں۔ ان کے خاندان میں علم و دین، سیرت و اخلاق اور عرفان و تصوف کا کون سا سرمایہ نہ تھا، جس کے لیے وہ دوسروں کے محتاج ہوتے، لیکن علمائے دیو بند سے ان کی عقیدت و ارادت معلوم ہے اور علوم قرآنی میں اسی مدرسۂ فکر کے ایک عالم ربانی شیخ التفسیر مولانا احمد علی لاہوری کی تعلیم و تربیت اور سیرت کی جھلک ان کے آثار علم و فکر اور سیرت میں دیکھی جا سکتی ہے۔

علمی خدمات:

علمی خدمات کے میدان میں بھی دیو بند اور اس کے فرزندوں نے صرف کام نہیں کیا، کارنامے انجام دیے ہیں۔ یہ علمی خدمات شخصی طور پر بھی انجام دی گئی ہیں اور منظم علمی اداروں کی صورت میں بھی۔ دارالعلوم دیو بند نے بلند پایہ اہل قلم مصنف، شاعر، صحافی اور مختلف علوم و فنون کے ماہرین پیدا کیے۔

خدام القرآن:

مفسرین و مترجمین قرآن کے سلسلے میں سب سے پہلا نام حضرت شیخ الہندؒ کا آتا ہے۔ آپ کے شاگردوں میں کئی حضرات ایسے گزرے ہیں، جن کا شمار بلند پایہ مفسرین میں ہوتا ہے۔ ان میں مولانا شبیر احمد عثمانی، مولانا عبیداللہ سندھی، مولانا اشرف علی تھانوی، خاص طور پر قابل ذکر ہیں۔ تھانوی سلسلے کے بزرگ مفتی محمد شفیع دیو بندی نے ''معارف القرآن'' کے نام سے اور بعض دوسرے بزرگوں نے تفسیری لٹریچر میں کتنے ہی دفاتر کا گراں قدر اضافہ کیا ہے۔ مولانا عبدالماجد

دریابادی کا شمار بھی اسی خانقاہ علم وتصوف کے مفسرین میں کیا جانا چاہیے، لیکن ان کا اپنا انداز تفسیر ہے۔

مولانا حفظ الرحمٰن سیوہاروی ایک جامع کمالات شخصیت کے مالک تھے انھوں نے دعوت قرآن وتفسیر کا ایک کا خاص میدان اور اسلوب اختیار کیا اور قصص القرآن کے نام سے اپنی یادگار چھوڑ گئے۔ اسی مجوزہ اسلوب کو مخدومی ومطاعی حضرت مولانا شریف احمد صاحب مدظلہ العالی نے دعوتِ قرانی کی عمومی اشاعت کے لیے اختیار فرمایا ہے۔ ''تذکرۃ الانبیاء'' اور ''خاتم الانبیاء'' (دو حصے) حضرت کی تالیف لطیف ہے۔

حضرت لاہوری کے بعد ان کے خلیفہ ارشد مولانا قاضی زاہد الحسینیؒ نے اپنے دروس قرآن کے ذریعے دعوت رجوع الی القرآن کو پاکستان کے شمال مغربی علاقے کے امصار وقریات تک عام کرنے میں سعی بلیغ کی اور اس میں وہ بہت کامیاب رہے۔ موجودہ دور کے بزرگوں میں حضرت صوفی مولانا عبد الحمید سواتی صاحب دامت فیوضہم کی خدمت دروس واشاعت تفسیر کی عظمت ووسعت اور اس کے فیضان واثرات کا تقاضا ہے کہ اس پر تحقیق وتعارف کی خاص نظر ڈالی جائے۔ حضرت صوفی صاحب نے خانوادۂ ولی اللہ دہلوی اور دیوبند کے اکابر علم وتفسیر کے بہترین خصایص کو اپنے دروسِ تفسیر میں جمع کر دیا ہے۔ حضرت کی ذات گرامی موجودہ دور میں ایک تفسیری مکتبۂ فکر کے بانی کی سی ہے۔

یہ تمام مفسرین اپنی الگ الگ تفسیری خصوصیات کی بنا پر طبقۂ مفسرین میں خاص امتیار رکھتے ہیں۔ مولانا سندھیؒ اپنے خاص مجتہدانہ فکر وذوق اور اندازِ تفسیر کی بنا پر گویا مستقل تفسیری دبستان کے بانی ہوئے ہیں۔

اہل علم ونظر:

عام اہل قلم میں مولانا حفظ الرحمٰن سیوہارویؒ، مولانا سعید احمد اکبرآبادیؒ، شیخ الاسلام حضرت مولانا حسین احمد مدنیؒ، حضرت مفتی اعظم محمد کفایت اللہ دہلوی، مولانا مناظر احسن گیلانیؒ، مولانا ثناء اللہ امرتسریؒ، مولانا اشرف علی تھانویؒ، مولانا سید محمد میاں دیوبندی، وغیرہ ایسے اصحاب علم واہل قلم ہیں جنھوں نے اپنے افکار اور تحقیقات سے اردو کے دینی وتاریخی اور سیاسی لٹریچر میں بیش بہا اضافہ کیا ہے۔ صحافیوں میں مولانا شائق احمد عثمانی (ایڈیٹر عصر جدید، کلکتہ) اور مولانا محمد عثمان فارقلیط (ایڈیٹر الجمعیت، دہلی) اور شاعروں کی صف میں مولانا تاجور نجیب آبادی کے سے نامور

صحافی اور شاعر گزرے ہیں۔ مصلحین امت میں مولانا احمد علی لاہوریؒ، مولانا حسین احمد مدنی، مولانا اشرف علی تھانویؒ محققین و مفکرین اور محافظین ناموس رسالت میں مولانا احمد سعید دہلوی، مولانا حفظ الرحمٰن سیوہاروی مرحومین نامور خطیب ہوئے ہیں قاری محمد طیب صاحبؒ کا شمار بھی پاک و ہند کے بلند پایہ خطیبوں میں ہوتا ہے۔

صحافت:

علمی و مجلاتی صحافت کے میدان میں تو دیوبند کی خدمات کا پیمانہ بہت ہی بلند رہا ہے۔ الرشید، القاسم، دارالعلوم وغیرہ رسائل تو دیوبند سے جاری ہوئے اس کے فرزندوں نے ملک کے طول و عرض میں اردو، عربی وغیرہ کے جو رسائل نکالے ان کی فہرست مرتب کرنے کی طرف ابھی شاید کسی نے توجہ نہیں کی۔ دیوبند کی خدمات کا یہ ایک اہم پہلو ہے۔ رسائل و جراید کے ذریعے وقت کے اہم دینی، معاشی، سیاسی مسائل پر نہایت بلند پایہ لٹریچر فراہم ہوا۔ بلند پایہ علمی، تاریخی اور تحقیقی مقالات لکھے گئے، تہذیب و ثقافت اور دور جدید کے بے شمار مسائل پر فکر انگیز مضامین کا ذخیرہ فراہم ہوا۔ اسلامی تاریخ، سیرت و سوانح، تعلیم، اصلاح، ردِ بدعات و محدثات تو ان کا خاص موضوع ہمیشہ ہی رہا۔

آج بھی ہندوستان پاکستان میں اگر بلند ترین علمی و تحقیقی اور دینی مجلات کی ایک مختصر فہرست تیار کی جائے تو برہان دہلی، الحق، اکوڑہ خٹک اور بینات والبلاغ، کراچی، الرشید اور انوار مدینہ، لاہور، الفاروق جو اردو، عربی انگریزی، سندھی چار زبانوں میں کراچی سے شائع ہوتا ہے اور نصرۃ العلوم، گوجرانوالہ کے نام سرفہرست ہوں گے۔

علمی و تحقیقی اداروں کا قیام:

دارالعلوم دیوبند میں اور اس کے باہر اس کے فرزندوں نے حالات و وقت کے مطابق بلند پایہ علمی و تحقیقی ادارے بھی قائم کیے اور اب تو تقریباً تمام دینی مدارس میں تحقیق اور تصنیف و تالیف کے مستقل شعبے قائم ہو چکے ہیں۔ دارالعلوم دیوبند کی بے شمار اور اہم خصوصیات میں سے ایک یہ ہے کہ اس کے فارغ التحصیل ایسی ذہنی و فکری تربیت سے آراستہ ہوتے ہیں جو کسی راہ میں صرف مقلدانہ گام فرسائی پر اکتفا نہیں کرتے، بلکہ حالات و وقت کے مطابق اپنی راہ آپ پیدا کرتے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ وقت کا جوں جوں تقاضا ہوا علمی ادارے بھی قائم ہوتے گئے اور رسایل و جراید

کا اجرا بھی عمل میں آتا گیا۔ اس کے فرزندوں نے علم و عمل کے مختلف میدانوں میں خدمتِ ملت کی راہیں خود تلاش کیں۔ دارالعلوم کے اندر تصنیف و تالیف کے انفرادی مشاغل کے علاوہ کئی اکیڈمیاں قائم ہیں۔ ان میں سے ''مجلس معارف القرآن'' ہے، شیخ الہند اکیڈمی ہے۔ دارالعلوم سے باہر ندوۃ المصنفین (دہلی) دارالعلوم کے فرزندوں کا کارنامہ ہے، مجلسِ علمی (ڈابھیل حال کراچی) اسی سلسلے کے تحقیق اور تصنیف و تالیف کا ذوق رکھنے والوں نے قائم کی، انجمن خدام الدین، لاہور ہے، بیت الحکمت کے نام سے مولانا عبیداللہ سندھی نے ایک ادارہ قائم کیا۔ جس کا مرکز دہلی اور اس کی شاخیں کراچی، پیر جھنڈا، خان پور، لاہور مین قائم کیں۔ ان کے تحت بعض اہم تصانیف شائع ہوئیں۔ کراچی میں مولانا عبیداللہ اکیڈمی اور مجلس یادگار شیخ الاسلام مولانا سید حسین احمد مدنی رحمۃ اللہ علیہ کی یاد میں سرگرم عمل ہے۔ مولانا قاری شریف احمد صاحب مدظلہم العالی اس کے صدر ہیں۔

ان کے علاوہ تبلیغی و اشاعتی ادارے ہیں جن کی تعداد سیکڑوں سے متجاوز ہے۔ حضرت مولانا سید محمد میاںؒ اپنی ذات سے ایک اکیڈمی تھے انھوں نے گوناگوں تصنیف و تالیف کا جو کام کیا ہے وہ کئی اداروں پر بھاری تھا۔ اگر آپ چاہیں اور نہ چاہیں جب بھی ان کے بجائے جمعیت علما ہند کا نام لے کر لیجیے کہ اس کے شعبۂ تصنیف و تالیف کی سب سے بڑی شخصیت کا نام ''سید محمد میاں'' تھا۔ انھوں نے نہ صرف نظری اور عملی سیاسی موضوعات پر لکھا بلکہ سیرت، تعلیم، فقہ، افتا اور زبان کے مسائل و موضوعات سے لے کر افسانوی ادب کی تخلیق تک کی۔ کسی علم و فن کے بیان میں نہ ان کا قلم کوتاہ تھا اور نہ ان کے موضوعات کا دایرہ تنگ تھا۔

بحیثیت مجموعی علوم و معارف دینی کی تالیف و تدوین میں دارالعلوم کے فرزندوں کو خاص امتیاز حاصل ہی تھا، دیگر علوم و فنون کے مختلف میدانوں میں بھی انھوں نے نمایاں مقام حاصل کیا۔ قرآن کے متعلق مختلف علوم میں، حدیث کے مختلف میدانوں میں، فقہ میں، علوم نقلیہ وغیرہ علوم دینی میں مقلدانہ اور نقل و اقتباس کی خصوصیات ہی کی بنا پر نہیں بلکہ مجتہدانہ نظر و بصیرت کی بنا پر بھی ان کے امتیاز و اختصاص کو دینی و علمی حلقوں میں تسلیم کیا گیا ہے۔ یہ امتیاز دیوبند کی تاریخ ماضی ہی کا حصہ نہیں بلکہ آج تک اس کا یہ امتیاز قائم ہے۔

سیاسی خدمات

اکابر دارالعلوم نے ہمیشہ اور ہر دور میں مسلمانوں کی فلاح و بہبود، ملت کے قیام، اور ملک کی

آزادی اور ترقی کی ہر تحریک میں بڑھ چڑھ کر حصہ لیا اور خواہ مسلمانوں کے مصالح ہوں یا تمام برادران وطن کے مشترک مفاد کی جدو جہد ہو، انھوں نے کبھی ملت کی بہی خواہی اور خدمت خلق کے کاموں میں اپنے آپ کو کسی سے پیچھے نہیں رکھا۔ ملک کی آزادی کی جدو جہد میں وہ کسی دوسری جماعت کے نہ مقلد تھے نہ پیرو۔ تحریک اصلاح و جہاد کے نام سے ان کے بزرگوں نے قیام ملت اور ملک اور تمام برادران وطن کی آزادی اور فلاح و بہبود کا جو نصب العین اپنے سامنے رکھا تھا وہ اسی کی طرف بڑھتے رہے تھے۔ اس میں اپنوں اور بیگانوں سے اختلاف واتحاد کے مرحلے پیش آتے رہے، لیکن انھوں نے نہ کسی پر بھروسا کیا، نہ کسی کا انتظار۔ وہ تمام باتوں سے بے نیاز آگے بڑھتے رہے۔

وطنی اور غیر ملکی تحریکات:

دارالعلوم کے بزرگ فکر وعقیدہ اور علم وتہذیب کی روایات میں جن اسلاف کرام سے نسبت رکھتے تھے اور پھر انھوں نے اپنی تعلیم و تربیت سے جو اصحاب استعداد اپنی روایات کے امین چھوڑے تھے، انھوں نے ایسا قلب گداز اور دل دردمند پایا تھا کہ، ان کے وطن میں یا بیرون وطن، دنیا کے دور یا نزدیک کسی ملک میں کسی کا استحصال ہو، کسی کے حقوق غصب کیے جائیں یا کسی کی آزادی چھینی جائے۔ غرضے کہ اپنی یا کسی غیر قوم کے گلے پر ظلم کا خنجر چلے، وہ تڑپ اٹھتے تھے۔ ان کی ملت پروری، وطن دوستی اور انسانیت نوازی کی داستانیں تاریخ میں رقم ہیں۔ اصحاب دارالعلوم کی خدمات کا دایرہ وطنی تحریکات سے لے کر غیر ملکی تحریکات تک پھیلا ہوا ہے۔

۱۔ وطن کی جنگ آزادی کے ابتدائی دور سے لے کر موجودہ زمانے تک جو ملی اور قومی تحریکیں چلیں، دارالعلوم کے اسلاف سے لے کر اخلاف تک سب نے ان میں حصہ لیا۔ تحریک اصلاح و جہاد (۱۸۲۳ء تا ۱۸۳۱ء وبعدہ)، جنگ آزادی (۱۸۵۷ء)، تحریک ریشمی رومال، (۱۷-۱۹۱۶ء) تحریک ستیہ گرہ (۱۹۱۹ء)، تحریک خلافت وترک موالات (۲۴-۱۹۱۹ء)، تحریک ہجرت (۱۹۲۰ء)، تحریک نمک سازی اور تحریک سول نافرمانی (۱۹۳۰ء وبعدہ)، انفرادی ستیہ گرہ (مقاومت) کی تحریک (۴۱-۱۹۴۰ء)، ہندوستان چھوڑ دو تحریک (۱۹۴۲ء)، تحریک پاکستان (۱۹۴۰ء وبعدہ) وغیرہ میں وقت کے ایثار اور جان و مال کی قربانی کی مثالیں قائم کیں۔

ملک کی آزادی کے بعد ہندوستان کے مسلمان سخت آزمائش سے دوچار ہوئے۔ ان کی زندگی کا پورا نظام تہ وبالا ہو گیا تھا، ان کی معیشت تباہ ہو گئی تھی، انھیں سخت فرقہ وارانہ تعصب کا

سامنا تھا۔ اغوا، قتل، لوٹ مار کا بازار گرم تھا، انھیں ہر طرف سے خطرات نے گھیر لیا تھا، لیکن دارالعلوم کے بزرگوں نے عوام، حکومت، دستور اور امن و اتحاد کی مخالف اور دشمن قوتوں کا ہر سطح پر مقابلہ کیا اور مسلمانوں کی منجدھار میں پھنسی اور ڈوبتی ہوئی کشتی کو ساحل مراد تک پہنچا دیا۔

جن مسائل میں مسلمان ہندوستان میں گرفتار ہوئے، اسی قسم کے مسائل پاکستان میں اقلیتوں کو درپیش تھے۔ دیوبند کے بزرگوں نے دونوں جگہ حالات کا مقابلہ کیا اور متاثرین کی بہترین امداد و حمایت کا کوئی موقع ہاتھ سے جانے نہیں دیا۔ ہندوستان میں مسلمانوں کی تعلیم کے نظام، مقابر و مساجد اور دیگر مقدس مقامات و آثار کے تحفظ، اوقاف کے نظام و بقا کے لیے دستور سازی، متروکہ و غیر متروکہ املاک پر کسٹوڈین اور دوسرے ناجائز قابضین، پاکستان سے واپس جانے والوں کے مسائل کی پیچیدہ صورت حال، تہذیب و ثقافت کے تحفظ اور زبان کی بقا اور فروغ وغیرہ کے مسائل کا سامنا تھا۔ پاکستان میں فرقہ پرستی، تنگ نظری، عداوت، دشمنی کے کم و بیش اسی قسم کے مسائل درپیش تھے، لوٹ مار کا بازار گرم تھا، اغوا، قتل کے واقعات نے زندگی کا سکون و اطمینان چھین لیا تھا۔ ان کے علاوہ جمہوریت کی بقا، دستور سازی، اسلامی نظام کے قیام کی جدو جہد، مسلمانوں کی اصلاح، اخلاق کی تہذیب، باطل فرقوں کی ریشہ دوانیاں، غیر اسلامی تحریکات کا ظہور وغیرہ مسائل درپیش تھے۔ دارالعلوم دیوبند کے مکتبۂ فکر کے علما و عوام نے ہر محاذ پر حالات کی اصلاح کے لیے سخت جنگ لڑی۔

۲۔ دیوبند کے اکابر نے دنیا کے دیگر ممالک کی آزادی، اس کے تحفظ اور ممالک کی بقا و استحکام کی تحریکات میں بھی حصہ لیا۔ افغانستان، ایران، ترکی، بلقان، حجاز، فلسطین، قبرص، مراکش، طرابلس، الجزائر، غرضے کہ ایشیا اور افریقہ و یورپ سے لے کر مشرق بعید کے ممالک تک کی آزادی کی جنگ میں اور وہاں کے عوام پر ظلم اور ان کے استحصال کے خلاف جب بھی کوئی تحریک اٹھی تو دیوبند کے اکابر و اصاغر نے دامے، درمے اور قدمے، سخنے اس میں حصہ لیا اور ظلم و استحصال کی خلاف آواز اٹھانے اور مظلومین کی امداد و حمایت میں کوتاہی نہیں کی۔ اور حالات و وقت گے مطابق ان تمام تحریکات و مسائل میں دین کی تعلیمات حقہ کی مطابق مسلمانوں کی بہترین رہنمائی کا فریضہ انجام دیا۔

اصحابِ عزیمت وایثار:

۱۳۲۷ھ (۱۹۰۹ء) میں جمعیت الانصار دیوبند اور ۱۹۱۹ء میں جمعیت علماے ہند کے قیام سے علماے دیوبند کی ایک جماعت نے ملک کی آزادی کی جدوجہد میں منظم طور پر حصہ لیا۔ اس نے آزادی کی راہ میں ہر طرح کی قربانیاں پیش کیں، قید و بند کی سختیاں جھیلیں، مال ومتاع کا نقصان برداشت کیا اور تجارت وملازمت کے بہترین ذرائع معیشت کو اس راستے میں قربان کر دیا۔

اس جماعت کے ایک ایک فرد نے اتنی قید کاٹی اور اتنا نقصان برداشت کیا کہ مسلم لیگ کے تمام رہنماؤں نے مجموعی طور پر بھی نہ اتنی قید کاٹی ہوگی، نہ اتنا نقصان اٹھایا ہوگا۔ صرف ایک شخص مولانا عبید اللہ سندھی رحمہ اللہ علیہ نے تقریباً چوبیس سال جلاوطنی کی زندگی کے مصائب برداشت کیے۔ ایک مختصر مضمون میں پوری جماعت دیوبند کی جنگ آزادی میں قید و بند کی تفصیلات کی گنجایش تو نہیں نکل سکتی، البتہ وقت کے عظیم مجاہد اور جماعت کے سربراہ شیخ الاسلام مولانا سید حسین احمد مدنی رحمہ اللہ علیہ کو مثالاً پیش کیا جاسکتا ہے۔ حضرت رحمہ اللہ علیہ نے مالٹا میں تقریباً ساڑھے تین برس (دسمبر ۱۹۱۶ء تا جون ۱۹۲۰ء)، مقدمہ بغاوت کراچی میں تقریباً دو برس (ستمبر ۱۹۲۱ء تا ستمبر ۱۹۲۳ء)، سول نافرمانی کی تحریک کے زمانے میں تقریباً ڈیڑھ ہفتہ (۱۹۳۲ء) اور ہندوستان چھوڑ دو تحریک کے زمانے میں تقریباً سوا دو برس (جون ۱۹۴۲ء تا اگست ۱۹۴۴ء)! مجموعی طور پر تقریباً آٹھ برس قید کی زندگی گزاری تھی۔ حضرت کے علاوہ مفتی کفایت اللہ، مولانا احمد سعید دہلوی، مولانا حفظ الرحمٰن سیوہاروی، مولانا سید محمد میاں اور جمعیت علماے ہند سے وابستہ سیکڑوں رہنماؤں اور ہزاروں کارکنوں نے اپنی زندگی کے کتنے برس قید کی کوٹھریوں میں گزارے تھے، حدِ شمار سے باہر ہیں۔ حقیقت یہ ہے کہ علماے ہند اور دارالعلوم دیوبند کی کوئی ایسی سیاسی تاریخ ابھی تک مرتب ہی نہیں ہوئی جس سے یہ معلوم ہو سکے کہ ان دونوں اداروں سے وابستہ صوبوں کی سطح سے لے کر قصبوں اور قریوں تک، کہاں کہاں، کتنے لوگوں نے' کن کن تحریکات میں کتنی سزائیں کاٹیں؟ جان ومال کی کیا قربانیاں دیں؟ اور تجارت، ملازمت وغیرہ ذرائع معیشت کی تباہی کی کن کن آزمایشوں سے گزرے تھے؟

دارالعلوم دیوبند نے اپنے وابستگان سے مجاہدین حریت کی ایک ایسی جماعت پیدا کر دی جس کی مثال ملنی مشکل ہے۔ اس جماعت میں حاجی امداد اللہ مہاجر مکی ہیں، مولانا رشید احمد گنگوہیؒ اور حجۃ الاسلام مولانا محمد قاسم نانوتویؒ ہیں۔ اسی جماعت میں حضرت شیخ الہند رحمہ اللہ علیہ کی ذات

والا صفات نظر آتی ہے، شیخ الاسلام مولانا سید حسین احمد مدنیؒ ہیں، جان نثار اسلام مولانا عزیر گل ہیں ،امام انقلاب مولانا عبید اللہ سندھی ہیں ،فقیہ امت مفتی اعظم کفایت اللہ ہیں ،مجاہد فی سبیل اللہ مولانا محمد میاں منصور انصاری ہیں، عازم حق مولانا محمد صادق (کراچی) وغیرہ بہت سے اصحاب عزیمت دعوت ہیں۔

زنجیر کی آخری کڑیاں:

اس زنجیر کی آخری کڑیاں بھی ابتدائی کڑیوں سے کچھ کم اہم اور کم شاندار نہ تھیں۔ان میں سے ایک کڑی مجاہد ملت مولانا حفظ الرحمٰن سیوہاروی کی سیرت میں ڈھل کر ہمیشہ کے لیے تابندہ وزندہ جاوید ہوگئی تھی۔ حضرت سیوہاروی کی ذات ستودہ صفات بارش کا آخری قطرہ تھا، جو ملت کے نخل امید کو تروتازہ کر گیا۔انھوں نے ہندوستان میں مسلمانوں کی جو خدمات انجام دی اور ان کے حقوق ومفادات کے تحفظ کے لیے جو مجاہدانہ کردار ادا کیا، وہ ہمیشہ یادگار رہے گا۔حضرت مولانا سید محمد میاںؒ کا اصل میدان تصنیف وتالیف اور تحقیق وتدوین تھا،لیکن وہ عملی سیاست میں بھی کسی سے پیچھے نہیں رہے اور کئی بار قید بند کی آزمائش سے گزرے۔اگر ان بزرگوں کے بعد بھی ملت مسلمہ کا وجود باقی اور اس کی رہنمائی کی ضرورت موجود ہے۔تو ہمیں یقین رکھنا چاہیے کہ دارالعلوم کے اخلاف میں بھی ایسی نابغہ اور صاحب عزیمت شخصیتیں ضرور پیدا ہوں گی جو ملت کی کشتی کو بھنور سے نکالیں گی اور اس کے مسافر ساحل مراد کو پالیں گے۔موجودہ دور میں امیر الہند مولانا سید اسعد مدنی کی ذات گرامی مایوسیوں کی تاریکی میں امید کی کرن موجود ہے۔ملت اسلامیہ ہندیہ کے نخل امید کی برومندی کی تمام آرزوئیں حضرت مدظلہ کے وجود سامی سے وابستہ ہیں۔پچھلی ربع صدی کی تاریخ ہمارے سامنے ہے حضرت موصوف کی فراست وتدبر اور جرأت مندانہ قیادت نے مسلمانوں کو بعض بڑے کٹھن مراحل اور مشکل حالات سے نکالا ہے اور نہ صرف ملت اسلامیہ کی رہنمائی بلکہ پوری ہندوستانی قوم کو اتحاد وترقی اور عزت ووقار کی راہ دکھائی ہے۔

ادبی ولسانی خدمات:

اردو زبان کے باب میں بھی اکابر دیو بند کی خدمت کا پیمانہ نہایت بلند رہا ہے اردو کو آسان بنانے ،بول چال کی زبان سے اسے ہم آہنگ کرنے اور ایک علمی زبان کا رتبہ دینے میں سرسید کی خدمات کا صور کچھ میں بلند آہنگی سے پھونکا گیا ہے کہ لوگ یہی سمجھ بیٹھے کہ اس تحریک کے قافلہ

سالار سر سید ہیں۔ ان بے خبروں کو معلوم نہیں کہ تاریخ کی شہادت اس سے مختلف ہے۔ سر سید کی پیدائش کا سال ۱۸۱۷ء ہے حضرت شاہ رفیع الدین کا سال وفات بھی یہی ہے۔ شاہ عبدالقادر کا انتقال اس سے تین سال قبل یعنی ۱۸۱۴ء میں ہو چکا تھا ان ہر دو ابنائے حضرت شاہ ولی اللہ محدث دہلوی کی فرو خدمات میں ترجمہ قرآن بہت نمایاں ہے۔

شاہ رفیع الدین کے ترجمے کی اولیت اور حضرت شاہ عبدالقادر کے ترجمے کی سلاست اور بامحاورہ ونکسالی زبان میں ہونے کی شہادت سر سید نے خود دی ہے اور بابائے اردو مولوی عبدالحق تک اردو کے تمام مورخین اور تذکرہ نگاروں نے ان کے ترجمے کے ادبی ولسانی محاسن کا اعتراف کیا ہے۔ بلاشبہ یہ وہ حضرات تھے جن کی خدمات کو دارالعلوم دیوبند کی خدمات کے زمرے میں محسوب نہیں کیا جاسکتا لیکن یہ وہ اسلاف تھے جن کی وراثتِ علمی و دینی کا سب سے زیادہ حصہ اصحاب دارالعلوم ہی کے نصیب میں لکھا گیا تھا۔

ان اصحاب کے بعد مولانا عبدالحی اور شاہ اسمٰعیل شہیدؒ کا دور آتا ہے یہ زمانہ سر سید کی خورد سالی کا تھا۔ ان حضرات کی خدمات کا غلغلہ بلند تھا اور دہلی کی نکسالی اور بامحاورہ اردو میں ان کی عظیم الشان کتاب ''تقویۃ الایمان'' منصۂ شہود پر آچکی تھی۔ سر سید نے حضرت شاہ صاحب کی تقریروں کے مطالب سے اپنے دامن فکر کو بھرا تھا۔ بلاشبہ حضرت شاہ صاحب بھی بانیان دارالعلوم میں نہ تھے۔ لیکن اس براہیم وقت کی میراث فکر وسیرت تو اکابر دیوبند ہی کے حصے میں آئی، نہ کہ سر سید اس کے وارث ہوئے؟ لیکن اس سے کون انکار کرسکتا ہے کہ حضرت قاسم العلوم مولانا محمد قاسم نانوتویؒ، ''قطب وقت حضرت حاجی امداد اللہ مہاجر مکیؒ اور حضرت مولانا رشید احمد گنگوہیؒ تو دارالعلوم کے بانیوں میں سے تھے۔ یہ حضرات اس وقت بامحاورہ بول چال کی زبان اور آسان وعام فہم اردو میں اپنی متعدد تھے کتب وتصانیف تالیف فرما چکے تھے، جب بانی علی گڑھ کالج سر سید احمد خان صہبائی مرحوم سے مقفیٰ و مسجع زبان لکھنے کی تربیت حاصل کر رہے تھے۔ حضرت قاسم نانوتویؒ کی تالیف رسالہ حجۃ الاسلام، تقریر دل پذیر، مجموعۂ رسائل قاسم العلوم وغیرہ، حضرت امداد اللہ کی تصانیف غذائے روح، ضیاء القلوب، تحفۃ العشاق، فیصلۂ ہفت مسئلہ اور مولانا رشید احمد گنگوہیؒ کی تصانیف کا تعلق خاص سر سید کے عہد سے تھا۔ یہ حضرات بانیاں دارالعلوم تھے۔ ان تصانیف کے ادبی محاسن اور لسانی خصایص کی طرف کم توجہ کی گئی ہے، لیکن ان کا دایرہ اس سے بہت وسیع ہے، جو عام طور پر سمجھا جاتا ہے، ان کی ادبی اور لسانی خدمات کا دور اس وقت سے شروع ہوتا ہے جب سر

سید کتمان عدم سے وجود میں بھی نہ آئے تھے، ان کی خدمات کا یہ سلسلہ اس وقت بھی جاری تھا جب ان کے دودھ کے دانت بھی نہ اکھڑے تھے، وہ یہ خدمت اس وقت بھی اپنے قلم سے انجام دے رہے تھے جب سرسید اپنی تحریر وتالیف میں صہبائی کی نظر وکاوش کے رہین منت تھے اور یہ خدمت انھوں نے اس وقت بھی انجام دی جب سرسید ''انگریزی کی برکتیں'' اور برٹش حکومت کے قیام اور استحکام کے لیے ''اپنی مدد آپ'' قسم کے مضامین لکھ رہے تھے اور دیوبند کی یہ خدمت اس وقت بھی جاری رہی، جب اردو ادب کے عناصر خمسہ میں اختلال پیدا ہوگیا۔ اور رفتہ رفتہ منتشر ہوگئے۔ سرسید اس جہاں سے رخصت ہوگئے اور ان کا کوئی جانشین پیدا نہ ہوسکا، نذیر احمد، شبلی نعمانی، محمد حسین آزاد دوسرے دائروں سے تعلق رکھتے تھے انھوں نے سرسید کی تحریک کی طرف پلٹ کر نہ دیکھا۔ حالی بلاشبہ اپنی وفاداری میں استوار رہے، لیکن ان کے جانشینوں نے ادب میں اپنی راہ آپ بنائی۔ بہ ہر حال سرسید نے زبان وادب کی جو عظیم الشان خدمات انجام دیں ان سے ہرگز انکار نہیں، لیکن حقیقت یہی ہے کہ اولیت کا سہرا اس میدان میں بھی ارباب دیوبند اور ان کے بزرگوں ہی کے سر ہے۔ (ڈاکٹر ابوسلمان شاہ جہان پوری)

دارالعلوم دیوبند کے قیام کا مقصد اولیٰ دورِ قاسمی اور عہدِ محمودی پر ایک سرسری نظر

(۱)

دورِ قاسمی اور اس کے خصائص

تحریکِ ولی اللّٰہی کا نیا دور:

دارالعلوم دیوبند کا قیام شاہ ولی اللہ دہلوی کی تحریک کے دورِ تجدید واحیاے ثانی کا آغاز تھا۔ ولی اللّٰہی تحریک، ۱۔ تالیف وتدوینِ افکار، ۲۔ تعلیم وتربیتِ افراد، ترویج واشاعتِ مقاصد اور ۳۔ تنظیمِ جماعت اور سعی اصلاح وانقلاب حالات کے تین اہم مراحل سے گزری تھی اور ۱۸۵۷ء میں مساعی انقلاب کی ناکامی کے بعد ضرورت پیدا ہوگئی تھی کہ

۱۔ کسی نئے مرکز کا قیام عمل میں لایا جائے، جو دہلی کے مرکز انقلاب کے مقابلے میں محفوظ ہو، اس کے لیے دیوبند (ضلع سہارن پور) کے قصبے کا انتخاب کیا گیا۔

۲۔ نئے حالات میں افکار انقلاب کے تحفظ، تعلیم وتربیت اصحاب، ترویج واشاعت افکار اور تنظیم جماعت کا سروسامان کیا جائے۔ انھی دو اہم مقاصد سے دارالعلوم کا قیام عمل میں آیا تھا۔

دارالعلوم دیوبند کے مربی:

دارالعلوم کے بانیوں میں متعدد حضرات شامل تھے، لیکن اس کے قیام کا جو جامع تصور تھا، وہ حضرت قاسم العلوم مولانا محمد قاسم نانوتوی کے سوا کسی کے ذہن میں نہ تھا۔ دارالعلوم میں تعلیم و تربیت اصحاب استعداد، ترویج واشاعت افکار اور تنظیم جماعت کے تمام کام دارالعلوم کے دو اکابر، مولانا محمد قاسم نانوتوی اور مولانا محمود حسن دیوبندی کے عہد میں تقسیم ہیں۔ حضرت قاسم العلوم کا کارنامہ منصوبہ بندی، مرکز انقلاب کے قیام، اجتماع واتحاد قوی اور تعلیم وتربیت کے دائروں میں ہے اور حضرت شیخ الہند کا کارنامہ تعلیم وتربیت اصحاب استعداد سے لے کر تنظیم قواے ملت، اتحاد اجزاے قوم اور افکار واعمال انقلاب کے تمام جزئیات وکلیات تک وسیع ہے۔

دارالعلوم دیوبند کے قیام کا مقصد محض ایک دینی درس گاہ کا قیام نہ تھا۔ بلکہ وہ احیاے اسلام

اور قیام ملت کی ایک ہمہ جہت تحریک تھی۔ اس میں دینی و اسلامی علوم وفنون کی تعلیم بھی دی جاتی تھی۔ اس میں مسلمانوں کی ذہنی وفکری تربیت اور عوائد و رسوم کی اصلاح اور دعوت وارشاد بھی شامل تھی، تبلیغ واشاعت اسلام بھی اس کی ایک جہت تھی۔ اسلامی زندگی کا قیام، برٹش استعمار کی غلامی سے نجات اور ملک وقوم کی آزادی بھی اس کے مقاصد کے دایرے میں آتی تھی۔

دیوبندی جماعت اور اس کا سلسلہ:

دارالعلوم نے جو جماعت تیار کی تھی، اس میں مختلف صلاحیتوں کے اصحاب شامل تھے اور اگرچہ بہ ظاہر الگ الگ اپنے کاموں میں مصروف تھے لیکن بہ باطن ان میں ایک رابطہ اور اتحادِ فکری موجود تھا۔ تمام قوائے جماعت تقسیم کار کے اصول پر کامل نظم وضبط کے ساتھ مصروف عمل تھے۔

اس سے آگے بڑھ کر ملک کی دوسری مذہبی (سیاسی، جماعتوں اور مردان کار سے بھی تعلقات استوار کر لیے گئے تھے جو بنیادی طور پر دارالعلوم کے مذہبی) اور سیاسی مکتبۂ فکر سے تو تعلق نہ رکھتے تھے، لیکن ولی اللہی سلسلے کے بزرگوں سے عقیدت وارادت یا دینی وملی اور سیاسی و قومی مقاصد میں اتحاد واتفاق کا کسی نہ کسی درجے میں کوئی رشتہ ضروری رکھتے تھے۔ البتہ یہ کام بہت احتیاط اور راز داری کے ساتھ انجام پا رہا تھا۔ حتی کہ دارالعلوم کے لوگوں کو بھی جو سیاسی ذوق سے ناآشنا تھے، خبر نہ تھی۔

دارالعلوم دیوبند نے علوم اسلامیہ کی تعلیم وتدریس، دعوت وارشاد، اصلاح عوائد ورسوم، تصنیف وتالیف اور تدوین علوم ومعارف کے میدانوں میں عظیم الشان خدمات انجام دی ہیں۔ اس کے علاوہ اس کی خدمات کا دایرہ ملک کی آزادی، برٹش استعمار سے عوام کی نجات اور برطانوی قوم کے استحصال سے قوم کو نجات دلانے کی کوششوں، قومی وسیاسی شعور کی تربیت، قوائے ملکی وقومی میں اتحاد، قوم ووطن کی تعمیر کے تمام کاموں، سماج اور سیاست کے تمام میدانوں اور عوام کی زندگی کے تمام گوشوں تک پھیلا ہوا ہے۔

ایک سوچا سمجھا منصوبہ:

دارالعلوم کے مردان کار نے سیاسی زندگی کے مقاصد اور ملک وقوم کی خدمت کے میدان کو محض اتفاق یا حادثے کی بنا پر اختیار نہیں کیا تھا۔ جیسا کہ ملک کے بعض دوسرے اداروں کے افراد حالات کے جبر یا کسی سیاسی تحریک یا شخصیت سے متاثر ہو کر سیاسی میدان میں آئے تھے۔ ملک کی

سیاسی وسماجی خدمت اور قوم کو برٹش استعمار کے استحصال سے نجات دلانا اور قومی سیاسی نظام کا احیا دارالعلوم کے مقاصد قیام میں شامل تھا۔

دارالعلوم کے مقاصد قیام کا یہ پہلو اتنا واضح اور نمایاں ہے کہ اس پر کچھ لکھنے کی ضرورت نہیں لیکن اس موضوع کا تقاضا ہے کہ اسے خاص طور پر نمایاں کیا جائے۔ مولانا مناظر احسن گیلانی دارالعلوم کے قیام کے پس منظر کے بارے میں لکھتے ہیں:

> ''جس وقت شاملی کے میدان سے وہ خود (حضرت قاسم نانوتوی) اور ان کے رفقائے کار بہ ظاہر ناکامی کے ساتھ واپس ہوئے، تو یقیناً ان کی یہ واپسی یاس اور نامرادی کی واپسی نہ تھی اور نہ ہو سکتی تھی...... واپس تو وہ بے شک ہوئے تھے، لیکن یقیناً یہ واپسی ''متحرفاً لقتال اور متحیزاً الیٰ فئۃ'' جنگ ہی کے لیے کتراتے ہوئے یا کسی ٹولی سے ملنے کے لیے ہو سکتی تھی اور یقیناً اسی کے لیے تھی۔'' (سوانح قاسمی: ج ۲، ص ۲۳_۲۲)

نئے محاذ جنگ کی تیاری:

آگے چل کر دارالعلوم کے قیام کو ''قتال کے نئے محاذ اور میدان کی تیاری'' سے تعبیر کرتے ہیں۔ مولانا لکھتے ہیں:

> ''۱۸۵۷ء کی کشمکش کی ناکامی کے بعد قتال اور آویزش کے نئے محاذوں اور میدانوں کی تیاری میں آپ (حضرت نانوتوی) کا دماغ مصروف ہو گیا۔ دارالعلوم دیوبند کا تعلیمی نظام، اس لائحہ عمل کا سب سے زیادہ نمایاں اور مرکزی وجوہری عنصر تھا۔'' (ایضاً، ص ۲۲۳)

مولانا سید محمد میاں مرحوم نے ایک روایت نقل کی ہے کہ حضرت حاجی امداد اللہ مہاجر مکی سے دارالعلوم کے قیام کے بعد جب اسی جماعت کے ایک بزرگ حاجی رفیع الدین نے (جو دارالعلوم کے دوسرے مہتمم حضرت شاہ عبدالغنی کے خلفاء میں سے تھے) عرض کیا:

> ''ہم نے دیوبند میں ایک مدرسہ قائم کیا ہے۔ اس کے لیے دعا فرمائی جائے''

تو آپ نے فرمایا:

> ''سبحان اللہ! آپ فرماتے ہیں، ہم نے مدرسہ قائم کیا ہے، یہ خبر نہیں کہ

کتنی پیشانیاں اوقاتِ سحر میں سر بہ سجود ہو کر گڑگڑاتی رہیں کہ خداوند!
ہندستان میں بقاے اسلام اور تحفظ علم دین کا کوئی ذریعہ پیدا کر۔''
(علماے حق اور ان کے مجاہدانہ کارنامے: حصہ اول، ص ۱۷)
یہ روایت مولانا گیلانی نے بھی بیان کی ہے اور اس پر لکھا ہے کہ:

''اس کا مطلب بجز اس کے اور کیا ہو سکتا ہے کہ شاملی کے میدان سے واپسی کے بعد سوچنے والوں نے نہ تو مایوس ہو کر سوچنا ہی چھوڑ دیا تھا اور نہ ہاتھ پر ہاتھ رکھ کر وہ بیٹھ گئے تھے۔ ''بقاے اسلام اور تحفظ علم دین'' کے نصب العین کو آگے بڑھانے کے لیے دماغ بھی مصروف فکر تھے اور ان کے قلوب بھی کائنات کی مرکزی قوت سے لو لگائے ''غیبی لطیفہ'' کے ظہور کا انتظار کر رہے تھے۔''
(سوانح قاسمی: ج ۲، ص ۲۲۴)

اس ''نئے محاذ'' کے قیام کی حکایت میں مولانا گیلانی مرحوم کے لیے نہ جانے کتنی لذت تھی کہ وہ ''سوانح قاسمی'' کی بڑی تقطیع کے صفحات میں صفحہ ۲۲۲ سے لے کر صفحہ ۲۲۵، بلکہ اس کے بعد تک اسے دراز کرتے چلے گئے ہیں۔ اس بیان کے چیدہ چیدہ جملوں کو یہاں نقل کیا جاتا ہے تاکہ دارالعلوم کے مقاصد قیام کا یہ پہلو قارئین کرام کے ذہن میں خاص طور پر نمایاں ہو جائے کہ دارالعلوم کا قیام محض ایک درس گاہ کے قیام کا واقعہ نہ تھا، بلکہ ملک کی آزادی اور قیام ملت اسلامیہ ہند کی تاریخ کے ایک نئے دور کے آغاز کا عظیم الشان واقعہ تھا۔ مولانا گیلانی رحمۃ اللہ علیہ لکھتے ہیں:

(۱) ''الغرض واپس ہونے والا جب واپس ہوا تھا، تو کسی ''نئے محاذ'' ہی کے قائم کرنے اور اس ''فئۃ'' یا جماعت سے رشتۂ اتصال و رابطہ کو درست کرنے ہی کے لیے واپس ہوا تھا، جس کے اجتماعی شیرازے کو درہم برہم کر کے چاہا جا رہا تھا کہ ہمیشہ کے لیے نیست و نابود کر دیا جائے۔''
(ایضاً: ص ۲۲۵)

(۲) ''واقعہ یہی ہے کہ دیکھنے والوں نے ۵۷ء کے ہنگامۂ رست و خیز کے دھیمے پڑ جانے کے بعد اس (حضرت نانوتوی) کو جو کچھ کرتے ہوئے دیکھا، بہ ذات خود اس کے لیے اور واپس ہونے والے ساتھیوں کے لیے یہ سب کچھ دیکھا بھالا تھا۔ ایک طے شدہ ''لائحہ عمل'' تھا۔ اپنے وقت پر اس کے فیصلے عملی قالب اختیار کرتے چلے جاتے تھے۔ کون کہہ سکتا ہے کہ مصلحت الٰہیہ اور ''اجل مسمیٰ'' کا اٹل قانون ہندی مسلمانوں کے اندر اس کے قیام کی مدت کو اگر حد سے زیادہ مختصر نہ کر دیتا، تو دیکھنے والوں کو خدا ہی جانتا ہے، وہی کیا کیا کر کے دکھاتا۔'' (ایضاً: ص ۲۶-۲۲۵)

(۳) ''مدرسے کے اجرائے قیام کی حد تک وہ (مولانا قاسم نانوتوی) اپنے اور اپنے رفقائے کار کے اسی طے شدہ ''لائحہ عمل'' کے ساتھ ''نئے محاذ'' کے کھولنے کے لیے صرف صالح اور قابل ذہن کی تلاش میں سرگرداں تھا۔ دینی تعلیم کا اجتماعی نظام جس میں عصری اقتضاؤں کی تکمیل کا بھی سروسامان تھا، اس کے اس لائحہ عمل کا اہم ترین جزء بلکہ قالب کے لحاظ سے، سب کچھ وہی تھا کہ نئے محاذ کا یہ نیا قالب یا ''عملی مرقع'' کہاں قائم ہو۔'' (ایضاً: ص ۲۹۔۲۲۸)

(۴) ''اسی نئے محاذ کے بانی سیدنا الامام الکبیر (حضرت مولانا محمد قاسم نانوتویؒ) کے دیو بند والوں سے قرابت قریبہ کے موروثی تعلقات پشتہا پشت سے قائم تھے۔'' (ایضاً: ص ۲۳۰)

(۵) وہ ''نیا محاذ'' جسے سیدنا الامام الکبیر شاملی کے میدان سے واپس ہونے کے بعد کھولنا چاہتے تھے اس ''نئے محاذ'' اور اس کے دور رس مضمرات رمکنونات خواہ کچھ ہی ہوں، لیکن ظاہری قالب تو اس کا یہی تھا کہ مسلمانوں کی دینی زندگی کی حفاظت کے لیے دینی تعلیم کا ایک ایسا نظام قائم کیا جائے، جس کے ذریعے ملک کے طول وعرض میں جہاں تک ممکن ہو، بڑی سے بڑی تعداد دینی علوم کے علم برداروں کی پھیل جائے۔

اس جدید تعلیمی نظام کے متعلق عرض کر چکا ہوں کہ ہمارے قدیم علماء کی تدریس وتعلیم کا آزاد اور انفرادی طریقہ سیدنا الامام الکبیر کے نزدیک قطعاً ناکافی تھا...... اپنے اسی اصولی نقطۂ نظر کے زیر اثر آپ دینی تعلیم کا اجتماعی نظام قائم کرنا چاہتے تھے۔ جس میں حتی الوسع تعلیم کے عصری لوازم اور تقاضوں کو بھی ممکنہ حد تک سمونے اور جذب کرنے کی صورت، چاہا جاتا تھا کہ نکالی جائے۔'' (ایضاً: ص ۲۳۲)

۱۸۵۷ء کی ناکامی کی تلافی:

اور اب تو اس حقیقت کو شمس العلماء حافظ محمد احمد کے صاحبزادۂ مرحوم ومغفور نے بھی تسلیم کر لیا ہے کہ دار العلوم کے مقاصد کا دایرہ درس وتدریس کے عام مقصد سے بلند بھی تھا اور بہت زیادہ وسیع بھی۔ حضرت مولانا قاری محمد طیب علیہ الرحمہ کا بیان کفایت کرتا ہے۔ اس پر کسی تبصرے کی ضرورت نہیں، لکھتے ہیں:

> ''عامۃ ان مؤسس اکابر مدرسہ کا تصور صرف تعلیم وتعلم ہی کی حد تک تھا۔
> حتی کہ عمارت مدرسہ کا سنگ بنیاد رکھنے تک یہی رہا۔ جب کہ مدرسے کے
> اجرا پر آٹھ نو سال بھی گزر چکے تھے۔ یہ وسیع اور عالم گیر نصب العین ان

کے سامنے نہ تھا جو حضرت قاسم العلوم اور ان کے رفقائے جہاد شاملی بہ اشارات غیب و بہ فیضان ولی اللہ و امداد اللہ اپنے اندر لیے ہوئے تھے اور جہاد شاملی کے بعد یہ مقاصد اور بھی زیادہ قوت اور عزیمت کے ساتھ ابھر آئے جس کا سرچشمہ حضرت حاجی امداد اللہ اور سرخیل حضرت قاسم العلوم تھے۔

اس ولی اللہی اور امداد اللہی تصور میں اوپر تعلیم کا پردہ تھا اور نیچے اسی تعلیمی لائن سے اعلائے کلمۃ اللہ، مسلمانوں کی آفاقی عزت و شوکت اور ملت کی عالم گیر خدمت کے اجتماعی جذبات پنہاں تھے۔ اسی حقیقت کو نمایاں کرتے ہوئے مولانا مناظر احسن گیلانی نے اپنے ایک مضمون ''دارالعلوم میں بیتے ہوئے دن'' میں جو ''دارالعلوم'' (رسالہ) میں شائع شدہ ہے۔ حضرت شیخ الہند کا یہ مقولہ نقل کیا ہے:

''حضرت الاستاذ (حضرت نانوتوی) نے کیا اس مدرسے کو درس و تدریس اور تعلیم و تعلیم کے لیے قائم کیا تھا؟ مدرسہ میرے سامنے قائم ہوا، جہاں تک میں جانتا ہوں ۱۸۵۷ء کے ہنگامے کی ناکامی کے بعد یہ ادارہ قایم کیا گیا کہ کوئی ایسا مرکز ہو جس کے زیر اثر لوگوں کو تیار کیا جائے تاکہ ۱۸۵۷ء کی ناکامی کی تلافی کی جائے۔''

(نیز دیکھیے: سوانح قاسمی: ج ۲، ص ۲۲۶)

- ☆ چناں چہ حضرت نے احاطۂ مدرسہ میں طلبہ کو فنون سپہ گری سکھانے کا بندوبست بھی فرمایا تاکہ علم کے ساتھ سپاہیانہ اسپرٹ بھی ان میں قائم رہے۔
- ☆ محکمۂ قضا بھی قائم فرمایا تاکہ تنفیذ احکام شرعیہ کی خو بھی ان میں محفوظ رہے۔
- ☆ ترکوں کی امداد کے لیے بھی مساعی فرمائیں۔
- ☆ سلطان ترکی کی مدح میں قصائد بھی لکھے تاکہ خلافتِ اسلامیہ سے مدرسے کے نونہالوں کا ربط قائم رہے۔
- ☆ انگریزی تسلط کے بعد ایسی اجتماعی انجمنوں کی حمایت و تائید بھی کی جو انگریزوں سے ملکی حقوق حاصل کرنے کے لیے قائم کی گئیں۔
- ☆ حضرت کی وفات کے بعد ان کے علمی جانشین شیخ الہند رحمہ اللہ نے ان ملی مقاصد کو

آگے بڑھایا او۔

☆ پھران کے تلامذہ نے بھی انھی تعلیمی لائنوں کو مضبوط کیا، مگر اجتماعی خدمات سے کبھی کنارہ کشی اختیار نہیں کی، بلکہ آزادی کی تمام تحریکات میں قائدانہ حصہ لیا۔ ان کے سرخیل اگر انگریزوں کے مقابلے میں میدان شاملی میں سربکف تھے تو ان کی ذریت اسی انگریز کے مقابلے میں قید و بند اور جیلوں میں سربکف رہی اور آج بھی کلمہ حق کہنے میں آگے ہی آگے ہے۔" (مقدمہ تاریخ دارالعلوم دیوبند (اشاعت کراچی)! ص ۴۵ تا ۴۳)

حقیقت کا اعتراف:

یہ بیان شمس العلما حافظ محمد احمد علیہ الرحمہ کے صاحبزادہ محترم قاری محمد طیب مرحوم و مغفور کا ہے اور اس بات کا کھلا اعتراف کہ ۱۹۱۳ء میں دارالعلوم میں جو حالات پیدا ہو گئے تھے اور حضرت شیخ الہند کے مقابلے میں شمس العلماء مرحوم نے جو رویہ اور برٹش استعمار پرستانہ جو پالیسی اختیار کی تھی، وہ ہرگز درست نہ تھی۔ مدرسے کے مقاصد قیام کے بارے میں حضرت شیخ الہند کا مسلک ہی درست تھا اور جس حقیقت کو ۱۹۱۳ء جھٹلایا گیا تھا اسے چونسٹھ برس کے بعد انھی مرحوم کے بیٹے نے تسلیم کرلیا۔ اگرچہ انھوں نے بھی اس دور کے نہایٹ اہم تاریخی واقعات کو اپنے مقدمہ میں نظر انداز کر دیا ہے۔ اپنی "مختصر تاریخ دارالعلوم" میں ان واقعات کی پرچھائیں نہیں پڑنے دی اور سید محبوب رضوی کی جامع " تاریخ دارالعلوم" میں بھی جمعیت الانصار کے قیام اور مولانا عبید اللہ سندھی کے تذکرے میں مصنف کو اسی انداز فکر کے اپنانے بلکہ انھی جملوں کو اختیار کرنے کی طرف رہنمائی کی جو خود انھوں نے اپنی مختصر تاریخ میں اختیار کیے تھے۔ لیکن تاریخ نے بالآخر اس حقیقت کو منوا ہی لیا۔ بھلا کہاں گورنر یوپی سر جیمس مسٹن کے حضور سپاس نامے میں یہ فرمانا کہ

"ہمارا ایک اور صرف ایک مقصد ہے! اور وہ ہے "مذہبی آزادی کا تحفظ اور صرف مذہبی آزادی کا تحفظ!" اس سے ہٹ کر کسی سیاسی تحریک کو مسترد کرنا یا قبول کرنا ہمارے قائم اور ناقابل تبدیلی نظریے کے باہر ہے۔

اگر حکومت "اسلام اور اس کے عقائد و رسوم کو اور ہمارے "حقیقی لیڈر" کو واقعی عزت دیتی ہے تو دل اور زبان سے اس کا شکریہ ادا نہ کرنا یا اپنے کسی عمل سے اس کے لیے مشکلات پیدا کرنا انتہائی " ناشکری" اور "معصیت" ہے۔"

اور کہاں شمس العلما کے صاحبزادہ نامدار قاری محمد طیب کا یہ اعتراف کہ

''حضرت شیخ الہند نے ملی مقاصد کو آگے بڑھایا، پھر ان کے تلامذہ نے اجتماعی خدمات انجام دیں، آزادی کی تمام تحریکات میں حصہ لیا، انگریز کے مقابلے میں قید و بند کی زندگی کو اختیار کیا اور کلمۂ حق کہنے میں آگے رہے'' وغیرہ وغیرہ۔

بلا شبہ دارالعلوم میں یہ کارنامہ انجام دیا گیا، مگر ان کے شاگرد اور جانشین علمی حضرت شیخ الہند مولانا محمود حسن، ان کے بعض تلامذہ مولانا عبیداللہ سندھی، شیخ الاسلام مولانا سید حسین احمد مدنی وغیرہم اور ان کی ذریت نے خصوصاً ان کے بعد مولانا سید اسعد مدنی نے جو شمس العلماء اور ان کی ''ذریت'' کی آنکھوں میں خار بن کر کھٹکتے رہے۔

جب نئے محاذ کے قیام کا فیصلہ کیا جا رہا تھا تو کئی مقامات کے نام ذہن میں آئے تھے لیکن یہ سعادت تو اللہ تعالیٰ نے پہلے ہی دیوبند کی قسمت میں لکھ دی تھی۔ مولانا سید محمد میاں نے حضرت حاجی امداد اللہ مہاجر مکی کے یہ الفاظ نقل فرمائے ہیں:

''یہ دیوبند کی قسمت ہے کہ اس دولت گراں مایہ کو یہ سرزمین لے اڑی۔'' (علمائے حق اور ان کے مجاہدانہ کارنامے: حصہ اول، ص ۷۱)

مدارس کا وسیع نظام اور اس کا مقصد:

دارالعلوم کے اعلیٰ دماغ اور بلند فکر بانی کو اس بات کا احساس بھی تھا کہ پورے ملک کی اجتماعی زندگی اور قیام ملت کی ضرورت کے لیے صرف دیوبند کا مرکز انقلاب اور محاذ ہی کافی نہیں ہوسکتا۔ ضرورت تھی کہ ملک کے مختلف علاقوں اور ان کے شہروں میں یہ محاذ قائم کیے جائیں جو اپنے اپنے دائروں میں خدمات انجام دیں۔ البتہ ان کا فکری تعلق دیوبند کے مرکز انقلاب سے ضرور ہو۔

چناں چہ مولانا گیلانی مرحوم کے بہ قول:

''دیوبند میں اس نئے محاذ کی بنیاد ڈالنے کے بعد دیوبند کے علاوہ مراد آباد، نگینہ، تھانہ بھون وغیرہ میں اس کی شاخیں سیدنا الامام الکبیر ہی کے منشا کے مطابق کھلتی چلی گئیں۔''

مراد آباد، امروہہ، نگینہ اور سہارن پور کے مراکز کا قیام تو دارالعلوم دیوبند کے قیام کے تھوڑے ہی عرصے بعد عمل میں آ گیا تھا۔ اس کے بعد تو یہ تحریک ایسی پھیلی کہ ملک کا کوئی حصہ ایسا نہ تھا

جہاں کوئی مدرسہ ہو اور اس کا تعلق دارالعلوم دیوبند سے نہ ہو یا کوئی مسجد ہو جس میں حضرت قاسم نا نوتوی سے عقیدت رکھنے والا اور حضرت شیخ الہند سے نسبتِ ارادت یا رشتۂ تلمذ، کھنے والا امام اور خطیب نہ ہو اور کوئی چھوٹا یا بڑا حلقۂ درس قائم نہ ہو۔

(۲)

عہدِ محمودی اور اس کے کارنامے

دارالعلوم دیوبند...... سیاسی سفر کا آغاز:

حضرت شیخ الہند کے سامنے دارالعلوم کے قیام کے علمی، تعلیمی اور اجتماعی و سیاسی دونوں پہلو تھے۔ حضرت کا تعلق دارالعلوم کے عہد قیام سے بہت قریبی رہا تھا۔ ان کے والد مولانا ذوالفقار علیؒ دارالعلوم کی تنظیم، تعمیر، ترقی کے تمام امور میں حضرت قاسم العلوم کے ساتھ شریک رہے تھے۔ حضرت شیخ الہند دارالعلوم کے پہلے طالب علم تھے۔ گھر سے باہر تک ان کی تعلیم و تربیت کی نگرانی ولی اللہی جماعت کے ارکان نے کی تھی۔ وہ دارالعلوم کے قیام کے مقاصد سے کسی کے بتانے سے پہلے واقف تھے۔ وہ اپنی اس واقفیت کے لیے کسی اخبار یا کتاب کے مطالعے کے محتاج نہیں تھے۔ ان کی واقفیت کسی پراسپکٹس یا دستاویز کے مطالعے پر مبنی نہ تھی۔ بلکہ شاملی کے معرکے میں شریک ہونے والی جماعت کے پسپا ہونے اور قومی و ملی مقاصد کے لیے جدوجہد کا نیا محاذ کھولنے والوں کی نج کی محفلوں اور راز و نیاز کی گفتگوؤں پر مبنی تھی۔ حضرت شیخ الہند کی تعلیم و تربیت اسی ماحول میں ہوئی تھی اور دارالعلوم کے بانیان کرام کی جماعت نے کی تھی۔ حضرت اس جماعت کے ارکان عظیم الشان کے شاگرد اور مرید تھے۔ اسی جماعت کے بزرگوں نے انھیں قرآن و حدیث کے درس دیے تھے، اسی جماعت نے انھیں شریعت و طریقت کے رموز سکھائے تھے، اسی جماعت نے انھیں قومی و ملی سیاست کے بھیدوں سے آشنا کیا تھا۔ حضرت شیخ الہند کو بہ یک وقت حضرت مولانا رشید احمدؒ گنگوہی، حضرت حاجی امداد اللہؒ مہاجر مکی اور حضرت قاسم العلوم والخیرات مولانا محمد قاسمؒ نانوتوی سے نسبت بیعت تھی اور خلعت خلافت حاصل تھا۔ اور نہایت فخر کا مقام یہ تھا کہ وہ ان حضرات گرامی منزلت کے ''مرید'' ہی نہیں ''مراد'' تھے۔ حضرت قاسم العلوم نے ان کی تعلیم و تربیت میں خاص ہمت صرف فرمائی تھی۔ حضرت شیخ الہند حضرت قاسم العلوم والخیرات کے تربیت یافتہ تھے، انھیں حضرت کا اعتماد حاصل تھا۔ مولانا قاری طیب صاحبؒ نے بھی انھیں حضرت قاسم العلوم کا ''جانشین علمی'' تسلیم کیا ہے۔ وہ حضرت الاستاذ الکبیر کے مزاج شناس اور واقف اسرار نہاں تھے۔ دارالعلوم کے بانیوں اور ابتدائی مخلصین و محسنین کے سلسلے میں جن بزرگوں

کے نام آتے ہیں، حضرت شیخ الہند نے ان کی آنکھیں دیکھی تھیں، ان سے علمی وروحانی استفادہ کیا تھا اوران کی صحبتوں سے فائدہ اٹھایا تھا۔

عہد محمودی کے خصایص چہارگانہ:

دیوبند کی عظمت کی داستان حضرت شیخ الہند نے ہم دورافتادگان عہد کی طرح کتابوں میں نہیں پڑھی تھی۔ اس کی عظمت کا نقش حضرت کی نگاہوں کے سامنے اجاگر ہوا تھا اور پھر آپ نے خود بھی اسے عظیم سے عظیم تر بنانے میں حصہ لیا تھا۔ پھر تاریخ نے وہ وقت بھی دیکھا کہ وہ حضرت قاسم العلوم کے علمی جانشین، اور آپ کی جماعت کے رہنما بنے، دارالعلوم میں انھیں مرکزیت اور مرجعیت کا مقام حاصل ہوا، دارالعلوم کی صدارت اور اجتماعی زندگی میں ان حضرات کا بلند کیا ہوا علم آپ کے ہاتھوں میں آیا، جسے حضرت نے پوری قوت اور ہمت کے ساتھ پوری زندگی سربلند رکھا۔ حضرت شیخ الہند کے ان چہارگانہ خصایص اور خدمات کو تاریخ بھلا نہیں سکتی:

۱۔ حضرت کی ذات گرامی اور خدمات دینیہ واجتماعیہ سے دارالعلوم کی تاریخ کا نیا دور شروع ہوتا ہے۔

۲۔ حضرت شیخ الہند نے حضرت مولانا محمد قاسم کی نہ صرف سیاسی تحریک کو آگے بڑھایا بلکہ آپ کی علمی وتعلیمی تحریک کو بھی وقار بخشا اور حضرت نانوتوی کے فیضان علمی اور منصوبہ تعلیمی کو کہیں سے کہیں پہنچادیا۔

۳۔ حضرت نے قاسمی جماعت کو منظم کیا، اس پرعمل وانقلاب کا دروازہ کھولا اور اسے ایک بین الاسلامی انقلابی تحریک بنادیا۔

۴۔ حضرت نے ہندوستان کے طول وعرض میں اس کے اثرات کو پھیلایا اور مسلمانوں کی اس ملی تحریک کو ہندوستان کی کل قومی انقلابی تحریک کا حصہ بنادیا۔

جمعیت الانصار کا قیام:

تعلیم وتربیت کے ایک زمانے تک تو یہ بات چھپی رہی لیکن ترویج واشاعت افکار سیاسی، اجتماعی اور تنظیم جماعت کے دور میں رفتہ رفتہ یہ بات ظاہر ہوگئی کہ تعلیم وتربیت اور ترویج واشاعت افکار سیاسی کا مرکز اور انقلاب کا سرچشمہ دارالعلوم اور تعلیم وتربیت سیاسی کے سب سے بڑے معلم اور مربی دارالعلوم کے صدر مدرس مولانا محمود حسن دیوبندی ہیں۔ ایک مدت تک ان کا یہ کام ایسی رازداری اور اتنی خوش اسلوبی سے چلتا رہا کہ خود دارالعلوم کے ارکان کو بھی اس کا پتا نہ چل سکا۔

دارالعلوم کے بانی اعظم حضرت مولانا محمد قاسم کا یہ قول کہ ہم نے دارالعلوم کے اصل مقصد پر درس و تدریس علوم اسلام کا پردہ ڈال دیا ہے، ہر شخص کی زبان پر تھا۔ حال آں کہ یہ کام اس حد تک انجام پا چکا تھا کہ متعدد اصحابِ استعداد کی سیاسی تربیت مکمل ہو چکی تھی، ملک کی سیاسی انقلابی شخصیتوں اور جماعتوں سے روابط اور ملک کے متعدد علمی، دینی اور انقلابی مراکز سے سیاسی تعلقات استوار ہو گئے تھے، دارالعلوم کے کئی فارغ التحصیل ملک کے مختلف علاقوں میں سیاسی کاموں میں مصروف تھے۔ یہ راز ۱۹۱۰ء میں، جمعیت الانصار کے قیام کے بعد رفتہ رفتہ کھلا اور جب راز کا انکشاف ہوا تو نہ صرف دنیا بلکہ دارالعلوم کے بعض حضرات بھی حیران و ششدر رہ گئے۔ حضرت مولانا شاہ عبدالرحیمؒ رائے پوری حضرت شیخ الہند اور دارالعلوم سے بہت قریبی تعلق رکھتے تھے لیکن انھیں یہ معلوم نہ تھا کہ حضرت اپنے مخصوص تلامذہ و مریدین سے بیعت جہاد بھی لیتے ہیں۔ جب معلوم ہوا تو انھیں اس بات پر بڑی حیرت ہوئی۔ حال آں کہ حضرت شیخ الہند کے سفر حجاز اور اسارتِ مالٹا کے زمانے میں حضرت رائے پوری رحمۃ اللہ علیہ ہی ہندوستان میں تحریک شیخ الہند اور دارالعلوم کی سب سے اہم شخصیت تھے۔

جمعیت الانصار کے مقاصد:

۱۹۰۹ء میں حضرت شیخ الہند نے مولانا عبیداللہ سندھی کو دارالعلوم بلایا اور جمعیت الانصار کے قیام اور اس کے تحت دارالعلوم کے قدیم طلبہ کی تنظیم کا کام ان کے سپرد کیا۔ جمعیت الانصار کے اغراض و مقاصد اسی زمانے میں کتابچے کی شکل میں (۱) اور رسالے القاسم میں چھپ گئے تھے۔ ''تذکرہ شیخ الہند'' (از مفتی عزیز الرحمٰن) میں یہ تفصیل اور دیگر کتب میں بھی موجود ہیں، لیکن ہم یہاں ''ریشمی خطوط سازش کیس'' سے ان مقاصد پر روشنی ڈالتے ہیں:

'' (جمعیت الانصار) مولوی عبیداللہ کی نظامت اور چھ سات ممبروں پر مشتمل مجلس منتظمہ کے ساتھ قائم ہوئی۔ یہ انجمن دیوبند میں تعلیم پائے ہوئے مولویوں کی انجمن کے طور پر قائم ہوئی ہے تاکہ

۱۔ مدرسۂ دیوبند کا انتظام کرے اور اس کو بہتر بنائے۔

۲۔ مدرسے کے لیے رقم کا انتظام کرے۔

۳۔ دیوبند میں جن عقائد کی تعلیم دی جاتی ہے، ان کی تبلیغ کرے اور انھیں فروغ دے اور

۴۔ دوسرے مقامات پر ایسے ہی مدرسے قائم کرے۔

۵۔ تمام مدارس اسلامیہ کو جمعیت الانصار کے تحت کر دیا جائے اور

۶۔ دیوبند کے فارغ التحصیل مولویوں کو ایسے تمام مدارس میں بھیجا جائے۔'' (''تحریک شیخ الہند۔ ریشمی خطوط سازش کیس'' مرتبہ: مولانا سید محمد میاں (اشاعت کراچی): ص ۳۵۔۴۳۴)۔

جمعیت الانصار کا قیام منتظمہ کی منظوری سے عمل میں آیا تھا، اسی نے اس کے قیام کے اغراض و مقاصد کی منظوری دی تھی، اسی کے فیصلے کے مطابق مولانا حبیب الرحمٰن عثمانی (نائب مہتمم دارالعلوم) کو اس کا صدر بنایا گیا تھا، مولانا عبید اللہ سندھی کو ناظم اور مولانا ابو احمد آف چکوال ضلع جہلم کو نائب ناظم مقرر کیا گیا تھا، لیکن اس کے بانی حضرت شیخ الہند تھے۔ مولانا سندھی حضرت کی ہدایت کے مطابق ہی کام کرتے تھے۔ حضرت شیخ الہند کا انھیں قرب اور اعتماد حاصل تھا۔

برٹش حکومت کی تشویش:

جمعیت الانصار کے مقاصد میں بہ ظاہر ایسی کوئی دفعہ شامل نہیں تھی، جس سے اس کے سیاسی عزایم و مقاصد کا اظہار ہوتا ہو۔ لیکن اس کے پہلے سالانہ اجلاس مراد آباد (۱۹۱۰ء) میں جو تجاویز پاس کی گئیں، اس سے اندازہ ہوا کہ جمعیت الانصار کالجوں کی اولڈ بوائز ایسوسی ایشنوں سے قطعاً مختلف ہے اور اس کا دایرہ مقاصد ان سے بہت زیادہ وسیع اور عزایم کاران کے کارکنان سے بہت زیادہ بلند ہیں۔ (۲)

انگریزوں کے لیے تو کسی ملکی تنظیم کا مجرد آزادانہ قیام ہی شکوک و شبہات کے لیے کافی تھا۔ مسلمانوں کی تنظیم و اصلاح اور قدیم اور جدید تعلیم یافتہ نوجوانوں کی تربیت، قیام مدارس و نظام مبلغینِ اسلام کی تیاری وغیرہ کے عزایم تو حکومت کے شبہات کو یقین میں بدل دینے کے لیے کافی تھے۔ چناں چہ حکومت اسی وقت چوکنی ہوگی۔ اس نے مولانا احمد حسن'' امروہوی سے اس سلسلے میں پوچھ گچھ کی اور حضرت شیخ الہند کی آمدنی پر ٹیکس لگا دیا گیا۔ حضرت اس وقت دارالعلوم سے صرف پچاس روپے مشاہرہ وصول فرماتے تھے۔ (۳)

جمعیت کے قیام پر زیادہ عرصہ نہیں گزرا تھا کہ حکومت کو یقین ہو گیا کہ اس کے سامنے صرف وہی مقاصد نہیں جن کا اعلان کیا گیا ہے یا اس کے اجلاس میں پاس شدہ تجاویز سے جن کا اظہار ہوتا ہے۔ حکومت کے خلاف مسلمانوں کو بھڑکانے والی انجمن ہے اور جمعیت الانصار کے پردے میں مسلمانوں کو منظم کیا جا رہا ہے۔ ریشمی رومال سازش کیس میں اس پر روشنی ڈالی گئی ہے:

> ''جلد ہی مولوی عبید اللہ نے انگریزی پڑھے ہوئے نوجوانوں کو طالب علم کی حیثیت سے لینا شروع کر دیا اور اس انجمن نے نیم سیاسی نوعیت اختیار

کر لی جب جنگ بلقان شروع ہوئی اور دیو بند کے ذمہ داروں نے ترکی کی مالی امداد کے جواز کا فتویٰ دیا۔ تو اچانک جمعیت الانصار اپنے اصلی رنگ میں آ گئی اور انتہائی متعصب سیاسی جماعت بن گئی۔

☆ مولوی، طلبہ اور دوسرے لوگ مبلغ بنا کر بھیجے جانے لگے اور ترکی کی مدد کے لیے ہلال احمر فنڈ میں بڑی بڑی رقمیں جمع کی جانے لگیں۔

☆ غیر ملکی سامان کے بائی کاٹ کی تبلیغ بڑے شد و مد سے کی جانے لگی۔

☆ اس کی شاخ قاسم المعارف نے کلکتہ میں چندہ جمع کرنے کے سلسلے میں بڑی سرگرمی دکھائی۔

☆ اس پر مدرسے کے عملے کے سنجیدہ لوگ چوکنے ہوئے اور ایسے اختلافات پیدا ہوئے کہ عبداللہ کو ۱۹۱۳ء میں استعفا دینا پڑا۔''

(تحریک شیخ الہند۔ ریشمی خطوط سازش کیس: (اشاعت کراچی): ص ۴۳۵)

حضرت شیخ الہند کی عظمت:

اسی ''ریشمی رومال سازش کیس'' میں حضرت شیخ الہند کے بارے میں کہا گیا ہے کہ:

☆ دیو بند میں ان کا مکان اتحاد اسلامی کی سازشوں کا گڑھ تھا۔

☆ انھوں نے سیف الرحمٰن، فضل الٰہی، فضل محمود وغیرہ کو سرحد پار قبائیلوں کو جہاد پر بھڑ کانے کے واسطے بھیجا۔

☆ ہندوستان میں اتحاد اسلامی کی سازش میں مولانا (محمود حسن) کی رہنمایانہ اور قائدانہ شخصیت بڑی سرگروہ ہے۔'' (ایضا: ص ۴۴۲)

یہ تھے مولانا محمود حسن، جن کی شخصیت کا خمیر قوم وملت کی ہم دردی اور غم خواری کی مٹی سے اٹھایا گیا تھا۔ جنھوں نے دیو بند کے مدرسۂ اسلامیہ میں ملت کے لیے ایثار وغم خواری کا سبق حضرت قاسم العلوم والخیرات مولانا محمد قاسم نانوتوی سے پڑھا تھا اور جب ان کی عمر ستر برس کی تھی تو انھیں جوارِ حرم میں گرفتار کر کے، ملت کے عشق کے جرم میں ساڑھے تین سال کے لیے جزیرۂ مالٹا میں قید کر دیا تھا۔ مولانا ابوالکلام آزادؒ نے ان کے بارے میں لکھا ہے:

''مولانا مرحوم ہندوستان کے گذشتہ دورِ علماء کی آخری یادگار تھے۔ ان کی زندگی اس عہد حرمان وفقدان میں علمائے حق کے اوصاف و خصایل کا

بہترین نمونہ تھی۔ ان کا آخری زمانہ جن اعمالِ حقہ میں بسر ہوا تھا۔ وہ علمائے ہند کی تاریخ میں ہمیشہ یادگار رہیں گے، ستر برس کی عمر میں جب ان کا قد ان کے دل کی طرح اللہ کے آگے جھک چکا تھا، عین جوارِ حرم میں گرفتار کیے گئے اور کامل تین سال تک جزیرہ مالٹا میں نظر بند رہے۔ یہ مصیبت انھیں صرف اس لیے برداشت کرنا پڑی تھی کہ اسلام وملت اسلام کی تباہی و بربادی پر ان کا خدا پرست دل صبر نہ کر سکا اور انھوں نے اعدائے حق کے مرضات واہوا کی تسلیم واطاعت سے مردانہ وار انکار کر دیا تھا۔ فی الحقیقت انھوں نے علمائے حق وسلف کی سنت زندہ کر دی اور علمائے ہند کے لیے اپنی سنت حسنہ یادگار چھوڑ گئے۔'' (خطبۂ صدارت جمعیت علمائے ہند'' (اجلاس سوم لاہور)، قومی دار الاشاعت، میرٹھ، ص ۱۰)

عمل حق اور اس کا نتیجہ:

حضرت قاسم العلوم نے حریت فکر اور عزیمتِ ودعوت کی تخم ریزی کا جو عمل حق انجام دیا تھا، حضرت شیخ الہند نے اس شجر طیب کی آبیاری کی اور اس کی نشو ونما وحفاظت کے اعمال حقہ میں اپنی زندگی کے شب وروز گزار دیے اور یہ انھیں اعمال حقہ کا نتیجہ تھا کہ آپ کی وفات پر ابھی پورا ایک قرن نہ گزرا تھا کہ براعظم پاک وہند آزاد ہو گیا اور جنوب مشرقی ایشیا سے لے کر وسطِ ایشیا اور جنوب مشرقی افریقہ تک پچاسوں ممالک رفتہ رفتہ آزاد ہونا شروع ہو گئے اور جس استعمار کی حکومت میں سورج غروب نہ ہوتا تھا، وہ سمٹ کر ایک چھوٹے سے خطۂ زمین میں محدود ہو کر رہ گئی۔

میری ناچیز رائے میں دار العلوم دیوبند کا عہدِ محمودی کوئی الگ دور نہیں بلکہ دورِ قاسمی کا تکملہ ہے۔

حواشی:

(۱) قواعد ومقاصد جمعیت الانصار لطلبۃ المدرسۃ العالیۃ الاسلامیۃ الدیوبندیہ، منظور شدہ جلسہ منعقدہ ۱۳ رمحرم ۱۳۲۸ھ (مطبوعہ): احمدی پریس، علی گڑھ۔ قاسم المعارف کے نام سے جمعیت الانصار کی کلکتہ اور سندھ میں شاخیں بھی قائم ہوئی تھیں۔ کلکتہ شاخ کا ذکر ریشمی خطوط سازش کیس میں آیا ہے۔ سندھ کی شاخ کے قواعد ومقاصد مستقل کتابچے کی شکل میں مطبع قاسمی دیوبند سے چھپوا کر مولانا عبید اللہ سندھی نے شائع کیے تھے۔

(۲) تجاویز کے مطالعے کے لیے'' قواعد ومقاصد جمعیۃ الانصار'' ...... یا'' تذکرۂ شیخ الہند''

(از مفتی عزیز الرحمٰن) سے رجوع کرنا چاہیے۔

(۳) حضرت شیخ الہند نے جب دار العلوم میں خدمات تدریس انجام دینا قبول فرمایا تھا تو حضرت مولانا رشید احمد گنگوہی کے اصرار سے پندرہ روپے مشاہرہ مقرر ہوا تھا۔ پھر کئی بار میں پچاس روپے تک اضافہ ہوا۔ حضرت گنگوہیؒ کے انتقال کے بعد پچھتر روپے آپ کی تنخواہ تجویز کی گئی، لیکن یہ اضافہ آپ نے قبول نہ فرمایا اور آخر میں تو اسے بھی لینا ترک کر دیا تھا۔ ۱۹۱۱ء میں جب حضرت کی پچاس روپے تنخواہ پر ٹیکس لگایا گیا تھا تو دار العلوم ہی میں مدرسین سے لے کر ارباب اہتمام تک کئی حضرات کی تنخواہیں اس سے زیادہ تھیں لیکن برٹش حکومت کی یہ خصوصی نظر حضرت شیخ الہندؒ کے لیے وقف تھی۔

(ڈاکٹر ابو سلمان شاہ جہان پوری)

دار العلوم دیوبند کے اصول و مقاصد:

حجۃ الاسلام حضرت مولانا محمد قاسم قدس اللہ سرہ العزیز کے قلم کے تحریر فرمودہ اصول (۱) رسالہ القاسم کے دار العلوم نمبر (مجریہ ۱۳۴۷ء) میں شائع ہوئے ہیں۔

ان اصول کی بنا پر آسانی کہا جا سکتا ہے کہ دار العلوم اور اس کے ہم صنف دیگر مدارس کے مقاصد حسب ذیل ہیں:

(الف) آزادیٔ ضمیر کے ساتھ ہر موقع پر کلمۃ الحق کا اعلا ہو۔ کوئی سنہری طمع، مربیانہ دباؤ یا سرپرستانہ مراعات اس میں حائل نہ ہو سکے۔

(ب) اس کا تعلق عام مسلمانوں کے ساتھ زائد سے زائد ہوتا کہ یہ تعلق خود بخود مسلمانوں میں ایک نظم پیدا کر دے جو ان کو اسلام اور مسلمانوں کی اصلی شکل پر قائم رکھنے میں معین ہو۔ اور اس طرح اسلامی عقاید اور اسلامی تہذیب ہمیشہ کے لیے یا کم از کم اس وقت تک کے لیے محفوظ ہو جائے۔ جب تک کہ یہ مرکز اپنے صحیح اصول پر قائم رہے، نیز توکل علی اللہ اور عوام کی

---

(۱) یہ اصول آٹھ ہیں۔ اس میں سے نمبر ۳، نمبر ۴، نمبر ۶، نمبر ۷، نمبر ۸ ان صفحات میں ناظرین کرام ملاحظہ فرمائیں گے۔ نمبر ۱، نمبر ۲، نمبر ۵ ہمارے مضمون سے تعلق نہیں رکھتے۔ تکمیل فائدہ کے لئے ان کو درج کیا جاتا ہے:

نمبر ۱ تا مقدور کارکنان مدرسہ کی ہمیشہ تکثیر چندہ پر نظر رہے۔ آپ کوشش کریں اوروں سے کرائیں، خیر اندیشان مدرسہ کو ہمیشہ یہ بات ملحوظ رہے۔

نمبر ۲ بقائے طعام طلبہ بلکہ افزائش طلبہ میں جس طرح ہو سکے خیر اندیشان مدرسہ ہمیشہ ساعی رہیں۔

نمبر ۵ خواندگی مقررہ اس انداز سے جو پہلی تجویز ہو چکی ہے یا بعد میں کوئی اور انداز جو مشورہ سے تجویز ہو پوری ہو جایا کرے ورنہ یہ مدرسہ اول تو خوب آباد نہ ہوگا اور اگر ہوگا تو بے فائدہ ہوگا۔ ۱۲۔

طرف سے احتیاج خود کارکنان مدرسہ کو اسلامی شان پر باقی رکھ سکے اور جابرانہ استبداد یا ریاست کا ٹھاٹھ ان میں قطعانہ پیدا ہو بلکہ ایک جمہوری تعلق ہو جو ایک کو دوسرے کا محتاج بنائے رکھے۔ اور اس طرح آپس میں خود ایک دوسرے کی اصلاح ہوتی رہے۔

(مندرجہ بالا (الف) اور (ب) کے لیے ملاحظہ ہو اصول وضوابط کی دفعہ نمبر ۶، نمبر ۷، نمبر ۸ جن کے الفاظ حسب ذیل ہیں:

اصل نمبر ۶۔ اس مدرسے میں جب تک آمدنی کی کوئی سبیل یقینی نہیں تب تک یہ مدرسہ ان شاء اللہ بشرطِ توجہ الی اللہ اسی طرح چلے گا۔ اور کوئی آمدنی ایسی یقینی حاصل ہوگئی جیسے جاگیر یا کارخانہ، تجارت یا کسی امیر محکم القول کا وعدہ تو پھر یوں نظر آتا ہے کہ یہ خوف ورجا جو سرمایۂ رجوع الی اللہ ہے ہاتھ سے جاتا رہے گا اور امداد غیبی موقوف ہو جائے گی۔ کارکنوں میں باہم نزاع پیدا ہو جائے گا۔ القصہ آمدنی اور تعمیر وغیرہ میں ایک قسم کی بے سروسامانی ملحوظ رہے۔

اصل نمبر ۷۔ سرکار کی شرکت اور امرا کی شرکت بھی زیادہ مضر معلوم ہوتی ہے۔

اصل نمبر ۸۔ تا مقدور ایسے لوگوں کا چندہ زیادہ موجب برکت معلوم ہوتا ہے جن کو اپنے چندہ سے امید ناموری نہ ہو۔ بالجملہ حسن نیت اہل چندہ زیادہ پائیداری کا موجب معلوم ہوتا ہے۔ (انتہی)

الحمد للہ کہ دارالعلوم دیوبند (متعدد بار لاکھوں روپے سالانہ کی طمع دلانے کے باوجود) آج تک گورنمنٹ کے احسان سے آزاد ہے اور مستقبل کے لیے اسی کا عہد کیے ہوئے ہے"۔ (علمائے حق اور ان کے مجاہدانہ کارنامے (حصہ اول): از مولانا سید محمد میاں: ص ۴۹۔۴۸)

انگلستان کا وفد:

۱۸۶۹ء: انگلستان کی حکومت نے ہندوستان سے برطانوی عمال کی ان یادداشتوں کا جائزہ لینے اور صورت حال کا بلاواسطہ مطالعہ کرنے کے لیے ۱۸۶۹ء کے شروع میں برٹش پارلیمنٹ کے ممبروں۔ بعض انگلستانی اخبارات کے ایڈیٹروں اور چرچ آف انگلینڈ کے نمائندوں پر مشتمل ایک وفد ہندوستان بھیجا۔ وفد کا مقصد یہ تھا کہ وہ پتا چلائے کہ ہندوستانی عوام میں وفاداری کیوں کر پیدا کی جاسکتی ہے اور مسلمانوں کے جذبۂ جہاد کو سلب کرکے انھیں کس طرح رام کیا جاسکتا ہے۔ اس وفد نے واپس جاکر دو رپورٹیں مرتب کیں۔ جن ارکان نے THE ARRIVAL OF

BRITISH IN INDIA ''ہندوستان میں برطانوی سلطنت کی آمد'' کے عنوان سے رپورٹ لکھی، انھوں نے لکھا کہ:

''ہندوستانی مسلمانوں کے اکثریت اپنے روحانی رہنماؤں کی اندھادھند پیروکار ہے۔ اگر اس وقت ہمیں کوئی ایسا آدمی مل جائے جو اپاسٹالک پرافٹ (حواری نبی) ہونے کا دعویٰ کرے، تو اس شخص کی نبوت کو حکومت کی سرپرستی میں پروان چڑھا کر برطانوی مفادات کے لیے مفید کام لیا جاسکتا ہے۔'' (تلخیص)

مرزا غلام احمد (قادیانی):

میرزا غلام احمد ڈپٹی کمشنر سیالکوٹ (پنجاب) کی کچہری میں ایک معمولی تنخواہ پر (۱۸۶۴ء تا ۱۸۶۸ء) ملازم تھے۔ آپ نے ملازمت کے دوران سیالکوٹ کے پادری مسٹر بٹلر ایم۔ اے سے رابطہ پیدا کیا۔ وہ آپ کے پاس عموماً آتا اور دونوں اندر خانہ بات چیت کرتے۔ بٹلر نے وطن جانے سے پہلے آپ سے تخلیہ میں کئی ایک طویل ملاقاتیں کیں۔ پھر اپنے ہم وطن ڈپٹی کمشنر کے ہاں گیا، اس سے کچھ کہا اور انگلستان چلا گیا۔ ادھر میرزا صاحب استعفیٰ دے کر قادیان آ گئے۔ اس کے تھوڑا عرصے بعد، مذکورہ وفد ہندوستان پہنچا تھا اور لوٹ کر محولہ رپورٹیں مرتب کیں۔ ان رپورٹوں کے فوراً بعد ہی میرزا صاحب نے اپنا سلسلہ شروع کر دیا۔

برطانوی ہند کے سنٹرل انٹیلی جنس کی روایت کے مطابق ڈپٹی کمشنر سیالکوت نے چار اشخاص کو انٹرویو کے لیے طلب کیا۔ ان میں سے میرزا صاحب نبوت کے لیے نامزد کیے گئے۔

میرزا صاحب کی پہلی تصنیف ''براہین احمدیہ'' (صفحات ۵۶۲) چار حصوں میں شائع ہوئی۔ ۱۸۸۰ء میں پہلے دو حصے شائع ہوئے، ۱۸۸۲ء میں تیسرا اور ۱۸۸۴ء میں چوتھا۔ آپ کے دوسرے بیٹے میرزا البشیر احمد ایم۔ اے کی تالیف ''سلسلۂ احمدیہ'' کے مطابق آپ کو ماموریت کا تاریخی الہام مارچ ۱۸۸۲ء میں ہوا۔ اس سے پہلے آپ نے ۱۸۸۰ء میں ''ملہم من اللہ'' ہونے کا اعلان کیا اور اپنے مجدد ہونے کا ناد پھونکا۔ دسمبر ۱۸۸۸ء میں اعلان کیا کہ اللہ تعالیٰ نے انھیں بیعت لینے کا حکم فرمایا۔ ۱۸۹۱ء میں اپنے مسیح موعود ہونے کی خبر دی اور ظلی نبی ہونے کی اصطلاح ایجاد فرمائی۔ پھر ۱۹۰۱ء میں نبوت کا دعویٰ کیا اور نومبر ۱۹۰۴ء میں کرشن ہونے کا اعلان فرمایا۔ یہی وہ سال تھے، جب انگریزی سیاست اپنے استعماری عزائم کو پروان چڑھانے کے لیے پنجاب اور سرحد کے مسلمانوں کا شکار کر رہی تھی۔ اور اس کے سامنے بیرون ہندوستان کی مسلمان ریاستوں کو

اپنے دام میں لانے کا منصوبہ بھی تھا۔ میرزا غلام احمد ان چاروں نکات کے جامع ہو کر سامنے آئے، جو انگریزوں کے ذہن میں تھے۔ انھوں نے انگریزی سلطنت کے استحکام وطاعت کی بنیاد ہی اپنے الہام پر رکھی اور ایک نبی کا روپ دھار کر انگریزی سلطنت کی وفاداری سے انحراف کو جہنم کی سزا کا مستحق قرار دیا۔ اپنی ربانی سند کے مفروضہ پر جہاد کو منسوخ کر ڈالا۔ اور ان لوگوں کو حرامی قرار دیا جو اس کے بعد جہاد کا نام لیتے یا اس کی تلقین کرتے تھے۔

ہندوؤں میں آریہ سماج ایک پروگریسو فرقہ اٹھ رہا تھا، سوامی دیانند اس کے بانی تھے۔ میرزا صاحب نے اس فرقہ کو ہدف بنا کر ہندو دھرم پر رکیک حملے کیے۔ نتیجۃً آریہ سماج نے رسول اکرم ﷺ اور قرآن واسلام کے خلاف دریدہ دہنی کا آغاز کیا۔ اسی طرح میرزا صاحب نے عیسائی مشنریوں کے خلاف یدھ رچایا۔ حضرت مسیح سے متعلق نازیبا زبان استعمال کر کے محمد عربی (فداہ امی وابی) کے خلاف مشنریوں کی زبان کھلوائی، نتیجۃً پنجاب کے مسلمان جہاد سے روگرداں ہو کر ہندو دھرم اور عیسائی مذہب سے نبرد آزما ہو گئے۔ محاذ کا رخ پلٹ گیا۔ میرزا صاحب کے دعویٰ نبوت سے خود مسلمانوں میں ایک ایسا محاذ کھل گیا کہ علماء کے لیے ختم نبوت کا مسئلہ، حفظ ایمان کے لیے ضروری ہو گیا۔ میرزا صاحب نے مسلمانوں کے حصار وحدت کو منہدم کرنے کے لیے ایک ایسی کدال اٹھائی کہ وہ انگریزوں کے خنجر کو بھول کر اس کدال کے پیچھے پڑ گئے۔ گو مسلمانوں کے ہر دائرے میں انگریزوں کی ہر خواہش پورا کرنے کے لیے مختلف افراد پیدا ہو چکے تھے، لیکن میرزا صاحب اس رعایت سے ان سب کے جامع تھے کہ جہاں انگریز اپنا قلعہ مضبوط رکھنا چاہتا تھا، وہاں میرزا صاحب نے "حواری نبی" ہونے کا دعویٰ کر کے اس ضرورت کا سفر شروع کیا۔ ادھر علماء کے محاسبے سے میرزا صاحب کی شہرت کا آغاز ہو گیا، اور یہی وہ چاہ رہے تھے، ورنہ میرزا صاحب خود حقیقۃ الوحی کے صفحہ ۲۱۱ پر تسلیم کرتے ہیں کہ:

"ہماری معاش کا دارومدار والد کی ایک مختصر آمدنی پر تھا۔ اور بیرونی لوگوں میں ہمیں ایک شخص بھی نہیں جانتا تھا۔ میں ایک گمنام انسان تھا، جو قادیان جیسے ویران گاؤں کے زاویۂ گمنامی میں پڑا ہوا تھا۔"

میرزا صاحب نے عیسائیوں اور آریوں سے مناظرے کی آڑ میں مسلمانوں سے چندہ مانگنا شروع کیا، تو تین لاکھ سے زاید روپیہ جمع ہو گیا۔ (حقیقۃ الوحی) نے اپنے الہامات کو مدار بنا کر انگریزی حکومت کی تائید وحمایت میں اس قدر کتابیں لکھیں کہ "تریاق القلوب" (مصنفہ میرزا غلام احمد) صفحہ ۱۵ کے مطابق وہ تمام کتابیں اکٹھی کی جائیں تو ان سے ۵۰ الماریاں بھر سکتی ہیں۔ انگریز

اسلامی ملکوں میں اپنے آیندہ منصوبوں کے لیے نقب لگا رہا تھا۔ میرزا صاحب کی اطاعت وحمایت کے مذکورہ پلندے اس منصوبے کا راشن تھا۔ ان الہامی کتابوں کے عربی فارسی اور انگریزی میں تراجم کرائے گئے۔ پھر ان کتابوں اور میرزا صاحب کے سیکڑوں اشتہاروں کو عرب، مصر، شام، کابل اور روم بھجوایا گیا۔ (ملاحظہ ہو تریاق انقلاب مصنفہ میرزا صاحب) میرزا صاحب نے اس مہم کے سلسلے میں بہت سے کتابچے، کتابیں اور بے شمار خطوط اور اشتہار شائع کیے۔ ان سب کا لب لباب یہ تھا کہ مسلمان سلطنت برطانیہ کے سچے خیر خواہ ہو جائیں۔ خونی مہدی اور خونی مسیح کی بے اصل روایتوں کو ترک کر دیں اور جہاد کا جوش دلانے والے مسائل جو احمقوں کے دلوں کو خراب کرتے ہیں، ان کے دلوں سے معدوم ہو جائیں۔'' (تریاق القلوب، ص ۱۵)

میرزا صاحب نے اپنی کتاب ''شہادت القرآن'' میں اپنے ایک اشتہار (صفحہ ۳) کو نقل کیا ہے۔ فرماتے ہیں:

''میرا مذہب جس کو میں بار بار ظاہر کرتا ہوں۔ یہی ہے کہ اسلام کے دو حصے ہیں۔ ایک یہ کہ خدا تعالیٰ کی اطاعت کرے۔ دوسرے اس سلطنت کی جس نے امن قائم کیا اور ظالموں کے ہاتھ سے اپنے سایہ میں پناہ دی ہے اور وہ سلطنت برطانیہ ہے۔''

ایک دوسری کتاب ''تبلیغ رسالت'' جلد ہفتم کے صفحہ ۱۰ پر فرماتے ہیں کہ میں اس وقت ساٹھ برس کا ہوں اس عمر تک اسی ایک اہم کام میں مشغول رہا ہوں، کہ مسلمانوں کے دلوں کو حکومت انگلشیہ کی سچی محبت، خیر خواہی اور ہمدردی کی طرف پھیر دوں اور کم فہموں کے دلوں سے جہاد کا غلط خیال دور کروں۔ میں دیکھتا ہوں کہ مسلمانوں کے دلوں پر میری تحریروں کا بہت ہی اثر ہوا۔ اور لاکھوں انسانوں میں تبدیلی پیدا ہو گئی۔''

''تبلیغ رسالت'' جلد ششم کے صفحہ ۶۵ پر گورنمنٹ کے نام ایک عریضہ ہے۔ اس میں لکھا ہے کہ:

''میں نے بیسوں کتابیں عربی، فارسی اور اردو میں اس غرض سے لکھی ہیں کہ اس گورنمنٹ محسنہ سے جہاد ہرگز درست نہیں، بلکہ سچے دل سے اطاعت کرنا ہر مسلمان کا فرض ہے۔ میں نے یہ کتابیں بصرفِ زرِ کثیر چھاپ کر بلادِ اسلامیہ میں پہنچائیں۔ ان کتابوں کا بہت سا اثر اس ملک پر بھی پڑا ہے۔

اسی عریضے میں درج ہے کہ'' میرے مریدوں کی ایک جماعت تیار ہوئی ہے، جو اس گورنمنٹ کے دلی جانثار ہیں۔'' ایک دوسری جگہ رقمطراز ہیں:

''میں نے اس مضمون کی ۵۰ ہزار کے قریب کتابیں، رسائل اور اشتہارات چھپوا کر ملک اور

دوسرے بلادِ اسلام میں بھجوائے ہیں کہ انگریزی حکومت ہم مسلمانوں کی محسن ہے۔ ہر مسلمانوں کا فرض ہے کہ اس کی سچی اطاعت کرے اور دل سے اللہ کا شکر گزار ہو، دعا گو رہے۔ میں نے یہ کتابیں اسلام کے دو مقدس شہروں مکہ اور مدینہ میں بھی بخوبی شائع کی ہیں۔ اس کے علاوہ روم کے پایۂ تخت قسطنطنیہ، بلاد شام، مصر اور افغانستان کے متفرق شہروں میں جہاں تک ممکن تھا، ان کی اشاعت کی ہے۔ نتیجہ یہ ہوا کہ لاکھوں انسانوں نے جہاد کے وہ غلیظ خیالات چھوڑ دیے جو نافہم ملاؤں کی تعلیم سے ان کے دلوں میں تھے۔ مجھے اس خدمت پر فخر ہے۔ برٹش انڈیا کے تمام مسلمانوں میں سے اس کی کوئی نظیر کوئی مسلمان نہیں دکھلا سکتا۔ (ستارہ قیصرہ، ص ۳)

غرض میرزا صاحب خود ساختہ نبوت کے بل پر جہاد کی تنسیخ اور ممانعت کے لیے لگا تار الہام پر الہام شائع کرتے رہے اور وہ الہامات و نگارشات عربی، فارسی اور انگریزی میں ترجمہ ہو کر برطانوی عملداری کی معرفت ان تمام ممالک میں تقسیم ہوتی رہیں، جو اس وقت تک برطانوی اقتدار میں آ چکے تھے اور باقی اس کی استعماری نگاہ میں تھے۔

''منارۃ المسیح'' کی تعمیر کے لیے فراہمی چندہ کے اشتہار میں میرزا صاحب نے لکھا کہ (بہ تلخیص) اس منارے کو کسی حصۂ دیوار میں نصب کرایا جائے گا کہ آسمان کے دروازوں کے کھلنے کا وقت آ گیا۔ اب سے زمینی جہاد بند کیے گئے اور لڑائیوں کا خاتمہ ہو گیا...... آج سے دین کے لیے لڑنا حرام کیا گیا۔ اب اس کے بعد جو دین کے لیے تلوار اٹھاتا ہے اور غازی کہلا کر قتل کرتا ہے، وہ خدا اور اس کے رسول ﷺ کا نافرمان ہے۔

''تبلیغِ رسالت'' جلد ہفتم صفحہ ۱۷ پر لکھا ہے کہ:

> ''جیسے جیسے میرے مرید بڑھیں گے، ویسے ویسے مسئلۂ جہاد کے معتقد کم ہوتے جائیں گے، کیوں کہ مجھے مسیح و مہدی مان لینا ہی مسئلۂ جہاد کا انکار کرنا ہے۔''

میرزا صاحب نے ایک رسالہ ''نور الحق'' تصنیف کیا۔ اس میں لکھا کہ:

> ''اس حکومت کے پاس میرا کوئی ہمسر اور نصرت و تائید میں میرا مثیل نہیں۔ میرا وجود انگریزی حکومت کے لیے ایک قلعہ، ایک حصار اور تعویذ کی حیثیت رکھتا ہے۔''

میرزا صاحب نے اطاعت برطانیہ اور حرمت جہاد کے سلسلے میں بلاشبہ ایک ضخیم دفتر مرتب

کیا۔ ''تبلیغ رسالت'' میں واضح طور پر اقرار کیا کہ:

''میرے پانچ اصول ہیں جن میں دو حرمت جہاد اور اطاعت برطانیہ ہیں۔''

میرزا صاحب کے فرزند میرزا محمود احمد نے تنسیخ جہاد کے موروثی سوال پر کہا:

......''بعض احمق سوال کرتے ہیں اور اس گورنمنٹ سے جہاد کرنا درست ہے یا نہیں؟ یہ گورنمنٹ ہماری محسن ہے۔ اس کا شکریہ ادا کرنا فرض اور واجب ہے۔ محسن کی بدخواہی ایک بدکار اور حرامی کا کام ہے۔'' (الفضل جلد ۲۷۔ ۱۲ر دسمبر ۱۹۳۹ء)

میرزا غلام احمد نے ۲۳ر فروری ۱۸۹۸ء کو لکھا تھا:

''ہم نے سرکار انگریزی کی راہ میں اپنا خون دینے سے کبھی گریز نہیں کیا۔'' (تبلیغ رسالت جلد ہفتم)

لیکن آپ کے فرزند میرزا محمود احمد (خلیفۂ ثانی) نے فرمایا:

''مسیح موعود فرماتے ہیں۔'' میں مہدی ہوں۔ برطانوی حکومت میری تلوار ہے۔ تمہیں بغداد کی فتح سے کیوں خوشی نہ ہو۔ عراق، عرب، شام ہم ہر جگہ اپنی تلوار کی چمک دیکھنا چاہتے ہیں۔'' (الفضل ۷ر دسمبر ۱۹۱۵ء)

میرزا غلام احمد نے برطانیہ کی اطاعت اور جہاد کی مخالفت میں مسلمان ملکوں میں اپنا لٹریچر بھجوایا، لیکن میرزا محمود نے برطانوی مقاصد برآری کے لیے جنگ عظیم اول سے پہلے افریقہ میں مشن قائم کیے اور عرب ملکوں میں اسکاٹ لینڈ یارڈ کے ماتحت اپنے معتمدین بھجوائے۔ جو اس کے حسب ہدایت کام کرتے، چناں چہ اسلامی ملکوں میں کام کرنے کے لیے برطانیہ کے محکمہ جاسوسی کی تجویز پر میرزائی امت کا دفتر لندن میں قائم کیا گیا، تاکہ براہ راست کنٹرول ہو سکے۔ اس غرض سے خواجہ کمال الدین دسمبر ۱۹۱۲ء کو انگلستان روانہ ہو گئے۔ انھوں نے وہاں بات چیت کے بعد خلیفۂ اول حکیم نور الدین کو لکھا، تو حکیم صاحب نے چودھری فتح محمد ایم۔ اے کو پہلا احمدی مبلغ مقرر کیا اور وہ ۲۸ر جون ۱۹۱۳ء کو لندن روانہ ہو گیا۔ دوسرا مشن اسکاٹ لینڈ یارڈ کے حسب ہدایت افریقہ کے جزیرۂ ماریشیش میں قائم کیا گیا۔ اس کا انچارج صوفی غلام محمد بی اے کو بنایا گیا جو فروری ۱۹۱۵ء میں روانہ ہو گیا اور پہلی جنگ عظیم کے دوران اسکاٹ لینڈ یارڈ کے حسب ہدایت خدمات انجام دیتا رہا۔

پہلی جنگ عظیم ۱۸۔۱۹۱۴ء میں عرب ریاستوں کے احوال وآثار اور اسرار و وقائع چوری کرنے کے لیے میرزا محمود نے اپنے پیروؤں کی ایک کھیپ مہیا کی۔ ہندوستانی فوج کی ہر کمپنی کی ساتھ جاسوسی کے فرائض انجام دینے کے لیے ایک یا دو قادیانی منسلک کیے گے۔ کئی ایک معتمد ترکی بھیجے گئے۔ جنھوں نے مقامی ملازمت کے پردے میں اسکاٹ لینڈ یارڈ کے حسب ہدایت کام کیا، دمشق میں میرزا محمود کا سالا ولی اللہ زین العابدین ترکوں کی پانچویں ڈویژن کے انچارج جمال پاشا کی معرفت قدس یونیورسٹی میں دینیات کا لیکچرار لگ گیا۔ لیکن جس روز انگریزی فوج دمشق میں داخل ہوئی، وہ انگریزی کمانڈر کے ماتحت ہو گیا۔ اور کئی ایک معتمد ترکوں کے قتل کرانے میں حصہ لیا۔ اس کا چھوٹا بھائی میجر حبیب اللہ شاہ فوج میں ڈاکٹر تھا۔ اس کو بغداد فتح ہونے پر عارضی گورنر مقرر کیا گیا۔ جب ۱۹۲۴ء میں عراقی حکومت کو میرزائیوں کے خط وخال کا پتا چلا، تو ان کی غدارانہ سرگرمیوں کے باعث ان سب کو وہاں سے نکال دیا۔ میرزا محمود نے جمعے کے خطبہ (مطبوعہ الفضل ۳۱/اگست ۱۹۲۳ء) میں اعتراف کیا کہ:

"عراق فتح کرنے میں احمدیوں نے خون بہایا اور میری تحریک پر سیکڑوں لوگ بھرتی ہو کر گئے۔"

میرزا محمود نے مصطفیٰ کمال کو قتل کرنے کے لیے اپنے ایک معتمد نوجوان مصطفیٰ صغیر کا انتخاب کیا۔ اس کو انگریزی حکومت نے میرزا معراج دین سپرنٹنڈنٹ سی۔ آئی۔ ڈی کے ہمراہ ترکی روانہ کیا، لیکن وہ اقدام قتل سے پہلے پکڑا گیا اور پھانسی پا گیا۔ میر محمد سعید حیدر آبادی مکۂ مکرمہ میں قادیانی کا مشن کا انچارج تھا اور وہاں برطانوی محکمۂ جاسوسی کے ایک اہم عہدہ دار کرنل ٹی۔ ڈبلیو لارنس کی ہدایت پر کام کرتا تھا۔ لیکن جب عربوں کو اس کا پتا چلا تو وہ اپنے ساتھیوں سمیت فرار ہو گیا۔ شام میں جلال الدین شمس کو مقرر کیا گیا، لیکن جب اہل شام کو معلوم ہوا کہ برطانوی جاسوس ہے، تو...... ۲۷ر دسمبر ۱۹۲۷ء کو اس پر قاتلانہ حملہ ہوا، لیکن وہ بچ گیا۔ آخر عراق میں برطانوی گرفت ڈھیلی پڑنے پر ۱۷ر مارچ ۱۹۲۸ء کو حیفہ آ گیا۔ اس کی بعد برطانوی سرکار کی ہدایت پر فلسطین کو قادیانی کارندوں کا ہیڈ کوارٹر بنایا گیا۔ وہاں برطانیہ کی جاسوسی کے محکمہ کا افسر اعلیٰ ایک یہودی تھا۔ قادیانی مشن کو اس کے ماتحت کیا گیا اور یہی احمدیت و یہودیت کے درمیان گٹھ جوڑ کا آغاز تھا۔ لائیڈ جارج وزیر اعظم انگلستان نے فلسطین میں قادیانی خدمات کا کھلم کھلا اعتراف کیا۔ ۱۹۲۲ء میں میرزا محمود خود فلسطین گیا اور اعلان کیا کہ یہودی اس خطے کے مالک ہو جائیں گے۔ میرزا محمود نے

برطانوی ہائی کمشنر سے ملاقات کی اور آئندہ خدمات کا نقشہ تیار کیا۔ جلال الدین شمس کے ساتھ دو یہودی نژاد محمد المغربی الطرابلسی اور عبدالقادر عودہ صالح منسلک کیے گئے۔ (تحریک ختم نبوت: شورش کاشمیری، ص ۲۸۔۲۲)

۱۰؍جولائی ۱۸۶۹ء تا ۱۸۷۱ء

عظیم آباد کا دوسرا بڑا مقدمہ:

مقدمۂ انبالہ سے تحقیق و تفتیش کا جو سلسلہ دراز ہوا تھا۔ اسی کے نتیجے میں عظیم آباد کا یہ مقدمہ بنا تھا۔ اس کے سات ملزمان تھے، ۱۔ پیر محمد، ۲۔ امیر خان، ۳۔ حشمت داد خان، ۴۔ مولوی مبارک علی، ۵۔ مولوی تبارک علی (ابن مولوی مبارک علی)، ۶۔ دین محمد اور ۷۔ امین الدین۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ تمام حضرات کا تعلق حضرت سید احمد شہید کی تحریک اصلاح و جہاد سے تھا اور اس کے کاموں سے دلچسپی رکھتے تھے اور مجاہدین کی امداد کے لیے اپنے اپنے دایروں میں ساعی تھے۔

اس مقدمے میں سب سے پہلے امیر خان کی بنگال ریگولیشن ۱۸۱۸ء کے تحت ۱۰؍جولائی ۱۸۶۹ء کو اور حشمت داد خان کی ۱۲؍جولائی کو گرفتار کیا گیا تھا اور کلکتہ اور عظیم آباد کی جیلوں میں مقید رکھا گیا۔ مقدمے کی سماعت یکم اگست ۱۸۷۰ء سے شروع ہوئی۔ ملزمان کی طرف سے کلکتہ و بمبئی کے تین یورپین وکلا، مسٹر اینسٹے، مسٹر انگرام اور مسٹر ایوانز نے پیروی کی لیکن انگریزی حکومت کے مصالح کے مقابلے میں وکلا کی قابلیت کام نہ آئی۔ حشمت داد خان اور پیر محمد کے خلاف کوئی الزام ثابت نہ ہو سکا تھا۔ لہذا ۱۴؍جولائی ۱۸۷۱ء کو انھیں رہا کر دیا گیا۔ دیگر پانچ ملزمان کو حبس دوام بہ عبور دریاے شور اور ضبطی جائیداد کی سزا دی گئی۔ امیر خان کو دو سال پہلے سے ہدف آزار بنایا گیا تھا۔ امیر خان اور مولوی مبارک علی کو انڈمان نہ بھیجا گیا۔ مبارک علی نے بہ حالت اسیری انتقال کیا۔ امیر خان کو ۱۸۷۸ء میں رہا کر دیا گیا۔ رہائی کے بعد ۸؍نومبر ۱۸۷۸ء کو ایک گھوڑا گاڑی سے ٹکر کے نتیجے میں ان کا انتقال ہوا۔ حشمت دادخان کے ۸؍مئی ۱۸۷۷ء کو سفر آخرت اختیار کیا تھا۔ بقیہ تین حضرات نے انڈمان میں حبس دوام کی سزا بھگتی۔

تفصیلات کے لیے دیکھیے، سرگذشت مجاہدین، از غلام رسول مہر، ص ۴۰۵۔۳۹۶۔
مولانا تبارک علی ۱۸۸۳ء میں انڈمان سے رہا ہو کر وطن آ گئے تھے۔

۱۸۷۰ء، ۱۸۷۲ء: مقدمات راج محل و مالدہ:

مولانا غلام رسول مہر نے اپنی تالیف لطیف ''سرگذشت مجاہدین'' میں ڈبلیو ڈبلیو ہنٹر کی کتاب ''ہندوستانی مسلمان'' اور مولانا مسعود عالم ندوی کی کتاب ''ہندوستان کی پہلی اسلامی تحریک'' کے حوالے سے راج محل اور مالدہ کی مقدمات کی ضروری تفصیل مرتب کر دی ہے۔ تفصیل

کے لیے انھیں مطالعہ کیجیے۔

۱۔ مولانا احمد اللہ کے مقدمے کے دوران میں تفتیش اور شہادتوں سے مجاہدین کے لیے جن امدادی کاموں کے مراکز کا پتا چلا تھا ان میں راج محل اور مالدہ کے مراکز اوران کے کارگزار تھے۔ راج محل متصل اسلام پور اس زمانے میں ضلع مالدہ ہی کا حصہ تھا۔ یہاں کے امدادی کاموں کے کارگزار ابراہیم منڈل تھے۔ لیکن مقدمہ مولانا احمد اللہ کے فوراً بعد ان کے خلاف قدم نہیں اٹھایا گیا، بلکہ ایک عرصے کی خفیہ تحقیق کے بعد ۱۸۷۰ء میں گرفتار کیا تھا۔ چوں کہ مقدمے میں کوئی جھول نہ تھا اس لیے اس کے طول کھینچنے کا کوئی موقع نہ تھا۔ اکتوبر ۱۸۷۰ء میں انھیں حبس دوام بہ عبور دریاے شور اور ضبطی املاک کی سزا ہوئی۔ لیکن انھیں انڈمان نہیں بھیجا گیا۔ ہندوستان ہی میں قید رہے۔ ۱۸۷۸ء میں لارڈ لٹن کے حکم سے انھیں رہا کر دیا گیا۔

۲۔ انبالہ اور عظیم آباد کے مقدمات کی تفتیش کے دوران مجاہدین سرحد کے لیے امداد کی فراہمی کے جو دیگر مراکز انگریزی حکومت کے علم میں آئے تھے۔ ان میں مالدہ اور راج محل کے مراکز بھی تھے۔ مالدہ کا مرکز ۱۸۴۰ء سے کام کر رہا تھا۔ یہ علاقہ مولانا ولایت علی کے ایک خلیفہ مولوی عبدالرحمٰن کے زیر اثر تھا۔ ان کے ماتحت ایک صاحب رفیق منڈل وصولی چندہ کا کام کرتے تھے۔ ۱۸۵۳ء مین ان کے متعلق شکوک پیدا ہوئے اور تفتیش کے دوران میں آزاد قبائل میں واقع مرکز مجاہدین سے ان کا تعلق بعض دستیاب کاغذات سے ثابت ہو گیا۔ انھیں گرفتار کر لیا گیا لیکن پھر انھیں چھوڑ دیا گیا۔

اسی کے بعد انھوں نے مجاہدین کے لیے امداد کی فراہمی کا کام اپنے بیٹے مولوی امیر الدین کے سپرد کر دیا وہ اسے نہایت سرگرمی سے انجام دیتے رہے۔ مولوی امیر الدین کا دایرۂ عمل ضلع مالدہ کے علاوہ متصلہ اضلاع میں سے مرشد آباد اور راج شاہی، بنگال کے بعض حصوں تک پھیلا ہوا تھا۔ مولوی امیر الدین کے ایک بھائی مجاہدین میں شامل تھے۔ مولانا احمد اللہ کے مقدمہ (۶۵۔ ۱۸۶۴ء) میں یہ تمام واقعات اوران مراکز کے حالات وضاحت کے سامنے آ گئے تو ضروری ہو گیا کہ ان کا تدارک کیا جائے۔ چناں چہ شاید ۱۸۷۱ء میں انھیں گرفتار کر لیا گیا۔ ان پر مقدمہ چلا اور ضبطی جائداد کے ساتھ حبس دوام بہ عبور دریاے شور کی انھیں سزا دی گئی۔ مارچ ۱۸۷۲ء میں وہ انڈمان پہنچے۔ ۱۸۸۳ء میں انھیں انڈمان سے رہائی مل گئی تھی اور ہندوستان واپس آ گئے تھے۔

۱۸۷۰ء

۱۸۷۰ء میں وہائٹ ہاؤس میں کوئی کانفرنس ہوتی تھی۔ اس کی مطبوعہ رپورٹ سے برطانوی

پرائم منسٹر گلیڈ اسٹون کی تقریر کا ایک اقتباس جانباز مرزا نے نقل کیا ہے۔ گلیڈ اسٹون کا کہنا ہے:

''ہم اس سے پہلے برصغیر کی تمام حکومتوں کو غدار تلاش کرنے کی حکمت عملی سے شکست دے چکے ہیں۔ لیکن وہ مرحلہ وار تھا۔ کیوں کہ اس وقت فوجی نقطۂ نظر سے غداروں کی تلاش کی گئی تھی۔ مگر اب جب کہ ہم برصغیر کے چپہ چپہ پر حکمران ہو چکے ہیں اور ہر طرف امن وامان بھی بحال ہو گیا ہے تو ان حالات میں ہمیں کسی ایسے منصوبے پر عمل کرنا چاہیے، جو یہاں کے باشندوں کے داخلی انتشار کا باعث ہو۔''

''ہندوستان میں ایسی تعلیم رائج کی جائے، جس کے ذریعے ہر ہندوستانی لباس' بول چال، رہن سہن اور طرزِ تمدن میں انگریز معلوم ہونے لگے، چاہے وہ عیسائی نہ بھی ہو، مگر زندگی کے ہر شعبے میں انگریز دکھائی دے۔'' (کاروانِ احرار، جلد۴، ص ۴۳۔ ۲۴۲۔ دی آرائیول آف برٹش ایمپایران انڈیا)

۲۱ر ستمبر ۱۸۷۱ء: چیف جسٹس جان نارمن جس نے عظیم آباد کے دوسرے بڑے مقدمے کی اور کئی دیگر مقدمات کی سماعت کی تھی اور تحریک مجاہدین کے متعدد افراد کو حبس دوام بہ عبور دریائے شور، ضبطی جائداد اور پھانسی کی سزائیں دی تھیں۔ عبداللہ پنجابی نامی ایک شخص نے احاطۂ عدالت میں چھرے سے زخمی کر دیا تھا، انتقال ہو گیا۔ (سرگزشت مجاہدین از غلام رسول مہر، ص ۴۰۵)

مولانا عبیداللہ سندھیؒ

۲۲ر مارچ ۱۸۷۲ء: مولانا سندھی اپنی پیدائش اور خاندان کے بارے میں لکھتے ہیں:

میں ضلع سیال کوٹ کے ایک گاؤں ''چیاں والی'' میں پیدا ہوا۔ ہمارے خاندان کا اصلی پیشہ زرگری تھا، لیکن عرصے سے ایک حصہ سرکاری ملازمت میں شامل ہو گیا اور بعض افراد ساہوکارہ کرتے رہے۔

''میں بہ شب جمعہ قبل صبح ۱۲ر محرم ۱۲۷۹ھ/۲۲ر مارچ ۱۸۷۲ء پیدا ہوا۔ میرا باپ (رام سنگھ) چار ماہ پہلے فوت ہو چکا تھا۔ دو سال بعد دادا (جسپت رائے ولد گلاب رائے) بھی مر گیا۔ تو میری والدہ مجھے ننھیال میں لے آئی۔ یہ ایک خالص سکھ خاندان تھا۔ میرے نانا کی ترغیب پر ہی میرا والد سکھ بن گیا تھا۔''

میرے دو ماموں جام پور ضلع ڈیرہ غازی خان میں پٹواری تھے۔ جب نانا فوت ہوا، تو ہم ان کے پاس چلے آئے۔ میری تعلیم ۱۸۷۸ء سے جام پور کے اردو مڈل اسکول میں شروع ہوئی۔ ۱۸۸۷ء میں مڈل کی تیسری جماعت میں پڑھتا تھا کہ اظہار اسلام کے لیے گھر چھوڑ دیا۔

مطالعۂ اسلام: ۱۸۸۴ء میں مجھے اسکول کے ایک آریہ سماج لڑکے کے ہاتھ سے ''تحفۃ الہند'' ملی۔ میں اس کے مسلسل مطالعے میں مصروف رہا۔ اور بالتدریج اسلام کی صداقت پر یقین بڑھتا گیا۔ ہمارے قریب کے پرائمری اسکول (کوٹلہ مغلاں) سے چند ہندو دوست بھی مل گئے، جو میری طرح تحفۃ الہند کے گرویدہ تھے۔ انھیں کے توسط سے مجھے مولانا اسماعیل شہید کی ''تقویۃ الایمان'' ملی۔ اس کے مطالعے پر اسلامی توحید اور پرانک شرک اچھی طرح سمجھ میں آ گیا۔ اس کے بعد مولوی محمد صاحب ''لکھوکی'' کی کتاب ''احوال الآخرۃ'' پنجابی ایک مولوی صاحب سے ملی۔ اب میں نے نماز سیکھ لی اور اپنا نام ''تحفۃ الہند'' کے مصنف کے نام پر عبیداللہ خود تجویز کیا۔ احوال الآخرۃ کا بار بار مطالعہ اور تحفۃ الہند کا وہ حصہ جس میں نومسلموں کے حالات لکھے ہیں، یہی چیزیں جلدی اظہارِ اسلام کا باعث بنیں۔ ورنہ اصلی ارادہ یہ تھا کہ جب کسی ہائی اسکول میں اگلے سال تعلیم کے لیے جاؤں گا تو اس وقت اظہار اسلام کروں گا۔

مولانا سندھی کا اظہارِ اسلام:

۱۵/اگست ۱۸۸۷ء کو توکلا علی اللہ نکل کھڑا ہوا۔ میرے ساتھ کوٹلہ مغلاں کا ایک رفیق عبدالقادر تھا۔ ہم دونوں عربی مدرسے کے ایک طالب علم کے ساتھ کوٹلہ رحم شاہ ضلع مظفر گڑھ میں پہنچے۔ ۹/ذی الحجہ ۱۳۰۴ھ کو میری سنت تطہیر ادا ہوئی۔ اس کے چند روز بعد جب میرے اعزہ تعاقب کرنے لگے تو میں سندھ کی طرف روانہ ہو گیا۔ عربی صرف کی کتابیں میں نے راستے میں اسی طالب علم سے پڑھنا شروع کر دی تھیں۔

اللہ کی خاص رحمت سے جس طرح ابتدائی عمر میں اسلام کی سمجھ آسان ہو گئی۔ اسی طرح کی خاص رحمت کا اثر یہ بھی ہے کہ سندھ میں حضرت حافظ محمد صدیق صاحب (بھر چونڈی والے) کی خدمت میں پہنچ گیا، جو اپنے وقت کے جنیدا ور سید العارفین تھے۔ چند ماہ میں ان کی صحبت میں رہا۔ اس کا فایدہ یہ ہوا کہ اسلامی معاشرت میرے لیے اس طرح طبیعت ثانیہ بن گی، جس طرح ایک پیدائشی مسلمان کی ہوتی ہے۔'' (کابل میں سات سال، صفحہ ۴۷-۱۴۴)

دار العلوم دیوبند:

نومبر دسمبر ۱۸۸۸ء: صفر ۱۳۰۶ھ کو میں دار العلوم میں داخل ہوا۔ تخمیناً پانچ مہینے میں قطبی تک منطق کے رسائل متفرق اساتذہ اور شرح جامی مولانا حکیم محمد حسن صاحب سے پڑھی۔ ایک فاضل

استاد کی مہربانی سے طریقۂ مطالعہ سیکھ لیا اور محنت سے ترقی کا راستہ کھل گیا۔

حکمت و منطق کی کتابیں جلد ختم کرنے کے لیے چند ماہ مولانا احمد حسن کانپوری کے مدرسے میں چلا گیا۔ پھر چند ماہ مدرسۂ عالیہ رام پور میں رہ کر مولوی ناظر الدین صاحب سے کتابیں پڑھ لیں۔ اس طرح صفر ۱۳۰۷ھ کو پھر دیو بند واپس آ گیا۔

جون جولائی ۱۸۸۹ء: دیو بند میں دو تین مہینے تک مولانا حافظ احمد صاحب سے پڑھتا رہا۔ اس کے بعد مولانا شیخ الہند کے درس میں شامل ہو گیا۔ ۱۳۰۷ھ میں ہدایہ، تلویح، مطول، شرح عقاید، مسلم الثبوت میں امتحان دیا۔ اور امتیازی نمبروں میں کامیاب ہوا۔ مولانا سید احمد صاحب دہلوی مدرس اول نے میرے جوابات کی بہت تعریف کی۔ فرمایا "اگر اس کو کتابیں ملیں تو شاہ عبدالعزیز ثانی ہوگا۔"

مئی ۱۸۹۰ء: رمضان شریف میں اصول فقہ کا ایک رسالہ لکھا، جسے شیخ الہندؒ نے پسند فرمایا۔ اس میں بعض مسائل اس طرح تحریر کیے جن میں جمہور اہل علم کے خلاف محققین کی رائے کو ترجیح دی تھی۔ مثلاً تاویل المتشابہات ناممکن الحصول نہیں بلکہ راسخین فی العلم انھیں علم سے جانتے ہیں۔

جون ۱۸۹۰ء: شوال ۱۳۰۷ھ سے تفسیر بیضاوی اور دورۂ حدیث میں شریک ہوا۔ جامع ترمذی مولانا شیخ الہند سے پڑھی اور سنن ابوداؤد کے لیے حضرت رشید احمد صاحب کی خدمت میں گنگوہ پہنچا۔

بیمار ہو کر گنگوہ سے دہلی چلا آیا۔ حکیم محمود خان کے علاج سے فائدہ ہوا۔ حدیث کی باقی کتابیں مولوی عبدالکریم صاحب پنجابی دیو بندی سے جلدی جلدی ختم کر لیں۔ مجھے یاد ہے کہ سنن نسائی اور سنن ابن ماجہ میں نے چار چار دن میں پڑھی تھیں اور سراجی دو گھنٹہ میں ختم کر لی۔

مولوی صاحب حضرت مولانا قاسم اور حضرت مولانا رشید احمدؒ کے غیر معروف محقق شاگرد تھے۔ اثنائے قیام دہلی میں دو دفعہ مولانا نذیر حسین صاحب کی خدمت میں گیا۔ صحیح بخاری اور جامع ترمذی میں دو سبق بھی ان سے سنے۔

۲۰ جمادی الثانی ۱۳۰۸ھ کو دہلی سے سیدھا بھر چونڈی ضلع سکھر پہنچا۔ (اس تمام سفر میں ایابا و ذہابا لاہور نہیں اترا اور مسجد چینیاں نہیں گیا)۔ میرے مرشد میرے آنے سے دس دن پہلے وفات پا چکے تھے۔

رجب ۱۳۰۸ھ (فروری ۱۸۹۱ء) میں حضرت شیخ الہندؒ نے اجازت نامہ تحریر فرما کر بھیج دیا اور مولوی کمال الدین صاحب نے مجھ سے سنن ابی داؤد پڑھی۔

شوال ۱۳۰۸ھ (جون جولائی ۱۸۹۱ء) میں سید العارفین کے دوسرے خلیفہ مولانا ابوالحسن تاج محمود صاحب کے پاس امروٹ ضلع سکھر میں چلا گیا۔ انھوں نے اپنے مرشد کا وعدہ پورا کر دکھایا۔ وہ میرے لیے بمنزلہ باپ کے تھے۔ میرا نکاح سکھر کے اسلامیہ اسکول کے ماسٹر مولوی محمد عظیم خان یوسف زئی کی لڑکی سے کرایا۔ میری والدہ کو بلایا۔ وہ میرے پاس اخیر وقت تک میرے طرز پر رہیں۔ میرے مطالعہ کے لیے بہت بڑا کتب خانہ جمع کیا۔ میں ان کے ظل عاطفت میں ۱۳۱۵ء (۹۸۔۱۸۹۷ء) تک اطمینان سے مطالعہ کرتا رہا۔

کتب خانہ پیر صاحب العلم:

گوٹھ پیر جھنڈا ضلع حیدر آباد میں راشدی طریقے کے پیر صاحب العلم کی پاس علوم دینیہ کا کتب خانے تھا۔ میں دوران مطالعہ میں وہاں جاتا رہا اور کتابیں مستعار بھی لاتا رہا۔ میرے تکمیل مطالعہ میں اس کتب خانہ کے فیض کا بڑا دخل تھا۔......

حضرت مولانا ابوالتراب راشد اللہ صاحب العلم الرابع سے علمی صحبتیں رہیں۔ وہ علم حدیث کے بڑے جید عالم اور صاحب تصانیف تھے۔ ان کے ساتھ قاضی فتح محمد صاحب کی علمی صحبت بھی ہمیشہ یاد رہے گی۔

اللہ کی رحمتوں میں سے ایک نعمت عظمیٰ جس کا شکریہ میں ادا نہیں کر سکتا، یہ ہے کہ فقہ و حدیث کی تحقیق و تطبیق میں اور ایسا ہی قرآن عظیم کی تفسیر میں حضرت مولانا محمد قاسم صاحب دیوبندی سے شروع کر کے امام ولی اللہ دہلوی تک سلسلہ علماء میرا رہبر بنا اور ان کو میں نے اپنا امام بنالیا۔

مجھے اپنی علمی و سیاسی ترقی میں اس سلسلے سے باہر جانے کی ضرورت پیش نہیں آئی۔ اس سے میری تمام کوششیں ایک اصول پر منظم ہو گئیں اور میں اسلام کی فلاسفی سمجھنے کے قابل ہو گیا۔

میں نے دہلی میں ''قبلہ نما'' کا مطالعہ کیا۔ اس کے معارف میری روح سے پیوست ہو گئے۔

حدیث کی تحقیق میں ''حجۃ اللہ البالغہ'' کا تعارف مولانا شیخ الہندؒ نے کرایا تھا۔ آخر میں اس طرح کے مطالعے سے مجھے اطمینان نصیب ہوا۔ میں نے علماء کو ''حجۃ اللہ البالغہ'' پڑھائی اور کافی عرصے بعد حضرت شیخ الہندؒ سے پڑھی۔......

میرا سیاسی میدان:

دوران مطالعہ میں نے مولانا محمد اسماعیل شہید کی سوانح عمری دیکھی۔ اسلامی مطالعے کی ابتدا سے میرا تعلیمی تعلق مولانا مرحوم سے پیدا ہو چکا تھا۔ دیوبند کی طالب علمی نے بہت سے واقعات

اور حکایات سے آشنا کر دیا تھا۔ مولانا عبدالکریم دیو بندی نے سقوط دہلی کی تاریخ آنکھوں دیکھی بتا دی تھی۔ میرا دماغ بچپن سے خاندانی عورتوں کی صحبت میں انقلاب پنجاب کے تکلیف دہ حالات سے بھرا ہوا تھا۔ اس میں ایک قسم کا انقلاب آیا۔ پہلے جو کچھ لاہور کے لیے سوچتا تھا۔ اب دہلی کے لیے سوچنے لگا۔ مولانا شہید کے مکتوبات میں سے ایک مضمون لے کر میں نے اپنا مختصر سیاسی پروگرام بنالیا۔ وہ اسلامی بھی تھا اور انقلابی بھی۔ مگر ہند کے باہر مسلمانوں کی تحریک سے اسے کوئی تعلق نہ تھا۔ میں نے حجۃ اللہ پڑھنے والی جماعت کو اس میں شامل کرلیا۔ اور اس طرح اپنے خیال کے موافق آہستہ آہستہ کام کرنا شروع کر دیا۔

۱۳۱۵ھ (۱۸۹۸ء) میں دیو بند پہنچا۔ اپنے مطالعے کا نمونہ دو رسالے لکھ کر ساتھ لے گیا۔ ایک علم حدیث میں اور دوسرا فقہ حنفی میں۔ حضرت مولانا نے دونوں رسالے پسند فرمائے۔ اس دفعہ دس بارہ حدیث کی مشہور کتابوں کے اطراف سنا کر دوبارہ شفہاً اجازت حاصل کی۔

بعض مسائل جہاد کے ضمن میں ہماری اس جماعت کا بھی ذکر آیا۔ حضرت مولانا نے اسے بہت پسند فرمایا اور چند اصلاحات کا مشورہ دے کر اسے اتحاد اسلامی کی ایک کڑی بنا دیا۔ اس کام کو جاری رکھنے کی وصیت کی۔ اس کے بعد میرے تعلیمی اور سیاسی تمام مشاغل حضرت شیخ الہند قدس اللہ سرہٗ سے وابستہ رہے۔

دارالرشاد گوٹھ پیر جھنڈا:

امروٹ واپس آ کر میں نے مطبع قائم کا اور دو سال تک چلایا۔ بعض عربی و سندھی نایاب کتابیں طبع ہوئیں اور ایک ماہوار رسالہ ''ہدایت الاخوان'' چھپتا رہا۔ اس کے بعد مدرسے بنانے کی کوشش جاری کی۔ مگر اس میں کامیابی نہیں ہوئی۔ ہمارا کام بغیر مدرسہ کے چل نہیں سکتا تھا۔ اس لیے دوسری جگہ کی تلاش میں تھا کہ حضرت مولانا راشد اللہ صاحب العلم الرابع نے ۱۳۱۹ھ (۱۹۰۲ء) میں میری تجویز کے موافق مدرسہ بنانے کا ارادہ کیا۔ یہ نام بھی میری تجویز سے مقرر ہوا۔ میں اس میں شریک ہو گیا۔ سات سال تک علمی و انتظامی کامل اختیارات کے ساتھ کام کرتا رہا۔ اکابر علماء میں سے حضرت مولانا شیخ الہند اور حضرت مولانا شیخ حسین بن محسن یمانی امتحان کے لیے تشریف لائے۔ اس مدرسے میں بھی میں نے رسول اللہ ﷺ کی زیارت خواب میں کی اور امام مالک ؒ کو بھی خواب میں دیکھا۔

جمعیۃ الانصار دیوبند:

۱۳۲۷ھ میں حضرت شیخ الہند نے دیوبند طلب فرمایا اور مفصل حالات سن کر دیوبند رہ کر کام کرنے کے لیے حکم دیا اور فرمایا کہ اس کے ساتھ سندھ کا تعلق بھی قائم رہے گا۔ چار سال تک جمعیۃ الانصار میں کام کرتا رہا۔ اس جمعیۃ کی تحریک تاسیس میں مولانا محمد صادق صاحب سندھی اور مولانا ابو محمد احمد لاہوری اور عزیزی مولوی احمد علی میرے ساتھ شریک تھے۔

نظارۃ المعارف دہلی:

حضرت شیخ الہندؒ کے ارشاد سے میرا کام دیوبند سے دہلی منتقل ہوا۔ ۱۳۳۱ھ میں نظارۃ المعارف قائم ہوئی۔ اس کے سرپرستوں میں حضرت شیخ الہند کے ساتھ حکیم اجمل خان اور نواب وقار الملک ایک ہی طرح شریک تھے۔ حضرت شیخ الہند نے جس طرح چار سال دیوبند میں رکھ کر میرا تعارف اپنی جماعت سے کرایا، اسی طرح دہلی پہنچ کر مجھے نوجوان طاقت سے ملانا چاہتے تھے۔ اس غرض کی تکمیل کے لیے دہلی تشریف لے آئے اور ڈاکٹر انصاری سے میرا تعارف کرایا۔ ڈاکٹر انصاری نے مجھے مولانا ابوالکلام اور محمد علی مرحوم سے ملایا۔ اس طرح تخمیناً دو سال مسلمانان ہند کی اعلیٰ سیاسی طاقت سے واقف رہا۔ (کابل میں سات سال، صفحہ ۵۴۔۱۴۸)

مولانا عبیداللہ سندھی کی ہندوستان سے روانگی اور کابل میں داخلہ:

اپریل ۱۹۱۵ء: ۱۳۳۳ھ موافق اگست ۱۹۱۵ء کو میں کابل کی طرف روانہ ہوا۔ اس سے تخمیناً چار مہینے پہلے ہندوستان چھوڑنے کا ارادہ مصمم کر چکا تھا۔ اپریل ۱۹۱۵ء کے شروع میں دہلی سے سندھ چلا آیا۔ اور چار مہینے مختلف مقامات پر گزرے(۱)۔ دوستوں سے آخری ملاقات اور ضمناً راستے کے خطرات سے محفوظ رہنے کی تدابیر میں مصروف رہا۔ بفضلہٖ تعالیٰ بلوچستان سے گزر کر

---

(۱) ''مولانا عبیداللہ صاحب دہلی سے روانہ ہو کر سندھ پہنچتے ہیں اور سی۔ آئی۔ ڈی کو غافل کرنے کے لیے ایک غیر معروف گاؤں میں نہایت سکون کی حالت میں اقامت گزیں ہو جاتے ہیں۔ خفیہ پولیس تین چار مہینے کی طویل مدت میں ان سے کسی قسم کی سیاسی سرگرمی محسوس نہیں کرتی، اس لیے مطمئن ہو جاتی ہے۔ مگر مولانا عبیداللہ صاحب اور ان کے رفقاء اپنی جدوجہد راز دارانہ میں غافل نہیں ہیں۔ ایک دن معہ شیخ عبدالرحیم صاحب سندھی حیدرآباد سے نکل پڑتے ہیں۔ سانڈنیوں پر بلوچستان کا ریگستان اور پہاڑی دروں میں سفر کرتے ہیں۔ برطانوی خفیہ پولیس کے تعاقب کے خوف سے نہ صرف عام شاہراہوں کو چھوڑا گیا اور غیر معروف راستے اختیار کیے گئے۔ بلکہ لگاتار سفر پر سفر اور کوچ پر کوچ ہوتا رہا تاکہ بہت طویل مسافت جلد سے جلد قطع کر لی گئی...... (نقش حیات خودنوشت سوانح حیات۔ مولانا حسین احمد مدنی جلد دوم صفحہ ۱۴۸)۔

۱۵/ اگست کی نماز مغرب سرحد افغانستان میں پڑھی اور توکل علی اللہ بغیر کسی پاسپورٹ کے حاصل کیے افغانستان میں داخل ہوا۔

جس حصۂ ملک میں ہم داخل ہوئے وہ سوراب (قندھار کا ایک ضلع) کا علاقہ تھا۔ وہاں کے حاکم سے ملا۔ پاسپورٹ نہ ہونے کی وجہ سے انھیں شکوک پیدا ہونے لگے مگر ہماری درخواست سن کر کہ آپ ہمیں سرکاری حفاظت سے قندھار پہنچادیں، وہاں ہم حکومت کو مطمئن کر دیں گے۔ چند سوالات پوچھے، جن کا جواب ان کے رفع شبہات کے لیے کافی تھا۔ اس لیے انھوں نے ہمیں حکومت کا معزز مہمان قرار دیا۔ اور ہمارے قندھار پہنچانے کا سب انتظام کر دیا۔ قندھار میں ہمارے بعض آشنا مل گئے۔ ان کا حکومت میں اچھا رسوخ تھا اور ہمیں اچھی طرح جانتے تھے۔ اس لیے نائب حکومت (گورنر) نے چند روز نہایت احترام سے مہمان رکھا۔ فقط کابل کے سفر کا نہیں بلکہ چند روز کابل میں رہنے کا بھی انتظام کر دیا۔ اس طرح ہم ۱۵/ اکتوبر ۱۹۱۵ء کو کابل پہنچے۔ اتفاقات زمانہ میں یہ بھی ایک عجیب بات سمجھی جائے گی کہ اسی تاریخ ۱۵/ اکتوبر ۱۹۲۲ء کو ہمیں کابل سے سفر کرنے کا پاسپورٹ مل گیا۔ گو ہماری روانگی سات دن بعد ۲۲/ اکتوبر کو عمل میں آئی۔ (کابل میں سات سال از مولانا عبیداللہ سندھی، لاہور، ۱۹۷۶ء (اشاعت ثانی)، صفحہ ۲۷۔۲۶)

علی گڑھ کالج کے قیام کا فیصلہ اور اس کا مقصد:

۱۲/ مئی ۱۸۷۲ء:

محسن الملک نے ''ایڈریسز اینڈ اسپیچز'' کے عنوان سے علی گڑھ کالج کے متعلق سرسید۔ کے خطبات و تقاریر کو جمع کیا ہے۔ یہ مجموعہ پہلی بار دسمبر ۱۸۹۸ء میں انسٹی ٹیوٹ پریس علی گڑھ میں چھپ کر شائع ہوا تھا۔ اس میں محسن الملک نے سرسید کی ایک تحریر سے کالج کے قیام کے پس منظر، اس کی تاریخ اور مقاصد پر روشنی ڈالی ہے۔ محسن الملک لکھتے ہیں:

''اس بات کو دیکھ کر کہ مسلمان عموماً گورنمنٹ کالجوں اور اسکولوں سے فایدہ نہیں اٹھاتے اور مغربی علوم و فنون سے نفرت رکھتے ہیں، ۱۸۷۰ء کے اخیر میں چند علم دوست مسلمانوں نے ایک کمیٹی مقرر کی۔ جس کا یہ نام تھا 'کمیٹی خواستگار ترقی تعلیم مسلمانانِ ہندوستان' اس کا مقصد ان موانع کی اور ان کے علاج کی تحقیق کرنا تھا جن کے سبب مسلمان سرکاری کالجوں اور اسکولوں میں نہایت کم پڑھتے ہیں اور جن کے سبب ان میں ویسٹرن سینسز و لٹریچر نے رواج نہیں پایا۔

اس کمیٹی نے اس مضمون پر مسلمانوں سے ''ایس سے'' مضمون لکھنے کی درخواست کی اور عمدہ

ایسوں کے لیے تین انعام مشتہر کیے قریب ''تیں ایس سے'' کمیٹی میں پہنچے اور ایک سلیکٹ کمیٹی میں جس میں ذی علم و معزز مسلمان شریک تھے متعدد اجلاسوں میں اس پر بحث ہوئی اور اس کا اخیر اجلاس ۱۵/اپریل ۱۸۷۲ء کو ہوا آخر کو کمیٹی نے ان موانع کے علاج کے طور پر ایک خاص کالج کا مقرر کرنا تجویز کیا اور ۱۲/مئی ۱۸۷۲ء کو کالج کے لیے سرمایہ جمع کرنے کو ایک کمیٹی قائم کی اس کا نام ''دی محمڈن اینگلو اورینٹل کالج فنڈ کمیٹی''، یعنی ''مجلس خزنۃ البضاعۃ لتاسیس مدرسۃ العلوم مسلمانان'' مقرر کیا پس اس کمیٹی کی پیداوار یہ کالج ہے۔

اصلی مقصد اس کالج کا یہ ہے کہ ''مسلمانوں میں عموماً اور بالتخصیص اعلیٰ درجے کے مسلمان خاندانوں میں یورپین سینسز اور لٹریچر کو رواج دے اور ایک ایسا فرقہ پیدا کرے جو از روے مذہب کے مسلمان اور از روے خون اور رنگ کے ہندوستانی ہوں مگر باعتبار مذاق اور راے و فہم کے انگریز ہوں''۔

بایں ہمہ کبھی یہ خیال نہیں کیا گیا تھا کہ ہندو یا عیسائی یا پارسی یا یہودی اس جگہ تعلیم نہ پادیں گے۔ گو اس کی بنا مذکورہ بالا مقصد سے ہو مگر بانیوں نے ابتدا سے یہ ارادہ کیا تھا کہ مثل قرطبہ اور غرناطہ کی مسلمان یونیورسٹیوں کے سب قوم کے لوگوں کو بلا تعصب اس میں تعلیم دی جائے۔ چناں چہ موجودہ کالج میں ہندوستانی، عیسائی، پارسی سب تعلیم پاتے ہیں اور سب کو تعلیم کے باب میں برابر استحقاق دیے جاتے ہیں۔

۲۴/مئی ۱۸۷۵ء کو کالج کھولنے کی رسم ادا کی گئی اور یکم جون ۱۸۷۵ء سے اسکول کی جماعتیں قائم ہوئیں اور تعلیم شروع ہو گئی یکم جنوری ۱۸۷۸ء سے فرسٹ ایر کلاس قائم ہوا اور ایف اے کی پڑھائی تک کلکتہ یونیورسٹی سے افلیٹ ہو گیا۔ یکم جنوری ۱۸۸۱ء سے تھرڈ ایر کلاس قائم ہوئی اور بی اے کی پڑھائی تک کلکتہ یونیورسٹی سے افلیٹ ہوا اور ۱۸۸۲ء میں فورتھ ایر کلاس قائم ہوا اور اسی سال اس کالج سے طالب علم کلکتہ یونیورسٹی کے بی اے کے امتحان کو بھیجے گئے۔ ۱۸۹۱ء میں لا کلاس کھولی گئی ۱۸۹۶ء میں یہ کالج پنجاب یونیورسٹی سے افلیٹ ہوا۔'' (تمہید) (طبع اول)، صفحہ ۱-۲)

۲۱/دسمبر ۱۸۷۳ء:

سرسید نے مذہبی عقاید مسایل میں جو آزاد روش اختیار کی تھی، اس نے اکثر راسخ العقیدہ مسلمانوں کو ان سے اور ان کی تعلیمی تحریک سے متوحش کر دیا تھا۔ مختلف عقاید و مسالک کے علماء نے ان کی سخت مخالفت کی۔ باوجود ان مخالفتوں کے سرسید نے مختلف اضلاع کے دورے کیے اور پر زور تحریک شروع کی جس سے مجوزہ مدرسۃ العلوم کے لیے چندہ آنا شروع ہوا۔ مگر مولوی سمیع اللہ

خان سب جج علی گڑھ نے جو سرسید کے ابتدا سے شریک کار تھے ۲۱/دسمبر ۱۸۷۳ء کو کمیٹی کے جلسے میں یہ فرمایا:

''مخالفت رفع کرنے کی کوئی تدبیر اس سے بہتر نہیں کہ ایک ماتحت مدرسہ بطور نمونہ کے علی گڑھ میں قائم کیا جائے۔ جس کے طریقۂ تعلیم سے لوگوں پر ظاہر ہو جائے کہ جو تعلیم صدر کمیٹی بنارس (سرسید) نے تجویز کی ہے، وہ کسی طرح اصول اسلام کے خلاف نہیں۔'' (حیات جاوید: الطاف حسین حالی، صفحہ ۱۹۲)

مگر اس تجویز کے پاس ہونے پر بھی یہ ماتحت مدرسہ اس وقت نہ کھولا گیا اور مذہبی تعلیم کے متعلق بحث و مباحثہ ہوتا رہا۔ مولانا مولوی محمد قاسم نانوتوی سے جب کہا گیا کہ وہ تجویز میں دینیات کی تعلیم کا اپنی مرضی سے انتظام کریں تو انھوں نے جواب دیا کہ سرسید اس مدرسے کے کاموں سے دست بردار ہو جائیں، تب مذہبی تعلیم کا انتظام کیا جاسکتا ہے اس پر سرسید نے یہ کیا کہ جو کمیٹی دینیات بنائی گئی اس کے ممبر خود نہیں ہوئے۔ بالآخر مولوی سمیع اللہ خان سیکریٹری سب کمیٹی نے جو اس وقت علی گڑھ میں سب جج تھے، جلسہ کا انتظام کیا اور ۲۴/مئی ۱۸۷۵ء کو جو ملکۂ معظمہ کی سالگرہ کا دن تھا، سرسید کی موجودگی میں جو بنارس سے جہاں وہ سب جج تھے علی گڑھ آگئے تھے مولوی محمد کریم ڈپٹی کلکٹر علی گڑھ کی صدارت میں مدرسہ کا افتتاح کیا گیا۔ اور پانچ برس کی کشاکش کے بعد چھاؤنی کے پرانے بنگلوں میں یکم جون ۱۸۷۵ء سے تعلیم شروع کر دی گئی۔ یہی اسکول بعد میں کالج اور پھر یونیورسٹی بنا اور تمام دنیا میں مشہور ہوا۔ (مسلمانوں کا روشن مستقبل، صفحہ ۲۱۶)

علی گڑھ کالج کی فضا:

۱۸ر فروری ۱۹۱۳ء: احمد علی شوق مصنف ''تذکرہ کاملان رام پور'' نے اپنے ایک عزیز مسٹر مشیر کو ایک پرائیویٹ خط لکھا ہے۔ اس میں دیگر گھریلو معاملات کے لکھا ہے:

رام پور اسٹیٹ۔ یو۔ پی۔ موتی مسجد

۱۸ر فروری ۱۹۱۳ء، چہار شنبہ: عزیز گرامی مسٹر مشیر سلمہ دعا اور سلام شوق میرا خط پچھلی ڈاک کا آپ کو پہنچا ہوگا۔

کل مقبول میاں کا خط جموں سے آیا۔ دو سال کے لیے انھیں مہاراج نے روک لیا ہے۔ شکریہ!

ہندوستان میں اس وقت بڑے تہلکے کا سامنا ہے۔ شیعہ اور سنی لڑ گئے۔ مجتہدینِ شیعہ کا فتوے شائع ہوا ہے کہ اہل تشیع کے لیے علی گڑھ۔ ایم۔ اے۔ او۔ کالج میں پڑھنا کفر ہے۔ ان کو اپنا کالج علاحدہ قائم کرنا چاہیے۔ اور ہر صورت سے اہل تشیع کو علی گڑھ کالج اور اس کی اعانت سے دست کش ہونا چاہیے۔ ادھ یہ فتوے نکلا۔ ادھ یوسف حسین بیرسٹر (لکھنو) نے جدید کالج کے واسطے ایک اپیل شائع کیا ہے۔ اور اس میں اہل تسنن کو ایسی ایسی بے نقط سنائی ہیں کہ خدا کی پناہ کوئی دقیقہ بدزبانی کا اٹھا نہیں رکھا ہے۔

میرے خیال میں یہ فتنہ فرو نہیں ہوسکتا۔ اس کی تہ میں ایسی آگ ہے۔ جو گل نہیں ہوسکتی، ضرور بھڑکے گی اور ایک حد تک پھیلے گی۔ یہ فتویٰ لکھنو کے مجتہدین کا ہے۔ اب دیکھنا یہ ہے کہ پنجاب وغیرہ کے مجتہدین کیا کہتے ہیں؟

خود علی گڑھ میں دونوں مذہبوں کے طلبہ میں ان بن ہوگئی ہے۔ اگرچہ ابھی غل نہیں ہوا ہے۔ مگر نقیض پڑگئی۔ یہ میں معتبر ذریعے سے لکھتا ہوں۔ منظور محمود علی گڑھ کو گئے تھے۔ پلٹ کے رام پور آکے لکھنو کو گئے ہیں۔

علی گڑھ میں سنی طلبہ نے مجلس میلاد کی تھی۔ شیعہ طلبہ نے مجلس عزا کی اجازت چاہی۔ سیکریٹری نے دے دی۔ انھوں نے صرف شیعہ طلبہ کی مجلس کی۔ اس میں سنیوں پر خوب زبان درازیاں کیں۔ سنیوں کو محرف قرآن پاک قرار دے کے سورۂ علی (جو قرآن پاک میں نہیں ہے) پڑھا گیا۔ اور بہت کچھ سنی مذہب کو برا کہا گیا۔ سنی لڑکوں نے یہ واقعہ سن کے شیعہ لڑکوں کو مارنے کا قصد کیا۔ یہ ہنگامہ تو دبا یا گیا۔ لیکن دونوں کے قلوب بھرے ہوئے ہیں۔

ان دونوں فرقوں کی اصلاح باہمی سے مجھے تو ناامیدی ہے۔ اب سنیوں کی حکمت عملی اس سے بہتر اور میرے خیال میں نہیں ہے کہ یہ بلا پس و پیش ہندوؤں سے مل جائیں۔ چاہے کچھ جزوی قربانی حقوق کی کرنی پڑے۔ اہل تسنن اور اہل ہنود میں باہمی میل آسان ہے۔ اگرچہ بلگرام وغیرہ میں یہ جال اتحاد کا اہل تشیع اہل ہنود پر ڈال رہے ہیں۔ (خدا بخش لائبریری جرنل، پٹنہ شمارہ (۱۰۴) ۱۹۹۶ء)

کانگریس کا سالانہ اجلاس:

۲۷ دسمبر ۱۹۱۳ء: کراچی میں نواب سید محمد بہادر کی زیر صدارت آل انڈیا کانگریس کا اٹھائیسواں سالانہ اجلاس منعقد ہوا۔ اس اجلاس میں ۵۵۰ ڈیلیگیٹ شریک ہوئے۔ خطبۂ صدارت میں پورا زور اس نکتے پر صرف کیا گیا کہ ہندوستان کی مختلف قوموں کو متحدہ طور پر منظم ہو کر آگے بڑھنے کی ضرورت اور ملک کی خدمت کرنے کا موقع ہے اور تمام الجھے ہوئے مسائل کو سلجھانے کے لیے کانگریس اور مسلم لیگ کے لیڈروں کو کبھی کبھی اکٹھا ہو کر تبادلۂ خیالات کرنا اور آپس میں ملتے جلتے رہنا چاہیے۔ نواب صاحب نے مثال کے طور پر ترکوں اور ایرانیوں کے حالات کا جائزہ بھی پیش کیا جس کا اثر اجلاس پر زبردست پڑا اور ملک کی آزادی کے لیے کاندھے سے کاندھا ملا کر آگے بڑھتے رہنے کی ہندو مسلم شرکاء نے رضاکارانہ خدمات پیش کرنے کا وعدہ کیا۔ ساتھ ہی ہندو مسلم اختلافات کے خاتمے کا بھی اسی اجلاس میں اعلان کیا گیا۔ اشوک اور اکبر اعظم کے زمانے کا ہندوستان بنانے کی قسمیں کھائی گئیں۔ (حسرت موہانی۔ ایک سیاسی ڈائری، ص ۶۳)

۱۹۱۴ء

جنگِ عظیم اول کا آغاز اور ترکی کے خلاف برطانیہ کا اعلان جنگ:

۲ نومبر ۱۹۱۴ء: ۴ اگست ۱۹۱۴ء کو عالمگیر جنگ کا شرارہ وسط یورپ میں چمکا اور دیکھتے ہی دیکھتے مغربی تمدن کا تمام آتشگیر مادہ جنگ بھڑک اٹھا۔ نار اللہ الموقدۃ التی تطلع علی الافئدۃ! تو تھوڑے ہی عرصے کے بعد جنگ نے مسلمانانِ ہند پاکستان کے لیے ایک ایسی نازک صورت اختیار کر لی جو ہندوستان میں برطانوی حکومت کی پوری تاریخ میں کبھی پیش نہیں آتی تھی۔ یعنی

خلیفۃ المسلمین بھی میدان جنگ میں مشغول پیکار نظر آئیں۔

ترکی کے خلاف برطانیہ نے بھی اعلان جنگ کر دیا اس اعلان جنگ کی اطلاع جب سرکاری طور پر ہندوستان میں مشتہر کی گئی، تو ساتھ ہی حسب ذیل امور کا بھی اعلان کیا گیا تھا:

(۱) ترکی حکومت کے ساتھ ہماری جنگ دفائی ہے، نہ کہ حملہ آورانہ ہم نے دو ماہ تک ہر طرح کا مخالفانہ اور جنگ جویانہ سلوک برداشت کیا اور پوری کوشش کی کہ کسی طرح یہ جنگ ٹل جائے۔ لیکن ترکی گورنمنٹ نے برابر اپنے حملے جاری رکھے۔ اب مجبوراً ہم کو بھی اعلان جنگ کرنا پڑا ہے۔

(۲) ہندوستان کے مسلمانوں کو پوری طرح بھروسا رکھنا چاہیے کہ اس جنگ میں ہمارے یا ہمارے ساتھیوں کی جانب سے کوئی بات ایسی نہ ہوگی جو ان کے مذہبی محسوسات کو صدمہ پہنچائے۔ اسلام کے تمام مقدس مقامات محفوظ رہیں گے جن میں عراق بھی داخل ہے۔ ان کے احترام کا پورا پورا لحاظ رکھا جائے گا۔ اسلام کے مقدس مقام خلافت کے خلاف کوئی کارروائی عمل میں نہ آئے گی۔ ہماری جنگ موجودہ ترکی وزارت سے ہے جو جرمنی کے زیر اثر کام کر رہی ہے۔ خلیفۃ المسلمین سے اور اسلام سے نہیں ہے۔ گورنمنٹ برطانیہ نہ صرف اپنی جانب سے بلکہ اپنے تمام حلیفوں کی جانب سے ان باتوں کی ذمہ داری لیتی ہے۔

یہ خلاصہ اس سرکاری اعلان کا ہے جو ۲ رنومبر ۱۹۱۴ء کو اعلان جنگ کی اطلاع کے ساتھ ہی گورنمنٹ آف انڈیا نے شائع کیا تھا۔ اور پھر تمام صوبوں میں سرکاری طور پر اس کی اشاعت کی گئی تھی۔ حتیٰ کہ ہر کمشنری، ہر ضلع، ہر صدر مقام، ہر شہر کے مسلمانوں کو جمع کر کے مقامی حکام نے اس کی نقلیں بانٹی تھیں اور زبانی بھی پڑھ کر سنایا تھا۔ برٹش انڈیا کا کوئی مسلمان گھر ایسا نہیں ملے گا جو اس اعلان سے بے خبر چھوڑ دیا گیا ہو۔ بعد کو "نیر ایسٹ" وغیرہ اخبارات سے معلوم ہوا کہ مصر و سوڈان میں بھی بجنسہ یہی اعلان شائع کیا گیا تھا۔

اس اعلان کے بعد بھی ہمیشہ ذمہ دار حکام ہندو انگلستان کی زبان سے یہ دونوں باتیں بار بار ظاہر ہوتی رہیں۔ اگر کسی اظہار و بیان کی مضبوطی میں اعلان کی تکرار و اشاعت کی کثرت وسعت کو دخل ہے، تو بلا خوف رد کہا جا سکتا ہے کہ جس قدر کثرت و تکرار کے ساتھ یہ اعلان شائع کیا گیا شاید ہی کوئی انسانی وعدہ اس قدر دہرایا گیا ہو۔"

۲ رنومبر ۱۹۱۴ء: ۲ رنومبر ۱۹۱۴ء کو حکومت برطانیہ نے ایک سرکاری اعلان شائع کیا جس کی اشاعت اعلان جنگ کے ساتھ ہر قصبہ وقریہ میں کی گئی۔

''ہندوستان کے مسلمانوں کو یقین کر لینا چاہیے کہ ہم یا ہمارے اتحادی اس جنگ میں کوئی ایسی بات نہ کریں گے جس سے ان کے مذہبی جذبات و خیالات کو ٹھیس لگے۔ اسلام کے مقدس مقامات بے حرمتی سے محفوظ رہیں گے اور ان کی عزت و حرمت قائم رکھنے کی ہر ممکن احتیاط برتی جائے گی۔ اسلام کے مقدس دار الخلافہ کے خلاف کوئی کارروائی نہیں کی جائے گی۔ ہم صرف ترکی وزراء سے لڑ رہے ہیں جو جرمنی کے زیر اثر کام کر رہے ہیں نہ کہ خلیفۃ المسلمین سے۔ برٹش گورنمنٹ نہ صرف اپنی طرف سے بلکہ اتحادیوں کی طرف سے بھی ان مواعید کے ذمہ داری لیتی ہے۔

یہ خلیفۃ المسلمین کے اعلان جہاد کا جواب تھا۔ بہت سے سادہ لوح مسلمان اور خاص کر فوج کے سپاہی اور افسران اس کے شکار ہو گئے اور یہ سمجھ لیا کہ یہ ایک ملکی جنگ ہے۔ (تحریک خلافت، از قاضی محمد عدیل عباسی، ص ۶۸)

الہلال کی ضمانت کی ضبطی اور بندش:

۱۶ر نومبر ۱۹۱۴ء: بنگال گورنمنٹ نے ۱۶ر نومبر ۱۹۱۴ء کو الہلال پریس کی دو ہزار کی پہلی ضمانت ضبط کر لی اور الہلال کے دو نمبر مورخہ ۱۴ و ۲۱ر اکتوبر ۱۹۱۴ء بھی جو ڈبل نمبر کی صورت میں ایک ساتھ شائع ہوئے تھے، ضبطی میں آئے۔ بنگال گورنمنٹ نے جن مضامین کو قابل اعتراض قرار دیا ہے، وہ ''حدیث الجنود'' اور ''سقوط انٹورپ'' ہیں۔ ایک بلجیین تصویر بھی قابل اعتراض قرار دی گئی ہے۔ جس کے نیچے قرآن حکیم کی یہ آیت درج ہے۔ وما ظلمھم اللہ ولکن کانوا انفسھم یظلمون. (الہلال، کلکتہ، ۱۸ر نومبر ۱۹۱۴ء، ص ۱۹)

پہلی ضمانت جس کا اوپر ذکر آیا ہے۔ ۱۸ر ستمبر ۱۹۱۳ء کو طلب کی گئی تھی۔ اگر چہ اس کے داخل کرنے کی مہلت ۲۷ر ستمبر تک تھی لیکن ۲۳ر ستمبر ہی کو جمع کرا دی گئی۔ (الہلال۔ کلکتہ: ۲۴ر ستمبر ۱۹۱۳ء، ص ۴)

یہ ضمانت مسجد مچھلی بازار کانپور کے ایک حصے کے انہدام اور پولیس کی فائرنگ سے چند مسلمانوں کی مظلومانہ شہادت کے ماتم میں بعض مضامین کی اشاعت کے سلسلے میں طلب کی گئی تھی۔

مزید ۱۹۱۴ء میں دو ہزار کی ضمانت کی ضبطی کے بعد دس ہزار روپے کی ضمانت طلب کی گئی تھی۔ لیکن حالات نے واضح کر دیا تھا کہ یہ ضمانت بھی ضبط کر لی جائے گی اور الہلال بند کرنا پڑے گا۔

اس لیے دس ہزار روپے کی ضمانت داخل ہی نہیں کی گئی اور ۱۸؍نومبر ۱۹۱۴ء کا پرچہ شائع کر کے الہلال کو بند کر دیا گیا۔ اس حادثے کے تقریباً ایک سال کے بعد ۱۳؍نومبر ۱۹۱۵ء کو ''البلاغ'' کے نام سے الہلال کا دورِ ثانی شروع ہوا۔ البلاغ کا آخری شمارہ ۱۷؍۲۴ و ۳۱؍مارچ ۱۹۱۶ء کا مشترکہ شمارہ تھا۔ البلاغ کے سات شمارے الگ الگ، دو شمارے دو دو نمبروں کا مجموعہ اور دو شمارے تین تین نمبروں کے مشترکہ شمارے کے طور پر شائع ہوئے۔ البلاغ کی کل گیارہ اشاعتیں ہوئیں اور کل صفحات ۳۳۶۔

سالانہ اجلاس کانگریس:

۲۸؍دسمبر ۱۹۱۴ء میں مدراس میں آل انڈیا کانگریس کا انتیسواں سالانہ اجلاس بھوپیندر ناتھ باسو کی صدارت میں منعقد ہوا۔ جس میں ۸۶۶ نمائندے شریک ہوئے۔ اجلاس میں ایک تجویز پیش ہوئی۔ ''جیسے کو تیسا'' جسے پورے جوش و خروش کے ساتھ اتفاقِ رائے سے منظور کیا گیا۔ ایک اور تجویز پاس ہوئی کہ جن ممالک نے ہندوستانیوں کا اخراج شروع کر دیا ہے۔ ہندوستان ان کا مال نہ منگوائے اور ایسے مال کا پوری طاقت سے بائیکاٹ کیا جائے۔ صدر اجلاس بوپیندر ناتھ باسو نے جو ایک زبردست مقرر تھے اپنی تقریر میں کہا کہ ہندوستان میں عیش اور چین اڑانے والوں کے دن لد گئے۔ دنیا وقت کے ساتھ آگے بڑھ رہی ہے سرمایہ داروں میں مفاد کی جنگ چھڑ گئی ہے جو بھیانک روپ اختیار کرے گی انھوں نے کہا اگر ہمارے ملک پر انگریز ہمیشہ قابض رہنا چاہتے ہیں تو یہ ان کی بڑی بھول ہے۔ اس طرح یہ اجلاس کئی اور تجویزیں پاس کرتا ہوا ختم ہو گیا۔

(حسرت موہانی۔ ایک سیاسی دائری)

۳۱؍دسمبر ۱۹۱۴ء: شمس العلماء خواجہ الطاف حسین حالی کا پانی پت میں انتقال ہو گیا۔ وہ سرسید کی جماعت میں سب سے زیادہ شریف النفس شخص تھے۔

واقعات پنجاب کی تحقیقات کے لیے جو ہنٹر کمیٹی قائم کی گئی تھی اس نے اپنی رپورٹ اپریل ۱۹۱۹ء میں کہا ہے:

> ''چار سال یا اس سے کچھ زیادہ عرصے'' تک ہندوستان کے ذرائع، دیگر ممبران سلطنت برطانیہ کے ممالک کے مانند جنگ کی وجہ سے انتہائی حد تک صرف میں آئے بہت بڑی فوج مہیا کی گئی۔ پنجاب نے سب سے زیادہ یعنی چار لاکھ آدمی بہم پہنچائے۔ تین قرضہ ہائے جنگ ہندوستان

نے دیے۔ اور دس کروڑ پونڈ سے سلطنت کی جنگ میں مدد دی اور آدمیوں اور روپیہ سے براہ راست مدد دینے کے علاوہ مختلف طریقوں سے، بالواسطہ طور پر بھی معقول امداد دی۔'' (ہنٹر کمیٹی (اردو ترجمہ) کی کثرت رائے کی رپورٹ کا خلاصہ، ص ۱۲، ۱۳)

میک ماہن لائن:

۱۹۱۴ء: ہندوستان اور چین کے درمیان بین الاقوامی سرحد جس کی نشان بندی کے سمجھوتے پر شملہ میں ۱۹۱۴ء میں چین، تبت اور برطانیہ نے دستخط کیے۔ برطانوی وفد کی قیادت میک ماہن نامی ایک افسر نے کی جس کے نام سے یہ سرحد موسوم ہے۔ چین کی کیمونسٹ حکومت نے ۱۹۵۹ء کے ہند چین معاہدے کے ذریعے تبت پر اپنی بالادستی مسلم کرانے اور تبت میں مکمل عمل و دخل قائم کرنے کے بعد یہ دعویٰ کیا کہ اس سرحدی معاہدے کو برطانوی سامراج نے چین پر جبراً مسلط کیا تھا، اسے کالعدم قرار دیا اور اس سرحد کے جنوب میں واقع شمال مشرقی سرحدی ایجنسی (نیفا) کے تیس ہزار مربع میل علاقہ پر اپنی ملکیت کا دعویٰ کر دیا۔ چین اور برما کے درمیان سرحد دراصل اسی میک ماہن لائن کا سلسلہ تھی جسے چین نے ۱۹۶۰ء میں جائز بین الاقوامی سرحد تسلیم کر لیا۔ لیکن ہندوستان پر ۱۹۶۲ء میں بڑے پیمانے کے حملے کر کے نیفا اور لداخ کے بعض علاقوں پر قبضہ کر لیا۔ (فرہنگ سیاسیات، ص ۴۲۰)

۱۹۱۵ء

۹ر جنوری ۱۹۱۵ء: جو ڈرپوک شرمیلا وکیل ڈربن کی سرزمیں پر برسوں پہلے اترا تھا وہ اب کسی اور ہی سانچے میں ڈھل کر جولائی ۱۹۱۴ء میں ہندوستان کو روانہ ہو رہا تھا۔ جنوبی افریقہ میں اس نے اپنے تین گرو تلاش کر لیے تھے۔

رسکن، تھورو اور ٹالسٹائی۔

لیو ٹالسٹائی کا مضمون '' خدا کی حکومت تمھارے اندر ہے۔'' ...... گاندھی جی نے رسکن کے مضمون کے ساتھ پڑھا تھا۔ انھیں ٹالسٹائے کی یہ بات پسند آئی تھی کہ جو دوسروں کو نصیحت کرتے ہیں، انھیں سب سے پہلے خود ان کا پابند ہونا چاہیے۔

تعلیم، غذا، عدم تشدد اور صنعت کاری وغیرہ وغیرہ ان موضوعات پر گاندھی جی اور ٹالسٹائے کے خیالات میں غیر معمولی یکسانیت تھی۔ ان دونوں میں خط و کتابت بھی ہوئی۔

اپنے ان تین مرشدوں کے اثر اور خود اپنے تجربوں سے گاندھی جی نے دو ہتھیار حاصل کیے تھے۔ اہنسا اور سول نافرمانی! یہ وہ ہتھیار تھے جن سے وہ دنیا کے سب سے زیادہ طاقت ور سامراج کو جھکا سکے۔

۹ر جنوری ۱۹۱۵ء کو جب وہ بمبئی کے گیٹ وے آف انڈیا سے گزرے تو ایک بہت بڑا مجمع ان کا خیر مقدم کرنے کے لیے بیتاب تھا۔

وہ اپنا ایک مسودہ ساتھ لائے تھے جس کا عنوان تھا ''ہند سوراج'' عنوان سے ہی یہ ظاہر تھا کہ افریقہ میں انھوں نے عدم تشدد کی بنیاد پر تحریک چلانے کی صرف تربیت حاصل کی تھی۔ ان اصولوں کی طاقت کا جہاں واقعی استعمال ہونا تھا وہ سرزمین ہندوستان کی ہی ہوسکتی تھی۔

احمد آباد کے صنعتی شہر کے قریب سابرمتی ندی کے کنارے انھوں نے ایک آشرم بنایا۔ جیسا انھوں نے جنوبی افریقہ میں بنایا تھا۔ ہمیشہ کی طرح سب سے پہلے۔

۱۲ر جنوری ۱۹۱۵ء: ۱۲ر جنوری ۱۹۱۵ء کو لارڈ ہارڈنگ وائسرائے ہند نے لیجسلیٹون کونسل میں اقرار فرمایا۔ ''اتحادیوں نے جزیرۃ العرب اور عراق کی اماکن مقدسہ کو حملہ سے محفوظ رکھنے کے متعلق اعلان کیا ہے اور برٹش گورنمنٹ نے یہ بھی اعلان کیا ہے کہ اگر کوئی ضرورت، ہو تو بیرونی حملہ آوروں کے خلاف ان کی حفاظت کرنے کے لیے تیار ہیں اور ان کو کسی قسم کا نقصان نہ پہنچنے دیں گے۔ گو واقعات کا رخ کتنا ہی بدلے، مگر اس میں شک نہ ہوگا کہ مقامات مقدسہ کے معاملات میں کسی قسم کی دست اندازی نہیں کی جائے گی اور اسلام دنیا کی بڑی طاقتوں میں شمار ہوگا۔'' (تحریک خلافت از قاضی محمد عدیل عباسی، ص ۶۸)

یکم مارچ ۱۹۱۵ء: آج دارالعلوم دیوبند میں اس کے ارباب اہتمام کی خواہش پر گورنر یوپی سر جیمس مسٹن نے قدم رنجہ فرمایا۔ ارباب اہتمام نے حضور گورنر کی خدمت میں نہایت عاجزانہ وعقیدت کیشانہ سپاس نامہ پیش کیا اور حضور گورنر بہادر نے نہایت مشفقانہ انداز میں جواب سپاس نامہ میں اپنے جذبات خسروانہ کا اظہار فرمایا۔ گورنر نے اپنی تقریر میں فرمایا کہ اس مدرسے کی اور آپ حضرات کی دل سے قدر کرتا ہوں۔ اس کی ایک بڑی وجہ یہ بھی ہے کہ ''آپ نہایت ثابت قدمی سے محض مذہبی درس وتدریس میں مشغول رہتے ہیں اور ایسے پولیٹکل یعنی انتظام ملک کے متعلقہ مباحثات یا اور امور سے بالکل احتراز کرتے ہیں، جن سے اس ملک کے حکام کو دشواریاں واقع ہونے کا احتمال ہو۔''

گورنر نے اپنی تقریر میں ارباب اہتمام کو "اے میرے دوستو!" کہہ کر مخاطب کیا اور پھر اس تخاطب کی وجہ بھی اس طرح بیان فرمائی:

"میں آپ کی نسبت لفظ دوست محض اخلاقی طور پر نہیں کہتا بلکہ میں فی الحقیقت مسلمانان ہند کا دوست صادق اور بہی خواہ ہوں۔ یہ امر میری نہایت مسرت کا باعث ہوا کہ آج میں یہاں آپ سب سے ملا اور مجھے آپ کو یہ یقین دلانے کا موقع حاصل ہوا کہ گورنمنٹ آپ کی اور آپ کے مدرسے کی نہایت عزت ووقعت کرتی ہے۔"

گورنر نے اس امر پر بھی اپنی دلی مسرت کا اظہار فرمایا کہ آپ حضرات لوگوں کو مذہبی تعلیم دیتے ہیں اور ہمیشہ عاقلانہ وعظ کی روشنی دکھاتے ہیں اور پولیٹکل معاملات سے الگ رہنے کی تلقین کرتے ہیں۔ گورنر فرماتے ہیں:

"اس طرح ان کی تکلیفیں جاتی رہیں گی اور آپ کی قوم اور گورنمنٹ جو دل سے ان کی بہبودی کی خواستگار ہے ہمیشہ آپ کی احسان مند رہے گی۔"

اس کے بعد گورنر کے یہ جملے کیسے پر معنی ان کی زبان سے نکلتے ہیں:

"اپنی قوم کی مدد کرنے سے آپ بعینہ ہم کو مدد دیتے ہیں اور ہمارا ساتھ دینے سے آپ ہمارے دل میں اپنی قوم کا اعتماد و اعتبار قائم کرتے ہیں۔"

(ماہنامہ القاسم، دیوبند۔ جمادی الثانی ۱۳۳۳ھ)

تاریخ نے اپنے صفحات میں اس واقعے کو بھی محفوظ کر لیا ہے کہ عقیدت و نیاز کے اس جلسے میں وقت کے عظیم انقلابی اور استعمار دشمن شیخ الہند مولانا محمود حسن دیوبندی جو اسی دار العلوم میں صدر مدرس اور شیخ الحدیث کے منصب پر فائز تھے، شریک نہیں ہوئے۔

یکم مارچ ۱۹۱۵ء: صوبہ متحدہ آگرہ اور اس کے گورنر سر جیمس مسٹن آج دار العلوم دیوبند میں آئے۔ ان کی خدمت میں سپاس نامہ پیش کیا گیا۔ گورنر نے میں جبی تقریر کی اور مہتمم دار العلوم حافظ محمد احمد کی اس پالیسی کو سراہا جو انھوں نے مدرسے کو سیاست سے الگ تھلگ رکھنے کے لیے اختیار فرما رکھی تھی۔

اس ہنگامہ شکریہ و سپاس میں حضرت صدر المدرسین، شیخ الحدیث مولانا محمود حسن شریک نہیں ہوئے۔ وہ اپنے گھر پر مقیم رہے اور مولانا ابوالکلام آزاد سے مصروف کلام رہے جو اس روز دیوبند

آئے ہوئے تھے اور حضرت شیخ الحدیث کے مہمان تھے۔

حوالہ جات:

۱۔شکریہ وسپاس کے الفاظ ومطالب کے لیے دیکھیے: مولانا شبیر احمد عثمانی کا مضمون ''عطاے اعزاز کی حقیقت'' القاسم دیو بند، بابت ماہ رمضان المبارک ۱۳۳۳ھ

۲۔لفٹننٹ گورنر سر جیمس مسٹن کی تقریر کے لیے دیکھیے: ''اسپیچ'' مطبوعہ القاسم، دیو بند، بابت ماہ جمادی الاولیٰ ۱۳۳۳ھ

۳۔لفٹننٹ گورنر موصوف کے دارالعلوم میں ورود کی تفصیل کے لیے مولانا حبیب الرحمٰن عثمانی، نائب مہتمم دارالعلوم کے قلم سے مقالۂ افتتاحیہ بہ عنوان ''ہز آنر نواب لفٹننٹ گورنر بہادر صوبۂ متحدہ آگرہ واودھ کا ورود دارالعلوم، دیو بند میں۔'' القاسم، دیو بند، بابت ماہ جمادی الاولیٰ ۱۳۳۳ھ۔

۴۔لفٹننٹ گورنر کی دارالعلوم میں آمد دوستانہ ملاقات، آیندہ توقعات وغیرہ پر مبنی انتظامیہ اور انٹیلی جنس کی رپورٹوں وغیرہ کے تفصیلی مطالعے کے لیے دیکھیے'' مولانا عبیداللہ سندھی اور ان کے چند معاصر۔'' از ڈاکٹر ابوسلمان شاہ جہان پوری، مولانا عبیداللہ سندھی اکادمی پاکستان کراچی ۲۰۰۰ء)

۲۰/اپریل ۱۹۱۵ء: لارڈ کرومر نے دارالامراء (ہاؤس آف لارڈس) میں ۲۰/اپریل ۱۹۱۵ء کو اپنی تقریر میں کہا:

> ''مجھ کو یہ کہنے کی کوئی ضرورت نہیں ہے کہ میں مارکوئس آف کربو کی اس رائے سے متفق ہوں کہ خلافت کا مسئلہ مسلمانوں کو خود ہی طے کرنا چاہیے لیکن ہم اتنا کہے بغیر نہیں رہ سکتے کہ خلیفہ کے لیے یہی ضروری نہیں ہے کہ وہ صرف مسلمان ہو بلکہ یہ بھی ضروری ہے کہ ایسا مسلمان ہو جو کسی یورپین طاقت کے زیر اثر نہ ہو۔''

وزیر اعظم برطانیہ مسٹر لائڈ جارج نے ۵/جنوری ۱۹۱۶ء کو ایک تقریر میں فرمایا:

> ''ہم اس غرض سے نہیں لڑ رہے ہیں کہ ترکی کو اس کے دارالسلطنت یا ایشیاے کوچک کے زرخیز ممالک سے جہاں ترکی النسل لوگ آباد ہیں محروم کر دیں۔'' (تحریک خلافت: قاضی محمد عدیل عباسی، ص ۶۸)

۲۷/ستمبر ۱۹۱۵ء: مولانا حافظ محمد احمد صاحب مہتمم دارالعلوم دیو بند کو شمس العلماء کے خطاب اور خصوصی سند ملنے کا شکریہ ادا کرنے کے لیے حضرت مہتمم صاحب دیو بند کے پانچ علماء کو اپنے

ساتھ لے گئے اور ہز آنر لیفٹننٹ گورنر صوبہ یوپی سرجیمس مسٹن کی خدمت میں ''یہ سپاس نامہ'' پیش کیا:

ہم (جنھیں بلا مبالغہ تمام باثر، ریا سے پاک اور بے غرضانہ رواداری رکھنے والوں کا ترجمان کہا جا سکتا ہے۔) نمایندے ہیں، ہندوستان میں قائم واحد اسلامی مرکز (دارالعلوم دیوبند) کے، جس کا کوئی ثانی نہیں اور ہم باوجود ہر قسم کی تخریبی کوششوں اور بدبختانہ کارروائیوں (۱) کے نہایت ثابت قدمی اور استقلال سے اس کی قدیم پالیسی چلا رہے ہیں۔ یور آنر کی خدمت میں اور ان کے توسط سے ہندوستان کے حکمران ہز ایکسیلینسی وائسرائے کی خدمت میں مولانا محمد احمد صاحب مہتمم دارالعلوم (دیوبند) کو شمس العلماء کا خطاب اور خصوصی سند مرحمت فرمانے پر جو کہ علماء کی عزت افزائی اور شاہی عطایہ کی روایات کا نمونہ ہے۔ اپنے پر خلوص قلبی جذبات تشکر کا اظہار کرتے ہیں۔ حکومت کے عمل سے یہی ثابت نہیں ہوتا کہ وہ انھیں مسلمان لیڈروں اور رہنماؤں کی عزت کرتی ہے جو اس کے اہل ہیں، بلکہ آزادی کے دعویداروں کے اس سوال کا جواب بھی فراہم ہو جاتا ہے کہ کیا اعزازات واقعی اہل لوگوں کو دیے جاتے ہیں؟

یہ درست ہے اور اس حقیقت کو ہم تسلیم کرتے ہیں کہ مادی اور دنیاوی مفادات حاصل کرنے کے لیے کوشاں رہنا، نہ تو ہمارا فطری رجحان ہے اور نہ ہمارے دینی فرائض کا حصہ ہے، لیکن خدا کی مرضی کے مطابق ہمارے موجودہ حکمراں اگر ہمیں کوئی اعزاز دیں تو ہم اسے کیوں نہ قبول کریں اور شایان شان طور پر ان کی ستائش کیوں نہ کریں (۲)۔ اگر ہم ایسا کریں (یعنی اعزاز کی قدر اور اس پر شکر گزاری کا اظہار نہ کریں) تو خدا معاف کرے، گویا ہم ممنونیت اور شکر گزاری کے اس فرض سے روگردانی کریں گے، جس کی ہمارے پاک مذہب نے ہمیں تعلیم دی ہے۔ اس سے غفلت برت کر ہم حکومت کی نظر میں اور خدا اور رسول کے آگے (۳) اور تمام اخلاقی اصولوں کے آگے ذلیل وخوار ہوں گے۔ ہم ایسے عمل کو سخت اخلاقی کمزوری بلکہ ایک نقطۂ نظر سے گناہ سمجھتے ہیں (۴)۔ ان مسلمانوں کے لیے جو ان آیات پر پختہ ایمان رکھتے ہیں:

(۱) اے پیغمبر! کہہ دو کہ ہر بات خدا کی طرف سے ہے (۵) اور

(۲) اس کے حکم کے بغیر ایک پتہ بھی حرکت نہیں کر سکتا (۶) اور

(۳) جنھوں نے اللہ کے آگے جھک جانے کا شعار اپنایا ہے (۷) اور پر خلوص طریقے سے اس پرانی کہاوت کو سچ مانتے ہیں کہ جو کچھ دوست کی طرف سے آئے خوب ہے (۸)۔ کسی شاہی

عطیے اور کسی بلند مرتبت اعزاز کو لینے سے انکار کرنا یا اسے شایانِ شان طور پر قبول نہ کرنا ناشکر گزاری ہے۔

یہی وجوہ تھے کہ ہم دارالعلوم کے چند بہی خواہ آج یور آنر کے حضور میں حاضر ہیں۔ ہماری حیثیت محض چند افراد کی نہیں ہے، بلکہ ہم قابل تعظیم گروہ کے نمائندہ و ترجمان ہیں، جو ایک ''حقیقی فرض'' ادا کرنے کے لیے آئے ہیں (۹)۔ ہمیں توقع ہے کہ یور آنر بھی ''ہمارے لافانی تشکر'' کا احساس رکھتے ہیں کہ ہمیں باریابی کا شرف عطا فرمایا (۱۰)۔ یور آنر! ہمارا طبقہ (جو دنیاوی لحاظ سے معمولی اور بے مایہ ہے) اس بات سے پوری طرح آگاہ نہیں کہ کون سا طریقہ اظہارِ تشکر و ممنونیت کے لیے مناسب ہو سکتا ہے۔ ہم اس طریقۂ کار کو اچھا نہیں سمجھتے کہ ہر ڈسٹرکٹ کے مسلمانوں کی طرف سے خطوط، ٹیلی گرامز، اور قرار دادیں روانہ کروا کے سارے ہندوستان میں دھوم مچا دیں۔ اس لیے ہم توقع کرتے ہیں کہ یور آنر دارالعلوم کے ہم چند خدمت گزاروں کی نحیف اور کمزور آواز کو (جو اتحاد کے مضبوط رشتوں میں بندھے ہوئے ہونے کی وجہ سے پورے فرقے اور درحقیقت تمام اعتدال پسندوں کی آواز ہے) ظاہری طمطراق اور شور شرابے کے ساتھ شکریہ ادا کرنے کے عمل کی بہ نسبت زیادہ باوقعت اور موثر گردانیں گے۔

یور آنر! ہمارے اس چھوٹے سے وفد میں نہ تو کوئی جاگیردار ہے اور نہ کوئی رئیس! یہ وفد ظاہری رکھ رکھاؤ اور شان و شوکت سے عاری ہے۔ پھر بھی یہ کہنا بیجا نہ ہوگا کہ یہ یور آنر کے دور حکومت کا فیضان ہے اور شمس العلماء مولانا محمد احمد کی مینیجر شپ (حسن انتظام و اہتمام) کا طفیل ہے کہ ہم جیسے بوریہ نشینوں کو یہ دن دیکھنا نصیب ہوا کہ ''گم نامی اور تاریکی کے قعرِ مذلت'' سے نکل کر شاہوں کے حضور میں جذبات تشکر و ممنونیت پیش کرنے کی ''سعادت'' حاصل ہوئی (۱۱)۔ یہ دراصل نتیجہ ہے دارالعلوم کی بڑھتی ہوئی افادیت اور اس کے پھیلتے ہوئے اثر و رسوخ کا۔

یور آنر! اگرچہ آج ہم ایک خاص ''احسان اور عنایت'' کا شکریہ ادا کرنے کے لیے حاضر ہوئے ہیں، جو صرف مہتمم صاحب ہی پر نہیں بلکہ ہمارے پورے طبقے پر کیا گیا ہے۔ ساتھ ہی ہمارے پیش نظر دارالعلوم کے لیے آپ کی نوازشیں بھی ہیں، جن کا حال مہتمم صاحب وقتاً فوقتاً بتلاتے رہتے ہیں۔ اس نظر کرم کی وجہ سے مسلم پبلک کا دارالعلوم پر اعتماد بحال ہوگا اور اس سے ہماری اس پالیسی کو تقویت ملے گی، جس کی تعریف یورپ کے بڑے بڑے آفیسر کرتے رہے ہیں۔

یور آنر! ہم خدا کے حضور سجدۂ شکر بجالاتے ہیں کہ مجموعی طور پر ہمارے اور ہمارے فرقے کے درمیان باہم زبردست اعتماد موجود ہے۔ اس کا ثبوت دارالعلوم کے بڑھتے ہوئے ذرائع آمدنی دے سکتے ہیں یا دارالعلوم میں دی جانے والی تعلیم کے اثرات!

جہاں تک ہمارے بس میں ہے، ہم اپنے طبقے کی مذہبی و روحانی ترقی اور بہبودی کے لیے اپنی ذمہ داریوں سے روگردانی نہیں کرتے۔ البتہ ممکن ہے بعض ناواقف حال افراد دارالعلوم کے تقدس اور مرتبے کو دیکھتے ہوئے، ہمارے بعض اعمال سے کبھی کبھار شک وشبہ کا شکار ہو جاتے ہوں۔ لیکن جیسے ہی گفتگو کے ذریعے یا باہم خط وکتابت کے ذریعے انھیں حقائق سے آگاہ کر دیا جاتا ہے تو وہ بھی پوری طرح مطمئن ہو جاتے ہیں۔

ہمارا ایک اور صرف ایک مقصد ہے ''مذہبی آزادی کا تحفظ اور صرف مذہبی آزادی کا تحفظ!'' اس سے ہٹ کر کسی سیاسی تحریک کو مسترد کرنا یا قبول کرنا ہمارے قائم اور نا قابل تبدیل نظریے کے باہر ہے (۱۲)۔ اگر حکومت اسلام اور اس کے عقائد و رسوم کو اور ہمارے ''حقیقی لیڈر'' (۱۳) کو واقعی عزت دیتی ہے، تو دل اور زبان سے اس کا شکریہ ادا نہ کرنا یا اپنے کسی عمل سے اس کے لیے مشکلات پیدا کرنا ''انتہائی ناشکری'' اور ''معصیت'' ہے (۱۴)۔

یور آنر! ہم نے اپنی واحد اور واضح پالیسی بتلا دی ہے۔ فی الوقت شمس العلماء مولانا محمد احمد اس پالیسی کو چلا رہے ہیں۔ ہمیں یقین ہے کہ ان کے خاندان کے بلند مرتبے اور ان کے شخصی اثرات کی وجہ سے ان کے شاگرد اسی پالیسی پر مستقل مزاجی سے قائم رہیں گے۔

ہم اختتام پر یور آنر کے وقت اور توجہ کے زیاں پر معذرت خواہ ہیں اور ایک بار پھر گرم جوشی کے ساتھ یور آنر کا شکریہ ادا کرتے ہیں، جو صوبے کے اولوالعزم حکمران اور دارالعلوم کے ہمدرد و بہی خواہ ہیں (۱۵)۔ ہم یہ یقین کر لینے میں حق بجانب ہیں کہ یور آنر زحمت فرما کر ہمارے عاجلانہ لیکن پرخلوص جذبات تشکر اور ممنونیت کو حضور ہزایکسیلینسی وائسرائے بہادر تک پہنچا دیں گے۔ ہم یور آنر کی ترقی اور خوش حالی کے لیے دعا گو ہیں۔''

حوالہ: ''انڈین مسلم......اے ڈاکومنٹری ریکارڈ'' جلد ۵، مرتبہ شان محمد، ۱۹۸۲ء، دہلی۔

حواشی:

(۱) تخریبی کوششوں اور بدبختانہ کارروائیوں سے اشارہ حضرت شیخ الہند مولانا محمود حسن اور مولانا عبیداللہ سندھی کی انگریز دشمن اور ملک کی آزادی کے لیے کوششوں کی طرف ہے۔ جس کا پہلا مرکز دارالعلوم دیوبند تھا پھر اس مرکز کو دہلی منتقل کر دیا گیا تھا۔ اگر چہ حضرت شیخ الہند کے وجود گرامی کی بدولت دارالعلوم میں حریت پسندانہ اثرات اور انگریز دشمن خیالات پھر بھی موجود تھے۔ (بقیہ اگلے صفحے پر)

حکومت یو پی نے اس ''سپاس نامہ'' کے ساتھ ۲۷ر ستمبر کو ایک نوٹ بھی بھیجا تھا۔ جس کا ذکر ۲۸ر اکتوبر ۱۹۱۵ء کے مراسلہ میں آیا ہے۔ ۲۷ر ستمبر کا حکومت یو پی کا وہ نوٹ تو دستیاب نہیں البتہ سپاس نامہ اور حکومت یو پی کے نوٹ پر کرمنل انٹیلی جنس نے جو تبصرہ کیا تھا، اس کا حوالہ آگے آرہا ہے۔

ستمبر ۱۹۱۵ء: مولانا (شیخ الہند) نے ماہ شوال ۱۳۳۳ھ میں سفر حجاز کا قصد فرمایا۔ مولوی عزیز گل صاحب خادم خاص کو اپنے وطن کی طرف جانا اور اپنے اکابر سے ملنا اور اجازت چاہنا ضروری تھا اس لیے ان کی واپسی کا انتظار فرمایا اس مدت میں سامان سفر قدرے مہیا ہوگیا۔ عالی جناب حکیم عبدالرزاق صاحب غازی پوری برادر بزرگ جناب ڈاکٹر انصاری نے اس سفر میں

(گذشتہ صفحے کا بقیہ)

(۲) برٹش حکومت کے کسی اعزاز کو اسلامی حکومت یا خلافت کے اعزاز کے مماثل قرار دینا بڑی زیادتی ہے۔ پھر یہ کہ مولانا محمد احمد کی کیا اہلیت اور خدمت تھی، جس کے اعتراف میں یہ خطاب اور خصوصی سند دی گئی تھی؟ تصنیف و تالیف اور درس و تدریس میں ان کا کوئی نمایاں مقام نہ تھا۔ اگر دارالعلوم کا عہدۂ اہتمام اس کی بنیاد تھی تو دیکھنا چاہیے کہ ملک کے اور کتنے دارالعلوموں، کالجوں اور یونیورسٹیوں کے شیوخ، پرنسپلوں اور مہتمموں کو اس وقت تک یا اس کے بعد شمس العلماء کے خطابات سے سرفراز کیا گیا تھا؟ واقعہ یہ ہے کہ مولانا محمد احمد کو دارالعلوم اور اس کے حلقہ اثر میں برٹش مفادات کے تحفظ کے لیے خدمات کے اعتراف میں اس خطاب اور سند سے نوازا گیا تھا۔ انھوں نے ایک نازک وقت اور عہد انقلاب میں اپنے تئیں برٹش حکومت کے سیاسی و استعماری مقاصد میں تعاون کے لیے پیش کیا تھا۔ اس لیے دارالعلوم دیو بند اور اس کے حلقہ اثر میں اس خطاب کے سب سے زیادہ اہل وہی تھے۔

(۳) معلوم نہیں یہ کیسے دریافت کرلیا گیا کہ انگریز حکومت کا مولانا محمد احمد کو شمس العلماء کا خطاب دینا اللہ کی مرضی کے مطابق اور اس کی خوشنودی کا موجب تھا کہ اس کا قبول کرنا، انگریزوں کے اس عمل کی شایان شان طور پر ستائش کرنا اور اس کا شکریہ ادا کرنا لازم ٹھہرا؟

ان حضرات کے نزدیک چوں کہ بحکم ''اطیعوا اللہ واطیعوا الرسول واولوالامر منکم'' برٹش استعمار اور اس کے حکام کی اطاعت خدا اور اس کے رسول کی اطاعت کے ساتھ ملزوم تھی، اس لئے حکومت سے جذبات تشکر کا اظہار بھی خدا اور رسول کے شکریے کے ساتھ ملزوم کردیا۔ ان کے نزدیک خدا، رسول، برٹش حکومت (اولوالامر منکم) اور تمام اخلاقی اصول مرادفات ہیں، جنہیں ایک ہی سلسلہ بیان میں پرو دیا گیا ہے اور اس کا خلاف ''سخت اخلاقی کمزوری اور گناہ'' تھا جس پر ان کا ''پختہ ایمان'' تھا۔

(۴) انگریزی حکام چوں کہ ان کی نزدیک ''اولوالامر منکم'' میں سے تھے۔ اس لیے ان کے خلاف عمل ذلت و خواری کا موجب بھی تھا۔ اخلاقی کمزوری بھی اور گناہ بھی۔

(۵) غالباً ان آیات کی طرف اشارہ ہے (۱) اے پیغمبر! ان لوگوں سے کہہ دو، ساری باتیں اللہ ہی کے اختیار میں ہیں، (۳: ۱۵۴) یا ''اے پیغمبر کہہ دو، جو کچھ ہوتا ہے اللہ ہی کی طرف سے ہوتا ہے۔'' (۴: ۷۸)

(۶) شاید اس آیت کا حوالہ دیا گیا ہو ''جو کچھ خشکی میں ہے اور جو سمندر میں ہے، سب کا وہ علم رکھتا ہے۔ درختوں سے کوئی پتہ نہیں گرتا اور زمین کے اندر کی اندھیریوں میں کوئی دانہ نہیں پھوٹتا۔ مگر یہ کہ وہ اسے جانتا ہے، کوئی خشک اور تر پھل نہیں گرتا، مگر یہ کہ (علم الٰہی کے) واضح نوشتے میں مندرج ہے (۶: ۵۹) (بقیہ اگلے صفحے پر)

نہایت زیادہ مدد دی جس کے حضرت مولانا مرحوم ہمیشہ ممنون منت رہا کیے، حکیم صاحب موصوف مولانا سے پہلے بمبئی پہنچ گئے اور ہر قسم کا ضروری سامان سفر نہایت فراخ دلی کے ساتھ مہیا کر دیا بلکہ

(گذشتہ صفحے کا بقیہ)

(۷) شاید ان آیات کا حولہ دیا ہو: ہاں! جس کسی نے بھی اللہ کے آگے سر جھکا دیا اور وہ نیک عمل بھی ہوا تو وہ اپنے پروردگار سے اپنا اجر ضرور پائے گا۔ نہ تو اس کے لیے کسی طرح کا کھٹکا ہے، نہ کسی طرح کی غم گینی (۲:۱۱۱) یا، اور پھر بتلاؤ! اس آدمی سے بہترین دین رکھنے والا کون ہو سکتا ہے جس نے اللہ کے آگے سر اطاعت جھکا دیا اور وہ نیک عمل' کی ہے اور اس نے ابراہیم کے طریقے کی پیروی کی جو صرف خدا ہی کے لیے ہو رہا تھا اور اللہ نے ابراہیم کو اپنا دوست مخلص بنالیا تھا، (۴:۱۲۵)

(۸) اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ یہ حضرات انگریزوں کو ملک پر ناجائز قابض اور ملک وقوم کا دشمن نہیں ''دوست'' سمجھتے تھے!

(۹) یہ وہ حضرات ہیں جن کے بزرگوں نے ہندوستان کو دارالحرب اور انگریز کو ملک اور قوم کا دشمن قرار دیا تھا۔ زمانے کی کیسی ستم ظریفی ہے کہ ان بزرگوں کی اولاد انگریزوں کے بخشے ہوئے خطاب پر فخر کر رہی ہے اور اس پر شکر ادا کرنے کو ''حقیقی فرض'' (مثل نماز، روزہ اور واجبات اسلامیہ وشرعیہ کے قرار دے رہی ہے۔

(۱۰) شاید مقصد یہ ہے کہ یہ جذباتِ تشکر وقتی اور کسی فوری مصلحت کے تحت نہیں بلکہ دائمی اور ابدی ہیں۔

(۱۱) غور فرمائیے! یہ حضرات نصیب کی یاوری پر فخر کر رہے ہیں اور کس زندگی کو ''گم نامی اور تاریکی کا تعر مذلت' قرار دیتے ہیں؟ علوم فنون اسلامی کی تعلیم وتدریس واشاعت کو؟ صبح وشام قال اللہ وقال الرسول کے ورد اور اعمال اسلامی کو؟ اور کس چیز کو ''باعث ممنونیت وسعادت'' قرار دے رہے ہیں؟ مزید حیرت اس بات پر ہے کہ ان کے اخلاف کا دعوا ہے کہ ملک کے لیے آزادی کی جنگ میں ان کا حصہ ہے اور پاکستان کا قیام ان کی کوششوں کا رہین منت ہے۔ فیا للعجب۔

(۱۲) اگر ان حضرات کے نزدیک دارالعلوم کا مقصد قیام اور خود ان کا مقصد حیات ''صرف مذہبی آزادی کا تحفظ'' تھا اور انگریزی حکومت کے دور میں وہ انھیں حاصل تھی تو ملک کی مکمل آزادی کی تحریک، ملک سے انگریزوں کے کلی انخلا کی سعی اور قیام پاکستان کی جدوجہد میں ان کے حصے کا کیا سوال؟ انھیں تو خود اعتراف ہے کہ مذہبی آزادی کے تحفظ کے نظریے سے ہٹ کر کسی سیاسی تحریک کا استرداد یا قبول ان کے ''قائم اور ناقابل تبدیلی نظریے کے باہر ہے۔''

(۱۳) ''حقیقی لیڈر'' سے مراد شمس العلماء مولانا محمد احمد ہیں۔ جو انگریزوں کے دشمن نہیں، دوست تھے۔ ریشمی رومال سازش کیس کی ڈائریکٹری میں انھیں نٹیلی جنس نے ''حکومت کا وفادار'' اور ''شریف آدمی'' لکھا ہے۔ ان کی وفاداری کا اس سے بڑا ثبوت کیا ہوگا کہ مولانا عبید اللہ سندھی کے خلاف لوگوں کو بھڑکایا، ان پر کفر کا فتویٰ لگوایا، انھیں دیوبند سے نکلوایا، جمعیت الانصار کے سارے سیاسی کام کو ملیامیٹ کر دیا اور حضرت شیخ الہند کی جاسوسی کرتے رہے، سہارن پور کے کلکٹر کے ذریعے گورنمنٹ کو اطلاعات فراہم کرتے رہے۔ ان کی شرافت کا بھی اس سے بڑھ کر اور کیا ثبوت ہوگا۔

(۱۴) گورنر یوپی سر جیمس مسٹن کے ملک وقوم پر احسانات ان حضرات کے عقیدے میں بے شمار ہوں گے۔ ملک وملت اور مسلمانوں کے ایسے محسن کا شکریہ ادا نہ کرنا یقیناً ''معصیت'' ہی تو تھا۔

(۱۵) مسٹن دارالعلوم کا ہمدرد اور بہی خواہ ہو یا نہ ہو، شمس العلماء مولانا محمد احمد کا ہمدرد اور بہی خواہ ضرور تھا۔ خطاب، خصوصی سند، زمین، وظیفہ، حیدر آباد دکن کی عالی شان ملازمت، کیا کچھ مسٹن نے ان پر نہیں کیا۔ لیکن بحکم ھل جزاء الاحسان الا الاحسان، شمس العلماء نے بھی ان کے احسان کا بدلہ مولانا عبید اللہ سندھی کو دیوبند سے نکلوا کر اور حضرت شیخ الہند مولانا محمود حسن کو گرفتار کروا کر ادا کر دیا۔

جائے قیام اور ٹکٹ وغیرہ کا بھی انتظام کافی طور پر کر دیا۔

مولانا کی روانگی ایک معمولی شخص کی روانگی نہ تھی، بہت سے ارباب عقیدت استفاضہ یا خدمت کے لیے ساتھ ہو لیے جن میں سے خاص خاص حضرات حسب ذیل ہیں۔ مولانا مرتضیٰ حسن چاند پوری، مولانا محمد سہول بھاگل پوری، مولوی محمد میاں انبیٹھوی، مولوی عزیرگل ساکن زیارت کا کا صاحب، حاجی خان محمد مرحوم، مولوی مطلوب الرحمان دیو بندی، حاجی محبوب خان سہارن پوری، حاجی عبدالکریم سرونجی، وحید احمد وغیرہ۔ عام لوگوں میں مشہور ہوگیا کہ مولانا دیو بند سے ہجرت کر کے جارہے ہیں اور اب ہمیشہ حرمین شریفین میں عمر بسر فرمائیں گے اور چوں کہ مولانا مرحوم نے بخوف وفات اپنی جائیداد شرعی طریقے پر ورثے میں تقسیم کردی تھی اس لیے اور بھی لوگوں کو اس خیال میں تقویت ہوئی۔ مولانا نے ایک عرصے تک کے لیے اپنے گھر کے مصارف کا بھی انتظام کردیا تھا۔ اس خاص افواہ کی وجہ سے ہر اسٹیشن پر لوگوں کا بہت بڑا مجمع زیارت کے لیے موجود رہتا تھا۔ طلبائے مدرسہ نے اپنے اپنے اعزہ کو تاریخ روانگی سے تار کے ذریعے سے مطلع کر دیا تھا، غرض کہ ہر اسٹیشن پر ہزاروں کا مجمع ہوتا تھا جس کی وجہ سے مصافحہ کرنا بھی سخت دشوار تھا، تشییع کرنے والے بھی بہت سے ساتھ ہوگئے تھے۔ دہلی میں مولانا مرحوم نے گاڑی میں قدرے تاخیر ہونے کی وجہ سے ڈاکٹر صاحب انصاری کی کوٹھی پر جاکر چائے نوش فرمائی اور بہت تھوڑی دیر قیام فرما کر گاڑی کے وقت اسٹیشن پر آگئے۔ ناگدہ ریلوے سے روانہ ہوئے۔ راستے میں رتلام، راندیر میں بھی قدرے قیام فرمایا کیوں کہ ان مقامات پر حضرت رحمۃ اللہ علیہ کے خاص خاص لوگ تھے جنھوں نے سخت اصرار فرمایا تھا۔ راندیر سے روانہ ہوکر بمبئی پہنچے اور انجمن محافظ حجاج کے آفس میں جس کو حکیم عبدالرزاق صاحب نے پہلے سے آراستہ کر رکھا تھا قیام فرمایا۔ وہاں پر بھی مولانا کے زائرین کا ایک بڑا مجمع رہتا تھا اگر انجمن کے کارکن انتظام کافی نہ کرتے تو غالباً مولانا کو آرام کی صورت ممکن ہی نہ ہوتی۔

۱۷/ستمبر ۱۹۱۵ء: بروز شنبہ ۷/ذی قعدہ ۱۳۳۳ھ کو بمبئی سے اکبر نامی جہاز پر سوار ہوکر جدہ روانہ ہوگئے۔ حضرت مولانا اور ان کے بعض خاص خدام کے ٹکٹ سکنڈ کلاس کے اور باقی ماندہ حضرات کے چھتری یا تتق کے تھے۔ چوں کہ اکثر ہمراہیوں کی طبیعت دریائی سفر سے مانوس نہ تھی اس لیے عموماً ان کو بدمزگی اور چکر وغیرہ کی شکایت پیش آئی جس کی وجہ سے میوہ جات اور عمدہ غذائیں اپنے موقع پر صرف نہ ہوئیں جن کی بڑی مقدار حکیم صاحب نے مولانا اور ان کے رفقا

کے لیے مہیا کی تھی، بلکہ بہت سی چیزیں ضائع ہوئیں بوجہ ظہور جنگ ان دنوں قرنطینہ جزیرۂ کامران سے اٹھالیا گیا تھا اور قریب جدہ کے مقام سعد میں ہوتا تھا۔ چناں چہ جہاز نے وہاں لنگر ڈالا اور بخیر وخوبی مولانا مع رفقا کے اترے اور ایام قرنطینہ نہایت عافیت سے انجام دے کر جدہ پہنچے۔

بمبئی میں سوار ہوتے وقت بعض لوگوں نے مولانا کے رفقاء سے یہ کہا کہ تقریباً آٹھ دس آدمی تمھارے ساتھ خفیہ پولیس کے ہیں، ان سے احتیاط رکھنا (ہم نہیں کہہ سکتے کہ یہ بیان صحیح تھا یا غلط) چوں کہ یہ بات اہل جہاز کو معلوم ہو چکی تھی کسی شخص نے جو کہ غالباً جدہ یا مکۂ معظمہ کا رہنے والا تھا اس کو ٹرکی پولیس تک پہنچا دیا اور جو لوگ مشتبہ تھے ان کے نام ونشان بتا دیے اور کہہ دیا کہ یہ لوگ مولانا پر مسلط ہو کر آئے ہیں۔ حال آں کہ اس قسم کا خیال نہ مولانا کو تھا اور نہ ان کے رفقا کو۔ ٹرکی پولیس نے فوراً ان لوگوں کو گرفتار کر لیا اور مولانا مرحوم کی خدمت میں پولیس کا افسر تصدیق کرانے کے لیے حاضر ہوا مولانا خود تو آفس میں نہ گئے، مگر مولانا مرتضیٰ حسن صاحب وغیرہ کو بھیج دیا، چوں کہ واقعی طور پر کوئی یقینی بات تھی ہی نہیں، اس لیے مولوی صاحب موصوف نے یہی بیان دیا کہ ہم کو کوئی یقین ان لوگوں کے سی آئی ڈی ہونے یا مولانا پر مسلط کیے جانے کا نہیں ہے، ہم کوئی شہادت ایسی نہیں دے سکتے جس کا ہم کو علم نہیں۔ مگر پولیس ٹرکی نے اس جواب کو اس پر حمل کیا کہ چوں کہ ان لوگوں کو پھر ہندوستان جانا ہے اس لیے صریح طور پر اپنی معلومات کو ظاہر نہیں کر سکتے۔ الحاصل ٹرکی پولیس نے ان بزرگوں کو زیرِ حراست رکھا اور اسی طرح ان کو حج کرا کر یہ کہا گیا کہ اگر تم اپنے محافظ سپاہیوں کا خرچ دو تو تم کو مدینۂ منورہ کی زیارت کی اجازت مل سکتی ہے ورنہ تم کو ہندوستان واپس ہونا پڑے گا، چوں کہ ان لوگوں کے پاس اس قدر خرچ نہ تھا اس لیے وہ بمبئی واپس کر دیے گئے۔

بعض خفیہ کے افسروں کا بیان ہے کہ جب مولانا مرحوم بمبئی پہنچے تو وہاں کے افسر پولیس کے پاس تار آیا کہ مولانا کو بمبئی میں گرفتار کر لیا جائے اور آگے جانے نہ دیا جائے مگر چوں کہ مولانا کے پاس بہت بڑا مجمع رہتا تھا اس لیے بمبئی کے مقامی حکام کو بلوے کا خوف ہوا اور اس وجہ سے انھوں نے عمل درآمد سے پہلو تہی کی۔ پھر دوسرا حکم روانگی کے بعد جہاز کے کپتان کے پاس پہنچا کہ مولانا کو جدہ میں اترنے نہ دیا جائے، بلکہ جہاز ہی پر گرفتار کر لیا جائے، مگر یہ حکم اس کے پاس اس وقت پہنچا جب مولانا جزیرۂ سعد میں برائے قرنطینہ اتر چکے تھے اس لیے اس میں معذوری رہی۔ ہم نہیں کہہ سکتے کہ یہ دونوں بیان کہاں تک صحیح ہیں، مگر ہم کو معتبر ذرائع سے معلوم ہوئے۔

(اکتوبر ۱۹۱۵ء): ۲۷ ستمبر کو جو سپاس نامہ پیش کیا گیا تھا، اس میں چوں کہ بواسطہ ہز آنر لیفٹنٹ گورنر سر جیمس مسٹن ہز ایکسیلینسی وائسرائے ہند کا شکریہ ادا کیا گیا تھا۔ اس لیے یہ سپاس نامہ گورنر کے آفس کے نوٹ کے ساتھ وائسرائے ہند کو بھیج دیا گیا تھا۔ وائسرائے کی جانب سے کرمنل انٹیلی جینس آفس نے گورنر مسٹن کو یہ نوٹ تحریر کیا۔ اس میں کئی اہم باتیں آئی ہیں۔ نوٹ میں کہا گیا ہے:

۱۔ میرے خیال میں سر جیمس مسٹن ان مولویوں کو اطلاع دیں گے کہ ہز ایکسیلینسی (وائسرائے ہند) نے ان کا پیش کردہ سپاس نامہ انتہائی مسرت سے پڑھا ہے۔

۲۔ میں سپاس نامے کی اشاعت کا مشورہ دینے میں مشکل محسوس کر رہا ہوں۔ دیو بند کی یہ اسپرٹ فیصلہ کن ہے اور اس امر پر دلالت کرتی ہے کہ ہندوستان کے مسلمانوں میں یہ اسپرٹ بڑھ رہی ہے (۱)۔ لیکن مولویوں کے اس سپاس نامے کو پاپائے اعظم کے ارشادات عالیہ کا درجہ نہیں دیا جا سکتا۔ یہ دیو بند کے صرف ایک حلقے کا ترجمان ہے۔ البتہ حکومت کی یہ فطری ضرورت ہے کہ وہ اپنی شناخت اس جیسے وفادار طبقے کے ذریعے کروائے۔ لیکن بہت محتاط رویہ رکھتے ہوئے تاکہ مسلمان حکومت میں کم سے کم مداخلت کر سکیں۔ یہ یقیناً دانش مندانہ پالیسی ہوگی۔

۳۔ میرے خیال میں ہندوستان کے مسلمانوں میں حکومت کے خلاف چھپی ہوئی خطرناک لہریں کارفرما رہی ہیں اور اب بھی ہیں (۲)۔ ہماری یہ خواہش جائز ہے کہ جنگ میں ہمیں نمایاں اور یادگار کامیابی حاصل ہو۔ تاکہ جو لوگ شش و پنج کا شکار رہے ہیں کہ ہندوستان میں برطانیہ اسلام کا مقابلہ کر سکتا ہے یا نہیں؟ ان کے ذہنوں سے شکوک و شبہات دور ہو جائیں (۳)۔ جیمس مسٹن کے خط کا پیرا گراف نمبر ۶ کے بارے میں خیال ہے کہ دیو بند کے ان مولویوں کے اثر و رسوخ کا اندازہ ان کی

اس رپورٹ پر مولف نے چند حواشی تحریر کیے ہیں۔ بعض اندراجات کی وضاحت کے لیے ان پر بھی ایک نظر ڈال لینی چاہیے۔ حواشی یہ ہیں:

(۱) یعنی خوشامد اور وفاداری کی اسپرٹ جس کا تازہ اظہار مولویوں کے اس سپاس نامے میں کیا گیا ہے۔

(۲) شیخ الہند مولانا محمود حسن کی تحریک آزادی اور مولانا عبید اللہ سندھی کی ان کوششوں کی طرف اشارہ ہے۔ جن کی تلاطم خیزیوں نے دیو بند کے ان خوشامدی اور وفاداری مولویوں کے حلقے میں تہلکہ مچا دیا تھا۔

(۳) یعنی مسلمانوں کے ذہنوں پر یہ بات نقش ہو جائے کہ برٹش حکومت ہندوستان میں اسلام کے مقابلے میں ایک فیصلہ کن طاقت کی مالک ہے۔ تاکہ مسلمان انگریزوں کے خلاف کسی سازش یا بغاوت کا خیال دل میں نہ لائیں۔

حیثیت سے بڑھ کر کیا گیا ہے۔ کیوں کہ اسے مکہ کے مولویوں نے کمزور کر دیا ہے جو پان اسلام ازم کے لیے ہمدردی کے جذبات رکھتے ہیں اور مذہبی جنونی ہیں (۴)۔

۴۔ میں اس امر کو پسند کرتا ہوں کہ سپاس نامہ ضرور شائع ہو، لیکن حکومت کی طرف سے نہیں۔ سابقہ تجربے سے ظاہر ہوتا ہے کہ حکومت کی جانب سے ایسا کرنا جوش و جنوں اور تنازعے کو ہوا دینا ثابت ہوگا۔

۶/ اکتوبر ۱۹۱۵ء: ۲۷/ ذی قعدہ ۱۳۳۳ھ کو مولانا رحمۃ اللہ علیہ جدہ سے اونٹوں کی سواری پر مکہ معظمہ کو روانہ ہوئے اور اٹھائیسویں کو مکۂ معظمہ میں شب بحرہ گزار کر شام کو داخل ہوئے، وہ زمانہ طبعی طور پر حجاج کے ہجوم کا ہوتا ہے، مگر چوں کہ جنگ کی وجہ سے بہت سے ملکوں سے حجاج کی آمد و رفت بند یا کمی پر تھی اس وجہ سے حسب دستور ہجوم میں کمی ضرور تھی مگر تاہم مکۂ معظمہ کی گلیاں اور مکانات مسافرین سے لبریز تھے۔ حرم محترم میں بھی لوگوں کی کثرت تھی۔ مولانا مرحوم طواف قدوم وسعی وغیرہ ادا کرنے کے بعد احباب سے ملنے اور ادائے عبادات میں بدل و جان مشغول ہوئے۔

مولانا مرحوم نے حسب مشورہ مولانا مرتضیٰ حسن صاحب و دیگر حضرات سید امین عاصم صاحب کو مطوف بنایا تھا سید صاحب موصوف حقیقت میں ایک نہایت شریف الطبع خوش خلق آدمی ہیں ہر شخص کے ساتھ معاملہ اس کی حیثیت اور قابلیت کے مطابق کرتے ہیں، حجاج کو عموماً ان کی ذات سے راحت پہنچتی رہی اور چوں کہ خود بھی صاحب علم ہیں ادائے مناسک میں حتیٰ الوسع احکام شرعیہ کا لحاظ رکھتے ہیں۔ عام مطوفوں کی طرح ان کے معاملات پیچیدہ نہیں۔ سید صاحب موصوف میں مروت بہت زیادہ ہے۔ شریف سابق یعنی شریف علی کے زمانے میں ان کو نہایت وسعت اور دولت حاصل تھی۔ زمانے کے انقلاب نے ان پر اس زمانے میں بہت زیادہ گراں باری کر دی ہے جس کی وجہ سے مقروض رہتے ہیں اور اسی وجہ سے سال گزشتہ میں مجبور ہو کر ہندوستان آئے تھے۔ اس میں شک نہیں کہ سید صاحب ممدوح نے مولانا اور ان کے رفقا کے ساتھ نہایت آدمیت اور شرافت کا معاملہ رکھا۔ ہم جملہ متوسلین مولانا مرحوم، کے ان کے خاص طور سے شکر یہ گذار ہیں۔

---

(۴) مراد یہ ہے کہ مولانا عبید اللہ سندھی اور ''مکہ کے مولوی'' یعنی حضرت شیخ الہند کی جو اس زمانے میں حج کے لیے مکہ تشریف لے گئے تھے، انگریزی حکومت کے خلاف تحریک اور اس کے بڑھتے ہوئے اثرات کی موجودگی میں شمس العلماء اور ان مولویوں کو نہ تو علمائے دیو بند کا ''ترجمان'' سمجھا جاتا ہے اور نہ ''حقیقی لیڈر۔'' دیو بند پر واقعی اثرات مولانا محمود حسن کے ہیں۔ لیکن حکومت کے لیے مصلحت وقت اور برٹش مفادات کا تقاضا یہی ہے کہ اس قسم کے شمس العلماؤں اور خوشامدی مولویوں پر اعتماد کرے، ان سے کام لے۔ البتہ ''محتاط رویہ'' اختیار کرے۔ حد سے زیادہ ان کی ہمت افزائی نہ کرے کہ وہ مطالبات کے ذریعے حکومت کے معاملات میں مداخلت کرنے لگیں۔

۱۹۱۵ء

مولانا عبید اللہ سندھی کی ہجرت کابل:

۱۵/اکتوبر ۱۹۱۵ء: مولانا سندھی نے "کابل میں سات سال" کے عنوان سے اپنی سرگزشت تحریر کی ہے۔ وہ اس میں لکھتے ہیں: "۱۳۳۳ھ میں شیخ الہند کے حکم سے کابل گیا۔ مجھے کوئی مفصل پروگرام نہیں بتایا گیا تھا۔ اس لیے میری طبیعت اس ہجرت کو پسند نہیں کرتی تھی۔ لیکن تعمیلِ حکم کے لیے جانا ضروری تھا۔ خدا نے اپنے فضل سے نکلنے کا راستہ صاف کر دیا اور میں افغانستان پہنچ گیا۔

دہلی کی سیاسی جماعت کو میں نے بتلایا کہ میرا کابل جانا طے ہو چکا ہے۔ انھوں نے بھی مجھے اپنا نمایندہ بنایا مگر کوئی معقول پروگرام وہ بھی نہ بتلا سکے (۱)۔

کابل جا کر مجھے معلوم ہوا کہ حضرت شیخ الہندؒ قدس سرہ، جس جماعت کے نمایندہ تھے، اس کی پچاس سال کی محنتوں کے حاصل میرے سامنے غیر منظم شکل میں تعمیل حکم کے لیے تیار ہیں۔ ان کو میرے جیسے ایک خادم شیخ الہند کی اشد ضرورت تھی۔ اب مجھے اس ہجرت اور شیخ الہند کے اس انتخاب پر فخر محسوس ہونے لگا۔

میں سات سال تک حکومت کابل کی شرکت میں اپنا ہندوستانی کام کرتا رہا۔ ۱۹۱۶ء میں امیر حبیب اللہ خان نے ہندوؤں سے مل کر کام کرنے کا حکم دیا۔ اس کی تعمیل میرے لیے فقط ایک ہی صورت میں ممکن تھی کہ میں انڈین نیشنل کانگریس میں شامل ہو جاؤں۔ اس وقت سے مَیں کانگریس کا ایک داعی بن گیا۔

یہ بات عجیب معلوم ہوگی کہ امیر صاحب مرحوم اتحاد اسلام کے کام سے ہندوستانی کام کو زیادہ پسند کرتے تھے۔

۱۹۲۲ء میں امیر امان اللہ خان کے دور میں میں نے کانگریس کمیٹی کابل بنائی، جس کا الحاق ڈاکٹر انصاری کوششوں سے کانگریس کے گیا سیشن نے منظور کر لیا۔ برٹش ایمپائر سے باہر یہ پہلی کانگریس کمیٹی ہے۔ اور میں اس پر فخر محسوس کر سکتا ہوں کہ میں اس کا پہلا پریذیڈنٹ ہوں"۔

(کابل میں سات سال: صفحہ ۵۵۔۱۵۴)

---

(۱) مولانا سندھی کے اس بیان میں "دہلی کی سیاسی جماعت" کا ذکر آیا ہے۔ اس سے مراد حکیم اجمل خان۔ ڈاکٹر مختار احمد انصاری، مولانا محمد علی ہیں (ا۔س۔ش)

سیاحت روس:

۱۵ راکتوبر ۱۹۲۲ء کو ہمیں کابل سے سفر کرنے کا پاسپورٹ مل گیا گو ہماری روانگی سات دن بعد ۲۲ راکتوبر کو عمل میں آئی۔ (کابل میں سات سال: صفحہ، ۲۷)

سات مہینے ماسکو میں رکا۔ سوشلزم کا مطالعہ اپنے نوجوان رفیقوں کی مدد سے کرتا رہا۔ چوں کہ انڈین نیشنل کانگریس سے تعلق سرکاری طور پر ثابت ہو چکا تھا، اس لیے سوویت روس نے اپنا معزز مہمان بتایا اور مطالعے کے لیے ہر قسم کی سہولتیں بہم پہنچائیں (یہ غلط ہے کہ میں لینن سے ملا۔ کامریڈ لینن اس وقت ایسا بیمار تھا کہ اپنے قریبی دوستوں کو بھی نہ پہچان سکتا تھا)۔

میرے اس مطالعے کا نتیجہ ہے کہ میں اپنی مذہبی تحریک کو جو امام ولی اللہ دہلوی کے فلسفے کی شاخ ہے، اس زمانے کے لادینی حملے سے محفوظ کرنے کی تدابیر سوچنے میں کامیاب ہوا۔ میں اس کامیابی پر اول انڈین نیشنل کانگریس، دوم اپنے ہندوستانی نوجوان رفقاء جن میں ہندو بھی شامل ہیں اور مسلمان بھی، سوشلسٹ بھی اور نیشنلسٹ بھی، سوم سوویت روس کا ہمیشہ ممنون اور شکر گزار رہوں گا۔ اگر ان تین طاقتوں کی مدد مجھے نہ ملتی تو میں اس تخصص اور امتیاز کو کبھی حاصل نہ کر سکتا۔

جدید ترکیا:

۱۹۲۳ء میں انقرہ پہنچا۔ میرے لیے سفیر ترکیا متعین ماسکو اور وزارت خارجہ ماسکو نے مل کر سفر کا راستہ متعین کر دیا تھا۔ اور برطانوی کارندے اس کا پتا نہ لگا سکے (یہ غلط ہے کہ میں اس زمانے میں پہنچا جب برطانیہ اور فرانس اس پر قابض تھے) تخمیناً تین سال ترکی میں رہا ہوں۔ میں نے تحریک اتحاد اسلام کا تاریخی مطالعہ کیا۔ مجھے مستقبل قریب میں اس کا کوئی مرکز نظر نہیں آیا۔ اس لیے میں نے ترکوں کی طرح اپنی اسلامی مذہبی تحریک کو انڈین نیشنل کانگریس میں داخل کرنا ضروری سمجھا اور کانگریس میں اپنے اصول کی ایک پارٹی کا پروگرام چھاپ دیا، جس سے میری مذہبی تحریک ہر ایک مخالف انقلاب سے محفوظ رہ سکتی تھی۔

ہمارا پروگرام: یورپ سے اس طرح اسلام کا تعارف کرانے میں، میرا خیال ہے کہ میں اپنے استاذ الاستاذ اور امام محمد قاسم صاحب دیوبندی کی ایک قلبی خواہش کو عملی جامہ پہنا تا ہوں۔

اس پروگرام کو ترکی پریس سے شائع کرنے کے لیے انقرہ گورنمنٹ کی اجازت حاصل کی گئی۔ وزارت خارجہ نے دو مختلف مترجموں سے ترجمہ کرا کے جب تک اس کا حرف حرف نہیں پڑھ

لیا، اجازت نہیں دی۔ بعض ہندو دوست اردو نہیں پڑھ سکتے تھے، ان کی سہولت کے لیے میں نے ان کا انگریزی ترجمہ بھی شائع کر دیا ہے، استنبول میں لالہ لاجپت رائے سے تبادلۂ افکار ہوا اور ایسا ہی ڈاکٹر انصاری سے اچھی طرح باتیں ہوئیں۔ ہمارے بزرگ نہ اسے مان سکتے ہیں، نہ اس کا اچھا بدل بتلا سکتے ہیں۔ وہ کوشش کریں گے کہ ہمیں ہزار دو ہزار برس پہلے زمانے میں لا کھڑا کر دیں۔ البتہ پنڈت جواہر لال نہرو نے ایک آدھ فقرہ اس کی پسندیدگی پر لکھا ہے، وہ میرے لیے باعث سرور ہے۔(۱)

میں نے اپنے پروگرام میں عدم تشدد کو ضروری قرار دیا ہے۔ اس میں مہاتما گاندھی کا ممنون ہوں۔ میں عدم تشدد کو اخلاقی اصول مانتا تھا۔ لیکن اس بنا پر پولیٹکل پروگرام کی تشکیل اور اس کی اہمیت میں نے گاندھی جی سے سیکھی ہے۔ گاندھی جی نے مجھے حضرت مسیح موعود علیہ الصلوٰۃ والسلام کی تعلیم یاد دلا دی۔ میں جانتا ہوں کہ اسلام کے پہلے دور میں اس اصول سیاسی پر عمل ہوتا رہا ہے۔

كلمة الحكمة ضالة المومنين حيث وجدها فهوا حق بها.

مکہ معظمہ:

ستمبر ۱۹۲۶ء: ۱۳۴۴ھ موسم حج پر مکۂ معظمہ میں مؤتمر خلافت منعقد ہوئی۔ میرے تمام دوست اس میں آ رہے تھے۔ میں نے محض ان سے ملنے کی خاطر اٹلی کے راستے سے مکۂ معظمہ پہنچنے کی کوشش کی، مگر میں مؤتمر ختم ہونے کے بعد صفر ۱۳۴۵ھ میں پہنچا۔ میں اپنی پوزیشن صحیح طور پر پہچانتا تھا۔ میں نے حجاز گورنمنٹ کو یقین دلایا کہ یہاں میں کوئی سیاسی پروپیگنڈا نہیں کروں گا۔

(۱) اوپر کی سطروں میں مولانا سندھی نے پنڈت جواہر لال نہرو اور ان کی طرف سے پروگرام کی پسندیدگی کا ذکر کیا ہے۔ مولانا سے پنڈت جی کی ملاقات ۱۹۲۶ء میں اٹلی میں ہوئی تھی جب کہ مولانا ترکی سے حجاز تشریف لے جا رہے تھے اور پنڈت جی اپنی بیوی کے علاج اور سیاحت کی غرض سے یورپ گئے ہوئے تھے۔ پنڈت جی نے اپنی آپ بیتی میں اس ملاقات کا ذکر کیا ہے وہ لکھتے ہیں:

''ہندوستانی جلا وطنوں میں ایک شخص مولوی عبیداللہ بھی تھے۔ جن سے میں تھوڑی دیر کے لیے اٹلی میں ملا تھا۔ وہ مجھے بہت تیز آدمی معلوم ہوئے...... انھوں نے ''ریاست ہائے متحدۂ ہند'' یا ''ہندوستان کی متحدہ جمہوریت'' کی ایک اسکیم تیار کی تھی، جس میں فرقہ وارانہ مسائل کو بڑی قابلیت سے حل کرنے کی کوشش کی گئی تھی۔''

(میری کہانی: پنڈت جواہر لال نہرو، دہلی، ۱۹۳۶ء، ص ۲۵۶)

مولانا سندھی کی یہ اسکیم خاکسار ابو سلمان شاہ جہان پوری نے مرتب کر دی ہے اور ''مولانا عبیداللہ سندھی کا انقلابی منصوبہ'' کے عنوان سے ہندوستان میں خدا بخش پبلک لائبریری پٹنہ سے ۱۹۹۸ء میں اور پاکستان میں المحمود اکیڈمی، لاہور سے شائع ہو گئی ہے۔

اس وجہ سے میں ایک طرح محفوظ ہوگیا۔ اگر کبھی کسی جزوی امداد کی میں نے درخواست کی تو حکومت نے اسے پورا کردیا۔ میرے اپنے طور پر رہنے میں اولیاء امور حارج نہیں ہوئے، اس لیے وہ میری طرف سے بہت بہت شکریے اور دعا کی مستحق ہیں۔

علمائے مکہ سے استفادہ:

مجھے اہل مکہ میں سے تین ہندوستانی اور ایک عرب خاندان نے خاص طور پر علمی امداد دی۔ سب سے پہلے شیخ عبدالوہاب دہلی (حاجی علی جان والے)، دوسرے عبدالستار بن عبدالوہاب (دہلی) مرحوم اور تیسرے ابوالشرف مجددی۔ ان کے کتب خانوں سے میں نے استفادہ کیا۔ عرب خاندان سے میری مراد شیخ محمد بن عبدالرزاق بن حمزہ شیخ الحدیث مکہ اور شیخ ابوالسمح عبدالظاہر امام الحرم کا خاندان ہے۔

میرا علمی مشغلہ:

میں تقریباً ۱۲، ۱۳ سال سے قرآن عظیم اور حجۃ اللہ البالغہ کا بہ نظر عمیق مطالعہ کرتا رہا۔ تفسیر قرآن عظیم میں جس قدر مقامات میرے لیے مشکل تھے، اس زمانے میں انھیں امام ولی اللہ دہلوی کے اصول پر بالاطمینان حل کرسکا۔ جو لوگ میری طرح امام ولی اللہ دہلی کو نہیں مان سکتے، ان کو مطمئن کرنے کا دعویٰ میں نہیں کرسکتا۔

لیکن مجھے اپنے اصول پر قرآن عظیم میں اس زمانے میں قابل عمل تعلیم کا ایک عملی نصاب نظر آیا۔ اس میں اس تجلی ریز مقدس مقام کی تاثیر ضرور ماننا پڑتی ہے۔

میں نے امام ولی اللہ دہلوی کی مشہور کتابوں کا خاص طور پر مطالعہ جاری رکھا۔ ''مثلاً بدورِ بازغہ، خیرِ کثیر، تفہیماتِ الٰہیہ، سطعات، الطاف القدس، لمعات وغیرہ۔

ان کی کتابوں کے لیے بطور مفتاح میں نے مولانا رفیع الدین دہلوی کی ''تکمیل الاذہان'' اور مولانا اسماعیل شہیدؒ کی ''عبقات'' اور مولانا محمد قاسمؒ کی ''قاسم العلوم'' اور ''تقریرِ دلپذیر'' اور ''آبِ حیات'' کو استعمال کیا۔

مجھے لوگوں کے پڑھانے کا بھی موقع ملتا رہا۔ اور ساتھ ہی مدرسۂ قرآن حکیم بھی جاری رہا۔ اس میں میرے نظریات بہت وسیع ہوگئے۔ للہ الحمد

امام ولی اللہ دہلوی کی حکمت کا مدرسہ:

اگر مجھے موقع دیا جائے کہ میں امام ولی اللہ دہلوی کو حکمت کا مجتہد مستقل فرض کرلوں اور امام عبدالعزیز دہلوی اور مولانا رفیع الدین دہلوی کو اس حکمت کے منتسب اور مولانا اسماعیل شہیدؒ اور مولانا محمد قاسم کو مجتہد فی المذہب کے مرتبہ پر تسلیم کرلوں۔ تو میں اس حکمت کا ایک ایسا اسکول قائم کرسکتا ہوں جس میں (الف) قرآن عظیم، (ب) سنت رسول اللہ ﷺ وسنت خلفاے راشدین، (ج) تاریخ اسلام کی پوری عقلی تشریح ممکن ہو۔ اس کے بعد تمام مذاہب عالم اور ان کی کتب مقدسہ کی تحقیق وتطبیق اس صول پر آسان ہوجائے۔ ذالک من فضل اللہ واللہ ذوالفضل العظیم۔

مراجعتِ وطن:

۱۹۳۶ء سے انڈین نیشنل کانگریس نے میری واپسی کے متعلق کوشش شروع کی۔ اور میرے تمام دوست اس کی تائید میں کام کرتے رہے۔ اس میں سیاسی مسلک کے اتحاد واختلاف کا کوئی فرق نہیں رہا۔ اس طرح کی کوششوں کا یہ نتیجہ نکلا کہ مجھے یکم نومبر ۱۹۳۸ء کو اجازت واپسی وطن کی اطلاع ملی اور یکم جنوری ۱۹۳۹ء کو پاسپورٹ دینے کا فیصلہ معلوم ہوا۔ حج کا موسم سر پر آ گیا۔ اس لیے اداے مناسک کے بعد سے فراغت پر واپسی کا ارادہ ہے۔ (واللہ الموفق) (کابل میں سات سال: صفحہ ۵۹۔۱۵۵)۔

حضرت شیخ الہند کی سفر حج

۱۷/اکتوبر ۱۹۱۵ء: سید صاحب موصوف (حضرت کے مطوف سید امین عاصم) نے سفر حج کا حسب عادت انتظام کیا اور ۸/ذی الحجہ کو مکہ سے قافلہ روانہ ہوکر شب کو منی میں اور صبح کو عرفات میں پہنچا اور پھر تمام مناسک بفضلہ تعالیٰ نہایت کمال کے ساتھ ادا کیے گئے۔

اسی سال جناب مولانا خلیل احمد نے بھی سفرِ حجاز کا قصد فرمایا تھا اور مولانا موصوف کا ضرور یہ خیال تھا کہ اگر ممکن ہوا تو ایک مدت دراز تک سرزمین حجاز خصوصاً مدینۂ طیبہ مبارکہ سے استفادہ حاصل کریں اور اشغال باطنیہ اور فیوضات ظاہر یہ سے خلق اللہ کی ہدایت میں حسب استطاعت دلچسپی لیں، لیکن چوں کہ یہ خیال مولانا صاحب کا مدت سے پختہ ہوکر تعین تاریخ وغیرہ تک کرا چکا تھا اور اس وقت تک مولانا شیخ الہند رحمۃ اللہ علیہ نے اپنا قصد مصمم نہ کیا تھا اس لیے سفر میں رفاقت

نہ ہوسکی بلکہ مولانا خلیل احمد صاحب کچھ عرصے پہلے ہندوستان سے روانہ ہوکر مکۂ معظمہ پہنچ چکے تھے۔ان کے ساتھ کوئی مجمع کثیر بھی نہ تھا فقط ان کی اہلیہ صاحبہ اور حاجی مقبول احمد صاحب اور بعض حضرات دیگر ہمراہ تھے، چوں کہ مطوف مولانا موصوف کا سید مرتضیٰ تھا اس لیے حج میں بھی دونوں حضرات کی رفاقت نہ ہوسکی۔ کیوں کہ ہر ایک کے شتربان مغائر تھے اور وہ سب علاحدہ علاحدہ رہتے تھے، مدینۂ منورہ کے سفر میں بھی اگرچہ قافلہ ایک ہی تھا مگر اتحاد کلی نہ ہوسکا شتربان دور دور رہتے تھے۔

۲۲ر اکتوبر ۱۹۱۵ء: ۱۳ر ذی الحجہ ۱۳۳۳ھ، تیرھویں تاریخ کی شام کو حسب عادت منیٰ سے واپس ہوئے، اب مدینۂ منورہ کی روانگی کی فکریں شروع ہوئیں۔ انھی ایام میں حاجی خان محمد مرحوم نے ملک عدم کا قصد فرمادیا، اونٹوں کے کرائے، شغادف کی درستگی، سامان سفر کی فراہمی، تبریز وغیرہ میں سات آٹھ دن لگ گئے۔

موجودہ رفقاء میں سے مولوی مطلوب الرحمٰن صاحب تو مکۂ معظمہ ہی سے ہندوستان واپس ہوگئے تھے۔ کیوں کہ ان کی ملازمت سرکاری تھی اور رخصت اس قدر نہ تھی کہ وہ مدینۂ منورہ سے لوٹ کر موقع ملازمت پر وقت سے پہلے پہنچ سکیں اور شاید خرچ میں بھی کچھ کمی تھی۔ باقی ماندہ حضرات سب ساتھ تھے۔ مولانا مرحوم نے حسن انتظام کے لیے ابتدا ہی سے مولانا مرتضیٰ حسن صاحب کو امیر قافلہ بنادیا تھا کیوں کہ مولوی صاحب موصوف کو انتظام سے خاص دلچسپی ہے اور من جملہ دیگر کمالات کے اس میں بھی ان کو خاص کمال ہے۔ مولوی صاحب موصوف نے ہر قسم کا انتظام اپنے ہاتھ میں رکھا تھا۔ اور جملہ خدمات نوبت بنوبت انجام پاتی تھیں۔ چوں کہ تمام رفقا اہل علم اور ایک مذاق کے تھے اس لیے نہایت خوش اسلوبی سے یہ سفر فرحت وسرور کے ساتھ طے ہوا۔ (سفرنامۂ شیخ الہند: مطبوعہ دہلی، اسٹار پریس، ص ۱۳۔۱۲)

۲۸ر اکتوبر ۱۹۱۵ء: یوپی گورنمنٹ کے سکریٹری نے سکریٹری گورنمنٹ آف انڈیا کو سپاس نامے کے حوالے سے جو خط لکھا ہے، اس میں سپاس نامے کی اہمیت پر روشنی ڈالی ہے اور خاص توجہ دلائی ہے۔اس کے ساتھ سپاس نامہ پیش کرنے کے بعد شمس العلماء مولانا حافظ محمد احمد صاحب نے گورنر سے تنہائی میں ملاقات میں حضرت شیخ الہند مولانا محمود حسنؒ کے بارے میں جو خفیہ معلومات بہم پہنچاتی ہیں، نیز مولانا عبیداللہ سندھی مرحوم کی ''شرارتوں'' کے بارے میں جو اظہار رائے کیا ہے اور دہلی سے انھیں نکالنے کا جو مشورہ دیا ہے اور حجاز مقدس میں حضرت شیخ الہند کے

عزائم کے بارے میں جن خیالات یا توقعات کا اظہار کیا ہے۔ اس سے حضرت شمس العلماے کے مشاغل و سیرت پر بہت اچھی روشنی پڑتی ہے۔ سیکریٹری حکومت یو پی لکھتا ہے:

اپنے ڈی او نمبر ۵۷۰/ سی، مرقومہ ۲۷ ستمبر ۱۹۱۵ء کے حوالے سے عرض ہے کہ

۱۔ حکومت ہند کو اس انٹرویو کے نتائج سے یقیناً دل چسپی ہوگی، جو ہز آنر لیفٹننٹ گورنر (صوبہ یو پی) اور شمس العلماے مولوی محمد احمد (دیو بند) کے مابین ۲۷ ستمبر کو ہوا تھا۔ وہ اس دن پانچ مولویوں (۱) کے ساتھ رسمی طور پر ملاقات کرنے، خطاب عطا ہونے پر ''شکریہ ادا کرنے'' اور اپنی ''وفاداری کا یقین دلانے'' آئے تھے۔ ان میں سے ایک مولوی نے سپاس نامہ پڑھا، جس کا ترجمہ اس رپوٹ کے ساتھ منسلک ہیں۔ اس پر مندرجۂ ذیل سطور میں تفصیلاً روشنی ڈالی جائے گی۔

۲۔ سپاس نامے کے ساتھ اس مولوی نے ہز آنر کی خدمت میں ایک پمفلٹ بھی پیش کیا، جس میں اخبار زمیندار (لاہور) سے کچھ اقتباسات درج تھے۔ اس پمفلٹ میں مولوی محمد احمد (مہتمم دارالعلوم) کو حکومت کی طرف سے دیے گئے ''شمس العلماء'' کے دنیاوی اعزاز کو قبول کرنے پر انھیں ''زر کا بندہ'' کہہ کر گالی دی گئی تھی۔ اس کا جو جواب دیو بند کے مولوی شبیر احمد (عثمانی) کی طرف سے دیا گیا تھا، وہ بھی ہز آنر کی خدمت میں پیش کیا۔ ان سب کا خیال ہے کہ وہ پمفلٹ الہلال (کلکتہ کے ایڈیٹر) مولوی ابو الکلام آزاد کا لکھا ہوا ہے۔ چوں کہ ان کی طرف سے کوئی جواب الجواب نہیں آیا، اس لیے یہ سمجھتے ہیں کہ ان سے اس کا جواب نہیں بن پڑا۔

۳۔ سب (مولویوں) کے چلے جانے کے بعد شمس العلماء نے (تنہائی میں) بتایا کہ
(الف) انھوں نے سہارن پور کے مجسٹریٹ کو مولوی محمود حسن کے بارے بتلا دیا تھا۔
(ب) انھوں نے یہ بھی بتلایا کہ مولوی (محمود حسن اور ان کے ساتھی) ۱۸ ستمبر کو بحری جہاز کے ذریعے روانہ ہوگئے ہیں اور اب وہ (مولوی محمد احمد) ان کا پیچھا کریں گے جو

حوالہ: ''انڈین مسلمز.....اے ڈاکومنٹری ریکارڈ، جلد ۵، مرتبہ شان محمد، ۱۹۸۲ء، دہلی۔

حواشی:

(۱) یہ پانچ مولوی کون تھے؟ یقین کے ساتھ تو مولانا محمد احمد (مہتمم دارالعلوم) اور مولانا حبیب الرحمٰن عثمانی (نائب مہتمم) ہی کا نام لیا جا سکتا ہے۔ شاید مولانا شبیر احمد عثمانی بھی ہوں کہ ارباب اہتمام کے محبوب تھے اور مولانا عبیداللہ سندھی کو دیو بند سے نکلوانے کے لیے جو جھگڑا پیدا کیا گیا تھا، اس میں سب سے زیادہ حصہ انھی مرحوم کا تھا۔

ایک مشکل مرحلہ ہے۔

(ج) انھیں توقع ہے کہ مولوی محمود حسن شریف (۲) مدینہ کے ذریعے انور پاشا سے تعارف حاصل کریں گے اور ان کے ذریعے سے سرحد پر گڑبڑ کی ہمت افزائی کریں گے۔

۴۔ شمس العلماے نے دہلی گروپ کے بارے میں تفصیلی معلومات فراہم کی ہیں۔ دہلی گروپ کو سکھ سے مسلمان ہونے والے نومسلم شاگرد عبیداللہ سندھی کی امداد حاصل ہے (۳)۔ انھوں نے بتایا کہ۔

(الف) محمود حسن جب بمبئی جاتے ہوئے، دہلی پہنچے تو ان کا زبردست استقبال کیا گیا تھا۔

(ب) استقبال کرنے والوں میں ڈاکٹر (مختار احمد) انصاری نمایاں تھے وہ مولوی (محمود حسن) کو اپنی موٹر میں بٹھا کر اپنے گھر لے گئے۔

(ج) شمس العلمانے ان کا تعاقب نہیں کیا، لیکن بعد میں وہ بیگم انصاری سے ملے، جو ان کی مرید ہیں۔ ان سے پوچھ گچھ کی تو

ا۔ ان خاتون نے بتایا کہ ڈاکٹر انصاری نے محمود حسن کو ایک خطیر رقم دی ہے۔

۲۔ ان خاتون نے ان کی (ڈاکٹر انصاری اور مولانا محمود حسن کی) بات چیت سنی، اس میں مدینہ اور انور پاشا کے نام آئے تھے۔

(د) ڈاکٹر انصاری کے بھائی (حکیم عبدالرزاق) محمود حسن کو رخصت کرنے بمبئی تک گئے۔

۵۔ شمس العلماے کا بیان ہے کہ۔

---

(۲) شریف مدینہ سے مراد مدینہ کا گورنر بصری پاشا ہے۔ جس کے نام گورنر مکہ غالب پاشا نے حضرت شیخ الہند کے تعارف میں خط دیا تھا اور انور پاشا سے ملاقات کرا دینے کے لیے سفارش کی تھی۔

(۳) دہلی گروپ سے مراد نظارۃ المعارف القرآنیہ کے سرپرست اور کارکن ہیں۔ اس میں حکیم اجمل خان، حکیم عبدالرزاق، ڈاکٹر انصاری، مولانا عبیداللہ سندھی وغیرہ ہیں۔ مولانا سندھی اس کے ناظم اور حکیم اجمل خان اس کے سرپرست تھے۔ مولانا سندھی کے بعد مولانا احمد علی لاہوری اسے چلاتے رہے تھے۔ شمس العلماء مرحوم کی خدمات کا دائرہ نہ صرف دیوبند میں حضرت شیخ الہند، مولانا سندھی اور جمعیت الانصار کی سیاسی کارگزاریوں تک محدود تھا، بلکہ دہلی گروپ کے بارے میں معلومات کی فراہمی تک پھیلا ہوا تھا۔

(الف) عبیداللہ کی ''شرارت آمیز حرکتوں'' (۴) کا مرکز دہلی کی فتح پوری مسجد ہے۔
جو ایک نئی سوسائٹی ''نظارۃ المعارف القرآنیہ'' کا مرکز ہے۔
(ب) اس (سوسائٹی) کا ناظم عبیداللہ ہے۔
(ج) یہ ادارہ سرتاسر آمادۂ بغاوت ہے۔
(د) بدقسمتی سے عبیداللہ کو بھوپال سے دوسو روپے ماہوار ملتے ہیں، جو اس کی ہمت افزائی کا باعث ہیں۔
(ہ) شمس العلماء کا پرزور مطالبہ ہے کہ دہلی کو عبیداللہ کے وجود سے پاک کر دیا جائے اور اسے سندھ واپس بھیج دیا جائے۔
۶۔ اب میں سپاس نامے کے بعض پہلوؤں کی طرف آپ کی توجہ مبذول کراؤں گا۔
یہ سپاس نامہ ایک غیر معمولی نوعیت کی دستاویز ہے۔ ہز آنر (گورنر یوپی) کا خیال ہے کہ حکومت ہند کو اس سے خاصی دلچسپی ہوگی۔
☆ یہ سپاس نامہ اس کالج کے ارا کین کی طرف سے پیش کیا گیا ہے، جس کی شہرت عالم گیر ہے۔
☆ جو اسلامی دنیا میں اپنے مذہبی تقدس اور علمی خدمات کی وجہ سے قابل احترام سمجھا جاتا ہے۔
☆ اس ادارے میں حصول علم کے لیے وسط ایشیا، ایران، عرب، مصر، یہاں تک کہ چین سے بھی طالب علم آتے ہیں۔ اس کی دینی تعلیم کے اثرات ان تمام علاقوں پر محیط ہیں۔
☆ اس کا سنی مسلمانوں پر بلا مبالغہ سب سے زیادہ اثر ہے۔
☆ ان مولویوں نے لیفٹنٹ گورنر سے کہا ہے کہ اس سپاس نامے کو جس طرح چاہیں استعمال کریں اور جو بھی موزوں طریقہ سمجھیں اسے شائع کریں۔

---

(۴) آج جن بزرگ کے خلف ''طیب'' کا دعوا ہے کہ ان کے سلف صالح (مولانا محمد احمد) نے تحریک آزادی میں حصہ لیا تھا اور اس تحریک میں دوسروں کی رہنمائی کی تھی۔ اب تاریخ نے ورق الٹا تو معلوم ہوا کہ انھوں نے وقت کے ایک انقلابی اور حضرت شیخ الہند مولانا محمود حسن کے دست راست کی انقلابی سیاسی کوششیں جن کے اصل رہنما حضرت شیخ الہند ہی تھے، ان کے نزدیک ''شرارت آمیز حرکتیں'' تھیں اور حکومت سے ان کا ''پرزور'' مطالبہ تھا کہ اس انقلابی کو اس کے مرکز انقلاب سے دور اور دہلی کو اس کے وجود سے پاک کر دیا جائے اور اس کی قومی وملی خدمات یا بقول شمس العلماء ''شرارت آمیز حرکتوں'' کو سندھ تک محدود کر دیا جائے۔ اگر مولانا سندھی کے بارے میں ان کے یہ خیالات تھے، تو یقین رکھنا چاہیے کہ حضرت شیخ الہند کے بارے میں بھی ان کے خیالات اس سے زیادہ بلند نہیں ہو سکتے۔ واضح رہے کہ مولانا سندھی اس وقت ''کابل منصوبے'' کے سلسلے میں دہلی سے نکل چکے تھے لیکن ابھی ملک ہی میں تھے اور سندھ میں منصوبے کی تکمیل کے کاموں اور سفر کی تیاریوں میں معروف تھے۔

☆ یہ ایک ایسا اعلامیہ ہے، جس کا بڑا وزن ہے۔

☆ اس کے ذریعے نوجوان مسلمانوں کے اس باغیانہ پروپیگنڈے کی تردید ہوتی ہے کہ حکومت سے خطابات حاصل کرنا بے معنی ہے اور بے عزتی کا باعث ہے۔

☆ اس سپاس نامے میں یہ بھی بتایا گیا ہے کہ جب تک مسلمانوں کو دینی فرائض کی ادائیگی کی آزادی حاصل ہے، اس کے وفادار رہیں گے اور تقدس مآب حضرات پر کیا فرائض عائد ہوتے ہیں۔

☆ ہر دو معاملات کے حوالے سے یہ ایک قیمتی ریکارڈ ہے، جو قدامت پسند مسلمانوں کے رجحان کی ترجمانی کرتا ہے۔

☆ اس کی قدر و قیمت اس بات سے اور بڑھ جاتی ہے کہ دیوبند کالج کی وفاداری کو متزلزل کرنے اور اس میں مخالف برطانیہ پان اسلام ازم رجحان پیدا کرنے کی مستقلا کوشش کی جاتی رہی ہے۔

☆ یہ ایک ایسا مینی فسٹو ہے جس کو حسب ضرورت مناسب طریقے سے استعمال کرنا چاہیے۔

☆ اس سے ان تمام مذہبی نوعیت کے استدلالات کی نفی ہوتی ہے۔ جن پر غیر وفادار اور باغیانہ خیالات رکھنے والے انحصار کرتے ہیں۔

☆ سر جیمس مسٹن تجویز کرتے ہیں کہ اس کی باقاعدہ واپسی اطلاع (رسید) دی جائے اور بتلایا جائے کہ آیا حکومت کے پاس ایسی کوئی تجویز ہے کہ اسے کس طرح مشتہر یا استعمال کیا جائے؟

☆ یہ صوبائی سطح کی اہمیت سے کہیں زیادہ بلند اہمیت کی دستاویز ہے (۵)۔

۷۔ لیفٹننٹ گورنر جانتے ہیں کہ حکومت کی طرف سے دینی ایجنسیوں کو استعمال کرنے کی کوشش ہمیشہ سنجیدہ اور اکثر محتاط ہوتی ہے۔ لیکن اس وقت صورت ایسی ہے کہ دیوبند کے ان مولویوں کا اقدام از خود برمحل ہے۔

☆ تقریباً ایک سال قبل ہز آنر کو انھیں ذرائع سے اطلاع دی گئی تھی کہ کالج میں گڑبڑ ہو رہی

---

(۵) دفعہ ٦ کے ضمن میں شمس العلماء اینڈ کمپنی کے سپاس نامے کی اہمیت کے جن پہلوؤں کو نمایاں کیا گیا ہے وہ درست! لیکن اس سے یہ بھی اندازہ ہوتا ہے کہ دارالعلوم، دیوبند کے مرکز انقلاب کو آزادی کی تحریک اور جدوجہد سے دور لے جانے کی یہ کتنی بڑی سازش تھی اور تاریخ کا یہ فیصلہ کتنا سنگین ہے کہ آج ان کے نام لیواؤں پر اسی دارالعلوم کی سرزمین اپنی وسعت کے باوجود تنگ ہوگئی ہے اور انھوں نے جامع مسجد دیوبند میں پناہ لے رکھی ہے۔ آج تحریک آزادی ملک کے حوالے سے ان کا نام لیتے ہوئے شرم آتی ہے۔ دنیا نے دیکھ لیا کہ حضرت شیخ الہند کی تحریک کی مثال ''مثل کلمۃ طیبۃ کشجرۃ طیبۃ اصلہا ثابت وفرعہا فی السماء......'' تھی اور شمس العلماء کی تحریک اس کے ''برعکس'' دریوزہ گری کی مثال ہے۔

ہے۔اس لیے وہ کالج تشریف لائیں، لیکن اس وقت ہزآ نر نے اس تجویز کو یہ کہہ کر رد کر دیا تھا کہ پرنسپل اور اسٹاف کی جانب سے ضابطے کے دعوت نامے کے بغیر وہ ایسا نہیں کر سکتے۔

☆ بعد میں ہزآ نر نے یکم مارچ ۱۹۱۵ء کو کالج کا دورہ کیا اور اس کے باوجود کہ محمد علی اور دہلی کے ایجی ٹیٹر جلسے میں موجود تھے، ہزآ نر کا شاندار استقبال کیا گیا۔

☆ کالج کے ''تمام افراد'' (٦) کی موجودگی میں رسمی (خیر مقدمی اور شکریے کی) تقاریر کا تبادلہ ہوا اور

☆ اس کے بعد کالج لائبریری میں خوش گوار ماحول میں دل کھول کر آزادانہ تبادلۂ خیال ہوا۔اس طرح باہم دوستی اور تعلقات قائم ہوئے۔

☆ پرنسپل (محمد احمد) کو وائسرائے کی جانب سے شمس العلماء کا خطاب دینے اور بالکل غیر متوقع طور پر پیش کیے گئے سپاس نامے سے (٧) یہ روابط مزید استوار ہوئے۔ لیفٹننٹ گورنر کا خیال ہے کہ اس کے نتائج دوررس اور قابل اطمینان ہوں گے۔

حضرت شیخ الہند کا سفر مدینۂ منورہ:

۳۰؍اکتوبر ۱۹۱۵ء: ۲۱؍ذی الحجہ بروز دوشنبہ ۱۳۳۳ھ کو قافلہ مدینۂ منورہ کو روانہ ہوا، سید امین عاصم صاحب نے اپنے شتربانوں کے سردار کو مولانا مرحوم اور ان کے رفقا کے لیے منتخب کیا اور اس کو مولانا کی راحت رسانی کی بہت زیادہ تاکید فرمائی۔اس میں شک نہیں کہ اس نے تمام راستے میں بہت ہی زیادہ آدمیت اور شرافت سے کام لیا، نماز ہمیشہ مولانا مرحوم اور ان کی جماعت اتر کر باجماعت ادا فرماتے تھے۔یہ شتربان یا تو اس وقت تک اونٹوں کے رو کے رکھتا تھا یا قافلہ چلنے دیتا اور خود مع دو ایک آدمی کے بندوق لیے ہوئے حفاظت کرتا تھا یہاں تک کہ نماز سے فراغت ہو جاتی اور پھر سب اپنے اپنے اونٹوں پر سوار ہو جاتے۔

۱۳؍نومبر ۱۹۱۵ء: ۶؍محرم ۱۳۳۴ھ بروز دوشنبہ صبح کو ۹ یا ۱۰ بجے مولانا بیر عروہ پر پہنچے، استقبالیہ

---

(٦) ان ''تمام افراد'' میں حضرت شیخ الہند مولانا محمود حسن صدر المدرسین و شیخ الحدیث دار العلوم شامل نہیں تھے۔حضرت اس موقع پر دیوبند سے باہر چلے گئے تھے۔

(٧) سپاس نامہ سے مراد خیر مقدمی تقریر اور خطاب یابی پر شکریے کی تقریر ہے۔ارباب اہتمام نے جن خیالات اور جذبات کا اظہار فرمایا تھا اس سے گورنر خوش ہوا اور دوررس اور قابل اطمینان نتائج کی توقع کی۔ایک سپاس نامہ وہ ہے جو خطاب ملنے کے بعد شمس العلماء مولانا محمد احمد اور چند دوسرے حضرات نے وفد کی صورت میں شملہ جا کر لیفٹیننٹ گورنر کی خدمت میں پیش کیا تھا۔اس کا ترجمہ سی آئی ڈی کی رپورٹوں کے حوالے سے اس سے پیشتر درج کیا جا چکا ہے۔

جماعت موجود تھی لوگوں کو خبر ہوئی جوق جوق جماعت اہل علم اور فضل کی نکلی اور مولانا مرحوم و مولانا خلیل احمد صاحب کی قدم بوسی سے مستفیض ہوئی۔ ہر دو حضرات مع جملہ رفقاء راقم الحروف کے مکان پر فروکش ہوئے اہل شہر، ائمہ و خطباء، روٴساء وغیرہ وغیرہ میں دھوم مچ گئی کہ ہندوستان کے آفتاب نے بارگاہ نبوت کی خاک روبی کا قصد کر کے عتبہٴ عالیہ پر جبہ سائی کی ہے چناں چہ تمام دن لوگ قدم بوسی کے لیے آتے رہے اور شہ نشین میں جو کہ اسی واسطے مزین کی گئی تھی مشرف ہوتے رہے۔ تقریباً تین چار دن تک ہجوم زوار و مسافرین سے نہایت ہی زیادہ چہل پہل رہی۔......

اس زمانے میں طلبہ و مدرسین مدینہٴ منورہ نے ہر دو حضرات سے اصرار کیا کہ ہمارے استفادہ کے لیے بعض کتابیں شروع کرا دیجیے۔ علاوہ اس کے بہت سے علما اور طلبہ نے حسب قاعدہ اسلاف اوائل کتب حدیث سنا کر اجازت بھی لی۔ خلاصہ یہ کہ مولانا نے بخاری شریف اور دیگر کتب حدیث لوگوں کے اصرار پر شروع کرادی۔ تقریر عربی میں فرماتے تھے۔ طلبہ اور مستفیدین کا جو کہ اکثر وہاں کے مدرس اور معتبر عالم تھے اس قدر مجمع ہوتا تھا کہ مکان میں جگہ بمشکل ملتی تھی۔ مولانا نے حلقہٴ درس حرم محترم میں اپنی کسر نفسی کی وجہ سے مناسب نہ سمجھا بلکہ مکان ہی پر پڑھاتے تھے۔'' دوسری بعض کتابوں کا درس مولانا خلیل احمد صاحب نے بھی اسی مزید اصرار کی بناء پر شروع کرادیا۔''

کانگریس کا سالانہ:

۲۷ر دسمبر ۱۹۱۵ء کو بمبئی میں آل انڈیا کانگریس کا تیسواں سالانہ اجلاس سر ستیندر پرشاد سنہا کی صدارت میں منعقد ہوا۔ اس اجلاس میں ۲۲۵۹ مندوبین شریک ہوئے۔ اسی اجلاس میں بالا تفاق رائے حکومت خود اختیاری کا مطالبہ کیا گیا اور ملک کی ترقی و آزادی کے لیے تجویزیں پاس ہوئیں۔ اس اجلاس میں مجلس خلافت کے کچھ ارکان بھی شریک ہوئے۔ (حسرت موہانی۔ ایک سیاسی ڈائری)

مسلم لیگ کا ہنگامہ خیز سالانہ اجلاس: دسمبر ۱۹۱۵ء بمبئی میں مسلم لیگ کا اجلاس مظہر الحق کی صدارت میں منعقد ہوا۔ مسٹر محمد علی جناح مجلس استقبالیہ کے صدر کی حیثیت سے پہلی بار مطلع سیاست پر نمودار ہوئے اس اجلاس میں خیر سگالی کے طور پر کانگریس کے کچھ ہندو لیڈر بھی شریک تھے۔ حسرت موہانی بھی شریک تھے اور کسی بات پر سختی سے مخالفت کر بیٹھے جس سے بڑی ہلچل مچ گئی مگر مولانا پر اس کا کوئی اثر نہ ہوا کیوں کہ وہ اپنے سیاسی عقیدے اور لائحہ عمل پر خودداری کے

ساتھ اٹل رہے خواہ انھیں اپنے مقصد میں کامیابی ہو یا نہ ہو۔ مجلس خلافت کی بنیاد اور کانگریس لیگ جذبۂ دوستی اس اجلاس کی خصوصیت تھی۔

مسٹر جناح نے انتخاب کے مسئلے پر غور سردست ملتوی کر دینے کا مشورہ دیا۔ ان کے نزدیک اس سے قوم کے دو حصوں میں تقسیم ہونے کا خطرہ تھا۔ مولانا ابوالکلام آزاد نے سیلف گورنمنٹ اور ہندو مسلمان اتحاد کے حق میں زبردست اور ولولہ انگیز تقریر کی۔ دراصل مسلم لیگ کی سرزمین میں یہ پودے انھی کے لگائے ہوئے تھے۔ آغا خان نے فارسی میں بڑی عمدہ تقریر کی۔ اجلاس میں شرکت کے لیے خان عبدالغفار خان اپنے چند رفقا سمیت سرحد سے آئے تھے۔

مسلم لیگ کے سالانہ اجلاس میں برطانوی سرکار نوازوں کا ہنگامہ:

مسلم لیگ نے اپنی سابقہ روش تبدیل کر کے برطانوی سرکار پرستی ترک کی اور مسلمانوں اور دیگر ہندوستانیوں کے مفادات کے مطابق حکومت خود اختیاری کا مطالبہ کیا تو سرکار پرست مسلم لیگی حلقوں میں زلزلہ آ گیا۔ نئی روش ترک کرنے کے لیے دباؤ پڑنے لگا اور سازشیں شروع ہو گئیں۔ آل انڈیا نیشنل کانگریس کا ۳۰ واں سالانہ اجلاس بمبئی میں منعقد ہونا طے پایا۔ (دسمبر ۱۹۱۵ء) مسلم لیگ نے بھی اپنا اجلاس بمبئی میں کرنے کا فیصلہ کیا۔ (۳۰ ردسمبر ۱۹۱۵ء تا یکم جنوری ۱۹۱۶ء) اس سے سرکاری حلقوں میں کھلبلی مچ گئی کہ ہندوستانیوں میں اتحاد کا فزوں تر ہونا برطانوی اقتدار کے مستقبل کے لیے زبردست خطرہ بن جائے گا۔ چناں چہ اسے سبوتاژ کرنے کی منصوبہ بندی کی گئی۔ جس میں بمبئی پولیس، بمبئی کے سرمایہ دار، شرپسندوں کے سرپرست اور بمبئی میں مقیم پٹھانوں کے بعض سربراہ شامل تھے۔ مسلم لیگ نے اپنے اجلاس میں کانگریس کے سربرآوردہ قائدین کو شرکت کی دعوت دی تھی۔ جن میں کانگریس کے صدر سرستیندر پرشاد سنہا، ڈنشا...... ایس۔ این بینرجی، مسز اینی بیسنٹ، مسز سروجنی نائیڈو، پنڈت مدن موہن مالویہ اور ایم۔ کے گاندھی کے نام قابل ذکر ہیں۔ مسلم لیگ نے جلسہ گاہ کو خوبصورت بینروں سے آراستہ کیا تھا اور صدر دروازہ پر "اتفاق طاقت ہے" کا بڑا بینر آویزاں کیا تھا۔ مسٹر مظہر الحق بیرسٹر بانکی پور بہار (۱۹۲۱ء۔۱۸۶۸ء) کی زیر صدارت اجلاس شروع ہوا۔ جو ایک اعتدال پسند سیاست داں تھے اور دونوں جماعت کو قریب تر لانے کے زبردست حامی تھے۔ رئیس احمد جعفری لکھتے ہیں۔ "مسلم لیگ کے اجلاس میں اکابرین ملت اسلامیہ کا ایسا مجمع تھا جو اپنی نوعیت میں تاریخی حیثیت رکھتا تھا۔"

پہلے روز کے اجلاس میں صدر نے اپنا صدارتی خطبہ پڑھا۔ انھوں نے زیر گردش افواہوں کی تردید

کرتے ہوئے کہا:

''اس موقع پر قومی مسائل پر ہماری خاموشی نہایت بدنما اور مضرت رساں فعل ہوگا۔ اس دنیا میں جمود کا تصور نہیں کیا جاسکتا ہمیں یا تو پیش قدمی کرنا ہوگی یا پسپائی اختیار کرنا پڑے گی۔ ہمارے متعلق یہ کہا جاتا ہے کہ ایک ہی وقت میں اجلاس منعقد کرنے کا مقصد لیگ کی آزادانہ حیثیت کو ختم کرنا ہے اور اسے کانگریس میں مدغم کر دینا ہے اس سے زیادہ بعید از حقیقت کوئی شے نہیں ہوسکتی گروہ افراد کی طرح محبت کرنا پسند کرتے ہیں اور اپنی انفرادیت کی پرورش کرتے ہیں جب تفاوت کے اندر سے اتحاد و اتفاق کے سوتے پھوٹیں گے تو حقیقی قومی ترقی دوامی صورت اختیار کرلے گی۔''

خطبہ صدارت کے بعد اجلاس بخیر و خوبی اگلے روز پر ملتوی ہویا۔

اجلاس کے انعقاد کے مسئلے پر تین متضاد آراء:

سرکار نواز گروہ نے یہ موقف اختیار کیا کہ اس سال سرے سے اجلاس ہی نہ منعقد کیا جائے اس کا استدلال یہ تھا کہ ترک حکومت برطانیہ کے خلاف برسر پیکار ہے۔ ان کا جرمنی کے ساتھ مل کر جنگ میں شریک ہونا اس گروہ کے لیے بڑا نازک مسئلہ بنا ہوا تھا۔ اس کا خیال تھا اور بالکل درست تھا کہ مسلمانوں کا رشتہ ترکوں کے ساتھ مذہبی اخوت کی بنا پر بہت گہرا ہے۔ اس حقیقت کے پیش نظر یہ گروہ اس پہلو سے سخت پریشان تھا کہ مبادا پبلک پلیٹ فارم سے کوئی ایسی بات نکل جائے۔ جس سے ہندوستانی مسلمانوں کی برطانیہ کے ساتھ وفاداری پر شبہ ہوجائے اور جنگ عظیم میں حکومت برطانیہ کو تکلیف محسوس ہو۔

دوسرا گروہ، ''باغباں راضی رہے اور خوش رہے صیاد بھی'' کی دوغلی پالیسی پر عمل پیرا تھا۔ اس کا کہنا تھا کہ اجلاس تو منعقد ہونا چاہیے لیکن بمبئی میں نہیں۔ اس سے کانگریس کے ساتھ تعاون اور اشتراک عمل کے باغیانہ اقدام کا تاثر قائم ہوتا ہے۔

تیسرا گروہ راست فکر اور بے باک حضرات پر مشتمل تھا۔ جو ''الہلال'' کی زبان میں آزادی کی دیوی کے حسن و جمال کو محسوس کر چکا تھا اور اس سے وصل کی خواہش کی تکمیل میں سب کچھ قربان کرنے کے لیے تیار تھا۔ اس گروہ کے نزدیک مصلحت کوشی معصیت تھی، مصلحت سوزی اس کا مطمح نظر تھا۔ پھر یہ اپنی جماعت کے اندرونی معاملات میں کسی بیرونی مداخلت کو گوارا کرنے کے لیے تیار نہ تھا اس کا موقف تھا۔ اجلاس ضرور ہونا چاہیے اور بمبئی میں ہونا چاہیے، ہمیں کسی کی

ناراضگی کی پروانہیں کرنی چاہیے، کسی سے خوفزدہ ہونے کی ضرورت نہیں ہے۔ آخری گروہ کی رائے صحیح اور درست تھی اور یہی غالب آئی۔ اجلاس ہوا اور بمبئی میں ہوالیکن اسے ناکام بنانے کے لیے حکومت اور اس کے آلۂ کار منصوبہ بندی سے حملہ آور ہوئے انھوں نے دونوں فرقوں کے درمیان منافرت پھیلانے کی غرض سے جذباتی نعرہ بازی کی۔ پولیس نے ان کی مکمل پشت پناہی کی، لیکن انھیں بالکل ناکامی کا سامنا کرنا پڑا اور پسپائی پر مجبور ہوئے۔ مسلم لیگ نے پروگرام کے مطابق تمام مراحل طے کیے اگرچہ اجلاس میں ہنگامہ آرائی کی وجہ سے بدمزگی بھی پیدا ہوئی لیکن اجلاس کی کارروائی اور فیصلوں سے دونوں جماعتوں کے اتحاد و اتفاق کے لیے راہ ہموار ہوگئی۔ سرکار کے عزائم بے نقاب ہوئے۔ (مولانا ابوالکلام آزاد اور آرام پرست مسلمانوں کی سیاست، ص ۱۹ـ۶۱۸)

۱۹۱۶ء

۵ر جنوری ۱۹۱۶ء: ۵ جنوری ۱۹۱۶ء کو مسٹر لائڈ جارج وزیر اعظم انگلستان نے اپنی مشہور تقریر میں کہا: ''ہم اس لیے جنگ نہیں کررہے ہیں کہ ٹرکی کو اس کے دارالخلافے سے محروم کردیں یا ایشیائے کوچک اور تھریس کے زرخیز وشہرہ آفاق علاقے لے لیں جن میں ترکی النسل آبادی کا جزو غالب ہے۔

ہم اس بات کے بھی مخالف نہیں کہ جن علاقوں میں ترکی نژاد آباد ہے، وہاں ترکوں کی سلطنت قائم رہے، یا قسطنطنیہ اس کا پایۂ حکومت ہو۔ البتہ بحیرۂ روم اور بحیرۂ اسود کے درمیانی راستے کو بین الاقوامی ضبط ونگرانی میں لانے کے بعد ہماری رائے میں عرب، آرمینیا، عراق، شام اور فلسطین اپنی اپنی جداگانہ قومی حکومت کے مستحق ہیں۔''

۹ر جنوری ۱۹۱۶ء: یوپی گورنمنٹ کے سکریٹری نے ہوم ڈیپارٹمنٹ آف انڈیا کے سکریٹری کو ایک خفیہ مراسلہ بھیجا ہے جس میں اس خبر پر کہ مولانا محمود حسن اور مولانا خلیل احمد ۱۰ر جنوری کو جج سے واپسی پر بمبئی پہنچ رہے ہیں، ان کی گرفتاری اور الٰہ آباد سول جیل میں انھیں زیرِ حراست رکھے جانے کے انتظام سے مطلع کیا ہے: یوپی گورنمنٹ کے سکریٹری نے لکھا ہے:

''بحوالہ ڈی او نمبر ۱۹۳۹ء مرقومہ ۱۸ر دسمبر ۱۹۱۵ء

میں آپ کو اطلاع دینا چاہتا ہوں کہ حکومت (بمبئی) کو تار دے دیا گیا ہے کہ

☆ محمود حسن اور خلیل احمد امکانی طور پر اس بحری جہاز پر ہیں، جو کویت سے ۱۰ر جنوری کو بمبئی

پہنچ رہا ہے(۱)۔

☆ حکومت بمبئی کو باخبر کردیا گیا ہے کہ شمالی ہند کے مسلمانوں کی اکثریت ان دونوں کی بے حد عزت اور احترام کرتی ہے۔ اس موقع پر ان کی گرفتاری اور نظر بندی مسلمانوں کے حلقوں میں اضطراب اور بے چینی کا سبب بن سکتی ہے۔ حکومت بمبئی اس صورت حال سے بچنا چاہتی ہے اور تجویز کرتی ہے کہ ان لوگوں کے پہنچنے پر ان کی سختی سے تلاشی لی جائے اور اگر کوئی قابل مواخذہ چیز برآمد نہ ہو تو ان پر سخت نگرانی رکھی جائے اور ان کا جہاں جانے کا ارادہ ہو وہاں تار کے ذریعے مطلع کر دیا جائے۔

☆ آپ نے اپنے ڈی او نمبر ۴۹۷۴ مرقومہ ۱۳ ردسمبر ۱۹۱۵ء میں خطرہ ظاہر کیا ہے کہ محمود حسن سرحد کی طرف چلے جائیں گے، اس لیے ہز آنر نے حکومت بمبئی کو تار دے دیا ہے، جس میں کہا گیا ہے کہ ان کی مجوزہ طور پر سخت تلاشی لی جائے اور پھر انڈیا آرڈیننس کی خلاف ورزی کے الزام میں انھیں پولیس کے زیر حراست الہ آباد پہنچا دیا جائے۔

☆ تجویز کیا جاتا ہے کہ حکومت کے احکام کے مطابق ضروری کارروائی کی جائے۔ آیندہ کارروائی کا تعلق ان کی تلاشی کے نتیجے پر منحصر ہوگا اور الہ آباد میں تفتیش کی جائے گی۔

☆ الہ آباد میں محمود حسن اور خلیل احمد کو فی الحال سول جیل میں زیر حراست رکھا جائے گا۔''

حوالہ:

گورنمنٹ آف انڈیا، ہوم ڈیپارٹمنٹ۔ پولیٹیکل ڈیپازٹ پروسیڈنگز، جنوری ۱۹۱۶ء نمبر ۴۷، صفحہ ۴۰ بہ حوالہ انڈین مسلمز......اے ڈاکومنٹری ریکارڈ، جلد ۵، مرتبہ شان محمد

حاشیہ:

(۱) حضرت شیخ الہند مولانا محمود حسن ۱۸ ردسمبر ۱۹۱۵ء کو ایس ایس اکبر جہاز سے حج کے لیے تشریف لے گئے تھے۔ یہ بات پولیس کے علم میں نہیں تھی کہ حضرت کچھ عرصہ عرب میں قیام فرمائیں گے۔ اس لیے وہ جنوری ۱۹۱۶ء میں ان کی واپسی کی متوقع تھی لیکن فروری میں مولانا مطلوب الرحمن اور ستمبر ۱۹۱۶ء میں مولانا خلیل احمد صدر مدرس مدرس مظاہر العلوم سہارنپور، ان کی اہلیہ، حاجی مقبول احمد اور سید ہادی حسن حج سے فراغت کے بعد تشریف لائے۔ ستمبر میں آنے والوں کو بمبئی میں روک لیا گیا۔ ان کے بیانات لیے گئے اور دو تین روز کے بعد انھیں نینی تال لے جایا گیا۔ نینی تال میں تینوں بزرگوں کو الگ الگ رکھا گیا اور ہر ایک سے متعدد بیانات لئے گئے۔ اب مولانا مطلوب الرحمن (مولانا حبیب الرحمان عثمانی نائب مہتمم دارالعلوم دیوبند اور مولانا شبیر احمد عثمانی مدرس دارالعلوم کے بھائی) کو بھی نینی تال بلا کر شامل تفتیش کرلیا گیا۔ دیوبند اور سہارنپور میں اطلاع پہنچی تو شمس العلماء مولانا محمد احمد اور مولانا حبیب الرحمن عثمانی کی سفارش یا ضمانت پر مولانا خلیل احمد، حاجی مقبول احمد اور مولانا مطلوب الرحمن عثمانی کو چھوڑ دیا گیا۔ چونکہ سید ہادی حسن سے نہ کوئی خاص بات معلوم ہوئی تھی نہ آیندہ کے لیے کوئی اطمینان ان بخش وعدہ ہاتھ آیا، اس لیے انھیں نہیں چھوڑا گیا، انھیں ''ایک عرصے کی نظر بندی'' کے بعد رہائی ملی۔ دیگر حضرات سے جو معلومات ارادتاً یا اتفاقاً حکومت کو حاصل ہوگئی تھیں ان کی بنیاد پر تقریباً تین درجن افراد کے بیانات لیے گئے، ان کے گھروں کی تلاشیاں لی گئیں اور بہت سے افراد کی طویل نظر بندیوں کا سلسلہ شروع ہوا۔

(تفصیل کے لیے دیکھیے ''شیخ الہند مولانا محمود حسن محدث دیوبندی کے مختصر سوانح اور حالات اسری'' از انجمن اعانت نظر بندان اسلام، دہلی، ۱۹۱۸ء)

۱۸ر جنوری ۱۹۱۶ء: وائسرائے ہند کی جانب سے ہندوستان کی سیاسی صورت حال کے بارے میں انڈیا آفس لندن کو ہر پندرہ دن میں ایک رپورٹ بھیجی جاتی تھی۔ ۱۵ر جنوری ۱۹۱۶ء کو ختم ہونے والے پندرھواڑے کی جو رپورٹ بھیجی گئی تھی، اس سے معلوم ہوتا ہے کہ حکومت ہند کو افغانستان میں انقلابیوں کی سرگرمیوں سے سخت تشویش تھی اور سرحد و پنجاب میں ان سرگرمیوں کو متوقع اثرات سے بچانے کے لیے ہندو مسلم مسئلہ پیدا کر دینا چاہتی تھی اور اس سلسلے میں ہندوؤں میں افغانستان میں انقلابی سرگرمیوں کے اثرات سے سراسیمگی پھیلا کر انھیں مسلمانوں یا انقلابی سرگرمیوں کے خلاف کام کرنے پر اکسا رہی تھی۔ اس رپورٹ میں افغانستان میں جرمن مشن کی آمد اور اس کی کارگزاری کی طرف بھی اشارہ ہے۔ رپورٹ میں کہا گیا ہے:

''بہ ظاہر تو پنجاب کی موجودہ سیاسی صوت حال میں کوئی تبدیلی نظر نہیں آتی۔ لیکن عام طور پر لوگوں میں بے چینی پائی جاتی ہے اور حالات پر بحث کرتے نظر آتے ہیں۔ بلقان، گیلی پولی، ایران، اور افغانستان کے حالیہ واقعات کو ترکی کے محمڈن اتحادیوں کی جانب سے برطانوی وقار کے خلاف سمجھا جاتا ہے۔ اگرچہ برطانیہ دشمن خیالات کھلے طور پر ظاہر نہیں ہوتے ہیں۔ لیکن مسلمان باغیوں کے لیے جرمنی کی امداد کے چرچے عام ہیں۔ افغانستان میں جرمن ترک ایجنٹوں کی مصروفیات اور سرحدی قبائل میں شورش انگیز صورت حال کے متعلق افواہوں سے صوبہ پنجاب کے ہندو سراسیمہ ہیں۔

راولپنڈی ڈویژن کے کمشنر نے اطلاع دی ہے کہ ہندو سخت بے چینی محسوس کر رہے ہیں۔ حال آں کہ فی الحال ان کے خوف کے لیے کوئی خاص بات نظر نہیں آتی۔ کابل میں پیدا ہونے والے حالات اور پھیلنے والے خیالات ہر طرف زیر بحث آ رہے ہیں۔ ان حالات میں اگر باحیثیت ہندوؤں کو اظہار خیال کا موقع دیا جائے تو حالات میں خوش گوار تبدیلی پیدا ہو سکتی ہے۔ وہ حکومت سے مطالبہ کریں گے کہ مسلمانوں پر زیادہ اعتماد نہ کیا جائے۔ اس (کمشنر راولپنڈی ڈویژن) نے یہ اطلاع بھی دی ہے کہ ان حالات سے مسلمان بھی کچھ زیادہ پر امید نہیں ہیں۔

جالندھر ڈویژن کے ہندو خاص طور پر بے چین ہیں۔ کمشنر یہ بھی لکھتا ہے کہ صورت حال میں موجودہ تبدیلیوں، ایران میں گڑبڑ اور جرمنی کی پٹھانوں کو بھڑکانے کی کوششوں نے جو جنگ کے امکانات پیدا کر دیے ہیں۔ اس کی وجہ سے ان (ہندوؤں) کے ذہن خدشات کا شکار ہیں اور وہ یہ بات محسوس کرنے لگے ہیں کہ ان کے مفادات کا تحفظ ہمارے (گورنمنٹ کے) ساتھ اشتراک

میں ہے۔
تعلیم یافتہ مسلمان اس بات پر مطمئن نظر آتے ہیں کہ ترکی بلقان کے حالیہ بحران سے نکل گیا ہے۔ ضلع شاہ پور کے مسلمان جہاں وہ اکثریت میں ہیں، خیال کرتے ہیں کہ میسوپٹامیہ میں حالات ٹھیک نہیں ہیں...... قصور ضلع لاہور کے مسلمان ماضی میں بیشتر لاقانونیت کے عادی رہے ہیں، وہ غیر مطمئن ہیں اور ان کا خیال ہے کہ یوروپین کو جس درجہ مدافعانہ قوت کی ضرورت ہے، وہ موجود نہیں ہے۔ کابل میں ترکی جرمن مشن کے بارے میں متعدد افوائیں پھیلی ہوئی ہیں۔ ان میں سے ایک یہ بھی ہے کہ امیر کابل نے بہت سے تحائف کے ساتھ وہ تلوار بھی وصول کر لی ہے جو سلطان ترکی کے ساتھ تعاون کے عزم کی علامت ہے(۱)''۔

کلکتہ سے مولانا آزاد کا اخراج اور نظر بندی:

۳ر مارچ ۱۹۱۶ء: حکومت بنگال نے مولانا ابوالکلام آزاد کو ڈیفنس آف انڈیا آرڈی نینس کے تحت حدود بنگال سے نکل جائے کا حکم دیا ہے چوں کہ اس سے پہلے اسی آرڈی نینس کے تحت دہلی، پنجاب، یوپی اور مدراس کی حکومتیں اپنے اپنے صوبوں میں مولانا آزاد کا داخلہ روک چکی تھیں، اس لیے بمبئی اور بہار کے دو صوبوں کے سوا کوئی صوبہ ان کے جانے کے لیے نہیں رہ گیا تھا

حوالہ:

گورنمنٹ آف انڈیا ہوم ڈیپارٹمنٹ، پولیٹکل ڈیپازٹ۔ جنوری ۱۹۱۶ء، نمبر ۶۶، بحوالہ ''انڈین مسلمز...... اے ڈاکومنٹری ریکارڈ'' جلد ۵، مرتبہ شان محمد، ۱۹۸۲ء دہلی۔

حاشیہ:

(۱) ہندوستانی ترکی جرمن مشن ۷ر اکتوبر ۱۹۱۵ء کو کابل پہنچا تھا۔ اس مشن کے سربراہ راجہ مہندر پرتاب آف ہاتھرس (یوپی۔ ہند) تھے اور مولانا برکت اللہ آف بھوپال (جنوبی ہند)، کاظم بیگ (ترکی)، فون ہنٹنگ (جرمن) اور نیڈر مائر (آسٹریلیا) اس کے ارکان تھے۔ ۱۵ر اکتوبر ۱۹۱۵ء کو مولانا عبیداللہ سندھی جب کابل پہنچے تو انھوں نے بھی اس مشن سے تعلقات پیدا کر لیے اور جب آزاد ہندوستان کی عارضی حکومت کا قیام عمل میں آیا تو راجہ صاحب اس کے صدر، برکت اللہ وزیر اعظم اور مولانا سندھی وزیر داخلہ مقرر ہوئے تھے۔ مشن کا مقصد افغانستان سے ہندوستان پر حملہ کرانا تھا۔ تاکہ انگریزی فوجوں کو یوروپین محاذوں کے بجائے ہندوستان کے محاذ پر مصروف رکھا جائے اور جرمن اور ترک فوجوں کو روس کے برخلاف زیادہ جنگ کرنے کا موقع مل سکے۔ اور افغانستان کے حملے سے برٹش ہندوستان کو آزاد کرایا جا سکے۔
اس متوقع جنگ کے خطرے سے جنوب مغربی ہند کے تاجروں اور کاروبار کرنے والوں میں جو بیشتر ملک کے غیر مسلم تھے، سراسیمگی پھیل گئی تھی۔ انگریزوں نے جنگ کا خطرہ دکھا کر ہندو مسلم منافرت پیدا کرنے کی کوشش کی اور اس کے لئے بعض ہندوؤں کو استعمال کیا تھا۔ اس رپورٹ میں اس کی طرف اشارہ ہے۔

اس لیے مولانا نے صوبۂ بہار کے مقام رانچی جانے کا فیصلہ کیا ہے۔ مولانا کا خیال ہے کہ رانچی کلکتہ سے قریب ہے اور وہ وہیں رہ کر تصنیف وطباعت کا کام جاری رکھ سکیں گے۔ (ترجمان القرآن (جلد اول)، ص ۱۹

۲۸ / مارچ ۱۹۱۶ء: ۲۸ / مارچ کو گورنمنٹ بنگال کا حکم زیر دفعہ ڈیفنس ایکٹ پہنچا کہ میں (ابو الکلام) چار دن کے اندر کلکتہ کا قیام ترک کر دوں اور حدود بنگال سے باہر چلا جاؤں۔ بعد کو یہ مدت ایک ہفتہ تک بڑھادی گئی۔ اس سے پہلے دہلی، پنجاب اور متحدہ (یوپی) اپنے اپنے صوبوں میں آنے سے روک چکی ہیں۔ (البلاغ۔ کلکتہ، ۱۷، ۲۴، ۳۱ / مارچ ۱۹۱۶، ص ۱)
حکومت مدراس نے بھی اپنے صوبے میں مولانا کی داخلے پر پابندی لگادی تھی

۵ / اپریل ۱۹۱۶ء: مولانا ابوالکلام آزاد رانچی پہنچے اور ڈاک بنگلے میں قیام فرمایا۔
۲۱ / اپریل کو ڈاک بنگلے سے مولانا آزاد مولوی عبدالکریم کے مکان واقع مورآبادی میں منتقل ہوگئے۔ (مولانا آزاد کا قیام رانچی: مرتبہ جمشید قمر، ۱۹۸۴ء، رانچی ص ۷۴)

۱۵ / اپریل ۱۹۱۶ء: بمبئی کی صوبائی حکومت نے اپنے حدود میں مولانا آزاد کے داخلے پر پابندی کا حکم جاری کر دیا ہے۔ مولانا آزاد کا قیام رانچی: مرتبہ جمشید قمر، ص ۷۵۔

انور پاشا اور جمال پاشا کی مدینۂ منورہ میں آمد:

اوائل اپریل ۱۹۱۶ء: انھی دنوں میں یکبارگی خبر آئی کہ وزیر جنگ جناب دولتلو انور پاشا اور جناب دولتلو جمال پاشا مع دیگر جرنیلوں وغیرہ کے مدینۂ منورہ تشریف لا رہے ہیں۔ حکومت کے جملہ ارکان انتظام اور استقبال کی طرف متوجہ ہوگئے یہ موقع نہایت مناسب معلوم ہوا کہ اس وقت میں پولیس کی شرارتیں کھولی جائیں جس سے فقط اپنا تحفظ مقصود تھا، کسی دوسرے کو ضرر پہنچانا مطلوب نہ تھا، جو جماعت انور پاشا کے ساتھ آئی تھی اس میں دمشق کے نقیب الاشراف بھی تھے جو کہ وہاں کے سادات کے رئیس اور ٹرکی حکومت کے بہت بڑے معتمد تھے اور چوں کہ پہلے بھی یہ ماہ ربیع الاول میں بمعیت علمائے شام مدینۂ منورہ میں آچکے تھے اور بواسطہ آفندی اسعد خالدی ان سے ملاقات دونوں حضرات کی ہوچکی تھی اور ان کو دونوں حضرات سے بہت زیادہ خوش عقیدگی اور محبت پیدا ہوگئی تھی ان کو اس وقت میں پولیس کی بعض شرارتوں کی بھی اطلاع مل چکی تھی۔ اس لیے انھوں نے اس سفر میں جناب جرنیل جمال پاشا سے مولانا کے تعارف کی کوشش کی ادھر مفتی احناف جناب ماموں آفندی بری شیخ علمائے مدینۂ منورہ نے بھی اس طرف خاص توجہ دی۔

چوں کہ امور جنگ کا انتظام سب انور پاشا کے ہاتھ میں تھا اور نیز محاذ جنوبی اور غربی یعنی میدان سویز، سینا، حجاز، یہ جمال پاشا کے متعلق اور ان کی کمانداری میں تھا اس لیے جمال پاشا تو فقط اپنے محاذ پر مقیم تھے اور بضرورت دوسری جانب کو بھی کبھی جاتے تھے مگر پھر وہیں لوٹ آتے اور فوجی کمانداری کرتے، مگر انور پاشا مرکز کی محافظت کرتے ہوئے ہر میدان میں جو کہ تقریباً گیارہ یا بارہ تھے۔ جب وہ سوریا (شام) میں آئے اور سویز وغیرہ کے میدانوں کے دیکھنے سے فارغ ہوئے تو قصد کیا کہ بادشاہ دو جہاں وسیلۂ دنیا و آخرت حضرت رسول اعظم ﷺ کی زیارت سے مشرف ہو جائیں اس لیے بمعیت، جماعت عظیم روانہ ہوئے ایک خاص اسپیشل میں روانگی کی خبر آئی۔

شان جلوس:

اور اگلے دن بروز جمعہ تقریباً دس بجے دن کے اسپیشل مدینۂ منورہ پہنچی چوں کہ یہ ایک پہلا موقع تھا کہ ایسے دو بڑے بڑے وزیر مع بہت سے جرنیلوں اور افسروں کے آئے ہوں، اس لیے بہت بڑا، ہجوم اسٹیشن پر تھا اور ہر طائفہ نہایت انتظام سے استقبال اور سلامی کے لیے وہاں موجود تھا، حکومت کا جو کچھ انتظام تھا وہ تھا ہی مگر اہل شہر نے جو جو انتظامات اپنی عقیدت و اخلاص و محبت کے لیے کیے تھے وہ بھی نہایت دلچسپ تھے جس وقت گاڑی اسٹیشن پر پہنچی تو حدود اسٹیشن اندر اور باہر لوگوں سے بھرا ہوا تھا، ہر ایک کی آنکھیں انور پاشا کے دیکھنے کو اٹھیں مگر ایسے ہجوم میں دیکھنا کوئی آسان بات نہ تھی، انور پاشا نے مدینۂ منورہ کا سفر کرتے وقت اپنے افسری کے کپڑے اور نشانات وغیرہ فقط اس خیال سے کہ بادشاہ دو جہاں کی بارگاہ میں حاضری ہے غلام بن کر جانا چاہیے، اتار دیے تھے نہایت سادہ اور اس لباس میں تھے جس میں ایک معمولی سپاہی رہتا ہے البتہ جمال پاشا کے لباس پر بعض نشانات و علامات افسری نمایاں تھے ٹرین سے جس وقت دونوں وزیر معہ ہمراہیوں کے اترے تو اسٹیشن کے بڑے ہال میں میونسپلٹی (بلدیہ) کی طرف سے چائے کی دعوت پیش کی گئی اور ایڈریس بھی اہل شہر کی طرف سے پیش کیا گیا جس پر اظہار شکریہ و مسرت طرف ثانی سے عمل میں آیا، چوں کہ جمعہ کا دن تھا اس لیے مسجد نبوی میں پہنچنے کی تعجیل کی گئی، اسٹیشن کے دروازے پر فتن وغیرہ سواریاں موجود تھیں، گورنر مدینۂ منورہ اور دیگر حکام نے سواری کرنے کے لیے آرزو ظاہر کی مگر انور پاشا نے انکار کر دیا اور کہا کہ ہم پیدل بارگاہ نبوت تک غلامانہ طریق سے چلیں گے

ترتیب جلوس:

اہل شہر نے عجب طرح جلوس نکالا جو کہ قابل دید تھا، جتنے اہل تصوف کے مختلف حلقے مدینۂ

منورہ میں تھے، سب کے سب علاوہ مع اپنے مریدوں کے زرین جھنڈوں کے آگے آگے ذکر کرتے ہوئے اشعار مدحیہ اور دعائیہ پڑھتے ہوئے جاتے تھے جن کی بڑی بڑی جماعتیں تقریباً آٹھ دس ہوں گی اس کے بعد حرم محترم نبوی کے مختلف خدام کی جماعتیں تھیں، موذنوں کی جماعت جو کہ تقریباً ڈیڑھ سو یا زیادہ آدمی تھے، علاوہ تھی، حرم کے جاروب کشوں کی علاحدہ، اماموں کی علاحدہ، خطیبوں کی علاوہ، حجرۂ مطہرۂ نبویہ کے خاص خدام خواجہ سراؤں کی علاوہ یہ سب کے سب درجہ بدرجہ یکے بعد دیگرے حمد و صلوٰۃ، دعا و ثنا پڑھتے ہوئے اپنے رسمی لباس پہنے ہوئے چل رہے تھے۔ ان کے بعد دونوں وزیر برابر چل رہے تھے ان کے پیچھے ان کے رفقا اور دیگر حکام تھے ان کے بعد اہل شہر، دائیں اور بائیں ترکی فوجیوں کی زنجیریں (قطاریں) تھیں جو کہ تمام ہتھیار اور سامان سے مکمل تھے اور دونوں طرف قطار باندھے ہوئے خراماں خراماں چل رہے تھے اور ان دونوں قطاروں کے باہر دائیں اور بائیں اور پیچھے اور مکانوں پر خلقت کا ہجوم تھا۔ جمال پاشا اور دیگر جرنیلوں وغیرہ کی نظریں کبھی کبھی دائیں بائیں بھی پڑ جاتی تھیں مگر انور پاشا کی آنکھ زمین سے لگی ہوئی تھی نہایت ادب اور احترام سے جا رہے تھے، جیسے کہ ایک شہنشاہ والا تبار کے سامنے کھڑے ہوں۔ اسی طرح یہ مجمع باب السلام تک پہنچا۔ باب السلام سے جب دست بستہ حرم نبوی میں داخل ہوئے ہیں اور مزور نے دعاے دخول پڑھانی شروع کی ہے تو انور پاشا کی آنکھیں آنسوؤں کی لڑیں بہا رہی تھیں، اسی طرح گریہ کناں بادشاہ دوجہاں کے سامنے دونوں وزیر ایستادہ ہوئے اور حسب اوامرِ شریعت بہ تلقین جناب شیخ الحرم حضرت سعید پاشا صلوٰۃ و سلام کی رسم کو پورا کیا۔"

خلفاے ترک کی خدمت گزاریِ حرمین:

بادشاہان روم اور خلفاے ترک نے جب سے کہ حرمین کا انتظام ہاتھ میں لیا ہے، ہمیشہ دونوں حرم محترم کا اپنے آپ کو خادم سمجھتے رہے ہیں، اسی لفظ کو اپنے لیے باعث نجات تصور کرتے ہوئے خطبہ میں بھی داخل کیا گیا یہی نہیں کہ فقط زبانی جمع خرچ تھا، دو روز کے بعد جاتا رہا یا عمل میں نہ لایا گیا بلکہ آخر دم تک یہ عمل جاری رہا اسی بنا پر ہزاروں پونڈ ماہوار خالص خزینہ اور اوقاف سے دونوں مقدس مقاموں میں صرف ہوتا تھا، یہاں کے باشندے گورنمنٹ ترکی کو کسی قسم کا خراج یا عشر یا مال گزاری نہیں دیتے تھے البتہ کچھ فی اونٹ شتربانوں سے لیا جاتا تھا او کچھ بندروں میں کسٹم تاجروں سے لیا جاتا تھا جو کہ فیصدی دس تک تا اخیر میں کچھ زیادتی بھی ہو گئی تھی، مکانوں یا باغوں یا مزارع وغیرہ پر دونوں مقدس مقامات میں کچھ نہ تھا بلکہ الٹے ہزاروں باشندے مختلف

عنوانوں سے تنخواہ اور وظائف پاتے تھے جن سے مقصد اصلی اہل حرمین شریفین کی پرورش تھی، مجھ کو صحیح طریقے سے معلوم ہوا ہے کہ قبل از جنگ حرمین شریفین کا خرچ گورنمنٹ ترکی پر تیس ہزار پونڈ ماہوار پڑتا تھا، فقط حرم محترم مدینۂ کے ائمہ دو سو سے زائد تھے، موذنوں کی تعداد سو سے زیادہ تھی، جھاڑو دینے والے ساٹھ سے زیادہ تھے خطبہ پڑھنے والے چھپن سے زیادہ تھے، خواجہ سرا یعنی آغاوات خادمین روضۂ مطہرہ ساٹھ ستر آدمی تھے جن کی کم سے کم تنخواہ دو پونڈ ماہوار اور زیادہ سے زیادہ تیس پونڈ ماہوار تھی، یہ مقدار خاص طور سے مقرر تھی اس کے علاوہ اور بھی طریقے ان کو عطا کرنے کے بہت سے تھے۔ خلاصہ کلام یہ کہ اکثر اہل مدینۂ خصوصاً اور بعض اہل مکہ عموماً (دولت علیہ) گورنمنٹ کی پرورش سے جیتے تھے۔

شاہان روم نے روزانہ خدمت روضہ اقدس کے لیے اور علی ہذا القیاس خدمت بیت اللہ کے لیے ایک ایک خاص شخص مقرر کر رکھا تھا جس کے ہاتھ میں ہر دو حرم کے کاروبار کا انتظام تو تھا ہی مگر اصلی وظیفہ یہ تھا کہ ہر روز خدمت جاروب کشی اور روشنی قندیل خادمانہ لباس پہن کر سلطان کی طرف سے اولاً یہ ادا کریں یہ شیخ الحرم استنبول کے بڑے خاندان کا اور بڑے رتبہ کا آدمی ہوتا تھا اس کی تنخواہ بھی بہت زیادہ ہوتی تھی، صبح کی نماز کے بعد اس پر لازم تھا کہ حجرۂ شریف یعنی روضۂ مطہرہ کی جاروب کشی کے لیے ان کا معینہ لباس زیب بدن کرتا اور حجرۂ شریفہ میں داخل ہو کر سلطان اور اپنی طرف سے صلوٰۃ وسلام عرض کر کے دعا کرتا اور پھر جاروب کشی کرتا اور اسی طرح شام کے وقت مغرب سے کچھ پہلے داخل ہوتا اور چند قندیلیں خدام کے ساتھ روشن کرتا اور یہ سب فعل اس کا سلطان کی قائم مقامی میں شمار ہوتا تھا، اس زمانے میں شیخ الحرم سعید آفندی تھے جو کہ باعلم، نہایت سمجھدار اور پرہیزگار شخص تھے، مولانا سے بھی ان کو خاص تعلق تھا۔ تصوف کی طرف ان کی طبیعت بہت مائل تھی۔ انور پاشا زیارت کرنے کے بعد روضۂ شریف میں جا بیٹھے۔......

کچھ عرصے کے بعد جمعہ کی اذان ہوئی۔ خطبہ اور نماز کو حسب معمول ادا کیا گیا۔ پھر دونوں وزیر مع ہمراہیوں کے جائے استراحت پر تشریف لے گئے، بیرون باب المجیدی سید مدنی (دارالسرور) ان کے قیام کے لیے تیار کیا گیا تھا، میونسپلٹی کی طرف سے ہر قسم کا انتظام خورد و نوش وغیرہ کا تھا الغرض وہاں جا کر بعد از جمعہ کھانا کھایا اور استراحت فرمائی، عصر کے وقت نماز کے لیے حاضر ہوئے اور باجماعت نماز ادا کی۔ شام کے وقت حجرۂ مطہرہ میں خادمانہ لباس پہن کر قندیل روشن کرنے کے لیے بھی داخل ہوئے پھر نماز مغرب کی باجماعت ادا کر کے قیام گاہ پر تشریف لے

گئے۔ چوں کہ پولیس کو ہمارے دونوں حضرات کی طرف سے بدظنی تھی جس کا پہلے ذکر ہو چکا ہے اس لیے جناب نقیب الاشراف صاحب موصوف نے چاہا کہ اگر ایسے میں حضرت مولانا سے جمال پاشا سے ملاقات ہو جاتی تو میں ایک اچھا موقعہ پولیس کے خطرہ کے دفع کرنے کا پاتا۔ چناں چہ انھوں نے کہا کہ قیام گاہ پر بعداز مغرب دونوں حضرات تشریف لائیں میں ملاقات کراؤں گا، مگر بدقسمتی سے جب ہم سب پہنچے تو وہ ہوٹل میں داخل ہو چکے تھے اور چوں کہ ہوٹل کے دروازہ پر نہایت سخت پہرہ تھا اس لیے ہم کو داخل ہونا ممکن نہ ہوا اور نہ کسی سے ملاقات ہو سکی۔"

حکام مدینہ منورہ نے سخت پہرہ اس لیے بٹھا رکھا تھا کہ لوگ مخالف اخبار ان دونوں وزرا تک نہ پہنچائیں جس کی وجہ سے ان کی پوزیشن میں نقصان واقع ہوگا علی ہذا القیاس اہل حاجت کے ہجوم کا بھی زیادہ خیال تھا۔

مفتی مدینۂ منورہ شیخ العلماء یعنی مفتی مامون بری حضرت شیخ المشائخ شاہ عبدالغنی صاحب دہلوی مرحوم و مغفور کے شاگرد تھے ان کو ہمارے اکابر سے خاص تعلق تھا وہ بھی اس کوشش میں تھے کہ کسی طرح ان حضرات کی عزت پر کوئی دھبہ نہ آئے اور کسی قسم کی تکلیف ان بزرگوں کو پیش نہ آوے اگر زمانہ جنگ کا نہ ہوتا تو اس قدر فکر نہ تھا مگر زمانہ جنگ کی وجہ سے حکم فوجی تھا اہل سیاست کا زور نہایت کمزوری پر تھا اس لیے زیادہ فکر تھی۔

مسجد نبوی میں جلسہ:

شب کو انور پاشا نے ان کے پاس حکم بھیجا کہ میں چاہتا ہوں کہ صبح کو اشراق کے بعد علمائے شہر کا مسجد شریف میں اجتماع ہو اور سب اپنی اپنی تقریریں سنائیں چوں کہ میرے پاس اتنا وقت نہیں ہے کہ ہر ایک کے حلقۂ درس میں جا کر تقریریں سنوں، اس لیے اس ایک مجلس میں مشرف ہونا چاہتا ہوں۔ علی الصباح مفتی صاحب نے کاتب الحروف سے کہا کہ بہت زیادہ مناسب ہے کہ دونوں حضرات اس مجلس میں تشریف لادیں تا کہ مجھ کو تعارف کرانے کا موقع ہاتھ آوے اور پھر میں مناسبت پا کر صفائی کرادوں گا، چناں چہ ہر دو حضرات تشریف لائے۔ صف اول میں مفتی صاحب موصوف بیچ میں بیٹھے ان کے بائیں طرف حضرت مولانا مرحوم تھے ان کے بائیں مولانا خلیل احمد صاحب ان کے بائیں کاتب الحروف تھا اور اسی طرح دوسرے علماء تھے۔ مفتی صاحب کے دائیں بھی بہت سے علماء تھے۔ شیخ الحرم صاحب خاص طور سے منتظم تھے۔ انھوں نے ہر دو حضرات سے خواہش کی کہ اگر دونوں وزرا میں سے کوئی صاحب آپ سے تقریر کی خواہش

کریں تو آپ انکار نہ فرمائیں مجمع پورا ہو گیا اور دونوں وزرا تشریف لے آئے تو اولاً انھوں نے مفتی صاحب سے تقریر کی خواہش کی انھوں نے تھوڑی دیر تقریر فرمائی اس کے بعد انور پاشاہ نے مولانا مرحوم سے خواہش کی مگر مولانا مرحوم نے انکار فرمایا۔ پھر انھوں نے مولانا خلیل احمد صاحب سے درخواست کی مگر دونوں حضرات نے یہ عذر پیش کیا کہ ہماری آواز نہایت کمزور ہے ہم تقریر نہیں کر سکتے اس کے بعد کاتب الحروف کی طرف اشارہ ہوا۔ میں نے حسب لیاقت ایک عرصے تک عربی میں تقریر کی اس کے بعد دوسرے علماے نے تقریریں کیں۔ اختتام جلسہ پر مفتی صاحب اور شیخ الحرم نے اسی جلسے میں مولانا مرحوم اور مولانا خلیل احمد صاحب کا تعارف کرایا آپس میں مصافحہ ہوا اور مزاج پرسی کی نوبت آئی اس سے زیادہ نہ وہاں موقع تھا اور نہ وقت تھا مجمع بہت ہی زیادہ تھا ہر دو وزرا اسی وقت اٹھے اور اپنی قیام گاہ پر چلے گئے اور کھانا کھا کر ظہر کی نماز ادا کرتے ہوئے مدینۂ منورہ سے روانہ ہو گئے، مگر اس تعارف کی وجہ سے مفتی صاحب اور دوسرے احباب کو موقع مل گیا کہ انھوں نے کھانا کھاتے وقت یا اور کسی وقت یہ عرض کر دیا کہ پولیس ایسے مقدس اشخاص کی نسبت ایذا رسانی کا قصد رکھتی ہے مدینۂ منورہ اور مکۂ معظمہ چوں کہ مسلمانوں کا مرکز ہے یہاں پر ہر ملک کے لوگ مذہبی حیثیت سے آتے رہتے ہیں ان پر یہ شبہ کرنا کسی طرح مناسب نہیں، چناں چہ شام پہنچ کر جمال پاشا نے ایک خاص حکم بھیجا کہ حرمین شریفین میں دول متحاربہ کی رعایا کے ساتھ وہی معاملہ کیا جائے جو ہماری رعایا کے ساتھ کیا جاتا ہے۔ اس حکم کے آنے کے بعد پولیس کی تمام کارروائیاں بے کار ہو گئیں، اور اس کے ہاتھ پیر ٹوٹ گئے۔''

''انور پاشا نے اہل مدینۂ اور خادمین حرم نبوی اور علما وغیرہ کے لیے پانچ ہزار پونڈ دیے جو کہ تقسیم کیے گئے۔ بڑے علما کو پانچ پانچ پونڈ اور دوسروں کو حسب مرتبہ کم یا زیادہ جس کی تقسیم ایک جماعت کے ذریعہ سے تھی جس کے رئیس شیخ الحرم صاحب تھے۔ چناں چہ انھوں نے پانچ پانچ پونڈ دونوں بزرگوں کو اور پانچ پونڈ کاتب الحروف کو بھیجے۔ حضرت مولانا مرحوم اور مولانا خلیل احمد صاحب نے ان کے لینے سے انکار کیا اور ظاہر کیا کہ ہم مستغنی ہیں ہم کو ضرورت نہیں مگر ادھر سے کہا گیا کہ یہ شاہی ہدیہ ہے صدقہ نہیں اس لیے دونوں حضرات نے قبول فرما کر پھر کاتب الحروف کو دے دیے۔ جمال پاشا نے اہل حجاز کی حاجت دیکھ کر بارہ ریلوے گاڑیاں گیہوں سے بھری ہوئی مدینۂ منورہ کے اہالی پر تقسیم کرنے کے لیے بھجوائیں۔ مگر بدقسمتی سے اس کی تقسیم کا کام شریف حسین کے بیٹے کے سپرد کیا گیا جو کہ ان دنوں بڑے وفادار اور خیر خواہ بنے ہوئے تھے، اس لیے اس میں

اہل مدینۂ کو بہت کم فائدہ ہوا۔ خود ان کے لوگوں اور فوج کو زیادہ فائدہ ہوا۔

انور پاشا نے پانچ ہزار گنی مکۂ معظمہ بھی وہاں کے لوگوں کے لیے بھیجیں جن کو شریف صاحب کی تھیلیوں کی نذر ہونے کا شرف عظیم حاصل ہوا۔ اسی طرح انور پاشا جہاں جاتے تھے، وہاں کے ضعفا، فقرا، مساکین پر تقسیم فرماتے تھے۔ حال آں کہ جنگ کا زمانہ تھا، رعایا کو دینا تو درکنار ان سے لوٹ کھسوٹ کر چندے کے نام سے، قرض کے نام سے سیکڑوں طریقے سے ہر جگہ ہندوستان میں وصول کیا جاتا تھا مگر ٹرکی گورنمنٹ فقرا کا پیٹ بھر رہی تھی۔

''اس کے بعد مناسب سمجھا گیا کہ اب مکۂ معظمہ کو جو قافلہ جانے والا ہے، اس کے ساتھ وہاں کا قصد کیا جائے،، ان دنوں مدینۂ منورہ میں خبر پہنچی تھی کہ ایک آگ بوٹ ہندوستان سے مختلف سامان خصوصاً چاول لے کر نکلا ہے اور عنقریب جدہ پہنچنے والا ہے۔ چوں کہ ان چند ماہ میں یعنی صفر سے جمادی الثانی تک کوئی آگ بوٹ غلے کا ہندوستان سے جدہ نہ پہنچا تھا۔ ادھر مصر کے آگ بوٹ بھی وہاں نہ آتے تھے۔ بحر احمر بالکل بند تھا۔ فقط اتحادیوں کے آگ بوٹ اس میں آتے جاتے تھے اس لیے عرب کے بندروں پر جملہ اشیائے تجارت کا آنا بند ہو گیا تھا۔ بادبانی کشتیاں پہلے پہل سفر کرتیں اور افریقہ کے بندروں سے چیزیں خرید کر لاتیں اور عرب کے بندروں پر پہنچاتی تھیں۔ مگر انگریزی جہازوں نے ان کو بھی پکڑنا، مال کا چھین لینا، کشتیوں کا غرق کر دینا، قید کر کے لے جانا وغیرہ مظالم اس قدر برسائے کہ ان کی بھی آمد و رفت بالکل بند ہو گئی۔ اس لیے تمام حجاز میں سخت گرانی پھیل گئی۔ لوگ بھوکوں مرنے لگے مدینۂ منورہ چوں کہ ریل کی بجہ سے شام سے قریب تھا اس۔ لیے گیہوں آٹے وغیرہ کی تو یہاں گرانی نہ ہوئی مگر شکر، چائے، چاول وغیرہ اشیا یہاں بھی سخت گراں ہو گئی تھیں۔

''اس قافلہ میں جانا اس لیے بھی ضروری معلوم ہوا کہ اب رمضان شریف کا زمانہ قریب ہے، مکۂ معظمہ میں رمضان کیا جائے تو بہتر ہوگا علاوہ ازیں مکۂ معظمہ میں پولیس کی اس قدر سختی بھی نہ تھی اور چوں کہ مدینۂ منورہ کا پولیس کمشنر ایک قسم کی پرخاش رکھنے لگا تھا اس لیے اس سے دور ہی رہنا ضروری معلوم ہوا، پھر ہندوستان جانے کے لیے مکۂ معظمہ سے قرب اور انتظام کا آسان ہونا بھی ظاہر تھا۔''

۱۶ یا ۱۷ اپریل ۱۹۱۶ء:

جمادی الثانی ۱۳۳۴ھ کی بارھویں یا تیرھویں کو قافلہ مدینۂ منورہ سے روانہ ہوا۔ اس وقت

حضرت رحمۃ اللہ علیہ کے ساتھ مولوی عزیر گل، وحید احمد، کاتب الحروف حسین احمد اور منشی محمد حسین فیض آبادی تھے نیز جناب مولانا خلیل احمد مع اپنی اہلیہ محترمہ اور حاجی مقبول احمد صاحب بقصد مکۂ معظمہ ساتھ ہی روانہ ہوئے تھے۔ مولوی ہادی حسن صاحب اس سے تقریباً دو ماہ پہلے مع حاجی شاہ بخش ساکن حیدر آباد سندھ روانہ ہو کر جدہ آچکے تھے، مگر اتفاق سے ان کو کوئی آگ بوٹ ہندوستان جانے والا ملا نہ تھا اس لیے دونوں صاحب مکۂ معظمہ ہی میں آگئے تھے بایں خیال کہ جب آگ بوٹ آجائے گا اس وقت روانہ ہوں گے۔ کیوں کہ جدہ کی خبریں مکۂ معظمہ میں برابر پہنچتی رہتی تھیں۔

اواخر جمادی الثانی:

قافلۂ مذکورہ جدہ ہوتا ہوا مکۂ معظمہ آیا اخیر جمادی الثانی میں پہنچا اور قریب باب العمرہ کے ایک مکان کرایے پر لے کر قیام کیا گیا۔ مولانا خلیل احمد مع متعلقین باب ابراہیم کے پاس قاری عبدالحق صاحب کے مکان پر فروکش ہوئے۔ اس زمانے میں مکۂ معظمہ میں گرمی بہت تھی۔ ادھر طائف کا موسم تو بوجہ سردی خوب مناسب تھا ہی وہاں حضرت عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما اور دیگر صحابہ کے مزارات بھی ہیں جن کی زیارت کی غرض سے اکثر لوگ وہاں جایا کرتے ہیں۔ اہل مکۂ عموماً گرمیوں میں مکۂ معظمہ میں نہیں رہ سکتے، طائف ہی میں چلے جاتے ہیں۔ مولانا نے بھی قصد فرمایا کہ طائف چلے جائیں اور کچھ دنوں ٹھہر کر نصف شعبان سے پہلے مکۂ معظمہ واپس چلے آئیں گے۔

۲۳ر مئی ۱۹۱٦ء:

چناں چہ بمعیت سید امین عاصم صاحب آمد و رفت کا شتر کرایہ کر کے ۲۰ر رجب ۱۳۳۴ء کو روانہ ہو کر ۲۳ یا ۲۴ر رجب کو طائف پہنچے شہر پناہ کے باہر ایک باغ میں فروکش ہوئے، جس کا انتظام سید صاحب نے پہلے سے کر رکھا تھا۔ باغ کے بالائی حصۂ مکان میں سید امین عاصم صاحب مع اپنے متعلقین تھے اور نیچے کے ایک حصے میں مولانا رحمۃ اللہ علیہ تھے اس سفر میں مولانا کے ہمراہ فقط تین آدمی تھے۔ مولوی عزیر گل صاحب وحید احمد اور کاتب الحروف حسین احمد۔"

طائف حقیقۃً ایک چھوٹا قصبہ ہے، مگر اس کا اطلاق بہت بڑے حصے پر کیا جاتا ہے جس میں بہت سے قصبات اور دیہات شامل ہیں یہ قطعۂ زمین کا بہت اونچائی پر واقع ہے۔ اونٹوں کے

راستے میں تین دن میں یہاں پہنچتے ہیں کیوں کہ چکر زیادہ ہے اور چڑھائی بآسانی طے ہوتی ہے اور جبل کرہ کے راستہ سے جس میں خچر گدھے گھوڑے چلتے ہیں ۲۴ گھنٹے بلکہ اس سے کم میں آدمی پہنچ جاتا ہے مگر راستہ دشوار گزار ضرور ہے۔ آدھے راستے ہی سے ہوا بالکل متغیر ہو جاتی ہے جب کہ مکہ معظمہ میں سخت گرمی کی وجہ سے شب کو بھی آرام نہ آتا تھا، طائف میں پتلی رضائی کی ضرورت ہوتی ہے وہاں کا موسم گرمیوں میں نہایت عمدہ رہتا ہے۔ جا بجا باغات ہیں، ہر قسم کے میوے پیدا ہوتے ہیں انگور، انجیر، برشومی (ناگ پھل) انار، آڑو، آلوچی وغیرہ وغیرہ جملہ سرد ملکوں کے میوے بکثرت اور عمدہ ہوتے ہیں زراعت اور سبزی ہر قسم کی پیدا ہوتی ہے جا بجا نہریں بھی ہیں۔ کنویں میٹھے بکثرت ہیں، بارش بھی خوب ہوتی ہے۔ حجاز کے لیے طائف ہند کے لیے شملہ کے مانند ہے، ترکی گورنر اکثر گرمیوں کے زمانے میں لطائف میں رہا کرتا تھا اور بڑے درجہ کے حکام اور اہل عرب شریف وغیرہ بھی وہاں ہی چلے جاتے تھے۔

جب ہم مکہ معظمہ میں پہنچے تو عجیب عجیب افواہیں مشہور تھیں عام بدوؤں اور اہل شہر کی زبانی سنا جاتا تھا کہ عنقریب بد عملی ہونے والی ہے۔ شریف حسین انگریزوں سے ملا ہوا ہے اور بغاوت کرنے والا ہے مگر ترکی استقلال میں کوئی فرق نہ تھا۔ ترکی فوج تمام حجاز میں غالباً چار پانچ ہزار ہوگی کیوں کہ اکثر فوج دوسرے مقامات جنگ پر چلی گئی تھی شریف نے باب عالی کو اطمینان دلا رکھا تھا کہ حجاز کا ذمہ دار میں ہوں یہاں زیادہ قوت رکھنے کی ضرورت نہیں جائے ضرورت جنگ پر اپنی قوت پہنچاؤ۔ یہ موجودہ فوج بھی جدہ، مکہ، طائف پر منقسم تھی ہم کو یہ بھی اس وقت کہا گیا کہ جلد طائف جانا اور لوٹ آنا چاہیے مبادا بد عملی ہو جائے۔ مگر ہم کو یقین کامل نہ ہوا، اسی زمانے میں یہ بھی خبر مشہور ہوتی تھی کہ گورنمنٹ برطانیہ کی طرف سے کوئی خط شریف کے نام آیا ہے کہ فلاں تاریخ تک یا تو تم ترکوں کو حجاز سے نکال دو ورنہ ہم شریف علی کو (جو کہ پہلے شریف حجاز تھا اور شریف حسین موجودہ کا بہنوئی ہے اور اس وقت مصر میں مقیم تھا) اس کو حجاز کا شریف بنا کر بھیجیں گے (نہ معلوم یہ خبر کہاں تک صحیح تھی)؟ جدہ میں ہمیشہ جنگی آگ بوٹ آتے اور بندر میں تین تین چار چار اور کبھی کم زیادہ جمع ہو جاتے تھے اور کھڑے رہ کر چلے جاتے تھے نہ وہ کچھ تعرض کرتے تھے یہ ترکی حکومت۔

ہم کو طائف پہنچ کر کچھ طبیعت سیر ہونے کا موقع ہاتھ نہ آیا تھا کہ شتربان آیا اور کہا کہ اگر چلتے ہو تو شتر حاضر ہے ورنہ میں آٹھ دن کے بعد پھر آؤں گا، مطوف صاحب اور ہم لوگوں کی رائے

ہوئی کہ ایک ہفتہ یہاں اور قیام کرلیا جائے اس کے بعد مکۂ معظمہ جانا چاہیے۔ اتفاق وقت سے اس وقت طائف میں میوے بہت کم تھے۔ شہتوت اور خوبانیوں وغیرہ کا ابتدائی موسم تھا البتہ شہد خوب آتا تھا۔ دو چار دن کے بعد مولانا مرحوم نے تقاضا فرمایا کہ مکۂ معظمہ کو چلنا چاہیے مگر شتربان جا چکا تھا۔ ایک دو دن کے بعد پھر زیادہ تقاضا فرمایا۔ ہم نے جب دوسری سواریاں تلاش کیں تو معلوم ہوا کہ راستہ بند ہو گیا ہے۔ ہم اس وقت اس راز کو نہ سمجھ سکے کہ کیوں اس قدر تقاضا کیا جارہا ہے مگر دو ہی تین دن کے بعد معلوم ہو گیا کہ آئندہ آنے والے واقعات نے خلاف عادت مولانا کو تقاضائے سفر پر مجبور کیا ہے، جن کو نظر کشفی سے مولانا نے معلوم کرلیا تھا مگر چوں کہ ضبط اور اخفا کا مادہ بہت زیادہ تھا، ادھر مقام رضا میں قدم راسخ تھا، اس لیے چند مرتبہ ظاہری تقاضا کرنے کے بعد چپ ہو رہے اور پھر معلوم ہوا کہ طائف نہایت سخت خطرہ میں پڑ گیا ہے اس لیے جو لوگ باہر باغوں میں مقیم ہیں ان کو شہر پناہ میں چلے جانا ضروری ہے چناں چہ ہمارے مطوف سید امین عاصم صاحب بھی مع اپنے اہل وعیال شہر میں سید علی حبشی کے مکان پر چلے گئے اور ہمارے لیے بھی وہاں ہی ایک کوٹھڑی لے دی۔ تمام شہر میں اس وقت عجیب ہل چل تھی، ۹ر شعبان بروز شنبہ ہم لوگ شہر میں چلے گئے تھے۔ ترکی افسروں کو بھی یہ بات محسوس ہوگئی انھوں نے شہر کے ارد گرد حسب قواعد مورچے بنائے اور جن جن باغوں اور مکانوں کو مورچہ کے لیے مناسب جانا ان کو خالی کرالیا۔'' (نقش حیات، حصہ دوم)

۵ر جون ۱۹۱۶ء: ۵ر جون ۱۶ء کو شریف مکہ نے بغاوت کا اعلان کر دیا۔ شریف کی بدوی فوجوں سے مدینۂ منورہ اور جدہ، طائف، مکۂ معظمہ پر حملہ کرایا۔ لیکن یہ فوجیں ترکوں پر غالب نہ آسکیں اور نہ ہی ان کو ان شہروں سے تخلیہ کرنے پر آمادہ کرسکیں۔ تو شریف حسین کی اس فرمایش پر کہ با قاعدہ فوج سے جدہ اور مکۂ معظمہ پر حملہ کیا جائے۔ یہ حکم کیا گیا کہ اہل مکہ اور جدہ سے ایک محضر دستخط کرا کر انگریزی بحری ذمہ دار کے پاس بھیجے کہ ہم کو ترکوں سے آزاد کراؤ۔ ہم سخت مجبور ہیں۔ چناں چہ یہ عمل کیا گیا۔ اور اس پر جبریہ طور سے سربرآوردہ اہالی شہر سے دستخط کرائے گئے۔ اور کمانڈر بحری قوت کے پاس محضر بھیجا گیا۔ اس کے پہنچنے کے بعد گولہ باری شروع کر دی گئی۔ چناں چہ کرنل لکھتا ہے ۱۹۱۶ء میں شاہ حجاز کو ہم نے اتحادیوں کا ساتھ دینے پر آمادہ کیا۔ (حسرت موہانی...... ایک سیاسی ڈائری، ص ۷۳)

۱۳ر جون ۱۹۱۶ء: گیارھویں شعبان ۱۳۳۴ھ کی شب کو صبح صادق کے قریب چاروں طرف

سے شریف کی فوجوں نے چڑھائی کی جو کہ زیر کمان داری عبداللہ بیگ کام کر رہی تھیں، صبح صادق کے وقت ہم سب بمعیت حضرت مولانا مرحوم صبح کی نماز کے لیے حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہ کی مسجد میں جا رہے تھے کہ ناگاہ ایک بندوق کی آواز سنائی دی پھر تو چاروں طرف سے بندوقیں چلنے لگیں۔ ترکی فوج جس نے چاروں طرف حسب قواعد جنگ مورچے بنا رکھے تھے پورے طور سے جواب دیتی رہی اگرچہ ترکی فوج کی مقدار تقریباً ایک ہزار مسلح سپاہی کے تھے باقی ماندہ لوگ مسلح نہ تھے مگر چوں کہ منظم جماعت تھی اس نے بدوی فوجوں کو بہت زیادہ اور قوی نقصان پہنچایا، بدویوں کی مقدار بہت زیادہ بتائی جاتی ہے۔ اس سے دو دن پہلے مکہ معظمہ، جدہ، ینبع، مدینہ منورہ میں یہی واقعہ پیش آ چکا تھا، چوں کہ شریف نے انتظام کیا تھا کہ ایک ہی دن میں سب جگہ یہ کام ہو اس جنگ کی وجہ سے جو لوگ طائف میں غلہ اور ترکاری میوہ وغیرہ لاتے تھے ان کا آنا بند ہو گیا اور یہاں سے باہر کا جانا بھی بند ہو گیا ادھر فوجی حکام کو رسد کی فکر ہوئی۔ حسب قواعد جنگ انھوں نے تاجروں سے موجودہ غلہ کی نصف مقدار لینی شروع کی۔ جس نے خوشی سے دے دیا اس کی مقدار میں سے نصف لے لیا اور نصف چھوڑ دیا اور لیے ہوئے نصف کی قیمت اس وقت کے حساب سے لگا کر اس کو رسید دے دی کہ حکومت ترکی بعد از جنگ یہ مقدار تجھ کو ادا کرے گی۔ البتہ جن لوگوں نے چھپایا ان پر شدت کی گئی اور تمام مال تجارت ان کا خورد و نوش اور ضرورت فوجی کی قسم کا لے لیا گیا۔ فقط بہ مقدار ان کے اہل و عیال کی ضرورت کے ان کو دے دیا گیا ادھر تو شہر میں غلہ کی کمی ادھر آمد بالکل بند۔ غرض کہ اس وجہ سے شہر میں سخت گرانی ہو گئی، پھر شریف کے لوگوں نے نہر کو بھی اوپر سے بند کر دیا اس وجہ سے پانی کی سخت تکلیف ہوئی۔ اگر قشلہ (فوجی قیام گاہ) کا کنواں نہ ہوتا تو نہایت زیادہ اشکال کا سامنا ہوتا۔ اگرچہ شریف کی فوج کثیر التعداد بھی تھی اور اس کے پاس نئی اور عمدہ انگریزی رائفلیں بھی تھیں اور سامان جنگ نہایت کثرت سے تھا مگر باوجود سعی بسیار ان کو کامیابی نہیں ہوئی جب انھوں نے ہجوم کیا منہ کی کھائی، دن رات برابر گولیاں چلتی رہتی تھیں۔ ترکی فوج ان کے مجمعوں پر توپوں سے گولے بھی برساتی تھی، نصف رمضان تک یہی حالت رہی اس کے بعد وہ مصری فوجیں جو جدہ میں اس کے لے لینے کے بعد اتاری گئی تھیں اور جنھوں نے مکہ معظمہ کے قلعے اور قشلہ کو توپوں کے ذریعہ فتح کیا تھا، طائف میں مع توپوں کے پہنچیں اور طائف کے چاروں طرف سے توپیں سات یا آٹھ نصب کر کے قلعہ اور قشلہ پر گولہ باری کرنے لگیں صبح سے تقریباً بارہ بجے تک یہ عمل ہوتا رہا۔ اس کے بعد توپیں ٹھہر جاتی تھیں۔ ترک بھی ان کا جواب

دیتے تھے یہی حال عید مبارک تک رہا۔ افسوس کہ عید کے دن بھی شریف کے لوگوں نے جنگ کو موقوف نہ کیا۔

چوں کہ رمضان کا مہینہ طائف میں نہایت بدامنی کی حالت میں واقع ہوا تھا۔ اس لیے نہ تو دن کو حسب خواہش لوگوں کو خوراک کا انتظام کرنا ممکن ہوتا تھا نہ مساجد میں تراویح وغیرہ کا انتظام حسب ضرورت ہو رہا تھا۔ مسجد ابن عباسؓ وہاں کی بڑی مسجد ہے، اس میں بھی تراویح الم ترکیف سے ہوتی تھیں اور اس میں بھی بہت کم آدمی آتے تھے باقی لوگ محلہ کی مسجدوں اور اپنے مکانوں میں پڑھتے تھے، کیوں کہ گولیاں ہر وقت اوپر سے گزرتی رہتی تھیں۔ مولانا نے بھی اولاً مسجد ابن عباسؓ میں حسب عادت سابقہ تراویح پڑھنی شروع کی مگر چوں کہ راستہ وہاں کا ایسا تھا جہاں پر گولیاں برابر آتی رہتی تھیں اس لیے اس مسجد میں جاتے وقت خطرہ ضرور رہتا تھا اور پھر ایک شب میں یہ واقعہ پیش آیا کہ نماز مغرب پڑھ کر فارغ ہوئے ہی تھے، ابھی تک نفل وغیرہ پڑھ رہے تھے اندھیرا ہو چکا تھا کہ بدوؤں نے ہجوم کیا۔ مسجد ابن عباس کی چھت اور میناروں پر بھی ایک بڑا دستہ ترکی فوجیوں کا تھا اور مسجد کے قریب جو دروازہ تھا وہاں پر مورچہ بھی تھا۔ غرض کہ طرفین میں خوب تیز گولی اور گولوں کی بارش دیر تک ہوتی رہی۔ خود مسجد میں بھی برابر گولیاں برستی رہیں، جو لوگ مسجد میں باقی تھے وہ ایک کونہ میں جدھر گولیوں کے آنے کا گمان نہ تھا بیٹھ گئے۔ اس روز تراویح بھی نہیں ہوئی۔ فقط چند آدمی بوقت نماز عشاء فرض عشاء ایک طرف پڑھ کر جب کچھ سکون ہوا چلے گئے۔ اس کے بعد احباب اور خصوصاً سید امین عاصم صاحب نے اصرار کیا کہ آپ مسجد ابن عباس میں نماز کے لیے نہ جایا کریں، دروازۂ مکان کے قریب جو مسجد ہے، اس میں ہمیشہ نماز باجماعت پڑھا کریں چناں چہ تمام رمضان اوقات خمسہ کی نماز وہاں پڑھتے تھے اس سال تراویح فقط الم ترکیف سے پڑھی گئی۔ اس کے بعد مولانا رحمۃ اللہ علیہ نوافل میں سحر کے وقت تک مشغول رہتے تھے، مولوی عزیز گل اور کاتب الحروف بھی اسی مسجد میں علاحدہ علاحدہ نفلوں وغیرہ میں وقت گزارتے، چوں کہ گرمیوں کی راتیں تھیں جلد تر سحور کا وقت ہو جاتا تھا پھر آ کر کچھ سحری پکاتے جو کہ میٹھے چاول ہوتے تھے مگر چوں کہ شکر وہاں ملتی نہ تھی اس لیے شہد کو بجائے شکر چاول اور چائے میں استعمال کرتے تھے اور اکثر تو نمکین چاول بغیر گوشت پکایا جاتا تھا، اس وقت طائف میں چاول وغیرہ دستیاب ہونا مشکل ہوتا تھا، ایک آنہ والی روٹی آٹھ آنے کو بمشکل ملتی تھی مگر دہلی کے تاجروں میں سے حاجی ہارون مرحوم نے تھوڑے چاول مولانا مرحوم کے لیے ہدیۃً بلا طلب بھیج دیے تھے جو

کہ عمدہ قسم کے تھے انھوں نے بہت کام دیا، اس مدت میں جو کہ تقریباً دو ماہ تھی ہم نے دس بارہ اشرفی طائف میں بوجہ گرانی کھا ڈالی۔

طائف سے روانگی:

عید کے بعد تمام اہل شہر چوں کہ بھوک سے مرنے لگے تھے، حکام کے پاس جاکر شکایت کی کہ اب ہمارے پاس کھانے کے لیے کچھ نہ رہ گیا ہے، ہمارے پاس جتنے حیوانات دودھ یا سواری کے تھے کھا ڈالے، غلہ سب ختم ہوگیا، اب ہمارے لیے کوئی صورت کیجیے، ہم سب مرے جاتے ہیں! انھوں نے کہا کہ اچھا صبح کے آٹھ بجے سے بارہ بجے تک باب ابن عباس سے روانگی کے لیے ہم تم کو اجازت دے دیں گے ہم اپنی حد میں تم کو کوئی نقصان نہیں پہنچائیں گے باقی شریف کے آدمی تم کو نقصان پہنچائیں تو اس کے ہم ذمہ دار نہیں۔

الحاصل اس طرح لوگوں کو ایک فارم مع ان کے اہل وعیال کے نام کے دیا جاتا تھا کہ وہ کہیں آکر ترکی حکومت سے جنگ نہ کریں گے پھر ان کو مع ان کے ضروری اسباب کے باہر نکلنے دیا جاتا تھا، جب اس طرح سے لوگ نکلنے لگے تو پھر ہم سبھوں کو بھی ضروری معلوم ہوا کہ نکل چلیں۔

(سفرنامۂ شیخ الہند، ص ۳۰۔۲۸)

۸ر جولائی ۱۹۱۶ء: حکومت ہند نے مولانا آزاد کی نظر بندی کے احکام جاری کر دیے پہلے مولانا کا ارادہ تھا کہ وہ رانچی میں رہ کر البلاغ (کلکتہ) کو جاری رکھیں گے، لیکن بقول مولانا:

''نظر بندی کے بعد کوئی موقع باقی نہیں رہا کہ باہر کی دنیا سے کسی طرح کا علاقہ رکھ سکوں۔'' (ترجمان القران (جلد اول): ۱۹۶۴ء، دہلی، ص ۱۹)

۱۰ر جولائی ۱۹۱۶ء: کو مولانا عبید اللہ سندھی نے شیخ عبدالرحیم سندھی کو جو خطوط و معلومات حضرت شیخ الہند مولانا محمود حسن کو حجاز بھجوانے کے لیے سندھ بھیجے تھے اور جو شیخ صاحب تک پہنچنے سے پہلے ہی خان بہادر رب نواز (ملتان) کے ذریعے انگریزی حکومت تک پہنچ گئے تھے۔ ان خطوط میں جنود ربانیہ نجات دہندہ فوج کے عہدے داروں کی ایک فہرست بھی تھی۔ اس فہرست میں مولانا سید حسین احمد مدنی کو نائب سالار یا لیفٹننٹ جنرل بنایا گیا ہے۔

۲۔ ریشمی رومال سازش کیس کا جو استغاثہ ملک معظم شہنشاہ ہند بنام عبید اللہ اور ان کے انسٹھ (۵۹) ساتھیوں یا سازشیوں کے نام گورنمنٹ نے تیار کیا اس میں مولانا مدنی کا اسم گرامی اکتیسویں نمبر پر بہ ایں الفاظ آیا ہے:

’’حسین احمد مدنی پسر مولوی حبیب اللہ آف فیض آباد، مدینۂ (ہندوستان سے باہر نظر بند ہے۔)‘‘

یہ استغاثہ یکم جنوری ۱۹۱۳ء اور یکم جنوری ۱۹۱۷ء کے مابین پیش آنے والے واقعات کی روشنی میں مرتب کیا گیا تھا۔ حضرت مدنی اس وقت حجاز میں تھے اور ۲۰ ر دسمبر ۱۹۱۶ء کو گرفتار کر کے مالٹا بھیجے جا چکے تھے۔

۳۔ استغاثے کے پیراگراف نمبر ۴۳ میں ہے کہ ’’مکہ‘‘ سے مولانا (محمود حسن) مدینۂ گئے۔......
مدینۂ میں انھوں نے مولوی حسین احمد مدنی کے ساتھ قیام کیا۔

۴۔ استغاثے کے پیراگراف نمبر ۷۶ میں مولانا مدنی کا پھر ذکر آیا ہے کہ ’’انھیں مولانا (محمود حسن) اور ان کی پارٹی کے ارکان کو جن میں مولانا مدنی بھی شامل ہیں، گرفتار کر لیا گیا ہے، اس بنا پر کہ وہ شریف مکہ کی حکومت کے خلاف سازش کر رہے تھے۔‘‘

۵۔ استغاثے کے مرتبین نے ملزمان کے حالات میں ایک ڈائریکٹری تیار کر دی تھی۔ اس میں مولانا مدنی کے بارے میں کہا گیا ہے:

’’واقعات مابعد جدہ بیان کرتے ہوئے حضرت مولانا کو عبید اللہ نے جو خط لکھا ہے اس میں یہ نام آیا ہے۔ یہ حسین احمد مدنی ہے۔ جنود ربانیہ کی فہرست میں لیفٹننٹ جرنل ہے۔ یہ خاندان اصل میں فیض آباد یو پی کا ہے۔ ۱۸۹۹ء میں حجاز کو ہجرت کر گیا تھا۔ مولوی حسین احمد مدنی مدینۂ کے مفتی تھے۔ ہندوستان سے جانے سے پہلے وہ دیو بند میں مدرس تھے۔ مولانا محمود حسن کا پکا مرید اور جہاد کا زبردست مبلغ ہے۔ دو سال ہوئے اپنے بھتیجے وحید کے ساتھ جو اس کے مرحوم بھائی مولوی صدیق کا لڑکا ہے، ہندوستان آیا تھا اور دیو بند میں مولانا محمود حسن کے مکان پر چند ماہ قیام کرنے کے بعد، وحید کو مدرسے میں طالب علم کی حیثیت سے چھوڑ کر عرب کو واپس ہو گیا تھا۔ مدینۂ میں مولانا محمود حسن اس کے مکان پر ٹھہرے تھے۔ شریف مکہ کے حکم سے ۲۰ ر دسمبر ۱۹۱۶ء کو یا اس کے لگ بھگ اسے مکہ میں گرفتار کر لیا گیا تھا اور جدہ بھیج دیا گیا تھا۔ جہاں سے اسے ۱۲ ر جنوری ۱۹۱۷ء کو مصر روانہ کر دیا گیا تھا۔‘‘

(تحریک شیخ الہند: مرتبہ مولانا سید محمد میاں)

۶ ر اگست ۱۹۱۶ء: چناں چہ ۶ ر شوال ۱۳۳۴ء کو بوقت صبح ہم بھی باب عباسؓ سے نکلے اور وہاں

سے چل کر پھرتے ہوئے (قیم) میں پہنچے یہ وہ مقام ہے جہاں پر شریف کا بیٹا عبداللہ بیگ جو کہ کمانداربدوؤں کا تھا مقیم تھا، اور تمام فوجی حرکات کا یہی مرکز تھا، یہیں مصری فوج کے خیمے بھی تھے چوں کہ ہمارے پاس نہ سواری تھی اور نہ نقد وغیرہ اور راستہ دور تھا ادھر حضرت مولانا رحمۃ اللہ علیہ نہایت ضعیف تھے تین دن تک پہاڑی راستہ کو قطع کرنا آسان نہ تھا علاوہ ازیں اسباب بھی تھا اس لیے وہاں جانا ضرور ہوا، عبداللہ بیگ سے ملاقات ہوئی، اعزاز واکرام سے پیش آیا ایک خیمہ کھڑے کرنے کا حکم کیا ایک دنبہ ذبح کر کے دعوت پیش کی (عرب میں عادت ہے کہ معزز مہمان کی دعوت میں دنبہ ذبح کرنا ضروری ہے) اگر ایسا نہ کیا جاوے تو وہ کامل اکرام مہمان کا شمار نہیں ہوتا اور پھر انجیر وغیرہ میوہ جات بھیجے اور ایک اشرفی نذر کی اور کہا کہ شب کو یہاں قیام کرو علی الصباح تم کو روانہ کردیا جائے گا مگر علی الصباح لڑائی پر چلا گیا اس کے لوگوں نے خالی پشت شتر کا انتظام کردیا کرایہ بھی خود دیا اور زادراہ بھی،

۱۰ر اگست ۱۹۱۶ء: اس طرح وہاں سے روانہ ہوکر ہم دسویں شوال کو مکہ معظمہ علی الصباح پہنچے، عمرے کا احرام تھا، افعال عمرہ ادا کرنے کے بعد معلوم ہوا کہ دو تین دن کا عرصہ گزرتا ہے کہ مولانا خلیل احمد صاحب، متعلقین اور مولوی ہادی حسن صاحب اور حاجی شاہ بخش صاحب جدہ تشریف لے گئے ہیں۔ کیوں کہ جدہ میں ہندوستان جانے والا جہاز آنے والا ہے، اس لیے ہندوستان کا قصد ہے۔ یہاں کے احوال دیکھ کر مولانا صاحب گھبرا گئے ہیں اور یہ معلوم نہ تھا کہ طائف سے مولانا مرحوم کب تک آسکیں گے، چوں کہ مولانا مرحوم اور مولانا خلیل احمد میں ہمیشہ سے تعلقات نہایت قوی اور گہرے تھے اس لیے مناسب نہ معلوم ہوا کہ وہ ہندوستان چلے جائیں اور ملاقات نہ ہو نیز جدہ میں اور دوسرے کاروبار بھی تھے ایک یا دو روز مکہ معظمہ میں قیام فرما کر جدہ سب کے سب پہنچے، وہاں حضرت مولانا خلیل احمد صاحب رام پور کی رباط میں اوپر کے طبقہ میں فروکش تھے اسی کے وسطانی طبقے میں، ہم سبھوں نے بھی قیام کیا چوں کہ جہاز کے آنے میں کچھ دیر لگی اس لیے تقریباً پندرہ بیس دن وہاں قیام کرنا پڑا جب جہاز آگیا تو حضرت مولانا خلیل احمد مع اہلیہ و حاجی مقبول احمد و مولوی ہادی حسن و حاجی شاہ بخش سوار ہوگئے ان کو جہاز تک پہنچانے کے لیے حضرت مولانا رحمۃ اللہ علیہ بھی تشریف لے گئے۔

الحاصل اس کے بعد پھر جدہ کے قیام کی کوئی ضرورت نہ تھی بہت جلد مکہ معظمہ واپس چلے آئے، حج کا زمانہ قریب تھا، حجاج کی آمد ہو رہی تھی، کاتب الحروف پر بعض احباب نے زور دیا کہ

علم حدیث وغیرہ کی بعض کتابیں درس کے طور پر حرم شریف میں شروع ہو جانی چاہییں۔ چناں چہ ان کو شروع کرا دیا۔ (نقش حیات، حصہ دوم)

مولانا آزاد کے اخراج کے خلاف میمورنڈم:

۱۸/ اگست ۱۹۱۶ء: کلکتہ سے اخراج کے حکم کی منسوخی کے مطالبے میں بنگال کے مسلمانوں نے لیفٹنٹ گورنر بنگال کو ایک میمورنڈم پیش کیا گیا ہے۔ روز نامہ صداقت کلکتہ نے ۳۰/ اور ۳۱/ اگست کی دو اشاعتوں میں میمورنڈم کی تائید کی ہے۔ (مولانا آزاد کا قیام رانچی از جمشید قمر، صفحہ ۷۶۔۷۷)

اس سلسلے میں مولانا آزاد خود لکھتے ہیں:

"حکم جلا وطنی کی منسوخی کے لیے احباب و مخلصین نے کوئی دقیقہ سعی و تدبیر کا اٹھا نہ رکھا۔ شاید اس قسم کی کوشش کی یہ پہلی مثال ہے کہ ساٹھ ہزار سے زیادہ دستخطوں کے ساتھ میموریل بھیجا گیا۔"

(تذکرہ: مالک رام، نئی دلی، ۱۹۶۸ء، ص ۳۳۵)

ہوم رول لیگ:

یکم ستمبر ۱۹۱۶ء: یکم ستمبر ۱۹۱۶ء سے مسز اینی بسنت (جو ایک انگریز خاتون ہندستان کی حمایت کی دعویدار تھیں) کی قیادت میں ہوم رول لیگ نے اپنا کام شروع کیا۔ اس کا مقصد بھی آئینی ایجی ٹیشن سے ہندوستان کے لیے حکومت خود اختیاری حاصل کرنا تھا۔ اس لیے نہیں کہ میدان جنگ میں ہندوستان نے انگریز کا ساتھ دیا ہے، بلکہ اس لیے کہ یہ اس کا حق ہے اور انصاف کا تقاضہ ہے۔ لیکن مسز بسنت کی تحریک کا منشاء اب معلوم ہوتا ہے کہ آزادی کامل سے محض توجہ ہٹانا تھا۔ وہ ہندو مذہب سے بھی ہمدردی کا دعویٰ کرتی تھیں۔ لیکن جب ہندوستان نے واقعی انگڑائی لی اور منزل آزادی کی جانب قدم اٹھایا تو وہ مخالف ہو گئیں۔ چناں چہ جب مہاتما گاندھی کی تحریک ترک موالات کا زور ہوا اور طلبہ کالجوں سے نکلنے لگے تو الٰہ آباد کے مقام پر طلبہ اور پبلک کے سامنے تقریر کرتے ہوئے مسز بسنٹ نے جو ایک بڑی مقرر تھیں خطابت کی پوری طاقت سے سوال کیا" ہندو مذہب نے کب یہ جائز رکھا ہے کہ بیٹا باپ کی حکم عدولی کرے۔ یا کوئی مثال ہے کہ کسی بیٹے نے باپ کے حکم کے خلاف کیا ہو" میور سنٹرل کالج الٰہ آباد کا ایک لڑکا کھڑا ہوا۔ تقریر انگریزی میں

ہو رہی تھی۔ اس نے بھی انگریزی میں گرج کر کہا ''پرہلاد نے اپنے باپ کے حکم کی خلاف ورزی کی'' مسز بسنٹ مبہوت رہ گئیں اور بیٹھ گئیں:

اس سے پہلے لوکمانیہ تلک یہ نعرہ دے چکے تھے کہ سوراجیہ ہمارا پیدائشی حق ہے اور یہ کہہ چکے تھے کہ سوراجیہ ہم ہر ممکن ذریعے سے حاصل کریں گے۔ اسی زمانے میں تلک کا مقدمہ لندن میں چل رہا تھا جس پر کثیر مصارف ہو رہے تھے۔ مولانا حسرت موہانی تلک کے چیلے اور ان کے بڑے معتقد تھے۔ تلک کے بارے میں حسرت موہانی نے کہا۔

اے تلک اے افتخار جذبۂ حب وطن
حق شناس و حق پسند و حق یقین و حق سخن
سب سے پہلے تو نے کی برداشت اے فرزند قوم
خدمت ملک و وطن میں محنتِ رنج و محن

(تحریک خلافت: قاضی محمد عدیل عباسی، ص ۷۹۔۷۸)

ستمبر ۱۹۱۶ء: اوائل ذی الحجہ میں مولوی مسعود احمد بھانجا و داماد خورد حضرت مولانا مرحوم اور مولوی ولی احمد مدرس مدرسہ حسن پور ضلع مراد آباد اور دیگر حجاج تشریف لائے۔ ان کی زبانی معلوم ہوا کہ گورنمنٹ کی نگاہیں حضرت مولانا پر نہایت سخت پڑ رہی ہیں، گورنمنٹ تک اس قدر افواہیں پہنچائی گئی ہیں کہ مولانا مرحوم کا بہت سخت بدظنی کے ساتھ انتظار کیا جا رہا ہے، ہر آگ بوٹ کی تفتیش بہت زیادہ کی جاتی ہے، آگ بوٹ کے پہنچتے ہی پولیس کمشنر اور متعدد عہدہ دار آگ بوٹ پر آتے ہیں اور مولانا کی نسبت ہر شخص سے پوچھتے اور تحقیق کرتے ہیں۔''

یہ بھی معلوم ہوا کہ جناب مولانا خلیل احمد بھی بجرد پہنچنے کے مع ہمراہیوں کے زیرِ حراست لے لیے گئے اور سیدھے نینی تال بھیج دیے گئے۔ حاجی شاہ بخش اگرچہ ہمراہیوں میں نہ تھے مگر حیدر آباد پہنچ کر وہ بھی زیر حراست لے لیے گئے اس لیے مولانا مرحوم نے یہ قصد ضرور فرمایا کہ جو کچھ ہوا بھی ہندوستان چلنے کا قصد مناسب نہیں، حج کے ادا کرنے کا تو پہلے ہی سے قصد تھا اور یہ ضروری خیال تھا کہ جب ایام حج سر پر آ گئے ہیں ایسی مبارک نعمت چھوڑ کر جانا کسی طرح مناسب نہیں مگر ہاں اگر یہ معلوم ہو جاتا کہ گورنمنٹ کو مولانا مرحوم سے کوئی خاص پرخاش اور بدظنی نہیں ہے تو غالباً حج کرتے ہی مولانا مرحوم ہندوستان کو ضرور روانہ ہو جاتے۔

ایام حج آہستہ آہستہ آ گئے اور تمام امور حج سے بحمد اللہ فراغتِ کاملہ حاصل ہوئی اس زمانے

میں یہ بات بھی خاص طور سے وقوع میں آئی کہ جناب حکیم عبدالرزاق نے بذریعۂ مولوی مسعود احمد صاحب ایک ہزار روپیہ مولانا کے پاس اخراجات حجاز کے لیے روانہ فرمایا کیوں کہ اس مدت میں جو روپیہ مولانا کی پاس تھا وہ تقریباً خرچ ہو چکا تھا اور باقی ماندہ کچھ زیادہ مقدار نہ تھی۔

مگر چوں کہ مولوی مسعود احمد کی روانگی یک بارگی بلا شہرت ہوئی علیٰ ہذا القیاس ان کا بمبئی پہنچنا بھی جہاز کی روانگی کے وقت ہوا جس کا اصلی سبب غالباً یہ تھا کہ حکیم صاحب موصوف کو یہ خیال غالباً اخیر میں ہوا، وہ ان روپوں کو تاجرون کے ذریعے بھی بھیج سکتے تھے، مگر ساتھ ہی شاید اس گمان پر کہ اگر مولوی مسعود احمد جائیں گے تو گھر کے سب لوگوں کے احول بیان کر دیں گے اور مولانا کو اپنے جملہ اقارب کی طرف سے مطمئن کر دیں گے ان کے واسطے سے بھیجنا ضروری سمجھا اور ان سے اس وقت کہا جب کہ جہاز کی روانگی سر پر آ پہنچی تھی بمبئی تار دے کر ٹکٹ وغیرہ کا انتظام کر دیا، غرض کہ ان کی اور آگ بوٹ کی روانگی کے بعد گورنمنٹ کو خبر پہنچی اس لیے گورنمنٹ کو شبہ دلایا گیا کہ اس طرح روانہ ہونا خالی از علت نہیں ہو سکتا، ضرور کوئی چیز ان کے ہمراہ ہے چناں چہ جس وقت آگ بوٹ عدن پہنچا پولیس ان کی تفتیش کے لیے سر پر آ دھمکی مگر وہاں کیا تھا تمام اسباب تفتیش کیا، ہر چیز کو دیکھا کوی مشتبہ چیز ہاتھ نہ آئی آخر کار اپنا سا منہ لے کر چھوڑ دیا مگر اس پر بھی گورنمنٹ کو باور نہ ہوا، ایک شخص سی آئی ڈی کا انسپکٹر مسمیٰ بہاؤالدین جدہ بھیجا گیا جو کہ بعہدۂ ظاہر یہ محافظ حجاج کے عہدے پر تعینات کیا گیا تھا اور غالباً وہ مرحوم کی نقل و حرکت کی تفتیش کی غرض سے وہاں مامور تھا۔ اسی زمانے میں اہل سورت و راندیر سے بعض احباب اور تلامذہ نے بھی مولانا کی خدمت میں ایک ہزار روپیہ ارسال کیا جو کہ بذریعہ تجار تھا۔ حج کرنے کے بعد مولوی مسعود احمد اور عموماً حجاج واپس ہو گئے کیوں کہ مدینۂ منورہ کا راستہ اس سال بند تھا۔ مولوی مسعود صاحب جب جہاز پر سوار ہو گئے تو بہاؤالدین نے ان کی تلاشی آگ بوٹ پر لی مگر کوئی مشتبہ چیز برآمد نہ ہوئی مگر پھر بھی بمبئی پہنچتے ہی زیر حراست کر لیے گئے اور پھر ان کو الٰہ آباد جیل میں پہنچایا گیا اور اس قدر سختی کی گئی کہ بیچارے نے جھوٹی جھوٹی باتیں بنا کر جان چھڑائی''۔ (سفرنامۂ شیخ الہند، ص ۳۲۔۳۱)

اواخر ستمبر یا اوائل اکتوبر ۱۹۱۶ء

ایام حج سے پہلے حکیم نصرت حسین صاحب ساکن کوڑہ جہان آباد ضلع فتح پور ہسوہ مع اپنے پھوپھی زاد بھائی جناب مولوی سید ہاشم صاحب کان پوری عدن اور پورٹ سودان ہوتے ہوئے تشریف لائے تھے۔ حکیم صاحب موصوف نے دیو بند میں علم حدیث وغیرہ پڑھا تھا، یہاں ہی ان کی دستار بندی ہوئی تھی، مولانا مرحوم سے بیعت بھی تھے اور مولانا سے ان کو نہایت زیادہ تعلق تھا طبیعت نہایت زیادہ جوشیلی اور خدا پرست تھی۔ احوال حاضرہ کی کشمکش عالم اسلام کے تسفل اور ہندوستان کی غلامی نے ان کو سخت پیچیدگیوں میں ڈال رکھا تھا، ان دنوں یہ دونوں حضرات مکلا وغیرہ ہوتے ہوئے حج کو تشریف لائے والی مکلا سید ہاشم صاحب سے واقف تھے اور ان کے دادا و مولانا عبدالحق صاحب کان پوری مرحوم کے معتقدین میں سے تھے، انھوں نے ہی انتظام ان دونوں حضرات کے سفر کا کر دیا تھا اور بذریعۂ برٹش حاکم عدن پورٹ سودان تک اور وہاں سے جدہ کا ٹکٹ بھی دلوا دیا تھا، چوں کہ حکیم نصرت حسین صاحب طب یونانی سے واقف تھے اور ان کے ساتھ مجرب دوائیں موجود تھیں، انھوں نے حاکم مکلا کی دوا بھی ایک مدت تک کی تھی اور بظاہر وہ اسی غرض سے مکلا پہنچے تھے پھر انھوں نے قصد حجاز کا کر دیا۔

یہ دونوں حضرات ابتدائے ذی الحجہ یا اواخر ذی قعدہ میں مکۂ معظمہ میں پہنچے تھے۔ عبدالقادر سکندر ان کا مطوف تھا چوں کہ ان دنوں وہ خود موجود نہ تھا، اس کے بیٹے اور نوکر وغیرہ موجود تھے انھوں نے پوری طرح خدمت اور خبر گیری ان دونوں حضرات کی رکھی۔ اس زمانے میں مکۂ معظمہ میں کوئی ترکی ٹوپی کا استعمال کرنے والا سوائے ان دونوں کے نہ تھا اس لیے عام طور پر لوگوں کی نظریں ان دونوں پر پڑتی تھیں۔ حج سے فارغ ہونے کے بعد سید ہاشم صاحب ہندوستان واپس چلے گئے اور حکیم صاحب موصوف وہاں اس بنا پر ٹھہر گئے کہ شاید انھیں چند دنوں میں مدینۂ منورہ کا راستہ کھل جائے تو مدینۂ منورہ کی زیارت سے مشرف ہونا نصیب ہو اور چوں کہ حضرت مولانا رحمۃ اللہ علیہ کا بھی خیال مدینۂ منورہ کے جانے کا ہو چکا تھا اس لیے انھوں نے اسی مکان میں آ جانا اور قیام کرنا مناسب سمجھا، جہاں پر حضرت مولانا مقیم تھے۔ سید ہاشم صاحب کا جہاز جب عدن پہنچا وہاں پر امیر مکلا نے جو روپے ان کے لیے پہلے وعدہ کے طور پر تیار کر رکھے تھے بذریعہ اپنے وکیل کے پیش کیے، کیوں کہ جیسا کہ میں پہل کہہ چکا ہوں!

اولاً تو امیر مذکور ان کے دادا کا معتقد تھا اس کو بھی حیدر آباد سے تعلق ہے اور ان کے دادا

صاحب بھی وہاں کے معتقد علیہ لوگوں میں سے تھے۔

ثانیاً یہ بھی سادات علویہ میں سے ہیں جن کا حضرموت میں قیام اور مرکز ہے اور امیر مذکور ان سادات کا ہمیشہ سے خادم اور معتقد رہا ہے۔

ثالثاً یہ دونوں وہاں اس کے پاس بطور مہمانی گئے تھے اس کے لیے ادائے خدمت و نذرانہ ضرور تھا۔

رابعاً حکیم صاحب سے اس نے مفید اور سریع التاثیر دوائیں پائی تھیں جن کو وہ ہزاروں کے خرچ میں نہیں پا سکتا تھا۔

ان وجوہ سے اس نے ان کے لیے اپنے وکیل کے پاس کچھ نقد جمع کر رکھا تھا، ان کا جہاز جب عدن پہنچا تو یہ بوجہ واقفیت سابقہ اس سے ملے اس نے وہ نقد پیش کیا جب یہ بمبئی پہنچے تو گورنمنٹ نے ان کو زیر حراست لے لیا اور جو کچھ نقد ان کے پاس تھا وہ بھی ضبط کر لیا اور تہمت یہ رکھی کہ تم اس سے مل کر امیر کابل سے سازش کرنا چاہتے ہو۔ بے چارے ایک مدت دراز تک الٰہ آباد اور فتح پور کی جیل میں رہ کر پھر چھوٹے مگر نقد اب تک نہیں ملا۔ (نقش حیات: حصہ دوم)

۴؍ اکتوبر ۱۹۱۶ء: مکتوب الیہ قاضی مظہر حسین (ف ۹؍ شعبان ۱۳۳۵ھ) دیوبند کے رئیس و سربرآوردہ، دارالعلوم کی مجلس شوریٰ کے رکن اور حضرت شیخ الہند کے بہنوئی تھے۔ مولوی محمد مسعود جن کا اس مکتوب گرامی میں ذکر آیا ہے۔ قاضی صاحب مرحوم کے صاحبزادے اور حضرت شیخ الہند کے بھانجے اور داماد تھے۔ انھیں مکہ معظمہ بھیجا گیا تھا تاکہ اہل خاندان کی خیریت اور حضرت کی روانگی کے بعد ہندوستان میں پیش آنے والے واقعات سے مطلع کیا جاسکے۔ نیز حضرت کی خدمت میں کچھ رقم بھیجنی مقصود تھی۔ حضرت مدنی مرحوم نے اسی خط میں قاضی صاحب مرحوم کو ان کے بہ خیریت مکہ پہنچنے اور حج کی سعادت سے مشرف ہونے پر انھیں مبارک دی ہے۔ مولوی مسعود احمد کو ہندوستان لوٹتے ہی گرفتار کر لیا گیا تھا اور ایک ابتلا کے بعد رہائی پائی تھی۔

از مکہ معظمہ شریف

مخدوم و مکرم جناب فیض مآب حضرت منشی صاحب زید مجدہم!

السلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہ۔ مزاج اقدس؟

اجی حضرت مٹھائی کھلائیے! ایسی ویسی مٹھائی کافی نہ ہوگی آپ کے ذمہ بہت سی مٹھائیاں واجب ہیں، مگر آپ اب تک ٹلاتے ہی رہے ہیں، لیجیے صاحبزادہ صاحب دولت و اقبال مولوی

مسعود احمد صاحب بخیر و عافیت ہماری خدمت میں پہنچ گئے۔ اور اس سے بڑھ کر یہ کہ بیت اللہ کی زیارت اور عمرہ سے مشرف و ممتاز ہوئے اور حضرت مولانا دام مجدہم وسیلہ دنیا و آخرت کے قدم بوس ہو کر قریر العین ہوئے۔ حال آں کہ آپ کے بڑے بڑے صاحبزادوں کو یہ نصیب نہیں ہوا، خوش قسمتی کی بات ہے میں امیدوار ہوں کہ نہایت خصوصیت اور ادب سے احقر کا سلام حضرت مولانا حافظ احمد صاحب و مولانا حبیب الرحمٰن صاحب و جناب مفتی صاحب و جناب حکیم صاحب و شاہ صاحب و دیگر اکابر و اساتذہ کو پہنچا دیں، حضرت مولانا دام مجدہم اور مولوی عزیز گل صاحب وحید احمد و منشی محمد حسین صاحب و مولوی ولی احمد صاحب وغیرہ سلام عرض کرتے ہیں گھر میں اور جملہ متعلقین سے سلام عرض کر دیں، مولوی مسعود احمد صاحب باادب دست بستہ سلام عرض کرتے ہیں اور دعوات صالحہ کے خواہاں ہیں اور عرض کرتے ہیں کہ والدہ صاحبہ اور بھائیوں اور بھابھیوں سے سلام کہہ دیں اور بچوں کو دعا و پیار پہنچا دیں، حماسہ مرسلہ حضرت مہتمم صاحب موصول ہوا۔

فقط والسلام

المرسل حسین احمد غفرلہٗ

۶/ ذی الحجہ ۱۳۳۴ھ از مکہ معظمہ

حج کے بعد حضرت شیخ الہندؒ کا مکہ میں قیام اور گرفتاری:

حضرت شیخ الہندؒ نے اس سفر میں پہلا حج ذی الحجہ ۱۳۳۳ھ (اکتوبر ۱۹۱۵ء) میں کیا تھا۔ پھر دوسرا حج طائف سے واپسی پر ذی الحجہ ۱۳۳۴ھ (اکتوبر ۱۹۱۶ء) میں کیا قاضی مسعود احمد صاحب اور دوسرے واقف حضرات کے روانہ ہو جانے کے بعد حضرت کو فکر ہوئی کہ جلد از جلد یہاں سے روانہ ہو کر یاغستان پہنچنے کی کوئی تدبیر ہونی چاہیے۔ حضرت نے بار بار فرمایا کہ مکہ معظمہ میں ہمارا قیام کسی طرح مناسب نہیں۔ کیوں کہ انگریزی حکومت ہم سے بدظن ہی نہیں بلکہ برہم اور مخالف ہے اور شریف حسین انگریزی حکومت کے آلۂ کار ہیں لہٰذا کسی بہتری کی توقع عبث ہے اس لیے جلد از جلد کوئی صورت ہونی چاہیے کہ یہاں سے روانہ ہو جائیں، لیکن اگر تنہا حضرت کی ذات مبارک ہوتی تو معاملہ آسان تھا، یہاں تو صورت یہ تھی کہ حضرت کے ساتھ چند رفقاء تھے جو اپنا سب کچھ قربان کر کے حضرت کے ساتھ ہوئے تھے، وہ حضرت کو کسی حال میں چھوڑنے کے لیے تیار نہیں تھے اور نہ حضرت ان کی جدائی پسند کرتے تھے۔ چوں کہ ترجمہ قرآن شریف کا سلسلہ جاری تھا۔ لہٰذا کتابوں کا بھی ایک ذخیرہ ساتھ رہتا تھا۔ سردی اور گرمی کے کپڑوں کے علاوہ ضعیف العمری اور امراض کی بناء پر دوائیں بھی ساتھ رہتی تھیں۔ اس قسم کی اور ضروریات بھی تھیں۔ ان سب کے

حمل ونقل کے لیے چند سواریاں درکار تھیں اور خاموشی سے دفعۃً روانہ ہو جانا مشکل تھا۔ تاہم جب حضرت کا تقاضہ شدید ہوا تو ایسا انتظام کیا گیا کہ خفیہ طور سے یہاں سے روانگی ہو جائے۔ چناں چہ ہم دو چار روز بعد روانہ ہونے والے تھے کہ تدبیر کے راستہ میں تقدیر حائل ہو گئی جس کی تفصیل یہ ہے؟

محرم ۱۳۳۵ھ کی اخیر تاریخوں میں شیخ الاسلام مکۂ معظمہ عبداللہ سراج کی طرف سے نقیب علماء مکۂ عصر کے بعد آیا اور کہا کہ مجھ کو شیخ الاسلام نے بھیجا ہے اور حضرت شیخ الہندؒ سے اس محضر کی تصدیق طلب کی ہے، مولانا کے اس پر دستخط کرا دو۔ اس کو دیکھا گیا تو عنوان یہ تھا ''من علماء مکۃ المکرمۃ المدرسین بالحرم الشریف المکی'' (مکۂ مکرمہ کی علماء کی جانب سے جو مکۂ کے حرم شریف میں درس دیتے ہیں) اور اس میں تمام ترکوں کی تکفیر اس بناء پر کی گئی تھی کہ انھوں نے سلطان عبدالحمید خان مرحوم کو معزول کیا ہے۔ شریف حسین کی بغاوت کو حق بجانب اور مستحسن قرار دیا گیا تھا اور ترکوں کی خلافت کا انکار تھا۔ وغیرہ وغیرہ حضرت نے اس پر دستخط کرنے سے انکار کر دیا اور کہا کہ چوں کہ یہ محضر ان علمائے مکۂ مکرمہ کی طرف سے ہے جو کہ حرم میں پڑھاتے ہیں اور میں ہندوستان کا باشندہ ہوں اور حرم مکی میں مدرس بھی نہیں ہوں اس لیے مجھ کو کسی طرح اس پر دستخط کرنا درست نہیں ہے۔ وہ واپس چلا گیا۔ حاضرین میں سے بعض احباب نے کہا کہ اس کا نتیجہ خطرناک ہے۔ حضرت نے جواب دیا کہ پھر کیا کیا جائے۔ نہ عنوان اجازت دیتا ہے نہ مضمون! مضمون میں جو باتیں ذکر کی گئی ہیں وہ سراسر خلاف شریعت ہیں۔ اس کے بعد سنا گیا کہ شیخ الاسلام عبداللہ سراج بہت برہم ہوئے۔ خطرہ تھا کہ وہ لوٹ کر آئے گا اور کچھ جواب دے گا۔ دو چار دن کے بعد شریف حسین خود جدہ گیا اور وہاں سے حکم بھیجا کہ فوراً مولانا محمود حسن اور ان کے رفقاء اور سید ہاشم اور حکیم نصرت حسین کو گرفتار کر کے بھیجو۔ اس پر بہت تشویش ہوئی اور مختلف طریقوں سے اس کی منسوخی کا مطالبہ کیا گیا، مگر کچھ نفع نہیں ہو۔

خلاصہ یہ ہے کہ ہم سب گرفتار کر کے جدہ بھیجے گئے ۲۴ر صفر ۱۳۳۵ھ (۳۰ر دسمبر ۱۹۱۶ء) کو بوقت صبح زیر حراست جدہ پہنچے اور تقریباً ایک مہینہ زیر حراست رکھے گئے پھر ۱۸ر ربیع الاول ۱۳۳۵ھ (۱۲ر جنوری ۱۹۱۷ء) کو خدیوی جہاز سے اسی طرح زیرِ حراست سویز بھیجے گئے۔ ۲۲ر ربیع الاول (۱۶ر جنوری ۱۹۱۷ء) کو سویز پہنچے۔ وہاں سے گوروں کی حراست میں جو کہ پندرہ یا سولہ تھے اور بندوق اور سنگینوں سے مسلح تھے ہم کو قاہرہ ریل میں بھیجا گیا اور اسی دن عصر کے بعد ہم کو جیزہ

کے سیاسی جیل (معتقل) میں داخل کر دیا گیا اور اگلے دن سے بیانات لینے کا سلسلہ شروع ہوا۔ بیان لینے والا شخص انگریز تھا۔ اردو نہایت سلیس اور صاف بولتا تھا۔ اس کے پاس بڑی بڑی ضخیم کتابیں اور فائل تھے۔ جن میں سی۔ آئی۔ ڈی کے بیانات اور رپورٹیں مندرج تھیں۔ پہلے ہمارا خیال تھا کہ ہماری گرفتاری فقط شریف کے محضر پر دستخط نہ کرنے اور شریف کی شکایت کی وجہ سے ہوئی ہے، مگر بعد میں بیانات لینے اور سوالات کرنے اور بار بار اس کے ان کتابوں کے دیکھنے اور حوالے دینے سے ظاہر ہوا کہ یہ گرفتاری تحریک آزادی کی ان جملہ کارروائیوں کی بناء پر ہوئی ہے جو کہ یاغستان، کابل، فرنٹیر اور دیوبند وغیرہ میں مدتوں سے ہوتی رہی ہیں اور جن کی مخبری اپنوں اور پرایوں دونوں نے کی ہے۔ بہت سی ایسی باتیں بھی پوچھیں گئیں ہیں جن کے متعلق یقین تھا کہ کسی کو اطلاع نہیں ہے۔ حضرت شیخ الہند ؒ کے متعلق اس کی پاس رجسٹر بہت بڑا تھا۔ بہر حال ہر شخص نے جوابات حسب اقتضائے وقت اپنی سمجھ کے مطابق دیے۔ اگرچہ ہم میں سے سب کے سب ایسے ہی تھے کہ جن کو ایسے امور کا سابقہ اس سے پہلے نہیں پڑا تھا اور بوجہ اس خیال کے کہ یہاں مصر میں ہندوستان کے واقعات اور وہاں کی کارروائیوں کا جاننے والا کوئی نہ ہوگا ہم نے آپس میں کوئی قرارداد بھی طے نہیں کی تھی مگر اظہار اور جوابات سب کے تقریباً ایک ہی جیسے رہے۔ اگرچہ علاحدہ علاحدہ ہوئے۔ جیزہ کی جیل (معتقل) میں تقریباً ایک مہینہ رکھنے اور بیانات لے لینے کے بعد پاسپورٹ مرتب کیا گیا اور ۲۴ ربیع الثانی ۱۳۳۵ھ مطابق ۱۶۔ فروری ۱۹۱۷ء کو ہمیں مالٹا روانہ کر دیا گیا۔ گوروں کی پوری گارد سنگینوں سے مسلح ہماری حراست کرتی تھی۔ اسی روز شام کو مالٹا جانے والے جہاز پر سوار کیے گئے اور ۲۰ ربیع الثانی ۱۳۳۵ھ (۲۱ فروری ۱۹۱۷ء) کو مالٹا پہنچ گئے۔ (نقش حیات: حصہ دوم، ص ۲۳۷-۲۳۵)

۱۹۱۶ء

میرا سیاسیات میں داخل ہونا:

میں اس وقت تک نہ مشن آزادی ہند میں شریک ہوا تھا، نہ حضرت شیخ الہند ؒ کی عملی سرگرمیوں سے واقفیت رکھتا تھا۔ مدینۂ منورہ پہنچنے کے بعد حضرت شیخ الہند رحمۃ اللہ علیہ نے ایک خصوصی مجلس میں مجھ کو اور مولانا خلیل احمد صاحب کو طلب فرما کر اپنے خیالات اور عملی کارروائیوں سے مطلع فرمایا میں اس وقت تک فقط علمی جدوجہد میں مشغول تھا اگرچہ مدینۂ منورہ میں اس سے پہلے جب محاذ

سویز کے لیے متطوعین (والنٹیر وں) کو بھیجنا شروع کیا گیا تھا، ترغیب جہاد پر تقریر کرنے کی نوبت آئی تھی اور اس سے متاثر ہو کر کچھ لوگ اس محاذ پر جہاد کے لیے مدینۂ منورہ سے گئے تھے۔ مگر اس کے علاوہ عملی جد وجہد کی نوبت نہیں آئی تھی۔ اب حضرت شیخ الہند ؒ کے واقعات اور خیالات سن کر میں بھی متاثر ہوا اور حضرت مولانا خلیل احمد صاحب بھی۔ یہ وقت میری سیاسیات کی ابتدا اور بسم اللہ کا وقت ہے، اور یہی وقت مولانا خلیل احمد صاحب کی ابتدائی شرکت کا ہے۔ رحمہ اللہ تعالیٰ وارضاہ آمین! اس کے بعد مولانا خلیل احمد صاحب جب تک حجاز میں رہے۔ بالکل متفق اور ہمنوا رہے۔

تقدیری امور پیش آ کر رہتے ہیں۔ کچھ لوگ حضرت مولانا خلیل احمد صاحب کی ساتھ جہاز میں لاہور کے باشندے رفیق رہے تھے ان میں سے دو نوجوان مدینۂ منورہ میں رہ گئے۔ اور ہندوستان واپس نہیں ہوئے۔ جب تک عام حجاج مدینۂ منورہ میں مقیم رہے، کوئی تفتیش ترکی پولیس نے نہیں کی، مگر قافلہ روانہ ہونے کے بعد تجسس شروع ہوا اور ہر باقی رہنے والے کی دیکھ بھال جاری ہوئی۔ وہ دونوں لاہوری نوجوان پولیس انسپکٹر کی نظر میں مشتبہ ثابت ہوئے۔ پولیس نے ان کو گرفتار کرلیا۔ حضرت مولانا خلیل احمد صاحب سیدھے سادھے بزرگ تھے ان کو ان دونوں کے متعلق حسن ظن تھا۔ مولانا نے ان کی گورنر مدینۂ کے یہاں براءت کی اس لیے پولیس کمشنر نے مولانا خلیل احمد صاحب کو بھی مشتبہ قرار دیا اور گورنر مدینۂ منورہ بصری پاشا کو تو نہ صرف ان دونوں جوانوں کی طرف سے بلکہ مولانا خلیل احمد صاحب کی طرف سے بھی بدظن کرنا شروع کیا۔ ادھر مولانا مرتضیٰ حسن صاحب نے جدہ سے ہر ڈاک میں طویل طویل خطوط پانچ پانچ چھ چھ ورقوں پر بھیجنے شروع کیے۔ وہاں ان کو کوئی کام نہیں تھا۔ حضرت شیخ الہند رحمۃ اللہ علیہ کو بلا دغدغہ مضامین لکھتے تھے۔

(نقش حیات: حصہ دوم، ص ۲۲۱)

اکتوبر ۱۹۱۶ء:

شمس العلماء حافظ محمد احمد نے حضرت شیخ الہند کی جاسوسی کے لیے عبد الاحد کشمیری نامی شخص کو حضرت کے ساتھ جو حجاز بھیجا تھا، وہ ۸/ستمبر ۱۹۱۶ء کو مغل جہاز راں کمپنی کے ایس ایس اکبر نامی جہاز سے واپس آیا۔ اس نے جو اطلاعات حضرت شمس العلماء کو فراہم کیں، انھوں نے ان سے کلکٹر سہارن پور کے ذریعے حکومت کو مطلع کیا۔ کلکٹر سہارن پور نے حکومت ہند کو مراسلے کے ذریعے مطلع کر دیا۔ کلکٹر لکھتا ہے:

۱۔ شمس العلماء محمد احمد نے اطلاع دی ہے کہ

☆ ہیڈ ماسٹر (صدر مدرس مولانا) محمود حسن تا حال عرب سے واپس نہیں آئے ہیں۔

☆ ڈاکٹر انصاری کے بھائی عبدالرزاق کبھی کبھی مطلوب الرحمٰن سے ملنے دیوبند آتے ہیں۔ مطلوب الرحمٰن کنویں کھودنے کے شعبے میں ہیں اور آج کل رخصت پر ہیں۔

☆ یہ شخص (مطلوب الرحمٰن) بھی ہیڈ ماسٹر (صدر مدرس) کے ساتھ عرب گیا تھا اور تقریباً ایک ماہ قبل لوٹ آیا ہے(۱)۔

☆ یہ دونوں (عبدلرزاق اور مطلوب الرحمٰن) بلقان میں جرمنوں کی فتوحات کو بڑا چڑھا کر پیش کر رہے ہیں اور کہتے پھرتے ہیں کہ جنگ کا فیصلہ ہندوستان میں ہوگا۔ ہندوستان میں جو حفاظتی انتظامات کی کمی ہے، اس کا عبدالرزاق مذاق اڑاتا رہتا ہے۔

۲۔ شمس العلماء نے مزید بتلایا کہ

☆ ان کا (شمس العلماء کا) اپنا فرستادہ عبدالاحد کشمیری (جسے انھوں نے مولانا محمود حسن کے حالات کی جاسوسی کے لیے) عرب بھیجا تھا۔ گذشتہ ماہ مطلوب الرحمٰن کے ساتھ ہندوستان لوٹ آیا ہے۔

☆ اس نے (عبدالاحد نے) بتایا ہے کہ ہیڈ ماسٹر (صدر مدرس مولانا محمود حسن) کی

حوالہ:

گورنمنٹ آف انڈیا۔ ہوم ڈیپارٹمنٹ۔ پولیٹکل ڈیپازٹ۔ پروسیڈنگز، جنوری ۱۹۱۶ء۔ نمبر ۴۷، بحوالہ ''انڈین مسلمز ......اے ڈاکومنٹری ریکارڈ''

حاشیہ:

(۱) مولانا مطلوب الرحمٰن عثمانی کے دوسرے بھائی مولانا حبیب الرحمٰن (نائب مہتمم دارالعلوم دیوبند)، مفتی عزیز الرحمٰن عثمانی (مفتی و مدرس دارالعلوم) اور مولانا شبیر احمد عثمانی (مدرس دارالعلوم) تھے آخرالذکر تینوں بھائیوں کا تعلق شمس العلماء پارٹی سے تھا۔ مولانا شبیر احمد عثمانی کے بارے میں سی آئی ڈی کی رپورٹ (ریشمی خطوط سازش کیس کی ڈائریکٹری۔ کون کیا ہے؟) میں ہے کہ شبیر احمد شروع میں (مولانا) عبیداللہ (سندھی) کے ساتھ دوستی رکھتے تھے لیکن بعد میں سخت دشمن ہو گئے اور دیوبند سے ان کے اخراج کے خاص ذمہ دار وہی ہیں۔'' مولانا مطلوب الرحمٰن عثمانی شروع سے حضرت شیخ الہند کی انقلابی جماعت سے تعلق رکھتے تھے، لیکن حج سے واپسی، گرفتاری اور شمس العلماء کی سفارش و ضمانت پر رہائی کے بعد انہوں نے حضرت شیخ الہند کی جماعت سے اپنا تعلق ختم کر لیا تھا۔ اگرچہ شمس العلماء پارٹی میں بھی شامل نہیں ہوئے اور نہ انھوں نے شیخ الہند کی جماعت کے خلاف معاندانہ رویہ اختیار کیا۔ ان بزرگ نے ''عثمانی خاندان'' کی سیاست سے بھی بہت کم تعلق رکھا۔ اپنے بھائیوں میں وہ شاید سب سے شریف تھے او راخلاقی سطح بلند رکھتے تھے۔

ملاقاتیں انور پاشا کے ساتھ جنھیں استنبول کی طرف سے خلیفہ کا نمایندہ مقرر کیا گیا ہے، ایک ہفتہ جاری رہیں۔

☆اس نے یہ بھی بتایا ہے کہ چالیس پچاس ہزار فوجی ترکوں کی سربراہی میں مکہ کے قریب جمع ہوئے اور طائف کے راستے مشرق کی طرف روانہ ہوئے ہیں تاکہ استنبول میں ہماری فوج کے مواصلاتی نظام کو منقطع کر دیں۔ میرے خیال میں طائف پہاڑوں پر واقع شہر ہے جو مکہ سے دو منزل کے فاصلے پر ہے۔

۲۲راکتوبر ۱۹۱۶ء: چارلس کلیولینڈ (ڈائریکٹر محکمہ سراغ رسانی حکومت ہند) کے مشورے کے مطابق حکومت بہار واڑیسہ نے مولانا آزاد کی نظر بندی کا حکم جاری کیا ہے۔

۲۳راکتوبر کی صبح کو پولیس کی ایک جماعت مورآبادی میں مولانا آزاد کی قیام گاہ پر پہنچی اور نظر بندی کے حکم کی تعمیل کی۔ نظری بندی کے حکم کے ساتھ تیرہ شرطیں بھی ہیں۔ مکان کی تلاشی بھی لی گئی تھی اور کچھ کاغذات اور کتابیں پولیس نے اپنے قبضے میں کر لی تھیں۔

۲۴راکتوبر کو پھر تلاشی لی گئی اور مزید کاغذات اور کتابیں پولیس اپنے ساتھ لے گئی۔

قول فیصل (۲۲۔۱۹۲۱ء کی قید کے زمانے میں عدالتی بیان) میں رانچی میں نظر بندی کے احکام کے اجرا کا مہینہ مولانا آزاد نے اکتوبر ہی لکھا ہے۔ (مولانا آزاد کا قیام رانچی: جمشید قمر، ص ۷۷و۱۰۲)

۱۷، ۱۸رنومبر ۱۹۱۶ء: مسلم لیگ اور کانگریس میں ایک معاہدہ طے پایا ہے۔ جسے مسلم لیگ کے صدر مسٹر محمد علی جناح کا کارنامہ قرار دیا جاتا ہے۔ اس کی سب سے بڑی خوبی یہ ہے کہ اب مسلمان اکثریت کے صوبوں میں بھی اکثریت میں نہیں رہی۔ تاریخ مسلم لیگ میں معاہدے کی تفصیل یہ ہے۔

''آل انڈیا کانگریس کمیٹی اور مسلم لیگ ریفارم کمیٹی کے مشترکہ فیصلہ کی کارروائی ۱۷راور ۱۸رنومبر ۱۹۱۶ء بمقام کلکتہ ہوئی۔ اس جلسے کی صدارت سر سرندر ناتھ بنرجی نے فرمائی تھی۔ کانگریس کمیٹی کے نمایندوں کی تعداد ۵۲ تھی اور مسلم لیگ کے نمایندوں کی تعداد ۲۰ تھی۔ حسب ذیل فیصلہ منظور ہوا تھا۔

صوبائی کونسلیں: بڑے صوبوں میں ۱۲۵ ممبروں کی ہوں اور چھوڑے صوبوں میں ۵۰ سے ۷۵ کی ہوں۔

۴/۵ حصہ ممبروں کا انتخاب کے ذریعہ ہو۔ حق رائے دہندگی میں توسیع ہو۔ ہر اقلیت کا انتخاب کے لیے معقول انتظام ہو۔

مسلمانوں کے لیے نمایندگی خاص نشستوں کے ذریعے ہو۔ جس کی صوبہ وار تفصیل یہ تھی:

پنجاب:	(۵۵ فیصد لیکن نمایندگی)	نصف	(۵ فیصد کم)
بنگال:	(۵۳ فیصد لیکن)	چالیس فیصد	(۱۳ فیصد کم)
یو۔ پی:	(۱۴ فیصد لیکن)	تیس فیصد	(۱۶ فیصد زیادہ)
بہار:	(۱۵ فیصد لیکن)	انتیس فیصد	(۱۴ فیصد زیادہ)
سی۔ پی:	(۴ فیصد لیکن)	پندرہ فیصد	(۱۱ فیصد زیادہ)
مدراس:	(۷ فیصد لیکن)	پندرہ فیصد	(۸ فیصد زیادہ)
بمبئی:	(۲۰ فیصد لیکن)	ایک تہائی	(۱۳ فیصد زیادہ)

اور یہ بھی شرط تھی کہ اس کے علاوہ مسلمان کسی دوسرے انتخاب کونسل میں حصہ نہ لے سکیں گے۔ یہ بھی منظور ہوا کہ کوئی مسودۂ قانون یا مسودے کا کوئی حصہ اس وقت تک کونسل میں پیش نہ ہو سکے گا، جب تک متعلقہ فرقے کے ۳/۴ ممبران اس سے متفق نہ ہوں گے۔

مرکزی کونسل: اس میں ایک تہائی تعداد مسلمان ممبروں کی ہوگی اور صوبہ وار تعداد ممبروں کی اسی تناسب سے ہوگی۔ جیسے صوبائی کونسل میں تعداد منظور ہوئی ہے۔ (تاریخ مسلم لیگ از مرزا اختر حسین ص ۱۲۷۔۲۸)

اوپر نمایندگان کے صوبہ دار چارٹ میں قوسین کی عبارتیں وضاحت کے لیے خاکسار نے اضافہ کی ہیں۔ (ا۔س۔ش)

نومبر ۱۹۱۶ء:

ایام حج میں اورنگ آباد کے خان بہادر مبارک علی مکۂ معظمہ تشریف لائے، سرکاری آدمی تھے، لن ترانیاں خوب ہانکتے تھے، شریف صاحب کے یہاں پہنچے، ترکوں کو ہر مجلس میں برا کہتے تھے، حکومت موجودہ کی مدح سرائی میں زبان خشک ہو جاتی تھی۔ انھوں نے ظاہر کیا کہ میں گورنمنٹ ہند کی طرف سے بھیجا ہوا آیا ہوں تا کہ حجاز کے احوال کو دریافت کر کے واقعی باتیں اہل ہند کو بتاؤں کیوں کہ ہند میں اس وقت بے چینی بہت پھیلی ہوئی ہے اور عموماً اہل ہند برطانیہ پر

صدائے احتجاج بلند کرتے ہوئے بادشاہ حجاز کو برا بھلا کہتے ہیں۔اس لیے ضروری ہے کہ ایک اعلان علمائے مکہ کی طرف سے مجھ کو دیا جائے جس میں ترکوں اور ان کی حکومت اور خلافت کی برائیاں ہوں اور ان کے استحقاق خلافت پر پرزور مضمون سے رد کیا گیا ہو، اس موجودہ انقلاب اور حکومت حاضرہ کی بھلائیاں ذکر کی گئی ہوں۔ چناں چہ ایسا ایک محضر تیار کیا گیا اور وہاں کے ان علما سے جن کو دربار شرافت میں دخل تھا اور صاحب عزت وشوکت شمار کیے جاتے تھے اس پر دستخط اور مہر کرایا گیا۔ بہتوں نے خوشی سے بہتوں نے خوف سے دستخط اور مہر کردیا، خان بہادر موصوف کے پاس جب یہ محضر پہنچا تو انھوں نے کہا کہ ان علماء کو کوئی ہندوستان میں نہیں جانتا کون تصدیق کرے گا، مناسب ہوگا کہ حضرت مولانا محمود حسن صاحب جو کہ علمائے ہند میں ایک مشہور اور مسلّم شخص ہیں ان کے اور دیگر علمائے ہند کے دستخط اور مہر ہوں (نہ معلوم یہ اسی واسطے وہاں بھیجے گئے تھے کہ اس ذریعے سے مولانا مرحوم کو وہاں سے پکڑا جائے یا یہ قضیہ اتفاقیہ تھا) الحاصل اس مضمون کو وہاں کے شیخ الاسلام مفتی عبداللہ سراج نے جو کہ زمانۂ حکومت ترکیہ میں مفتی احناف تھے اور اب انقلاب کے بعد عہدۂ شیخ الاسلامی اور وکالت شرافت پر مامور ہوگئے تھے بذریعۂ نقیب العلماء مولانا کے پاس بھیجا۔

نومبر ۱۹۱۶ء:

اواخر محرم الحرام ۱۳۳۵ھ میں عصر کے بعد وہ اس محضر کو لے کر مکان پر آیا، اس زمانے میں اہالی مکۂ معظمہ میں سے جو لوگ مہاجرین ہند اور علم دوست تھے انھوں نے ظہر کے بعد مولانا مرحوم سے بخاری شریف کو شروع کررکھا تھا، مکان اقامت ہی پر درس دیا کرتے تھے جب وہ کاغذ آیا تو چوں کہ اس کی سرخی تھی "من علماء مکۃ والمکرمۃ المدرسین بالحرم الشریف المکی" یعنی یہ تحریر مکۂ مکرمہ کے ان علما کی طرف سے ہے جو کہ حرم شریف مکی میں پڑھاتے ہیں۔اس لیے ان سے کہا گیا کہ اولاً اسی سرخی کی وجہ سے کوئی استحقاق نہیں کہ حضرت مولانا اس پر کچھ لکھیں کیوں کہ وہ علمائے مکۂ میں سے نہیں اور نہ حرم مکی یعنی مسجد الحرام میں مولانا نے کبھی تدریس کی۔

ثانیاً اس میں قوم ترک کی مطلقاً تکفیر کی گئی ہے اور در بارہ اس کے جو کچھ احتیاط اور سخت احکام ہیں آپ کو معلوم ہے۔

ثالثاً اس میں وجہ تکفیر سلطان عبدالحمید خان کا تخت سے اتار دینا لکھا گیا۔ ہے حال آں کہ کسی فقیہ نے اس کو موجبات کفر میں سے قرار نہیں دیا۔

رابعاً اس میں خلافتِ سلاطین آل عثمان کا انکار کیا گیا ہے حال آں کہ یہ امر مخالف نصوص شرعیہ ہے۔

خامساً اس میں اس انقلاب اور حرکت کو مستحسن دکھایا گیا ہے اور یہ بھی شرعاً نہایت قبیح واقع ہوا ہے۔

چوں کہ کاتب الحروف کے نقیب العلما سے کچھ پہلے سے معرفت تھی اس لیے ان سے تمام کیفیتیں ظاہر کر دینے کے بعد یہ کہا گیا کہ تم شیخ الاسلام سے یہ کہہ دینا کہ مولانا نے اس پر دستخط اور مہر سے اس وجہ سے انکار کر دیا کہ اس کا عنوان اہل مکہ اور مدرسین حرم کے ساتھ مخصوص ہے، میں آفاقی شخص ہوں۔ پردیسی ہونے کی وجہ سے مجھ کو کوئی استحقاق اس پر دستخط کرنے کا نہیں اور یہ کہا گیا کہ ابھی دوسری وجوہ کو ان پر ظاہر نہ کرنا، اگر پھر انھوں نے اصرار کیا تب ان وجہوں کو پیش کیا جائے گا۔ وہ اسی وقت واپس ہو گئے اور پھر کوئی جواب نہ لائے، اس محضر کا شہر میں پہلے سے چرچا تھا جو لوگ حقانی تھے ان کو خوف لگا ہوا تھا کہ اگر ہمارے پاس آیا تو ہم کیا جواب دیں گے اور کس طرح جان چھڑائیں گے، مولانا مرحوم کے رد کرتے ہی تمام شہر میں مشہور ہو گیا کہ مولانا نے اس پر دستخط کرنے سے انکار کر دیا، اب تو دوسروں کو بھی ہمت ہو گئی۔

ادھر شیخ الاسلام صاحب کو تنبہ ہوا، انھوں نے عبارت سابقہ بالکل بدل ڈالی اور اس طرح اس کو لکھا کہ اس میں سے مبحث تکفیر بالکل خارج ہو گیا مگر دستخط کرنے کو پھر نہیں بھیجا جو عبارت دوسری مرتبہ بنائی گئی تھی اس پر پہلے علما سے فقط دستخط لے کر اخبار ''القبلہ'' میں بھی چھاپ دیا گیا، اور اسی کو خان بہادر مبارک علی خان لے کر روانہ ہو گئے، خیر خواہوں نے مولانا مرحوم سے کہا کہ کہیں شریف آپ کو کوئی اذیت نہ پہنچائے؟ مولانا مرحوم نے فرمایا کہ پھر کیا کیا جائے؟ مذہبی حیثیت سے اس پر مہر و دستخط کسی طرح درست نہ تھا، آیندہ جو کچھ تقدیر الٰہی میں ہوگا جھیلیں گے۔

مولانا کو پہلے سے ہی بارہا یہ خیال آیا تھا کہ مکہ معظمہ میں ہمارا قیام کرنا کسی طرح مناسب نہیں بلکہ شریف کے احاطۂ حکومت میں رہنا خالی از خطرہ نہیں، کیوں کہ گورنمنٹ انگریزی کو لوگوں نے اس طرح بدظن کر رکھا ہے اور شریف سے اور گورنمنٹ سے از حد اتحاد ہے پھر کیوں کر بہتری کی امید کی جائے۔ اس لیے بار ہا تقاضا فرمایا کہ کوئی صورت جلد یہاں سے نکلنے کی ہونی چاہیے لیکن اگر فقط مولانا صاحب کی ذات مبارک ہوتی تو ہر وقت نکلنا ممکن تھا وہاں تو کئی کئی آدمیوں کا مجمع اور بہت سا اسباب تھا ان سب کے لیے متعدد سواریوں کی ضرورت تھی جن کے

انتظام میں بڑا کھٹراگ اور بہت شہرت کا سامنا تھا اس پر بھی فکر کیا گیا۔

اواخر نومبر ۱۹۱۶ء:

اس فتوے کے واقعہ کے بعد ہم کو عموماً اور مولانا کو خصوصاً اس کا خیال تھا کہ مکہ معظمہ سے باہر چلا جانا اور خصوصاً شریف کی قلمرو سے بیرون ہو جانا نہایت ضروری ہے، مگر اسباب اور ہمراہیوں کے تعدد کی وجہ سے اشکال تھا، حضرت رحمۃ اللہ علیہ کا تقاضا بھی شدید تھا، بہت کچھ انتظام کیا جس کی کچھ صورت ہوگئی تھی غالباً اگر دو چار یوم کی تاخیر ہو جاتی تو ہم روانہ ہو چکے ہوتے، مگر تقدیر کا لکھا ہوا ہو کر رہتا ہے۔ شریف صاحب جدہ گئے اور وہاں کرنیل ولسن معتمد برطانیہ سے خدا جانے کیا گفت وشنید ہوئی کہ شیخ الاسلام کے نام حکم آیا کہ مولانا اور ان کے جملہ ہمراہیوں اور حکیم نصرت حسین صاحب اور سید ہاشم صاحب کو زیر حراست یہاں بھیج دو مگر سید صاحب کی نسبت کہا گیا کہ وہ روانہ ہو گئے سید امین عاصم صاحب کو اس کی خبر رات کو ہی ہو گئی تھی، مگر انھوں نے ہم کو کچھ نہیں بتایا صبح کو شیخ المطوفین احمد سجی مولانا کے پاس مکان پر پہنچا اس وقت حضرت مولانا رحمۃ اللہ علیہ کے پاس مولوی عزیر گل صاحب اور دوسرے رفقا تھے کاتب الحروف نہ تھا اس نے کہا کہ تمھاری گورنمنٹ جس کی تم رعایا ہو تم کو طلب کرتی ہے۔ اس لیے مجھ کو شریف کی طرف سے حکم ہوا ہے کہ تم کو راحت کے ساتھ روانہ کر دوں، جس سواری کی اور جتنی سواریوں کی ضرورت ہو ہم کو بتلا دو تاکہ ان کا انتظام کر دیں۔ مولوی عزیر گل صاحب سے اس کی کچھ زیادہ گفتگو ہوئی، جس کا خلاصہ یہ تھا کہ ہم یہاں کسی کافر گورنمنٹ کو نہیں پہچانتے، ہم حرم خداوندی میں امان لیے ہوئے ہیں۔ اگر شریف ہم کو یہاں سے نکالتے ہیں تو ہم خوشی سے نہ جائیں گے جب تک کہ تم ہم کو ڈنڈے کے زور سے نہ نکالو، وہ کچھ پیچ وتاب کھا کر جواب دے رہے تھے۔ اتنے میں (کاتب الحروف) پہنچ گیا، قصہ دریافت کیا۔ حال معلوم ہوا۔ آخر کار یہ رائے قرار پائی کہ سید امین عاصم صاحب سے اس بارے میں چارہ جوئی کرنی چاہیے، وہ کچھ اس بارے میں سعی کریں۔ چناں چہ ہم سب ان کے مکان پر گئے تو معلوم ہوا کہ ان کو پہلے سے خبر ہے کہ رات کو یہ حکم شریف کا شیخ الاسلامؒ کے پاس آچکا ہے پھر آخر کار رائے یہ ہوئی کہ سب کو مل کر شیخ الاسلام کے پاس حمیدیہ میں جہاں حکام کا مرکز ہے چلنا چاہیے اور اس سے گفت وشنید کرنی چاہیے چناں چہ وہاں گئے اول سید صاحب اوپر گئے اور ہم سبھوں کو نیچے بٹھا گئے انھوں نے جب شیخ الاسلام سے گفتگو کی تو اس نے وہی فتوے پر دستخط

نہ کرنے کا الزام رکھا انھوں نے جواب دیا کہ وہ نیچے موجود ہیں ان میں سے حسین احمد عربی میں آپ کو وجہ اور اصلیت بتلا سکتا ہے اس کو بلائیے اور تحقیق کیجیے۔

الغرض مجھ کو بلایا گیا انھوں نے کہا کہ مولانا ہمارے مخالف ہیں ہم کو باغی کہتے ہیں ہم کو خارجی کہتے ہیں اس لیے ان کو باغیوں کی حکومت میں نہ رہنا چاہیے میں نے کہا کہ آخر آپ کو یہ کہاں سے معلوم ہوا انھوں نے کہا کہ مولانا نے فتوے پر دستخط کیوں نہیں کیے؟ میں نے کہا آپ خود نقیب کو بلا کر پوچھیے۔ چوں کہ اس کا عنوان (سرخی) یہ تھا کہ ''من علماء مکۃ المکرمۃ المدرسین بالحرم الشریف المکی'' تو مولانا نے فرمایا کہ نہ تو میں مکۂ معظمہ کے علما میں سے ہوں اور نہ میں مسجد الحرام میں پڑھاتا ہوں۔ اس لیے مجھ کو اس پر دستخط کرنے کا کوئی استحقاق نہیں۔ اس نے اس جواب کا انکار کیا آخر کار نقیب بلایا گیا اور اس نے اس کی تصدیق کی۔ شیخ الاسلام نے کہا کہ تم ہمارے حکم سے نافرمانی کرتے ہو۔ میں نے کہا ہم تو یہ چاہتے ہیں کہ آپ ہم کو کل تک اجازت دے دیں، کل کو شریف صاحب خود آجائیں گے ہم ان سے کچھ عرض کر لیں وہ اگر راضی ہوئے تو ہم امتثال حکم کے لیے تیار ہیں۔ کہا کہ یہ نافرمانی نہیں؟ میں نے کہا کہ یہ استرحام ہے اور استرحام بادشاہ اور وزیر سے۔ سبھوں سے ہو سکتا ہے۔ تب ذرا ڈھیلا ہو کر کہنے لگا کہ مولانا سیاسی مجالس منعقد کرتے ہیں، میں نے کہا کہ آپ کو غلط خبر پہنچائی گئی ہے، مکان پر مولانا بخاری شریف پڑھاتے ہیں۔ اس کے پڑھنے اور سننے کے واسطے لوگ جمع ہو جاتے ہیں کوئی سیاسی مجلس منعقد نہیں کی جاتی اس نے کہا کہ اس میں پہلے یا بعد کوئی سیاسی تذکرہ نہیں ہوتا؟ میں نے کہا ہاں کبھی بعد درس کے بعض باتوں کا جو اخباروں میں یہاں آتی ہیں تذکرہ ہوتا ہے جن کا تعلق آپ کے داخلی احکام و نظام سے کوئی نہیں، فقط خارجی امور سے تعلق رکھتی ہیں۔ کہا کہ مولانا بعد مغرب مسجد الحرام میں بھی سیاسی مجلس منعقد کرتے ہیں، میں نے کہا یہ بھی غیر واقعی خبر ہے مغرب کے بعد مولانا نوافل دیر تک پڑھتے رہتے ہیں اس کے بعد ہم فقط چند خدام مولانا کے پاس حاضر ہو جاتے ہیں وہاں کوئی مجلس نہیں ہوتی اور نہ امور سیاست سے کوئی تعلق ہوتا ہے۔ اس نے کہا تو نے حافظ عبدالجبار صاحب دہلوی کی دکان پر یہ کہا کہ یہاں پر سب چیزیں اور احکام انگریزی ہو گئے ہیں۔ میں نے کہا کہ میں نے سب چیزوں اور سب احکام کو نہیں کہا بلکہ ایک کتاب کی جلد باندھ کر ایک صاحب لائے تھے ان سے حاضرین میں سے ایک شخص نے کہا کہ کیسی جلد باندھ کر لائے ہو، اس نے جواب دیا کہ افرنجی باندھ کر لایا ہوں میں نے کہا کہ افسوس کہ اب سب چیزیں افرنجی پسند ہونے لگیں، میرا

اشارہ اور مطمح کلام جلد کے سوا دوسرا کوئی امر نہ تھا، میں نے کہا کہ ہر خبر کی آپ تصدیق کیوں کر فرما لیتے ہیں، اس نے کہا کہ ہمارے پاس خبر لانے والے تو یہی لوگ ہوتے ہیں فرشتے تو لانے سے رہے!

الغرض اخیر میں اس نے اگلے دن کی اجازت دے دی کہ کل کو شریف لے جائے گا تو خود ان سے گفتگو کر لینا ہم خوشی خوشی گھر چلے آئے اور سارا قصہ حضرت رحمۃ اللہ علیہ سے تمام راستے بیان کرتے رہے، خیال یہ بھی ہوتا تھا کہ شب کو کسی طرف نکل چلیں تاکہ ان کے دست برد سے بچے رہیں۔

حافظ عبدالجبار صاحب دہلوی نے کوشش یہ کی کہ شیخ الاسلام کی مولانا سے صفائی ہو جائے تو بہتر ہے وہ شریف سے بھی کہہ لے گا۔ اس لیے لوگوں کو درمیان میں ڈال کر کچھ گفتگو کی اور مجھ کو بلا کر کہا کہ اگر تو اس پر راضی ہو کہ شیخ الاسلام کے ہاتھ چوم کر معافی طلب کر لے تو یہ سب قصہ رفع دفع ہو جائے، میں نے کہا کہ مولانا کی راحت کے لیے شیخ الاسلام کے ہاتھ تو درکنار میں پیر چومنے کے لیے بھی تیار ہوں انھوں نے فرمایا کہ تو مغرب کے بعد ہمارے مکان پر آ جانا ہم تجھ سے پہلے شیخ الاسلام کے یہاں جائیں گے اور پھر جس وقت ہمارا آدمی تیرے پاس آوے، اس وقت تو اس کے ساتھ چلے آنا۔ الغرض ایسا ہی کیا گیا، مغرب عشا کے درمیان میں وہ حضرات مجتمع ہو کر علی نالکی (مفتی مالکیہ) کے کان پر گئے۔ وہیں شیخ الاسلام شام کو بوجہ اپنی سسرال ہونے کے بیٹھا کرتا تھا، تھوڑی دیر کے بعد میرے پاس آدمی آیا۔ میں وہاں پہنچا، شیخ الاسلام کے ہاتھ چومے معافی طلب کر کے ایک طرف کو بیٹھ گیا۔ اس نے جواب دیا کہ خواہ ہم نے ترکوں سے لڑنے میں غلطی کی یا صواب کیا مگر اب جب کہ لڑائی ٹھن گئی اور ہم اس میدان میں اتر آئے ہیں، تو جب تک کہ ہماری عورتیں اور بچے باقی ہیں ہم لڑیں گے۔ میں نے اس کا کوئی جواب نہیں دیا، تھوڑی دیر بیٹھ کر قہوہ پی کر میں چلا آیا۔ اب جملہ احباب کو بھی اور ہم کو بھی اطمینان ہو گیا کہ قصہ رفع دفع ہو گیا کوئی ضرورت نہیں کہ جلدی کر کے یہاں سے سفر کیا جاوے،

اگلے روز جب شریف صاحب آئے تو شیخ الاسلام نے اس سے کہا کہ وہ لوگ رات کو آئے تھے اور معافی کے خواستگار ہوئے ہیں، اس لیے ان کو چھوڑ دیا گیا۔ شریف نہایت برہم ہوا کہ کیوں نہ تم نے ان کو شب ہی کو روانہ کر دیا، ان کو آج ہی روانہ کر دو، ان کو کسی طرح مت معاف کرو اور بہت سختی کے کلمات کہے۔ اس خبر کے پہنچنے پر ہم میں سے بعض احباب کی رائے ہوئی کہ مولانا کو اور

ان کے ساتھ وحید احمد کو کہیں چھپا دیا جائے اور شب کو ان کو کسی دوسری جگہ روانہ کر دیا جائے گا۔ باقی لوگوں کو دو چار دن غایۃ مافی الباب قید رکھیں گے پھر چھوڑ دیں گے، چناں چہ ایسا ہی کیا گیا۔ تھوڑی دیر کے بعد پولیس کا آدمی مجھ کو اور وحید کو بلانے کے لیے پہنچا، وحید موجود نہ تھا، مجھ کو حمیدیہ میں بلا کر لائے، کمشنر پولیس نے مجھ کو کہا کہ تو انگریزی حکومت کو برا کہتا ہے اب اس کا مزہ چکھ اور قید خانے میں مجھ کو بھیج دیا۔''

''اس کے بعد پولیس نے مولانا کو تلاش کیا چوں کہ مکان پر موجود نہ تھے، اس لیے مولوی عزیر گل صاحب اور حکیم نصرت حسین صاحب کو پکڑا اور کہا کہ جہاں سے ممکن ہو مولانا کو ڈھونڈ کر لاؤ ان دونوں خدام نے مولانا کی لاعلمی بیان کی باوجود سخت تقاضے اور دھمکی موت کے ان خدام نے کچھ پتا نہیں دیا، بالآخر یہ دونوں اسی مکان میں حضرت کی آمد تک مقید رکھے گئے اور شریف کے نوکر چاکر حضرت کی تلاش میں رہے۔

۱۹ر دسمبر ۱۹۱۶ء: ...... جب شام کا وقت ہو گیا اور مولانا باوجود تفتیش کثیر ہاتھ نہ لگے تو پھر شریف کو خبر دی گئی کہ مولانا تو ہاتھ نہیں آتے خدا جانے کہاں ہیں۔

شریف نے حکم کیا کہ اگر عشا تک مولانا آموجود نہ ہوئے تو دونوں ساتھیوں کو گولی سے مار دو اور مطوف کے سو کوڑے لگاؤ اور مطوفیت چھین لو، اس خبر کی وجہ سے مطوف صاحب کو نہایت پریشانی ہوئی اور مولانا کو بھی خبر پہنچی مولانا نے فرمایا کہ میں کسی طرح گوارا نہیں کرتا کہ میری وجہ سے کسی کو کوئی آزار پہنچایا جائے، جو کچھ ہوگا میں اپنے سر پر جھیلوں گا اور نکلنے کے لیے تیار ہوئے احباب نے کہا کہ اچھا احرام کے لباس میں نکلیے تاکہ لوگوں کو خیال ہو جائے کہ یہاں تھے ہی نہیں چناں چہ احرام کے لباس میں مولانا مکان پر آگئے اسی وقت اونٹ وغیرہ حاضر کیے گئے اور چار دوں آدمی تقریباً عشاء کے وقت وہاں سے دو اونٹوں پر روانہ کر دیے گئے، مولانا روانگی کے وقت نہایت مطمئن تھے اور احباب سے رخصتی میں ملتے وقت فرماتے تھے کہ ''الحمد للہ بمصیبتے گرفتارم نہ بمعصیتے۔'' ......

مولانا کے ساتھ چند سپاہی بندوق لیے ہوئے حفاظت کے لیے ساتھ تھے جو نوبت بہ نوبت ہر مقام پر بدلتے رہتے تھے یہ سفر مولانا مرحوم کا مکہ معظمہ سے ۲۳ر صفر شب یک شنبہ ۱۳۳۵ھ کو ہوا، دوشنبہ کی صبح ۲۴ صفر کو جدہ پہنچے۔

دسمبر ۱۹۱۶ء: ۱۳۳۵ء، مجھ کو قید خانے میں کوئی حالت صبح تک معلوم نہ ہوئی۔ صبح کو جب

احباب ملنے آئے تب سب کیفیت معلوم ہوئی۔ تھوڑی دیر کے بعد سید امین عاصم کے بھانجے زادے سید احمد جعفری آئے اور کہا کہ سید صاحب نے تیرے چھڑانے کے لیے بہت کوشش کی مگر چوں کہ شریف بہت خفا ہے اس لیے کم از کم آٹھ دن تک تجھ کو قید خانے میں رہنا پڑے گا۔ میں نے کہا کہ چوں کہ میں مدینۂ منورہ سے فقط مولانا کی خدمت کے لیے نکلا ہوں اس لیے مجھ کو خدمت میں رہنا ضروری ہے اگر جدہ سے مولانا ہندوستان تشریف لے گئے تو اپنے ساتھ رہنے کی کوئی ضرورت نہیں، وہاں مجھ سے اعلیٰ اعلیٰ خدام موجود ہیں اور اگر کسی دوسری جگہ ان کو بھیجا گیا تو میرا ساتھ رہنا ضروری ہے اس لیے جس طرح ممکن ہو مجھ کو مولانا کے پاس بھجوا دیجیے انھوں نے کہا کہ یہ بات تو آسان ہے ہم ابھی شیخ الاسلام سے جا کر کہے دیتے ہیں کہ مادۂ فساد میں سے بعض کا باقی رکھنا اور بعض کا اخراج کرنا مناسب نہیں اس لیے اس کو بھی وہاں بھیج دو، غالباً وہ اسی وقت تجھ کو بھی وہاں بھیج دیں گے، میں نے کہا کہ ہاں ایسا ہی کیجیے، پھر نہ معلوم ان سے کیا باتیں ہوئیں ظہر کی بعد قریب عصر کے معلوم ہوا کہ مجھ کو جدہ جانے کا حکم ہوا ہے۔......

الغرض مولانا کی روانگی کے بعد اگلے دن خچروں پر مجھ کو زیر حراست روانہ کر دیا گیا چوں کہ اونٹ جدہ اور مکہ کے درمیان دو دن لگاتا ہے اور خچر ایک ہی شب میں پہنچتا ہے اس لیے حضرت مولانا رحمۃ اللہ علیہ کے پہنچنے کے تقریباً ڈیڑھ یا دو گھنٹہ کی بعد میں پہنچ گیا۔ جدہ قید خانے کے دروازے پر ایک کمرہ تھا وہاں پر مولانا مع اپنے رفقاء کے فروکش تھے۔ وہاں ہی میں پہنچا دیا گیا، مولانا کو میری طرف سے بہت فکر تھا، حاضر ہو جانے پر اطمینان ہوا۔

بیان فرمایا کہ میں نے رات کو خواب میں دیکھا ہے کہ جناب سرور کائنات آئے نامدار حضرت رسول مقبول صلی اللہ علیہ وسلم کا جنازہ ہے اور ہم سب لیے جا رہے ہیں اور میں یہ سمجھ رہا ہوں کہ آپ کی تجہیز و تکفین وغیرہ سب امور کا میں متکفل ہوں اور پھر اپنے دل ہی دل میں سوچ رہا ہوں کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی تجہیز و تکفین ہم کس طرح سے پورے طور پر ادا کر سکیں گے؟ پھر دیکھا میں نے کہ جنازہ ایک جگہ رکھا گیا اور حضرت حاجی امداد اللہ صاحب قدس اللہ سرہ العزیز اس کے سامنے دوزانو مراقب بیٹھے ہوئے ہیں اور میں چاروں طرف اردگرد تجہیز و تکفین غسل وغیرہ کا انتظام کرتا پھر رہا ہوں، تعبیر چوں کہ ظاہر تھی کچھ بیان نہیں فرمایا۔

شام کے وقت انسپکٹر سی آئی ڈی بہاؤ الدین محافظ حجاج آئے اور انھوں نے کہا کہ کل آگ بوٹ جانے والا ہے اگر آپ اس میں چلیں تو میں آپ کا انتظام کروں؟ ہم نے ان سے کہا کہ

آپ معتمد برطانیہ کرنل ولسن کی طرف سے مامور ہو کر ہمارے پاس آئے ہیں، یہ کہہ دیجیے کہ ابھی تک ہمارا سامان مکۂ معظمہ سے نہیں آیا اس لیے ہم اگلے آگ بوٹ میں جائیں گے اور پھر دوسری بات ہم آپ سے بحیثیت ہندوستانی اور مسلمان ہونے کے خیر خواہانہ کہتے ہیں کہ اگر ہم کو اس وقت ہندوستان بھیجا گیا تو جو واقعات حجاز کے ہیں ہم بلا کم و کاست وہاں کہیں گے، ہم نہ جھوٹ بولیں گے، نہ چھپاویں گے اور یہ امر گورنمنٹ کی سیاست کے زیادہ مخالف ہوگا۔ اس لیے آپ کوشش کیجیے کہ گورنمنٹ تا اختتام جنگ ہم کو یہاں ہی کسی جگہ رکھ دے خواہ جدہ میں یا اور کسی قریہ یا قصبہ میں انھوں نے کہا کہ بہتر ہے اگلے روز وہ آئے اور ہم کو اپنے مکان پر لے گئے اوپر کے طبقہ میں جو کہ خالی تھا ہم کو رکھا اور بیچ کے طبقے میں خود رہتے تھے اور نیچے دروازے پر شریف کا سپاہی محافظت کرتا تھا، جو جہاز اس وقت موجود تھا وہ روانہ ہو گیا کرنل ولسن کسی جنگی ضرورت سے باہر چلا گیا تھا تقریباً ۲۰ یا ۲۵ دن کے بعد آیا انھوں نے اس سے کہا اس نے جواب دیا کہ ممکن نہیں کہ ان کو یہاں چھوڑ دیا جائے کیوں کہ شریف کہتا ہے کہ میری قلمرو میں ان کا چھوڑنا میری مرضی کے خلاف ہے۔ ان کو مصر بھیجنا چاہیے: جب ہم کو یہ خبر پہنچی تو ہم نے کہا کہ مصر سے تو ہندوستان ہی اچھا ہے۔ آپ ہندوستان کے لیے ان سے زور دیجیے۔ انھوں نے جواب دیا کہ اب وہ ہندستان کے لیے کسی طرح تیار نہیں ہوتا۔ (یہ سب ان کا بیان ہے۔)

۳۱ / دسمبر ۱۹۱۶ء: مسلم لیگ کا نواں جلسہ مسٹر محمد علی جناح کی صدارت میں لکھنؤ میں ہوا۔ اس جلسے کی نمایاں کامیابی یہ رہی کہ کانگریس کی مقرر کردہ اور مسلم لیگ کی کمیٹیوں نے جو معاہدہ تیار کیا تھا، اسے تالیوں کی گونج میں منظور کر لیا گیا۔ مسلم لیگ اور کانگریس کا یہ وہی معاہدہ ہے جسے لکھنؤ پیکٹ یا میثاق لکھنؤ کے نام سے یاد کیا جاتا ہے۔

چودھری خلیق الزماں کا خیال ہے کہ اس تصفیے نے پاکستان کے مطالبے کی راہ ہموار کر دی۔ ان کے نزدیک یہ اقدام انتہائی غلط تھا۔ اگر اس وقت صوبوں میں واقعی اکثریت اور اقلیت کی بنیاد پر نمائندگی کا فیصلہ کر لیا جاتا تو مسلمان ۱۹۳۵ء تک ہی بہت فوائد حاصل کر لیتے۔ وہ لکھتے ہیں:

> "اس طرح آپس کے تصفیے سے مستقبل میں تقسیم ہند کی بنیاد لکھنؤ میں پڑ گئی۔ اس کی ذمہ داری مسلمانوں کی ناتجربہ کاری ہو یا ہندوؤں کی ہوشیاری مگر دونوں نے یہ طے کر لیا کہ سارے ہندوستان میں مسلمان اقلیت میں ہوں گے۔ جو کسی طرح بھی سیاسی مصلحت کی کسوٹی پر پورا نہیں اترتا۔ یہی غلط اقدام تھا جس کی بدولت ہندوستان کی

فضا لکھنو کے ''ہندو مسلم پیکٹ'' کے بعد برابر مکدر رہنے لگی۔ یہاں تک کہ اس نزاع نے اتنا طول کھینچا کہ پاکستان کا مطالبہ سامنے آیا۔ اگر اس وقت سیدھا سادا فیصلہ یہ کر لیا گیا ہوتا کہ دونوں قومیں اپنے اپنے صوبوں میں اپنی تعداد کے اعتبار سے نمایندگی حاصل کریں تو ۱۹۱۶ء سے ۱۹۳۵ء تک بنگال، پنجاب، سندھ، صوبہ سرحد اور بلوچستان میں مسلم حکومتیں قائم ہو کر اپنی سطح پالیتیں اور کل ہندوستان میں ان کی حیثیت محض ایک اقلیت کی نہ رہ جاتی بہرنوع اس مصالحت سے دانستہ یا نادانستہ ہندوؤں کو ایک زمانے تک بہت بڑا سیاسی فائدہ پہنچتا رہا۔''

(شاہرہ پاکستان: کراچی۔ (۱۹۸۷ء)، صفحہ، ۳۱۰)

مولانا طفیل احمد منگلوری نے بھی اس تصیے کو مسلمانوں کے لیے مضر قرار دیا ہے۔ ان کے نزدیک مسلمانوں کا مسلم اکثریت کے صوبوں میں اقلیت میں ہو جانا کسی طرح مسلمانوں کے مفید نہ تھا۔ ان کے خیال میں یہ ''سوء اتفاق'' تھا کہ مسلمانوں کو یہ اصول پسند آیا۔ (مسلمانوں کا روشن مستقبل: ۱۹۴۵ء (دہلی)، ص ۹۹۔ ۳۸۹)

اس فیصلے کے مطابق مسلمانوں کے جداگانہ انتخاب کا اصول بھی تسلیم کر لیا گیا تھا اور اس بات پر چودھری اور منگلوری، دونوں صاحبان متفق ہیں کہ یہ اصول بھی مسلمانوں کے لیے سراسر غیر مفید اور موجب زحمت ہی تھا۔

ڈاکٹر عبدالسلام خورشید کی روایت کے مطابق علامہ اقبال مرحوم نے بھی اس تصنیے ''میثاق لکھنو'' کو ناپسند کیا تھا ڈاکٹر خورشید لکھتے ہیں:

''سالک نے میثاق لکھنو کے سلسلے میں اقبال کی رائے یوں بیان کی ہے کہ علامہ اقبال اس میثاق کے مخالف تھے، کیوں کہ اس کے ماتحت مسلم اکثریت والے صوبوں میں مسلمانوں کو موثر اقتدار نہ ملتا تھا اور مسلم اقلیت والے صوبوں میں پاسنگ کی وجہ سے ان کو کوئی خاص فائدہ نہ پہنچتا تھا۔ اس کے علاوہ علامہ کا خیال تھا کہ ایسا میثاق اسی صورت میں مفید ہو سکتا ہے کہ ہندوستان میں قومیت متحدہ کی داغ بیل ڈالنا منظور ہو، اور حقیقت یہ ہے کہ ہندوستان میں قومیت متحدہ کی تعمیر ناممکن ہے۔ نہ اس کے لیے کوشش کرنا مفید ہے۔'' (سرگزشت اقبال، ڈاکٹر عبدالسلام خورشید، ۱۲۲)

مولانا محمد علی نے بھی جداگانہ انتخاب کے فیصلے کو ''ایک مہلک غلطی'' اور مسلم اکثریت کے صوبوں میں انھیں اقلیت میں تبدیل کر دینے کے معاہدے کو ''ایک اور بڑی غلطی'' قرار دیا ہے۔ (مکتوبات

رئیس الاحرار: مرتبہ ابوسلمان شاہ جہان پوری، ۱۹۶۸ء کراچی، خط بنام ریمزے میکڈانلڈ وزیر ہند)

قاضی عدیل احمد عباسی لکھتے ہیں:

۱۹۱۶ء میں مسلم لیگ اور کانگریس کے درمیان سمجھوتا ہوکر ایک باہمی معاہدہ مرتب ہوا تھا جس کا نام تاریخ میں "میثاق ملی" ہے......

جس وقت یہ میثاق ملی مرتب ہوا تو مولانا محمد علی، مولانا شوکت علی اور مولانا ابوالکلام آزاد نظر بند تھے۔ مسٹر جناح مسلم لیگ کے صدر تھے۔ اس میثاق سے نہ مسلمان مطمئن ہوئے نہ ہندو۔ مسلمانوں کو اعتراض یہ تھا کہ اکثریتی صوبوں کو اقلیت میں تبدیل کر دیا گیا ہے اور ہندو اقلیتی صوبوں میں مسلمانوں کی مخصوص نشستوں کو ناپسند کرتے تھے۔ مورخین اور ماہرین سیاست کا فیصلہ ہے کہ کانگریس نے اس پر رضامندی دے کر بھیانک غلطی کی کیوں کہ اس میں جداگانہ انتخاب کو تسلیم کرلیا گیا تھا۔ اسی بنیاد پر آیندہ پاکستان کا محل تعمیر ہوا، یہ میثاق بھی راستے کا ایک روڑا تھا۔ اس کی وجہ سے ہندو اور مسلمان کی نظر حصول آزادی سے ہٹ کر حصے بخرے پر لگ جاتی تھی اور اختلاف رونما ہوتا تھا۔ (تحریک خلافت از قاضی محمد عدیل عباسی، صفحہ ۷۷۔۷۶)

حضرت شیخ الہند کا منصوبہ بقول.....:

حجاز مقدس میں حضرت مولانا محمود حسن کی سرگرمیوں، ان کے عزائم و مقاصد کے بارے میں حضرت مولانا حافظ محمد احمد مہتمم دارالعلوم دیوبند نے کلکٹر سہارن پور کو جو اطلاعات بہم پہنچائیں تھیں اور ملاقات میں حضرت مولانا محمود حسن کے بارے میں جو خیالات ظاہر کیے تھے، ان پر مشتمل جو رپورٹ کلکٹر سہارن پور نے ہوم ڈیپارٹمنٹ کو بھیجی ہے۔ اس میں کہا گیا ہے:

۱۔ دیوبند کے شمس العلماء مولوی محمد احمد نے کل یہ اطلاع دی ہے کہ

☆ ہیڈ ماسٹر (شیخ الحدیث۔ صدر المدرسین) کا خط وصول ہوا۔ اس میں بتایا گیا ہے کہ انھوں نے (مولانا محمود حسن نے) مدینہ میں انور پاشا سے ملاقات کر لی اور وہ ان سے معاملات طے پاتے ہی دیوبند واپس آجائیں گے۔ ان کے مقاصد یہ ہیں:

(الف) اپنے ایجنٹوں کے ذریعے سرحد پر گڑبڑ پیدا کرنا

(ب) ہندوستان میں انگریزوں کے خلاف نفرت کو ہوا دینا (۱)۔

۲۔ انھوں نے بتایا کہ

☆ استنبول اور ہندوستان میں غیر وفادار مسلمانوں کے درمیان ریڈسی (بحیرۂ احمر) جانے

والے بحری جہازوں کے عملے کے ذریعے کافی خط و کتابت ہو چکی ہے۔

☆ بلغاریا کے جنگ میں شامل ہونے اور غیر متوقع طور پر سرویا کے اتنی جلدی پسپا ہو جانے کی وجہ سے غیر وفاداروں کے حوصلے بہت بڑھ گئے ہیں۔

۳۔ انھوں نے یہ بھی کہا کہ ڈاکٹر انصاری اور ان کے رشتہ دار (بھائی حکیم) عبدالرزاق اپنے حلقۂ احباب میں یہ پھیلا رہے ہیں کہ

(الف) وہ (شمس العلماء) حکومت کو اطلاعات فراہم کر رہے ہیں۔

(ب) لیفٹنٹ گورنر نے ہیڈ ماسٹر (صدر مدرس مولانا محمود حسن) کی نظر بندی کی سفارش کی تھی، جسے وائسرائے نے مسترد کر دیا (۲)۔

(ج) ان امور کی تصدیق سیکریٹریٹ کے کاغذات سے کر لی گئی ہے۔

۴۔ ہیڈ ماسٹر (صدر مدرس) نے اس قدر اثر ورسوخ کس طرح پیدا کر لیا؟

اس سوال کے جواب میں انھوں نے بتلایا کہ

(الف) ان کی عمر (۷۰ سال) کی بزرگی۔

(ب) ان کی قابلیت اور ان کا تقدس۔

(ج) اور یہ کہ وہ شمس العلماء کے والد مولانا محمد قاسم کے سربر آوردہ شاگرد ہیں۔ شمس العلماء کے والد خود بھی سربر آوردہ مولوی تھے۔ جنھوں نے پچاس سال قبل دارالعلوم دیوبند کی بنیاد رکھی تھی۔

(د) ان کا دارالعلوم دیوبند سے تعلق۔ (بقول ان کے یہ ہندوستان میں اپنی نوعیت کا واحد ادارہ ہے۔)

۵۔ ان کا (شمس العلماء) بیان ہے کہ یہ آدمی (محمود حسن) ترش مزاج اور غیر مصالحانہ طبیعت کا مالک ہے (۳)۔

حوالہ:

گورنمنٹ آف انڈیا۔ ہوم ڈیپارٹمنٹ۔ پولیٹکل ڈیپازٹ۔ پروسیڈنگز۔ جنوری ۱۹۱۶ء، نمبر ۴۷، بحوالہ انڈین مسلمز...... اے ڈاکومنٹری ریکارڈ، جلد ۵، مرتبہ شان محمد۔

حواشی:

(۱) الحمد للہ! ان تمام مراسلات اور گورنمنٹ کی رپورٹوں سے حضرت شیخ الہند کی سیاسی

کارگزاریوں اور خدمات قوم و وطن کا کیسا بین و مبرہن ثبوت دشمن کے قلم سے بہم پہنچا ہے۔

(۲) اس وقت جب حضرت شیخ الہند وطن میں تھے تو بلاشبہ حضرت شمس العلماء کی اس تجویز کو نظر انداز کر دیا گیا تھا۔ لیکن جب حضرت شیخ الہند ملک سے باہر تشریف لے گئے اور حضرت کی کارگزاریوں کے ثبوت سامنے آئے تو شمس العلماء کے مشورے اور ان کی رائے کی اصابت کو محسوس کر لیا گیا اور حضرت کو گرفتار کرنے میں بالکل تاخیر نہیں کی گئی۔ کیا اس حقیقت کے انکشاف کے بعد بھی اس امر میں شبہ کیا جائے گا کہ حضرت شیخ الہند کو شمس العلماء نے گرفتار نہیں کروایا تھا؟

(۳) شمس العلماء نے بہت صحیح فرمایا کہ حضرت واقعی ترش مزاج اور غیر مصالحانہ طبیعت کے مالک تھے، لیکن انگریز یعنی قوم وطن کے دشمن کے مقابلے میں! اپنے دوستوں، بزرگوں اور خردوں کے لیے نہایت مخلص، بہت شفیق اور رحیم تھے، ''گویا اشداء علی الکافر رحماء بینہم'' کی عملی تفسیر تھے۔ انگریزوں کے مقابلے میں حضرت کے مزاج کی شدت کا اندازہ اس سے لگایا جا سکتا ہے کہ ایک دفعہ مولوی محمد طاہر قاسمی نے پوچھا:

حضرت! انگریزوں کی کوئی اچھی چیز بھی ہے؟

جواب دیا: ہاں! ان کے گوشت کے کباب بہت لذیذ ہوں گے۔

۱۹۱۶ء پر تبصرہ:

اسی سال مدراس میں مسز اینی بیسنٹ نے ہوم رول لیگ کی بنیاد ڈالی اور تمام سیاسی جماعتوں میں ایک نئی روح پھونک کر انھیں متحد و متفق کر دیا۔ اسی سال لکھنؤ میں کانگریس اور مسلم لیگ کا تاریخی اور مشہور متحدہ اجلاس ہوا اور دونوں پارٹیوں نے حصول آزادی کی راہ میں اشتراک کلی کا وہ معاہدہ کیا جس نے انگریزوں کو خوفزدہ کر دیا اور وہ ہندوستانیوں کو مزید رعایتیں دینے پر مجبور ہوئے۔ آج بھی ''لکھنؤ پیکٹ'' کو تاریخ آزادی میں سنگ میل کا درجہ حاصل ہے۔ اس اجلاس کے صدر امبیکا چرن موجمدار تھے۔ اجلاس کے خاتمے ''پر آزادی میرا پیدائشی حق'' کے خالق لوکمانیہ تلک نے ہوم رول تحریک شروع کی۔ مدراس میں اینی بیسنٹ نے جو ہوم رول تحریک شروع کی تھی، وہ بھی ان کے ساتھ ہو گئیں۔

لائڈ جارج کی وعدہ خلافی نے تحریک خلافت کی بھڑکتی آگ پر تیل کا کام کیا۔ ملک بھر میں قومی یگانگت، اتفاق و اتحاد کے جھکڑ چلنے لگے۔ اور ہر طرف یکجہتی و بھائی چارہ کی پرشور شہنائیاں بجنے لگیں۔ جناب ڈاکٹر مختار احمد انصاری، اینی بیسنٹ، مسٹر جناح اور مالویہ جی نے اعتدال

پسندوں اور انتہا پسندوں کو ایک صف میں کھڑا کر دیا۔ (حسرت موہانی...... ایک سیاسی ڈائری)

دسمبر ۱۹۱۶ء: کانگریس کا اکتیسواں سالانہ اجلاس لکھنؤ میں زیر صدارت امبیکا چرن موجمدار دسمبر کے آخری ہفتے میں ہوا۔ مسٹر موجمدار نے ایک پر جوش اور فکر انگیز خطبہ صدارت پیش کیا۔ متعدد ریزولیوشن پاس ہوئے، جن میں ڈیفنس آف انڈیا اور ریگولیشن ۱۸۱۸/ ۱۱۱ کے بغیر مقدمہ چلائے سیاسی کارکنوں کے خلاف استعمال، قانون اسلحہ اور پریس ایکٹ کی تنسیخ اور سودیشی کے حق میں تجاویز پاس کی گئیں۔

انھی تاریخوں میں مسلم لیگ کا اجلاس بھی لکھنؤ میں ہوا تھا اور کانگریس لیگ دونوں جماعتوں نے اصلاحات کی ایک مشترکہ اسکیم وائسرائے کو بھیجی تھی۔ (سکسٹی ایئرز آف کانگریس، ص ۱۹۴۔۲۰۰)

۱۹۱۷ء

۱۲ر جنوری ۱۹۱۷ء: ۱۲ر جنوری ۱۹۱۷ء مطابق ۱۸ ر ربیع الاول ۱۳۳۵ھ جدہ سے سوئز کو خدیوی آگ بوٹ پر ہم کو سوار کر دیا گیا، تقریباً ایک ماہ جدہ میں رہنا ہوا، نماز پنجگانہ ہم مکان پر ہی پڑھتے تھے، جمعہ کے روز بہاؤ الدین ہمارے ساتھ جامع مسجد کو جو کہ قریب ہی تھی جاتا تھا اور پھر ساتھ ہی واپس ہوتا تھا، بازار میں سے اگر کوئی چیز ضروری ہوتی تھی تو اس کو اپنے ہمراہ لے جا کر خرید وا دیتا تھا یا اپنے نوکر کے ذریعے سے جو کہ خفیہ ہی کا آدمی تھا منگوا دیتا تھا، جہاز پر سوار ہونے تک ہم اس کے زیر حراست رہے اور جہاز کی روانگی تک دو سپاہی شریف کے ہماری حفاظت کرتے رہے جب کہ وقت روانگی کا آ گیا، چلے گئے۔ جہاز پر کوئی پولیس ہم پر نہ تھی، جدہ میں کھانا گورنمنٹی خرچ سے بواسطۂ بہاؤ الدین عبدالرحیم بخش کے یہاں سے پک کر دونوں وقت آتا تھا۔"

۱۶ر جنوری ۱۹۱۷ء: جہاز جدہ سے روانہ ہو کر چوتھے دن ۱۶ر جنوری ۱۹۱۷ء (سہ شنبہ) مطابق ۲۲ر ربیع الاول سوئز میں صبح کو پہنچا، کچھ عرصے کے بعد ایک گارد تقریباً اٹھارہ بیس گوروں کی سنگین اور بندوق لیے ہوئے پہنچی اور ہم کو قریب کے ایک کیمپ میں جو اسٹیشن کے قریب ہی تھا لے گئی وہاں ایک خیمہ میں ہم کو ٹھہرایا گیا اور کہا گیا کہ کل تم کو مصر روانہ کیا جائے گا ہم پر ہندوستانی سپاہی پہرے کے لیے مقرر کیے گئے اور ہندوستانیوں ہی سے ہمارے واسطے کھانا پکوا کر دیا گیا......

۱۷ر جنوری ۱۹۱۷ء:...... صبح کو نماز کے وقت ہم کو ریل پر سوار کرا دیا گیا، درجہ تھرڈ کلاس تھا اور

تقریباً چودہ یا پندرہ گورے سنگین لگائے ہوئے ہماری حفاظت کو ساتھ تھے، اسباب سب ہمارا ہمارے ساتھ تھا، گوروں کی گارد جنکشنوں پر ایک یا دو جگہ بدلی، سہ پہر کو تقریباً دو بجے اسی روز یعنی چہار شنبہ ۱۷ر جنوری مطابق ۲۳ر ربیع الاول گاڑی قاہرہ کے اسٹیشن پر پہنچی۔ یہاں ہم اتارے گئے چوں کہ نماز کا وقت تھا ہم نے پانی مانگا اور اسٹیشن ہی پر با جماعت نماز پڑھی گورے سپاہی ہمارے چاروں طرف سنگین لیے ہوئے محافظت کرتے رہے پھر عصر کی بھی نماز وہیں پڑھی۔ جب کہ تقریباً ڈیڑھ گھنٹہ دن باقی تھا اس وقت موٹر آیا اور ہم کو مع جملہ اسباب کے جیزہ لے گیا۔"......

اہرام مصر پادشاہان قدیم کی عمارات یہاں جیزہ ہی میں واقع ہیں، یہاں پر زمانۂ سابق کا ایک جیل خانہ تھا جس کو سیاہ جیل خانہ کہتے تھے......، یہاں پر ان دنوں ڈیڑھ یا دو سو سے زائد سیاسی لوگ قید تھے، جن میں اکثر حصہ مسلمانوں کا تھا اور کچھ عیسائی بھی تھے، ہندستانی بھی تقریباً آٹھ دس تھے جن میں سے عموماً وہی لوگ تھے جنھوں نے مصر میں بود و باش اختیار کر رکھا تھا، ہم مغرب سے کچھ پہلے یہاں داخل کیے گئے ہماری تلاشی لی گئی ہمارے پاس چھری یا استرہ وغیرہ جو کچھ تھا وہ لے لیا گیا اور نقد سے استفسار کیا گیا، اس وقت ہمارے پاس (۸۱) پونڈ انگریزی اور کچھ نقد رقم تھی جن کو ہم نے بنظر احتیاط مکۂ معظمہ سے ساتھ لے لیا تھا اور تقریباً چالیس پونڈ چھوڑ دیا تھا کہ اگر ضرورت پڑی تو پھر منگالیں گے وہ سب لے لیے گئے اور بد امانت رکھ لیے گئے اور کہا گیا کہ جب تم کو ضرورت ہوا کرے گی ملا کرے گا۔

ہم کو اندرون قید خانہ جہاں قیدی رہتے تھے شب کو داخل نہیں کیا گیا بلکہ دیوار ہائے قید خانہ کے اندر قیدیوں کے کٹہرے سے باہر ایک خیمہ کھڑا کر دیا گیا اور اس میں چار پائیاں بچھادی گئیں اور کھانا چائے وغیرہ ہم کو دی گئی، چائے تو حقیقت میں سیاسی قیدیوں میں سے حاجی غلام نقشبند کا بلی وغیرہ حضرات نے بھیجی مگر کھانا ترکی مطبخ میں سے گورنمنٹ کی طرف سے آیا۔ رات بخیر و عافیت ہم نے خیمے میں گزاری۔ وہ ایام مصر میں سخت سردی کے تھے اور ہم مکۂ معظمہ سے جو کہ گرم جگہ ہے گئے تھے، مگر چوں کہ ہمارے پاس کپڑے ہر قسم کے موجود تھے اس لیے کوئی سخت تکلیف نہ ہوتی تھی،

۱۸ر جنوری ۱۹۱۷ء: صبح کو ہم سے بلا کر پوچھا کہ یہ مقدار نقد کس کے نام سے لکھی جائے۔ ہم سبھوں نے اتفاق سے کہہ دیا کہ ہم پانچوں کے مشترک ہیں کسی خاص نام کو مناسب نہ سمجھا گیا اس کے بعد ہماری چار پائیاں ایک طویل کمرے میں داخل کر دی گئیں اور باہر سے دروازہ لوہے کی

سلاخوں کا مضبوط تھا اور حضرت مولانا رحمۃ اللہ علیہ کو اول وہاں کے دفتر میں لے گئے پھر وہاں سے شہر میں جہاں جنگی دفتر اور مرکز تھا دو سپاہیوں کی حفاظت میں ٹریموے میں لے گئے کیوں کہ جگہ بہت دور تھی ایک کمرہ میں مولانا کو داخل کیا گیا جو کہ چھوٹا سا تھا اس میں تین نشستیں تین انگریزوں کی تھیں، دو ان میں سے اردو نہایت صاف بولتے تھے، سمجھتے تھے۔ مولانا مرحوم کی ڈائری بہت زیادہ تھی اتفاق سے مولانا کو اس وقت کچھ پیشاب کا تقاضا تھا کچھ تنہائی رفقاء کا خیال کچھ انگریزوں اور دنیاوی حکم سے نفرت، اس نے اولاً مولانا کا نام اور پتا وغیرہ پوچھنا شروع کیا اور پھر دوسری باتیں پوچھیں۔ مولانا نے نہایت مختصر اور محض اکھڑے ہوئے طریقہ پر بلا التفات وتوجہ کے جوابات دیے جس طریقے کو غالباً اس نے تمام عمر میں کہیں دیکھا نہ تھا، اس وجہ سے اس نے حکیم نصرت حسین صاحب سے شکایت کی اور کہا کہ غالباً مولانا کو کبھی حکام سے ملنے اور ان سے طرزِ معاشرت کا سابقہ نہیں پڑا ہے، اس نے پتا وغیرہ لکھنے کے بعد سوالات کیے:

سوال مستنطق: آپ کو شریف نے کیوں گرفتار کیا؟

جواب مولانا: اس کے محضر پر دستخط نہ کرنے کی بناء پر

سوال مستنطق: آپ نے اس پر کیوں نہ دستخط کیے؟

جواب مولانا: مخالف شریعت تھا۔

مستنطق: آپ کے سامنے مولوی عبدالحق حقانی کا فتویٰ ہندوستان میں پیش کیا گیا تھا؟

مولانا: رد کر دیا۔

مستنطق: کیوں۔

مولانا: مخالف شریعت تھا۔

مستنطق: آپ مولوی عبیداللہ کو جانتے ہیں؟

مولانا: ہاں

مستنطق: کہاں سے؟

مولانا: انھوں نے دیوبند میں مجھ سے عرصۂ دراز تک پڑھا ہے۔

مستنطق: وہ اب کہاں ہیں؟

مولانا: میں کچھ نہیں کہہ سکتا، میں عرصہ ڈیڑھ سال سے زیادہ ہوتا ہے کہ حجاز وغیرہ میں ہوں۔

مستنطق: ریشمی خط کی کیا حقیقت ہے؟

مولانا: مجھ کو کچھ علم نہیں، نہ میں نے دیکھا ہے۔

مستنطق: وہ لکھتا ہے کہ آپ اس کی سیاسی سازش میں خلاف برطانیہ شریک ہیں۔ اور آپ فوجی کماندار ہیں؟

مولانا: وہ اگر لکھتا ہے تو اپنے لکھنے کا وہ خود ذمہ دار ہوگا، بھلا میں اور فوجی کمانداری! میری جیسی حالت ملاحظہ فرمایئے اور پھر عمر کا اندازہ کیجیے، میں نے تمام عمر مدرسہ کی مدرسی میں گزاری، مجھ کو فنون حربیہ اور فوج کی کمان سے کیا مناسبت!

مستنطق: اس نے دیوبند میں جمعیۃ الانصار کیوں قائم کی تھی؟

مولانا: محض مدرسہ کے مفاد کے لیے۔

مستنطق: پھر کیوں علاحدہ کیا گیا؟

مولانا: آپس کے اختلاف کی وجہ سے۔

مستنطق: کیا اس کا مقصد اس جمعیت سے کوئی سیاسی امر نہ تھا؟

مولانا: نہیں۔

مستنطق: غالب نامہ کی کیا حقیقت ہے؟

مولانا: غالب نامہ کیسا؟

مستنطق: غالب پاشا گورنر حجاز کا خط جس کو محمد میاں لے کر حجاز سے گیا ہے اور آپ نے غالب پاشا سے اس کو حاصل کیا ہے۔

مولانا: مولوی محمد میاں کو میں جانتا ہوں وہ میرا رفیق سفر تھا، مدینۂ منورہ سے مجھ سے جدا ہوا ہے وہاں سے لوٹنے کے بعد اس کو جدہ اور مکۂ میں تقریباً ایک ماہ ٹھہرنا پڑا تھا، غالب پاشا کا خط کہاں ہے جس کو آپ میری طرف منسوب کرتے ہیں؟

مستنطق: محمد میاں کے پاس ہے۔

مولانا: مولوی محمد میاں کہاں ہے؟

مستنطق: وہ بھاگ کر حدود افغانستان میں چلا گیا ہے۔

مولانا: پھر آپ کو خط کا پتا کیوں کر چلا؟

مستنطق: لوگوں نے دیکھا

مولانا: آپ ہی فرمائیں کہ غالب پاشا گورنر حجاز اور میں ایک معمولی آدمی، میرا وہاں تک

کہاں گزر ہوسکتا ہے، پھر میں ناواقف شخص، نہ زبان ترکی جانوں، نہ پہلے سے ترکی حکام سے کوئی ربط وضبط، حج سے چند دن پہلے مکۂ معظمہ پہنچا، اپنے امور دینیہ میں مشغول ہوگیا، غالب پاشا اگرچہ حجاز کا گورنر تھا مگر طائف میں رہتا تھا، میری وہاں تک رسائی نہ حج کے پہلے ہوسکتی تھی نہ بعد از حج یہ بالکل غیر معقول بات ہے، کسی نے یوں ہی اڑائی ہے۔

مستنطق: آپ نے انور پاشا اور جمال پاشا سے ملاقات کی؟

مولانا: بے شک۔

مستنطق: کیوں کر؟

مولانا: جب وہ مدینۂ میں ایک دن کے لیے آئے تھے تو صبح کے وقت انھوں نے مسجد نبوی میں علماء کا مجمع کیا مجھ کو بھی حسین احمد اور وہاں کے مفتی اس مجمع عام میں لے گئے اور اختتام مجمع پر انھوں نے دونوں وزیروں سے مصافحہ کرا دیا۔

مستنطق: آپ نے اس مجمع میں کوئی تقریر کی؟

مولانا: نہیں۔

مستنطق: کیوں؟

مولانا: مصلحت نہ سمجھی۔

مستنطق: مولوی خلیل احمد صاحب نے تقریر کی؟

مولانا: نہیں۔

مستنطق: حسین احمد نے کی؟

مولانا: ہاں

مستنطق: پھر کچھ انور پاشا نے آپ کو دیا؟

مولا: ہاں اتنا معلوم ہوا تھا کہ حسین احمد کے مکان پر ایک شخص پانچ پانچ پونڈ لے کر انور پاشا کی طرف سے آئے تھے۔

مستنطق: پھر آپ نے کیا کیا۔

مولانا: حسین احمد کو دے دیا تھا۔

مستنطق: ان کاغذات میں لکھا ہے کہ آپ سلطان ترکی اور ایران اور افغانستان میں اتحاد کرانا چاہتے ہیں اور پھر ایک اجتماعی حملہ ہندوستان پر کرا کے ہندوستان میں اسلامی حکومت قائم

کرانا چاہتے ہیں اور انگریزوں کو ہندوستان سے نکالنا چاہتے ہیں؟

مولانا: میں تعجب کرتا ہوں کہ آپ کو بھی حکومت کرتے ہوئے اتنے دن گزر چکے ہیں کیا آپ گمان کر سکتے ہیں کہ میرے جیسے گمنام شخص کی آواز پادشاہوں تک پہنچ سکتی ہے اور پھر کیا سالہا سال کی ان کی عداوتیں میرا جیسا شخص زائل کرا سکتا ہے اور پھر اگر زائل بھی ہو جاویں تو کیا ان میں ایسی قوت ہے کہ جو اپنے ملک کی ضرورتوں سے زائد سمجھ کر ہندوستان کی حدود میں فوجیں پہنچا دیں اور اگر پہنچا بھی دیں تو آیا ان میں آپ سے طاقت جنگ کی ہوگی؟

مستنطق: فرماتے تو آپ سچ ہیں مگر ان کاغذات میں ایسا ہی لکھا ہے۔

مولانا: اس سے آپ خود سمجھ سکتے ہیں کہ اس میں کی باتیں کس قدر پالیۂ اعتبار رکھ سکتی ہیں؟

مستنطق: شریف کی نسبت آپ کا کیا خیال ہے؟

مولانا: وہ باغی ہے۔

مستنطق: حافظ احمد صاحب آپ کو جانتے ہیں؟

مولانا: ''خوب'' وہ میرے استاذ زادے ہیں اور بہت سچے اور مخلص دوست ہیں۔ میری تمام عمر ان کے ساتھ گزری ہے۔

غرضے کہ اسی قسم کے بہت سے سوالات وہ کرتا رہا۔ حدود افغانستان اور قبائل و نیز کابل وغیرہ کی نسبت بھی سوالات کیے۔ مولانا بھی مختصر مختصر جملوں میں مگر نہایت بے رخی کے ساتھ جواب دیتے رہے۔ وہ سب کو انگریزی میں لکھتا رہا اور پھر مولانا کو جیل میں واپس کر دیا۔ مگر مولانا جیل میں واپس جانے کے بعد ہمارے پاس نہیں لائے گئے بلکہ اندر جیل خانہ میں بھیج دیے گئے......

(حضرت شیخ الاسلامؒ نے اس مقام پر قید تنہائی کی حالت اور وہاں کے کھانے پینے وغیرہ کے انتظامات کے بارے میں تفصیل کے ساتھ لکھا ہے۔ تفصیلی مطالعے کے لیے ''سفر نامۂ اسیر مالٹا'' سے رجوع کرنا چاہیے۔)

تفکرات:

مولانا کو تو کوٹھڑی کے اندر بند کر دیا گیا مگر ہم کو یہی خیال ہوا کہ مولانا کو اندر لے جا کر جملہ اسیروں کے ساتھ کسی بارک میں چھوڑ دیا گیا ہوگا۔ مولانا نے اپنی ضروریات قرآن شریف دلائل الخیرات، تسبیح وغیرہ طلب فرمائی۔ ہم نے یہ چیزیں اور چند پان اور لوٹا وغیرہ بھیج دیا۔ ہم کو معلوم نہ تھا کہ مولانا کوٹھڑی میں بند ہیں، مولانا کو قدرے پانوں کی وجہ سے تکلیف ہوئی مگر حتی الوسع خبر گیری رکھی گئی۔ مولانا مرحوم جب وہاں بند ہو گئے تو یہ خیال ہوا کہ مجھ کو سزائے پھانسی دی جائے گی کیوں کہ مشہور ہے کہ جس کے لیے پھانسی کا حکم ہوتا ہے اس کو کال کوٹھڑی میں رکھا جاتا ہے۔
مولانا مرحوم کو اپنی جان کی کوئی فکر نہ تھی جیسا کہ ان کے کلام سے معلوم ہوا، فقط ان کو دو فکر تھے، ایک یہ کہ میری وجہ سے یہ چند رفقاء بھی اذیت اور تکالیف میں پڑے ہیں، خدا جانے ان کے ساتھ کیا معاملہ کیا جائے اور دوسرا وہ تھا جو کہ حقیقت میں اہل بصیرت اور بڑے مرتبہ والوں کو ہوا کرتا ہے۔ یعنی چوں کہ بارگاہِ الٰہی نہایت بے نیاز بارگاہ ہے جس کے استغناء اور علو نے تمام اکابر کو ان کے درجہ کے موافق بے چین کر رکھا ہے۔
چناں چہ مولانا کو یہ پریشانی بہت زیادہ پریشان رکھتی تھی، چھٹے یا ساتویں روز جب کہ ہم سب اس ہوا خوری کی جگہ میں جمع ہوئے اور نہایت آزادی سے ہر ایک نے اپنے احوال بیان کیے اور مولانا کے افکار کا حال معلوم ہوا تو مولانا سے بعض خدام نے سبب پوچھا کیوں کہ اس مدت میں مولانا نے بالکل کھانا نہیں کھایا کثرتِ افکار اور استغراقِ باطنی کی بناء پر کھانا ویسا ہی واپس ہو جاتا

تھا، فقط چائے پیتے تھے اور پان کھاتے رہتے تھے ممکن ہے کہ کبھی ایک دولقمہ روٹی کھالی ہو مگر مجھ کو جہاں تک معلوم ہے، نہ اس مدت میں کھانا کھایا نہ قضائے حاجت فرمایا۔ البتہ پیشاب برابر کرتے رہے۔ ان کو ہمیشہ سے غذا کی تقلیل میں بہت سرگرمی تھی اسی وجہ سے قلت غذا ان کی طبیعت ثانیہ ہوگئی تھی فرمایا کہ مجھ کو برابر یہ خیال دامن گیر رہا کہ میری وجہ سے تم سب بھی پکڑے گئے اور پھر اس خیال نے کہ غالباً ہم سبھوں کو سزائے موت دی جائے گی اور بھی بے چین کر دیا تھا، میرا کچھ نہیں تھا میں اپنی طبعی عمر سے تجاوز کر چکا ہوں مگر تم سب کی طرف سے بہت بڑا خیال تھا اور ہے کہ تم سب نوعمر میری وجہ سے گرفتار ہوئے۔ خدام نے عرض کیا کہ یہ سب خدا کے راستے میں واقع ہوا ہے، پھر کیا فکر ہے...... عام طور سے ہم سب کو یقین یا ظن غالب پھانسی کا تھا، مولوی عزیز گل صاحب تو اپنی کوٹھڑی میں رہ رہ کر اپنی گردن اور گلے کو پھانسی کے لیے ناپتے اور دباتے تھے تاکہ ذرا عادت ہو جائے اور پھانسی کے وقت یک بارگی تکلیف سخت پیش نہ آئے اور تجربہ کرتے تھے کہ دیکھوں کس قسم کی تکلیف ہوتی ہے، مگر سب کے دل نہایت مطمئن تھے گویا کہ نانی کے گھر میں آرام کر رہے ہیں۔

بیانات:

۱۹؍جنوری ۱۹۱۷ء: ۲۴؍ربیع الاول ۱۳۳۵ھ مطابق ۱۸؍جنوری ۱۹۱۷ء (پنج شنبہ) کو مولانا کے اظہار لیے گئے اور اسی دن وہ قید تنہائی یعنی کال کوٹھڑی میں جس کو اہل مصر (زنزنہ) کہتے ہیں بند کر دیے گئے اور بروز جمعہ مجھ کو کچہری میں بلایا اور مجھ سے اظہارات لیے گئے۔ میں چوں کہ ہمیشہ سے فضول گو اور کثیر الکلام ہوں، میں نے زمین و آسمان کے قلابے بہت کچھ ملائے۔ میرا بیان دو دن تک لکھتا رہا اور بار بار کہتا تھا کہ تم لوگوں کی نسبت ہمارے کاغذات میں باتیں تو پھانسی کی ہیں مگر تم اقرار نہیں کرتے۔

شریف کی بغاوت، مسئلہ خلافت کے متعلق ٹرکی حکومت سے اسلامی علائق وغیرہ کی نسبت سب کے بیان بحمد اللہ ایک ہی رہے، کوئی بھی حق کہنے سے نہیں ٹلا البتہ جو دوسرے اتہامات یا افواہیں تھیں ان کا مناسب جواب سب نے دیا، سب سے اخیر میں یہ بھی پوچھا گیا کہ گورنمنٹ کے لیے تم کوئی مشورۂ خیر دیتے ہو تو غالباً سبھوں نے کہا کہ ہاں شریف کی مدد نہ کی جائے اور سلطان سے لڑائی نہ کی جائے اس میں گورنمنت کا بڑا نقصان ہوگا، آخر کار مجھ کو بھی ایک دوسری

کوٹھری میں جو مولانا کی کوٹھری کے بعد تھی رکھا گیا۔

۲۲/۲۱ جنوری ۱۹۱۷ء: پھر وحید سے اظہار لیے گئے اور مولوی عزیز گل صاحب سے، اخیر میں حکیم نصرت حسین صاحب کو بلایا گیا اور ان سے کہا کہ میں تمھاری نسبت کچھ ڈایری میں نہیں پاتا، انھوں نے کہا کہ جناب میں تو حقیقت میں ان جملہ اشخاص خصوصاً مولانا کی طرح بالکل بے قصور ہوں، مگر بات یہ ہے کہ مولانا بڑے آدمی ہیں اس وجہ سے اصحاب اغراض کو ان سے اور ان کے خدام سے مقاصد اور اغراض ہیں اس لیے مولانا کی نسبت افواہیں مشہور کی گئی ہیں۔

حکومت کے متعلق اور گورنمنٹ سے اس کے ناجائز تعلقات کی برائی میں انھوں نے خوب تفصیلی بیان دیا مگر بالکل خیر خواہانہ طریقے پر، وہ مقدمہ بازی اور قانون وغیرہ سے واقف تھے اور انگریزی بھی جانتے تھے آخر کار ان کو بھی کوٹھڑی میں سب سے اخیر میں بھیجا گیا مگر چوں کہ کوٹھڑیاں فقط چار خالی تھیں اور ہم پانچ آدمی تھے اس لیے ان کی چارپائی مولانا مرحوم کی کوٹھڑی میں رکھی گئی۔

۲۴/۲۵ جنوری ۱۹۱۷ء: جس روز وہ وہاں لائے گئے تو انھوں نے ہم سبھوں پر جو واقعات ہوئے تھے مولانا کو اجمالاً سنائے اور کہا کہ اور باقی رفقاء بھی انھی کوٹھڑیوں میں ہیں، وضو وغیرہ میں اعانت بھی کی اس وقت مولانا مرحوم کے افکار میں کسی قدر کمی ہوئی اس روز ان کے اصرار پر مولانا نے کچھ کھایا بھی اور چارپائی پر راحت فرمائی ان چھ سات دنوں تک مولانا نے چارپائی پر کمر بھی نہیں لگائی تھی۔

چارپائی کے پائتیں زمیں پر کمبل بچھا کر بیٹھ گئے اور قرآن اور دلائل الخیرات، تسبیح، مراقبہ، نماز وہیں کمبل پر سب مشاغل ادا کرتے تھے، مراقبہ میں بیٹھے بیٹھے کچھ نیند آگئی آگئی ورنہ استراحت بالکل نہیں فرمائی۔ ہم میں سے کوئی نہ ان کو دیکھ سکتا تھا نہ وہ ہم کو دیکھ سکتے تھے اور نہ آپس میں باتیں کر سکتے تھے۔ تمام مدت اسارت میں یہ سات آٹھ دن نہایت سخت ہم سبھوں پر گزرے مگر سب سے زیادہ سختی مولانا مرحوم پر ہوئی اس کے بعد معاملہ روزانہ آسان ہی ہوتا رہا...... جب سبھوں کے بیانات ہو گئے تو ساتویں دن صبح کو ہم سبھوں کو ہوا خوری کے لیے ایک ہی گھنٹہ میں کھولا گیا اور سب کو مجتمعاً اس جگہ میں جہاں روزانہ ٹہلتے تھے بند کیا گیا، اس وقت کی خوشی کو نہ پوچھیے۔

چوں کہ ہم سب ایک تو نو گرفتار، دوسرے ایسے وقائع سے بالکل ناتجربہ کار تھے، تیسرے

ہمارے اذہان یہاں تک پہنچے ہی نہ تھے کہ گورنمنٹ کو لوگوں نے اس درجہ ہم سے بدظن کیا ہے، جو تھے اس وقت تک بھی گمان تھا کہ ہماری گرفتاری محض شریف کی شکایت اور اس فتوے (محضر) کی مخالفت کی وجہ سے ہوئی ہے کہ گورنمنٹ کو اگرچہ مولانا سے بدگمانی ہے مگر اس کو یہاں تک پرخاش اور بدظنی نہیں کہ ہم کو حجاز سے پکڑوادے اس لیے ہم سبھوں نے آپس میں جو کچھ سوچ لیا تھا اور اتفاقی رائے پاس کی تھی وہ یہی تھی کہ ہم سے شریف اور اس کے افعال اور فتوے کے متعلق پوچھا جائے گا اس میں بلاخوف اور بے ہراس وہ حق جس کو ہم کل کو خداوند اکرم کے سامنے کہیں گے اور کہہ سکیں گے ظاہر کردیں گے، باقی وہ امور جن کی نسبت ہم سے یہاں (مصر) اظہار کے وقت پوچھا گیا ان میں سے بہت سی باتوں کا تو علم ہی نہ تھا اور اگر کسی بات کا کسی درجہ تک علم تھا تو نہ اس قدر جس قدر کہ گورنمنٹ کو پہنچایا گیا۔ اس لیے نہ تو ان امور کے متعلق آپس میں کبھی گفت وشنید کی نوبت آئی اور نہ کوئی متحدہ رائے قرار پائی۔ اب اظہار جو اس خاص طریقے سے لیا گیا تو کوئی بھی دوسرے کو کسی قسم کی خبر نہ دے سکا تاکہ سوچا جاتا اس لیے اس وقت (اظہار کے وقت) جو جس کی سمجھ میں آیا یا جس قدر معلوم تھا کہہ دیا گیا۔ اب سب کو یہ فکر دامنگیر ہوئی کہ نہ معلوم ان امور کی نسبت حضرت مولانا رحمۃ اللہ علیہ نے کیا فرمایا ہے اور دوسرے رفقاء نے کیا کہا ہے۔ مبادا بیان میں تخالف ہو تو مشکل کا سامنا ہوگا، خصوصاً وحید بالکل نوعمر اور ناتجربہ کار تھا اس لیے ہر ایک اپنی اپنی جگہ پر کثرت افکار کی وجہ سے بے چین تھا جس روز ہم سبھوں کو ایک ہی وقت ہوا خوری کی جگہ میں داخل کیا گیا سب نے اس خاص بات کی طرف توجہ کی اور ایک دوسرے کے بیان کو پوچھا تو معلوم ہوا کہ خدا کے فضل وکرم سے اور حضرت مولانا رحمۃ اللہ علیہ کی برکت سے سبھوں کے بیانات تقریباً متفق ہیں گویا کہ ایک مشورے سے ہوئے ہیں، چھوٹوں میں بھی استقلال اور صداقت، بڑوں جیسا پایا گیا بلکہ کچھ زیادہ۔ مولوی عزیر گل صاحب سے سرحد کے واقعات قبائل کے احوال سید احمد صاحب شہید مرحوم ومغفور کے قافلے کی خبریں، حاجی صاحب ترنگ زئی (حاجی عبدالغفور صاحب) سرحد کے بڑے پیر ہیں وہ اس زمانے میں انگریزی علاقہ سے اپنے اہل وعیال کو لے کر یاغستان میں چلے گئے تھے اور وہاں جا کر مشہور ہوا تھا کہ انھوں نے جہاد قائم کیا ہے) مولوی سیف الرحمان صاحب، مولوی عبیداللہ صاحب، مولوی محمد میاں صاحب وغیرہ وغیرہ حضرات کے متعلق زمین آسمان کی واہی تباہی باتیں پوچھیں، جن کا نہ سر تھا نہ پیر، مگر مولوی صاحب نے نہایت استقلال سے اپنے روایتی اکھڑپنے سے سب کا جواب دیا اور بہت ہی متین جواب دیا۔

الغرض ہم سبھوں کو آپس کے بیانات معلوم کر کے اور یہ کہ کوئی تخالف نہیں ہوا، بہت خوشی ہوئی جو کچھ افکار تھے وہ اس روز عموماً دور ہو گئے ہر ایک کو ایک درجہ اطمینان کا حاصل ہو گیا، ہم وہاں کے کمانڈر جیل سے اپنی ضروریات کے لیے نقد منگاتے تھے جس کو شمع وغیرہ میں بھی خرچ کرتے اور دل کھول کر مصارف کرتے تھے اس لیے ہمارے ساتھ ان دنوں اتنی رعایت ضرور ہونے لگی کہ ہم کو اس ہوا خوری کے پنجرے میں صبح سے داخل کر دیتے تھے اور شام کو چار بجے تک وہاں ہی چھوڑ دیتے تھے یا کبھی قضائے حاجت کے لیے پاس کے پاخانہ میں جانے دیتے تھے۔ چائے وغیرہ اور کھانا صبح کا وہیں اکٹھا لا کر دے دیتے تھے جس کو ہم عموماً مجتمعاً کھاتے تھے......، کچھ دنوں کے بعد ہم سبھوں کو شہر میں لے گئے اور ایک جگہ ہم سبھوں کو فوٹو لیا گیا، کیوں کہ اب پاسپورٹ میں ہر ایک کا فوٹو بھی رہتا ہے خصوصاً ایام جنگ میں اور پھر اسیروں کے لیے خاص طور سے اس کا اہتمام تھا۔ دوسرے دن، ہم کو دوسرے محکمہ میں لے گئے جہاں پر ہماری تشخیصات وغیرہ لکھی گئیں اور تمام انگلیوں اور انگوٹھوں کے نشان لگوائے گئے ہم کو ان سب باتوں کے ہوتے ہوئے کچھ نہیں معلوم تھا کہ ہمارے ساتھ استقبال میں کیا ہونے والا ہے ہم یہ خواہش کرتے تھے کہ ہم کو انھی حجروں میں وہاں ہی رکھیں مگر دیگر اسیروں کی طرح جیل میں آزاد ہوں......''

''مصر کے مدت قیام میں صوفی مولوی شاہ محمد صاحب الہ آبادی نے ہم کو بعض کتابیں بھی لا دی تھیں جن کی وجہ سے اکثر دل لگی رہتی تھی، ہمارا اسباب وہاں کھولا گیا جو صاف کپڑے تھے وہ چھوڑ دیے گئے باقی سب بھپارے میں ڈس ان فیکٹ (Disinfect) کے لیے بھیج دیے گئے، دوائیں سرمہ وغیرہ ضائع کر دی گئیں ایام قیام زنزنہ (کال کوٹھڑی) میں وہ سب مخازن میں محفوظ رکھے گئے، کتابوں کی کوئی پڑتال نہیں کی گئی فقط سرسری طور سے دیکھا گیا اور چھوڑ دیا گیا، اپنے میلے کپڑوں کو ہم نے وہاں ہی کے بعض محتاج اسیروں سے دھلوا لیا۔''

مالٹا کے سفر کی تیاری:

۱۵ر فروری ۱۹۱۷ء: ۱۵ر فروری ۱۹۱۷ء مطابق ۲۳ر ربیع الثانی ۱۳۳۵ھ کو مولانا رحمۃ اللہ علیہ کو ایک ماہ گزر جانے کے بعد جیل کے کمانڈر برٹش حاکم نے بلا کر یہ کہا کہ کل تم مالٹا بھیجے جاؤ گے، ضروری سامان کر لو اور تیار ہو جاؤ ہم نے دو اشرفیاں طلب کیں اور ان کو بھنوا کر جو کچھ چائے وغیرہ کے اخراجات کا ہم پر قرضہ تھا وہ ادا کیا اور باقی تقریباً ڈیڑھ گنی کی تفاریق ساتھ رکھی،

قاہرہ سے اسکندریہ اور مالٹا کی روانگی:

۱۶ رفروری ۱۹۱۷ء: مطابق ۲۴ رربیع الثانی کو صبح کے وقت ہم کو گوروں کی گارد کی حفاظت میں موٹر پر بٹھا کر مع سامان ریلوے اسٹیشن قاہرہ پہنچادیا گیا اور اسی وقت تھرڈ کلاس میں گارد کی حفاظت میں ہم کو اسکندریہ روانہ کر دیا گیا، تقریباً ایک بجے اسی دن اسکندریہ پہنچے۔ اسی وقت بند موٹر لایا گیا اور اس میں بٹھا کر ہم کو اسٹیشن سے گودی پر پہنچادیا گیا، جہاز پر سوار ہونے کا حکم ہوا، جہاز کے بالائی طبقے پر ایک بڑا کمرہ تھا جس کے دونوں طرف چار پائیاں لگی ہوئی تھیں اور اس پر گدے اور کمبل پڑے ہوئے تھے، اور بیچ میں ایک لمبی میز بچھی ہوئی تھی، اس میں داخل کر دیا گیا، اس کی باہر کی کھڑکیاں جن سے ہوا اور روشنی آسکتی تھی بند ہی نہیں بلکہ کیلوں سے مضبوط تختوں سے جڑ بھی دی گئی تھیں دروازے پر تین گورے سپاہیوں کا پہرہ قائم کر دیا گیا، ہم نے جا کر پانچ چار پائیوں پر ایک طرف قبضہ کرلیا، اس کے آخر میں ایک کمرہ بھی تھا جس میں پاخانہ اور غسل خانہ بھی تھا جس میں میٹھا پانی موجود تھا۔

جہاز کے سفر اور اس کے مسافر:

تھوڑا ہی عرصہ ہم کو گزرا تھا کہ بہت سے ترکی فوجی افسر اور سپاہی لائے گئے افسروں کو نیچے کے خاص کمروں میں جو کہ سیکنڈ یا فرسٹ کے تھے رکھا گیا اور سپاہیوں کو جن کی تعداد تقریباً پندرہ سولہ تھی ہماری کمرے میں داخل کر دیا گیا چوں کہ قواعد اسارت میں یہ ہے کہ جب کوئی فوجی افسر اسیر ہو تو اس کو اس کی حسب منشا ایک خادم فوجی دیا جاتا ہے اس لیے یہ سپاہی ان افسروں کے خدام تھے جو کہ سب مسلمان اور نیک مزاج تھے اور عموماً ترکی سپاہی نیک مزاج ہی ہوتے ہیں، یہ سب جب داخل ہوئی اور حضرت مولانا مرحوم کو دیکھا تو نہایت احترام سے پیش آئے۔ انھوں نے ہماری چار پائیوں سے تعرض نہ کیا بلکہ خود باقی ماندہ چار پائیوں پر قابض ہو گئے چوں کہ وہ عدد میں کم تھیں اس لیے ایک ایک پر دو دو قابض ہوئے یہ آپس میں کھیلتے اور گاتے اور کشتی کرتے تالیاں وغیرہ بجاتے تھے جس کو دیکھنے کے لیے انگریزی گورے سپاہی جمع ہو جاتے تھے ان کو دیکھ کر یہ سب اور زیادہ گاتے اور کودتے تھے۔ پھر بعد کو دو تین شخص حضرت مولانا رحمۃ اللہ علیہ کے پاس آئے اور کہا کہ حقیقت میں ہم آپ کی بے حرمتی کرتے ہیں کہ آپ کے سامنے گاتے اور کودتے اور ناچتے ہیں، مگر کیا کریں دشمن دین کافر کے ہاتھ میں اسیر ہو گئے ہیں اگر ہم باادب بیٹھیں تو یہ

کافر خوش ہوں گے اور ہم کو رنجیدہ اور غمگین خیال کریں گے۔ اس لیے ہم اپنی قوت اور اپنی عدم رنجیدگی جتلانے کے لیے ناچتے گاتے ہیں، مولانا نے فرمایا کہ تم خوب کودو اور گاؤ ہماری طرف سے اجازت ہے۔

جب شام کا وقت آیا چوں کہ ہم نے صبح سے کچھ کھایا نہیں تھا تو ایک افسر سے پانی اور کھانے کا تذکرہ حکیم نصرت حسین صاحب نے فرمایا، کیوں کہ وہی انگریزی بول سکتے تھے۔ اس نے کہا کہ اگر تم ہمارا کھانا پکا ہوا کھاؤ تو حاضر ہے۔ انھوں نے حضرت رحمۃ اللہ علیہ سے پوچھ کر جواب دیا کہ تمھارا گوشت اور تمھارا پکا ہوا سالن ہم نہیں کھا سکتے تو اس نے کہا کہ اسی خیال سے ہم کو تمھارے لیے یہاں سے مالٹا تک کے لیے یہ جنس دے دی گئی ہے اس کو لے جاؤ اور جس طرح چاہو خرچ کرو۔ مالٹا تک تم کو اور کوئی چیز نہیں ملے گی۔ جہاز کا باورچی خانہ بتا دیا کہ یہاں پکا لیا کرو اور باورچی سے کہہ دیا کہ جس چیز کو جس طرح یہ پکائیں ان کو مت روکو، چوں کہ آٹے کے پکانے میں دقت بھی تھی اور روٹی کے لینے میں شرعی کوئی قباحت نہ تھی اس لیے اس سے کہا گیا کہ ہم تمھاری پکی ہوئی روٹی لے لیں گے فقط سالن اور چائے وغیرہ ہم خود پکائیں گے وہ اس پر رضی ہو گیا اور فی کس ایک ایک پاؤ روٹی صبح و شام دینے کا حکم کر دیا، باقی جنس اٹھا لائے جس میں چنے کی دال، آلو، اڑد کی دال، گھی، مرچ، دھنیا، ہلدی، چائے، گڑ، چاول وغیرہ تھے، چوں کہ ہمارے پاس تمام سامان پکانے کا موجود تھا اور قدرے جنس بھی اپنی موجود تھی اس لیے اپنی دیگچیوں میں حکیم صاحب مرحوم اور وحید جا کر کھانا پکا لاتے تھے اور ایک جگہ جمع ہو کر کھا لیتے تھے وہ تمام جنس مالٹا تک بھی ختم نہ کر سکے باقی ماندہ جہاز ہی پر چھوڑ کر اتر گئے۔

اسی روز شام کو یعنی ۱۶ ر فروری ۱۹۱۷ء مطابق ۲۴ ر ربیع الثانی ۱۳۳۵ھ کو جہاز اسکندریہ سے روانہ ہوا اس کے آگے آگے ایک جنگی جہاز کروزر اس کی حفاظت کو چلتا تھا اور کبھی کبھی دائیں اور بائیں بھی چکر لگاتا تھا اس پر بہت بڑا اسٹین بورڈ لگا ہوا تھا کہ اس جہاز میں زخمی اور مریض سپاہی ہیں سامان جنگ نہیں ہے، کیوں کہ جرمنی سمرینیں اس زمانے میں بحر سفید میں بھی آگ بوٹوں کو غرق کر رہی تھیں خود اسکندریہ کے بندر پر چند دن پہلے ایک آگ بوٹ غرق کی جا چکی تھی مگر زخمی اور مریض سپاہیوں کو ایذا پہنچانا انسانیت اور معاہدات دول کے خلاف تھا۔ اس لیے ان سے تعرض نہیں کرتی تھیں۔ فقط دول متحاربہ کے جنگی اور ان جہازوں سے تعرض کرتی تھیں جن پر فوج یا سامان جنگ ہو مگر جب برٹش نے اپنے جنگی جہازوں اور فوجی سامانوں کو تجارتی آگ بوٹوں میں

لے جانا اور غیر جانبدار باڈتوں کی آڑ میں شکار کھیلنا شروع کر دیا تو اس نے اعلان کر کے سبھوں کو ڈبونا شروع کر دیا تھا جس کی بنا پر اس کو وحشی غیر متمدن بنایا جارہا تھا۔ یہ وہ زمانہ ہے کہ کوئی جہاز سمندر میں باامن وبلا خوف سفر نہیں کر سکتا تھا۔

پر آشوب دور، خطرناک سفر:

جب ہمارا جہاز شب کو اسکندریہ کی پورٹ سے روانہ ہو گیا تو تھوڑے ہی عرصے کے بعد ہر ایک شخص کو کاگ (جس کی ڈاٹ بوتلوں میں ہوتی ہے) کی پیٹیاں دی گئیں۔ یہ پیٹیاں کاگ کی لکڑیوں کے ٹکڑے سے جو کہ کپڑوں میں سلی اور جڑی ہوتی ہیں بنائی جاتی ہیں۔ جہاز کے ڈوبنے کے وقت گلے یا کمر میں پڑے رہنے کی وجہ سے آدمی ۲۴ گھنٹے یا اس سے زیادہ تک نہیں ڈوبتا اور پھر جتنے آدمی اس آگ بوٹ میں تھے خواہ جہاز راں یا فوجی یا اسیر وغیرہ سب کے سب مختلف کشتیوں پر تقسیم کر دیے گئے اور سب کو کشتیوں کے نمبر اور جگہ بتادی گئی اور کہہ دیا گیا کہ جب سیٹی ہو ہر شخص ان پیٹیوں کو گلے میں فوراً ڈال کر اپنی اپنی کشتی پر بلا تاخیر پہنچ جائے خواہ دن ہو خواہ رات کسی وقت ان پیٹیوں کو اپنے سر سے دور نہ کرے چناں چہ انگریزی افسر وغیرہ ان کو ہر وقت گلے میں ڈالے رکھتے تھے، حتیٰ کہ کھانے اور چلنے کے وقت بھی ان کی یہی حالت تھی، کثرت خوف کی وجہ سے بعض لوگ سخت پریشان تھے۔ اس کے لیے امتحان بار بار کیا گیا اور سیٹیاں دی گئیں ہر ایک اپنی کشتی پر پہنچ گیا، حضرت مولانا رحمۃ اللہ علیہ نے بھی اپنے خدام کو جو خاص تبرکات اپنے اکابر کے تھے بانٹ دیے۔ بایں وجہ کہ خدا جانے کیا واقعہ پیش آئے اور پھر کون مرے اور کون بچے۔ ہر ایک ایک ایک تبرک اپنے پاس رکھے حضرت رحمۃ اللہ علیہ کے پاس حضرت قطب العالم حاجی امداد اللہ (مہاجر مکی) اور حضرت شمس الاسلام مولانا محمد قاسم (نانوتوی) اور حضرت شمس العلماء وفضلا مولانا رشید احمد (گنگوہی) قدس اللہ اسرارہم کے خاص خاص تبرکات اور ناخن اور بال تھے۔ سب کو ایک ایک لباس اور ناخن اور بال دیے اور خود بھی اپنے پاس رکھا، کاتب الحروف کو حضرت مولانا گنگوہی قدس اللہ سرہ العزیز کی روئی کی وہ کمری عنایت فرمائی جو کہ بوقت وصال آپ کے جسم مبارک پر تھی۔ مالٹا پہنچنے کے بعد جب سب تبرکات واپس ہوئے۔ اس کو میں نے واپس نہیں کیا بلکہ اب تک میرے پاس محفوظ ہے۔ مولانا رحمۃ اللہ علیہ سے کہہ دیا کہ اس کو میں واپس نہ کروں گا، آپ نے بھی کچھ اصرار نہ فرمایا۔

تمام جہاز کے لوگ عموماً اور ہم سب خصوصاً ہر وقت موت کے لیے تیار رہے، لوگوں کو رات اور دن یہی خیال رہتا تھا کہ خدا جانے کب سمرین جہاز پر گولہ پھینک دے۔ بعض مقامات تو بہت زیادہ خطرے کے گزرے مگر بایں ہمہ مولانا رحمۃ اللہ علیہ پر کسی قسم کی گھبراہٹ اور اضطرار کا ظہور نہ تھا۔ ہم سبھوں کے قلوب پر بھی ان کی برکت سے اطمینان تھا۔ اسی طرح سے چار دن برابر گزر گئے۔

ترکی افسر جو کہ فرسٹ اور سیکنڈ میں تھے اوپر صبح کو ہوا خوری کو آتے تھے اس وقت ہمارا بھی کمرہ کھول دیا جاتا تھا ہم بھی ہوا خوری کو نکالے جاتے تھے ان لوگوں نے ہندوستانی اشخاص اسیر دیکھ کر تعجب کیا چوں کہ پہلے سے ان لوگوں کی اور ہماری کوئی جان پہچان نہ تھی اس لیے انھوں نے ہم کو اور ہم نے ان کو تفصیلی پتے اور وجوہ کے ذکر کرنے کی تکلیف دی۔ معلوم یہ ہوا کہ یہ افسر عموماً فوجی تھے۔ بعض کرنیل، بعض میجر، بعض لیفٹیننٹ کپتان وغیرہ جو کہ عراق، یمن، حجاز وغیرہ سے پکڑے گئے تھے، ان ترکی افسروں نے حضرت مولانا سے خصوصاً اور ہم سبھوں سے عموماً نہایت محبت کا برتاؤ کیا اور جب تک مالٹا میں رہے بہت زیادہ الفت اور مودت سے ملتے رہے۔

مالٹا کی منزل مقصود:

۲۱؍فروری ۱۹۱۷ء: جہاز جمعرات کی شام کو روانہ ہو کر دوشنبہ کی صبح کو تقریباً دس بجے ۲۱؍فروری ۱۹۱۷ء مطابق ۲۹؍ربیع الثانی ۱۳۳۵ھ کو مالٹا میں لنگر انداز ہوا، مگر تقریباً چار بجے تک کوئی ہمارے اترنے کی فکر نہیں ہوئی، چار بجے کے بعد ہم اتارے گئے اول ترکی افسر اور سپاہی اترے پھر ہم کو اترنے کا حکم ہوا، ترکی افسروں نے اپنے سپاہیوں کو حکم دیا کہ تم ان کے سامان اتر واؤ۔ انھوں نے ہاتھوں ہاتھ ہمارا سامان اتار دیا اور پھر کنارے پہنچ کر افسروں کو دوسرے راستے سے موٹر پر ان کے جائے قیام یعنی دال فرسٹہ پر بھیج دیا گیا اور حضرت مولانا رحمۃ اللہ علیہ کو وہ انگریز افسر جو اتارنے کے لیے آیا تھا اپنے ساتھ اکے پر بٹھا کر لے گیا باقی ہم چاروں آدمی اور جملہ سپاہی پیدل کیمپ تک گئے۔ ہمارا اسباب موٹر پر گیا۔ (سفرنامۂ اسیر مالٹا: ص ۶۸-۶۳)

(اس مقام پر حضرت شیخ الاسلام نے مالٹا کے قلعے (اسارت گاہ)، اس کی عمارتوں، قیدیوں کی تفصیل، کیمپوں میں دکانوں، دفتر، ہسپتال، مریضوں سے ملنے کے قواعد، کیمپوں کے انتظام، اشیاء رسد کی فراہمی۔ قیدیوں کی آپس میں ملاقاتوں کے ضابطوں، ڈاک کے انتظام وغیرہ کا بہ تفصیل تعارف کرایا ہے۔ تفصیلی مطالعے کے لیے ''سفرنامہ اسیر مالٹا'' سے رجوع کرنا چاہیے۔)

اسرا تعداد اور نشان:

مجموعہ اسرا کا تقریباً تین ہزار تھا جن میں اکثر جرمنی تھی یعنی تقریباً نصف حصہ جرمن تھے جو کہ عموماً سویلین تھے اور مصر و سوڈان وغیرہ سے پکڑے گئے تھے اور باقی فوجی تھے جو مختلف افریقہ کے میدانوں وغیرہ سے ہاتھ آئے تھے۔ انھی میں ایڈن جہاز کے لوگ بھی تھے اور باقی ماندہ آسٹرین، بلغاری، ترکی، مصری شامی وغیرہ تھے، عموماً جو لوگ مشرقی محاذ سے پکڑے جاتے تھے، وہ قبرص، اسکندریہ، مصر وغیرہ سے اور جو لوگ عراق (ماسوپوٹامیا) سے پکڑے جاتے تھے وہ برہما، ہندوستان کے مختلف مقامات میں بھیجے جاتے تھے، مگر ان لوگوں میں جن کو زیادہ خطرناک شمار کیا جاتا تھا، ان کو مالٹا میں بھیجا گیا تھا، چناق قلعہ (درہ دانیال) سے بھی لوگ یہاں لائے گئے تھے، ان کو جب داخل کیا جاتا تھا تو ان کو نمبر بتلا دیا جاتا تھا اور ایک کاغذ ان کے نمبر کا دے دیا جاتا تھا تاکہ بوقت ضرورت تمیز ہو سکے۔ چناں چہ ہمارے ساتھ بھی یہی کیا گیا اور ہمارے نمبر حسب ذیل تھے۔ مولوی عزیر گل نمبر ۲۲۱۵ حکیم نصرت حسین نمبر ۲۲۱۶ حسین احمد نمبر ۲۲۱۷ وحید احمد نمبر ۲۲۱۸ حضرت مولانا نمبر ۲۲۱۹۔

اسرا تفریح:

ان جملہ اسراء کو خواہ وہ سویلین ہوں یا فوجی افسر ہوں یا سپاہی اسارت گاہ سے باہر جانے کی کسی وقت میں اجازت نہ تھی البتہ آپس میں دو گھنٹہ کی مقدار دس بجے سے بارہ بجے تک مل سکتے تھے۔ ہاں بعض لوگوں کو خاص طور سے دوسرے وقت بھی اجازت دو بجے سے چار بجے تک دی جاتی تھی جن کو کوئی تحریر آفس سے دے دی جاتی تھی یا اس کیمپ کے سارجنٹ سے کہہ دیا جاتا تھا کہ ہفتے میں دو چار دن یا پورے ہفتے بھر اس کو دو بجے سے چار بجے تک فلاں کیمپ میں لے جایا کرو، چناں چہ ہم لوگوں کو بھی اخیر میں ہفتے میں تین دن کی اجازت اس طرح پر مل گئی تھی، علاوہ اس کے تفریح کے لیے بھی روز ایک مقدار اسیروں کی جایا کرتی تھی جس کی حیثیت سے ہفتہ میں ایک مرتبہ نوبت آتی تھی۔ سویلین اور سپاہیوں کو سنگینوں کی قطار کے بیچ میں چلنے کا حکم تھا یعنی دونوں طرف حفاظت کے لیے سپاہی کھلی ہوئی سنگین و بندوق لیے ہوئے چلتے تھے اور بیچ میں نہتے اسیر لوگ اسی طرح ان کو تین چار میل کی مسافت تک لے جاتے اور پھر واپس لاتے تھے کہیں کہیں دس پندرہ منٹ راحت کے لیے دیتے تھے مگر عموماً شہر میں نہیں لے جاتے بلکہ بیرون شہر جنگل کی طرف

جاڑوں کے دنوں میں دو بجے دن سے چار ساڑھے چار بجے دن تک اور گرمیوں میں پانچ ساڑھے پانچ بجے دن سے چار ساڑھے چار بجے دن تک اور گرمیوں میں پانچ ساڑھے پانچ بجے صبح سے آٹھ بجے تک یہ تفریح ہوتی تھی، مگر گرمیوں میں سمندر پر لے جاتے تھے اور وہاں پر دریا میں جن لوگوں کو شوق ہوتا تھا نہاتے تھے تقریباً پندرہ منٹ یا بیس منٹ وہاں ٹھہرتے تھے اور پھر واپس ہوجاتے تھے جن لوگوں کو دریا میں تیرنے یا نہانے کا شوق نہیں ہوتا تھا وہ کنارے پر بیٹھے رہتے تھے، سپاہی چاروں طرف حفاظت کے لیے کھڑے رہتے تھے۔ دریا میں بھی حد مقرر ہوتی تھی جس پر چھوٹی چھوٹی کشتیاں تھوڑی تھوڑی دور کھڑے رہتی تھیں اور ان میں سپاہی مع آلات جنگ موجود رہتے تھے۔ آفیسروں کے ساتھ عام سپاہی نہیں جاتے تھے اور نہ اس طرح قطار کے اندر وہ جاتے تھے بلکہ ان کے ساتھ سارجنٹ یا کپتان وغیرہ ریوالور لیے ہوئے ساتھ رہتا تھا ان کے لیے گھوڑے گاڑیاں لائی جاتی تھیں جن کا کرایہ خود اسیر افسروں کو اپنی تنخواہ میں سے دینا ہوتا تھا اور اگر کوئی آفیسر اپنے پیروں چلنا چاہتا تھا تو اس کو کوئی روک ٹوک نہ ہوتی تھی اس کے ساتھ وہی سارجنٹ یا کپلر ریوالور لیے ہوئے جاتا تھا، عام اسرا اگر ضعیف العمر یا کمزور ہوں تو ان کے لیے بھی سواری منگادی جاتی تھی بشرطیکہ کرایہ وہ اپنے پاس سے ادا کریں اس لیے چند ضعیف العمر ایک گاڑی منگا لیتے تھے، وہ گاڑی اسی قطار فوج میں ساتھ ساتھ چلتی تھی۔ حضرت مولانا رحمۃ اللہ علیہ بہت زیادہ اصرار پر فقط ایک مرتبہ اس تفریح میں تشریف لے گئے تھے۔ عموماً مولوی عزیر گل اور وحید جایا کرتے تھے اور کبھی کبھی مولوی حکیم نصرت حسین بھی۔ (ایضاً: ۷۷۔۷۶)

(اس مقام پر حضرت شیخ الاسلام نے نہایت تفصیل کے ساتھ قیدیوں کے اخبار و تار کے انتظام، ہلال احمر اور صلیب احمر کی امداد، کیمپوں کے مکانوں اور خیموں کی کیفیت، قیدیوں کے مشاغل، ان کی باہمی ہمدردی، قیدیوں کے مشاغل تجارت، ان کی صناعت، ان کے آپس کے جھگڑوں اور ان کے مقدمات کے فیصلوں، اسارت گاہ کے حالات بیان فرمائے ہیں۔ ان حالات وتفصیلات کے مطالعے کے لیے "سفرنامۂ اسیر مالٹا" سے رجوع کرنا چاہیے۔)

مالٹا کے چند ہندوستانی قیدی:

مولانا مرحوم بندرگاہ سے سالٹر کے ساتھ اِکّے پر سوار ہوکر آگے آگے چلے آئے تھے اور ہم لوگ پیدل سپاہیوں کے ساتھ آئے۔ ردگیٹ کیمپ میں پہلے سے ہمارے آنے کی اسی دن خبر ہوگئی

تھی جس دن ہمارا آگ بوٹ اسکندریہ سے روانہ ہوا تھا وہاں پر بذریعۂ تار آفس مالٹا کو اطلاع دی گئی تھی۔ آفس نے روگیٹ کیمپ میں انتظام کیا اور خبر بھی دے دی کہ پانچ ہندوستانی آرہے ہیں، الغرض دو خیمے وہاں ہمارے لیے نصب کیے گئے تھے اور لکڑی کے تختے کی پانچ چار پائیاں ان کے گدے، کمبل وغیرہ جملہ ضروریات مہیا تھیں، چوں کہ اس کیمپ میں پہلے سے دو ہندوستانی ایک ڈاکٹر غلام محمد پنجابی آدم پوری اور دوسرے مسٹر سیدار بنگالی ساکن چندرنگر وہاں موجود تھے۔ مسٹر سیدار برہمن تھا، فرانسیسی زبان عمدہ جانتا تھا، انگریزی اور جرمنی بھی جانتا تھا مگر اردو بالکل نہیں جانتا تھا۔ سنسکرت سے بھی خوب واقف تھا وہ بم بازی کی تہمت میں گرفتار کیا گیا، مگر باوجودے کہ اس پر کوئی ثبوت واقعی نہیں پہنچ سکا تھا۔ گورنمنٹ بنگال نے اس کو مصر بھجوا دیا اور پھر وہاں سے مالٹا روانہ کر دیا گیا تھا، اس پر مصائب اسارت نے اتنا ضرور اثر کیا تھا کہ اس کی عقل میں فتور ہو گیا تھا۔

ڈاکٹر غلام محمد مصر میں ایک مدت سے مقیم تھے وہاں ان کے والد اور بھائی بھی آ گئے تھے یہاں انھوں نے اپنی شادی بھی کر لی تھی۔ ابتدائے جنگ میں ان پر بھی ان کے دشمنوں نے کچھ خبریں اڑا کر گورنمنٹ کو بدظن کر دیا۔ ان کو سخت تکلیفیں پہنچائی گئیں اور بالآخر جیزہ کی سیاسی قید گاہ جس میں ہم بھی ایک ماہ رکھے گئے تھے، اس میں یہ بھی گئے۔ وہاں پر مختلف وقائع ایک جماعت سے ایسے ہوئے کہ گورنمنٹ کو یقین ہو گیا کہ یہ لوگ بہت زیادہ خطرناک ہیں۔ اس لیے ان سبھوں کو مالٹا بھیج دیا گیا۔ اس میں سے ڈاکٹر موصوف بھی تھے۔ ڈاکٹر صاحب موصوف نے پہلے تو یہ خیال کیا کہ غالباً جیزہ میں جو اور چند ہندوستانی قید تھے، جن سے یہ واقف تھے، وہ لوگ ہیں اس لیے یہ خوش تھے مگر جب مولانا کو دیکھا تو ان کو معلوم ہو گیا کہ وہ خیال غلط تھا۔ مگر انھوں نے وطنی تعلق کی وجہ سے نہایت تپاک سے مولانا کا استقبال کیا اور اپنے خیمے میں لے گئے، مولانا تقریباً مغرب کے قریب روگیٹ کیمپ کے دروازے پر پہنچے تھے اسی وقت ان کو وہاں داخل کر دیا گیا، مولانا نے جا کر وضو کر کے نماز ادا کی۔ اتنے میں ہم سب بھی پہنچ گئے۔ ہم نے بھی جا کر نماز پڑھی کچھ مختصر سامان چائے وغیرہ کا اس وقت موجود تھا اس کو تناول کر کے سامان درست کیا، چار پائیوں وغیرہ کو لگایا اور پھر عشا کے بعد سونے کی تیاری کر دی۔ اس روز تھوڑی تھوڑی بارش ہو رہی تھی اور نہایت سرد ٹھنڈی ہوائیں چل رہی تھیں، جس نے اور بھی ہم کو مجبور کیا کہ نہایت جلد آمد و رفت بند کر دیں، مگر اتفاق سے اس کیمپ میں عموماً وہ لوگ تھے جو کہ مکۂ معظمہ سے پکڑے گئے تھے اور اکثر لوگ مکہ کے رہنے والے یا عرصے سے رہے ہوئے ترکی حکام تھے اور حج سے بہت پہلے پکڑے

جا چکے تھے انھوں نے جمع ہو کر مکۂ معظمہ کے احوال وغیرہ کے پوچھنے میں بہت بڑا حصہ رات کا لے لیا، ایک خیمہ میں حضرت مولانا مرحوم اور مولوی عزیر گل صاحب اور کاتب الحروف کی چارپائی رکھی گئی اور دوسرے میں حکیم صاحب اور وحید کی تھی۔ (ایضاً: ۸۴۔۸۲)

مالٹا:

جزیرہ مالٹا وسطی بحر متوسط میں صقلی سے ساٹھ میل دور جنوب میں اور ساحل افریقہ سے دو سو میل دور شمال میں واقع ہے۔ رقبہ ۹۵ مربع میل ہے۔ مالٹی مملکت میں شامل دو چھوٹے جزیرے ۲۶ مربع میل کے ہیں ۱۹۷۱ء میں مجموعی آبادی ۳,۲۲۰۷۰ تھی۔ سرکاری زبانیں انگریزی اور مالٹی ہیں۔ اطالوی بھی بولی جاتی ہے۔ سرکاری مذہب رومن کیتھولک ہے۔ راجدھانی والٹیا ہے۔

مالٹا ۲۰ ستمبر ۱۹۶۴ء تک برطانیہ کی نوآبادی تھا۔ ۲۱ ستمبر ۱۹۶۴ء کو اسے دولت مشترکہ کے اندر آزادی ملی۔ ۱۹۶۵ء میں اقوام متحدہ اور کونسل آف یورپ کا رکن ہوا۔ ۱۹۴۶ء کے ایک قانون کے تحت ملکۂ، انگلستان مالٹا کی سربراہ مملکت ہے جس کی نمایندگی گورنر جنرل کرتا ہے۔ پارلیمنٹ کے انتخابات متناسب نمایندگی کی بنیاد پر ہوتے ہیں۔ نظامِ حکومت پارلیمانی طرز کا ہے۔ (فرہنگ، سیاسیات، ص ۳۷۲)

عرب کیمپ میں تبدیلی:

ہم رد گیٹ کیمپ سے بہت اچھی طرح مانوس اور وہاں کے لوگوں سے پوری طرح تعارف پیدا کر چکے تھے کہ یکایک کماندار کا بلا ہماری درخواست کے حکم آیا کہ تم کو کل عرب کیمپ میں جانا ہوگا، ہم کو طبعی طور پر نہایت ناگوار معلوم ہوا۔ ہم نے چارہ جوئی کی فکریں کیں، سب بے سود ہوئیں۔ اس مدت میں چوں کہ ڈاکٹر غلام محمد اور مسٹر سیدار سے تعارف ہوگیا تھا اور ڈاکٹر صاحب وہاں کے احوال سے واقف تھے اس لیے ان کے اشارے پر ہم نے درخواست کی کہ اگر ہم کو بغیر ہماری مرضی کے وہاں منتقل کیا جاتا ہے تو کم از کم اتنا تو کیا جائے کہ ہمارے ساتھ یہ دو ہندوستانی کر دیے جائیں تا کہ ہم سب اہل وطن ایک جگہ بسر کریں، یہ استدعا منظور کر لی گئی۔ ہمارا خیال تھا کہ ہم کو وہ راحت جو کہ رد گیٹ کیمپ میں ہے، عرب کیمپ میں نہ ملے گی۔ اسی وجہ سے ہم کو پس و پیش تھا مگر حقیقت میں ہم کو وہاں پہنچ کر بہت ہی زیادہ راحتیں ملیں۔ وہاں پر ہم کو ایک بہت بڑا کمرہ صاف کر کے دے دیا گیا اور کہا گیا کہ اس میں تمھارے سوا اور کوئی نہیں رہے گا۔ یہ کمرہ نہایت

وسیع تھا اس کے دو ٹکڑے تھے درمیان میں ایک دیوار حائل تھی جس میں دروازہ لگا ہوا تھا، قطعہ نمبر ا کے بھی دو حصے ہم نے کر دیے تھے، یعنی ایک پردہ ڈال کر اندرونی اور بیرونی حصہ کو جدا کر دیا تھا۔ (سفر نامۂ اسیر مالٹا، ص ۹۱۔۹۰)

کمرے کی ترتیب:

بیرونی حصے میں ایک مستطیل ٹیبل (میز) رکھی رہتی تھی جس پر چادر بچھی رہتی تھی اور چند کتابیں چنی رہتی تھیں اس پر دیا سلائی اور سگریٹ بھی اکثر رکھے رہتے تھے۔ اس کے طول میں دونوں جانب اور دروازہ کی طرف عرض میں کرسیاں بچھی رہتی تھیں جن میں سے اکثر آفس سے ملی تھیں اور بعض خود ہم نے بنوائی تھیں۔ دوسری طرف عرض کی جانب ایک چارپائی لکڑی کی جس پر گدے اور کمبل اور سفید چادر پڑی رہتی تھی۔ یہ سب باہر سے جو مہمان ملنے کے لیے آتے تھے ان کے لیے انتظام تھا۔ جب مہمان نہیں ہوتے تھے ہم سب کتابوں کے دیکھنے یا خطوط وغیرہ لکھنے کے لیے یہاں بیٹھتے تھے......

حضرت شیخ الہند کی نشست:

دیوار کا وہ حجم جو کہ کھڑکی میں سطح زمین سے بقدر ایک کرسی کے اونچا تھا اس کے ساتھ ایک تختہ لگا کر اس پر گدا ڈال دیا گیا تھا یہاں پر مولانا اکثر اوقات میں بیٹھتے اور تحریر وغیرہ کرتے تھے، اپنے درود و وظائف بھی سردی کے ایام اور اوقات میں یہاں ہی پڑھتے تھے۔ گرمی کے اوقات میں بیٹھتے تھے مولانا کو روشنی اور ہوا کی وجہ سے یہ جگہ زیادہ مرغوب تھی یہاں ہی بیٹھ کر ترجمہ قرآن شریف لکھتے اور تصحیح فرمایا کرتے تھے اس کھڑکی کے باہر صحن میں گرمیوں کے ایام میں ایک چارپائی دیوار سے متصل بچھا دی جاتی تھی عصر کے بعد سے مولانا وہاں بیٹھتے تھے اور شب کو بھی اس پر ہی آرام فرماتے تھے۔

(اس مقام پر حضرت شیخ الاسلام نے مکان کے دوسرے اور تیسرے حصے (قطعہ نمبر ۲ قطعہ نمبر ۳) میں حضرت شیخ الہند اور دوسرے رفقا کی چارپائیوں، کھانا پکانے، کھانے اور نماز پڑھنے کی جگہوں کی تفصیل بیان فرمائی تھی جو خدمت کر دی گئی۔ جو حضرات تفصیلی مطالعے کے شائق ہوں، انھیں ''سفر نامۂ اسیر مالٹا'' سے رجوع کرنا چاہیے۔)

''چوں کہ ہر اسیر پر اپنے کیمپ کا صاف کرنا پاے خانے کا دھونا اور باہر سے رسد وغیرہ کا لانا

ضروری تھا، اس لیے ہم نے اس کام کے لیے دنیز کپڑوں کے دھونے اور جھاڑ دینے کے لیے ہم پانچوں اشخاص بلکہ ابتداء میں تو ساتوں ہندوستانیوں کی طرف سے ایک شخص کو انھی صیدادی عربوں میں سے نوکر رکھ لیا تھا اس کو نصف پونڈ ماہوار دیا کرتے تھے ہفتے میں ایک دفعہ یہ سبھوں کے کپڑے دھوتا تھا صابن وغیرہ ہم دیتے تھے اور جب ہماری باری دوسری بیرونی خدمات کی آتی تو ان کو بھی انجام دیتا تھا۔'' (ایضاً:ص۹۴)

(اس مقام پر حضرت شیخ الاسلام نے صیدادی عرب اسیروں کے حالات اور حضرت شیخ الہند کے فیضانِ صحبت سے ان میں دین داری کا جو ذوق پیدا ہو گیا تھا، اس کی تفصیل بیان فرمائی تھی۔ اسے حذف کر دیا گیا۔)

حضرت کا فیضانِ صحبت:

ہمارے کیمپ میں تقریباً پچیس آدمی تھے بیچارے عموماً نہایت نرم اخلاق والے اور دیانت دار تھے ہم لوگوں سے عموماً اور حضرت مولانا رحمۃ اللہ علیہ سے خصوصاً ان کی معاملات نہایت ہی شریفانہ رہے۔ ہر ایک ہماری ہم دردی اور غم گساری کے لیے تیار رہتا تھا، ان کو دینی باتیں جو کچھ بتائی جاتی تھیں نہایت بشاشت سے قبول کرتے تھے۔ ان میں سے بہت سے لوگوں نے جب ان کو معلوم ہوا کہ یہ گوشت جائز نہیں بالکل چھوڑ دیا تھا۔ ڈاڑھی منڈانے کی عادت تھی، حکم شرئی جان کر ڈاڑھیاں چھوڑ دی تھیں، جماعت سے ہمیشہ نمازوں کی پابندی کرتے تھے۔ اذان تکبیر وغیرہ سب کے یہی لوگ متکفل تھے ان میں سے چند آدمی حضرت مولانا رحمۃ اللہ علیہ سے بیعت بھی ہوئے تھے اور خط وکتابت وغیرہ بھی ہم لوگوں سے سیکھی، علمی مجالس میں شریک ہوتے تھے۔

حضرت کے معمولات:

مولانا عشاء کی نماز کے بعد تھوڑی دیر جاگتے تھے، کچھ اپنے اوراد پڑھتے تھے اور پھر پیشاب وغیرہ سے فارغ ہو کر اکثر وضو فرماتے تھے۔ کبھی کبھی کچھ باتیں بھی فرماتے اور پھر سو جاتے تھے کیوں کہ دس بجے کے بعد حکماً روشنیاں بجھا دی جاتی تھیں جہاں دس بجے اسی وقت سپاہی آواز دیتا تھا۔ سب چراغ اور موم بتیاں بجھانی پڑتی تھیں اور پھر تمام شب جلانے کی اجازت نہ ہوتی تھی۔

دس بجے سے سب لوگ سو جاتے تھے مولانا رحمۃ اللہ علیہ تقریباً ایک بجے یا ڈیڑھ بجے شب کو

اٹھتے تھے، نہایت دبے دبے پیروں نکلتے دروازے سے باہر تشریف لے جاتے۔ پیشاب سے فارغ ہو کر وضو فرماتے تھے۔ گرمیوں میں تو گرم پانی کی ضرورت ہوتی ہی نہ تھی، نل کا پانی مناسب ہوتا تھا۔ سردی کے زمانے میں ہم نے یہ خاص انتظام کیا تھا کہ چولھے پر کھانے کے بعد ایک بہت بڑے ٹین کے لوٹے میں جو کہ چائے کے لیے گورنمنٹ کی طرف سے ملتا تھا اور اس میں نیچے ٹینٹو (ٹونٹی) پیچ دار لگی ہوتی تھی اور اس میں ہمارے معمولی دس بارہ لوٹے پانی آجاتا تھا، پانی خوب گرم کر لیا جاتا تھا اور پھر اسی پاس والے کمرے میں جہاں پر نل لگا ہوا تھا اس لکڑی کے تخت پر جس پر سب کپڑے دھوتے تھے ایک کمبل میں لپیٹ کر عشاء کے بعد رکھ دیتے تھے یہ پانی صبح تک خوب گرم رہتا تھا حال آں کہ سردی بہت ہی زیادہ پڑتی تھے۔ الغرض مولانا کو شب میں جتنی دفعہ وضو کی ضرورت ہوتی تھی، اسی سے پانی گرم لیتے تھے اور وضو فرماتے تھے اور مسجد کے کمرے میں محراب کی دائیں جانب مولانا کی سفید اونی جانماز کمبلوں پر ہمیشہ بچھی رہتی تھی۔ اندھیرے ہی میں جا کر اس پر نماز تہجد ادا فرماتے تھے جب اس سے فارغ ہو جاتے تھے تو پھر آ کر اپنی چار پائی پر بیٹھ جاتے تھے اور صبح تک مراقبہ اور ذکر خفی میں مشغول رہتے تھے۔ ہزار دانوں کی تسبیح ہمیشہ سرہانے رکھی تھی، اسم ذات کی کوئی مقدار معین فرما رکھی تھی اس کو ہمیشہ بالالتزام پورا فرماتے تھے۔ مراقبہ کا اس قدر انہماک ہو گیا تھا کہ اکثر حصہ دن رات کا اس میں گزرتا تھا، استغراق بعض اوقات میں غالب ہو جاتا تھا۔ ہم بعض اوقات میں دو دو تین تین دفعہ باتیں دہراتے تھے مگر سمجھتے نہ تھے۔ صبح کی نماز سے پہلے اکثر پیشاب کرتے تھے وضو کی تجدید فرما کر نماز باجماعت ادا فرما کر وہیں مصلے (سجادہ) پر آفتاب کے بلند ہونے تک مراقب رہتے تھے۔ اس کے بعد اشراق کی نماز ادا فرما کر اپنے کمرے میں تشریف لاتے۔ اس وقت مولانا کے لیے ابلے ہوئے انڈے اور چائے تیار ہوتی تھی، وہ پیش کر دی جاتی تھی اس کو نوش فرما کر دلائل الخیرات اور قرآن شریف کی تلاوت فرماتے تھے، اس سے فارغ ہو کر کچھ ترجمہ قرآن شریف تحریر فرماتے، یا اس پر نظر ثانی کرتے یا اگر خط لکھنے کا دن ہوتا تو خط تحریر فرماتے، یا وحید کو سبق پڑھاتے۔ اتنے میں کھانے کا وقت آجاتا کھانا تناول فرما کر چائے نوش فرماتے تھے۔ اس کے بعد اگر کسی سے ملنے کے لیے دردالہ یا سینٹ کلیمنٹ کیمپ یا بلغار کیمپ میں جانا ہوتا تو وہاں کا قصد فرماتے اور کپڑے پہن کر تیار ہو جاتے تھے اور اگر جانے کا قصد نہ ہوتا تو آرام فرماتے اور اگر کوئی ملنے کے لیے دوسرے کیمپ میں سے آجاتا تو اس سے باتیں کرتے۔ اگر تیز گرمی کا زمانہ ہوتا تھا تب تو وہیں اپنی چار پائی پر اور اگر کچھ بھی سردی ہوتی تھی

توصحن میں دھوپ میں قیلولہ فرماتے تھے۔ وہاں پر ہم سب دو تین گدے ڈال دیتے تھے اور اس پر کمبل اور تکیہ پہنچا دیا جاتا تھا اور اگر کسی نے غفلت کی تو خود تکیہ لے جاتے اور ان گدوں اور کمبل کو بچھا کر آرام فرماتے تھے دو تین گدے ہم نے زائد اسی واسطے لے رکھے تھے جو کہ ہمیشہ علاحدہ رکھے رہتے تھے اور جب تک وہ حاصل نہ ہوئے تھے تو بعض چارپائیوں کے گدے اٹھائے جاتے تھے۔ گاڑھے کی ببول (کی چھالی) سے رنگی ہوئی چادر اوڑھ کر دھوپ میں آرام فرمایا کرتے تھے۔ یہی عادت مولانا کی وطن میں بھی تھی۔ تقریباً ڈیڑھ یا دو گھنٹہ اس طرح آرام فرمانے کے بعد قضائے حاجت کے لیے تشریف لے جاتے اور پھر وضو فرمانے کے بعد تلاوت قرآن شریف، دلائل الخیرات، حزب الاعظم وغیرہ میں مشغول ہوتے تھے۔ مگر قرآن شریف بہت زیادہ پڑھتے تھے، غالباً روزانہ دس بارہ پارے پڑھا کرتے تھے۔ ظہر کی اذان تک اسی حالت میں مشغول رہتے تھے، پھر مسجد میں تشریف لاتے اور نماز سے فارغ ہو کر اگر وحید کا سبق ہوتا تو کبھی اس وقت میں اور کبھی صبح کو اپنے اوراد سے فارغ ہو کر کھانے کے وقت تک پڑھاتے تھے بلکہ اکثر صبح ہی کو پڑھاتے تھے، چوں کہ عربی کتابوں میں فقط مشکوٰۃ اور ترمذی پاس تھیں اس لیے انھی دونوں کو پڑھاتے رہتے۔ یہاں تک کہ دونوں ختم ہو گئیں۔ جلالین شریف بھی ساتھ تھی وہ بھی غالباً ختم ہو گئی تھی۔ اس کے بعد کتابوں کے نہ ہونے، وحید کی بے شوقی، مدت اقامت کی لاعلمی کی وجہ سے اور کتابیں شروع نہ ہوئیں۔ اس کے بعد اکثر ترجمۂ قرآن پر نظر ثانی فرماتے تھے اور کبھی کبھی مولوی نصرت حسین صاحب مرحوم اور مولوی عزیر گل صاحب کو ترجمہ سناتے تھے کچھ دنوں تک میں بھی اس میں شریک ہوتا رہا مگر چوں کہ مجھ کو تمام دن میں قرآن کے دور کرنے کے لیے یہی وقت فارغ ملتا تھا۔ اس لیے میں نے شرکت اس میں چھوڑ دی تھی۔ دونوں حضرات کی بحثیں بھی ترجمہ کے متعلق مولانا مرحوم سے ہوتی رہتی تھیں۔ اگر کوئی تاریخ ایسی ہوئی جس میں ظہر کے بعد دوسرے کیمپ میں جانا ہے جیسا کہ میں پہلے ذکر کر چکا ہوں کہ ہم کو بھی ہفتے میں تین دن دوسرے کیمپوں میں ظہر کے بعد جانے کی اجازت تھی تو وہاں تشریف لے جاتے اور ہم سب یا بعض ضرور ساتھ ہوتے تھے۔ اس لیے یہ انتظام تھا کہ ہفتے میں ظہر کے بعد ایک دن روگیٹ کیمپ میں جاتے ایک دن سینٹ کلیمنٹ کیمپ میں اور ایک دن بلغار کیمپ میں، عصر کی نماز کے بعد اکثر مولانا رحمۃ اللہ علیہ ذکر خفی لسانی میں مشغول ہوتے وہ ایک ہزار دانے والی تسبیح کو چادر یا رومال کے نیچے چھپا کر بیٹھ جاتے اور ذکر کرتے رہتے ہاں اگر ورد کسی وجہ سے رہ گیا ہوتا تھا، تو اس کو پورا فرما لیتے۔ اکثر جیسا

کہ پہلے بیان ہو چکا ہے اس وقت کھانا تیار ہو جاتا تھا تو جب دسترخوان چن لیا جاتا تھا اس وقت مولانا سے عرض کیا جاتا تھا کہ تشریف لائیے کھانا نوش فرما کر پھر اپنی جگہ پر جا بیٹھتے اور اپنے کام میں مشغول ہو جاتے چائے وہیں پیش کر دی جایا کرتی تھی مغرب کے بعد بھی نوافل وغیرہ سے فارغ ہو کر ذکر اسم ذات سے خفیہ طور پر اسی بڑی تسبیح کو لے کر عشاء تک مشغول رہتے اس درمیان میں اگر ہم میں سے کوئی کسی بات کے لیے پاس جا بیٹھتا تو کچھ بات بھی کر لیتے ورنہ اپنے کام میں مشغول رہتے تھے کبھی کبھی صبح کو دس بجے سے بارہ بجے تک اور کبھی کبھی ظہر کے بعد ۲ بجے سے ۴ بجے تک بعض ترکی احباب وغیرہ تشریف لاتے تھے تو اس وقت مولانا اپنے کام کو چھوڑ کر ان کے پاس آ بیٹھتے تھے......

مولانا کو اپنے روحانی کاروبار اور باطنی ترقی اور اپنے محبوب حقیقی سے راز و نیاز کرنے کا فارغ وقت تمام عمر میں کبھی ایسا نصیب نہیں ہوا تھا جیسا کہ مالٹا کی اقامت کے ایام میں ہوا۔ دن رات ان کو یہی دھن تھی اور یہی مشغلہ تھا، نہ کبھی ان کی طبیعت گھبراتی تھی اور نہ کبھی دوسری طرف کو رغبت ہوتی تھی۔ بسا اوقات تو ان کو ہم لوگوں سے بات کرنا بھی ناگوار ہوتی تھی، یہ ایک واقعی اور حقیقی انعام خداوندی تھا جس میں مولانا رحمۃ اللہ علیہ کے ترقی معنوی کے مدارج طے کرانے تھے، کاتب ازلی نے جو مقامات ازل سے مقرر فرما دیے تھے، ان کے طے کرنے کا ذریعہ یہ سفر اور اسارت قرار دی گئی۔

ہمارے پاس جو کچھ نقد تھا یعنی (۸۱) پونڈ انگریزی اور وہ جزیرہ میں ہم سے لے لیا گیا تھا اور اس میں سے چار پونڈ ہم کو مصاریف کے لیے وہاں دیا گیا تھا جس میں سے تقریباً ڈیڑھ پونڈ ہم نے راستہ کے خرچ کے لیے اپنے پاس رکھ لیا تھا باقی (۷۷) پونڈ کے لیے جیزہ کے انگریزی افسر نے بوقت روانگی یہ کہا کہ یہ نقد روپیہ وہیں مالٹا میں مل جائے گا۔ ہم نے اس سے کوئی رسید وغیرہ نہ مانگی اور اس کے قول پر اطمینان کر کے یقین کر لیا کہ ابھی ہمارے ساتھ بذریعۂ ڈاک وہاں یہ خبر بھیج دی جائے گی مگر مالٹا پہنچنے پر جب ہم کو ضرورت ہوئی تو ہم نے کمان دار سے طلب کیا اس نے جواب دیا کہ ہمارے پاس اطلاع نہیں آئی اس کی وجہ سے ہم کو سخت کلفت کا سامنا ہوا۔ اس نے ایک مرتبہ جب کہ ہماری خاطر داری کو کہا کہ اگر کوئی تکلیف ہو تو اطلاع دو، تو ہم نے ان نقود کی نسبت پھر تذکرہ کیا۔ اس نے کہا کہ مجھ کو کوئی اطلاع نہیں ملی اور میں نہایت افسوس کرتا ہوں کہ میں اس کے متعلق کوئی انتظام نہیں کر سکتا، تب ہم نے درخواست کی کہ آپ مصر میں تحریر کریں اور

استفسار کر کے منگائیں اس نے قبول کیا۔ ہمارے آنے کے دوسرے دن میجر حسن عزت بیگ کا دروالہ سے پیام پہنچا کہ میں مولانا سے ملنے کا شائق ہوں۔

میجر حسن عزت بیگ ایک نہایت خلیق، شریف وضع، علمی خاندان کا دیانت دار شخص تھا۔ جس کے ہر ہر عمل اور حرکت سے مروت اور انسانیت ٹپکتی تھی۔ اصل میں اس کا وطن دمشق شام تھا اس کا رتبہ فوجی بیکباشی (میجر) تھا وہ عرصۂ دراز سے مختلف مرتبوں پر موظف ہو کر حکومت عثمانیہ کے مختلف ممالک میں ہمدردی اور اخلاص کے ساتھ خدمت کر رہا تھا اور اسی وجہ سے اپنے افسروں اور حکومت کے ذمہ داروں میں نہایت وقعت کی نظر سے دیکھا جاتا تھا۔ جنگ کے زمانے میں وہ یمن میں عہدہ دار تھا اس کو گورنر یمن کا حکم ملا کہ وہ حجاز میں بحری راستہ سے جائے اور احکام فوجی کے پورے کرنے کی کوشش کرے چناں چہ وہ حسب ہدایت یمن کے بعض بندروں سے مع اپنے سامان وغیرہ کے بادبانی کشتی پر سوار ہو کر جدہ کو روانہ ہوا کیوں کہ بحر احمر (قلزم) میں ان دنوں دخانی آگ بوٹ کا ملنا ممکن نہ تھا بادبانی کشتی سمندر میں سفر کر رہی تھی کہ انگریزی جنگی جہاز نے اس کو دورے سے دیکھ لیا کشتی کو پکڑا اگر چہ میجر موصوف اپنے رسمی اور ترکی لباس میں اس وقت نہ تھا مگر جہاں تک معلوم ہوا کہ جس بندر سے وہ سوار ہوا تھا وہاں پر انگریزی سی آئی ڈی کے لوگ موجود تھے۔ انھوں نے خبر پہنچا دی تھی۔ خیال کیا جاتا ہے کہ یہ امور شریف حسین کے ذریعہ سے یمن کے قریب کے بندروں پر تکمیل دیے گئے تھے۔ غرض کہ انگریزی آگبوٹ نے جبراً میجر موصوف کو گرفتار کر لیا تمام اسباب لے لیا اور جا کر عدن کے قید خانہ میں ڈال دیا اور پھر کچھ عرصے کے بعد وہاں سے مصر کو منتقل کر دیا گیا، وہاں بھی ایک عرصے تک قید میں رہنا پڑا پھر مالٹا بھیج دیا گیا اور اخیر وقت تک ممدوح کو وہاں کے ایام کاٹنے پڑے۔

مولانا مرحوم اگلے روز وہاں گئے اور ملاقات کی۔ نہایت اخلاق سے پیش آیا اور درخواست کی کہ آپ ابھی آنے ہیں، اس لیے غالباً مصاریف کی ضرورت ہوگی، ہم سب آپ کے ہمدرد اور خادم ہیں جس قدر کی ضرورت ہو بلا تردد آپ ہم سب سے ظاہر فرمائیں۔ ہم نے کہا کہ ہم سب آپ کا شکریہ ادا کرتے ہیں۔ ہمارے پاس ایک مقدار معتد بہ موجود ہے جس کو حکومت نے ہم سے لے لیا تھا اور یہاں بھیجنے کا وعدہ کیا تھا، غالباً دو چار دن میں یہاں آجائے گی۔ اس نے ہمارے احوال وغیرہ پر نہایت ہمدردی کا اظہار کیا اور کمال توجہ سے ہمیشہ پیش آتا رہا چلتے وقت ڈاکٹر غلام محمد سے کہا کہ ممکن ہے کہ یہ لوگ اپنی حاجت ظاہر کرتے ہوئے شرمائیں اس لیے تم

جوان کی ضرورت ہو مجھ سے بیان کر دینا۔ جب ہم کو کچھ عرصہ گزر گیا اور نقد کی کوئی خبر نہ ملی کمانداز اسراء نے بھی باوجود تقاضوں کے صاف جواب دیے تو بہت دقت کا سامنا پیش آیا۔ اس لیے رائے یہی ہوئی کہ میجر موصوف سے قرض لے لیا جاوے۔ چناں چہ موصوف سے مختلف اوقات میں تقریباً پانچ پونڈ لینا پڑا علاوہ ازیں اور بھی بعض آدمیوں سے قرض لینا پڑا، کیوں کہ ہمارے جانے کے تھوڑے ہی عرصے کے بعد یعنی تقریباً بیس یا پچیس دن کے بعد میجر موصوف کے افسر کرنیل علی فطری بیگ نے ان کو اپنے پاس وال فرسٹہ میں منتقل ہونے کو فرمایا اس لیے وہ وہاں چلے گئے۔

حسب قواعد مقررہ دول متمدنہ فوجی افسروں کو ایام اسارت جنگ بہت زیادہ حقوق دیے جاتے ہیں۔ ان کے لیے تنخواہیں بمقدار کفایت دی جاتی ہیں جن کا بوقت صلح حساب کیا جاتا ہے، ہر بادشاہت نے جس قدر خرچ کیا ہے اپنی مقابل بادشاہت سے وصول کرتی ہے اگر دونوں برابر سرابر ہو جاتے ہیں جب تو خیر ورنہ زائد مصاریف والی حکومت مقدار زائد کو وصول کرتی ہے۔ چھوٹے افسروں کو یعنی کرنیل جرنیل وغیرہ کو سات پونڈ ماہوار دیا جاتا تھا جس میں سے خوراک کی رسد میں تقریباً ڈیڑھ پونڈ ماہوار محسوب ہو کر باقی ماندہ دو تین ہفتوں میں پورا کر دیا جاتا تھا کیوں کہ مقرر تھا کہ کسی اسیر کو خواہ اس کی تنخواہ ہو یا اس کی مقدار جمع ہو دو پونڈ فی ہفتہ سے زائد نہیں دی جا سکتی۔ افسروں کے لیے علاوہ اس کے پلنگ لوہے کے گدے عمدہ اور صاف چادریں اور کمبل بھی عمدہ قسم کی الماریاں، آئینے چینی کے برتن، عمدہ کمرے، کرسی میز وغیرہ دیے جاتے تھے جو کہ سول بڑے بڑے عہدہ داروں کو نہیں ملتے تھے، ہاں اگر بڑی کمیٹی سے جو کہ اسراء کے انتظام کی ذمہ دار تھی کہ سویلین افسر کے لیے حکم ہوتا تھا کہ اس کے ساتھ ملٹری افسر کا معاملہ کیا جاوے تو اس کے حقوق ویسے ہی ہوتے تھے۔ مذہبی لوگوں کے بھی حقوق زائد شمار ہوتے تھے تقریباً دو مہینہ تک ہم کو یہ انتظار اور تکلیف اٹھانی پڑی۔ معلوم یہ ہوا کہ وہ روپے ہم سے لے کر فوراً برٹش بنک میں جمع کر دیے گئے تھے اور پھر چوں کہ بنکوں کو اپنا نفع ضرور حاصل کرنا چاہیے۔ خصوصاً انگریزی بنکوں کو اس لیے اس کے حوالے کرنے اور پہنچنے میں تاخیر کی گئی۔ اس مدت میں جب ہم نے تقاضا زیادہ کیا تو آفس کی طرف سے قنطین (دوکان) والے کو کہہ دیا گیا کہ تم ان کو جن چیزوں کی ضرورت ہو دے دیا کرو، ان کے روپے مل جائیں گے۔ چناں چہ وہاں سے بھی ہم نے تقریباً ساڑھے چھ پونڈ کا سودا خریدا تھا اور بعض اور دوسرے لوگوں سے بھی قرض لینے کی نوبت آئی تھی۔ (ایضاً: ص ۱۰۱-۹۶)

۲۲رفروری ۱۹۱۷ء: صبح کے وقت ہم سبھوں کو آفس میں بلایا گیا۔ ہم کو خیال ہوا کہ غالبًا ہم سے کوئی اظہار مثل مصر لیا جاوے گا۔ مگر وہاں معمولی طور سے پتا وغیرہ پوچھا گیا اور رجسٹروں میں درج کرلیا گیا، ہر ایک کو تولا بھی گیا اور وزن بھی درج کرلیا گیا بعد ازاں ہم کو کیمپ میں واپس کر دیا گیا۔ حسب قاعدہ رسد کی چیزیں جاری کردی گئیں۔ چوں کہ گوشت قابل اعتبار نہ تھا اس لیے ہم کو اس کے کھانے سے انکار ہوا۔ مگر چوں کہ گورنمنٹ نہ اس کو واپس لیتی تھی اور نہ اس کے بدلے میں دوسری کوئی چیز دیتی تھی ادھر پہلے سے آئے ہوئے مسلمان اپنی کمزوری کی وجہ سے اس کو برابر کھا رہے تھے اس لیے گورنمنٹ کو اور بھی حیلہ مل گیا تھا۔'' (ایضاً، ص ۸۴)

لیکن حضرت شیخ الہند اور ان کے رفقا نے اسے اپنے لیے جائز نہ سمجھا۔ البتہ فقہ اسلامی سے اس کے فروخت کردینے کا جواز نکلتا تھا۔ چناں چہ سے اس فائدہ اٹھایا گیا۔ حضرت شیخ الاسلام فرماتے ہیں:

''چوں کہ یہ گوشت حسب قاعدہ شریعت میتہ (مردار) تھا اس لیے ہم نہ اس کو کھا سکتے تھے اور نہ کسی مسلمان کو کھلا سکتے تھے۔ اب اس میں فکر کرنا پڑی کہ آیا اس کی بیع وشرا بھی جائز ہے یا نہیں؟ چوں کہ قاعدہ ہے کہ جو چیز حرام ہے، اس کی خرید وفروخت بھی حرام ہے وہ بیع باطل ہوگی اس کی قیمت بھی حرام ہوگی۔ اس لیے مولانا سے جب پوچھا گیا تو فرمایا کہ ہاں اس کی خرید و فروخت ناجائز ہے۔ مگر تم فقہ کی کتابوں کو دیکھو اسیر کے لیے دارالحرب میں بیع باطل اور قمار وغیرہ کی سب اجازت دی گئی ہے۔ اسیر کو کافروں سے جس طرح ہوسکے مال لینا جائز ہے اور وہ مال حلال ہے۔ چناں چہ اس وقت شروح کنز موجود تھیں ان کی طرف رجوع کیا، یہ مسئلہ صاف اور واضح طور سے مل گیا۔ اس وقت سے ہم نے گوشت کو ہمیشہ کافروں کے ہاتھ جس قیمت سے وہ لیتے تھے بیچ دینا شروع کردیا اور اخیر تک یہی کرتے رہے۔ اس کے پیسوں میں اپنے پاس سے کچھ نقد ملا کر اور دوسری چیزیں خریدتے تھے اور پکا کر کھاتے تھے''۔ (ایضاً، ص ۸۶)

کیمپ میں حلال گوشت کے طریقے:

تمام اسراء کی قیام گاہ میں جملہ حیوانات کا سوائے چڑیوں کی پالنا ممنوع تھا۔ ہاں کتے تو البتہ (چوں کہ یورپین لوگوں کی جان ان سے متعلق ہے) ماذون بہ تھے اور علیٰ ہذا القیاس بڑے جانوروں کا باہر سے لانا اور وہاں ذبح کرنا بھی ممنوع تھا جو لوگ تازہ گوشت کسی حیوان کا چاہتے

تھے وہ شہری کا ذبح کیا ہوا آ سکتا تھا جو لوگ مرغی یا کبوتر یا خرگوش منگاتے تھے وہ وہاں سے ذبح کردہ شدہ پیٹ کی آلائش صاف کی ہوئی حالت میں آتا تھا اس لیے ہم کو کوئی طریقہ اس کے استعمال کا بھی نہیں ہو سکتا تھا۔ ہم نے آفس سے مراجعت کی اور اپنے مذہبی اعذار کو بیان کیا تو ہم کو بعد دشواریوں کے اس قدر اجازت ہوگئی کہ ہم زندہ مرغ یا کبوتر یا خرگوش منگائیں اور اس کو سرکاری سپاہی کے سامنے ہی ذبح کر لیں اور پھر صفائی کے قوانین کا پورا لحاظ رکھیں۔ چناں چہ ہم نے اس کی ذمہ داری لی اور اس کے بعد سے ان زندہ حیوانات کے آنے کی ابتدا ہوئی۔ کچھ دنوں تو یہ ہمارے ہی ساتھ مخصوص رہا پھر اس کے بعد اور لوگوں کو بھی اجازت مل گئی۔ مگر یہ چزیں اس قدر گراں تھیں کہ الامان۔ کبوتر فی عدد ڈیڑھ یا دو روپے میں پڑتا تھا۔ مرغی فی عدد ساڑھے پانچ، چھ یا ساڑھے چھ میں پڑتی تھی، البتہ خرگوش ساڑھے تین، چار یا ساڑھے چار میں پڑتا تھا، گوشت بھی اس کا زیادہ ہوتا تھا اس لیے اسی پر اعتماد کیا گیا۔

ہفتہ میں اول اول ایک یا دو مرتبہ اس کو کھاتے تھے اور باقی ایام میں دال اور ترکاری وغیرہ سے گزران کرتے تھے، ایک خرگوش کو دو وقت کرتے تھے اس میں آلو یا دوسری ترکاری ڈالتے تھے کبھی کبھی مچھلی منگاتے تھے، مگر وہ بھی نہایت گراں آتی تھی، تقریباً تین روپے سیر یا چار روپے سیر معمولی مچھلیاں آتی تھیں اس لیے ہمیشہ اس کا بھی منگانا دشوار ہوتا تھا۔

دالیں اور ترکاریاں:

دال وہاں پر مسور کی ملتی تھی مگر کچھ دنوں کے بعد وہ بھی ایک عرصہ تک بند ہوگئی، گول مٹر سفید دلی ہوئی اور بے دلی ہمیشہ ملتی رہی، کبھی کبھی بے دلی مسور بھی مل جاتی تھی، مصری فول بھی ملتے تھے دوسری دالیں وہاں نہیں ملتی تھیں۔ البتہ ہندوستان اور مکۂ معظمہ سے پارسلوں میں ماش کی دال دھلی ہوئی اور بے دھلی اور بڑیاں وغیرہ آ جاتی تھیں جن کو ہم سب نہایت عظیم الشان نعمت سمجھ کر بہت چاہ سے استعمال کرتے تھے۔

ترکاریاں حسب موسم اکثر ملتی تھیں البتہ گوبھی کی تینوں قسمیں اور آلو اکثر اوقات میں بکثرت پائے جاتے تھے۔ بھنڈی جب بہت سستی ہوتی تھیں تو ۳ درجن بغیر چھانٹے ہوئے ملتی تھی۔ اسی طرح کدو طویل اور کدو سرخ چقندر، پالک، فول کی پھلیاں مٹر کی پھلیاں، وغیرہ آتی تھیں، مگر نہایت گراں، بروزانہ ہم کھانوں کے اقسام بدلتے رہتے تھے تاکہ کھانے والوں کو ایک ہی کھانے

کی وجہ سے گھبراہٹ اور بدمزگی نہ پیدا ہو، سالن عموماً ہم ایک ہی پکاتے تھے۔

کھانے کے معمولات:

روزانہ دو وقت کھانا تیار کیا جاتا تھا صبح کو تقریباً نو بجے اور شام کو تقریباً پانچ بجے چوں کہ دیگر رفقاء کھانے پکانے سے ناواقف تھے علاوہ ازیں ان کو دیگر مشغولیتیں فرصت بھی نہ دیتی تھیں پھر وہ مداومت بھی نہ کر سکتے تھے اور میرا ہمراہ ہونا فقط ادائے خدمت کی غرض سے تھا، اس لیے تمام ضروری خدمتوں کے انجام دینے کی کوشش کرنا میرا فرض منصبی تھا۔ جس کے لیے میں نے مالٹا پہنچتے ہی اپنے آپ کو تیار کیا اور ہر کام کی باگ اپنے ہاتھ میں لی......، روٹی عموماً دوپہر کے وقت آتی تھی اس کا آدھا حصہ شام کے وقت صرف ہوتا تھا اور آدھا صبح کے وقت، چوں کہ بہت بڑی اور موٹی ہوتی تھی اس لیے اس کو چھری سے کاٹنا پڑتا تھا، سالن جو کہ حسبِ عرضِ سابق عموماً ایک ہی قسم کا ہوتا تھا ایک بڑے برتن یا طباق یا لگن میں نکال لیا جاتا تھا اور دسترخوان کے بیچ میں وہ طشت یا طباق رکھ دیا جاتا تھا اور اردگرد روٹیوں کے ٹکڑے کٹے ہوئے رکھے ہوتے تھے اور پھر ہم سب جمع ہو کر کھاتے تھے۔ عموماً دسترخوان پر فقط ہم ہی پانچ آدمی نہیں ہوتے تھے بلکہ دو چار آدمی اور بھی زائد ہوتے تھے کیوں کہ مولانا رحمۃ اللہ علیہ کی طبیعت سخاوت اور مہمانداری پر مجبول اور مفطور ہوئی تھی، ان کو جس قدر مہمانداری اور سخاوت میں لطف آتا تھا کسی حال میں نہ آتا تھا، اکیلے کھانا ان کو سخت ناگوار ہوتا تھا یہی حال ان کا ہمیشہ ہندوستان میں رہا کیا اور اسی وجہ سے وہ ہمیشہ مقروض رہے اور عموماً جائداد اپنی بیچ کر قرضہ ادا کرتے رہے۔ مدرسے کی تنخواہ اور بیرونی آمدنی ان کو کبھی کافی نہ ہوئی مہمان داری کی وسعتِ دیکھ کر عموماً اہل دنیا اور اصحاب ثروت دنگ رہ جاتے تھے۔ مگر ہمیشہ سے یہ خداوندی کارخانہ جاری رہا۔

حضرت کی غذا:

علی الصباح اندرون خانہ جھاڑو دینا اور اپنے اپنے بستروں کا درست کرنا ضروری تھا کیوں کہ کپلر یا سارجنٹ روزانہ بستروں وغیرہ کو دیکھتا تھا اگر درست نہیں ہوتا تھا۔ تو تاکید کرتا تھا اس کے بعد ڈاکٹر آتا تھا اور کمروں کے باہر اور اندر مکان کا معائنہ کرتا تھا۔ اس کے بعد چائے بنائی ہوتی تھی۔ مولانا مرحوم کے لیے دو انڈے نیم برشت کر کے پیش کیے جاتے تھے اگرچہ اس میں انھوں نے بارہا سختی کی اور ناک بھوں چڑھایا کیے مگر خدام کسی طرح اس کے ترک کرنے پر راضی نہ

ہوئے ،مولانا کی خوراک بہت کم تھی اور ضعیف العمری کا زمانہ تھا غذا حسب عادت اور طبیعت میسر نہ ہوتی تھی۔اس لیے تقویت کے لیے اس کا انتظام ضروری خیال کیا گیا تھا، ہندوستان میں بھی اس کا انتظام تھا اس کے بعد سب مل کر کچھ روٹی کے ٹکڑے کے ساتھ چاے پیتے تھے۔اس کے بعد کھانا پکایا جاتا تھا جو کہ تقریباً دو گھنٹہ میں تیار ہو جاتا تھا۔تقریباً نو یا ساڑھے نو بجے صبح کو کھانا کھا لیتے تھے اس کے بعد دوسرا کھانا ظہر کی نماز کے بعد تیار کیا جاتا تھا اور عموماً عصر اور مغرب کے درمیان میں اس سے بھی فارغ ہو جاتے تھے ہمیشہ دونوں کھانوں کے بعد سادی چاے پی جاتی تھی اس لیے روزانہ تین دفعہ چاء لازمی طور سے پکتی تھی اور اگر کوئی مہمان آ جاتا تھا تو وہ دوسری بات تھی۔ شام کا کھانا ایک عرصہ تک اصرار کر کے ڈاکٹر غلام محمد اور حکیم نصرت حسین پکاتے رہے اور پھر میں نے اس کا بھی انتظام اپنے ہاتھ میں لے لیا کبھی کبھی مولوی عزیر گل صاحب یا وحید بھی انتظام کر لیتے تھے۔

جزیرۂ مالٹا کا موسم:

روگیٹ کیمپ میں قیام تقریباً ایک ماہ کامل رہا وہاں کے لوگوں سے بخوبی واقفیت اور انس بھی ہو گیا مگر تکلیف بہت زیادہ ہوئی۔وجہ اس کی یہ تھی کہ اگر چہ وہ زمانہ فروری کے آخر کا تھا، مگر مالٹا نہایت سرد جزیرہ واقع ہوا ہے۔اگر چہ شمالی یورپ کے باشندے جو سخت برفستان کے رہنے والے ہیں اس کو نہایت معتدل خیال کرتے تھے.........

روگیٹ کیمپ اگر چہ خندق میں واقع تھا، مگر چوں کہ اس میں فقط خیمے تھے اس لیے وہ سردی سے پوری محافظت نہ کر سکتے تھے اور پھر کھلا ہوا میدان تھا، رات کو باوجو یکہ ہم اپنے کپڑوں کو پہنے ہوئے دو کمبل اور ایک چادر اوڑھے ہوئے گدوں پر ایک کمبل بچھائے ہوئے سوتے تھے مگر تقریباً دو ڈھائی بجے رات سے کثرت سردی کی وجہ سے نہ اٹھنے کی ہمت ہوتی تھی اور نہ نیند ہی آتی تھی، صبح کے وقت نماز کے لیے اٹھنا پڑتا تھا تو خیمہ سے سر نکالنا ایک عذاب الیم کا سامنا ہوتا تھا۔سرد ہوا کے اس زور کے تھپیڑے لگتے تھے کہ معلوم ہوتا تھا کہ جسم ٹکڑے ٹکڑے ہو جائے گا۔وضو کرنے کی کوئی ایسی جگہ نہ تھی جہاں پر ہوا اور سردی سے محافظت ہو۔پانی جو ہم بالٹیوں اور برتنوں میں بھر کر رات سے وضو کے لیے رکھ لیتے تھے وہ برف سے زیادہ سرد ہو جاتا تھا۔پیشاب اور پاخانہ کی جگہ ایسی نہ تھی جہاں پر ہوا اور سردی سے پوری محافظت ہو۔جو لوگ نماز کے پابند نہیں تھے وہ تو آفتاب نکلنے سے پہلے اپنے خیموں سے سر بھی نہ نکالتے تھے۔مگر جس طرح بھی ہو سکتا ہم سب ایک دوسرے کو

اٹھاتے اور پانچوں آدمی جماعت سے نماز حضرت مولانا کے خیمہ میں پڑھتے تھے۔

سردی کا موسم اور حضرت کے معمولات:

مولانا مرحوم کو ہندوستان کی سردی بھی سخت اذیت دیتی تھی۔ وہ سردی کے ایام میں دن کو ہمیشہ دھوپ میں سوتے تھے بلکہ بسا اوقات گرمیوں کے زمانے میں بھی، سردیوں میں آگ اور کوئلہ سے تاپنے کی اکثر عادت تھی۔ روئی کے کپڑے بہت استعمال فرمایا کرتے تھے۔ گھٹنوں میں اکثر درد رہا کرتا تھا۔ سردی کے ایام میں ہاتھوں اور پیروں پر ورم ہو جاتا تھا جو سکنے سے جاتا تھا۔ مگر مالٹا کی اس سخت سردی میں حسب عادت شب کو ڈیڑھ یا دو بجے کا اٹھنا کبھی انھوں نے نہ چھوڑا۔ اسی وقت پیشاب فرماتے، وضو کرتے، تہجد کی نماز ادا فرماتے اور اس کے بعد صبح تک مراقبہ اور ذکر خفی میں وقت گزارتے۔ ہم جوانوں کو منہ کھولنا بھی قیامت معلوم ہوتا تھا، اٹھنا یا نماز پڑھنا یا وضو کرنا تو ہزار قیامت سے بھی زیادہ تھا مگر ان کی استقامت ان کو اپنے اوقات کی پابندی اور اپنے پروردگار کی عبادت پر مجبور کرتی تھی۔ یہی حالت ہمیشہ سفر اور حضر میں مولانا کی رہی۔ پھر اس پر طرہ یہ تھا کہ اس طرح اٹھتے تھے اور اس طرح آہستہ آہستہ قدم رکھتے اور دروازہ وغیرہ کھولتے تھے کہ کسی کو خبر نہ ہوتی تھی۔ نہ نیند میں اصلاً فرق آتا تھا باوجودے کہ ہم سب خدام ہی تھے اور سفر و حضر میں ہمراہ اور رفیق تھے۔ مگر ہم سبھوں سے بھی چھپانے کی آخر تک برابر کوشش فرماتے رہے۔ چوں کہ پیشاب کا عارضہ تھا اس لیے عموماً شب میں چند مرتبہ وضو کرنے کی ضرورت پڑتی تھی۔ پانی بھی نہایت سرد ملتا تھا مگر خدا کے فضل و کرم سے باوجود ان سب امور مخالف طبع کے کوئی تکلیف مولانا کو روگیٹ کیمپ کے ایک ماہ قیام میں مرض وغیرہ کی نہیں ہوئی۔ (ایضاً، ص ۹۰-۸۶)

۲۵ر اپریل ۱۹۱۷ء: ۲۵ر اپریل ۱۹۱۷ء مطابق ۴ر رجب ۱۳۳۵ھ، کو ہم کو فی کس دو پونڈ کے حساب سے دس پونڈ وصول ہوئے۔ جس سے اکثر قرضہ ادا کر دیا گیا۔ فقط میجر عزت حسن بیگ کا قرضہ اس ہفتے میں ادا نہیں کیا گیا۔ چوں کہ مالٹا میں قیمتیں چیزوں کی اس قدر گراں تھیں کہ ذرا ذرا سی چیزوں میں دس بارہ شلنگ خرچ ہو جانا معمولی بات ہوتی تھی۔ (ایک پونڈ ۲۰ شلنگ کا ہوتا ہے) اس لیے بہت زیادہ مصاریف واقع ہوئے۔ خصوصاً ابتدا میں اس لیے کہ آیندہ کے انتظامات کے لیے بہت ضروریات کا انتظام کرنا پڑا۔ جیسے کہ کسی کو نیا گھر بنانا پڑتا اور کچھ بد انتظامیاں بھی ناواقفیت اور نالائق واسطوں کی وجہ سے پیش آئیں۔

۲۶ر مئی ۱۹۱۷ء: ۴ر شعبان تک یہ تمام مقدار (۷۷) پونڈ کی آفس سے وصول ہوگئی جو کہ

مولوی عزیر گل صاحب کی تحویل میں رہتی تھی۔ ہفتہ وار خرچ کے لیے ان سے حسب حساب لیا جاتا تھا۔ یہ مقدار نقود کی برابر خرچ میں آتی رہی۔ اگر چہ ہم نے بہت زیادہ کفایت شعاری سے انتظام کیا مگر گرانی اشیاء اور گوشت کے نہ ہونے اور دیگر ضروریات کی وجہ سے ہر مہینے پانچ چھ گنی کا خرچ پڑتا ہی رہا۔ چوں کہ ہندوستان بہت دور تھا۔ چھوٹنے کی کوئی خبر نہ تھی۔ مقدار موجودہ تھوڑی تھی اس لیے پھونک پھونک کر قدم رکھنا پڑتا تھا۔ غرضیکہ ابتداء ماہ جمادی الاول ۱۳۳۵ھ سے (جو کہ اگلا دن دخول مالٹا کا ہے) اواسط ربیع الاولیٰ ۱۳۳۶ھ تک ہم نے اس ۷۷ پونڈ کی مقدار کو خرچ کر ڈالا۔ اس مدت میں ہم نے جب خرچ کی حالت یہ دیکھی اور اسارت کی نہایت کی کوئی اطلاع نہ پائی تو مکہ معظمہ کو لکھا کہ بقیہ ہمارے نقود جو کہ تقریباً ۴۰ پونڈ یا کچھ اس سے کم ہوتے ہیں، ہمارے پاس بذریعہ حوالہ بھجوا دو۔ چناں چہ منشی محمد حسین نے ۳۵ پونڈ نقد اور دیگر ضروری اشیاء پان چھالیہ وغیرہ بذریعہ معتمد بریطانی مقیم جدہ بھجوایا۔ جس کی صورت یہ واقع ہوئی کہ اگر چہ اولاً جدہ کی حکومت قبول نہیں کرتی تھی۔ مگر جب ہم نے بذریعہ آفس گورنر مالٹا سے خواستگاری کی کہ ہماری ضروری پارسلیں اور نقود مکہ معظمہ سے بذریعہ معتمد بریطانی مقیم جدہ منگادی جائیں، اس وقت وہاں سے حسب قاعدہ حکم کیا گیا اور ہمارے نقود وغیرہ آ گئے۔

۲۴ راکتوبر ۱۹۱۷ء مطابق ۷ رمحرم الحرام ۱۳۳۶ھ سے یہ مقدار دو تین ہفتہ میں ہم کو وصول ہوگئی۔ جس کو بمد امانت علاحدہ مولوی عزیر گل صاحب کے پاس رکھا گیا۔ ۱۶ رربیع الاول ۱۳۳۶ھ سے اس مقدار میں خرچ کرنا شروع کیا گیا اور ۱۹ر جمادی الثانی ۱۳۳۶ھ مطابق ۲۸ رمارچ ۱۹۱۸ء تک یعنی تقریباً تین ماہ تک اس مقدار میں سے صرف ۷ پونڈ خرچ کیا گیا اور نہایت کفایت شعاری کو کام میں لایا گیا۔ اس کے بعد اپریل ۱۹۱۸ء سے نفقہ گورنمنٹ کی طرف سے مقرر ہو گیا۔

مسٹر سیدار اور ڈاکٹر غلام محمد کی علاحدگی:

مسٹر سیدار اور ڈاکٹر غلام محمد جیسا کہ میں پہلے ذکر کر چکا ہوں ہمارے ساتھ ہی روگیٹ کیمپ سے عرب کیمپ کے کمرہ میں آ گئے تھے مگر چوں کہ ہم سب تو حضرت مولانا کے زیر اثر تھے۔ اگر خلاف طبائع امور پیش آتے تھے تو ہم پر قوت حاکمہ اور جامعہ موجود تھی مگر ان دونوں کی وہ حالت نہ تھی۔ کچھ ہی دنون کے بعد رفقاء میں خلاف طبع امور ظاہر ہونے سے کشیدگیاں پیدا ہو گئیں۔ ہم نے

ہر طرح اصلاح کی کوشش کی ان دونوں حضرات کو مصاریف زائدہ کی گراں باری کا بھی متحمل نہ کیا، خدمات وغیرہ میں بھی حتی الوسع ان کی خبر گیری اور ہمدردی پوری طرح کی گئی۔ مگر آخرکار کوئی نتیجہ نہ ہوا۔ ماہ رمضان ۱۳۳۵ھ مطابق اوائل جولائی ۱۹۱۷ء میں سیدار علاحدہ ہوکر ردگیٹ کیمپ کو چلا گیا اور پھر ڈاکٹر غلام محمد ماہ اکتوبر ۱۹۱۷ء مطابق اواخر ذی الحجہ ۱۳۳۵ء میں ردگیٹ کیمپ میں چلے گئے۔

علی بیگ کا واقعہ:

ہمارے مالٹا پہنچنے سے پہلے ترکی کے دو افسروں میں کچھ اختلافات ردگیٹ کیمپ میں واقع ہوئے۔ یہ دونوں ترکی گورنمنٹ کے مجرم تھے اور فرار ہوکر مصر میں موجود تھے کہ اعلان جنگ ہوا۔ حکومت انگریزی نے دونوں کو مع دیگر اسرء کے یہاں مالٹا میں بھیج دیا تھا۔ علی بیگ ترکی حکومت میں یوزباشی (کپتان) فوجی تھا اور دوسرا ڈاکٹر تھا، ایک شب دونوں میں سخت ناچاقی ہوئی، شب میں سوتے ہوئے علی بیگ نے ڈاکٹر پر حملہ کیا اور چھری سے سخت زخمی کردیا، ڈاکٹر کو ہسپتال پہنچایا گیا اور علی بیگ کو قید خانہ میں پہنچادیا گیا۔ ڈاکٹر کو ایسا زخم کاری لگا تھا کہ وہ جانبر نہ ہوسکا، مقدمہ قائم کیا گیا۔ حکام نے اس کی نسبت پھانسی کا فیصلہ کیا ترکی گورنمنٹ کو حسب قاعدہ خبر کی گئی۔ وہاں سے بھی اجازت آگئی۔ آخرکار علی بیگ مرحوم کے لیے پھانسی کی تاریخ مقرر ہوگئی۔ جب کہ اس کی تاریخ کو تقریباً ڈیڑھ ماہ باقی تھے ہم سب مالٹا پہنچے۔

حضرت مولانا کے تقدس کی خبر اس کو پہنچی اس نے وہیں جیل خانہ میں درخواست کی کہ میں مولانا سے ملنا چاہتا ہوں۔ غالباً یہ درخواست اس کی پھانسی سے پانچ چھ دن پہلے ہوئی تھی۔ چناں چہ آفس نے مولانا کو موٹر پر وہاں پہنچایا، یہ شخص چوں کہ اصلی باشندہ تیونس یا الجیریا کا تھا اس لیے عربی زبان خوب جانتا تھا۔ اس نے مولانا مرحوم سے باتیں کیں اور بہت زیادہ گرویدہ ہوگیا۔ دوسرے دن پھر طلب کیا اور مجھ کو (کاتب الحروف) کو بھی طلب کیا اور اپنی وصیت میں لکھا کہ مولانا میری پھانسی کے وقت بھی موجود رہیں اور میرا دفن کفن نماز جنازہ وغیرہ سب مولانا فرمائیں۔ اگرچہ مولانا مرحوم کو ان امور سے کوئی سابقہ خاص طور پر نہ پڑا تھا اور نہ ان کو ایسی باتوں سے دلچسپی تھی مگر اس وقت میں اس کے سامنے انکار کرنا بھی غیر مناسب معلوم ہوا۔ اس نے علاوہ کاتب الحروف اور مولانا مرحوم کے اور بھی مصر اور ترکی کے بعض آدمیوں کو اپنی تکفین وغیرہ کے لیے طلب کیا تھا۔ چناں چہ پھانسی کے دن صبح صادق کے وقت ہم سبھوں کو آفس میں لے گئے۔ وہیں ہم سبھوں نے نماز فجر ادا کی اور پھر موٹر میں قید خانہ میں پہنچے۔ تقریباً سات یا آٹھ بجے پھانسی

کا وقت آ گیا۔ وہاں بھی سبھوں کے لیے چائے حاضر کی گئی تھی۔ سبھوں نے اور خود علی بیگ نے بھی چائے پی اور پھر کچھ وصیتیں کیں اور جب وقت پھانسی کا آ گیا اور اس کو ہتھکڑیاں پہنائی گئیں اس وقت اس نے مولانا سے درخواست کی کہ آپ میرے ساتھ پھانسی کے چبوترہ اور تختے تک رہیں۔ چناں چہ اس نے مولانا کے ہاتھ پکڑ لیے اور پھانسی کے تختے تک برابر لے گیا۔ باقی لوگ سب کے سب چبوترے کے نیچے کھڑے تھے، جب اس کو تختے پر کھڑا کیا گیا تب اس نے ہاتھ چھوڑا، مولانا مرحوم اس کے قریب وہاں ہی رہے۔ اسی دم اس کو حلقہ پھانسی کا پہنا دیا گیا۔ اس نے کلماتِ شہادت ادا کیے اور تختہ ہٹا دیا گیا۔ اس کے بعد سب لوگ باہر کر دیے گئے۔ تھوڑی دیر کے بعد مرحوم کی نعش لکڑی کے صندوق میں لائی گئی اور ایک خاص گاڑی میں جو اسی نعش کے ڈھونے کے لیے گھوڑوں کی وہاں ہوتی ہے رکھ دی گئی اور ہم سبھوں کو موٹر میں زیر حراست قبرستان اسلام میں پہنچا دیا گیا۔'' (سفر نامہ اسیر مالٹا: ص ۹۴۔۱۰۱)

پنجاب میں سر مائیکل اوڈائر کا عہد گورنری:

پنجاب میں سر مائیکل اوڈائر کا زمانۂ گورنری جنگ عظیم اول کے آغاز سے ایک سال پہلے (۱۹۱۳ء میں) شروع ہوا تھا۔ مارشل لا کی مصیبت تو ۱۹۱۹ء میں آئی تھی، لیکن پنجاب میں مظالم کا آغاز سر مائیکل کے زمانے ہی سے ہو گیا تھا۔ مائیکل کا دور ہندوستان کی تاریخ میں اہل ملک کی تذلیل، توہین، تحقیر اور ان پر مظالم کا انتہائی وحشت ناک اور شرم ناک دور تھا۔

سر مائیکل اوڈائر ۱۹۱۳ء میں پنجاب کے لیفٹننٹ گورنر بنے۔ اپنے تقرر کے چند ہفتوں کے اندر ہی انھوں نے اخبارات کو ایک وارننگ جاری کی اور پریس ایکٹ کے تحت ان کے خلاف کارروائیاں کی گئیں۔ بہت سے اخبارات سے ضمانتیں طلب کی گئیں اور ضمانتیں ضبط بھی کی گئیں۔ پنجاب میں نیو انڈیا، امرت بازار پتریکا اور انڈیپنڈنٹ جیسے مقتدر اخبارات کا داخلہ بند کر دیا گیا۔ انھوں نے غدر تحریک کو بڑی بے رحمی سے دبا دیا۔ اس کے متعلق آل انڈیا کانگریسی کمیٹی کی پنجاب سب کمیٹی نے چھان بین کے لیے ایک کمیٹی مقرر کی تھی۔ اس نے اپنی رپورٹ میں لکھا ہے۔

''سینکڑوں بے گناہ لوگوں کے ساتھ بے انصافی کی گئی۔''

سر مائیکل کے مطلق العنانی اور قانون کی پیروی سے متعلق حقارت آمیز رویے کا اظہار اس کی ان حرکتوں سے بخوبی ہوتا ہے جو اس نے فوج میں بھرتی اور جنگ کے لیے چندہ وصول کرنے کے

سلسلے میں اختیار کی تھیں۔ عدالت میں برسرعام مجرموں کو یہ کہہ کر رہا کر دیا یا سزا دی جاتی تھی کہ انھوں نے وار فنڈ میں چندہ دیا یا نہیں دیا ہے۔ یہ حرکت صرف چھوٹے موٹے مقدموں تک محدود نہ تھی بلکہ قاتلانہ حملوں کے مرتکب مجرموں تک کے ساتھ کی جاتی تھی۔ رشوت، دھمکی، جبر و دباؤ اور ظلم و تشدد کی گرم بازاری تھی۔

مظفر گڑھ کے ایک سیشن جج کو اپنے فیصلے میں یہ لکھنے پر مجبور ہونا پڑا کہ سر مائیکل اوڈائر نے جو طریقے اختیار کیے ہیں وہ اکثر غیر قانونی، قابل اعتراض اور ظالمانہ ہوتے ہیں اور یہ لوگوں کے لیے نا قابل برداشت ہیں۔ انھی وجوہ سے ایک ضلع میں ایک تحصیل دار کو لوگوں کی بھیڑ نے موت کے گھاٹ اتار دیا۔ کسی بات یا واقعہ کے خلاف بالکل صحیح طور پر کسی ناگواری کا اظہار یا احتجاج کیا جاتا تو اسے بغاوت قرار دیا جاتا اور بڑی سختی برتی جاتی۔ اینی بیسنٹ نے لکھا ہے:

> ''سر مائیکل اوڈائر کی تحقیر آمیز اور ظالمانہ حکومت، فوج میں بھرتی کے ان کے طریقے، لڑائی کے لیے زبردستی وصول کیے گئے قرضے اور تمام سیاسی رہنماؤں کے ساتھ جابرانہ سلوک نے لوگوں کے دلوں میں غم و غصے کی چنگاری کو سلگا رکھا ہے جو آگ کے شعلوں میں بدل جانے کے لیے بالکل تیار ہے۔''

موتی لال نہرو کمیٹی نے اپنی رپورٹ میں لکھا ہے:

> ''اس طرح سر مائیکل نے پنجاب کی زندگی میں حرارت پیدا کر دی اور سارے پنجابی اپنے آپ کو اس طرح ایک اور ہم آہنگ محسوس کرنے لگے، جیسے پہلے کبھی نہیں تھے۔ جب اپریل کا مہینہ شروع ہوا اور جب انھوں نے پنجاب اور سارے ہندوستان کی ایکتا کا مظاہرہ اپنی آنکھوں سے دیکھ لیا تو وہ حواس باختہ ہو گئے اور ۷ اپریل کو انھوں نے ایک تقریر کی جو ان کی بدمزاجی کی مظہر تھی۔ اپنے آہنی دور حکومت میں آزادی کی جس روح کو انھوں نے اپنے ظلم و جبر کے بوجھ تلے دبا رکھا تھا انھیں ہر تقریر اور آپس کی میل ملاقات سے سازش اور بغاوت کی بو آتی تھی۔ اسی لیے نہایت غیظ و غضب کے عالم میں انھوں نے ڈاکٹر ستیہ پال، ڈاکٹر سیف الدین کچلو اور مسٹر گاندھی کے خلاف احکام جاری کر دیے۔ انھیں

معلوم ہونا چاہیے تھا کہ اس اقدام سے ان لوگوں میں مزید اشتعال پیدا ہوگا جو پہلے ہی سے ان کی حکومت کے خلاف بھڑکے ہوئے ہیں۔ ہم یہ کہنے میں جھجھک محسوس نہیں کرتے کہ انھوں نے لوگوں کو تشدد کے لیے بھڑکایا تاکہ وہ انھیں کچل سکیں۔''

کالا قانون:

حکومت کے خلاف اس بے اطمینانی اور بے اعتمادی کی فضا میں رولٹ بل پاس کیا گیا۔ جب لڑائی ختم ہوئی تو لوگوں میں امید پیدا ہوئی تھی کہ ڈیفنس آف انڈیا ایکٹ کو منسوخ کردیا جائے گا۔ لوگ اس قانون کو اس وجہ سے ناپسند کرنے لگے تھے کہ حکومت کے اعلانات کے برعکس سر مائیکل اوڈائر جیسے لوگ سیاسی تحریکوں کو کچلنے کے لیے اس قانون کی مدد لینے لگے تھے۔ اسی قانون کے تحت تلک اور پال کو پنجاب سے دور رکھا گیا اور اینی بیسنٹ اور ان کے ساتھیوں کو نظر بند رکھا گیا۔ کیوں کہ وہ لوگ وہاں انڈین ہوم رول تحریک کی نمائندگی کرنے آئے تھے۔

اگست ۱۹۱۷ء میں وعدہ کیا گیا تھا کہ ہندوستان میں ذمہ دار حکومت قائم کرنے کے سلسلے میں آگے قدم اٹھایا جائے گا اور اس کی امید بھی کی جاتی تھی کہ ڈیفنس آف انڈیا ایکٹ کا خاتمہ ہوجائے گا اور لوگوں کو خفیہ محکمے کی ناخوشگوار توجہات سے نجات مل جائے گی۔ لوگوں کی یہ امید بلاوجہ نہ تھی۔ انھوں نے لڑائی میں پوری طرح انگریزوں کا ساتھ دیا تھا۔

اس لیے جب رولٹ قوانین پاس ہوئے تو لوگ حیران رہ گئے۔ پہلے ہی سے ناراض اور مشتعل لوگوں کی ساتھ قصداً چھیڑ خانی کی گئی تھی۔ ان قوانین کے نفاذ کے وقت وائسرائے نے جو تقریر کی اس سے ظاہر ہوا کہ یہ بل ہندوستان کی سول سروس میں شامل برطانوی عناصر کے خوف اور شبہات کو دور کرنے کے لیے پاس کیے گئے ہیں۔ اس بات سے مشتعل ہوکر مہاتما گاندھی نے یہ سوال کیا تھا کہ کیا ان کے مفادات ہندوستان کے مفادات سے بالاتر ہیں؟

مانٹیگ چیمسفرڈ اصلاحات:

اگست ۱۹۱۷ء: مانٹیگ چیمسفرڈ اصلاحات سے مراد ہندوستان کے لیے دستوری اصلاحات کا وہ خاکہ ہے جو وزیر ہند ایڈوین مانٹیگ کے اگست ۱۹۱۷ء کے اس اعلان پر عملدرآمد کرنے کے لیے برطانیہ کا مقصد ہندوستان کے سلطنت برطانیہ میں شامل رہتے ہوئے وہاں ذمہ دار حکومت کا

قیام ہے انھوں نے وائسرائے لارڈ چیمسفرڈ کے ساتھ صلاح ومشورہ کر کے تیار کیا اور جو ہندوستان کی دستوری اصلاحات سے متعلق رپورٹ کے عنون سے جولائی ۱۹۱۸ء میں شائع ہوا۔ اس رپورٹ کی بنیاد پر مزید تحقیقات کی گئیں اور بالآخران تجاویز پر مبنی گورنمنٹ آف انڈیا ایکٹ ۱۹۱۹ء پارلیمنٹ سے منظور ہوا۔ اس دستور کے تحت صوبوں میں دوعملی نظام حکومت نافذ ہوا۔ بلدیات کو خودمختاری دی گئی۔ (فرہنگ سیاسیات: ص ۷۷۔۳۷۶)

حضرت شیخ الہند کے لیے خاص رعایات:

ستمبر یا اکتوبر ۱۹۱۷ء: ستمبر یا اکتوبر ۱۹۱۷ء میں ایک روز مولانا کو آفس میں بلایا گیا اور کمانڈار نے کہا کہ ہمارے پاس آپ کے لیے خاص طور پر حکم آیا ہے کہ آپ کی خاطر داری غایت درجہ کریں اور جو مراعات اور حقوق فوجی کپتان کے کیے جاتے ہیں، وہ آپ کے ساتھ ملحوظ ہوں۔ اس لیے ہم آیندہ اس کا اہتمام کریں گے، مگر آپ کو کوئی ضرورت یا شکایت ہو تو بیان فرمایئے۔ مولانا مرحوم نے فرمایا کہ میں کیمپ میں جا کر کل کو لکھ کر بھیجوں گا، اس نے کہا کہ اپنے قیام کے لیے جس کیمپ اور جس کمرہ کو آپ چاہیں پسند فرمائیں۔ ہم وہاں انتظام کردیں گے۔ مولانا مرحوم نے فرمایا کہ میں اس کیمپ میں ہی رہنا پسند کرتا ہوں۔ میں یہاں سے دوسری جگہ جانا نہیں چاہتا۔ اس نے کہا کہ دردالہ اور دال فرسٹہ میں اچھے اور آرام کے مکانات ہیں۔ مولانا نے فرمایا کہ میرے لیے پیشاب کی سخت تکلیف ہے اس کا کوئی انتظام کردیجیے، باقی امور کو میں کل لکھوں گا۔

مولانا مرحوم کا طبعی مذاق تھا کہ وہ غرباء اور معمولی آدمیوں میں رہنا پسند فرماتے تھے اور اپنی عادت، لباس، چال، معاملات وغیرہ اسی قسم کا رکھنا چاہتے تھے۔ اہل دنیا اور امراء اور تکلف والوں سے گھبراتے تھے۔

حضرت مولانا شیخ الہند رحمۃ اللہ علیہ اس بات کی تلاش میں رہتے تھے کہ کس بات میں فروتنی، نفس کشی، خمول، تواضع، انکساری ہوتی ہے۔ اس کے لیے از حد کوشاں ہوتے تھے اور جس چیز میں رعونت، جاہ طلبی، نفس پرستی، تعلی، خودداری ہوتی تھی، اس سے کوسوں بھاگنے کی فکریں کرتے تھے۔

........الغرض مولانا نے اپنے نفس کو ریاضتوں وغیرہ سے اس طرح مہذب بنالیا تھا کہ صادقین کے زمرۂ شریفہ میں داخل ہوکر منصب عظیم حاصل کرلیا تھا۔ کہ ان کی یہ فروتنی کسر نفسی حالی

تھی قائل نہ تھی۔ ان کا قلب اسی بات کو دیکھتا تھا جس کو ان کی زبان اور آنکھ ظاہر کر رہی تھی۔ وہ اپنے آپ کو واقع میں ایک معمولی مخلوق اور ایک ادنیٰ درجے کا انسان دیکھتے تھے۔......

مولانا نے اپنے تشریف لانے کے بعد ہم خدام سے بیان فرمایا اور یہ حکم کیا کہ جن چیزوں کی حاجت ہو اور مناسب معلوم ہو اس کو لکھو۔ اس لیے ہم نے اگلے دن ایک مفصل عرضی حضرت مولانا کی طرف سے تیار کر دی۔ جس کا خلاصہ یہ تھا کہ ہم گرم ملک کے رہنے والے ہیں، مالٹا نہایت سرد جگہ ہے۔ جس طرح اہل یورپ کو وسط افریقہ کی گرمی ستاتی اور امراض پیدا کرتی ہے اسی طرح ہم لوگوں کو ان سرد ملکوں کی آب و ہوا مناسب نہیں ہوتی

میں چوں کہ ضعیف العمر ہوں اور مختلف امراض مزمنہ میں مبتلا بھی ہوں، ہمیشہ وطن میں باوجود گرم ملک ہونے کے سردی سے مجھ کو بہت زیادہ ضرر پہنچتا تھا اس لیے میں مالٹا کی تکلیف کا متحمل نہیں ہو سکتا۔ ہمیشہ مجھ کو اپنے رفقاء کی نسبت بھی یہی خوف رہتا ہے کہ یہاں کی نہایت سرد ہوا سے کسی سخت بیماری کا سامنا نہ ہو جائے۔ اس لیے ضروری ہے کہ جب کہ میں کسی قسم کا واقع میں مجرم نہیں ہوں تو جلد آزاد کر دیا جاؤں اور اگر یہ منظور نہیں ہے تو کم از کم اتنا تو ضرور ہو جائے کہ مجھ کو اسارت میں ہی رکھا جائے مگر اپنے وطن ملک ہندوستان میں منتقل کر دیا جاؤں اور اگر یہ بھی نہیں کیا جاتا تو اتنا تو ضرور کر دیا جائے کہ مصر کے ان شہروں میں مجھ کو رکھا جائے جہاں پر سردی زیادہ نہیں ہوتی تاکہ اسلامی شہر اور گرم ملک ہونے کی بناء پر مجھ کو مختلف تکالیف کا سامنا نہ ہو۔

مجھ کو اور میرے رفقاء کو کھانے کی سخت تکلیف ہے۔ ہم گوشت کھانے کے عادی ہیں، جس پر طبی حیثیت سے بھی مدار زندگی شمار کیا جاتا ہے۔ مگر موجودہ گوشت ہمارے مذہب کے بالکل خلاف ہے۔ مالٹا سے اگرچہ زندہ حیوان منگانے کی ہم کو اجازت دے دی گئی ہے، مگر وہ اس قدر گراں ہے کہ ہمارا موجودہ سرمایہ بہت احتیاط سے صرف کرنے میں بھی اکثر خرچ ہو گیا۔ علاوہ اس کے دیگر اشیاء بھی ہماری طبیعت اور عادت کے موافق جس پر ہمارا نشو و نما ہوا ہے، یہاں پر میسر نہیں ہوتیں،

لباس جو اسراء کو ملتا ہے اس سے بھی ہم نفع نہیں اٹھا سکتے کیوں کہ وہ ہماری وضع کے بالکل مخالف ہے۔ ہم نے ایک سال سے زیادہ ہو چکا ہے فقط دو تین چیزیں ضروری لی ہیں۔ اب تک ہم اپنا لباس جو ہمارے ساتھ تھا استعمال کرتے رہے، مگر وہ اب پرانا ہو گیا ہے، اس لیے اس کا انتظام ہونا چاہیے۔

ہم کو اس مکان سے بدل کر دوسرے کیمپ میں جانے کی ہرگز خواہش نہیں، مگر البتہ ہم کو جو تکالیف ہیں ان کا دفعیہ کر دیا جائے۔ یعنی پیشاب وغیرہ کے لیے کوئی قریب جگہ ہم کو بالفعل بنوادی جائے اور ہماری آزادی یا انتقال مکانی کے لیے بہت جلد کوئی صورت پیدا کر دی جائے۔

اس عرضی کو عربی اور انگریزی میں لکھوا کر کمانڈر کے پاس بھجوا دیا گیا۔ اس سے دو ہی ایک دن پہلے یہ بھی واقعہ ہوا تھا کہ ڈاکٹر نے بلا کر مولانا سے ان کی صحت وغیرہ کی نسبت پوچھا تھا اور کہا تھا کہ گورنمنٹ ہند سے حکم آیا ہے کہ آپ کی صحت کی تحقیقات کر کے میں اس کو اطلاع دوں۔ اس سے بھی یہی امور کہہ دیے گئے تھے۔

اس عرضی کے بعد فقط اتنا معاملہ ضرور ہوا کہ ایک لوہے کا پلنگ اور ذرا بڑھیا گدا مولانا کے لیے آیا اور ایک کوٹھڑی میں جس کا میں نشان پہلے دے چکا ہوں پیشاب کے لیے بالٹی اور چوکی رکھوادی گئی، جس میں شب کو مولانا رحمۃ اللہ علیہ اور دوسرے ہمسایہ پیشاب کرتے تھے باقی امور کی طرف ادنیٰ توجہ بھی نہ کی گئی۔ (سفرنامۂ اسیر مالٹا: ص ۹-۱۰۵)

حضرت کی رہائی کے لیے میمورنڈم:

۵ر نومبر ۱۹۱۷ء: جب کانگریس، مسلم لیگ اور ملک کے دوسرے سیاسی وغیر سیاسی افراد اور جماعتوں خصوصاً ''انجمن اعانت نظر بندان اسلام'' کی طرف سے ملک و بیرون ملک نظر بند سیاسی اسیروں کی رہائی کا مطالبہ کیا جانے لگا اور مولانا ابوالکلام آزاد، مولانا محمد علی، مولانا شوکت علی اور حضرت شیخ الہند مولانا محمود حسن اور ان کے رفقاء کی رہائی کی تحریک عام ہوئی تو دارالعلوم کے ارباب اہتمام کے لیے بھی جھینپ مٹانے کے لیے کوئی قدم اٹھانا ضروری ہو گیا۔ چناں چہ اس سلسلے میں ایک میمورنڈم تیار کیا گیا اور نومبر ۱۹۱۷ء کو علمائے دیوبند کا ایک وفد گورنر یو پی سے ملا اور حضرت شیخ الہند اور ان کے رفقاء کی رہائی کی درخواست کی۔ مفتی عزیز الرحمٰن بجنوری اپنی تالیف 'تذکرۂ شیخ الہند'' میں لکھتے ہیں:

> ''......ارکان تحریک (شیخ الہند) ارباب اہتمام کی طرف سے مطمئن نہیں تھے۔ ان کو گورنمنٹ کا آدمی خیال کرتے تھے۔ اس میں شک نہیں کہ ۵ر نومبر ۱۹۱۷ء کو ایک وفد علمائے دیوبند کا گورنر یو پی کے پاس پہنچا اور انھوں نے ایک تحریر پیش کی، جو القاسم میں شائع ہو چکی ہے۔ جس میں

حضرت شیخ الہند کے آزاد کرانے کا مطالبہ اور حضرت موصوف کی بریت اور صفائی کا اظہار تھا۔'' (صفحہ ۲۵۹)

۱۰ دسمبر ۱۹۱۷ء: ۱۰ دسمبر ۱۹۱۷ء کو حکومت ہند نے ایک کمیٹی مقرر کی تھی۔ جس کے صدر مسٹر جسٹس رولٹ تھے۔ یہ کمیٹی اس غرض سے قائم کی گئی تھی کہ ''ہندوستان کی انقلابی تحریکوں سے جن مجرمانہ سازشوں کا تعلق ہے'' ان کا پتا لگایا جائے اور ان سے نمٹنے کے لیے جن قوانین کی ضرورت ہے، ان کی سفارش کی جائے۔ اس کمیٹی کے اجلاس خفیہ طور پر ہوئے اور ۱۵ اپریل ۱۹۱۸ء کو اس کمیٹی نے اپنی رپورٹ پیش کی۔ اس رپورٹ کی بنیاد پر جو قوانین بنے انھیں رولٹ بل کہا جاتا ہے۔

عوام کو اس کی کوئی خبر نہ تھی کہ اس کمیٹی کے سامنے کس قسم کی شہادتیں گزری ہیں یا کن لوگوں نے شہادتیں دی ہیں۔ عوام کی طرف سے گواہوں سے کوئی جرح نہیں کی گئی تھی اور نہ ہی عوام کو اس کمیٹی میں کوئی نمایندگی دی گئی تھی۔ موتی لال نہرو کمیٹی رقم طراز ہے:

> ''ایسے قوانین کا مطالبہ جس سے لوگوں پر جبراً حکومت کی جائے، یہ ظاہر کرتا ہے کہ عوام کی خواہشوں کا احترام نہیں کیا جائے گا۔ دوسرے الفاظ میں اس کا مطلب یہ ہوا کہ ان پر ان کی مرضی کے خلاف حکومت کی جائے۔''

جب یہ بل امپیریل لیجس لیٹو کونسل میں پیش ہوا تو مسٹر سری نواس شاستری نے اپنی یادگار تقریر کی۔ گاندھی جی نے ان کی تقریر سنی تھی۔ اس کے متعلق وہ لکھتے تھے۔

> ''ایسا لگتا تھا کہ وائسرائے مسحور ہو کر ان کی تقریر سن رہا ہے۔ اس کی آنکھیں شاستری پر جمی ہوئی تھیں اور وہ نہایت جوشیلی اور گرما گرم تقریر کر رہے تھے۔ تھوڑی دیر کے لیے مجھے محسوس ہوا کہ وائسرائے پر اس تقریر کا گہرا اثر ہوا ہوگا کیوں کہ یہ تقریر مدلل اور پر معنی تھی۔''

مسٹر شاستری نے اپنی تقریر میں انتباہ دیا:

> ''ملک میں عوام کے جوش وجذبے میں اتنی کمی اور سیاسی طور پر اتنا انحطاط آ گیا ہے کہ ذمہ دار حکومت قائم کرنے سے متعلق آپ کی باتیں محض مذاق بن کر رہ گئی ہیں۔''

انھوں نے کہا۔

''یہ کہیں اچھا ہے کہ چند بدمعاش آزاد گھومیں بجائے اس کے کہ ایماندار افراد ملک کے قانون کے ڈر سے اپنے گھروں میں بند رہیں یا ان سرگرمیوں میں حصہ نہ لیں جن مین حصہ لینا ان کی سرشت مین شامل ہے۔ تمام سیاسی اور عوامی کاموں سے اجتناب کریں۔ محض اس وجہ سے کہ ملک میں نہایت خطرناک قوانین نافذ ہیں۔''

انھوں نے حکومت کو مشورہ دیا کہ اتنی سخت مخالفت کے پیش نظر یہ قانون پاس نہ کیا جائے۔

انھوں نے پوچھا۔

''ہندوستان میں کون کون آپ کے ساتھ ہے؟ ہندوستان کی الم ناک کہانی کو مختصراً ان الفاظ میں پیش کیا جائے گا کہ اس پورے زمانے میں آپ نے ہندوستان پر بالکل الگ تھلک رہ کر حکومت کی اور ہندوستان کی رائے عامہ کا کوئی بھی ذمہ دار حصہ آپ کے ساتھ نہیں تھا۔''

انھوں نے مزید کہا:

''لوگوں میں پہلے ہی سے ہیجان اور اشتعال موجود ہے اور اس میں ہمارا کوئی حصہ نہیں ہے۔ لیکن اگر ہماری اپیل نہیں سنی جاتی اور اس بل کو پاس کر دیا جاتا ہے، تو میرا خیال ہے کہ ہر وہ شخص جو یہاں موجود ہے، اگر اس ایجی ٹیشن میں شامل ہو جاتا ہے تو اپنا فرض ادا کرتا ہے۔''

اتنی زبردست مخالفتوں کے باوجود اس بل کو قانون کی شکل دے دی گئی اور رائے شماری کے ہر اہم موقعے پر لیجسلیٹو کونسل کے کسی ہندوستانی ممبر نے سوائے ایک کے ''اس کے حق میں ووٹ نہیں دیا۔ جس واحد ممبر نے اس کے حق میں ووٹ دیا تھا وہ بھی پنجاب میں اس کے نتائج دیکھ کر مستعفی ہو گیا۔

ہدایت کے مطابق جنوری ۱۹۱۸ء سے کمیٹی نے اپنا کام شروع کر دیا تھا۔ اس کے بعض اجلاس لاہور میں اور باقی سب کلکتہ میں ہوئے۔ ساڑھے تین ماہ کی سعی کے بعد ۱۵ر اپریل ۱۹۱۸ء کو یہ رپورٹ سیکریٹری گورنمنٹ ہند ہوم ڈیپارٹمنٹ کی خدمت میں پیش کر دی گئی۔

رپورٹ میں بنگال، بمبئی، مدراس، بہار واڑیسہ، صوبہ جات متوسط اور صوبجات متحدہ پنجاب

میں انقلابی سیاسی تحریکوں کے متعلق تحقیقات پیش کی گئی ہیں۔ یہ رپورٹ سولہ ابواب اور چند دیگر مشمولات پر دو حصوں میں ہے۔ پہلے حصے میں تحقیقات اور ان کے نتائج بیان کیے ہیں۔ یہ حصہ ۲۵۸ صفحات پر ختم ہوتا ہے۔ دوسرا حصہ مشکلات اور ان کے متعلق مشورے کے عنوان سے ہے اور صفحہ ۲۵۹ سے شروع ہو کر صفحہ ۳۴۴ پر ختم ہوتا ہے۔ یہ رپورٹ ''باغیانہ تحریک کے متعلق رولیٹ کمیٹی کی تحقیقات کی رپورٹ'' کے نام سے شیخ عبدالعزیز جوائنٹ سیکریٹری پنجاب پبلسٹی کمیٹی کے زیر نگرانی ترجمہ ہوئی اور کاشی رام پریس، لاہور سے دسمبر ۱۹۱۸ء میں شائع ہوئی تھی۔ اس کا چودھواں باب لاہور سے مسلمان طلبہ کے فرار اور ریشمی خطوط سازش کے منصوبے کے متعلق ہے۔ اس کے چند خاص پیرگراف یہاں شامل کیے جاتے ہیں:

''ریشمی خطوط والے سازشی:

مجاہدین کے طرف دار تعداد میں کم ہیں۔ لیکن ان کا حال بھی اس سلسلے میں خط و کتابت کی ایک بہت ضروری کڑی ہے۔ جو وہ لوگ جنھیں ہم آیندہ ''ریشمی خطوط والے سازشی'' لکھیں گے، ہندوستان کے مسلمان کے ساتھ جاری کرنے کی کوشش کرتے ہیں۔

اگست ۱۹۱۶ء میں اس سازش کا انکشاف ہوا جو گورنمنٹ کے کاغذات میں ''ریشمی خطوط کی سازش'' کہلاتی ہے۔ یہ ایک تجویز تھی جو ہندوستان ہی میں تیار کی گئی تھی۔ اس کا مقصد یہ تھا کہ شمال مغربی سرحد سے ایک حملہ ہو۔ ادھر ہندوستان کے مسلمان اٹھ کھڑے ہوں اور سلطنت برطانیہ کو تباہ و برباد کر دیا جائے۔ اس تجویز پر عمل کرنے اور اس کو تقویت دینے کے لیے ایک شخص مولوی عبیداللہ نے اپنے تین رفقاء عبداللہ، فتح محمد اور محمد علی کو ساتھ لے کر اگست ۱۹۱۵ء میں شمال مغربی سرحد کو عبور کیا۔ عبیداللہ سکھ سے مسلمان ہوا ہے اور صوبہ جات متحدہ کے ضلع سہارن پور میں مسلمانوں کے مذہبی مدرسۂ دیوبند میں اس نے مولوی کی تعلیم پائی ہے۔ وہاں اس نے اپنے جنگی اور خلاف برطانیہ خیالات سے عملہ مدرسۂ کے بعض لوگوں اور کچھ طلبہ کو متاثر کیا اور سب سے بڑا شخص جس پر اس نے اپنا اثر ڈالا، وہ مولانا محمود حسن تھا، جو اسکول میں بہت دیر تک ہیڈ مولوی رہ چکا ہے۔ عبیداللہ چاہتا تھا کہ دیوبند کے مشہور مدرسے کے تعلیم یافتہ مولویوں کی رفاقت سے تمام ہندوستان میں ایک اسلامی جوش اور برطانیہ کے خلاف تحریک پھیلائے، لیکن اس کی تجاویز کے راستے میں مدرسے کے مہتمم اور انجمن کی لوگ سدراہ ہوئے۔ انھوں نے اسے اور اس کے چند

ساتھیوں کو مدرسے کی ملازمت سے برخاست کردیا۔ اس امر کا بھی ثبوت مل چکا ہے کہ وہ بعض حالات میں مصیبت میں گرفتار رہا۔ پھر بھی وہ مولانا محمود حسن کے پاس عام طور پر آتا رہا۔ مولانا کے مکان پر خفیہ جلسے ہوتے رہے اور اس بات کی اطلاع ملی ہے کہ سرحد سے کچھ آدمی بھی وہاں آتے تھے۔

۱۸ر ستمبر ۱۹۱۵ء کو محمود حسن نے بھی ایک شخص محمد میاں اور دوستوں کے ساتھ عبیداللہ کی مثال کی پیروی کی اور شمال کی طرف جانے کے لیے نہیں بلکہ عرب کے صوبۂ حجاز میں مقیم ہونے کی غرض سے ہندوستان چھوڑ دیا۔

روانہ ہونے سے پہلے عبیداللہ نے دہلی میں ایک مدرسہ قائم کیا اور دو ایسی کتابیں معرض اشاعت میں لایا۔ جن میں ہندوستانی مسلمانوں کو جنگی اور مذہبی جوش کی ترغیب دی گئی تھی اور ان کو جہاد کے فرض اولیٰ کے ادا کرنے پر آمادہ کیا گیا تھا۔ اس شخص کا اور اس کے دوستوں کا جن میں مولانا محمود حسن بھی شامل ہیں، عام مقصد یہ تھا کہ مسلمانوں کا ایک بہت زبردست حملہ ہندوستان پر ہو اور مسلمانوں کی بغاوت سے اس کو تقویت پہنچے۔ اب ہم ذیل میں ان کوششوں کا ذکر کریں گے جو ان لوگوں نے اپنے مقاصد میں کامیاب ہونے کے لیے کیں۔

عبیداللہ اور اس کے دوست پہلے ہندوستانی مجنونان مذہبی کے پاس گئے اور اس کے بعد کابل پہنچے۔ وہاں وہ ترکی جرمن مشن کے ممبروں سے ملے اور ان سے تبادلۂ خیالات کیا اور تھوڑے عرصے کے بعد ان کا دیوبندی دوست مولوی محمد میاں انصاری بھی آن ملا۔ یہ آدمی مولانا محمود حسن کے ساتھ عرب گیا تھا اور ۱۹۱۶ء میں وہ اعلان جہاد ساتھ لے کر آیا، جو حجاز کے ترکی فوجی حاکم غالب پاشا نے مولانا محمود حسن کو دیا تھا۔ اثنائے راہ میں محمد میاں اس تحریر (جو غالب نامے کے نام سے مشہور ہے) کی نقلیں ہندوستان اور سرحدی قوموں میں تقسیم کرتا ہوا آیا، عبیداللہ اور اس کے ساتھی سازشی لوگوں نے ایک تجویز تیار کی تھی کہ جب سلطنت برطانیہ کو مٹا دیا جائے تو ہندوستان میں ایک عارضی حکومت قائم کی جائے۔ ایک شخص مہندر پرتاب اس کا پریذیڈنٹ ہونے والا تھا۔ یہ شخص ایک اچھے خاندان کا ہندو اور خودرائے اور وہمی سیرت کا آدمی ہے اور ۱۹۱۴ء میں اسے اٹلی، سوئٹزرلینڈ اور فرانس میں سفر کرنے کا پروانہ راہداری دیا گیا تھا۔ وہ سیدھا جنیوا کو گیا۔ وہاں ہردیال سے ملا اور ہردیال نے اس کا جرمن قونصل سے تعارف کرادیا۔ اس کے بعد وہ برلن چلا گیا۔

ایک شخص جو عبیداللہ کو اچھی طرح جانتا تھا اس کی نسبت وہ لکھتا ہے کہ وہ شخص تجویزیں تیار کرنے میں بہت عجیب اور غیر معمولی آدمی تھا اور ایسا معلوم ہوتا تھا کہ وہ کسی بہت بڑی سلطنت کا حکمران ہے مگر جہاں کام کرنے کا وقت آجائے تو وہ بہت سست تھا اور کام کرنے سے جی چراتا تھا۔........

خود عبیداللہ ہندوستان کا وزیر ہونے والا تھا اور کرشنا ورما کا دوست اور امریکی غدر پارٹی کا ممبر برکت اللہ جس نے برلن کے راستے (کابل) کا سفر کیا تھا وزیراعظم ہونے والا تھا۔ یہ شخص ریاست بھوپال کے ایک ملازم کا بیٹا تھا اور انگلستان، امریکہ اور جاپان ہو آیا تھا۔ یہ شخص ٹوکیو میں ہندوستانی کا پروفیسر مقرر ہوا تھا اور وہاں اس نے برطانیہ کے خلاف ایک نہایت تیز اخبار ''اسلامک فیریٹرنٹی'' کے نام سے جاری کر رکھا تھا۔ اس اخبار کو بعد میں جاپانی حکام نے بند کر دیا تھا۔ اس کے بعد وہ اپنے عہدے سے موقوف کر دیا گیا اور پھر امریکہ جا کر وہ اپنے غدری دوستوں سے مل گیا۔

وہ جرمن جو افغانستان میں اپنے مقاصد کے لیے آئے تھے، جب ناکام رہے تو ۱۹۱۶ء میں واپس چلے گئے، مگر ہندوستانی وہیں رہے، اور ''حکومت عارضی'' والوں نے روسی ترکستان کے حاکم اور زار روس کو اس مضمون کے خطوط لکھے کہ روس کو چاہیے کہ برطانیہ کلاں کے اتحاد کو خیر باد کہہ کر ہندوستان سے سلطنت برطانیہ کو مٹا دینے کی کوشش میں امداد کرے۔ ان خطوط پر مہندر پرتاب کے دستخط تھے۔ آخر یہ خطوط برطانیہ کے ہاتھ آ گئے۔ شہنشاہ روس کے نام جو خط تھا وہ سونے کے پترے پر لکھا گیا تھا۔ جس کی عکسی تصویر ہمیں دکھائی گئی ہے۔

''حکومت عارضی'' نے ترکی گورنمنٹ سے ساتھ اتحاد پیدا کرنے کی تجویز بھی کی اور اس مقصد کے حصول کے لیے عبیداللہ نے اپنے پرانے دوست مولانا محمود حسن کو خط لکھا۔ یہ خط ایک اور خط مورخہ ۸ رمضان المبارک مطابق ۹ جولائی ۱۹۱۶ء کے ساتھ جو محمد میاں انصاری نے لکھا تھا بند کر کے اس نے حیدر آباد سندھ کے شیخ عبدالرحیم کے نام ایک نوٹ لکھ کر بھیج دیا۔ یہ شخص اس وقت مفقود الخبر ہے۔ شیخ عبدالرحیم سے اس نوٹ میں یہ التجا کی گئی تھی کہ وہ کسی معتبر حاجی کے ہاتھ وہ خطوط مکہ میں مولانا محمود حسن کو پہنچا دے۔ وہ خطوط زرد ریشمی کپڑے پر بہت صاف اور خوشخط لکھے ہوئے تھے۔ محمد میاں کے خط میں یہ باتیں لکھی تھیں: جرمن اور ترک وفود کا آنا، جرمنوں کا واپس چلے جانا، ترکوں کا بغیر کسی کام کے رہ جانا، غالب نامے کی اشاعت، حکومت عارضی کی تجویز

اور خدائی فوج کی مجوزہ ساخت۔

اس فوج کی نسبت یہ تجویز تھی کہ اس کے لیے ہندوستان سے رنگروٹ بھرتی کیے جائیں اور مسلمان حکمرانوں کے درمیان اتحاد پیدا کیا جائے۔ محمود حسن ان تمام معاملات کو حکومت عثمانی تک پہنچانے پر مقرر تھا۔ عبیداللہ کے خط میں خدائی فوج کی تجویز کا ایک نقشہ تھا۔ اس فوج کا ہیڈکوارٹر مدینہ اور اس کا جنرل انچیف محمود حسن ہونے والا تھا۔ دوسرے ہیڈکوارٹر مقامی جرنیلوں کے ماتحت قسطنطنیہ، تہران اور کابل میں قائم ہونے والے تھے۔ کابل میں خود عبیداللہ جرنیل مقرر ہونے والا تھا۔ اس نقشے میں تین سرپرستوں، ۱۲ فیلڈ مارشلوں اور بہت سے اور اعلیٰ فوجی افسروں کے نام تھے۔ لاہور کے بھاگے ہوئے طالب علموں میں سے ایک میجر جنرل، ایک کرنل اور چھ لیفٹنٹ کرنل ہونے والے تھے۔ جو اشخاص ان اعلیٰ عہدوں کے لیے منتخب کیے گئے تھے۔ ان میں سے اکثر ایسے تھے جن سے ان کے تقرر کی نسبت مشورہ نہیں لیا گیا تھا۔ لیکن ریشمی خطوط سے جو اطلاعات ملیں ان میں بعض تدارک ضروری تھے اور وہ لیے گئے۔

دسمبر ۱۹۱۶ء میں مولانا محمود حسن اور ان کے چار رفقا برطانیہ کے ہاتھ آ گئے۔ وہ اس وقت جنگی قیدی ہیں اور برطانیہ کی سلطنت کے ایک حصے میں نظر بند ہیں۔ غالب پاشا بھی جس نے غالب نامے پر دستخط کیے تھے، آج کل جنگی قیدی ہے اور اس امر کا اقبال کرتا ہے کہ اس نے اس کاغذ پر دستخط کیے تھے جو محمود حسن پارٹی نے اس کے روبرو پیش کیا تھا۔ اس کے ضروری حصوں کا ترجمہ یوں ہے:

ایشیا، یورپ اور افریقہ کے مسلمان ہر قسم کے اسلحہ سے آراستہ ہو کر خدا کی راہ میں جہاد کے لیے اٹھ کھڑے ہوئے ہیں۔ خدائے قادر وقیوم کا شکر ہے کہ ترکی فوج اور مجاہدین دشمنانِ اسلام پر غالب آ گئے ہیں...... اس لیے اے مسلمانو! اس ظالم عیسائی حکومت پر حملہ کر دو۔ جس کی قید میں تم پڑے ہو...... بہت جلد عزم صمیم سے اپنی تمام کوششوں کو دشمن کے مار ڈالنے کے لیے وقف کر دو اور ان سے نفرت و دشمنی ظاہر کر دو۔ تمھیں یہ بھی معلوم ہونا چاہیے کہ مولوی محمود حسن (جو پہلے ہندوستان کے مدرسۂ دیوبند میں تھے) ہمارے پاس تشریف لائے اور ہم سے مشورہ لیا۔ ہم نے اس خیال میں ان کی تائید کی اور انھیں ضروری ہدایات دے دی ہیں۔ اگر وہ تمھارے پاس آئیں تو تم ان پر اعتماد کرو اور آدمیوں، روپے اور ہر چیز سے جو وہ طلب کریں امداد کرو۔"

۱۶۵ء نتیجہ:

اس باب میں جو واقعات لکھے گئے ہیں ان سے صاف ظاہر ہے کہ چند مسلمان مذہبی مجنون

ہندوستان میں بغاوت پھیلانے کے کس قدر خواہش مند تھے اور اپنے مقاصد میں کامیاب ہونے کے لیے انھوں نے برطانیہ کے دشمنوں کے ساتھ اتحاد پیدا کرنے کی کوشش کی۔ جنگ برپا کرنے کے لیے ان کے طریقے یہ ہیں کہ پہلے خفیہ اور پراسرار سازشیں اور تجاویز کی جائیں اور پھر آشکارا طور پر فساد کھڑا کیا جائے، کبھی وہ رنگروٹ بھیجتے ہیں، کبھی چندے جمع کرتے پھرتے ہیں، کبھی وہ خود جاتے ہیں۔ وہ ہمیشہ بغاوت کا وعظ کرتے ہیں۔ ان کی تجاویز سے محفوظ رہنے کے لیے عام مسلمانوں کی وفاداری اور گورنمنٹ کی طاقت کا رعب واثر ہی دو ذریعے ہیں۔" (باغیانہ تحریک کے متعلق رولیٹ کمیٹی کی تحقیقات کی رپورٹ، ص ۵۶۔۲۵۲)

کانگریس کا سالانہ اجلاس:

۲۷ ردسمبر ۱۹۱۷ء: ۲۷ ردسمبر ۱۹۱۷ء کو کلکتہ میں آل انڈیا کانگریس کا بتیسواں سالانہ اجلاس شریمتی اینی بیسنٹ کی صدارت میں منعقد ہوا۔ اجلاس میں کانگریس کے ۴۹۶۷ ڈیلیگیٹ شریک ہوئے اور ہندوستانی فوجیوں کو فوج کے لیے اعلیٰ عہدوں پر فائز کیے جانے کی تجویز پاس ہوئی۔ ایک تجویز یہ بھی تھی کہ مردوں کے ساتھ ساتھ عورتوں کو بھی رائے دہندگی کا حق دیا جائے۔ ساتھ ہی اچھوت عورتوں کو مردوں کے ساتھ نمایندگی کی تجویز پاس ہوئی۔ آندھرا پردیش کو علاحدہ کرکے تسلیم کیے جانے پر کافی بحث ومباحثہ ہوا۔ شریمتی اینی بیسنٹ، مہاتما گاندھی اور مدراس کے نمایندوں کی مخالفت کے باوجود بھاشا (زبان) کے آدھار پر آندھرا کو صوبہ تسلیم کرکے حکومت کے فیصلے کی توثیق کردی گئی۔ (حسرت موہانی......ایک سیاسی ڈائری، ص ۷۶)

میثاقِ لکھنو پر حضرت مفتی اعظم کا تبصرہ

۱۹۱۷ء

فرقہ وارانہ مسئلہ ہندوستان کی آزادی کی راہ میں سب سے بڑی رکاوٹ رہا۔ جمعیت علماے ہند نے ہمیشہ اسے قرار واقعی اہمیت دی اور فرقہ وارانہ سمجھوتے کی ہر کوشش کی خواہ وہ کسی طرف سے ہو، کامیاب بنانے میں سعی کی۔ ہمارے بزرگ جو جمعیت علماے ہند کے قیام کے بعد اس کے رہنما بنے تھے وہ فرقہ وارانہ سمجھوتے اور اقوام لیے مذاہب ہند کے مابین اتحاد کے لیے جمعیت کے قیام سے بہت پہلے سے کوشاں تھے۔ ان کے نزدیک فرقہ وارانہ اتحاد اور اس کے نتیجے میں قائم

ہونے والا امن معاشرہ ملک کی صرف سیاسی ضرورت اور معاشی اقتصادی ترقی اور آزادی وطن کی مستحکم بنیاد ہی نہ تھی بلکہ مسلمانوں کی ایک مذہبی ضرورت بھی تھی۔ ہندوستان میں ایک پرامن معاشرے کے قیام کے بغیر مسلمان مذہبی تعلیم وتبلیغ اور اشاعت اسلام کے اپنے فرائض کو ادا نہیں کر سکتے تھے۔ ہمارے بزرگ کسی اتحاد اور فرقہ وارانہ سمجھوتے کے بارے میں اس کے سیاسی، معاشی، اقتصادی ضروریات سے زیادہ مذہبی اور دینی ضروریات سے جو باتیں سوچتے تھے ان کا تعلق ہمارے بزرگوں کے امتیازات، فکر کی جامعیت اور وسعت نظر سے ہے۔

۱۹۱۶ء میں جب کانگریس اور مسلم لیگ میں ایک فرقہ وارانہ سمجھوتا ہوا جو ''لکھنو پیکٹ'' کے نام سے مشہور ہوا تھا اس وقت اگرچہ جمعیت علماے ہند کے قیام میں تقریباً تین برس باقی تھے لیکن ہمارے بزرگوں نے بعد میں جن کے ہاتھ میں جمعیت کی رہنمائی کی باگ ڈور آئی اس پر اپنے نہایت مثبت ردعمل کا اظہار کیا، وہ اگرچہ سمجھوتے کے مخالف نہ تھے لیکن اس کی بعض دفعات کے دوررس نتائج سے مشوش تھے۔ ہندو مسلم مفاہمت اور اس کی اہمیت پر مولانا احمد سعید دہلوی نے اپنے خطبۂ صدارت جمعیت علماے صوبہ متحدہ منعقدہ میرٹھ (۱۹۳۱ء) میں تبصرہ کیا ہے اور مولانا مفتی محمد کفایت اللہ دہلوی کی ایک نادر تحریر پیش کی ہے۔ یہ ۱۹۱۷ء کی ایک یادگار تاریخی تحریر ہے۔ حضرت مولانا احمد سعید دہلوی فرماتے ہیں:

''ہندوستان میں آج کل ہندو مسلم مسئلے نے خاص صورت اختیار کر رکھی ہے۔ عام طور پر یہ مسئلہ باشندگان ہندوستان کے لیے دلچسپی کا سبب بنا ہوا ہے۔ ۱۹۱۶ء میں مسلم لیگ اور کانگریس کے درمیان ایک سمجھوتا ہوا تھا۔ اس وقت مسلمانوں کی ایک ہی سیاسی جماعت تھی۔ مسلمانوں میں سیاسی بیداری بھی نہ تھی۔ حکومت خود اختیاری کا بہت زیادہ امکان بھی نہ تھا۔ اس لیے اس وقت اس پیکٹ کے متعلق نہ کچھ زیادہ چرچا تھا اور نہ کسی قسم کے جھگڑے تھے۔ لیکن شاید یہ سن کر آپ کو تعجب ہوگا کہ اس وقت باوجودے کہ علماء نے میدان سیاست میں قدم بھی نہ رکھا تھا، نہ جمعیت علماء کا وجود تھا، نہ ان کا کوئی سیاسی پلیٹ فارم تھا۔ مگر جونہی کانگریس اور مسلم لیگ کا سمجھوتا شائع ہوا، فوراً علماء کی تمام جماعت میں سے صرف ایک ہی شخص اٹھا اور اس نے مسلم لیگ کے سمجھوتے میں وہی خامیاں بیان کی تھیں جن کی بناء پر آج تمام ہندوستان کے مسلمان اس سمجھوتے کو ناپسند اور ناقابل قبول سمجھتے ہیں۔ وہ دوربین اور غائر النظر اور ہمدرد اسلام و مسلمین ہستی حضرت مولانا مفتی محمد کفایت اللہ صاحب صدر جمعیت علماے ہند کی ہے۔ حضرت محترم نے اس وقت ایک اعلان

بعنوان ''مسلمانوں کے مذہبی اور قوامی اغراض کی حفاظت'' شائع کیا اور مسلمانوں کو حکومت خود اختیاری کے حصول میں کوشش کرنے کی تاکید کے ساتھ ہی مسلم لیگ کانگریس کے سمجھوتے کی خامیاں بیان کی تھیں۔ مناسب معلوم ہوتا ہے کہ ہم حضرت موصوف کا وہ اعلان تمام دکمال یہاں پر نقل کردیں تاکہ آپ یہ اندازہ کرسکیں کہ جمعیت علمائے ہند کے محترم صدر کے کس وقت سے تحصیل آزادی کے جذبۂ بے پناہ کے ساتھ ہی مسلمانوں کے حقوق کی حفاظت کا خیال پیش نظر ہے۔ وہ اعلان یہ ہے:

مسلمانوں کے مذہبی اور قومی اغراض کی حفاظت

صاحب وزیر ہند کی ہندوستان میں تشریف آوری کی تقریب میں تمام اقوام ہند میں سیاسی تحریک موجزن ہے۔ تمام چھوٹی بڑی قومیں اپنی آئندہ بہبودی کے متعلق غور وفکر کررہی ہیں۔ اس وقت ہر شخص کا فرض ہے کہ جس چیز کو قوم کے لیے مفید سمجھے، بغیر کسی پس وپیش کے ظاہر کردے۔ اس لیے خاکسار اپنے خیالات کو مسلم پبلک کے سامنے پیش کرکے اپنے فرض سے سبکدوش ہوتا ہے:

(۱) کوئی قوم حقیقی ترقی نہیں کرسکتی جب تک کہ اس کے افراد میں اپنے اوپر خود حکومت کرنے کی استعداد نہ پیدا ہوجائے اور حقیقی آزادی اور حقیقی ترقی بغیر حکومت خود اختیاری کے حاصل نہیں ہوسکتی۔

(۲) آزادی کی خواہش انسان کی طبعی اور جبلی خواہش ہے، اس لیے کوئی فرد بشر بجا طور پر حکومت خود اختیاری کی مخالفت نہیں کرسکتا۔

(۳) دنیا کی متمدن اور مہذب قومیں ہمیشہ انسانی آزادی اور ترقی میں ساعی رہتی ہیں۔ برطانی گورنمنٹ کی رعایا کے مختلف طبقے بھی ہمیشہ اس کے آرزومند رہے کہ گورنمنٹ ان کو حکومت خود اختیاری عطا فرمائے اور برطانی گورنمنٹ نے اپنی رعایا کے کئی طبقوں کی یہ آرزو پوری بھی کردی۔

(۴) اس وقت کہ گورنمنٹ نے فراخ دلی سے ہوم رول دینے کا ارادہ ظاہر کیا ہے یا اس کی امید کی جاتی ہے اور صاحب وزیر بہادر اسی کے متعلق ہندستانیوں کے خیالات معلوم کرنے تشریف لارہے ہیں۔ اگر ہندوستان کی قومیں ہوم رول کی خواہش کریں اور آزادی کی نعمت حاصل کرنے کی کوشش کریں تو ان کی یہ خواہش اور کوشش یقیناً حق بجانب ہوگی۔

(۵) ہندوستان کی آبادی مختلف العقائد اور متبائن الخیالات اقوام سے مرکب ہے اور ایک قوم کے مذہبی اغراض دوسری قوم کے مذہبی اغراض سے متصادم ہیں اور اسی بناء پر یہاں ہمیشہ جھگڑے اور فساد ہوتے رہتے ہیں۔ اس لیے ضروری ہے کہ ہوم رول کی خواہش کرنے سے پہلے مذہبی تصادم اور تمام اقوام کے مذہبی اور قومی اغراض کی حفاظت کا پورے طور پر خیال کرلیا جائے۔

یہ باتیں تو ایسی ہیں جن کا تعلق کسی خاص قوم سے نہیں، تمام اقوام اس حد تک متساوی الاقدام ہیں اور جہاں تک میرا خیال ہے، ان وجوہ خمسہ کی معقولیت میں کسی کو بھی کلام نہ ہوگا۔ اس کے بعد خاکسار خاص اسلامی طبقے کے متعلق عرض کرتا ہے۔

مسلم پبلک کا اولین فرض ہے کہ وہ سیاسی ترقی کی رفتار میں مذہبی آزادی کی حفاظت کو سب سے زیادہ اہم اور مقدم سمجھے اور ''پہلے ہم مسلمان ہیں پھر ہندی یا عربی، ایرانی یا چینی وغیرہ'' کے اصول کو لازم سمجھیں۔ کیوں کہ مسلمانوں کی متحدہ قومیت کا سیرازہ صرف مذہب اور اسلام سے ہی بندھا ہوا ہے۔

اس وقت مسلمانوں کی اصولی تقسیم کے لحاظ سے دو گروہ ہیں۔

(۱) ہوم رول کے طالب، (۲) ہوم رول کے مخالف!

دوسرے گروہ میں پھر دو قسم کے لوگ ہیں!

اول وہ لوگ جن کو ہوم رول کے معنی اور مفہوم کی خبر نہیں اور (انھیں کی تعداد زیادہ ہے)۔

دوسرے وہ جو کسی خارجی اثر سے متاثر ہو کر اپنے ذاتی اغراض کی خاطر قومی اغراض اور انسانی فطری خواہش کو پامال کرنا چاہتے ہیں۔

ان دونوں فریق کی متفقہ آواز یہ ہے کہ ہمیں ہوم رول کی ضرورت نہیں۔ ہم گورنمنٹ انگریزی کی حکومت سے خوش ہیں۔ مسلمان ابھی ہوم رول کے لائق نہیں ہوئے۔

لیکن چوں کہ ان کی مخالفت ناواقفیت یا ذاتی غرض پر مبنی ہے، اس لیے وہ کسی درجے میں لائق اعتبار نہیں، اور نہ مسلمانوں کو ان کی آواز پر کان لگانا چاہیے اور نہ ان کی آواز قومی آواز سمجھی جاسکتی ہے۔

ہوم رول کے طالب گروہ میں تمام سمجھ دار، ذی علم، متمدن، مہذب افراد شامل ہیں۔ مگر اس میں بھی دو فریق ہوگئے؟

فریق اول مسلم لیگ کے ارکان اور اس کے حامی،

فریق دوم جدید تعلیم یافتہ طبقے کا ایک معتد بہ حصہ اور تقریباً تمام مذہبی طبقہ اور عامۂ مسلمین کا ایک جم غفیر۔

یہاں پر یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ جب یہ دونوں ہوم رول کے مطالبے میں شریک اور اصل مقصد میں متفق ہیں پھر وجہ اختلاف کیا ہے؟ اس کا جواب یہ ہے کہ فریق اول یعنی مسلم لیگ نے ہوم رول کے مطالبے کا یہ طریقہ اختیار کرلیا ہے:؟

(۱) کانگریس کے ساتھ اتفاق کرلیا اور لیگ اور کانگریس نے متفقہ اسکیم تیار کرلی۔

(۲) اس اسکیم میں مسلمانوں کو جو حق دیا گیا ہے اس کے لحاظ سے کسی صوبے کی کونسل میں دس فیصد، کسی میں پندرہ فیصد، کسی میں بیس فیصد، کسی میں تیس فیصد مسلمان ممبر ہوں گے۔ صرف صوبہ پنجاب میں پچاس فیصد مسلمان ہوں گے۔ یعنی ہندوستان کے کسی صوبے میں ان کو اکثریت حاصل نہ ہوگی۔

(۳) کم تعداد والی قوموں (جن میں سوائے صوبہ پنجاب کے تمام ہندوستان کے مسلمان داخل ہیں) کے قومی اغراض کی حفاظت اس طرح کی گئی کہ ایک قاعدہ مقرر کردیا گیا کہ کوئی ایسا ریزولیوشن جو کسی غیر سرکاری ممبر نے پیش کیا ہو اور کسی قوم کے اغراض پر اس کا اثر پہنچتا ہو، اگر کسی قوم کے نمایندوں کی ۳/۴ تعداد اس ریزولیوشن کی مخالفت کردے تو وہ ریزولیوشن پاس نہ ہوسکے گا۔

اس قرارداد پر لیگ اور کانگریس کے ممبروں نے سمجھوتا کرلیا ہے اور ارکان لیگ کا خیال ہے کہ یہ سمجھوتا مسلمانوں کے لیے مضر نہیں ہے اور اس میں مسلم پبلک کی قومی اغراض کو کوئی صدمہ نہیں پہنچے گا، نیز بعض حامیان لیگ سے یہ بھی سنا گیا کہ گورنمنٹ ہوم رول ضرور دے گی۔ اس کی بنیاد پڑ چکی ہے، تو اگر ہم اس سمجھوتے کے موافق ہوم رول پر آمادہ نہ ہوجاتے تو اندیشہ تھا کہ گورنمنٹ ہوم رول دے دیتی اور پھر برادران وطن ہمیں اتنا حصہ بھی نہ دیتے، جتنا کہ اس سمجھوتے میں انھوں نے منظور کرلیا ہے۔

فریق دوم کے خیالات:

فریق دوم کہتا ہے کہ ہوم رول ضروری اور ہمارا بھی مقصد اہم یہی ہے اور ہم کو ارکان مسلم لیگ کی نیت پر بھی حملہ کرنا مقصود نہیں۔ انھوں نے جو کچھ کیا مسلمانوں کی خیر خواہی کی نیت سے ہی

کیا۔ لیکن ان کے فیصلے کے متعلق ہمیں حسب ذیل شکایتیں ہیں :

(۱) مسلم لیگ نے یہ فیصلہ کرتے وقت عام مسلم رائے حاصل نہیں کی۔ مسلمانوں کی قومی اور مذہبی انجمنوں سے کوئی استصواب نہیں کیا گیا اور اگرچہ ہمیں ان کی نیت پر بدگمانی نہیں تاہم سات آٹھ کروڑ مسلمانان ہند کی قسمت کا فیصلہ کرنے میں وہ معصوم بھی نہیں ہیں اور اپنی اس استبدادی کارروائی کے جواب دہ ہیں۔

(۲) اس سمجھوتے میں مسلمانوں کے قومی اغراض کو صدمہ پہنچنے کا نہ صرف گمان، بلکہ ظن غالب ہے۔ کیوں کہ مسلمانوں کو اس صورت میں کثرت رائے حاصل ہونا ناممکن ہے۔

(۳) یہ قاعدہ کہ غیر سرکاری ممبر کے پیش کیے ہوئے ریزولیوشن کی اگر کسی قوم کے ۳/۴ ممبر مخالفت کردیں تو وہ پاس نہ کیا جائے۔ پرسنل لا کی حفاظت کے لیے چنداں مفید نہیں، کیوں کہ سرکاری غیر مسلم ممبروں کی ان ریزولیوشنوں کو جو مسلمانوں کے اغراض قومی کے مخالف ہوں اس قاعدہ سے کوئی روک نہیں ہوئی۔ وہ برابر کثرت رائے سے پاس ہوتے رہیں گے اور غیر سرکاری ممبر اپنے رزولیوشن کا مقصد سرکاری ممبروں کو سمجھا کر ان کے ذریعے سے پیش کرا سکتے ہیں۔ دوسرے یہ کہ اس قاعدے کا اثر زیادہ سے زیادہ ان تجاویز پر پڑسکتا ہے جو غیر مسلم غیر سرکاری ممبروں کی طرف سے پیش کی جائیں، لیکن مسلمان ممبروں کے واسطے اپنی اغراض کے لیے مفید تجاویز پاس کرنے کا کوئی راستہ نہیں۔ بخلاف غیر مسلم ممبروں کے کہ وہ اپنی اغراض کے لیے مفید تجاویز جس قدر چاہیں کثرت رائے سے پاس کرا سکتے ہیں۔

(۴) پنجاب میں ۵۰ فیصدی مسلم نیابت اس اصول کے موافق بھی صحیح نہیں۔ کیوں کہ پنجاب میں مسلم آبادی کا اوسط اس سے زیادہ ہے۔

(۵) ہندو تعداد مردم شماری میں تمام ان قوموں کو محسوب کرلیا گیا ہے جو ہندو دھرم کے معتقد نہیں، بلکہ اس کے مخالف ہیں۔ اور یہ اصولاً خلاف انصاف ہے۔

(۶) مسلم لیگ اور کانگریس نے جو سمجھوتا کیا ہے، اس کی پختگی کی طرف سے بھی قوم کا کوئی اطمینان نہیں کیا گیا۔

(۷) مسلمانوں کی مذہبی آزادی کے تحفظ کا خیال نہیں رکھا گیا۔

(۸) یہ خیال کہ گورنمنٹ ہوم رول ضرور دیتی اور ہم یہ سمجھوتا نہ کرتے تو اس سے زیادہ نقصان میں رہنے کا اندیشہ تھا، صحیح نہیں! کیوں کہ ہندوستان کو ہوم رول دینے کے نہ یہ معنی ہیں کہ ہندوؤں کو

ہوم رول دے دیا جائے، اور نہ گورنمنٹ کے ہوم رول دینے کے یہ معنی ہو سکتے ہیں کہ وہ مسلم قومیت اور مسلم حقوق کو پامال کر کے ایک قوم کو حکمران بنادیتی۔ اگر مسلمان استقلال اور خودداری اور وقار سے اپنے حقوق کا مطالبہ آئینی طریقے سے کرتے تو کوئی وجہ نہیں کہ گورنمنٹ اسے نظر انداز کردیتی۔

اس کے بعد عرض ہے کہ اگرچہ اب وقت نہیں رہا کہ وزیر ہند کی خدمت میں کوئی ایڈریس یا وفد پیش کرنے کی درخواست کی جائے لیکن جن ایڈریسوں اور وفدوں کی اجازت لی جاچکی ہے ان کے اصحاب و ارکان کو یہ موقع ہے کہ وہ اپنے مجمل ایڈریسوں کی تفصیل میں اس تجویز کے مضمون کو بھی شامل کرلیں جو ذیل میں درج ہے اور اب سے بہت پہلے شائع کی جاچکی ہے۔

مسلمانوں کی شدید ترین مذہبی ضرورت:

اسلامی عقائد کے بموجب بہت سے مقدمات کا فیصلہ کرنے کے لیے قاضی یا حاکم کا مسلمان ہونا شرط ہے۔ مثلاً ایک عورت کا نابالغی کی حالت میں باپ دادا کے سوا کسی اور ولی نے نکاح کردیا۔ نکاح تو صحیح ہوگیا لیکن عورت کو بلوغ کے وقت یہ اختیار ہوتا ہے کہ اس نکاح کو پسند کر کے باقی رکھے یا ناراضی ظاہر کر کے فسخ کردے۔ مگر اسلامی احکام کی رو سے عورت خود نکاح کو فسخ نہیں کرسکتی بلکہ ضروری ہے کہ مسلمان قاضی سے فسخ کرائے۔

اسی طرح کسی عورت کا خاوند چار پانچ سال سے مفقود الخبر ہوگیا ہے اور عورت کے لیے گزارے کی کوئی صورت نہیں یا اس کے جوان ہونے کی وجہ سے اس کی عصمت محل خطر میں ہے۔ ایسی حالت میں ضرورت ہے کہ مسلمان قاضی سے خاوند کی موت کا حکم حاصل کیا جائے اور عورت عدتِ وفات پوری کر کے دوسرا نکاح کرلے۔

اسی طرح عبادات و معاملات بالخصوص نکاح، طلاق، میراث، وقف، شفعہ وغیرہ کے ہزاروں مقدمات ایسے ہوتے ہیں جن میں مسلمان حاکم کے فیصلے اور حکم کی ضرورت ہے۔ غیر مسلم حاکم کا حکم یا فیصلہ شرعی نقطۂ نظر اور اسلامی عقائد کے بموجب کافی نہیں۔

گورنمنٹ انگلشیہ کے شاہی اعلان ۱۸۵۸ء کے بموجب اگرچہ رعایا کو مذہبی آزادی حاصل ہے اور قوانین گورنمنٹ احکام مذہبیہ کے موافق فیصلے کرنے کے مدعی ہیں، لیکن اس کے ساتھ ہی یہ ناقابل انکار حقیقت بھی ہمارے پیش نظر ہے کہ گورنمنٹ کی عدالتوں میں مسلم و غیر مسلم دونوں قسم

کے حاکم مسند آرائے سریر حکومت ہوتے ہیں، بلکہ اعلیٰ عدالتوں میں غیر مسلم عنصر ہی غالب ہے۔ بہت سے شہر اور قصبے ایسے ہیں جہاں ایک بھی منصف یا جج مسلمان نہیں۔

اس لحاظ سے گورنمنٹ کا اعلان مذکور اور موجودہ قوانین ان مقدمات کے متعلق، جن میں حاکم کا مسلمان ہونا شرط ہے بالکل غیر مفید اور ناکافی ہیں اور مسلمانوں کی اس شدید ترین مذہبی ضرورت کے پورے ہونے کی کوئی سبیل نہیں ہے۔

ہندوستان میں بلا مبالغہ ہزاروں عورتیں ایسی ہوں گی جو اپنے خیار بلوغ کو اس وجہ سے استعمال نہیں کر سکتیں کہ مسلمان حاکم میسر نہیں اور اگر ناواقفیت کی وجہ سے غیر مسلم سے فسخ نکاح کا حکم حاصل کر کے دوسرا نکاح کر لیتی ہیں تو وہ اسلامی عقائد کے بموجب گناہ گار اور مرتکب حرام ہوتی ہیں۔

ہزاروں عورتیں جن کے خاوند مفقود ہیں مسلم عدالت نہ ہونے کے باعث عذاب میں مبتلا ہیں۔ زندگی بیکار ہے، رات دن مصیبت جھیلتی ہیں اور اسی طرح بہت سے دینی اور قومی اغراض اسلامی عدالت نہ ہونے کی وجہ سے ملیا میٹ ہو رہے ہیں۔

مجوزہ درخواست یہ ہے: گورنمنٹ مسلمانوں کے خالص مذہبی معاملات اور ان مقدمات کے فیصلے کے لیے جن میں مسلمان قاضی شرط ہے، ہر ضلع میں ایک شرعی عدالت قائم کر دے اور اس میں ایک مسلمان قاضی (جو علوم شرعیہ کا عالم اور متدین ہو) مقرر کر دے اور اس کو ان مقدمات کے متعلق ڈسٹرکٹ جج کے برابر اختیار عطا کیے جاویں اور ہر صوبے میں ان ماتحت عدالتوں کے احکام کے خلاف اپیل کرنے کے لیے ایک بڑی عدالت قائم کی جائے۔

یہ درخواست کا مجمل خاکہ ہے۔ اس کی اجمالی عام منظوری کے بعد ان احکام کی تعیین جو ان شرعی عدالتوں میں طے ہونے ضروری یا مناسب ہیں، علمائے ہندوستان کی ایک منتخبہ جماعت کر دے گی اور اس کے دیگر مراحل پر بھی مفصل بحث کی جا سکے گی۔

کتبہ محمد کفایت اللہ غفرلہ، مدرس اول مدرسۂ امینیہ۔ دہلی۔ ۱۹۱۷ء

دولت مشترکۂ اقوام:

۱۹۱۷ء دولت مشترکہ سابق سلطنت برطانیہ سے تعلق رکھنے والی مملکتوں کی ایک رضاکارانہ انجمن ہے۔ اس میں شریک ملکوں کو تین زمروں میں تقسیم کیا جا سکتا ہے۔ برطانیہ اور وہ ملک جنھوں نے آزاد ہونے کے باوجود برطانیہ کی ڈومینین میں رہنے کا فیصلہ کیا ہے۔ جس کے معنی یہ ہیں کہ وہ

ملک ملکۂ برطانیہ کو اپنا دستوری سربراہ تسلیم کرتے ہیں۔ (سلطنت متحدہ برطانیہ اور شمالی آئرلینڈ، کینیڈا، آسٹریلیا، نیوزی لینڈ، جمیکا، ٹرینی ڈاڈ اور ٹوباگو، مالٹا، بارے ڈوس، ماریشس، فیجی اور برطانیہ کے تمام مقبوضہ علاقے)۔

دوسرے زمرے میں وہ ملک ہیں جو آزادی کے بعد ریپبلک (جمہوریہ) ہوگئے، (مثلاً ہندوستان، غانا، قبرص، تنزانیہ، نائیجیریا، یوگنڈا، زمبیا، کینیا، سنگاپور، ملاوہ، بوٹسوانا، بورو، گیانا، گیمبیا، سیرالیون، بنگلہ دیش اور سری لنکا) یہاں سربراہ مملکت بالواسطہ انتخاب کے ذریعے چنا جاتا ہے۔

تیسرے زمرے میں وہ آزاد ممالک ہیں، جہاں سربراہ مملکت دستوری بادشاہ یا عملاً حکومت کرنے والا بادشاہ ہے۔ (مثلاً ملائیشیا، لیسوتھو، سوازی لینڈ، ٹونگا اور مغربی ساموٴ) پاکستان ۳۰ رجنوری ۱۹۷۲ء کو برطانیہ کے بنگلہ دیش کو تسلیم کرنے پر احتجاج کرتے ہوئے دولت مشترکہ سے علاحدہ ہوگیا۔ بنگلہ دیش ۱۸ر اپریل ۱۹۷۲ء کو شامل ہوا۔

دولت مشترکہ کا مقصد ایک ایسا پلیٹ فارم مہیا کرنا ہے، جہاں متعلقہ ممالک مشترکہ مفادات، بین الاقوامی مفاہمت اور عالمی امن کو فروغ دینے میں تعاون اور صلاح و مشورہ کرسکیں۔ ۱۹۸۱ء میں اس کے ۴۴ رکن تھے۔

دولت مشترکہ کا تصور پہلی عالمی جنگ کے دوران رونما ہوا۔ ۱۹۱۷ء کی شاہی جنگی کانفرنس میں برطانیہ کی ڈومینیوں (کینیڈا، آسٹریلیا، نیوزی لینڈ) کو برطانوی دولت مشترکہ کے اندر خودمختاری دے دی گئی۔ ۱۹۲۶ء کی دوسری شاہی کانفرنس میں دولت مشترکہ کے اس رشتہ کو بالفور اعلانیہ کے ذریعہ متعین شکل دی گئی۔ ۱۹۳۱ء کے ''اسٹے ٹیوٹ آف ویسٹ منسٹر'' کے ذریعے قانونی شکل دی گئی اس کی رو سے برطانیہ کی ڈومینین دولت مشترکہ کے اندر مکمل طور پر آزاد اور خودمختار ہیں، تاج برطانیہ کی وفادار ہیں اور اپنی آزادانہ مرضی سے دولت مشترکہ میں شریک ہیں۔ ہندوستان اور پاکستان کی آزادی کے بعد دولت مشترکہ کا رکن ہونے کے لیے تاج برطانیہ سے وفاداری کی شرط ختم کردی گئی اور ملکہ اب محض دولت مشترکہ کی سربراہ ہے۔ (دیکھیے: ''ڈومینین کا درجہ''، ''سلطنت متحدہ''، ''شاہی ترجیحات'') (فرہنگ سیاسیات: ص ۲۱۹)

بولشویک انقلاب (۱۹۱۷ء):

روس میں بولشویک انقلاب نومبر ۱۹۱۷ء میں رونما ہوا جب کہ بولشویکوں نے لینن کی قیادت

میں اقتدار پر قبضہ کیا۔ بولشویک انقلاب سے پہلے روس میں ۱۹۰۵ء میں سیاسی انقلاب لانے کی ناکام کوشش کی گئی تھی۔ اس اولین انقلابی جدوجہد میں روسیوں نے مکمل ہڑتالوں کے ذریعے زار کی مطلق العنان حکومت کو شہریوں کے سیاسی حقوق کی بحالی اور روس کی پہلی پارلیمنٹ ''دوما'' کے قیام کا وعدہ کرنے پر مجبور کر دیا تھا۔ لیکن بحران کے ختم ہو جانے سے زار کی حکومت اپنے بیشتر وعدوں سے منحرف ہو گئی۔ ۱۹۱۷ء کے شروع میں جرمنی کے ہاتھوں روس کی شکست اور اندرونی خلفشار کے نتیجے میں دارالحکومت سینٹ پیٹرز برگ میں اور دوسری جگہوں پر مزدوروں اور سپاہیوں نے بغاوتیں کر کے زار نکولاس ثانی کو تخت سے دستبردار ہونے پر مجبور کر دیا۔ اس کے بعد اقتدار ''دوما'' کی مقرر کی ہوئی ایک عبوری حکومت جس کا سربراہ پرنس لوو ف تھا اور پیٹرس برگ میں مزدوروں کے نمائندوں کی سویت (مجلس) کے درمیان تقسیم ہو گیا۔ اس طرح کی سوویتیں ماسکو اور دوسرے شہروں میں بھی وجود میں آگئی تھیں۔ جولائی میں لووف کی حکومت کی جگہ کرنسکی کی قیادت میں ایک مخلوط حکومت قائم ہوئی۔ جس کی بولشویکوں نے مخالفت کی۔ لینن نے جو اپریل میں جلاوطنی سے واپس آیا، اس عبوری حکومت کا تختہ پلٹنے اور اقتدار پر قبضہ کرنے کی مہم چلائی۔ چناں چہ نومبر میں دستور ساز اسمبلی کے انعقاد سے کچھ پہلے بولشویکوں نے کرنسکی حکومت کا تختہ پلٹ دیا اور اپنا اقتدار قائم کیا۔ (فرہنگ سیاسیات: ص ۱۱۰-۱۱)

۱۹۱۸ء

چودہ نکات:

۸ر جنوری ۱۹۱۸ء: کو صدر ووڈرو ولسن نے ولایات متحدہ کی کانگریس کے مشترکہ اجلاس کے سامنے اپنے خطاب میں جو چودہ سرخیوں میں تقسیم تھا پہلی جنگ عظیم کے بعد عالمی تصفیہ کے متعلق اپنے خیالات کا اظہار کیا۔ ولسن کے چودہ نکات یہ تھے:

(۱) امن کے اعلانیہ معاہدے، جن کو کھلی بات چیت کے ذریعے طے کیا جائے، اور جن کے بعد کسی قسم کی کوئی خفیہ بین الاقوامی مفاہمت نہیں ہوگی۔

(۲) علاقائی سمندروں کے ماوراز مانۂ امن اور زمانہ جنگ دونوں میں سمندروں میں جہاز رانی کی مطلق آزادی، لیکن کسی مخصوص سمندری علاقہ کو کلیتاً یا جزواً بین الاقوامی معاہدوں پر عمل کرانے کے لیے بین الاقوامی کارروائی کے ذریعے بند کیا جا سکتا ہے۔

(۳) جہاں تک ممکن ہو سکے تمام اقتصادی رکاوٹیں دور کی جائیں اور امن پر متفق قوموں کے درمیان تجارتی شرائط کی یکسانیت قائم کی جائے اور اس کے قیام کے لیے وہ سب اشتراک عمل کریں۔

(۴) اس بابت معقول ضمانتوں کا تبادلہ کہ قومی اسلحہ کی مقدار کو گھٹا کر اتنی کم سے کم حد تک پہنچایا جائے جو صرف داخلی تحفظ کے لیے ضروری ہو۔

(۵) تمام نوآبادیاتی مطالبات کا آزادی، وسیع الخیالی اور غیر جانبداری سے تصفیہ۔ لیکن کسی علاقے پر سیادت سے متعلق سوالات کو طے کرنے کے دوران متعلقہ آبادیوں کے مفادات کو اس حکومت کے سارے مطالبات پر برابر وزن دیا جائے جو اس علاقے پر حکمران ہونے کی دعوے دار ہے۔

(۶) روس کے تمام علاقوں سے بیرونی فوجوں کی واپسی اور روس سے متعلق تمام معاملات کا ایسا تصفیہ کہ جس سے وہ دوسری قوموں سے آزادانہ تعاون کر سکے، بے روک ٹوک اپنی مرضی کے مطابق سیاسی ادارے قائم کر سکے اور آزاد قومی پالیسی وضع کر سکے، روس کو بین الاقوامی برادری میں خوش آمدید کہا جائے اور اس کی ضروریات کے مطابق اسے ہر طرح کی امداد فراہم کی جائے۔

(۷) بلجیم سے بیرونی فوجوں کی واپسی اور اس کے قومی اقتدار کی بحالی۔

(۸) تمام فرانسیسی علاقوں کی فرانس کو واپسی اور ۱۸۷۱ء میں پروشیا کی طرف سے السیس لورین کے معاملے میں فرانس کے ساتھ کی گئی زیادتی کا ازالہ۔

(۹) قومیت کی بنیاد پر اطالیہ کی سرحدوں کا از سرنو تعین۔

(۱۰) آسٹریا، ہنگری کے عوام کو خود مختارانہ ترقی کے تمام مواقع کی فراہمی۔

(۱۱) رومانیہ، سربیا، مانٹی نیگرو کا تخلیہ اور مقبوضہ علاقوں کی بحالی۔

(۱۲) سلطنت عثمانیہ کے ترک علاقوں کے قومی اقتدار کا تحفظ۔ لیکن دوسری قومیتوں کو جان و مال اور خود مختارانہ ترقی کی ضمانت۔ بین الاقوامی ضمانتوں کے تحت درۂ دانیال سب کے لیے کھلی آبی گزرگاہ قرار دیا جائے۔

(۱۳) پولینڈ کے ایک آزاد ملک کی حیثیت سے بحالی۔

(۱۴) چھوٹے بڑے سبھی ملکوں کی سیاسی آزادی اور علاقائی سالمیت کو برقرار رکھنے کے مقصد سے آپس میں ایک دوسرے کو ضمانت دینے کے لیے ٹھوس معاہدوں پر مبنی ایک بین الاقوامی تنظیم کا قیام۔

۱۹۱۸ء کے دوران صدر ولسن نے ان خیالات کو اپنے متعدد طریقوں میں مختلف شکلوں سے ظاہر کیا۔ انھیں ''چار اصولوں''، ''چار مقاصد'' اور ''پانچ مخصوص نکات'' کے لفظوں سے جانا جاتا ہے۔ لیکن جب جرمنی کو جنگ میں مکمل شکست ہوگئی تو اس کے بعد ان نکات کے بارے میں مزید کچھ نہ سنا گیا۔ (دیکھیے ''جمعیت اقوام''، ''خود اختیاری''، ''انتدابات'')

(فرہنگ سیاسیات، ص ۹۴۔۱۹۳)

مسٹر برن کی مالٹا میں آمد:

جنوری فروری ۱۹۱۸ء: اواخر جنوری یا ابتدا فروری ۱۹۱۸ء میں ایک روز ہم سب (اسیران مالٹا) صبح کو آفس میں بلائے گئے۔ ہم کو کوئی خبر پہلے سے نہ تھی۔ ہم دفتر میں ایک طرف کرسیوں پر بٹھا دیے گئے کچھ عرصے کے بعد کماندار اور اس کے ساتھ ایک بڈھا انگریز دونوں آئے اور مولانا اور ہم سبھوں سے ہاتھ ملا کر بیٹھ گئے۔ اس بڈھے نے اردو میں باتیں کرنی اور مزاج پرسی وغیرہ شروع کردی۔ مولوی عزیز گل صاحب نے خیال کیا کہ یہ سنسر ہے، اس دفتر میں ملازم ہو کر آیا ہے۔ اس نے جب خطوط اور پارسلوں وغیرہ کی نسبت سوال کیا تو انھوں نے نہایت بے رخی سے

کہا کہ آپ ہم سے کیا پوچھتے ہیں، اپنے دفتر میں دیکھ لیجیے اور اسی طرح اور بھی کچھ اکھڑی اکھڑی باتیں کیں۔ اس نے کہا کہ آپ عزیز گل ہیں۔ ان کو اس واقفیت پر تعجب بھی ہوا اور پھر غالباً ان کے مسکن شہر وغیرہ کا بھی ذکر کیا۔ اس وقت ان کا تعجب کچھ زیادہ ہوا اس نے اپنا ہندوستان سے آنا اور انگلستان کا قصد کرنا بیان کیا اور تھوڑی دیر باتیں کر کے رخصت کر دیا، مگر حکیم نصرت حسین صاحب مرحوم کو روک لیا اور دوسرے کمرے میں لے جا کر ان سے بہت دیر تک باتیں کرتا رہا اور کچھ بیان قلم بند کیا۔ اس کا بہنوئی ضلع فتح پور ہسوہ میں کلکٹر تھا۔ اس لیے حکیم صاحب موصوف اس کے بہنوئی سے بوجہ زمینداری واقفیت بھی رکھتے تھے۔ اس کو بھی تقریب کا موقع اس وجہ سے ملا۔ اس نے انھی باتوں کے متعلق پوچھا جن کا ذکر مصر کے اظہار میں آیا تھا، مگر اختصار کے ساتھ۔ البتہ حکیم صاحب سے ان کے ضلع اور زمینداری اور ہندوستان کے احوال کے متعلق بہت کچھ باتیں کیں اور اپنے عہدوں کے متعلق بیان کیا اور یہ کہ وہ بالفعل گورنر یوپی سر مسٹن کا سیکریٹری ہے۔ کچھ عرصے کی رخصت لے کر انگلستان کو جا رہا ہے، جب حکیم صاحب وہاں سے واپس ہوئے، تب حقیقت کی اطلاع ہوئی۔ شام کو دو بجے کے بعد مولانا مرحوم کو بلایا گیا اور انھی معمولی باتوں کی نسبت پوچھا، جن کا ذکر مصر میں مولانا سے ہو چکا تھا۔ مولانا نے اسی قسم کے جواب دیے، البتہ نئی بات اس نے ہندوستان کی نسبت دریافت کی۔ اس نے کہا کہ ہندوستان دارالحرب ہے یا دارالاسلام۔ مولانا رحمتہ اللہ علیہ نے فرمایا کہ علماء نے اس میں آپس میں اختلاف کیا ہے۔ اس نے کہا کہ آپ کی کیا رائے ہے؟ مولانا نے فرمایا کہ میرے نزدیک دونوں صحیح کہتے ہیں۔ اس نے تعجب سے کہا کہ یہ کیوں کر ہو سکتا ہے؟ مولانا نے فرمایا کہ دارالحرب دو معنوں میں استعمال کیا جاتا ہے اور حقیقت میں یہ دونوں اس کے درجات ہیں، جن کے احکام جدا جدا ہیں۔ ایک معنی کی حیثیت سے اس کو دارالحرب کہہ سکتے ہیں اور دوسرے کے اعتبار سے نہیں کہہ سکتے۔ اس نے تفصیل پوچھی۔ مولانا نے فرمایا کہ دارالحرب اس ملک کو کہتے ہیں جن میں کافروں کی حکومت ہو اور وہ اس قدر با اقتدار ہوں کہ جو حکم چاہیں جاری کریں۔ اس نے کہا یہ بات تو ہندوستان میں موجود ہے، تو مولانا نے فرمایا کہ ہاں اس لیے ہندوستان ضرور دارالحرب ہے۔ اس نے کہا کہ دوسرے معنی کیا ہیں؟ مولانا نے فرمایا کہ جس ملک میں اعلانیہ طور پر شعائر اسلام اور احکام اسلامیہ کے ادا کرنے کی ممانعت کی جاتی ہو، یہ وہ دارالحرب ہے کہ جہاں سے ہجرت واجب ہو جاتی ہے (اگر استطاعتِ اصلاح نہ ہو) اس نے کہا کہ یہ بات تو ہندوستان میں نہیں۔ مولانا نے فرمایا کہ ہاں جس نے دارالحرب

کہنے سے احتراز کیا۔ غالباً اس نے اسی کا خیال کیا ہے۔ وہ چپکا ہوگا اور لکھ لیا۔

اسی طرح روزانہ صبح وشام اور دوسروں کے بیانات لیے۔ میں (کاتب الحروف) نے حسب عادت اس بیان میں بھی زمین آسمان کے قلابے ملائے اور پھر مالٹا کی غذاؤں اور سامان رسد اور آب وہوا اور موسم اور کپڑوں کی نسبت تو بہت ہی شکایتیں کیں اور پھر یہ بھی کہا کہ ہم کو تقریباً ڈیڑھ ہزار یا سوا ہزار روپیہ فقط اپنی جیب سے خرچ کرنا پڑا ہے، ہمارا نقد بالکل ختم ہونے پر آ گیا ہے، ہر چند ہم کفایت شعاری کرتے ہیں مگر اخراجات کی کثرت اور عدم موافقت غذا وغیرہ سے ہم کو یہاں سخت تکلیف ہے اور نہایت افسوس ظاہر کیا کہ گورنمنٹ نے ہمارے ساتھ یہاں بھیج کر اس قدر تو وظالمانہ سلوک کر ہی رکھا ہے اور پھر بھی ہماری ضروریات اور صحت طبعی کی طرف ادنیٰ توجہ کی بھی خبر گیری نہیں کرتی۔ ہمارے ساتھ مصری قیدی ہیں گورنمنٹ مصران کے اہل وعیال کے لیے دس دس بارہ بارہ پونڈ اور بعضوں کے لیے اس سے زیادہ ماہوار خرچ دیتی ہے۔ ان میں سے بہتوں کے لیے یہاں پر بھی خرچ آتا ہے۔ میرے بھائی ترکی کے یہاں اڈریانوپل میں نظر بند ہیں مگر ان کو چھ چھ پونڈ ماہوار ترکی حکومت دے رہی ہے۔ ان کو قلعہ میں رکھ رکھا ہے، دن بھر تمام شہر اور ملحقات شہر میں پھرنے کی اجازت ہے، فقط شہر سے دوسری جگہ سفر کرنے کی اجازت نہیں، اہل وعیال کی بھی اجازت ہے اور جب سے اہل وعیال ان کے پاس آ گئے ہیں، تب سے ہر ایک عورت اور بچے کی بھی اسی حساب سے تنخواہ مقرر ہوگئی ہے۔ اس نے اس کی تصدیق سے انکار کیا۔ میں بھائی صاحب کے خط کو (جو کہ اڈریانوپل سے کچھ ہی عرصے پہلے آیا تھا) لے گیا تھا، اس کو جیب سے نکال کر دکھلانا چاہا اور کہا کہ دیکھیے اس خط میں عربی میں یہ صاف لکھا ہوا ہے۔ اس نے عربی جاننے سے انکار کیا اور کہنے لگا کہ انھوں نے اپنے آفیسر کے اثر سے یہ لکھ دیا ہوگا۔ حقیقت یہ ہے کہ بقول شاعر اذا ساء فعل المرء ساءت ظنونہ (جب آدمی کے اعمال بد ہوتے ہیں تو اس کے خیالات دوسروں کے ساتھ بھی ویسے ہی برے ہوتے ہیں) برٹش گورنمنٹ اپنے ہی جیسا سبھوں کو سمجھتی ہے۔ کہنے لگا کہ وہ تو کھانے کو نہیں دے سکتے۔ ہمارے اسیروں کے ساتھ ایسا اور ایسا برتاؤ انھوں نے کر رکھا ہے اور اس قدر آدمی وہاں مر گئے ہیں۔ میں نے کہا کہ یہ خبر غیر واقعی آپ کو پہنچی ہے۔ یہاں پر خطوط وہاں سے لوگوں کے آ رہے ہیں۔ ٹائمز میں لندن سے انگریزی اسراء کے احوال خطوط وغیرہ سے چھپ کر آ چکے ہیں۔ وہ نہایت شکریے کے الفاظ لکھتے ہیں۔ وہاں پر سیاسی اسراء تو درکنار جنگی اسراء بھی کانٹے دار تاروں میں قید کر کے نہیں رکھے گئے۔

میں نے مسٹر برن سے ہندوستان کے سیاسی اسراء کا حال بھی ذکر کیا کہ ہم کو معلوم ہوا ہے کہ گورنمنٹ ان کی دو دو سو اور تین تین سو ماہوار سے خبر گیری کرتی ہے۔ اس نے اقرار کیا مگر بڑی مقداروں کا انکار کیا۔ اس نے مولانا مرحوم سے یہ بھی کہا تھا کہ آپ اپنے اہل وعیال کی طرف سے فکر نہ فرمائیں۔ حکیم عبدالرزاق صاحب ان کو پچاس روپے ماہوار دیتے ہیں۔ ہمارے بیانات اس نے لکھے اور کہا کہ میں ان کاغذات کو پارلیمنٹ میں پیش کروں گا۔ میں کچھ صورت آپ لوگوں کے لیے نہیں کرسکتا۔ مولوی عزیر گل صاحب کا بھی بیان لیا اور ان سے سرحدی اخبار وغیرہ پوچھیں، مگر انھوں نے حسب عادت سختی ہی سے جواب دیا۔ اس نے جہاد کی نسبت بھی ان سے پوچھا۔ انھوں نے جواب دیا کہ: آپ مجھ کو مسلمان سمجھتے ہیں یا نہیں۔ اس نے کہا کہ ''ہاں۔'' کہا کہ ''پھر آپ کا کیا خیال ہے کہ کوئی شخص بغیر قرآن کی تصدیق کیے ہوئے اور اس کے تمام حصوں کو مانے ہوئے مسلمان ہوسکتا ہے؟'' اس نے کہا: ''نہیں۔'' انھوں نے کہا کہ ''پھر اس کے کیا معنی کہ آپ مجھ سے ایسی بات پوچھ رہے ہیں جس کو آپ خود جانتے ہیں کہ قرآن میں مذکور ہے۔'' اسی طرح کی بہت سے باتیں ہوئیں۔

حکیم نصرت حسین کی استقامت:

سبھوں کے بیانات لکھنے کے بعد اس نے حکیم نصرت حسین صاحب مرحوم کو بلایا اور ادھر ادھر کی باتوں کے بعد کہا کہ میں تم پر کوئی الزام نہیں پاتا اور تم کو چھوڑ سکتا ہوں۔ ہندوستان آپ ابھی جاسکتے ہیں۔ اسی کے قریب ان سے بہاؤالدین انسپکٹر سی آئی ڈی نے جدہ میں بھی کہا تھا، مگر انھوں نے اس وقت بھی اکیلے چھوٹ جانے کی مخالفت کی تھی اور اب بھی کی۔ یہ کہا کہ آپ کو سبھوں کو چھوڑنا چاہیے۔ اس نے جواب دیا کہ یہ میرے اختیار میں نہیں مگر تمھارا امر میرے اختیار مین ہے، انھوں نے کہا کہ میں مولانا کو چھوڑ کر اگر ہندوستان چلا گیا تو تمام ہندوستان والے مجھ کو کھا جائیں گے اور کہیں گے کہ مولانا کو پھنسوا کر اکیلے چلے آئے ہیں، اکیلا ہرگز نہیں جانا چاہتا۔ وہاں سے لوٹ کر جب آئے اور واقعہ بیان کیا تو مولانا نے اور ہم سبھوں نے بہت ان کو سمجھایا اور زور دیا کہ آپ ہندوستان اکیلے جانے پر راضی ہوجایئے اور چلے جایئے مگر انھوں نے ایک بھی نہ مانی۔ مولانا مرحوم نے یہ بھی فرمایا کہ آپ وہاں جاکر ہماری خلاصی کی کوشش کرسکتے ہیں، مگر یہاں تو ہماری طرح ہاتھ پیر بندھے ہوئے پڑے ہیں، مگر ان کی سمجھ میں یہ بھی نہ آیا اور پھر تیسری مرتبہ

جب وہ سخت بیمار ہوئے، تب بھی مولانا مرحوم نے ان کو کہا اور زور دیا کہ تم اپنی تبدیلی آب وہوا کی درخواست دے دو۔ انھوں نے جواب دیا کہ موت اور حیات خدا کے ہاتھ میں ہے۔ میں آپ سے جدا نہیں ہوسکتا۔ خداوند کریم ان کی مغفرت فرمائے۔ نہایت مستقیم اور ایمان دار شخص تھے۔

رسد کے بجائے نقد کا اجرا:

مسٹر برن نے کوشش کی کہ ان لوگوں کو روزانہ ڈیڑھ شلنگ اور مولانا مرحوم کو تین شلنگ دیا جایا کرے اور علاوہ اس کے روٹی، کوئلہ، شمع، صابن، حسب عادت سابقہ ملنے کا حکم جاری کر دیا اور یہ کہا کہ ماہوار ان سے قبض الوصول پر دستخط کرا کر ہندوستان بھیج دیا کرو وہاں سے آتا رہے گا، کپڑوں کے واسطے بھی اس نے کوشش کی، جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ کچھ دنوں کے بعد ہمارے پاس کچھ نمونے کپڑوں کے بھیجے گئے کہ جن کپڑوں کو تم چاہو پسند کرلو مگر چوں کہ وہ بہت ہی گھٹیا تھے، مولوی عزیر گل صاحب نے ان کو واپس کر دیا۔ اس کے کچھ عرصے کے بعد اول سے کچھ بڑھیا نمونے آئے۔ تو ان میں سے ایک نمونہ پسند کیا اور اس سے ہر ایک کے لیے ایک ایک پائجامہ اور ایک صدری ایک اچکن یا لانبا کوٹ بنوایا گیا، مگر آخر میں مولانا مرحوم کے لیے کپڑا کافی نہ ہوا کیوں کہ درزی نے جو تخمینہ کر کے بتایا تھا وہ قطع کرنے کے بعد ناکافی معلوم ہوا۔ جب آفس سے طلب کیا گیا تو آفس نے امروز وفردا میں بالکل ٹال دیا۔ اس کے بعد آخر دم تک پھر نہ گرمیوں کا نہ جاڑوں کا کپڑا بنوایا گیا۔ البتہ جو کپڑے معمولی ملتے تھے ان میں سے تولیہ، پیروں کے بنیائن، کرتا، رومال، سلیپر ہم لیتے رہے مگر کوٹ، پتلون وغیرہ مثل سابق ہم رد کرتے رہے۔ مسٹر برن نے سردی کی شکایت کی بناء پر جاڑوں کے لیے کوئلہ کی زیادہ مقدار مقرر کرادی۔ جس سے ہم اپنے کمرہ کو روزانہ گرم کرسکتے تھے۔ اخیر میں وہ ہماری قیام گاہ کو دیکھنے کے لیے خود آیا اور کمرہ کو اندر باہر سے دیکھا اور مولانا سے نہایت ادب اور تپاک سے پیش آکر مصافحہ کیا۔ اس وقت مولانا ترجمۂ قرآن لکھ رہے تھے، اس کو دیکھا۔ پھر میز پر جتنی کتابیں رکھی ہوئی تھیں، ان کو دیکھا، ان کے نام پوچھتا رہا، ان کے فنون سے واقفیت حاصل کی۔ اس کے بعد کہا کہ میں اب انگلستان چلا جاؤں گا۔ میں نے آپ سب لوگوں کے لیے ایسا اور ایسا انتظام کرادیا ہے اور پھر مصافحہ کر کے چلا گیا۔ فارسی اچھی جانتا تھا، کانوں میں اس کے ثقل تھا۔ باتیں نلکی لگا کر یا زور سے سنتا تھا۔ اگلے روز کماندار نے مولانا مرحوم کو مع رفقاء کے بلایا اور کہا کہ مسٹر برن نے آپ کے حق میں خاص طور سے ہم کو فہمائشیں کی ہیں اس لیے ہم آپ کو اطلاع دیتے ہیں کہ آپ کے لیے اب سے نقد مقرر ہوگا اور آپ کی خاص خاص رعایتیں کی جائیں گی۔ جب کبھی کوئی ضرورت ہو آپ ہم کو اطلاع دیتے رہیں۔

۳۰رفروری ۱۹۱۸ء: اس وقت سے ہماری رسد بالکل بند ہوگئی اور تقریباً پندرہ سولہ دن کے بعد ۲۰رفروری ۱۹۱۸ء روز چہار شنبہ سے نقد ملنے لگا۔ اس روز سے ہم کو اپنے مصاریف میں آسانی ہوگئی۔ یہ مقدار اگر چہ باعتبار مالٹا کی گرانی کے کوئی حیثیت نہیں رکھتی تھی، مگر پہلی سختیوں کے حساب سے بہت ہی غنیمت معلوم ہوئی۔ اس وقت ہمارے پاس تقریباً ستائیس پونڈ باقی تھے۔ مولانا مرحوم نے حکم فرمایا کہ ہم نہیں چاہتے کہ مقدار معینہ ماہانہ سے کچھ بچے اس کو صرف کرو اور بہ نسبت پہلے کے توسع برتو۔ تمھاری حسن انتظامی میں اس میں نہیں سمجھتا کہ اس مَیں سے بچاؤ۔ ہاں یہ ضرور حسن انتظام میں شمار کروں گا کہ اصلی سرمایہ یعنی ۲۷ پونڈ تم محفوظ رکھو کہ آئندہ کسی ضرورت کے وقت کام آئے۔ اس پر توسع کے متعلق رفقاء نے اس قدر پیر پھیلانا چاہا کہ اس مقدار میں بھی پورا پڑنا مشکل ہوگیا۔ ادھر اس کی خبر ہندوستان لکھی گئی مگر اسی کے ساتھ غالباً وحید نے یا میں نے لکھ دیا کہ اگر چہ یہ مقدار بہت ہی زیادہ مشکلات سے رہائی کا سبب بن گئی ہے مگر مالٹا کی گرانی سخت درسخت ہے۔ ایک انڈا ان دنوں ۴ آنے کا اور ایک مرغی چھ روپے کو اور اسی طرح دیگر اشیاء ہیں۔ اس کی بناء پر حضرت مولانا رحمتہ اللہ علیہ کی اہلیہ مرحومہ نے غالباً گورنر یوپی کے پاس عرضی بھیجی کہ جو مقدار مولانا کے لیے مقرر کی گئی ہے وہ مالٹا کی گرانی کی وجہ سے کافی نہیں، اس لیے یا تو تم خود ان کے لیے کافی مقدار پہنچاؤ یا ہم کو اجازت دو اور انتظام کردو۔ ہم یہاں سے نقد روانہ کردیں۔ وہاں سے جواب آیا کہ تم فکر مت کرو۔ ہم خود انتظام کریں گے۔ وہاں سے حکم مالٹا میں زیادتی کی نسبت دریافت کیا۔ ہم نے جواب دیا کہ آپ کو معلوم ہے کہ انسان کا مدار زندگی گوشت پر ہے۔ جس کو جملہ اہل یورپ تسلیم کرتے ہیں؟ ہم یہاں کی گرانی کی وجہ سے بہت کفایت کرتے ہیں، ہفتہ میں فقط تین دن گوشت کھا سکتے ہیں، گھی یہاں ملتا ہی نہیں۔ بجائے اس کے زیتون کا تیل استعمال کیا جاتا ہے۔ اس کی بھی ایک بوتل چھ شلنگ میں آتی ہے جو بمشکل تمام ہم کو دو دن کافی ہوتی ہے اور بعض کھانوں میں تو ایک بوتل ایک دن میں خرچ ہوجاتی ہے۔ شکر گیارہ آنے ہے۔ اسی طرح جملہ اشیاء کی حالت ہے۔ اس نے اس وقت سے فی کس دو شلنگ یومیہ اور مولانا کے لیے چار شلنگ یومیہ کردیے۔ (واضح ہو کہ شلنگ بارہ آنے کا ہوتا ہے)

مسٹر برن کے لائے ہوئے خطوط:

مسٹر برن کے جانے کے تقریباً ایک ماہ یا کچھ زیادہ دنوں کے بعد لندن ہوتے ہوئے بہت

سے خطوط آئے۔ جن میں حضرت مولانا عبدالرحیم صاحب مرحوم، مولانا خلیل احمد صاحب، مولانا حبیب الرحمٰن صاحب، مولانا حافظ محمد احمد صاحب، مولانا حکیم محمد حسین صاحب اور دیگر اعزہ اور احباب کے خطوط تھے۔ سب نے بتاکید لکھا تھا کہ مسٹر برن چیف سیکریٹری مسٹن گورنر یوپی جاتے ہیں۔ ہم آپ سے خواہشمند ہیں کہ آپ ان کی پیش کردہ شروط کو قبول فرما کر بہت جلد ہندوستان تشریف لائیں۔ ہرگز ان کے مطالیب کو رد نہ فرمائیں۔ ہماری استدعا پر گورنمنٹ نے یہ صورت قبول کی ہے کہ اس قسم کی باتیں اور یہی مضمون سب میں تھا۔ اس وقت حقیقت مسٹر موصوف کے آنے کی معلوم ہوئی اور یہ بھی معلوم ہوا کہ حسب اشارہ احباب نے ایک وفد علماء کا گورنمنٹ کے پاس مولانا کی رہائی کے لیے پیش کیا تھا۔ جس کی وجہ سے مسٹر موصوف مالٹا میں اترے ہیں اور ان خطوط کو بھی لائے ہیں، مگر غالباً کسی سیاسی غرض سے ان خطوط کا یہاں دینا مستحسن نہ سمجھا گیا بلکہ وہاں پہنچنے پر بھیج دیے گئے۔

اس کے بعد بعض امور میں ہماری خاص خاص رعایتیں کی گئیں۔ مثلاً ایک زمانے میں شکر بازار میں نہیں تھی، اس لیے تمام اسراء کو سخت تکلیف ہوگئی تھی، ہم نے آفس سے مراجعت کی، اس نے خاص طور پر انتظام کر دیا۔ جس کی بناء پر بقیمتِ وقت ہم کو شکر مل جاتی تھی۔ اسی طرح ظہر کے بعد سیر کے لیے دوسرے کیمپوں میں جانے کی بھی ہفتے میں تین دن کی اجازت ہوگئی۔

(سفرنامۂ اسیر مالٹا: ص ١٠٧۔١٠٩)

مولوی عزیر گل کا اشتغال:

مولوی عزیر گل صاحب مختلف اوقات میں اعمال سلوک تعلیم کردہ حضرت مولانا مرحوم میں مشغول رہتے تھے اور پھر کچھ وقت قرآن شریف کے یاد کرنے میں بھی صرف کرتے تھے۔ انھوں نے زبان ترکی کے سیکھنے کی طرف بھی توجہ کی اور تھوڑے ہی دنوں میں بحمد اللہ اچھی خاصی ترکی بولنے لگے۔ اس کے بعد انگریزی زبان کی طرف متوجہ ہوئے، مگر سوء بخت یا خوش نصیبی نے اس میں دستگیری نہ کی۔ ان کو حسب خواہش کوئی استاد نہ ملا اور کچھ طبعی عدم استقلالی بھی اس فن کے کمال سے مانع ہوئی۔ قرآن شریف کی طرف توجہ بہت کی مگر ضعف حافظہ اور عدم استقلال طبع سدراہ ہوتا رہا، موصوف کو اس کا شوق بہت ہے یاد بھی جلد کر لیتے ہیں مگر بھول بھی جلد جاتے ہیں۔ مولانا رحمۃ اللہ علیہ کی نظر عنایت ان پر بہت زیادہ تھی اور بہت بے تکلفی سے ان سے رہتے تھے۔ جو بے تکلفی ان سے برتتے رہے وہ کسی اور کے ساتھ عمل میں نہیں آئی۔

وحید کا اشتغال:

اس نے ابتدا ہی سے اجنبی زبانوں کی طرف توجہ کی۔ اولاً فرانسیسی، پھر جرمنی زبان کو سیکھا۔ پھر جب دیکھا کہ پانسہ جنگ پلٹ گیا تو انگریزی کی طرف متوجہ ہوا۔ مختلف فنون عربیہ خصوصاً حدیث اور تفسیر کی چند کتابیں اس سفر میں اس نے مولانا سے پڑھیں مگر بد قسمتی سے نہایت بے اعتنائی اور کم محنتی سے پڑھا گیا۔

کاتب الحروف کا اشتغال:

مجھ کو طالب علمی کے زمانے سے شوق تھا کہ قرآن شریف حفظ کروں۔ مگر بد قسمتی سے کبھی ایسا فارغ وقت نہ ملا تھا کہ اس مراد کے حصول کی کوئی صورت ہوتی۔ مدینۂ منورہ میں بڑی بڑی مشکلوں سے سورۂ بقرہ اور آل عمران کئی دفعہ یاد کی مگر سنبھال نہ سکا، بھول بھول گیا۔ جب طائف پہنچا پھر اس کو دہرایا اور سورۂ نساء، مائدہ، انعام یاد کر لیں مگر جب مکۂ معظمہ آنا ہوا پھر بھول گیا۔ کثرت اشتغال نے مہلت نہ دی کہ آگے بڑھتا یا انھی کی حفاظت کرتا۔ مالٹا پہنچ کر پھر از سر نو شروع کیا۔ چند دن تو وہاں کے انتظامات وغیرہ میں خرچ ہو گئے۔ اس کے بعد تقریباً نصف جمادی الاولیٰ سے اواخر شعبان تک پندرہ پارے یاد ہو گئے۔ چوں کہ فارغ وقت فقط ظہر کے بعد دو ڈھائی گھنٹہ یا اس سے بھی کم ملتا تھا اس لیے زیادہ یاد نہ ہو سکا۔ اس رمضان میں مولانا نے فرمایا کہ نوافل میں سنانا چاہیے۔ چناں چہ ہر شب میں تراویح کے بعد (جو کہ الم ترکیف سے ہوا کرتی تھی کیوں کہ ہمارے پڑوسی عرب زیادہ دیر تک سب کے سب نہیں کھڑے ہو سکتے تھے) نوافل میں سنا کرتے تھے۔ رمضان شریف کے بعد پھر آگے یاد کرنا شروع کیا مگر اس مدت میں مدینۂ کے واقعات والد مرحوم کی خبر وحشت اثر اور جملہ کنبہ والوں کے رنجیدہ واقعات نے تشویشیں بہت پیدا کی۔ تاہم فضل و کرم خداوندی سے ماہ صفر تک پورا قرآن ختم ہو گیا اور پھر روزانہ دور کر کے محفوظ رکھا اور رمضان شریف میں مولانا مرحوم نے سن لیا، قرآن شریف یاد کر لینے کے بعد مجھ کو بھی ترکی زبان کی طرف توجہ ہوئی کیوں کہ یہ بھی ایک دیرینہ آرزو تھی۔ آہستہ آہستہ کچھ اس میں شد بد ہو گئی۔ بالٹا میں داخل ہونے کے وقت بلکہ اسیر ہونے کے زمانے ہی سے میری تین آرزوئیں تھیں۔ ترکی زبان سیکھنا، قرآن شریف حفظ کرنا، باطنی اشتغال میں ترقی کرنا۔ خدا کے فضل و کرم سے دو اول کی تو ایک درجہ تک حاصل ہو گئیں، اور تیسرا مقصد باوجود صحبت شیخ کامل اور فراغ وقت اپنی بدنصیبی سے ناکام رہا:

تہید ستانِ قسمت راچہ سود از رہبرِ کامل
کہ خضر از آبِ حیواں تشنہ می آرد سکندررا

مگر تاہم مجھ کو افضال خداوندی اور بزرگوں کی جوتیوں کے طفیل سے اس باب میں بہت کچھ امیدیں ہیں کہ لاتقنطوا من رحمة الله ارشاد قرآنی ہے۔ اہل اللہ کی عنایت وتوجہ کبھی نہ کبھی تو ضرور دستگیری فرمائے گی۔ اولئک قوم لایشقی جلیسھم. ولله الحمد والمنة (ایضاً: ص۱۹۔۱۱۷)

رولیٹ ایکٹ کا نفاذ اور اس کا مفاد:

۱۸/ مارچ ۱۹۱۸ء: ۱۸/ مارچ ۱۹۱۸ء کو اس قانون کا نفاذ ہوا اور کونسل کے تین اہم ممبرز پنڈت مدن موہن مالویہ، مسٹر محمد علی جناح اور مسٹر مظہر الحق نے استعفیٰ دے دیا۔

اس قانون کا نفاذ پورے برطانوی ہند پر کیا گیا تھا۔ اس کے تحت انقلابی یا انارکسٹ تحریکوں میں ماخوذ افراد کے مقدموں کو جلدی جلدی نمٹانے کا التزام کیا گیا تھا۔ کوئی شخص ایسی تحریک سے وابستہ ہے یا نہیں ہے، اس کا فیصلہ صرف ایک ادنیٰ درجے کے پولیس مین کی رپورٹ پر کر دیا جاتا تھا۔ یہ رپورٹ اوپر کو بھیج دی جاتی اور بڑے بڑے افسروں کی منظوری حاصل کرتی ہوئی گورنر جنرل ان کونسل کا فیصلہ بن جاتی۔

ایسے مقدموں کے فیصلوں کے خلاف اپیل کا حق بھی نہیں تھا۔ کارروائی خفیہ طور پر بھی کی جاسکتی تھی۔ ضابطۂ فوجداری اور قانون شہادت کی بعض دفعات کو ایسے مقدموں کے لیے معطل کر دیا گیا تھا۔ ایسے مقدموں کی سماعت جس میں موت کی سزا دی جاسکتی تھی ایسے ڈھنگ سے کی جاتی تھی جیسے وارنٹ کیسوں میں مجسٹریٹ کرتے ہیں۔

اسی پر بس نہیں کیا گیا تھا، احتیاطی کارروائی کے طور پر حکام کو بڑے وسیع اختیارات دے دیے گئے تھے۔ وہ کسی بھی شخص سے ضمانت طلب کر سکتے تھے اور اس سے اس بات کی بھی ضمانت لے سکتے تھے کہ وہ فلاں فلاں جرائم کا ارتکاب نہیں کرے گا۔ کسی بھی شخص سے مطالبہ کیا جاسکتا تھا کہ وہ اطلاع دیے بغیر اپنی جائے رہائش کو تبدیل نہیں کرے گا اور اپنی موجودگی کی اطلاع نزدیکی تھانے کو وقتاً فوقتاً دیتا رہے گا۔ حکام سے کہا گیا تھا کہ وہ ان باتوں پر عمل درآمد کرانے کے لیے تمام ذرائع استعمال کر سکتے ہیں۔ جو لوگ ماخوذ ہوں وہ اپنی وکالت کے لیے کوئی وکیل مقرر نہیں

کرسکیں گے۔ مختصراً موتی لال نہرو کمیٹی کی رپورٹ کے الفاظ میں ''اس قانون نے انصاف اور قاعدے قانون کی حکومت کو بالائے طاق رکھ دیا۔''

مولوی حکیم نصرت حسین کی علالت اور رحلت:

اپریل تا اگست ۱۹۱۸ء: حکیم صاحب مرحوم سلیم الطبع ذکی القریحہ، مستقیم الاوقات تھے۔ انھوں نے علم حدیث وغیرہ دیوبند میں پڑھا تھا۔ باقی کتابیں لاہور، کان پور، دہلی وغیرہ میں پڑھی تھیں۔ دیوبند سے تکمیل کی۔ جلسۂ دستار بندی دیوبند میں ان کی دستار بندی ہوئی۔ مولانا شبیر احمد صاحب کے ساتھ دورہ میں شریک تھے۔ اسی زمانہ جلسہ میں مولانا مرحوم سے بیعت بھی ہوئے تھے۔ اپنے والدین کے اکلوتے بیٹے تھے۔ گھر پر جاگیر زمینداری کے انتظامات اور مطب میں مشغول رہے۔ اسی زمانے میں انگریزی بھی کچھ پڑھ لی۔ مگر مشق پوری نہ تھی۔ اس سفر میں بولتے بولتے اچھی طرح کام نکالنے لگے تھے۔ تقویٰ طبیعت میں ابتداء ہی سے تھا۔ اس لیے نمازوں کو ہمیشہ اول وقت پر پڑھتے تھے۔ تہجد کا بہت ہی زیادہ خیال تھا۔ فضولیات کی طرف طبیعت کو رغبت نہ تھی۔ اسلام کا درد اور وطن اور قوم کی محبت نہایت زیادہ تھی۔ سیاسی امور میں پوری دلچسپی رکھتے تھے۔ ہندوستان کی آزادی کی ہمیشہ دھن لگی رہتی تھی۔ نہایت معزز خاندان کے نونہال تھے۔ کوڑا جہان آباد (ضلع فتح پور ہسوہ) ان کا آبائی وطن ہے۔ ان کے بعض احوال پہلے گزر چکے ہیں۔ جب یہ نظر بند ہوئے تو ان کو جدہ ہی سے خیال ہوا کہ اس وقت کو ہاتھ سے جانے دینا نہ چاہیے بلکہ سلوک طریقت کی طرف توجہ مبذول کرنی چاہیے، چناں چہ انھوں نے مولانا مرحوم سے اس کی درخواست کی۔ مولانا نے کوئی ذکر مناسب تعلیم فرمایا، چناں چہ انھوں نے نہایت پابندی سے جملہ امور تعلیم کردہ مولانا مرحوم پر عمل کرنا شروع کیا۔ عموماً ہر وقت ذکر اسم ذات جاری رہتا تھا اور کچھ اوقات معینہ میں مراقبہ وغیرہ بھی کیا کرتے تھے۔ وہ اسی طرح ہمیشہ اپنے کام میں مشغول رہتے اور اپنی جملہ کیفیات مولانا مرحوم سے ذکر فرمایا کرتے تھے۔ بعد مولانا مرحوم کے ہماری جماعت میں کوئی بھی بااوقات شب خیز تہجد گزار ان سے زیادہ نہ تھا بلکہ تمام کیمپ اسراء مالٹا میں بھی کوئی ایسا نہ تھا۔ مولانا کی نظر عنایت بھی ان پر بہت تھی۔ ان کو ضعف معدہ کی شکایت بھی تھی اور ہمیشہ گھر پر بھی بخار وغیرہ میں مبتلا رہتے تھے۔ یہ اپنے اوقات قرآن شریف، دلائل الخیرات، ذکر، مراقبہ وغیرہ میں صرف کرتے تھے۔ ڈاکٹر غلام محمد کے چلے جانے کے بعد ایک مدت تک شام کا کھانا بھی

پکاتے تھے اور خود اپنی خواہش اور اصرار سے اس کا ذمہ لیا تھا۔ میں نے کوئی زور ان پر نہ ڈالا تھا اور نہ ڈاکٹر غلام محمد پر۔ پھر کچھ عرصے کے بعد میں نے ان سے یہ کام لے لیا تھا۔ ان کی طبیعت کچھ عرصے کے بعد مالٹا میں خوب سنبھل گئی تھی اور جو شکایتیں ان کو ضعف معدہ اور بخار وغیرہ کی تھیں جاتی رہی تھیں۔

اپریل مئی ۱۹۱۸ء: ماہ رجب ۱۳۳٦ھ سے ان کو پھر تپ ولرزہ کے دورے شروع ہوئے۔ خیال کیا گیا کہ معمولی جیسے ہمیشہ ان کو اس قسم کے دورے ہوا کرتے تھے، ویسے ہی ہیں، نہ انھوں نے کوئی فکر کی اور نہ دوسرے لوگوں نے۔ یہی حال تمام شعبان رہا۔ رمضان آنے پر انھوں نے روزے بھی رکھے اور اخیر شعبان میں بعضے مسہلات بھی استعمال کیے۔ کونین بھی استعمال کی مگر فائدہ نہ ہوا۔

جولائی ۱۹۱۸ء: اواخر رمضان میں بہ مجبوری ڈاکٹر کی طرف رجوع کیا گیا۔ ڈاکٹر نے مختلف دوائیں استعمال کرائیں۔ جن کو حکیم صاحب بوجہ رمضان شریف دن کو استعمال نہ فرماتے تھے بلکہ شب کو استعمال کرتے تھے، مگر کوئی فائدہ نہ ہوا۔ عید کے بعد پھر ڈاکٹر آیا اور اس نے کہا کہ ان کو ہسپتال جانا چاہیے۔ ہم نے زور دیا کہ ان کی دوا یہیں کی جائے مگر اس نے کہا کہ یہاں باقاعدہ علاج نہیں ہوسکتا۔ اب تک کیا گیا، مگر کوئی فائدہ نہیں ہوا، وہاں چلنا ضروری ہے۔ ہم نے جب دیکھا کہ یہ صورت نافع نہیں ہے تو درخواست کی کہ اچھا ہم میں سے ایک آدمی ان کے ساتھ رہنا چاہتا ہے اور یہ ضروری امر ہے۔ اس کی اجازت ہونا چاہیے۔ اس نے کہا کہ یہ بھی نہیں ہوسکتا۔ خلاف قاعدہ ہے اور پھر ایک کے ساتھ دوسرا بھی مریض ہوگا۔ الغرض ان کو وہاں پہنچادیا۔ ہم نے آفس میں اس کے متعلق درخواست کی کہ یا تو ہم میں سے ایک آدمی کو وہاں رہنے کی اجازت دی جائے، ورنہ کم از کم روزانہ ہم کو ان سے ملنے اور ان کی خبر گیری کرنے کی اجازت دی جائے۔ انھوں نے اول بات کی تو اجازت نہ دی، مگر یہ کہا کہ ہر تیسرے دن تم جا کر دو بجے کے بعد مل سکتے ہو۔ چناں چہ اس حکم کے بعد جس کو اس کی روانگی سے پانچ چھ دن کے بعد ہم حاصل کر سکے تھے، ہم وہاں گئے مگر ان کی حالت بہت گری ہوئی اور کمزور پائی۔ معلوم ہوا کہ ڈاکٹروں کی ایک بڑی جماعت جس میں بڑے بڑے آفیسر ہیں، ان کی مداواۃ میں مشغول ہیں اور بہت توجہ سے کام کر رہے ہیں۔ جو میم کمپوڈری اور دوسری ضرورتوں کو انجام دیتی تھی وہ ان پر خاص طور سے مہربان ہے، جس کی وجہ ان کا انگریزی جاننا اور برٹش رعیت ہونا ہے، کیوں کہ اس تمام ہال میں غیر برٹش

رعایا بلکہ دشمنانِ برطانیہ تھے۔ اس نے یہ بھی کہا کہ میں تمھارے لیے یخنی اور دوسری مقوی دوائیں جن میں شراب کا جوہر پڑتا ہے دوں گی، جس سے تمھاری صحت بہت جلد کامل ہوجائے گی، مگر انھوں نے یخنی اور ایسی مقوی دواؤں سے انکار کردیا کہ ہمارے مذہب میں یہ چیزیں حلال نہیں۔ اس نے نہایت افسوس کیا، پھر ہم کو وہاں سے حکم آیا کہ تم خود مرغی ذبح کرکے اس کی یخنی بھیجا کرو۔ چناں چہ ہم نے اس کا انتظام کردیا اور روزانہ بھیجتے رہے۔ جو لوگ ہال میں بیمار تھے، ان میں بعض مسلمان بھی تھے اور بعض عیسائی تھے، مگر اکثر حصہ عیسائیوں کا تھا۔ جن میں سے بعض سے قدرے واقفیت بھی تھی اور ان میں مادہ انسانیت کا بہت زیادہ تھا۔ ان کی صحت بھی تقریباً کمال کو پہنچ چکی تھی، ان لوگوں نے بہت اچھی طرح حکیم صاحب کی خبر گیری کی۔ حکیم صاحب نے کچھ نقد بھی لیا کہ خدام کو برابر دیتے رہیں گے، تاکہ خبر گیری اور خدمت پوری طرح سے ہو۔ ہم کو کبھی اُمید اُن کی صحت کی بندھ جاتی تھی اور کبھی خوف بھی ہوتا تھا۔

اوائل اگست ۱۹۱۸ء: اواخر شوال میں ان کی حالت زیادہ گرنے لگی۔ اس وقت ہم نے آفس سے درخواست کی کہ ہم کو وہاں رہنے کی اجازت دی جائے اور حکیم صاحب سے بھی طلب کرایا مگر اس کے جواب آنے میں بہت تاخیر ہوئی۔ غالباً ۷/ ذیقعدہ کو اجازت ملی، مگر فقط تحریری اجازت تھی۔ جب ہم نے چاہا تو ایک دو دن کی تاخیر افسروں کے موجود نہ ہونے یا کسی اور عذر سے کرادی گئی۔

۱۶/ اگست ۱۹۱۸ء: نویں (ذیقعدہ) تاریخ کو جب ہم اجازت لینے گئے تو ہم کو خبر دی گئی کہ ان کا شب کو صبح کے وقت انتقال ہوگیا۔

اس سے تقریباً دو روز پہلے بھی حسب عادت ہم گئے تھے۔ ان ایام میں ان کو سانس بہت زور سے اور جلدی جلدی آیا کرتا تھا۔ ہوا کے لیے برقی پنکھا ان کے آگے رکھا رہتا تھا۔ وہ اکثر تکیوں کے سہارے پر کمر لگائے ہوئے بیٹھے رہتے تھے۔ وفات سے ایک دن پہلے جب ہم گئے تھے تو آواز بہت پست پائی تھی مگر وہ خود اطمینان سے تھے۔ کسی قسم کی گھبراہٹ ان کو نہ تھی۔ ان کا رخ قبلہ کی طرف ایک عرصے سے اس وجہ سے کردیا گیا تھا کہ ان کو اٹھنے اور چلنے کی اجازت ڈاکٹروں کی طرف سے نہ تھی، اس لیے ان کو نماز چارپائی پر پر اشاروں سے پڑھنا پڑتی تھی۔ جس کی وجہ سے ہمیشہ چارپائی رو بقبلہ رہتی تھی۔ مگر یہ معلوم ہوا کہ وہ رات کو چارپائی سے اتر کر خفیہ نماز پڑھا کرتے تھے۔ (واللہ اعلم) انھوں نے جب جب جانا ہوا تو کہا کہ ذکر میرا جاری ہے اور تعلق خداوندِ

ذوالجلال سے بندھا ہوا ہے۔

چوں کہ مرحوم کا مرض نمونیہ تجویز کیا گیا تھا اور وہ امراض متعدیہ میں سے ہے، اس لیے کمانداراسراء نے مولانا مرحوم کو اور ہم کو بلا کر کہا کہ حکیم صاحب مرحوم کی نعش تم کو قبرستان میں ملے گی۔ لیکن تم فقط دور سے نماز پڑھ لینا۔ تابوت کے پاس بھی مت جانا۔ ہم نے اصرار کیا کہ ہم کو غسل دینا اور کفن پہنانا ضروری ہے۔ اس نے کہا کہ ڈاکٹر کا حکم ہے کہ اس کے پاس بھی کوئی نہ جائے۔ ہم نے کہا کہ ہم کو شریعت کا حکم ہے۔ غرضیکہ اس بارے میں مولانا مرحوم سے اور کماندار سے بہت زیادہ ردوقدح ہوتی رہی، جب اس نے زیادہ ردوقدح کی اور تقریباً آدھا گھنٹہ ردوقدح پر بھی راضی نہ ہوا۔ تو ہم نے کہا اچھا ہم نہ نہلائیں گے مگر کفن تو پہنادیں۔ بڑی مشکلوں سے، وہ اس پر بھی جب راضی ہوا، جب مولانا خفا ہو کر کہنے لگے کہ جب آپ کو ہماری مذہبی ضروریات کی پروا ہو نہیں تو پھر ہم کو کیوں بلایا، خود ہی جو چاہتے تھے، کر دیا ہوتا۔ یہ کہا اور لوٹ جانے کے لیے آمادہ ہو گئے۔ اس وقت اس نے اجازت دی۔ مولانا مرحوم نے فرمایا کہ اس بہانے سے ہم ان کو تیمم کرادیں گے اور کفنا بھی دیں گے اور یہ بھی معلوم ہوا تھا کہ شفا خانے میں ان کو اپنے طریقہ پر دوا کے پانی سے ڈاکٹروں نے خوب نہلایا تھا۔ مولانا نے فرمایا کہ وہ کافی تھا، مگر ہم چاہتے تھے کہ طریق مسنون پر ان کو نہلائیں۔

خلاصہ یہ کہ ان کے مقبرہ میں جانے کے واسطے ہم نے تقریباً پچاس یا ساٹھ آدمیوں کی اجازت طلب کی۔ کماندار نے اجازت دے دی۔ یہ سب وہاں گئے۔ ایسا اجتماع کسی شخص کے جنازے میں وہاں نہ ہو سکا تھا۔ ان کو تیمم کرا کے کفنایا گیا۔ مولانا مرحوم نے بادل غمگین نماز پڑھائی اور دروازے کے قریب ہی ان کی قبر کھودی ہوئی تیار تھی، اس میں دفن کر دیے گئے۔ ان کے مصاریف جو کچھ وہاں واقع ہوئے تھے وہ تو ہم نے اپنے پاس سے دیے تھے، مگر گاڑیوں کا کرایہ کرنیل اشرف بیگ نے جو کہ کئی پونڈ کی مقدار میں ہوتا تھا، بغیر ہماری اطلاع دے دیا۔ ان کی قبر پر جو کہ مثل دیگر قبور کے خام ہے، ایک پتھر حسب رائے مولانا مرحوم لگا دیا گیا ہے جس پر ذیل کی عبارت کندہ ہے۔

هذا قبر الحكيم السيد نصرت حسين من اهل كوڑا جهان آباد الهند. اسر بمكة المكرمة مع حضرة العلامة مولانا الشيخ محمود حسن صدر المدرسين بكلية ديوبند في

الحرب العمومي وتوفي اسيراً في تاسع (٩) ذى القعده
١٣٣٧ هجرة النبي سيدنا محمد صلى الله عليه وسلم
رحمته الله، رحمة واسعة وله الفاتحة.

اس پتھر کو کرنیل اشرف بیگ ہی نے کندہ بھی کرایا تھا اور لگوایا بھی تھا کیوں کہ اس نے ایک بڑی مقدار نقود کی خرچ کر کے بطور یادگار جملہ اسراء مدفون کے لیے پتھر کندہ کرائے تھے اور ایک مربع ستون پتھر کا جس میں سنگ مرمر پر جملہ ان ترکی اسراء کا نام کندہ تھا جو کہ ایام اسارت جنگ عمومی میں وہاں مدفون ہوئے تھے۔

مالٹا میں جو اسراء وفات پا جاتے تھے خصوصاً غیر ممالک کے ان کے سینہ کو چاک کر کے اندرونی اعضاء کو دوا میں رکھا جاتا تھا۔ جس سے غالباً یہ مقصود تھا کہ اگر حکومت مخالفانہ دعویٰ یا شبہ کرے کہ میت کو کوئی زہر وغیرہ دے دیا گیا ہے تو دل اور جگر وغیرہ کی کیفیت سے معلوم ہو سکے۔ (واللہ اعلم) اس لیے ہم نے اولاً یہ کوشش کی کہ حکیم صاحب کے شکم کو چاک نہ کیا جائے اور اس پر مولوی عزیر گل صاحب نے بہت زور دیا۔ چناں چہ انھوں نے ایسا ہی کیا۔

اسرا[illegible] چھوڑا جانا:

حکیم صاحب مرحوم کی وفات سے دو تین مہینے کے بعد سے اسر[illegible] کا چھوڑا جانا شروع ہو گیا۔ اول اول جرمنی لوگ چھوڑے گئے، پھر آسٹیرین، بلغاری وغیرہ۔ مگر بہت تھوڑی تھوڑی مقدار میں لوگ چھوڑے جاتے تھے۔ تقریباً تین ماہ میں اکثر حصہ اسر[illegible] کا روانہ کر دیا گیا، اس وقت سب اسیروں کو مختلف جگہوں اور کیمپوں سے نقل کر کے ورد الہ میں رکھا گیا۔ ترکی اور شامی اسراء اس وقت تک نہیں چھوڑے گئے تھے جو لوگ روگیٹ کیمپ یا وال فرسٹہ یا سینٹ کلیمٹ براکس وغیرہ میں تھے سب کے سب وہاں جمع کر دیے گئے۔ جو لوگ زمانۂ التوائے جنگ کے بعد استنبول سے پکڑے گئے تھے ان کو اس اسارت گاہ سے بہت دور رکھا تھا اور ان قدیمی اسیروں سے ملنے نہیں دیا جاتا تھا۔ انھی میں شیخ الاسلام خیری آفندی اور احمد پاشا انور پاشا کے والد ماجد اور دوسرے ترکی کے معزز اور اکابر عہدیدار تھے۔ اس وقت میں ان کو بھی یہیں جمع کر دیا گیا، شیخ الاسلام خیری آفندی کا کمرہ ہمارے کمرہ کے قریب تھا۔ اس مرتبہ ہم کو وردالہ میں دو کمرے دوسرے طبقے پر نہایت مکلف ملے، جس میں سے ایک حضرت مولانا مرحوم کے لیے خاص کر دیا گیا اور اس میں

ایک طرف مولوی عزیر گل صاحب کی چارپائی تھی اور اس میں پردے کے باہر مہمانوں کے لیے میز و کرسیاں بچھا دی گئی تھیں اور دوسرے کمرے میں کھانے پکانے کا جملہ سامان تھا اور اس میں، میں اور وحید تھے۔ کھانا بھی وہیں کھایا جاتا تھا۔ ہمارے رفقاء اہل سید اہم سے ذرا کچھ دور ہو گئے تھے، مگر اسی کیمپ میں تھے۔ کچھ تھوڑے ہی دن گزرے تھے کہ ان کی روانگی کا بھی وقت آ گیا اور وہ بھی اپنے اپنے وطن کو روانہ ہو گئے۔ اس وقت سے ہم کو اپنے کاروبار میں ذرا دقت کا سامنا ہو گیا کیوں کہ کوئی شخص کاروبار ضرور یہ انجام دینے والا نہ رہ گیا تھا مگر مسبب الاسباب ہر قسم کی آسانی پہنچاتا تھا۔ اس کے کچھ ہی عرصے کے بعد باقی ماندہ ترک اور دوسری اقوام بھی اپنے اپنے ممالک کو سفر کر گئے۔ جو لوگ کہ التوائے جنگ کے بعد پکڑے گئے تھے، وہ اور کچھ دوسرے لوگ باقی رہ گئے، درداله کا اکثر حصہ فارغ ہو گیا تو ہم کو تقریباً ڈیڑھ ماہ رہنے کے بعد درداله سے بھی وال فرسٹہ میں منتقل کر دیا گیا۔ وال فرسٹہ کے کمرے نہایت ہی آرام کے تھے۔ ہر کمرے میں چار حصے تھے چوتھے حصے میں نل اور غسل وغیرہ کا سب سامان تھا۔ ایک کمرہ ہم سبھوں کے لیے کافی تھا۔ وہاں بھی لوگ آہستہ آہستہ سفر کرتے رہے۔ یہ سب کچھ ہوتا رہا۔ تقریباً پانچ چھ ماہ اسیروں کو سفر کرتے گزر گئے، مگر ہماری نسبت کوئی خبر نہ آئی، یہاں تک کہ پرانے اسراء میں سے فقط دس بارہ آدمی باقی رہ گئے تھے، جن میں سے پانچ یا چھ آسٹیرین، جرمنی تھے جو کہ مصر کو جانا چاہتے تھے کیوں کہ ان کے متعلقین مصر میں تھے۔ حکومت برطانیہ ان کو وہاں بھیجنا اپنی مصلحت کے خلاف سمجھتی تھی اور اسی طرح پانچ چھ ترکی آفیسر تھے جو کہ اپنی قوم اور وطن کے خائن تھے۔ ایام جنگ میں انگریزوں سے مل گئے تھے۔ وہ اپنے ملک میں واپس ہونا نہیں چاہتے تھے۔ وہ بھی مصر جانا چاہتے تھے، اسی وال فرسٹہ میں سعید حلیم پاشا سابق صدر اعظم ترکی اور ان کے بھائی عباس حلیم پاشا سابق گورنر بورصہ، کرنیل جلال بیگ، جرنیل علی احسان پاشا، جرنیل فخری پاشا، شیخ الاسلام خیر الدین آفندی، جرنیل محمود پاشا وغیرہ اکابر ترکی تھے۔ جن سے اکثر ملاقات ہوتی تھی اور مولانا سے ملنے کے لیے یہ حضرات آیا کرتے تھے۔ آخر کار انتظار کرتے کرتے ہمارے لیے بھی وقت آ پہنچا۔

قاعدہ تھا کہ جب کسی اسیر کی نسبت روانگی قرار پاتی تھی تو اس کو آٹھ دس دن پہلے خبر دی جاتی تھی کہ وہ تیار رہے اور جس دن جانا ہوتا تھا یک بارگی اس کو حکم روانگی کا دے دیا جاتا تھا۔ جبکہ ایک مرتبہ حکم دے دیا گیا، ہم تیار ہوئے مگر آٹھویں دن خبر ملی کہ اس آگبوٹ میں بیماری ہے۔ دوسرے آگبوٹ میں جانا ہوگا۔

۱۲ر مارچ ۱۹۲۰ء: دس پندرہ دن کے بعد ۲۲ر جمادی الثانی ۱۳۳۸ھ مطابق ۱۲ر مارچ ۱۹۲۰ء جمعہ کے دن تقریباً دس بجے دن کے ہم وہاں سے روانہ ہوکر آگبوٹ پر سوار کرادیے گئے۔ ہم کو سیکنڈ کلاس کے کمرے دیے گئے اور چوں کہ وہ جہاز جنگ کی مہمات کی خدمت کے لیے تھا، اس لیے اس میں جملہ کاروبار کرنے والے عموماً افغانی لوگ تھے۔ جو صوبہ فرنٹیر کے تھے۔ ہمارے کھانے کا انتظام انھی کے سپرد کیا گیا، چوں کہ مولوی عزیر گل اس صوبے کے ہیں، ان سے ان لوگوں کی پشتو میں بات چیت ہوئی تو وہ ان کے شیدائی ہوگئے۔ انھوں نے نہایت اخلاص سے کھانے پینے کا انتظام کیا مگران پر آفیسروں کی سخت تاکید تھی کہ کوئی ان میں سے نہ ہمارے پاس بیٹھے، نہ بات چیت کرے۔ فقط کھانا وقت پر پیش کردیا کرے۔ وجہ یہ تھی کہ ان کو خوف تھا کہ یہ سیاسی ہیں ان لوگوں کو خراب نہ کردیں۔

۱۵ر مارچ ۱۹۲۰ء: ۲۵ر جمادی الثانی ۱۳۳۸ھ مطابق ۱۵ر مارچ ۱۹۲۰ء کو صبح کے قریب آگبوٹ اسکندریہ پہنچا، وہاں عرصے تک انتظار ہوتا رہا مگر قریب شام کے کچھ سپاہی اور آفیسر آئے، ان کے ساتھ روانہ ہوئے۔ وہ لوگ ہم کو نہایت بے ترتیبی کے ساتھ لے گئے۔ اسباب قلیوں کے سپرد کردیا اور ہم کو ٹریموے میں سوار کرکے گوروں کے فوجی کیمپ میں لے گئے اور وہاں پر مجرم سپاہیوں کی قید کا جو کیمپ تھا اس میں ہم کو داخل کردیا اور ہم پر اسی طرح سخت پہرہ کردیا جیسا کہ ان لوگوں پر تھا۔ شام کا وقت ہوگیا تھا کچھ کھانا انھوں نے ہم کو دیا اور ایک خیمہ میں جس میں نہ گدا تھا نہ بچھونا تھا، نہ چارپائی تھی نہ روشنی، فقط کمبل دے کر پڑ رہنے کو کہہ دیا۔ اسباب قریب عشاء کے پہنچا اس کو بھی انھوں نے اندر داخل نہ ہونے دیا۔ دروازے پر باہر ہی رہا۔ اس شب کو ہم کو سخت تکلیف اٹھانی پڑی۔ صبح کو آفیسر آیا اور ہم نے جو کچھ معاملہ گزرا تھا بیان کیا۔ اس نے بہت عذر معذرت کی اور اپنی لاعلمی ظاہر کرکے کہا کہ میں معافی کا خواستگار ہوں، مجھ کو بالکل اطلاع نہ تھی۔ اس نے اسی وقت اپنے بڑے آفس میں جاکر گفت وشنید کرکے سیدی بشر میں جو کہ مصر میں قرارگاہ اسرا تھا بھجوادیا۔ ہمارا اسباب تو گاڑی پر بھجوایا مگر ہم کو پیدل بھجوایا۔ جگہ نہایت دور تھی۔ چلتے چلتے ہم نہایت پریشان ہوگئے۔ چوں کہ عرصہ دراز سے قید میں تھے اس لیے چلنے کی عادت چھوٹ گئی تھی اور پھر مولانا کو بھی مشکل تھی، سپاہی بندوق لیے ہمارے ساتھ تھے۔

۱۶ر مارچ ۱۹۲۰ء: ہم ۲۶ر جمادی الثانی کو تقریباً ایک بجے وہاں پہنچے۔ ہم کو اسی وقت قرارگاہ کے اس کیمپ میں داخل کردیا گیا، جس میں قرنطینہ نئے اسیروں کا ہوا کرتا تھا۔ اس میں تین خیمے

نصب کردیے گئے اور چارپائیاں، گدے وغیرہ جملہ ضروریات مہیا کردی گئیں۔ داخل ہوتے وقت سب کی تلاشی لی گئی۔ مولوی عزیرگل صاحب غفلت کی حالت میں آئے تھے ان کے پاس ۲۷ پونڈ تھے ان کو لے لیا گیا اور رسید دے دی گئی۔

سیدی بشر میں اس وقت ترکی اسرا کی بہت بڑی مقدار موجود تھی۔ غالباً آٹھ نو کیمپ میں اسرا وہاں موجود تھے، یہ سب کیمپ آفیسروں کے لیے تھے اور ہر کیمپ میں خدمت کے لیے ترکی سپاہی تھے۔ ہمارے کھانے کا انتظام باہر سپاہیوں کے متعلق کیا گیا، جو کہ ہندوستانی یا ولایتی تھے، کیوں کہ وہاں پر پہرہ وغیرہ ہندوستانیوں کے ذمے تھا۔ وہ لوگ جیسا کہ خود کھاتے تھے، دال روٹی لاتے تھے، گوشت بہت کم ہوتا تھا، جو ترکی آفیسر اردگرد کے کیمپوں میں موجود تھے وہ ہم پر نہایت شفقت کرتے تھے اور بہت زیادہ محبت اور لطف سے پیش آتے تھے۔ ہم نے خیال کیا کہ گنتی کے بعد حسب عادت جیسے کہ دوسرے کیمپ ہیں اور لوگ آپس میں ملتے ہیں، ہمارے ساتھ بھی یہی معاملہ کیا جائے، مگر ہمارے لیے بالکل اجازت کسی سے ملنے اور آنے جانے کی نہ تھی، بلکہ دوسرے اسرا سے دور سے باتوں کی بھی اجازت نہ تھی۔ پھر یہ خیال کیا کہ شاید دو تین دن کے بعد جب کہ ایام قرنطینہ ختم ہو جائیں، اجازت ہو، مگر جب بھی نہ ہوئی۔ جو انگریز آفیسر اور کماندار تھا اس سے کہا، بلکہ ترکی آفیسروں نے خود درخواست کی تو اس نے کہا کہ یہ لوگ سیاسی ہیں اور تم جنگی ہو، تمھارا آپس میں اجتماع خلاف قانون ہے۔ آخیر تک ہم آپس میں نہ مل سکے۔ مگر چوں کہ راستہ بعض بعض کیمپوں میں سے تھا۔ اس لیے چلتے چلتے بعض اشخاص سے مصافحہ وغیرہ ہو جاتا تھا۔ وہ لوگ ہمارے پاس اکثر ہدایہ وغیرہ بھیجتے تھے، ہم اصرار بھی کرتے تھے مگر وہ نہ مانتے تھے۔ کھانے کی حالت پر انھوں نے کہا کہ تم کماندار سے کہہ دو کہ خشک رسد ہمارے باورچی خانہ میں دے دیا کرے، ہمارے یہاں سے کھانا پکایا ہوا تمھارے واسطے آیا کرے گا۔ چناں چہ یہی انتظام کیا گیا۔

۲؍اپریل ۱۹۲۰ء: تقریباً اٹھارہ روز وہاں اسی طرح قیام ہوا۔ ۱۲؍رجب ۱۳۳۸ھ مطابق ۲؍اپریل ۱۹۲۰ء کو وہاں سے روانگی ہوئی اور اسی طرح سنگینوں کے بیچ میں ہم اسٹیشن پر پہنچائے گئے۔ فرسٹ کلاس میں سفر کر کے شام کے قریب سویز پہنچے۔ ہم کو خیال تھا کہ آگبوٹ وہاں تیار ملے گا، مگر بدقسمتی سے پھر کیمپ اسرا میں قید کیے گئے۔ وہاں پر آبادی سے دور اسارت گاہ تھی، جس میں بہت سے ترکی آفیسر اور سپاہی تھے۔ پہرہ ہندوستانی سپاہیوں کا تھا۔ ہم کو مغرب کے بعد وہاں داخل کر دیا گیا اور دو خیمے دیے گئے۔ جن میں رہنا شروع کیا۔ یہاں پر ہم کو سکھوں کے ساتھ رکھا

گیا۔ وہ بے چارے عراق سے پکڑے گئے تھے اور استنبول بھیجنے کے وعدہ پر سوئز لائے گئے تھے جو کہ دو دو تین تین ماہ سے وہاں پڑے ہوئے تھے۔ ان لوگوں سے مل کر نہایت دلچسپی رہتی تھی۔ نہایت توجہ اور کرم سے پیش آتے تھے، مگر عموماً آفیسر نہایت تنگدستی کی حالت میں تھے، کیوں کہ ان کی نہ تو تنخواہیں ملتی تھیں نہ ان کو آگے روانہ کیا جاتا تھا۔ فقط کھانے کا انتظام تھا۔ ہم کو بھی یہی دقت پیش آئی۔ چوں کہ وہاں بھی چیزیں نہایت گراں آتی تھیں، ادھر ہم سے جو پونڈ اسکندریہ میں لے لیے گئے تھے ان کے بدلے ہم کو نوٹ دیے گئے۔ ساورن نہیں دی۔ ہم نے اصرار بھی کیا مگر ایک نہ سنی گئی۔ ساورن وہاں پندرہ روپے سے زائد کو تھی مگر نوٹ ایک ساورن کا دس روپے کو چلتا تھا۔ سیدی بشر میں اور یہاں سویز میں یہی مقدار کام آئی۔ یہاں آگبوٹ کے انتظار میں ہم کو بہت زمانہ گزارنا پڑا۔ تقریباً پونے دو مہینے گزر جانے کے بعد آگبوٹ کی آمد ہوئی۔

۲۲ رمئی ۱۹۲۰ء: پانچویں رمضان المبارک ۱۳۳۸ھ مطابق ۲۲ رمئی ۱۹۲۰ء اتوار کے دن دس بجے صبح کو کیمپ سے روانہ ہو کر آگبوٹ پر پہنچے۔ فرسٹ کلاس کمرہ ہم کو دیا گیا اور کمروں میں اسباب وغیرہ جما دیا گیا۔ اسی روز شام کو آگبوٹ روانہ ہو گیا۔ ۱۲ر رمضان المبارک کو اتوار ہی کے دن آگبوٹ عدن پہنچا۔

۷ تا ۱۳ ار جون ۱۹۲۰ء: ۲۰ر رمضان المبارک کو پیر کے دن بمبئی پہنچنا ہوا۔ میں (کاتب الحروف) اور مولوی عزیز گل صاحب اکثر اسباب لے کر کنارے پہنچے اور ہوڑی کو حضرت رحمۃ اللہ علیہ اور وحید کے لینے کے لیے روانہ کیا۔ اتنی ہی دیر میں بارش ہو گئی۔ دریا میں طوفان آ گیا جس کی وجہ اس روز حضرت مولانا رحمۃ اللہ علیہ اور وحید نہ آ سکے۔ اگلے دن بمشکل تمام مولانا کو اتارا گیا۔ بمبئی پہنچنے پر معلوم ہوا کہ ہم بالکل آزاد ہیں۔ کسی قسم کی روک ٹوک ہم کو نہیں۔

بمبئی آگبوٹ پہنچنے پر سب سے اول سی آئی ڈی کا افسر انگریز مع دو تین ہندوستانی افسروں کے جن میں بہاؤ الدین بھی تھے، آئے۔ اس انگریز نے مولانا سے کہا کہ میں کچھ آپ سے علاحدہ میں باتیں کرنا چاہتا ہوں۔ مولانا کمرے میں چلے گئے، اس نے کہا کہ مولوی رحیم بخش یہاں آئے ہوئے ہیں۔ آپ بغیر ان سے ملے ہوئے ہرگز جہاز سے نہ اتریں۔ یہ کہہ کر وہ چلا گیا۔ ہم نے عرصے تک انتظار کیا۔ آخر کار ہم اسباب لے کر اتر آئے۔ اس کے بعد مولوی رحیم بخش وہاں پہنچے۔ مولانا سے ملاقات ہوئی۔ معلوم ہوا کہ موصوف گورنمنٹ کی طرف سے مولانا پر اثر ڈالنے کی غرض سے بھیجے گئے تھے، جس سے مقصد یہ تھا کہ مولانا یہاں پہنچنے کے بعد سیاسیات میں دلچسپی نہ

لیں۔ مگر ایک تو مولانا کچھ اپنے ارادوں میں کمزور نہ تھے ان کی پختگی گورنمنٹ اور خلقت پر ظاہر ہو چکی تھی۔ ادھر مولوی موصوف مہذب تعلیم یافتہ بزرگوں کے دیکھنے والے۔ مولانا کی شدت عزم واستقلال سے واقف تھے۔ اس لیے وہ کوئی قوی اثر نہ ڈال سکے۔ انھوں نے دھیمے الفاظ استعمال کیے اور جلسوں کی شرکت وغیرہ سے نفرت ضرور دلائی، جلسوں میں جو بے عنوانیاں ہوتی تھیں ان کا بھی تذکرہ فرمایا اور اس پر زور دیا کہ مولانا اترنے کے ساتھ ہی ریل پر سوار ہو کر دیوبند کو روانہ ہو جاویں، بمبئی میں خلافت والوں کے ہاتھ میں نہ پڑیں۔ انھوں نے یہ بھی فرمایا کہ میں آپ کو قلبی ارادوں اور مذہبی عزائم سے روکنا نہیں چاہتا مگر مناسب یہی معلوم ہوتا ہے کہ مبادا آپ پر اس ضعیف العمری میں کوئی اور بدظنی گورنمنٹ کو پیدا نہ ہو جائے، مگر بقول شخصے:

یہ وہ نشہ نہیں جسے ترشی اتار دے

آخر کار ایک بھی نہ سنی۔ خلافت کمیٹی نے استقبال کیا۔ انھی کے مکان میں قیام فرمایا۔ انھی کے یہاں دعوتیں ہوئیں۔ ایڈریس پیش کیا گیا۔ ۲۲ اور ۲۳ رمضان کو قیام فرما کر جمعرات کی شام کو ۲۴ رمضان کی شب میں ایکسپریس پر روانہ ہو کر ۲۵ رمضان کی صبح کو ہفتہ کے دن دہلی پہنچے۔ ڈاکٹر انصاری صاحب کی کوٹھی پر قیام فرمایا اور اتوار کی شب کو وہاں سے روانہ ہو کر ۲۶ رمضان المبارک کو تقریباً ۹ بجے صبح کو دیوبند پہنچے۔ راستہ میں اہل میرٹھ نے ایڈریس پیش کیا۔ میرٹھ شہر، میرٹھ چھاؤنی، مظفرنگر وغیرہ پر بہت ہی زیادہ مجمع تھا اور دیوبند میں بھی استقبال کرنے والوں کا جم غفیر تھا۔ (سفر نامۂ اسیر مالٹا: ص ۲۸۔۱۲۰)

عارضی صلح یا التوائے جنگ:

۲۰ اکتوبر ۱۹۱۸ء: ترکی نے التوائے جنگ کے صلح نامہ پر دستخط کر دیے۔ رؤف بے وزیر بحریہ ترکی اور امیر البحر برطانیہ ملے کالتھراپ کے دستخطوں سے یہ شرائط طے پائے تھے:

(۱) درہ دانیال اور باسفورس اور اس کے علاوہ وہ قلعے جو ان پر ہیں سب کو خالی کر کے اتحادیوں کے حوالے کر دیے جائیں۔

(۲) کل فوج غیر مسلح کر دی جائے۔

(۳) تمام جہازات اتحادیوں کے حوالے کر دیے جائیں۔

(۴) اتحادیوں کو یہ حق دیا جاتا ہے کہ فوجی نقطہ نظر سے جو بھی مقام وہ اہم سمجھیں اس پر قبضہ

کرلیں۔

(۵) ترکی ریلوں کا انتظام اتحادیوں کے ہاتھ میں رہے گا۔

(۶) تمام ترکی بندرگاہ اتحادیوں کے لیے کھول دیے جائیں گے۔

(۷) تمام تار کی لائنیں اتحادیوں کے اقتدار میں دے دی جائیں گی۔

(۸) ترکی افواج کے جو لوگ گرفتار ہو گئے ہیں، وہ سب قید رہیں گے۔

(۹) ترکی افواج جو حجاز اور طرابلس میں ہیں، ان کو ہتھیار ڈالنے پر مجبور کیا جائے گا۔

(۱۰) اتحادی فوجوں کے جو لوگ گرفتار ہوئے ہیں وہ فوراً رہا کر دیے جائیں گے۔

ایسی ذلت خیز شرائط شاید ہی کسی فاتح نے کسی مفتوح پر عائد کی ہوں۔ جرمنی سے جن شرائط پر التوائے جنگ کا مسودہ تیار کیا گیا تھا وہ بالکل مختلف تھا۔ اب کل اختیارات کو اپنے ہاتھ میں لے کر قسطنطنیہ پر انگریزوں نے قبضہ کر کے اور ترکان احرار کے سربرآوردہ لوگوں کی تلاش ہوئی کہ ملیں تو فوراً تہ تیغ کر دیے جائیں۔ وزیر اعظم طلعت پاشا، وزیر حرب انور پاشا، وزیر بحریہ جمال پاشا وغیرہ یورپ بھاگ گئے اور لوٹے تو انڈر گراؤنڈ ہو گئے۔ ان کی عجیب داستان ہے کہ کس طرح وہ لوگ اپنے کو محفوظ رکھنے کے لیے بھیس بدلتے اور مختلف قسم کی تدبیریں کرتے تھے۔ خلیفۃ المسلمین عبدالحمید خان نے طوق غلامی اپنے گلے میں لٹکا لیا اور یہ آس لگائی کہ ان کی پنشن مقرر ہو جائے گی اور وہ زیر سایۂ دولت برطانیہ آرام و آسایش کی زندگی گزاریں گے۔ مفتی اعظم اور علمائے اسلام بھی احساس کمتری کا شکار ہو گئے۔

عارضی صلح کی شرائط سے ہندوستان کے مسلمانوں کو بڑی مایوسی ہوئی۔ اب ان کو اندازہ ہوا کہ مستقل صلح جب ہوگی تو نہ ترکی باقی رہے گا، نہ خلیفۃ المسلمین، نہ اماکن مقدسہ، نہ فلسطین، نہ بیت المقدس۔ بدحواسی اور بے چارگی میں مسلمانوں نے جلسے اور تجاویز کا انبار لگا دیا۔ غرض یہ تھی کہ حکومت برطانیہ دب کر وہ سب کچھ نہ کرے جس کا اندیشہ تھا۔ (تحریک خلافت، ص ۷۵)

۱۹۱۴ء تا نومبر ۱۹۱۸ء

جنگ عظیم اول:

سربیا، مانٹی نیگرو، یونان اور بلغاریہ نے ترکی کے ٹکڑے ٹکڑے کرنے کے لیے ترکی سے جنگ شروع کی۔ سلطان عبدالحمید کو معزول کرنے کے بعد نوجوان ترکوں نے زمام حکومت

سنبھالی۔ ابھی صرف چند سال ہوئے تھے کہ اکتوبر ۱۹۱۲ء سے یہ جنگ شروع ہوگئی۔ جنگ شروع ہونے پر سب کا گمان یہ تھا کہ ترکی کامیاب رہے گا۔ اس لیے انگلستان کے وزیراعظم مسٹر اسکو۔تھ اور فرانس کے وزیراعظم موسیو گلے مینو دونوں نے ایک متفقہ بیان جاری کیا کہ کوئی بھی کامیاب ہو جغرافیائی حدود برقرار رکھے جائیں گے۔ مگر نتیجہ برعکس نکلا اور ترکی کو شکست ہوگئی۔ تب ان دونوں وزیراعظموں نے اپنا رخ بدل دیا اور دیدہ دلیری سے یہ اعلان کیا کہ کوئی وجہ نہیں کہ فاتحین کو فتح کا ثمر نہ ملے۔ یہ لڑائی مئی ۱۹۱۳ء میں ختم ہوگئی اور ۱۳ر مئی ۱۹۱۳ء کو لانڈ کے مقام پر معاہدہ ہوا جس سے ترکی کے یہ صوبے آزاد ہوگئے۔ اس کے بعد سربیا، یونان اور رومانیہ نے بلغاریہ پر حملہ کر دیا اور یہ دوسری جنگ بلقان اگست ۱۹۱۳ء میں ختم ہوئی اور رومانیہ کے دارالسلطنت بوخارسٹ میں آخری معاہدۂ صلح مرتب ہوا۔ اس معاہدے کی رو سے سربیا کی مملکت میں کافی اضافہ ہوگیا۔

۲۸ر جون ۱۹۱۴ء کو مملکت آسٹریا کے تاج وتخت کے ولی عہد آرچ ڈیوک فرینک فرڈینڈ کو سرجیو کے مقام پر قتل کر دیا گیا۔ سرجیو آسٹریا کے صوبہ باسنیا کا دارالسلطنت تھا۔ باسنیا پہلے سربیا کی قدیم حکومت میں شامل تھا۔ آسٹریا نے سربیا کو اس قتل کا ذمہ دار قرار دیا اور سربیا کے خلاف ۲۸ر جولائی ۱۹۱۴ء کو اعلان جنگ کر دیا۔ روس عرصے سے سربیا کا حامی اور سرپرست تھا۔ اس نے اپنی فوجوں کو تیاری کا حکم دیا۔ جرمنی نے روس کو منع کیا اور روس کے نہ ماننے پر اس کے خلاف ۳۰ر جولائی ۱۹۱۴ء کو جس دن بلگریڈ پر گولہ باری ہو رہی تھی روس کے خلاف بھی اعلان جنگ کر دیا۔ فرانس روس کا حلیف تھا۔ اس لیے ۳ر اگست ۱۹۱۴ء کو جرمنی نے فرانس کے خلاف بھی اعلان جنگ کر دیا اور فرانس پر حملہ کرنے کے لیے بیلجیم سے راستہ مانگا۔

برطانیہ، پروشیا، فرانس، آسٹریا اور روس نے ۱۸۳۹ء میں بیلجیم کی غیر جانبداری کے تحفظ کی گارنٹی کی تھی۔ اس لیے برطانیہ نے جرمنی کو الٹی میٹم دیا کہ وہ بیلجیم سے راستہ نہ طلب کرے۔ (پروشیا اب جرمنی کا ایک جزو ہے) جرمنی کے کچھ جواب نہ دینے پر ۴ر اگست ۱۹۱۴ء کو برطانیہ نے جرمنی کے خلاف اعلان جنگ کر دیا۔ ۲۳ر اگست ۱۹۱۴ء کو جاپان نے جرمنی کے خلاف جنگ کا اعلان کیا اور رفتہ رفتہ یہ عالمگیر جنگ بن گئی۔ جس میں ۱۹۱۷ء یعنی آخر میں امریکہ بھی شریک ہوگیا، جس کی پالیسی اب تک یورپ کی سیاست سے علاحدگی کی تھی۔

اتحادی ممالک:

برطانیہ اور اس کے ساتھیوں کا نام اتحادی رکھا گیا۔ اتحادیوں میں حسب ذیل ممالک شامل

تھے:

(۱) برطانیہ، (۲) فرانس، (۳) اٹلی، (۴) امریکہ، (۵) جاپان، (۶) بلجیم، (۷) بولویا، (۸) برپریل، (۹) چین، (۱۰) کیوبا، (۱۱) زیکوسلوویکیا، (۱۲) یونان، (۱۳) پولینڈ، (۱۴) پرتگال، (۱۵) رومانیہ اور چھوٹی چھوٹی ریاستیں تھیں جن کو لے کر مجموعی تعداد ۱۷ تک پہنچتی ہے۔

جنگ میں ترکی کی شرکت:

برطانیہ کے کارنامے ترکوں کے سامنے کھلے پڑے تھے۔ جس طرح ایک ایک صوبہ کو ترکی کے قبضے سے نکال کر دوسروں کو ان پر اقتدار جمانے میں برطانیہ نے امداد و اعانت کی تھی وہ عیاں تھے۔ مثلاً ۷۸۔۱۸۷۷ء میں روس و ترکی کی جنگ میں ترکی کے دو صوبے بوسنیا اور ہرزی گووینا آسٹریا کے زیر انتظام برطانیہ ہی کی سازش سے دیے گئے تھے۔ بعد کو ۱۹۰۸ء میں آسٹریا نے ان دونوں کو اپنی مملکت میں شامل کرلیا۔ مصر پر برطانیہ نے قبضہ کرلیا تھا اور طرابلس کی جنگ میں ترکوں کا راستہ مصر سے روک دیا تھا۔ الغرض ایک داستان پھیلی ہوئی تھی۔ نوجوان ترکوں نے اصلاحات نافذ کر کے برطانیہ کی حمایت حاصل کرنی چاہی تھی لیکن جو طرز عمل بلقان میں برطانیہ اور فرانس نے اختیار کیا اس نے نوجوان ترکوں میں آخر مایوسی پیدا کردی اور کچھ بھی ہو نومبر ۱۹۱۴ء میں ترکی بھی جرمنی کی طرف سے جنگ میں شریک ہوگیا۔

جرمنی کی فوجی طاقت کا اس وقت ایک عالم لوہا مانتا تھا۔ اس نے اپنی سائنسی اور تکنیکی معلومات کی برتری کی بناء پر ایسے آلات حرب تیار کیے تھے جن کا دنیا کو تصور بھی نہ تھا۔ بلجیم کا وہ قلعہ جو ناقابل تسخیر سمجھا جاتا تھا، جرمنی کی ہاوٹرز توپوں نے روئی کے گالے کی طرح اڑا دیا۔ سربیا کے پرخچے اڑ گئے۔ فرانس بھاگنے لگا۔ شروع میں جو جرمنی کے سامنے آیا اس نے منہ کی کھائی۔

ترکوں نے جنگ میں داخل ہوتے ہی انور پاشا کی قیادت میں کوہ قاف کے علاقوں پر زبردست حملہ کیا۔ لیکن اس کو پسپا ہونا پڑا اور روس نے ارض روم پر قبضہ کرلیا۔ ۲رفروری ۱۹۱۵ء کو مصر میں نہر سوئز پر ترکوں نے یلغار کیا۔ لیکن وہاں بھی ان کو کامیابی نہیں ہوئی۔ اب اتحادیوں نے قسطنطنیہ پر قبضہ کر کے ترکی کو جنگ سے خارج کرنے کا پروگرام بنایا اور برطانیہ اور فرانس کی متحدہ بحری قوت نے ۲۹رفروری ۱۹۱۵ء کو درہ دانیال پر بھرپور بحری طاقت سے وار کیا۔ اتحادیوں کا خیال تھا کہ درہ دانیال جو ایک ڈھلوان درہ ہے اور جس کے دونوں کناروں پر قلعے بنے ہوئے ہیں ان

قلعوں پر توپیں نہیں ہیں اور وہ با آسانی درہ دانیال سے داخل ہو کر قسطنطنیہ پر قابض ہو جائیں گے، کیوں کہ سلطان عبدالحمید نے ان قلعوں کو زیر حکم آقایان برطانیہ غیر مسلح کر دیا تھا۔ لیکن اس کو سخت مقابلے کا سامنا ہوا۔ نوجوان ترکوں نے آتے ہی ان قلعوں پر توپیں چڑھا دیں۔ اور ہر طرح کا ساز و سامان حرب مہیا کر دیا تھا۔ سیکڑوں توپوں کی زد سے جب کہ اس زمانے میں ہوائی جہاز نہ تھے، بحری جہازوں کا بچ کر نکل جانا محال تھا۔ لیکن اب یہ معاملہ اتحادیوں کی عزت کا مسئلہ بن گیا تھا۔ ۱۹ رفروری ۱۹۱۵ کو پسپا ہونے کے بعد ۲۳ رفروری ۱۹۱۵ء، ۶ رمارچ ۱۹۱۵ء، ۱۸ رمارچ ۱۹۱۵ء کو زبردست تیاریوں سے حملے کیے گئے جن کی نگرانی کے لیے لارڈ کچنر بہ نفس نفیس ایک موقع پر آئے۔ لیکن سب بے سود۔ اتحادیوں کو کوئی کامیابی نہیں ہوئی تو ۲۵ راپریل ۱۹۱۵ء کو بحری و بری مشترکہ حملہ شروع ہوا۔ اسکیم یہ تھی کہ گیلی پولی کے ذریعے خشکی کے راستے قسطنطنیہ پر قبضہ کیا جائے۔ لیکن ترکوں نے جس طرح بحری حملہ رد کر دیا تھا، اپنی روایتی شجاعت اور دلیری کو قائم رکھتے ہوئے غازی مصطفیٰ کمال پاشا کی سرکردگی میں اتحادیوں کو شکست فاش دی اور آخرکار خود اتحادیوں کے قول کے مطابق ۳۱۳۸۹ ہلاک، ۱۸۷۴۰ مجروح اور ۹۷۰۸ گمشدہ کو چھوڑ کر اتحادی وہاں سے فرار ہو گئے۔ اس جنگ میں ترکوں نے جس جانبازی و جوانمردی کا ثبوت دیا وہ ان کی شجاعانہ کارروائیوں میں بھی عدیم المثال ہے۔ لیکن میسوپٹامیہ میں ہندوستان کی ہندو مسلم فوجوں اور عربوں کی بغاوت سے ترکوں کو شکست پر شکست کا سامنا کرنا پڑا۔ شروع میں تو ترکوں نے اپنی بہادری کا سکہ جمایا لیکن بعدہ موصل اور دریائے فرات پر ترکوں کو نقصان اٹھانا پڑا۔ حتیٰ کہ ۲۸ رستمبر ۱۹۱۶ء کو تکریت پر برطانیہ کا قبضہ ہو گیا۔ پھر جنرل ٹاؤنشنڈ برطانوی اور ہندوستانی فوجوں کے ساتھ غازہ کی طرف بڑھا۔ ادھر فلسطین کا یہ حال ہوا کہ برطانوی اور ہندوستانی فوجیں غازہ تک بڑھتی چلی گئیں اور ۲۶ رمارچ ۱۹۱۷ء کو غازہ کے مضبوط مسلح شہر پر حملہ ہوا۔ دو دن کی خونریز جنگ کے بعد انگریزوں کو پسپا ہونا پڑا۔ تب فرانس سے جنرل البنر ی کو بھیجا گیا۔ جنرل البنر ی نے ۳۱ راکتوبر ۱۹۱۷ء کو بلیرشبہ پر قبضہ کر لیا اور ۷ رنومبر ۱۹۱۷ء کو غازہ کا سقوط بھی عمل میں آیا۔ اس کے بعد ۱۶ رنومبر ۱۹۱۷ء کو جنرل البنر ی نے ترکوں کو جافہ تک ڈھکیل دیا اور ۹ ردسمبر ۱۹۱۷ء کو بیت المقدس فتح ہو گیا۔

۱۹۱۷ء موسم بہار میں جنرل البنر ی نے دریائے اردن کو عبور کر لیا اور جنرل البنر ی کی سوار فوجوں نے ترکوں کے لیے مغرب کی طرف پیچھے ہٹنا ناممکن کر دیا۔ مشرق کی طرف امیر فیصل اور

کرنل لارنس کی قیادت میں تعاون کرنے والے عربوں نے راستہ کاٹ دیا۔ اکتوبر ۱۹۱۷ء کے آخر میں جنرل الینبی الپو میں داخل ہوا اور فلسطین کی فتح مکمل ہوگئی۔ آخرکار ۳۰؍اکتوبر ۱۹۱۸ء کو مڈراس کے مقام پر عارضی صلح کی بات چیت کا آغاز ہوا اور اسی دن ترکی کی جنگی سرگرمیاں ختم ہوگئیں۔

۹؍نومبر ۱۹۱۸ء کو جرمنی نے صلح کی درخواست کی۔ قیصر جرمنی ولیم دوم نے تاج و تخت سے دستبرداری دے دی اور فرار ہوگیا اور جنگ بندی کے شرائط طے ہوئے اور بعدہ ہر محارب ملک سے اتحادیوں نے الگ الگ صلح نامے کیے۔ (تحریکِ خلافت، از قاضی محمد عدیل عباسی، دہلی، ۱۹۷۸ء، ص ۵۴۔۵۱)

۱۵؍دسمبر ۱۹۱۸ء: ۱۱؍نومبر ۱۹۱۸ء کو جنگ عظیم اول کا خاتمہ ہوگیا۔ اس جنگ میں جرمنی، آسٹریا اور ترکی شکست کھا گئے۔ برطانوی ایمپائر میں فتح کی خوشی میں ہفت روزہ جشن منایا گیا۔ ہندوستان کے طول و عرض میں بہت سے جلسے ہوئے۔ ۱۵؍دسمبر کو لاہور میں ایک جلسہ پنجاب کے گورنر سر مائیکل اوڈوائر کی صدارت میں بریڈلا ہال میں منعقد ہوا۔ اور معززین پنجاب کو عصرانہ دیا گیا۔ اس جلسے میں علامہ اقبال کو بطور خاص شرکت کی دعوت دی گئی تھی۔ علامہ شریک ہوئے تھے اور نظم بھی پیش کی تھی۔ ڈاکٹر غلام جیلانی برق لکھتے ہیں:

''...... چوں کہ میں ان دنوں لاہور میں تھا اس لیے بیش تر اجتماعات اپنی آنکھوں سے دیکھے۔ جشن کے ساتویں دن پنجاب کے گورنر اوڈوائر نے لاہور کے ایک ہزار اکابر کو عصرانے پر بلایا۔ ان میں اقبال بھی شامل تھے۔ گورنر نے تین چار روز پہلے اقبال کے ایک نہایت مخلص دوست سر ذوالفقار علی خان کو تاکید کی تھی کہ وہ علامہ اقبال سے جشن کے سلسلے میں ایک نظم لکھوائیں...... وہ گورنر ہاؤس سے نکل کر سیدھے اقبال کے یہاں گئے اور بات بتائی۔ اقبال نے کہا ایسا کرنا میری موت ہے...... سر ذوالفقار علی کسی طرح اپنے مطالبے سے دستبردار ہونے پر تیار نہ ہوئے تو اقبال نے اس شرط پر حامی بھر لی کہ وہ اس کی نقل کسی کو نہیں دیں گے اور نہ کسی جریدے میں شائع ہوگی۔ اتنی احتیاط کے باوجود دوسرے روز ایک اخبار میں شائع ہوگئی:

اس کے بعد برق نے پانچ شعر کی یہ نظم نقل کی ہے:

ہیچ می دانی کی صورت بند ہستی یا فرانس
فکرِ رنگین و دلِ گرم و شرابِ ناب داد

روس از سرمایۂ جمعیت ملت ربود
قہرا وکوہِ گراں رالرزشِ سیماب داد
ملک و تدبیر و تجارت رابہ انگلستاں سپرد
جرمنی راچشمِ حیران و دل بے تاب داد
تابر انگیز د نوائے حریت از ساز دہر
صدر جمہوریۂ امریکہ را مضراب داد
ہر کسے در خور و فطرتِ از جناب او ببرد
بہر ماچیزے نماندہ خویش راباما سپرد

(اقبال۔ جادو گر ہندی: نژادا: عتیق صدیقی، ص ۷۸، ۷۷)

مسلمانوں نے جشن فتح کا مکمل طور پر مقاطعہ کیا تھا۔ ان کے ساتھ تمام حریت پسند اور قوم پرست ہندو بھی شریک تھے۔ لیکن علامہ اقبال مرحوم جشن فتح کے جلسوں میں شریک ہوئے اور اپنے وفادار ہونے کا یقین دلایا۔ ''نذر محقر'' پیش کی اور برٹش استعمار کی تعریف کی اور اس کے حضور اپنی عقیدت کا اظہار کیا۔ جشن فتح میں شرکت اور نظم خوانی کا واقعہ عبدالمجید سالک نے ''ذکر اقبال'' میں اور برق نے اپنے ایک مضمون ''میں اور اقبال'' مشمولہ ''اوراق گم گشتہ'' میں بیان کیا ہے۔

کانگریس کا سالانہ جلسہ:

۲۶ر دسمبر ۱۹۱۸ء کو دہلی میں آل انڈیا کانگریس کا تینتیسواں سالانہ اجلاس پنڈت مدن موہن مالویہ کی صدارت میں منعقد ہوا۔ اس اجلاس میں ۴۸۶۹ ڈیلیگیٹ شریک ہوئے۔ جناب حکیم اجمل خان، جناب ڈاکٹر مختار احمد انصاری اس اجلاس کے روح رواں تھے۔ صدارت کے لیے لوکمانیہ بال گنگا دھر تلک کا نام تجویز پایا تھا۔ مگر ان کو گاندھی جی کے ہمراہ ہتک عزت کے ایک مقدمے کی پیروی کے لیے اچانک لندن جانا پڑا۔ اس لیے مالویہ جی کو صدارت سنبھالنی پڑی۔ اس اجلاس میں مولانا حسرت موہانی نے شرکت کی تھی اور ایک شعر بھی حسب حال فرمایا تھا:

مغموم نہ ہونا خاطر حسرت کہ تلک تک
پیغام وفاباد سحر لے کے گئی ہے

مولانا حسرت کی تقریر:

اس اجلاس میں تقریر کرتے ہوئے مولانا حسرت نے شمالی ہند کے مسلمانوں کو خطاب کرتے ہوئے کہا کہ ہم دعوے سے کہہ سکتے ہیں کہ جو لوگ اس زمانے میں بھی کانگریس میں شرکت کرنے کو مسلمانوں کے حق میں مضر سمجھتے ہیں، ان کے پاس سوائے اس کے اور کوئی دلیل نہیں ہے کہ ہم سرسید کی پالیسی کے پیرو ہیں۔ ہم اس کو تسلیم کرتے ہیں کہ سرسید احمد اپنے زمانے میں قوم کے مسلمہ رہنما تھے اس وقت مسلمانوں کے حق میں انھوں نے جو کچھ کیا بہتر کیا۔ اس بناء پر کہ غدر کے بعد سرکار انگلشیہ مسلمانوں سے بدگمان تھی اور ان کو بغاوت کا ملزم سمجھتی تھی تو بہت خوب کیا۔ اگر انھوں نے مسلمانوں کی توجہ کو تمام معاملات ملکی سے علاحدہ کر کے صرف اعلیٰ تعلیم کی جانب مائل کر دیا تو اور بھی خوب کیا۔ لیکن ہم سوال کرتے ہیں کہ کیا زمانے کی اب تک وہی حالت ہے جو سرسید کے وقت میں تھی۔ کیا سرکار انگریزی کو اب کسی متنفس پر بغاوت کا شبہ ہے؟ ہم پھر سوال کرتے ہیں کہ آیا اب بھی ہم کو اس نصیحت پر بلا چوں چرا عمل کرنا چاہیے کہ گورنمنٹ کی عنایت ہمارے لیے کافی ہے اور بفرض محال گورنمنٹ نے عنایت کی بھی تو آیا یہ مہربانی اس کی ہمارے حق میں مفید بھی ہوگی؟

سب سے بڑا اعتراض شرکت کانگریس کے لیے یہ پیش کیا جاتا ہے کہ ہم ابھی دیگر اقوام ہند کے برابر تعلیم یافتہ نہیں ہوئے، اس لیے ان کے ساتھ برابری کی شرکت ہم سے نبھ نہ سکے گی اور اس لیے ہم کو بھی صرف تعلیم کی جانب متوجہ رہنا چاہیے۔ جب اس میں کمال پیدا ہو جائے گا تب ملکی معاملات میں بھی دخل دیں گے۔

(سکسٹی ایئرز آف کانگریس، ص ۲۱۵، وحسرت موہانی...... ایک سیاسی ڈائری)

اس کا جواب کسی قدر ہمارے دوست شیخ عبداللہ صاحب بی اے، ایل ایل بی نے ''اردوے معلیٰ'' کے کسی نمبر میں دیا تھا کہ کوئی قوم اس وقت تک ترقی نہیں کر سکتی جب تک وہ علمی ترقی کے ساتھ سوشل اور پولیٹکل حالات میں بھی ترقی نہ کرے۔ بعض لوگ یہ بھی شبہ کرتے ہیں کہ اگر مسلمان کانگریس میں شریک بھی ہوئے تو یہ اس کے جزو ضعیف ہوں گے اور اس لیے نقصان میں رہیں گے۔ لیکن ہم کہتے ہیں کہ کسی گروہ کی طاقت کا دارومدار تمام تر اس کی تعداد پر ہی نہیں ہوتا۔ دیکھو کہ کانگریس میں پارسیوں کا زور کس قدر ہے اور پھر یہ بھی دیکھو کہ ان کی آبادی ہندوستان میں کس قدر ہے۔

اصل یہ ہے کہ قوت اصل میں قابلیت اور کوشش و جہد کی ہو نہ کہ تعداد کی۔ ہم مانتے ہیں کہ کچھ دنوں تک مسلمانوں کی آواز کانگریس میں ضرور کمزور رہے گی لیکن ہم کو اگر انتہا تک پہنچنا ہے تو بغیر ابتدا کے چارہ نہیں ہے۔ ہم کو چاہیے کہ کچھ دن اس مجمع بزرگ میں رہ کر یہاں کی راہ و رسم سے واقفیت پیدا کریں اور اپنی قوم میں تقریر کرنے والے اور پالیٹکس سے دلچسپی رکھنے والوں کی تعداد کو بڑھانے کی فکر کریں۔ پھر ہم ملکی معاملات میں شریک ہو کر اور کوشش کر کے اپنی آواز کو طاقتور بنائیں، صرف آرزو سے کام نہیں ہوسکتا۔ جب تک اس آرزو کا نتیجہ ہمت اور کوشش اور استقلال نہ ہو۔

گزشتہ پندرہ سولہ سال کے عرصے میں ان باتوں کو جن معمولی کوششوں کے ذریعے سے ہم نے حاصل کیا ہے، اس کے دیکھتے ہوئے کسی کو مایوس ہونے کی ضرورت نہیں ہے۔ بہت سی باتوں میں ایجی ٹیشن سے بہت فائدہ پہنچا۔ مثلاً یونیورسٹی کمیشن کی رپورٹ میں کئی دفعات نرم کر دیے گئے۔ آفیشل سیکرٹ بل کی سختی بھی کسی قدر کم کر دی گئی اور اس سے قبل جنوبی افریقہ کی فوجوں کا خرچ ہندوستان کے ذمہ نہ رہا۔ ملک معظم کے دربار تاجپوشی کے زمانے میں مہمانان ہند کا سفر خرچ بھی ہندوستان کو نہ دینا پڑا۔ لیکن ان سب کامیابیوں کے باوجود بہت سے لوگ پھر بھی گرداب مایوسی میں مبتلا نظر آتے ہیں۔ غرضے کہ خلاصہ کلام یہ قرار پایا کہ لوگوں کا یہ شبہ کہ کانگریس ایک محض بے سود مجمع ہے، بالکل غلط ہے! نیز بعض لوگوں کا یہ خیال کہ پولیٹکل ایجی ٹیشن سے کوئی فائدہ نہیں حقیقت سے بہت دور ہے۔ (حسرت موہانی......ایک سیاسی ڈائری)

علامہ اقبال کا ایک تاریخی قطعہ:

وائسرائے ہند نے دہلی میں جنگ عظیم اول کے اواخر میں وار کانفرنس منعقد کی تھی اور نواب ذوالفقار علی خان کی وساطت سے اس کانفرنس میں علامہ اقبال کو بھی مدعو کیا گیا تھا۔ علامہ مرحوم نے اس میں شرکت کی اور نو بند پر مشتمل ایک مسدس شہنشاہ ہند کی خدمت میں بہ طور ''نذر محقر'' پیش فرمایا۔ اس مسدس کا پہلا بند یہ ہے:

اے تاجدار خطہ جنت نشان ہند
روشن تجلیوں سے تری خاوران ہند
محکم ترے قلم سے نظام جہان ہند
تیغ جگر شگاف تری پاسبان ہند
ہنگامۂ وغا میں میرا سر قبول ہو

اہل وفا کی "نذر محقر" قبول ہو

عبدالمجید سالک کا بیان ہے کہ یہ مسدس علامہ نے مجبور ہو کر لکھا تھا۔ اگرچہ مسدس کے مطالعے سے اس جبر کا پتا چلانا مشکل ہے۔ مرحوم کی شاعری جبر و اختیار، دونوں عالم میں بہت خوب ہے۔ حضرت علامہ نے خیال نہیں فرمایا کہ جس تاجدار برطانیہ و ہند سے خاوران ہند جگمگا اٹھے تھے اس نے خلافت اسلامیہ کے سورج کو گہنا دیا تھا اور جس تیغ جگر شگاف نے ہندوستان کی پاسبانی کی تھی اس نے لاکھوں فرزندان توحید اور جاں نثارانِ خلافت کے سینوں کو چھلنی کر دیا اور خلافت ترکیہ کو نیم بسمل بنا دیا تھا۔

مولانا نجم الدین صاحب اصلاحی رح کی مرتب کردہ

مکتوبات شیخ الاسلام رح

کامل چار جلدیں جدید اضافہ شدہ ایڈیشن

یعنی

قطب الارشاد، شیخ العرب والعجم حضرت مولانا حافظ الحاج سید حسین احمد مدنی قدس سرہ

شیخ الحدیث دارالعلوم دیوبند کے اُن خطوط کا مجموعہ جو انھوں نے اپنے دوستوں عزیزوں اور ارادتمندوں کو لکھے جن میں مذہبی، علمی، فقہی اور ملکی و سیاسی خیالات و افکار و مسائل کا بڑا عظیم الشان ذخیرہ موجود ہے۔

یہ چاروں جلدیں پہلے لیتھو کی کتابت پر طبع ہوئی تھیں چونکہ اب لیتھو کا سلسلہ ترک ہوگیا ہے۔ اس لئے اب نئی آفسٹ کی کتابت کراکر پاکستان میں پہلی مرتبہ مکتبہ رشیدیہ نے شائع کی ہیں۔ بہتر کتابت، طباعت عمدہ ریگزین کی جلد

تشنگانِ علومِ نبوت و اسرارِ شریعت کے لئے مژدۂ عظیم

معارفِ مدنیہ شرح اردو ترمذی شریف

مع افاداتِ مبارکہ

امام العصر شیخ الاسلام حضرت شیخ سید حسین احمد صاحب مدنی قدس سرہ العزیز و تحقیقاتِ اکابر محققین

چند خصوصیات

معارفِ مدنیہ ائمہ متقدمین و مجتہدین نیز امام طحاوی، علامہ رازی، امام غزالی، علامہ ابن ہمام، حافظ ابن حجر عسقلانی، علامہ عینی، امام عبدالوہاب شعرانی، حضرت شیخ عبدالقادر جیلانی، حضرت شیخ اکبر محی الدین ابن عربی، علامہ ابن النجیم، قاضی ابوبکر بن عربی، علامہ خطابی، علامہ نووی، حافظ ابن تیمیہ، حافظ ابن قیم، علامہ ابن قدامہ حنبلی، امام ربانی مجدد الف ثانی، علامہ علاء الدین ترکمانی، شیخ شاہ ولی اللہ دہلوی، علامہ ابن عبدالبر مالکی، علامہ جلال الدین سیوطی، حجۃ الاسلام شیخ محمد قاسم نانوتوی، قطب العالم شیخ رشید احمد گنگوہی، حضرت شیخ الہند شیخ محمود حسن، حضرت علامہ عبدالرحمٰن سہارنپوری، شمس الائمہ سرخسی، علامہ شوکانی، علامہ ذہبی، حکیم الامت شیخ اشرف علی تھانوی رحمہم اللہ تعالیٰ جیسے محققین کی تقریرات و تشریحات کا ایک نفیس گلدستہ ہے جس میں ان اکابر کی تحقیقات کے گل ہائے رنگا رنگ جابجا اپنی نرالی شان سے چمکتے اور مہکتے نظر آئیں گے۔

معارفِ مدنیہ میں سرکارِ دوعالم صلی اللہ علیہ وسلم کے مبارک اقوال و تعلیمات اس حاملِ علوم شریعت و طریقت کے ساتھ ملیں گی جو بارہ سال تک گنبدِ خضرا کے سایہ میں براہِ راست فیوض و برکاتِ نبوت کے شاد رہا ہے۔

معارفِ مدنیہ میں ائمہ اربعہ کے مسالک، ان کے مفصل دلائل، فقہ حنفی کی امتیازی خصوصیات پر جامع و سیر حاصل مباحث میں امام المحققین حضرت علامہ شیخ انور شاہ کشمیری رحمۃ اللہ علیہ و دیگر اکابر عصر کی گرانقدر تحقیقات کے جواہر پارے جابجا نظر آئیں گے۔

معارفِ مدنیہ میں عصرِ حاضر کے مسائل پر اسلام کی روشنی میں تبصرے، دورِ جدید کے پیدا کردہ شکوک و شبہات نیز مستشرقین یورپ کے اعتراضات کے محققانہ جوابات، اسلامی تعلیمات کے اسرار و حکم، بصیرت افروز حقائق و معارف نیز متعدد ایسے مباحث ملیں گے جو کسی دوسری جگہ نہ مل سکیں گے۔ انشاء اللہ تعالیٰ

معارفِ مدنیہ عوام، طلبہ و علماء کرام نیز جدید تعلیم یافتہ حضرات کے لئے یکساں طور پر مفید ہے۔

حضرت مولانا سید حسین احمد مدنی قدس اللہ سرہ العزیز

مولانا افضال الٰہی دیوبندی